ایڈیٹر: عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs 7.

62 nP.

ضروری اعلان

ناگزیر وجوہ کی بنا پر ——— جن میں بڑی وجہ مدیر تجلی کی علالت رہی یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں کافی تاخیر سے پہنچ رہا ہے۔ جناب مدیر کی صحت اب اگرچہ پہلے سے بہتر ہے لیکن اگلے شماروں کو ٹھیک وقت پر لانے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہی ہے کہ دو ماہ کا شمارہ ایک ساتھ شائع کیا جائے۔ چنانچہ قارئین کے احساسات کا پورا اندازہ رکھنے کے باوجود ہم اپنے آپ کو اس اعلان پر مجبور پاتے ہیں کہ اگلا اپریل کا پرچہ، اپریل میں شائع نہیں ہو سکے گا، بلکہ اپریل اور مئی کا مشترکہ نمبر انشاء اللہ یکم مئی کو اشاعت پذیر ہوگا۔

سال میں ایک دو مشترک شماروں کے اگرچہ قارئین تجلی عادی ہو چکے ہیں، اور ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ زبردستی کی عادت ان پر شاق ہی گذرتی ہے لیکن اس کی افادیت بہرحال نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جب کبھی معذوریوں کے تحت کسی اشاعت میں تاخیر واقع ہو جاتی ہے تو اس طریقہ پر اس کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے، ورنہ ایسا نہ کیا جائے تو مہینوں تک ہر شمارہ کچھ نہ کچھ لیٹ ہوتا رہے۔ ہر مہینے کی خلش اور کاہش انتظار سے کہیں بہتر ہے کہ کسی ایک ماہ ڈٹ کر صبر کر لیا جائے۔

یہ بہرحال ہمیں امید ہے کہ جس طرح پچھلا ہر مشترکہ شمارہ اپنی افادیت، دلکشی اور جاذبیت کے باعث یک ماہی تعطیل کا نعم البدل ثابت ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح انشاء اللہ اب کی بھی قارئین کو مایوسی نہیں ہوگی۔

مخلصین و محسنین سے درخواست ہے کہ وہ مدیر تجلی کی صحت عاجلہ کے لئے دعا فرمائیں اور اس گرانیِ خاطر کے لئے ادارے کو معاف فرمائیں جس کی ذمہ داری بلاشبہ ادارے ہی پر عائد ہوتی ہے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان ——— الملتمس

منیجر تجلی

فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۶۲ء

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔
پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ بھیجدیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۰ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

شمس نوید عثمانی

آغازِ سخن

"تجلّی" کی تقریباً تیرہ سالہ تاریخ میں یہ بات ایک "حادثہ" سے کم نہیں کہ اس کا "آغازِ سخن" مدیر تجلّی مولانا عامر عثمانی کے بجائے کوئی اور لکھنے بیٹھا ہے۔ نومبر ۴۹ء سے لے کر آج تک اداریہ کے صفحات ہمیشہ اس کے مدیر کے ممنونِ قلم رہے ہیں۔ لیکن اس بار مدیر تجلّی کے حکم پر مارچ ۶۲ء کے اداریہ کو سپردِ قلم کرنے کا فرض مجھے ادا کرنا پڑ رہا ہے ــــ اس کا باعث کیا ہوا؟ اس کا اندازہ تجلّی کے اکثر و بیشتر ناظرین فروری ۶۲ء کے آغازِ سخن سے روشنی میں خود بھی کر سکتے ہیں۔ جس میں مولانا عامر عثمانی نے غیر معمولی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنی علالت کا تذکرہ فرمایا تھا۔ یہ علالت کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے، اور اب جب کہ رسالے کی تاریخِ اشاعت بالکل سر پر آگئی ہے یہ ضروری ہوا کہ "آغازِ سخن" مرتب ہو جائے۔ میری خواہش تو آپ سب کی طرح یہی تھی کہ مولانا موصوف خود ہی اداریہ کو قلم بند کریں یا کم سے کم املا کرا دیں۔ لیکن کسی بھی صفحہ کی "خانہ پُری" مولانا کو کبھی گوارا نہیں ہوئی ــ حضورِ قلب اور حقیقی دلچسپی کی پوری زندگی کے ساتھ وہ رسالے کے تمام تر صفحات کو منتخب مواد سے زینت دینے کے خوگر رہے ہیں۔ تجلّی کی طویل زندگی کا ہر "ماہنامہ" گواہ ہے کہ اگر معیاری اور پسندیدہ مواد باہر سے فراہم نہ ہو سکا تو انھوں نے پورا کا پورا رسالہ اپنے قلم سے لکھا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ مشقت و کاوش کی خشک اور عرق ریز راہ کو چھوڑ کر وہ غیر معیاری مضامین سے مصالحت پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تجلّی نے طبع زاد اور غیر مطبوعہ مضامین پیش کر کے اپنی اس انفرادیت کو ہمیشہ قائم رکھا اور یہی باعث تھا کہ مولانا موصوف نے بھرتی کا اداریہ زور میں لکھانے کے بجائے یہ پسند کیا کہ بیماری اور نقاہت سے جنگ کر کے ذہنی انتشار میں کچھ لکھنے کے بجائے کچھ نہ لکھیں۔

میں خوب محسوس کر رہا ہوں کہ ان تمہیدی کلمات سے گزرتے ہوئے تجلّی کے سیکڑوں ناظرین پہلے سے کیا سوچ رہے ہیں! غالباً ان کے دل و دماغ کی سطح پر ابھرا ہوا پہلا سوال یہ ہوگا کہ آغازِ سخن کے صفحات میں وہ مولانا عامر عثمانی سے کب ملاقات کر سکیں گے؟ آپ کو اس باب میں متوحش ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ کا تجلّی مدیر تجلّی کے دماغ و قلم کا "اداریہ" پیش کرے گا۔ مولانا کی علالت کا زور ٹوٹ چکا ہے اور خدا کے فضل سے یہ قوی توقع ہے کہ اگلے ماہ کا آغازِ سخن لکھنے کے وقت تک بیماری کے بقیہ اثرات اور کمزوری کی یہ گرفت بھی ختم ہو چکی ہوگی اور مولانا موصوف جو اپنے ناظرین کی گہری محبت اور خلوص کیشی کا پورا احساس رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی عظیم نعمت تصور کرتے ہیں "شکرِ نعمت" کا عملی موقعہ پا سکیں گے۔

تجلّی کے ناظرین اور مدیر تجلّی کے درمیان قلبی تعلق کے احساس نے مجھے اس عظیم حقیقت کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ دیا ہے کہ الحمد للہ کیا چیز ہے یہ حقیقت اس باہمی تعلق کی بنیاد دنیا کے کسی رشتے پر نہیں۔ خالق تعلق گوشت پوست کے بندھن، مفادات کا رشتہ ضبط

ان میں سے کوئی چیز یہاں موجود نہیں۔ لیکن اس کے
وجود۔ تعلق کی کوئی ظاہری بنیاد موجود نہ ہونے کے باوجود
ایک گہرا، عمیق اور بے لوث تعلق پوری قدرت کے
ساتھ موجود ہے۔ اس تعلق کی بنیاد سوائے اس کے اور
کیا ہے کہ انسان کی روح "سچائی" اور اعلائے کلمۃ الحق
سے والہانہ محبت رکھتی ہے۔ یہ "حق" کی موجودگی کا
مقناطیسی احساس سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلوں کو
طے کرتا ہوا ظاہری اجنبیت و بیگانگی کی تمام حدیں توڑتا
ایک ایسے لطیف تعلق خاطر کی بلندیوں تک جا پہنچتا
ہے جہاں ہر دو انسان صرف اس لئے ایک دوسرے کو
سینے سے لگا لیتے ہیں کہ وہ دونوں ایک خدا کے پجاری
ہیں اور ایک رسول کے غلام ہیں۔ ایک قرآن کا لاہوتی
نغمہ ان کے دلوں کی دھڑکنوں سے پھوٹ رہا ہے اور
"اسلام" کے لفظِ حسین میں ان دونوں کا وجود گم
ہو چکا ہے۔

یہ للّٰہیت کا تعلق — یہ خدا کے لئے محبت کا
جذبہ اندازِ جس حد تک بھی کسی جگہ موجود ہے ایک ایسی
قیمتی شے ہے جس کی قیمت کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔
آج جب کہ انسان کی محبت اور نفرت کے جذبات
خود غرضی اور مفاد پرستی کے غلیظ ڈگر پر چکرا رہے ہیں، آج
جب کہ دو حقیقی بھائی ایک دوسرے کو اس وقت تک
سینے سے لگانے کے لئے تیار نہیں جب تک اس ہم آغوشی
کے نتیجے میں ذاتی مفادات کو تقویت پہنچنے کا کوئی پہلو نہ
نکل آئے — آج جبکہ خود غرضی اور خود کامی نے خونی تعلق
کی شہ رگیں کاٹ کر رکھ دی ہیں۔ ایسی ہولناک اور
تاریک دنیا میں اگر کسی جگہ بھی الحب للّٰہ کا کوئی منظر
نظر آتا ہے تو کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ — نہیں —
ہرگز نہیں!!

... پھینکا ہے اور
درحقیقت ہماری تمام تر تنگی و چھوٹے پاس خاطر میں
... کا اصلی سبب اور ہماری ...؟
... کا بنیادی باعث نفرت کے جذبات میں جس قدر
... رہا ہی انسانی ہدایت کا امکان

ہے کہ ہماری محبت و نفرت کے اسلامی معیار بدل چکے ہیں —
محبت و نفرت کے جذبات کا مرکز اب "للّٰہیت" کے سوا ہر چیز
ہے۔ ہر وہ نقصان ہمیں سراسیمہ کر سکتا ہے جس سے ہماری ذاتی
خود غرضانہ مفادات کو ہلکی سے ہلکی چوٹ پہنچ سکتی ہو — ہر وہ
منفعت کا پہلو ہمارے جذبات کو اپیل کر سکتا ہے جس سے
ہماری اپنی پسندیدگی اور تمنا کا کوئی بعید سے بعید علاقہ ہو۔
ہر وہ چیز ہمیں مشتعل کر سکتی ہے جس سے ہمارے نفس کے وقار
کو دھکا لگ رہا ہو — ہر وہ عمل ہمارے دل میں مسرت کی
گدگدی پیدا کر سکتا ہے جس سے ہمارے پندار کو تسکین ملتی
ہو۔ لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے "اسلام" کی نیم جان
نعش تڑپ رہی ہو تو ہم اس طرح خاموشی سے دیکھتے ہوئے
گذر جاتے ہیں جیسے ہماری رگوں میں زندگی کی کوئی رمق ہی
موجود نہیں۔ حلقۂ احباب میں بیٹھ کر ہم رونقِ محفل سے لطف
اندوز ہو سکتے ہیں، مگر مسجد کی محراب کے نیچے ویران معبد کے
در و دیوار کو ماتم میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ہمارے ہونٹوں سے کراہ
نہیں نکلتی! ایک باپ ایک ساعت کے لئے یہ برداشت
نہیں کر سکتا کہ اس کی اولاد اس کے منشاء کے خلاف کوئی
حرکت کر سکے۔ گستاخی کی ایک اٹھتی ہوئی سی نظر بھی نظر انداز
نہیں کی جا سکتی۔ بے ادبی کا ایک ہلکا سا "اُف" بھی احساسات
کو چھیڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہی باپ اپنی آنکھوں سے
دیکھتا ہے کہ اس کی اولاد اس کے "خدا" کے احکام کو قدموں
تلے روند رہی ہے اور اس کے رسول کے فرمانوں کا مذاق
اُڑا رہی ہے، لیکن یہ "حادثہ" اس کے جذبات نفرت و
محبت میں کوئی قیامت برپا نہیں کرتا!

ایک دوست دوسرے دوست کی موت پر اور ایک
عزیز دوسرے عزیز کی جانکنی پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا
کہ ہم دن رات یہ ہولناک خبریں سنتے ہیں کہ فرخ پرور
... کمیونسٹ ہو کر دینی موت مر گیا اور فلاں ...
کتاب ... ہزاروں مسلمانوں کے ایمان ...
... مگر یہ خبریں اور یہ ۵۰ روپے ...
... میں کوئی ...
... حضیت میں ... گا اسی طرح وہ شخص

پیدا نہیں کرتے! کیسے کیسے فتنے ہیں جو اسلام کا چراغ گل کرنے کے لئے ظلمتوں کی آندھیاں اُٹھا رہے ہیں۔ کیسے کیسے خطرات ہیں جو حق کو تباہ کرنے کے لئے ہر افق سے نمودار ہو رہے ہیں۔ کہیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بغاوت ہو رہی ہے — کہیں خدا کی کتاب کے معنی و مفہوم میں تنسیخ و تحریف کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ کہیں توحید کو فنا کرنے کے لئے "قبوری شریعت" کے اہرام تعمیر ہو رہے ہیں — کہیں معصوم بچوں کی نسل کو کفر و شرک کا لذیذ زہر پلایا جا رہا ہے اور کہیں مذہب کا قلع قمع کرنے کے لئے لامذہبیت اور دہریت کا سُرخ عفریت اپنے خون آشام جبڑے تیز کر رہا ہے۔

لیکن اتنی پُرخطر دنیا میں ہم رات بھر پاؤں پسار کر میٹھی نیند سوتے ہیں! اور تمام دن دنیائے فانی کی بے اعتبار چند روزہ زندگی کی اُدھیڑ بُن میں اس طرح گم رہتے ہیں کہ "الحب للہ اور البغض للہ" کے جذبات کو ہمارے وجود میں سر اٹھانے کا ہلکے سے ہلکا موقعہ نہیں ملتا۔ وہی انسان جو دنیا کے نام پر محبت و نفرت کے پورے جذبات کے ساتھ جیتا جاگتا، بھاگتا دوڑتا اور ہنستا روتا ہوا نظر آتا ہے۔ "دین" کا نام سنتے ہی اس طرح ہاتھ پاؤں چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیتا اور سانس روک لیتا ہے جیسے اس کی رگوں میں زندگی کا دوڑتا ہوا خون اچانک رُک گیا ہے اور جیسے وہ ایک ٹھنڈی بے حس جامد لاش کے سوا کچھ بھی نہیں!

یہ مہیب صورتِ حال یقیناً حوصلہ شکن ہے۔ لیکن جتنی حوصلہ شکن اور روح فرسا ہے اسی قدر حیات انگیز اور مفید بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر شدید اور
الم ... لرزہ خیز ہو گی اتنی ہی شدت اور بے رحمی سے
انھوں نے ... سوئے ہوئے احساسات اور زنگ آلود روح
یہ کبھی نہیں ہوا کہ جھنجوڑ ڈالے گی۔ ہاں یہ ہمیں پوری ... تیرا
کو چھوڑ کر وہ غیر مذ... ہوشیار! تمہارے ا... پر آمادہ
ہو گئے ہوں۔ یہی ... ہیں۔ تمہارے ... زاد اور غیر مطبوعہ

عظیم جذباتِ حیات و کائنات کے مرکزِ تخلیق سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہارے اندر وہ دینی حس دھیرے دھیرے دم توڑ رہی ہے جس کا دوسرا حسین نام یہی الحب للہ اور البغض للہ ہے۔

نمازِ عشاء کے آخری موڑ پر جب بندہ اپنے خدا سے اگلے دن کی پَو پھٹنے تک کے لئے رخصت ہو کر نیند، موت آسا کیفیت میں گم ہونے سے پہلے اپنے مولا سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ "تیرے نافرمانوں سے میں ترکِ تعلق کرتا ہوں" تو وہ اسی عظیم حقیقت کا عہد کر رہا ہوتا ہے کہ اس کی محبت و نفرت، تعلق و لاتعلقی، دلچسپی اور سرد مہری کی بنیاد للہیت اور صرف للہیت ہو گی۔ وہ اس سے جُڑے گا جو اس کے خدا سے جُڑا ہوا ہو گا وہ اس سے کٹ جائے گا جس نے اس کے مولا۔ اسکے حقیقی اور عظیم ترین محسن سے اپنا تعلق ختم کر کے اربابِ من دون اللہ کے ساتھ محبت و دوستی کی گستاخانہ جسارت کی ہو گی۔ یہ تعلق و لاتعلقی کا عہد صرف خارجی دنیا کے سلسلے میں ہی نہیں وہ خود اپنے وجود کی داخلی دنیا کے باب میں بھی کرتا ہے۔ یعنی وہ خود اپنے جسم و روح کے صرف ان میلانات کو اپنائے گا جن میں اس کے خدا کے تعلق کی حسین نسبت کارفرما ہو گی اور ان تمام داعیوں، ان تمام خواہشات اور تمناؤں سے یک قلم قطعِ تعلق کرے گا جو اس کو اسکے معبود کی راہ سے ہٹا کر کسی دوسری سمت میں کشاں کشاں لے جانا چاہتی ہوں۔ وہ دوسروں ہی کے ساتھ نہیں خود اپنی ذات سے بھی خدا ہی کے لئے محبت کرے گا اور خدا ہی کے لئے نفرت کرے گا۔ اس کی محبت و نفرت کے معیار اس کی لذت کیش نفسانیت اور خود کامی کے
ہاتھوں نہ بنیں گے، بلکہ اس کے جذباتِ محبت و نفرت
کے ... اپنے من اور اپنے دل کے بجائے اسکے
کا موقعہ دیا ہے کہ ...
باہمی تعلق کی بنیاد دنیا کے ... ہے وہ عہد جو ہم لوگ روزِ ازل
گوشت پوست کے بندھن ... رہے تھے جب اس نے ہماری
... فرما کر الست بربکم

لیا میں تمہارا پروردگار نہیں ؟) کے الفاظ سے خطاب کیا تھا۔ اور ہم سب نے بیک زبان و بیک جنبشِ دل یہ نعرۂ شوق بلند کیا تھا کہ "بلیٰ !" (ہاں کیوں نہیں ؟) — بیشک تو ہی ہمارا پالن ہار ہے — تو ہی ہمارا معبود اور خالق ہے — تو ہی ہمارے جذبات محبت و نفرت کا ایک ور یگانہ محور ہے — اور یہی وہ عہد ہے جس کا اعادہ ہم روزانہ عشاء کی نماز میں دعائے قنوت کے ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں کہ "نخلع ونترك من يفجرك" —

لیکن ہم میں سے کتنے ایسے راست باز ہیں جو خدا سے یہ عہد کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے نشیب و فراز پر اسی عہد کی عملی صورت گری کا کام کرتے ہوئے گذرتے ہوں گے۔ کتنے ایسے ہیں جو زبان سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل بھی اسی آواز سے آواز ملا کر سینوں کی گہرائیوں میں دھڑک رہے ہوں اور زبان و دل کی اس مشترک آواز پر ان کے کردار و عمل کے قدم بھی اسی سمت میں اٹھ رہے ہوں۔ کتنے ایسے حساس بن رہے ہیں جو شب و روز کی ایک ساعت گریز پا کے لئے زندگی کے ہنگاموں میں چونک کر اس بات کا جائزہ لیتے ہوں کہ خدا کے سامنے انھوں نے جو عہد کیا تھا خدائی کے آگے اسی عہد کا ثبوت دے رہے ہیں کہ نہیں ؟ — وہ ایمان و وفا کیشی کا جو جذباتی عہد نخلع ونترك من يفجرك کے الفاظ میں کر چکے ہیں زندگی کی عملی قربانگاہ میں اس عہد پر کیا کچھ بھینٹ چڑھا سکے ہیں ؟ کتنے انسانوں سے انھوں نے اس عہد کی روشنی میں تعلق قائم کیا ہے اور کتنے عزیزوں کو اس عہد کے احترام میں اپنے تعلق کی دنیا سے جلا وطن کیا ہے — کتنے ارمانوں اور ترنگوں کو اس عہد کے نام پر اپنے دل سے کھرچ کر پھینکا ہے اور کتنی صبر آزما قربانیوں کو اس عہد کے پاس خاطر میں تن من دھن سے قبول کیا ہے ؟

درحقیقت محبت و نفرت کے جذبات میں جس قدر یہ للٰہیت پیدا ہوگی اتنا ہی انسانی ہدایت کا امکان روشن اور یقینی ہو سکے گا۔ ورنہ یہ بالکل ممکن ہے کہ محبت و نفرت کے جذبات ہمیں انتہائی خطرناک دھوکا دے کر للٰہیت کے پردے میں ہماری نفسانیت و خود پرستی کا طلسم قائم کرتے چلے جائیں۔ ہم ایسی چیزوں سے وابستہ ہو جائیں جو خدا کی نہیں ہماری اپنی پسندیدہ چیزیں ہوں اور ایسی چیزوں سے اپنا تعلق توڑ لیں جو خدا کو درحقیقت پسند ہوں مگر وہ ہمارے نفس و خواہش کو لذیذ معلوم ہوتی ہوں۔

ہمارا ماحول ہمیں ہماری اس خطرناک بےحسی اور ایمانی سرد مہری کی مہلک بیماری کا بار بار احساس دلا رہا ہے۔ ہمارا عملی وجود اندر ہی اندر تشنج رہا ہے تم اپنے وجود کی گہرائیوں میں ایک ایسی موت کے جبڑوں میں پستے چلے جا رہے ہو کہ جس کے بعد زندگی کی کوئی حقیقی امید ہی نہیں — کاش دن رات کا کوئی ایک ہی لمحہ اس خطرناک مسئلے پر سوچنے سمجھنے کی توفیق عطا کرے کہ جس خدا نے ہمیں سب کچھ دیا اس کو ہم کچھ بھی دینے کے لئے تیار کیوں نہیں ؟ اور جس رسول ؐ نے اپنی تمام عمر ہمارے درد میں تڑپ کر بسر کی اس کے لئے ہمارے جذبات شل ہو کر کیوں رہ گئے ہیں ؟ — کون جانے کہ اب یہ بات سوچنے سمجھنے کی کتنی مہلت اور باقی رہ گئی ہے — اور اگر خدا نخواستہ ہمیں موت کی ہچکی نے آ دبوچا تو آخر کس طرح ہم اپنے خدا کو منہ دکھائینگے ؟

ضیت میں اللہ ... گا اسی طرح وہ شخص

بدعت کے رد اور توحید و سنت کے اثبات میں ایک عظیم کتاب
بدعت کیا ہے؟
چند ایسے دل نشین مقالات کا مجموعہ جو قبوری
شریعت کے ہر استدلال کے لئے پیامِ مرگ
کا درجہ رکھتے ہیں۔
قرآن — حدیث — عقل — اور نقل
ہر اعتبار سے واضح اور روشن براہین و شواہد
عُرس — فاتحہ — نذر و نیاز — تیجہ چہلم — الابلا
تمام ایجادات و بدعات کے لئے ضرب کلیم
نیا ایڈیشن عمدہ کاغذ اور سولہ صفحات کے قیمتی
اضافے کے ساتھ۔ مگر قیمت میں کوئی اضافہ نہیں
وہی — تین روپے
وجد و سماع
از شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح
گانا بجانا۔ قوالی۔ عرس وغیرہ
کے بارے میں بے نظیر گفتگو
پیش لفظ مدیر تجلی کا ہے۔
بلاغ المبین
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح
کی
ایک بیش بہا کتاب کا اردو ترجمہ۔ جو بدعت کے رد، سنت
کے اثبات اور عقائد صحیحہ کی توضیح میں نہایت اعلیٰ ہے۔
قیمت مجلد چار روپے

مستقل عنوان — عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

ہمسائے کے حقوق

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:- مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ (بخاری و مسلم)

ترجمہ:-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل مجھے ہمیشہ اس انداز میں پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہتے ہیں کہ جیسے اب اسے شریک وراثت ہی ٹھیرادیں گے۔

تفہیم:-

ایک پائدار، سربفلک اور عالی شان عمارت اُسی وقت بن سکتی ہے جب ہنرمند کاریگروں نے اس میں استعمال کئے جانے والے تمام سازوسامان پر پوری توجہ دی ہو۔ اینٹیں عمدہ پکی ہوئی ہوں۔ پتھر اچھی قسم کے ہوں۔ لوہا پختہ ہو۔ مسالے ہنرمندی سے بنائے گئے ہوں۔

اسی طرح معاشرے کو بھی ایک عمارت سمجھئے چند افراد مل کر ایک گھرانہ بناتے ہیں اور چند گھرانوں کے مجموعے سے خاندان بنتا ہے۔ پھر متعدد خاندانوں کا مجموعہ ایک گاؤں ایک قصبہ شہر کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور بہت سے شہر مل کر ملک کا نام پاتے ہیں۔ پورے معاشرے کے سدھار یا بگاڑ کا مدار اُن اکائیوں اور یونٹوں کے اوصاف احوال پر ہے جن کے مجموعے سے یہ معاشرہ بنتا ہے۔ اگر ایک ہی خاندان کے افراد باہم دگر اخوت و مودت کے تعلقات نہیں رکھ سکتے اگر ایک ہی گھرانے کے افراد بجائے حسن سلوک کے آپس میں بدسلوکی اور کدورت و نفرت کی روش اختیار کرتے ہیں تو لازمی بات ہے کہ ان بدگہر اور بداطوار افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ بنے گا وہ بھی فاسد و کاسد ہوگا۔ لیکن یہی افراد اگر باہم دگر ہمدردی و غمگساری کے تعلقات رکھتے ہیں تو ان کے مجموعے سے ظہور پانے والے خاندان اور کنبے ایسا ہی معاشرہ تخلیق کریں گے جس میں امن و محبت اور اخوت و دوستداری کے اثرات غالب ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اصلاح معاشرہ کے بلند بانگ دعوؤں اور نعروں کی بجائے انتہائی متانت اور اصرار و تاکید کے ساتھ اُن بنیادی مؤثرات اور ان اساسی اقدار و اُصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے جنھیں اپنا لینے کے بعد خود بخود ایک صالح اور بلند معاشرہ کا وجود میں آنا امر لازم ہے۔

آپ نے دیکھا اس نے صلہ رحمی پر کتنا زور دیا۔ ہمنے اگرچہ بخوف طوالت صلہ رحمی کی تاکید و تحسین کی تمام روایات بیان نہیں کی ہیں، لیکن جتنی بھی کی ہیں وہ یہ واضح کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں کہ ضرورت مند عزیز و اقربا کی حتی الوسع مدد کرنا ہر شخص کی ایسی ذمہ داری ہے جسے اللہ نے اس پر عائد کیا ہے اور جس طرح ایک صاحب نصاب زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی معصیت میں اللہ کے یہاں پکڑا جائے گا اسی طرح وہ شخص

بھی ضرور پکڑا جائے گا جس کا کوئی عزیز و قریب محتاج ہو اور وہ باوجود قدرت و استطاعت رکھنے کے اس کی احتیاج پوری نہ کرے۔ بس فرق نوعیت اور درجات کا ہے مجرم یقیناً دونوں ہی ہیں۔

یہ گویا خاندانوں کے نظم و ضبط کو حسن سلوک اور رفق و موانست میں رنگنے کی ایک پاکیزہ تعلیم تھی۔ اب اسی رفق و موانست کو نسل و نسب کے دائرے سے آگے بڑھا کر پورے عالمِ انسانی میں عام کرنے کی خاطر اسلام نے پڑوسی سے حسن سلوک کا وہ معیارِ اعلیٰ پیش کیا ہے جس سے بڑھ کر ہمہ گیر اور مؤثر معیار پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ذرا سوچئے بظاہر ایک پڑوسی کا معاملہ ہے لیکن فی الحقیقت یہی چھوٹا سا معاملہ بہت بڑا دائرہ بن کر پورے معاشرے کو گھیر لیتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا پڑوسی ضرور ہے۔ آپ کا محلہ سو آدمیوں پر مشتمل ہے تو ان میں سے ہر فرد باقی ننانوے افراد کا پڑوسی ہوگا۔ یہ تو فرق کیا جا سکتا ہے کہ چند افراد بالکل متصل رہتے ہیں اور دوسرے افراد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر، لیکن فاصلوں کا یہ معمولی سا اختلاف حقِ ہمسائگی کو ساقط نہیں کرتا۔ اسلام نے صرف اسی کو پڑوسی نہیں مانا ہے جس کا گھر آپ کے گھر سے بالکل ملا ہوا ہو، بلکہ اس نے بہت سے اور معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی عرف عام کا لحاظ کیا ہے اور عرف عام میں پڑوسی کا اطلاق پورے محلے پر ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی وہ ہدایات جو پڑوسی کے سلسلہ میں دی گئی ہیں محلے کے تمام افراد کو حاوی ہیں۔ گویا جن متعدد محلوں کے مجموعے سے ایک آبادی، ایک شہر بنتا ہے ان میں سے ہر ایک کے باشندوں پر اس نے ایک دوسرے کی غمگساری، مدد، ہمدردی، مواسات اور دوستداری لازم کر دی۔ صاف کہہ دیا کہ وہ شخص فی الحقیقت مومن ہی نہیں ہے جس کے شر سے اس کے ہمسائے رنج و مصیبت کا ہدف ہوں۔ جس کی بداطواری اس کے پڑوسیوں کے لئے خطرہ اور جنجال بنی ہوئی ہو۔ اور اس شخص کو جانور، شقی اور بدنصیب قرار دیا گیا جو خود تو پیٹ بھر کر مرغن مال اُڑا جائے مگر اسکا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہو۔

ہر خاندان پورے معاشرے کی ترکیب و تعمیر میں ایک یونٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر محلہ پورے شہر کی عمارت کا ایک ستون ہے۔ ظاہر ہے کہ ستون اگر مضبوط ہوں تو ان پر چھائی جانے والی چھت بھی دیرپا ہو سکے گی۔ جن لوگوں کے کردار میں اسلام کی مطلوبہ خوبی پیدا ہو جائے کہ وہ پڑوسیوں کے لئے سرمایۂ رحمت و راحت بن جائیں ان سے یہ توقع کرنی یقیناً درست ہوگی کہ اپنے محلے سے باہر بھی وہ خوش کرداری ہی کا ثبوت پیش کریں گے۔

پڑوسی سے حسن سلوک کی تاکید میں جو بہت سی روایتیں عمدہ سندوں کے ساتھ مروی ہیں ان میں سے بعض کا بیان ہم آگے کریں گے۔ ان سے بلا ریب وابہام معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسی کا حق کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ وہ اتنا مؤکد اور قطعی ہے کہ قانوناً نہ سہی لیکن معنوی حیثیت سے اسکا لحاظ اتنا ہی ضروری ہے جتنا ورثہ کی تقسیم میں ترکے کے صحیح مستحقین کا لحاظ۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورۃ الصدر ارشاد صادر فرمایا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ نے مرنے والے کے مال و جائداد کا وارث معین فرمایا ہے انھیں سوائے ارتداد کے کوئی چیز محروم الارث نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ ایک بدکار و گناہگار بیٹے کو لازماً اتنا ہی حصہ ملے گا جتنا دوسرے نکوکار و متقی بیٹے کو۔ اسی پر ہمسائے کو قیاس کیجئے۔ ہمسایہ بدکار ہو یا نکوکار۔ شریر ہو یا صلح پسند۔ جو حقوقِ ہمسائگی اللہ اور اس کے رسول ؐ نے معین فرما دیئے انھیں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ اگر وہ کافر بھی ہے تو اس کا حق ہمسائگی ختم نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہیں ارتداد کی سزا قتل ہے، لیکن کافروں کا ناحق قتل جائز نہیں۔ مرتد چونکہ قبولِ اسلام کے بعد داخلِ کفر ہوا ہے اس لئے اسے محروم الارث ہو ہی جانا چاہئے، لیکن ہمسایہ اگر کافر ہے تو یہ کفر

اس کے حقِ ہمسائگی کا قاطع نہیں۔

امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ کسے نہیں سنا کہ آپ اُس یہودی ہمسائے کو قید و بند سے چھُڑا کر لائے تھے جس کا دائمی معمول یہ تھا کہ رات کو شور شرابا کر کے آپ کی عبادت میں خلل ڈالے اور ہر ممکن ایذا پہنچائے۔ امام اعظمؒ نے محسوس کیا کہ اس کی شورہ پشتی اپنی جگہ بجا، لیکن ہمسایہ تو وہ بہرحال ہے اور ہمسائے کے حقوق اللہ اور اس کے رسولؐ نے استثناء کے بغیر واضح فرمائے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمسائے کی کوئی بُری عادت و خصلت انھیں ساقط کر دے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمسایہ کتنا ہی بدنہاد اور ناشکرا ہو لیکن آپ اس سے مستقلاً حسنِ سلوک سے پیش آئیں گے تو ایک دن ضرور وہ اس کو محسوس کرے گا اور اس کی کمینہ طبیعت کچھ نہ کچھ اصلاح پذیر ہو گی۔ خدانخواستہ اگر کوئی ہمسایہ ایسا ہی پتھر مل جائے کہ آپ کے حسنِ سلوک کو پیہم نظر انداز کرتا جائے تب بھی اس میں ذرّہ برابر شک نہیں کہ اس کا حقِ ہمسائگی ادا کرنے میں آپ کو اور زیادہ ثواب ملیگا بشرطیکہ یہ کٹھن مرحلہ آپ اللہ کی خوشنودی کے لئے طے کر رہے ہوں۔ کوئی شے اللہ نے بے مصلحت پیدا نہیں کی۔ کمینے، دنی اور پرلے سرے کے ناشکرے لوگ بھی اللہ نے ہماری آزمائش ہی کے لئے پیدا فرمائے ہیں۔ گُڑ کے بدلے گُڑ دینا مشکل نہیں ہے، لیکن ایلوے کے بدلے نیشکر پیش کرنا یقیناً اربابِ عزم کا کام ہے۔ عزیمت اگر اللہ کے راستہ میں ہو تو کوئی اذیت بلا اجر نہیں رہتی

افسوس موجودہ تہذیب و تمدّن اس سے بالکل متضاد درس دیتے ہیں۔ ان کی بنیاد مفاد پرستی اور خود غرضی پر ہے۔ جب اپنا ہی مفاد و غرض سب کچھ ہو تو حسبتہً للہ کسی پر مال اور وقت صرف کرنا کوئی کیوں گوارا کرے گا۔ ہم نے بمبئی جیسی جگھوں میں خود ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ وہ ایک ہی فلیٹ کے دو متصل کمروں میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے آشنا تک نہیں ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک ہی کمرے میں رہنے والے دو مختلف کرائے دار ذہنی طور پر ایک دوسرے سے اتنی دور ہیں کہ شاید دو جانور بھی ایک کھونٹے سے بندھ کر باہم دگر اتنے دور نہ ہوتے ہوں۔ کیسا پڑوسی اور کس کے حقوق۔ ہر شخص غرض کا بندہ اور مفاد کا شیدائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کو جو معاشرہ مطلوب ہے، اسمیں "حقِ ہمسائگی" ایک عظیم حق ہے اور جو مومن اس حق کو ادا کرے گا اُس کے لئے آخرت میں بڑا اجر ہے۔

ذرا دیکھئے اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس کس انداز میں حقِ ہمسائگی کی اہمیت ظاہر فرماتے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرۃ رضؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

واللہ لا یومن واللہ لا یومن واللہ لا یومن	خدا کی قسم مومن نہیں ہے خدا کی قسم مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے

اللہ اکبر کیسی تاکید و توثیق۔ ایک طرف ہم۔ وہ بھی کس کی اللہ کے سچے رسولؐ کی۔ دوسری طرف تین بار دُہرانا اس سے بڑھ کر تنبیہ و تاکید کیا ہو گی۔

اصحاب نے پوچھا:-

"اے اللہ کے رسول! یہ آپ کس کے بارے میں فرما رہے ہیں؟" ارشاد ہوا:-

الذی لا یأمن جارہ بوائقہ۔	اس شخص کے بارے میں جس کا پڑوسی اسکے شر سے محفوظ نہ ہو

اور سُنیئے مسلم میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:-

لا یدخل الجنۃ من لا یأمن جارہ بوائقہ۔	وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

دیکھ لیجئے کیسے قطعی اور صریح و واضح الفاظ ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ سے پوچھا "تم زنا کو کیا سمجھتے ہو؟"

صحابہؓ نے جواب دیا:-

"اے اللہ کے رسولؐ! وہ ایک فعل حرام ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے۔"

سرکارؐ نے فرمایا:-

"سن لو۔ جو شخص کسی ایک پڑوسن سے زنا کرے اس کا جرم اُس شخص سے زیادہ شدید ہے جس نے دس غیر پڑوسی عورتوں سے زنا کیا۔"

اس کے بعد آپؐ نے دریافت فرمایا:-

"تم چوری کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

صحابہؓ نے جواب دیا:-

"یارسول اللہ۔ یہ بھی فعل حرام ہے جسے اللہ اور اسکے رسولؐ نے حرام ٹھیرایا ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:-

"تو سنو۔ جس شخص نے پڑوس کے کسی ایک گھر میں چوری کی وہ اُس شخص سے بڑا مجرم ہے جس نے پڑوس سے باہر دس گھروں میں چوری کی۔"

اس روایت سے جو کچھ ظاہر ہوا وہ کسی تفہیم و توضیح کا محتاج نہیں۔ کوئی شخص زنا کرتا ہے وہ مجرم ہے لیکن جو شخص کسی محرم عورت سے زنا کرتا ہے وہ بہت بڑا مجرم ہے اور جو بدنصیب عیاذاً باللہ اپنی بہن یا ماں سے زنا کا مرتکب ہو اس کے ملعون مردود ہونے کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ گویا ایک ہی فعل مختلف حالتوں میں مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ بس یہی نکتہ پڑوسی اور غیر پڑوسی کے معاملات میں ملحوظ رہنا چاہیئے۔ وارثوں کو مرحوم کی جائداد میں حصہ ملکر رہے گا یہ ایک قانون ہے۔ جس میں میری آپ کی پسند اور مرضی کو کوئی دخل نہیں اسیطرح پڑوسی کا استحقاق ایک قانون ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس قانون کے سلسلہ میں دار و گیر اور احتساب کو اللہ نے دنیا کی بجائے آخرت پر اُٹھا رکھا ہے۔ قاضی آپ کو مار مار کر پڑوسی سے حسن سلوک پر مجبور نہیں کرے گا لیکن اللہ کے حضور ہر اُس رویے اور روش کی جواب دہی کرنی ہوگی جسے آپ نے پڑوسی کے بارے میں اختیار کیا ہے۔

بادی النظر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ جو جرائم زیادہ سخت ہیں ان پر اللہ نے دنیا ہی میں سخت سزائیں رکھدی ہیں اور جن پر سزائیں نہیں رکھیں وہ ایسے شدید نہیں ہیں ـــــ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ جن جرائم پر اللہ نے دنیاوی حدود و تعزیر معین نہیں فرمائی ان میں سے بعض ایسے سخت اور گھناؤنے ہیں کہ بعض حالتوں میں زنا اور سرقہ و قمار سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پڑوسی کے یہاں آج چولھا نہیں جلا ہے، اس کے اہل و عیال فاقے سے ہیں اور اسی حالت میں انھیں رات کاٹنی ہوگی۔ خود آپ میں بفضلہ تعالیٰ اتنی استطاعت ہے کہ اس کے یہاں ایک وقت کی روٹی پہنچا سکیں لیکن نہیں پہنچاتے اور خود پیٹ بھر کر آرام سے سو جاتے ہیں تو یقین کیجئے کہ یہ بے کرداری انتہا درجے سخت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو معاف کردے جو جوانی کے جوش میں طوائف کے کوٹھے پر مُنھ کالا کر آیا ہے، لیکن یہ توقع بہت کم ہے کہ پڑوسی کی فاقہ کشی کی پروا نہ کرنے والا شقی بھی معاف کیا جا سکے گا۔ حالانکہ شرعاً ایسے شخص کے لئے کوئی دنیاوی سزا معین نہیں نہ قاضی اس شخص پر دار و گیر کر سکتا ہے۔ مگر اللہ ایسے شخص کو بہت سختی سے پکڑے گا۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔

شمس نوید عثمانی

ماہِ صیام پر نگاہِ واپسیں

رمضان المبارک بھی یوں تو دیکھنے میں سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ کا نام ہے۔ لیکن درحقیقت اگر ایمان ویقین کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ مہینہ صرف تیس یا انتیس شب و روز کے مجموعہ کا نام نہیں، اس کے سوا اور بھی کچھ ہے۔ اگر سچائی اور ہدایت کو انسانیت کا ماحصل اور اس فانی زندگی کا حقیقی سرمایہ تسلیم کرلیا جائے تو یہ مہینہ اسی دولت کا لامحدود خزانہ ہے۔ ذرا سی دیر کے لئے ایک ایسی دنیا کا تصور فرمائیے جس میں سب کچھ ہو مگر "قرآن" نہ ہو! ——— قرآن ——— جو حقیقت کا واحد مینارۂ نور ہے ——— قرآن جو ظن وتخمین اور اندیشہ وگمان کی آوارہ خیالیوں کی تاریک بھول بھلیاں سے نکلنے کا واحد اور قطعاً واحد راستہ ہے ——— قرآن جو حیات وکائنات کے بنانے والے، پالنے والے خدا کا وہ آخری پیغام ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی کھوئی ہوئی جنت کی طرف سفر کرسکتا ہے۔ اپنی زندگی کا مقصد، راہِ عمل اور منزلِ مقصود کا تعین مکمل اذعان ویقین کے ساتھ کرسکتا ہے ——— اگر قرآن موجود نہ ہوتا تو بڑی سے بڑی عبادتیں اور سخت سے سخت ریاضتیں انسان کو آنکھوں اور کانوں اور قلوب کے باوجود اندھا بہرہ اور بےحس ہونے سے نہ بچا سکتیں۔ زندگی صبح وشام اور صبح و شام کے گھسے پٹے معمولات سے ابھرتی اور وہیں کی وہیں دفن ہوکر رہ جاتی۔ سائنس اور فلسفے کے دھارے انسانیت کی کشتی کو اپنے تیز رو دھاروں میں ڈبو کر رکھ دیتے اور اس موت کی دنیا سے باہر ایک نہ ختم ہونے والی زندگی کے "عالمِ بالا" کا کوئی یقینی تصور ہمارے پاس ہرگز نہ ہوتا۔

اگر قرآن انسانیت کا واحد سرمایۂ حقیقت ہے تو رمضان المبارک اس سرمایہ کا مخزن ہے۔ اسی مبارک مہینے کے افق سے صدیوں کی سیاہ رات کا پردہ چاک ہوا تھا اور ریگستانِ عرب کے اُمّی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں پر اللہ کی آواز ابھرتی ہوئی سنائی دی تھی۔ اسی مہینے کی وسعتوں میں عرشِ اعظم سے حقائق کا نور اینٹ پتھر کی دنیا پر نازل ہوا تھا، اور خدا کا مقرب ترین فرشتہؑ اسی مہینے کے صبح وشام میں آسمانوں سے زمین پر اتر کر ایک انسانِ صادقؐ سے ہمکلام ہوا تھا۔ یہ عظیم ترین تاریخی واقعہ ہر سال رمضان المبارک کے پردۂ نور پر منعکس ہوتا ہے اور ہر سال جنت سے نکالے ہوئے انسانوں کو خدا کی جنت ابدی کی طرف اشارہ کرکے حقیقی زندگی کا شعور، لگن، حوصلہ اور ولولہ عطا کرتا ہے۔ لیکن کتنے "مسلمان" ہیں جو اس ماہِ صیام کی عظمت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں؟۔ کتنے دل ہیں جو ہلالِ رمضان کو دیکھ کر جذبات شوق سے دھڑک اٹھتے ہیں؟۔ کتنی آنکھیں ہیں جو اس مہینے میں ندامت وانفعال کے گرم گرم آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں؟ کتنی زبانیں ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اپنے خدا کو پکارتی ہیں؟۔ کتنے دماغ ہیں جو اس ماہِ مبارک کے سائے میں بیٹھکر انسانی زندگی کے اس "آخری انجام" کے متعلق سوچتے ہیں جو بنتا ہے تو زندگی طربیہ کہانی بن جاتی ہے اور بگڑ جاتا ہے تو زندگی کی ساری تابانیاں ایک المناک ظلمت کے سانچے میں ڈھل کر رہ جاتی ہیں؟

روزے کوئی گھسا پٹا معمول نہیں۔ تقدیر کو بنانے کا ایک سنہرا موقعہ ہیں جو سال کے ۳۶۵ دنوں میں چند دن کے لئے انسان کے ہاتھ آتا ہے، اور پھر ایک سال یا ہمیشہ کیلئے

ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی نہیں جانتا اگلے رمضان المبارک کو پانے کے لئے وہ زمین پر ہوگا یا زمین کی گہرائیوں میں منوں مٹی کے نیچے اس کی ہڈیاں بھی سُرمہ بن چکی ہوں گی۔ اس ماہِ مبارک کا لازوال تحفہ " قرآن " اس لئے نہیں کہ اس کے الفاظ کو کسی منتر کی طرح الاپ لیا جائے ــــــــ اس کا ہر لفظ ہمیں حقیقت کا ایک شعور اور ہدایت کا ایک ٹھوس پیغام دیتا ہے۔ جس کو پڑھنا اور پڑھ کر سمجھنا اور سمجھ کر کردار و عمل میں جذب کرنا ہماری نجات و فلاح کے لئے لازم و ناگزیر ہے۔ اب جب کہ " ماہ صیام " کا یہ سنہری موقعہ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے ــــــــ ہمیں اپنی پیش کش اپنا عظیم تحفہ، لازوال یادگار دیکر جا رہا ہے اور وہ ہے کتاب اللہ۔ اس لئے اگر ہم نے بدقسمتی سے اس ماہ مقدس کی برکات سے اپنا حصہ حاصل نہیں کیا تو " قرآن " کے صفحات میں اپنی محرومی کا نعم البدل تلاش کر سکتے ہیں۔ ایک بار اللہ کے بندے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

" لوگو! ــــــــ جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے آدمی کے دل کو بھی زنگ لگ جاتا ہے " ــــــــ صحابہؓ نے یہ بات سنی تو فکر و تشویش کے گہرے جذبات نے ان کے دل و دماغ کو متزلزل کر دیا۔ انھوں نے انتہائی درد و اضطراب کے ساتھ اس روحانی زنگ خوردگی کا علاج دریافت کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہلک ترین مرض کے لئے دو دوائیں تجویز فرمائی تھیں ــــــــ " موت کی بکثرت یاد اور اللہ کی کتاب کی زیادہ سے زیادہ تلاوت "۔

قرآن کریم کے الفاظ قلب انسانی کے زنگ کو کس حد تک کھرچ سکتے اور دل کی مردہ دھڑکنوں میں زندگی کی سنسنی کس حد تک پیدا کر سکتے ہیں اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے۔ عرب کے سنگدل ترین کافرجن کے دلوں پر کفر و شرک کے زنگ کی انتہائی جامد تہیں چڑھی ہوئی تھیں، اور جو کبھی اس مہلک مرض سے شفا نہ پا سکے اور کفر کی موت مرے ان پر بھی قرآن اثر کرتا تھا۔ یہ اثر کوئی معمولی اثر نہ تھا تأثر کا ایک طوفانی اثر تھا جو ان کے پورے وجود کو مرتعش کر کے رکھ دیتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیقت کی کپکپی محسوس کرنے کے بعد بھی ہدایت صرف ان کو ملی جن کی طرف رحمتِ خداوندی کی نگاہ اٹھ گئی ــــــــ اس لئے کہ " ہدایت " وہ آخری نعمت ہے جو خدا ہی اپنے ہاتھ سے انسان کو عطا کرتا ہے۔ کفر کی حالت میں جب قرآن نے انسان پر یہ اثر کیا تھا تو اسلام کی حالت میں اس کا اثر کتنا گہرا اور ہمہ گیر ہونا چاہئے اس کا پورا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ہاں طلب اور جستجو کی ٹیس لئے ہوئے قرآن کی طرف بڑھ کر دیکھئے تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو جائے گی۔

قرآن نے انسانی قلوب پر ان کے کفر و شرک کی بدترین کیفیت میں کیسا کیسا اثر کیا ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ کرنے کے لئے چند واقعات کی تاریخی جھلک دیکھئے:۔

دارالندوہ کی تاریخی عمارت میں کفر و باطل کی قوتوں کا ایک تاریخی اجتماع ہو رہا تھا۔ زیر غور یہ تجویز تھی کہ قرآن اور حاملِ قرآن محمد عربیؐ فداہ روحی کا مقابلہ کرنے کے لئے شعر و ادب اور فصاحت و بلاغت کی طاقت استعمال کر کے دیکھی جائے۔ نگاہِ انتخاب عتبہ بن ربیعہ پر پڑی جو کفر کی صفوں میں شعر و سخن کی ممتاز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ یہ شخص جارحانہ ذہنیت اور غنیمانہ مقابلہ کے جذبات لئے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ لفاظی اور سطحی استدلال کے اوچھے ہتھیاروں سے زبانِ وحی ترجمان پر بازی لیجائے۔ جب کافر سب کچھ کہہ چکا اور سب ہتھیار استعمال کر چکا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جواب تک خاموشی سے سنتے رہے تھے خدا کی کتاب کی چند مخصوص آیات انتہائی دردناک آواز میں تلاوت فرمانے لگے۔ خدا کا رسولؐ خدا کے الفاظ میں شیطانی ہیرو کو جواب دے رہا تھا۔ اللہ کی کتاب کے الفاظ اور رسول خدا کی دل گداز آواز نے مل کر سنگدل کافر کے زنگ خوردہ دل پر یہ اثر کیا کہ وہ بُت کی طرح ساکت و صامت کھڑا کا کھڑا رہ گیا! ہوش و بیداری کی حالت میں ہوش و حواس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی اور قرآن کے الفاظ کا زیر و بم اس پتھر کی رگ و پے میں رقت اور سنسنی کی لہر دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔

جب آنحضرتؐ اس مقام پر پہنچے جہاں قرآن سے یہ جلال آمیز للکار بلند ہو رہی تھی کہ ـــــ "پس اگر یہ لوگ اعراض روگردانی کریں تو کہدے کہ میں تمہیں ایک ایسی گرج سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود کے سروں پر گرج چکی ہے" ـــــ تو عتبہ کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا، وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور شدید بدحواسی کے عالم میں آنحضرت کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکار اٹھا ـــــ "بس! بس کر اے محمدؐ! (صلعم) میرے حال پر رحم کر! ـــــ اتنا نہ ستا!!"۔

عتبہ کی اس وارفتگی وسراسیمگی کی خبر مکہ کی گلی کوچوں میں پھیل گئی ـــــ ابوجہل بوکھلایا ہوا عتبہ کے پاس پہونچا اور کہا "کیا تو بھی مسحور ہو گیا ہے؟ کیا تو بھی دین آبائی سے پھر گیا؟"

عتبہ جس کے کانوں کے پردے اب تک اسی گرج کی دعید سے جھنجھنا رہے تھے۔ خوف زدہ آواز میں بولا "میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ ـــــ اے ابوجہل! محمدؐ کی آواز میں ایک خوفناک خبر کی دھمک سُنی ہے میں نے ـــــ اور مجھے کچھ یاد نہیں۔ وہ ہمیں عاد وثمود کی کڑک کا خوف دلاتا ہے۔ میں ہرگز دین آبائی سے نہیں پھرا مگر میں کیا کروں کہ محمدؐ (صلعم) کی آواز نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا ہے" ـــــ

ایک بار مغیرہ کا بیٹا ولید ـــــ سرغنۂ کفر قرآن کی زد میں آیا ـــــ رسولِ خدا کتاب اللہ کی تلاوت کرتے جاتے تھے اور ولید پر سر سے پاؤں تک ایک شدید کپکپی دوڑ رہی تھی۔ ضبط کی ناکام کوشش کے بند ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور کفر وطغیان کا ہٹ دھرم شیطان قرآن کے آگے رو پڑا۔

ولید جو جزبہ شاعری اور قصیدہ گوئی میں ماہر تھا قرآن سے ٹکرانے کا حوصلہ لے کر آیا تھا۔ مگر اس کا پتھریلا احساس بھی قرآن کی لطیف چوٹ کی تاب نہ لاسکا۔

خدا، محمد عربیؐ اور قرآن کا جانی دشمن قرآن کے آستانے پر شکست وہزیمت کے بیشمار آنسو ٹپکا رہا تھا۔ یہ حقیقت کی آواز تھی جو پتھر کو پگھلائے دیرہی تھی۔ یہ قرآن تھا جو کافر کو رلائے دیرہا تھا

ابوجہل نے جب ولید سے اس ردعمل کی توجیہ معلوم کی تو اس نے جواب دیا کہ "میں بد دین نہیں ہوا مگر یہ محمدؐ کے ہونٹوں سے جو آواز سنائی دے رہی ہے میں اس کی تاب نہیں لاسکا! ـــــ اس آواز میں سوز ہے ـــــ میٹھا میٹھا درد ہے"۔

وحشیؓ جنھوں نے حالتِ کفر میں حضرت امیر حمزہؓ کا کچا کلیجہ چبایا تھا ان کے آقا جبیر مطعم ابھی کفر کی حالت میں تھے کہ اسیرانِ بدر کا فدیہ ادا کرنے کے لئے اللہ کے رسولؐ کے پاس آئے یہ وہ وقت تھا جب ایک انتہائی خون آشام کفران کے دل میں اسلام کے خلاف نفرت کی بھٹیاں دہکا رہا تھا۔ لیکن نفرت و انتقام کی آگ میں جلتا ہوا "دشمن" جب رسول کریمؐ کے پاس پہنچا تو یہ دیکھا کہ آپؐ خدائے ذوالجلال کے آگے ہاتھ باندھے ہوئے قرآن پاک کی تلاوت میں محو ہیں۔ خشوع وخضوع سے کانپتی ہوئی پرسوز آواز خدا کا آخری پیغام نشر کر رہی تھی ـــــ جبیرؓ کہتے ہیں کہ میں اس آواز کو سن کر کفر کی حالت میں سراپا درد واضطراب بنا ہوا کھڑا تھا ـــــ آپ قرآن پڑھ رہے تھے اور میں دل تھامے ہوئے یہ محسوس کر رہا تھا کہ درد کی شدت سے میرا دل اب پھٹا ـــــ بس اب پھٹا! ـــــ

تاریخ اسلام کے یہ چند واقعات اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے کافی ہیں کہ قرآن میں ایک بے پناہ تاثیر ہے ـــــ ایک زبردست اثر ہے ـــــ ایک عظیم قوت ہے جو سینوں کی گہرائیوں میں، گوشت کے دلوں میں درد وگداز کی بجلیاں کوٹ دیتی ہے ـــــ لیکن کیا ہوا کہ آج ہمارے دل اسلام وایمان کی حالت میں بھی قرآن کو سن کر گریۂ دردناک کی توفیق نہیں پاتے! ـــــ ہم قرآن کو سینے سے لگائے ہوئے بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کو نہیں چھو رہا ہے ـــ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ قرآن میں تو بے شک وشبہ اثر موجود ہے اس لئے کہ یہ وہی قرآن ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے سرغنۂ کفار تک کے دلوں کو ہلا دیتا تھا ـــــ قرآن میں بے شک بے پناہ اثر ہے، مگر ہمارے احساسات اور قرآن کے

درمیان ایک نامعلوم دبیز پردہ ـــــــ ایک "حجاب مستور" حائل ہو چکا ہے۔ اس خوفناک ظلمت کے نظر نہ آنے والے پردے کو چاک کئے بغیر ہم نہ رمضان سے مستفید ہو سکتے ہیں نہ قرآن سے فیض یاب۔ اس پردے کو چاک کرنے کے لئے ہمیں "زیغ قلب" کے مرض کو دور کرنے کے لئے رسولِ خدا کی تجویز کردہ پہلی دوا استعمال کرنی ہوگی جو اپنی موت کی بکثرت یاد ہے۔ فریب زندگی کو توڑنے کے لئے اس دن کو بار بار یاد کیجئے جب ہم موت کے بستر پر پڑے ہوئے نہ جانے کس قدر تکلیف کے ساتھ دم توڑ رہے ہوں گے ـــــــ جب دنیا ہمیں اٹھاکر زمین کی تہ میں پھینک رہی ہوگی اور ہماری آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہوگی ـــــــ انسان خدا کا انکار کر سکتا ہے مگر موت کا انکار نہیں کر سکتا ـــــــ موت پر ہر شخص ایمان رکھتا ہے ـــــــ اسی ایمان سے چلئے اور آپ خود بخود قرآن پر ایمان کی منزل کو چھولیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

اے خدا ہم پر قرآن کے صدقے میں رحم فرما! ـــــــ اور اس کو ہمارے لئے مشعلِ راہ اور حجت بنادے! آمین۔

تجلّی کی ڈاک

مکائد شیطانی

سوال :- از انور اقبال۔

حال ہی میں ایک ماہنامے کا مضمون "وسیلۂ اولیاء" نظروں سے گذرا اس میں بزرگانِ دین کے اقوال کے زیر عنوان چند ایسی باتیں بحوالۂ کتب ان جلیل القدر علمائے متقدمین کی طرف منسوب ہیں جن کے بارے میں ہم پڑھتے اور سُنتے آئے ہیں اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ تمام حضرات توحیدِ خالص کے علمبردار اور شرک اور بدعت سے سخت بیزار اور اس کے مخالف تھے۔ متذکرۂ مضمون کے چند حیرت انگیز اور تعجب خیز انکشافات درج ذیل ہیں:-

(۱) حضور غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی رح اپنے قصیدۂ غوثیہ میں اپنے خداداد اختیارات بیان فرماکر ارشاد فرماتے ہیں :-

وَكُلُّ وَلِيٍّ لَهُ قَدَمٌ وَإِنِّيْ
عَلٰى قَدَمِ النَّبِيِّ بَدْرُ الْكَمَالِ

(۲) اماموں کے امام یعنی امام اعظم ابوحنیفہ رح قصیدۂ نعمان میں فرماتے ہیں — "یارسول اللہؐ میں آپ کی عطا کا امیدوار ہوں اور مخلوق میں ابوحنیفہ رح کا تمہارے سوا کوئی نہیں۔" (۳) مولانا جلال الدین رومی رح مثنوی میں فرماتے ہیں — "بہت سے قبروں میں سونے والے بندے ہزاروں زندوں سے زیادہ نفع پہنچاتے ہیں۔ اُن کی قبر کی خاک بھی لوگوں پر سایہ فگن ہے۔ لاکھوں زندے ان قبر والوں کے سایہ میں ہیں۔" (۴) حنفیوں کے معتبر عالم ملا علی قاری رح اپنی کتاب نزہۃ الخاطر الفاطر فی ترجمہ شیخ عبدالقادر صفحہ ۶۲ میں فرماتے ہیں کہ حضور غوث پاک رح نے فرمایا — "یعنی جو کوئی مصیبت میں مجھ سے مدد مانگے تو وہ مصیبت دُور ہوگی اور جو کسی تکلیف میں میرا نام لے کر پکارے تو تکلیف دفع ہوگی۔" اس کے بعد مولانا قاری نماز غوثیہ کی ترکیب بتاکر فرماتے ہیں۔ — "اس کا بار بار تجربہ کیا گیا صحیح ثابت ہوا۔" فرمائیے ملا علی قاری بھی حضور غوث پاک رح کا وسیلہ پکڑ کر فرماتے ہیں کہ درست ہے۔ یہ ملا علی قاری وہ بزرگ ہیں جن کو دیوبندی وہابی بڑے زور شور سے مانتے ہیں۔ چند اقوال کے زیر عنوان درج ہے (۵) مولوی اشرف علی صاحب رح اپنی کتاب نسیم الطیب ترجمہ شیم الحبیب میں حسب ذیل اشعار تحریر کرتے ہیں :-

دستگیری کیجئے میری نبی
کشمکش میں ہوں تم ہی میرے ولی

جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ
فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی

ابنِ عبداللہ زمانہ ہے خلاف
اے مرے مولا خبر لیجے مری

(۶) شاہ ولی اللہ صاحب رح کشف قبور کے عمل میں تحریر فرماتے ہیں — "اس کے بعد قبر کے سات چکر طواف کرے اور اس طواف میں تکبیر کہے دائیں طرف سے شروع کرے بعد میں قبر کے بائیں اپنا رخسار رکھے۔" اس عبارت کو مولوی اشرف علی صاحب رح تھانوی نے اپنی کتاب حفظ الایمان میں نقل فرماکر اس عمل کو جائز ثابت کرنے کی

کوشش کی (۷)" یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ اس کی اردو شرح میں مولوی خرم علی بلہوری لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ پہلی آیت وابتغوا الیہ الوسیلۃ میں وسیلہ سے مراد مرشد کی بیعت ہے۔"

براہِ مہربانی جواب دیجئے کہ مذکورہ بالا سطور میں جو باتیں جلیل القدر علمائے سلف کی طرف بحوالہ کتب منسوب ہیں کیا واقعتاً ایسی باتیں ان علماء کی کتابوں میں موجود ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا فی الواقع یہ تمام باتیں کتاب وسنت کی رو سے درست بھی ہیں؟ امید کہ آپ ضرور جواب دینگے۔

الجواب:۔

آپ ہی کی طرح ہمارے پاس اور بھی حضرات وقتاً فوقتاً ایسے اقتباسات اور پوسٹر اور پمفلٹ وغیرہ بھیجتے رہتے ہیں جن میں اسی نوع کی لغو ولاطائل باتیں درج ہوتی ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم انکے تفصیلی جواب دیں۔ لیکن ہمارے لئے نہ تو عملاً ہر ایسی چیز سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہے نہ اس کا کوئی نتیجہ ہی ہے کہ ہر کہ ومہ کی عامیانہ گل افشانیوں پر وقت برباد کیا جائے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اصل الاصول — قرآن و سنت — کی تعلیمات کو ان کی صحیح اسپرٹ میں پیش کرتے رہیں اور صرف ایسے لوگوں کے فرمودات پر توجہ دیں جنھیں متین لہجے اور سنجیدہ زبان میں علمی گفتگو کا سلیقہ بھی ہو۔ تجلی کا مستقل مطالعہ کرنے والے گواہ ہیں کہ غلط عقائد و نظریات کے رد میں ہم نے مفصل و مدلل تنقیدیں کی ہیں۔ دلیل کو دلیل سے کاٹا ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو ان کے اصلی رنگ اور مزاج و مذاق کے مطابق پیش کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ یا کوئی اور صاحب اس طرح کے بے بنیاد، بے حیثیت اور تیسرے درجے کے مضامین سے جن کا ایک نمونہ آپ نے سوال میں پیش کیا ہے متأثر ہو کر یہ چاہیں کہ ہم براہِ راست ان پر نقد و تبصرہ کرتے رہیں تو یہ ہمارے لئے عملاً محال ہوگا اور اسے ہمارے اکثر وبیشتر قارئین کا متین علمی مزاج بھی گوارا نہ کر سکے گا۔

اہلِ بدعت کا یہ عام طریق ہے کہ وہ قرآن کی کسی آیت یا احادیث میں سے کسی حدیث کو پورے قرآن اور تمام مجموعۂ حدیث کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ قرآن و حدیث کی بنیادی تعلیمات سے کٹ کر اور سیاق وسباق کو نظر انداز کر کے اس کا ایک ایسا مفہوم تراشتے ہیں جو ان کے واہی عقائد و افکار کی ترجمانی کرتا ہے حالانکہ اس کا ادنیٰ تعلق بھی اللہ اور رسولؐ کے فرمودات سے نہیں ہوتا بلکہ اکثر وبیشتر وہ اللہ اور رسولؐ کے صریح ارشادات کے خلاف خالص ابلیسی طرزِ فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کی کج فہمی دیکھئے کہ وہ آیات واحادیث تو انھیں نظر نہیں آئیں گی جن میں صریح ومحکم انداز میں صرف اور صرف اللہ کے عالم الغیب ہونے کی تشریح وتعبیر ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا مؤکد اثبات ہے۔ لیکن ایسی آیتیں اور حدیثیں ان کے وردِ زبان ہوں گی جن سے کھینچ تان کر یہ ثابت کیا جاسکے کہ رسول اللہؐ بھی عالم الغیب تھے۔ انھیں بشر کہنا غلط ہے۔ وغیر ذلک۔ قرآن کتنا ہی ہانکے پکارے کہے کہ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (اے پیغمبر تمھیں بھی مرنا ہے اور انھیں بھی مرنا ہے) اللہ تعالیٰ کتنے ہی صریح لفظوں میں فرمائیں کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (جو کچھ بھی زمین پر ہے فانی ہے) الفاظ وحی کتنے ہی صریح وصاف ہوں کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ (ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے) لیکن ان لوگوں کی ذہنی گمراہیوں کا یہ عالم ہے کہ جو مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کر بیٹھے اور سیدھے سچے مسلمان کی طرح یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ہر انسان کی طرح آخری پیغمبرؐ نے بھی ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھا تھا۔ بس اسے یہ لوگ وہابی اور گمراہ اور نہ جانے کیا کیا کہتے چلے جائیں گے۔ جب ایسی صریح ومحکم آیات کے باب میں ان کا یہ وطیرہ ہے تو دیگر آیات، احادیث اور لطیف حقائق کے بارے میں یہ جتنی بھی تحریف و تلبیس سے کام لیں کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

یہ شرارت بہت عام ہوگئی ہے کہ اہلِ بدعت سلف و خلف سے من گھڑت عقیدے منسوب کر کے متعدد کتابوں کے

کے نام لکھ دیتے ہیں۔ اس میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ یہ حوالے یکسر غلط ہوتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ حوالے تو درست ہوتے ہیں مگر اصل عبارت کا منشا کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر یہ اس کا ترجمہ اپنے منشاء کے مطابق کرتے ہیں اور اسی ترجمے کو اصل کا نام دے کر خوب اچھالتے ہیں۔ حد ہے کہ یہ متعدد علمائے دیوبند کے بعض ایسے عقائد نقل کرتے ہیں جن کا تصور بھی ان کے حیطۂ خیال میں نہیں آیا اور ٹھاٹ سے ان کی کسی کتاب کا بھی حوالہ دے ڈالتے ہیں۔

اب ان تمام صورتوں میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جن باعلم اور فہیم حضرات کو ان کی کمینگی اور شرارت کا پتا چل گیا انھوں نے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر ٹھنڈی آہ بھر لی۔ لیکن عوام کی غالب اکثریت کم علم ہے۔ کم علمی کے علاوہ ایسے ماحول میں زندگی گذار رہی ہے جو شیطان کی کھیتی کے لئے نہایت سازگار آب وہوا رکھتا ہے۔ جو شوشہ شیطان کی ذریت نے چھوڑا وہ تو خوب پھلا پھولا اور جو آواز شیطان کے کسی دشمن نے اٹھائی وہ اسی طرح دب کر رہ گئی جس طرح ڈھول اور تاشوں کے غل غپاڑے میں آذان کی آواز۔ بچارے عوام کیا جانیں حوالے جھوٹے ہیں یا سچے۔ انھیں کیا معلوم کس عبارت کا کیا مفہوم لیا گیا ہے اور کس جملے کو کہاں سے اکھاڑ کر کہاں رکھا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد سنئے کہ اوّل تو یہی بات بنیاداً غلط ہے کہ کسی انسان کو ان معانی میں غوث کہا اور سمجھا جائے جن معانی میں یہ لفظ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے لئے رائج ہو گیا ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ چونکہ "غوث" اللہ کے اسمائے حسنہ میں شامل نہیں اس لئے غیر اللہ کو بھی یہ نام دیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے ٹھیٹ قانونی اعتبار سے اس خطاب کا جواز نکل آئے لیکن فی زمانہ جو تصورات اس لفظ سے وابستہ کر لئے گئے ہیں ان کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ خالی غوث سے بڑھ کر غوث الثقلین کہنا اور بھی بڑی جسارت ہے۔ اتنا مبالغہ آمیز خطاب تو ہم نے اپنے اسلاف کے یہاں ختمی مرتبت، خلاصۂ کائنات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی نہیں دیکھا۔

اللہ کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو ہمارے پیارے پیغمبر کا ہے۔ ان کا علم ان کی قوت، ان کے اختیارات سارے جہان سے بڑھ کر لیکن غوث الثقلین وہ بھی نہیں۔ وہ بھی اللہ کے ایک ایسے ہی بندے ہیں جو کسی کی حاجت روائی اور دستگیری میں صرف ایک واسطہ بن سکتے ہیں۔ بالذات دستگیر و حاجت روا نہیں بن سکتے۔ کون ہے جو اللہ کی حکمرانی میں شریک ہو سکے۔ کس کی مجال ہے جو اللہ کے اذن و رضا کے بغیر کسی کو کچھ دے سکے یا کسی سے کچھ چھین سکے۔ خدا ہی جانے لوگ اللہ کے ایک نیک بندے عبدالقادر جیلانیؒ کو کس دلیل سے انس و جن کا غوث قرار دیتے ہیں۔ خود حضرت موصوف کی "غنیۃ الطالبین" کا تو حرف حرف ایسے غلو آمیز عقائد کی تردید کرتا ہے۔ قصیدہ غوثیہ خود حضرت موصوف کا ہے بھی یا نہیں، یہی بات قطعی نہیں۔ لوگ حضرت علیؓ کا دیوان اور خطبات گھڑ سکتے ہیں تو شاہ جیلانیؒ کا قصیدہ کیوں نہیں گھڑ سکتے۔ پورا نہ گھڑیں تو حذف و اضافے میں تو کوئی دشواری ہی نہیں۔ پچھلا زمانہ پریس کا تو تھا نہیں کہ حضرت جیلانیؒ نے اپنا قصیدہ چھاپ دیا ہو اور کسی کو حذف و اضافے کا موقع نہ ملے۔ ابن مریم کو ابن اللہ بنانے والی ذہنیت نے اور بھی طرح طرح کے کرتب دکھائے ہیں قصیدہ غوثیہ ہی کی تصنیف یا تحریف کونسی مشکل تھی۔

پھر نقل فرمودہ شعر ان کا ہو بھی تو آخر اس سے ایسا کوئی اختیار کہاں نکلتا ہے جس سے حضرت موصوف کا غوث الثقلین ہونا ثابت ہو۔ جتنی عربی ہم نے پڑھی ہے اس کی روشنی میں تو یہ شعر موصوف کے لئے کسی بھی مافوق البشر قدرت و اختیار کا مظہر نہیں ہے۔ رہا قصیدۃ النعمان کا معاملہ۔ تو اوّل تو یہی سب کو معلوم ہے کہ عقائد کا پتا چلانے کے لئے شعروں کو دلیل نہیں بنایا جاتا۔ بڑے سے بڑے اور بزرگ سے بزرگ شاعر کے یہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ محبوب کو اور بعض اور لوگوں کو حاضر کے صیغے سے خطاب کرتا ہے، حالانکہ مخاطب سامنے موجود نہیں ہوتا۔ اب اس سے آپ اس شاعر کا یہ عقیدہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ مخاطبین کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب سمجھتا ہے تو یہ مسخرے پن کے سوا کیا ہوگا۔

دوسرے شعر کی زبان عموماً مبالغے اور اشارات، استعارات
پر مبنی ہوتی ہے۔ شاعر محبوب کو رشکِ قمر کہتا ہے تو سچ مچ یہ
مطلب نہیں ہوتا کہ وہ محبوب کے لب و عارض میں چاند سے
زیادہ روشنی دیکھ رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے آنے سے
میرے اندر جان آگئی اور وہ چلا گیا تو جان نکل گئی۔ کیا آپ ایسے
حقیقت پر مبنی قرار دے سکیں گے؟

تیسرے قصیدۃ النعمان کا پیش کردہ شعر کسی ایسے شخص
کا فقرہ نہیں ہے جسے ہم اور آپ نہ جانتے ہوں۔ امام صاحب
کو دنیا جانتی ہے۔ ان کے عقائد و افکار سب پر واشگاف
ہیں۔ ان کے کسی فقرے سے ایسا ہی مفہوم نکالنا درست
ہو سکتا ہے جو ان کے معلوم و معروف عقائد و تصورات سے
ہم آہنگ ہو۔ مسلمات میں سے ہے کہ وہ ان تمام واہی عقائد
سے بلند تھے جو آج کل کے نام نہاد سُنّی حنفی دوستوں نے گھڑ رکھے
ہیں۔ وہ نہ قبروں کا طواف کرتے تھے نہ ان پر دھونی رما کر
بیٹھتے تھے۔ نہ کبھی انھیں کسی نے یا رسول اللہ کا نعرہ
لگاتے سنا نہ انھوں نے کسی کو یہ تعلیم دی کہ ضرورت کے وقت
اللہ کی بجائے رسول اللہ ﷺ سے مدد چاہو۔ ان کی فقہ اکبر
آج بھی موجود ہے اور وہی ملا علی قاریؒ جن کے حوالے سے
آپ کے اقتباس میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف ایک
من گھڑت قول منسوب کیا گیا ہے فقہ اکبر کی شرح میں ان
باطل عقائد کی کھلی تردید کرتے ہیں جو اہل بدعت کے دماغوں
میں بھرے ہوئے ہیں۔ اگر امام ابو حنیفہؒ نے کسی شعر میں وہ
بات کہی بھی ہے جو نقل کی گئی تو اس سے شریعتِ قبوری کے
نکات نکالنا اور شرک و زندقہ کو تقویت دینا بس ایسے ہی
بوالفضولوں کا کام ہو سکتا ہے جو اللہ کے نہیں اپنے دل و
دماغ کے پجاری ہیں اور جن کا مطمح نظر حق پرستی نہیں بلکہ اپنے
تخیلات کی پیچ اور اپنے مزعومات کی پیروی ہے۔ مولانا
اشرف علیؒ نے اگر کبھی کچھ اشعار ایسے کہہ دیئے تھے جن سے
استدلال کرنا اہلِ بدعت کے لئے ممکن ہو تو ایسا استدلال
بھی طفلانہ حرکت کے سوا کچھ نہ کہلائے گا۔ اوّل تو جیسا کہ
ہم نے ابھی کہا شعروں سے عقائد اخذ نہیں کئے جاتے۔ اگر
اشعار عقائد کے درجے میں شمار ہو سکتے ہوں تو کوئی بھی شاعر
کفر و زندقہ کے فتوے اور دیوانگی کے الزام سے نہ بچ سکے گا۔
ہر شاعر کو آپ نہایا پاگل کہہ سکتے ہیں اگر اس کے اشعار کو عقیدے
اور منطق کی ترازو میں تولا جائے۔

دوسرے ہر انسان مختلف ادوار سے گذرتا ہے۔ اگر
ایک دور میں مولانا اشرف علیؒ نے چند ایسے شعر کہہ بھی دیئے
جو عقائد کی کسوٹی پر کسنے سے کھوٹے ثابت ہوں تو یہ کوئی
عجیب بات نہیں۔ اگر کوئی آدمی متانت و شرافت کو
بالکل ہی بالائے طاق نہ رکھدے تو کسی عالم کے عقائد جاننے
کے لئے اس کے کبھی کبھار کے شعروں کی طرف رجوع نہیں
کرے گا بلکہ اُن ارشادات پر نظر کرے گا جو اس نے واقعۃً عقائد
ہی کے سلسلہ میں کھُل کر صادر کئے ہیں۔ مولانا اشرف علیؒ کی بیشمار
کتابیں مطبوعہ موجود ہیں۔ ان میں انھوں نے جگہ جگہ اصرار و تاکید
کے ساتھ اُن مبالغہ آرائیوں کی مذمت کی ہے جو اہل بدعت
رسول اللہ ﷺ کی شان میں کرتے ہیں۔ یا رسول اللہ کے نعرے
کو وہ ممنوع قرار دیتے ہیں۔ قیام میلاد کو بدعت فرماتے ہیں۔ عرس و
فاتحہ اور نذر و نیاز کے ہنگاموں کو گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذرا
سوچئے تو وہ شخص کس قدر حق سے گریزاں اور اپنی غرض کا بندہ
ہوگا جو ایک عالم کے صریح بیانات اور کھلے کھلے فرمودات کو
تو نظر انداز کر دے مگر ڈھونڈ کے لائے اس کے شعر تاکہ ان کے
ذریعہ یہ ثابت کرے کہ عالم موصوف بھی ہمارے ہی جیسا عقیدہ
رکھتے تھے۔ یہی حرکت اہلِ بدعت قرآن و حدیث کے ساتھ
کرتے ہیں یہی اقوالِ بزرگاں کے ساتھ۔

قبر کے طواف کا سبق شاہ ولی اللہؒ کی طرف یقیناً غلط
طور پر منسوب ہو گیا ہے۔ آخر ان کی اور تصنیفات بھی تو موجود
ہیں۔ بلاغ المبین ہی دیکھئے۔ کھلم کھلا قبر پرستی کا رد، قبوری رسوم
کی تردید اور اہل بدعت کے عقائد کا ابطال اس میں موجود
ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مقامات پر اسی نوع کی چیزیں
ملیں گی۔ آخر کیسے مان لیا جائے کہ جو بزرگ قدم قدم پر قبر پرستی
کی مذمت کرتے ہیں وہی طواف قبر کا سبق دینے بیٹھ جائیں۔
لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو اسی طرح اس کی تاویل [illegible]

جس طرح بعض آیات کی تاویل دوسری آیات سے مطابقت دینے کے لئے کرنی ضروری ہے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو صاف و سادہ سی بات ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ سہو و خطا ان سے بھی ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کسی رَو میں وہ طواف قبر کا سبق دے گئے ہوں اور اس پر پچھتائے بھی ہوں۔ ضروری تو نہیں کہ ان کا پچھتاوا بھی تاریخ نے محفوظ کر ہی لیا ہو۔ دلیلِ مبین یہ ہے کہ ان کی متعدد کتابیں چھپی چھپائی موجود ہیں ان میں وہ قبر پرستی کی سخت مذمت اور قبوری آداب و رسوم کی برملا تردید فرماتے ہیں۔

مولوی خُرّم علی نے یا کسی اور نے اگر الوسیلہ سے مرادِ مرشد کی بیعت لی ہے تو اس کے ذمّے دار وہ خود ہیں۔ وہ خود نبی تو نہیں تھے کہ جو تفسیر انھوں نے کر دی نقش کا الحجر ہوئی یہ آیت ایک مفہوم عام پر دال ہے۔ مرشد کی بیعت بھی الوسیلہ کے ذیل میں آسکتی ہے بشرطیکہ وہ دائرۂ شریعت میں محدود ہو۔ لیکن یہ کہنا تو محض دھاندلی ہے کہ صرف بیعت ہی کو الوسیلہ کہا گیا ہے۔ ہم سلسلۂ بیعت وارشاد کو اصلاً غلط نہیں سمجھتے، بلکہ ہماری نظر میں تذکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کیلئے شریعت کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا بیعت وارشاد کا سلسلہ یقیناً بہترین وسیلہ ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو پیری مریدی کو ہر آئینہ غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس قول کو ـــ چاہے وہ کسی قطب دوراں ہی کا کیوں نہ ہو ـــ متجاوز عن الحق سمجھتے ہیں کہ وسیلے سے مراد مرشد کی بیعت ہے۔ اِس آیت کے باب میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالے الوسیلہ میں جو کچھ شرح و بسط سے لکھا ہے اسے پڑھ لیا جائے تو انشاء اللہ نافع ہوگا۔

یہ تو سوالات کا جواب ہوا۔ آخر میں یہ نصیحت سُنتے جائیے کہ مطالعہ کے لئے صحیح لٹریچر کا انتخاب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا پیٹ بھرنے کے لئے مناسب غذا کا انتخاب بجائے مفید و مقوّی غذاؤں کے آپ گھاس پھونس اور مضر اشیاء کھاتے رہیں گے تو مفید و مقوّی غذائیں بھی اپنی افادیت کھو دیں گی۔ کمیونسٹوں اور فحش نویسوں کے لٹریچر کی کمی نہیں تو اہلِ بدعت کا لٹریچر کیوں کم ہونے لگا۔ آپ "وسیلۂ اولیاء" جیسے مضامین چھاپنے والے رسالے اور کتابیں دیکھیں گے تو ذہنی انتشار اور فسادِ مزاج کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وقت کی قدر کیجئے اور ایسا ہی لٹریچر دیکھئے جو ایمان وعمل کی اصلاح میں نافع اور عقل و بصیرت کو تقویت دینے والا ہو۔

اور ایک بات یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ بے شک بعض اونچے درجے کے بزرگوں سے بھی کبھی کبھار ایسے اقوال صادر ہوتے رہے ہیں جن سے وحشت ہوتی ہے۔ تو یہ ان کی بزرگی میں قادح نہیں اور اس میں حیرت کی بھی کوئی بات نہیں۔ قصور سے بالاتر ہونا تو انبیاء کی شان ہے۔ باقی جملہ انسان غیر معصوم ہیں۔ شاہ عبدالقادر اور امام ابو حنیفہؒ تو کس شمار میں ہیں صحابہ رضوان اللہ علیہم سے بھی قصور و سہو کا صدور ہوا ہے۔

حقائق کے سمندر میں زیادہ گہرائی تک غواصی کرنے کی ہمت ہو تو حضرت مجدد الف ثانیؒ قدس اللہ سرہٗ کے یہ الفاظ پڑھئے۔ مکتوبات جلد اوّل کے مکتوب ۲۲ میں تحریر فرماتے ہیں:

هیچ کس از القاءِ شیطانی محفوظ نیست ہرگاہ کہ در انبیاءً متصور باشد بلکہ متحقق، در اولیاء بطریقِ اولیٰ خواہد بود۔ غایت ما فی الباب انبیاء علیہم الصلاۃ والتسلیمات بر آں القاء متنبّہ می سازند و باطل را از حق جدا می نمایند

کوئی ذی روح القاءِ شیطانی سے محفوظ نہیں ہے، جبکہ انبیاءؑ تک میں یہ چیز نہ صرف متصور بلکہ محقق ہو تو اولیاء میں تو بطریقِ اولیٰ ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس القاءِ شیطانی پر متنبہ کر دیئے جاتے ہیں اور باطل کو حق سے جدا کر دیا جاتا ہے۔

+ + + +

دیکھا آپ نے۔ یہ کسی معمولی آدمی کا فرمودہ نہیں۔ اہلِ بدعت تو اپنی کیفیتِ سکر و غلو میں اس طرح کے نکات واضح کرنے والوں کو وہابی اور گمراہ وغیرہ کہہ کر عقل و ہوش سے چھٹی پا جاتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ شیطان کو اللہ نے بڑی قوت دی ہے۔ اس نے ہمارے جدِ امجد حضرت آدمؑ

بہکانا ہوا الا جو سب سے پہلے نبی تھے۔ پھر قرآن کو آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ صاف معلوم ہوگا کہ شیطان برابر انبیاء کی گھات میں رہا ہے اور کبھی نہ کبھی انبیاء بھی اس کے مکر و کید کا کسی نہ کسی درجے میں شکار ہوتے رہے ہیں۔ وہ تو چونکہ اللہ انبیاء کی نگرانی کرتا ہے اور ان کی لغزشوں کو واضح کردیتا ہے اسلئے یہ لغزشیں آسمانی تعلیمات کو مشکوک نہیں ہونے دے سکتیں ان کا زہر تبیان و تنبیہ کے باعث وحی کے جسدِ اطہر میں سرایت نہیں کرسکتا اور انبیاء علیہم السلام کو فوراً ہی رجوع الی الحق ——— اور توبہ اور اصلاح کی توفیق میسر آجاتی ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو خود سوچ لیجئے کہ اولیاء اور علمائے امت اور مشائخ و اقطاب کس شمار میں ہیں کہ انھیں کیدِ شیطانی کی زد سے باہر سمجھ لیا جائے۔ ہوشیار باش کہ جو نا فرجام کسی بزرگ کا کوئی ایسا قول و فعل سامنے لاتا ہے جس سے شریعتِ حقہ کے کسی حکم و عقیدے کی تردید اور عقائدِ باطلہ کی تائید ہوتی ہو تو ناموں اور حوالوں کے رعب میں ہرگز مت آئیے۔ کیا بعید ہے کہ ایک بڑا بزرگ بڑا عالم، بڑا شیخ اپنے علمی سفر اور منازلِ سلوک میں کسی قدم پر بہک گیا ہو۔ کبھی اس پر بشریت کا ضعف غالب آگیا ہو کبھی اس سے غلط قول یا غیر مناسب فعل سرزد ہوگیا ہو۔ اس طرح کی چیزیں ہمارے لئے حجت نہیں۔ حجت ہے قرآن۔ حدیث، تعاملِ صحابہؓ، اجماع، قیاسِ صحیح۔ جب قرآن تک کا یہ معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں محکمات پر توجہ رکھو۔ متشابہات کے پیچھے دوڑنا دل کی ٹیڑھ کی علامت ہے۔ متشابہات کے چکر میں وہی پڑتے ہیں جن کے قلوب میں زیغ ہوتا ہے۔ تو انسانوں کا مقام تو بدرجۂ اولیٰ یہ ہے کہ ان کے اسوۂ حسنہ سے فائدہ اُٹھایا جائے اور ان کے پیچیدہ اقوال و اعمال سے درگزر کیا جائے۔ شاہ ولی اللہؒ ہوں یا ملا علی قاریؒ۔ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں یا امام ابو حنیفہؒ۔ ان کی صریح و واضح ہدایات سے استفادہ لازم ہے، کیونکہ انھوں نے پوری دیانت اور پورے فکر و تفحص کے ساتھ قرآن و سنت کی تبیین و تشریح کی ہے اور ان کے اُن اقوال کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہے جن کی کوئی ایسی تاویل و توجیہہ تم سے نہ ہوسکتی ہو جیسے ان کے معلوم و معروف افکار و عقائد کے مطابق کہا جاسکے مجدد الف ثانیؒ جیسے امام و شیخ کے مکتوبات میں نظر کروگے تو معلوم ہوگا کہ فکر و فیصلے میں ان سے بھی بعض ایسی لغزشیں در فروگذاشتیں ہوتی رہی ہیں جن کا وہ خود ہی بعد میں اعتراف کرگئے ہیں۔ علیٰ ہٰذا شاہ ولی اللہؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے افاضل سے بھی کبھی فکر و فیصلے میں چوک ہوسکتی ہے۔ کتنی بُری بات ہے کہ ایک شخص ان جلیل القدر اکابر کے مجموعی فکر، مؤکد پیغامات، صریح و محکم ہدایات اور معلوم و معروف تعلیمات کو تو پس پشت ڈالدے مگر ڈھونڈ کر لائے وہ اقوال جن کی حیثیت شاذ کی ہو الشاذ کالمعدوم۔ نیکیاں بُرائیوں کو محو کردیتی ہیں۔ اسیطرح بڑے لوگوں کے فکری و عملی کارنامے ان کی اتفاقی لغزشوں اور بشری کمزوریوں کو ناقابلِ التفات بنادیتے ہیں۔ محکم پکڑو۔ متشابہات کو اللہ کے حوالے کردو۔ یہی ہے گُر کی بات۔

نذر لغیر اللہ

سوال ۲: از محمد ہاشم۔ نارتھ ارکاٹ۔

بدعات کے رد میں تجلّی جو پارٹ ادا کر رہا ہے اس کا علم و اندازہ ہمیں بخوبی ہے۔ راقم الحروف اگرچہ شروع سے اسکا خریدار نہیں ہے، لیکن تقریباً ایک سال سے برابر خرید رہا ہے اور یقین یہ ہے کہ جب تک آخری سانس ہے اس کا ساتھ نہیں چھوٹے گا۔ یقینی بات ہے کہ نذر و نیاز ——— جو آج کل بہت مروّج ہے اسکے بارے میں بھی آپ نے پچھلے سالوں میں بہت کچھ لکھا ہوگا، لیکن مجھے فائل میسر نہیں ہے۔ اگر آنجناب شروع سے دسمبر ۶۰ء تک کا مکمل فائل مہیا فرمادیں تو اس کی جو بھی قیمت آپ فرمائیں ادا کردی جائے گی۔ یا پھر "تجلی کی ڈاک" کو کتابی شکل میں جلد از جلد چھاپ دیں۔ دونوں ہی صورتیں فوری طور پر ممکن نہ ہوں تو میری استدعا ہے کہ نذر کے بارے میں جلد کچھ ارقام فرمائیں آج کل مزاروں، پیروں اور متبرک مقامات کے لئے نذریں ماننا عام ہے۔ آپ اس بارے میں کوئی جامع اصولی بات تجلی میں ارقام فرمادیں تو اس کا نفع عام ہوگا۔ لیکن عقل ...

اتھ کچھ نقل بھی ہو تو زیادہ مؤثر ہوگی۔

الجواب:۔

جہاں تک تجلّی کے فائل کا تعلق ہے تو پچھلے تمام سالوں کا
وکیا کسی ایک سال کا بھی مکمل فائل دفتری فائل کے سوا شاید
ی نکل سکے۔ جتنے فائل مہیا کئے جانے ممکن تھے کئے جا چکے۔
ب اس سے معذوری ہے۔

اور تجلّی کی ڈاک " کو کتابی شکل میں لانے کا معاملہ یہ ہے
کہ اس کے لئے تو ہرت سے مخلصین و محبین کا اصرار جاری ہے
اور خود عاجز کو بھی احساس ہے کہ یہ کام ضرور ہونا چاہئیے۔
علم و فہم، کردار و عمل اور سلیقۂ گفتار میں یہ ناچیز
ہزار ناقص و کوتاہ سہی لیکن عطیۂ قدرت کا کفران ہوگا اگر اس
تحدیثِ نعمت میں بخل کیا جائے کہ " تجلّی کی ڈاک " نے بے شمار
قلوب و اذہان کو متأثر کیا ہے، اس کا نہج و پرداز عصرِ حاضر کے
فکری تقاضوں سے بہت قریب ہے، اور اس کا مطالعہ کرنے
والے بفضلہٖ تعالیٰ بہت سے غلط اور واہی عقائد و تصورات
سے نکل کر ایسے مستقیم و معتدل افکار و عقائد پر ثابت قدم
ہوگئے ہیں جنہیں فہمِ دین کی منزلِ دشوار کے لئے سنگِ میل
کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ بڑی بات اللہ کے فضل سے یہ ہے کہ
" تجلّی کی ڈاک " نے بے شمار ذہنوں کو دینی مسائل میں سوچنے
سمجھنے کا ایک خاص طرز و انداز دیا ہے۔ ایک رُخ دکھایا ہے
ایک ایسا شعور دیا ہے جو ان کے فکر و بصیرت کو باطل سے
حق کی طرف لے جانے میں ایک داخلی عامل کا کام دیتا ہے۔

یہ تحدیثِ نعمت اگر عجب و غرور اور خود پسندی و کبر
کی ناپاکی سے ملوّث ہے تو یہ بندۂ عاجز اس سے ہزار بار خدا
کی پناہ مانگتا ہے اور صاف صاف یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ
مسائل کی تنقیح و توجیہ میں اس سے بہت سی غلطیاں، لغزشیں
اور فروگذاشتیں بھی ضرور ہوئی ہوں گی۔ اسی لئے " تجلّی کی
ڈاک " کو کتابی شکل دینے کے لئے اتنی فرصت کا مہیا ہونا
ضروری ہے جس میں اس پر نظرِ ثانی ہو سکے اور پھر ترتیب و تبویب
کے ساتھ یہ آپ حضرات کے سامنے آئے۔ یہ فرصت باوجود سعی
بسیار کے نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ بے نصیبی
دراصل بے توفیقی کی ایک شکل ہے۔ توفیق اللہ عطا کرتا
ہے۔ بندہ کس شمار میں ہے کہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ
پہنا سکے۔ عاجز کو یقین ہے کہ اگر اپنے ہی عمل و کردار میں
بدترین خامیاں اور اپنے ہی حسنِ نیت میں شرمناک
فتور نہ ہوتا تو اس کارِ خیر کے لئے وقت میں اتنی برکت
ضرور ہو جاتی کہ کبھی کا یہ انجام پا جاتا۔ لیکن جب بندہ
گناہوں میں ملوّث اور کفرانِ نعمت میں بدمست ہو جاتا
ہے تو اس سے توفیقِ خیر اٹھا لی جاتی ہے۔ گو کہ اللہ کی ناراضگی
اس بدبخت سے ابھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ سارے ہی
امورِ خیر کی توفیق اس سے حبط کر لی گئی ہو۔ یہ تجلّی کے صفحات
پر جو بُرا بھلا مواد ہر ماہ پیش کر دیا جاتا ہے یہ بھی اللہ کی
دی ہوئی توفیق ہی کا ثمرہ ہے تاہم توفیقِ مزید کے لئے
اللہ کی طرف رجوعِ خالص کی ضرورت ہے اور یہ نعمت
جسے مل جائے اس کے لئے اُمورِ خیر کی انجام دہی میں کوئی
رکاوٹ نہیں۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۔

اصل سوال کا جواب دینے کی بجائے یہ لاحاصل سی
داستاں سرائی دراصل اُن بے شمار محبین و مخلصین کی آگاہی
کے لئے کی گئی ہے جو بار بار مجھے توجہ دلاتے ہیں کہ تجلّی کی
ڈاک کو کتابی شکل میں لانا ضروری ہے۔

رہا سوال کا جواب تو بے شک نذر و نیاز کے
باب میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ یہاں بقدرِ ضرورت
کچھ اور لکھتا ہوں۔ نذر کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آیا وہ
جائز ہے یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں
فائدہ ہونے نہ ہونے کے بارے میں میں احادیث
کے حوالے سے تجلّی میں واضح کر چکا ہوں کہ فی الحقیقت یہ کوئی
ذاتی اور داخلی منفعت نہیں رکھتی۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ
اے اللہ اگر آپ نے میرے بھائی کو فلاں ملازمت دلوا دی
تو میں پچاس غریبوں کو کھانا کھلاؤں گا۔ یہ نذر بلاشبہ جائز
ہے۔ اس کے پورا کرنے میں ثواب بھی ملے گا لیکن یہ ثواب
دراصل نذر کا نہیں ہے انفاق کا ہے۔ محتاجوں کے اطعام کا ہے
آپ نذر مانے بغیر بھی پچاس محتاجوں کا پیٹ بھر دیں تو اس کا

ثواب شبہ سے بالاتر ہوگا۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو نذر کی صورت میں ثواب کم اور بلا نذر کے ثواب زیادہ ملنا چاہئے۔ نذر تو گویا ایک طرح کی قیمت تھی اُس مقصد کی جس کے لئے آپ نے اسے مانا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ آپ نے اللہ سے ایک سودا کیا تھا۔ مطلوبہ شئے آپ کو مل گئی۔ آپ نے اس کی قیمت ادا کردی۔ بات ختم۔ پچاس مسکینوں کو کھانا کھلانے کا مقصود حصول ثواب نہیں تھا بھائی کی ملازمت تھی۔ بدلے میں آپ خالص ثوابِ آخرت کے خواہاں نہیں تھے ایک دنیاوی غرض پیشِ نظر تھی۔ ایسی صورت میں عقل و انصاف کا فیصلہ ظاہر ہے یہی ہونا چاہئے کہ آپکو ثوابِ آخرت یا تو ملے ہی نہیں یا ملے تو اس شخص سے بہر حال کم ملے جس نے کوئی سودا کئے بغیر کسی دنیاوی مقصد کو سامنے رکھے بدون پچاس غریبوں کا پیٹ اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی نیت سے بھر دیا۔

اگر یہ استدلال و تفکر درست ہے تو نذر کا فی حد ذاتہٖ غیر مفید بلکہ نسبتاً ضرر رساں ہونا بالکل واضح ہوگیا اور یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ چونکہ ہم نے نذر مانی تھی اس لئے فلاں کام ہوگیا اگر نہ مانتے تو نہ ہوتا۔ العیاذ باللہ۔ پچاس کیا پچاس لاکھ غریبوں کا پیٹ بھر کر بھی ہم اللہ پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ یہ تو خود اپنے اوپر احسان ہے۔ اس کا فائدہ جو کچھ پہنچتا ہے ہمیں ہی پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ فلاں کام اللہ نے اس لئے کردیا کہ ہم نے نذر مانی تھی۔ نذر نہ مانتے جب بھی وہ کام ضرور ہوتا اگر اللہ نے اس کا ہونا مقدر فرما دیا تھا اللہ تعالیٰ دعا کی قبولیت کے لئے قلب و ذہن کا تضرع دیکھتا ہے خشوع و خضوع دیکھتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا کہ بندہ اپنے مقصود و مطلوب کی قیمت کیا لگا رہا ہے۔ قیمت کو تو وہ دیکھے جو کسی درجے میں حاجتمند ہو۔ وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اللہ غنی و مالک پر بھلا کسی شئے کے عطا کرنے میں یہ چیز کیا اثر کرے گی کہ مانگنے والا ہزار مسکینوں کے اطعام یا دس مساجد کی تعمیر یا پچاس جانوروں کی قربانی کا وعدہ کر رہا ہے۔ کلّا کلّا۔ کبھی نہ سمجھو کہ فلاں کام نذر ماننے کی وجہ سے ہوگیا۔ حرمتِ شرعیہ سے خالی نذریں بے شک جائز ہیں، لیکن عاجز نے کبھی نذر نہیں مانی اور شاید کبھی مانے گا بھی نہیں۔ بندہ آخر گرہ میں رکھتا کیا ہے جو وہ اللہ سے سودا کرے۔ اللہ سے کچھ لینے کے لئے کسی قیمت کی پیش کش کرے۔ بندہ تو اس لائق ہے کہ جب اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلائے تو اس یقین و احساس کے ساتھ پھیلائے کہ وہ مشتِ خاک ہے فقیر و محتاج ہے۔ خالی ہاتھ ہے۔ بے مایہ ہے۔ اللہ کے اُن لامتناہی انعامات ہی کی کوئی قیمت وہ ادا نہیں کر سکتا جو بے طلب اس پر برسا دیئے گئے ہیں۔ پھر کسی نئے انعام، کسی مزید عطیے کی قیمت وہ کہاں سے کس طرح پیش کر دے گا۔ یقین جانو صرف ایک سانس کی قیمت بھی تم ہرگز ادا نہیں کر سکتے۔ پھر کیا طرفہ تماشا ہے کہ یکسر تہی دامن ہو کر بھی اللہ سے سودا کرنے کی فکر میں ہو۔ جیب خالی ہے اور کہہ رہے ہو کہ ہمیں فلاں چیز قیمتاً دیدیجئے قرض کے بوجھ میں دبے ہوئے ہو مگر طنطنہ یہ ہے کہ عطائے ربانی کی بہا پیش کروگے۔

نہیں بھائی۔ اپنے فکر و فہم نے تو ہمیشہ اس سے ابا کیا کہ نذر مان کر کوئی دعا کی جائے۔ جو کچھ ہم اطاعت و عبادت اور انفاق کر سکتے ہیں وہ ہمیں سودے سے بالاتر ہو کر کرنا چاہئے پچاس مسکینوں کی حاجت روائی اگر ہمارے بس میں ہے تو اسے کسی دعا اور مانگ سے نتھی کرنا اور مقدور بھر عملِ خیر کو اس پر معلق رکھنا کہ اللہ ہماری فلاں مراد پوری کر دے تب اسے انجام دیں، کچھ ایسے معنی رکھتا ہے جیسے اب تک جو کچھ اللہ نے ہمیں از راہِ فضل و کرم دے رکھا ہے اس کی قیمت تو ادا کر چکے۔ اس کا حق تو پورا ہوا۔ اب مزید دولت و قوت جو ہمارے پاس ہے اسے اس کی راہ میں جبھی خرچ کریں گے جب وہ کچھ اور ہمیں دے۔ کیسا مکروہ ہے یہ تخیل، کیسا غلط اور لغو۔

تاہم یہ ہمارے ذاتی احساسات و افکار ہیں۔ فقہ کا جہاں تک تعلق ہے ایسی تمام نذریں جائز ہیں جن میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو اور چونکہ عہد کو پورا کرنا اخلاق و کردار کے لئے ضروری ہے اس لئے جائز نذروں کو پورا کرنا بھی ضرور چاہئے ویسے نذر کا صحیح اطلاق صرف اُن منتوں پر ہوتا ہے جن سے اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو۔ حدیث میں آیا ہے:۔

انما النذر ما لا تبتغی بہ الا وجہ اللہ (مسند امام احمدؒ)

نذر وہی ہے جس کا مقصود خوشنودیِ رب ہو۔

سنن ابو داؤد میں ایک واقعہ آیا ہے :-

ان رجلا نذر ان ینحر ابلاً فی موضع سماہ فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم "ھل فیہ وثن من اوثان الجاھلیۃ تعبد؟ قال لا! قال" اوف بنذرك"

ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ فلاں مقام پر اونٹ ذبح کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا اُس مقام پر زمانۂ جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت ہے جسکی پرستش کی جاتی ہو۔ اس نے جواب دیا۔ جی نہیں ایسا تو نہیں ہے، حضور نے فرمایا۔ تو جاؤ نذر پوری کرو"

+ + + +

+ + + +

+ + + +

چونکہ قربانی کرنا بجائے خود فعلِ نیک ہے، اس لئے اس کی منت پوری کرنی چاہئے لیکن کسی استھان، کسی بتکدے پر قربانی فعلِ حرام ہے اس لئے اللہ کے رسولؐ نے تصریح طلب کی۔ اگر جواب اس کے خلاف ہوتا جو شخص نذر کو رنے دیا تو ظاہر ہے اللہ کے رسولؐ منع فرما دیتے۔

اب ذرا اُن نذروں پر نگاہِ غور ڈالئے جو فی زمانہ قبوری شریعت کے دائرے میں رائج ہیں۔ ہر وہ شخص جس کے ذہن کو شیطان نے فاسد نہ کر دیا ہو خوب جانتا ہے کہ صرف پتھر کے بُت پوجنا ہی شرک نہیں، بلکہ اللہ کے سوا کسی کی بھی پرستش شرک ہے حتیٰ کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُلوہی صفات سے متصف کرے وہ بھی مشرک ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ بُت پوجنے والوں کے شرک میں ایک گنجائشِ تاویل بھی ہے۔ بے جان پتھروں کے متعلق احمق سے احمق آدمی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ ہمارے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے مجسمے فی الواقع معبود ہیں بلکہ وہ انھیں ایک طرح کا واسطہ اور مظہر خیال کر کے سرِ عبودیت جھکاتا ہے، لیکن انسان چونکہ ذی روح ہے، ذی قوت ہے، ذی ارادہ ہے اس لئے اگر کسی زندہ یا مردہ انسان سے ہماری عقیدت مندیاں مناسب حدوں سے گزر جائیں تو ہمارے قلب و ذہن میں اس باطل خیال کے جاگزیں ہو جانے کے بہت زیادہ امکانات ہیں کہ یہ انسان بجائے خود مختار و دستگیر ہے۔ غوث و حاجت روا ہے۔ پھر جب اس سے کچھ کرامتیں بھی صادر ہوئی ہوں، یا غلوئے عقیدت نے بعض سادہ اُمور کو کرامت کا رنگ دے کر اس سے منسوب کر دیا ہو تو اس کا بہت زیادہ خطرہ ہے کہ شرک کی حد تک اس کے اقتدار و اختیار کا تخیل ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست دماغوں پر چھا جائے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں۔ معمولی سی مثال شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کی لے لیجئے۔ لوگ انھیں غوث الاعظم کہتے ہیں اور اس سے بھی پیٹ نہیں بھرتا تو غوث الثقلین (انس و جن کے دستگیر) کا لقب تراشتے ہیں، صرف جہلا ہی نہیں، کتنے ہی پڑھے لکھے حضرات اور کتنے ہی صوفیائے کرام حضرت موصوف کے بارے میں حد سے متجاوز عقیدت کا شکار ہیں اور عجوبہ ہے کہ یا عبد القادر شیئاً للہ کا صریح مشرکانہ وظیفہ تک اُس ملتِ مسلمہ میں رائج ہو گیا ہے جس کا پہلا فرض ہی یہ تھا کہ ایسے ہر شرک و طغیان کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔

اِن گوشوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ یہ جو مرحوم بزرگوں کی قبر و تبر درگاہیں بنالی گئی ہیں ان کی شناعت زمانۂ جاہلیت کے استھانوں سے کم نہیں، بلکہ کچھ زائد ہی ہے اور نذر و نیاز، استغاثہ و استمداد، مراقبہ و طواف اور عرس و اجتماع کی مروجہ شکلیں اس سے بھی بڑھ کر قبیح و نجس ہیں جتنی وہ زمانۂ جاہلیت کے استھانوں اور صنم کدوں پر تھیں۔

آج بے شمار جاہل و نیم جاہل مسلمان ـــ جنکی قیادت و رہنمائی کا سہرا بیشتر علماء ہی کے سر ہے ـــ بے تکلف ایسی نذریں مانتے ہیں جن کا پورا کرنا کسی درگاہ اور مزار سے مقید ہوتا ہے۔ تو کیا شریعت کی نظر میں یہ زمانۂ جاہلیت کے توہم پرست، گمراہ اور بے عقل مشرکین سے کم کسی عمل کے

نکب ہونے ہیں! ـــ نہیں یہ ان سے بھی آگے ہیں - وہ رحال اتنی توجیہہ ضرور کرتے تھے کہ یہ ہمارے تراشیدہ بت وسیلہ یں، مظہر ہیں، بالذات قادر و معبود نہیں۔ قرآن گواہ ہے کہ اکثریت پرست اپنے بتوں سے اوپر بھی ایک نادیدہ قوت کا تصور ضرور رکھتے تھے۔ وہ مانتے تھے کہ پیدا کرنے اور مارنے والا کوئی اور ہے۔ بارش کوئی اور برساتا ہے۔ اولاد کوئی اور دیتا ہے۔ وغیر ذلک۔ لیکن آج کل کی درگاہوں نے تو غضب یہ ڈھایا ہے کہ نا پختہ اور جاہل و نیم جاہل مسلمانوں کے ذہنوں پہ اہل قبور کی بالذات کارسازی و الوہیت مسلط کر دی ہے۔ سیہ بختی کے مارے یہ سمجھتے ہیں کہ صاحبِ قبر چاہیں تو اولاد سے لیکر نوکری تک اور عشق کی کامیابی سے لیکر سودی قرضہ وصول ہونے تک ہر اختیار و قدرت ان کی کنیز ہے۔ وہ بجائے خود قوت و اقتدار کا سرچشمہ اور مافوق البشر اوصاف و ملکات کا مصدر و منبع ہیں۔ سحقاً سحقاً۔

خوب سمجھ لو۔ نذر و نیاز کے وہ سارے ہنگامے اور مراسم و آداب جن کا تعلق مزاروں اور درگاہوں سے ہے اور ہر وہ نذر جو غیر اللہ کے نام پر یا غیر اللہ کی خوشنودی کیلئے مانی گئی ہے احرم الحرام ہے۔ یہ تاویل حد درجہ رکیک ہے کہ صاحب قربانی تو ہم نے اللہ ہی کا نام لیکر کی، نیکن کی ہے فلاں بزرگ کے لئے۔ وہ چونکہ اللہ کے مقرب اور برگزیدہ ہیں اس لئے انھیں خوش کرکے اللہ ہی کو خوش کرنا مقصود ہے۔ نذر مانو تو اللہ کی براہِ راست خوشنودی و رضا کے لئے مانو۔ کیا نہیں دیکھتے کہ قرآن بار بار دینِ خالص کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اسکا فرمان ہے کہ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْن۔ یہ آخر بندگی کے ساتھ اخلاص کی قید کیا یوں ہی ہے۔ قید بھی کیسی۔ کہا جاتا ہے اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِص۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ کان کھول کر سن لو۔ اللہ ہی کے لئے ہے ـــ صرف اور صرف اللہ ہی کے لئے ہے دینِ خالص پھر ہمیں ہی نہیں پہلوں کو بھی حکم عبادت اسی قید کیساتھ دیا گیا تھا۔

وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ۔	اور انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ بندگی کریں اللہ کی دین کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے مکمل یکسوئی کے ساتھ (ابراہیم)

آخر ذرا سوچو یہ اخلاص و حنفیت کی قیدیں کیا اقتضاء اور مفہوم رکھتی ہیں۔ ملی جلی بندگی تو کافر و مشرک بھی کرتے ہیں۔ نادیدہ آسمانی معبود ـــ بھگوان، ایشور، گاڈ وغیرہ کے ناموں سے تو اہل ہنود اور یہود و نصاریٰ کے بھی ہیں۔ فقط توحید خالص اور مکمل تردید شرک ہی تو ہے جو ملتِ مسلمہ کو دوسری تمام ملتوں سے جدا کرتی ہے۔ توحید خالص کہاں متحقق ہو سکتی ہے اگر مسلمان زبان اور عمل دونوں سے وہی اعتراف نہ کرے جو اللہ نے اپنے آخری رسول ؐ سے کرایا تھا کہ:۔

قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ۔	کہدے میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں بالکل خالص کرتے ہوئے اپنے دین کو تم پوجے جاؤ جسے پوجتے ہو اللہ کے سوا۔

گرہ سے باندھ لو کہ ملی جلی بندگی بارگاہِ لم یزل میں مردود ہے سچے مومن اسی وقت ہو گے جب ہر طرف سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ ہی کے آستانے پر سر جھکا دو گے۔ ایسا سر جس کے ساتھ دل و دماغ اور روح سب جھک جاتے ہیں۔ جس سر کے ساتھ انسان کا تمام وجود، پورا باطن نہ جھک جائے اس پر اللہ کا آستان لعنت بھیجتا ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ کے رسول ؐ نے فرمایا ہے کتنے ہی بدبخت ایسے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن انپر لعنت کرتا ہے۔ اسی طرح کتنے ہی بدنصیب ایسے ہیں جو توحید کا دعوے کرتے ہوئے اللہ کے آگے سر جھکاتے ہیں، لیکن اللہ اور اسکے فرشتے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی پیشانیاں دوسروں کے آگے جھکنے کی ناپاکی سے بھی ملوث ہیں۔ ان کے کاسۂ سر میں غیر اللہ کی نیازمندی و عبودیت کا بھی سودا سمایا ہے۔ خدایا تیری پناہ۔

جہاں تک دلائل عقلیہ کا تعلق ہے عاجز وقتاً فوقتاً انھیں تجلی کے صفحات میں پیش کرتا رہا ہے۔ قرآن کی دسیوں آیات اور سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے فرمودات ان حقائق کے لئے منھ بولتی دلیلیں ہیں۔ حد درجہ افسوس ہے کہ جو لوگ نذر و نیاز اور دینِ قبوری کے پھیر میں آئے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جو اپنے حنفی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، حالانکہ جس طرح اللہ جل و علا مشرکین کے شرک سے بلند و برتر ہے اسی طرح حنفیت

فوات وبدعات سے یکسر بری الذمہ ہے۔ رئیس الطائفہ
رت امام ابوحنیفہؒ کے فکر وعقیدے کا اندازہ تو اس سے لگائیے
ایک واقعہ کئی سندوں سے مختلف کتابوں میں بیان کیا جاتا
ہیں امام موصوف نے قبر پر آکر صاحب قبر سے دعا کی
واست کرنے والے ایک شخص سے فرمایا:۔

"تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ تو ان کو آواز دیتا اور
سے مدد چاہتا ہے جو نہ جواب دینے پر قادر ہیں نہ کسی اور چیز
بلکہ وہ تو سن بھی نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود رسول اللہ
اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَمَا أَنْتَ
بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ۔ اے محمد! تو قبر میں پڑے ہوؤں
ہیں سنا سکتا۔"

"قاضی خان" میں امام موصوف کا واضح فتویٰ
ود ہے کہ قبر کو پختہ بنانا تو درکنار اسے لیسا بھی نہ جائے نہ
ں پر عمارت بنائی جائے۔ اور کبیری میں ان کا فیصلہ نقل
ہے کہ قبر کے پاس مسجد بنانا یا اور کسی طرح کا تعمیری نشان
م کرنا یا اسے سجانا بنانا جائز نہیں ہے۔

مشہور حنفی عالم شارح مشکوٰۃ ملا علی قاری المرقاۃ
فرماتے ہیں کہ قبر پر جو عمارت بنادی گئی ہو اسے ڈھا
واجب ہے چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔

نذر ونیاز کے بارے میں حنفی فکر وعقیدے کا ملخص
ر الرائق میں حنفی عالم ابن قطلوبغاؒ کی شرح درر البحار
نقل کرتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے۔

ن ر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الشمع والزیت ونحوها الی ضرائح الاولیاء الکرام تقربا الیھم فھو بالاجماع باطل وحرام لوجوہ منھا انہ نذر للمخلوق والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق ومنھا ان المنذور لہ میت والمیت لا یملک ومنھا انہ ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ واعتقاد ذلک کفر۔

یہ جو بہت سے عوام مُردوں کے لئے نذریں مانتے ہیں اور شمع وتیل اور چراغ وغیرہ تقرب حاصل کرنیکے خیال سے اولیاءِ کرام کی قبروں پر روشن کرتے ہیں وہ متفق علیہ طور پر حرام ہے۔ اس حرمت کی متعدد وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کی نذر جائز نہیں کیونکہ نذر ایک طرح کی عبادت ہے اور عبادت مخلوق کیلئے نہیں ہوتی ایک یہ کہ جس کیلئے نذر مانی جارہی ہے وہ تو مردہ ہے اور مردہ کسی بھی شے کا مالک مختار نہیں ہوتا ایک یہ کہ اس طرح کی حرکتوں سے یہ غلط فہمی رواج پاتی ہے کہ یہ مُردہ بزرگ مختلف امور میں تصرف واختیار رکھتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھنا کفر ہے

\+ + + +

\+ + + +

گویا نذر لغیر اللہ تو احناف کے نزدیک ایسا فعل حرام ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو اندازہ فرمالیجئے کہ بھیڑوں کی پوری قوت کے ساتھ حنفی، سنّی اور اہل سنت والجماعت ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کا نفاق وزندقہ کن مراحل میں ہے کہ قبروں پر بنائے ہوئے قبے اور عمارتیں تو ان کے لئے نعوذ باللہ من ذلک مکہ اور مدینہ بنی ہوئی ہیں۔ وہاں جیسی کچھ آرائش کی جاتی ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ وہاں میلے لگتے ہیں، درخواستیں پیش کی جاتی ہیں، پھول اور چادریں چڑھتی ہیں، عرس ہوتے ہیں، وہاں کے لئے نذریں مانی جاتی ہیں، چراغاں کیا جاتا ہے۔ کوئی ذہنی وعملی شرک ایسا نہیں جس کی تکمیل ان نام نہاد حنفیوں نے نہ کردی ہو۔ فتوے کی زبان میں ہم انھیں مشرک نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اپنے کرتوتوں کی تاویلیں کرتے ہیں، لیکن اللہ کو اگر تاویل اور چرب زبانی سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا تو سخت اندیشہ ہے کہ آخرت میں ان لوگوں کا انجام بڑا دردناک ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو اسلئے مددگار وکارساز بنا رکھا ہے کہ ہم تو انکی بندگی اللہ سے خصوصی تقرب حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں انکی اختلافی باتوں کا فیصلہ اللہ ضرور کریگا۔ اللہ جل شانہٗ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹے ناشکرے ہوں

اس سے بڑا جھوٹ اور اس سے بدتر ناشکری اور کیا ہوگی کہ آدمی اللہ سے مانگنے کی بجائے قبروں پر ناک رگڑے اور اللہ کے اُن نیک بندوں کو خدائی صفات سے متصف کر چھوڑے جن کی نیکی کا سنگِ بنیاد ہی یہ خیال و عقیدہ تھا کہ ہم کچھ نہیں ہیں اللہ ہی سب کچھ ہے۔ ہم بے اختیار، محتاج، ناطاقت ہیں اور اللہ مختارِ کل، قادر و توانا اور مالک و معبود ہے۔ ہو العزیز الحکیم۔

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

جذباتی آزمائشیں

حضرت سعد الاسودؓ اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت تھے کہ کالی صورت اور حسن و رعنائی سے محروم جسم کے اندر بھی ایک جگمگاتی ہوئی انسانی سیرت موجود ہو سکتی ہے۔ عام انسانی نگاہوں نے اب تک انھیں حقارت کیساتھ دھتکارا تھا۔ زمانے کی سطحیت پسندی نے اب تک ان کی شخصیت کی بے قیمتی کا مایوسانہ احساس ہی دلایا تھا۔ عام دنیا کے لئے ان کے اندر کوئی کشش موجود نہ تھی۔ انسانی آبادیوں میں ایک انسان اس ناکردہ گناہی کی دردناک سزا پا رہا تھا کہ وہ بدصورت کیوں پیدا ہوا ہے! لیکن قدرت کا ہاتھ اس بدصورتی کا پردہ ہٹا کر ان کے اندر چھپی ہوئی ان روحانی رعنائیوں کو آشکارا کرنے والا تھا جن کی خبر اس سیاہ فام انسان کو خود بھی نہ تھی۔

اپنی بدصورتی سے خائف و مایوس انسان نے خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور یوں فریاد کی۔

"اے محمدؐ! میں ایمان لانا چاہتا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ مجھے جنت کے دروازے پر اندر جانے سے روک دیا جائے گا۔"

انتہائی دلسوزی کے ساتھ وہ نظر سعد الاسودؓ کی طرف اٹھی جس میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ رحمۃ للعالمین کی نظر تھی۔ ہمیشہ سچ بولنے والی زبان سے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکلے اور سننے والے کی سماعت پر آبِ حیات کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے ٹپکا گئے۔

"نہیں اے سعد! خدا کی جنت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے — وہاں جانے سے تمھیں روکنے والا کوئی نہیں!"

"اچھا!" سعد الاسودؓ کا منہ حیرت اور خوشی سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر بے اختیار کلمۂ توحید کا پاکیزہ نعرہ ان کے سیاہ ہونٹوں سے بلند ہو گیا۔ سعدؓ ایمان لا چکے تھے — خدا کا ایک دل شکستہ بندہ اپنے خدا کو پا گیا تھا۔ سعدؓ مسلمان ہو گئے تھے — انسانیت نے ایک مایوس انسان کو سینے سے لگا لیا تھا۔

لیکن کچھ دن بعد ایک بار پھر یہی انسان خدا کے رسولؐ کے پاس کھڑا ہوا دیکھا گیا — ایک بار پھر اسکے چہرے سے خوں چکاں مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"اے خدا کے رسولؐ!" سعد الاسودؓ نے دلریشی کے ساتھ کہا "اسلام نے مجھ سے جنت کا وعدہ تو کیا ہے مگر دنیا بدستور تاریک ہی ہے — میں شادی کا آرزومند ہوں مگر کوئی شخص مجھے اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوٹے ہوئے دل کی پکار کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "جاؤ! قبیلہ ثقیف کے نو مسلم سردار عمرو بن وہب کو خدا کے رسولؐ کا یہ فیصلہ سنا دو کہ اس کی بیٹی سعد الاسودؓ کے نکاح میں دیدی گئی!"

سعد الاسودؓ حیرت سے شل ہو گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو کوئی معمولی سے معمولی خاندان اپنے اندر جذب

[illegible] جا رہا تھا۔" اس کو ایک معزز سردار اپنے گھرانے
[illegible] بنانے پر آمادہ ہو جائے! — مگر سعدؓ جو اپنی صورت
[illegible] مایوس تھے رسالت کی عظمت کا یقین رکھتے تھے — یہ
رسالت کی آواز تھی جو اسلامی معاشرے میں تقدیر کے اٹل
فیصلہ کا درجہ رکھتی ہے۔ سعدؓ امید و بیم کے شدید اضطراب
کے عالم میں گرتے پڑتے روانہ ہوئے اور معزز سردار کے
دروازے پر دستک دے کر اپنی شادی کی پیشکش کر دی۔
معزز سردار یہ بات سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ غیظ و
غضب کے ابال نے اس کو یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا کہ اس
پیشکش کے پس منظر میں رسالت کی آواز ہے — اس کے
سامنے محض ایک کالا بھجنگ انسان کھڑا تھا جس نے
قبیلۂ ثقیف کے خاندانی وقار کو للکارا تھا۔ سعدؓ اس در
سے ٹھکرا دیئے گئے۔ مگر ابھی وہ چند قدم بھی جانے نہ
پائے تھے کہ پیچھے سے ایک کانپتی ہوئی شرمیلی نسوانی آواز
نے ان کو انتہائی بے تابی کے ساتھ پکارا "اے جانیوالے
— اے خدا کے بندے! اگر یہ فیصلہ محمد عربیؐ کا فیصلہ
ہے تو مجھے منظور ہے"— یہ آواز عمرو بن وہب کی صاحبزادی
کی آواز تھی — عورت نسلی وقار اور سماجی بندشوں کی
جھوٹی عظمتوں کو ٹھکراتی ہوئی دین کی قربانگاہ پر اپنے
جذبات کی قربانی پیش کر رہی تھی۔ بیٹی کے ایمان افروز
فیصلے نے باپ کو جیسے گہری نیند سے چونکا دیا تھا۔ سعدؓ
جن کو ابھی حقارت کے ساتھ نکالا گیا تھا انتہائی اعزاز
کے ساتھ واپس لائے گئے۔ دنیا جس شادی کا تصور بھی نہ
کر سکتی تھی وہ شادی طے ہو گئی اور سعدؓ اس تقریب کا
ضروری سامان خریدنے کے لئے بازار پہنچے۔ خوشی اور
آرزوؤں کے جذبات میں تلاطم بپا تھا۔ زندگی کی ایک
کچلی ہوئی حسرت ایک حسین ترین تکمیل آرزو کی سمت
بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک نئی عظیم آزمائش کا موڑ سامنے
آ گیا — انھوں نے بازاروں کو اس پکار سے گونجتا ہوا
پایا کہ "اے خدا کے بندو! میدانِ جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ"
سعدؓ چلتے چلتے رک گئے۔ جذبات کا طوفان

اچانک ٹھہر گیا۔ نفس کی ساری دنیا اس ایک پکار میں
گم ہو گئی۔ جذبات کے نشیلے خواب ایک لافانی حقیقت
میں جذب ہو گئے۔ "نئی نویلی دلہن" کے خوابوں سے کھیلنے
والا اب اپنی موت کو سینے سے لگانے پر تیار کھڑا تھا —
دنیا کی لذیذ فرصتوں کی طرف بڑھنے والے قدم رک کے
اور خدا کی طرف بڑھ گئے۔ شادی کے سامان کی جگہ
انھوں نے جہاد کا ساز و سامان خریدنا شروع کیا۔ پھر
راہِ جہاد پر وجد کرتے ہوئے چل دیئے۔ اب انکے سامنے
شبستانِ عروسی نہیں اس جنت کا تصور تھا جس میں خط
سے زیادہ حسین تر کوئی شے نہیں۔ اب ان کی زندگی اس
مقام پر تھی کہ جہاں موت ہی سب سے حسین آرزو ہوتی ہے
جہاں انسان سرخیِ حنا کے بجائے شہادت کی مقدس
آغوش میں اپنی سرخیِ خون سے کھیلنا پسند کرتا ہے، جذبات
کے خوبصورت محل ہر گام پر ان کو پکار رہے تھے مگر جانے
والا قبر کی تنہائیوں کی طرف کھنچا جا رہا تھا — حسن و عشق کی
خلوتیں بازو پھیلا رہی تھیں، مگر شہادت کا جذبۂ بیتاب
تلواروں کی خوں آشام پرچھائیوں کی طرف لپکتا جا رہا
تھا۔ خدا کا بندہ اپنے خدا کی ملاقات کے لئے بے قرار
تھا۔ میدانِ جہاد میں ایک خوبصورت عمامہ باندھے ہوئے
ایک "مجاہد" جان دینے کے لئے بیتاب نظر آ رہا تھا۔ مگر کوئی
نہ پہچان سکا کہ وہ کون ہے؟ آج سعدؓ کی صورت نہیں ان کی
سیرت کا حسن دنیا کے سامنے تھا۔ ان کا جذبۂ جاں نثاری
ایک ایسا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ دیکھنے والے رشک اور
حیرت سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ یکایک ان کے ہاتھ
کی سیاہی لباس کے اندر سے ظاہر ہوئی اور سب سے پہلے
رسولِ خداؐ نے پہچان لیا کہ یہ سعدؓ ہیں — آپؐ نے انکو بلایا
آواز دی۔ مگر آج خدا کے رسولؐ کی آواز بھی ان کو شہادت
کی سرمستی سے نہ چونکا سکی۔ وہ بڑھتے رہے — لڑتے رہے
— لڑتے رہے اور بڑھتے رہے اور عبودیت کی نامعلوم گہرائیوں
میں ڈوبتے چلے گئے۔ دنیا پس منظر میں دھندلا رہی تھی کائنات
پسپا ہو رہی تھی — زمین و آسمان سمٹ رہے تھے اور [illegible]

ساتھ ... انسان ... خدا کے قدموں کو چھولینے کے لئے اپنے وجود کی سرحدوں سے آگے نکلتا ہوا ہمیشہ کے لئے دنیا سے دور نکل گیا۔ سیاہ فام جسم سرخ خون میں نہایا ہوا فرش خاک پر پڑا تھا اور روح اپنے معبود سے جا ملی تھی۔ رسولِ خدا ان کی حسین لاش پر جھکے اور شدت جذبات میں بے جان نعش کو زانوئے مبارک پر رکھتے ہوئے بولے۔
— "اے قبیلۂ ثقیف! خدا نے اپنے سعد کو قبیلۂ ثقیف کی بیٹی سے کہیں زیادہ خوبصورت دولہن عطا فرمادی ہے"۔

سعد الاسودؓ کی کہانی میں انسانی جذبات کے لئے کیسی عبرت کا سامان ہے! لیکن کون ہے جو اس عبرت و نصیحت کے خزانوں سے اپنے دامن بھرے۔ کون ہے جو یہ بات سمجھ سکے کہ "انسان" انسانی چہرے کا نام نہیں، بلکہ اس "انسان" کا نام ہے جو آدمی کے اندر چھپا ہوا ہے!۔ کون جانے کتنے ہی ایسے خوبصورت چہرے ہیں جن کے اندر ایک "خوفناک انسان" چھپا ہوا ہے — اس حقیقت کو دیکھنے کے لئے چشم سر کی نہیں بصیرتِ ایمانی کی ضرورت ہے — کیا ہم اس حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں دیکھ سکتے تو سوچو کیا ہم پھر بھی مسلمان ہیں؟!

دردِ انسانیت

ریاضتوں اور مجاہدوں سے تھکا ہوا ایک پریشان بوڑھا چہرہ عبادت گاہ کی کھڑکی سے اس مردِ مومن کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا جس کا نام عمر ابن الخطابؓ تھا۔ دیکھنے والا ایک مسیحی راہب تھا۔ ایک راہب جس نے دنیا کی ہر لذت اپنے اوپر حرام کرلی تھی محض اس لئے کہ وہ اپنے خدا کو پاسکے۔

حضرت عمرؓ نے اس چہرے پر ایک پُرسوز نظر ڈالی اور بے اختیار رو ... اس گریۂ دردناک کا ... ایک غیر مسلم راہب کی صورت کو ...

"آپ ایک عیسائی راہب کو دیکھ کر رو رہے ہیں؟" لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا اور زیر لب مسکرائے۔

"ہاں!" حضرت عمرؓ کہا اور اندوہناک آواز میں ...
"میں ایک غیر مسلم کو دیکھ کر رو رہا ہوں۔ اے خدا کے بندو! اس سے زیادہ رونے کا مقام کیا ہوگا کہ ایک انسان ایسی عبادت میں اپنی جان کھپا رہا ہے جن کا انجام ہلاکت اور عذاب جہنم کے سوا کچھ نہیں"۔

حضرت عمرؓ نے جو منظر دیکھا تھا وہی منظر آج ایک بہت بڑے پیمانے پر ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے — مگر کہاں ہیں وہ لوگ جو آگ کے یقینی عذاب کے تصور سے کانپ اٹھتے تھے! کہاں ہیں وہ انسان جو اپنی جانوں پر ترس کھاتے ہوئے غیر مسلموں کی ناکام عبادتوں پر پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے؟ — کل اسلام کفر کی حالتِ زار پر رو سکتا تھا مگر آج کفر بھی شاید ہمارے "اسلام" پر رو رہا ہے — کیا ہم مسلمان ہیں؟

جنت کے خریدار

بارگاہ رسالت میں ایک جاگیر کا مقدمہ درپیش تھا۔ ربیعہ مدعی تھے اور امرء القیسؓ مدعیٰ علیہ — قریب تھا کہ پوری جاگیر امرء القیس کی ایک قسم کی قیمت میں ان کے ہاتھ آجائے کہ اچانک رسولِ خدا نے فرمایا۔

"خدا کو یہ بات پسند نہیں کہ صرف مالی منفعت کیلئے اس کا نام استعمال کیا جائے۔ ایسا شخص جب اپنے خدا سے ملاقات کرے گا تو اس کو اپنے سے خفا پائے گا"۔

"لیکن اے خدا کے رسولؐ!" امرء القیسؓ نے کہا "اگر کوئی شخص قسم سے بچنے کے لئے اپنے جائز حق سے دست بردار ہو جائے تو اس کا انعام کیا ہے؟"

"خدا کی جنت" — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ایک لمحے — ایک ذرا سی لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ربیعہ کے چہرے سے مایوسی اور اضطراب ظاہر ہوا کہ مدعا علیہ کی ایک قسم اس جاگیر کو اپنے قبضے میں لیا چاہتی ہے

[illegible] نہ جانتے تھے کہ اہرام القیش اینٹ پتھر کی دنیا سے دور اپنے خدا کی جنت کے تصور میں گم ہو چکے ہیں — قرنوں سے پھیلی ہوئی زمین حیاتِ ابدی سے جگمگاتی ہوئی جنت کے آگے ماند پڑ چکی ہے۔ ایک بندے نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کا جائز حق حاصل کرنے کے لئے اپنے خدا کا مقدس نام استعمال کرنا گوارا نہ کرے گا۔

"میں قسم نہیں کھاؤں گا — میں قسم نہیں کھاؤں گا — خواہ میری یہ جاگیر میرے ہاتھ سے جاتی رہے!"

یہ ماضی کی بات تھی مگر حال کیا ہے؟ — حال یہ ہے کہ ہم دنیا کے حقیر منافع حاصل کرنے کے لئے جھوٹی قسموں تک سے دریغ نہیں کرتے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں! جی ہاں ہم مسلمان ہیں!!

عارف سیالکوٹی

مقامِ صدیقؓ

قرآن حکیم نے تقرّبِ الٰہی کے جو چار مدارج مقرر کئے ہیں اُن میں سے افضل ترین مقام نبوت ہے اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اولاً یہ مقام اکتسابی نہیں اور ثانیاً رسولِ اکرم خاتم الانبیاء بھی ہیں نبی کے بعد صدیق کا درجہ ہی جو قربِ خداوندی، تقویٰ اور روحانیت کی مکمل حصول معراج ہے اور حضرت ابوبکر عبداللہ ابو قحافہ روحانی کی اسی آخری منزل تک پہنچ چکے تھے آپ کے متعلق کسی عارف کا یہ قول کسقدر مبنی بر حقیقت ہے کہ ع '

بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر

یقیناً خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس برگزیدہ اور مقدس ہستی کا دل سے احترام کرتے ہیں اور خوش نصیب تر ہیں وہ لوگ جو ان کو صدیقِ اکبر، خلیفۂ برحق اور ختم المرسلین کا صحیح جانشین جانتے ہیں صدیق کا معزز اور ممتاز لقب کسی خوشامد پسند بادشاہ یا قصیدہ گو شاعر کا عطا کردہ نہ تھا بلکہ رحمت اللعالمین فخرِ موجودات سرورِ کائنات محمد مصطفٰے ؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے بے مثال جذبِ ایمانی، بے نظیر راسخ الاعتقادی، بے پناہ جذبۂ ایثار اور استقامت کے پیشِ نظر انھیں صدیق کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا حضورِ پُر نور کی اس نوازش کا صاف مطلب یہ تھا کہ ابوبکر مجسمۂ تقویٰ، صدق و صفا، راست کرداری و راست بازی اور روحانیت کے آخری مقام پر فائز تھے جملہ اصحاب میں معزز ترین تھے اور آپ کے جائز وارث تھے رحمت اللعالمین نے نہیں بلکہ یوں کہیے کہ خود رب العالمین نے حضرت ابوبکر کو صدیقیت کے مقام پر سرفراز فرمایا تھا کیونکہ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کا ایمان ہے کہ رسول کا فرمودہ خدا کا فرمودہ اور رسول کا انتخاب خدا کا انتخاب ہوتا ہے پھر کسی [illegible] یا تنقید کی کیا مجال کسی

مادی طاقت کی کیا بساط کہ خدا کے فائز کردہ شخص کو اس کے اعلیٰ و ارفع مقام سے ہٹا دے ۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ نبی کریم کا فرمودہ پورا ہوا، اللہ کا انتخاب اٹل رہا، حق فی الحقیقت حق بن کر چمکا اور سرورِ کائنات کے وصال کے بعد قرآن کے مقرر کردہ مدارج کے مطابق صدیقِ اکبر ہی نبی کریم کے جانشین ہوئے۔

سرکارِ دو عالم بیت المقدس، ہفت افلاک اور عرشِ اعظم کی سیر کر کے واپس تشریف لے آئے ہیں اور دوسرے دن مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو شبِ اسریٰ کے واقعات بالتفصیل سُنا رہے ہیں اپنی نوع کے انوکھے واقعات بڑی دلچسپی اور تعجب سے سُنے جا رہے ہیں۔ حاضرین تصویرِ حیرت بنے ہوئے ہیں، عقل کچھ اور سوچ رہی ہے اور دل کچھ اور کہہ رہا ہے ذہن یقین و گمان کی آماجگاہ بنا ہوا ہے دماغ میں کبھی یقین کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں اور کبھی گمان اپنا رنگ جما لیتا ہے۔ ایک کشمکش کا عالم ہے، کشتیِ اعتقاد بیم و رجا کے طوفان میں ہچکولے کھا رہی ہے بڑی مشکل کا سامنا ہے بڑی کٹھن منزل ہے، بڑی سخت آزمائش ہے۔

حاضرین میں سے بعض کے خیالات متزلزل بھی ہو چکے ہیں ابوبکرؓ اس محفل میں موجود نہیں ہیں یہ واقعات کفار کے علم میں آجاتے ہیں، انھیں اسلام کو بدنام کرنے سرورِ کائنات کا مذاق اڑانے اور توحید پرستوں کو گمراہ کرنے کا ایک سنہری موقع ملجاتا ہے کفار اِن حیرت انگیز واقعاتِ معراج کو بڑی رنگ آمیزی سے بیان کر رہے ہیں لمبے چوڑے حاشیے چڑھا رہے ہیں فقرے چُست کر رہے ہیں کہ ابوجہل دوڑا دوڑا حضرت ابوبکرؓ کے پاس جاتا ہے اور اُن سے بڑے طنزیہ انداز میں کہتا ہے " ابوبکرؓ کچھ تم نے بھی سُنا، تمہارا دوست کیسی باتیں کر رہا ہے ... وہ کہتا ہے کہ میں کل رات روانہ ہوا اور بیت المقدس [illegible]

کر کے علی الصبح واپس مکہ پہنچگیا، کہو تمہارا ان باتوں کے متعلق کیا خیال ہے" یہ الفاظ کہہ کر وہ بڑے غور سے ابو بکرؓ کے چہرے کو دیکھنے لگتا ہے۔ آپ بڑے پُروقار انداز میں جواب دیتے ہیں اگر تم یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہے ہو تو سراسر غلط ہیں اور اگر فی الحقیقت یہ الفاظ رسولِ خدا نے فرمائے ہیں تو بالکل سچ ہیں۔" آپ نے مزید کہا" یہ تو ایک چھوٹی سی بات ہے میں تو ایک بہت بڑی بات پر ایمان رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جبریلِ امین ان کے پاس آسمانوں سے خدا کا پیام لے کر خود آتے ہیں... پھر بھلا میں اس بات پر کیوں تعجب کروں کہ حضورؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے۔"

حضرت ابو بکرؓ کے لئے فخر کائنات کا رات کے ایک قلیل حصے میں بیت المقدس، ہفت افلاک اور عرش اعظم تک جا کر واپس آجانا عین ممکن تھا کیونکہ اس آسمانی سفر کو پرکھنے اور سمجھنے کے لئے ایسی عقل اور ایسی نظر کی ضرورت تھی جو اُس فضا کو سمجھتی ہو اور جو اُس ماحول سے آشنا ہو۔ یہ ہے وہ اہم ترین واقعہ، یہ ہے وہ عظیم جذبہ، یہ ہے وہ عدیم المثال راسخ الاعتقادی یہ ہے وہ اظہارِ حقیقت اور یہ ہے وہ اعلان کلمۃ الحق جس نے آپ کو مقام صدیقیت تک پہنچا دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نہ صرف اس عجیب وغریب، حیرت انگیز اور بظاہر ناممکن واقعۂ معراج کے شاہد اول ہیں بلکہ صحیح معنوں میں پہلے مومن بھی ہیں۔

آپ کے قبول اسلام کا قصہ بھی عجیب ایمان پرور ہے اور اپنی مثال آپ ہے آنحضرت صلعم نے جب حکم خداوندی تحت اپنے مامور من اللہ ہونیکا اعلان کیا اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلایا تو کفار مکہ رسولِ کریم کے دشمن ہوگئے، مخالفت کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا۔ ان ناموافق حالات میں ابو بکرؓ ہی وہ پہلے بالغ، عاقل باخبر، سعید فطرت اور صاحب حیثیت شخص تھے جو اپنے بچپن کی ساتھی اور دوست پر ایمان لائے۔ ابو بکرؓ جب شام کے سفر سے واپس آئے تو سنا کہ اُن کے دوست محمدؐ نے رسول اللہ ہونیکا دعویٰ کیا ہے آپ شام کو اپنے دوست کے گھر گئے اور اُن سے پوچھا کہ کیا انھوں نے نبوت کا اعلان کیا ہے رسول اللہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ آپ نے کہا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی آپ نے نبی ہونیکا دعویٰ کیا ہے [illegible] مصطفےٰ نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے [illegible] سے آنحضرتؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یہ ہے مومن کی شان اور یہ ہے صدیق کا مقام کہ نہ کوئی سوال وجواب، نہ بحث وتمحیص، نہ جرح وتبصرہ۔ اِدھر پیغمبرِ خدا کی زبانِ حقیقت ترجمان سے بات نکلی سُنا اور اِدھر ایمان لے آئے۔

مکہ سے مدینے کی جانب ہجرت تاریخ اسلامی کا بڑا اہم انقلاب انگیز واقعہ ہے یہاں بھی آپ کو حضور پرنور کے رفیق طریق ہونیکا فخر حاصل رہا ہے غار ثور میں بھی آپ رسولِ اکرم کے ہمراہ تھے اسی غار میں آپ کے زانوؤں کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ شافع روز جزا ان پر اپنا مقدس سر رکھکر استراحت فرماتے رہے اسی غایت درجہ ایثار اور بے حد جذبۂ رفاقت کی وجہ سے آپ کو یارِ غار بھی کہا جاتا ہے جہاں تک ایثار اور قربانی کا تعلق ہے آپ اس نقطۂ عروج تک پہنچ چکے تھے کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابی بھی آپ پر رشک کرتے تھے غزوۂ تبوک کے موقع پر ختم المرسلین نے مالی امداد طلب فرمائی اور حضرت عمر فاروقؓ اسی جذبۂ رشک کے تحت اپنا نصف اثاثہ لے آئے انھیں یقین تھا کہ وہ اس مرتبہ سبقت لے جائینگے لیکن وہ یہ دیکھکر حیران رہ گئے کہ صدیق اکبرؓ پہلے سے موجود تھے اور آپ نے گھر کا تمام اثاثہ فخر دو عالم کے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا۔ رحمت اللعالمین نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو۔ اُس مجسمۂ ایثار نے جواب دیا کہ ابو بکرؓ اور اس کے گھر والوں کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کا نام ہی کافی ہے

پروانے کو چراغ، عنادل کو پھول بس
صدیق کو خدا و خدا کا رسول بس

یہ ہے ایثار و قربانی کا وہ بلند ترین مقام جہاں صدیق اکبرؓ پہنچ چکے تھے اور یہ ہے وہ عشق رسول کا جذبہ جس کی مثال محال ہے، صدیقؓ کے مرتبے کے کیا کہنے۔ صدیق تو دراصل فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول ہوتا ہے

جنگ بدر کو اسلامی تاریخ میں ایک [illegible] خصوصیت حاصل ہے یہی ہے وہ پہلا معرکۂ حق و باطل [illegible]

قلیل التعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود توحید پرستوں نے کفار کی کثیر التعداد، بہترین آلاتِ حرب و ضرب سے آراستہ اور باسر و سامان افواج پر شاندار فتح پائی۔ اسی معرکۂ حق و باطل کی ایک رات کا ذکر ہے کہ ابوبکرؓ آنحضرت صلعم کے عریش کی نگرانی کر رہے تھے آدھی رات کے وقت نبی کریم رب ذوالجلال کے حضور با چشمِ تر عرض کر رہے تھے کہ "اے مالک کل ہماری مدد فرما۔ ہمارے حال پر رحم کر۔ جو کچھ بن پڑا ہے تیرے حضور میں پیش کر دیا ہے اے اللہ اگر توحید پرستوں کی یہ مختصر سی جماعت بھی ختم ہو گئی تو پھر صفحۂ ہستی پر تیری مکمل بندگی اور تیری غلامی کا نظام ہرگز قائم نہ ہو سکیگا" صدیق اکبر سے یہ عالم نہ دیکھا گیا، عریش میں داخل ہوئے اور حضور کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "یا رسول اللہ آپ مطمئن رہیں اللہ نے آپ کو فتح و نصرت کا وعدہ دیا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کریگا" یہ ہے صدق و صفا کا وہ بلند مرتبہ اور رفاقت و حمایت کا وہ ارفع جذبہ کہ جب جنگ بدر کے نازک ترین حالات میں ہادیٔ دو عالم نہایت عاجزی اور بے قراری سے بارگاہِ خداوندی میں فتح و نصرت کے لئے مصروفِ دعا تھے تو ایک طرف خود خدا اپنے حبیب کو وحی کے ذریعہ فتح و کامرانی کی بشارت دے رہا تھا اور دوسری طرف آپ کے یارِ غار حضرت صدیق اکبر وحی الٰہی کی تائید میں نصرت و کامرانی کا یقین دلانے میں مصروف تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ہر جنگ میں شریک ہوئے باطل کے مقابلے میں ہمیشہ سینہ تان کر میدان میں نکلے اور ہر موقع پر شجاعت کے جوہر دکھائے تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ آپ کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہیں ہوئی آپ کی عمر کا بیشتر حصہ رسول مقبول کی صحبت میں گزرا۔ آپ نے ہادیٔ برحق سے بہترین استفادہ کیا عقل و دانش کے موتی چنے، علم کی باتیں سیکھیں، مسئلے سمجھے، دقیق مسائل کے حل پوچھے، قرآن کے معارف پر غور کیا۔ حضور کا اشارہ پا کر مشورے دیئے بہت کچھ دیکھا بہت کچھ پوچھا، بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سمجھا۔ سرکار دو عالم کی علالت کے دوران امامت کے فرائض بھی سر انجام دیئے یہ تمام واقعات صاف صاف بتا رہے ہیں کہ قدرت کا منشا اپنی لطیف حکمتوں کے تحت آپ کو کسی عظیم [illegible] کے لئے تیار کر رہی تھی۔

رسول اللہ کے وصال کی خبر سنتے ہی باطل پرستوں کے [illegible] ایک کرگدی سی اٹھی، حق دشمنوں کے خوابیدہ جرائم انگڑائیاں لینے لگے اور وہ اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنے اور سازشوں کے جال بچھانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ادھر شدتِ غم سے جاں نثارانِ رسول کا حال ابتر تھا وفورِ محبت کے بے پناہ اثر کے تحت بعض جلیل القدر صحابی، جن میں حضرت عمرؓ جیسی پُرعزم شخصیت بھی شامل تھی۔ خاتم الانبیاء کی وفات کو امر ناممکن سمجھتے تھے اور یہ باور کرنے کو تیار ہی نہ تھے کہ محمد مصطفےٰ صلعم بھی انتقال فرما سکتے ہیں ان نازک ہوتے حالات میں نبی کے بعد افضل ترین بشر نے امتِ محمدیہ کی صحیح راہ نمائی کی، نظم کو بحال رکھا، اتحاد کا دامن تار تار نہ ہونے دیا ملت کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا اور باطل کی امید پر پانی پھیر دیا۔

دنیا کے آخری نبیؐ پر نازل شدہ آخری دین، مکمل شریعت اور کامل ضابطۂ حیات کو دنیا کے افضل ترین صدیق اور اسلام کے پہلے خلیفہ نے عالم کے گوشے گوشے میں عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، تبلیغ دین کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ خلیفۃ المسلمین امیر المومنین حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اکبرؓ ہر مشکل پر قابو پانے، ہر گتھی کو سلجھانے، جھوٹے نبیوں کو شکست دینے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے زعم خودسری کو مٹانے، اور باطل کی سرکوبی کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ان حالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تائید ایزدی آپ کے ساتھ تھی، اللہ کی رحمت آپ کے شریکِ حال تھی، فرشتے آپ کی حمایت پر مامور تھے۔ اور آپ خدا کے نزدیک واقعی صدیق اور ختم المرسلین کے جائز وارث تھے آپ کی خلافت، خلافتِ راشدہ تھی،

مسلمانوں کا تیسرا الیکشن

(از ملّا واحدی)

انگریز قوم اپنے بادشاہ کے مرنے کا اعلان ان الفاظ میں کیا کرتی ہے King is dead, Long live the King گویا بادشاہ کے مرنے اور نئے بادشاہ کے تخت نشین ہونے کا اعلان ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یہ بات انگریزوں نے ہم سے سیکھی ہے۔ ہم نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفات پاتے ہی حضور کے خلیفہ اور امیر المومنین کا انتخاب کر لیا تھا۔

کسی قوم کی اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہے کہ اس کا کوئی سردھرا نہ ہو اور اُسے بے مہار چھوڑ دیا جائے۔ قوم کے سردھرے کا انتخاب پیغمبرؐ کی تدفین پر مقدم ہے۔

خیر مسلمانوں کا پہلا الیکشن تو یہی تھا جو اتنی اہمیت کے ساتھ ظہور میں آیا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکثریت سے نہیں، سب نے بالاتفاق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ قدرے متامل تھے۔ مگر چند دن بعد ہم نے دیکھا کہ حضرت علیؓ خلافت صدیقی میں مجلس شوریٰ کے ایک معتبر رکن ہیں۔

دوسرا الیکشن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مرض الموت میں رحلت سے ذرا قبل وصیت نامہ لکھوانا شروع کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بولتے جاتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ لکھتے جاتے تھے۔ خلافت کے لئے نام تجویز کرتے کرتے حضرت ابوبکرؓ کو غش آگیا۔ غشی ختم ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمان سے پوچھا کہ کہاں تک لکھ چکے ہیں آپ "حضرت عثمان نے ادھورے فقرے کو پورا کر رکھا تھا اور حضرت عمرؓ کا نام لکھ لیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تکبیر کہی اور فرمایا۔ آپ نے میرے دل کی بات لکھی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ ہم خیال ہیں۔

یہ تجویز حضرت ابوبکر کے سامنے ہی صحابہ میں پھیل گئی۔ اس پر غور ہوا۔ حضرت عمرؓ کی سخت مزاجی کا چرچا رہا۔ مگر بالآخر انھیں قبول کر لیا گیا۔ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے انتخاب کے پہلے دن سے مؤید تھے اور حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو اتنی مدد دی کہ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے (لولا علیؓ لھلک عمر) علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

خود حضرت علیؓ نے ایک دفعہ کہا کہ ابوبکر و عمر کی خلافت کامیاب تھی۔ کیونکہ ہم ان کے مشیر تھے اور میرے زمانے میں انتشار ہے۔ مجھے اچھے مشیر میسر نہیں ہیں۔

تیسرا الیکشن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے الیکشنوں کی سادگی اور سبھاؤ کا تو جواب محال ہے۔ دونوں الیکشنوں کا طریقہ مسلمانوں کے نکاح کی طرح سادہ تھا۔ لیکن تیسرا الیکشن بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ اسے میں ذرا مفصل بیان کرتا ہوں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا ایک غلام تھا۔ پارسی نسل سے۔ فیروز اس کا نام تھا۔ فیروز نے حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ مغیرہ کہتے ہیں دو درہم روز کما کر دیا کرو۔ دو درہم زیادہ ہیں آپ کم کرا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فیروز سے پوچھا تم کیا کام جانتے ہو۔ فیروز نے جواب دیا۔ بہت سے کام۔ رودگری۔ نقاشی۔ آہن گری۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جسے اتنے کام آتے ہوں اُسے دو درہم کمانے مشکل نہیں۔ تمہارا مقدمہ خارج۔

فیروز حضرت عمرؓ سے بگڑ گیا۔ حضرت عمر نماز پڑھا رہے تھے۔ فیروز نے اس حالت میں ان پر حملہ کیا اور تابڑ توڑ چھ وار کئے اور کئی زخم لگائے

زخم مہلک تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو بلایا اور فرمایا کہ عثمان۔ علی۔ زبیر ابن العوام۔ سعد ابن ابی وقاص اور ابن عبدالرحمٰن پانچ شخص میرے نزدیک خلافت کے اہل ہیں۔ تم کوشش کر کے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرا دو۔

حضرت طلحہ ابن عبدالرحمٰن دارالخلافے میں موجود نہیں تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف چار حضرات کو حضرت عمرؓ کے ہاں لے آئے۔ حضرت عمر نے چاروں سے کہا "میرا ایسا خیال ہے۔ تم آپس میں فیصلہ کر لو۔ عبدالرحمٰن ابن عوف فیصلہ کرانے میں تمہارے مشیر رہیں گے۔ تین دن کے اندر اندر فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ اور سنو۔ جو خلیفہ منتخب ہو جائے وہ انصار کا ضرور لحاظ رکھے۔ انصار نے آڑے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی دل جوئی لازم ہے۔ نیز خلیفہ غیر مسلموں کی حفاظت کرنی نہ بھولے۔ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے غیر مسلموں سے کئے ہیں اُنھیں نباہنا ہے۔ اور علی! خلافت تمہیں ملے تو بنی ہاشم کو فوقیت مت دینا۔ اور عثمان! خلافت تمہیں ملے تو بنو امیہ کو فوقیت مت دینا۔ زبیر اور سعد تمہارے لئے بھی یہی وصیت ہے۔ سب کے حقوق کا یکساں دھیان رہنا چاہیئے۔ سب کو برابر سمجھنا چاہیئے"

اور لوگ بھی حاضر تھے۔ ان میں سے ایک صاحب بولے۔ آپ خود انتخاب کر دیتے تو اچھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ ابو عبیدہ ابن الجراح زندہ ہوتے تو میں تنہا ان کی تحریک کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابو عبیدہ سالم ہیں اور اللہ کی محبت میں پختہ۔ مگر علی، عثمان، زبیر، طلحہ اور سعد میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی دشوار ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔ عبداللہ ابن عمر کو خلیفہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ خاموش۔ تم نے یہ بات للّٰہیت سے نہیں کہی ہے۔ مجھے خوش کرنے کی غرض سے کہی ہے۔ عبداللہ مسلمانوں کے فیصلے کیا کرے گا۔ وہ بیوی کو طلاق دینے میں تو صحیح فیصلہ کر نہیں سکا۔

تیسرے صاحب نے عرض کیا۔ سعد ابن زید بھی ان پانچ کے ساتھ شامل کر لئے جائیں۔ سعد ابن زید حضرت عمرؓ کے ہم قبیلہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "بنی عدی کا ایک آدمی کافی ہے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ جواب دہی کا مرحلہ کیسے طے کروں گا۔ بنی عدی کے دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر علی۔ عثمان، زبیر اور سعد کے مقابلے کا آدمی بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔ علی اور عثمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا میں ہیں۔ زبیر بھی چچا زاد بھائی ہیں۔ طلحہ کو رسول اللہ نے طلحۃ الخیر فرمایا ہے۔ خیر جسے انتخاب کر لیا جائے اس کی مخالفت ہرگز نہ کی جائے۔ جو مخالفت پر اڑے اسے قتل کر دیا جائے"

حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ سے کہا "تم مشورے میں شریک رہو صرف مشورے اور رائے زنی کا حق تمہیں دیا جاتا ہے"

حضرت مقداد ابن اسود سے فرمایا۔ "تمہیں مشورہ کرنے والوں کا نگراں مقرر کرتا ہوں" حضرت صہیب سے فرمایا "خلافت کے طے ہونے تک تم نمازوں میں امامت کرو" حضرت طلحہ انصاری سے فرمایا "پچاس انصار لے کر بیت المال کا پہرہ دو"

اس کے بعد متعلقہ حضرات ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں بیٹھ گئے۔ غیر متعلق حضرات کو رخصت کر دیا گیا۔

تمام دن گفتگو جاری رہی لیکن نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دوسرا دن بھی یوں ہی گذرا۔ تیسرے دن حضرت مقداد (انتخاب کے نگراں) نے کہا "آج میں جلسہ بند نہیں کروں گا اور فیصلہ کئے بغیر نہیں اُٹھنے دوں گا"

تیسرا دن قریب الختم تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے فرمایا "اب فیصلے کی صورت یہ ہے کہ جو میں فیصلہ کروں اُسے مان لیا جائے" سب نے کہا۔ ٹھیک ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف الگ حجرے میں چلے گئے اور وہاں حضرت علی کو طلب کیا اور کہا۔ تم بنی ہاشم کے سردار ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہو تاہم تھوڑی دیر کے واسطے میں فرض کرتا ہوں کہ تم مستحقین خلافت کی فہرست میں نہیں رہے۔ اب بتاؤ تمہارے نزدیک باقیوں میں خلافت کا مستحق کون ہے۔ حضرت علی نے فرمایا "عثمان"

حضرت علی سے گفتگو ختم کر کے حضرت عثمان کو بلایا گیا اور اُن سے پوچھا گیا کہ تمہیں اگر خلیفہ نہ بنایا جائے تو پھر کسے خلافت کا حق دار قرار دیجیئے۔ اُنھوں نے فرمایا "علی کو"

حضرت زبیر اور حضرت سعد سے بھی اسی طرح سوال و جواب ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے حق میں رائے دی۔
حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف حجرے سے نکل آئے اور اعلان کر دیا کہ بس علی اور عثمان میں سے ایک کو چننا رہ گیا ہے۔ رات بھر مہلت دیجئے ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔

صبح حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے حضرت زبیر اور حضرت سعد سے فرمایا۔ آج فیصلہ کرنا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرے ذمے کوئی بات رہ جائے سوچ لو۔ اُنھوں نے پہلے حضرت عثمان کے حق میں رائے دی تھی مگر اس وقت کہا کہ علی مناسب ہیں۔

حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے جلسۂ عام میں تمام حالات بیان کر دیئے اور جتنی کارروائی تین دن میں ہوئی تھی وہ سنا دی۔ حضرت عمار یاسر رضی نے کہا حضرت علی رض سے بیعت کرنی چاہیئے۔ حضرت مقداد نے تائید کی۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کھڑے ہو گئے اور حضرت علی کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر اور بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ کر بولے :۔ علی عہد کرو کہ میں خلافت کے فرائض اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق انجام دوں گا اور ابوبکر و عمر کے نقش قدم پر چلوں گا۔ حضرت علی رض نے کہا میں اللہ سے مدد مانگوں گا کہ مجھے ایسا کرنے کی توفیق عطا کرے میں دعوے کے ساتھ عہد نہیں کر سکتا حتی المقدور کوشش کروں گا"۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے کہا عزم کی کمی ہے اور حضرت عثمان سے بلا کر ان سے اقرار طلب کیا حضرت عثمان نے صاف الفاظ میں اقرار کر لیا۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے ان سے بیعت کر لی۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بعد حضرت علی نے بیعت کی۔ حضرت علی کا بیعت کرنا تھا کہ مجمع بیعت کے لئے ٹوٹ پڑا۔

ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا۔ ابتداءً حضرت عمر نے حضرت عبدالرحمن ابن عوف کو بھی مستحقین خلافت میں رکھا تھا۔ مگر انھیں تامل ہوا۔ لہٰذا انتخاب کی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمن ابن عوف فہرست میں شامل رہے اور حضرت طلحہ بھی موجود تھے یا آ گئے تھے۔ حضرت عمر کا تو انتقال ہو چکا تھا حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے فرمایا کہ چھ کے تین کر دیئے جائیں تو فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ حضرت زبیر نے کہا میں دستبردار ہوتا ہوں اور علی مرتضیٰ کو پیش کرتا ہوں۔ حضرت طلحہ نے کہا میں دست بردار ہوتا ہوں اور عثمان کو پیش کرتا ہوں۔ حضرت سعد نے کہا میں دستبردار ہوتا ہوں اور عبدالرحمٰن ابن عوف کو پیش کرتا ہوں۔ چھ کے تین رہ گئے تب حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے کہا میں بھی دست بردار ہوتا ہوں بس علی یا عثمان کو خلیفہ بنایا جائے گا۔

یہ الفاظ مولانا عبدالماجد دریابادی "نفس جیسے اس زمانے میں اس قوم کے اندر رہ ہی نہیں گیا تھا۔ اس درجہ بے نفسی، خود فنائی، آخر کس چیز کا نتیجہ تھی؟ کیا ارسطو کی سیاسیات اور افلاطون کی جمہوریت چاٹ جانے کی؟ ان بیچاروں نے تو ان شاندار کتابوں کا نام بھی نہ سنا ہو گا ——— نتیجہ صرف اس کا تھا کہ اپنی عبدیت اور آخرت کا استحضار ایک زندہ حقیقت تھی۔

ثمرات کا ظہور کل جو کچھ ہونا ہے اُسے چھوڑ یئے۔ دنیا، اس مادی دنیا کی تسخیر اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ کس قوم نے کی ہے!"[1]

[1] ہمارے علم کی حد تک صحیح واقعات یوں ہیں کہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کو نامزد کیا تھا۔ عثمان رض۔ علی رض۔ زبیر رض۔ سعد رض۔ طلحہ رض بن عبید اللہ (طلحہ ابن عبدالرحمٰن نہیں) اور عبدالرحمٰن بن عوف (ابن عبدالرحمٰن نہیں) مقداد بن اسود کو ان حضرات کے اجتماع کا منصرم بنایا تھا۔ انھوں نے طلحہ کے علاوہ کہ وہ باہر گئے ہوئے تھے۔ باقی پانچ کو، مسور بن مخرمہ کے مکان میں جمع کیا۔ پھر عبدالرحمٰن بن عوف خود ہی اپنے حق خلافت سے دست بردار ہو کر شرکا کی رضامندی سے حَکَم بن گئے تھے (تجلی)

اصحابِ رسولؐ

انسان کے فرائض میں سب سے مقدم اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ اخلاق انسان کی اصلاح، اور نفوس بشری کی تہذیب وتک جائے۔ علوم وفنون، تہذیب وتمدن، صنعت وحرفت، غرض وہ تمام چیزیں جو ہمیشہ سے دنیا کا سرمایۂ ناز رہی ہیں، آسمان کی ہزا گردشوں اور زمانہ کے ہزاروں انقلابات کے بعد عالم وجود میں آئیں لیکن تہذیب نفوس انسانی کا فرض، اس قدر ضروری تھا کہ جب پہلا انسان آدمؑ دنیا میں آیا تو اس کی ذمہ داریوں سے گرانبار ہوکر آیا۔ حضرت آدمؑ کے بعد اس سلسلہ کو زیادہ ترقی ہوئی اور بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوئے۔ لیکن ان سب فضائل ومناقب کا مجموعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تھی۔ جہاں پہنچکر یہ سلسلہ ابدالآباد کے لئے مکمل گیا، اور وحیٔ الٰہی نے یہ مژدہ سنایا:۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس برگزیدہ اصفیا اور عصارۂ انبیاء یعنی سرورِ کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدس فرض کو کس وسعت اور کس جامعیت کے ساتھ ادا کیا؟ اور نفوس بشریہ کو تہذیبِ اخلاق کے کس ذروۂ کمال تک پہنچایا۔ تو اس کا جواب ہمیں اسلام کے ان مقدس بزرگوں کے متعلق اخلاق کی خاموش زبان سے دینا ہوگا، جو آپ کے اخلاق واعمال کے مظہرِ اتم، آپ کی تعلیم وتربیت کی مثال ہیں۔ آپ کی ہدایت وارشاد کے مخاطب اول، اور آپ کے فیضِ صحبت سے شب وروز بہرہ اندوز تھے۔

اصحابہ کرام کی اس مقدس جماعت کی نشو ونما بھی دنیا کے حیرت انگیز واقعات کی ایک عجیب وغریب مثال ہے، اول اول جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو عقائد واعمال کی اصلاح کی دعوت دی تو ریگستان عرب کے ایک ذرہ نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ لیکن صداقت، اثر اور تربیت پذیری کے جوہر نے چند ہی دنوں میں آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں غرض ہر طرف ان بزرگوں کی قطاریں کھڑی کردیں۔ جن کے وجود سے دعوتِ نوح، بعثتِ موسیٰ اور بعثت عیسیٰؑ کی تاریخ اکثر خالی ہے، ابتدا میں اُن بزرگوں کا نام انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا، ہجرت کے زمانہ تک ان میں معتد بہ اضافہ ہوا اور غزوۂ بدر کی صف میں تین سو تیرہ سرفروش تیغ بکف نظر آئے۔ فتح مکہ میں یہ تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ حجۃ الوداع میں تیرہ ہزار صحابہ آپؐ کے جلو میں روانہ ہوئے، لیکن جب آپ نے انتقال فرمایا تو یہ تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی۔

دریائے حق کے جزر ومد کا کتنا عجیب وغریب منظر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام مدتوں توحید کا غلغلہ بلند کرتے رہے۔ ان کے سایہ کے کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انصار واعوان کی جستجو میں "من انصاری الی اللہ" کا نعرہ لگایا۔ لیکن چند حواریوں کے سوا کسی نے ان کی حمایت نہ کی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو چھوڑا تو اس آفتاب وعالمتاب کے نور سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ روشن تھا، لیکن:۔

"دوسرے پیغمبروں پر آپ کو صرف یہی فضیلت حاصل نہیں ہے کہ آپ کے اصحاب کی تعداد اکثر پیغمبروں کے اصحاب سے زیادہ ہے بلکہ آپ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ کے نور ہدایت نے جن ذروں کو روشن کردیا تھا، وہ اب تک آب وتاب سے چمک رہے ہیں اور گم گشتگانِ راہ انہیں ستاروں کی روشنی میں "اصحابی کالنجوم" اپنی منزل مقصود کا پتہ

پیے ہیں۔ اگر ہم شناوران طوفانِ نوح کے حالات کا پتہ لگانا چاہیں تو ناکامی کے سوا ہم کو کیا ملے گا! اگر ہم معتکفانِ وادی کے اخلاق و عادات سے واقف ہونا چاہیں تو خاک بیزی کے سوا کیا حاصل ہوگا! اگر ہم حوارییّنِ عیسٰی کے سوانح تلاش کریں تو غیر مرئی نقوش کے سوا ہم کو تاریخ کے صفحوں میں کیا نظر آئے گا، لیکن اصحابِ محمدؐ کے ایک ایک خط و خال کو ہم تاریخ کے مُرقع میں دیکھ سکتے ہیں، اور اس مُرقع کو مذہبی، علمی، سیاسی، اخلاقی غرض ہر حیثیت سے دُنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں!

(اسوۂ صحابہ حصۂ اول)

بصائر و حِکَم

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ :- خلوت و جلوت میں خدا کا خوف رکھو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لئے ایک ایسی سبیل اور اس کے رزق بلکہ ایسا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے، جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آسکتا، جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس کا اجر دو بالا کر دیتا ہے بے شک بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے۔ تم خدا کی ایسی راہ میں ہو جس میں افراط تفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ :- صاحبو! میرے اوپر تمہارے متعدد حقوق ہیں، جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہئیے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مالِ غنیمت بیجا طور پر جمع نہ کیا جائے۔ ایک یہ کہ وہ میرے ہاتھ سے بیجا طور پر صرف نہ ہونے پائے۔ ایک یہ کہ تمہارے روزینے بڑھاؤں تمہاری سرحدیں محفوظ رکھوں۔ اور یہ کہ تم کو خطرہ میں نہ ڈالوں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ :- لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے محبت رکھتا ہوں، اور اُن کے ساتھ فیاضی کرتا ہوں، لیکن میری محبت نے مجھے ظلم کی طرف مائل نہیں کیا ہے۔ بلکہ بس صرف اُن کے واجبی حقوق ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح فیاضی بھی اپنے ہی مال تک محدود ہے، مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی دوسرے کے لئے! خدا کی قسم میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی بار ایسا نہیں ڈالا ہے کہ اس قسم کا الزام دینا جائز ہو اور جو کچھ وصول ہوا۔ وہ انہی کے لوگوں کے رفاہ و بہبود پر صرف ہوا ہے، میرے پاس خمس آیا، اور اس میں سے بھی میرے لئے کچھ لینا جائز نہیں، مسلمانوں نے اس کو میرے مشورے کے بغیر مستحقین میں صرف کیا۔ خدا کے مال میں ایک پیسہ کا تصرف بھی نہیں کیا جاتا۔ میں اس سے کچھ نہیں لیتا ہوں۔ یہاں تک کہ کھاتا بھی ہوں تو اپنے مال سے!

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ :- جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، جس نے اس کو چھوڑا خدا اسے ذلت کا لباس پہناتا ہے اور رُسوائی کو شاملِ حال کرتا ہے، اور ذلت کا مزہ چکھایا جاتا ہے ——— لوگوں سے وہی کہو جسے وہ سمجھ سکتے ہوں۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ خدا یا خدا کا رسولؐ جھٹلایا جائے ——— اگر دینی مسائل کا انحصار محض رائے پر ہوتا تو تلوے اوپر کے پاؤں سے زیادہ مسح کے مستحق ہوتے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کی پشتِ پا پر مسح فرمایا (یعنی اسی کی اتباع کرنی چاہئیے)

مستقل عنوان — ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

تانگہ کہ ہم سوختہ سامانوں کا چہار نفری قافلہ گھر کی طرف چلا تو کم سے کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے خود اپنے ہی جنازے کے ساتھ قبرستان تشریف لیجا رہا ہوں۔ رضیہ رہ رہ کر ہنس رہی تھی کیونکہ اسے کسی طرح کا خوف نہیں تھا، بلکہ ناکام واپسی پر طرارہ اور غم تھا۔ فتو اگلی سیٹ پر اکڑوں بیٹھا ہوا اُلووں کی طرح دیدے نچا رہا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ دکانوں اور شاہراہوں پر جلتے ہوئے برقی قمقموں کا منظر بھی بائیسکوپ ہی کا کوئی حصّہ ہے۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسا استعجاب اور احمقوں جیسی طمانیت تھی۔ بیگم شاید آیۃ الکرسی کا ورد کر رہی تھیں۔

"کہیئے جناب کیا کہیں گی چل کے بھیّا سے؟"

میں نے سوال کیا۔ وہ بھنّا گئیں۔

"میں ہی کیوں کہوں گی۔ آپ ہی پہلے کہیئے گا۔"

"مجھے اس کے سوا کیا کہنا ہے کہ مُردہ بدست زندہ لے جایا گیا تھا۔ کیا آپ اس سے مکر جائینگی کہ الجمعیۃ کے حوالے سے "گنگا جمنا" دیکھنے کا جواز آپ ہی نے نکالا تھا؟"

"میں ضرور مکر دوں گی۔ مجھ کمبخت کو کیا خبر تھی کہ بھیّا آج ہی لوٹ پڑیں گے۔"

"بہت اچھے۔ سیدھی جنت میں جانے کی یہ ترکیب بہت اچھی ہے کہ بھیا کے ہاتھوں شوہر کو پٹوا دیا جائے۔"

"اجی آپ تو کسی نہ کسی طرح نپٹ ہی لیں گے۔ مجھے وہ ہرگز معاف نہیں کریں گے۔"

"حد کرتی ہو — اگر انھوں نے نوکری سے الگ کر دیا پھر؟"

"کیوں کرتے بس ذرا بُرا بھلا کہہ لیں گے۔"

"تو گویا میں کان پکڑ کے تسلیم کر لوں کہ آپ کی بہن کو زبردستی فلم دکھانے لے گیا تھا۔"

"نہ جبر و زبردستی تو وہ کبھی باور نہیں کریں گے۔ آپ بس اتنا مان لیجئے گا کہ میں نے ہی اصرار کیا تھا۔ الجمعیۃ کا حوالہ بھی آپ ہی دیجئے گا۔"

رضیہ کا گھر غریب خانے کی پشت پر گلی میں تھا۔ تانگہ یہاں پہنچا تو میں نے فتو کو رضیہ کے ساتھ کر دیا کہ اسے گھر چھوڑ آئے اور اب میرے جی میں آئی کہ بیگم کو گھر کے دروازے پر چھوڑ کر کہیں رفوچکر ہو جاؤں۔ ایڈیٹر تجلی کے غیظ و غضب کا سارا ابال بہن ہی پر چھٹ لے تو بعد میں میرا نبٹنا آسان ہو جائے گا۔

لیکن تانگہ ابھی ڈیوڑھی پر ٹھیک طرح رُکا بھی نہیں تھا کہ بیگم بولیں:-

"خدا کے لئے جلدی سے اُتریئے۔"

"تم اُتر جاؤ۔ مجھے تو ایک بڑا ضروری کام یاد آگیا ہے اسی تانگے سے واپس جاؤں گا۔"

"ہائے اللہ جان نہ جلائیے۔ چلئے اُتریئے۔"

میں اُتر تو گیا لیکن دل کی دھڑکنیں اب دس سے ضرب کھا کر کھوپڑی میں ٹھوکریں مارنے لگی تھیں۔

ایڈیٹر تجلی سے میں اس قدر کیوں ڈرتا ہوں یہ بیہودہ بات
آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔ ستارے گواہ ہیں
کہ بارہا میں نصف رات کے سناٹے میں گھنے جنگلوں میں
مارا مارا پھرا ہوں۔ زمانہ تھا جب صوفی تسکین علی کے
بتائے ہوئے ایک وظیفے کے سلسلہ میں ویرانے کے
ایک تالاب میں نصف شب کو گلے گلے پانی میں کھڑا
ہونا پڑا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اجمیر اور کلیر کے علاقوں
میں کتنی بار میں نے صوفیاء اور ان کے پہلوان حواریوں
سے تن تنہا چھیڑ چھاڑ کیا ہے۔ ڈر کس چڑیا کا نام ہے یہ میرے
فرشتے بھی نہیں جانتے لیکن یہ ایڈیٹر تجلی خدا جانے کس
دنیا کی مخلوق ہے کہ اس کے سامنے پہنچ کر میں اپنے آپکو
بکری کی اولاد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ بارہا میں نے اپنے
آپ کو للکارا ہے کہ ارے بزدل نابکار۔ ایڈیٹر تجلی بھی
تو آدمی ہی ہے دیو یا جن نہیں ہے۔ تجھ سے تو رشتے میں
بھی چھوٹا ہے۔ تجھ پر لعنت ہے کہ ایک مشت خاک سے
اس قدر لرزاں و ترساں وغیرہ وغیرہ۔

مگر لاحاصل۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی سارے دم دلاسے
معدے کی تہہ میں جا بیٹھتے ہیں اور دل حلق میں دھڑکتا
ہوا محسوس ہوتا ہے۔

"آپ ذرا دیکھئے تو بھیا کیا کر رہے ہیں۔" بیگم نے
دبی دبی سہمی سہمی آواز میں کہا۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ
گھر میں پہلے میں ہی داخل ہوں۔

"یہ نیک کام تم ہی جو کرو۔" میں نے جواب دیا۔

"میری تو جان نکل رہی ہے۔"

"میری نکل بھی چکی ہے۔"

پھر ہم دونوں نے کواڑ کی درزوں سے اندر جھانکا۔
صحن میں راڈ کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے
کی صحنچی میں ایڈیٹر تجلی کرسی پر براجمان تھے اور ہاتھ
میں کوئی اخبار تھا۔ ہو سکتا ہے پہلے وہ اسے پڑھتے ہی
رہے ہوں، لیکن اب تو ان کی نظریں کہیں اور تھیں اور
اخبار ایک بے مصرف کھلونے کی طرح انگلیوں میں الجھا
ہوا تھا۔ میرے دل کی اسپیڈ تقریباً بیس میل فی سکنڈ
کے حساب سے تیز ہو گئی۔

"بہت غصے میں ہیں۔" میرے منھ سے نکلا۔

"ہوں.... تو بتائیے نا کیا کرنا چاہئے۔" بیگم نے
کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"کیا کرنا چاہئے.... میرا خیال ہے ہمیں ڈرنے
کی کوئی ضرورت نہیں۔ پارلیمنٹری سطح پر گفتگو کرنی چاہئے۔"

"خدا کے لئے اس وقت تو سنجیدہ رہئے۔"

"سنجیدگی اگر کسی مرض کا علاج ہے تو لیجئے میں
سنجیدہ ہو گیا۔ اب آپ بتائیے کیا تجویز ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" وہ روہانسو ہو کر بولیں

"جو استدلال آپ نے سینما چلتے وقت پیش کیا تھا اگر
وہی دہرا دیں تو کیا حرج ہے؟"

"جھاڑو پھر جائے استدلال پر.... میری تو مت
ماری گئی تھی۔"

آخر کار ایک تجویز میرے ذہن میں آئی۔

"دیکھئے جناب ایک ہی علاج ہے۔ بزرگوں نے
کہا ہے ایک چپ سو کو ہرائے ــ بس اندر چلو اور چپ
سادھ لو۔ بھیا کچھ بھی کہیں ہونٹ بھینچے سنتی رہو۔ اسکے
علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

اتنے میں فتو آ گیا اور ہمیں ڈیوڑھی میں موجود
پا کر چہکا:-

"اجی میاں کواڑ تو ویسے ہی بھڑے ہیں۔ دھکا دیکر
کھول لیجئے۔"

اس کی کڑاکے دار آواز توپ کا گولہ بن کر ہم ناکردہ
گناہوں پر پھٹی۔ ظاہر ہے ایڈیٹر تجلی نے سن ہی لی ہو گی،
فوراً ہی ان کے جوتوں کی کھٹ کھٹ دروازے کی
سمت بڑھتی محسوس ہوئی۔

"باپ رے...." میں ہڑبڑا کے پیچھے ہٹا۔

پھر پانچ منٹ بعد ہم صحنچی میں ایڈیٹر تجلی کے سامنے
مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

"کہاں گئے تھے ؟" وہ میری طرف دیکھ کر دہاڑے
جی میں آئی کہدوں تنہا میں ہی تو نہیں گیا تھا اپنی بہن ہی سے پوچھئے نا کہاں گئی تھیں۔ لیکن قرارداد مکمل خاموشی کی تھی اس لئے میں نے اس طرح بیگم کی طرف دیکھا جیسے سوال کا تعلق تنہا انھی کی ذات سے رہا ہو۔

"اُدھر کیا دیکھتے ہو" وہ غرّائے "میں تم سے پوچھ رہا ہوں"

میں ہونٹوں کو زور سے بھینچے زمین کی طرف اس انداز سے تکتا رہا گویا جواب زمین ہی سے اُگنا ہے۔ بیگم بھی گم صُم رہیں مگر دبی دبی ہچکیوں کی آواز ضرور آئی وہ غالباً رونے کے لئے اسٹارٹ لے چکی تھیں۔

"زبانیں کیوں گنگ ہو گئیں۔۔۔ نسیمہ یہ گدھا تو برباد تھا ہی مگر تجھ سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی"

"س سچ بھیا۔ وہ اخ۔۔ بار الجمعیۃ۔۔۔"

"ہاں ہاں رُک کیوں گئی۔ کہونا ؟"

"اس میں تا۔۔ ریف چھپی تھی۔۔"

"اس میں تو عرسوں کی تعریف بھی چھپتی ہے۔ کبھی عرس میں بھی گئی ہو ؟"

"جی۔۔۔ جی وہ۔۔۔"

"کیا فضول جی جی کرتی ہو۔ یوں کہو اس نالائق نے الجمعیۃ کی آڑ لے کر تمھیں بہکایا تھا"

"جی ہاں۔۔۔ جی ہاں انھوں ہی نے کہا تھا الجمعیۃ عالموں کا اخبار ہے۔ اس نے جس فلم کو قابلِ دید لکھا ہے اسے دیکھنا ناجائز ہو ہی نہیں سکتا"

میرا بھیجا سنسنا گیا۔ ہرگز امید نہیں تھی کہ بیوی صاحبہ اس ڈھٹائی سے اپنا جرم میرے سر تھوپ دینگی۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو" میں ڈپٹ کے بولا۔

"بس بس تم زبان بند رکھو" سالے صاحب غرّائے "تمہاری بدعنوانیاں حد سے بڑھ چکی ہیں۔ اگر سنیما دیکھے بغیر تمہاری جان نکلی جا رہی تھی تو تنہا جا کر مر جاتے۔ نسیمہ اور رضیہ کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت تھی"

"جناب انھیں میں نے نہیں گھسیٹا۔ یہ آپ کی بہن جھوٹ بول رہی ہیں۔ میرے گھر میں آنے سے پہلے ہی یہ اور رضیہ پروگرام سیٹ۔۔۔"

"ختم کرو۔۔۔۔ تم چرب زبانی سے کبھی باز نہ آؤگے۔ تمھاری وجہ سے میری بڑی بدنامی ہو رہی ہے"

"صاحب۔۔۔۔ میں مردود تو واقعی اسی قابل ہوں کہ کھال کھینچکر بھُس بھر دیجئے۔ مگر قسم کھاکے کہتا ہوں اس وقت کی سچوئیشن وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی ہے"

انھوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا "کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ میرے سامنے انگریزی کی ٹانگ مت توڑا کرو۔۔۔ آخر عورتوں کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی"

"یہی تو عرض کر رہا ہوں۔ اللہ قسم اسکیم خود انھی لوگوں نے بنائی تھی"

"ہائے اللہ۔ اتنا جھوٹ تو نہ بولئے" بیگم کی بچی بڑے بھولپن سے منمنائی۔

"کیا کہا جھوٹ۔۔۔ یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔۔"

"نہیں نہیں تم نے تو زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا" سالے صاحب نے سرد آواز میں کہا "بس ختم کرو یہ ٹانک"

آپ انصاف سے کہئے اس زبردستی پر کیا کچھ غصہ نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر بے بسی کا وہی عجیب و غریب احساس جو ہمیشہ اس خونخوار سالے کے سامنے میرے دل و دماغ پر مستولی رہتا ہے اس وقت بھی کابوس کی طرح سوار تھا۔ فرطِ یاس میں نچلا ہونٹ کاٹنے پر قناعت کی۔ پھر پینترا بدل کر عرض کیا:۔

"اچھا قصور میرا ہی سہی مگر آپ الجمعیۃ کو بھی تو کچھ کہئے۔ وہ علمائے دین متین کا آرگن ہے۔ اس کے صدر اس کے سکریٹری اس کے ذمہ دار اراکین سبھی اقطاب و اعلام ہیں پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن چیزوں کا وہ پروپیگنڈا کرے وہ ناجائز ہی رہے جائیں۔ میرا خیال ہے آپ بھی اپنی رائے میں تشدد سے پرہیز فرمائیں تو بہتر ہو"

انھوں نے ماتھے پر ساختہ شکنیں پیدا کیں لیکن وہ بے اختیار تبسم پھر بھی نہ چھپ سکا جو ان کے گوشہ ہائے لب سے ہویدا ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا دہ مارا۔

اتنے میں فتو چائے لے آیا۔ چائے مفاہمت کی فضا کو خوشگوار بنانے میں کس درجہ معاون ہوتی ہے یہ راز کسی خوش ذوق سے چھپا ہوا نہیں۔ جب آنحضرت نے چائے کی دو چار چسکیاں لے لیں اور ماتھے کے مصنوعی شکن دائمی شگفتگی میں تبدیل ہو گئے تو میں بولیں:۔

"اچھا بھیّا یہ آخر قصہ کیا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے الجمعیۃ ہی میں "برف میں منور تجن" کی بڑی بڑی تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ آئے دن عرسوں کے اعلانات بھی چھپتے رہتے ہیں اور اب فلموں کی تعریف بھی چھپنے لگی ہے۔"

"اپنی قبر میں ہر شخص کو خود سونا ہے" انھوں نے بات ٹلائی "میں صرف تجلّی کی حد تک جوابدہ ہوں۔"

"تجلّی کو تو سب لوگ وہابی پرچہ کہتے ہیں۔" میں نے ان کا موڈ دیکھ کر مصرعہ عرض کیا۔

"کون سب لوگ؟" وہ غرائے۔

"کون... جی یہی سب خورد و کلاں... یعنی کہ خوش عقیدہ سنّی حنفی لوگ۔"

"فضول مت بکو۔ اس وقت تذکرہ اہلِ بدعت کا نہیں الجمعیۃ کا ہے۔ الجمعیۃ کے اراکینِ اعلیٰ تو دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"چلئے یہی سہی، لیکن آپ بھی تو دیوبندی ہیں تصاویر اور فلموں کے بارے میں کیا اتفاقِ رائے ممکن نہیں۔"

"تمھاری بکواس کا جواب دینے کے لئے میرے پاس فالتو وقت نہیں۔ ختم کرو۔"

"ختم کیا ——— لیکن مولوی شہید الحق کو تو آپ بھی مانیں گے کہ نیک آدمی ہیں۔"

"کون شہید الحق؟" انھوں نے بُرا سا منھ بنایا۔

"الجمعیۃ کی پُر تاضی والی شاخ کے انچارج۔"

"چلو آگے کہو۔"

"وہ پرسوں ہی کہہ رہے تھے کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو قومی تال میل کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہئے۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ میں نے تقریر جاری رکھی۔

"مثال میں انھوں نے فلم "گنگا جمنا" ہی کو پیش کیا تھا کہہ رہے تھے کہ اوّل تو اس فلم کا نام ہی قومی نقطۂ نظر سے اتنا مقدس ہے کہ جذباتی ہم آہنگی کی خاطر مسلمانوں کو اس سے بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ دوسرے اس کی کہانی بڑی قوم پرستانہ ہے مسلمان اسے دیکھ کر اپنی ذہنی فضا کو قوم پرستانہ احساسات کے لئے حد درجہ سازگار بنا سکتے ہیں۔"

"میں چپت ماردوں گا۔" وہ اچانک تڑخے لیکن یہ تڑخاہٹ سو فیصدی جعلی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تبسم رقص کر رہا تھا۔ میں نے شہ پاکر مصرع ثانی عرض کیا۔

"چپت آپ شوق سے ماردیں لیکن مولوی شہید الحق جیسے آدمی کی بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔"

"تم رفتہ رفتہ کسی سرکس کے مسخرے بنتے جا رہے ہو۔ مولوی شہید الحق ایک صالح آدمی ہیں کبھی ایسی لغو باتیں نہیں کہہ سکتے۔"

"اب آپ کے حسنِ ظن کا میرے پاس کیا علاج ہے اگر موقع ہوا تو کل ہی میں انھیں آپ کی خدمت میں لاؤں گا۔ آج کل یہیں اپنی سسرال آئے ہوئے ہیں۔"

"بکے جاؤ گے۔ ان کا نکاح تو میرٹھ میں ہوا تھا۔"

"جی ہاں نکاح تو میرٹھ ہی میں ہوا تھا اور سسرال کا بیشتر حصّہ میرٹھ ہی میں فروکش ہے لیکن ان کی زوجہ کے چچا زاد بھائی کی ممیا ساس نے دیوبند ہی میں اپنی ایک لڑکی بیاہی ہے۔ مولوی شہید الحق صاحب صلہ رحمی کے خیال سے اس لڑکی کے گھر کو بھی اپنی سسرال ہی کہتے ہیں اور ہر مہینے دو چار روز ضرور قیام کرتے ہیں۔"

وہ اس انداز میں کھنکارے جیسے گلے میں کوئی چیز

چیز ہمک گئی ہو جیسے بچے میں کہنے لگے۔
"تم سے بڑا یاوہ گو اور زبان دراز شاید ہی اس دنیا میں کوئی پیدا ہوا ہو۔ تمھیں یہ رشتہ داریاں کہاں سے معلوم ہوئیں؟"
"انھوں نے بتایا تھا" میں نے برجستہ بیگم کی طرف اشارہ کیا۔ بیگم چونک گئیں۔
"میں کیوں بتاتی۔ مجھے کیا معلوم مولوی شہید الحق کون ہیں۔"
"اب ہر بات میں جھوٹ بولوگی" میں نے تلخ لہجے میں کہا "تم ہی نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ مولوی شہید الحق کی خلیا ساس کے ایک نواسے کی شادی خواجہ شہادت حسین کے خالہ زاد بھائی کی پھوپی زاد بہن کے سوتیلے....."
"بکواس بند کرو" ـــــ ایڈیٹر تجلی دہاڑے۔ اب کی سچ مچ انھیں طرارہ آگیا تھا۔
پھر کچھ دیر بعد یہ محفل برخواست ہوئی۔

لیکن میرے لئے مولوی شہید الحق کے حق میں ایڈیٹر تجلی کا حسن ظن مستقل چیلنج کا درجہ رکھتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر تاؤ آرہا تھا کہ آج میرا ہر سچ جھوٹ بنا جارہا ہے۔ شہید الحق صاحب کے خیالات میں نے غلط نقل نہیں کئے تھے۔ یقیناً انھوں نے مجھ سے وہی کچھ کہا تھا جسے میں نے پوری ایمانداری کے ساتھ دہرادیا۔ بس فرق الفاظ کا ہو سکتا ہے لیکن ہر صاحب علم جانتا ہے کہ روایت بالمعنیٰ پر تو بڑے بڑے علوم کا مدار ہے حتیٰ کہ علم الحدیث میں بھی روایت بالمعنیٰ کو پوری قبولیت حاصل ہے۔
اب مرحلہ یہ تھا کہ کس طرح مولوی شہید الحق کو ایڈیٹر تجلی کے سامنے کھینچ کر لاؤں اور ان سے وہی خیالات اگلواؤں جنھیں ایڈیٹر تجلی میرے طبعزاد خیالات تصور فرمارہے تھے۔
اللہ کا کرنا دیکھئے۔ گردن لٹکائے اسی فکر میں غلطاں پیچاں چلا جارہا تھا کہ سرِ راہ مولوی صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے سراپا تپاک بن کر سلام عرض کیا اور انھوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں جواب مرحمت فرمایا۔
"کدھر تشریف لئے جارہے ہیں حضرت؟" میں نے مؤدبانہ پوچھا:۔
"کہیں نہیں ذرا ٹہلنے نکل تھا۔ یہاں کی آب و ہوا معدے کے لئے کچھ سازگار ثابت نہیں ہوئی"۔ انھوں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک جاندار قسم کی ڈکار لی۔
"جی ہاں بے شک۔ خود میں بھی اسی لئے ٹہلنے کا عادی ہوں۔ اجازت ہو تو آپ کے ساتھ....."
"ارے ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم ساتھ رہوگے تو ذرا لمبی چہل قدمی ہو جائے گی۔"
بازار سے گذر کر ہم تارکول کی سیاہ گرانٹ ٹرنک روڈ پر ہو لیئے۔ یہ ٹہلنے کے لئے بڑی اچھی سڑک ہے اور اسی کے پہلو میں پیر جنگل شاہ کی درگاہ بھی ہے جس کے متعلق خوش عقیدہ مجاوروں کا دعویٰ ہے کہ اس کے دم سے ایک ایک میل تک کی سڑک ہمیشہ ایر کنڈیشنڈ رہتی ہے۔
میں سوچ رہا تھا کس طرح حرفِ مطلب زبان پر لاؤں۔ وہ دو چار کلاں سائز کی ڈکاریں لینے کے بعد فرمارہے تھے۔
"بعد عصر خاطر خواہ ٹہل لیا جائے تو رات کا طعام خوب چلتا ہے۔ دوپہر فرنی اور کوا بنے معدے کو بوجھل کردیا۔ اب انشاء اللہ بھوک نکل آئے گی۔"
میں نے کچھ نہیں سُنا۔ لیکن جی ہاں جی ہاں کا ورد بہرحال ناگزیر تھا۔ اچانک میں موضوع کی طرف آیا:۔
"حضرت آپ نے جو اس دن فلم "گنگا جمنا" کے تعلق سے کچھ نکات ارشاد فرمائے تھے انھوں نے بڑا کام کیا۔"
"اچھا..... کیا؟"
"ایڈیٹر تجلی کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نہایت رجعت پسند اور وہابی ٹائپ کے آدمی ہیں۔"
انھوں نے بُرا سا منھ بنایا" ہاں خوب جانتا ہوں

اس کے چچا مسلم لیگ میں تھے اور وہ خود بھی آج تک اندر سے مسلم لیگی ہی ہے۔"

"بالکل بجا فرمایا ——— لیکن یہ سُنکر آپ کو خوشی ہوگی کہ عاجز نے رفتہ رفتہ ان کے فاسد خیالات کی بہت کچھ اصلاح کر دی ہے۔ اب یہی دیکھئے آپ کا حوالہ دیئے بغیر میں نے انھیں گنگا جمنا کی قوم پرورانہ حیثیت اور وغیرہ وغیرہ پر مطمئن کرنے کی کوشش کی تو پہلے ذرا اکھڑ گئے مگر جب میں نے منکشف کیا کہ یہ خیالات کسی ایسے ویسے کے نہیں ہیں حضرت مولانا شہید الحق بھی ان کے مؤید ہیں تو پہلے تو حیرت سے مجھے گھورا پھر جھٹلانے لگے کہ تو غلط بکتا ہے ایسے صاحب علم بزرگ اس طرح کے خیالات کی تائید نہیں کر سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ قومی فلم دیکھنے میں اور علم و فضل میں تضاد نہیں ہے۔ موجودہ ملکی حالات میں مسلمانوں کے مستقبل کی خاطر ہر ذی علم بزرگ لازماً قومی تال میل پر زور دے گا۔ ہر بات میں فتووں اور فقہی فیصلوں کی ٹانگ نہیں اڑانی چاہیئے۔"

مولانا کے چہرے پر بڑی بشاشت نظر آئی۔ مجھے چپ ہوتے دیکھ کر جلدی سے بولے :-

"پھر؟ پھر اس نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔ پہلے تو مجھے اس طرح گھورتے رہے جیسے میری صداقت پر اعتبار نہیں پھر گردن کو اثباتی انداز میں جنبش دے کر کہنے لگے کہ مولانا شہید الحق کے علم و فضل کا میں دل سے قائل ہوں۔ انھوں نے اگر کوئی فیصلہ کیا ہوگا تو روحِ شریعت کو نظر انداز کر کے نہیں کیا ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے گوشۂ چشم سے انکے روئے پُر نور کو دیکھا۔ وہ رمضان کی چاند والی انتیسویں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ قدموں کی رفتار ہلکی کر کے فرمانے لگے :-

"ایڈیٹر تجلّی ہے تو کچھ لغو سا آدمی مگر اتنا بھی نہیں کہ اس کی رائے کو بالکل ہی ناقابلِ لحاظ مان لیا جائے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے پُر قاضی میں بھی کسی نے بتایا تھا کہ رفتہ رفتہ اس کے خیالات میں سلجھاؤ آتا جا رہا ہے۔ میرے بارے میں اس کا یہ اندازِ نظر ثابت کر رہا ہے کہ واقعتاً اب وہ صحیح خطوط پر سوچنے کا اہل ہو چلا ہے۔"

"جی ہاں فدوی کی بھی یہی رائے ہے۔ فدوی نے تو ان سے کہا تھا کہ جب مولانا شہید الحق ہی گنگا جمنا جیسی قومی فلموں کی ہمت افزائی کے حق میں ہیں تو کیوں نہ ہم سالے بہنوئی بھی کسی شو کی سیٹیں بک کرا لیں۔ مگر۔۔"

"ہاں ہاں کیا مگر؟" وہ مجھے رُکتا دیکھ کر بیتابی سے بولے۔

"ایک تو وہی پُرانی وہابیت جھجکتے ہیں کہ داڑھی سمیت سینما کیسے جاؤں۔ دوسرے ابھی میرے قول پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ کہہ رہے تھے کہ جب تک اس بارے میں خود مولنٰا شہید الحق ہی سے تبادلۂ خیالات نہ کر لوں گا کوئی فیصلہ نہ کر سکوں گا۔"

"ہاں بھئی تو یہ کیا مشکل ہے۔ آپ انھیں صبح کی چائے پر میرے یہاں لے آیئے۔"

"آپ کے یہاں!" میں نے چونکنے کے انداز میں کہا۔ "پُر قاضی تو شاید وہ نہ جا سکیں۔"

"تو بہ پُر قاضی کیسا۔ میں یہیں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ میرے میزبان میرے مہمانوں کو بھی سر آنکھوں پر لیتے ہیں۔"

"لیکن ایڈیٹر تجلی یوں ایکا ایکی آنا مشکل ہی سے پسند کریں گے۔"

"تو پھر ہمیں اور انھیں چائے وغیرہ پر بلا لو۔"

"باپ رے۔۔۔ نہ توبہ۔۔۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ کل ظہر کے وقت آپ ایڈیٹر تجلّی ہی کے یہاں زحمت فرمائیں میں بلانے حاضر ہو جاؤں گا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ چائے تو پینی ہی ہے۔ یہاں پی وہاں پی لی۔"

اتنے میں آذانِ مغرب کی صدا بلند ہوئی۔ ان کے لئے اس ویرانے میں یہ آواز شاید خلافِ توقع ہی تھی چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"ارے بھئی یہ آذان کہاں ہوئی؟"

"جی وہ سامنے پیر جنگل شاہ کی درگاہ میں — آج جمعرات ہے۔ درگاہ میں خاصا مجمع ہوگا۔"

"خوب — چلو شریک جماعت تو ہو ہی جائینگے۔"

"جی ۔۔۔" میں سٹپٹایا۔

"ہاں ہاں جی کیا۔ ارے بھئی مغرب تو پڑھنی ہے۔"

"بیشک مگر وہ ۔۔۔ دیکھئے ایڈیٹر تجلی ہی نے بتا رکھا ہے کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنا ٹھیک نہیں۔"

"ارے وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔ لیکن عزیزم فتوے میں حالاتِ زمانہ کی بھی رعایت ضروری ہوتی ہے۔ اب مسلمان جن نازک حالات سے گذر رہے ہیں ان میں باہمی جنگ و نزاع کی بجائے مفاہمت اور رواداری کی سعی بلیغ ہونی چاہئے۔ عرسوں اور قبر پرستیوں کیخلاف ہم نے بھی پہلے دھواں دھار تقریریں کی ہیں لیکن اب قومی اور اجتماعی سطح پر سوچنے کا دَور ہے۔ کچھ وہ پڑھیں کچھ ہم پڑھیں۔ اسی طرح قومی بیڑا پار لگ سکتا ہے۔"

"قومی ۔۔۔ یعنی آپ کا مطلب ہے قومی —"

"ہاں ہاں قومی۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب ہے قومی تو شاید آج کل ساری بھارتی جنتا کے لئے بولا جاتا ہے۔"

"اُف بڑے کج فہم ہو۔ بھئی محل استعمال تو دیکھا کرو۔ خیر چلو آذان ختم ہو رہی ہے ۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گرانٹ ٹرنک روڈ سے اُتر کر کچی ٹیا پر قدم زن ہوئے جو سامنے کی درگاہ تک جاتی تھی۔ میرے پیر کئی کئی من کے ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ بد سے بدتر کاموں میں مجھے عار نہیں۔ مثلاً شطرنج کھیل سکتا ہوں۔ سنیما دیکھ سکتا ہوں۔ پتنگ لڑا سکتا ہوں مگر درگاہ میں نماز ۔۔۔۔ خدا کی پناہ۔ اس کے تصور ہی سے مجھے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔ خدا جانے غلط ہے یا صحیح اسی وہابی سالے نے بتا رکھا ہے کہ اللہ ہر گناہ معاف کر سکتا ہے۔ مگر شرک کو کسی بھاؤ معاف نہیں کرتا۔ باپ رے باپ۔

لیکن مولانا شہید الحق بھی تو آخر کیے عالم ہیں۔ وعظ میں ایک مرتبہ انھوں ہی نے جہنم کا نقشہ اس طرح کھینچا تھا کہ کڑاکے کی سردی میں حاضرین کو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ خود میں بھی حاضر مجلس تھا ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے زمین سے آسمان تک آگ ہی آگ ہو۔

"اٹک کیوں گئے آؤنا" انھوں نے مڑ کر کہا۔

"بات یہ ہے حضرت جی میرے کپڑے پاک نہیں ہیں۔ آپ پڑھ آئیں میں یہیں منتظر ہوں۔"

"استغفراللہ۔ ارے آؤ بھی گھر جا کے دھرا لینا۔"

"جی بس آپ چلئے ۔۔"

وہ منہ ہی منہ میں لاحول وغیرہ پڑھتے ہوئے درگاہ میں داخل ہوگئے۔ اب میں نے پاس کے کھیت میں گھس کر رہٹ پر وضو کیا اور کھٹا کھٹ اکیلے ہی پانچ رکعتیں کھینچ دیں۔ پھر نظر ڈالی کہ مولانا بھی درگاہ سے طلوع ہو رہے ہیں یا نہیں نہیں نظر آئے تو دو نفلیں اور نمٹا دیں۔ اب بھی وہ ندارد ہی تھے۔ دس منٹ تک تسبیح پڑھتا رہا۔ پھر دس منٹ ٹہلا مگر وہ شاید عشاء بھی درگاہ ہی میں پڑھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ہارمونیم کی تانوں پر کسی خوش گلو قوال نے تمہیدی سُر اُٹھانے شروع کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی طبلہ بھی ٹھنکا۔ پھر تو میں بھی درگاہ کی طرف بڑھا اور پشت پر جا کر ایک سوراخ سے جھانکا۔ مزار کے پاس جھکڑی جمی تھی جھکڑی سے مراد چھ آدمی نہیں ہیں، بلکہ عشّاق کا وہ مجمع ہے جسمیں میر مجلس کی حیثیت اُس معزز قوال کو حاصل تھی جسکی گھرجی ہوئی ٹھوڑی پر استرے کے نشان میں اتنی دُور سے بھی گن سکتا تھا۔ یہاں در اصل ہنڈہ روشن تھا اور اسکی بھرپور روشنی میں مولوی شہید الحق کے چہرے پر بھی تصوف کا وہ نور صاف نظر آرہا تھا جو مرحوم بزرگوں کی ہڈیوں سے بطور فاسفورس حاصل کیا جاتا ہے۔ ان کے جم کر بیٹھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے باقاعدہ مدعو ہو کر آئے ہوں اور خاتمۂ محفل سے پہلے اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔ کمال دیکھئے قوال نے قوالی بھی گنگا جمنا ہی کے

ایک طرز پر تلاوت کی اور ہاؤ ہو کے شور سے ویرانہ گونج اٹھا۔ ایک بار تو میرے منھ سے بھی بے اختیار نکلا "مکرر ارشاد ہو" مگر خیریت گذری فرطِ انہماک میں کسی نے سُنا نہیں اور جلدی سے میں نے اپنا منھ دبا یا۔ مجھے معلوم تھا کہ خوش عقیدہ حلقوں میں ایڈیٹر تجلّی کے ساتھ میری شہرت بھی کچھ کم خراب نہیں ہے اور بہت سے لوگ فکر میں ہیں کہ کہیں موقع پڑے تو ملّا کی جی بھر کے مرمت کریں۔ مرمت تو وہ ایڈیٹر تجلّی کی بھی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے بارے میں امید نہیں ہے کہ کبھی گھیرے میں آسکیں گے، لیکن ملّا کو اندھیرے اُجالے گھیر لینا ان کی دانست میں غیر ممکن نہیں ہے۔ خود میں بھی سمجھتا ہوں کہ اگر کہیں بے موقع گھر گیا تو ہڈیاں تک کحل الجواہر میں تبدیل ہو جائیں گی۔

بارے ایک گھنٹے بعد قوالی ختم ہوئی اور مولوی شہید الحق بعض دیگر اختتامی مراسم سے قبل ہی باہر نکل آئے۔ جی میں تو آئی کہ مرغ کی بولی میں میں بھی چند قوالیاں ان کے کان کی کوکر میں عرض کر دوں، مگر اصل مقصد کی خاطر ضبطِ نفس سے کام لینا پڑا۔

"ارے میاں کہاں رہ گئے تھے۔ اندر آگئے ہوتے۔"

"آپ نہیں جانتے قبلہ۔ یہ صوفی لوگ مجھے دیکھ کر ہتھے سے اکھڑ جاتے۔"

"اجی چھوڑو۔ پچھلے اختلافات انگریزوں کے ساتھ گئے۔ اب تو عرس و قوالی وغیرہ کی تقریبات مل جُل کے منانی چاہئیں۔ اسی سے دوسری اقوام پر ظاہر ہوگا کہ مسلمان متحد ہیں۔ اتحاد ثابت ہو جائے تو فساد وساد اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔"

"حق فرمایا۔ بندہ خود اسی طرزِ فکر کے حق میں ہے مگر لطف تو جب ہے آپ ایڈیٹر تجلی کو بھی قائل کریں جب تک وہ راہِ راست پر نہیں آئیں گے مجھ حقیر فقیر کی عاقبت روشن نہیں ہو سکتی۔"

"ہو سکتا ہے وہ بھی سدھر جائے۔ کل اس پہلو کو بھی نظر میں رکھیں گے۔ تو ٹھیک ظہر کے بعد آ رہے ہو نا؟"

"جی بالکل۔"

یہ تو مشکل ہی تھا کہ میں براہِ راست ایڈیٹر تجلی کو عصرانے پر آمادہ کرتا۔ البتہ ایڈیٹرائن کی خوشامد کر کرا کے معاملہ پکا کر لیا اور پھر ہم دونفر ظہر کے بعد اس طرح دولتکدے پر پہنچے جیسے اتفاقاً آنکلے ہوں۔ وہ مسجد سے نکل ہی رہے تھے کہ ہم نے جالیا۔ ظاہر ہے وہ مولوی شہید الحق کے مصافحے سے فرار اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ مکلف علیک سلیک کے بعد ہم بیٹھک میں پہنچے۔ مولوی شہید الحق کی رفتار تو قدرتاً معزز مہمان ہی کی سی تھی مگر میں ڈر رہا تھا کہ پھر کوئی ایسی بات ان کے منھ سے نہ نکل جائے جس سے راز کھل جائے۔ شکر ہے پردہ کم سے کم فوری طور پر اٹھا نہیں۔ بعد میں انھیں کچھ احساس بھی ہوا ہو تو ظاہر ہے منھ پھاڑ کر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مہمان کی ایسی تیسی۔

ایڈیٹرائن نے اچھے خاصے عصرانے کا اہتمام کر دیا تھا۔ جب ہر دو بزرگوں کو میں نے پوری طرح شیرِ شکر محسوس کر لیا تو دفعتاً ایڈیٹر تجلی سے گویا ہوا:۔

"آپ خود ان سے پوچھ لیں میں نے کیا جھوٹ کہا تھا۔"

"ہشت" انھوں نے اس انداز میں ٹوکا جیسے بچہ بچے کی توتلی زبان سے بھولپن میں گالی نکلی ہو۔ انھیں دراصل یقین تھا کہ میں نے خالص افترا پردازی کی ہے اور یہ بداخلاقی ہوگی کہ گھر آئے مہمان کو ایک نامتبوع بحث سے خفیف کیا جائے۔

"کیا بات ہے؟" مولوی شہید الحق نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ اس کی تو عادت ہی لغو گوئی کی ہے۔" سعادت مند سالے نے بہنوئی کی ہمت افزائی کی!

"میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ انھیں یقین ہی نہیں آتا۔" یہ الفاظ میں نے مولوی شہید الحق سے فریاد کے طور پر کہے۔ "اب ذرا آپ ہی تشفی فرما دیں۔"

"ارے ہاں بھئی" مولانا نے بڑی شفقت سے

ایڈیٹر صاحب کی طرف رُخ کیا" مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ معلوم کرکے کہ آپ نے بھی بہتر انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ واقعی آدمی حالات سے کہاں تک چشم پوشی کر سکتا ہے۔ اب تو کام تال میل ہی سے چلے گا۔"

ایڈیٹر صاحب کے ہاتھ کی پیالی ہونٹوں سے دو انچ ہی کے فاصلہ پر معلق رہ گئی۔ وہ دائرے کے انداز میں منھ کھولے مولانا کو تک رہے تھے اور استعجاب کی شدت سے ان کی داڑھی کے کئی بال ہاتھوں ہاتھ سفید ہوتے نظر آئے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" انھوں نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"میرا اشارہ قومی ہم آہنگی کی طرف ہے۔" مولانا تین چار نمک پاروں کو چائے کی مدد سے حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے بولے" جو خیالات میاں ملّا نے آپ تک پہنچائے ہیں انھیں بے شک میں نے بہت غور و فکر کے بعد اختیار کیا ہے اور فقہی نزاکتیں بھی میری نظر میں ہیں ہر آئینہ یہی بات حکمت کے عین مطابق نظر آتی ہے کہ قومیت کے ہر حلقے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک و ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعیِ پیہم کی جائے۔ دراصل یہ آئے دن کے فسادات، یہ مسلمانوں کی حق ماری یہ تعصب کی گرم بازاری سب اسی لئے ہے کہ ہم مسلمانوں کے طور طریق سے علیحدگی پسندی کا رجحان شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم اگر فقہی مسالک اور سماجی آداب و مراسم کو ذرا الگ الگ دائروں میں رکھ کر اپنی راہِ عمل معین کریں تو میرا خیال ہے ابنائے وطن کی بدگمانیاں کم سے کم تر ہو سکتی ہیں اور بعید نہیں کہ ہمارے اس توسع اور فراخ نظری سے ایک دن وہ متحدہ بھارت جنم لے جس کے خواب ہم سب مدت سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اب رواداری اور ہم آہنگی ہی ہمیں ہلاکت سے بچا سکتی ہے ورنہ ہمیں پیس ڈالا جائے گا۔ بھون ڈالا جائے گا۔"

یہ مرقع تقریر کر رہے تھے اور اللہ میرے دل پہ چوٹ رہی تھی۔ ملّا صاحب کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے مولانا کے ماتھے پر سینگ دیکھ کر دم بخود رہ گئے ہوں۔ پیالی جہاں کی تہاں تھی۔ جیسے کسی جادوگر نے اچانک روح کھینچ کر بے جان مجسمے میں تبدیل کر دیا ہو۔

"میں سمجھتا ہوں مسلم لیگ کے فلسفہ کو آپ جیسا کوئی بھی ذہین و فہیم آدمی اب منھ لگانا پسند نہیں کرے گا۔" مولانا نے نصف کیلے کا لقمہ بناتے ہوئے سلسلۂ ارشاد جاری رکھا" وہابیت بھی اب بعد از وقت ہو چلی۔ عرس وغیرہ قومی آہنگی کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ بڑے عرسوں میں ہمارے وزراء وغیرہ نہ صرف پیغام بھیجتے ہیں بلکہ موقع بہ موقع شریک بھی ہوتے ہیں۔ اونچے درجے کی درگاہوں پر آپ مسلمانوں کے علاوہ کتنے ہی غیر مسلموں کو بھی سرِ عقیدت جھکاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آثار بحالاتِ موجودہ خوش گوار ہی کہے جا سکتے ہیں۔"

"ماشاء اللہ" ایڈیٹر صاحب کے ہونٹوں سے شاید غیر شعوری طور پر نکلا۔ پھر انھوں نے دھڑ دھڑی سی لی اور پیالی کو ٹرے میں رکھتے ہوئے ایسی گمبھیر آواز میں بولے جو کنویں کی تہہ سے آتی محسوس ہوتی تھی" یہ طرزِ فکر میرے لئے حیرتناک ہے۔ آپ کے بارے میں میرے خیالات بہت بلند تھے۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے" مولانا نے داد قبول کرنے کے انداز میں کہا" میں نے ابتدا ہی سے نظری اور عملی مسائل میں توافق پیدا کرنے کے اصول پر بڑی محنت کی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں روزنامہ الجمعیۃ بفضلہ تعالیٰ اب کسی بھی ترقی یافتہ جریدے سے پیچھے نہیں۔ شروع شروع میں بعض ارکین نے تصویروں اور عرسوں کے اشتہارات وغیرہ کی شدید مخالفت کی تھی لیکن میں نے علیٰ وجہ البصیرت واضح کیا کہ آپ لوگ غلطی پر ہیں۔ آخر کار استدلال کے آگے انھیں جھکنا پڑا۔۔۔۔"

"لیکن مولانا گستاخی معاف" ایڈیٹر صاحب بولے" کیا آپ بھی گنگا جمنا دیکھ آئے ہیں؟"

"جی ... جی نہیں تو۔ میں تے تو نہیں دیکھا تا ہم ... میں نے گھر کے کسی فرد کو روکا بھی نہیں۔ اب میں خود کیا بڑھاپے میں سنیما ہال کا رُخ کرتا"

گمان تھا کہ جوابی بحث کا چرخہ اب سالے صاحب چلائیں گے، لیکن وہ چند ثانیے اس طرح ہونٹ کاٹتے رہے جیسے توس نوش کر رہے ہوں پھر یک قسم کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ٹھیک اسی اسلوب میں گل افشاں ہوئے جس اسلوب میں یہ عاجز صوفیا رگل افشاں ہوتا ہے۔

"بوڑھاپا تو نیک کاموں کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے مولانا! اگر ہندی مسلمانوں کے مستقبل کا مدار اب اسی تال میل پر ہے تو آپ جیسے بزرگوں کو کھل کر آگے بڑھنا چاہیئے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو گنگا جمنا چلانے والے سنیما کے ٹکٹ گھروں پر ہر شو میں باقاعدہ کھڑا رہتا تاکہ ہر شخص دیکھے اور سبق لے۔"

مولانا نے قدرے تشویشناک انداز میں ایڈیٹر صاحب کو گھورا۔ انھوں نے غالباً لب ولہجے کا استہزاء محسوس کر لیا تھا۔

"آپ میری معروضات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں" مولانا کے لہجے میں احتجاج تھا "حالانکہ میرے پاس دلائل ہیں۔ آپ واضح فرمائیں کہ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی عزت مندانہ زندگی کے لئے آپ قومی ہم آہنگی اور تال میل کے سوا اور کونسا راستہ ممکن تصور فرماتے ہیں۔"

"قومی ہم آہنگی اور تال میل!" ایڈیٹر صاحب نے ان الفاظ کو اس طرح چبا چبا کے دہرایا جیسے ان کا قیمہ بنا رہے ہوں" میں تو قبلہ آج تک ان الفاظ ہی کے مفہوم سے نابلد ہوں۔ چھوڑیئے یہ بحث آپ جیسے بزرگوں کے سامنے میں کیا بول سکتا ہوں۔"

پل بھر کے لئے تو مولانا کے چہرے پر چاندنی سی کھل گئی مگر پھر انھوں نے خاصی مشکوک نظروں سے ایڈیٹر تجلی کے بشرے کا جائزہ لیا اور پھر گوشۂ چشم سے میری طرف ایسے کڑے انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں:۔

"تم تو خبیث کہتے تھے ایڈیٹر تجلی راہ راست پر آتا جارہا ہے۔"

میں نے مناسب یہی سمجھا کہ دو چار نمک پارے اور نمٹا دوں۔ آخر کار یہ محفل برخواست ہوئی۔ اب مجھے اپنی خیریت نظر نہیں آرہی تھی۔ سوچا کہ مولانا کے ساتھ ساتھ ہی لگا لگا نکل جاؤں گا، مگر مدظلہٗ گرجے:۔

"بیٹھو۔"

میں طوعاً وکرہاً بیٹھ گیا، لیکن ساتھ ہی معذرت بھی کی۔ "دیکھیئے مولانا کا غصہ مجھ پر مت اتاریئے گا۔ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ کل آپ نے مجھے دروغ گو سمجھ کر انصاف نہیں کیا۔"

"چلو برتن اٹھاؤ۔ تمھیں جواب دہی کرنی ہوگی کہ مجھے اطلاع دیئے بغیر تم نے میرے یہاں مولوی شہید الحق کو مدعو کیسے کیا؟"

"مجھے پھانسی دیدیجئے مگر قومی تال میل، ہم آہنگی، ایکتا ..."

"حلق بند کرو" وہ بُری طرح دہاڑے۔ یہ دہاڑ ایڈیٹرائن نے بھی سن لی تھی۔ میں برتن سنبھالے اندر پہنچا تو وہ بولیں:۔

"ارے بھئے وہ کس پر بگڑ رہے ہیں؟"

"مجھ بدنصیب کے سوا کس پر بگڑیں گے" میں نے بڑی مظلومیت سے کہا "خفا ہیں کہ بغیر پوچھے دعوت کیسے کی۔"

اتنے میں ایڈیٹر صاحب بھی گھر میں آگئے۔ ایڈیٹرائن نے بڑی شفقت سے برتن میرے ہاتھ سے لے لئے اور ایڈیٹر صاحب سے گویا ہوئیں:۔

"ہائے اللہ آپ تو اس غریب کی جان نکال دینگے ذرا دیکھئے تو ڈر کے مارے بچارے کا منھ کتنا سا نکل گیا ہے۔"

"تم نے اسے اور سر پر چڑھا یا ہے۔" وہ بھنّائے "میں پوچھتا ہوں یہ مجھ سے پوچھے بغیر دعوت ہی معنی دارد؟"

"ہائے اللہ یہ کوئی دعوت تھی۔ اب کیا آنے جانے والوں کو خالی جائے جایا کرے گی۔"

"آپ تو کسی نواب کی بیگم ہیں نا۔ خبر ہے آمدنی اور خرچ کا توازن کیا ہے؟"

"سب خبر ہے۔ آپ اپنا کام کیجئے۔ چولھے ہانڈی سے سر کھپانا میرا کام ہے آپ کا نہیں۔"

"اُفوہ۔ تم عورتوں کی عقل گُدی میں ہوتی ہے چولھے ہانڈی کے لئے خرچ بھی کیا تم ہی لاؤ گی؟"

"خدا نہ کرے میں لاؤں۔ آپ تو جو منہ میں آتا ہے کہہ گذرتے ہیں۔ ہم کم بختوں کی عقلیں تو گُدی میں بھی کہاں ہوتی ہیں ہوتی ہی نہیں ہیں۔"

آخری جملہ ادا کرتے کرتے ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔ ایڈیٹر صاحب تلملا گئے۔

"اب رونا شروع کر دو گی۔ کیا مصیبت ہے۔ تم سب مجھے پاگل بنا دو گے۔"

"دشمن بنیں آپ کے پاگل" ایڈیٹرائن نے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "میں تو جب بھی دیکھتی ہوں آپ ننھے سے غصّے ہی سے پیش آتے ہیں۔ اس کا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھ جی ہاں وہ اپنی جانب کو "ننھا" ہی کہا کرتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے بڑے تاؤ میں آکر کہا:۔

"یہ ننھا جس قدر آفت کا پرکالہ ہے تمہارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔"

"کیوں میرا آفت کا پرکالہ۔ کوئی آج کل کا سا بہنوئی مل جاتا تب آپ کو پتا چلتا کہ۔۔۔"

"بس بند کرو خدا کے لئے بند کرو۔"

وہ پیر پٹختے کمرے میں چلے گئے اور ایڈیٹرائن نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں بیٹے تو غمگین مت ہو۔ ان کی تو ایسی ہی باتیں ہیں۔"

ملاز مدہ صحبت باقی

مسلسل

جب اسلام کارفرما تھا

از:- مولانا عبدالرؤف رحمانی

اعلام

جب حضرت ابوبکرؓ نے فاروق اعظمؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا لاحاجۃ لی بھا مجھے خلافت کی ضرورت نہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ولکن بھا الیک حاجۃٌ یعنی تم کو خلافت کی حاجت نہ ہو نہ سہی لیکن خود خلافت کو تمہاری حاجت ہے۔ اس کے بعد کیا خوب فرمایا واللہ ما حبوتک بھا ولکن حبوتھا بک یعنی خدا کی قسم میں نے تم کو خلافت نہیں دی، بلکہ خلافت کو تمھیں دیا ہے۔ بلاشبہ خلافت وامارت کے لئے ذاتِ فاروقی ایک عطیہ اور ایک نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئی (الامامۃ والسیاسۃ و سیرت عمرؓ لابن الجوزی ص۴۸) کیا سچ کہا ہے ؎

ہمہ خوبانِ عالم را بزیور ہا بیاراند
تو سیمیں تن چناں ہستی کہ زیور را بیارائی

اسی لئے علماءِ تاریخ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے حسنات میں اس نیکی کا بھی اضافہ کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے عمرؓ جیسی جامع المحاسن ہستی کو امت پر خلافت کیلئے نامزد فرمادیا قالوا انما عمرؓ حَسَنَۃٌ مِنْ حَسَنَاتِ ابی بکرؓ

(سیرت عمرؓ بن الخطاب لابن الجوزی ص۲۹)

حضرت ابوبکرؓ کی نظر میں خلافتِ فاروقی کی جو وقعت تھی وہ اس تاریخی واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ جب کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ نے ایک سخت گیر آدمی کو خلیفہ بنایا ہے خدا کو کیا جواب دیجئے گا فرمایا میں اللہ تعالےٰ سے کہوں گا استخلفت خیر خلقک (الاعتصام للشاطبی جلد ثالث ص۱۳۰) کہ خدایا میں نے تیری مخلوق میں جو سب سے بہتر تھا اسے خلیفہ بنایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا حسن ظن درست ثابت ہوا بلاشبہ حضرت عمرؓ خلافت کیلئے سراپا برکت ورحمت ثابت ہوئے۔

بیت المال میں سب کے حقوق برابر ہیں

مسلمانوں کے بیت المال میں سب کے حقوق یکساں تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں کس قدر حق تھا وہ سب حسب ذیل روایت سے ظاہر ہے:-

(۱) ایک دفعہ کچھ اونٹ صدقہ کے آپ کے سامنے گذرے فرمایا اس اونٹ کے پہلو میں جو یہ تھوڑا سا مال ہے میں کسی مسلمان کے مقابلے میں اتنے کا بھی زیادہ حقدار نہیں ہوں (مسند احمد جلد اوّل ص۸۸)

(۲) اسی طرح حضرت عمرؓ نے تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ کوئی شخص اس مال کا کسی سے زائد حق دار نہیں ہے اور خدا کی قسم میں خود کسی سے زائد حق دار نہیں ہوں۔ مسلمان کا ایک ایک فرد اس مال میں یکساں مستحق ہے (مسند احمد جلد ۱ ص۴۲)

علامہ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں۔ وانزل نفسہ من مال اللہ بمنزلۃ رجلٍ من الناس (استیعاب جلد ۲ ص۴۶۲) یعنی اپنا حصہ بیت المال میں عام انسانوں کی طرح رکھا۔

) اسی طرح حضرت عمرؓ کے پاس "بحرین" سے مشک و عنبر
و حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی اچھی طرح وزن کرنے والی عورت
ی تو میں اس سے وزن کراکے مسلمانوں میں برابر حصہ
کر تقسیم کر دیتا۔ حضرت عمرؓ کی بیوی عاتکہؓ بولیں کہ میں
ی طرح وزن کر دوں گی۔ فرمایا تمھیں اجازت نہیں۔ انھوں نے
چھا آخر کیوں؟ جواب دیا تم وزن کروگی اور تمہاری انگلیوں
ں اس کی خوشبو لگے گی اور تم اسے اپنی کنپٹی اور گردن پر ملوگی
اس طرح عام مسلمانوں کے مقابلے میں تمھیں خوشبو کا زیادہ حصہ
ل جائے گا۔ مجھے اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے گوارہ نہیں۔
منتخب کنز العمال جلد چہارم ص۴۱۳ و سیرت عمرؓ ص۱۳۸ و
حیاء العلوم جلد ثانی ص۹۷ و ازالۃ الخفاء)
حضرت عمرؓ کے پاس کسی جگہ سے فتوحات یا خراج کے
سلسلے میں کچھ عود آیا یہ اتنا کم تھا کہ سب لوگوں میں اس کی
تقسیم دشوار ہو رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے نہ تو خود لیا نہ اپنے
کسی عزیز و قریب کو دیا، بلکہ اس کا یہ حل نکالا کہ اسے کعبۂ مطہرہ
میں بھیج دیا کہ خوشبو سے بسایا جائے تاکہ سب حضرات خوشبو سے
برابر مستفید ہوں۔ (شفاء الغرام باخبار البلد الحرام جلد ثانی ص۲۴۰)
(۴) امام غزالیؒ نے اس کے علاوہ ایک اور واقعہ نقل کیا
ہے کہ حضرت عمرؓ نے . . . . بیت المال سے کسی
خوشبو کی چیز کو اپنی بیوی کے حوالے کیا کہ نعیمہ عطارہ کو
بلا کر اپنے سامنے وزن کراکے بیچ دیں۔ وزن کراتے وقت
ان کی انگلیوں میں اس کی خوشبو لگ گئی ان کو انھوں نے
اپنی اوڑھنی میں رگڑ لیا۔ حضرت عمرؓ اتفاقاً داخل ہوئے
پوچھا یہ کیسی خوشبو ہے؟ انھوں نے بتایا انگلیوں میں کچھ
لگ گئی تھی ان کو اوڑھنی میں مل دیا۔ فرمایا کیا مسلمانوں
کی خوشبو کو تم تنہا استعمال کر سکتی ہو؟ یہ کہہ کر سر سے اوڑھنی
کو جھٹک لیا اور مشکیزے سے پانی لیا اور مسل مسل کر مٹی لگا لگا
کر دھویا دھو دھو کر سونگھتے رہے جب خوشبو نکل گئی تب
اوڑھنی کو چھوڑا۔ (احیاء العلوم جلد ثانی ص۹۷ و سیرت عمرؓ ص۱۳۸)

دنیا میں اسلامی و قومی بیت المال کے ان جیسے امین
اب چشمِ فلک کو پھر کہاں دیکھنے نصیب ہوں گے۔ ~

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(۵) حضرت عمرؓ کے متعلق ان کی امانت، دیانت اور
مسلمانوں کی حق شناسی کے متعلق صحابۂ کرامؓ نے شہادت
دی ہے۔ اِنَّكَ تَعْدِلُ فِي الرَّعِيَّةِ وَتَقْسِيمُ بَيْنَهُمْ
بِالسَّوِيَّةِ وَتُشْفِقُ عَلَيْهِمْ شَفَقَةَ الرَّجُلِ عَلَى اَهْلِهٖ
(منتخب کنز العمال جلد چہارم ص۳۸۹) کہ آپ رعایا کے معاملات
میں عدل و انصاف کا برتاؤ کرتے ہیں اور ان میں سب
چیزوں کو برابر تقسیم کرتے ہیں اور ان پر اس طرح شفقت
کرتے ہیں جس طرح آدمی اپنے بال بچوں پر شفقت کرتا ہے۔
(۶) حضرت عمرؓ ایک مرتبہ سفر کر رہے تھے روحاء کے
قریب ایک پہاڑی پر آپ نے چرواہے کی آواز سُنی تو
راستہ سے مڑ کر اس کے پاس پہنچے اور کہا جہاں سے میں
مڑ کر آیا ہوں اُدھر زیادہ سبزی ہے وہاں لیجا کر چرا۔
اس کے بعد فرمایا کل راعٍ مسئول عن الرّعیۃ
(ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں محاسبہ کیا جائیگا)
(اشہر مشاہیر الاسلام جلد اوّل ص۲۲۴) اس واقعہ سے
فاروق اعظمؓ کی شفقت و رعایا پروری کا حال کس قدر
آشکارا ہے۔
(۷) حضرت عثمانؓ نے صاف طور سے فرمایا لا استحل اموال
المسلمین لنفس ولا لِاَحَدٍ من الناس ولقد کنت
اعطی العطیۃ الکبیرۃ من صُلب مالی (تاریخ طبری ص۲۴۴)
یعنی مسلمانوں کے بیت المال سے کسی مال کو نہ اپنے لئے حلال
سمجھتا ہوں نہ کسی عزیز و اقارب کے لئے جس کو بھی میں نے
بڑا عطیہ دیا وہ اپنی ذاتی ہی رقم سے دیا ہے۔
(۸) حضرت علیؓ جب بیت المال کے مالک اور امیر
قطعی تھے اُس وقت کا حال یہ تھا کہ ایک بار منبر پر مجمع عام
میں فرمانے لگے۔ من یشتری منّی سیفی ھٰذا فلو
کان عندی ثمن ازارٍ ما بعتہ۔ یعنی یہ تلوار مجھ
سے کون خریدے گا اگر میرے پاس ایک تہبند خریدنے کی
قیمت ہوتی تو میں اسے فروخت نہیں کرتا۔ ایک شخص نے کہا

آپ تلوار نہ فروخت کریں ہم آپ کو قرض دیدیں گے اس سے تہبند خرید لیں۔ امام عبدالرزاق کہتے ہیں۔ کانت بیدہ فما فیما الأمما کان من الشام (احیاء العلوم جلد ثانی ص۱۲۲، استیعاب جلد دوم ص۴۶۵) کہ یہ اس وقت کی بات جب کہ ملک شام کے علاوہ جس پر حضرت معاویہؓ قابض تھے باقی ایک بڑی دنیا ان کے ہاتھ میں تھی، مگر قصر خلافت میں بیٹھ کر بیت المال سے ایسی ضرورتوں کو نہیں نکالا کرتے تھے۔ آج گورنروں، کمشنروں کے یہاں اسباب وساز وسامان کی ریل پیل رہتی ہے ان کے عہدوں پر آجانے کے بعد کوٹھی، بنگلہ، کار، حدم وحشم سبھی لوازمات ان کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ زرکشی وزراندوزی ورشوت خوری آج کے عہدوں کے لوازمات بن گئے ہیں۔

(۸) آپ نے عہدِ خلافت میں جس طرح بیت المال کی چیزوں کی امانت داری فرمائی اس کا اندازہ حضرت اُمّ کلثومؓ کے اس بیان سے کیجئے وہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ بیت المال میں نارنگیاں آئیں حضرت حسنؓ وحسینؓ بھی موجود تھے۔ ایک نارنگی انھوں نے لے لی۔ حضرت علیؓ نے دیکھا تو ان سے چھین لیا اور مسلمانوں میں اسے تقسیم کر دیا (ازالۃ الخفاء بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ)

(۹) ایک شخص حضرت علیؓ کے دربار خلافت میں ان کے پاس کسی ضرورت سے آیا دیکھا کہ حضرت علیؓ ایک چھوٹے سے مکان میں فروکش ہیں اور ایک پرانی چادر اوڑھے ہوئے ہیں اور جسم جاڑے کا ہے راوی کا بیان ہے وھو یرعد فیھا کہ وہ جاڑے کی شدت سے کانپ رہے تھے ان سے کہا کہ آپ بیت المال سے بقدر ضرورت کیوں نہیں لے لیتے اس قدر سختی کیوں برداشت کرتے ہیں۔ فرمایا یہ سادی اور پرانی چادر گھر سے لایا ہوں مجھے اپنی ضرورت کے لئے بیت المال میں اس کے بقدر بھی نقصان پہنچانا گوارہ نہیں۔ اس واقعہ سے ان کی غائت دیانت داری اور قومی امانت کا حال صاف ظاہر ہے۔ (کتاب الاموال ص۲۷۶) حضرت علیؓ نے آذربائیجان کے عامل اشعث بن قیس کو لکھا کہ میں نے جس عملداری پر تم کو مامور کیا ہے اس کو اپنا رزق مت سمجھو، بلکہ وہ سرتاپا ایک امانت ہے، خبردار رعایا کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ بیت المال کے تم صرف خزانچی ہو، اس کے مالک نہیں ہو جس طرح چاہو تصرف کرو۔ (نہج البلاغۃ جلد ثالث ص۷)

(۱۰) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں ایک روز بیت المال میں بہت سا شہد آیا جو مشکوں میں بھرا ہوا تھا اتفاق سے اسی وقت آپ کے صاحبزادے امام حسنؓ کے یہاں چند مہمان آئے اور روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے شہد کی ضرورت پڑی۔ حضرت امام حسنؓ نے امیر المومنین کے غلام قنبر سے کہا

ایک مشک کھول کر تھوڑا سا شہد لا دو جب شہد تقسیم ہونے لگے تو میرے حصہ میں اتنا وضع کر لینا۔ قنبر کو کوئی مضائقہ نہ معلوم ہوا اور اس نے تھوڑا سا شہد وزن کر کے دیدیا۔ تھوڑی دیر میں امیر المومنین حضرت علیؓ نے شہد تقسیم کرنے کے لئے مشکیں منگوائیں تو ایک مشک میں شہد کچھ کم معلوم ہوا آپ نے قنبر سے وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا صاحبزادے حسنؓ کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے انھوں نے تھوڑا سا شہد اس شرط پر منگوا لیا تھا کہ جب تقسیم ہونے لگے تو ان کے حصہ سے اتنا شہد لے لیا جائے۔

یہ سُنکر حضرت امیر المومنینؓ نہایت خفا ہوئے۔ آپنے حکم دیا کہ حسنؓ فوراً حاضر کئے جائیں۔ امام حسنؓ حاضر ہوئے حضرت امیر المومنینؓ نے اظہار خفگی کرتے ہوئے پوچھا تمھیں بیت المال کی چیز لینے کی جرأت کیسے ہوئی امام حسنؓ نے عرض کیا جرأت تو نہ ہوتی مگر صرف اس خیال سے کہ شہد میں میرا بھی حصہ ہے تھوڑا سا اس شرط پر منگوا لیا تھا کہ تقسیم کرتے وقت اتنا ہی واپس کر دوں گا۔ امیر المومنینؓ نے فرمایا ہاں یہ صحیح ہے کہ شہد میں تمہارا بھی حق ہے، مگر تقسیم ہونے سے قبل تمھیں اپنا حصہ لینے کا کیا حق تھا۔ اس سوال پر حضرت امام حسنؓ خاموش ہو گئے۔ امیر المومنینؓ نے فوراً شہد واپس لانے کا حکم دیا۔ حضرت امام حسنؓ نے فوراً شہد واپس لا کر بیت المال میں داخل کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ادنیٰ لحاظ بھی جائز نہ تھا تقسیم سے قبل شہد واپس لے لیا گیا اور مہمانوں کو شہد کھانا نصیب نہ ہوا۔

(۱۱) حضرت علیؓ کے پاس اصفہان سے کچھ مالِ غنیمت آیا مستحقین پر اس کے حصے تقسیم کئے گئے تو اس میں ایک عمدہ روغنی روٹی بھی نکلی تو اس کے بھی ٹکڑے کئے اور برابر برابر سب کے حصوں پر رکھدیا۔ نہ تو خود لیا نہ اقربا کو دیا نہ کسی کے حصہ میں کم و بیش کیا (استیعاب جلد دوم صفحہ ۴۶۲)

(۱۲) حضرت امیر المومنین حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں موتیوں کا ایک ہار آیا اور بیت المال میں داخل کر لیا گیا اس کی خبر آپ کی صاحبزادی کو ہوئی۔ صاحبزادی نے عید کے ایک روز قبل بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ کل عید ہے تمام عورتیں اچھے اچھے لباس اور زیور سے آراستہ ہوں گی، لیکن میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے بیت المال میں جو موتیوں کا ہار آیا ہے اسے تم مجھے دیدو تاکہ میں اس موقع پر اسے پہن لوں عید کے بعد نہایت احتیاط سے واپس کر دوں گی۔ بیت المال کے افسر نے جواب دیا کہ میں صرف تین دن کے لئے یہ ہار دے سکتا ہوں صاحبزادی راضی ہو گئیں اور تین دن کے وعدے پر افسر نے ہار بھیجدیا عید کے دن اس ہار کو پہنا۔ اتفاقاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نظر اس ہار پر پڑی آپ نے فوراً پہچان لیا اور دریافت کیا کہ یہ ہار تمھیں کہاں سے ملا ہے؟ صاحبزادی نے عرض کیا یہ ہار بیت المال کا ہے۔ میں نے بیت المال کے افسر سے تین دن کے لئے لیا ہے کل واپس کر دوں گی۔ یہ سُنتے امیر المومنینؓ نے بیت المال کے افسر کو طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو آپنے فرمایا کہ تم مسلمانوں کی امانت میں خیانت کرتے ہو؟ افسر نے کہا خدا کی پناہ میں اور مسلمانوں کی امانت میں خیانت کروں یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔ امیر المومنینؓ نے کہا تم نے بغیر میری اجازت کے یہ موتیوں کا ہار میری بیٹی کو کیوں دیا؟ افسر نے کہا چونکہ صاحبزادی نے طلب فرمایا تھا اور وہ بھی تین دن کے وعدے پر اس لئے دے دیا ورنہ ہرگز نہ دیتا۔ امیر المومنینؓ نے فرمایا تم نے غلطی کی۔ تمھیں مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ایسا کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ فوراً ہار لیکر بیت المال میں داخل کر دو۔ میں اپنی لڑکی سے سخت ناراض ہوں۔ اگر اس نے تین دن کے وعدے پر نہ لیا ہوتا تو میں اسے چوری کے جرم میں ماخوذ کر کے سخت سزا دیتا۔ بیت المال کے افسر نے اسی وقت صاحبزادی سے ہار طلب کیا، صاحبزادی امیر المومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عاریت کے طور پر دن بھر کی اجازت چاہی۔ امیر المومنینؓ نے فرمایا بیٹی کیا تم اپنے نفس کی خاطر انصاف کا خون کرنا چاہتی ہو؟ کیا تمام مسلمانوں کی لڑکیاں آج زیور سے

وابستہ ہوں گی۔ صاحبزادی خاموش ہو گئیں اور ہار بیت المال
کے افسر کو واپس کر دیا۔ عید کے پورے ایام تک بطور رعایت
بھی ان کو اپنے پاس رکھنا نصیب نہ ہوا۔
(۱۳) حضرت علیؓ بیت المال کا مال سب کو برابر تقسیم کرتے
تھے۔ ایک شخص نے کچھ زیادہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا۔ انما المال
مال اللہ وان اعطاء المال فی غیر حقہ تبذیر
واسراف (نہج البلاغۃ جلد ثانی صفحہ ...) یعنی یہ مال اللہ کا
مال ہے کسی کو بلا حق کے زیادہ دیدینا اسراف وتبذیر ہے،
جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ اسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ
کی دیانت داری کی بابت صاحب طبقات نے لکھا ہے کہ،
رات میں حکومت کا کام کرتے تو حکومت کی شمع استعمال کرتے
اور اگر اس وقت کسی ذاتی ضرورت کے لئے لکھنا ہوتا تو اپنا
ذاتی شمعدان جلا کر اس کی روشنی میں لکھتے۔ بیت المال کے
چراغ سے کبھی ایک حرف بھی اپنے ذاتی کام کے لئے نہیں لکھا۔
(البدایہ والنہایہ جلد تاسع صفحہ ۲۰۳ وطبقات ابن سعد جلد خامس ...)
(۱۴) اسی طرح شاہی خزانے میں معائنہ کے وقت مشک
کا ڈبہ کھولا گیا تو آپ نے معائنہ تو فرمالیا لیکن ناک کو فوراً بند
کر لیا کسی نے کہا حضرت یہ کیا بات ہے۔ فرمایا مجھے عام مسلمانوں
سے زیادہ خوشبو سونگھنے کا حق ہی کیا ہے۔ لوگوں نے کہا حضرت
یہ تصرف کہاں ہوا اس کی خوشبو ناک میں خود بخود آجاتی ہے
فرمایا مشک ؏ میں بجز خوشبو کے ہوتا ہی کیا ہے۔ (البدایہ
والنہایہ جلد تاسع صفحہ ۲۰۹ وطبقات ابن سعد جلد خامس صفحہ ۲۷۱
وسیرۃ عمر بن عبدالعزیز صفحہ ... وتہذیب الاسماء جلد ثانی صفحہ ۲۲)
دنیا جانتی ہے کہ مشک کے خواص ومنافع اور اس کے استعمال
کے اثرات وفوائد ہی مشک کو ایک بڑی قیمت کی چیز بناتی
ہے، لیکن اس کا استعمال تو کجا صرف اس کا سونگھنا جن خلفاء
کو بیت المال میں تصرف نظر آیا ہوا اور انھوں نے اس سے بچنے
کے لئے اپنی ناک بند کر لی ہو ان کی امانت ودیانت ہر تعریف
سے بے نیاز ہے۔
(۱۵) ایک دفعہ آپ کے سامنے عنبر معائنہ کے لئے لایا گیا، آپ نے
ہاتھ سے چھوکر ٹٹولا پھر اس کے فروخت کرنے کا حکم دیا، پھر اپنے
ہاتھ کو ناک پر رکھا تو خوشبو آرہی تھی، فوراً پانی منگوا کر اچھی طرح
ہاتھ کو اتنا دھویا کہ خوشبو نکل گئی (سیرت عمر بن عبدالعزیز ...)
(۱۶) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بہترین پھل تازہ
کھجوروں کی تھیلیاں بطور تحفہ امیر اردن کی طرف سے آئیں
پوچھا یہ تحفے کس ذریعے سے یہاں تک پہونچے بتایا گیا سرکاری
ڈاک کے گھوڑے آرہے تھے بس اسی پر آگئے ہیں۔ فرمایا
سرکاری ڈاک کے گھوڑے تو بیت المال کے ہیں ان سے تمام
پبلک کا تعلق ہے۔ لہذا ان پھلوں کو بازار میں بیچ کر اس کی
قیمت المال میں داخل کر دو اور اس سے ڈاک کے گھوڑوں کو
دانہ چارہ دو (سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۵۵) جانوروں کے
ساتھ حسن سلوک کا یہ سبق دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ہی کا دیا ہوا ہے۔ امام مالکؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک روز
صحابہ کرامؓ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھوڑے
کا چہرہ خود ہی اپنی چادر مبارک سے صاف کر رہے ہیں۔ آپؐ
سے صحابہؓ نے سوال کیا تو فرمایا مجھے گھوڑوں کی اچھی طرح تربیت و
نگہداشت کے بارے میں خاص طور سے ہدایت کی گئی ہے۔
(مؤطا امام مالکؒ جلد ثانی صفحہ ...)

خلفائے راشدینؓ کی سادہ زندگی

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کی زندگی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا پرتو تھی ان کے سامنے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک موجود تھا۔ کھری
چارپائی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرماتے تھے اور تن
مبارک پر رسیوں کے نشانات نمایاں طور سے ظاہر ہوجاتے
تھے۔ حضرت عمرؓ یہ نقشہ دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے اور کہنے
لگے قیصر وکسریٰ آرام کی زندگی گذاریں اور خدا کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح عسرت وتنگی سے گذر بسر کریں۔

؏ مسعودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ عمدہ ترین مشک تبت کا ہوتا
ہے کہ وہاں ہرن سنبل الطیب چرتا ہے اور چین کا مشک اچھا نہیں ہوتا
وہاں کا ہرن گھاس پھوس چرتا ہے۔ پھر ان میں سے بہترین مشک وہ ہوتا
جو بالغ ہرن کے نافہ سے نکالا جائے۔ (مروج الذہب جلد اول صفحہ ...)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہماری مثال اس مسافر کی سی ہے جو کسی سایہ دار درخت کے نیچے ذرا دم لینے کے لئے ٹھیر جائے تو جس طرح وہ شخص اس جگہ کو اپنی منزل نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ہمیں اس دنیا کو منزل نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ یہاں کے آرام دراحت واسباب تعیش کی فکر کرنی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا معمولی تھی۔ جو اور گیہوں کی بن چھنی روٹیاں اور سرکہ بے تکلف استعمال فرماتے اور اس پر بھی یہ حال ہوتا کہ مسلسل غذا کا سامان بہم نہ رہتا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے دو دن نہ گذرتے جس میں دونوں دن پیٹ بھر کر کھانا ملا ہو مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ یَوْمَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ نے ہمارے سامنے ایک موٹا تہبند نکالا اور اسی قسم کی ایک موٹی چادر اور فرمایا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ کا لباس بھی سادہ تھا۔ ایمنؓ کہتے ہیں کہ میں نے جو کرتہ آپ کے استعمال میں دیکھا تھا وہ کل پانچ درم یعنی سوا روپے کا تھا۔ پھر فرمایا لیکن آج میری لونڈی بھی گھر میں اس قسم کے کرتہ پہننے سے انکار کرتی ہے۔ حالانکہ رسول کریمؐ کے زمانے میں میرے پاس پانچ درم کا ایک کرتہ تھا جو عورت مدینہ میں دلھن بنائی جاتی تو میرا یہی کرتہ منگنی میں جایا کرتا تھا۔ (صحیح بخاری جلد

(۱) حضرت ابوبکرؓ کی تخت نشینی مسجد کی چٹائی پر حضرت عمر فاروقؓ کی پھٹے پرانے کمبل پر اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک معمولی بوریے پر ہوئی۔ یہی وہ سادے نمونے تھے ن کی پابندی کے لئے گاندھی جی نے وزراء خلافت نصیحت فرمائی تھی۔ مگر ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد کی تخت نشینی ہوئی تو اس سادگی کا پورا پورا جواب لایا گیا۔ آزاد ہند کلکتہ نے یہ خبر شائع کی کہ شان نمائی کے لئے پہلے چاندنی چوک سے جلوس نکلا چھ سو سپاہی شاہی سواری کے آگے آگے اور چھ سو پیچھے پیچھے چلتے تھے شاہانہ جلوس پر نقرئی سکوں کی بارش اس وقت ہو رہی تھی جب کہ گجرات کے قحط زدہ علاقوں سے بھوکی جنتا کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں جس ہاتھی نے اس تقریب میں حصہ لیا تھا اس ہاتھی کے لئے نئی دہلی میں چھبیس ہزار روپے کے خرچ سے فیڈر اور حوض بنا گیا تھا۔ الغرض خلفائے راشدین کے زمانہ میں جس قدر سادگی تھی اسی قدر آج اسراف وتبذیر ہے۔ خلفائے راشدینؓ کی سادہ زندگی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۲) ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زوجۂ محترمہؓ نے کسی میٹھی چیز کے کھانے کی خواہش ظاہر کی تو صدیق اکبرؓ نے فرمایا میرے پاس کسی میٹھی چیز کے پکانے کی رقم نہیں ہے مجبوری ہے۔ اس جواب کے بعد زوجۂ محترمہ نے روزمرہ کے خرچ میں سے تھوڑا تھوڑا روزانہ بچایا اور

ان سے گھی اور شکر وغیرہ کے لئے تھوڑی سی رقم بچائی جب صدیق اکبرؓ کے سامنے وہ رقم پیش ہوئی تو فرمایا یہ پیسہ کہاں سے آیا؟ انھوں نے اپنی روزمرہ کی کفالت و بچت کا ذکر فرمایا آپ نے وہ رقم ان سے لے لی اور بیت المال کے خزانچی کے پاس لے جاکر کہا ھذا یفضل عن قوتنا اس قدر رقم ہمارے خرچ سے زائد ہے اسے بیت المال میں داخل کردو اور ایک چٹکی کے مقدار ہمارے وظیفہ میں سے کم کردو۔ (اشہر مشاہیر الاسلام جلد ۱ صفحہ ۹۶)

مسعودی نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے کھانے میں جس قدر خشونت تھی اور جس طرح موٹا جھوٹا کھاتے تھے اسی طرح لباس بھی بے حد معمولی اور موٹے جھوٹے کپڑے کا ہوتا۔ حالانکہ ذاتی آمدنی بھی حضرت ابوبکرؓ کے پاس کم نہ تھی، لیکن تواضع اور سادگی پسند تھی آپ ہی کے طرز پر تمام اجلۂ اصحاب حضرت عمرؓ وغیرہ بھی تھے۔ آپ نے عہدِ خلافت میں بھی ایسے ہی موٹے اور معمولی لباس میں زندگی گذاری۔ عرب کے امراء اور یمن کے بادشاہ آپ سے ملنے آتے تو بہترین حلّے منقش سنہری بوٹیوں کی چادریں اور زرنگار تاج پہن کر آتے۔ یہ لوگ آپ کی سادگی اور معمولی لباس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے اور متاثر اس قدر ہوتے کہ وہی سادگی خود بھی اختیار کرلیتے۔ حمیر کا بادشاہ ذوالکلاع بڑے شاہانہ ٹھاٹ باٹ پُر تکلف لباس میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا شاہی امراء کے علاوہ ایک ہزار غلام خدمت کے لئے اس کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی سادگی کو دیکھ کر عش عش کرنے لگا۔ تمام شاہی لباس اُتار کر حضرت ابوبکرؓ کے رنگ میں رنگالیا۔ (مروج الذہب للمسعودی جلد ثانی صفحہ ۳۰۵)

(باقی باقی)

شمس نوید عثمانی

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

فتنے کا سدِ باب

قرآن کی معنوی تحریف اور انکارِ حدیث کے

از پیر غلام دستگیر صاحب نامی۔

صفحات ۶۴۔

کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت کچھ نہیں۔

ہندوستان والے محصول ڈاک کے لئے ۱۹ پیسے کے ہندوستانی ٹکٹ بھیجکر منگا سکتے ہیں۔ پاکستان والے پاکستانی ٹکٹوں کے ذریعے

ملنے کا پتہ:- دائرۃ الاصلاح۔ محلہ چلّہ بی بیاں اندرون اکبری دروازہ۔ لاہور۔

منکرین حدیث اور قرآن کی من مانی تاویلات کرنے والوں کا فتنہ ہندوستان اور پاکستان میں خطرناک ترین صورت حال پیدا کر رہا ہے۔ یہ لوگ قرآن کا نام لیکر اسلام کو کُند چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ قرآن پاک میں لفظی تحریف تو ممکن نہ تھی اس لئے شیطانی ذہنیت نے قرآن کے معنوں میں تحریف کا ناپاک راستہ نکالا ہے۔ پاکستان میں یہ فتنہ بہت شدت پکڑ چکا ہے اور اس کے سرخیل مسٹر غلام احمد پرویز ہیں۔ اس مختصر کتاب میں مصنف نے بڑے درد و کاوش کے ساتھ اس تحریک کی قلعی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ کتاب کا اسلوب علمی کم اور دردمندانہ زیادہ ہے۔ تاہم عوام کو اس فتنے کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کے لئے اس کا مواد کافی ہے۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے

مرتبہ:- سعید بن وحید۔ بی۔ اے۔ علیگ۔

شائع کردہ:- خواجہ خضر۔ منیجر کتب خانہ دیندار انجمن۔ حیدرآباد دکن۔ (آندھرا پردیش)

ہر فرقہ دوسرے فرقے کو "کافر" بتا رہا ہے ــــ تو پھر مسلمان کون ہے؟ دیندار انجمن کا فیصلہ ہے کہ وہ "مسلمان" ہے دلیل یہ ہے کہ وہ کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتی! ۔ یہاں تک انداز گفتگو بہت سلجھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب کتاب کے آخر میں انجمن مذکور اپنے عقائد کی فہرست پیش کرتی ہے تو اس کی دفعہ ۳ ایک "ستم ناک لطیفہ" کی بنیاد ڈالتی ہے:-

> "حضرت مولانا صدیق دیندار صاحب کا نہ دعویٰ الوہیت ہے ــــ نہ مسیحیت اور نہ نبوت و مہدیت ــــ نہ کبھی کیا گیا اور نہ آئندہ کیا جائے گا۔ آپ کا دعوے صرف کافروں کے لئے ہے۔ مسلمانوں کے لئے آپ کا کوئی دعویٰ نہیں"۔

گویا دیندار صاحب نے جو الوہیت۔ مسیحیت۔ نبوت اور مہدیت کا دعویٰ کیا ہے اس کے مخاطب کفار تو ہیں، مسلمان نہیں! ــــ نبوت کے جھوٹے دعادی کی مکروہ تاریخ میں دنیا کا یہ آٹھواں عجوبہ ہے!۔ کوئی اس انجمن سے پوچھے کہ کیا اسلام کی تبلیغ کے مفاد میں یہ بات بھی کبھی شامل ہو سکتی ہے کہ کفار کے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا جائے؟۔ کیا محمد عربی فداہ روحی کے ختم رسالت کے امتیاز پر حملہ کر کے اسلام کی کوئی حقیقی خدمت کی جا سکتی ہے؟ حیرت اور ماتم کا مقام ہے کہ جب انسان کی مت ماری جاتی ہے تو وہ کیسے کیسے مضحکہ انگیز تماشوں کو مخلصانہ سنجیدگی کیساتھ پیش کر جاتا ہے

حقیقت اتنی ہی بدیہی ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی اصلاح کا جذبہ لیکر بھی اٹھتا ہے تو گمراہی اور کجروی کی پست دلدل میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ خدا ہم پر رحم فرمائے!۔

سُنّت (قرآن حکیم کی روشنی میں)

ناشر:۔ جناب عبدالغفار صاحب۔
صفحات ۴۰۔ قیمت درج نہیں۔
شائع کردہ:۔ شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ تعلیمات اسلامیہ۔ ۵ جناح کالونی۔ لائل پور۔

انکار حدیث کے فتنے کے جواب میں یہ مقالہ ترجمان القرآن اور مقام رسالت کراچی میں ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ منکرین حدیث چونکہ اسلام کو خدا کی کتاب ہی سے سمجھنے اور سمجھانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، اس لئے اس مقالے میں اس بات کی مستحسن کوشش کی گئی ہے کہ "سُنّت" کی اہمیت و عظمت کو کتاب اللہ کی روشنی میں ثابت کیا جائے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اتنے دقیق موضوع کا تقاضا تھا کہ اسکا ظاہری روپ بھی شایان شان ہو۔ بہرحال کتاب لائق مطالعہ ہے۔

— "میں نے مرزائیت کیوں چھوڑی؟"
— "خود فیصلہ کیجئے"
— "دعوتِ مباہلہ"۔

انجمن تبلیغ الاسلام۔ چینوٹ ضلع جھنگ —
شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ عربیہ چینوٹ۔ ضلع جھنگ۔ پاکستان۔
قیمت ہر ایک کتاب دو آنے۔ صفحات ۲۴۔

۱) "میں نے مرزائیت کیوں چھوڑی؟"۔ ایک ایسے شخص کا اعتراف در انکشاف حق ہے جو جامعہ احمدیہ ربوہ میں پیدائشی قادیانی کی حیثیت سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہاں اس کو موقعہ ملا کہ قادیانی سربراہوں کو ان کی خلوت و جلوت میں قریب سے دیکھے۔ اسنے کیا دیکھا کہ مرزائیت کے عقیدے پر نفرت سے ٹھوکر ماردی۔ اس مختصر ٹریکٹ میں اس بارے میں لرزہ خیز انکشافات کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ مرزا محمود خلیفہ قادیانیت سے لیکر ان کے حواریوں کی مخصوص صفوں تک بدکرداری، فحاشی اور بدترین جنسی عیاشیوں کی گرم بازاری ہے۔

(۲) — "خود فیصلہ کیجئے" نامی مختصر ۸ صفحاتی ٹریکٹ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تہذیب و شائستگی کے نادر نمونے جو مُرصّع گالیوں، دروغ بافیوں اور حقیقت کُش حرکتوں پر مشتمل ہیں پیش کئے گئے ہیں۔ ہر اقتباس مع حوالہ دیا گیا ہے۔ ان نمونوں کو دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ "یہ انداز گفتگو کیا ہے؟"...... نبوّت کا دعویٰ اور یہ رکیک بازاری انداز سخن! مگر کتنے ہی ہوش مند انسان ہیں جو ایسے شخص کو نبوّت کے مقام پر فائز تسلیم کرتے ہیں۔ ھیہات! ھیہات!۔

تیسرا ٹریکٹ "دعوتِ مباہلہ کا آخری چیلنج" جامعہ عربیہ چینوٹ کے پرنسپل جناب منظور احمد کے قلم سے ہے جس میں موصوف نے بتایا ہے کہ کس طرح انھوں نے مرزا محمود کو ختم نبوّت کے مسئلے اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوّت کے باب میں مباہلہ کی للکار دی تھی۔ لیکن کس طرح قادیانیت کے سربراہوں نے چپ سادھ لی اور مباہلہ کا خطرہ مول لینے سے خاموش انکار کر کے گویا اس حقیقت کا پردہ فاش کر دیا کہ ان لوگوں کو خود بھی اس جھوٹی نبوّت کا کامل یقین نہیں جس کی تبلیغ کرنے کے لئے وہ خشک و تر پر جال بچھا رہے ہیں۔ تینوں ٹریکٹ حقیقت پسندانہ کاوشوں کے سیدھے سادے نمونے ہیں۔ جن میں علمی استدلال کے بجائے خالص ٹھوس واقعات کی زبان میں قادیانیت کا جھوٹ دو اور دو چار کی طرح ثابت کیا گیا ہے۔ جو لوگ حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت کھو چکے ہوں ان سے گفتگو کا یہی انداز باقی رہ جاتا ہے۔ تینوں ٹریکٹ پڑھنے کے لائق ہیں۔ شاید کسی خود فریب کو ان سے ہوش آجائے!۔

درسِ توحید

ابو عبداللہ سراج الدین جودھپوری صاحب

صفحات ناول سائز ۴۸۔
ملنے کا پتہ:۔ حاجی عبدالکریم۔ عبدالحلیم
سوداگر چرم۔ قاضی ٹولہ۔ بریلی۔
قیمت درج نہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں اس دردناک حقیقت کا جائزہ لیا گیا ہے کہ امت مسلمہ جو دنیا میں توحید کی علمبردار رہی ہے اور جس کا سرمایۂ وجود ہی توحید خالص ہے کس طرح خفی و جلی، کھلے اور چھپے شرک کے تاریک غار میں گرتی جا رہی ہے۔ قبوری شریعت نے کس طرح قبروں، مزاروں اور مُردوں کی قربانگاہ پر "خدائے واحد" کے عقیدے کو بھینٹ چڑھایا ہے۔ واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اکابر امت کے اقوال و نظریات سے استشہاد کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "توحید" ہے کیا اور اس کی حدود کیا ہیں؟ شرک کا خطرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کس کس شکل میں توحید کا عقیدہ روز مرہ کی محسوس نہ ہونے والی حرکتوں سے گھائل ہو کر رہ جاتا ہے۔ کتاب بظاہر چھوٹی سی ہے مگر اس میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے۔ قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔

سنت اور اتحاد ملت

مکتوبہ:۔ عبدالغفار حسن صاحب۔
صفحات:۔ ناول سائز:۔ ۱۶۔
ناشر:۔ شعبۂ نشر و اشاعت۔ جامعہ تعلیمات اسلامیہ۔ ۴ جناح کالونی لائلپور۔ پاکستان۔

پرویزی مکتب فکر کا الزام ہے کہ "سنت" امت میں تفرقہ کی بنیاد ہے! یہ الزام صاف و صریح الفاظ میں نہیں دیا جا سکا تو بین السطور اور اشاریہ کے انداز میں دیا جا رہا ہے اور کتاب اللہ کو سنت رسول اللہ کی "حریف" کی شکل میں آہستہ آہستہ لانے کی ناپاک جسارت کی جا رہی ہے۔ صاحب کتاب مذکور نے جامع انداز سے اس الزام کا جواب دیا ہے۔ اس ظاہر و باہر حقیقت کو پیش کیا ہے کہ درحقیقت اتحاد ملت کا سنگِ بنیاد ہی سنتِ رسولؐ ہے۔ "سنتِ رسولؐ" سے ہٹ کر امت کتاب اللہ کی ترجمانی کی سند کس کو مانے گی؟ ہر کس و ناکس دعویٰ کرے گا کہ میں ہی "سند" ہوں اور ذہنی طوائف الملوکی اور فکری انارکی کا اتحاد سوز فتنہ پھیل جائے گا۔ کتنی موٹی سی بات ہے۔ مگر ان نام نہاد "اہل قرآن" کی بر خود غلط دقیقہ سنجی کو نظر نہیں آتی! ۔

قادیانی اور مسلمان

از:۔ جناب عبدالرحیم اشرف صاحب۔
صفحات:۔ ناول سائز:۔ ۱۶۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ المنیر۔ پوسٹ ۲۱۱ لائل پور
پاکستان (قیمت درج نہیں)۔

اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں کے وہ اقتباس دیئے گئے ہیں جن میں نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے اور غیر قادیانی کو ذلیل ترین تکفیر کی زبان میں رگیدا گیا ہے، صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قادیانی اور مسلمان دو مشرق و مغرب ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان اور ہندوستانی پورچ

از:۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب۔
صفحات:۔ ناول سائز:۔ ۱۶۔
(قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

جس طرح پاکستان میں اسلام کش فتنوں کی نت نئی آندھیاں چل رہی ہیں ہمارے دیش میں بھی "اسلام" کے وجود کے لئے نازک مسئلے سر اٹھا رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستانی برادران وطن مسلمانوں کو ہندی نژاد ثابت کر کے بھارتی سنسکرتی کا لبادہ اڑھانے کے لئے بے چین ہیں جیسا کہ اس کتاب میں مسٹر سمپورنانند کے یہ الفاظ نیشنل ہیرلڈ کے حوالے سے دیئے گئے ہیں:۔

"ہندوستانی مسلمانوں میں ننانوے فی صدی سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو یہیں کے ہندوؤں کی اولاد ہیں [illegible]

بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن افسوس کہ وہ اپنے اصل اجداد کے کارناموں سے ناواقف ہیں"۔

مولانا علی میاں مدظلہ نے ان چند صفحات میں اس بنیادی سوال کا مسکت جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان کی "ملت و قومیت" جغرافیائی اینٹ پتھر اور نسلی خون کے لوتھڑوں سے نہیں بنتی بلکہ اس کے عناصر ترکیبی ایمانی حقائق ہیں۔ مسلمان مادر گیتی کا بیٹا نہیں خدا کی مخلوق اور اسی کا بندہ ہے۔ مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے اور اس کے جواب کو جاننے کے لئے اس طرح کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔

سوانح حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف:۔ مرزا محمد یعقوب لائل پور۔

صفحات:۔ ناول سائز:۔ ۱۱۲۔

قیمت ———— ۲؍

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اشاعت توحید....

گلی ۳ محمد پورہ۔ لائل پور۔ پاکستان۔

مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ توحید کے ایک جفاکش اور جاں نثار مبلغ گذرے ہیں۔ آپ نے گنگوہ کے بزرگوں سے استفادہ کرنے کے بعد تقریباً پچاس سال تک پنجاب کے علاقے میں توحید کی اشاعت کا کام کیا۔ یہ کتاب آں محترم مرحوم و مغفور کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہستی ان بے لوث خدام دین میں سے تھی جن کے نزدیک کام کا بہترین اجر رضائے الٰہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کارنامے خاموشی اور گمنامی میں رہے۔ حالانکہ آپ نے امت مسلمہ کے اندر ایسے شرک آمیز عقائد کے صنم کدے مسمار کئے جہاں توحید کا عقیدہ بگڑتے بگڑتے " اوتار واد" کے اس نعرے تک جا گرا تھا کہ وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر + اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰے ہو کر

معاذ اللہ! ———— انا للہ وانا الیہ راجعون۔

توحید ذات باری کے ساتھ ان صنم کدوں میں خدا کی صفات کے ساتھ بھی "استہزاء" ہوتا ہے۔ کسی بدعقیدہ مسلمان سے جو اپنے "پیر" کے علم غیب کا قائل تھا، آپ نے کہا کہ :۔

"بھائی مجھے اپنے پیر کے پاس لے چلو۔ میری جیب میں پڑی ہوئی چیز کا بھی اسے پتہ نہ چلے گا۔ کجا کہ دور کے حالات سے وہ آگاہ ہو سکے........ اور سن لو! حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین رحمۃ للعالمین بھی غیب داں نہ تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر منافقوں نے بہتان لگایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ایک مہینہ تک پریشان رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عفت و طہارت کی خود شہادت دی"۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانائے مرحوم کام کے دھنی ہونے کے ساتھ کام کرنے کے سلیقے اور زیرکی و حکمت کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ یاب تھے۔

پنجاب کی سرزمین جہاں نبوت والوہیت کے دعویدار بھی شیطانی پود برسات کے کیڑوں کی طرح جنم لیتی رہی ہے ———— جہاں قبوری شریعت کا غلیظ و تاریک "اندرون" اپنی پوری شرمناکیوں کے ساتھ ننگا نظر آتا رہا ہے۔ آپ نے تن، من، دھن سے توحید و رسالت کا عقیدہ درست کرنے اور حقیقی اسلام کی تصویر اُجاگر کرنے میں پچاس سال کی عمر صرف کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انکسار اور عجز کا یہ حال تھا کہ:۔

" ایک عالم دین بمبئی سے آئے اور دریافت کیا کہ مولانا کہاں ہیں؟ جواب ملا کہ مولانا اس وقت اپنے کھیت میں مویشیوں کے لئے چارہ کاٹ رہے ہیں"

سادگی اور فقیرانہ زندگی میں دین کی یہ لگن ——"گدڑی میں لعل" شاید اسی کا نام ہے۔ کتاب کی ترتیب بھی اچھی ہے پہلے اس ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں مولانا نے کام کیا پھر آپ کے کام کی سرگذشت ہے۔ اگرچہ بار بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے واقعات کو جگہ جگہ "کٹ شارٹ" کر دیا گیا ہے ———— کتابت و طباعت بہت ہی گئی گذری ہے۔ افسوس کہ اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔

کتاب کے صفحۂ اول پر مولانا کے نام نامی کے ساتھ متعدد تعریفی القاب لگائے گئے ہیں، جن میں سے ایک "مجدد ملت"

...مث پر مولانا کو حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت ...کے بعد "تیسری واحد شخصیت" کا ریمارک دیا گیا ہے اور کہیں کہیں جملہ مرتب کے ذہن کا یہ جھکاؤ ملتا ہے کہ وہ مولانا کی "مجددیت" تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یہ انداز کچھ زیب نہیں دیتا۔ جس شخص نے اپنی للّٰہیت کو خود نمائی اور تشہیر سے آلودہ نہ ہونے دیا ہو اسکے معتقدین کو اس کے اس رجحان کا ہی احترام کرتے ہوئے عقیدت کی رو میں بہہ کر "مبالغہ آرائی" سے دامن کش ہی رہنا چاہیئے شخصیت خود اپنا صحیح مقام تسلیم کرا لیتی ہے۔ اور غلو آمیز تعریف شخصیت کو اس کے اصل مقام سے بھی گرا دیتی ہے۔

مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ

از:۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی۔

صفحات:۔ ناول سائز:۔ ۱۴۴۔

قیمت:۔ غیر مجلّد ۱/- مجلّد 1/8۔

ناشر:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد دہلی

اس کے خطوط کی روشنی میں کسی شخص کا مطالعہ شخصیت کا بہترین مطالعہ مانا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب نے اس کتاب میں تبلیغی جماعت کے بانی مبانی حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط جمع کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی نے کتاب کے ابتدائی حصے میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ ان خطوط کی زبان بھی "غیر مانوس" ہے اور مضامین کی سطح بھی عام فہم انداز کی نہیں۔ تاہم یہ خطوط ایک ایسے قلب روشن کی دھڑکنیں ہیں جس کی گہرائیوں میں اشاعت دین کا جذبہ ایک جذبۂ بیکراں کی شکل میں طوفانی تلاطم برپا کئے ہوئے تھا "تبلیغ" جس کا میدان عرصے سے اہل علم نے چھوڑ دیا اس انسان کے سینے میں جذبات دینی کا ایک طوفان اٹھائے ہوئے تھی جس کا نام نامی "محمد الیاسؒ" تھا۔ خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آں محترم میں اس قدر عظمت کے باوجود کتنی سادگی کیسا عجز و انکسار اور کس قدر غلبۂ عبودیت تھا۔ قدم قدم پر اسلام کی تڑپتی ہوئی محبت اور نفسانی حملوں کی طرف سے بے پناہ احتیاط ملتی ہے۔ اس "مجاہد" کے جذبات میں کہیں بھی خود پرستی عصبیت اور دھڑے بازی کا رجحان دور دور تک نہیں ملتا لیکن افسوس کہ تبلیغی مشن میں بھی بے لوث اور سرفروش للّٰہیت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے اور لوگ مولانا مرحوم کے ان الفاظ کو بھول رہے ہیں کہ:۔

"ہماری تحریک اور اسلامی تبلیغ نہ کسی کی دل آزاری کو پسند کرتی ہے۔ اور نہ کسی فتنہ و فساد کے الفاظ سننا چاہتی ہے .... آئندہ سے ایسے الفاظ سے احتراز چاہیئے جو اشتعال انگیز، فتنہ خیز ہوں بلکہ اس قسم کے مبہم الفاظ لکھنے چاہئیں جس سے کسی خاص فرقے اور جماعت پر طعن نہ ہو (ص ۱۲۵)

کاش یہ جذبۂ تبلیغ و اشاعت دین کی صفوں میں عام ہو جا... اور مقصدی اتحاد کا شعور سطحی اختلافات کی خلیج کو پاٹ ... دین کے دردمندوں کو "بنیان مرصوص" اور "مضبوط چٹا..." میں تبدیل کر دے ———— ان خطوط میں تبلیغی ... کی آبیاری کا بھی سامان ہے اور تزکیۂ و اصلاح کی نازک گھا... کے لئے بھی رہنمائی اور روشنی موجود ہے۔ گویا یہ کتاب انفرا... اور اجتماعی دونوں لحاظ سے مفید ہے۔

دیہاتی معالج
Hamdard

Regd. No. A-972 Tajalli Monthly Deoband. U. P.

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی مشہور و معروف تفسیر

مکمل تفسیر بیان القرآن عکسی اردو

اصل نسخہ مطبوعۂ تھانہ بھون ـــــ فوٹو آفسیٹ کے ذریعے

مثالی خوبیوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے

تقریباً چالیس سال سے یہ تفسیر بیشتر مقامات سے بار بار شائع ہو چکی اور ہو رہی ہے۔ لیکن جس حسن انتظام اور خوبیوں کے ساتھ حضرت تھانوی نے اپنی نگرانی میں "تھانہ بھون" سے شائع کرائی تھی آج تک کوئی دوسرا مطبع شائع نہیں کر سکا۔

الحمد للہ! اب ادارہ تفسیر دیوبند نے تھانہ بھون کے مطبوعہ ۱۲ نسخے کا فوٹو لیکر نہایت موزوں سائز پر ماہانہ پروگرام کی شکل میں طبع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

طریق اشاعت

۱- اس اشاعتی پروگرام میں شریک ہونے کے لئے صرف ایک روپیہ "فیس ممبری" ارسال کر کے اپنا نام اور پتہ خریداروں کے رجسٹر میں درج کرا لیں۔

۲- قیمت فی جلد تین روپے (۳ ہے) محصولڈاک ۔۔۔۔ ہے۔

۳- ممبران کو ہر ماہ ایک جلد صرف تین روپے میں بذریعہ وی پی ارسال کیجائیگی محصولڈاک معاف ہوگا۔

۴- مکمل تفسیر ۲۴ جلدوں میں تیار ہوگی، ہر ایک جلد میں تقریباً سوا پارہ کی تفسیر ہوگی۔

۵- پانچ احباب ملکر ایک پتہ پر پانچ جلدیں طلب کرینگے تو صرف بارہ روپے میں پیش کی جائیں گی۔

۶- ایجنٹ حضرات اور تاجران کتب کو معقول کمیشن دیا جائے گا معاملات خط و کتابت سے طے فرمالیں۔

تعاون کا طالب: منیجر ادارۂ تفسیر دیوبند (یوپی)

ماہنامہ
دیوبند
تجلی
تاریکیوں میں ایک چراغ
ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)
سالانہ:- سات روپے
۱۸ شلنگ
۶۲ نئے پیسے
دس آنے

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں

صافی

استعمال کیجیے

صافی آپ کو خون کی خرابی سے
پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچائے گی
اور آپ کے نظامِ عصبی میں توازن
پیدا کرکے آپ کے جسم میں تازہ خون
کی لہر دوڑا دے گی۔ معدہ کے فعل
کو درست کرے گی اور جسم کو چست
اور پھرتیلا بنائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلّی دیوبند

شمارہ ۳و۴ — جلد ۱۴

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

قیمت سالانہ سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

اس پرچہ کی قیمت ایک روپیہ

ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ بھیجیے)

شذرہ فہرست

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات: ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائیگا

فہرست مضامین مطابق ماہ اپریل و مئی سنہ ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلّی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات: مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ بنیا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

آغازِ سخن

قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ

یہ آدمی۔ یہ ناشکرا اور خیرہ سر آدمی جو زمین کے سینے پر اس طرح دندناتا ہے گویا اس کا توانا جسم، اس کے دل و دماغ، اس کی بے مثال صلاحیتیں اور اسکی روح خود اسی کے کمالِ تخلیق کا شاہکار ہوں۔ گویا زندگی اور اس کی بیکراں نعمتوں کا کوئی حساب اسے کہیں نہ دینا ہو۔ — آخر اس کی حقیقت کیا ہے۔ ایک تنکہ، ایک حباب، ایک ذرّہ بے مقدار۔ خالقِ کائنات کی قدرت و اختیار کے مقابلے میں اس کے ضعف و بے اختیاری کا تناسب بیان کرنے کے لئے نہ ریاضی کے پاس کوئی فارمولا ہے نہ لغت کے پاس کوئی لفظ۔ کچھ نہ ہونا اور سب کچھ ہونا۔ ان دو متقابل نقطوں میں جو نسبت ہے ٹھیک ایسی ہی نسبت آدمی اور اللہ کے مابین ہے۔ پھر بھی یہ آدمی کتنا احسان فراموش، کیسا خود سر و مغرور کس درجہ غافل و مدہوش ہے۔ ظلوم و جہول۔ کفور و کنود۔

برتر ہے وہ ذات جس نے عسر کے ساتھ یسر، صحت کے ساتھ مرض اور راحت کے ساتھ مشقت پیدا فرماکر غافل و تساہل انسان کے لئے خوابِ غفلت سے چونکنے، اپنی حقیقت کو سمجھنے اور اپنے کفران و طغیان پر متنبہ ہونے کا زرّیں موقع بہم پہنچایا۔ راقم الحروف پہلے تو آئے دن کی بیماریوں اور دشواریوں پر ملول ہوا کرتا تھا، لیکن اب جتنا جتنا سوچتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا کہ بیماریوں اور دشواریوں میں خیر ہی کا پہلو غالب ہے۔ کتنا بصیرت افروز ہوتا ہے وہ منظر کہ ابھی ہم بہت کچھ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، اسکیمیں سوچ رہے ہیں، مگن ہیں کہ یہ کرلیں گے وہ کرلیں گے اور ابھی بیماری ہمیں آدبوچتا ہے۔ ابھی داڑھ یا کان میں درد شروع ہو جاتا ہے، ابھی آنکھیں دُکھنے آجاتی ہیں۔ ابھی کوئی زہرہ گداز خبر ہمارے ہوش و حواس معطل کرکے رکھدیتی ہے۔ بس بھئی سارے منصوبے خاک ہیں۔ سارے عزائم دھرے رہ گئے قلم ہاتھ میں ہے مگر انگلیاں جنبش کرنے سے انکار کر رہی ہیں دماغ سنسنا رہا ہے۔ توانائیاں ہتھیار ڈال رہی ہیں۔ کہاں ہے ہمارا تبختر، ہمارا گھمنڈ، ہمارا طنطنہ۔ لاریب کہ یہی وہ لمحات ہیں جب اللہ اپنے بندے کو موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ اپنی بے حیثیتی کو سمجھے اپنے کفران و سرکشی کا احساس کرے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو اور سوچے کہ اسی طرح ایک دن اس کے بے حقیقت جسم کو خاک کے سپرد ہو جانا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

اس موقع سے جس نے فائدہ اُٹھالیا وہی صاحبِ بصیرت ہے۔ وہی دانشور ہے۔ وہی خوش نصیب ہے۔ صدقے اُس رحیم و کریم کے جس نے مرض دیکر صحت کی، مصیبت دے کر آرام و راحت دی اور مجبوریاں دیکر قوت و اختیار کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بخشا۔

عاجز یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سعادت مند بندوں کی طرح اس نے بھی عسر و یسر کی سبق آموزیوں سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھایا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کر سکتا ہے کہ انسان کو خود سری

اور غفلت سے چونکانے کے لئے حوادث و آلام اور امراض و آفات سے بڑھ کر کوئی تریاق نہیں۔ پلنگ پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے یا حوادث و آفات کی گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے سوچو تم کیا ہو، تم میں کیا دھرا ہے جس پر گردن اکڑا کر چلتے ہو۔ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ۔ خدا کو بھول کر خود کو بھلا دینے والو کیا بھول گئے تمھیں منی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا گیا۔ فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔

تمھیں ہو کیا گیا ہے کہ اس خالق و مالک کی ناشکری کرتے ہو جس نے تمھیں وجود بخشا۔ پھر وہ اس وجود چھین لینے کے بعد تمھیں دوبارہ وجود بخشے گا اور پوچھے گا کہ کیا کر کے آئے ہو؟ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

هیهات۔ آیاتِ الٰہیہ کو تلاوت کرنے والے بہت ہیں، مگر وہ لوگ کہاں گئے جن کے سینے آیاتِ الٰہیہ کو سن کر سوز و گداز سے بھر جاتے تھے۔ جن کی عقلِ سلیم نے آیاتِ ربانی کے عطا فرمودہ پیغامات کو اپنے ایک ایک ہوئے تن میں اس طرح سمویا تھا کہ وہ خود بھی چلتی پھرتی آیتیں بن گئے تھے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

تجلی کا مدیر بیمار ہوتا ہے۔ تجلی اپنے وقت پر شائع نہیں ہو پاتا۔ مشتاق قارئین کو کوفت رہتی ہے، کاروباری اعتبار سے ادارۂ تجلی کو زیاں پہنچتا ہے۔ یہ سب بظاہر بہت اہم ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی اہم نہیں۔ اہم یہ چیز ہے کہ ہم نے ٹھوکروں سے، آفات و حوادث سے، امراض و عوارض سے سبق لینا چھوڑ دیا۔ حالانکہ کارگہِ عالم میں حوادث و آلام اور امراض و عوارض کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ آدمی جاگے۔ عبرت پکڑے۔

اپنے انجام کی طرف متوجہ ہو۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (النساء) کہدو اے پیغمبر دنیا کی پونجی تو بہت قلیل ہے اور آخرۃ ہی بہتر ہے اس کے لئے جو اللہ سے ڈرے۔ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ (المؤمن)

اے قوم! یہ جو دنیا کی زندگی ہے اسے تو بس تھوڑا سا برت لینا ہے ہمیشہ رہنے کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مصیبت اور تکلیف میں آدمی خدا کو یاد بھی کرتا ہے تو یہ یاد عموماً دیرپا نہیں ہوتی۔ ادھر مصیبت کے بادل چھٹے اور ادھر اس کی خدا فراموشیاں انگڑائی لے کر بیدار ہوئیں۔ پھر ظلمت علیٰ ظلمت یہ کہ مصیبت ختم کر دینے کا کریڈٹ وہ اللہ کی بجائے اُن اسباب و سائل کو دیتا ہے جو بظاہر دفع مصیبت کا سبب بنے ہیں اور اُن افراد و اشخاص کو جن کے واسطے سے یہ اسباب و وسائل میسر آئے ہیں شکر و نیازمندی کا وہ سرمایہ پیش کر دیتا ہے جس کا حقدار سوائے اللہ کے اور کوئی بھی نہیں۔ اس عام اور ودصورتِ حال کو اللہ نے کیسے پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے:-

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (الزمر)

اور جب آ پہنچی انسان پر سختی تو پکارنے لگا اپنے رب کو بڑی توجہ کیساتھ پھر جب اسکے رب نے اپنی طرف سے نعمت عطا فرما دی تو بھول گیا اُس چیز کو جسکے لئے پہلے اپنے رب کو پکار رہا تھا اور لگا اللہ کی برابر ٹھیرانے اوروں کو تاکہ اسکی راہ سے بھٹکائے۔ کہدو اے محمد! اُٹھائے تھوڑا سا فائدہ اپنے کفران نعمت سے بلاشبہ تو دوزخیوں میں سے ہے۔

+ + + +
+ + + +
+ + + +

دیکھ لیجئے یہ منکرین خدا یا مشرکین و کفار کا ذکر نہیں۔ ان لوگوں کا ذکر ہے جو خدا کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ کلفت و مصیبت کی گھڑیوں میں دیوی دیوتاؤں کے عوض اسی کو خضوع قلب اور تضرع کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اسی سے دعا کرتے ہیں۔ اسی کو دافع البلیات اور شافی جانتے ہیں۔ انھیں اللہ نے مصیبت میں ڈال کر موقع دیا کہ غفلت سے چونکیں، بدعملی اور خدا فراموشی سے باز آئیں، لیکن ان کا رویہ عموماً یہ ہے کہ مصیبت پڑنے پر تو خدا کو پکارا اور جب مصیبت دور کر دی گئی تو بجائے اس کے کہ اللہ کی شکر گزاری کرتے انکی زبانوں پر اور ذہنوں میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں کہ فلاں ڈاکٹر بہت اچھا ہے فلاں دوا بڑی اکسیر ہے فلاں بزرگ کا تعویذ نہایت تیر بہدف ہے، فلاں پیر غوث و دستگیر ہیں۔ فلاں مزار پر جو دعا کرو مقبول ہوتی ہے وغیر ذلک۔ یہ باتیں نہ صرف ان کی اپنی گمراہی کا ثبوت ہیں بلکہ ان کے ذریعہ وہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ سے بھٹکا رہے ہیں۔ بے شک ڈاکٹر اچھے اور برے بھی ہوتے ہیں۔ دوائیں زود اثر بھی ہوتی ہیں اور بے اثر بھی۔ اولیاء اللہ کسی کے لئے دعا کریں تو مقبول ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ تعویذ میں بھی کچھ نہ کچھ اثر ہے، لیکن ایک تو ہے اسباب و وسائل کو ثانوی درجہ میں اہمیت دیتے ہوئے اصل معطی بخشندہ خدا ہی کو سمجھنا اور ایک ہے اسباب و وسائل کو بنیادی اہمیت دے کر خدا کو نعوذ باللہ ثانوی درجے میں ڈال دینا۔ ان دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی محمود ہے اور دوسری مردود۔ پہلی بجا ہے اور دوسری کلیۃً باطل۔ یہ ٹھیک ہے کہ زبان سے ہم صاف صاف نہیں کہتے کہ فلاں شخص یا فلاں ذریعہ اللہ کے مساوی ہے۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ مرض اور مصیبت دور کرنے میں اللہ کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن یہ سکوت بجائے خود کفران اور بے حسی میں داخل ہے۔ اللہ کا یہ مطالبہ نہیں کہ مجھے بھی کارساز مانو، وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مجھے ہی کارساز مانو۔ ان دونوں باتوں میں بون بعید ہے۔ ایک اسلام ہے تو دوسری کفر۔ ایک شکرانِ نعمت ہے تو دوسری کفرانِ نعمت۔ پھر سکوت نہ بھی کیا جائے بلکہ اللہ ہی کو کارساز ماننے کا اعلان و اظہار ہی کر دیا جائے تب بھی ذہن و اعتقاد کی کیفیات کا صحیح فیصلہ زبان سے نہیں عمل سے ہوا کرتا ہے ہمارا عمل اگر احسانِ الٰہی کے احساس اور اسی کے امتنان و شکر کا مظہر نہیں تو یہی ہمارے کفران اور غلط اندیشی کا سب سے بڑا برہان ہے۔ ہم خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کے لئے بھی گمراہی کا وسیلہ بنے۔ ہمیں ڈرنا چاہئے کہ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ کا آتشیں دائرہ کہیں ہمیں بھی تو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گیا۔

بات پھیل گئی۔ تذکیر صرف اس نکتہ کی مقصود تھی کہ بیماری اور مشقت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر وہ نفس امارہ کی دسیسہ کاری کے لئے تازیانۂ عبرت بنکر ذہن انسانی کو اطاعت و بندگی کی طرف منعطف کر دے اور آرام و راحت کی ساعتیں غفلت و بے حسی کی جو گرد ذہن و قلب پر تہہ بر تہہ جمانی چلی جاتی ہیں اسے دھو ڈالے۔

لیکن یہی بیماری اور مشقت عذاب و سزا بھی ہے اگر انسان اس سے کوئی سبق نہ لے یا سبق لے تو محض وقتی پھر اللہ اس پر رحم فرما کر صحت و راحت کی نعمتیں نازل کر دے تو وہ بھول ہی جائے کہ کس نے اسے مصیبت سے نکالا اور کس کی چشم کرم کے اشارے سے اس کے امراض و آلام کا استیصال ہوا۔ ایسے بدنصیب کی مثال ایک تو وہ ہے جو اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ والی آیت میں بیان کی گئی اور ایک وہ ہے جو ریاکارانہ عبادت کے سلسلہ میں اللہ نے سورۂ بقرہ میں بیان فرمائی ہے:-

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ	پس اس کی مثال اس پتھر کی سی ہے جس پر تھوڑی سی گرد جمی ہوئی ہے پھر اس پر زور کا مینہہ برسا تو اسے کر چھوڑا بالکل صاف۔ کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جسے انھوں نے کمایا اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ناشکروں کو۔

+ + + +

بڑی قابلِ توجہ بات ہے کہ غیر محتاط قسم کے مفسرین و واعظین کے ..... عامۃ المسلمین کے دماغ میں یہ مہلک خوش فہمی جاگزیں ہوگئی ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں کافر آتا ہے اس سے مراد وہی لوگ ہوتے ہیں جو اصطلاحاً بھی کافر ہیں اور ہم مسلمانوں سے ان آیات کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ علی الاطلاق ہرگز درست نہیں ہے۔ قرآن اٹھا کر اسی آیت کو دیکھئے۔ اس کا آغاز یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ہوتا ہے۔ یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! مومنین ہی کو یہ ہدایت دی بھی جاسکتی ہے کہ ریاکاروں کی طرح اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذا پہنچا کر مت برباد کرو۔ کافر اصطلاحی ریاکاری نہ کرے تب کیا اور احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنے صدقات برباد نہ کرے تب کیا۔ وہ تو جہنمی ہے ہی۔ خطاب مسلمانوں سے ہے اور الکفرین سے مراد اصطلاحی کافر نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو زبان سے تو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان کے افعال و اطوار اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ اللہ اور یوم آخرت کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترا یا اترا ہے تو رگ پے میں رچا نہیں، بلکہ قلب و ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جا پڑا ہے۔ یہاں بے اختیار وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو اللہ کے رسول نے بڑے الحاح اور فریاد کے انداز میں اللہ سے کہے تھے:۔

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (الفرقان)	اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بالکل متروک و مہجور کر چھوڑا ہے۔

فرق اتنا ہے کہ کفار تو نعوذ باللہ قرآن کو جھک جھک اور بکواس قرار دے کر اسے چھوڑے ہوئے تھے، لیکن ہم مومنین کی غالب اکثریت قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے تلاوت کرنے اور جزدانوں میں احترام و عقیدت کے ساتھ رکھنے کے باوجود عملاً چھوڑے ہوئے ہے۔ انبیاء اور ان کی دعوتِ حق کے دشمن کھلے کافر تھے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ۔ لیکن ہمارے دین و ایمان کے دشمن خود ہمارے نفس ہیں جن کی خباثت و بغاوت پر تن آسانی، لذت کیشی، مادہ پرستی اور ملمع کاری کے حسین غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ان غلافوں پر نئے دور اور نئے مادہ پرستانہ فکر نے تو وہ زر دوزی کی ہے کہ الامان والحفیظ۔ بازارِ حیات میں خوبصورت الفاظ کا لین دین شباب پر ہے معانی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جسم سجے ہوئے ہیں اندروں کی کسی کو فکر نہیں۔

حاصل یہ کہ مصیبت میں خدا کو پکارنا اور راحت میں اسے بھلا دینا بدترین کفران ہے۔ ہم سب کو اس کفران سے پناہ مانگنی چاہئے۔

عاجز کی جس وقتی بیماری کے باعث مارچ ۱۹۶۳ء کا تجلی بیس دن مؤخر ہوا اس کے سلسلے میں عیادت کے خطوط لکھنے اور دعائیں کرنے والے دوستوں کو فرداً فرداً شکریے کا خط لکھنا ممکن نہیں ہوا اس لئے آج میں من لم یشکر العبد لم یشکر اللہ کے تحت ان سب حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ زیر نظر شمارے کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ یہ الزام نہ دے سکیں گے کہ میں نے یک ماہی خلا کی تلافی کرنے میں اپنی حقیر استطاعت کی حد تک محنت نہیں کی ہے۔ وللہ الحمد۔

عامر عثمانی

شذرے

الجزائر

یہ مسرت انگیز خبر یقیناً آپ پہلے ہی سن چکے ہونگے کہ الجزائر کی طویل جنگ آزادی آخرکار مغرور و بے رحم فرانس کی شکست اور فولادی عزائم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے مسلمانوں کی فتح پر منتج ہوئی۔ فالحمد علیٰ ذلک۔ گویا یہ لازوال حقیقت اس خالص مادّہ پرست عہد میں بھی ثابت ہوکر رہی کہ سر میں سودا ہو تو انسان پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لا سکتا ہے۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔ فرعونوں کے استکبار و تمرد کو پاش پاش کر سکتا ہے۔

ویسے تو تاریخ کا دامن مجاہدین اسلام کے بے مثال کارناموں سے پہلے ہی مالا مال ہے۔ چشم فلک نے وہ جانباز بھی دیکھے ہیں جنھوں نے خدائے واحد کے بھروسے پر خالی ہاتھوں پوری دنیا کو للکارا تھا اور مہر و ماہ نے دیکھا کہ ان کی ٹوٹی ہوئی تلواروں اور خم کھائے ہوئے نیزوں نے آہن و فولاد کے سینے چیر دیئے تھے۔ وہ سر بکف مجاہدین بھی دیکھے ہیں جنکی پیش قدمیوں کو کف در دہاں سمندر اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ بھی نہ روک سکے۔ وہ اولوالعزم من چلے بھی دیکھے ہیں جو چار ہزار کی فوج لیکر سرزمین فراعنہ کے ایک کروڑ شہریوں اور کئی لاکھ فوجیوں کو حق کے آستانے پر جھکانے چلے تھے اور فتح و ظفر کے پرچم اڑاتے ہوئے چپے چپے پر چھا گئے تھے۔

لیکن الجزائر کا رزمیہ اس اعتبار سے عدیم النظیر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان سرفروشوں نے بڑی طویل مدّت تک لرزہ خیز ابتلا جھیلی ہے اور ایک ایسے دور میں جب نئے نئے مہلک ترین ہتھیاروں کے آگے انسانی جسم مچھر اور مکھی کی طرح بے حقیقت ہوکر رہ گیا ہے اُس حیرتناک پامردی اور بے نظیر تحمل کا مظاہرہ کیا ہے جس کی کماحقہٗ تحسین کے لئے ڈکشنری میں کوئی بھرپور لفظ موجود نہیں ہے۔ زندہ باد مردانِ حریّت۔ پائندہ باد عزم و ہمت کے زندہ پیکر۔

کیا شک ہے کہ مسلمانانِ الجزائر کے ناقابلِ شکست عزم و استقلال کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا اس کا کریڈٹ اسلام ہی کو پہنچتا ہے۔ اسلام ہی کی نفسیات سے یہ اذعان و یقین ابھر سکتا ہے کہ جان دیکر ہم سب کچھ نہیں کھو رہے ہیں بلکہ موت کی سرحد سے بالکل متصل اگلے ہی قدم پر ایک نئی زندگی ہے۔ نئی دنیا۔ نئے ساز و سامان۔ ہاں ہمیں سب کچھ مل سکتا ہے۔ جنت مل سکتی ہے اور جنت سے بڑھکر کوئی شئے نہیں جس کی انسان آرزو کر سکے۔ بے نہایت آسائشوں کا گہوارہ اور لازوال نعمتوں سے معمور جنت جہاں آلام و آفات کا گذر نہیں۔ جہاں مرض کا ڈر اور موت کا اندیشہ نہیں۔

جان کی قربانی کافر وملحد بھی دیتے ہیں۔ سرفروشی کے کارناموں سے کفر کی تاریخ بھی خالی نہیں، لیکن جن کی تگ وتاز اور سعی وجہد کی تہہ میں قوم اور وطن اور فانی مناع دنیا کے سوا کچھ بھی نہ ہو وہ ہنگامی جوش، وقتی سرفروشی اور ضعیف البنیان اشتعال سے زیادہ کسی پائدار جذبے کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ متین اور مستقل جذبۂ جانفروشی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے شعور وادراک کی تہوں میں کسی لافانی محرک کی جڑیں گہری اُتری ہوئی ہوں اور یہ محرک سوائے ایمان بالآخرۃ کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وہ محرک تھا جو عرب کی وادی سے ایک ابرِ گہربار بن کر اٹھا اور ایمان وعمل کی عطر بیز ہواؤں کے دوش پر چل کر اقصائے عالم پر چھا گیا۔

بلند وبرتر ہے وہ اسلام جس نے الجزائر کے بانکے سرفروشوں کو عزم وتحمل کے بارانِ مسلسل سے سیراب کیا۔ اور ایک لمحے کو بھی یہ مایوس کن تخیل ان کے ذہنوں میں نہیں اُبھرنے دیا کہ شاہدِ حریت کے قدموں میں لاکھوں سروں کی قربانی پیش کرنا کوئی نقصان کا سودا ہے۔

لیکن اب یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسلام کے احسانِ بے پایاں اور اسلام نازل کرنے والے خدائے برتر کے فضلِ بیکراں کے جواب میں حریت کے متوالے شکر گذاری کا ثبوت دیتے ہیں یا ناشکری کا۔ بڑی مایوسی ہوتی ہے یہ سوچکر کہ رزمِ مسلسل کے گذشتہ طویل عرصے میں آزادیِ وطن کے نعرے تو بہت سنائی دیتے، لیکن ایسا کوئی نعرہ سامعہ نواز نہیں ہوا جو یہ اطمینان دلاتا کہ جن سروں کو دیوِ فرانس گاجر مولی کی طرح کاٹے دے رہا ہے ان میں آزادیِ وطن کے علاوہ اعلائے کلمۃ الحق اور غلبۂ اسلام کا بھی کوئی سودا سانس لے رہا ہے۔

سر اعلائے کلمۃ الحق کے ذوق وشوق سے خالی ہو تو پھر برابر ہے کہ وہ آزادیِ وطن کی راہ میں کٹے۔ یا قبیلے اور قوم کی عصبیت میں۔ ملک وقوم کے لئے لڑنا بھی لاریب جی داروں ہی کا کام ہے اور الجزائری مسلمانوں کی غیرت وحمیت، شجاعت وبسالت، عزم وہمت اور تحمل واستقلال کا انکار حرب وضرب کی تاریخ کبھی نہیں کر سکے گی۔ لیکن وہ لفظ "مجاهد" جس کا ایک ایک حرف جنّاتِ نعیم کی بے مثال نعمتوں کا امین ہے الجزائری سورماؤں پر بھی صادق آسکتا ہے یا نہیں یہ فیصلہ ماضی نہیں مستقبل کرے گا۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا جب اخباروں میں کچھ اس نوع کی خبریں پڑھیں کہ الجزائر کی نئی حکومتِ مسلمہ کا دستور سیکولر ہوگا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ "سیکولر" کے بعض مفاہیم اچھے بھی لئے جا سکتے ہیں اور زیادہ حسن ظن سے کام لیا جائے تو یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض سیاستہً یا الطورفیش کہا گیا ہے۔ ورنہ ارادہ اسلام ہی کو سربلند کرنے کا ہے۔ لیکن خدا اس لفظ کی چھوت سے بچائے۔ اس کی سرشت ہی میں خدا بیزاری اور دنیا پرستی داخل ہے۔ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ جو فاتحین آج اسلام کا نام لیتے ہوئے بھی شرماتے ہیں اور برائے نام بھی انھوں نے یہ اعلان نہیں کیا کہ لاکھوں سروں کی قیمت میں خریدی ہوئی اس نئی مملکت میں ہم خدائے برتر کے دین کو سربلند ونافذ کرنے کی سعی کریں گے۔ ان کی جانبازیوں کے پیچھے مادی منافع کے علاوہ بھی کوئی بلند تصور رہا ہوگا۔ اللہ محفوظ رکھے۔ اگر سچ مچ الجزائری سورماؤں کی منزلِ مقصود اسلام کی سربلندی کے عوض اینٹ اور پتھر کی سربلندی تھی تو یہ سارا خون خرابہ اکارت گیا۔ مصطفےٰ کمال نے بھی کافروں کو شکست دی تھی۔ ان کی سرفروشی بھی تاریخ کا ایک ولولہ انگیز باب ہے لیکن کس ہوشمند اور صحیح الایمان مسلمان میں جرأت ہے کہ انھیں غازی ومجاہد کے خطاب سے یاد کر سکے۔ اگر خدا نخواستہ فاتحینِ الجزائر نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ رشک انگیز پامردی کا یہ لاجواب کارنامہ اعلائے کلمۃ الحق کے طاہر ومطہر جذبے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، بلکہ وطن کی آزادی اور آزادی سے حاصل ہونے والے مادی منافع ہی تمام ترک تازیوں کا آخری ہدف تھے تو بے خدا نظامِ حکومت کے

غالباً ہمیں ایک اور سیکولر اسٹیٹ کا اضافہ کرنے والے سن لیں کہ خداوند عالم الغیوب اس سے بے نیاز ہے کہ دنیا کی راہ میں انھوں نے دس لاکھ قتل کرائے یا دس کروڑ۔ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ (اور جس نے نیت کی نفع دنیا کی اسے ہم نفع دنیا ہی دیں گے اور جس نے نیت کی ثواب آخرت کی اسے ثواب آخرت عطا کیا جائیگا اور اللہ جزا دے گا شکر گذاروں کو)

تو کیا یہ شکر گذاری ہوگی کہ جس اسلام نے الجزائری مسلمانوں کو انعام آخرت اور فردوس کے یقین سے نواز کر کٹ مرنے کا ولولہ دیا اسے اقتدار کی مسند اعلیٰ پر بٹھانے کے بجائے وہ کسی ایسے نظام کے ہاتھ میں زندگی کی زمام دیدیں جو کفر ہی کی کارگہ فکر میں ڈھلا ہو۔ جس کی بارگاہ میں اسلام اور کفر سب برابر ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا:۔

یا رسول اللہ رجل یرید الجهاد فی سبیل اللّٰہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم لا اجر له (مشکوٰۃ)	اے اللہ کے رسول! ایک شخص ارادہ رکھتا ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنیکا حالانکہ وہ دنیاوی مال و منال کی فکر و خواہش میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسکے لئے کوئی ثواب نہیں۔

ہمیں بے حد مسرت ہے کہ الجزائر کی فضا میں اللہ کی یہ آیت پرچم زرنگار بن کر ابھری وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى (اور کفر کرنے والوں کی بات کو اللہ نے نیچا کر دکھایا) لیکن بے حد رنج ہوگا اگر اس آیت کا اگلا فقرہ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا (اور اللہ ہی کی بات سب سے بلند ہے) طاقِ نسیاں میں رکھ دیا جائے گا۔ اللہ تو جہاد بالکفار کا مقصود بتاتا ہے کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (اور مقاتلہ کرو ان سے یہانتک کہ فتنہ دب جائے اور غالب آجائے حکم صرف اللہ کا) لیکن کفار کو شکست دینے کے بعد اگر فاتح مسلمان اللہ کے دین کو پس پشت ڈال کر ایک نئے فتنے کی داغ بیل ڈالدیں تو کس منہ سے کہا جا سکے گا کہ وہ "مجاہد" تھے۔ اللہ اپنے آخری پیغمبر کی بعثت کا منشاء واضح فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبہ)	اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر تاکہ اسے غالب کردے ہر دین پر اور پڑے برا مانا کریں مشرک

+ + + +

یہ بات اتنی کلیدی اور اہم تر تھی کہ اسے سورۂ صف میں جوں کا توں پھر دہرایا گیا اور سورۂ فتح میں بھی صرف آخری فقرے کے تغیر کے ساتھ تذکیر کی گئی۔ خوب معلوم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جتنی جنگیں لڑیں اور آپ کے بعد اصحابؓ نے جتنا مقابلہ کیا وہ سب کا سب غلبۂ دین ہی کے لئے تھا۔ اسی دین نے ہمیں مجاہد اور غازی اور شہید کی بے مثال اصطلاحیں دی ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان بلند و برتر اصطلاحوں کا استعمال وہاں بھی ہو سکے جہاں حرب و ضرب اور ایثار و قربانی کا تمامتر مدعا صرف اتنا ہو کہ ہمیں اپنی جنم بھومی پر خود حکومت کرنے کا موقع مل جائے تاکہ وہاں کے معدنوں، چشموں، زمینوں اور کھیتوں سے ہم زیادہ سے زیادہ نفع اٹھا سکیں وہاں ہم صنعت و تجارت کو ترقی دے کر سامانِ عیش و راحت میں اضافہ کر سکیں اور وہاں ہمیں اسکی مکمل آزادی ہو کہ اشتراکیت یا امپیرل ازم یا سیکولر ازم جس کے چاہے دستِ خدا ناشناس میں اپنے معاشرے کی عنان پکڑا دیں۔

کبھی نہیں۔ یہ اصطلاحیں بہت مقدس ہیں۔ بڑی انمول۔ ہمیں یہ تو امید ہے کہ فرانس کے استبداد کا شکار ہونے والوں کو کسی نہ کسی نوع کا درجۂ شہادت ضرور نصیب ہوا ہوگا، لیکن وہ شہادتِ عظمیٰ جو ایک ہی جست میں مومن کو بہشت کی وادی بے ہمتا میں پہنچا دے

ہے کچھ اور شے ہے۔ اللہ کے رسولؐ سے پوچھا گیا:۔

الرجل يقاتل للمغنم والرجل يقاتل للذكر والرجل يقاتل ليرٰى مكانه فمن في سبيل الله قال من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله (بخاری ومسلم)

ایک شخص ہے جو اس لئے لڑتا ہے کہ مالِ غنیمت ہاتھ لگے ایک شخص ہے جو اس لئے مقاتلہ کر رہا ہے کہ اس کی بہادری کے چرچے ہوں ایک شخص ہے جو اس لئے گرم پیکار رہے کہ اس کا مرتبہ لوگوں کی نظروں میں آئے تو ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ ہے؟ حضورؐ نے فرمایا صرف وہ شخص جو اس لئے لڑے کہ اللہ ہی کا کلمہ بلند ہو بس وہی مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

+ + + +

ثانوی درجے میں تو شہید وہ بھی ہے جو طاعون یا مرضِ شکم میں مرجاتے۔ لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ فرانس کے قہر و استبداد سے ٹکرانے اور اپنے جان و مال آبرو اور آزادی کے لئے کٹ مرنے والے بھی کسی نہ کسی درجے میں شہادت سے ہمکنار ہوئے ہونگے، لیکن اس شہادت کے ساتھ یہ کیسا استہزاء ہوگا کہ غازیانِ کرام قدرت پاتے ہی اپنی مملکت میں کلمۃ الکفر ہی العلیا؟ کا نعرہ بلند کریں اور ظاہر فریب سیاسی اصطلاحات کی آڑ لیکر اسلام کو غلبہ و اقتدار کے ایوان سے دُور پھینک دیں۔

اے اللہ! الجزائر کی جنگِ آزادی میں مرمٹنے والوں کی مغفرت فرما اور جن غازیوں کو تو نے فتح دی ہے انھیں توفیق دے کہ وہ اپنے حدودِ مملکت میں تیرے ہی کلمہ کو بلند کریں۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

پاکستان کا نیا دستور

پاکستانی عوام مستحق مبارکباد ہیں کہ وہاں کی فوجی حکومت نے ملک کے لئے ایک باقاعدہ دستور وضع کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور وہ مارشل لا جس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں تدریج و تہذیب کے ساتھ آئین کے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ دستور پر ہندوپاک میں جو تبصرے ہوئے ہیں ان کے بعد ہمارے کسی تبصرے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ لیکن وہ سب سے اہم اور کلیدی نکتہ جسے دستور کے باب میں سب سے زیادہ فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے کسی تبصرے میں اتنا اُبھر کر سامنے نہیں آیا ہے جتنا اس کا حق تھا۔ اس لئے جی چاہتا ہے کہ اسے ہم اُبھا کر پیش کر دیں۔

کوئی بھی دستور اپنی تفصیلات اور مضمرات و عواقب کے لحاظ سے کیسا ہے یہ بعد کی بات ہے پہلی بات یہ ہے کہ اس دستور کو چلانے اور اس کے متن کی شرح و تاویل کرنے والے کیسے ہیں؟ ہو سکتا ہے ایک دستور علمی و سیاسی اعتبار سے کچھ ناقص ہو، لیکن اس کے چلانے والے نیک نیت، دیانتدار اور سلیم الطبع ہوں تو عملی دنیا میں اس نقص کا خلا پُر ہو جائے۔ اور ہو سکتا ہے ایک دستور زر و جواہر کے پانیوں سے لکھا گیا ہو، لیکن اس کے چلانے والے خود غرض بے کردار اور ہٹ دھرم ہوں تو الفاظ کی چمک دمک ظلم و فساد کی سیاہی میں بدل جائے۔ ہمارے بھارت ہی کے دستور کو دیکھ لیجئے۔ یہ اپنی کاغذی حیثیت میں کافی متوازن، عدل پرور اور روادار ہے لیکن اس کو چلانیوالے اتنے توازن پسند، روادار اور منصف مزاج نہیں ہیں جتنے کا یہ متقاضی ہے اس لئے معیشت و اقتصاد اور سیاست و معاشرت کے کتنے ہی دوائر میں وہ بے لاگ انصاف عنقا ہو کر رہ گیا ہے جس کی ضمانتِ دستوری دفعات نے کھُل کر دی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی تاریخ دیکھ لیجئے۔ فساد و انحطاط کی وجہ دستور کی تبدیلی نہیں بنی تھی۔ دستور تو مدت تک وہی رہا ہے جس نے خلافتِ راشدہ کے عدیم النظیر نمونے تاریخ کے حوالے کئے۔ لیکن دستور کی عنان پکڑنے والے ہاتھ بدل گئے تھے۔ وہ دل و دماغ بدل گئے تھے جنھیں دستور کے بے جان الفاظ میں عملی تعبیروں کی روح پھونکنی تھی تو وہ دنیا بھی بدلی جو آئین و دستور کے لفظی ڈھانچے

سے نہیں اس کی معنوی تعبیروں اور عملی اطلاقات سے ظہور میں آتی ہے۔ اسی اساسی نکتہ کو ذہن میں رکھ کر غور و فکر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے لئے دستور کی قدر و قیمت عام دنیاوی نقطۂ نظر سے کچھ بھی ہو، لیکن اُس اسلام کے فروغ و عروج کے لئے اس میں کوئی پیغام موجود نہیں ہے، جس کی خدمت و اشاعت کے بلند بانگ دعوے اور وعدے اس دستور کے بنانے والے برابر کیئے جا رہے ہیں۔ یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ پاکستان کی موجودہ حکومت ملک و ملت کے حق میں نہایت مخلص ہے اور اسلام کا نام وہ ازراہِ نفاق نہیں لیتی بلکہ واقعۃً وہ اسلام سے قلبی تعلق رکھتی ہے۔ لیکن فیصلہ کن عامل فقط اخلاص نہیں ہوا کرتا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس اسلام کے لئے وہ تصویر اخلاص بنی ہوئی ہے کیا وہ واقعتاً اسلام ہے بھی یا کسی اور شئے کو وہ اسلام باور کئے ہوئے ہے؟

اس سوال پر جتنا بھی غور کیجئے جواب مایوس کن ہی ملے گا۔ حکومت کا غالب ذہن یہ ہے کہ اسلام وہ نہیں ہے جسے قرآن و سنت سے مستنبط کر کے صحابہؓ و ائمہ اور علمائے سلف نے ہم اخلاف کو پہنچایا ہے بلکہ اس کے تصور میں ایک ایسے پیکرِ خیالی کا نام اسلام ہے جس کے ہاتھ پیر تو اسلام ہی کے ہیں لیکن دل و دماغ اور مزاج و میلان مغرب کی کارگہِ فکر سے ڈھل کر آئے ہیں۔ بلکہ حکومت کے ذمہ دار عناصر میں بعض عناصر تو ایسے ہیں جو ہاتھ پیروں کی حد تک بھی قرآن و سنت والے اسلام کے روادار نہیں، بلکہ تقاضا کرتے ہیں کہ فکر نو ہی کے تحت جو بھی معاشرہ وہ تعمیر کریں اسی پر اسلام کا لیبل چسپاں کر دیا جائے۔ جن اقدار و عقائد کو وہ فوقیت دیں انھی کا نام اسلامی عقائد تسلیم کر لیا جائے۔ جو تفسیر و تاویل وہ اسلام کی کتاب آئین — قرآن کی کریں اسی کو قرآن کا منطوق و مصداق مان کر ہر اُس تفسیر و تاویل کو نظر انداز کر دیا جائے جو اس کے خلاف ہو۔

مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ ناچ گانا، سینما تھیٹر، عریانی و فحاشی ہر خلاف اسلام شئے کے لئے آپکو بالآخر میں اسلامی اصطلاحیں مل جائیں گی۔ ثقافت و تمدن، تہذیب و ترقی کے نام پر جو معاشرہ وہاں نشو و نما پا رہا ہے وہ وہاں کے معروف عاشقانِ اسلام اور مفسرانِ قرآن کے نقطۂ نظر سے عین اسلامی معاشرہ ہے حالانکہ قرآن و سنت کا ہر سلیم القلب عالم دو اور دو چار کی طرح جانتا ہے کہ اس معاشرے کی ایک ایک اینٹ افکارِ باطل کی مٹی سے بنی اور نفسِ امارہ کی بھٹی میں پکی ہے۔ ایک نیا فرقہ جو "اہلِ قرآن" کے نام سے اُبھرا ہے اس نے تو قسم ہی کھائی ہے کہ شہنشاہ اکبر اور اس کے والاگہر مصاحبین کی تمام ہی گمراہیوں کو نئی تراش خراش، نئے نہج و اسلوب اور نئے نقش و نگار سے سجا بنا کر ملک و ملت کے سر منڈھے گا اور قرآن کی ایک ایک تعلیم کو قرآن ہی کے نام پر مسخ و محرّف کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ یہ فرقہ مسندِ اقتدار پر تو جلوہ افروز نہیں ہے، لیکن مقربینِ بارگاہ میں ضرور شامل ہے۔ اقتدار کی مشین چلانے والے انتظامی عملے میں اس کے کامریڈ کلیدی مناصب حاصل کئے ہوئے ہیں اور قرآن کے ساتھ "سنت" کے جس لفظ سے اسے چڑھ ہے وہ دستور کے الفاظ سے خارج کر دیا گیا ہے، جب کہ پچھلے دستور میں یہ کسی نہ کسی طرح شامل ہو ہی گیا تھا۔

ان حالات میں یہ مغز زنی اور کنج کاوی کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتی کہ پاکستان کے نئے دستور کی کونسی دفعہ اسلام کے حق میں سازگار ہے اور کونسی نہیں۔ ہاں ثانوی درجہ میں بہرحال دستوری دفعات کی اہمیت مسلّم ہے۔ دستوری نکات کے تجزیہ و تحلیل کو اہلِ بصیرت پر چھوڑتے ہوئے ہم تو بس اس دعا پر اکتفا کرتے ہیں کہ اے اللہ پاکستان کو اُس انجام سے بچا جس کو ترکی پہنچا ہے اور اُس معاشرے سے محفوظ رکھ جو مصر و شام میں پھل پھول رہا ہے۔ ویسے یہ نہیں کہ برابر بھی امید نہیں کہ یہ دعا قبول ہوگی۔ قبولیت مذاق نہیں ہے کہ منھ سے دو بول نکلے اور اللہ نے تقدیر بدلی۔ سنت اللہ یہ اٹل ہے —

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۚ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ

مستقل عنوان

عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

پڑوسی کے حقوق

(۲)

ابن الزبیر یقول :۔ سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ۔" لیس المومن الذی یشبع وجارُہٗ جائعٌ ۔

(اخرجہ الطحاوی فی الطھارۃ والحاکم فی المستدرک والبیہقی فی شعب الایمان والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ :۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بات سنی ہے کہ" وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھرا ہو مگر اس کا پڑوسی بھوکا ہو"۔

تفہیم :۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پڑوسی کے حقوق سے غفلت برتنے والا آئینی اعتبار سے خارج از اسلام نہیں ہو جاتا بلکہ اسے مسلمان ہی شمار کیا جائے گا، لیکن اللہ کے سچے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عادت شریفہ تھی کہ جو حرکات و افعال اس درجہ برے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی ایمان جیسی طاہر و مطہر چیز سے نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اپنی معنوی ناپاکی کے اعتبار سے کفر و زندقہ ہی کی جنس سے ہیں، ان سے روکنے کے لئے یہی بلیغ و عمیق اسلوب اختیار فرماتے تھے جو اس حدیث میں اختیار فرمایا ہے۔ صرف اسی ایک بخیلی اور سنگدلی کے لئے نہیں جس کا ذکر اس حدیث میں ہے، بلکہ متعدد دوسری معصیتوں کے لئے بھی سرکار نے اسی انداز میں تہدید و تنبیہ کی ہے۔ اس سے سطح بین اور جلد باز قسم کے لوگ اس دھوکے میں آگئے کہ جس معصیت کے ارتکاب پر اللہ کا رسولؐ مرتکب کے بے ایمان ہونے کی شہادت دے رہا ہے اس معصیت کے مرتکب کو کافر ہی تسلیم کیا جائے گا اور جب تک وہ توبہ نہ کرے مرتد واجب القتل رہے۔

ایسا گمان کرنے والے خوارج کہلائے اور ان کے جذبۂ پرہیزگاری نے یہاں تک وسعت اختیار کی کہ ہر ایک ہی معصیتِ کبیرہ کے مرتکب کا خارج از اسلام ہونا ان کے نزدیک مسلّم ہو گیا۔

یہ نقطۂ نظر غیر صالح جذباتیت اور یک رخے اندازِ فکر کا نتیجہ تھا جو یقیناً غلط ہے۔ ایمان کا مقام و مستقر قلب ہے، اعضاء و جوارح نہیں۔ اعمال آدمی کو کافر نہیں بنا سکتے جب تک کہ اس کے اسلامی عقائد ہی میں کفر کی جونک نہ لگ گئی ہو۔

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جو شخص بدترین گناہوں کا

مرتکب ہوتا رہے گا اسے آئینی اعتبار سے مسلمان تسلیم کرنے کے باوجود یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ اس کے ایمان پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس کے ایمان کا نور بے حسی اور سرتابی کی ظلمتوں میں گم ہوگیا ہے

زید بہت زیادہ مریض اور کمزور ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا حال مُردوں سے بدتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قول کو آئین و منطق کی میزان میں نہیں تولا جاتا بلکہ اس کا مطلب یہی لیا جاتا ہے کہ زید زندہ تو ہے، مگر بہت ناتواں ہوگیا ہے۔ امراض سے مغلوب ہے ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ حضورؐ کے ان اقوالِ شریفہ کا ہے جن میں کسی معصیتِ کبیرہ پر مومن نہ ہونے کی وعید دی گئی ہے۔ زید جب تک سانس لے رہا ہے اسے زندہ ماننا ہی پڑے گا چاہے کتنا ہی مریض ہو، اسی طرح مومن جب تک قولاً یا عملاً عقیدۂ کفر کا اعلان نہ کر دے اسے آئین و منطق کی رو سے مسلمان ہی ماننا پڑے گا چاہے کیسا ہی گناہگار ہو۔ لیکن جس طرح زید زندہ ہونے کے باوجود زندگی کے لذائذ و منافع حاصل کرنے کا اہل نہیں رہا ہے۔ اسی طرح وہ مومن بھی جو کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہے ایمان کی لذت اور منافع کثیرہ حاصل کرنے کی جدوجہد سے دستکش ہوگیا ہے۔ سسکتے ہوئے زید کو بحالتِ حیات ہی اگر مُردوں سے بدتر کہنا محاورے میں داخل ہے تو سخت قسم کے گناہوں کے مرتکب، کو بے ایمان کہنا بھی محاورے کے اعتبار سے بالیقین درست ہے۔

پھر حقیقت کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھیے تو یہ سمجھنا بھی دشوار نہ ہوگا کہ ایمان اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے طغیان و سرکشی کی ضد ہے۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو تو ہر طرف اجالا ہی اجالا ہوگا۔ وہ ڈھل جائے تو روشنی کم ہو جائے گی۔ اس پر بادل چھا جائے تب بھی ظلمت کو ہاتھ پیر نکالنے کا موقع ملے گا، اور وہ کامل طور پر گہن میں آجائے تو پھر ظلمت ہی ظلمت کی عملداری ہوگی۔ یہ فطرت کے اٹل قوانین ہیں۔ اسی طرح ایمان اور سرکشی کا معاملہ ہے کہ ایمان کامل ہو تو سرکشی صفر کے درجے میں ہوگی اعمال و عقائد میں اجالا ہی اجالا ہوگا۔ پھر جتنا جتنا خاور ایمان ڈھلتا جائیگا اور اس پر خدا فراموشی کی سیاہ گھٹا چھاتی جائے گی اسی تناسب سے سرکشی بھی بڑھتی جائے گی۔ حتیٰ کہ جس کی سرکشی نے کبیرہ گناہوں کو دلچسپ مشغلہ بنا لیا اس کے متعلق یہ کہنا بالیقین درست ہوگا کہ اس کا نیّرِ ایمان کامل طور پر گہنا گیا ہے۔ چاند اور سورج گہن میں آکر اپنی روشنی کھو دیں تو پھر ان کا عدم وجود برابر ہے۔ مومن و مسلم اگر معاصی کبیرہ پر جری ہو جائے تو ایمان کا ہونا نہ ہونا اثرات و ثمرات کے اعتبار سے یکساں ہی ہوگا۔ گویا ایمان آئینی اعتبار سے ہے بھی مگر اثرات و مظاہر کے لحاظ سے نہیں بھی ہے۔

ایک اور جگہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ جب مومن زنا یا چوری وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے تو ایمان سے نکل جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ ایمان اور معاصیِ کبیرہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سورج روشن بھی ہو اور فضا میں ظلمتیں بھی بکھری رہیں۔ ظلمت بجائے خود سورج کے ڈھل جانے، گہن میں آجانے اور غروب ہو جانے کا ثبوت ہے۔ اسی طرح اللہ اور رسول کی کھلی نافرمانی ایمان کے اضمحلال اور نزع کا ثبوت ہے، اور جب نافرمانی ذہنی بغاوت کا رخ اختیار کرلے تو سمجھ لو کہ آفتاب ایمان ڈوب گیا اور کفر و ارتداد کی پرہول تاریکی چھا گئی۔

حاصلِ تفہیم یہ ہے کہ جو شخص خود شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی فاقے میں مبتلا ہو وہ صرف سنگدل، بے حس اور بداخلاق ہی نہیں ہے حقیقۃً مومن بھی نہیں ہے۔ وہ ایسا بدنصیب شخص ہے جس سے اللہ کے رسول ناخوش ہیں، اسے آخرت میں بڑی شرمندگی اور مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جن گناہوں کے مرتکب کے بارے میں اللہ کے سچے رسولؐ یہ فرماتے ہیں کہ وہ مومن نہیں ہے، یا وہ ہم میں سے نہیں ہے تو اگرچہ اسے قانون کے دائرے میں مومن ہی شمار کیا جائے گا، وہ ایک نہ ایک دن جنت میں بھی جائے گا اور اللہ ارحم الراحمین کی اجازت سے سرکار رسالت اس کی شفاعت بھی فرمائیں گے لیکن مغفرت اور شفاعت کی منازل رفیع سے قبل محشر میں اسے جن زہرہ گداز آلام و مصائب اور ہولناک آفات و شدائد سے گذرنا پڑے گا ان کا ادراک و احساس اگر اسے آج کی ناپائدار زندگی میں ہو جائے تو قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی وہ ان افعالِ ذمیمہ کے ارتکاب سے ہزار درجہ بہتر اسے سمجھے کہ اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کووں کو کھلا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف

اگر گھنٹے دو گھنٹے کی تکلیف ہو۔ اور دوسری طرف غیر معین طویل مدت کا عذاب الیم تو ہر شخص یہی پسند کرے گا کہ پہلے کو قبول کر لے اور دوسرے سے پناہ مانگے۔

مگر دقت یہی ہے کہ عذابِ آخرت کا کوئی جاندار شعور ہم بدنصیبوں میں نہیں پایا جاتا اور باوجود مومن ہونے کے ہمارا آفتابِ ایمان اس طرح گہنا گیا ہے کہ ہمارے اعمال و حرکات میں سیاہی ہی سیاہی نظر آتی ہے۔ ہم خوش ہوتے ہیں کہ اس پیغمبر کی امت ہیں جو شفیع المذنبین ہے۔ ہم مطمئن ہیں کہ ایمان و اسلام کے طفیل آخر کار ہمیں جنت مل کر رہے گی۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ قبر سے لیکر مغفرت تک ہم پر کیا بیتے گی۔ کیسے کیسے لرزہ خیز شدائد سے ہمیں گذرنا ہوگا۔ مانا کہ چوری اور جعل سازی کی سزا پھانسی نہیں، لیکن مہینوں اور سالوں کی قید و بند بھی تو کوئی خوشگوار چیز نہیں جسکی ایک صحیح العقل آدمی پرواہی نہ کرے دنیا کی قید و بند اور صعوبتیں تو پھر بہت ہلکی ہیں۔ قبر اور یوم الحساب کی سختیاں ایسی خوفناک ہوں گی کہ ایک ایک ساعتِ عذاب کو آدمی حیاتِ دنیاوی کی دس دس سالہ مشقت سے بڑھکر اذیتناک تصور کرے گا۔ پھر یہ بھی نہ سمجھئے کہ جہنم محض کافروں کے لئے بنایا گیا ہے۔ کتنے ہی بدنصیب مسلمان ہوں گے جنھیں ہمیشہ کے لئے نہ سہی مگر تھوڑی مدت کے لئے ضرور آگ میں ڈالا جائے گا، آگ میں جلنا اور تڑپنا بعد کی بات ہے۔ یہی دیکھ لیجئے کہ دنیا میں فقط ایک چنگاری بدن پر آپڑتی ہے، یا زبان لپکاتے شعلوں کا ایک لوکا جسم کو چھوجاتا ہے تو آدمی کیسا ناچا ناچا پھرتا ہے، کیسی واویلا مچاتا ہے، تب وہ عالم کتنا مہیب ہوگا جب دہکتی ہوئی آگ میں آدمی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپے گا اور یہ آس بھی نہیں ہوگی کہ دس پانچ منٹ میں موت اس کرب و اذیت کا قصہ تمام کر دیگی وہاں موت کہاں۔ جینا اور مجبوراً جینا، تڑپنا اور پیہم تڑپنا۔ پناہ خدایا تیری ہزار بار پناہ۔

ایک بات حدیث بالا سے یہ بھی مترشح ہوتی ہے کہ مسلمان کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں ہے کہ پڑوسی کو اگر فاقے سے دیکھے تو کھانا کھلا دے بلکہ یہ بھی اس کا فرض ہے کہ پڑوسیوں کے حال سے باخبر رہنے کی کوشش کرے۔ اللہ کے رسولؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ پڑوسی کو بھوکا دیکھو تو کھانا کھلا دو، یہ فرمایا ہے کہ شکم سیر مسلمان کا ہمسایہ اگر فاقے سے ہے تو یہ شکم سیر مومن نہیں ہے۔ اب چاہے یہ صورت ہو کہ ہمسائے کا فاقہ اس شخص کے علم میں ہو اور پھر بھی اس نے پروا نہ کی ہو، یا یہ صورت ہو کہ پڑوسیوں سے بے تعلقی اور لاپرائی کے باعث اسے پتا ہی نہ رہتا ہو کہ کس پر کیا گزر رہی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ اس حدیث کا مصداق ہوگا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صورت مقابلۃً زیادہ شقاوتِ قلبی کی مظہر ہے۔ ونعوذ باللہ من قساوت القلوب۔

پڑوسی کو اذیت دینا بدترین گناہ ہے

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :—

قیل النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم، یا رسول اللہ فلانۃ تقوم اللیل وتصوم النہار وتفعل وتصدق وتؤذی جیرانہا بلسانہا فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لا خیر فیہا ھی من اھل النار قالوا وفلانۃ تصلی المکتوبۃ وتصدق بأثوار ولا تؤذی احدًا، فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ھی من اھل الجنۃ۔

(اخرجہ احمد والبزار والحاکم وابن حبان فی صحیحہ واخرجہ ابوداؤد من طریق اخر واخرجہ احمد والبیہقی مرفوعًا بلفظ اخر)

ترجمہ:—
حضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ فلاں عورت راتوں کو نماز پڑھتی اور دن میں روزے رکھتی ہے، اور اچھے کام کرتی ہے اور صدقہ و خیرات میں بھی پیش پیش ہے، لیکن اپنی بدکلامی سے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے جواب دیا۔ "اس کی عبادت و ریاضت میں کوئی بھلائی نہیں وہ تو جہنمی ہے"۔

پھر عرض کیا گیا کہ فلاں عورت بس نماز فرض ادا کرتی ہے اور فقط رمضان کے روزے رکھتی ہے اور صرف پنیر کے ٹکڑے خیرات کرتی ہے مگر کسی کو ایذا نہیں پہنچاتی۔

سرکارِ رسالت نے جواب دیا ــ "وہ جنتی ہے"۔

تفہیم:۔

اس حدیث میں بڑا سبق ہے ـــــ اور صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے کس ارشاد میں سبق نہیں ہوتا۔

موضوع کی حد تک تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ پڑوسی کو ستانا اتنا زبردست گناہ ہے کہ اس کے ہوتے ساری نیکیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ بڑا نادان ہے وہ شخص ـــــ مرد ہو یا عورت ـــــ جو دن رات تو عبادت کرے مگر کسی ایسے فعل کا بھی ارتکاب کرتا رہے جو اس کی ساری عبادت کو مٹی میں ملا دے۔

موضوع سے ذرا آگے بڑھ کر اس سے ایک ایسی غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے جس میں عام طور پر لوگ مبتلا ہوتے رہے ہیں اور آج تو یہ ابتلاء بہت ہی عام ہے۔ آپ کتنے ہی آدمیوں کو دیکھیں گے کہ وہ نہ صرف فرض نماز و روزے کے پابند اور حج و زکوٰۃ کی ادائگی کرنے والے ہیں بلکہ عبادات نافلہ میں بھی سرگرم ہیں۔ تہجد پڑھتے ہیں نفل روزے رکھتے ہیں۔ غریبوں کو سہارا دیتے ہیں، اوراد و وظائف سے شغل رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ شوقِ عبادت کی رو میں نئے نئے مشاغل بھی نکال لیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف وہ یہ جائزہ لینے کی بالکل فکر نہیں کرتے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری زندگی کے کسی شعبے میں ایسی کوئی معصیت پرورش پا رہی ہو جو سارے ہی اعمالِ خیر کو بے اثر کر کے رکھ دے۔

یا بعض لوگوں کو یہ تو علم ہوتا ہے کہ ہماری فلاں حرکت گناہ ہے لیکن اس حرکت کو چھوڑنے کی بجائے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اتنی بہت ساری نیکیوں کے ہوتے یہ ایک گناہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔

یہ دونوں شکلیں بڑی خطرناک ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اللہ جل شانہٗ نے کیا فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (الحجرات)

اے اہل ایمان! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور اس سے اس طرح زور سے ہم کلام مت ہو جس طرح آپس میں بولتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یہاں نہ یہ شرط لگائی گئی کہ زور سے بولنا گستاخی کی نیت سے ہو۔ نہ یہ کہا گیا کہ آواز میں درشتی اور تندی ہو۔ بس یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اتنی سی بات بھی تمام اعمال کو برباد کر کے رکھ سکتی ہے کہ صحابی اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند کرے اور ان سے اس طرح بے جھجک بے تکلف اور مساوی انداز میں کلام کرے جیسے ہم سب آپس میں کرتے ہیں۔ گویا عزم گناہ کے بغیر بھی بعض قبیح افعال و اطوار زندگی بھر کی نکوکاری پر پانی پھیر دے سکتے ہیں تو ایسا کوئی عمل تو اور بھی زیادہ حبطِ اعمال کا باعث بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے پیچھے عزم گناہ بھی موجود ہو۔ ریاضی کا فارمولا نہیں ہے کہ نیکیوں کی گنتی برائیوں سے بڑھ گئی تو لازماً ساری برائیاں نظر انداز کر دی جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ صرف ایک ہی نیکی اللہ غفور رّحیم کے یہاں ایسی مقبول ہو جائے کہ بدیوں کے تمام انباروں کو وہ اپنی رحمت کے سمندر میں غرق کر کے اسی ایک نیکی کے عوض مغفرت سے نواز دے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقط ایک معصیت کے سبب سے آدمی کا سارا کیا کرایا اکارت ہو جائے اور اسے شعور بھی نہ ہو کہ اللہ کی جناب میں اس کی ساری فردِ عمل پر کالک پھر گئی ہے۔

حدیث بالا سے یہ تنبیہ بھی واضح ہے کہ جن نفل عبادات کا ترک بھی جائز ہے، ان کی ادائگی کے اہتمام سے کہیں زیادہ ضروری اس بات کا اہتمام کرنا ہے کہ ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو حرام و منکر کے دائرے میں آتا ہو۔ پڑوسی کو ایذا دینا تو سخت قسم کا منکر ہے ہی۔ اللہ کے کسی بھی بندے کو ناحق ایذا دینا ممنوع و حرام ہے۔ فرض کرو تم حج کو گئے ہو۔ بے شک اللہ اور رسول کے گھروں میں جتنی بھی عباداتِ نافلہ ادا کرو گے، فائدے ہی میں رہو گے۔ لیکن بہت زیادہ نظر اس بات پر رکھو کہ حجاج کے اژدہام میں کسی بھی موقع پر اپنے سے کمزور لوگوں کو دھکا مت دو۔ آگے پیچھے مت دھکیلو

ایسی بات مت کہو جو دل دکھانے والی ہو۔ بظاہر یہ نہایت معمولی نصیحت ہے لیکن کوئی تعجب نہیں کہ دوسروں کو پہنچائی ہوئی کوئی چھوٹی سی اذیت ہی تمہارے سچ کو لے ڈوبے۔ تمہاری ساری محنت پر سیاہی لیپ دے۔

حدیث میں ایک طرف وہ عورت ہے جو صائم الدہر، اور قائم اللیل ہے۔ گویا ظاہری اعتبار سے پوری زاہدہ ہے۔ تقی بھی ہے تہجد گذار بھی۔ لیکن اس کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان پڑوسیوں کے دل زخمی کرتی رہتی ہے۔ تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا۔ اور انھوں نے فرمایا تو گویا اللہ نے فرمایا کہ اس بدنصیب کو دوزخ کا ذائقہ چکھایا جائیگا

اور دوسری طرف وہ عورت ہے جو محض فرائض ادا کرتی ہو پانچ وقت کی نماز پڑھ لی، رمضان میں روزے رکھ لئے۔ صدقہ و خیرات میں بھی فراخ دل نہیں، پنیر جیسی معمولی چیز دیدی بس۔ مگر یہ ضرور ہے کہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی، زبان کے تیر نہیں چلاتی، دل نہیں دکھاتی، تو اللہ کے رسول نے فرمایا وہ جنتی ہے۔ اللہ اکبر۔ دلستانی اور ایذادہی کتنا بڑا گناہ ہے۔ خصوصاً پڑوسیوں کا دل دکھانا تو اتنا ہولناک گناہ ہے کہ شاید زنا اور چوری بھی اس پر بازی نہ لیجا سکیں۔

یہاں اس نامتبوع صورتِ حال پر بھی اشارہ ہوجائے آجکل تو بہت زیادہ پائی جارہی ہے۔ تم کتنے ہی لوگوں کو دیکھتے ہو وہ نوافل بھی پڑھتے ہیں، تسبیح سے بھی غافل نہیں، دعائیں بھی خاصی لمبی مانگتے ہیں لیکن نماز باجماعت کے بارے میں متساہل ہیں، یا سنن ضرور یہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ نہ رکوع درست، نہ سجدہ شایانِ شان رکوع کے بعد ٹھیک طرح سیدھا کھڑا ہونا اور دونوں سجدوں کے درمیان ڈھنگ سے بیٹھنا انھیں بالکل پسند نہیں۔ قیام اتنا مختصر کہ ابھی کھڑے ہوئے اور ابھی تمہاری پلک جھپکی تو رکوع میں ہیں۔

یہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے جیسی اس حدیث میں پائی جاتی ہے۔ نوافل اور تسبیحات اور لمبی دعائیں ایسے امور نہیں جن کا ترک معصیت ہو لیکن ان کا انھیں خاص خیال ہے۔ اس کے برخلاف نماز کو ڈھنگ سے نہ پڑھنا اور قیام و قعود میں تو جل میں آیا کا انداز اختیار کرنا اتنی بڑی کوتاہی ہے کہ بعید نہیں ان کی ناقص نمازیں حشر کے دن ان کے منھ پر ماردی جائیں اور داور محشر ارشاد فرمائے کہ اے نادانو تم فرائض واجبات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتے تھے تو ایسا کیوں نہ کیا کہ نفل نمازوں اور تسبیحوں میں خرچ ہونے والا وقت فرائض و واجبات میں لگا دیتے، نوافل کا تم نے التزام کیا مگر فرائض و واجبات کی ادائگی میں بیدلی اور تعجیل کی روش اختیار کی۔

ایسے بھی لوگ عام ہیں جو مطلوبہ عبادات کی بڑی پابندی کرتے ہیں' اوراد و وظائف انکا معمول ہیں۔ بات بات میں اللہ اور رسول کا نام وردِ زبان رہتا ہے لیکن اس کا انھیں کوئی فکر نہیں کہ پڑوسی کس حال میں ہیں۔ یا ذرائع معاش کس حد تک حلال و طیب ہیں۔ یا صلہ رحمی کے باب میں ہماری کوتاہیاں کہاں تک جا پہنچی ہیں۔ ان کا حال تقریباً اسی عورت جیسا ہے جس کے جہنمی ہونے کی خبر اللہ کے رسول نے دی۔ تمثیل کی زبان میں یہ ایسے لوگ ہیں جو صحت و قوت کی دوائیں تو نہایت اعلیٰ قسم کی استعمال کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسی غذاؤں کے استعمال سے بھی نہیں چوکتے جو جگر اور معدے کے لئے برباد کن ہیں۔ جگر اور معدہ ماؤف ہوجائے تو ہر غذا بے کار اور ہر ٹانک لاحاصل ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قیمتی سے قیمتی کھانے کی بڑی سے بڑی دیگ کو زہر کی ایک بوند یا فضلے کی ایک پھونک اس قابل بنا دیتی ہے کہ سوائے پھینکنے کے اس کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا اسی طرح عبادات کا بڑے سے بڑا ذخیرہ بھی یکسر فاسد ہوسکتا ہے اگر کسی معصیت کا گھن اسے لگا ہوا ہو۔

ایک سبق اس حدیث سے یہ بھی ملا کہ کسی مرد یا عورت کی برائی اس کے پیٹھ پیچھے اس مقصد سے کرنا کہ اس برائی کی شرعی حیثیت معلوم ہو۔ غیبتِ محرمہ کے دائرے میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ ایک متعینہ عورت کی بدکلامی کا تذکرہ اس کی عدم موجودگی ہی میں صحابہ نے فرمایا تھا۔ اگر یہ حرام نوعیت کی غیبت میں داخل ہوتا تو حضورؐ ضرور تنبیہ اور نکیر فرماتے۔ نہیں فرمائی تو ثابت ہوا کہ صحابہ کا یہ فعل غیبتِ ممنوعہ نہیں تھا۔

پڑوسی کی دلداری کا حضورؐ کتنا لحاظ رکھتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے بھی خوب ہوتا ہے جو امام بخاری نے اپنی الادب المفرد میں لا یؤذی جارہ کے تحت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جَو کی ٹکیاں پکائیں لیکن ابھی حضورؐ کے سامنے لانے کی نوبت

نہیں آئی تھی کہ پڑوسی کی بکری آئی اور ٹکیاں منھ میں دبا کر چلتی بنی ام المومنین کو اس پر طیش آیا اور بکری کے پیچھے دوڑیں۔ اس اللہ کے رسول فداہ امی وابی نے فرمایا۔

اے عائشہ جو ٹکیاں بکری کے منھ سے چھوٹ کر گر گئی ہوں وہ بے شک تم اٹھا لو مگر اس سے زیادہ کچھ کر کے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانا آپ کے الفاظ یہ ہیں لا توذی جارک فی شاتہا (اپنے پڑوسی کو اس کی بکری کے سلسلہ میں کوئی دکھ مت پہنچانا) ہم نافرمان غلاموں کا عموماً یہ حال ہے کہ اس طرح کا واقعہ اگر ہمیں پیش آئے تو بکری غریب کے الگ دو ہتھڑ جھاڑیں اور اس کے مالک سے الگ جھگڑا ٹھانیں۔ اور ہماری عورتیں تو خدا کی پناہ۔ ان میں کی اکثر کوسنے کاٹنے اور زبان کے تیر چلانے میں شیطان کے کان کاٹتی ہیں۔

سمجھ لو کہ یہ صرف تمثیل ہے، بات بکری تک ہی محدود نہیں پڑوسی کا کتا بھی اگر تمہاری ہانڈی خراب کر جائے۔ تمہاری مرغی کو چیر پھاڑ دے، تو اسے اینٹ پتھر مارنے یا اس کے مالک کو صلواتیں سنانے سے پہلے سوچ لو کہ اللہ کے رسول نے پڑوسی کے کیا حقوق بیان فرمائے ہیں۔ اتنا تو کر سکتے ہو کہ کتے کے مالک سے نرمی اور اخلاق کے ساتھ اس صورت حال کی اصلاح کا التماس کرو۔ وہ اگر تم سے کمزور اور نادار ہے تب بھی غراتے ہوئے مت چڑھ دوڑو صبر و تحمل اور عجز و فروتنی اختیار کرو۔ تمہیں کیا خبر کہ کسی ضعیف و نادار سے۔ کسی کمزور جانور سے۔ حتیٰ کہ بلی اور کتے سے محض اس لئے نرمی اور رحمدلی برتنا کہ تمہارے رسول کی یہی تعلیم، یہی اسوہ اور یہی ہدایت ہے۔ تمہاری زندگی بھر کی عبادتوں سے سبقت لیجائے۔ تمہیں وہاں پہنچا دے جہاں کی ضمانت ہزار سال کی عبادتیں بھی نہیں دے سکتیں۔

کبھی غم یک نفس بھی کافی کبھی عبث گریۂ مسلسل
خدا کا انعام منحصر ہے، نہ ایک دن میں نہ سو برس میں

....

مستقل عنوان

تجلّی کی ڈاک

عناد و تعصب

سوال ۱:- یکے از باشندگانِ سوروال (راجستھان)

مولانائے محترم! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

مجھے آپ سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی آپ کا رسالہ تجلّی بغور پڑھا ہے۔ مگر مجھے باوثوق ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے اور مجھے اس پر پورا پورا اطمینان بھی ہے کہ آپ جماعت اسلامی کے آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی آپ "کٹر دیوبندی" ہیں۔ آپ بلاشبہ ایک غیر جانبدار عالمِ دین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں چند مسائل میں آپ کی رہنمائی کا خواہش مند ہوں۔ مجھے پوری پوری توقع ہے کہ آپ ان درج ذیل مسائل میں میری رہنمائی قرآن وسنت کی روشنی میں فرمائیں گے اور میں پوری خندہ پیشانی کے ساتھ آپ کے مشوروں کو قبول کرونگا انشاء اللہ العزیز۔

ہمارے یہاں اس وقت دو مدرسے مسلمانانِ قصبہ کی طرف سے چل رہے ہیں۔ ایک مدرسہ جو بہت پہلے سے چل رہا ہے اس میں تقریباً چالیس بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر افسوس کہ مدرس صاحب خود علمِ دین سے کورے ہیں۔ نماز با جماعت کے تارک اور لوز کیرکٹر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسے کے بچے بھی نماز سے بے تعلق ہیں۔ یہ بچے صرف قاعدے اور سپارے و قرآن مجید کی تعلیم اور معمولی اُردو کی غیر معیاری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم بھی انتہائی افسوسناک حد تک ناقص ہے۔ یعنی بے شمار غلطیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس مدرسے کا یہ افسوسناک پہلو ہے۔ دوسرا مدرسہ کوئی سال ڈیڑھ سال سے قائم ہوا ہے۔ اس میں اعظم گڑھ کے ایک نوعمر مدرس کام کرتے ہیں۔ اس مدرسے میں جماعت اسلامی کا مکمل کورس داخل ہے کلاس وار تعلیم ہوتی ہے۔ مگر بچے تقریباً ۲۵ و ۳۰ تک ہیں اور مدرس صاحب بھی باعلم انتہائی نیک اور خوش اخلاق ہیں۔ نماز با جماعت کے پابند اور ہم سب میں برائیوں سے زیادہ محفوظ اور عمدہ کیرکٹر کے مالک ہیں مگر یہ صاحب ہیں جماعت اسلامی کے آدمی۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس قصبے کی جماعت کے امیر بھی ہیں۔ ان کی عمدہ تعلیم کے اثرات اور انکے اخلاق و پاکیزہ کیرکٹر کے باعث جہاں مدرسے کے بچے بشوق نماز کے پابند ہیں وہیں بڑوں پر بھی ان کا رنگ جمتا جا رہا ہے۔ اس وقت خوش قسمتی یا بد قسمتی سے یہی ہماری مسجد کے امام بھی ہیں۔ رمضان میں تراویح بھی انھوں نے ہی پڑھائی ہے۔ مگر چند افراد (جن کی تعداد تین ہے) ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ نماز با جماعت مسجد میں ہو رہی ہوتی ہے اور یہ چند افراد مسجد ہی کے اندر کبھی صف میں کبھی پیچھے الگ سے نماز پڑھتے ہیں۔ ان چند افراد کے علاوہ بقیہ نمازی جن کا اوسط ۲۰ کے قریب ہے اور جمعہ میں پچاس ساٹھ کے قریب ہو جاتا ہے، امام پر بالکل مطمئن اور خوش ہیں۔ جو لوگ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ان کا کہنا یہ ہے کہ (۱) یہ امام جماعت اسلامی کا آدمی ہے اور علماء کہ

فتویٰ ہے کہ جماعت اسلامی والوں کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے (۲) پنج وقتہ نماز اور جمعہ کی نماز یہ ٹوپی پہن کر پڑھاتا ہے۔ صافہ (دستار) نہیں باندھتا (۳) فرض اور سنتیں تو پابندی سے پڑھتا ہے مگر نوافل مسجد کے اندر پابندی سے نہیں پڑھتا' بلکہ اکثر نہیں پڑھتا۔ اکثر یہ ظہر کی دس، مغرب کی پانچ اور عشاء کی نو رکعتیں پڑھتا ہے۔ فجر اور عصر میں کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اس میں نوافل نہیں ہیں۔ (۴) نیاز' فاتحہ' سوئم' چالیسواں وغیرہ کے سلسلے میں اگرچہ یہ دوسروں کو صاف لفظوں میں نہیں روکتا مگر خود ان کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی ان کاموں میں شریک ہوتا ہے۔ تقریر اور وعظ وغیرہ میں لوگوں سے درود شریف نہیں پڑھواتا۔ میلاد شریف کو بھی پسند نہیں کرتا۔ (۵) اس کے سر پر اگرچہ انگریزی بال تو نہیں ہیں مگر ہیں اسی کے مشابہ یعنی استرے کے اور مشین کے بجائے یہ پیچھے کے کچھ بال کنگھی کے ذریعہ قینچی سے کٹواتا ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے نماز کس طرح درست ہو سکتی ہے (۶) نمازوں میں یہ مسنون سورتیں نہیں پڑھتا۔ قرآن حکیم سے جہاں سے چاہتا ہے پڑھ دیتا ہے (۷) سردیوں میں یہ چادر اوڑھ کر نماز پڑھاتا ہے اور چادر کا کچھ حصہ اس کے سر پر بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ چادر سر پر اوڑھ کر نماز پڑھنا مکروہ سُنا گیا ہے (۸) جمعہ کے خطبے میں علمی خطبے کے اشعار نہیں پڑھتا اس کے بجائے قرآن و احادیث سے کچھ باتیں بتاتا ہے۔

یہ ہیں: ۵ وجوہ جن کی موجودگی میں یہاں کے چند حضرات اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے حتیٰ کہ اس سے سلام و کلام بھی بند کر رکھا ہے۔ جب یہ امام مسجد میں ہوتے ہیں تو یہ چند حضرات مسجد میں بھی سلام کر کے نہیں داخل ہوتے اور دوسروں کو اس کی مخالفت پر اُکساتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں پہلے جو امام رہتے ہم سب ان کو ناج دیتے اور تراویح کے پیسے بھی۔ مگر یہ امام صاحب صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ "میں اپنے لئے کرائے کی امامت کو جائز نہیں سمجھتا"۔ امسال تراویح کے سلسلے میں لوگوں نے غالباً ۲۹ روپے پیش کئے تھے۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ خود لینے کے بجائے اس رقم کو دینی تعلیم کی مد میں یہ کہہ کر عنایت کر دیا کہ "ایسا رویہ آئندہ میرے ساتھ نہ ہونا چاہیئے"

براہِ کرم آپ ہمیں واضح لفظوں میں بتائیں کہ ہم کیا رویہ اختیار کریں۔ جہانتک نیاز فاتحہ سوئم وغیرہ کا تعلق ہے یہ رسمیں ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آئی ہیں اور بریلی شریف کی کتابوں کے اندر انھیں بالکل جائز قرار دیا گیا ہے۔ ٹوپی پہن کر تو واقعی ہمارے راجستھان میں شاید ہی کوئی نماز جمعہ پڑھاتا ہو۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں بالکل تیار ہوں جو مشورہ آپ مجھے دیں گے میں اُسے قبول کر دوں گا اور مجھے توقع ہے کہ یہ چند حضرات بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں گے۔ کیونکہ انھیں بھی تو اپنی نماز محبوب ہی ہوگی۔ اگر قرآن و سنت کی روشنی میں آپ کوئی بات کہیں گے تو مجھے امید نہیں ہے کہ یہ حضرات اسے ٹھکرا دیں۔ کیونکہ خدا و رسول سے انھیں بھی بے حد محبت ہے۔ اَن پڑھ یا کم پڑھے ہونے کی وجہ سے شاید کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سک رہے ہیں۔ معاف کیجئے گا میرا یہ استفسار ایک مضمون بن گیا اور بیشتر سوالات آپ کی نگاہ میں بے وزن بھی ہونگے مگر کیا کیجئے یہی ہم لوگوں کی نگاہوں میں بہت وزنی ہیں کاش آپ یہ عبارتیں بھی بے کم و کاست شائع فرمادیں۔

واضح رہے کہ یہاں پر امامت کا مسئلہ بڑا سنگین انھیں اسباب کی بناء پر بنتا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے اپریل کے تجلی میں شائع فرمادیں تو عین نوازش ہوگی۔ ورنہ پھر مئی کے تجلی میں تو ضرور ہی۔

الجواب :-

قارئین شاید بدمزا ہو گئے ہوں گے کہ اتنا طویل لاحاصل سا خط ہم نے کیوں نقل کیا اور کونسا مسئلہ اس میں ایسا ہے جس پر ہم دادِ تحقیق دینے بیٹھیں گے۔

لیکن ہم نے بحث و نظر کی خاطر نہیں بلکہ اس نیت سے یہ خط نقل کیا کہ ــــ ہو سکتا ہے اس کے جواب میں جو معروضات ہم پیش کریں وہ ان لوگوں پر کچھ اثر کر جائیں جو اپنی جا

معصومیت کے باعث اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ الفتنۃ اشد من القتل۔

اسی وجہ سے ہم براہ راست انھیں ہی مخاطب کرتے ہوئے کچھ کلمات کہیں گے۔ اثر ہونا نہ ہونا اللہ کے ہاتھ ہے۔

اے دینی بھائیو! تم جو کچھ کر رہے ہو ہمیں معلوم ہے کہ وہ نیک نیتی ہی سے کر رہے ہو۔ تمھیں علماء پر اعتماد ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے سینوں میں دین کی محبت زندہ ہے۔ یہ مبارک بات ہے لیکن تم یہ بھی ضرور جانتے ہوگے کہ علماء انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے معصومیت تو بس انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہے۔ تم اگر ہمہ شما پر نہیں بلکہ اللہ اور رسول پر ایمان لائے ہو تو دینی معاملات میں تمھیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اللہ اور رسول کیا فرما رہے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے اُردو ترجمے موجود ہیں۔ مسائل بتانے والی کتابیں بھی نایاب نہیں۔ تمہاری نظر میں اگر عاقبت اور رضائے الٰہی کی کچھ بھی قدر و قیمت ہے تو اردو ہی کی کسی معتبر کتاب فقہ میں یہ دیکھنے کی زحمت ضرور اُٹھاؤ کہ جن مہمل اور لایعنی وجوہات کو تم نے ترکِ جماعت اور افتراق و نزاع کا وسیلہ بنایا ہے کیا ان میں سے کوئی بھی اس لائق ہے کہ اس کی بنیاد پر جماعت جیسی ضروری چیز چھوڑی جائے اور عین مسجد میں جو اخوت اسلامی کا سب سے بڑا مظہر ہے وہ نفرت انگیز حرکتیں کی جائیں جن کی اطلاع یہ خط دے رہا ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ کسی بھی معتبر کتاب میں ایسی کوئی چیز نہیں ملے گی جو تمہاری غلط فہمی کا جواز پیش کر سکے۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ نماز باجماعت کس قدر ضروری چیز ہے۔ سُن لو کہ اللہ کے سچے رسولؐ نے ایک بار تارکین جماعت کے لئے فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔

اور شاید تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ نماز فاسق و فاجر کے پیچھے بھی ادا ہو جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے صلوا خلف کل بر و فاجر (ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہو) جب یہ بات ہے تو اس شخص کے پیچھے نہ پڑھنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے جس کے بارے میں تم نے ایک بات بھی ایسی نہیں بتائی جو گناہ کی فہرست میں آتی ہو۔ یہ جتنے اعتراضات تم نے اٹھائے ہیں ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شیطان نے تم پر قابو پالیا ہے۔ شیطان ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ نیکی اور اطاعت الٰہی کے ہر محاذ پر جہاں تک ہو سکے جہالت و طغیان کا غبار پھیلائے اور جس ناپاک مقصد کے لئے اس نے اللہ سے قیامت تک کی زندگی مانگی تھی اسے پورا کرتا رہے۔ تم تو عوام میں داخل ہو۔ شیطان تو بڑے بڑے علماء اور زہاد و عباد کو بہکا لیتا ہے۔ بلکہ انھیں وہ زیادہ بہکاتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ یہ بہکے تو ان پر بھروسہ کرنے والے ہزاروں مسلمان خود بہک جائیں گے اور مجھے فرداً فرداً گمراہ کرنے کی دردسری مول لینی نہیں پڑے گی۔

یہ جو تم دیکھتے ہو کہ علماء نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف طرح طرح کے فتوے صادر کر دیئے اور دین کو غالب کرنے کا جو ارادہ لے کر یہ جماعت آگے بڑھی تھی اس کی راہ میں اس طرح روڑے اٹکائے کہ کیا کوئی غیر مسلم اٹکائیگا تو یقین کرو کہ یہ بھی شیطان ہی کی دسیسہ کاری ہے۔ ہم خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے پیچھے نماز درست نہ ہونے کے فتوے اتنے ہی غلط اور لایعنی ہیں جتنی یہ بات کہ سورج رات میں نکلتا ہے اور چاند دن میں روشن ہوتا ہے۔ ہماری مولانا مودودی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہم نے انھیں صرف دیکھا ہے۔ ان سے گہرے روابط بھی نہیں رکھے ہیں۔ ہم جماعت اسلامی کے ممبر بھی نہیں ہیں لیکن ہم نے مولانا موصوف اور جماعت اسلامی کے دیگر رہنماؤں کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان پر غور و فکر کیا ہے انھیں قرآن و سنت کی روشنی میں جانچا ہے۔ ہم تم سے اللہ کو گواہ بنا کر عرض کرتے ہیں کہ فتوے دینے والے علماء جو غلط سلط عقائد ان کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ بالکل درست نہیں ہیں اور ان کی تہہ میں وہی تعصب اور جہل کا م

کر رہا ہے جس کے بھرے بھرے پیالے شیطان اچھے عالموں اور دانش مندوں کے حلق میں انڈیلتا رہتا ہے۔

تعصب اور جہالت کا اندازہ اس سے کرو کہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک فارغ التحصیل نے مفتی دارالعلوم کو کسی کتاب کی ایک عبارت نقل کرکے بھیجی اور دریافت کیا کہ اسکے لکھنے والے پر شریعت کیا حکم لگاتی ہے۔ اس نے کتاب اور مصنف کا نام نہیں لکھا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ پست فطرت لوگ مولانا مودودی کی کتابوں میں سے اسی طرح کے فقرے تراش خراش کر جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی کتابوں میں تراشتے خراشتے رہے ہیں علماء کے پاس بطور استفتاء بھیج رہے تھے اور بعض ایسے علماء بھی جن کے زاہد و متقی ہونے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں دھوکے میں آکر گمراہی کے فتوے صادر کر رہے تھے۔ ان علماء کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ اصل کتاب کو پڑھیں اور بعد میں اگر کہنے سننے سے پڑھا بھی تو اسی طرح جانبدارانہ ذہن سے پڑھا جس طرح غیر مسلم قرآن و حدیث کو اعتراض کی خاطر پڑھتے ہیں اور ان کی عبارتوں میں انھیں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے ہیں۔ تم پہلے سے طے کرلو کہ فلاں کتاب بالکل لغو ہے پھر اسے پڑھو تو اکثر و بیشتر یہی ہوگا کہ اس میں تمھیں لغویت ہی لغویت نظر آئے گی۔ تم جس سے محبت کرتے ہو اس کی چال تو تمھیں قیامت کی نظر آتی ہے، لیکن جس سے نفرت کرتے ہو اسکی رفتار میں لنگ اور بھدے پن کے سوا کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ یہی حال دوسرے معاملات کا ہے۔

تو دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب نے یہ سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ عبارت مولٰنا مودودی ہی کی ہے اور انھی کی کسی کتاب سے نقل کرکے بھیجی گئی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ دیدیا فتویٰ کہ اس عبارت کا لکھنے والا اسلام سے خارج کافر و مرتد ہوا۔ اس کی بیوی پر طلاق پڑ گئی وغیرہ وغیرہ۔ اس افسوسناک داستان کی پوری تفصیل مع تاریخ اور مصدقہ نقول کے تجلی میں آچکی ہے۔ اب جو بعد میں حال کھلتا ہے تو یہ کھلتا ہے کہ وہ عبارت مولٰنا مودودی کی نہیں تھی، بلکہ اُن مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جو علمائے دیوبند کے سرتاج اور مقتدار ہو گذرے ہیں۔ اسے انکی کتاب "تصفیۃ العقائد" سے نقل کیا گیا تھا اور نقل بھی اسطرح نہیں کیا گیا تھا کہ مصنف کے خلافِ مقصد مطلب ظاہر ہو، بلکہ پوری کتاب پڑھ کر بھی اسی مقصد کی تصدیق ہوتی تھی جو اس پیش کردہ عبارت سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود مفتی صاحب نے اتنا سخت فتویٰ داغ دیا۔ اسے کہتے ہیں تعصب اور خدا کے خوف سے لاپروائی۔ جب تعصب دماغ پر چھا جاتا ہے تو عقل بیچاری مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب سوچ لو کہ جب شریر لوگ مولانا مودودی کی کتابوں سے اسی طرح عبارتیں کاٹ کاٹ کر پیش کریں گے کہ مفہوم کچھ سے کچھ ہوجائے تو آلا بلا فتوے صادر کرنا کیا مشکل ہوگا۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو اپنی غلطی واضح ہوجانے پر کھلے بندوں اس کا اعتراف کرسکیں۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ جب ان جلد باز مفتیوں کو اطلاع دی گئی کہ آپ نے عبارت کا جو مطلب سمجھکر فتویٰ دیا ہے وہ مطلب مصنف کا ہے ہی نہیں تو ان مفتیوں نے اصل کتاب کو دیکھا اور بجائے اس کے کہ دیانت و صداقت سے کام لیتے ان کے نفسوں نے انھیں اُکسایا کہ جس طرح بھی ہو اپنی بات کی پچ کرو، ورنہ دنیا کے آگے ہیٹی ہوجائے گی۔ ایسی حالت میں انصاف کا تو کیا سوال تھا انھوں نے کھینچ تان کر وہی مطلب نکال لیا جس سے ان کے فتوے کی صحت ثابت ہوجائے اور مزید خود نمائی کے لئے اور بھی عبارتوں سے ایسے ایسے مطالب اخذ کرکے دکھائے جو لکھنے والے کے حاشیۂ خیال تک میں نہ آئے ہوں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر تم اسلام اس لئے لائے ہو کہ آخرت میں نجات پاؤ۔ اگر نماز اور روزے کی زحمت اسلئے اٹھا رہے ہو کہ اللہ راضی ہو تو اندھے تعصب اور احمقانہ ضد بازی سے بلند ہو کر تحقیق کرو کہ ایک دیندار امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنا اور فضول قسم کے اعتراضات کی بنیاد پر عین مسجد میں نفرت و نزاع کے بیج بونا کس قدر ناراضگی رب کا موجب ہے۔

ہم تمہاری ذہنی سطح کا لحاظ کرکے چند کلمات براہِ راست تمہارے اعتراضات کے بارے میں بھی عرض کرتے ہیں۔

(۱) جماعت اسلامی کے پیچھے نماز جائز نہ ہونے کا فتوے

نام مستند علماء کا نہیں، بلکہ گنے چنے چند علماء کا ہے۔ ان علماء
میں بعض نے یہ فتویٰ جلد بازی میں دیا۔ بعض نے فرطِ انفعالات
میں دیا۔ بعض نے کم عقلی میں دیا۔ تم یہ مت سمجھو کہ جس کے
سر پر بڑا سا صافہ اور جس کے نام کے ساتھ لمبے چوڑے
القاب ہوں وہ عقل بھی اسی پیمانے کی رکھتا ہے۔ یقین کرو
کتنے ہی بڑے صافے اور لمبے القاب والے پرلے سرے کے
کم عقل بھی ہوتے ہیں اور بعض عقلیں کچھ ایسی دھان پان ہوتی
ہیں کہ جتنا جتنا ان پر علم کا بوجھ پڑتا ہے اتنی ہی اتنی وہ
پچکتی اور برباد ہوتی چلی جاتی ہیں۔

بریلوی علماء کو دیکھو انھیں خود اللہ تعالیٰ تک یہ
یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے، نہ یہ باور کرا سکے کہ عالم الغیب
اور حاضر و ناظر صرف میں ہوں، نہ یہ اطمینان دلا سکے کہ
قبروں میں سونے والے بے بس ہیں وہ تمھیں کچھ نہیں دے
سکتے۔

اب یا تو نعوذ باللہ اللہ کو غلطی پر مانو یا پھر وہی تسلیم
کرو جو ہم کہتے ہیں کہ علم نے ان کی عقلوں کو روشن کرنے کے
عوض توڑ پھوڑ کے رکھ دیا ہے۔

(۲) نماز پڑھانے کے لئے دستار باندھنا نہ باندھنا
سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تم دیوبندی علماء کے
معتقد ہو یا بریلوی فضلاء کے۔ ان میں سے اکثر کو بلا دستار
ہی نماز پڑھاتے دیکھو گے اور ان کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لو
کہیں نہیں ملے گا کہ صافہ و دستار کا امامت سے کوئی ادنیٰ
سا تعلق بھی ہے۔

(۳) نوافل بجائے مسجد کے گھر میں پڑھنا مسنون ہے۔ اللہ
کے رسول عموماً گھر ہی میں نوافل پڑھا کرتے تھے۔ اب کیا
تم یہ بھی کہو گے کہ اللہ کے رسول غلطی کرتے تھے۔

پھر نوافل مسجد یا گھر میں پڑھنے کا آخر امامت سے
کیا تعلق ہے۔ تمھیں سوائے شیطان کے اور کس نے اس
لایعنی نکتہ سنجی پر ابھارا ہے۔ نوافل اصطلاح میں کہلاتی ہی
وہ نمازیں ہیں جن کی پابندی ضروری نہ ہو۔ جب اللہ اور
رسول ہی نے ایک چیز کا پابند نہیں بنایا تو سوائے شیطان
کے اور کون اس شخص کو امامت کے ناقابل قرار دے
سکتا ہے جو اس چیز کا پابند نہیں ہے۔

(۴) نیاز، فاتحہ، سوئم، چالیسواں سب بدعات و
خرافات ہیں۔ مگر چلو تمہارے نقطۂ نظر سے ہم فرض کئے
لیتے ہیں ان میں کوئی خرابی نہیں بلکہ ان میں ثواب ملتا ہے
لیکن کیا تم قرآن و حدیث سے کسی بھی درجے میں ثابت
کرسکتے ہو کہ ان کا قائل نہ ہونا ایسا جرم ہے کہ اسکے مرتکب
کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔ توبہ استغفر اللہ۔ ہمارے
اپنے نزدیک تو ان بدعات کی مخالفت ہی کارِ ثواب ہے۔
اور جو ان سے بیزاری کا اظہار نہیں کرے گا گنہگار ہوگا۔
لیکن امام مذکور تو اظہارِ بیزاری بھی نہیں کرتے۔ پھر آخر
شیطان کے علاوہ یہ کس کی کارروائی ہوسکتی ہے کہ تمھیں
ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے بدکا دیا۔

درود شریف کا ایک محل ہے اگر ریاکاری مقصود نہ ہو
تو ہر آدمی دن میں صدہا بار اپنے طور پر درود پڑھ کر ثواب
کما سکتا ہے۔ لیکن وعظ و تقریر میں خواہ مخواہ لوگوں کو درود
پڑھوانا اور نمائش کرنا بہت بری بات ہے۔ ہمارے حضور
کا نام گرامی آئے تو بے شک صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہہ لو مگر
اس کے لئے بھی گلے پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دکھاوا
اللہ کو پسند نہیں۔ زیرِ لب کہہ لو یا دل ہی دل میں دہرا لو
وہ اللہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر ہے جس سے اجر و
ثواب کی توقع رکھتے ہو۔ أَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا
بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (تم دل ہی دل میں
قول کرو یا زور سے اللہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے)۔

رہا میلاد۔ تو میلادِ مروجہ کو ہم بدعت قرار دیتے ہیں
اس کے ہزار دلائل بھی ہم نے اور دیگر علمائے حق نے دیئے
ہیں۔ تاہم تم اسے کارِ ثواب سمجھتے ہو تو کم سے کم یہ زبردستی
تو مت کرو کہ جو تمہارا ہم خیال نہ ہو اس کے پیچھے نماز ہی
چھوڑ دو۔ نماز اس شخص کے پیچھے چھوڑی جاسکتی ہے جو
واضح طور پر کفر و شرک کا عقیدہ رکھے اور کفر و شرک کا

اللہ اور رسولؐ نے خوب واضح کردیا ہے۔ میلاد کا ذکر تک تم قرآن و حدیث میں نہیں دکھلا سکتے۔ یہاں تک کہ صحابیوں اور تابعیوں اور قرونِ اولیٰ کے کسی بھی مسلمان نے میلاد کا تصور تک نہیں کیا۔

(۵) اگر تم اپنے آپ کو پیغمبر نہیں سمجھتے تو ذرا تلاش کرو کہ قرآن یا حدیث میں کس جگہ یہ نادر مسئلہ بیان ہوا ہے کہ جو شخص پیچھے کے بال کنگھی کے ذریعہ قینچی سے کٹوائے اسکے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی۔ قرآن و حدیث تمہاری دسترس سے باہر ہیں تو اپنے علماء و فقہاء ہی کی کسی کتاب میں ڈھونڈو کہ یہ مسئلہ لکھا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں لکھا اور یقیناً نہیں لکھا تو آخر دل سے مسئلہ گھڑتے ہوئے خدا سے کیوں نہیں ڈرتے۔

(۶) نمازوں میں مسنون سورتیں کونسی ہیں یہ تم بتاؤ اور پھر یہ بتاؤ کہ جو ان کا پابند نہ ہو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئیے؟ اگر نہیں بتا سکتے تو کیوں لایعنی باتوں سے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ اللہ اجازت دیتا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (پڑھو قرآن میں سے جو کچھ تمھیں آسان معلوم ہو) لیکن تمہارا اعتراض ثابت کرتا ہے کہ اللہ تک پر تمھیں اطمینان نہیں۔ اطمینان ہوتا تو جس چیز کی اس نے اجازت دی ہے اس پر اعتراض نہ جڑتے۔ خوب سمجھ لو۔ علمائے حق نے اس بات کو پسند یدہ سمجھا ہے کہ امام پارۂ عم ہی تک محدود نہ رہے بلکہ وقتاً فوقتاً۔ خصوصاً صبح اور عشاء کی نماز میں دوسرے پاروں میں سے بھی رکوع آدھ رکوع پڑھ لیا کرے۔ امام موصوف یہی کر رہے ہیں لیکن تمھیں تو ان کا ہنر بھی عیب ہی نظر آرہا ہے۔ یہ در اصل ایسا ہی ہے جیسے کیمرے کا فوکس بگڑ جائے تو تصویر خراب ہی آتی ہے۔ اللہ نے جس چیز کو تلک نربیغ (دل کی کجی) سے تعبیر کیا ہے وہ یہی چیز ہے۔

(۷) تم کہتے ہو چادر سر پر اوڑھ کر نماز پڑھنا مکروہ سنا گیا ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ تم نے سب کچھ سنا ہی سنا ہے یا کچھ پڑھا اور دیکھا بھی ہے؟ اگر یوم قیامت کا کچھ بھی لحاظ ہے تو سنی سنائی پر فیصلے کرنے کے عوض خود پڑھو۔ دیکھو تدبر کرو۔

(۸) حد ہوگئی۔ تمھیں قرآن و حدیث کی باتوں پر اعتراض اور اشعار کی چاٹ ہے۔ اس سے بڑی دلیل تمہاری کج فکری کی اور کیا ہوگی کہ بعد کا ترتیب دیا ہوا ایک خطبہ تمھیں اللہ اور رسول کے ارشادات سے بہتر معلوم ہو رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں ضلالِ مبین یعنی واضح گمراہی۔ توبہ کرو۔ خدا کی بارگاہ میں گڑ گڑا کر عفو طلب ہو۔ رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ان خیر الحدیث کتابُ اللّٰہ وخیر الھدیِ ھدیُ محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ	بہترین باتوں کی کتاب اللہ کی کتاب ہے، اور بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو دین میں نئی نکالی گئیں اور ہر نئی چیز گمراہی ہے۔

+ + + +

تعویذ

سوال ع۲:— از ابو ریحان۔ چناری۔ ضلع شاہ آباد۔

تجلی کے کسی گذشتہ شمارے میں تعویذ لکھنے کو آپ نے جائز بتایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا تعویذ لکھنے، گلے میں پہننے، بازو پر باندھنے اور انگوٹھی پر کندہ کر کے انگلی میں پہننے کا جواز عمل نبویؐ اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہے؟ کیا تعویذ کو دم کرنے پر قیاس کیا جائے گا؟

ایک حدیث ہے کہ عیسیٰ بن حمزہؒ کہتے ہیں کہ میں عبد اللہ بن حکیمؓ کے پاس گیا ان کا جسم بیماری سے سرخ تھا۔ میں نے کہا تم تعویذ کیوں نہیں باندھتے۔ انھوں نے کہا ہم خدا کے ذریعہ اس سے پناہ چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی چیز لٹکائے یا باندھے وہ اسی کے حوالے کر دیا جاتا

ہے۔ (ابوداؤد) اس حدیث کا کیا مطلب ہوا؟

الجواب ۲

جن چیزوں کے لٹکانے یا باندھنے کا اس حدیث میں تذکرہ ہے وہ دراصل جاہلیت کے برگ و بار میں سے تھیں۔ گنڈے تعویذ اور ٹوٹکے وغیرہ دورِ جاہلیت کے عرب میں بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی بنیاد تصورات جاہلی پر ہوگی اور ان میں اگر کچھ نقوش یا تحریریں استعمال کی جاتی ہوں گی تو ان کا مبنیٰ وہی توہمات و عقائد ہوں گے جن کا خمیر دیوی دیوتاؤں کی عقیدت اور وہم پرستانہ پروازِ خیال کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے بارے میں اگر اللہ کے رسولؐ نے مذکورہ ارشاد فرمایا تو بجا فرمایا۔

لیکن ہم نے جن تعویذوں کے جواز کا قول کیا ہے ان کی نوعیت اور ہے۔ ہمارے علم کی حد تک تعویذوں کے نقوش عموماً آیاتِ قرآنیہ ہی کی تلخیص ہوتے ہیں۔ جیسے ۷۸۶ لکھ کر بسم اللہ مراد لی جاتی ہے اسی طرح تعویذ کے اعداد و نقوش بعض آیات یا احادیث یا کلماتِ دعا و تسبیح کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ ان سے اگر منفعت و برکت کی توقع کی جائے تو اصلاً یہ کلامِ الٰہی اور حدیثِ رسولؐ ہی سے توقع ہے جس کے جواز میں کوئی شک نہیں۔ ہاں جس تعویذ کی بنیاد غیر مشروع تخیلات پر ہو ان کا جواز نہیں ہے، اور تعویذ کی خرید و فروخت کا کاروبار تو بالکل ہی جائز نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسائلِ تصوف

سوال ۳:۔ (ایضاً)

رسالہ المجیب پھلواری شریف (پٹنہ) اپنے اداریہ میں خانقاہ مجیبیہ کے بزرگوں کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ۔

۔"بعض کو ظاہری تعلیم بھی حضور نبویؐ سے ملی اور بعض نے آنحضرتؐ کی جناب میں قرآن کریم سبقاً سبقاً پڑھ کر ختم کیا۔" پھر تحریر ہے کہ "۔۔۔۔ گویہ شرف حاصل ہوا کہ چشمِ ظاہر سے نبی کریمؐ سے مشرف ہوتے اور قرآن کریم کا درس لیتے۔ پھر باطنی تعلیم سے نوازے گئے۔" (ربیع الاول [illegible])

اب سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفات تصوف و معرفت کے خانوادوں کو ظاہری اور باطنی تعلیم اور سبقاً سبقاً قرآن پاک کا درس دے سکتے ہیں اور کیا ایک شخص چشمِ ظاہر سے آپ کی زیارت کر سکتا ہے؟

الجواب ۳

بعض امور ایسے ہیں جو ہمارے نقد و نظر کے دائرے سے باہر ہیں انھی میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ہمیں تصوف و طریقت کا کوئی عملی تجربہ نہیں اور تجربے کے بغیر وہ باتیں کیسے معلوم ہوں جن کا تعلق علم و فہم سے نہیں تجربے سے ہے۔

جتنا ہم نے پڑھا ہے اس میں تو اس طرح کے اسرار و رموز کی کوئی تصدیق نہیں، لیکن کسی خانقاہ کے بزرگوں کو اگر کچھ پبلسٹی مل جائے اور پھر ان کے سلسلہ کو قائم رکھنے والے بقیہ حیات بزرگوں کو اس کے نتیجے میں وافر معتقدین و متوسلین ہاتھ آجائیں تو ہمیں اسے بحث و نظر کی کیا ضرورت۔ کون جانے کس کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کا کیا معاملہ رہا۔ ہمیں تیقن کے ساتھ جو باتیں معلوم ہیں وہ بس یہ ہیں کہ انک میت وانھم میتون کی تصریح کے مطابق ایک دن اللہ کا سب سے بڑا رسول بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا تھا مگر اس کے جسدِ اطہر کو مٹی نہیں کھا سکتی کیونکہ وہ نبی تھا۔ فرشتے اس تک ہمارا درود پہنچاتے ہیں اور قسمت والے خواب میں اس کی زیارت کرتے ہیں۔

اب یہ سوالات کہ اس کی روح اور جسم میں فی الوقت کیا تعلق ہے اور وہ اپنے کسی امتی کو عالمِ بیداری میں چشمِ سر سے نظر آ سکتا ہے یا نہیں اور کسی بزرگ کو اس سے سبقاً سبقاً قرآن کی تعلیم کی عظیم سعادت میسر آئی ہے یا نہیں تو اس بحث میں نہ آپ پڑیے نہ ہم پڑتے ہیں۔ واللہ بکل شئ علیم۔

وہی دیرینہ بیماری ....!

سوال:- از محمد عبدالرزاق - نظام آباد - دکن -

ذیل میں جناب شیخ داد صاحب پیش امام جامع مسجد ایڑپلی تعلقہ بودھن ضلع نظام آباد (آندھرا پردیش) کے چند ارشادات روانہ کئے جارہے ہیں - براہ کرم اپنے رسالہ کی قریبی اشاعت میں ان کی صحت یا عدم صحت پر مدلل روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں تاکہ یہاں کے لوگوں میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے دور ہو سکے -

(۱) اللہ کے نیک بندوں اور آنحضرتؐ کے وسیلہ کے بغیر ہماری نماز و دعا اللہ کے حضور قبول ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہم بندے گندے ہیں - ہمارے گناہوں کی وجہ سے اللہ ہماری دعا قبول نہیں کرتا اس لئے جب ہم حضورؐ کو وسیلہ ٹھیرا کر دعا کرتے ہیں تو حضورؐ ہمارے لئے اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں - اس لئے ہماری دعا مقبول ہوتی ہے ورنہ ہماری نماز و دعا قبول ہی نہیں ہوتی -

(۲) حضورؐ اپنی طبعی موت مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں - اگر حضورؐ مرچکے ہیں زندہ نہیں ہیں تو پھر حج کے موقع پر حاجی مدینہ طیبہ جاکر حضورؐ کی زیارت کیوں کرتے ہیں - کیا صرف قبر کی زیارت کرنے کو حاجی جاتے ہیں ؟ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضورؐ طبعی موت مرچکے ہیں وہ گمراہ ہے -

(۳) جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضورؐ مرچکے ہیں اس کو چاہئے کہ صرف لا الٰہ الا اللہ پڑھے اور محمد الرسول اللہ کو کلمہ میں سے نکالدے -

(۴) حضورؐ فرشتوں کی طرف بھی رسول بناکر بھیجے گئے ہیں ؟

الجواب:-

آدمی علم و فہم کے غرور اور خود پسندی کے شکنجے میں پھنسکر جو بھی گل افشانیاں کر گذرے کون اس کی زبان اور قلم پکڑ سکتا ہے - یہ امام صاحب ایسے ہی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جن کے علم و فہم کو خود بینی و استکبار نے جہل مرکب کی حدوں میں پہنچا دیا ہے -

بالترتیب جوابات یہ ہیں :-

(۱) ایک معمولی علم و عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ جو احکام و ہدایات بہت ضروری اور اہم ہوتے ہیں انھیں قانون کی کتابوں میں بہت کھول کر بیان کیا جاتا ہے اور ذرا بھی ابہام ان میں نہیں رہنے دیا جاتا - قرآن بھی قانون ہی کی ایک کتاب ہے جس میں سب سے بڑے حاکم نے اپنے احکام و ہدایات کو بندوں کیلئے ثبت فرما دیا ہے اور جو امر و نہی زیادہ مؤکد تھے انھیں اتنی ہی تاکید اور صراحت کے ساتھ نازل کیا ہے - کون نہیں جانتا کہ دعا کی کس قدر اہمیت ہے اور نہ صرف یہ کہ حدیث سے اس کا مخ العبادت (مغز عبادت) ہونا منکشف ہے، بلکہ عقلاً بھی اس کی بے حد اہمیت و ضرورت ظاہر و باہر ہے - کون انسان ہے جو قدم قدم پر اللہ سے طلب و التجا کا محتاج نہیں اور کون ہے جسے اپنی خطاؤں کی مغفرت اور مختلف اُمور میں کامیابی کے لئے دعا کی حاجت نہیں -

جب یہ صورتِ حال ہے تو بالکل ظاہر تھا کہ اگر قبولیت دعا کے لئے کسی کا وسیلہ پکڑنا شرط لازم ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے نہ صرف واضح فرما دیتے بلکہ نماز اور زکوٰۃ کی طرح اس وضاحت کو بار بار نمایاں کرتے، لیکن قرآن آپکے سامنے ہے الحمد سے والناس تک دیکھ جائیے کہیں بھی اشارہ تک نہیں ملیگا کہ دعاؤں کی قبولیت کا انحصار توسّل پر ہے - وہاں تو کہا جاتا ہے :-

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ -	اور اے محمد جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہدے میں قریب ہی ہوں جب کوئی دعا کرنیوالا دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں - پس چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھی پر یقین رکھیں - (البقرہ رکوع ۲۳)

\+ + + +

\+ + + +

\+ + + +

کتنی صاف بات ہے کہ اگر دعا کی قبولیت کا مدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسّل پر ہوتا تو اس موقع پر بالیقین اسکی توضیح و تاکید کردی جاتی لیکن نہ یہاں نہ قرآن بھر میں کہیں اور

جگہ اشارۃً بھی اس طرح کی بات کہی گئی - قرآن میں تو جگہ جگہ انابت الی اللہ اور توبہ و استغفار کی ترغیب و تاکید ہے، لیکن توحیدِ خالص کی سطح پر - اور احادیث صحیحہ میں بھی یہی رنگ ہے - کسی کے ـــــ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے کو بھی قبولیت دعا کی شرط لازم ٹھیرانا دراصل اُسی ذہن کی اُپج ہے جو افراط و غلو کی راہ میں آگے بڑھکر مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیتا ہے۔

دعا کے ساتھ امام صاحب نے "نماز" کا بھی ذکر کیا ہے - اس بوالفضولی کو کیا کہیئے - نماز خالصۃً اللہ کی بندگی ہے - اس بندگی کے مکلف اور مامور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح تھے جس طرح ہم ہیں - اس کی قبولیت اور عدمِ قبولیت میں کسی کے توسّل کا کیا واسطہ - بیشک رسول اللہؐ اور حضرت ابراہیمؑ پر صلوات کو داخلِ نماز کیا گیا ہے، لیکن یہ توسّل نہیں ہے - قدرِ نعمت کا ایک بلیغ اسلوب ہے، وہ نعمت جو ہماری ملت کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ اور ہمارے برگزیدہ پیغمبر محمد رسول اللہؐ کے مقدّس واسطوں سے اللہ نے ہمیں بخشی۔

(۲) حضورؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں یا نہیں اور زندہ ہیں تو زندگی کس نوع کی ہے - یہ بحثیں تو علماء میں کافی چلی ہیں اور ان میں اختلاف آراء کی گنجائش بھی ہے - لیکن سرے سے یہی نہ ماننا کہ حضورؐ پر طبعی موت وارد ہوئی تھی مبالغہ پرست اور بگڑے ہوئے ذہنوں کی ایجاد ہے - تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہؐ کی رحلت پر حضرت عمر فاروقؓ کچھ دیر کے لئے جذبات سے مغلوب ہو گئے تھے اور یقین ہی نہیں کر رہے تھے کہ اللہ کا سب سے بڑا رسولؐ بھی موت کا ہدف ہو سکتا ہے - اس پر وہ مردِ جلیل سامنے آیا جس سے بڑا صائبِ نظر اور حق شناس انبیاء کے سوا چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھا - یعنی پیغمبر کے غارِ ثور کا ساتھی ثانی اثنین ابوبکر صدیقؓ اور کہنے لگا عمرؓ کیا کہتے ہو۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران ع ۱۵)	اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہیں - گزر چکے ان سے پہلے بہت رسول - پھر کیا اگر محمدؐ مرگئے یا قتل کر دیئے گئے تو تم اُلٹے پیروں پھر جاؤگے؟ اور جو کوئی اُلٹے پیروں پھر جائیگا (وہ سمجھ لے کہ) اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور اللہ ثواب عطا کریگا شکر گذاروں کو۔

+ + + +

اور اسی وقت حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے یہ الفاظ بھی دُہرائے تھے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (بے شک اے محمد تجھے بھی مرنا ہے اور وہ بھی مرجائینگے)

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دل و دماغ میں کجی نہ ہو تو قرآن و حدیث اور عقل و ادراک کے دوسرے شواہد سے قطع نظر صرف یہی ایک تاریخی شہادت اُن فاسد خیالات کا قلع قمع کرنے کے لئے کافی ہے جو حضورؐ کی طبعی موت سے انحراف پر مشتمل ہیں۔

سمجھنا چاہیئے کہ حضورؐ کا بعد از مرگ کسی قسم کی زندگی سے متصف کیا جانا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ آپ پر کبھی مرگِ طبعی وارد ہی نہیں ہوئی - موت تو ہر بشر کا مقدور ہے اور حضورؐ بھی بشر ہی تھے - دو جداگانہ باتوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

(۳) یہ استدلال چٹکلے کی نوع کا ہے - مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کا مطلب رسالتِ محمدیؐ کا اعلان و اعتراف ہے اگر یہ اعتراف اسی بات پر منحصر ہو کہ حضورؐ پر کبھی طبعی موت وارد نہیں ہوئی تو پھر تو تمام انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی عقیدہ ضروری ہوگا کہ انھیں موت نہیں آئی - آخر قرآن تو سبھی انبیاء پر ایمان اور اس ایمان کے اعتراف کا حکم دیتا ہے - لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ یہ وہ کلمۂ تصدیق ہے کہ اسے جو نہ دُہرائے وہ مسلمان ہی نہیں ہے - پھر ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے موت سے بالاتر ہونے کے کیوں مدعی ہو تمام انبیاء کے بارے میں کہو کہ انھیں موت نے نہیں چھوا۔

امام صاحب اگر سیدھے سادے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آج بھی کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ محمدؐ زندہ ہیں تو اگرچہ ہم زندگی کا انکار نہیں کرتے، لیکن اسے خوب سمجھ لیجئے کہ رسالت محمدیؐ کے اقرار سے حضورؐ کے زندہ ہونے نہ ہونے کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تو اس بات سے ہے کہ محمدؐ کو رسول بنا کر اللہ نے جو شریعت نازل فرمائی تھی وہ آج بھی اسی طرح واجب التعمیل اور زندہ جاوید ہے جس طرح پہلے تھی۔

حضورؐ کی طبعی موت کا اعتقاد رکھنے سے تو محمد رسول اللہ کو کلمے سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاں جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ پر کبھی موت وارد ہوئی ہی نہیں وہ ضرور اُن آیات کو قرآن سے خارج کر چکے ہوں گے جن میں سے دو کا ابھی ذکر (بزبان صدیق رضؓ) ہوا اور اسی نوع کی دوسری آیات بھی انکے نزدیک منسوخ و معطل ہوں گی۔ مثلاً:۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ	ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے
اور۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ	زمین پر جو کچھ بھی ہے اسے ضرور فنا ہونا ہے۔

تُف ہے اس عقل پر جو محکمات کو چھوڑے اور متشابہات کو سینے سے لگائے۔

(۴) حضورؐ فرشتوں کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے، اسے ماننے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں، لیکن اس نکتہ پر ضرور غور کر لینا چاہئے کہ فرشتے اللہ کی وہ مخلوق ہیں جن میں سرتابی و سرکشی کی صلاحیت ہی نہیں رکھی گئی۔ وہ انس و جن کی طرح اس اختیار سے نہیں نوازے گئے کہ چاہیں تو ربانی احکامات کی تعمیل کرکے ثواب کمائیں اور چاہیں تو بغاوت و معصیت کرکے عذاب کا سامان کریں ایسی حالت میں ان کی طرف رسول مبعوث کرنا فعلِ عبث ہوگا۔ رسالت اللہ تعالیٰ کا کوئی کھیل نہیں ہے ایک مقصدی شے ہے۔ رسولوں کے ذریعہ اللہ اپنی ہدایات پہنچاتا ہے۔ تاکہ بندے اپنے رب کو پہچانیں اور عبادت کریں۔ فرشتے خلقتاً ہی رب کو پہچانتے ہیں اور اس کے مکمل مطیع فرمان ہیں لہٰذا ان کے لئے رسول کی بعثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تاہم اگر کسی کو یہ کہہ کر خوشی ہوتی ہے کہ رسول اللہ فرشتوں کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے تو ہمیں اسکے تعاقب سے کوئی دلچسپی نہیں۔

سالی اور بہنوئی

سوالؓ:۔ از ابوظفر۔ مقام نامعلوم۔

بہنوئی اور سالی (بیوی کی بہن) کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہے جب کہ بیوی بقید حیات ہو۔ سورۂ نسآ کی آیت۔ أَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ (دو بہنوں کو بیک وقت قید نکاح میں لانے کی حرمت پر نص صریح ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا سالی کے ساتھ معاملہ کی نوعیت بھی ویسی ہی ہوگی جیسی دیگر محرمات مثلاً اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ؟ کیا سالی کے لئے بہنوئی سے پردہ کرنا ضروری ہے جس طرح کسی غیر سے کیا جاتا ہے یا پردے کے حدود میں کچھ نرمی ہے۔ کیا سالی بہنوئی کے ساتھ عام حالات میں سفر کر سکتی ہے۔ کیا عام حالت میں بہنوئی سالی سے جسمانی خدمت لے سکتا ہے۔ مثلاً سر میں تیل ڈالنا یا پاؤں ہاتھ یا جسم دابنا وغیرہ ؟ امید ہے بہنوئی اور سالی کے تعلق سے پیدا ہونے والے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو فرمائینگے۔

الجوابؒ:۔

سالی اور دیگر محرمات میں فرق یہ ہے کہ سالی کی حرمت مشروط ہے اور دیگر محرمات کی غیر مشروط۔ بیوی مرجائے یا اسے طلاق دیدی جائے تو اس کی بہن سے نکاح اسی طرح جائز ہوجاتا ہے جس طرح کسی بھی نامحرم عورت سے۔ لیکن ماں اور بہن اور خالہ وغیرہا کی حرمت دائمی ہے۔ کوئی صورت نہیں کہ کبھی ان سے نکاح کا جواز نکلے۔

سالی کا بہنوئی سے پردہ تو ضروری نہیں ہے لیکن جسمانی

خدمت اور بے تکلفانہ تعلقات میں اُن حدوں کا لحاظ ضروری ہے جن کا لحاظ اسلام باپ اور بیٹی تک کے معاملہ میں کرتا ہے۔ جوان بیٹی اور باپ تک کے مابین اسلام نے کچھ ایسے آداب و قیود رکھے ہیں کہ نفس امّارہ اور شیطان کی دراندازی کا امکان بعید سے بعید ہو جائے تو سالی اور بہنوئی کے مابین تو لازماً ایسی تمام احتیاطیں بہت ضروری ہیں جن کے بغیر نفسانیت کو اُبھرنے اور دسیسہ کاری کرنے کا موقع میسر آسکتا ہو۔

بہنوئی اگر شیخ فانی کے درجے کو پہنچا ہوا ہے یعنی اتنا بوڑھا ہے کہ اس میں رجولیت اور جنسی رجحان کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو معمولاً نہیں بلکہ ضرورۃً ایک جوان سالی اسکے ہاتھ پاؤں دبا سکتی ہے۔ سر میں تیل ڈال سکتی ہے۔ ہمراہ سفر بھی کر سکتی ہے۔ لیکن جسم دبانے کے ساتھ ضرورۃً کی قیدیں ضروری ہے کہ بلا سے بہنوئی بوڑھا سہی لیکن سالی تو جوان ہے اور مردانہ جسم کا لمس اس کے اندر جنسی رجحان کو مشتعل کر سکتا ہے۔ یہ اشتعال اگرچہ بہنوئی کی ذات سے غیر متعلق ہو، لیکن یہ بجائے خود فتنہ کا دروازہ ہے اور اس کے نتیجے میں عورت کی ذہنی رو غلط راہوں پر بہک سکتی ہے۔

اسلام کے مطلوبہ معیارِ عفت و عصمت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر صرف سالی بہنوئی ہی کے معاملہ میں نہیں تمام ہی مرد و زن کے معاملات میں آدمی خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہاں تک روابط درست ہیں اور کون سے نہیں۔ کن مراحل تک اختلاط روا ہے اور کہاں سے انقطاع ضروری ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حقیقی بھائی اور بہن کو بھی ــــ اگر وہ بوڑھے نہ ہوں۔ اسلام ایک گھر یا ایک کمرے میں بلا ضرورت خلوت گزینی ہو نیسے روکتا ہے۔ وہ یہ بھی اجازت نہیں دیتا کہ دونوں پلنگ ملا کے سوئیں یا آپس میں ہاتھا پائی کے انداز کا مذاق کریں حالانکہ بہن اور بھائی کے رشتے کا تقدس بچپن ہی سے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اور جنسی رجحان کی نمو داس تقدس کی موجودگی میں کافی بعید از قیاس ہے، لیکن واقعات شاہد ہیں کہ یہ تقدس مات بھی کھا جاتا ہے جنسی جذبہ ایسی قوی جبلّت ہے کہ اس پر کڑی نگرانی کے بند نہ باندھے جائیں تو اس کا طوفان بعض مرتبہ احساس تقدس اور ورع و تقویٰ کے بڑے بڑے ایوانوں کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اسی لئے ذہنی تقدس کے ساتھ ضروری ہے کہ عملاً بھی اُن آداب و قیود کو ملحوظ رکھا جائے جن سے اس تقدس کو غذا ملتی ہے۔ نہ یہ کہ نفسِ امّارہ کو اُبھرنے اور مشتعل ہونے کا موقع دیا جائے۔

جب بھائی اور بہن کا بھی یہ معاملہ ہے تو نامحرم مرد و زن کے معاملات تو اور بھی زیادہ احتیاط کے محتاج ہیں۔ وہاں تو کوئی ذہنی تقدس بھی نہیں پایا جاتا۔ وہاں جنسی رجحانات کو اُبھرنے اور کھل کھیلنے کی زیادہ آزادی ہے۔ مثلاً سالی اگرچہ اس کی بہن کے زوجیت میں ہوتے ہوئے حرام ہے، لیکن وہ بہن اور ماں جیسی محرم نہیں ہے۔ اس سے بہنوئی کا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ اس کے لئے کسی تقدس کا احساس بھی بہنوئی کے قلب و ذہن میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے جنسی تعلق قائم کرنے کی وہ نوعیت نہیں ہے جو خدانخواستہ کسی محرم سے ہے۔ لہٰذا اس کے معاملہ میں اور بھی حزم و احتیاط ضروری ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

ایصالِ ثواب

سوال ۱۲:۔ (ایضاً)

ایصالِ ثواب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا قرنِ اولیٰ میں صحابۂ کرامؓ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے اسکے جواز پر کوئی ہدایت ملتی ہے؟ کیا جسمانی عبادت مثلاً نماز روزہ، تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب مُردوں کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کی وفات پر رشتہ داروں کا مجلس قرآن خوانی منعقد کرنا کیسا ہے؟ آج کل باقاعدہ مساجد میں قرآن خوانی کا اعلان کیا جاتا ہے اور نمازیوں کو ٹھیرنے اور تلاوت کرنے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ کیا یہ مزاج شریعت سے مطابقت رکھتا ہے؟ بلکہ اب تو جذبۂ مسابقت اور مقربین کے لئے مواقع فراہم کرنے کا منظر بھی سامنے

آرہا ہے۔ دیگر افراد میں بھی یہ جذبہ پرورش پا رہا ہے کہ ہم بھی اپنے وفات پانے والے رشتہ داروں کے لئے مسجد میں تلاوت کا اہتمام کریں، بلکہ کچھ آگے بڑھ کر اپنے اپنے سلسلے کے بزرگوں کے لئے بھی قرآن خوانی کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ براہِ کرم مسئلہ کی اصل نوعیت نیز رواجی طریقہ پر سیر حاصل تبصرہ فرمائیں۔

الجوابـــ :-

اس موضوع پر ہم اپنے خیالات کا اظہار بارہا کر چکے ہیں۔ علماء کے درمیان اس بارے میں تقریباً اتفاق ہی ہے کہ ایصالِ ثواب کی ایک حقیقت ہے لیکن کیا ہر نوع کی عبادتوں کا ثواب دوسروں کو پہنچایا جا سکتا ہے یا بعض انواع اس سے مستثناء ہیں؟ یہ مختلف فیہ ہے۔

ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے فرائض و واجبات کے علاوہ جو بھی نیک عمل کرے اس کا ثواب دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ دعا کر سکتا ہے۔ صدقہ و خیرات ہو یا قرآن خوانی یا نفل روزہ نماز۔ اب یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ وہ دعا قبول کرے یا نہ کرے۔ ایصالِ ثواب کا جذبہ ایک اچھا جذبہ ہے جو ایثار، سخاوت اور غمگساری پر دلالت کرتا ہے۔ چھوڑیئے کہ فی الواقع بھی ثواب منتقل ہوتا ہے یا نہیں۔ نہ ہوتا ہوگا تو خود صاحبِ عمل کے حساب میں جمع ہو جائے گا۔ لیکن ذاتی مفاد و غرض سے بلند ہو کر محض دوسروں کے نفع کی خاطر کام کرنے کا مظاہرہ تو اس سے ہوا۔

ہاں بحث طلب یہ ہے کہ ایصال ثواب کے صحیح طریقے کیا ہیں۔ تو ان کے بارے میں ہماری رائے وہی ہے جو دوسرے امورِ خیر کے بارے میں ہے کہ ان کی ادائگی خود ساختہ رسوم اور ایجاد کردہ قیود و آداب کی بجائے سادگی اور شرعی توسع کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ مرحوم کے لئے قرآن پڑھیئے مگر یہ رسم مت جاری کیجئے کہ جب تک دس بیس آدمی یکجا ہو کر قرآن نہ پڑھ لیں مُردہ دفن ہی نہ ہو۔ مسجدیں اجتماعی قرآن خوانی کے لئے نہیں ہیں نہ انکا یہ مصرف قرونِ اولیٰ میں نظر آیا۔ پھر یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو مسجدوں میں جمع ہو کر قرآن خوانی کی دعوت دی جائے۔ تلاوتِ قرآن عبادت ہے اور عبادتوں میں ہم بس انہی حدود اور دائرہ میں رہنے کے قائل ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول اور خلفائے راشدین نے واضح کر دیا ہے۔ یا پھر ائمۂ مجتہدین نے قرآن و سنت کی روشنی میں ان پر اجماع کیا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر بہت سے آدمیوں کا قرآن پڑھنا اس پہلو سے تو مفید کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح بعض وہ لوگ بھی تلاوت کر لیتے ہیں جو اپنے طور پر شاید اس کا وقت نہ نکالتے۔ لیکن یہ فائدہ اس نقصان کے مقابلے میں بہت کم ہے کہ عبادت کا ایک نیا انداز اور نئی شکل نکال کر بدعت کی فہرست میں اضافہ کیا جائے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ جہاں ایک بدعت جنم لیتی ہے وہاں سے ایک سُنت اُٹھالی جاتی ہے۔ یہ فرمودہ سورج کی طرح روشن ہے جس کی بصیرت ماری نہیں گئی وہ جائزہ لے لے کہ جن حلقوں میں بدعات رواج پا گئی ہیں وہاں سنتوں کا وجود ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ ایاکم والمحدثات۔

خرد کا نام جنوں

سوالـ :- از احمد حسین۔ آسام۔

آپ نے تجلّی کے ستمبر و اکتوبر کے مشترکہ شمارے میں عبدالرحمٰن خاں الٰہ آبادی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حافظ ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری کے متعلق ارقام فرمایا تھا کہ :-

”ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مولانا مودودی کی دینی فکر کو سراہنے والا قیام جیسی بدعتِ صریحہ کا مرتکب ہوتا ہوگا“

آپ نے صرف اندیشہ ظاہر کیا تھا مگر حافظ صاحب نے اپنے رسالہ ”انوار الاسلام“ بابت جنوری ۶۳ء میں ایک اداریہ لکھ کر غیر ارادی طور پر خود ہی انکشاف فرما دیا ہے کہ وہ قیامِ میلاد کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظ صاحب

اپنے مذکورہ بالا پمفلٹ میں "خدایا تفریق پسند علماء سے اسلام کو بچا" کے تحت رقم طراز ہیں:۔

"چھدو ہی ضلع بنارس میں راقم الحروف (حافظ ابو محمد امام الدین صاحب) ہی کی زیر صدارت ایک جلسہ سیرت ہوا۔ حضرت مولانا ابو الوفا صاحب شاہجہانپوری بھی اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ مولانا صبغۃ اللہ انصاری فرنگی محلی نے تقریر کرتے ہوئے اچانک قیام کردیا مولانا ابو الوفا بھاگ بھی نہ سکے دوزانو مؤدب بیٹھ گئے سارا مجمع کھڑا صلوٰۃ وسلام پڑھ رہا تھا۔ مولانا بیٹھے تھے، ساتھ دیا صرف جماعت اسلامی کے ایک مقامی ہمدرد نے جو مولانا کے داعی تھے اس وقت مولانا کی پوزیشن اتنی مضحکہ خیز تھی کہ مجھ کو بھی ترس آرہا تھا"

خط کشیدہ عبارت صاف بتارہی ہے کہ حافظ صاحب موصوف بھی قیام کرنے والوں ہی میں تھے۔ مجھے سخت حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا شاہجہانپوری کی اس پوزیشن کو انھوں نے مضحکہ خیز کہا ہے۔ حالانکہ مضحکہ خیز تو حافظ صاحب اور جملہ شرکاءِ جلسہ کا حال تھا۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ جو بدعت سے اجتناب کرے اس کی اس پوزیشن کو مضحکہ خیز کہا جائے اور جو بدعت پر نکیر نہ کرے بلکہ خود بھی اسی بدعت کا ارتکاب کرے وہ قابل ستائش۔

اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک لائق صد آفریں ہے مولانا ابو الوفا صاحب کی یہ پوزیشن جسے حافظ صاحب مضحکہ خیز بتارہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ایسے لوگوں کی ہمدردی سے جماعت اسلامی بچی رہے جو دعویٰ تو ہمدردی کا کریں مگر اس کے دستور سے انحراف بھی کریں۔ مخالفین جماعت کا یہ الزام کہ جماعت اسلامی والے گفتار کے ذریعہ قرآن وسنت کا ڈھول تو خوب پیٹتے ہیں مگر ان کا کردار قرآن وسنت کیخلاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ حافظ صاحب موصوف جیسے لوگ ہی جماعت کے ہمدرد بن کر دوسروں کو الزام تراشی کا موقع دیتے ہیں۔

الجواب:۔

ہمیں بعض اور ذرائع سے بھی معلوم ہو چکا ہے کہ حافظ امام الدین صاحب میلاد میں قیام کے قائل بھی ہیں اور عامل بھی۔ جو اقتباس آپ نے ان کے ادارئیے سے دیا وہ پوری طرح اس کا مظہر ہے کہ قیام کی بدعت انکی نگاہ میں نہ صرف یہ کہ بدعت نہیں بلکہ ہر آئینہ محمود اور موجب اجر و ثواب ہے۔

پھر جس عنوان کے تحت انھوں نے یہ سب لکھا ہے وہ بھی اس بات کا مظہر ہے کہ اتحاد و اتفاق اور رواداری کو وہ یکسر غلط معنی میں لے رہے ہیں۔ تفریق و تنفر بے شک نہایت بُری شے ہے اور رواداری و فراخ قلبی کے محمود ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اسے رواداری نہیں ذہنی مرعوبیت کہیں گے اگر آدمی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے عقیدے کے خلاف عمل پر آمادہ ہو جائے۔

ہمیں نہیں معلوم امام الدین صاحب جیسے دانشمند اور سرد و گرم چشیدہ کے علم و فہم نے کس بنیاد پر یہ بدعتِ قیام کو مستحسن قرار دے لیا ہے جب کہ معمولی سا غور و فکر بھی اس حقیقت کو منکشف کرنے میں کافی ہے کہ یہ قیام اُسی شجرِ خبیث کے برگ و بار میں سے ہے جس کی جڑیں افراط و غلو اور شرک کی زمین میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آخر صلوٰۃ وسلام کیوقت کھڑے ہو جانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہوتا ہے کہ کھڑا ہونے والا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا یقین رکھتا ہے یہ یقین جس عقیدے کا ماحصل ہے وہ یہی تو ہے کہ رسول اللہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہیں۔ ممکن ہے حافظ صاحب اور بعض دیگر حضرات اس عقیدے کا شعور و احساس نہ رکھتے ہوئے محض تابع اہل کے طور پر ہی قیام کر لیتے ہوں لیکن دنیا کے سب سے بڑے گناہ شرک کی دنائت و قباحت تو اس درجہ ہے کہ محض صورۃً بھی اعمالِ شرکیہ کا ارتکاب

کسی موحد کو گوارا نہ ہونا چاہئے۔
آپ نے درست کہا کہ زیرِ بحث معاملہ میں مولٰنا ابوالوفا کی پوزیشن اللہ اور رسولؐ کے نزدیک لائقِ صد آفریں ہے۔ لیکن حافظ صاحب نے بھی اپنے نقطۂ نظر سے غلط نہیں کہا ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ اور آخرت کی بات نہیں کر رہے بلکہ خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے رائے زنی فرما رہے ہیں۔ دنیا کا حال آپ دیکھتے ہی ہیں کہ اگر رشوت خور محکمے میں ایک ایسا ملازم پھنس جاتا ہے جو رشوت سے گریز کرتا ہو تو اس کی پوزیشن مضحکہ خیز ہی ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً ٹرکی اور مصر و شام میں کوئی داڑھی والا مسلمان پہنچ جائے تو وہاں کے اکثر و بیشتر حلقوں میں خود مسلمان ہی اس کی طرف ایسے مضحکہ اڑانے والے انداز میں دیکھتے ہیں جیسے اس کے ماتھے پر سینگ اُگ آئے ہوں۔
مغرب زدہ سوسائیٹی میں ہم جیسا کوئی مُلّا پھنس جائے تو اس کی پوزیشن واقعی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ دور کیوں جائیے اپنے پاکستان ہی میں یہ حال ہو چلا ہے کہ سوسائٹی کے بیشتر حصے میں داڑھی کو استہزاء کی نظر سے دیکھا جاتا ہے خود ہم نے اپنے کانوں سے ایک روشن خیال جوان کا یہ عجیب ریمارک سُنا کہ عجیب مصیبت ہے دیوبند سے جسے دیکھو داڑھی لگائے چلا آرہا ہے۔
ہمارے قلب پر بجلی سی گری۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ یہ تنہا اس نوجوان کا ذہن نہیں، بلکہ یہ تو تہذیبِ نو کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی پاکستانی سوسائٹی کا وہ عام ذہن ہے جو موسمِ بہار کے گل بوٹوں کی طرح تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ اب ظاہر ہے ایسے ماحول میں تو ہماری اور ہم جیسے دوسرے داڑھی والوں کی پوزیشن مضحکہ خیز ہی ہو جائے گی۔
خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ اعمال اگر خیالات ہی کا مظہر ہوتے ہیں تو صلوٰۃ و سلام کے وقت کا قیام یقیناً ایک ایسے غلو آمیز عقیدے کا اعلان و اظہار ہے جس کے لئے قرآن و سنت میں کوئی بنیاد نہیں، بلکہ قرآن و سنت جہراً و علانیاً اس کی مذمت کر رہے ہیں۔ اگر حافظ صاحب کو سچ مچ ایسے دلائلِ قاہرہ دستیاب ہوگئے ہیں جن سے یہ بدعت دائرۂ استحسان میں آگئی ہو تو انھیں اپنے رسالے میں ان کا انکشاف کرنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک تو یہ منکرات میں داخل ہے اور منکرات کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ان کی حتی الوسع مخالفت کرو۔ انھیں ممکن ہو تو زورِ قوت سے کچل دو اور یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم زبان ہی سے بُرا کہتے رہو۔ زبان بھی پکڑلی جائے تو دل میں بُرا سمجھو۔ اگر دل سے بھی بُرائی نکل گئی تو ایمان کا کوئی درجہ باقی نہیں۔
اس سلسلے میں اگر دورِ حاضر کے ایک ممتاز اور صاحبِ تقویٰ عالم مولانا بدرِ عالم میرٹھی ثم مدنی کا وہ نصیحت نامہ پڑھ لیا جائے جسے "بدعت کیا ہے" نامی کتاب کے تازہ ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بُرائی کے باب میں مصالحت اور درگذر کا طرزِ عمل اختیار کرنے کو ایک ہم ہی ذہن و بے حسی سے تعبیر نہیں کر رہے، بلکہ اونچے درجے کے اولیاء اللہ بھی ایسا ہی کہتے اور سمجھتے چلے آئے ہیں رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

گمراہی کے مقدس راستے

سوال ۴:- (ایضاً)

ایک کتاب "تجلیاتِ مدینہ" ہے جس کے مصنف مولٰنا الحاج احتشام الحسن صاحب کاندھلوی ہیں جو تبلیغی جماعت کے رکن ہیں اور متعدد تبلیغی کتابوں کے مصنف بھی۔ آپ کا تعلق دیوبندی مکتبِ خیال سے بھی ہے۔
اسی تجلیاتِ مدینہ کے صفحہ ۹ پر وہ حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے اپنے نور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو پیدا کیا اور آپؐ کے نور سے جمیع مخلوقات پیدا کی گئی۔
لیکن آپ نے دسمبر ۶۰ء کے تجلی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے کسی اور کا قول ہے۔
مگر علماء متقدمین اسے حدیث کہتے ہیں لیکن انکی سند

میں اختلاف ہے۔ علماء کا ایک گروہ اسے ضعیف کہتا ہے تو دوسرا اگروہ صحیح۔ موضوع کہنے والے بھی علماء گذرے ہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔ آپ کو ان کے نام معلوم ہوں تو تحریر کریں۔

اسی کتاب کے صفحہ ۹ پر مصنف نے آداب زیارت مدینہ منورہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ:۔

"جمہور علماء محققین بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور وفات میں کوئی فرق نہیں۔ رسول اللہؐ اب بھی اپنی امت کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی حالتوں اور ان کی نیتوں اور ان کے ارادوں اور ان کے دل کے خیالوں سے اللہ رب العزت نے آپؐ کو باخبر کیا ہے اور یہ سب امور آپ پر اس طرح روشن اور واضح فرمائے کہ ان میں کوئی پوشیدہ باقی نہیں رہی۔ پس اس بارگاہِ عالی کی حضور میں اپنی حرکات وسکنات ونیات وخیالات کی سخت نگرانی اور پوری نگہبانی کرے۔" الخ

ایسی بے سند باتوں سے اہل بدعت دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ دیکھو اللہ کے بتلانے سے حضورؐ کو علم غیب حاصل ہے کہ دلوں کے بھید آپ پر منکشف ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ دلوں کے بھیدوں، انسان کے ارادوں اور نیتوں سے اللہ ربّ العزت نے آپؐ کو باخبر کیا ہے۔ قرآن اور سنت میں اس کی دلیل کیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایک دیوبندی مکتبِ فکر کا عالم بھی ایسا لکھ سکتا ہے آخر وہ کون سے علماءِ محققین ہیں۔ انکا نام کیوں نہیں بتایا گیا۔ ہمارے دیوبندی علماء ہی شرک اور بدعت کی حمایت کرنے لگے تو اس ملک میں شرک وبدعت کی بیخ کنی ناممکن ہے۔

الجواب:۔

ہم نے دسمبر ۶۱ء میں لولاک لما کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث نہیں کسی امتی کا قول ہے۔ یہی ہم آج بھی لکھتے ہیں اور یہی مرتے دم تک لکھتے رہیں گے۔ اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر کسی قول کی نسبت ہمیں پل بھر کو گوارا نہیں۔ بس چلے تو ایسے تمام اقوال کو دریا برد کر دیں جنھیں غلط طور پر سرکارِ رسالتؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

رہی وہ روایت جو آپ نے نقل فرمائی تو اسے اگرچہ بعض علماء نے حدیث کا لقب دیا ہے اور نتائج کو ملحوظ رکھے بغیر صحیح کہہ گذرنے تک کی جرأت کر گئے ہیں۔ لیکن درایت وتحقیق کی گہرائی میں جانے کے بعد اس کا موضوع اور یکسر ناقابل اعتبار ہونا اتنا متیقن ہو جاتا ہے کہ ہمیں تو قسم کھا لینے میں بھی تکلف نہیں۔

آخر مطلب کیا ہوا کہ اللہ نے محمدؐ کو اپنے نور سے پیدا کیا؟ محمدؐ بشر تھے۔ بشر آدم کی اولاد ہے۔ آدم مٹی سے پیدا کئے گئے جس پر قرآن بار بار متنبہ کرتا ہے۔ کیا مفہوم ہے اس کا کہ محمدؐ کو اللہ نے اپنے نور سے تخلیق کیا!

جہاں تک اسناد کا تعلق ہے اس روایت کی ایک بھی سند اس لائق نہیں کہ اسے کوئی وزن دیا جائے۔ لیکن سند کی گفتگو تو بعد میں ہوگی پہلے اس کے ناقلین ومبلغین یہ تو بتائیں کہ وہ مطلب کیا لے رہے ہیں۔ کیا انکا منشاء یہ ہے کہ رسول اللہ کو اسی طرح اللہ کا جز مان لیا جائے۔ جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا مان لیا ہے۔ یا کچھ اور مقصد ہے؟

اس طرح کی روایتوں کو عوام میں پھیلانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی کرم خوردہ توحید کی تہ در تہ مشرکانہ اوہام کی کچھ اور جونکوں کا اضافہ ہو جائے۔ تبلیغی جماعت کے معظم افراد کی متعدد کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ حضرات رو[ایات] کے بارے میں احتیاط نہیں برتتے یہاں تک کہ بعض ایسے بزرگ بھی جن کے علم وفضل قابلِ رشک ہیں روایت حکایت کے میدان میں درایت کا دامن بالکل ہی چھوڑ [کر] آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

صفہ ۹ سے جو اقتباس آپ نے دیا ہے وہ بھی اسی نوع کا ہے کہ اس کے سپردِ قلم کرنے والے کے بارے میں سوائے اس کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ نہ تو اسے "جمہور علماءِ محققین" کی اصطلاح کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا شعور ہے۔ نہ اسے یہ معلوم ہے کہ جن مریضوں کا وہ روحانی علاج کرنے چلا ہے انھیں مرض کس نوع کا ہے۔ نہ وہ یہ احساس رکھتا ہے کہ کونسی بات کس مخاطب پر کیا اثر کرے گی۔ بس بے مغز واعظوں کی طرح جو جی میں آیا نشر کرتے چلے گئے۔ اب جتنی آیتیں اللہ نے اپنی مخصوص صفت علم کے بیان میں نازل فرمائیں۔ مثلاً اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وغیرہ وہ سب رسول اللہ پر منطبق کرتے چلے جائیے۔ کون ہے جو ان کی زبان و قلم پر پہرے بٹھائے۔

بالکل جھوٹ ہے۔ بلکہ سخت جسارت اور بہتان ہے یہ کہنا کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی نیتوں اور ارادوں تک سے باخبر ہو سکتا ہے۔ جس رسولؐ پر ہم ایمان لائے ہیں وہ تو زندگی میں بھی ایسا نہیں تھا کجا کہ بعد رحلت۔ اس کا اپنی قبر میں زندہ ہونا اور بات ہے لیکن جب حقیقی دنیاوی زندگی ہی میں وہ علیمٌ بذاتِ الصدور نہیں تھا۔ عالم الغیب نہیں تھا۔ مافوق البشر نہیں تھا تو اس بعد کی زندگی میں یہ سب کیسے ہو سکتا ہے جس کے بارے میں حتمی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس نوع کی زندگی ہے۔ اس کے کیا حدود ہیں۔ اس سے کس طرح کے اوصاف منسوب ہیں۔

اللہ تعالیٰ بے شک اپنے بعض اوصافِ عالیہ کا پرتو بفرقِ مراتب بندوں پر ڈالتے رہتے ہیں۔ انسانی علم، ارادہ، ایجاد، اقدام، یہ سب صفاتِ ربانی ہی کے مظاہر ہیں۔ اس نے اپنے انبیاء کو وقتاً فوقتاً بعض امورِ غیب سے بھی بذریعہ وحی مطلع فرمایا ہے اور غیر انبیاء کو بھی القاء کے طور پر کبھی کبھی مغیبات کا کچھ علم دیدیتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا نہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا کوئی وصف پورا کا پورا کسی مخلوق کے کالب میں رکھدے جب کوئی کہتا ہے کہ رسول اللہ کو تمام ماکان و مایکون کا علم اللہ نے دیدیا۔ وہ نیتوں اور ارادوں سے بھی باخبر ہیں۔ ان سے کسی کا کوئی حال مخفی نہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی پوری کی پوری صفت علم رسول اللہ کو عنایت کر دی۔ یہ اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ عقیدہ کہ مسیح اللہ کے بیٹے تھے۔ اس کی تردید جس طرح قرآن نے کھل کر کی ہے اسی طرح اللہ کے سوا کسی اور کے غیب داں ہونے کی بھی تردید کھل کر کی ہے۔ مؤخر الذکر کی تاویلیں کرتے ہو تو پھر عیسائیوں کو بھی لم یلد ولم یولد جیسی آیتوں کی تاویل میں معذور مان لو۔ وہ بھی تو اپنے عقیدے کی نت نئی تاویلیں ہی کرتے ہیں۔ وہ بھی تو ایسے ہی نکتے تراشتے ہیں جیسے رسول اللہ کو عالم الغیب قرار دینے والے تراشتے ہیں۔ کیا صرف یہ دلیل مسیح کو ابن اللہ قرار دینے کے لئے کافی ہو سکتی ہے کہ مسیح خود ابن اللہ نہیں بن گئے تھے، بلکہ اللہ نے اپنی قدرت سے انھیں بیٹا بنا یا تھا۔ اگر نہیں ہو سکتی تو یہ دلیل رسول اللہ کو عالم الغیب بنانے کے لئے کیسے کافی ہو سکتی ہے کہ وہ خود عالم الغیب نہیں بن گئے، بلکہ اللہ نے اپنی قدرت سے بنا دیا تھا!

جب ہم جماعت تبلیغی یا فضلائے دیوبند میں سے کسی کی زبان یا قلم سے غالیانہ اور مبتدعانہ خیالات کی تراوش دیکھتے ہیں تو بے اختیار یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے :-

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فسادِ عقائد سے بچائے۔ بدعملی تو معاف ہو سکتی ہے۔ لیکن عقائد ہی بگڑ گئے تو کہیں ٹھکانا نہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

نزولِ قرآن اور تفسیرِ صدیقی

سوال ۳ :- از محمد اشفاق حسین - حیدرآباد دکن۔

تجلی دسمبر ۶۰ء میں میرا ایک سوال بعنوان "تفسیر القرآن" قرآن مجید کے نزول سے متعلق شائع ہوا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں کے ایک عالم صاحب نے اپنی تفسیر بنام "تفسیر صدیقی" میں انزال اور تنزیل کے معنیٰ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قرآن شریف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

پورا کا پورا ایک دفعہ ہی اترا اور پھر وقت بوقت اسکی تبلیغ ہوتی رہی"۔ آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "جس دعوے کو آپ ان (مفسر موصوف) سے منسوب کر رہے ہیں وہ تو ڈو اور ڈو پانچ کی طرح غلط ہے"

لیکن حال ہی میں یہاں کے ایک ماہنامے کے فائل دیکھتے وقت "درس تفسیر صدیقی" کے عنوان سے جو کہ مفسر موصوف کے افادات پر مشتمل ہے۔ اسی موضوع پر چند مزید باتیں علم میں آئیں جنھیں ذیل میں نقل کر رہا ہوں:۔

" نَزَّلَ اور اَنْزَلَ کے معنوں کا فرق واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ عربی میں اِنْزَال دفعتہً اتارنے کو کہتے ہیں اور تنزیل رفتہ رفتہ جزو جزواً اتارنے کو قرآن شریف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پورے کا پورا ایک دفعہ ہی اترا، لیکن ظاہری اعتبارات کے مد نظر وقت بہ وقت تھوڑا تھوڑا (بغرض تبلیغ) بھیجا گیا۔

قرآن کے انزال اور تنزیل کے فرق کی بابت دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا۔ احکام کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو بغرض تشہیر عوام ہوتے ہیں اور ایک صرف مخصوص افراد کو مطلع کرنے کے لئے جسے عرف عام میں "راز" کہا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک کا حکم بالکل الگ ہے۔ ایک قانون یا حکم اس کے بنانے والوں کے ذریعہ بن تو جاتا ہے، لیکن عوام پر اس کا نفاذ صرف اسی وقت ہوگا جب کہ اس کی تشہیر کی جائے اور اس سے قبل خود واضعانِ قانون یا ارکانِ حکومت بھی جو فی الاصل اس قانون یا حکم سے واقف تو رہتے ہیں، لیکن اس کا اظہار نہیں کر سکتے اس طرح حضورؐ پر بھی سارا قرآن یک وقت اتارا گیا یا لوحِ محفوظ پر بھی آپ نے اسے دیکھ لیا۔ لیکن جب تک وہ بحیثیت قانونِ الٰہی بغرضِ نفاذ آپ کے پاس روانہ نہیں کیا گیا اسوقت تک آپ نے اس کا اظہار نہیں فرمایا۔

براہِ مہربانی ایک بار پھر تکلیف گوارا فرما کر جواب دیجئے کہ یہ کہاں تک درست ہے؟

الجواب:۔ بڑا دکھ ہوتا ہے اس صورتِ حال سے کہ وقتاً فوقتاً ہمیں "چھوٹا منہ بڑی بات" کا مصداق بنتے ہوئے ایسے بزرگوں پر گرفتِ احتساب کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے جن سے ہم علم، عمل اور عقل ہر چیز میں کم ہیں۔ لیکن جس منصب کو ہم نے اپنے لئے اختیار کیا ہے وہ ہر آئینہ اس کا متقاضی ہے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں ذرہ برابر لاگ لپیٹ اور تامل و تساہل سے کام نہ لیا جائے۔ اللہ علیم و دانا ہے کہ بزرگوں پر نقد و جرح کرتے ہوئے ہم ہرگز کسی ذہنی استکبار میں مبتلا نہیں ہوتے مگر یہ بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ دین کے معاملہ میں ہم مرعوبیت کی راہ اختیار کریں۔

یہ تمہید ہم نے اس لئے اٹھائی کہ ہمیں یاد ہے دسمبر ۵۸ء میں جب تفسیر صدیقی سے متعلق چند سوالات پر ہم نے کلام کیا تھا تو متعدد خطوط ہمارے پاس ایسے آئے تھے جن میں ہماری اس جرأت کی بڑی مذمت کی گئی تھی کہ بڑے سے بڑے عالم پر زبانِ اعتراض دراز کرنے میں ہم تامل نہیں کرتے اور خود کو خدا جانے کتنا بڑا علامہ تصور کرتے ہیں۔

نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ اپنے آپ کو ہم ایک طالب علم سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے نہ انشاء اللہ مرتے دم تک سمجھیں گے۔ ہاں یہ عیب ہم میں ضرور ہے اور مرتے دم تک رہے گا کہ کسی بزرگ کے ساتھ دس بیس بھاری بھرکم القاب و آداب لگا کر ہمیں ان کی کورانہ نیازمندی پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ جناب عبدالقدیر صدیقی کو شمس المفسرین استاذ العلماء حبر العلوم خاصتہ القرآن علامۂ دہر حضرت محمد عبدالقدیر صدیقی حسرت مدظلہ، لکھا جاتا ہے تو شوق سے لکھا جائے، لیکن ہم صرف اس چیز کو دیکھیں گے جو ان القاب و آداب سے چھن کر آئے گی۔ وہ مصفا ہوگی تو سبحان اللہ اور غبار آلود ہوگی تو نقد سے نہیں چوکیں گے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا۔

اب سوال کا جواب سنئے:-

فاضل مفسر نے انزال و تنزیل کے باہمی فرق میں نکتہ سنجی کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا ہے کہ اس کے عواقب و مضمرات کیا ہوں گے۔ وہ اگر ذہنی استحضار اور منطقی شعور سے کام لیتے تو یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ انزال و تنزیل کا بیان فرمودہ فرق ہرگز ایک لطیفے سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر بطور استدلال جو تفصیل انھوں نے پیش کی ہے وہ تو اور بھی لایعنی ہے۔ انھیں یہ بھی مستحضر نہیں رہا کہ قرآن میں صرف احکامات ہی نہیں ہیں اخبار بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر پہلے ہی پورے مضامین قرآن سے باخبر ہوگئے تھے تو ان کا کوئی طرز عمل کسی بھی وقت ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا جو ان اخبار سے ناواقف ہونے پر دال ہو۔ تفصیل ہم ابھی پیش کریں گے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ انزال و تنزیل کا جو فرق انھوں نے بیان کیا ہے اسکے لئے لغت عربی میں کوئی سند ہے۔ اگر ہے تو تفسیر میں اسے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ نہیں پیش کی تو ظاہر ہوا کہ بنیاداً ہی ان کا دعویٰ بے ثبوت ہے۔

پھر لغت کو بھی چھوڑیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیتیں ایک دوسرے کی مفسر ہوتی ہیں۔ قرآن نے جن الفاظ کو جن جن معانی میں استعمال کیا ہے وہ اپنی سند خود آپ ہیں اور ان کے مقابلے میں ہر دوسری سند ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اب ذرا آپ قرآن اٹھاکر دیکھیں تو پچاسوں جگہ انزال کے صیغوں کا استعمال دیکھیں گے۔ لیکن مشکل ہی سے کچھ مقامات پر دفعتہً اتارنے کا مفہوم پیدا کرسکیں گے۔ بیشتر جگہ یہ باب خالی اتارنے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اتارنا دفعتہً ہو یا تدریجاً۔

ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:-

(۱) قرآن کے شروع ہی میں متقین کی صفت بیان ہو رہی ہے:-

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔	جو ایمان لائے اس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے (انبیاء پر) نازل کیا گیا۔

اب غور کیجئے۔ اُنْزِلَ دونوں بار انزال ہی سے آیا ہے نہ کہ تنزیل سے۔ صدیقی صاحب کے دعوے کے مطابق انزال سے مقصود اس قرآن کی طرف اشارہ ہوتا ہے جسے نزول سے قبل پیغمبر کو عطا کر دیا گیا تھا یا پیغمبر نے اسے لوح محفوظ پر دیکھ لیا تھا۔ یہ بعد میں نجماً نجماً نازل ہونے والا قرآن مقصود ہو تو انزال نہیں تنزیل کا باب استعمال ہونا چاہئے۔

مگر ملاحظہ کیجئے۔ اس آیت میں تو صاف طور پر اسی نجماً نجماً نازل ہونے والے ہی قرآن کا ذکر ہے۔ اسی قرآن پر ایمان لانا مومنین کے لئے ممکن تھا اور اسی پر وہ ایمان لائے۔ اگر انزال میں دفعتہً اتارنے کا مفہوم شامل ہوتا تو یہاں اُنْزِلَ نہیں نُزِّلَ ہونا چاہئے تھا۔

(۲) صدیقی صاحب کے دعوے کا اقتضاء تھا کہ اللہ تعالیٰ جہاں کہیں اس نجماً نجماً نازل ہونے والے قرآن کا تذکرہ کرے بس باب تنزیل کا صیغہ استعمال فرمائیں۔ کیونکہ باب انزال سے تو صدیقی صاحب کے دعوے کی رو سے وہ دفعتہً نازل ہونیوالا قرآن مراد ہوتا ہے جس کا کوئی تعلق عام بندوں سے نہیں، بلکہ صرف محمدؐ کے لئے اسے مخفی طور پر دفعتہً نازل کیا گیا۔

لیکن کثیر آیات میں سے صرف چند آیات ملاحظہ کیجئے۔ جن میں یہ اقتضاء پورا نہیں ہوا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (یہ اسلئے کہ وہ کفار ناپسند کرتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ نے نازل کیا) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ اس چیز پر جسے اللہ نے نازل کیا) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ (فرماں برداری کرو اس کی جو تم سب کی طرف نازل کیا گیا) وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ (اور چلو اس عمدہ بات پر جو تم سب کی طرف اتری) اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا (ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی)

یسی ہی کتنی آیتیں قرآن میں دیکھ ڈالئے۔ اظہر من الشمس
ہے کہ ان میں نازل شدہ شے سے وہی آیات مراد ہیں جو
قتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی ہیں اور سالہا سال میں قرآن
کی مکمل شکل اختیار کرسکی ہیں۔ نہ کہ وہ قرآن جو حضورؐ کو بقول
صدیقی صاحب پہلے ہی مخفی طور پر دیدیا گیا تھا۔

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً (وہی ہے وہ جس نے آسمان سے پانی نازل
کیا) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً — اور
— وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ کیا یہ مشاہدہ نہیں ہے
کہ بارش سے قبل بادل آتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں۔ آثار
ظاہر ہوتے ہیں تب کہیں جاکر بارش ہوتی ہے اور بارش
بھی ہمیشہ یکبارگی دھواں دھار نہیں ہوجاتی۔ بارہا بوندا
باندی ہوتی ہے۔ برائے نام ترشح جاری رہتا ہے۔ اگر
انزال کا مطلب کسی شے کو دفعتہً پورا کا پورا اُتارنا ہوتا تو
بارش کے لئے یہ باب کبھی استعمال نہ ہوتا۔ وہ نہ تو ہمیشہ دفعتاً
ہوتی ہے نہ تمام بارش کا یکلخت نازل کردینا کوئی مفہوم رکھتا
ہے — پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ اسی بارش کے لئے قرآن
نے باب تنزیل بھی استعمال فرمایا ہے۔ وَلَئِنْ
سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اس سے معلوم
ہوا کہ انزال و تنزیل دونوں ہی یکساں مفہوموں میں استعمال
ہوتے ہیں اور یہ بالکل ضروری نہیں کہ دفعتہً نازل کیجانے
والی چیزوں ہی کے لئے باب انزال کا استعمال کیا جائے

لفظی بحث سے ہٹ کر اب قرآن کے اُن داخلی شواہد
کو دیکھئے جو صدیقی صاحب کے دعوے کی علانیہ تکذیب کرتے ہیں
لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ہماری ساری گفتگو اُس مفہوم پر ہے
جو صدیقی صاحب کی پیش فرمودہ عبارت سے سمجھ میں آتا ہے
ان کا منشاء یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہؐ نے لوحِ محفوظ
والے قرآن کا صرف ایسا ہی نظارہ کیا ہوگا جیسے ہم طاق
میں رکھی ہوئی کسی مجلد کتاب کو ایک نظر دیکھ لیں اور
اس کے مضامین سے آگاہ نہ ہوں۔ اس کے برخلاف
ان کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ پر دیکھ لینے کا
مطلب قرآن کے تمام مضامین کو دیکھ لینا ہے اور اسی
منشاء کی تائید اس دوسرے امکان سے ہوتی ہے جو
تقدم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی سارا قرآن بیک
وقت حضورؐ پر نازل کردیا گیا۔ نزولِ قرآن کا مطلب
یہ تو نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ اس کے مطالب و مضامین سے
بے خبر رہے ہوں۔

صدیقی صاحب کی پوری ہی عبارت اور اسکے
متعدد الفاظ ان کا یہی مافی الضمیر ظاہر کرتے ہیں کہ پورے
قرآن کے الفاظ و معانی حضورؐ کو پہلے ہی اکھٹے معلوم
ہوچکے تھے مگر ان کی حیثیت ایسے راز کی تھی جسکا انکشاف
بعد میں ہونا تھا۔

اب نمونتہً چند قرآنی شواہد ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) حضورؐ نے ایک نابینا کی آمد پر تیوری چڑھائی۔
اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ فرمایا۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى
اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى اگر حضورؐ پہلے ہی مضامین قرآن
سے آگاہ ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ وہ کیفیت ظاہر فرماتے
جس کے عند اللہ ناپسندیدہ ہونے کا انھیں علم ہوچکا تھا

(۲) غزوۂ بدر میں جب ستر کے قریب کفار قید ہوکر
مسلمانوں کے ہاتھ آئے تو سوال اٹھا کہ انھیں قتل کردیں یا
فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ حضورؐ صحابہؓ سے مشورہ کرتے ہیں۔
حضرت عمرؓ قتل کی رائے دیتے ہیں، لیکن دیگر صحابہ
فدیہ لے کر چھوڑ دینے کو پسند کرتے ہیں اور سرکارِ رسالتؐ
کی رحمدلی بھی اسی فیصلے کا ساتھ دیتی ہے لہٰذا قیدی فدیہ
لے کر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اب دیکھئے اللہ اس فیصلے پر
کیسی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ	نبی کو زیبا نہیں ہے کہ جبتک
لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ	خوب خونریزی نہ کرلے اپنے
فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ	یہاں قیدیوں کو رکھے تم سامانِ
عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ	دنیا کے طالب ہو اور اللہ کے
يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ	یہاں مطلوب ہے آخرۃ اور اللہ ہی

عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ (انفال ۹۶)

قوی اور حکمت والا ہے۔ اگر یہ ایک ایسی ہی بات نہ ہوتی جسے اللہ نے مقدر فرما دیا تھا تو تمھیں اس فدیہ کے بدلے بڑا عذاب پہنچتا جو تم نے قیدیوں کے بدلے وصول کیا ہے۔

+ + +

+ + +

اللہ اکبر۔ کس شان سے اللہ ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ سُن لیں لے نبی کو اُلوہی صفات سے متصف کرنے والو! یہ سرزنش یہ تنبیہ یہ ڈانٹ ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جن میں رسول اللہ ؐ بھی شامل ہیں اور اُس فعل پر دی جا رہی ہے جو رسول اللہ ؐ ہی کی رضامندی سے عمل میں آیا ہے۔

خیر یہ تو دوسرے موضوع کی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ کیا کوئی مسلمان اس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ اگر حضور ؐ کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دینا اللہ کو اس قدر ناپسند ہوگا تو وہ پھر بھی ایسا ہی کرتے؟ العیاذ باللہ۔ پیغمبر کے لئے متصور ہی نہیں کہ وہ قصداً مرضیاتِ الٰہی کے خلاف کرے۔

(۳) ایک گھریلو قضیے میں حضور ؐ قسم کھا لیتے ہیں کہ آئندہ شہد نہیں چکھوں گا۔ اللہ اسے پسند نہیں فرماتے ارشاد ہوتا ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبۡتَغِيۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ

اے نبی تم اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے۔ تم اپنی بیویوں کی رضامندی چاہتے ہو۔

+ + + +

پھر تہدید ہی پر بس نہیں کی۔ حکم ہوا:۔
قَدۡ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمۡ تَحِلَّةَ اَيۡمَانِكُمۡ (اللہ نے ایسی قسموں کا توڑ دینا تم پر ضروری قرار دیا ہے جو مناسب نہ ہوں)

ذرا سوچیئے۔ اللہ کا رسول ؐ پہلے ہی تمام قرآن سے آگاہ ہوتا تو کیا یہ واقعہ پیش آ سکتا؟ کیا وہ جانتے بوجھتے ایسی قسم کھاتا جو اللہ کے نزدیک اس درجہ ناموزوں ہوتی کہ اسے توڑ دینے کا حکم نافذ ہوتا۔ حاشا حاشا۔

(۴) ایک غزوے سے واپسی پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زنا کا بہتان تراشا جاتا ہے پناہ بخدا۔ اللہ تعالیٰ آیات نازل فرماتے ہیں کہ یہ افتراء ہے۔ زوجۂ رسول پاکدامن ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہاں سوال کسی حکم کا نہیں، بلکہ ایک اطلاع اور خبر کا ہے۔ اگر حضور ؐ پہلے ہی سے پورے قرآن سے آگاہ ہوتے تو کیا وہ تمام رنج و تعب نعوذ باللہ ایک ڈرامہ تھا جس کا مظاہرہ تقریباً ایک ماہ تک حضور ؐ کے حرکات و سکنات اور اقوال و افعال سے ہوتا رہا اور کیا حضرت عائشہ رضؓ کی بے گناہی کا وثوق رکھنے کے باوجود حضور ؐ عائشہ رضؓ سے یہ بات کہہ سکتے تھے کہ "اگر تم سچ مچ کسی گناہ میں مبتلا ہوگئی ہو تو اللہ سے استغفار کرو۔"

آغاز وحی کا قصہ دیکھیے۔ حضور ؐ فرماتے ہیں کہ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا (لقد خَشِيۡتُ عَلٰی نَفۡسِیۡ بخاری) لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور پہلے ہی پورا قرآن لوح محفوظ میں ملاحظہ فرما چکے تھے یا ان پر سارا کا سارا نازل کیا جا چکا تھا تو پہلی ہی آیات کے نزول پر جان کا خوف کیا معنیٰ جب کہ معلوم ہے کہ ابھی تو مجھے بہت دنوں زندہ رہنا ہے اور پورے قرآن کو نجماً نجماً نازل ہونا ہے۔

پھر حضرت خدیجہ رضؓ انھیں ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں وہ اطمینان دلاتے ہیں کہ حیرت و خوف کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو وہی فرشتہ تھا جسے موسیٰ ؑ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ آپ پیغمبر بنائے گئے ہیں۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہ سکتا جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کردے گی!

دیکھ لیجئے کہ قصۂ ہجرت اور مابعد کے واقعات ضروری حد تک خود قرآن میں موجود ہیں۔ ان کا علم

ہوئے کو ہوتا تو ورقہ بن نوفل سے لوٹ کر یہ سوال کرنے
، کوئی معنی نہیں تھے کہ کیا واقعی یہ لوگ مجھے شہر بدر
ردیں گے ؟

حاصل یہ کہ کوئی بنیاد صدیقی صاحب کے دعوے کی
یں موجود نہیں۔ ہاں تردید ہر اعتبار سے واضح
ہے۔ لیکن ان معروضات کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے
یں کہ میرا منشاء یہ نہیں تھا کہ حضورؐ قرآن کے مضامین
طالب سے بھی پہلے ہی آگاہ ہو چکے تھے تو ہم کہیں گے
اول تو مفسر بننے سے قبل بات کہنے کا وہ متین طریقہ
سیکھنا چاہیئے جو مافی الضمیر کے اظہار میں دھوکا نہ دے
دوسرے اس نکتہ کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ حضورؐ نے
رآن کا محض طائرانہ نظارہ فرمالیا تھا۔ یا وہ آپؐ پر
ک بند کتاب کی طرح نازل کر دیا گیا تھا جس کے اندر
کچھ بھی علم آپؐ کو نہ ہوا۔ آخر لاحاصل نکتہ سنجیاں کرنا
زران پر شدومد سے زور دینا وقت اور انرجی کی بربادی
یں تو اور کیا ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔

وائِدَۃُ وَالْمَوْءُوْدَۃُ فِی النَّارِ

سوال نمبر۱ :۔ از عبد الباری۔ رحیم آباد (ضلع رحیم یار خاں)

مجھے چند احادیث کے اشکالات ذہنی الجھن کا باعث
نے ہوئے ہیں۔ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں امید
ہے کہ جواب بذریعۂ تجلی عنایت فرمائیں گے۔ احادیث
سلسلہ وار درج ہیں۔

(۱) پہلی حدیث یہ ہے کہ مشکوٰۃ شریف اور دوسری کتب
دیث میں ہے کہ الوائدۃ والموءودۃ کلاھما فی النار
س کے معنیٰ ومفہوم بالکل واضح ہے۔ اس پر یہ اشکال ہے کہ
ندہ در گور کرنے والی عورت تو ہے ہی جہنمی لیکن دفن شدہ
موؤدہ) بچی کس جرم میں جہنم کی سزا بھگتے گی۔ کسی نے یہ تاویل
ی ہے کہ "موؤدۃ" سے مراد "موءودۃ لہا" ہے۔ لیکن یہ توجیہ
س لئے وزنی نہیں ہے کہ وائدہ اور موءودۃ لہا کا مفہوم
الکل متحد ہو جاتا ہے۔ بہرحال "موؤدۃ" بچی دنیا میں بھی
مظلوم ہے اور حدیث کا ظاہری مفہوم لیا جائے تو آخرت
میں بھی مظلوم ہے۔ کیونکہ دنیا میں اسے زندہ قبر تک سفر کرنے
کی سزا دی گئی اور آخرت میں جہنم کی آگ میں رسید کرنے کی
سزا ملے گی تو ظالم اور مظلوم کا کیا امتیاز رہا۔ حالانکہ اللہ کے
دربار میں مظلوم کی دادرسی کی جائے گی ؟

الجواب :

معلوم نہیں آپ نے کس کتاب سے یہ حدیث نقل کی ہے۔
جہاں تک مشکوٰۃ کا تعلق ہے اس میں تو کلاھما کے الفاظ
نہیں ہیں۔ ان الفاظ کے ہونے نہ ہونے سے اگرچہ معنی میں کوئی
فرق نہیں پڑتا، لیکن مناسب یہی تھا کہ جب آپ نے
مشکوٰۃ کا حوالہ دیا ہے تو الفاظ اسی سے نقل کرتے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم مختصراً جواب عرض کریں گے
کہ ہمارے نزدیک وائدہ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو زمانۂ
جاہلیت کے عرب میں دائیوں اور دودھ پلانے والیوں کی حیثیت
میں معروف تھیں۔ قابلہ، اناّ یا آیا جو چاہے کہہ لیجئے۔ انھی کا
یہ کام بھی تھا کہ جس بچی کو زندہ دفن کرنا ہے اسے بفرقِ عمر گود
میں یا پیدل قبر تک لے جائیں اور گاڑنے کے سفاکانہ فعل کو
اپنی سرکردگی میں تکمیل کو پہنچائیں۔ یہ سب کچھ وہ پیشے کے
طور پر کرتی تھیں اور معاوضہ لیتی تھیں۔

موؤدۃ کا مصداق ہمارے نزدیک وہ افراد ہیں
جن کے ایماء اور حکم پر یہ فعلِ خبیث ارتکاب میں آیا ہے خصوصاً
وہ بے رحم باپ اس کا اولین مصداق ہے جس پر اس جرم
کی سب سے زیادہ اور حقیقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اس تصریح سے واضح ہو گیا کہ موؤدۃ سے موؤدۃ
لہا مراد لینے میں وائدۃ اور موؤدۃ لہا کا مصداق و
مفہوم متحد نہیں بلکہ الگ الگ ہی رہتا ہے۔

لیکن کیا اس مختصر سے جواب سے وہ ساری الجھنیں دور
ہو گئیں جو اس حدیث کے بارے میں پہلے بھی پائی جاتی رہی
ہیں اور آج بھی اُن طلباء کے ذہنوں میں موجود ہیں جن کے
اساتذہ مشکوٰۃ اور ابو داؤد پڑھاتے ہوئے گہرے فکر و تدبر
سے کام نہیں لیتے، بلکہ لگی بندھی روایتی باتوں پر اکتفا

کرتے ہیں۔

نہیں۔ ضرورت ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اطمینان بخش گفتگو کی جائے اور دلائل سے ثابت کیا جائے کہ حدیث کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے وہی واحد اور قطعی ہے کوئی دوسرا مفہوم اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مشکوٰۃ کے بڑے بڑے قدیم وجدید شارحین نے اس حدیث کی شرح میں اذعان و وثوق کا نہیں تذبذب اور بے یقینی کا رویہ اختیار کیا ہے اور اس رویہ کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ سمجھدار طلباء کے اذہان میں اشکال و اشتباہ کے کانٹے چبھے رہ گئے ہیں۔ نیز اُردو تراجم اور جدید اُردو شروح میں بھی ہمارے علم کی حد تک کسی نے اس سعی میں کامیابی حاصل نہیں کی کہ تمام ظاہر و مخفی گوشے پوری طرح منقح کردے اور طالب علم محض خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ عقل و منطق کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت کسی قطعی فیصلے پر پہنچ جائے۔

تذبذب اور بے یقینی کے رویہ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ شارحین کے نزدیک اولیٰ اور مقدم توجیہ یہی ہے کہ موؤدۃ سے مراد وہ لڑکی نہیں ہے جسے زندہ درگور کیا گیا۔ بلکہ موؤدۃ لھا ہے یعنی جس کے ایماء پر دفن کیا گیا۔ لیکن اوّل تو خود اس توجیہ میں ایک لطیف خامی ہے جو فہیم طلباء سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ یہ کہ موؤدۃ لھا میں مؤنث کی ضمیر استعمال کی گئی جس کا منشاء یہ نکلا کہ اصل مجرم زندہ درگور بچی کی ماں ہے نہ کہ باپ۔ حالانکہ جیسا ہم واضح کریں گے اصل اور حقیقی مجرم باپ ہے نہ کہ ماں۔ حالانکہ اگر کسی درجے میں تبعاً ماں کو بھی مجرم مان لیا جائے تو یہ بہرحال ضروری تھا کہ ضمیر مذکر ہی کی استعمال کی جائے تاکہ اصلی مجرم کی نشاندہی ہوسکے۔

دوسرے شارحین نے دو اور تاویلوں کو بھی ساتھ ساتھ بیان کردیا اور ان پر نکیر نہیں کی۔ حالانکہ وہ تاویلیں فاسد تھیں اور ہرگز اس لائق نہیں تھیں کہ انھیں ممکن القبول سمجھا جائے۔ اس طرز عمل کا کھلا مطلب یہ تھا کہ مذکورہ بالا پہلی توجیہ پر بھی انھیں وثوق نہیں ——— لیکن ہماری ناقص رائے میں یہ حدیث سوائے اُس واحد مفہوم کے جو ہم نے عرض کیا کسی اور تاویل و توجیہ کی متحمل نہیں ہے۔ اس رائے کی وضاحت میں قدرے تفصیل اختیار کرنی ہوگی۔ شارحین کی بیان فرمودہ مزید دو توجیہات میں سے ایک توجیہ یہ ہے کہ بچیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج چونکہ کافروں میں تھا اور وہ مدفونہ بچی بھی کافر ہی ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ اور اس کے ماں باپ سب جہنمی ہوئے۔ اس تاویل کی بنیاد اس غلط عقیدے پر ہے کہ کافروں کے نابالغ بچے بھی دوزخ ہی میں جائیں گے۔ یہ عقیدہ بعض احادیث کے سطحی اور یک رُخے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ زیر بحث حدیث سے متصل قبل ہی ایک حدیث ہے جس سے بادی النظر میں دھوکا ہوتا ہے کہ واقعی ہر کافر زادہ دوزخی ہے چاہے وہ تین چار ہی سال کی عمر میں فوت ہوگیا ہو۔ اسی لئے متعدد علمائے احناف بھی یہی خیال کرگذرے ہیں کہ کافروں کے بچے دوزخی ہوں گے۔ لیکن ہم اس طرح کے اہم فکری معاملات میں کورانہ تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ اکثر احناف کی کچھ بھی رائے ہو لیکن بات وہی ہے جو امام نوویؒ نے فرمائی۔ یعنی یہ کہ تمام احادیث مختلفہ اور آیاتِ قرآنیہ میں تطبیق دینے کے بعد قول راجح یہی ہے کہ کافروں کے نابالغ بچے جنت میں جائیں گے۔ ہم ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ یہ صرف قول راجح ہی نہیں ہے واحد صحیح ترین قول ہے جس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا قول درست نہیں۔

تاہم یہاں اس مسئلہ کی بحث نہیں اس لئے صرف اتنا ہی عرض کردینا کافی ہوگا کہ غیر مسلم بچوں کو جہنمی تسلیم کرنے کی بنیاد پر موؤدۃ کا مصداق ایسی مظلوم بچی کو ٹھیرانا جسے زندہ گاڑ دیا گیا ہے بڑا وحشتناک ہے۔ اس توجیہ سے اسلام کی بے نظیر اقدار عدل کے دامن پر ایسا بدنما داغ آتا ہے کہ سوائے کورانہ عقیدت کے اس پر مطمئن ہونے کی کوئی راہ نہیں۔

دوسری تاویل یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس لڑکی کے

زندہ در گور کئے جانے کا واقعہ سنکر اللہ کے رسولؐ نے الوائدۃ والموؤدۃ فی النار کے الفاظ فرمائے، ہوسکتا ہے وہ بالغ رہی ہو۔ لہٰذا بالغ کی حیثیت میں وہ مکلف ہے اور مکلف کو جہنم میں ڈالدینا خلافِ عدل نہیں۔ گویا تاویل کرنے والے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جس مہیب جرم کے بارے میں گفتگو تھی اُسے تو اللہ کے رسولؐ نے نظر انداز فرما دیا اور موؤدۃ کے جہنمی ہونے کی اطلاع اس بنیاد پر دی کہ وہ کافرہ تھی۔

حیرت ہے اس صریح الغلط توجیہ کو نہ صرف قدماء نے لائق بیان سمجھا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس سے اشکال رفع ہوجاتا ہے بلکہ دورِ حاضر کے محقق محمد ناصر الدین البانی نے بھی اپنی کتاب میں یہ الفاظ لکھ دیئے ہیں[1]۔

فجائز ان تلک الموؤدۃ کانت بالغۃ فلا اشکال ص۲۵۶ جلد اول۔

جائز ہے یہ بات کہ وہ موؤدۃ بالغہ ہو پس اس صورت میں اشکال باقی نہیں رہتا

لیکن محاورات اور قواعدِ زبان کو بالکل ہی بالائے طاق نہ رکھ دیا جائے تو سامنے کی بات ہے کہ موؤدۃ کا بالغ ہونا جہنمی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ گفتگو ایک خاص جرم و گناہ کے سلسلے میں ہو رہی ہے۔ کفر و اسلام کی بحث کہاں ہے۔ کافر تو وائدہ (گاڑنے والی) بھی ہے۔ لیکن ارشادِ رسولؐ میں اس کے جہنمی ہونے کی علت کفر نہیں ہے، بلکہ گاڑنے کا ذلیل فعل ہے۔ اسی طرح موؤدۃ کا مطلب اگر مظلوم لڑکی ہی لے لیا جائے تو چاہے وہ بالغ ہو یا نابالغ جہنم کی بشارت کا تعلق اس خاص فعل ہی سے ہوگا۔ یعنی واحد مطلب یہی نکلے گا کہ چونکہ وہ گاڑی گئی اس لئے جہنمی ہے!۔

سب جانتے ہیں کہ سوال اگر قاتل یا سارق یا زانی یا شراب خور کے بارے میں ہو تو جواب کا تعلق قتل اور سرقے اور زنا اور شراب خوری ہی کے اوصاف سے ہوگا نہ کہ سیرت و کردار کے دوسرے پہلوؤں سے۔ عدالتی پیمانے پر بھی ایک مثال دیکھئے کیونکہ اللہ کے رسولؐ جج اور قاضی بھی تھے۔ آپ کے تمام ہی فیصلے۔ چاہے وہ ظاہری قوانین شریعت پر مبنی ہوں چاہے مخفی اُمور کی بشارت کے انداز کے ہوں بہر صورت عدل و تدبر کی اعلیٰ اقدار کے حامل ہوں گے۔

فرض کیجئے ایک فرض شناس جج اپنے ہمسائے زید کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ چور اُچکا ہے۔ آوارہ ہے، بدقماش ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس کے آگے زید کے خلاف کوئی مقدمہ پیش نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس پولیس ایک دن زید کو مجروح و مضروب حالت میں جج کے سامنے لاتی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ اسے طلحہ نے ناحق زخمی کردیا ہے۔ طلحہ بھی گرفتار شدہ عدالت میں موجود ہے۔ جج بیانات لیتا ہے گواہ طلب کرتا ہے اور انجام کار یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کیس میں زید واقعتہً مظلوم اور طلحہ ظالم و جارح ہے۔

اب بتلائیے کیا یہ بات اِس فرض شناس جج اور قانونِ عدل کے شایانِ شان ہوسکتی ہے کہ وہ طلحہ کے ساتھ زید کو بھی اس بنیاد پر سزا دے ڈالے کہ وہ چور اُچکا ہے۔ بدقماش ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے دانش ور اور متدین جج کے ذہن میں یہ تصور تک گذر سکتا ہو کہ مار پیٹ کا جو کیس اس کے سامنے ہے اس کا بے لاگ فیصلہ کرنے کی بجائے مظلوم زید کے اُس کردار پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھے جس کی کوئی گفتگو اس کیس میں نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں ایسا نہ تو کوئی منصف مزاج جج کرسکتا ہے نہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے نہ کوئی بیرسٹر ایسے کسی فیصلے کی معقولیت تسلیم کرسکتا ہے جو زیر بحث معاملات کے عوض کسی خارج از بحث اور غیر متعلق نکتہ پر استوار کیا گیا ہو۔

جب یہ بات ہے تو اُس واقعہ کو بھی اسی سطح پر رکھ کر دیکھئے جس کے سلسلے میں حضورؐ نے زیر بحث الفاظ

---

[1] اس کتاب کا صرف جزء اول ابھی چھپا ہے۔ بڑے سائز کے ۷۷۶ صفحات ایک محترم دوست کی عنایت سے یہ ہمیں میسر آگئی ہے (ع)

صادر فرمائے تھے کچھ لوگ ایک عورت کا واقعہ بیان کرتے ہیں جس نے لڑکی کو زندہ دفن کیا تھا۔ اس عورت اور مدفونہ لڑکی کے کفر واسلام کی کوئی بحث نہیں ہو رہی ہے۔ رُوئے زمین کا سب سے بڑا منصف اور متدین جج صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ صادر فرماتا ہے کہ الوائدۃ والموؤدۃ فی النار تو یہ کیسے ممکن تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس فیصلے کی بناء بجائے موضوع کلام کے موؤدہ کے اُس کفر پر ہو جس کا اس موقع پر کوئی سوال ہی درپیش نہیں تھا۔ بالکل نہیں۔ یہ بڑی بعید از قیاس اور بارد تاویل ہے۔

غور کیا جائے تو مدفونہ کے بالغہ ہونے کی صورت میں تو اس کی مظلومیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ننھے بچے نہ طاقت رکھتے ہیں نہ قوی احساس۔ انھیں نہ تو ابھی دنیا اور اسکے لذائذ سے اتنا گہرا ذہنی تعلق ہوتا ہے کہ اس سے جُدا ہونے کا تصور ان کے لئے بہت زیادہ اذیت دہ ہو نہ ان کے احساس وادراک کی صلاحیتیں ابھی اتنی ترقی یافتہ ہوتی ہیں کہ غیر معمولی ذہنی وروحانی کرب کی مورد بن سکیں۔ انھیں تو اکثر حالتوں میں یہ بھی علم نہیں ہو سکتا کہ انھیں کہاں لیجایا جا رہا ہے۔ بس جس وقت گڑھے میں رکھا گیا اس وقت انھیں علم ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے لیکن اس علم سے پیدا شدہ اذیت کی مدت بھی نسبتاً مختصر ہی ہوگی کیونکہ ایک جوان لڑکی کے مقابلے میں پھول سی نازک بچیوں کا چراغ زندگی جبر و سفاکی کے تند جھونکوں میں جلد ہی بجھ جائے گا۔ اسکے برخلاف جو لڑکی جوان ہو گئی ہے اس کے احساسات تو کہیں زیادہ قوی ہوں گے۔ اسے تو دنیا سے کہیں زیادہ انس ہوگا۔ وہ تو اپنے زندہ درگور کئے جانے کے تصور سے کہیں زیادہ اذیت محسوس کرے گی اور اسی تناسب سے شاید جذبۂ مدافعت بھی اس کے اندر پیدا ہوگا۔ اس کے کرب وابتلا کی مدت بھی نسبتاً زیادہ ہوگی کیونکہ اسے تو ہوش سنبھالتے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ جانوروں کے اس معاشرے میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ اس کے سنِ شعور کا ایک ایک لمحہ اُس بدنصیب انسان کی طرح گذر رہا ہوگا جس کیلئے پھانسی کا فیصلہ صادر ہو چکا ہو۔ پھر جب آخری مرحلہ آئے گا تو جانکنی کی مدت بھی اس پر مقابلتہً طویل ہوگی اور فطری طور پر وہ مدافعت و مزاحمت بھی کرے گی جس کے نتیجے میں سفاک گاڑنے والوں کو اس سے زیادہ بے رحمی اور تشدد کی ضرورت پیش آئے گی جتنی ننھی بچیوں کے گاڑنے میں پیش آسکتی ہے۔

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ صورت حال مقابلتہً زیادہ بے رحمانہ نہیں ہے۔ کیا اس میں ظالم کا ظلم اور مظلومہ کی مظلومیت کئی گنی نہیں ہو گئی ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات ہی میں ہونا چاہئیے تو کس دل گردے سے آپ یہ رائے قائم کر سکیں گے کہ جس صورت میں مظلومیت کی کیفیت وکمیت کم ہو اس صورت میں تو مظلومہ جنت میں جائے گی، لیکن جس شکل میں مظلومیت المضاعف ہو جائے اس شکل میں رسول اللہؐ مظلومہ کے جہنمی ہونے کا فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ حاشا ثم حاشا۔

ہم نے جتنا بھی غور کیا شارحین کی اس روش کو اثرات کے اعتبار سے ضرر رساں ہی پایا کہ حدیث مذکور کا ایک قطعی مفہوم بیان کرنے کے عوض وہ ان تاویلات کو بھی برابر کا امکانی درجہ عطا کرتے رہے جو اسلام کے ناقابل تغیر، محکم اور متفق علیہ تصورات عدل پر غبار اُڑاتی ہیں۔ ہم اپنی حقیر فہم ودرایت کے سہارے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس حدیث کا صرف ایک ہی مفہوم ہونے کے کیا دلائل ہیں اور کس لئے ہمیں اصرار ہے کہ دوسری ہر تاویل معقولیت سے بعید ہے۔ وباللہ التوفیق وعلیہ توکلنا

محاورات واصطلاحات کا متفق علیہ قاعدہ ہے کہ ان کے الفاظ کو لغت اور صرف ونحو کی کسوٹی پر نہیں کسا جاتا بلکہ جس معروف ومعلوم مفہوم میں وہ روزمرہ استعمال ہوتے ہیں اس کے سوا کسی اور مفہوم کا تصور تک نہ تو سامع کے ذہن میں آتا ہے نہ خود قائل کے ذہن میں کوئی اور مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے کہ دنیا نے ہمارے ساتھ

بڑی ناانصافیاں کیں۔ تو سامع فوراً سمجھ لیتا ہے کہ ہماری مراد دنیا نہیں اہلِ دنیا ہیں اور تمام اہلِ دنیا نہیں بلکہ کچھ افراد ہیں "دنیا" تو ظاہر ہے کہ اُس زمین کا نام ہے جس پر ہم بستے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ کیا ظلم اور کیا انصاف کریگی لیکن محاورہ یوں ہی ہے کہ دنیا بول کر اہلِ دنیا مراد لی جائے۔

یا مثلاً کہا جاتا ہے کہ روس خدا کا منکر ہے۔ امریکہ مہذب ہے، چین جارح ہے وغیرہ۔ تو کسی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ اوصاف ملکوں کے نہیں بلکہ ملک والوں کے ہیں۔

اسی طرح کتنی ہی مثالیں بہ ادنیٰ تعمق آپ ڈھونڈ سکتے ہیں جن میں ظاہری و لفظی مفہوم کی بجائے متعینہ اصطلاحی مفہوم ہی مسلّم ہوا کرتا ہے۔

اب آیئے۔ حدیث سے قبل قرآن کو دیکھیں کہ اسمیں بھی موءودہ کا ذکر آیا ہے۔

سورۂ تکویر میں ہے۔ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (اور جب زندہ درگور لڑکی سے سوال ہوگا کہ کس جرم میں قتل کی گئی)

تو کیا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی نصوص صریحہ اور اٹل قوانینِ عدل کے برعکس اللہ کے یہاں بیچاری وہی معصوم بچی جوابدہ اور محاسبہ کا ہدف ہوگی؛ جسے بے رحم ہاتھوں نے سنگدل ماں باپ کے ایماء پر زندہ دفن کر دیا ہے۔ پناہ بخدا۔ وہ اللہ جو واشگاف طور پر اعلان کرتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (کوئی متنفس کسی دوسرے کے گناہ کی سزا میں نہیں گرفتار ہوگا) جو انداز بدل بدل کر آگاہ کرتا ہے کہ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا جو متنبہ کرتا ہے کہ میں عادل ہوں۔ ذرہ برابر ظلم کسی پر نہیں کروں گا وہ کیا ایسا ظالم ہو سکتا ہے کہ معصوم بچیوں کو ان کی انتہائی مظلومیت کا اجر و ثواب دینے کے عوض ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سوال کرے کہ بتاؤ تم کیوں زندہ دفن کی گئیں؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر معلوم ہوا

کہ موءودہ کے مسئول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بارے میں وہ اشقیاء مسئول ہوں گے جو اس شقاوت کے مرتکب ہیں جن کے ایماء پر اور جن کے ہاتھوں سے ہولناک بے دردی کا یہ ڈرامہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہ مراد اسی طرح کسی دلیل کی محتاج نہیں جس طرح دنیا سے اہلِ دنیا اور ملک سے اہلِ ملک مراد لینا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

آپ کہتے ہیں زید نے طلحہ کی جان لے لی۔ کیا بھولے سے بھی کسی سننے والے کے دل میں یہ خیال گذر سکتا ہے کہ زید نے طلحہ کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اس کی جان نکالی ہوگی۔ سننے والے کو معلوم ہے کہ زید نے ریوالور داغا تھا۔ اسمیں سے گولی نکل کر طلحہ کے جسم میں پیوست ہوئی اور طلحہ مر گیا جان کا خاتمہ کرنے والی شے براہ راست گولی تھی نہ کہ زید۔ زید تو گولی جسم میں اُتار دینے کا صرف ذریعہ اور وسیلہ بنا تھا۔ اثر نے والی شے خود گولی تھی اور جان بھی فی الحقیقت زید نے لی نہیں ختم کر دی، لیکن ان میں سے کوئی شوشہ سامع کے ذہن میں نہیں اُبھرتا، بلکہ وہ محاورے کی روشنی میں سمجھ لیتا ہے کہ قتل کی ذمہ داری ریوالور پر نہیں ریوالور چلانے والے پر ہے۔ جان جس گولی نے لی قاتل وہ نہیں ہے۔ قاتل وہ ہے جو اس گولی کو طلحہ کے جسم میں پیوست کر دینے کا ذریعہ بنا ہے۔

اسی طرح اذا الموءودۃ سئلت کا ارشاد خداوندی سُنکر کسی بھی صحابی کے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ موءودہ بیچاری کس لئے مسئول ہوگی، بلکہ انھوں نے روزمرہ کی روشنی میں بلا تأمل سمجھ لیا کہ موءودہ کے مسئول ہونے کا مطلب فی الاصل ان لوگوں کا مسئول ہونا ہے جو معصوم بچی کو زندہ درگور کرنے کے مرتکب اور ذمہ دار ہیں۔ یہ روزمرہ ان کے لئے جانا پہچانا تھا۔ انھوں نے ارشاد خداوندی إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا[1] پر بھی یہ سوال پیغمبر سے نہیں کیا تھا کہ عہد تو غیر مرئی شے ہے اس سے کیونکر محاسبہ ہوگا۔ انھیں معلوم تھا کہ عہد کے مسئول ہونے کا مطلب ان لوگوں کا مسئول ہونا ہے جو عہد کر رہے ہیں۔ فعلِ عہد

[1] اسرائیل ۱۲

سے فاعل مراد ہے۔ یعنی معاہد۔ اسی طرح انھیں ارشادِ باری کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا[1] کے بارے میں بھی یہ سمجھنے میں ادنیٰ سا تأمل نہیں ہوا تھا کہ مَاتِیًّا کے معنی آتِیًا لئے گئے ہیں اور مفعول کو اسم فاعل کے معنی میں بولا گیا ہے

سورۂ مائدہ دیکھئے۔ فرمایا گیا:۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی	اور جب اللہ نے پوچھا اے
ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ	عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ	کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور
وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ	میری ماں کو اِلٰہ قرار
دُوْنِ اللّٰہِ۔	دے لو۔

یہ آیت صحابہؓ نے سنی تو ان کے ذہن میں پل بھر کو بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اللہ تو خود ہی ہر چیز سے واقف ہیں پھر کیوں حضرت عیسیٰؑ سے ایسا سوال کیا گیا۔ آگاہی کے باوجود سوال ایسے ہی افعال کے بارے میں کیا جاتا ہے جو لائق محاسبہ ہوں تاکہ مجرم اعترافِ جرم کر کے قانوناً مستحق سزا ہو، لیکن حضرت عیسیٰؑ تو جرم کے مرتکب تھے ہی نہیں پھر بھی اللہ نے سوال کیا تو صحابہؓ نے سمجھ لیا کہ مقصود دراصل حضرت عیسیٰؑ سے سوال نہیں، بلکہ ان لوگوں کی تذلیل و تکذیب ہے جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی ماں مریم کو خدا بنا چھوڑا ہے۔

ان تمثیلات سے ہمارا انشاء یہ واضح کرنا ہے کہ محاورے، مخصوص اسلوب، اصطلاحی کلمات خالصتًہ لغت اور الفاظ کے پیمانے سے نہیں ناپے جاتے، بلکہ ان کا ایک متعین مفہوم و منشاء ہوتا ہے۔ جب کسی صحابی نے سوال نہیں کیا کہ اے اللہ کے رسول! زندہ درگور لڑکی سے محاسبہ کرنا تو خود قرآن اور سرکارِ والا کی تعلیمات اور عقل و قیاس ہر اعتبار سے ظلم ہے پھر کیوں اللہ تعالےٰ موؤدہ کو مسئول قرار دے رہے ہیں تو ثابت ہوا کہ موؤدۃ سے وہ افراد مراد لئے، جنھوں نے سنگدلانہ قتل کے اس بھیانک ڈرامے میں کسی بھی نوع سے شرکت کی ہو ایک ایسی ہی معلوم و معروف اصطلاحی بات تھی جسے اخذ کرنے میں ادنیٰ سا تأمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ خود اللہ کے رسولؐ اور کسی صحابیؓ کو پل بھر کے لئے بھی تشویش نہیں ہوئی کہ اللہ نے ایک ایسی بات کیسے فرما دی جو خود اسی کے صریح و محکم ارشادات کی نقیض ہے۔ حالاں کہ آپ کو معلوم ہے جب اللہ کے سچے رسولؐ نے یہ فرمایا تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم تو صحابہؓ نے فوراً پوچھا تھا کہ یا رسول اللہؐ کیا ظالم ہو تب بھی؟ اس پر حضورؐ نے تصریح کی تھی کہ ہاں ظالم کی مدد کا مفہوم یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دو۔

ثابت ہوا کہ صحابہؓ ایسے ارشادات کی شرح ضرور دریافت کر لیتے تھے جن میں کوئی ابہام یا پیچیدگی ہو۔ تب کیا وہ یہ نہ پوچھتے کہ اے اللہ کے رسولؐ! موؤدۃ غریب کا جہنمی ہونا تو ناقابل فہم ہے؟ ضرور پوچھتے اگر محاورۃً وہ اس پر مطمئن نہ ہوتے کہ موؤدۃ سے مراد وہ افراد ہیں جن کے ایماء پر لڑکی گاڑی گئی ہے۔

اس صورت حال کو ذہن میں رکھ کر اب ایک اور نکتہ پر غور کیجئے۔ یہ کہ زندہ درگور کرنے کے عملِ خبیثہ میں سب سے بڑا مجرم بالیقین وہی ہوگا جو اس جرم کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہو اور جس کی مرضی و خواہش کے بغیر یہ وقوع ہی میں نہ آ سکتا ہو ہمیں یقین ہے آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ سب سے بڑا مجرم باپ ہے۔ آج بھی جب کہ عورتیں غلامی و مظلومی کی پہلی سطح پر نہیں ہیں اور اچھے خاصے مرد بیویوں کی نیاز مندی میں پیش پیش ہیں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ لڑکی کو زندہ دفن کرنے کے اہم ترین معاملہ میں ماں کی مرضی باپ کی مرضی پر غالب آ سکتی ہے۔ باپ آج بھی کم سے کم مشرق میں اتنا غالب اور مختار ہے کہ خدانخواستہ لڑکی کو زندہ دفن کرنے کا مسئلہ درپیش ہو تو یہ نہیں ہو سکتا کہ باپ نہ چاہے اور ماں لڑکی کو دفن کرا دے ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ماں نہ چاہے اور باپ یہ شیطنت کر گذرے یہ حال جب آج ہے تو ذرا اُس دور کا تصور کیجئے جب عورت غلاموں سے بدتر تھی۔ بے طرح مجبور و مقہور تھی۔ موم کی ایسی ناک تھی جسے مرد جس طرف چاہے موڑ توڑ لیتا تھا۔ اُس زمانے

[1] سلہ مریم ۱۲

میں اگر لڑکیاں زندہ دفن ہوتی تھیں تو اس میں شمّہ برابر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کا ذمّہ دار سرتاسر مرد ہی تھا۔ مرد نہ چاہتا تو عورتوں کے لئے عملاً ممکن ہی نہیں تھا کہ اس شیطانی رسم کو اس کے علی الرغم چلا سکیں۔ علاوہ ازیں ماں کسی بھی زمانے کی ہو لیکن "مامتا" اس کی قوی ترین جبلت ہے۔ یہ محالات میں سے ہے کہ کسی بھی جذبۂ و احساس کے نتیجے میں اس کے ذہن میں یہ تخیل جنم لے سکے کہ اپنی بچیوں کو زندہ گاڑ دینا چاہئیے۔ یہ تو مرد ہی تھا جس کی درندگی اور شقاوت نے ایک غالی و مفرط جذبۂ غیرت کی آڑ لیکر یہ سوچنے کی جرأت کی کہ بچیوں کو مار ڈالا جائے اور اس تخیل کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ جب لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا ایک اٹل رواج کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا اس وقت بھی ماؤں کے سینے پھٹتے تھے وہ روتی تھیں، تڑپتی تھیں، ان کے کلیجے منہ کو آتے تھے ان کے بس میں اگر ذرا بھی ہوتا تو وہ اس رواج پر ہزار لعنت بھیجتیں۔ لیکن مرد نے ان کے محسوسات کی پروا نہیں کی اور اس تسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ بربریت کا یہ ناپاک کھیل کھیلتا رہا کہ مائیں بھی مجبوراً اس کی عادی ہوگئیں۔ عادی نہ بھی ہوتیں تو اُس دَور کی عورت مرد کے مقابلہ میں کہاں کس سے احتجاج کرتی۔

الحاصل یہ کہ سب سے بڑا اور اصلی مجرم باپ تھا۔ اب سوچئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے حضور اس جرم کی ایک داستان بیان کی گئی تاکہ معلوم کیا جائے کہ اس کے مرتکب کا اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں کہاں ٹھکانا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ سب سے بڑے اور اصلی مجرم کا تو ذکر تک نہ کریں اور نارِ جہنم کی وعید سُنائیں صرف اُن دو ہستیوں کے لئے جن میں سے ایک تو صراحتاً مظلومہ ہے اور دوسری محض درمیانی واسطہ۔ ہماری عقل تو اسے ماننے سے صاف انکار کرتی ہے

اگر آپ کہیں کہ اصل مجرم کا ذکر تو حضور نے لفظ وائدہ کے تحت کر دیا تو عرض کریں گے کہ وائدہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا مصداق اگر آپ اُس درمیانی عورت کو نہیں مانتے جو دوسروں کی خاطر معاوضتہً یہ فعل خبیث کیا کرتی تھی تو پھر مدفونہ کی "ماں" کو مانیں گے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے واضح کیا ماں ہرگز ہرگز اصلی مجرم نہیں ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مائیں خود اپنے ہاتھ سے اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو زندہ دفن کرتی تھیں تب بھی یہ حقیقت شبہ سے بالاتر ہے کہ اس عمل پر آمادگی مَردوں ہی کے جور و تشدد سے ہوتی تھی۔ مرد ہی اس کے اسی طرح ذمہ دار تھے جس طرح فوج کے حملے کی ذمّہ داری متعلقہ ملک کی حکومت پر ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تنہا ماں مجرم قرار پائے اور باپ صاف بچ جائے۔

آپ اگر کہیں کہ وائدہ کے ذیل میں باپ بھی آگیا تو یہ خلافِ قیاس دعویٰ ہوگا۔ وائد (بصیغۂ تذکیر) کہا جاتا تب تو یہ کہنا بجا ہوتا کہ وہ ماں بھی اس کے ذیل میں آگئی جس کی مرضی اس رسم کی انجام دہی میں شامل ہو۔ قاعدہ ہے کہ تانیث و تذکیر کا برابر کا اجتماع ہو تو تذکیر کو فوقیت دے کر صیغے مذکر کے لائے جاتے ہیں اور مؤنث تبعاً اسمیں آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں اکثر پر حکم کُل کا لگتا ہے۔ جیسے ہزار عورتیں اور چند مرد جمع ہوں تو اسے عورتوں کا مجمع کہدیا جائیگا فرض کیجئے کچھ واقعات ایسے بھی پیش آئے ہوں جن میں ماں ہی نے خوشی سے اپنی بیٹی کو گاڑ یا گڑوا دیا ہو تو انھیں استثنا اور شاذ کا درجہ حاصل ہوگا۔ وہ کلیہ اپنی جگہ مسلّم رہے گا کہ باپ ہی اصلی مجرم ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصلی مجرم کا ذکر ایسے صیغے سے فرمائیں جو کسی طرح اس کے لئے موزوں نہ ہو، بلکہ اس کے تحت بیچاری ماں بالکلیہ مجرم قرار پاجاتی ہو جو یا تو مجرم ہے ہی نہیں یا ہے تو کمتر درجے کی۔

بالکل نہیں۔ وائدہ سے مدفونہ کی ماں مراد لینا اور اس کے تحت باپ کو بھی شمار کر لینا جو اصلی مجرم اور سربراہ ہے بے بنیاد بات ہے۔ اس سے مراد وہی ہو سکتی ہے جو عموماً اس جرم کو عملی اسٹیج سے گذارنے میں نمایاں حصہ لیتی تھی۔ اگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہو کہ کوئی

یا خود باپ اس جرم کو انجام دے جب بھی وائدۃ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ عموم و کثرت کے ساتھ بچہ لیا عورتیں ہی اسے انجام دیا کرتی تھیں اور عموم و کثرت ہی کا اعتبار کر کے صیغۂ تانیث ارشاد ہوا ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ وائدۃ کے تحت اصل مجرم نہیں آ سکتا تو اس کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ موؤدۃ میں اس کا شمول کیا جائے۔ یہ لفظ صیغۂ تانیث میں تو اس لئے آنا ضروری تھا کہ زندہ دفن کی جانے والی مظلومائیں لازماً لڑکیاں ہی ہوا کرتی تھیں۔ صاحبزادوں کو کسی نے نہیں گاڑا۔ لیکن صیغۂ تانیث کے باوجود جس طرح قرآن میں واذا الموؤدۃ سئلت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود موؤدہ نہیں، بلکہ گاڑنے والے مسئول ہوں گے اور ان ہی سے یہ سوال ہوگا کہ کس قصور میں لڑکی زندہ درگور کی گئی۔ اسی طرح حدیث کے لفظ موؤدۃ سے بھی یہی مطلب ہوگا کہ جن افراد کے ایماء اور حکم سے لڑکی گاڑی وہ جہنمی ہیں۔ یہ مطلب نہ لیا جائے تو اس ہولناک شبہ کے ازالہ کی کوئی صورت نہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے مظلومہ کا حشر تو بیان کر دیا، لیکن سب سے بڑے اور اصلی مجرم کے بارے میں سکوت کیا۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر وائدہ سے مراد اصل مجرم نہیں لئے جا سکتے تو آخر اس کی کیا ضرورت تھی کہ اصل مجرموں کا ذکر تو غیر صریح انداز میں آئے اور اس بچہ لیا عورت کا تذکرہ صریح طور پر ہو جو محض حکم کی بندی ہے معاوضے پر کام کر رہی ہے۔ ہم جواب دیں گے کہ جس انداز کو آپ غیر صریح کہہ رہے ہیں وہ غیر صریح ہے ہی نہیں محاورات اپنے مطالب کے لئے آخری حد تک صریح ہوتے ہیں۔ جب کسی نے کہا کہ روس منکر خدا ہے تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ اس میں روس بول کر اہلِ روس مراد لئے گئے ہیں اس لئے یہ اپنے مفہوم میں غیر صریح ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن نے وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ یا حدیث نے والموؤدۃ فی النار کہا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ اس میں موؤدۃ بول کر موؤدۃ لہم مراد لی گئی ہے اس لئے یہ اپنے مفہوم میں غیر صریح ہے۔ یہ تو اسی طرح صریح ہے جیسے ہم یوں کہیں کہ زید گدھا ہے یا ہندہ شیرنی ہے۔ حالانکہ ہم نے یہ تصریح نہیں کی کہ انسان کو جانور قرار دینے سے ہمارا کیا منشاء ہے لیکن سننے والے کو ہمارا صحیح منشاء سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ ایسے ہی موؤدۃ کے جہنمی اور مسئول ہونے کی وعید سن کر یہ سمجھنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ جہنمی اور مسئول وہ افراد ہیں جن کے ایماء اور مرضی سے زندہ گاڑنے کا فعلِ مردود انجام پایا ہے نہ کہ خود وہ مظلومہ جسے بہیمیت کا شکار بنا لیا گیا۔

رہا بچہ لیا عورت کا خصوصی ذکر تو اس کی ضرورت یہ واضح کرنے کے لئے تھی کہ جو شخص — مرد یا عورت — کسی فعلِ بد کا مرتکب ہوتا ہے وہ چاہے کسی اور ہی کے ایماء پر مرتکب ہوا ہو مگر مجرم وہ بھی ہے۔ بچہ لیا عورت مانا کہ دوسروں ہی کے حکم پر محض پیسوں کی خاطر تکمیلِ جرم کر رہی ہے اور اس کی حیثیت مہرے سے زیادہ نہیں۔ لیکن یہ مہرہ تلوار اور ریوالور کی طرح بے شعور نہیں ہے۔ باشعور اور مکلف ہے لہٰذا اسے بھی مجرم قرار دیکر آگ میں ڈالا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جس طرح گلا کاٹنے والی تلوار کو ہم سزا کا مستحق نہیں سمجھتے، بلکہ تلوار چلانیوالے کو پھانسی پر لٹکاتے ہیں اسی طرح اس بچہ لیا عورت کو بھی نظر انداز کر دیا جائے جو تلوار ہی طرح صرف آلۂ کار رہی ہے اصل مجرم نہیں ہے۔

عقلی استدلال سے فارغ ہو جانے کے بعد اب ایک نظر حضرت حسناء بنت معاویۃ کی وہ روایت بھی دیکھ لیجئے جسے صاحبِ مشکوٰۃ نے ابوداؤد کے حوالے سے نقل کیا ہے کسی نابینا نے حضورؐ سے سوال کیا کہ جنتی کون ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا:۔

النبی فی الجنة والشهید — نبی اور شہید اور بچے اور

فی الجنۃ والمولود فی الجنۃ والوئید فی الجنۃ (کتاب الجہاد ۔ فصل الثالث)	اور جنہیں زندہ درگور کیا گیا جنتی ہیں۔

+ + + +

یہاں اللہ کے رسولؐ نے صریح الفاظ میں خبر دی ہے کہ زندہ دفن کی ہوئی مظلومہ جنتی ہے اور بچے بھی جنتی ہیں ۔ کھلی بات ہے کہ مولود کا لفظ عام ہے جس کا مصداق خالی مسلمانوں کے بچے نہیں ہو سکتے ۔ بچے یہودی کے ہوں یا نصرانی کے، ہندو کے ہوں یا مجوسی کے اگر وہ بلوغ سے پہلے مرگئے ہیں تو المولود کے خانے میں آتے ہیں ۔

جن حضرات نے المولود کے الف لام کا سہارا لے کر اس لفظ کو مسلمان ہی بچوں تک محدود رکھنے کی سعی کی ہے ان کا استدلال بے حد کمزور ہے لیکن یہاں موضوع بحث بچوں کا جنتی ہونا نہ ہونا نہیں اس لئے الف لام کی نئی بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ اس حدیث نے زندہ درگور بچی کے جنتی ہونے کی صریح خبر دی ہے ۔ لہٰذا الموؤدۃ فی النار کا وہی واحد مفہوم طے ہو جاتا ہے جسے ہم مصرح کر آئے ہیں ۔

شارحین نے تذبذب کی جو راہ اختیار کی اسکی خامی تو بے شک ہمارے قلم نے واضح کر دی، لیکن یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اسلاف کی یہ روش زہد و تقویٰ، خشیتِ الٰہی اور رواداری کی بناء پر تھی نہ کہ کم فہمی کی وجہ سے ۔ وہ اس طریقہ کو حزم و احتیاط سے زیادہ قریب سمجھتے تھے کہ جس آیت یا حدیث میں ایک سے زیادہ معانی کی گنجائش ہو اس کا کوئی ایک قطعی مفہوم اپنی طرف سے معیّن نہ کریں، بلکہ اپنے مختار مفہوم کے ساتھ وہ دوسرے اقوال و روایات بھی بیان کر دیں جن سے واضح ہوتا ہو کہ بعض لوگوں نے دوسرے مفاہیم بھی لئے ہیں ۔ اسے سیر چشمی اور علمی رواداری کہنا بیجا نہ ہوگا ۔

لیکن ہم جس تعقل پسند زمانے میں سانس لے رہے ہیں اس میں طالب علم یا معترض کی تشفی کے لئے یہ بات بہت ضروری ہو گئی ہے کہ اگر کسی ایک مصداق و مفہوم کے لئے مضبوط دلائل مہیا ہو جائیں تو قطعیت اور قوت کے ساتھ اسی کو [illegible] میں اُتارنے کی کوشش کی جائے اور متعدد تاویلات کی بھول بھلیاں کا دروازہ نہ کھلنے دیا جائے ۔ اسی لئے ہمارے نزدیک متقدمین کی وہ تفاسیر و شروح جن کے بلند پایہ اور بیش قیمت ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ انھیں عوام کے سامنے جوں کا توں رکھا جائے ۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ فان اکون مصیبًا فالاصابۃ والھدایۃ کل من اللہ رب العٰلمین وان اکون مخطیئًا فالخطیئۃ والزّلۃ کل من نفسی فاستغفر اللہ ارحم الراحمین ۔

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

اسلام — ایک بے پناہ سچائی

یہ دنیا — خدا سے مایوس اور مذہب سے بیزار نام نہاد مہذب دنیا جو خدائے حیّ و قیوم کے بجائے سائنس کے بے حس آلات پر اعتماد کرتی ہے — جو حقیقت آشنا بصیرت کے بجائے خوردبینوں کے کمزور شیشوں پر دل و جان سے فدا ہے۔ جو حق کوشی کو چھوڑ کر حق پوشی کے فن پر فخر کرتی ہے اور جو سچائی پر طاقت کو اور سوزِ دروں پر قوتِ بازو کو فوقیت دیتی ہے — ہاں یہی مغرور دنیا خواہ اور سب ہی کچھ کر چکی ہو لیکن کبھی یہ نہیں کر سکی کہ انسان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں گھس جائے اور وہاں نفرت و انتقام کے اُبال کو ٹھنڈا کر کے اسے محبت و سپردگی کے لطیف ترین جوش میں تبدیل کر دے۔ محبت اور نفرت کے پُراسرار جذبات — تہلکہ ڈالنے والے عظیم ترین جذبات پر قابو پانا "جھوٹ" کے لئے کبھی بھی ممکن نہیں ہوا۔ یہ کام ہمیشہ سچائی نے کیا ہے دھوکے اور جعل سے ہمیشہ انسان کی فطرتِ صالحہ نے نفور کیا ہے اور "سچ" کو جہاں کہیں محسوس کیا ہے فی الفور اس کی عظمت کے آگے جذبات نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ نفس اور ضمیر کی کشمکش میں سچائی کے اعتراف بالجہر اور اعلائے کلمۃ الحق کی توفیق صرف ان مٹھی بھر انسان ہی کو حاصل ہوتی رہی ہے جو سچ کو جاننے کے بعد اس کو ماننے اور استعمال کرنے کی جرأت پیدا کر سکے ہوں — یہ وہ نقطۂ عروج ہے جہاں آدمی خوب محسوس کر لیتا ہے کہ اس دنیائے فانی میں جو شے ہر شے سے زیادہ قیمتی اور عزیز ہے وہ زندگی نہیں، بلکہ سچائی پر جان دینا ہے — زندگی۔ حقیقی زندگی کا پہلا سانس ہی آدمی اس وقت لیتا ہے جب اس کے خون کا آخری قطرہ تک سچائی کو اپنے کردار کی "لوحِ محفوظ" پر نقشِ دوام بنا دینے کے کام آجائے۔

اس زاویئے سے جب ہم اسلام کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ کس طرح اور کس حد تک اسلام کے پیغام نے اپنے جانی دشمنوں کے جذبات پر فاتحانہ اثر کیا۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ وقت کی سرکش سیاسی قوتوں کو پست و زبوں کر کے دکھایا — مٹھی بھر انسانوں کی نہتی ٹولی نے آہن و فولاد میں ڈوبی ہوئی غنیم کی صفوں کو پرکاہ کی طرح ہوا میں اُڑا کر دکھا دیا — اور چٹانوں کی صلابت رکھنے والے شاہی قلعوں کو عرب کے پیدائشی غلاموں کے قدموں پر خم کر دیا۔ بلکہ اس نے اس سے بھی زیادہ حیرتناک فتح یہ بھی حاصل کی کہ جو انسان پوری قوت سے اس کا نام سننے سے جلتے تھے ان کی نفرت کو محبت اور سپردگی کے سانچوں میں ڈھال دیا — جذبات کے طوفانی دھاروں کا رُخ بدل دیا۔ دل کی دھڑکنوں میں تہلکے ڈال دیئے — آرزوؤں کی قسمت بدل دی اور جذبات و خیالات کی اَن دیکھی دنیاؤں کو مسخر کر کے ایک انسان کو بالکل دوسرا انسان بنا کر

دکھادیا۔ اسلام بھی اگر انسان کی "شاطرانہ دماغ" کی کوئی سیاسی اور نظریاتی تخلیق ہوتا تو جو لوگ ہوش وحواس کے عالم میں اس کے نام سے متنفر تھے اور اُس کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ دینے میں پسینے پسینے ہوئے جاتے تھے کبھی بھی اسلام کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اپنا کر اس کی راہ میں پروانہ وار قربانیاں پیش کرنے کی تحریک نہ پا سکتے — بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ جو دشمن ایک دو دن نہیں — سالہا سال تک اپنی دولت اور خون پسینے کو اسلام کو مٹا دینے کی راہ میں پانی کی طرح بہاتے رہے ہوں — جن کی پوری زندگی "اسلام دشمنی" کے مرکز پر سمٹ گئی ہو جو اس نفرت کے خوں آشام جنون میں دن رات کا سکون وآرام تج چکے ہوں وہ اچانک اسلام کو جھوٹ سمجھتے ہوئے اس پر اس طرح قربان ہو جائیں کہ جس کا خواب بہت سے سچائیوں کو ماننے والے بھی نہ دیکھ سکیں۔ اگر تاریخ انسان کے اپنے ہی ماضی کی کہانی ہے اور یہ کہانی ہمارے مستقبل کی میزانِ فکر وعمل میں کوئی بھی وزن رکھتی ہے تو اسلام کی اس نفرت سوز — انقلاب آفریں سچائی سے زیادہ سچا اور وزنی کوئی واقعہ اس تاریخ کے دامن میں موجود نہیں —

سہیل بن عمرو بھی اسلام کے ایک ہی "تاریخی دشمن" رہ چکے تھے جن کو اس پیغام کو خود قبول کرنا تو کیا دوسروں کو قبول کرتے دیکھنا بھی شاق تھا۔ لیکن ان کی تقدیر کی "ستم ظریفی" سے جب اسی انسان کے گوشت وخون سے بنا ہوا اسکا اپنا بیٹا "مسلمان" ہو گیا تو سہیل کی اسلام دشمنی جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ گلی گلی اور سڑک سڑک پر وہ اس نفرت کی آگ اُگلتے پھرتے — زہر میں بجھی ہوئی تقریروں سے اسلام کے خلاف نفرت وانتقام کا آتشیں اشتعال پھیلاتے — لوگوں کو پکار پکار کر جمع کرتے اور کہتے کہ ان کی زندگی کا سب سے پہلا کام اس "پیغام" کو موت کے گھاٹ اُتار دینا ہے — باپ کے مجنونانہ ظلم واستبداد کی یہ مہم "غیروں" ہی کو تختۂ مشق بنانے پر اکتفا نہیں کر رہی تھی، بلکہ اس نے پوری بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ شفقتِ پدری کی شہ رگوں کو بھی کاٹ دیا تھا اور "باپ" کے ہاتھوں نے اپنے مسلمان بیٹے کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر قید وبند میں گھٹ گھٹ کر مرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو محمد عربیؐ کے چاہنے والے انسانوں کے لئے ایک ناقابل برداشت گستاخ ترین کافر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کو رسول کریمؐ کے خلاف زہرناک لاف گزاف میں ڈوبا ہوا دیکھ کر عمر ابن خطابؓ کی غیرتِ حق بار بار خدا کے رسولؐ کے سامنے یہ اجازت حاصل کرنے کے لئے تڑپ تڑپ کر آتی تھی کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے دانتوں کو پاش پاش کر دوں" — یہی وہ انسان تھا جو اسلام کے خلاف پہلی جنگ — جنگِ بدر میں کفر کی صفِ اولیں میں پیچ وتاب کھاتا ہوا نظر آیا۔ یہی وہ شخص تھا جس کے کفر کے مشتعل غلو نے صلح حدیبیہ کی دستاویز میں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کاٹ دینے کی پہلی آواز اٹھائی تھی۔ یہی وہ اسلام کا آخری مخالف تھا جس نے اس وقت بھی اسلام کے خلاف "تلوار" اُٹھائی جب مکہ پر مسلمانوں کی چڑھائی ہو رہی تھی اور بڑے بڑے "اشتہاری مجرم" فرار ومصلحت کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ ظالمانہ طاقت کا طلسم ٹوٹے اور مظلوم سچائی فاتحانہ شان سے حیات وکائنات کے روشن افق پر نمودار ہو — کفر وشرک کے ہزاروں سال تک جو بے ان انسانوں کے قدموں پر اوندھے منہ گر رہے تھے، جن کو ضعیف وناتواں سمجھ کر ان کے گھروں اور بستیوں سے تہی دامن اور بے دست وپا کر کے نکالا گیا تھا۔ لیکن آج اسکے باوجود ان کے فاتحانہ سر ایک نامعلوم طاقت کے احترام سے جھکے ہوئے تھے — نفرت وانتقام کے خلاف جوابی ردِ عمل کے بجائے ان کے سینے محبت وانسانیت کے جوش سے پھٹے جاتے تھے — ہاتھوں میں چمکنے والی تیز وبرّاں تلواروں سے زیادہ ان کے سوز دروں کا یہی وہ "تیر نیم کش" تھا جو سہیل کے قلب میں ترازو ہو گیا — ہتھیاروں سے صرف سر جھکائے جا سکتے ہیں مگر اخلاق کی زد میں پتھریلے دل جھک جاتے ہیں۔ سہیل نے مایوسی کے ساتھ جب رسولِ خداؐ سے "امان"

چاہی تو ان کو کامل یقین تھا کہ اس کے جواب میں ان کی گردن اُڑا دی جائے گی اور زبان قلم کر دی جائے گی اور اس طرح ان کی عمر بھر کی اسلام دشمنی کا حساب پل بھر میں ہمیشہ کے لئے چکا دیا جائے گا۔ لیکن جس باپ نے اپنے بیٹے کو حق پسندی کے جرم میں بدترین عقوبتوں کے شکنجے میں کسا تھا اس بیٹے نے آج باپ کی دردناک پکار سُنی۔ وہی آج ایک سچا انسان ثابت ہوا اور وہی اپنے باپ کی جان بخشی کی درخواست رسولِ خدا تک پہنچانے کے کام آیا۔ سہیل اس دوران میں مایوسی کی کرب انگیز کیفیت میں زندگی کے سانس گن رہے تھے بیٹے کی غمگساری میں خون کے فطری جوش کی توجیہ کی جا سکتی ہے، مگر محمد عربیؐ اپنے جانی دشمن پر کیوں ترس کھانے لگے! سہیل یہی سوچ رہے تھے اور ان کا وہ ماضی ایک ہولناک تصویر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا جب وہ اسلام۔ خدا اور محمدؐ کے خلاف ملک کے طول و عرض میں آگ لگاتے پھرتے تھے۔ لیکن سہیل یہ دیکھ کر حیرت و عقیدت سے سکتے میں آ گئے کہ رسالت کا کشادہ سینہ اپنے استنے بڑے دشمن کے لئے بھی تنگ نہیں اور یہ کہ ٹھیک اس وقت جب عمر بھر کے طویل جرائم کی آخری سزا دی جانی تھی۔ رحم طلبی کی ایک پشیمان پکار پر محمد عربیؐ نے انکی طرف رقت و شفقت کے نرم بازو پھیلا دیئے ہیں — یہ سہیل کی زندگی کا وہ پہلا دن تھا جب ان کی زبان نے حضورؐ کے اخلاق کو بے ساختہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا "محمد کبھی بھی بُرے نہ تھے۔ میں نے انکو بچپن میں بھی نیک دیکھا تھا اور بڑے ہو کر بھی ان کو نیک ہی پا رہا ہوں۔" یہ الفاظ کسی شاعر کے الفاظ نہ تھے۔ — یہ کسی چاہنے والے کی مبالغہ آرائی نہ تھی — یہ کسی عزیز یا دوست کی اندھی محبت کا جوش نہ تھا — یہ دشمنِ جاں کے الفاظ تھے۔ جو گھر کی خطرناک تنہائی میں چھپا ہوا ایک انسان خود ہی کہہ رہا تھا اور خود ہی سُن رہا تھا۔ نہیں! یہ زبان کی چند جنبشوں سے ڈھلے ہوئے الفاظ نہ تھے۔ یہ دل کی دھڑکنیں تھیں — یہ احساسِ حق کی زلزلہ انگیز دھمک۔ پہلی دھمک تھی جو باطل اور جھوٹ کی ہٹ دھرمیوں کی ایک عمر دراز کی بنیادیں ہلا چکی تھی۔ یہ نفرت و انتقام کی وہ آخری ہچکی تھی جو صرف حق آشنا ہونٹوں پر سنائی دیتی ہے — آخر حق و صداقت کا یقینی اثر شروع ہوا اور اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرنے لگا اور جنگِ حُنین سے واپسی پر آنحضرتؐ نے دیکھا کہ سہیل کے لئے حق کی تڑپ اب ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ وہ آئے — عمر بھر کا دشمن آیا اور اس اسلام کے قدموں کو فرطِ شوق سے لپٹ گیا جس پر کبھی وہ ٹھوکروں کے نشانے لگانے میں زندگی کا واحد لطف محسوس کیا کرتا تھا۔

احساسِ حق — اعترافِ حق ہی کی منزل پر نہیں ٹھیرا — اب وہ حق و صداقت کی قیمت چکانے کیلئے تلافیٔ مافات کی حدت میں سلگ رہے تھے۔ وہ زندگی جو انھوں نے پورے فخر و تکبر کے ساتھ اسلام کی دشمنی میں گذاری تھی وہی زندگی اب ان کی نظر میں ایک "فردِ جرم" تھی جس کا خیال کر کے وہ اس طرح بے کل ہو جاتے جیسے ان کی دل کی ایک ایک دھڑکن میں نشتر اُتر گئے ہوں۔ عملی گناہوں کا کفارہ زبانی دینا منظور نہ تھا — عملی کفارے کے بعد بھی ان کی روح کسی طرح تسکین نہ پاتی تھی آخر قسمت نے ان کو وہ عظیم مواقع دیئے جن کے ذریعے ان کو ضمیر کی یہ پھانس نکال دینے کی حسین فرحت حاصل ہوئی — حضورؐ کی وفات کے بعد جب منافقوں اور ڈھلمل عقیدہ لوگوں نے ارتداد کا فتنہ اُٹھایا تو یہ سہیل ہی تھے جو تلواروں کی چھاؤں میں جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے "اسلام — اسلام!" کا نعرۂ شوق بلند کرتے سُنے گئے۔ وہی سہیل جو اسلام کی بنیادیں ڈھایا کرتے تھے اسلام کی گرتی ہوئی دیواروں کو اپنے پورے وجود کے سہارے روکنے کی دُھن میں پسے جا رہے تھے۔ وہی شخص جو اسلام اور کفر کے دوراہے پر ننگی تلوار اُٹھائے کبھی ایمان لانے والوں پر "ہزن" لیلنے کی وحشت ناکیوں میں گم تھا آج پوری قوت سے گرج رہا

"یاد رکھو! جس شخص نے اسلام سے باہر ایک قدم نکلنے کا ارادہ کیا اس کا سر تن سے جدا کر کے خاک و خوں میں لتھیڑ دوں گا۔" وہی سہیل رضؓ جو کبھی اپنے بیٹے ابوجندلؓ کو اسلام لانے کے جرم میں پا بجولاں کر کے وحشیانہ مظالم ڈھایا کرتے تھے — ہاں اسی سہیل رضؓ نے اسلام کی راہ میں اپنے بیٹے عبداللہ کی گردن کٹا دی اور تعزیت کرنے والوں کو اس نعرۂ مستانہ سے گنگ کر دیا "میرا بیٹا شہادتِ حق کی راہ میں کام آیا۔ مجھے مبارکباد دو! میں کیسا خوش نصیب ہوں — میں ایک شہید کا باپ ہوں جس کا بیٹا رسولِ کریمؐ کے ارشادات کے مطابق وہاں کام آئے گا جہاں کوئی کام نہیں آ سکتا!"

اسلام نے اس انسان کے سینے میں جذبات کا جوش ہی نہیں بصیرت و ہوش کا ٹھنڈا نور بھی بھر دیا تھا۔ کفر کی دولت میں جو شخص عصبیت کے زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا تھا وہ خدا کی بندگی اور حق کی حلقہ بگوشی کے بعد اپنی انصاف پسندی اور حقیقت پسندانہ اعتدال میں اپنا جواب آپ تھا۔ معرکۂ شام کے سلسلے میں جب حضرت عمر ابن خطابؓ نے اپنی بزم مشاورت میں اس ترتیب سے لوگوں کو مشورہ کے لئے بلایا جس ترتیب سے انھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اس طرح غلاموں نے اپنے آقاؤں کے مقابلے میں شرفِ فضیلت اور تقدیم کا اعزاز حاصل کیا تو ابوسفیانؓ کے اندازِ طبیعت پر یہ بات گراں گذری۔ سہیلؓ کے لئے یہ واقعہ غیرتِ حق کو جوش میں لانے کے لئے کافی تھا۔ اگرچہ وہ خود اس مشورے میں تقدیم سے محروم لوگوں میں تھے لیکن اعلائے حق میں پہل کا شرف یہاں ان کی تقدیر میں لکھا تھا۔

اے لوگو! سہیلؓ کی نوائے حق بلند ہوئی — "ان سابقون الاولون کی تقدیم پر بگڑنے کے بجائے تمہیں اپنے آپ پر خفا ہونا چاہئے! یہ وہ خوش نصیب ہیں جو اس وقت اسلام کے دوست تھے جب ہم اسلام کے بدترین دشمن تھے۔"

اسلام اب ایک مقناطیسی کشش کی طرح ان کے قلب و دماغ کو مطالعۂ حق کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ ایک طرف وہ جہاد کی راہوں میں خونِ حیات کے قطرے پیش کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کی آنکھیں کتاب اللہ کے اوراق پر آنسوؤں کی بارش کر رہی تھیں — وہ شخص جو قرآن پڑھنے والوں پر کبھی بلائے بے درماں بنکر ٹوٹ پڑتا تھا۔ قرآن کا لفظ لفظ اس کے جذباتِ عبودیت میں تلاطم پیدا کئے دیتا تھا۔ قرآن شریف پڑھتے جاتے اور روتے جاتے تھے — اور گلوگیر آواز کتاب اللہ کے الفاظ کو سینے سے لگائے سینے کی گہرائیوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ حق گوئی نے دل میں درد اور دماغ میں حقیقت پسندی کا وہ نور پیدا کر دیا تھا کہ جاہلی عصبیت کی فضا اس کے شفاف نور میں نہا گئی تھی۔ کسی نے ایک بار کہا "تم معاذؓ کے گھر جا کر قرآن پڑھتے ہو — وہ تو ایک خزرجی ہے اور تم . . ."

"کیا کہہ رہے ہو!" سہیلؓ کے سینے میں جاہلی عصبیت کے بجائے اعترافِ حق میں پچھڑ جانے کی دیرینہ خلش جاگ اٹھی "کیا کہہ رہے ہو! — اسی شوخیٔ فکر نے ہماری یہ درگت بنائی کہ لوگ خدا شناسی میں ہم پر بازی لے گئے — کاش۔ ہم پہل کرنے والوں میں ہوتے! — کاش!! — مگر خدا کا شکر ہے کہ اسی نے ہمیں بچا لیا ورنہ اگر ہم کفر ہی کی موت ہی مر جاتے تو ہمارا انجام کیا ہوتا! — نہیں! میں معاذ کی خدمت میں جاتا رہوں گا۔ ضرور جاتا رہوں گا۔"

اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز تھرتھرائی اور آنکھوں میں عقیدت کے آنسو جھلملا گئے۔ سر سینے پر ڈھلک گیا اور سینہ میں دھڑکتا ہوا دل کسی نیم بسمل پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ یکایک نہ جانے ان کو کیا یاد آ گیا تھا! — کونسی ظالم یاد تھی جس نے حال کو ماضی کی پہنائیوں میں دھکیل دیا تھا اور یاد کرنے والا اپنے وجود تک کو بھول گیا تھا۔ سوچ اور اضطراب میں سینے پر ڈھلکا ہوا سر پھر اٹھا — آنسوؤں سے گلنار پُر نور ایمانی آنکھیں مخاطب کے چہرے پر جم گئیں۔ چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں کا منظر کانپ گیا اور لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

پھر خشک سے ... پر کمر اٹھی تھی — اس وقت مجھے اس دن کی یاد آ رہی ہے جب میں خدا کا بندہ ہوتے ہوئے یہ بات نہ جانتا تھا کہ میں خدا کا بندہ ہوں — جب ایک درخت کے سائے میں ایک خدا کے بتائے ہوئے دو طرح کے انسان — کافر اور مومن یکجا ہوئے تھے اور حدیبیہ کی دستاویزِ صلح لکھی جا رہی تھی — اس وقت یہی وہ بدنصیب انسان تھا جس نے پاگلوں کی طرح یہ چیخ ماری تھی کہ کاغذ پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ برداشت نہیں جا سکتے — مٹاؤ — ان کو مٹاؤ! — اور ... آج میں ان الفاظ پر خود کو مٹا دینے کی حسرت میں تڑپتا ہوں تو مجھے اپنی زندگی کا یہ تاریک واقعہ جان کنی سے زیادہ روح فرسا محسوس ہوتا ہے — اے ضرار! میں خدا کے رسول کے سامنے جاتا ہوں تو مجھے اپنے وہی الفاظ تیر و نشتر بن کر روح میں گھستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور مجھے حضور سے آنکھیں ملاتے ہوئے شرم آتی ہے!"

کیسے تھے وہ لوگ بھی جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ انکی غیرتِ حق، غیرتِ ایمانی آخر کیا چیز تھی جو ان کے ایامِ کفر کی بداعمالیوں پر خون کے آنسو رلاتی تھی — جو نادانی کی خطا کاریوں پر اس طرح سرافگندہ و دلفگار تھے جیسے کسی نے جان بوجھ کر حق و صداقت کی عدالت میں کوئی سنگین جرم بقیدِ ہوش و حواس کیا ہو! لیکن ہم ٹھیک اسی سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں — ہم نے حق کی گود میں شعور کی پہلی آنکھ کھولی — ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں کفر کی ہوا تک نہیں لگی۔ مگر اس کے باوجود ہمارا احساسِ گناہ پتھر ہے — پتھر سے زیادہ سخت ہے۔ ہم ایامِ ایمان کی سیاہ کاریوں کی فردِ جرم اٹھائے ہوئے اپنے خدا کی "عدالتِ محشر" کی طرف یوں ہنستے کھیلتے جا رہے ہیں جیسے دوزخ کی آگ اور جنت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں کوئی فرق نہیں! جیسے خدا کی رحمت اور خدا کے قہر و جلال میں تمیز کرنے کی حس ہی ہمیشہ کیلئے ماری گئی ہو! اے وائے بر حالِ ما! ہم مسلمان "ہیں! — کیا ... کیا ہم مسلمان ... ہیں؟ نہیں — نہیں! — کیا ہم مسلمان ہیں؟ —

—— ((۳)) ——

عبداللہ بن اُمیّہ کو "اسلام دشمنی" اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ نفرت و انتقام کا آتشیں لاوا انکی رگ و پے میں خون بن کر گردش کر رہا تھا۔ یہ دشمنی ان کو اس المناک حد تک لے گئی تھی جہاں آدمی کا زاویۂ نظر یکسر اُلٹ کر رہ جاتا ہے — جہاں "جھوٹ" ایک مایۂ ناز حقیقت اور خود سچائی ایک مضحکہ خیز جھوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ جہاں انسان اپنے ضمیر کی موت پر رو پڑنے کے بجائے سچائی کو دیکھ کر نفرت سے ہنستا ہے — دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہے۔

اس "ٹریجڈی" کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ نے قریشی زعما اور معزز سربراہوں کے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اس ماحول نے شروع سے ان کو یہ بات سمجھائی تھی کہ دنیا کی قدر و منزلت ہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی کی عظمت کو ناپا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں ان کے "باپ" ایک عظیم شخصیت تھے۔ کیونکہ مکے کی سوسائٹی ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھاتی تھی — قریش کے سربرآوردہ کافر ان کی نظر میں اونچے لوگ تھے اس لئے کہ ان کی سماجی قیادت اور معاشی خوشحالی کا وزن قدم قدم پر محسوس کیا جاتا تھا۔ بھلا وہ "اسلام" ان کے جذبات کو کیا اپیل کر سکتا تھا جو غلاموں اور غریبوں، لاچاروں اور بے کسوں کے درمیان ظاہر ہوا — فاقوں کی آنچ میں تپتا ہوا "اسلام" — زخموں اور رستے ہوئے آبلوں کی ٹیس سے چور چور اسلام — جو ایک اَن دیکھے معبود کے قدموں کو چھونے کے لئے آنکھ کھولے ہی تمام دنیا کی ٹھوکریں برداشت کر رہا تھا۔ ابھی عبداللہ انسانی زندگی کے اس انقلابی موڑ سے بہت دور تھے جہاں زندگی اپنے حقیقی خالق کا تعارف حاصل کرتی ہے تو تخلیق کی یہ پوری بیکراں کائنات ایک تنگ و تاریک زنداں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان کی آخری آرزو یہ اور صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان جاں آفریں کے قدموں پر جتنی جلد نثار کر دے اتنا ہی بہتر ہو — جنتِ ارضی کے سرابوں سے دور جہاں حقیقی

جنت کی خوشبو سونگھ کر انسان شہادت کے لہو میں نہا جانے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے — ابھی عبداللہؓ ایمان و یقین کے اس لطیف سوئیدروں سے ناواقف تھے — کفر و شرک کی قہرانیت کے مقابلے میں ابھی حق پسندوں کے کمزور ڈھانچے ہی ان کو دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے روشن اور تابناک سینے اور فولادی ایمان و یقین نہیں — اس لئے پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی "کمزوری" کو کڑکتی چمکتی "طاقت" کے منہ آتا ہوا دیکھ کر وہ سوائے اس کے اور کیا کرتے کہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہنس پڑیں اور حقارت و استہزاء کی شدت سے قہقہہ لگاتے چلے جائیں — وہ ابھی یہی کر رہے تھے۔ ان کے باپ کا قہر و غضب ایک شکل میں اسلام پر شعلہ باری کر رہا تھا تو عبداللہ کی اپنی سرد مہری اور حقیقت ناآشنا قہقہوں کی بوچھاڑ دوسری شکل میں حقیقت کشی کی یہی مہم سکے کے طول و عرض میں چلا رہی تھی۔

"کیا — تم خدائے واحد کے فرستادہ ہو؟" عبداللہ نے بے رحمانہ و گستاخانہ شرارت سے خدا کے رسولؐ کو سرِراہ چھیڑتے ہوئے کہا۔ "جی! کیا آپ ہی خدا کے رسول ہیں؟"

سوال کرنے والا جس انداز سے سوال کر رہا تھا وہ کس قدر جارحانہ ہوگا اس ہستیؐ کے لئے جس کے احساسات پر نزاکتِ احساس کی انتہائیں ختم ہوتی تھیں۔ گستاخی اور خون آشام درندگی کے موڈ نے سوال کرنے والے انسان کو ایک ایسے جانور کی شکل میں ڈھال دیا تھا جس کو حیوانیت بھی دیکھ لے تو شرم سے سر جھکا لے، لیکن آج درندگی کی زد میں وہ انسانِ کامل تھا جو دشمنوں کو پیار کرتا تھا — جو جانوروں کو بہترین انسان بنانے کے لئے ریگستان کے آتشیں ذرّوں کی پیاس اپنے خونِ دل و جگر کے آخری قطروں تک سے بجھانے کے لئے تیار تھا صرف اس توقع اور اس حسرت میں کہ آدمی اس آگ میں کوئلہ بن جانے سے بچ جائے جس کا ایندھن پتھر اور پتھر دل انسانوں کی ہڈیاں بننے والی ہیں۔ بے حسی اور جراحت کاری کے اس سوال پر اس نے نفرت سے منہ نہیں موڑا۔ قلب و روح کی دردمندانہ ٹیس کے ساتھ گوش بر آواز ہو گیا اور فرطِ درد سے پکار اٹھا "ہاں! اے پاگل انسان! خود پر ستم توڑنے والے انسان! تیرے سامنے اس وقت تیرے خدا کا آخری رسول ہی کھڑا ہوا ہے۔ جس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تجھے تیرے خدا کا آخری پیغام پہنچا دے اور بس۔"

عبداللہ نے یہ الفاظ سنے اور تھوڑی دیر کو سناٹے میں آ گئے! — یہ کون شخص ہے جو ان سے اس طرح باتیں کر رہا ہے کہ جیسے کوئی اپنا دل چیر کر دکھلا رہا ہو! نفرت و حقارت کے جواب میں یہ شدتِ دردمندی! — مضحکہ اور استہزا کے جواب میں یہ انتہا سنجیدگی کا وقار! — انکار و تردید کی ہٹ دھرمیوں کی ٹھیک زد میں سچائی کے لامتناہی یقین کا اٹل ثبوت! — لیکن جب دل اور نگاہ کے درمیان زنگ آلود فطرت کا "حجابِ مستور" پڑا ہوا ہو تو آدمی سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں دیکھ پاتا! — سب کچھ سن کر بھی یہ محسوس کرتا ہے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں — عبداللہ ابھی اسی المناک منزل میں تھے۔ وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ سچائی اپنے حسن و جلال کے ساتھ سامنے موجود ہے — مگر آنکھیں دل کی گرہ نہ کھول سکیں تو عقیدت کی روشنی باطن کے زنگ خوردہ بند دروازوں سے ٹکرائی اور نفس کی اندھیر نگری میں گم ہو گئی — انسان حق کو پا رہا تھا مگر خود کو ابھی نہ پا سکا۔ روح نے اس نارسائی کے درد میں چیخ ماری لیکن ہونٹوں نے اس کو "وحشت زہرخند" میں الٹ دیا۔ فطرتِ انسانی اندر پڑی سسک رہی تھی مگر ہونٹوں سے قہقہے نکل رہے تھے اور رسالت کے خلوص کا جواب دے رہے تھے — انسانی خود فریبی کی اس قاتلانہ دیوانگی پر پیغمبرؐ کا دل بھر آیا۔ پرائے غم پر روتی ہوئی آنکھیں سوئے فلک اٹھیں اور وہ ہونٹ جن کو کبھی جھوٹ کی آلودگی نے چھوا تک نہ تھا دعائیہ سرگوشی میں جنبش کرنے لگے "اے خدائے واحد! تو نہ خفا ہو جانا! — یہ بدنصیب تجھے جانتے نہیں۔ تیرے رسول کو پہچان نہیں رہے۔ ورنہ یہ ایسا نہ کرتے! — رحم کر — اے ارحم الراحمین! رحم فرما!" — اور "بدنصیب انسان" نے اس "درد" کی جو پذیرائی کی وہ یہ تھی کہ صداقت کی پیمائش کے لئے شعبدوں کا پیمانہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میں تمھیں

رسول مان لوں گا۔۔۔ مگر پہلے زمین سے اچانک پانی کا ایک چشمہ نکال کر دکھاؤ۔۔ یا صرف اتنا کرو کہ پلک جھپکتے تمہارے لئے ایک قصرِ زرنگار تعمیر ہو جائے۔"

زمین سے اچانک پانی نکال دینا اور چشم زدن میں سونے کا محل تیار کر دینا جتنا نا ممکن تھا اس سے کہیں زیادہ نا ممکن یہ تھا کہ یہی بے تکے مطالبے پیش کرنے والا کسی دن خود بخود اٹھے اور حق کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے۔ اسلام کی تیر بہدف سچائی نے یہ ناممکن ممکن کر دکھایا۔۔۔

مکہ سے خدا کا نام لینے والے ایک ایک کر کے نکال دیئے گئے تھے۔ بدر و احزاب کے میدانوں میں اسلام کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش خود موت کے گھاٹ اتر چکی تھی۔۔ کہ ایک دن نہ جانے کیا سوچ کر عبد اللہ مکہ سے چل پڑے۔۔۔ وہ "اسلام" کی طرف جا رہے تھے۔ مگر اس کو مٹانے کے لئے نہیں اس کی ادائے حق پر مٹ جانے کے ذوق و طلب میں!۔۔۔ شاید یہ انقلاب اس دن شروع ہوا تھا جب مکے سے محمد عربیؐ اور ان کے غلاموں کے جانے سے عبد اللہ کے نزدیک ایک بھیانک خلا پیدا ہوا تھا۔ جب انکو ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا انسان نہ ملتا تھا جو ظلم کے جواب میں ترس کھاتا ہو۔۔۔ جو بیجسی کے خوں آشام قہقہوں سے گھائل ہو کر بھی جوابی حملہ نہ کرے۔۔۔ جو نفرت و حقارت کی ٹھوکروں پر بھی دعائے خلوص کے پھول برسائے۔۔۔ وہ اس سوز کو کیسے بھول جاتے جو بدترین سرد مہریوں کے جواب میں بھی سرد نہ ہوتا تھا۔۔۔ وہ اس درد بھری سنجیدگی کی یاد کو دل سے کس طرح نکال دیتے جو بدترین استہزاء کی زد میں بھی انسان دوستی کی شمع جلائے رکھتی۔ انھوں نے مکے میں مسلمانوں کو زخم کھاتے بھی دیکھا تھا اور بدر و احد کے میدانوں میں تلوار اٹھاتے بھی۔۔۔ مگر وہ جہاں بھی نظر آئے ان کے چہروں سے وہی حقیقت کی معصومیت ٹپکتی تھی۔۔۔ وہی سوز، وہی درد و گداز۔۔۔ وہی بے لوث سچائی کا سوز ان کی سیرت اور صورت سے چمکتا دکھائی دیتا جس کو انھوں نے محمد عربیؐ کی ذات گرامی میں ہمیشہ نقطۂ عروج پر دیکھا تھا۔ کردار کی یہ طاقت اور اخلاق کی یہ فاتحانہ تاثیر ہی تھی جو عبد اللہ کے وجود میں ہر غلط فہمی کی بنیادیں ہلا رہی تھی۔ اور آج وہ دھوکے کے ہر امعیار سے نکل آنے کے لئے بیتاب تھے۔ جو اسلام ان کی دل کی دنیا میں ہنگامہ اٹھاتے ہوئے تھا اس کو زبان پر لانے کی تڑپ انھیں حضورؐ کی تلاش میں کھینچے لئے جا رہی تھی۔ ماضی کے جرائم کا احساس رہ رہ کر ان کے ذوق و شوق کی پیش قدمی روک دینا چاہتا، مگر مستقبل بنانے کی بیکلی پھر آگے کو دھکیلتی لے جاتی۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی پشیمان صورت اس قابل نہیں کہ براہ راست باریابی کی جسارت کی جا سکے۔ انھوں نے اپنی قریبی عزیزہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا سہارا لیکر حضورؐ سے ملاقات کی اجازت طلب کی۔ ہنس ہنس کر سینے پر زخم لگانے والے کو دروازے پر حاضر پاکر آپ کو مکہ کا دورِ ستم یاد آ گیا۔۔۔ عبد اللہ کی وہ ساری کہانی نظروں میں پھر گئی جس میں نفرت کے دلخراش قہقہے تھے۔۔۔ حقیقت کا خوں آشام مذاق تھا۔۔۔ دلدوز بے حسی کی مسلسل مشق تھی اور وہ سب کچھ تھا جو دلوں کو جوڑنے کا ہر نفسیاتی امکان ہمیشہ کے لئے ختم کر ڈالے۔ لیکن اس ظالم دشمن کی آواز سنکر جوابی انتقام کے جوش میں ٹوٹ پڑنے کے بجائے آپؐ نے ظالم کو صرف ستم یاد دلائے اور جراحتوں کی ٹیس سے مدھم آواز میں فرمایا "مکے میں انھوں نے میرے لئے کونسی کسر اٹھا رکھی تھی جسکو پورا کرنے کے ارادے سے اب یہاں آئے ہیں۔"

یہ تھی وہ لطیف سزا جو عمر بھر کے قہر و ستم کے جواب میں ایک گردن زدنی دشمن کو اپنے مکمل اختیار میں پاکر دی گئی۔ لیکن نہیں!۔۔ یہ "سزا" نہیں "انعام" تھا۔ یہ سختی نہیں ہمدردی تھی۔ مشیت چاہتی تھی کہ حق کی طرف جذباتی ذوق میں بڑھنے والا انسان مخالف جذبات کا دھکا برداشت کرے اور سچائی کی نئی پاکیزگی کو پانے سے پہلے ہر پرانی کثافت کو اذیت کی آگ میں تپا کر کندن بنا لے۔ عبد اللہ نے اس لطیف سزا کا یہ فائدہ اٹھایا۔۔۔ ناکامی اور آخری زیاں کے تصور سے وہ ماہیٔ بے آب ہو گئے۔۔۔ مایوسی کی آخری اذیت نے تلافیٔ مافات کے درد کو ناقابل برداشت حدوں تک پہنچا دیا۔ اور عبد اللہ ان بلندیوں کو چھونے لگے جہاں حقیقت پسندی کے سیلِ رواں میں

انسان زندگی کی محبت تک کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

"محمدؐ کے در سے ٹھکرایا ہوا انسان جینے کے قابل نہیں"۔ عبداللہ نے آخری جذباتی پیغام دیا" اگر میرے جرائم معاف نہ ہوئے تو عبداللہ خود کو موت کی سزا دے گا — میں دشت و صحرا میں تڑپ تڑپ کر جان دیدوں گا۔ مگر اب اس دنیا میں واپس نہ جاؤں گا جس کی فضا میں کفر و شرک کا زہر ہے"۔

رحمت اللعالمین نے یہ پکار سُنی تو عبداللہ کے اقدام کی پختگی نے ماضی کی ہر ذاتی تلخی یکسر بھلا دی۔ خدا کی طرف چلنے والے پر عفو و درگذر کا سینہ کھول دیا گیا اور عبداللہ نے محسوس کیا کہ ٹھیک اس سینے میں جس پر ان کے اپنے ہاتھوں نے سالہا سال زخم لگائے تھے رحمت و رافت کا دل پوری قوت سے دھک دھک کر رہا ہے۔ محمد عربیؐ کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل سے مس ہو کر عبداللہ کی للہیت میں تلاطم بپا ہو گیا۔ سچائی پر قہقہے لگانے والا انسان اب فکر آخرت کی تصویر بنکر رہ گیا زبان سے حق کی گواہی تسکین دینے کے لئے کافی نہ تھی۔ اب تو ہر رگ و پے سے یہ شہادتِ حق خون کا فوارہ بن کر پھوٹ نکلنے کو بیتاب تھی۔ مستقبل کو روشن بنالینے کا یقین ہی اس وقت تک مکمل نہ ہوتا تھا جب تک ماضی کی سیاہ کاریوں کو آنسوؤں اور خون کے قطروں سے دھوڈالا نہ جائے — تلافیٔ مافات کے اس اضطراب نے عبداللہ کے پورے وجود میں گرم گرم سیماب کوٹ دیا تھا۔ وہ جہاد کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گن گن کر گذار رہے تھے اور جب فتح مکہ، جنگِ حنین میں جان دینے کی یہ حسرت نہ نکلی تو طائف کی مہم میں پروانہ وار شریک ہوئے اور اسلام پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔

یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ اسلام کتنی بڑی، کتنی قیمتی سچائی ہے — کھوکھلے عقیدوں متزلزل قدموں کے لئے جس کی گرد تک پانا ممکن نہیں — اسلام جسکو لفظوں سے نہیں خونِ دل و جگر دے کر خریدا جا سکتا ہے — جس کی قیمت چکانے کی والہانہ تڑپ روح و جسم کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آتی ہے — اور دل کی تمام دھڑکنیں شہادتِ حق کے الفاظ بنکر ہونٹوں پر گونجتی ہیں اور ہمیشہ کیلئے فضائے کائنات میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں —

کیا ہماری زندگی میں بھی اسلام کی عظمت کا یہ عالم ایک دن — ایک ساعت کے لئے بھی گذرا ہے؟ — اگر نہیں تو ان فاصلوں کا تصور کیجئے جو پیدائشی مسلمان ہونے کے باوجود ابھی ہماری زندگی اور حقیقی اسلام کے درمیان حائل ہیں! — اسلام پر پیدا ہونا ایک چیز ہے اور اسلام پر مرنا دوسری چیز! — کاش ہم سمجھ سکیں کہ اسلام پر پیدا ہونے سے مطمئن ہونے کے بجائے ہم یہ فکر کریں کہ جس زندگی کی رگ و پے میں دنیا پرستی رچی ہوئی ہو کیا اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بسترِ جانکنی پر اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے آخری الفاظ "لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ" کی شہادت دے رہے ہوں گے؟ —

ہندی سکھانیوالی بہترین کتابیں
ہندی اُردو ماسٹر ...... ۳۰ نئے پیسے
اُردو ہندی ماسٹر ۵۰
ہندی اُردو لغت ...... ساڑھے تین روپے
اُردو ہندی لغت ...... ساڑھے تین روپے
ہندی دفتری مراسلات ...... دو روپے
مسلم یونیورسٹی اور جارحانہ فرقہ پرستی
ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور جان و مال پر جو یورشیں ہیں ان کا مبصرانہ جائزہ اور ممتاز لوگوں کے فرمودات پر نقد و تبصرہ ڈھائی روپے
فسادات جبلپور اور اسکے بعد
حال ماضی کی قبر میں دفن ہو جاتا ہے لیکن اس سے سبق حاصل کرنا جبھی ممکن ہے کہ وہ حافظے کی سطح پر زندہ رہے۔ یہ کتاب اسی امکان کو پائندہ رکھنے کی ایک مؤثر، سنجیدہ اور فکر انگیز کوشش ہے۔
قیمت دو روپے
وہ۔ جنھیں کوئی نہیں جانتا
اس کتاب میں بہت سے ایسے شعراء کے جستہ جستہ اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ جنھیں شہرت حاصل نہیں ہے، لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتیں خاصی نکھری ہوئی ہیں۔ دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت مجلد چار روپے
بزم پیغمبر
منتخب احادیث رسول کا مفید ترجمہ و تشریح۔ سوا روپیہ
جواہر رسالت
قدم قدم پر کام آنے والی احادیث مع ترجمہ و تشریح
قیمت سوا روپیہ (یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر بجائے ڈھائی کے سوا دو روپے)
وجد و سماع
از شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ
گانا بجانا۔ قوالی۔ عرس وغیرہ کے بارے میں بے نظیر گفتگو۔ پیش لفظ مدیر تجلی کا ہے
(ایک روپیہ)
تعزیہ۔ علماء اسلام کی نظر میں
ایک مختصر لیکن مفید و وقیع کتاب
چھ آنے
مصر کے شہرۂ آفاق مصنف محمد حسین ہیکل کی دو بے نظیر کتابیں
ابوبکرؓ۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیات مبارک کا ہمہ گیر جامع اور بھرپور مطالعہ۔ پانچ روپے
عمر فاروق اعظمؓ۔ خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل، مبسوط اور سیر حاصل سوانح حیات
قیمت ۱۲ روپے
مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)
(مولانا ابو الکلام آزاد کی چند کتابیں)
... قرآن کا قانون عروج و زوال۔ ڈھائی روپے ● اسلامی جمہوریہ۔ ڈیڑھ روپیہ ● مسئلہ خلافت۔ پانچ روپے ● آزاد

مسلسل

جب اسلام کارفرما تھا

مولانا عبدالرؤف رحمانی

حضرت عمرؓ کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ ایک صحابی حضرت عمرؓ کے دسترخوان بچھنے کے وقت عموماً رہا کرتے، لیکن حضرت عمرؓ کے کھانے میں شریک نہ ہوتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے ان سے سوال کیا کہ تم کبھی ہمارے کھانے میں شریک نہیں ہوتے اس کا سبب کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا انّ طعامک خشنٌ غلیظٌ آپ کا کھانا بہت موٹا جھوٹا ہے میں نرم و ملائم غذا کا عادی ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں چاہوں تو روزانہ آرام و راحت کا کھانا لذیذ پُر تکلف غذا کھا سکتا ہوں میرے لئے یہ کچھ مشکل نہیں ہے کہ بکری کا گوشت پکے اور باریک میدے کی پتلی روٹیاں بنیں اور منقّیٰ اور گھی کا مزے دار مشروب تیار ہو۔ یہ سُنکر حفصؓ نے کہا آپ لذیذ اور نفیس کھانوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بے شک خوب جانتا ہوں لیکن میں عیش کی زندگی گذارنا نہیں چاہتا (منتخب کنز العمال جلد چہارم ص ۴۰۲ و طبقات طبری الشعرانی جلد اوّل ص ۱۶ و سیرت عمر لابن الجوزی ص ۱۱۹)

(۳) اسی طرح ایک اور شخص نے حضرت عمرؓ کے معمولی اور موٹے کھانے کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بیت المال کا اگرچہ میں مالک ہوں، مگر اس کی ملکیت میری اپنی ذات کیلئے نہیں ہے۔ میری مثال ان چند مسافر ساتھیوں کی ہے جنھوں نے اپنے اپنے زادِ راہ کو ایک معتبر ساتھی کے سپرد کیا ہے کہ ان سب کے حسب ضرورت ان سب کے لئے خرچ کرے تو کیا یہ جائز ہوگا کہ ان کے خرچ میں سے کچھ اپنے لئے بچا کر مخصوص کرے قال لا یا امیر المومنین قال کذالک مثلی ومثلہم اس نے کہا نہیں اے امیر المومنین۔ فرمایا بس میری اور امت مسلمہ کی یہی مثال ہے۔ (منتخب کنز العمال جلد چہارم ص ۴۰۳ بحوالہ ابن عساکر و سیرت عمر ص ۹۹ والسیاستہ الشرعیہ لابن تیمیہ ص ۱۰۱)

(۴) سفر شام سے واپسی میں ایک دہقان نے آپکی دعوت کردی اور خواہش کی کہ میرے گھر تشریف لاکر کھانا کھائیں۔ پوچھا تیرے گھر میں تصاویر ہوں گی؟ اُس نے کہا ہاں۔ فرمایا تم جاؤ کھانا یہیں بھیجدینا لیکن دیکھنا صرف ایک کھانا بھیجنا طرح طرح کی چیزیں ہرگز نہ بھیجنا۔ (منتخب کنز العمال جلد چہارم ص [illegible])

۵۔ اور تو اور جب سفرِ شام میں آپ تشریف لے گئے تو اس وقت بھی آپ کے جسم پر بارہ پیوند والے کپڑے تھے آپ نے کوئی تکلف اس سفر کے لئے نہیں کیا۔ حالانکہ یہ سفر ایک انتہائی اہم سفر تھا۔ ایک ایسے حکمراں کا سفر تھا جس کی سطوت و عظمت کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اسلام کے سچے خادم اور اللہ کے پاکباز بندے فاروق عمرؓ نے اس میں بھی وہی لباس زیب تن کیا جس میں چودہ پیوند تھے پھر لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے سفید مصری کپڑے پہنے اور ایک رومی گھوڑے پر سوار ہوئے لیکن پھر فوراً اتر پڑے اور فرمانے لگے اس کے استعمال سے مجھے تکبر اور تفاخر کی بُو آتی ہے خدا میری لغزش کو معاف کرے لاؤ میرے وہی پیوند والے کپڑے لاؤ چنانچہ وہی پہنکر بطریق (پادری) کے پاس تشریف لے گئے ابوعبیدہ بن جراح نے اہل قلعہ کو پکارا کہ امیر المومنین آگئے منّ البطرك عنقه ونظر اليه فزعق زعقة وقال هٰذا هو الذی صفته ونعتهٗ فی كتبنا۔ یعنی آپ کو دیکھکر بڑے پادری نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہنے لگا کہ ہماری کتابوں میں فاتح بیت المقدس کا جو حلیہ تھا وہ حلیہ اس خلیفہ میں موجود ہے۔ بیت المقدس کا دروازہ کھول دو (ثمرات الاوراق علی حاشیۃ المستطرف جلد ثانی ص۱۰)

۶۔ آپ کے پیوند والے لباس کا سلسلہ کسریٰ و قیصر کے ممالک کے مفتوح ہو جانے اور مشرق و مغرب اور عرب و عجم کے مطیع ہو جانے کے بعد بھی قائم تھا صحابہ کرام نے اکابر صحابہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ وغیرہ کو عرض کیا کہ آپ لوگ اس بارے میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کریں۔ ان حضرات نے فرمایا کہ ہماری مجال نہیں حضرت علیؓ گفتگو کر سکتے ہیں پھر حضرت علیؓ نے کہا میری بھی ہمت نہیں البتہ ازواج مطہرات میں سے صرف حضرت عائشہؓ و حفصہ رضی اللہ عنہما یہ گفتگو کر سکتی ہیں جب یہ حضرات ہمت کر کے پہنچیں اور فتوحات اسلام اور بیت المال کی ترقی کی تعریف کر کے کہنے لگیں۔ وفود العرب والعجم یردون علیك وعلیك هٰذه الجبة قد رقعتها اثنتی عشرة رقعة عرب و عجم کا وفد آتا رہتا ہے اور آپ اسی جُبّہ کو پہنکر ان سے ملتے ہیں جس میں بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے ہیں پس آپ ملائم اور خوشنما کپڑا پہنیں اور اچھی طرح کھائیں پئیں اور آنے والوں کو کھلائیں۔ حضرت عمر فاروقؓ یہ سنکر رو دئے اور کہنے لگے آپ حضرات ام المومنین ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے اور کپڑوں میں سادگی کا حال آپ کو معلوم ہے پھر بھی آپ عمرؓ کو دنیا کی لذائذ کی رغبت دلاتی ہیں یہ کہتے ہوئے آپ کے چہرے پر رنج و تأسف کے ایسے پرسوز آثار نمایاں ہوئے کہ امہات المومنین خود بھی رونے لگیں (احیاء العلوم جلد۴ ص۲۲۶ و منتخب کنز العمال جلد۴ ص۴۱۵)

حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے فرمایا بس قوت لا یموت یعنی قریش کے ایک عام آدمی کے برابر غلہ اور حج وغیرہ کا خرچ اور سردی اور گرمی کے لئے دو حلّے (دو جوڑے) ہمارے لئے کافی ہیں۔ (طبقات ابن سعد جلد سوم ص۱۹۸ و تاریخ الخلفاء ص۶۰ و سیرت عمرؓ ص۹۵ و احیاء العلوم للغزالی جلد ثالث ص۲۳۶)

۷۔ حضرت عمرؓ کفایت شعاری اور سادہ زندگی گذارنے کی تعلیم و تلقین بھی فرمایا کرتے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ ایک عمدہ قمیص پہنے ہوئے ہے فرمایا بکم اخذت قمیصك یہ کرتہ کتنے میں خریدا اس نے جواب دیا کہ ۱۲ درم میں خریدا ہے فرمایا اگر کوئی چھ درم والا خرید لیتے تو کیا حرج ہوتا اور پھر باقی چھ درم تمہارے دوسرے کام آجاتے (منتخب کنز العمال جلد اول ص۱۴۱) اسی طرح عام کھانے پینے میں کفایت کا حکم دیتے تھے علامہ شعرانی کہتے ہیں کل من رآه یشتری لحماً یومین متتابعین یضربه جب کو مسلسل دو دن گوشت خریدتے ہوئے دیکھتے آپ درّے سے مارتے اور فرماتے هلا طویت بطنك لجارك وابن عمك یعنی اپنے کام و دہن کی لذتوں پر اپنے ہمسایوں اور عزیز و اقارب کی خدمت کو کیوں نہیں مقدم رکھتے یعنی یہ پیسہ بچا کر اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں پر ہی خرچ کرنا چاہئے تھا (طبقات کبریٰ جلد اول ص۱۶ موطا امام مالک مع مسوی جلد ثانی ص۱۵۷)

۸۔ حضرت عمرؓ اپنے سالاران لشکر کو لکھا کرتے تھے کہ سادہ زندگی اختیار کرو موٹا پہنو موٹا کھاؤ سخت کوشی کی عادت ڈالو دھوپ میں بیٹھو گھوڑے کی پیٹھ پر کود کر سوار ہو اور اقتصاف

الاشراف بلاذری بحوالہ حضرت عمر کے سرکاری خطوط صفحہ ۲۳۳)

ایک بار حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے عبد اللہ کو گوشت کھاتے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے کہا آج گوشت کھانے کو طبیعت چاہ رہی تھی پہلے تنبیہ فرمائی پھر ارشاد ہوا۔ کفی بالمرء سرفاً ان یاکل کل ما اشتھاہ یعنی آدمی کے اسراف اور فضول خرچ ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر چیز کھایا کرے جو اس کا جی چاہے (منتخب کنز العمال جلد چہارم صفحہ ۴۱۴)

۹۔ عبد الوہاب شعرانیؒ حضرت فاروق اعظم کی سیرت میں لکھتے ہیں وکان رضی اللہ عنہ لا یجمع لی سماطہ بین ادامین یعنی کبھی اپنے دسترخوان پر دو قسم کا سالن نہیں جمع ہونے دیتے ایکبار آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے آپ کے پاس بطور تحفہ کچھ گوشت کا سالن بھیجا اس میں زیتون بھی ڈال دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ دو طرح کا سالن میں نہیں کھایا کرتا الفاظ یہ ہیں۔ ادامان فی اناء واحد لا اکلہ حتی القی اللہ مطلب یہ کہ گھی بھی ایک مستقل سالن ہے تو دو سالن کی کیا ضرورت ہے (طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول صفحہ ۱۸، منتخب کنز العمال جلد چہارم صفحہ ۴۱۷، تاریخ الخلفاء صفحہ ۹۶ و تہذیب الاسماء للنوویؒ جلد ثانی صفحہ ۶)

ایک بار آپ کے پاس کسی نے تازہ اور فربہ گوشت اور دودھ کھانے کے لئے پیش کیا۔ فرمایا ان میں سے ہر ایک مستقل سالن ہے میں دو سالن ایک وقت میں نہیں کھا سکتا یہ کہکر آپ نے کھانے سے انکار کر دیا (سیرت عمرؓ لابن الجوزی صفحہ ۱۱۱)

اعلام! یہ ساری سخت کوشی، زہد، پرہیزگاری اور قناعت صرف اپنی ذات کی حد تک تھی یا پھر اہل وعیال کے معاملہ میں لیکن اپنے عاملوں کیلئے اچھی خوراک کا انتظام فرماتے تھے علامہ شبلیؒ اس کی توجیہ میں لکھتے ہیں ان الحالۃ التی ھو علیھا لو کان غیرہ علیھا لھان فی نفوس الناس ولم یجرموا یعنی حضرت عمرؓ نے اگرچہ اپنے لئے نمک روٹی رکھا لیکن دوسرے عمال کے لئے روزانہ نصف بکری کا راشن مقرر کیا تھا تاکہ عمال اور حکام کی عزت افزائی ہو اور لوگوں کے قلوب میں ان کا احترام اور ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو اور اس کے ذریعہ انتظام مملکت درست و محفوظ رہے (کتاب الاعتصام جلد اول صفحہ ۲۴۸)

کپڑوں کی سادگی! کپڑوں کے استعمال میں یہی حال تھا کہ دو کپڑے تن ڈھانکنے کے لئے برابر میسر نہ تھے ایک بار حضرت عمرؓ جمعہ میں دیر سے تشریف لائے اور لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا انما حبسنی غسل ثوبی ھذا ولم یکن لی ثوب غیرہ (سیرۃ عمرؓ صفحہ [illegible]) یعنی مجھے اسلئے دیر ہوئی کہ جو کپڑے میرے جسم پر ہیں انھیں دھو رہا تھا۔ ان کے علاوہ کوئی جوڑا میرے پاس نہیں ہے۔

۱۰۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمرؓ جمعہ میں دیر سے تشریف لائے اور دو کپڑے پہنکر آئے وہ دونوں نئے تھے جب منبر پر تشریف لائے اور لوگوں نے آپ کو دو نئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا سب کو آپ نے ایک ایک کپڑا تقسیم کیا ہے آپ کو یہ دو کپڑے کیسے مل گئے؟ فرمایا بات یہ ہے کہ میرے پاس صرف ایک ہی کپڑا تھا جو آج عام مسلمانوں کے برابر مجھے بھی ملا ہے دوسرا کپڑا مطلق نہیں تھا پھر اپنے بیٹے عبد اللہ کو مخاطب کرکے فرمایا وہ کپڑا جسے ہم نے ازار بنالیا ہے کیا وہ تمہارے حصہ کا کپڑا نہیں ہے انھوں نے کہا اللھم نعم جی ہاں وہ میرا ہی کپڑا ہے (صفۃ الصفوۃ جلد اول صفحہ ۲۱۶ و سیرت عمرؓ لابن الجوزی صفحہ ۱۲۷) اس سے معلوم ہوا کہ دور خلافت میں مسلسل دو کپڑے بھی ان کو میسر نہ تھے۔

۱۱۔ ابو عثمانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے ایک ایک کرتہ میں بارہ بارہ پیوند لگے تھے (البدایہ والنہایہ جلد سابع صفحہ ۱۳۳ و اشہر مشاہیر الاسلام جلد اول صفحہ ۲۷۴) ان میں سے بعض بعض مختلف رنگ کے ہوتے اور بعض پیوند چمڑے کے بھی ہوتے تھے (سیرت عمرؓ صفحہ ۱۲۰، طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول صفحہ ۱۸، مروج الذھب جلد ثانی صفحہ ۳۱۳ و احیاء العلوم للغزالی جلد رابع صفحہ ۲۳۵)

۱۲۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے زمانہ خلافت میں حضرت کو خطبہ کی حالت میں دیکھا کہ وہ جس تہبند کو استعمال

فرماتے ہوئے دیکھا جس میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے (منتخب کنزالعمال جلد چہارم ص۴۰۶ وسیرۃ عمرؓ ص۱۲۰ وتاریخ الخلفاء ص۹۸)

۱۳ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کے مونڈھے پر تین پیوند دیکھے جو ایک دوسرے کے قریب لگے ہوئے تھے اور پورے کرتہ میں چودہ پیوند تھے (تہذیب الاسماء جلد ثانی ص۱۶ منتخب کنزالعمال جلد چہارم ص۴۰۶ وسیرۃ عمرؓ ص۱۲۰) وموطا امام مالک مع مسوی جلد ثانی ص۱۴۲ وموطا امام محمد مطبوعہ کراچی ص۴۲۵)

۱۴ ایک بار حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ یزید بن ابی سفیان کے دسترخوان پر طرح طرح کا کھانا کھایا جاتا ہے اپنے غلام یرفاء سے کہا کہ جس وقت یزید کھانا کھانے کے لئے بیٹھے مجھے اطلاع دو چنانچہ حضرت عمرؓ اطلاع پاتے ہی اُن کے مکان پر پہنچے اور سلام مسنون فرما کر اندر داخل ہوئے تو انھوں نے کھانے میں حضرت عمرؓ کو بھی شریک کیا روٹی اور گوشت تو کھا لیا پھر بھنا ہوا گوشت کا پیالہ جب اندر سے آیا تو یزید نے اُسے بھی کھانا چاہا حضرت عمرؓ نے ہاتھ روک لیا اور اُن کو بھی باز رکھا اور فرمایا ایک طرح کے سالن کے بعد دوسرے رنگ برنگ اور طرح طرح کے سالن سُنت نبوی کے خلاف ہیں (کتاب الاعتصام جلد اول ص۲۱۴ منتخب کنزالعمال جلد چہارم ص۴۰۲ احیاء العلوم جلد ثالث ص۹۰

۱۵ حضرت علیؓ نے اپنے ایک عامل عثمان بن حنیف کو رنگ برنگ اور طرح طرح کے سالنوں کے استعمال سے منع کیا اور فرمایا کہ تم ان محتاجوں اور غریبوں کو دیکھو جو ایک طرح کے سالن سے بھی محروم ہیں (نہج البلاغہ جلد ثالث ص۷۴

۱۶ ہرمزان کسریٰ شاہی خاندان میں معزز حکمراں تھا جب گرفتار ہو کر مدینہ ایک وفد کی معیت میں بھیجا گیا تو اس میں حضرت انسؓ اور احنف بن قیسؓ بھی تھے جب ہرمزان مدینہ سے قریب ہوا تو اس سے وفد نے کہا کہ اپنا شاہی لباس اور تاج وغیرہ پہن لے تاکہ اہل مدینہ اسے دیکھکر عبرت پذیر ہوں جب وفد ہرمزان کو لیکر مدینہ میں داخل ہوا اس نے مسجد نبوی میں حضرت عمرؓ کو سوتا ہوا پایا ہرمزان نے پوچھا کہ حضرت عمرؓ کہاں ہیں وفد نے کہا یہ دیکھو سو رہے ہیں ہرمزان اسکی سادہ زندگی کو دیکھکر حیران ہو کر پوچھتا ہے ان کے حرس و حُجّابہ اس کے باڈی گارڈ اور مصاحب وغیرہ کہاں ہیں؟ کیونکہ ہرمزان اِن چیزوں کے بغیر کسی بادشاہ کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا لوگوں نے کہا یہ سب لوگوں میں آزادانہ رہتے ہیں۔ پہرہ چوکی نہیں رکھتے۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ جاگے۔ معلوم کیا کہ یہ ہرمزان ہے حضرت عمرؓ نے اس سے کچھ سوال کیا اُس نے کہا جواب دیتا ہوں۔ پہلے مجھے پانی پلا ئیے اس نے کہا ایسا نہ ہو کہ پانی پینے سے پہلے آپ مجھے قتل کرادیں۔ آپ نے فرمایا لا باس علیک (تمہیں خوف مت کرو) اس کے بعد پیالہ میں پانی آگیا اس کے شاہی مزاج اور شاہی نفاست نے اس پیالہ کو دیکھ کر کہا لو مِتُّ عَطَشًا لم استطع اَنْ اَشْرَبَ فی مثل ھٰذا القدح (ایسے بھدّے پیالے میں سے پانی نہیں پی سکتا خواہ پیاس سے میری جان جاتی رہے پھر ایک پاکیزہ اور پسندیدہ برتن میں پانی آیا اس نے کہا پانی پینے میں نہ مارا جاؤں چونکہ یہ کئی بار بدعہدی کرچکا تھا اسلئے بار بار ڈرتا تھا حضرت عمرؓ نے فرمایا لا باس علیک حتّٰی تشربہ۔ جب تک پانی نہ پی لو تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں اس نے کہا اب میں پانی نہ پیوں گا آخر حضرت عمرؓ نے جان بخشی کی اور وہ اسلام لے آیا۔ (اشہر مشاہیر الاسلام جلد اول ص۳۲۹) اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کی سادہ زندگی اور درویشانہ طرز معیشت کا حال اچھی طرح واضح ہے کہ ایسے معمولی اور سادہ برتنوں میں گذر اوقات فرماتے تھے جکو امراء زمانہ ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کریں۔ حالی مرحوم نے خلفاء کرام کی سادہ زندگی کا کیا خوب نقشہ اپنی مسدس کے ایک بند میں پیش کیا ہے ؎

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت
نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت
فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

۱۶ ۔ حضرت عمرؓ نے معمولی خرچ کے ساتھ سفر حج بھی ادا کیا چنانچہ مکہ سے مدینہ آنے جانے میں آپ نے کل سولہ دینار خرچ کئے پھر بھی یہ احساس تھا کہ ہم نے اس سفر میں بہت زیادہ خرچ کر دیا۔ (مروج الذہب جلد ثانی ص ۳۲۳)

۱۷ کھانے اور کپڑے میں حضرت عثمانؓ بھی کفایت شعار اور سادگی پسند تھے مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ جمعہ کے روز منبر پر حضرت عثمانؓ کو دیکھا گیا جو موٹا تہبند آپ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت چار پانچ درم یعنی سوا روپے سے زیادہ نہ تھی۔ (مستدرک حاکم جلد سوم ص ۹۶)

علامہ شعرانی لکھتے ہیں کہ عدن کا بنا ہوا ایک تہبند آپ کے استعمال میں رہتا جسکی قیمت چار پانچ درم سے زیادہ نہ تھی یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپ خلیفہ تھے اور یہی حال کھانے کا تھا لوگوں کو بہترین کھانا کھلاتے اور خود گھر میں جا کر روزمرہ کا کھانا یعنی روٹی کو سرکہ یا زیتون سے کھاتے (طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول ص ۱۸ و منتخب کنز العمال جلد پنجم ص ۱۲)

۱۸ حضرت علیؓ کی سادہ زندگی تو مشہور ہی ہے ایک واقعہ علامہ ابو عبید قاسم بن سلام نقل کرتے ہیں کہ موسم سرما میں وہ ایک بہت پرانی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہے تھے کسی نے اعتراض کیا فرمایا بس یہی موٹی اور سادی چادر مجھے میسر ہوسکتی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری چادر مرے گھر میں نہیں (کتاب الاموال ص ۲۷)

۱۹ علامہ شعرانی لکھتے ہیں کہ کسی نے کہا آپ کیوں جاڑے سے کانپ رہے ہیں الا تاخذ کساءً من بیت المال بیت المال سے کوئی کمبل کیوں نہیں لے لیتے فرمایا لا انقص المسلمین من بیت مالھم شیئًا یعنی اپنے آرام وراحت کے لئے میں مسلمانوں کے بیت المال میں سے کچھ کم نہیں کرنا چاہتا ہوں (طبقات کبریٰ للشعرانیؒ جلد اول ص ۱۸)

۲۰ علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ عبد اللہ ابن ابی ہذیلؒ نے کہا کہ میں نے حضرت علیؓ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک موٹا کرتہ تھا جو پہنا ہوا ہونے کے ساتھ اسقدر تنگ اور چھوٹا تھا کہ آستین کھینچتے تو ناخن تک پہنچ جاتا اور جب چھوڑتے تو آدھے بازو تک پہنچ جاتا (استیعاب جلد ثانی ص ۴۶۵ و منتخب کنز العمال جلد پنجم ص ۵۸)

ایک بار تو یہ حال گذر گیا کہ منبر پہ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کوئی اس تلوار کو خرید لے تو میں اس کی قیمت سے ایک تہبند خرید لوں گا فلو کان عندی ثمن ما بعتہ اگر میرے پاس تہبند خریدنے کو دام ہوتے تو میں اس محبوب تلوار کو نہ فروخت کرتا یہ حالات اس وقت کے ہیں جب آپ خلیفہ تھے (استیعاب جلد دوم ص ۴۶۵ و احیاء العلوم جلد ثانی ص ۲۲۱)

۲۱ حضرت عمرو بن قیس کا بیان ہے کہ میں نے ان کے تہبند کو دیکھا اس میں متعدد جگہ پیوند لگے ہوئے تھے کسی نے کچھ کہا تو فرمایا ایسے کپڑوں سے دل میں عاجزی پیدا ہوتی ہے (منتخب کنز العمال جلد پنجم ص ۵۷)

۲۲ حضرت علیؓ کھانا بھی موٹا جھوٹا کھاتے تھے علامہ شعرانی لکھتے ہیں کان یعجبہ من اللباس ما قصر ومن الطعام ما خشن یعنی کپڑا کم وسعت والا پسند کرتے تھے اور کھانا موٹا جھوٹا (مروج الذہب جلد ثانی ص ۴۳۳ و مستدرک جلد اول ص ۱۴۷) آپ کا کپڑا تہبند وغیرہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ آنے کا ہوتا (تہذیب الاسماء جلد اول ص ۳۴۹ و احیاء العلوم جلد ثالث ص ۲۳۳)

آپ جب کوفہ تشریف لے گئے تو باوجود اس کے کہ عراق میں انواع واقسام کے کھانے تھے کبھی آپ نے مختلف قسم کا کھانا نہ کھایا ایک دن آپ کے سامنے فالودہ پیش ہوا تو فرمایا خوشبودار ہے خوش رنگ ہے خوش ذائقہ بھی ہوگا لیکن اکرہ نفسی ان اعود مالم تعتد ولم یاکل یعنی اپنے نفس کو ایسے چیزوں کا عادی بنانا نہیں چاہتا ہوں جس کا اب تک عادی نہ تھا یہ کہکر کھانے سے انکار فرمایا (منتخب کنز العمال جلد پنجم ص ۵۵ و احیاء العلوم جلد ثانی ص ۳۶)

۲۳ حضرت علیؓ نے ایک بار عاصم نامی ایک شخص کو ڈانٹا کہ تم نے ٹاٹ و کمبل وغیرہ پہن کر اور لذیذ کھانوں کو چھوڑ کر ایسی

سخت زندگی کیوں اختیار کی عاصم نے جواب دیا فما بالك فی خشونة مآکلك وخشونة ملبسك یعنی تو پھر آپ نے اپنے کھانے کپڑے میں کیوں ایسی تنگی اختیار کی ہے حضرت علیؓ نے فرمایا میرا حال تم سے جدا ہے خداوند کریم نے امراء و خلفاء پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ غریب عوام جیسی زندگی گذاریں اور عیش و راحت کی پر تکلف معاشرت کے ذریعہ خود کو عوام سے ممتاز و برتر نہ بنالیں (کتاب الاعتصام للشاطبی جلد۲ ص۵۵م)

۲۴ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز کی سادگی کا عجب عالم تھا کہ جب آپ تخت نشینِ خلافت ہوئے تو شاہی غالیچوں، قالینوں، گدّوں شطرنجیوں، مسندوں میں سے کسی چیز کو استعمال نہ فرمایا بلکہ صرف ایک نمدہ بچھا کر بیٹھ گئے (طبقات ابن سعد جلد خامس ص۲۵۱)

پھر سواری کے لئے شاہی سواریاں پیش کی گئیں آپ نے انکار فرمایا یا قَنِّ موا الیّ بَغْلتِی میرا خچر میری سواری کیلئے کافی ہے تمام ساز و سامان اور قیمتی گھوڑوں کے بارے میں فرمایا کہ ان سب کو فروخت کر کے ان کے دام بیت المال میں داخل کرلو۔

۲۵ ایک بار آپ بیمار ہوئے تو کئی دن تک ایک ہی کپڑا آپ کے جسم پر رہا جو میلا ہوگیا تھا حضرت کے اقرباء نے آپکی بیوی فاطمہ سے کہا کہ آج امیر المومنین کو کچھ افاقہ ہے کپڑے بدل دو لوگ ملاقات و عیادت کے مشتاق ہیں کپڑے بدل جانے کے بعد ہم ان کو ملاقات کا موقع دیدیں وہ خاموش بیٹھی رہیں پھر جب دوبارہ کہا گیا تو فرمایا واللّٰہ ماله غیرہ یعنی خدا کی قسم دوسرا کپڑا ان کے پاس موجود نہیں ہے (طبقات ابن سعد جلد خامس ص۲۹۷ و سیرت عمر بن عبد العزیز مولفہ ابن عبد الحکم ص۴۸ البدایہ والنہایہ جلد ص۲۱۴)

۲۶ علامہ شعرانیؒ اپنے طبقات میں لکھتے ہیں کانت غلته خمسین الف دینار فلما ولی الخلافة صار ینفقها کل حین حتی ما بقی له غیر قمیص و احد لا یخلعه حتی یتسخ فاذا اتسخ غسله و مکث فی البیت حتی یجف (طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول ص۳۰)

یعنی آپ کی ذاتی آمدنی خلافت سے پہلے پچاس ہزار اشرفی سالانہ تھی لیکن خلافت کے بعد ہی ان رقموں کو ضعفائے اسلام میں اس طرح خرچ کرتے رہے کہ بجز ایک قمیص کے اور کوئی دوسرا کپڑا آپ کے پاس نہ ہوتا جسکو میلا ہونے تک برابر پہنتے رہتے میلا ہونے پر دھو لیتے اور خشک ہونے تک گھر میں ٹھہرے رہتے کیونکہ دوسرا کپڑا نہ ہوتا جسے پہنکر باہر آتے اور یہ کرتہ زیادہ سے زیادہ چار درم (عہ) کا ہوتا (البدایہ والنہایہ جلد تاسع ص۲۰۲ و مراۃ الجنان جلد اول ص۲۱۱)

میمون بن مہران کا بیان ہے کہ میں عمر بن عبد العزیز کے پاس چھ مہینہ رہا ان کے جسم پر صرف ایک چادر دیکھی جسکو جمعہ تک پہنتے رہتے اور جمعہ کو دھویا کرتے کان یغسله بنفسه من الجمعة الی الجمعة (تہذیب الاسماء جلد ثانی ص۲۳)

حالانکہ خلافت سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیز کے ذوق و مزاج کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ تیز خوشبو کے عطر استعمال کرتے، جب ہوا اڑتی اور خوشبو پھیلتی تو لوگ سمجھ جاتے کہ ادھر سے عمر بن عبد العزیز گذر رہے ہیں شہزادگی کے زمانے میں امیر عبد الملک کی طرف سے ہزار دینار کا وظیفہ جاری تھا (سیرت عمر بن عبد العزیز مؤلفہ عبد اللہ بن عبد الحکم ص۲۱)

سادی غذا

حضرت عمر بن عبد العزیز کی غذا بھی خلافت کے بعد نہایت سادی تھی ایک بار آپ کی پھوپی آئیں کھانے میں صرف خشک روٹی اور نمک اور زیتون کا تیل تھا نصیحت کرنے لگیں اس سے ذرا بہتر کھانا کھائیے فرمایا لیس عندی یا عمة اس سے بہتر کا ہمارے پاس انتظام نہیں (سیرت عمر بن عبد العزیز ص۶۲)

انگور آپ کو بے حد مرغوب تھے خریدنے کے لئے بیوی سے کچھ قرض مانگا انہوں نے کہا میرے پاس بھی نہیں جب آپ کے پاس خلیفہ ہو کر نہیں تو میرے پاس کہاں سے ہوگا؟ فرمایا آخرت کا عذاب سامنے ہے ورنہ خلافت میں تو بہت مال و زر ہے (البدایہ جلد تاسع ص۲۰۲)

ایک بار حضرت عمر بن عبد العزیز کے بھائی زبان بن عبد العزیز

آپ کے پاس گئے شام کا کھانا دیکھا کہ صرف مسور کی دال اور پیاز پر گذر ہو رہا ہے روٹی وغیرہ ندارد نصیحت کرنے لگے عمر ابن عبدالعزیز نے فرمایا زبان بند کرو آئندہ میں کبھی اپنے راز کا افشانہ کروں گا یعنی ایسا موقع نہ دوں گا کہ میرے بے تکلف کھانوں کو کوئی دیکھ سکے (سیرت عمر عبدالعزیز ص۱۴۱ البدایہ والنہایہ جلد تاسع ص۲۰۹ وتاریخ الخلفاء ص۱۵۵)

۲۷ ایک راوی کا بیان ہے کہ بحالت خلافت جب آپ خطبہ دے رہے تھے تو دیکھا گیا کہ آپ کے کُرتہ کا گریبان اور سامنے کے حصہ میں پیوند لگے ہوئے ہیں (طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول ص۲۵ وتذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۱۱۳)

دور خلافت سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے چار چار سو دینار اور ہزار ہزار دینار کے کپڑے خرید کرآتے تو فرماتے بہت موٹا اور بہت گاڑھا ہے لیکن خلافت کی ذمہ داریوں کے بعد جب دس بارہ درم کا کپڑا آتا تو فرماتے بہت نرم و ملائم کپڑا ہے۔

(تہذیب الاسماء جلد ثانی ص۲ والبدایہ والنہایہ جلد تاسع ص۲۰۲ ومروج الذھب للمسعودی جلد ثانی ص۱۹۶)

ایک بار آپ نے آٹھ درم کا کپڑا منگایا جب اُسے دیکھا تو فرمایا بہت ملائم ہے ایک آدمی ہنسنے لگا فرمایا تو بلا وجہ ہنستا ہے کیا احمق ہو گیا ہے؟ اس نے کہا نہیں بات یہ ہے کہ جب آپ شہزادے تھے تو میں ہی آٹھ سو درم کا ایک کپڑا ریشمین آپ کے لئے لایا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ بہت موٹا ہے اور آج آٹھ درم والے کپڑے کو بہت ملائم کہہ رہے ہیں (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۴۰)

یہی حال آپ کے بچوں کا تھا ان کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے نظر آتے تو فرماتے رقعوا قمیصک یا بُنَیَّ اے میرے بیٹے اپنے کرتہ پر پیوند لگا میں آج سب سے زیادہ محتاج ہوں (الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ الدینوری جلد ثانی ص۱۲۴)

۲۸ علامہ شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار آپ نے ایک صاحبزادی کو آواز دی وہ حاضر نہ ہوئی تو آپ نے ایک خادم کو بھیجا کہ بلا کر لاؤ جب وہ آئیں تو پوچھا مَا مَنَعَکِ اَنْ تُجِیبِنِی فقالت انی عریانۃ یعنی میرے پکارنے پر تم کیوں نہ آئیں انھوں نے جواب دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ تھا نہیں کس طرح آسکتی تو ایک موٹے کپڑے کی طرف اشارہ کیا اور اسے ان کے استعمال کے لئے دیا (طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول ص۲۹)

۲۹ امام ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ لکھتے ہیں کہ جب بوقت وفات اپنے بچوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بلایا تو وہ تیرہ یا چودہ لڑکے تھے تنظر الیھم وقد لبسوا الخشن من قباطی مصر فاغرورقت عیناہ بالدموع (احیاء العلوم جلد ثالث ص۲۲۵ الامامۃ والسیاسۃ جلد ثانی ص۱۳ البدایہ والنہایہ جلد تاسع ص۲۱۴)

یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مصر کے عوامی قبطی کپڑے یعنی موٹے جھوٹے کپڑے سب کے بدن پر تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔

آئینہ حقیقت نما

مصنفہ :- مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی

ہندو اور مغربی مورخین گذشتہ برسوں سے ہندوستان پر مسلم فاتحین کے حالات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر پیش کر رہے تھے اور مسلمان حکمرانوں کی ساری خوبیاں خرابیاں ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں مورخ اسلام نے محققانہ قلم اُٹھایا اور تمام الزامات کا مدلل اور دندان شکن جواب تاریخ کی روشنی میں لکھا جو "آئینہ حقیقت نما" کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب حیرت انگیز تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔ قیمت مکمل مجلد بارہ روپے۔

البرامکہ

مصنفہ :- مولانا عبد الرزاق کانپوری

عالم اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کون تھے، انھوں نے عہدِ عباسیہ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان دانشور اور مدبّر وزیروں کے عروج و زوال کی حیرت انگیز و عبرت انگیز داستان۔ مکمل مجلد بارہ ۱۲ روپے۔

سفینۃ الاولیاء

دارا شکوہ کی مشہور و مستند کتاب سفینۃ الاولیاء کا سلیس و بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں آنحضرت سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین و امام اعظم ابو حنیفہؒ امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو یوسفؒ، امام مالک بن انسؒ و امام شافعیؒ و ائمہ اثنا عشری و ازواج مطہراتؓ و اسلام کی مشہور و نیک خواتین اور اولیاء کرامؒ کے جامع حالات از تاریخ ولادت تا تاریخ وفات کو مستند ماخذوں سے جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد چھ ۶ روپے بارہ آنے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ

حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور ان کے فکر و نظر کی تشریح و توضیح از :- علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ قیمت مجلد چار روپے پچاس نئے پیسے۔

مقالات جمال الدین افغانیؒ

چودھویں صدی کے مجدد اور مفکر جمال الدین افغانیؒ کے زندگی افروز، ولولہ انگیز، روح پرور، عزم آفرین اور داعیانہ عربی خطبات و مقالات کا شستہ اُردو ترجمہ

قیمت مجلد چار روپے

نظام الملک طوسی

الپ ارسلان کے وزیر کبیر ابو علی حسن بن علی کی مبسوط سوانح عمری۔ قابلِ اعتماد تاریخی مواد۔ مؤلفہ :- مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ قیمت بارہ ۱۲ روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات

تاریخ کے بعض دلچسپ اہم اور تعجب خیز واقعات کا عبرت آموز بیان۔ قیمت تین ۳ روپے۔

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیبؒ

مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ (۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء) جس میں شاہجہاںؒ کے آخری دور کا حال، اورنگ زیبؒ کی بھائیوں سے کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پس پردہ واقعات اور اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت مجلد بارہ ۱۲ روپے

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

دنیائے عرب کے مشہور عالم و محقق استاذ ابو زہرہ کی بیش بہا عربی تصنیف کا نفیس اُردو ترجمہ۔ امام ابن تیمیہؒ پر سب سے جامع، مبسوط اور سیر حاصل کتاب۔ ضخیم اور وسیع۔

قیمت مجلد اکیس ۲۱ روپے۔

رسائل و مسائل

گوناگوں دینی و علمی سوالات کے جو مدلل اور مفکرانہ جوابات مولٰنا مودودی وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں ان کے مجموعے کا نام رسائل و مسائل ہے۔ نکتہ رسی، زورِ استدلال، فہم و بصیرت، تدبر و تفقہ اور فصاحت و بلاغت کا گنجینہ۔ مکمل دو حصے۔

قیمت بارہ روپے

تفسیر سورۃ والتین

از :- مولانا ابو الکلام آزادؒ۔ ہدیہ چھ آنے

اُردو فارسی ڈکشنری ۷/۰ – اُردو سے فارسی بنانے کیلئے ایک مختصر لیکن اہم مفید ڈکشنری - بارہ آنے ● ترجمان فارسی - ایک روپیہ ● مبتدیوں کی تجویز

۵ ... ● بھارت کے تہوار – ۶۲ پیسے ● بھارت کے تہوار (ہندی میں) ۶۲ پیسے

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجددؒ نے کن حالات میں کس حیرتناک پامردی سے کس نوع کا کارنامۂ تجدید انجام دیا۔ اس بارے میں نہایت مفصل اور بلند پایہ کتاب۔ بہت دلچسپ اور دلنشین۔ قیمت مجلد چار روپے۔

فارابی

تالیف :۔ عباس محمود (مصری)
ترجمہ :۔ رئیس احمد جعفری۔

معلم ثانی۔ حکیم ابونصر فارابی کے فضل وکمال، شخصیت حالات وسوانح، علمی مقام اور تجدید فلسفہ ومنطق کے مفصل اور مستند حالات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

تاریخ اسلام کامل

از:۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

یہ تین جلدوں کی ضخیم تاریخ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قدیم جدید تاریخوں کا نچوڑ سمجھیے۔ اسلام کی اس سے زیادہ جامع معتبر اور نفیس تاریخ اردو میں کوئی نہیں۔ روشن کتابت و طباعت، سفید کاغذ، حسین گرد پیش۔ تین جلدیں الگ الگ مجلد قیمت چھتیس ۳۶ روپے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ مکمل

مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے عربی سفر نامے کا شگفتہ ترجمہ۔ جناب رئیس احمد جعفری کے قلم سے

سفرنامہ ابن بطوطہ کی چند خصوصیات

(۱) دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو (۲) مشرق اور ایشیاء کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس منچلے سیاح کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ (۳) سرزمین مغرب کے بعض مقامات کی بھی ابن بطوطہ نے سیاحت کی (۴) اور اپنے تأثرات ومشاہدات سفر پوری سچائی، بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلم بند کر دیئے۔ قیمت مجلد پندرہ روپے

فقہ الاسلام

اسلامی اصول وقوانین پر ایک عظیم عربی تصنیف۔ جس کا سلیس اردو ترجمہ نہایت سلیقے سے چھاپا گیا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں سے ہر ایک معلوماتِ مفیدہ سے لبریز ہے۔ مجلد بارہ روپے۔

اسلامی معاشیات

از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ۔ اسلام کے معاشی نظام کا ایک تحقیقی مرقع۔ روئے زمین کے مسلمانوں کے قلوب کی پکار کا بر وقت جواب۔ مولانا گیلانیؒ کا مجتہدانہ کارنامہ۔ قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں۔ مجلد بارہ روپے۔

فتنہ انکار حدیث کا منظر و پس منظر

منکر حدیث کے رد میں ایک مبسوط، مدلل اور دلچسپ کتاب۔ ان کے ہر ہر اشتباہ کا جواب ان کے افکار کی پوست کندہ حقیقت اور ان کے موقف کی لغویت کا اثبات۔ پُرلطف اور دلنشیں نقد۔ قیمت مکمل سہ حصہ ساڑھے تیرہ ۱۳ روپے۔

حافظ ابو محمد امام الدین کی مفید تصنیفات

ان کے مطالعہ سے روح ایمان تازہ ہوتی ہے

سچے رسول کی سچی تعلیم ۔۔۔۔۔۔۔ ڈیڑھ روپیہ
حضرت خدیجہؓ ۔۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
حضرت فاطمہ زہرہؓ ۔۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
خاصان خدا کی نماز ۔۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
نماز کے فضائل ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵ آنے
خاصانِ خدا کا خوف آخرت ۔۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
ان چھ کتابوں کی یکجائی قیمت ۔۔۔۔۔۔۔ ساڑھے پانچ روپے

مکتبہ تجلی سے کتابیں منگانا "ایک پنتھ دو کاج" کے مرادف ہے۔ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین بھی اور اپنے محبوب تجلی کی مدد بھی

مستقل عنوان

مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

ہم دونوں ــــــــ یعنی مُلّا اور مُلّائن ــــــــ سفرِ حج کی تیاریاں اس طرح چپکے چپکے کر رہے تھے جیسے کوئی بڑا جرم کرنے جا رہے ہوں۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہم جرم ہی کرنے جا رہے تھے۔ دراصل یہ طے ہوا تھا کہ گھر سے تو حاجیوں ہی کے ساتھ روانہ ہوں گے۔ مگر بمبئی پہنچکر ادھر اُدھر گول ہو جائیں گے اور جب حاجی لوگ حج کر کے واپس ہوں گے تو ان میں رل مل کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گھر لوٹ آئیں گے۔

یہ پارسال کا قصہ ہے۔ مونچھوں پر تاؤ کی بات سن کر مُلّائن نے کچھ ایسی کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا تھا جیسے ان کے مونچھ نہ اُگنے کی ذمہ داری مجھی پر رہی ہو۔ میں سٹپٹا گیا تھا کہ اب وہ پھر سفر منسوخ کرنے کی دھمکی دیں گی۔

"غلط مت سمجھو بیگم" میں نے بیحد شفقت سے کہا "مونچھوں پر تاؤ دینا صرف محاورہ ہے، محاوروں پر تاؤ دکھانا شائستگی کی علامت نہیں ہے۔ ویسے تم چاہو گی تو تاؤ دینے کے لئے تمہیں بھی بمبئی سے مونچھیں خرید دیں گے، وہاں ہر دوکان پر مونچھ ضرور ملتی ہے کیونکہ پتا نہیں کب کسی راہگیر پر ایکٹر بننے کا دورہ پڑ جائے اور ایکٹر بننے کی بسم اللہ میک اپ ہی سے ہوتی ہے۔"

"بس کیجئے" وہ بیزاری سے بولیں "آخر ان تیاریوں سے کیا فائدہ پہلے بھیا سے اجازت لینے کی تو کوئی ترکیب نکالئے۔"

میرے سینے پر گھونسہ لگا۔ واقعی مشکل ترین مسئلہ یہی تھا کہ مُلّائن کے بھیا یعنی ایڈیٹر آف تجلّی سے اس خاص الخاص سفرِ حج کی اجازت آخر کیسے ملیگی۔ وہ یہ تو باور کرنے سے رہے کہ سالے بلند اقبال کو بیٹھے بٹھائے کوئی وظیفہ ہاتھ آگیا ہے۔ وہ ضرور جرح کریں گے کہ تم جو ہر مہینے کا آخری ہفتہ نیم فاقہ کشی میں گذارتے ہو سفرِ حج کے لئے رقم کہاں سے لائے؟

اگر عاجز دستِ غیب کا حوالہ دے گا تو وہ تھپڑ مار دینگے۔ کیونکہ وہابیوں کو غیبی قوتوں پر کم ہی اعتقاد ہوتا ہے۔ اگر کہے گا کہ قرض لایا ہے تو ہاتھوں ہاتھ ان دو کا نداروں کو چڑھا لائیں گے جو ہر مہینے پچھلا حساب دکھا کر سودا نہ دینے کی دھمکی دیا کرتے ہیں اور پھر حضرت موصوف ہی اپنی بہن کے اکلوتے شوہر کی آبرو رکھنے کے لئے کچھ دے دلا کر ان کا منہ جھلستے ہیں۔

پھر آخر کیا کہوں۔ اصلی بات تو کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مُلّا اور مُلّائن دونوں کی مٹی خراب وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اگر معلوم ہو گیا کہ زادِ سفر کا انتظام سید کلیم الدین نے کیا ہے۔

سید کلیم الدین کو تو آپ پہچان گئے ہوں گے۔ وہی جو مدت دراز تک کالو قصائی کہلاتے رہے ہیں۔ یہ کالو فی الاصل کلیم ہی کی تصغیر تھی۔ جب تک یہ ڈنگر کاٹتے رہے تصغیر ہی ان کے لئے مناسب بھی تھی، مگر جب سودی قرض کا لین دین شروع کیا تو چند ہی سالوں میں کالو کلیم سے بدل گیا اور جب ان کا بینک بیلنس لاکھ سے اوپر پہنچ گیا تو اَلدین بھی انگڑائی لیکر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب وہ نہ صرف کلیم الدین تھے بلکہ اس عالی شان بلڈنگ کے دروازے پر جو انھوں نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے اپنی رہائش کے لئے تیار کرائی تھی سیدانیت بھی دربانی کرنے آگئی تھی۔

کیوں وہ مجھے حج کرانے پر آمادہ ہوئے تھے، یہ لطیف نکتہ آپ کے کاسۂ سر میں مشکل ہی سے سمائے گا۔ پھر بھی اس راز کو میں چھپا دس گا نہیں۔ سخت دشواری یہ تھی کہ مُلّائن کے بھیا سے کیسے اجازت ملے۔ بہت سوچا۔ صوفی بدرالدجیٰ سے بھی مشورہ کیا مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے۔

"اماں ہٹائیے بھی۔ سالے سے اتنا ڈرتے ہیں تو چوڑیاں پہنکر بیٹھ جائیے"۔

"پہن سکتا ہوں صوفی صاحب مگر وہ ظالم چوڑیوں پر بھی ترس نہیں کھا سکتا"۔

"اماں تو یہ کافر ہے کیا آپ کا سالا؟"۔

"کافر کیا اکفر بلکہ کافرین کہئے، آپ پردیس میں رہے ہیں اس لئے اسے نہیں جانتے، سڑا ہوا وہابی ہے"۔

"نعوذ باللہ۔ مگر وجہ تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگی۔ آخر نابکار مبارک سفر میں کیوں حائل ہو رہا ہے"

"وجہ کچھ بھی نہیں۔ اس کے بھیجے میں کسی طرح یہ بات نہیں اتاری جاسکتی کہ سید کلیم الدین کے دیئے ہوئے روپے سے حج ہو سکتا ہے ہم زوجین کے علاوہ آٹھ افراد اور بھی ہیں۔ کسی مولانا نے سید صاحب کو بتایا ہے کہ دس آدمیوں کو حج کرادو تو سارا پیسہ پاک ہو جائے گا"۔

صوفی صاحب نے پُر اہمیت انداز میں آنکھیں پھڑپھڑائیں ــــ "بات تو پتے کی ہے۔ شاید کلام پاک ہی میں تو لکھا ہے کہ ان الحسنات ...... یعنی وہ ..... کیا نام ہے نیکیاں برائیوں کو لیجاتی ہیں"۔

"جی ہاں، لیکن یہ وہابی لوگ قرآن کو بھی ماننے کی طرح کب مانتے ہیں۔ میں اور آپ مل کر سو سال بھی ایڈیٹر تجلی کو سمجھائیں کہ دس حجوں کا ثواب تو بحر الکاہل بھی پاٹ سکتا ہے بیچارہ سود کیا چیز ہے۔ مگر وہ نہیں ماننے گا۔ آپ ہی کوئی ترکیب بتائیے کیسے اسے ہموار کیا جائے"۔

"ہم کیا بتائیں۔ ہمارا سالا ہوتا تو کان کھینچکر گُدی میں لگا دیتے"۔

"اس رُخ سے مت سوچئے وہ اور ہی قسم کا سالا ہے۔ فدوی تو آپ کی خدمت میں یہ امید لیکر آیا تھا کہ جناب پرانے صوفی ہیں، صوفیوں کے پاس تالیف قلب کے بہت نسخے ہوتے ہیں۔ پہلے تو ناچیز ایسے الجھے ہوئے معاملات میں صوفی بصیر الدین سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ انھیں اللہ نے بڑے سے بڑے مسئلے کو پانی کر دینے میں بڑا رسوخ دیا تھا"۔

صوفی صاحب ایسے بزرگانہ انداز میں مسکرائے جیسے میں نے کوئی بہت نا سمجھی کی بات کہدی ہو ــــ "اللہ تو ملّا صاحب سبھی کچھ دیتا ہے مگر یوں نہیں دیتا۔ بغیر وسیلے کے خاک بھی نہیں ملتا۔ صوفی بصیر الدین صاحب سے ہم بھی واقف ہیں، انھیں جو کچھ ملا اجمیری داتا سے ملا۔ تین سال تک وہ درگاہ شریف میں بلا کھائے پیئے مراقبے میں بیٹھے تھو

معلوم نہیں آجکل کہاں ہیں"؟۔

"سنا ہے پنجاب میں ہیں۔ گذشتہ سال پنجاب کے ایک سیٹھ لے گئے تھے۔ اپنی لڑکی سے شادی بھی کر دی تھی۔ پھر نہیں لوٹے ..... خیر ان کا ذکر چھوڑیئے۔ آپ بھی خدا نخواستہ ان سے کم تھوڑی ہیں"۔

"دین ہے پیر دستگیر کی مگر ....."

اچانک ان کے چہرے پر کسی نئے خیال کی پرچھائیں لہرائی گر کو جملے سے ادا کر کے وہ ٹھیر گئے تھے۔ پھر پاٹدار آواز میں کہنے لگے۔ "اجی اگر آپ کا سالا نہیں مانتا تو مت جائیے۔ آپ کی جگہ ہم چلے جائیں گے"۔

"باپ رے ..... بہت بہت شکریہ صوفی صاحب لیکن فدوی بہت گناہگار ہے اگر حج نہ کیا تو بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

"اس کی فکر مت کیجئے" صوفی صاحب کے ہونٹوں پر فخریہ انداز کا تبسم تھا "اجمیر شریف ہمارے ساتھ چلئے گا میاں سے سفارش کرانا ہمارا ذمہ"۔

"سفارش ..... یعنی ایڈیٹر تجلی میاں کی سفارش پر مان جائے گا"۔

"حول ولا قوۃ۔ میاں ایڈیٹر تجلی کیسا۔ ہم آپ کی بخشش کے لئے اجمیری خواجہ سے مولا کے یہاں سفارش کرا دیں گے۔ ان کی سفارش کبھی رد نہیں ہوتی"۔

"آپ تو صوفی صاحب مرنے کے بعد کا جغرافیہ لے بیٹھے۔ مجھے جیتے جی ثواب چاہیئے"۔

"اچھا حج کو ہمیں بھجوا دیجئے ہم ثواب آپ کو ایصال کر دیں گے ایصال ثواب تو بہر حال برحق ہے"۔

"وہ تو ہے لیکن جہاز کی سیٹیں ہم میاں بیوی کے نام بک ہیں"۔

"اس کی بھی فکر مت کیجئے۔ ہمارے خالو صاحب کے بھانجے داماد کا لڑکا حج کے محکمے میں نوکر ہے۔ وہ سب انتظام کر دے گا"۔

جی میں تو آئی وہ زناٹے دار ہاتھ رسید کروں جو صوفی صاحب کے بھانجے داماد کا خالو بنا دے مگر اس اندیشے سے ضبط کرنا پڑا کہ وہ مرتے مرتے بھی ایڈیٹر تجلی کو سارا ماجرا سنانے سے نہیں چوکیں گے۔ یہاں تو اسکیم یہ تھی کہ اندر ہی اندر تیاریاں مکمل ہوں سالے صاحب کو [illegible]

پھر عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اجازت لے لی جائے گی۔ ملائن کے لئے میں نے تین روپے گز کے لیڈی مشن کا برقعہ بنوایا تھا۔ ایک درجن جوڑے تیار کرائے تھے۔ اپنے لئے سرج کی شیروانی اور پتلونیں سلنے دی تھیں۔ دوکانداروں کو اطمینان تھا کہ جب چاہیں گے ایڈیٹر تجلی پر چڑھ دوڑیں گے اور حسب معمول قرض ادا ہو جائیگا۔ ہمیں اطمینان تھا کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ادھر سید صاحب نے نوٹوں کی تھپی دی اور ہم نے حساب چکتا کیا۔

" آپ تو گم ہو گئے" ملائن نے مجھے خواب خرگوش سے چونکایا "آخر بتایئے نا بھیا سے کیسے اجازت ملیگی؟"۔

" نہ ملے اجازت ..... میں ان کا غلام تو نہیں ہوں .... اررر یہ تو عادۃً عرض کیا۔ دراصل کھوپڑی ان دنوں کچھ ایسی بنجر ہو رہی ہے کہ بالکل گدھا بن کر رہ گیا ہوں۔ ویسے بھی تمہارا بھیا میری رگ رگ سے واقف ہو چکا ہے۔ میرے جھانسے میں مشکل ہی سے آسکتا ہے۔ تم کچھ سوچو، تم نے اگر اس مرتبہ اسے شیشے میں اتار لیا تو تمہیں دنیا کی سب سے دانشمند مخلوق مان لینے میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

" یہ اسے اسے آپ کیا کہنے لگے" وہ بگڑ کر بولیں۔

" ارے ... اوہ .... اسے نہیں، انھیں انھیں۔ تم تو واقعی کافی عقلمند ہو"۔

" مجھے بیوقوف ہی رہنے دیجئے، توبہ توبہ مجھے بھی آپنے پاگل بنا دیا ہے۔ جب کپڑے سینے بیٹھتی ہوں تو اپنی حماقت پر شرم آتی ہے بھلا بھیا جانے دیں گے"۔

" لاتقنطوا من رحمۃ اللہ، آخر مایوس کیوں ہوتی ہو۔ کہدیں گے ذرا دلی تک جا رہے ہیں۔ پھر دلی سے خط لکھدیں گے..... کہ ...."

" ہاں کیا لکھدیں گے؟"

" اپنا سر لکھدیں گے۔ ابھی تیاری مکمل کرو۔ میں انشاء اللہ آج ہی مولانا عظیم علی سے ملوں گا کیا خبر وہ ایسے دلائل مہیا کر ہی دیں جن کے ذریعے تمہارے بھیا کو اس حج کے جواز پر مطمئن کیا جا سکے"۔

" اگر ایسے دلائل ممکن ہو سکتے ہیں تو پھر سچ مچ ہی کیوں نہ حج کر لیا جائے۔ بمبئی تک جانے سے کیا حاصل؟"۔

" بچی ہو، دلائل ہمیں اپنے لئے نہیں تمہارے بھیا کے لئے چاہئیں ــــ بمبئی تک جانے کا حاصل پوچھتی ہو۔ ارے بمبئی فردوس البلاد ہے۔ بھارت کا پیرس ہے۔ دوزخ کا بہشت ..... وہ کیا ہوتا ہے اگر فردوس بروئے زمین است ...."

" بہک گئے آپ" ملائن مسکرائیں "یہ شعر تو کشمیر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے"

" جہنم میں گیا کشمیر، ارے بمبئی میں ٹھاٹ کریں گے۔ نگار خانوں میں شوٹنگ دیکھیں گے۔ تاج محل میں ڈنر کھائیں گے۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو زندگی بھر چار ہزار کا خواب تک نہیں دیکھ سکو گی"۔

" میرا مطلب یہ ہے کہ سید صاحب کے روپے سے اگر تھوڑا بہت حج بھی ہو سکتا ہو تو کیوں نہ حج ہی کر آئیں، نہ ملے پورا ثواب آدھا تہائی تو مل ہی جائے گا"۔

" مائی پروفیسر ثواب ریاضی کے قاعدے سے نہیں ملا کرتا۔ سودی روپے سے سفر کر کے دیار حجاز میں قدم رکھنے سے تو کہیں بہتر ہے کہ آپ اور ہم بسم اللہ کر کے خودکشی کرلیں"۔

" پھر دھوکے سے بمبئی کی سیر کرنا ہی کہاں حلال ہوگا"۔

" کمال کرتی ہو۔ کیا ارسطو نہیں کہہ گیا۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت ــــ سودی روپے کا اس سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے کہ شہر نگاراں کی سیر کی جائے"۔

" چولھے میں گیا شہر نگاراں۔ اچھا وہ جو پانچ پانچ سو روپے سید صاحب اپنا سامان منگانے کے لئے ہمیں دیں گے انکا کیا کروگے وہ سامان بمبئی میں تو ملنے سے رہا؟"۔

" یہ سب بکھیڑ چھوڑو۔ تمہیں تو صرف بھیا کے لئے کوئی جال بننا ہے۔ یاد ہوگا شاید میراجی یا ن۔ م راشد کی ایک نظم ہم نے تم نے مل کر پڑھی تھی۔

تجلۂ ریشم سے تو اے پیلۂ ریشم نکل!

اور بن!

ان بتان رشتہ بر پا کے لئے بھی ایک جال"

" اب ہٹایئے بھی، سچی بات ہے میرا دل تو نہیں ٹھکتا"۔

" مرغی کی ایک ٹانگ۔ اب میں پل پل تو حضور کی خوشامد کرنے سے رہا کہ خدا کے لئے ساتھ چلئے۔ مت چلو میں اکیلا ہی جھک مار لوں گا مگر یہ مت سمجھو کہ تین مہینے میں لوٹ آؤں گا۔ برسوں سے ایکسرسوں کی

ملاقاتوں کا ارمان لئے پھر رہا ہوں تم ساتھ نہیں ہوگی تو یہ ملاقاتیں طویل بھی ہوسکتی ہیں۔"

"بھاڑ و پھر جائے ایکٹرسوں پر" انھوں نے اردو میں کہا "میں نے کب کہا کہ اکیلے جاؤ۔ جائیں گے تو دونوں جائیں گے نہیں تو کوئی نہیں جائے گا۔"

"یہ بھی سمجھداری کی بات، تمہیں تو میں لئے ہی اس لئے جارہا ہوں کہ بمبئی کی جادوگرنیوں نے مجھے بے نکیل دیکھ لیا تو ہنکا نہ لے جائیں۔"

ناظرین بے تمکین سوچ رہے ہوں گے ملا بڑا احمق ہے۔ تنہا جانے کی بجائے بیوی کو بھی گھسیٹنے کے درپے ہے۔ حالانکہ بمبئی کی مہذب دنیا میں ایک عدد برقعہ پوش بیوی کو لئے پھرنے سے بہتر ہے کہ کسی شراب خانے میں فضائل درود وسلام پر وعظ کہا جائے۔

مگر اے ناظرین ذرا تمکین اختیار کیجئے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ پورا معاملہ کیا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ سید کلیم الدین نے زادِ سفر کے سلسلے میں فی نفر ڈیڑھ ہزار دینے طے کئے تھے اور بیس ہزار روپے دسوں افراد میں اس لئے تقسیم کرنے کی تجویز تھی کہ جو جو سامان سید صاحب بتائیں وہ ان کے لئے ہر حاجی حجاز سے خریدتا لائے۔ لیکن یہ تقسیم برابر کی نہیں تھی۔ زیادہ روپے ان پختہ کاروں کو ملتے تھے جو پہلے بھی حجاز ہو آئے ہوں اور وہاں سے نفع بخش سامان لانے کی تکنک سے واقف ہوں ہم زوجین کے لئے سامان لانے کے سلسلہ میں بس پانچ پانچ سو روپے تجویز تھے اور جس سامان کی فہرست لکھ کر ہم دونوں کو دی گئی تھی۔ وہ بہ قیمت بہتر ہونے کے باوجود بہ قامت کہتر کی قسم سے تھا، مثلاً گھڑی، کیمرہ وغیرہ۔

میں نے بڑی مشکل سے سید صاحب کو یقین دلایا تھا کہ ہم میاں بیوی دونوں کو بھیجئے تو حج مبرور کا ثواب ہاتھ آئے گا۔ وہ چمک کر بولے تھے

"یہ حج مغرور کیا ہوتا ہے"؟

"مغرور نہیں مبرور۔ درجۂ اول کے حج کو کہتے ہیں جو علماء کے نزدیک سو حجوں کے برابر ہوتا ہے۔"

"چلئے منظور ہے" وہ مان گئے۔

اب ظاہر ہے کہ ملائن جانے پر آمادہ نہ ہوتیں تو ان کے حصے کے پورے دو ہزار ہاتھ سے جاتے۔ اسکیم اپنی یہ تھی۔ جیسے ہنوز ملائن سے بھی مخفی رکھا تھا کہ قیام خواجہ گوہر علی کے یہاں رہے گا۔ ان کا بنگلہ ورلی میں ہے۔ موصوف سے خود میرے بھی خاصے تعلقات ہیں اور ان کی منجھلی لڑکی زہرہ ملائن کی کلاس فیلو بھی ہے۔ تقریباً بارہ سال قبل یہ دونوں میرٹھ کے کسی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ زہرہ بڑی ہنس مکھ ہے اور خواجہ گوہر علی بھی باوجود سن رسیدہ ہونے کے مُردہ دل نہیں ہیں۔ ملائن کو یہ نہیں مستحضر تھا کہ وہ بمبئی میں فروکش ہیں۔۔۔ وہاں ٹھیرنے میں ایک تو یہ فائدہ ہوتا کہ ہوٹل کے قیام کا خرچ بچ رہتا دوسرا بیش بہا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ملائن اور زہرہ اپنی تفریحیں آپ کرتی پھرتیں۔ ان کے یہاں کار بھی تھی، ریڈیو بھی تھا۔ مجھ پر یہ آفت نہ پڑتی کہ برقعے سمیت ٹخ ٹخ کرتا پھروں۔ صبح ہوئی اور اکیلا نکلا بمبئی میں خاک تو کیا ملتی اس لئے خاک چھاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں نگارخانے بہت ہیں۔ فلموں کی شوٹنگ اور فلمی ستاروں کے دیدار کا ارمان اس وقت سے ہے جب پہلی خاموش فلم کا ٹکٹ خریدنے کے سلسلے میں دودھ کے دانت ٹوٹے تھے۔ یہ ارمان اگرچہ ایک بار تھوڑا بہت نکل چکا ہے مگر شاعر جو کہہ گیا ہے کہ

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو ظاہر ہے کم اسی لئے نکلے ہوں گے کہ پیسہ کم رہا ہوگا۔ اب سید کلیم الدین کے طفیل اپنے ہاتھ لگی چانس آرہا تھا تو کیوں نہ کم سے کم وہ ظالم قسم کی حسرتیں تو پوری کر ہی لی جائیں جن کے بارے میں چچا غالب نے یقیناً بے کاری کے زمانے میں فرمایا ہوگا۔

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے

خیالات کی اسی جنت کو دماغ کی تہ میں لسائے دھکی خوشامد اور ترغیب وتحریص جیسے بھی بن پڑا ملائن کو آمادۂ سفر کیا۔ وہ پہلے تو یہی سمجھیں کہ اصرار سفر حجاز ہی کے لئے کیا جارہا ہے۔ بھنک کے کہنے لگیں میں تو ہرگز سودی روپے سے حج کو نہ جاؤں گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ عذاب ثواب میری گردن پر۔ کہنے لگیں ہرگز نہیں۔ اللہ رسول کے گھر ناپاک پیسے سے جانا پرلے سرے کی ڈھٹائی ہے۔ ہزار بار توبہ کیجئے۔

اب میں نے اپنا منصوبہ عرض کیا کہ نیک بخت توبہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ حجاز کون مسخرہ جارہا ہے۔ بمبئی چل کر مزے اڑائیں گے۔ وہ کئی دن تک نہیں مانیں، میں نے پیچھا لئے رکھا آخر تنگ آکر

دس فی صدی مانیں۔ پھر بیس فیصدی۔ پھر میں نے یاد دلایا کہ تمہاری کلاس فیلو زہرہ بھی تو بمبئی میں ہی ہے۔ تب پچاس فی صدی مانیں۔ قسمت کی خوبی انھی دنوں ان کے نام زہرہ کا خط آیا کہ بہن تم نے تو ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔ کبھی آؤ نا بمبئی۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی کب تلک

یہ خط مہمیز کا کام کر گیا۔ چہک کر کہنے لگیں۔

"چلیئے پھر یوں ہی سہی۔ زہرہ سے ملے بہت دن ہو گئے مگر...... اچانک ان کا چہرہ اتر گیا۔" بھیّا سے کیا کہہ کے اجازت لیں گے"۔

"دیکھی بھالی جائے گی تم تیاری مکمل کرو"۔

جوں جوں جہاز کی روانگی کے دن قریب آ رہے تھے یہ تشویش بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ ایڈیٹر تجلی سے آخر کیسے نمٹا ہوگا۔ ان دنوں عاجز نے بھولو پالشیے سے تقریباً روز ہی بادام روغن کی مالش کرائی تاکہ چٹیل کھوپڑی میں کوئی تو شگوفہ پھوٹے۔ صدقے اللہ میاں کے نوازنے کے۔ شگوفہ پھوٹا اور اچھا پھوٹا۔ سچ کہا ہے اقبال نے

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

ہو سکتا ہے آپ ان مصرعوں کو شعر تسلیم نہ کریں۔ لیکن ملائن نے بہرحال میری تجویز تسلیم کر لی اور کھٹا پٹ زہرہ کو خط لکھا کہ ڈیئر زہرہ! لیٹر ملا۔ خوشی ہے یہ حال ہوا کہ تھرما میٹر لگاتی تو ایک سو چھ سے کم ٹمپریچر نہ نکلتا۔ دل تو اپنا بھی تم سے ملنے کے لئے بیتاب ہے بقول شخصے ماہی بے آب ہے، لیکن بڑے بھیّا کو تم جانتی ہی ہو، انکی قدامت پرستی کبھی اجازت نہیں دے سکتی کہ نسیمہ محض تفریح کی غرض سے بمبئی کا لمبا سفر کرے۔ تمہارے دولہا بھائی ہمہ تن آمادہ ہیں مگر بھیّا کے آگے ان کی بھی سٹی گم ہے۔ اگر سچ مچ بلانا چاہتی ہو تو فلاں تاریخ کو اپنے ڈیڈی سے تار دلوا دینا کہ نصیب دشمناں زہرہ سخت بیمار ہے۔ نسیمہ کو بجد یاد کرتی ہے فوراً پہنچو۔ اس طرح ممکن ہے کہ رو دھو کر میں بھیّا کو رضامند کر ہی لوں۔

خط ڈال تو گیا اور یہ بھی سو فیصدی امید تھی کہ زہرہ باپ سے تار دلوا کر ہی چھوڑے گی اور اگر بفرض محال وہ آمادہ نہ ہوئے تو خود زہرہ کافی اسمارٹ ہے۔ باپ کی طرف سے خود ہی تار بھیج دے گی لیکن برا ہو اس شاعر کا جس نے ہم ہی جیسے بدنصیبوں کے لئے کہا تھا۔

سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

صوفی بدرالدجیٰ سے مشورہ کیا گیا تھا خود ہی اپنا مقبرہ تیار کر لیا تھا۔ وہ سچ مچ ٹائم بم ثابت ہوئے۔ انھوں نے پہلے تو سید کلیم الدین کو سبق پڑھایا کہ دس کی گنتی میں عورت کو مت شامل کیجئے ورنہ ساڑھے نو رہ جائیں گے۔ عورت کو ترکہ بھی آدھا ملتا ہے اور گواہی بھی آدھی لگتی ہے۔ سید صاحب نے تشویش میں پڑ کر مجھے بلایا۔ میں نے خدا ہی بہتر جانتا ہے کتنی کتابوں کے حوالے سے انھیں باور کرایا کہ صوفی جی جھک مارتے ہیں۔ عبادات میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ وہی تیس روزے اور پانچ نمازیں مردوں کے لئے وہی عورتوں کے لئے بلکہ عورتوں کو حج کا ثواب زیادہ ملتا ہے۔ وہ کمزور ہوتی ہیں اور حج مشقت طلب عبادت ہے جو زیادہ مشقت اٹھائے گا اسے ثواب بھی ظاہر ہے زیادہ ہی ملیگا۔

یہ استدلال ان کے دماغ میں اتر گیا۔ کہنے لگے۔

"آپ کی قابلیت پر مجھے اعتماد ہے۔ مگر دیکھئے ہمارا احسان نہ بھولئے گا"۔

"کیا مجال ہے جناب! وہ تو سمجھئے آیا دھرا ہے"۔

اب میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

لیکن کہاں بخیر گذشت۔ صوفی جی نے جب دیکھا کہ یوں کام نہیں چلتا تو دفتر تجلی پہونچ گئے۔ انھیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ ملا کی نکیل سالے کے ہاتھ میں ہے۔ سالے جب بہنوئیوں پر حکومت کرنے لگیں تو سمجھ لو

قریب ہے یار و روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

ہماری تیاریاں آخری منزل میں تھیں۔ زنانے اور مردانے سوٹ سل چکے تھے۔ مغرب کے بعد میں کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ ملائن نے کہا

"ذرا آپ مردانے میں چلے جائیں پردے والی آئی ہیں۔ باہر مرد بھی ہیں"۔

میں مردانے میں پہنچا تو حاجی بلبل جلوہ فرما تھے۔ ان کا اصلی نام کچھ بھی رہا ہو بہت دنوں تک وہ مولوی بارود الحق کہلاتے رہے ہیں مامجر لوگوں کا کہنا ہے کہ انگریز کے زمانے میں ایک دفعہ وہ دھواں دھار تقریر کر رہے تھے کہ کسی بچہ نے پٹاخہ چھوڑ دیا۔ زمانہ نازک تھا بھگدڑ مچ گئی بس اسی دن سے انھیں بارود الحق کا خطاب مل گیا آواز ان کی اچھی ہے۔ بلبل تخلص رکھتے ہیں۔ انگریزی دور ختم ہوا تو خطاب کی دل کشی بھی کم ہو گئی۔ اب لوگ انھیں حاجی بلبل ہی کہتے ہیں اور اس پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کئی بار حج کر آئے ہیں۔

علیک سلیک کے بعد آمد کا مدعا یہ ظاہر ہوا کہ ہم مُلّا ملائن کے حج کو جانے کا راز انھیں بھی معلوم ہو گیا تھا۔ بڑی التجا اور اصرار کے ساتھ سامان کی ایک فہرست اور سو سو کے دو نوٹ میرے حوالے کئے کہ خدا کے لئے یہ معمولی سا سامان ہمارے لئے لیتے آئیے گا ان سے اگرچہ میرے تعلقات شناسائی سے زیادہ نہیں ہیں لیکن کورے جواب کی بدلحاظی کیا کرتا ویسے بھی کچھ آہی رہا تھا جا نہیں رہا تھا۔ سوچا سیر سپاٹے کے بعد لوٹا دیئے جائیں گے۔ وہ فرشی انداز کا شکریہ ادا کرتے رہے اور بار بار اس پر بھی زور دیتے رہے کہ اس معاملہ کو اپنے ہی تک رکھئے گا۔

ضمناً انھوں نے دس پانچ لکھنوی قسم کے شعر بھی میری کھوپڑی میں ٹھونسے اور تقریباً نصف گھنٹے بعد اہلیہ سمیت تشریف لے گئے۔ گھر میں آیا تو ملائن نے خاص اہمیت کے انداز میں پوچھا کہ حاجی جی کیسے تشریف لائے تھے؟ میں اگرچہ رازداری کا وعدہ کر چکا تھا مگر بیوی نصف بہتر ہوتی ہے اس سے اظہار کرنا اپنے تک رکھنے کے منافی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے سنا تو کھل کھلا کے ہنس دیں اب میں نے بھی سوال کیا کہ فرمائیے محجن بی کیسے آئی تھیں؟ کہنے لگیں میں آپ کی طرح وعدہ شکن نہیں ہوں۔ انھوں نے قسمیں دلائی تھیں کہ کسی سے نہ کہنا۔

"اللہ اکبر اب ہم کسی ہو گئے۔ خدا کی بندی اپنے نصف بدتر سے کچھ کہنا کسی سے کہنے کے دائرے میں کب آتا ہے"۔

انجام کار انھوں نے بتا ہی دیا کہ محجن بی نے بھی سامان کے پرچے کے ساتھ دو سو انھیں دیتے ہیں۔ پرچوں کا مقابلہ کر کے دیکھا تو سامان تقریباً ایک ہی تھا اور ہینڈ رائٹنگ تو سو فی صد ایک تھا۔

عاجز کی زبان پر بے ساختہ بیتقاضائے ترنم کا شعر آیا۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

لیکن عاقبت آج ہی آدھمکے گی۔ یہ تصور کیسے ہو سکتا تھا۔ عشاء کے بعد میں تو تکئے پر سر رکھے سنہری سپنوں کے جال بن رہا تھا اور ملائن "شعلۂ طور" کھولے ایصال ثواب کے انداز میں کچھ گنگنا رہی تھیں۔ انھیں جگر علیہ الرحمۃ سے بڑی عقیدت ہے۔ شاید اسی لئے ترنم میں فاتحہ کا لحن بھی شامل کر لیا تھا۔

اتنے میں ان کے بھیا کی جانی پہچانی سرد آواز دروازے پر گونجی — "نسیمہ!"۔

انھوں نے شعلۂ طور اپنے تکئے کے نیچے چھپایا اور یہ سمجھے بغیر دروازہ کھول دیا کہ بھیا کا یہ بے وقت آنا قیامت کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور یہ ٹھنکاہٹ اگلے ہی لمحے سردی کی لہر میں تبدیل ہوتی چلی گئی کیونکہ مارے غصے کے ان کا چہرہ اس قدر تمتمایا ہوا تھا کہ سیاہ داڑھی اس کے عکس سے ڈارک براؤن نظر آرہی تھی۔ معاً خیال گذرا کہ وہ داڑھی کو مہندی لگا کر آئے ہیں۔ مگر جب قریب آتے پر روشنی کا زاویہ بدلا تو ثابت ہوا کہ مہندی ویہندی تو نہیں لگی مگر بقول شاعر

وہ میرے خون سے مہندی لگانے آئے ہیں

وہی کیفیت بیوی کی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ مسہری کے تکئے سے پشت لگا کر وہ ایک لحظہ اس طرح متفکر رہے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ کیسے اسٹارٹ لیں۔ یہ لحظہ میرے لئے تقریباً ایک صدی کے برابر تھا۔ آخر کار سکوت ٹوٹا۔ ان کی کھا جانے والی نظریں میرے متیم چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"کیوں گدھے کیا صوفی بدرالدجیٰ کی یہ اطلاع درست ہے کہ تم کالو قصائی کے خرچ پر حج کو جا رہے ہو؟"۔

"جی ... جی ہاں ..... وہ بہت ہی مجبور کر رہے تھے"۔

"تمہیں معلوم ہیں ان کے ذرائع آمدنی کیا ہیں؟"

"انھوں نے قسم کھا کر بتایا ہے کہ جو روپیہ وہ حج کے لئے دے رہے ہیں وہ انھوں نے انڈوں کی کاشت .... جی وہ انڈا مرغی کی بزنس کر کے کمایا ہے"۔

"تم اب مسخرے کے بجائے گنڈے ہوتے جا رہے ہو۔ میرے

دماغ میں اتنا گند داخل ہوگیا ہے کہ روز روز تمہیں پھٹکار کروں ——— نسیمہ! برقعہ سنبھالو تم اسی وقت میرے ساتھ چلو گی۔"

بھتا نے پھٹی پھٹی نظروں سے پہلے بھتیا کو پھر مظلوم شوہر کو دیکھا۔

"آپ جناب لپائیوں کے آثار چڑھاؤ میں آجاتے ہیں" میں نے بمشکل قابو پاتے ہوئے فریاد کی" دو مہینے پیشتر خود میرے سامنے سید صاحب کی دو بوگیاں انڈا مرغی سے بھری ہوئی ڈیلیور ہوئی تھیں اب یہ کیا ضروری ہے کہ ان کا پیسہ پیسہ سود ہی کا ہو۔"

"بکواس بند کرو۔ انڈے اگر بوگیوں میں آنے جانے لگیں تو انکا بھی حشر ہوگا جو تمہاری عقل کا ہوا ہے۔ میں اب قطعی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم سے قطع تعلق کرلوں۔ کم سے کم مجھ پر تمہاری رسوائیوں کی چھینٹیں نہیں پڑیں گی ——— نسیمہ! اب تک برقعہ نہیں پہنا"

ان کے لہجے میں نپولین کا طنطنہ تھا۔ ملائن کا ہاتھ اٹو میٹکلی برقعے پر پہنچا مگر سہمے ہوئے چہرے پہ مظلوم شوہر کی مامتا بھی کلیلیں کر رہی تھی۔

"آپ ..... پ کا کیا ہرج ہے بھتیا اگر ہم لوگ حج کو ہو ہی آئیں۔"

"تو یوں کہو تم پر بھی ابلیسیت طاری ہے" وہ گرجے "جاؤ شوق سے جاؤ۔ میں بھی دیکھوں گا کہ وہ قصائی کا بچہ تم لوگوں کو پھوٹی کوڑی بھی کیسے دیتا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ....

اور بس کیا کہئے۔ اگلے ہی دن سید صاحب نے مجھے بلاکر روکھے سے لہجے میں فرمایا

"ملا صاحب میں معافی چاہوں گا۔ آپ کے سالے صاحب نے کہا ہے کہ آپ کا سفر اس سال ممکن نہیں ہے لہذا میں نے دو اور آدمیوں کا انتظام کرلیا ہے"۔

یہ ظاہر تھا کہ سید صاحب سالے لاٹ صاحب کی رعیت نہیں تھے کہ اشارہ پاتے ہی سمعنا واطعنا پکار اٹھتے۔ وہ تو اندر خانہ معاملہ ہی اور تھا۔ خاص ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایڈیٹر تجلی نے ایک دستی رقعہ بھیجا تھا۔ جس کا خلاصہ مطلب یہ تھا کہ آپ نے گذشتہ چند سالوں میں سمگل کرا اور کرا کے جتنا کچھ کمایا ہے وہ میرے علم میں ہے۔ اگر ملا کا نام آپ نے اپنے حاجیوں کی لسٹ سے کینسل نہ کیا تو کان کھول کر سن لیجے کہ نہ صرف اس سال آپ خسارے میں رہیں گے بلکہ پھیلا کھایا پیا بھی اگلنے کی نوبت آسکتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ موجودہ ایس پی۔ میرے خاص دوستوں میں سے ہے اور نہ بھی ہو تو بعض مخصوص ذرائع اور بھی میری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔

یہ داستانِ درد ختم ہوئی۔ میں زندگی میں پہلی بار اتنا رو دیا ہوں کہ گھر کی کیاریوں میں آٹھ دن پانی دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی ملائن بھی روئی مگر اس کا غم زیادہ دلدوز نہیں تھا۔ اسے تو صرف ایک سہیلی کی ملاقات سے محرومی کا غم تھا لیکن یہاں تو حسین خوابوں کے نہ جانے کتنے شیش محل چھن چھن کر کے ٹوٹ گئے تھے اور ان کی کرچیں کھوپڑی کی ایک ایک تہہ میں اس طرح چبھ رہی تھیں جیسے عید کا معانقہ کرتے ہوئے گردن میں مولانا شباہت علی کی داڑھی چبھی تھی۔

آپ اکتا گئے ہوں گے لیکن کہانی کا ایک دم چھلا ابھی اور باقی ہے اسے بھی سنئے تاکہ آپ بور ہو کے خودکشی کرلیں اور عاجز ہمیشہ آپ بیتیاں سنانے کے کھٹراگ سے نجات پالے۔

حاجی بلبل اور ان کی اہلیہ اگلے ہی دن پیسے اگلوا کے لے گئے تھے۔ غالباً وہ حالات پر بڑی گہری نظر رکھ رہے تھے۔ ورنہ اتنی جلدی انہیں سفر کی منسوخی کا علم نہ ہوتا۔ بعید نہیں تھا کہ پیسوں کی واپسی کے سلسلے میں انہیں سال چھ مہینے ڈنڈوت کرنی پڑتی لیکن میری تمام تر توجہات اس وقت صرف اس صوفی کے بچے پر مرکوز تھیں جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑا تھا۔ لہذا حاجی بلبل کا پاپ کاٹا اور سید صاحب سے مل کر دریافت کیا کہ کیا میری جگہ صوفی بدر الدجیٰ ہی سیٹ ہوئے ہیں۔

"جی ہاں وہ اور ان کا بھتیجا۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں ملا صاحب ...."

"پروا نہ کیجئے مجھے یقین ہے صوفی اینڈ کو کو بھیجکر آپکی شرمندگی سو سے ضرب کھا جائے گی"۔

"جی کیا فرمایا؟" سید صاحب کی بجو کی سی آنکھیں پھیلنے کی کوشش میں مکمل دائرہ بن گئیں۔

"فرمانا تو ہمارے سالے صاحب بہادر کا حصہ ہے سید صاحب

غلام زادہ کیا فرما سکتا ہے ـــــــ مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ اگر صوفی اینڈ کو میری جگہ بھیجے گئے تو وہی ایس۔ پی میرا بھی دوست ہے جس کا حوالہ صاحب بہادر نے رقعہ میں دیا ہے۔"

سید صاحب اچھل پڑے۔ "جی .... م م میرا مطلب ہے آپ تو بگڑ گئے .... کون حرامزادہ صوفی کو بھیجتا ہے۔ آپ خود بتا دیجئے کسے بھیجوں، اسی کو بھیج دوں گا۔"

"کالے چور کو بھیجئے مجھے اس سے بحث نہیں کون جاتا ہے بس صوفی بدرالدجیٰ یا اس کا کوئی لگا سگا نہیں جانا چاہئے۔"

"نہیں جائے گا صاحب نہیں جائے گا ـــــ بیٹھئے نا آپ تو خواہ مخواہ خفا ہوتے ہیں۔ ہم کب آپ لوگوں کے کہنے سے باہر ہیں ـــ ارے پھینرے۔ چائے ملا جی کے لئے ...."

"ملا جی نہیں ملا مکّی کہیئے ـــــــ معاف کیجئے گا میں چائے نہیں پی سکوں گا۔"

وہ روکتے رہے مگر میں کہاں رکتا۔ رکنے کا مطلب یہ تھا کہ ایمان صرف ایک پیالی پر نیلام ہو جائے۔ کامیابی تو بہرحال ہو ہی گئی تھی کہ صوفی اینڈ کو اب نہیں جا سکتے تھے مگر اندر کا ہوا خون کہہ رہا تھا کہ یہ تو محض طفلِ تسلی ہے۔ بے شمار زہرہ جبیں خوابوں کے فردوسی محلوں کو پاش پاش کرنے والے فتنہ پرداز کی سزا کم سے کم اتنی تو ہونی ہی چاہیئے کہ اسے سال دو سال کا کھایا پیا یاد آ جائے۔

لیکن انتقام کا چانس چھ مہینے بعد آیا جو مستقل ایک کہانی ہے فی الوقت جس دم چھلّے پر یہ روداد ختم کرنا چاہتا ہوں وہ حاجی بلبل سے متعلق ہے۔ تین مہینے بعد جب حجاج واپس آ چکے تھے ایک دن مرزا مکرّم کی بیٹھک کے پاس سے گذر رہا تھا کہ حاجی بلبل کی کچھ گھگیائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں تحقیقِ حال کے لئے بیٹھک میں داخل ہوا تو وہاں کئی آدمی موجود تھے۔ اور مرزا اکرم حاجی بلبل کے ہاتھ میں سو سو کے نوٹوں کی ایک خاصی دبیز گڈی پکڑاتے ہوئے بھبکتی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"ہمیں خدا کو منھ دکھانا ہے حاجی جی، نہیں تو آپ کی سزا تو یہ تھی کہ ایک پیسہ بھی نہ لوٹایا جائے۔"

حاجی بلبل نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے گرے پڑے لہجے میں کہا ـــــ ہیں ... ہو .... جی معاف کیجئے گا" ـــ اور دم دبا کے چلتے بنے۔ اب میں نے مرزا جی سے قصہ پوچھا تو بڑے تأسف سے کہنے لگے۔

"کیا بتائیں ملّا صاحب بُرا زمانہ آگیا ہے۔ بتائیے یہ مولوی اور حاجی بنتے ہیں۔"

میرے اصرار پر انھوں نے تفصیل سنائی کہ حاجی بلبل نے ہمیں دو سو روپے دیکر عرب سے کچھ سامان منگوایا تھا۔ ہم نے مروت میں منظور کر لیا۔ مدینے سے یہ سامان خرید بھی لیا۔ مگر اس چار سو بیس نے اپنی بیوی کے ذریعے ہماری بیوی سے بھی اتنے ہی کا سامان منگوایا تھا اور رازداری کا وعدہ لے لیا تھا۔ وہ تو چوری یوں پکڑی گئی کہ میرا بڑا سالہ گلزار بھی ساتھ گیا تھا۔ اہلیہ نے روپے اور سامان لکھا ہوا پرچہ اسے دیا کہ اپنے دولہا بھائی سے چپکے سے یہ سامان خرید لاؤ۔ وہ ایک دوکان سے پرچہ دیکھ کر کچھ خرید رہا تھا کہ میں بھی اتفاقاً پہنچ گیا اب جو نظر پرچے پر پڑی تو وہی چار سو بیسیے کی تحریر نظر آئی۔ گلزار نے چاہا بھی کہ پرچہ چھپا جائے مگر میں نے ڈانٹ کر وصول کیا اور اپنے پرچے سے ملا کر دیکھا عین مین ایک تحریر تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ کیا قصہ ہے۔ اہلیہ کو ڈانٹا ڈپٹا تو اس نے اصلیت بتائی۔ وہ بتا رہی تھی کہ چچی بھی کہنے لگیں کہ ہائے اللہ بٹیا جن نے تو مجھے بھی دو سو روپیے دیئے تھے۔ یہ دیکھو یہ ہے پرچہ۔ اب بھائی شفاعت اور منشی رحمان بھی بولے کہ حاجی بلبل نے تو ہمیں بھی روپے دیئے تھے۔ ابھی ہم نے سامان نہیں خریدا ہے۔ اسطرح معلوم ہوا کہ چار سو بیسیئے نے دو ہزار کے نوٹ بانٹے تھے۔ خدا جانے اور کہاں کہاں بانٹے ہوں گے۔ بچے جانے والوں میں ایک ماسٹر لقمان رہ گئے تھے جنھیں ہم نے سمجھا کہ وہ چھوڑ دیئے گئے ہیں مگر جب ہم لوگ ان کے نظر انداز ہو جانے پر حیرت کر رہے تھے تو وہ بھی بول پڑے کہ بھائی صاحب میں رازداری کا وعدہ تو نہیں توڑ سکتا مگر ایک شعر ضرور آپ لوگوں کو سنا سکتا ہوں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہ دم چھلہ ختم ہوا، بس یہ اطلاع اور سن لیجئے کہ میری آفیشل معلومات کے مطابق سید کلیم الدین کو مذکورہ حج سروس سے دو فائدے پہنچے۔ اوّل یہ کہ تمام اندوختہ طیب و طاہر ہو گیا۔ دوئم یہ کہ دسوں حاجیوں کے لائے ہوئے سامان سے نفع کا اوسط تقریباً پانچ ہزار رہا جب کہ پندرہ ہزار بطور راس المال واپس آ گئے۔ اب خود انصاف کیجئے کہ ملّا اور ملّائن اگران کے چار ہزار سے شہر نکالا ہ

عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

اسلام بیسویں صدی میں

● تالیف و ترتیب:- جناب ایم۔ محی الدین بی۔ اے۔ ایل ایل بی ● شائع کردہ:- ادارہ اوراق زریں ۸۵ ریلوے روڈ۔ لاہور ● صفحات ۲۲۴ ناول سائز۔ قیمت ساڑھے چار روپے

اس کتاب میں ایک مختصر سے خط کا فوٹو شائع ہوا ہے جس کے بارے میں مؤلف کا کہنا ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ یہ تو الگ بحث ہے کہ واقعتہً یہ مولانا مرحوم کا ہے یا نہیں لیکن اس خط کے تعلق سے یہ ضرور ہوا ہے کہ اس کتاب کا تذکرہ متعدد جرائد میں آیا ہے اور یوں بھی اس کا نام اتنا پرکشش ہے کہ بعید نہیں اگر اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل جائے۔

اس کے مؤلف ناشر کی تصریح کے مطابق بائیس سال کے نوجوان ہیں۔ کتاب کی مقبولیت انھیں یقیناً مزید تالیف و تصنیف پر آمادہ کرے گی اور امید ہے کہ جلد یا بدیر ان کے قلم سے لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔ لہذا ہم ازراہ دوستی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ قدرے تفصیل کے ساتھ تبصرہ کریں اور جو خامیاں ہونہار مؤلف کے طرزِ فکر میں پائی جاتی ہیں ان کی نشاندہی کر دیں تاکہ وہ ان پر غور کر سکیں اور آئندہ ان کا قلم زیادہ بہتر خدمات انجام دے سکے۔ ابھی ان کا ذہن ناپختہ ہے اس کی کجی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

ہمیں ایک مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر بڑی تشویش ہے کہ پاکستانی معاشرہ تیزی سے مغربی تہذیب و تمدن کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے اور اس غلط روی کو روشن خیالی باور کرانے والوں نے وہاں ایسا رنگ جمایا ہے کہ حقیقی اسلام کے خدوخال روز بروز دھندلے پڑتے جا رہے ہیں۔ گمراہی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی نفسانیت کے تحت بد اعمالیوں میں گرفتار ہو مگر فکر و عقیدے کی حد تک ان بد اعمالیوں کو مذموم ہی سمجھتا رہے۔ یہ شکل بہت بُری ہے، لیکن اس سے بدتر شکل یہ ہے کہ گناہ و طغیان پر جری ہونے کے بعد آدمی اس جرأت کو تہذیب و شائستگی کا نام دے، عروج و ترقی باور کرانے میں کوشاں ہو اور اپنی بد اعمالیوں کو عینِ دین قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے۔

پاکستان میں یہی دوسری شکل نمایاں تر ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی طرزِ فکر سے مرعوب ہو کر اسلام کو مادہ پرستی کی عینک سے دیکھنے والے اور قرآن کو اپنے واہی مزعومات کی خراد پر چڑھانے والے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں مگر ان کی مساعیِ مذمومہ کو زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا۔ اور ان کے شیطانی اجتہاد کسی منظم تحریک کے سانچے میں نہ ڈھل سکے۔

لیکن تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ جو ملک اسلام کے

نام پر حاصل کیا گیا تھا آج اس ہی اسی شیطانی اندازِ نظر کو ایک مستقل تحریک کی حیثیت سے چلانے والے پھل پھول رہے ہیں اور قرآن و سنت کے ساتھ اسلام ہی کے نام پر وہ بے رحم مذاق کیا جا رہا ہے جس کی نظیر ادوارِ سابقہ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

نام آپ اس فتنے کا چاہے انکارِ حدیث رکھیں یا مغرب زدگی۔ بنیاد اس کی بہرحال مادّہ پرستی پر ہے۔ مادّہ پرستانہ طرزِ فکر نے پہلے بھی جن و مَلک جیسے حقائقِ ثابتہ کی تعبیر مادیت کے زاویوں سے کرنی چاہی تھی لیکن اب تو غیبی حقائق اور روحانی اقدار سے بیزاری اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جنت دوزخ، صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور نبوت و رسالت تک کے مفاہیم مادّہ پرست مفکرین کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلام کے متفق علیہ احکام و اصول کو بدلنا ممکن ہی نہیں ہے جب تک تمام علمائے سلف کو غلط بیں، کم فہم اور ناقابلِ اعتماد قرار نہ دیدیا جائے۔ اسی لئے علماء کا تمسخر اور عباد و زہاد کا استہزاء ایک عام بات ہوتی جا رہی ہے۔ متجددین برملا کہتے ہیں کہ اجتہاد کا حق ہمیں بھی ہے۔ قرآن کی من مانی تعبیر ہم بھی کر سکتے ہیں اور متجددین کے بعض سرغنے تو دو قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہنے میں حیا نہیں کرتے کہ تمام علمائے سلف اور فقہائے سابق سازشی تھے، انھوں نے اسلام کو مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور حقیقی اسلام وہ ہے جسے آج ہم پیش کر رہے ہیں

یہ صورتِ حال نہایت افسوسناک ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ کتنے ہی ایسے حضرات بھی جو قصد و ارادے کی حد تک نہایت مخلص اور دردمند ہیں اس فتنے کے اثرات سے اسی طرح ملوّث ہوتے جا رہے ہیں جس طرح وبا کے زمانے میں کتنے ہی محتاط لوگ بھی وبا کے اثرات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے

چنانچہ زیرِ تبصرہ کتاب کے ہونہار مؤلف میں بھی ہمیں اس فتنے کے جراثیم صاف نظر آ رہے ہیں۔ وہ ایک طرف مولانا مودودی کو مفکرِ اسلام بھی کہتے ہیں، ان کی بلند شخصیت اور دینی خدمات کا تہہ دل سے اعتراف بھی کرتے ہیں اور ان کے فرمودات کو حرفِ آخر بھی قرار دیتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کا اپنا طرزِ فکر مادّہ پرستی اور بے لگام تجدد کے ایسے نقش و نگار سے آراستہ ہے جن کی تردید و تغلیط میں مولانا مودودی نے اپنی ساری زندگی لگا دی ہے۔

بے دلیل بات کہنا ہماری عادت نہیں اس لئے ہم طول کی پروا کئے بغیر اس کتاب کے اکثر قابلِ نظر حصوں کی نشاندہی کریں گے۔

یہ کتاب تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلے جز میں ابتداءً ناشر نے مؤلف کا تعارف کرایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کی عمر صرف بائیس سال ہے۔ ہو سکتا ہے اس تعارف سے کچھ لوگ سرسری گذر جائیں لیکن دور اندیش قارئین کو مؤلف کی نوعمری کتاب کے بارے میں پُر امید نہیں رہنے دے گی۔ ظاہر ہے جس شخص نے بائیس سال کی عمر میں بی اے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر لی ہو اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچا جا سکتا کہ اس کا تمام زمانۂ شعور اسکول اور کالج کے جلنے پھاپنے ماحول میں انگریزی پڑھتے گذرا ہے اور اسلام کو اس کے اصل سرچشمے سے حاصل کرنے کا موقع اسے میسر نہیں آ سکا۔ اس کے بعد کیا توقع ہو سکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی مسائل اور اہم مباحث کے بارے میں وہ کوئی پچی تلی وزندار بات کہہ سکیگا۔

دنیا کے ہر علم و فن کی طرح اسلامی علوم و فنون میں بھی مجتہدانہ بصیرت اور عبور و دسترس کی دور افتادہ منزل تک پہنچنے کے لئے آغازِ سفر اس مرحلے سے ہوتا ہے کہ آدمی اس زبان کو سیکھے جس میں یہ علوم و فنون مدوّن ہوئے ہیں اور اس لٹریچر کو پڑھے جس کے صفحات میں ان علوم و فنون کی بحثیں محفوظ ہیں۔ یہ مرحلہ بھی اگرچہ منزل تک پہنچانے کا ضامن نہیں، بلکہ فکر و بصیرت کی خاص صلاحیتوں اور احکامِ دین سے عملی وابستگیوں کا پایا جانا بے حد ضروری ہے۔ اس حد تک ضروری کہ اس کے بغیر منزلِ اجتہاد کی طرف سفر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم بغرضِ محال اس قید کو نظر انداز

بھی کر دیں تو یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ اٹل ہے کہ علوم دینیہ کو ان کی اپنی زبان میں پڑھے اور سیکھے بغیر اسلامی علوم و فنون میں نقد و نظر اور بحث و تمحیص کا کوئی مطلب ہی نہیں۔

لیکن بڑا رنج ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ کمسن مؤلف نے اپنے مبلغ علم اور مقام و منصب کا احساس کئے بغیر نہ صرف یہ کہ علمائے سلف پر تحقیر و تخفیف کے ترکش خالی کئے ہیں۔ بلکہ آیاتِ قرآنیہ کو بھی طباعی اور جودت کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ جودتِ طبع بے شک ایک اچھی صلاحیت ہے اور ذہانت کی تعریف ہرحال میں کی جائے گی، لیکن اللہ کی کتاب اور اللہ کے دین میں شاعرانہ انداز کی جدت طرازیاں کسی حال میں بھی لائق تحسین نہیں کہی جاسکتیں۔ یہاں شاعری کا نہیں روایت و درایت کا محل ہے۔ یہاں پرواز تخیل سے نہیں علمی استدلال و استشہاد سے کام چلتا ہے۔ تمثیلات ہم ابھی جزءِ ثانی کے تبصرے میں پیش کریں گے۔

تعارف کے بعد چند علماء کے وہ خطوط درج کئے گئے ہیں جو مؤلف کے بھیجے ہوئے خطوط کے جواب میں موصول ہوئے۔ ان میں جناب غلام احمد پرویز کا خط بھی ہے۔ نہ صرف ہے بلکہ مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا تقی امینی کے خطوط پر مقدم ہے اور لطفِ مزید یہ کہ ناشر نے جلی عنوان دے کر انھیں "مقتدر علماء" کی فہرست میں بھی شامل کر لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤلف اور ناشر دونوں ہی ذہنی عدمِ بلوغ کی حدوں سے آگے نہیں نکل سکے ہیں۔

خطوط کے بعد غازی سراج الدین صاحب کا پیش لفظ ہے۔ یہ بھی مطالب کے اعتبار سے جاندار نہیں اور اسلوب کے لحاظ سے تو بالکل ہی مبتدیانہ ہے۔ موصوف ایک دردمند انسان معلوم ہوتے ہیں، لیکن عصری رجحانات کی تاخت سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ آج کا ذہن سائنسی تگ و دَو کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور مرد و زن کے قدرتی امتیازات کو ظاہر فریب نعروں کے ذریعے خلط ملط کر دینے میں کوشاں ہے۔ شاید اسی سے ہم آہنگی کے لئے موصوف نے آیتِ قرآنی کے ترجمے کی حیثیت میں یہ فقرے سپردِ قلم کئے ہیں۔

"ہر مسلمان مرد اور عورت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے متعلق ہر قسم کی معلومات اور واقفیت بہم پہنچائے" (صـ۲۵)

ہر باہوش جانتا ہے کہ اس مفہوم کی کوئی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے نہ ہوسکتی ہے۔ خط کشیدہ الفاظ مترجم کے اپنے ذہن کی جودت ہیں۔ ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانا تو مردوں تک کے لئے نہ پہلا فرض ہے نہ دوسرا۔ کجا عورتوں کے لئے اور جس علم کی تحصیل مرد و زن کے لئے اسلام نے فرض کی ہے وہ یہ سائنس نہیں ہے جس کے گیت اس کتاب میں گائے گئے ہیں بلکہ وہ "سائنس" ہے جو انسان کو اللہ اور رسول کی مرضیات سے آگاہ کرتی ہے۔ سائنسی تگ و دو بے شک اسلام کی نظروں میں عیب کا درجہ نہیں رکھتی، لیکن نہ تو اسے ہر مسلمان کیلئے فریضۂ اولیٰ کہا جاسکتا ہے۔ نہ عورتیں اس کی مکلف قرار دی جاسکتی ہیں

ایک اور ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"کیا ہم نے زمین اور آسمانوں کے درمیان جو حرکت پذیر ہے پیدا نہیں کیا۔" (صـ۲۴)

یہ کیا ترجمہ ہوا!

"ہم آج اسلام شناسی سے اس قدر دور ہو گئے ہیں اور ہمارا خیال ہوتا ہے کہ سائنس شاید کوئی شیطانی کارنامہ ہے۔" (صـ۲۶)

اوّل تو سائنسی بصیرت کو "اسلام شناسی" کا مرادف قرار دینا بے جوڑ بات ہے۔ دوسرے یہ پتا نہیں چلتا کہ "ہم" سے مراد کون لوگ ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے معروف علماءِ اسلام اور قابلِ ذکر افرادِ ملت میں کوئی بھی سائنس کو شیطانی کارنامہ گمان کرنے کی حماقت میں مبتلا نہیں۔

"جب میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کیا شیطان نے کوئی چیز پیدا کی ہے؟ تو فوراً جواب ملتا ہے نہیں ہرگز نہیں، لیکن اس کے باوجود سائنس کو برا سمجھتے ہیں اور اسے نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔"

ہماری ناقص رائے میں اس طرح کی بے مغز باتیں اس لائق نہیں تھیں کہ کسی سنجیدہ قلم سے ان کی تراوش ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء اور اربابِ دین کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے جو طبع زاد الزامات مغرب زدہ طبقوں نے تراش رکھے ہیں انھی میں ایک الزام بھی ہے کہ علماء سائنس کو برا اور حقیر سمجھتے ہیں حالانکہ صداقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قابلِ ذکر علماء نے کبھی نفسِ سائنس کو معصیت نہیں سمجھا نہ اسے جنسِ کاسد قرار دیا وہ تو صرف اُس فکر و تہذیب کو مذموم گردانتے ہیں جس کے ہاتھ میں فی زمانہ سائنس کی باگ ڈور ہے اور یہ گردانتا بلا شبہ حق ہے۔ خدا، اخلاق اور روحانیات کے بارے میں قطعاً غیر جانبدار رہ کر خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر سائنس کے گھوڑے دوڑانا طرح طرح کی ایجادیں تو دنیا کو دے سکتا ہے، لیکن دین و اخلاق کی قدریں بھی اس کے ہاتھوں پامال ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ چنانچہ سائنس کے گُن گانے والے اُن ملکوں کی دینی و اخلاقی حالت پر توجہ فرمائیے جنھیں آج سائنس میں امامت و قیادت کا مقام حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ جس پیش لفظ کو ناشر نے اہمیت کا حامل قرار دیا ہے اس کی کوئی اہمیت ہماری کوتاہ عقل میں نہ آسکی۔

کتاب کا دوسرا جزء خود مؤلف کے رشحات پر مشتمل ہے اس میں متعدد ابواب و فصول ہیں جن میں بعض نہایت اہم اور وسیع ہیں۔ خصوصًا وہ حصہ جس میں انھوں نے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی برتری ثابت کی ہے خاصا جان دار اور دل کش ہے۔ اسلامی نظریۂ حکومت و سیاست، اسلامی عدل و نظم اور ان دونوں کے ذیلی مسائل کی تفصیلات پیش کرنے میں مؤلف نے لائقِ تعریف کاوش کی ہے۔ اسلام سے متعلق دیگر مباحث پر بھی ان کی کاہش داد کی مستحق ہے لیکن بعض اجزاء ان کی تحریر کے ایسے ہیں جنھوں نے ان کی نگارشات کا وزن بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔

زبان و انشاء کی خامیوں سے ہم تعرض نہیں کرینگے کیونکہ مؤلف کی نوعمری اس کے لئے عذر کی حیثیت سے قبول کی جاسکتی ہے، لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ انھیں اپنی ناپختگی اور کم علمی کا احساس نہیں، بلکہ جہلِ مرکب کا وہی معلوم انداز ان کی نگارشات میں متعدد جگہ پایا جاتا ہے جو مغرب زدہ متجددین کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ اگرچہ زندقہ کی اُس وادیِ تاریک تک ابھی نہیں پہنچے ہیں جہاں تمام اسلاف بے عقل، کم سواد اور فاطر العقل نظر آنے لگتے ہیں اور مشتِ خاک کی کھوپڑی میں یہ خنّاس سما جاتا ہے کہ ہم اپنے تمام آباؤ اجداد سے زیادہ عقل مند ہیں، لیکن اِس وادیِ ظلمت کی طرف سفر کے تیور ان کے قلم پاروں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

اولاً انھوں نے سلاطین کی تاریخ پر طبع آزمائی کی تو خلفائے راشدین کے بعد کے تمام ہی مسلمان خلفاء و ملوک کو بدگہر اور خدا فراموش اور ظالم و جابر پوز کر دیا۔ حتےٰ کہ حضرت معاویہؓ اور عمر ابن عبد العزیزؒ کا استثناء بھی ان کے ارشادات میں نظر نہیں آتا۔

"آیاتِ قرآنی کی غلط تاویلات" کے ذیل میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ فسادِ قلب و نظر کا واضح نمونہ ہے۔ لکھتے ہیں:-

> "جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے تو اس سے ہماری مراد ہوتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے قرآن ایک اصول یا جہاں ضرورت ہو تھوڑی تفصیل پیش کرتا ہے لیکن ضابطہ ہائے زندگی کے تمام اصولوں کی تفصیل اور جامع ہدایات تفصیلاً موجود نہیں اس کے لئے ہمیں احادیث یا قرآن کی تفسیر پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اس طرح قرآنی آیات کی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تاویلات اور تفسیر بیان کرتے وقت مختلف علماء نے تنگ نظری، خود غرضی اور کسی نظریہ یا عقیدے سے لگاؤ کی وجہ سے ایک ہی آیات کی مختلف تاویلیں کیں چونکہ عوام کو ان تاویلات پر تکیہ کئے بغیر چارہ نہ تھا اس طرح غلط تاویلات کر کے بعض علماء فرقہ بندی کا

موجب ہے اور اس طرح ملت اسلامیہ عذباتی نعروں کا شکار ہو کر فرقہ بندی میں پھنس کر رہ گئی غلط تاویلات کا دوسرا سبب یہ ہے کہ مفسرین عربی زبان میں ملکہ نہ رکھتے اور اس زبان کی سلاست، فصاحت و بلاغت اور محاورات صرف و نحو پر عبور حاصل کئے بغیر ان آیاتِ قرآنی کی افہام و تفہیم کے میدان میں اُتر آئے لیکن اس زبان کی روح کو پہنچنا ایک عجمی کے بس کی بات نہ تھی۔" (۳۹)

یہ سطور ذہن کے ایک تاریک گوشے کی طرف مشیر ہیں جس میں علمائے سلف سے بدگمانی اور ائمۂ دین سے بداعتمادی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ جو شخص کسی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ خود تو کیا جان سکتا ہے کہ کون شخص کتنا اس پر عبور رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مفسرین کی تقلیل و تجہیل کا سبق کسی اور ہی نے انھیں پڑھایا ہے۔ لیکن بی۔ اے ایل ایل بی کے کسی نہ کسی مرحلے میں یہ بدیہی اصول تو ان کے گوش گذار ضرور ہوا ہوگا کہ کسی علم و فن کے ائمہ و اساطین پر جرح و تعدیل کے لئے خود بھی اس علم و فن میں درک و مہارت نہایت ضروری ہے۔ ہیروں کی قیمت جوہری ہی متعین کر سکتا ہے۔ پنساری اگر جواہرات سے مرصع تاج کو ترازو کے پلڑے میں رکھ دے گا تو ظاہر ہے یہ مسخرہ پن ہوگا۔ پُرلطف بات ہے کہ مؤلف کی دانست میں عربی زبان — خصوصاً قرآن کی زبان کی روح کو پہنچنا کسی بھی عجمی کے بس کی بات نہیں، لیکن وہ خود عجمی ہیں اور اس کے باوجود زبان عربی اور آیاتِ قرآنیہ میں مجتہدانہ بصیرت کے مدعی ہیں! — کاش وہ بولنے سے پہلے بات کو تولتے۔

آگے مؤلف نے مفسرین کی غلط تاویلات کی چند مثالیں بھی دی ہیں مگر وہ سب مضحکہ خیز ہیں۔ حد ہے کہ خاتم النبیین کے سلسلہ میں قادیانی حضرات نے لفظ خاتم سے جو عنمدانہ کھیل کھیلا ہے مؤلف اسے بھی علمائے سلف کے حساب میں درج کر کے انھیں کوتاہ بین اور غلط گو کہنے سے نہیں چوکے۔

پھر مزے کی بات تو یہ ہے کہ اپنے دعوے کے مطابق انہیں مفسرین کی ایسی تفسیری غلطیاں پیش کرنی چاہئے تھیں جو انتشار و افتراق پر منتج ہوئی ہوں لیکن ایسا بالکل نہیں ہے فرض کیجئے مفسرین نے شجر الخلد کو گیہوں کا درخت کہنے میں غلطی کی یا یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ کا لفظی ترجمہ کر کے بقول مؤلف جہل کا ثبوت دیا تو اس سے عملی دنیا میں کونسی قیامت برپا ہو گئی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس مفروضہ غلطی کے نتیجے میں جنگ برپا ہوئی ہو یا متعدد فرقے بن گئے ہوں۔

یہ ایراد تو اس صورت میں ہے کہ مؤلف کی موشگافیوں کو بے دلیل درست مان لیا جائے، لیکن حقیقت میں ان کی موشگافیاں کسی کام کی نہیں مفسرین نے اپنی تفسیر کیلئے کسی نہ کسی روایت کا سہارا ضرور لیا ہے، لیکن مؤلف کی تفسیری کاوشوں کے لئے تو کوئی ضعیف سے ضعیف سہارا بھی موجود نہیں۔ اس کے برعکس یوم یکشف عن ساق کی جس تاویل کو انھوں نے بلا تکلف گمراہ کن قرار دیا ہے وہ درحقیقت مفسرین سلف کی اپنی تاویل نہیں بلکہ بخاری و مسلم کی حدیث مرفوع میں خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ اس انکشاف پر ایسا شخص تو شاید کانپ جاتا جسے قولِ رسول ﷺ کی صداقت پر تہہ دل سے اعتماد ہوتا لیکن مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو چکا کہ مؤلف کے نزدیک احادیث کی بنیاد پر کی گئی تفسیر بھی معتبر نہیں ہے اس لئے انھیں شاید اس انکشاف پر کوئی دھچکا نہ لگے۔

لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ سے استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ کی پنڈلی ہو ہی نہیں سکتی لہذا یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ کا یہ ترجمہ کرنا کہ "جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھایا جائے گا" سخت گمراہ کن ہے۔ ہم نہیں سمجھتے مؤلف کی منطق جس کو کیا ہو گیا۔ آخر مفسرین نے کب کہا کہ اللہ کی ساق ہماری ساق کی مانند ہے۔ وہ تو اسی طرح ساق کا ترجمہ پنڈلی

کرتے ہیں جس طرح وجہ کا ترجمہ چہرہ اور یدی کا ترجمہ ہاتھ ہوتا ہے۔ قرآن میں اللہ کے لئے وجہ، یدی، ضحک، سمع وبصرہ وغیرہ کا بھی متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اللہ کو جسمانیت سے بلند و بالا ماننے کے باوجود لفظی ترجمہ تو لغت ہی کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

پھر مؤلف کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کہنے کے باوجود اسی قرآن میں خود اللہ نے اپنے نور کی مثال پیش فرمائی ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ (سورۂ نور) تب مذکورہ استدلال کی کیا قیمت رہ جاتی ہے۔

"مشیتِ ایزدی اور اختیارِ انسانی" کے ذیل میں کہا گیا ہے:۔

> "سطحی مطالعہ رکھنے والے اکثر علماء مسئلۂ تقدیر و تدبیر کی تشریح و توضیح کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا حل نکالنے اور اُسے عمل پیرا ہونے سے زندگی کا اصل مقصد اسکے سامنے آجاتا ہے۔" (ص۶۹)

دراصل مؤلف نے ایسے ہی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی ہے جہاں علماء کی تضحیک و تحقیر ایک دلچسپ مشغلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے بار بار ایسی باتیں نکلی ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں۔ انھیں کون بتائے کہ مسئلۂ تقدیر پر بحث و تمحیص سے اکثر علماء کا گریز اس وجہ سے ہے کہ اللہ کے سچے رسولؐ نے ہی اس گریز کی ہدایت کی ہے۔ ورنہ جہاں تک بوقت ضرورت اس مسئلہ پر گفتگو کا تعلق ہے علمائے سلف نے اس پر وہ سیر حاصل اور جامع بحثیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ ممکن ہی نہیں خود مؤلف نے اس مسئلہ کی توضیح میں دو تین صفحات پر جو کچھ لکھا ہے وہ خود ان کے نزدیک ضرور نیا اور اچھوتا ہوگا کیونکہ قدیم اسلامی لٹریچر سے انھیں واقفیت نہیں ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ اس اعتبار سے پامال اور فرسودہ ہے کہ علمائے سلف مدت ہوئی اسے بہ طرح اسالیب میں دُہرا چکے ہیں۔ مؤلف اگر علماء کو حقیر ٹھیرائے بغیر اپنی کاہشیں پیش کرتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ یا پھر تخصیص و تعیین سے کام لیتے۔ گدھے گھوڑے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا واضح کرتا ہے کہ ہانکنے والے کو گدھے اور گھوڑے میں فرق کرنے کی تمیز نہیں۔

صفحہ ۵۵ کے چند کلمات بوالعجبی کا شاہکار ہیں:۔

> "علم انسان کو لکیر کا فقیر بننے نہیں دیتا بلکہ اسے ریسرچ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ کانوں سے سُنکر دل و دماغ سے تولنے پر خود کو آمادہ کرتا ہے۔ لہذا جو بھی اس دنیا میں تحقیق یا ریسرچ سے کام لے گا (مسلم ہو یا غیر مسلم) اس پر کائنات بے نقاب ہو جائے گی۔ قرآن ایسے لوگوں کو "متقین" کے نام سے خطاب کرتا ہے جن کو جنّت کی بشارت دی گئی ہے۔"

اگر مؤلف کے کمسن ذہن و شعور پر سائنس کا کابوس بُری طرح مسلط نہ ہوتا تو ایسے مضحکہ خیز فقرے ان کے قلم سے کبھی نہ نکلتے۔ مگر فوراً ہی انھیں یہ بھی خیال آیا کہ میں نے یہ کیا کہدیا اس طرح تو سارے سائنس داں جنت میں اور سارے مسلمان جہنم میں پہنچے جاتے ہیں۔ جو زرّیں الفاظ لکھے جاچکے تھے ان کو کاٹنا تو گوارا نہ ہوا ہاں آگے یہ اطلاع بہرحال دیدی کہ مسلمان تو جنت میں جائینگے اور غیر مسلم جنت سے محروم رہیں گے۔

مگر کیوں؟ جب تمام مسلم و غیر مسلم محققوں اور اسکالروں کو اللہ نے متقی کا خطاب دے کر جنت کی بشارت دیدی تو غیر مسلم بچارے دوزخی کس لئے؟ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ چونکہ اہلِ مغرب نے ایٹم بم اور دیگر ہلاکت سامان ایجادات مہیا کیں اس لئے وہ جنت سے محروم رہیں گے اور مسلمان چونکہ اپنی ایجادات میں بنی نوع انسان کی فلاح مدنظر رکھتے ہیں۔ لہذا وہ جنت میں جائیں گے۔

یہ آخر کیسی واہی تواہی باتیں ہیں۔ حیرت ہے بھی۔ اے

ایل ایل بی تک پڑھنے کے باوجود مؤلف میں ہوا وسط درجے کا بھی منطقی شعور پیدا نہ ہو سکا۔ ذہن کا یہ رُخ کس قدر بربادکن ہے کہ کفر و اسلام، فسق و تقویٰ اور فردوس و جہنم کی سائنسی تحقیق و ریسرچ کی بنیادوں پر کی جائے۔ کاش مؤلف اپنی قلم شگافیوں کو پریس میں لانے سے کسی پڑھے لکھے کو دکھا لیتے۔ "پڑھے لکھے" سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں جنھوں نے بی اے کیا ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کا کچھ علم حاصل کرنے کی طرح حاصل کیا ہے۔

اور سنیئے:—

"آج جب سطحی علم رکھنے والے تنگ نظر علماء چاند اور ستاروں پر کمند ڈالنے کی خبر پڑھتے ہیں تو (آگے) تحقیق کرنے والوں پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔" (صلا)

خواہ مخواہ علماء کی تذلیل و تخفیف کا شوق نہ ہوتا تو ایسی فضول بات کبھی قلم سے نہ نکلتی۔ کسی ایک ہی قابل ذکر عالم کا نام بتایا جائے جس نے ایسا فتویٰ صادر کیا ہو —— ہو سکتا ہے کسی جاہل داڑھی والے نے مؤلف کے سامنے ایسے احمقانہ خیال کا اظہار کیا ہو اور مؤلف اسے صرف داڑھی کی بنیاد پر عالم سمجھ بیٹھے ہوں۔ ورنہ جہاں تک سچ مچ کے علماء کا تعلق ہے ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف ایسے فتوے کی نسبت کورا جھوٹ ہے۔ اگر ہم غلط کہتے ہیں تو کوئی ایک ہی فتویٰ تمام دنیائے اسلام میں سے ڈھونڈ کے لایا جائے۔

اب آیئے ایک جھلک اس کی بھی دیکھئے کہ مفسرین کو غلط تاویلات کا مرتکب قرار دینے والا خود کس نوع کے تاویل و ترجمے کا حامل ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کا ترجمہ کیا گیا:—

"سورج اپنے اس محور پر گھومتا ہے جو قانون کے مطابق اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔" (ص۱۹)

اگر یہ ترجمہ عصرِ نو سے غیر معمولی مرعوبیت کا مظہر نہیں ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ "تجری" کا ترجمہ "گھومنا" کس سند پر کیا گیا۔ "جریان" کے معنی عربی زبان و لغت میں "بہنے" کے آتے ہیں۔ گھومنے اور گردش کرنے کیلئے دوسرے الفاظ ہیں۔ "دَوَر"، "دوران"، "صرف و صروف"، "حول و حولان"، "انقلاب و تقلب" جیسے الفاظ آتے ہیں۔ مفسرین پر الزام تھا کہ انھوں نے کسی نظریئے یا عقیدے سے لگاؤ کے باعث غلط تراجم کئے، لیکن خود مؤلف سائنس دانوں کے اس تخمینے پر ایمان لاکر کہ سورج گھوم رہا ہے لغتِ قرآنیہ کا ایسا ترجمہ پیش فرما رہے ہیں جس کے لئے عربی زبان میں کوئی سند نہیں۔ ہم نہیں کہتے کہ سورج کے گھومنے کا دعوے غلط ہے۔ ممکن ہے وہ درست ہی ہو۔ قرآن اس کا انکار نہیں کرتا، لیکن یہ جسارت بھی غیر معقول ہی ہے کہ اس دعوے پر خود قرآن کی تصدیق ثبت کر دی جائے جبکہ وہ اس سے بحث ہی نہیں کر رہا۔ قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ سورج چل رہا ہے۔ اس کی حرکت میں جریان ہے۔ وہ کسی ایک جگہ قائم نہیں ہے۔ بس۔ اب رہی یہ بات کہ اس حرکت اور رفتار کے ساتھ اس میں محوری گردش بھی موجود ہے یا نہیں قرآن اس کا فیصلہ نہیں کرتا۔ ہو جب بھی کوئی حرج نہیں نہ ہو جب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ آخر کیسا ترجمہ ہے کہ قرآن کو خواہی نخواہی سائنسدانوں کے اندازوں کا مؤید و مصدق بنایا جا رہا ہے۔

آگے کہا گیا ہے کہ "قرآن کی پچاسوں آیات سے دیگر سیارگان پر آباد مخلوق کا گمان ہوتا ہے۔" ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں۔ کسی ایک ستارے یا متعدد ستاروں پر مخلوق ہو نہ ہو قرآن اس سے بحث نہیں کرتا۔ چنانچہ مثال میں جو آیات پیش کی گئی ہیں وہ ہرگز اس پر مشیر نہیں، کجا کہ موضح اور دال ہوں۔ نیز آسمان سے مراد دو سیاروں کا درمیانی خلائی فاصلہ لینا بھی اٹکل پچو تفسیر کی ایک ناموزوں مثال ہے اور قرآن کے دابۃ الارض کی تعبیر مصنوعی سیارے یا راکٹ اور اسپٹنک سے کرنا تو اور بھی رندانہ جرأت ہے۔ عجیب بات ہے اس تفسیری نکتہ سنجی کے ذیل میں مؤلف نے دبّات کا لفظ لکھا ہے۔ ہم اسے کتابت کی غلطی سمجھتے اگر یہ ایک ہی پیرے میں تین بار اسی طرح نہ آیا ہوتا لیکن

بجائے دابّۃ کے دبّہ اور دبّات لکھنا اور اس پر کاسے دینا حیران کن ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہاں مؤلف کو وہ تفسیری روایات بھی قابلِ استناد نظر آئیں جنھیں وہ پہلے لائقِ ترک و اجتناب قرار دے چکے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو متجددین کا معمول رہا ہے۔ جب اپنی گاڑی اٹکتی ہو تو روایتوں کے سارے ذخیرے کو برملا غیر معتبر اور ناقابلِ استشہاد قرار دیدیں لیکن جب کچھ کام بنتا نظر آئے تو بے تکلف روایات سے استناد کرنے لگیں۔

سائنسی تفسیر کے میدان میں مؤلف کچھ اور آگے بڑھتے ہوئے سورہ الرحمٰن کی آیت یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ الآیۃ میں اقطارِ السمٰوٰتِ والارض کا مطلب بتاتے ہیں کششِ ثقل سے نکل کر خلا میں پرواز کرنا اور سلطان کی مراد بتائی گئی کہ کششِ ثقل پر کنٹرول کرنا یا کششِ ثقل کے مقابلہ میں زیادہ زور یا جھٹکے سے راکٹ یا مصنوعی سیارے کا آگے نکل جانا۔

اعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ اس طرح کی باتوں کو تفسیر بالرائے کہنا بھی پوری طرح ان کی قباحت ظاہر نہیں کرتا۔ یہ اصل میں تلعب بالقرآن ہے۔ مفسرینِ سلف بیچارے تو اگر مرعوب ہوئے ہیں تو روایات سے مرعوب ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے متعدد مواقع پر انھوں نے غلط روایات کو صحیح سمجھ کر قرآن کی غلط تفسیر کر ڈالی ہو۔ لیکن اس فریب خوردگی سے کم سے کم یہ تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ انھوں نے راویوں کے ظاہری تقدّس سے دھوکا کھایا۔ مگر یہ مرعوبیت کس قدر گھٹیا ہے کہ مؤلف بے خدا سائنس کے رعب میں آکر آیاتِ قرآنیہ کا کھیل بنا رہے ہیں۔ لفظ "سلطان" قرآن میں تین پینتیس بار تو آیا ہی ہوگا کسی بھی جگہ ایسی لغو نکتہ سنجیوں کی کوئی گنجائش نہیں اور اقطارِ السمٰوٰت والارض سے کششِ ثقل مراد لینا ایسا شگوفہ ہے کہ اس کی تردید کرنا بھی علم و متانت پر سخت بار ہے۔

مسلمانوں کے زوال و انحطاط کی وجہ یوں بیان فرمائی جاتی ہے:۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان قرآنی اصولوں کو اقوامِ مغرب نے اپنے ہاتھوں میں لیکر اوجِ ثریا پر پہنچنے کی جد و جہد کر رہی ہیں۔"
(ص۹۸ نقل مطابق اصل)

یہ باتیں اس نوع کی ہیں کہ ناشر اگر تعارف مؤلف کی عمر نہ بھی بتاتے تو سمجھدار لوگ اس کا کچھ اندازہ پھر بھی کر لیتے۔ لطیفے کا اتمام اس بات پہ کہ یُرۡسَلُ عَلَیۡکُمَا شُوَاظٌ مِّنۡ نَّارٍ الآیۃ سے نے ایٹم بم اور ایٹمی جنگ کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ گویا انسانوں ہی کو نہیں جنوں کو بھی اللہ نے ایٹم بم سے ہے اور ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم سے برباد ہو والے انسانوں کی تعداد میں اندازاً لاکھ دو لاکھ جنو لاشے بھی بڑھا لینے چاہئیں!

خدا ہی جانتا ہے کہ مؤلف کے ناپختہ ذہن قرآن سے اس بے رحمانہ مذاق میں کونسے فوائد نظ ہیں۔ اس طرح کی ترقی پسندانہ تفسیر کا حق تو فی زمانہ غلام احمد پرویز ہی اتنا بھرپور ادا کر رہے ہیں کہ کسی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں پھر کیوں مؤلف تحصیہ میں وقت ضائع کرتے ہیں۔

ایک ارشاد اور سنتے چلیے:۔

"موجودہ ترقی یافتہ سائنسی دور سے ۱۴ سو سال قبل تاریک دور میں اسلام کے ذخیرۂ افکار نے ہر قسم کے علوم و فنون کے جواہر ریزے بکھیرے جن کی خوشہ چینی کر کے اقوامِ مغرب نے موجودہ دور میں ضیا پاشی کی ہے۔ قرآن پاک نے زرّیں اصول پیش کئے تو مسلمان اس وقت کچھ نہ سمجھ سکا۔ آج حقیقت پر سے پردہ اٹھا تو قرآن کی صداقت سامنے آجاتی ہے. . . ." (ص۱۰۱)

گویا تمام امت جو اس حسن ظن میں گرفتار ہے کو سب سے بہتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ا

یہ محض غلط فہمی ہے۔ بہتر سمجھنے والے تو اب پیدا ہو رہے ہیں اور سائنس ہی کے انکشافات نے قرآن فہمی ممکن بنایا ہے۔

معلوم نہیں مؤلف کو کس نے بہکا دیا کہ اقوام مغرب کی سائنسی ضیا پاشیاں قرآنی اصولوں سے اخذ و استفادے پر مبنی ہیں یہ انتہائی درجہ خلافِ واقعہ خیال ہمارے احساسِ کمتری کو طفل تسلی دے تو دے لیکن سچائی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سائنس تمام تر تجربات اور ان کے نتائج کا نام ہے۔ اقوام مغرب کے لئے اوّل تو قرآن کو سمجھنا ممکن ہی کب تھا جب کہ قرآن کی تجب ایمان بالغیب سے شروع ہوتی ہے۔ سائنس اور ایمان بالغیب ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دوسرے قرآن کی صداقت پر اہل کفر کو اعتماد ہی کب تھا کہ وہ اس سے سائنسی اصول نکالنے کی دردسری مول لیتے۔ تیسرے قرآن میں ایسے اصول ہیں ہی کہاں جو ایمان اور روحانیات سے بے تعلق رہنے والی سائنس کو عملی سطح پر رہنمائی دے سکیں۔ یہ کشش ثقل اور خلائی پرواز اور ایٹم بم جیسی چیزوں کے لئے قرآنی آیات کو گواہ بنا کر کھڑا کرنا کھیل کود کے درجے کی جدّت ہے مفسرین سلف کو اناڑی اور کم سواد قرار دینے والے کو کم سے کم اتنا تو محسوس کرنا چاہیئے تھا کہ قرآن کا ایک مزاج ہے، ایک رُخ ہے، ایک موضوع ہے اور پھر ہر آیت کے نزول کا کچھ تاریخی پس منظر ہے۔ سیاق و سباق ہے۔ موقع محل ہے۔ یہ سب کچھ نظر انداز کر کے مادیت کی ترازو میں کلام الٰہی کو تولنا اور سند و روایت سے یکسر بے نیاز ہو کر عقلی جمناسٹک کا مظاہرہ کرنا محفلِ مشاعرہ میں تو لائقِ داد ہو سکتا ہے مگر علم و متانت کی بارگاہ میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، ریاضی، ہیئت، سائنس، سیاست ہر ایک کا اپنا اپنا میدان ہے۔ اپنے اپنے حدود و قیود ہیں۔ اپنے اپنے سانچے اور مزاج ہیں۔ جب بھی ان پر گفتگو ہو گی انکے التزامات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ریاضی کو شاعری کے پیمانے سے ناپا اور افسانہ نگاری کو ہیئت کی کسوٹی سے پرکھا جائے۔ ٹھیک اسی طرح قرآن کو بھی خالص مادیت اور سائنسی زاویۂ نظر سے نہیں سمجھا اور سمجھایا جا سکتا۔ وہ ایسی شے نہیں کہ اس میں آزادی سے جودتِ طبع کے جوہر دکھائے جائیں نہ وہ ایسی شے ہے کہ بی۔ اے ایل ایل بی کی قابلیت اس کی تفسیر و تاویل میں کافی ہو۔

"اسلامی نظریۂ حکومت و سیاست" کے ذیل میں کہا گیا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ اپنے اقتدار اعلیٰ کا اختیار حکومت ملت میں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار مسلمان کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے سپرد کرتا ہے۔" (ص۱۱۲)

یہ علی الاطلاق درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نسبتاً کم متقی ہو، لیکن خلافت کی صلاحیتیں اسمیں زیادہ ہوں۔ وہ ایسے متقی کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ اہل ہے جس میں حکمرانی کی صلاحیتیں مفقود ہوں۔ اسی کتاب میں مولانا تقی امینی نے بھی صفحہ ۲۱۶ پر اس حقیقت کو قرآن کے حوالے سے واضح کیا ہے۔

صفحہ ۱۲۲ پر بہت عجیب بات کہی گئی:۔

"بیسویں صدی میں البانیہ اور ٹرکی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور صاف اعلان کر دیا کہ انکی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں اور اپنے ملکی قانون اٹلی، سوئیزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونے پر ڈھال لئے۔ اب صرف افغانستان اور سعودی عرب دو جگہیں ایسی باقی ہیں جہاں "شریعت" کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ ہر امت کے لئے علیحدہ ضابطۂ زندگی نازل فرماتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں ایک جگہ آیا ہے۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا"

خط کشیدہ الفاظ سے اگر مؤلف کا مقصود غیر اسلامی دساتیر و قوانین کی تحسین و اباحت نہیں ہے تو آخر کیا ہے؟ گویا البانیہ یا ٹرکی یا کوئی اور مسلمان حکومت اگر اسلامی

قانون کو چھوڑ کر دوسری طرز کے بے خدا قوانین کو دستوری حیثیت دیدیتی ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں، بلکہ مذکورہ آیت کے مطابق اللہ نے ہر امت کیلئے علیحدہ ضابطۂ زندگی نازل فرمایا ہے اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان حکومت اسلام ہی کو "دستور" بنائے۔

دراصل مؤلف کا موعود ذہنی تو یہ نہ ہوگا لیکن ان کے حواس مدرکہ پر چونکہ مغربیت کا غلبہ ہے اس لئے وہ نادانستگی میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کو جداگانہ اقوام و ملل تصور کر بیٹھے ہیں۔ بلکہ لفظ "امت" جو قوم وملت کے لفظ سے زیادہ خاص ہے اسے بھی انھوں نے جغرافی اعتبار سے تقسیم کر دیا۔ اگر ٹرکی کے مسلمان ان کی نگاہ میں افغانستان اور عرب کے مسلمانوں سے الگ کوئی "امت" نہ ہوتے تو یہ کہنے کا کوئی محل نہیں تھا کہ ویسے بھی اللہ ہر اُمت کیلئے علیحدہ ضابطۂ زندگی نازل فرماتا ہے۔ نہ مذکورہ آیت کا کوئی موقع تھا۔

صفحہ ۱۲۷ پر ہے:۔

"چاروں خلفائے راشدین کے اصل فیصلے بھی قانون کی شکل اختیار کر گئے۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ انھیں اپنے فیصلے بھی واپس لینے پڑے، بلکہ اکثر فیصلے قرآن وسنت یا فقہی احکامات کے ظاہری اصولوں کے خلاف صادر کئے گئے جو کہ ان کی اجتہادی بصیرت کا نتیجہ ہیں۔"

یہ وہی بات ہے جو نئے دور کے نام نہاد مجتہدین نے متعدد بار صرف اس مقصود سے کہی ہے کہ جو فیصلے وہ قرآن و سنت یا اجماع کے خلاف محض نفسانیت کے تحت کرتے ہیں ان کے لئے صحابہؓ کے تعامل سے وجہ جواز ہاتھ آجائے۔ چنانچہ مؤلف نے جو چند مثالیں پیش کی ہیں وہ بھی وہی ہیں جو اس سے پہلے متجددین پیش کر چکے ہیں۔

لیکن مؤلف اگر گہرا علم رکھتے تو اس حقیقت سے بے خبر نہ رہتے کہ خلفائے راشدین کے جن فیصلوں کو قرآن و سنت اور اصول فقہ کے خلاف باور کرایا جا رہا ہے وہ ہرگز ہرگز اس نوع کے نہیں ہیں، بلکہ ان کے لئے خود قرآن وسنت میں ایجابی دلائل و قرائن موجود ہیں۔ ہم یہاں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ ورنہ ایک ایک مثال پر گفتگو کر کے بتا سکتے تھے کہ کسی بھی خلیفۂ راشد نے کوئی فیصلہ قرآن وسنت اور اصول فقہ کے خلاف صادر نہیں کیا وہ لوگ جان دے سکتے تھے مگر قرآن وسنت کے حریف نہیں بن سکتے تھے۔

مؤلف کی دانست میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی ساری داستان سائنسی کج کادی کے گرد گھوم رہی ہے لیکن ہماری دانست میں بنیادی عامل اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کہ انھوں نے اللہ اور رسول کی کامل اطاعت سے منھ موڑ لیا۔ کسی قوم کو ہلاک کرنے والی شے قول و عمل کے تضاد سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔ ماننا مگر عمل نہ کرنا۔ باتیں بنانا لیکن سعی و جہد کو بالائے طاق رکھدینا۔ نفاق، دورنگی اور تن آسانی۔ تاریخ گواہ ہے اور خود مؤلف بھی اس کے منکر نہیں ہیں کہ جب مصطلحہ علوم و فنون ایام طفولیت میں تھے اسی وقت امت مسلمہ کی عظمت و اقبال کا خادر تاباں وسط فلک تک پہنچا تھا۔ بیچارے معمولی پڑھے لکھے لوگ سائنس کے تصور تک سے ناآشنا۔ آلوں اور مشینوں سے بیخبر۔ مگر جہد و عمل کے پیکر۔ قول و فعل کے نفاق سے بلند۔ سرگرم و مستعد۔ باتیں کم کام زیادہ۔ یہ تھا وہ عامل جس نے انھیں عزت و عظمت کے سمائے ہفتم پر پہنچایا۔ یہی عامل آج بھی کسی قوم کو اونچا اُٹھا سکتا ہے۔ لیکن آج تو باتیں ہی باتیں ہیں۔ لفاظی ہی لفاظی ہے۔ زبان اسلام اسلام پکارتے خشک ہوئی جاتی ہے۔ قلم اسلامی علوم و معارف کے تاج محل تعمیر کر رہے ہیں، لیکن یہ مت پوچھو عمل کیا ہے۔ مؤلف اپنے نوزائیدہ ملک کو دیکھیں۔ حلقہ در حلقہ اسلام کی شان میں وہ قصیدہ آرائیاں ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی، لیکن ان قصیدہ سراؤں کی عملی زندگی

لیا ہے - دریں عبرت! صورت سیرت، رہن سہن، ذہنی رجحان ہر شے اسلام کی نفی اور اسلام دشمن فکر و تہذیب کی توثیق کرنے والی - جو مغرب زدہ نہیں ہیں ان پر دوسری قسم کے شیطان سوار ہیں - مولوی ملّا کی غالب اکثریت کو نفسانیت نے مارا - نفسانیت ہی کے درخت پر تقلید پرستی، کج فکری، بدعت و معصیت اور نفرت و افتراق کے پھل آتے ہیں - خواص بگڑے تو عوام بھی بگڑے - ہر طرف قول و فعل کی دورنگی، فکر و نظر کی بے راہ روی اور اسلامی اخلاق سے گریز و نفور کا دَور دَورہ ہے - حاصل یہ کہ امتِ مسلمہ کے زوال کی جڑیں اس کی نفسانیت میں ہیں - خدا فراموشی میں ہیں حقیقی اسلام سے دوری میں ہے - نہ کہ سائنسی کم سوادی میں - سائنسی، اقتصادی، تہذیبی افلاس و بے مائگی تو محض برگ و بار ہیں سبب و علت نہیں - قرآنی آیات کے نئے نئے مفاہیم نکالنے سے کیا ملے گا جب کہ ثابت شدہ مفاہیم پر عمل کی توفیق نہیں - اسلام کو کما حقہ، حرزِ جان بنالو سب دلدّر دور ہو جائیں گے - خالی ذہنی جمناسٹک میں مشغول رہے تو خالی باتوں سے کس کا پیٹ بھرا ہے جو ہمارا بھرے گا -

---

کتاب کا تیسرا جزو سوال و جواب پر مشتمل ہے - سوالات مؤلف کے ہیں اور جوابات مولانا تقی امینی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے - مولانا مودودی کے یہ جوابات تو ہم ماہنامہ ترجمان القرآن میں پہلے پڑھ چکے ہیں - ہاں اوّل الذکر کے جوابات سے اسی کتاب نے فیضیاب کیا - مولانا تقی امینی ایک صاحبِ فکر اور متین عالم ہیں - ان کی منزلت کا راقم الحروف پہلے سے معترف ہے - لاریب کہ بعض اہم سوالوں کے جواب انھوں نے بڑی توجہ اور کاوش سے دیئے ہیں، لیکن فرضِ تبصرہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اپنا پورا تاثر بے کم و کاست بیان کر دیں - معلوم نہیں کیوں وہ اپنے جوابات کی زبان و انشاء پر زیادہ توجہ نہ دے سکے - عام حالات میں ان کی تحریریں دلکش اور رواں ہوتی ہیں لیکن ان جوابات میں بیشتر عبارتیں کچھ اس نوع کی ہیں جیسے وہ ترجمہ ہوں - روانی اور رعنائی کے عوض ان میں بوجھل پن اور آورد ہے - اس کے علاوہ تطویل بھی کچھ اس قسم کی ہے کہ سوال اور جواب کا ربط باہمی متعدد جگہ دھندلا گیا ہے - پھر بڑی کمی یہ ہے کہ ان کے جوابات میں جذبات کے سوز و گداز کا نام نہیں، بلکہ ایسا خشک رکھ رکھاؤ ہے جیسے وہ کسی قانونی یا دفتری موضوع پر مصروفِ کلام ہوں - مستزاد یہ کہ ان کے جوابات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس خاص ذہن کے اجزائے ترکیبی کا اندازہ لگا سکے ہوں جو اکثر سوالوں میں کار فرما ہے - سوال اگر کسی خاص پس منظر میں کیا گیا ہو تو جواب بھرپور ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس پس منظر کو ملحوظ نہ رکھا جائے -

ہاں مولانا مودودی کے جوابات کو اس کتاب کا سب سے قیمتی سرمایہ کہا جا سکتا ہے - مولانا مودودی سے بھی فکر و قیاس کی غلطیاں ہو سکتی ہیں - ان کے قلم پاروں میں بھی جھول رہ سکتا ہے، لیکن تجدد اور مغربیت کا تعاقب ان کا خصوصی وصف ہے - اس میدان میں فی زمانہ انکا کوئی ہمسر نہیں - غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنے دَور کے نظریاتی فتنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے جھجک دِرّانہ گفتگو کر سکیں مولانا مودودی بھی اس پہلو سے اپنے دَور کے امام ہیں کہ جن مغربی افکار نے اچھے اچھے علماء کو فکر و منظر کے بعض محاذوں پر معذرت اور پسپائی کا انداز اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا انھیں مولانا مودودی نے اللہ کے فضل سے مجاہدانہ شان سے للکارا اور دلائل قاہرہ سے زک دی ہے - ھٰذا من فضل ربی یؤتیہ من یشاء - سائل کے دماغ میں اُتر جانا اور تاریکی میں چھپے ہوئے چور پکڑ لینا ان کی خداداد صلاحیتوں میں سے ایک ممتاز صلاحیت ہے جو ان کے تمام ہی "رسائل و مسائل" میں جھلکتی ہے لیکن

جب سوالات کا تعلق عصری افکار و رجحانات سے ہو تو ان کی یہ صلاحیت بڑی آن بان سے نمایاں ہوتی ہے ۔ حق یہ ہے کہ ان کے فکر و نظر اس عہدِ فرعونی کے کلیم ہیں ۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ اس کتاب کا پہلا جزء افادیت سے خالی ہے ۔ دوسرے جز میں اسلامی اصول و آئین کے ذیل میں ایسا مفید مواد پیش کیا گیا ہے جو عام لوگوں کی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگا لیکن مؤلف کا زاویۂ نظر اور سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ اصلاح طلب ہے ۔ تیسرا جز افادیت سے لبریز ہے اور جن لوگوں نے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی کے جوابات نہ پڑھے ہوں وہ صرف ان ہی جوابات کے لئے یہ کتاب خرید لیں تو سودا مہنگا نہ ہوگا ۔

آخر میں ہم یہ تنبیہ بھی ضرور کریں گے کہ ہمارے تبصرے سے کوئی یہ مطلب نہ نکالے کہ ہم سائنسی تگ و دو اور مادی ترقی کو لایعنی خیال کرتے ہیں ۔ استغفر اللہ ۔ علم و تحقیق تو مومن کا سرمایہ ہیں ۔ بڑی خوشی کی بات ہوگی اگر پاکستان مادّی ترقی کی راہ میں تیز گامی دکھائے ، لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مادی ترقی کا نام اسلام نہیں ہے ۔ اسلام عبارت ہے مکارم اخلاق سے اور اخلاق کا پیمانہ اللہ اور رسول کے فرمودات ہیں ۔ جس سائنس جس علم و حکمت جس صنعت و حرفت کا رُخ بھلائی ، انسانیت دوستی ، اخلاق اور حسنِ معاشرت کی طرف ہو وہ لائقِ صد ہزار فخر ہے ، لیکن جس کا رُخ خدا فراموشی ، تن آسانی ، جارحیت اور اسلامی اخلاق سے نفور و بیزاری کی طرف ہو اس کے ملعون و مردود ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ اسلامی اخلاق سے تہی دامن ہو کر مسلمان آسمان کے تارے بھی توڑ لائے تو اُس معبود حقیقی کی بارگاہ میں اس کے لئے کوئی منزلت نہیں جس پر ایمان کامل کا وہ مدعی ہے ۔ فنعوذ باللہ من ذٰلک ۔

تفسیر معالم التنزیل (اُردو)

● مترجم :- جناب محمد عثمان کاشف الہاشمی ۔

● طابع :- مکتبہ ندوۃ الفرقان ۔ دیوبند ۔

تجلی سائز کے ۹۶ صفحات ۔ کاغذ سفید ۔ ہدیہ فی ایشوع دو روپے ۔ ممبروں کے لئے سوا روپیہ ۔

ضخیم کتابوں کو جزءً جزءً شائع کرنے کا جو طریقہ دیوبند میں بڑے زور شور سے مقبول ہوا ہے وہ اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ۔ یہ تفسیر بھی اسی طریقے کے تحت شائع کی جا رہی ہے ۔ پہلے ایشوع کے آغاز میں ناشر نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی کی توصیفی تقریظات شائع کی ہیں جن کے بعد ہم جیسے ہیچ میرز کے لئے امن و عافیت کا راستہ یہی تھا کہ بغیر پڑھے کچھ تعریف و توصیف کر جاتے لیکن پڑھ کر تبصرہ کرنے اور تبصرے میں اپنی رائے کو بے کم و کاست سپردِ قلم کرنے کا جو مرض ہمیں ہے اس کی فطرت ہی یہ ہے کہ امن و عافیت کے خرمن میں اپنے ہی ہاتھوں سے آگ لگاتے رہو ۔ ہمیں احساس ہے کہ صاف بیانی فی زمانہ ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے ۔ لیکن خلّاقِ اکبر نے جس مشتِ خاک کو پیدا ہی اس جرم کے لئے کیا ہو وہ اپنی تقدیر سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے ۔

تفسیر کا آغاز جناب ناشر کے مقدمے سے ہوا ہے ہمیں اس بات سے بڑی گھٹن ہوتی ہے کہ جو بھی اُٹھتا ہے خدمت دین کا بلند بانگ دعویٰ لیکر اُٹھتا ہے اور یہ باور کرانے کی سعی کرتا ہے کہ اچانک اسے دین و ملت کے درد نے بے چین کر دیا ہے ۔ حالانکہ جن کاموں کی نوعیت خالص کاروباری ہو اور محض ضمناً ان سے دین و ملت کو بھی کوئی فائدہ پہنچتا ہو ان کا آغاز خدمتِ دین کے مبالغہ آمیز دعووں سے کرنا بڑی گھٹیا بات ہے ۔ حد ہے کہ کاروباری ٹکنک کے طور پر جو رعایت خاص معاونین کے لئے مشتہر کی جاتی ہے اس کے لئے بھی "دین" ہی کو استعمال کرنا عام ہو گیا ہے ۔ چنانچہ ناشر نے اسی نوع کی رعایت کا مقصد "قرآنی تعلیمات کو عام کرنا" ظاہر فرمایا ہے ۔

مبالغہ آرائی کا یہی مزاج بعض دوسرے الفاظ میں ملتا ہے۔ مثلاً :—

"ندوۃ الفرقان نے اپنا ایک عظیم الشان مکتبہ بھی قائم کرلیا ہے۔" (ص ۵)

اور— "ادارہ ندوۃ الفرقان علمی، مذہبی، درسی، غیر درسی کتب اور قرآن مجید معریٰ و مترجم مہیا کرنے والا ایک مرکزی ادارہ ہے۔"

اس طرح کی ظاہر فریب باتیں اسلامی تعلیمات کے نقطۂ نظر سے تو کیا عام کاروباری دیانت کی رو سے بھی قابلِ اعتراض ہیں۔ گز کو سوا گز کہنا ایک گوارا مبالغہ ہے لیکن انچ بھر کو سو گز پوز کرنا دروغ بافی کہلائے گا۔ ہم ادارہ ندوۃ الفرقان ہی سے نہیں دیوبند کے تمام "خادمانِ دین" سے ادب کے ساتھ گذارش کریں گے کہ خدارا اپنی تجارتوں کو ملمع کاریوں کی ناپاکی سے بچائیے۔ "خدمتِ دین" کا مقام بہت بلند ہے۔ یہی کافی ہے کہ آپ اپنے خالص تاجر ہونے کو چھپا جائیں، لیکن یہ تو بڑی جرأت ہے کہ تجارت کا آغاز ہی بلند بانگ دعاوی سے کیا جائے۔

مقدمے کے بعد دو صفحے پر "عرض مترجم" ہے۔ اسمیں فاضل مترجم نے قابلِ تعریف صاف گوئی سے ظاہر فرما دیا ہے کہ میرے مسودے کی تصحیح میں جناب ریاست علی بجنوری اور جناب مولوی محمد طفیل جونپوری فاضل دیوبند نے اعانت فرمائی اور میری کئی فاحش غلطیوں پر متنبہ کیا۔

لیکن زیرِ تبصرہ الشیوع کو اوّل سے آخر تک بہ نگاہِ غور دیکھنے کے بعد ہم یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ اس کا مسودہ زیادہ اہل حضرات کی نگاہ ثانی کا محتاج تھا۔ کتنے ہی مقامات ایسے ہیں جہاں ترجمہ بے سوچے سمجھے کیا گیا ہے۔ کتنے ہی نقائص اتنے نمایاں ہیں کہ حیرت ہوتی ہے وہ مترجم اور ان کے فاضل معاونین کی نگاہ سے کیونکر مخفی رہے۔

مترجم نے بتایا ہے کہ چونکہ مفسر شافعی المسلک ہیں، اس لئے جہاں ضرورت تھی وہاں حاشیہ پر حنفی مسلک بیان کردیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں پھر اظہار حیرت کرنے دیجئے کہ پورے الشیوع میں ایسا ایک جگہ بھی نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ "ایمان و عمل" جیسی معرکہ کی بحث میں مترجم صرف اتنا حاشیہ دیتے ہیں :—

"یہ حضرت مفسر رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنا مسلک ہے ورنہ درحقیقت یہ دونوں الگ الگ ہیں اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور دلکش تفصیل "آثار امام" اور دیگر کتابوں سے ملے گی۔" (ص ۳۵)

یہ حاشیہ ہے ؟

کسی کتاب کا اشتہار معیوب چیز نہیں لیکن ایک غلط مسلک پر ایسا طائرانہ حاشیہ کچھ ایسا انداز رکھتا ہے جیسے ناول لکھنے والے کسی تلمیح پر نوٹ دیا کرتے ہیں کہ :—

"اس کہانی کو ہمارے فلاں حیرت انگیز ناول میں ملاحظہ فرمائیے۔"

مفسر نے ایمان کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اگر مترجم نے واقعی اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ کیا ہے تو کہنا چاہئے کہ خود مفسر کے خیالات میں کافی الجھاؤ ہے۔ اس الجھاؤ کو دور کرنے کے لئے مفصل حاشیے کی ضرورت تھی لیکن پورے ہی ترجمے سے یہ بات مترشح ہے کہ مترجم صرف ترجمہ کردینا چاہتے ہیں تفہیم و تبیین پر محنت نہیں کرنا چاہتے۔

کون نہیں جانتا کہ فاتحہ خلف الامام احناف اور شوافع کے درمیان مشہور نزاعی مسئلہ ہے مفسر فضائل فاتحہ کے ذیل میں ایسی روایات بیان فرماتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہی ہے لیکن مترجم ایک لفظ بھی اس مسلک کے خلاف حاشیے میں نہیں لکھتے۔ خدا جانے پھر وہ کونسا نزاعی مسئلہ ہوگا جس میں وہ فقہ حنفی پر احسان کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

کمال یہ ہے کہ حاشیہ وہاں دیا جاتا ہے جہاں حاشیے کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے تحت مفسر نے بتایا کہ بحر کو وسعت کی بنا پر بحر کہا جاتا ہے۔ جب گھوڑا خوب دوڑتا ہے تو بولا جاتا ہے انہ بحر۔ اب اس پر

مترجم چار سطر کا حاشیہ دیتے ہیں جس کا مفاد صرف یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس معنی میں بحر کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اب سوچئے اس حاشیے کا مصرف قرآن فہمی کے ذیل میں کیا ہے جب کہ آیتِ مذکورہ میں لفظ بحر اسی عام مفہوم میں ارشاد ہوا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ اسی حاشیے کی مانند دوسرے حواشی بھی محض اس بات کے مظہر ہیں کہ مقصود قرآن کی تفہیم نہیں، بلکہ وسعتِ مطالعہ کا اظہار ہے۔

بعض روایات تو ایسی وحشت ناک ہیں کہ مترجم کو ضرور ہی ان پر حاشیہ دینا چاہئے تھا۔ بغیر حاشیے کے یہ قارئین کے لئے سوائے بیزاری و انقباض کے اور کسی تأثر کی حامل نہیں۔ قابلِ نقد روایات سے یہ تفسیر بھری پڑی ہے اس لئے سب کا نقد تو تبصرے کے محدود صفحات میں ممکن نہیں۔ صرف مثال کے طور پر ایک روایت کا ذکر کرتے ہیں:۔

قرآن کے الفاظ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ کے ذیل میں مفسر نے یہ اشکال نکالا کہ انبیاء کا قتل تو ظاہر ہے کہ بغیر الحق یعنی بلا جرم ہی ہوتا ہے۔ پھر اس ارشاد کی کیا ضرورت تھی؟ مفسرینِ کرام اس سلسلہ میں دو باتیں فرماتے ہیں۔

اس کے بعد دونوں باتیں بیان کی گئی ہیں، مگر دونوں ہی اشکال کو رفع کرنے میں ناکافی ہیں۔ پہلی کسی درجہ میں بہت ذہین لوگوں کے لئے رہنما بن سکتی ہے مگر عوام کے لئے نہیں۔ دوسری بالکل بے جوڑ ہے اور ناقابلِ اعتبار بھی۔ ملاحظہ کیجئے:۔

"یہود نے ایک بار ستر انبیاء کرام کو یک لخت دن کے ابتدائی حصے میں قتل کیا اور شام کو بازار لگایا۔" (ص۵۵)

ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس سے اشکالِ مذکور کیسے رفع ہوا۔ پھر یہ روایت انبیاء کے بارے میں جیسا کچھ غلط تأثر دیتی ہے محتاجِ تشریح نہیں۔ کیا انبیاء ایسی ہی جنسِ ارزاں تھے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر دو نہ چار اکٹھے ستر مبعوث کئے گئے اور پھر ان کی بیکسی کا یہ عالم کہ یہود نے ایک ہی وقت میں انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھدیا۔ معاذ اللہ ایسی روایات کو بلا نقد زیبِ تفسیر کر دینا اس کے سوا کیا مفاد رکھتا ہے کہ گئے گذرے عوام کے رہے سہے خیالات کی بھی مٹی پلید ہو جائے۔

ترجمہ عالمانہ ہے مگر سلیس نہیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مترجم نے کس سطح اور صف کے قارئین کو نظر میں رکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ تفسیری سلسلے کم علم عوام ہی کے لئے جاری کئے گئے ہیں، لیکن اوّل تو خود یہ تفسیر ہی بکثرت ایسے مطالب پر مشتمل ہے جو خالص مکتبی نوع کے ہیں اور ان سے استفادہ صرف مدرسین و طلباء ہی کرسکتے ہیں۔ پھر مترجم نے ان کی تسہیل کا بھی حق ادا نہیں کیا۔ ان میں اچھا لکھنے کی صلاحیت ہے، لیکن بلند پایہ انشاء لکھنے کا مفرط شوق اس صلاحیت کے نکھار میں حائل ہو گیا ہے۔ وہ نئی تراکیب اور نئے اسلوب اختراع کرتے ہیں، لیکن یہ جدّت طرازی مبتدیانہ ہونے کے باعث اغلاق اور ژولیدگی کے سوا کچھ نہیں دیتی۔

مثال کے طور پر چند ایسی عبارتیں ملاحظہ ہوں، جنھیں عوام کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے۔

"اگر پہلا حرف مشدد یا منون (تنوین والا) ہو یا منقوص یا مفتوح ہو، تاءِ خطاب ہو اور اس سے ماقبل مثلین کے علاوہ کوئی لفظ ہو تو موصوف ادغام نہیں کرتے۔ کسی متحرک حرف کا ادغام کسی حرفِ کبیر میں ہوا کرتا ہے۔" (ص۲۶)

فرمائیے کیا پلے پڑا۔ اگر مترجم نے ترجمہ صرف طلباء و اساتذہ کے لئے کیا تو منون کی تشریح میں "تنوین والا" کہنے سے کیا فائدہ۔ اور اگر یہ تشریح عوام کی خاطر تھی تو منقوص اور مثلین اور حرفِ کبیر کی بھی تشریح ضروری تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں خود مترجم بھی مطلب نہ سمجھے ہوں۔ یہ بے بنیاد

سو ظن نہیں ہے بلکہ متعدد مقامات اس کا یقین دلاتے ہیں کہ ترجمہ مفہوم و منشا سمجھے بغیر کیا گیا ہے۔

"ابو عمر اور کسائی نے ابصار کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے" (ص۳۵)

خیال فرمایئے۔ تفسیر خرید کر پڑھنے والوں میں کے آدمی امالہ کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔

"ان لوگوں نے اظہار ایمان کو اخفاء کفر سے خراب ڈالا" (ص۵۷)

اس گتھی کو اگر کسی عام آدمی نے سلجھالیا تو وہ "عام" ہی کب رہے گا۔

"یہ دونوں حضرات ایسے ہر ایک ہمزہ کو چھوڑ دیتے ہیں جو ساکن ہو اور فاء فعل ہو" (ص۳۳)

یا — "الذین یؤمنون - یہ جملہ متقین کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور ہے" (〃)

بولیئے جملے کا "مجرور" ہونا اور ہمزے کا "فاءِ فعل" ہونا کتنے ناظرین کی سمجھ میں آئے گا۔

اس تفسیر میں کتنی ہی روایات ایسی ہیں جنھیں پایۂ اعتبار سے ساقط کہے بغیر چارہ نہیں، لیکن مترجم اس خامی کا ازالہ بایں طور کرنا چاہتے ہیں:۔

"بعض حضرات نے اسرائیلی واقعات و امثال کی طرف انگلی اٹھائی ہے۔ بے شک یہ ایک کوتاہی ہے مگر حضرت مفسر رحمہ اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہیں وہ ہر واقعہ کی کمی یا کوتاہی پر اشارہ فرمادیتے ہیں۔ کوتاہی اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے کہ ایسے واقعات کو سرے سے ذکر ہی کیوں کردیا۔ مگر اس سلسلہ میں ان کو معذور سمجھنا چاہیئے ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست"

اوّل تو یہ معذرت قابل نظر ہے دوسرے مطابق واقعہ بھی نہیں ہم نے اس اشوع کو الف سے یا تک پڑھا ہے۔

معدودے چند مقامات کے مبہم اشارات کے سوا کہیں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جو قاری کو غیر معتبر روایات کی تشخیص میں مدد دے۔ حالانکہ اسرائیلیات کی نشاندہی میں صرف اشارہ ہی کافی نہیں واضح فیصلہ ضروری تھا۔

تاویل و تفسیر کا فرق بیان کرتے ہوئے لفظ تفسیر کا جو لغوی آپریشن کیا گیا ہے اس پر مفسر اور مترجم دونوں ہی کو الگ الگ داد دی جاسکتی ہے۔ آپ بھی سنتے چلیئے:۔

"تفسیر تفسرہ سے مشتق ہے اور تفسرہ اُس پانی (قارورہ) کو کہتے ہیں کہ جس سے ایک طبیب مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ اسی طرح مفسر کا کام بھی یہی ہے کہ وہ آیت کا شان نزول اور دیگر خصوصیات کو واضح کرے" (ص۱۹)

اگر صرف لفظی ہم آہنگی کی بنیاد پر اللہ نے لا تقولوا راعنا فرمایا۔ اگر اللہ کے رسول نے اعضائے مستورہ کے لئے متین الفاظ کی تلقین کی تو معلوم ہوا کہ لفظی مناسبتیں بھی بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ تب آخر اُس ذوق و وجدان کو کیا کہا جائے گا جو تفسیر قرآن میں یہ خوش خبری سنانے لگے کہ لفظِ تفسیر کی اصل قارورہ (پیشاب) ہے! قصور مفسر ہی کا سہی مگر مترجم کو حاشیے میں تو اپنی خوش مذاقی کا مظاہرہ کرنا ہی چاہیئے تھا۔

اور دیکھئے۔ حروف مقطعات کی بحث میں ارشاد ہوا:۔

"ہر حرف باری تعالیٰ کے کسی اسم مبارک کا پہلا حرف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کھیعص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ک الکافی کا پہلا حرف ہے ہ الہادی کا پہلا حرف ہے ی الحکیم کا پہلا حرف ہے۔"

کون نہیں ہے جو یہ پڑھکر چونک نہیں جائے گا کہ ی الحکیم کا پہلا حرف ہے! اصل تفسیر ہمارے سامنے نہیں اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ کیا گھپلا ہوا ہے۔ تاہم مترجم اور مسودے پر نظر ثانی کرنے والے فاضلین کو تو سوچنا چاہئے تھا کہ الحکیم کی صحیح ہجے کیا ہے۔

آگے ہے :-

" اسی طرح المص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انا اللہ الملک کی مختصر صورت ہے " ص۳۱

چلئے اس تخمینے کو تفسیر ہی شمار کر لیجئے کہ الف سے مراد انا لام سے مراد اللہ اور میم سے الملک ہے لیکن ص کہاں گیا۔ اس کے لئے بھی تو کوئی تخمینہ دینا چاہیئے تھا۔ روایت میں نہیں دیا گیا تو مترجم کو حاشیہ میں اظہارِ خیال کرنا چاہیئے تھا۔

مفلحون کی تشریح میں لکھا گیا ہے :-

" فلاح کے معنی کاٹنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ کاشتکار کو فلاح کہتے ہیں کہ وہ زمین جوتتا ہے ضرب المثل ہے الحدید بالحدید یفلح اس کے پیش نظر معنی یہ ہوں گے کہ دنیا اور آخرت میں خیر صرف ان کے لئے مختص ہے " ص۳۷

کیا بات ہوئی ؟ آخر دلیل اور دعوے میں کیا مناسبت ہے ؟ کاٹنے اور پھاڑنے کے مفہوم سے اختصاص بالخیر کیسے ثابت ہوا ؟

کفر جحود کی تعریف کی گئی ہے کہ " دل تو اس بات کا اعتراف کرتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالٰے ہیں مگر زبان سے اعتراف نہیں کرتا جیسے ابلیس اور یہود کی حرکتیں " (ص۳۷)

دونوں مثالیں غلط ہیں۔ ابلیس کب وجود خداوندی کا منکر ہوا ہے اور یہود بھی ہستی باری کے منکر نہیں ہیں۔ رہا اس آیت سے استدلال کہ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ تو اس کا تعلق رسول اور کتاب اللہ کے انکار سے نہیں۔

کفر عناد کے بارے میں ارقام ہے :-

" اللہ تعالیٰ کی معرفت دل میں جاگزیں ہے زبان سے اعتراف بھی ہے مگر عملاً اس کے احکام سے گریز کرتا ہے جیسے ابوطالب ..... "

خدا جانے مترجم کی سوجھ بوجھ کو کیا ہو گیا۔ دل کے یقین اور زبان سے اعتراف کے بعد تو آدمی مومن ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ صرف احکام سے گریز کرے تو اسے کافر خوارج ہی کہہ سکتے ہیں۔ نیز ابوطالب نے اسلام کا اعتراف کب کیا تھا۔ اگر کر لیتے تو آج کس کی مجال تھی کہ ان کا نام بغیر رضی اللہ عنہ کے لیتا۔ احکام سے گریز اسلام قبول کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ جو شخص اسلام ہی نہیں لایا وہ احکام کا محل کب ہے۔ دراصل یہاں ترجمہ کی خامی ہے۔ کہنا یوں چاہیئے تھا کہ اسلام کی حقانیت پر یقین ہے مگر قبولِ اسلام پر آمادہ نہیں۔

ایک حدیث کا ترجمہ کیا گیا۔

" سورۂ بقرہ وآل عمران کی تلاوۃ کرو یہ دونوں اپنی تلاوت کرنے والوں کے لئے بادل کی طرح جانوروں کے پرے کی طرح آکر دلائل قائم کرینگی " ص۴۸

لفظی دروبست کی خامی کے علاوہ " جانوروں " کا لفظ یہاں صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ یہ لفظ وحوش وانعام کا مفہوم ادا کرتا ہے نہ کہ طیور کا۔ پھر " پرے " بھی طیور ہی کے ہوتے ہیں اور جانوروں کے لئے غول، ریوڑ، گلّے، ڈار جیسی اصطلاحات مروّج ہیں۔ " پرندوں کے جھنڈ " کہنا یہاں موزوں ترین تھا — صفحہ ۸۲ پر کہا گیا :-

" ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ پتھر ایک چوکور آدمی کے سر کے برابر تھا "

" چوکور آدمی " کیا بلا ہوتی ہے ؟

" مآل کاران کے لئے تباہ کن ہو کر رہے گا " ص۴۹

تباہی تو خود مآل کار ہی کا نام ہے۔ کہنا یوں چاہیئے تھا کہ مآل کار ان کے لئے تباہی ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کا ترجمہ :-

" پس اگر تم گذشتہ زمانہ میں بھی نہ کر سکے " (ص۵۰)

غلط ہے۔ یہ مفہوم اگر خود مفسر نے لیا ہے تب کا غلط ہے اور مترجم کا اجتہاد ہے تب بھی غلط ہے — ا اعلان کرتا ہے کہ اگر تمھیں قرآن کے منزّل من اللہ میں شک ہے تو بلاؤ اپنے اعوان وانصار کو اور لاکر دکھا

ایک ہی ایسی صورت۔ پس اگر نہ لاسکے اور ـــ ہر گز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے پتھر اور انسان جسکا ایندھن ہیں
اس ارشادِ ربانی میں گذشتہ زمانے کا ذکر کہاں سے آداخل ہوا۔ صفحہ ۵۵ پر ـــ "صابئین کا نام بھی ان پر اسی وقت تک راس آتا رہا"

"راس" نہیں "راست آنا" محاورہ ہے۔ راس کا محل استعمال اور ہے۔

غنیمت ہے اس ایشوع کے اواخر میں مترجم نے اپنے نوٹ میں بعض روایات کو اسرائیلی روایات تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ:۔

"بہتر تھا کہ یہ روایات تفسیر میں نہ آتیں" صہ ۹۴

لیکن کیا اتنے سے اعتراف سے ان نقصانات کی تلافی ہو جائے گی جو اسرائیلی روایات کی حامل تفاسیر کا ترجمہ پیش کرنے سے ظہور میں آسکتے ہیں اور آتے ہیں۔ معلوم نہیں اُن عقلوں کو کیا ہو گیا جو آج بھی ایسی تفسیروں کو عوام تک پہنچانے کا نام خدمتِ دین رکھتی ہیں۔ ہماری نگاہ میں تو یہ کھلی عداوتِ دین ہے۔ حکیم وہ ہے جو مریض کے مزاج کو ملحوظ رکھ کر نسخہ لکھے۔ ہر دور ایک خاص رنگ، ایک مزاج، ایک فکری سانچہ، ایک نفسیات رکھتا ہے۔ اگر مقصود صرف تجارت اور اظہارِ علمیت نہیں تو علومِ دینیہ کی تبلیغ و تعلیم میں یہ التزام بہرحال ناگزیر ہے کہ ان کو پیش کرنے کا ڈھنگ ایسا ہو جو مخاطبین کے ذہن و قلب کو اپیل کر سکے۔ جو عصری تقاضوں کی جائز پاسداری سے گریزاں نہ ہو جس سے بیزاری کی وحشت کے عوض اُنس و دلبستگی پیدا ہو۔ تھا ایک دور جب دلچسپ روایتیں اور قصہ کہانیاں بھی تعلیم و تفہیم کا فائدہ دیتی تھیں، لیکن آج اس کی کوئی گنجائش نہیں آج تو پچھلے مفسرین کی تمام کنج کاویوں کو بلا انتخاب اور بلا تنقید و نظر عوام کے آگے رکھ دینا مفسرین اور ائمۂ دین کی تخفیف و تضحیک کا موجب ہو گا اور ہو رہا ہے۔ ہم نے ابھی "اسلام بیسویں صدی میں" کے تبصرے میں بے شک علمائے سلف کی حمایت اور انکی تخفیف کرنے والوں کی مخالفت کی ہے، لیکن یہ یقین بھی ہمیں بہت پہلے سے ہے کہ مفسرین و محدثین اور علمائے سلف سے بدگمانی اور استکراہ کی فضا پیدا کرنے میں مادہ پرستانہ فکر و تہذیب ہی تنہا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ ایک عامل ہماری اپنی یہ کوتاہی بھی ہے کہ روایات کے بارے میں ہمارے اکثر علماء و فضلاء نے اپنے ذہن و مزاج کو اُن جائز حدوں تک بھی نہیں بدلا جن کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ حکمت مومن کی متاع ہے۔ قرآن بار بار اس کی اہمیت نمایاں کرتا ہے۔ سچ سچ اگر خدمتِ دین کرنی ہے تو اپنے دور کے ذہنِ عام میں اُتر کر دیکھو وہ کس انداز میں سوچتا ہے۔ وہ کن بنیادوں پر کسی شئے کو رد اور کسی کو قبول کرتا ہے۔ وہ کن مؤثرات سے سُدھرا اور کن سے بگڑ سکتا ہے۔ بے عقلوں کی طرح لگی بندھی ڈگر پر چلتے رہنا اور علمائے سلف کے سرمایۂ علم و فن کو احتساب و انتخاب کے بغیر پیش کرتے رہنا اُس حکمت و تدبر سے انکار ہے جس کے بغیر انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

اس طرح کی تفسیروں کا ـــ جیسی کہ معالم التنزیل ہے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ مطالب قرآنیہ کے بارے میں اذعان و یقین کا اضافہ کرنے کے عوض رہے سہے یقین و اطمینان کی بھی چولیں ڈھیلی کر دیتی ہیں۔ مثلاً ایک عام مسلمان بھی اس بارے میں تو مطمئن ہی ہے کہ الذین یومنون بالغیب کے تحت جنت دوزخ، قیامت، ملائکہ جیسی اَن دیکھی چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن معالم التنزیل یہ بھی اطلاع دیتی ہے کہ:۔

"بعض حضرات نے غیب سے مراد صرف حضرت حق جل مجدہ سمجھا ہے۔ بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو قرآن کریم کو اس کا مدلول بتاتے ہیں" صہ ۳۵

ہر اُس قول کو بیان کر دینا جو کسی صاحب نے کیا ہو اضافۂ معلومات تو بے شک کہلائے گا لیکن عوام کے لئے اسکا اثر اس کے سوا کیا ہو گا کہ قرآن کے کسی بھی لفظ کسی بھی اصطلاح کا مفہوم معین نہیں ہے حتٰکہ "غیب" جیسا لفظ بھی جس کا مفہوم خود قرآنی آیتوں نے بے کم و کاست معین کر دیا ہے

اس کا تحمل ہے کہ لوگ اس میں قیاسات کے تیر چلائیں اور ان کے اس فعل کی تحسین بایں طور کی جائے کہ قرآن کی تفسیروں میں ان کا تذکرہ برابر کیا جاتا رہے۔

یا مثلاً عامۃ المسلمین اس بارے میں کسی الجھن کا شکار نہیں کہ آدم و حوا علیہما السلام شیطان کے بہکاتے میں آ گئے تھے اور یہ بھی انھیں یقین ہے کہ وہ ام الخبائث جو انسان کے ہوش و حواس کا تیا پانچا کر دیتی ہے وہ دنیا ہی کی ناپاک چیزوں میں سے ایک چیز ہے۔ جنت کی شراب اس نشہ کی حامل نہیں ہو سکتی جو ناپاکی اور حرمت کا سببِ واحد ہے۔

لیکن معالم التنزیل کا یہ بیان دیکھیے:۔

"حضرت سعید بن المسیب قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ آدم نے حواس و ہوش میں پھل نہیں کھایا بلکہ حوا نے پہلے اتنی شراب پلا دی کہ حضرت آدمؑ بے ہوش ہو گئے۔ اس بیہوشی میں انھیں درخت تک لے گئیں اور پھل آدم نے کھا لیا۔" ص۶۲

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم و حوا جنت میں بھی شراب سے شغل کیا کرتے تھے اور یہ بعینہٖ وہی شراب تھی جو ہوش و حواس معطل کر دیتی ہے۔ پھر اسکا پینا پلانا جائز بھی تھا۔ کیونکہ اس کی حرمت کا کوئی ذکر قرآن و سنت میں نہیں ہے نہ آدم و حوا کو اس کے سلسلہ میں کوئی سزا دی گئی۔

دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ 'لایکلف اللہُ نفساً اِلّا وسعھا' کا قانونِ الٰہی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہوش و حواس کے کامل تعطل کی حالت میں بھی انسان جو کچھ کرے گا اس پر سزا و جزا کا انطباق بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح حالتِ ہوش میں قصد و ارادے کے ساتھ کیے جانے والے افعال پر ہوتا ہے۔

تیسری بات اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ ابن المسیت جیسے مکرم حضرات بھی قسم کھانے کے معاملے میں محتاط نہ تھے۔ ظاہر ہے یہ بات محض اندازے ہی سے نکالی گئی کہ حضرت آدمؑ نے بے ہوشی میں نافرمانی کی۔ یا پھر اس کا منبع کوئی بے تہہ روایت ہو سکتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں قسم کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر پھر بھی ایک برگزیدہ عالم قسم کھا سکتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ حزم و احتیاط انھیں چھو کر نہیں گیا تھا۔ خوفِ خدا کا ان میں نام نہیں تھا۔ پناہ بخدا۔

• یہ اچھی بات ہے کہ متنِ قرآن کی تصحیح ذمہ داری سے کی گئی، لیکن تفسیر کے ذیل میں آیات کے جو ٹکڑے آئے ہیں ان میں فاحش غلطیاں ہیں۔ جیسے واخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور (ص۶۶)

یا۔ فازلھما الشیطن عنھما (ص۶۱) مجود و جُد کو ہر جگہ حجود و حجد لکھا گیا ہے۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ معالم التنزیل کو بایں انداز اردو میں منتقل کرنا اور عوام کے ہاتھوں پہنچانا کسی بھی معنی میں خدمتِ دین نہیں ہے، بلکہ سلف صالحین کی عظمت و منزلت کی لرزہ بر اندام بنیادوں کو دھکا لگانے کے مرادف ہے۔ اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بیدار ذہن اور پختہ کار مترجم کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں جو زمانے کی نفسیات کو بھی سمجھتا ہو، منجھی ہوئی زبان بھی لکھ سکتا ہو، کھرے اور کھوٹے کی بھی نہ صرف تمیز کر سکے بلکہ لومتِ لائم سے بے خوف ہو کر بات کہنے کی ہمت بھی رکھتا ہو، جیسے فنِ روایت میں درک ہو اور خزف ریزوں کو موتیوں سے جدا کر کے دکھا سکتا ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا وہ حصہ جو کتبی نوع کا ہے خطِ فاصل دیکر علیحدہ لکھا جائے تاکہ سوادِ اعظم والے عوام اسے پڑھنے اور پڑھ کر جھک ہونے پر مجبور نہ ہوں۔

ویسے ہمیں امید نہیں ہے کہ دیوبند کی خاص فضا میں کوئی عالم اِن صلاحیتوں کا حامل مل سکے۔ ملے گا تو محنت کا معاوضہ اتنا مانگے گا کہ ناشر دے نہیں سکتے۔ دیدیا تو نکو بننے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے کیونکہ یہاں ایسے گستاخوں کیلئے کوئی جگہ نہیں جو بزرگوں کو محفوظ عن الخطاء نہ سمجھیں۔

اسلام ایک نظر میں

مصنفہ: مولانا صدرالدین اصلاحی
شائع کردہ:- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند- دہلی ع۶-
صفحات ۳۲۰- قیمت ڈھائی روپے-

مولانا صدرالدین ایک جانے پہچانے اسلام پسند مصنف ہیں جن کی متعدد تصانیف اہلِ نظر سے اپنی اہمیت منوا چکی ہیں، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب ان کے اب تک کے تمام قلم پاروں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے- اسے ہم نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور پڑھنے کے بعد جو تأثر پیدا ہوا اُس کو تمثیل کی زبان میں یوں سمجھیئے کہ یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کی بنیادیں بھی مضبوط جس کی دیواریں بھی پائدار، جس کے بام و در بھی مشیّد اور جس کے نقش و نگار بھی فردوسِ نظر ہیں- الف سے لیکر یا تک نور ہی نور، حسن ہی حسن- استدلال قوی، اسلوب فصیح و بلیغ- انشاء میں رچاؤ اور گیرائی، پرداز میں بانکپن، زبان شیریں، فقرے جامع- بڑی خوبی یہ ہے کہ لفظی التزامات کے اعتبار سے فاضل مصنف کی زبان قانونی انداز کی جامعیت اور متانت رکھتی ہے، لیکن اس میں قانونی زبان والی یبوست اور سنگینی نہیں، بلکہ ایمان کے سوز و گداز اور جذبے کی نرم آنچ نے اسے بڑا دلکش، بڑا اثر انگیز اور روح پرور بنا دیا ہے- فصول و ابواب کا دروبست اور ترتیب کا حسن بھی سلیقے اور خوش اسلوبی کا مظہر ہے- قدم قدم پر آیات و احادیث کے حوالوں نے اگرچہ کتاب کو علم و متانت کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا ہے، لیکن کمال ہے کہ رعنائیِ بیان اور روانی و شگفتگی میں بالکل بھی فرق نہیں آیا-

فاضل مصنف نے پہلے "اسلام" کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی ہے- اس کے بعد بنیادی عقائد کو بڑے دلپذیر طرز میں زیبِ قرطاس کیا ہے- عقائد کے بعد اعمال کا نمبر ہے- اس سے فارغ ہو کر ارکانِ اسلام پر ایک مجموعی نظر ڈالی گئی ہے- دین و سیاست، شریعت و عبادت، اسلام اور دیگر مذاہب، امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں اور اسلام کی دنیوی برکتوں کے عنوانات پر جس اصابتِ فکر اور زندہ ضمیری کے ساتھ مصنف نے قلم اُٹھایا ہے حق یہ ہے کہ انھی کا حصہ ہے- تذکیر بھی اور استدلال بھی عقل اور جذبے کی حسین آمیزش- لاگ لپیٹ، اگر مگر کچھ نہیں- صاف اور بے لاگ باتیں- دلائل نکھرے ہوئے، پرداز ترشا ہوا، ہر لفظ کے سینے میں ایمان کا دل دھڑکتا ہوا- سچی بات ہے یہ کتاب لکھکر مصنف نے ایک نہایت قیمتی تحفہ ملتِ اسلامیہ کو دیا ہے اور اسلام کے یکجائی تعارف کا کام دینے والی دیگر کتب کی صف میں یہ کتاب منفرد اور ممتاز تر سمجھی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا- بلکہ اس لحاظ سے تو یہ بے نظیر ہی سمجھنی چاہئے کہ دین اور سیاست کے جس رشتے کو عام طور پر تاویلاتِ باردہ کا ہدف بنا لیا گیا ہے اور اچھے اچھے اہلِ علم بھی جسکے بارے میں فکری اُلجھاؤ سے نہیں بچ سکے ہیں اس کے مالہٗ و ما علیہ کو مولانا صدرالدین نے پوری جرأت اور پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کھول کر بیان کر دیا ہے فجزاھم اللہ خیرالجزاء

اس جائز تعریف کے بعد ہم ان مقامات کا بھی ذکر کرتے ہیں جہاں ہمیں ٹھٹکنا پڑا یا جہاں ہماری عقلِ کوتاہ کو بات سمجھنے میں دشواری پیش آئی ہے-

ایمان باللہ کے ذیل میں بنیادی صفاتِ باری کا ذکر کرتے ہوئے مُجازی کا اسم صفت کچھ بیگانہ سا محسوس ہوا معناً بلا ریب درست ہے، لیکن دیگر صفات کے لئے جب معروف اسماءِ حسنہ ہی استعمال کئے گئے ہیں تو بدلہ دینے کا وصف بھی کسی ایسے ہی نام سے ظاہر کرنا اولیٰ ہوتا جو اسماءِ حسنہ کی معروف فہرست میں شامل ہو-

صفحہ ۳۰ پر:-

"اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے- کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں

پیش کی جائیں اعتراف نعمت کیا جائے ..."

بات سولہ آنے ٹھیک ہے" لیکن نذریں پیش کیجائیں" کے الفاظ محلِ غور ہیں۔ نذریں ماننا اور بات ہے اور پیش کرنا اور۔ نذر اللہ کے سوا کسی کی نہیں ماننی چاہیئے بجا لیکن غیر اللہ کو نذر پیش ضرور کی جا سکتی ہے۔ مرید پیر کو، شاگرد استاد کو، اربابِ استطاعت علماء کو جو مال یا سامان ازراہ عقیدت پیش کرتے ہیں وہ بھی محاورے میں نذر پیش کرنا ہی کہلاتا ہے اور اس کے جواز میں کوئی شک نہیں۔ مقصود مصنف کا فی الاصل نذر ماننے ہی کی حرمت ہے، لیکن نقرہ جامع و مانع نہیں رہا ہے۔

شرک کی تیسری قسم کے بیان میں یہ جو کہا گیا کہ:۔

"مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی اطاعت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی ہی محبت اور عقیدت رکھے یا اسی طرح کی اطاعت کا اسے مستحق قرار دے لے تو یہ صفاتِ الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھیرانا ہوگا" (ص۳۳)

اطاعت کی حد تک بات صد فی صد درست ہے۔ لیکن "محبت" کا معاملہ ذرا الجھا ہوا ہے۔ جس نوع کے محسوسات کے لئے "محبت" کا لفظ اردو میں بولا جاتا ہے اس نوع کے محسوسات تو ذاتِ باری کے لئے خال خال ہی پائے جا سکتے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو ایمانداری کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکے کہ اسے اولاد ازواج اور احباب و اعزا سے کہیں بڑھ کر اللہ سے محبت ہے۔ تو کیا ہم سب گرفتارِ شرک ہیں۔ ہمارا ناچیز خیال یہ ہے کہ اللہ کے معاملہ میں لفظ محبت کم سے کم اردو میں اُس مفہوم و مراد کے ساتھ بولا ہی نہیں جا سکتا جس کے ساتھ یہ غیر اللہ کے معاملہ میں بولا جاتا ہے۔ غیر اللہ میں اللہ کے آخری رسولؐ بھی شامل ہیں اور بے شک ان کی محبت لازمۂ ایمان ہے۔ اسی کا نام اللہ کی محبت بھی ہے لیکن براہِ راست اللہ کی محبت بڑا گہرا فلسفہ ہے جس تک عوام کا ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا محتاط طریقہ یہی ہوگا کہ شرک و توحید کی بحث میں "اطاعت" کے لفظ پر قناعت کی جائے۔ اطاعت خالصۃً خوف ہی کے تحت ہو تب بھی مقصودِ اصلی حاصل ہو ہی جاتا ہے۔

* صفحہ ۳۵ پر ذکر مومنوں کا ہو رہا ہے۔ جنھوں نے نیک عمل کئے انھیں جنت ملے گی اور جن کا اعمالنامہ برائیوں سے پُر ہو گیا انھیں ایک ایسی جگہ دی جائے گی:۔

"جو ناقابلِ بیان تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ ہو گی ایسی تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ جو کبھی ختم ہونے والی نہ ہوں گی — اس جگہ کا نام جہنم ہے"

خط کشیدہ الفاظ نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ یہ تو اُن غیر مومنین کے لئے موزوں ہوتے جن کی تقدیر خلود فی النار ہے۔ مومن کتنا ہی بدکار ہو لیکن سزا بھگت کر آخر کار اسے جنت میں جانا ہے۔ یہی عقیدہ خود مصنف کا بھی ہے لیکن یہ الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

ہو سکتا ہے کوئی کہدے کہ ذکر مومنوں کا نہیں جملہ انسانوں کا ہو رہا ہے اور اس عبارت کا روئے سخن کافروں کی طرف ہے۔ لیکن یہ عذر معقول نہ ہوگا۔ کیونکہ اعمال کے محاسبے کا ذکر جہاں ہو رہا ہو وہاں مومن ہی موضوعِ ذہنی ہو سکتے ہیں۔ کافروں کا تو کفر ہی اکیلا وہ جرم ہے جس کے بعد جہنم رسید ہونا اعمال کے محاسبہ پر موقوف نہیں رہ جاتا۔

رسالت کی بحث میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت دی گئی ہے:۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ——— ہمیں حیرت ہوئی کہ اس میں روح کا ترجمہ "وحی" اس طرح کیا گیا ہے گویا اس میں دو رائے کی گنجائش نہیں۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ قرآن میں لفظ "روح" وحی کے معنی بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (النحل) يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (المومن) اور قرآن یا فرشتے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔

لیکن یہ طریقہ غیر علمی ہوگا کہ جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہو سیاق و سباق اور شانِ نزول پر نظر کئے بغیر "وحی" کے معنی میں لے لیا جائے۔ مثلاً وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (النساء) یا۔ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا یا۔ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء) میں روح سے وحی مراد لینا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے میں غور کی ضرورت ہے۔ بخاری و مسلم کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال اللہ کے رسولؐ سے یہودیوں نے کیا تھا اور ان کی مراد "وحی" نہیں تھی، بلکہ وہ "روح" تھی جو اجسام کو زندہ و متحرک رکھتی ہے۔ خود وہ جواب بھی جو اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے بتا رہا ہے کہ سوال وحی کے بارے میں نہیں تھا۔ وحی کا معاملہ تو بالکل صاف ہے کہ وہ اللہ کے اُن احکام و ہدایات کا نام ہے جو انبیاء کے پاس فرشتوں کے ذریعے بھیجے جاتے رہے ہیں۔ ہاں "روح" بے شک ایک سرِّ نہاں ہے، ایک راز ہے جس کی حقیقت کا علم کسی کو نہیں دیا گیا حتیٰ کہ انبیاءؑ بھی اسکے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکے کہ وہ امرِ ربّی ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے بھی وضاحت پسند نہیں فرمائی۔ شارحین لکھتے ہیں کہ خود توریت میں یہ تنبیہ موجود ہے کہ روح وہ شے ہے جس کی حقیقت پر اللہ نے کسی بندے کو مطلع نہیں کیا۔ چنانچہ یہود نے سوال ہی اس ذہن سے کیا تھا کہ اگر محمدؐ نے روح کی حقیقت بیان کرنی شروع کر دی تو ثابت ہو جائیگا کہ وہ نبی نہیں ہیں، کیونکہ نبی اٹکل پچّو کچھ نہیں کہتا اور جس شے کی حقیقت سب سے مخفی ہو اس کی تبیین و تفسیر اٹکل پچو ہی کی جا سکتی ہے۔ یا پھر یہود کا مقصود ان لاحاصل بحثوں میں وقت برباد کرنا ہو کہ روح مجرد ہے یا مادّی۔ مرکب ہے یا بسیط۔ جوہر ہے یا عرض۔ وغیر ذلک۔

مختصر یہ کہ ہمارے خیالِ ناقص میں یہاں روح سے مراد وحی نہیں ہے۔ تاہم اگر اس کی گنجائش ہو بھی تو بہرحال یہ تو نامناسب ہی ہوگا کہ ایسے فیصلہ کن انداز میں روح مراد لے لی جائے گویا یہ طے شدہ مراد ہے۔ نہ اس مراد سے کسی دعوے پر استدلال موزوں رہے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز اور زکوٰۃ کی فصول میں کہیں کہیں اندازِ بیان کچھ ایسا ہے جو غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔

مثلاً — "یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو مگر سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو۔" (صـ)

نیز — "جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ جہاں سورج نکلا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔"

پھر وہ حدیثیں بیان کی گئی ہیں جن کا اُبھرا ہوا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ نماز کفر و شرک کی علامتِ لازمہ اور ایمان سے تہی دامن ہونے کی دلیل محکم ہے۔

آگے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی اندازِ گفتگو کچھ ایسا ہی ہے جیسے تارکِ زکوٰۃ کا ایمان و اسلام ہی قابلِ تسلیم نہ ہو۔ ہماری رائے میں اس اندازِ گفتگو پر مصنف کو ایک بار اور نظر ڈال لینی چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے لئے نماز و زکوٰۃ پر زیادہ سے زیادہ زور دینا اچھی بات ہے اور اللہ و رسولؐ نے بھی ان دونوں پر بڑا زور دیا ہے۔ لیکن یہ کتاب خالی وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ عقائد کی ہے اور عقائد آئینی نوعیت رکھتے ہیں۔ آئینی زبان میں لفظی دروبست ویسا ہی جامع و مانع اور غیر مبہم ہونا چاہیئے جیسا کہ اس پوری کتاب میں پایا جاتا ہے۔

ایمان اور عمل میں سورج اور روشنی کی نسبت نہیں ہے تخم اور درخت کا تعلق ہے۔ تخم اسی لئے ہے کہ اس سے درخت نکلے۔ لیکن زمین بنجر ہو یا آبیاری پر توجہ نہ دی جائے تو ضروری نہیں کہ درخت نکل ہی آئے۔ پھر بھی نفسِ تخم کے وجود سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ یہ کہ اس مسلّمہ حقیقت کو نماز و زکوٰۃ کے ابواب میں اچھی طرح واضح کر دینا چاہیئے کہ ایمان کا خاتمہ جحود و انکار کی صورت میں ہوتا ہے نہ کہ ترک و تساہل کی صورت میں۔ اس بات پر تو خود مصنف ہی نے زور دیا ہے کہ نماز و زکوٰۃ وغیرہ

کُل دین نہیں ہیں اجزائے دین ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ کسی جز اور شعبے کے نہ پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل شے ہی مفقود ہو۔ کفر تو صرف ایک سنتِ ثابتہ متواترہ ہی کے انکار سے لازم آجاتا ہے چہ جائیکہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے انکار سے لیکن خروج عن الایمان ہزار نمازوں کے ترک اور سالہا سال زکوٰۃ نہ دینے سے بھی لازم نہیں آتا۔

ہو سکتا ہے مصنف ذہنی طور پر اُن علماء کی صف میں ہوں جنھوں نے بعض آیات و احادیث کے ظاہر سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ بے نمازی کافر ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیئے جو اہلِ کفر کے ساتھ ہوتا ہے۔ نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے نہ اس سے شادی بیاہ کے رشتے جوڑے جائیں وغیر ذالک۔

لیکن ایسا سوچنا بے حد غلط ہے۔ ایسا وہی سوچ سکتا ہے جو یا تو پورے قرآن اور ذخیرۂ سنت سے واقف ہی نہ ہو یا واقف ہو تو اجتہاد و تفقہ کی اونچی صلاحیت اور دینی بصیرت سے محروم ہو۔ فاضل مصنف کے بارے میں دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں کہی جا سکتی۔

حج کے تذکرے میں الم ترکیف والے واقعے کا مختصراً ذکر آیا ہے۔ اس میں یہ فقرہ کھٹکا:۔

"ابرہہ کی فوجیں کعبے کو ڈھا دینے کے ارادے سے بڑھ آئی تھیں اور پھر پتھروں سے ہلاک کر دی گئی تھیں۔" (ص۱۳۲)

ڈھیلے تو پتھروں کا لفظ کنکریوں پر بھی بولا جا سکتا ہے لیکن چونکہ بعض ایسے حضرات نے جنھیں یہ باور کرنے میں تکلف ہے کہ ننھی ننھی چڑیوں کی پھینکی ہوئی کنکریوں سے بھی کوئی لشکر تباہ ہو سکتا ہے دوسری نوع کی تاویلیں کی ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ کہیں مصنف بھی تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کی کوئی ایسی ہی تاویل تو نہیں کرتے۔ پتھروں کا لفظ جو تصور دیتا ہے وہ یقیناً اس سے مختلف ہے جو پرندوں کے برسائے ہوئے سنگ پاروں کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں تو فوج ابرہہ کی بربادی کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ قادرِ مطلق نے پرندوں ہی کے ذریعہ اس پر خزف ریزے برسا دیئے تھے اور اس برسات کو کنکریوں ہی کی برسات کہنا موزوں ہوگا۔

صفحہ ۱۴۶ پر:۔

"ہر شخص جانتا ہے کہ ان تعلیمات میں بے شمار ایسی ہیں جن کا تعلق دنیا کی بھری زندگی سے ہے۔"

"دنیا کی بھری زندگی" شاید جدّت ہے۔ بات محاورے کے دائرے میں آجاتی اگر "بھری پُری" کہہ دیا جاتا۔

پوری کتاب میں احادیث پر بھی اعراب کا التزام کیا گیا ہے اور تصحیح قابلِ تعریف ہے۔ لیکن کیا اسے کتابت کی غلطی سمجھیں کہ صفحہ ۱۵۸ پر بخاری کی ایک حدیث میں اعراب یوں ہے:۔

حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوْرِثُهٗ۔

يُوْرِثُ تو لازم کا صیغہ ہے حالانکہ محل متعدی کا تھا۔ صحیح اعراب یوں ہونا چاہیئے۔ سَيُوَرِّثُهٗ (واؤ پر زبر را پر تشدید)

جہاد کی بحث میں یہ فقرہ:۔

"جہاد ایک باقاعدہ نظام حکومت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔" (ص۲۱)

جامع مانع نہیں۔ اگرچہ جہاد کی پوری بحث پڑھنے کے بعد سارے پہلو منقح ہو جاتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ فقرہ اپنی جگہ کسی ایسے لفظ کا طالب ہے جو استثناء کا اشارہ دے سکے۔

ہمیں یہ بات بھی مزید غور و فکر کی مستحق نظر آتی ہے کہ:۔

"اسلامی ریاست کا حقِ شہریت ہر اس شخص کو حاصل ہوگا جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔ اس طرح صرف وہی مسلمان اس ریاست کے شہری نہ ہوں گے جو اس کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں بلکہ دنیا کے کسی بھی حصے کا رہنے والا مسلمان جیسے ہی اس ریاست میں آئے گا آپ سے آپ

اس کا شہری بن جائے گا۔ (والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض" کلمہ

اگر دنیا میں صورتِ حال وہی پیدا ہو جائے جو اسلام کو مطلوب ہے، یعنی تمام عالمِ اسلامی کا ایک ہی خلیفہ ہو، ہمیں تو تب بھی اس بیان فرمودہ قانون کی قطعیت میں شک ہے چہ جائیکہ وہ صورتِ حال ہو جو خلافتِ راشدہ کے کچھ عرصے بعد ہی پیدا ہو گئی تھی اور آج بھی موجود ہے کہ مختلف مسلم حکومتوں کے الگ الگ سربراہ ہیں۔ ہم خلافتِ راشدہ کی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اکابر صحابہؓ کو مدینے میں روکے رکھا اور آخر دم تک اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ جہاں چاہے جاتے پھریں جہاں چاہے اقامت گزیں ہو جائیں اس بارے میں حضرت عمرؓ کے جو الفاظ تاریخ میں منقول ہیں وہ بھی حکم ہی کے تیور رکھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو کسی خاص علاقے میں روکے رکھنا اگر ملک وملت کے مفاد میں ہو تو خلیفہ اس کا مجاز ہے۔ اور جب اس کا مجاز ہے تو وہ اس بات کا مجاز تو بدرجۂ اولیٰ ہوگا کہ ملک و ملت کے مفاد اور سیاسی و عمرانی مصالح کے پیشِ نظر اگر اس کے زیرنگیں ممالک کے مابین پاسپورٹ کی پابندی ضروری ہو اور ایک ملک کے شہریوں کا دوسرے ملک میں آزادانہ جانا اسٹیٹ کے اقتصادی یا معاشرتی کسی بھی نوع کے مفاد پر اثرانداز ہوتا ہو تو وہ کچھ آئینی پابندیاں عائد کر دے۔

جو آیت بطور استدلال پیش کی گئی ہے وہ فی الحقیقت اس طرح کے آئینی و سیاسی اُمور سے کوئی تعلق نہیں رکھتی مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو ترکہ چار حقیقی بھائیوں کو مل رہا ہے اس میں برابری کی شرکت کے لئے ہر مسلمان اس دلیل کے سہارے دوڑ پڑے کہ ہم بھی تو تمہارے بھائی ہیں یا ہر مسلمان کی لڑکی دوسرے مسلمان کے لئے محرم قرار پائے کیونکہ بھتیجی کو قرآن نے محرم قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے آیت مستدلہ میں مجاز کا پیرایہ ہے اور یہی مجاز حدیثِ رسول میں یہاں تک پھیل گیا ہے کہ تمام ہی انسانوں کو باہم گر بھائی بھائی فرمایا گیا۔ تو اس طرح کی تعبیریں اُصول و آئین میں ہرگز دخل انداز نہیں ہو سکتیں اگر متعدد ممالک ایک خلیفہ کے زیرِ انتظام ہوں تو گوناگوں مصالح اس بات کے متقاضی ہو سکتے ہیں کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے اور وہاں کا شہری بننے پر کچھ نہ کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ آخر بھائیوں میں بھی تو دشمنی، منافرت، کشمکش ہوتی ہے۔ خلیفہ اور اس کے مشیر اس بات کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں کہ ان کے کچھ بھائی ازراہِ فساد بھی ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ حقِ شہریت کی اس درجہ مطلق آزادی کو اسلام کی ایک آئینی دفعہ کی حیثیت سے پیش کرنا ہماری ناچیز رائے میں غور طلب ہے۔

صفحہ ۲۵۲ پر ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا کا ترجمہ:۔

" اس نے پہلے سے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اور اسی خصوص میں رکھا ہے "

نیا سا معلوم ہوا۔ مفسرین تو عام طور پر ھٰذا کا مصداق قرآن مانتے ہیں اور ھو کا اشارہ چاہے حضرت ابراہیمؑ کی طرف ہو چاہے باری تعالیٰ کی طرف دونوں صورتوں میں قرآن کو مصداق ٹھیرانا غیر موزوں نہیں۔ چونکہ قرآن میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی دعا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ موجود ہے اس لئے ھو کا مشارٌ الیہ حضرت ابراہیمؑ کو ماننے کے بعد بھی ھٰذا کا مصداق قرآن مان لینے میں استبعاد نہیں رہتا۔ اس نکتہ کو عام قارئین شاید نہ سمجھیں لیکن حضرت مصنف کو اس پر نگاہ فرمانی چاہیئے۔ فی ھٰذا سے یہ مراد لینا کہ "اسی خصوص میں رکھا ہے" معلق و مجمل سی بات ہے۔

آگے ایک سے زائد جگہ " اسلحین " کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کیا حرج تھا اگر " اسلحہ " پر اکتفا کیا جاتا۔

اردو طریق پر جمع الجمع بے مزا سی معلوم ہوئی۔

"مسلح جہاد" کے زیر عنوان کہا گیا ہے:۔

"نماز کے سوا کوئی اور عمل اتنا محبوب نہیں ہے" صفحہ ۲۸۹

لیکن بعد کی تمام توضیحات ثابت کرتی ہیں کہ نماز کا استثناء درست نہیں۔ صحیح بھی یہی ہے کہ جہاد بالسیف بلا استثناء ہر عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اُن احادیث کے علاوہ جن کا ذکر مصنف نے کیا بہت بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے جہاد کی خاطر کئی وقت کی فرض نمازیں قضا کر دیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نماز کی خاطر جہاد قضا کر دیا ہو۔

صفحہ ۲۹۷ پر اس جملہ نے چونکا دیا:۔

"جہاں ضرورت نے اسے بیکار اور ضروری شرطوں نے ہری جھنڈی دکھادی۔"

معلوم نہیں ژرف نگار مصنف نے یہ ہری جھنڈی کا شوخی اور مزاح ملا ہوا محاورہ کیسے استعمال کر ڈالا جبکہ پوری کتاب کی زبان متانت کی بلند سطح اور ثقہ مزاج رکھتی ہے

ان معروضات کے بعد ہم اعراب کی غلطیاں بھی سپرد قلم کرتے ہیں۔ اس سے اعتراض مقصود نہیں، بلکہ چونکہ تصحیح کا عمدہ اہتمام کیا گیا ہے اس لئے زیر زبر کی معدودے چند غلطیاں بھی اگلے ایڈیشن کے لئے پلیٹوں میں درست کرلی جائیں تو بہتر ہوگا۔

صفحہ ۸۹ پر سورۂ مومنون کی آیت کا نمبر غلط ہے۔ ۶۲ کی جگہ ۶۰ بنا لینا چاہیئے۔ بعض صفحات بھی الٹ پلٹ لگ گئے ہیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۴	۵	مُعْرِضُوْن	مُعْرِضُوْن (قرآن)
۱۸۰	۱۱	اَلْخِنْزِیْر	اُلْخِنْزِیْر (حدیث)
۲۲۴	۸	وِسَعَۃٌ	وَسِعَہ (حدیث)
۲۶۳	۱	اَنَّمَا	اِنَّمَا (حدیث)
۲۶۵	۱	دَانَّہٗ	وَانَّہٗ (قرآن)
۲۶۵	۳	اِئْتَمِرُوْا	اِئْتَمَرُوْا (حدیث)
۲۶۶	۵	وَنَمُوْا	وَکَمُوْا (قرآن)
۲۷۵	۱۰	بعثنی	بعثنی ودیاہ (حدیث)
۲۹۶	۲	اَنَّا قُلْتُمْ	اَنَّا قُلْتُمْ (قرآن)

تبصرے کا لب لباب یہ ہے کہ "اسلام ایک نظر میں" ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیئے۔ عوام ہی نہیں بہت سے خواص بھی بعض اُن عقائد و تصورات کے بارے میں صاف ذہن نہیں رکھتے جن کی دل نشیں تنقیح و تصریح اس بیش بہا کتاب میں کی گئی ہے۔ قیمت بھی کم ہے۔ اتنے صفحات کی کتاب آج کے بازار میں عموماً ساڑھے تین کی ملتی ہے۔ مکتبہ تجلّی کی "بدعت کیا ہے" اتنے ہی صفحات کی ہے مگر اس کی بھی قیمت تین نہیں ڈھائی ہے۔

پس چہ باید کرد؟

جماعت اسلامی ہند کے امیر جناب مولانا ابو اللیث اصلاحی کا یہ فکر پارہ جو تیس صفحات کے پمفلٹ کی صورت میں مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے شائع کیا ہے۔ وقت کی اہم تر چیز ہے۔ مسلمان کیا کریں؟ یہ سوال ایک اژدر کی طرح گھٹاٹوپ اندھیرے میں جبڑے پھیلائے کھڑا ہے۔ جوابات بہت دیئے گئے لیکن "اونٹ کی داڑھ میں زیرہ" کے مصداق یہ اس دیو پیکر اژدر کے معدے میں اُتر کر تحلیل ہو گئے اور اس کے کھلے ہوئے جبڑوں سے برابر ھل من مزید کی پرشور صدا بلند ہو رہی ہے۔

مولانا ابو اللیث کا جواب فکری پاکیزگی کے اعتبار سے یقیناً پرکشش ہے اور مسرت کی بات ہے کہ خالص مومنانہ زاویۂ نظر سے غور و فکر کرنے والے ابھی خاکدانِ بھارت میں نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ اپنی زندگی کا ثبوت بھی دے رہے ہیں، لیکن عملی نقطۂ نظر سے تو یہ جواب بھی بجائے خو[د] گوناگوں سوالوں کا مصدر و منبع نظر آتا ہے اور مولانا خو[د] بھی اسے سوال ہی کے پیرا[یہ] میں پیش کر رہے ہیں۔

انھوں نے مسائل حاضرہ کا جائزہ جس مبصرانہ انداز میں لیا ہے وہ بحیثیت مجموعی لائق تعریف ہے اور ان کا

۱۵ یعنی حرف اوّل "ا" کو بے اعراب چھوڑ دینا چاہیئے اور "تَ" پر زبر ہے ۱۲

ہمیشہ ہی جس آئینی انداز سے لکھ رکھاؤ اور اگر مگر کی فکر انگیز ٹکنک کو ملحوظ رکھتا ہے اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن بعض مقامات پر وہ اتنے گہرے چلے گئے ہیں کہ ہماری کوتاہ بصیرت ان کا ساتھ نہیں دے سکی۔

مثلاً وہ نیشنلزم کے زیر عنوان فرماتے ہیں :۔

" نیشنلزم اپنی سادہ شکل میں چنداں معیوب چیز نہیں ہے اور نہ اس سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے ۔" (صہ ۱۲)

ہماری محدود عقل اب تک یہ سمجھتی رہی ہے کہ "نیشنلزم" دنیا کے اُن چند زہروں میں سے ایک قاتل زہر ہے جس کے خمیر ہی میں سمیت کے لاینفک اجزاء شامل ہیں۔ "نیشنلزم" اپنی وضع ہی کے اعتبار سے ایک ایسے تعصب کا مفہوم رکھتا ہے جو انسانیت کی آفاقی حیثیت کا کھلا منکر ہے۔ اسکی سادہ شکل کونسی ہے یا ہو سکتی ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

" بلکہ اگر اس کو (نیشنلزم کو) اس معنی میں لیا جائے کہ وطن کے ہر باشندے کو اپنے وطن سے محبت ہونی چاہیئے تو مسلمان اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتا کیونکہ کس کو اپنے ملک سے محبت نہیں ہوتی اور اسلام اس سے روکتا نہیں، بلکہ اس کو پسند کرتا ہے اور اس معنی میں نیشنل ازم مسلمانوں کیلئے خطرناک ہونے کے بجائے ان کے حق میں مفید ہی ہو سکتا ہے ۔"

ہمارے خیال میں یہ بہت سادہ سی حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ازم محض ایک سیدھے سادے مجرد خیال سے عبارت نہیں ہوا کرتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ محض ایک یا دو چار بسیط و مجرد نوع کے خیالات و احساسات کو کبھی کسی نے "ازم" کا نام نہیں دیا۔ ازم کا نام تو دیا ہی اُس وقت جاتا ہے جب کوئی خیال و تصور ایک مستقل فلسفے ایک فکری نظام ایک طویل الذیل نظریئے کی شکل اختیار کر لیتا ہے نیشنلزم کا کوئی سادہ سے سادہ تصور بھی ان فاسد و کاسد لوازمات سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا جو اسلام کے آفاقی و انسانی نقطۂ نظر کی ضد ہیں۔

اور اپنے ملک سے محبت بیشک ناپسندیدہ شے نہیں ہے لیکن جن بنیادوں پر آج کی دنیا محبت کا سبق دے رہی ہے وہ اُن تصورات سے کوئی میل نہیں رکھتیں جن کے تعلق سے اسلام وطن کی محبت کو پسندیدہ قرار دیتا ہے لہذا نیشنل ازم کے وہ معنی کبھی نہیں نکل سکتے جنھیں مولانا نے بطور تمنا بیان کیا ہے :۔

" ہندوستانی معاشرے میں وسعت و رواداری کا جو عنصر پایا جاتا ہے اس کی بناء پر عام ہندوستانی ذہن نسل و نسب اور جغرافیائی نسبت و تعلق سے گہرا لگاؤ رکھنے کے باوجود نیشنلزم کی کوئی جارحانہ شکل اور خصوصیت کے ساتھ اسکی فسطائیت پر مبنی شکل کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔" (صہ ۱۲)

لیکن ہماری نظر میں ہندوستانی معاشرے میں رواداری و وسعت کا عنصر اُس ماضی کی بچی کچی پونجی ہے جب قومی احساسات نے ازم کا جامہ نہیں پہنا تھا۔ جب سے دنیا نے ان احساسات کو ازم کے سانچے میں ڈھالا یہ عنصر کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور ایک ہی ملک کے مختلف صوبے بھی اس ازم کے فطری اثرات کی آماجگاہ بنتے جا رہے ہیں۔ جارحیت کو اگر محض مار کاٹ کے محدود معنی میں نہ لیا جائے تو ہمارے نزدیک نیشنلزم کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو غیر جارحانہ کہلائی جا سکے۔ ہاں غیر فسطائی بے شک ہو سکتی ہے مگر گہرائی میں جائیے تو غیر فسطائی فسطائی سے زیادہ خطرناک ہوگی۔ فسطائیت انسانی قلب و ضمیر کو دھوکا نہیں دیتی، لیکن جب جارحیت اور قوم پرستی کو ظاہر فریب قوانین و اصطلاحات کا لباس پہنا کر غیر فسطائی بنا دیا جائے تو قلب و ضمیر بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں اور قومیں معصومیت کے ساتھ گمراہی کے وہ مراحل طے کر جاتی ہیں جو فسطائیت کے دور میں کبھی طے نہیں ہوا کرتے۔

خلاصہ یہ کہ نیشنل ازم پر مولانا کا اظہار خیال ہمارے خیالات کی سطح سے بلند رہا۔

یہ بات بھی بظاہر خوش فہمی ہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں شہادتِ حق کے ذریعہ اکثریت کو اس بات پر آمادہ کرنا آسان ہے کہ وہ اسلامی جمہوریت کا تجربہ کرکے دیکھے۔ مولانا کے الفاظ:۔

"اس لئے ملک کی اکثریت کو اس تجربہ پر آمادہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے" ص۳۶

حسن آرزو کا ایک شاعرانہ مظہر تو ہو سکتے ہیں، لیکن حقائق ان کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے۔ حقائق تو یہ ہیں کہ ہمارے خوبصورت نظریات کے مقابلہ میں حریف نظریات کی قوت و شوکت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا تناسب بھی بیان کرنا ریاضی کے بس کی بات نہیں اور یہ قوت و شوکت ہمیں اور ہمارے دین کو تسلسل، انتظام اور عزم کے ساتھ اُدھیڑنے میں مصروف ہے۔ ہم شہادت حق کہاں اور کیسے دیں گے جب کہ تیروں کی بوچھار میں ہمیں اپنا وجود ہی بچانا دوبھر ہو رہا ہے۔ ہماری جمعیت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک جماعت اسلامی کو چھوڑ کر کوئی بھی ٹولی اس پر آمادہ نہیں ہے کہ شہادتِ حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہمت آزما وادیوں میں قدم رکھے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا۔ اگر ہم جُڑ جائیں، ہماری اکثریت کسی ایک موقف پر متحد ہو جائے تب تو ممکن ہے کہ شہادتِ حق کی بھی راہیں نکل آئیں، لیکن بحالتِ موجودہ یہ صرف خواب ہے ایسا خواب جو تمناؤں کے گیسو سنوار تا ہے اور بس!

لیکن اس سے بہت خوشی ہوئی کہ مولانا نے الیکشن میں حصّہ لینے کو اصولی اعتبار سے جائز مان لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی واضح فرمودہ متعدد وجوہ سے یہ شرکت فی الوقت مناسب نہ ہو یا اسے مناسب بنانے کیلئے بہت سے قیود و شرائط کی ضرورت ہو، لیکن اصلاً اس کو مباح تسلیم کر لینا امید دلاتا ہے کہ دیر سویر اس پر عمل کی نوبت بھی آسکتی ہے اور جماعت اسلامی کے اونچے تصورات کو عملی دنیا میں اپنی قدر و قیمت منوانے کا موقع بھی مہیا ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ کہ مولانا ابو اللیث کا یہ پمفلٹ عام و خاص کے لئے غور و التفات کی ایک اہم چیز ہے جس کی بنیاد پر اگرچہ کوئی عملی جد و جہد فوری طور پر ممکن نہ ہو لیکن فکر و تعمق کے لئے اسے مہمیز کا درجہ ضرور حاصل ہے۔

اس کی قیمت ۲۵ پیسے ہے اور ملنے کا پتہ ہے:۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ سوئی والان۔ دہلی ۶

(۱) آئینۂ قرآن
(۲) آئینۂ رسولؐ
(۳) آئینۂ ایمان

یہ تینوں کتابیں دار الاشاعت اسلامیہ (۸۰ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ ۱) نے شائع کی ہیں۔ نمبر۱ صفحات ۱۳۶ قیمت درج نہیں۔
نمبر۲ صفحات ۱۲۸ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔
نمبر۳ صفحات ۹۶ قیمت ایک روپیہ دو آنے۔

کاغذ تینوں کا سفید ہے اور کتابت و طباعت بُری نہیں

(۱) آئینۂ قرآن میں ایک مختصر لیکن مفید مقدمے کے بعد مختلف عنوانوں کے تحت آیاتِ قرآنیہ مع ترجمہ درج کی گئی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عوام کو مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی آیتیں آسانی سے مل جائیں اور وہ عمل کر سکیں۔ یہ اس کتاب کا اوّامر نمبر ہے اس لئے صرف مثبت احکام سے متعلق آیتیں دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے۔

یہ بات "اسراف" میں داخل محسوس ہوئی کہ بالکل ایک ہی مفہوم و منشاء کی اگر دو آیتیں بھی نقل ہوئی ہیں تو ہر ایک پر مستقلاً عنوان لگایا گیا ہے۔ مناسب تھا کہ متعلقہ آیات پر ایک ہی عنوان لگایا جاتا۔ تکرارِ عنوان سے کاغذ کی بربادی کے سوا کیا حاصل ہے۔ حد ہے کہ مثلاً عنوان دیا گیا "ترغیب جہاد" اور آیت کے دو لفظ دیدیئے گئے وحرّض المومنین۔ پھر فوراً ہی عنوان دیا گیا جہاد کی ترغیب اور دوسری آیت دی گئی یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِینَ عَلَى الْقِتَالِ اور اس سے قبل "جہاد کا حکم" عنوان قائم کرکے فَقَاتِلْ فِی سَبِیلِ اللَّهِ کے الفاظ نقل کر دیئے گئے۔ یہ عنوانات کی کیسی فضول خرچی ہے۔

متعدد عنوانات لفظاً بھی قابل اعتراض ہیں، مثلاً:۔

"رسول اللہ اللہ کے نور ہیں"

یہ نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن ہے۔ خصوصاً جس ملک میں رسول اللہؐ کی غلو آمیز عقیدت عام ہو وہاں بلا تصریح ایسے عنوان شرک و زندقہ کے سوا کچھ نہ دیں گے۔

یا مثلاً عنوان ہے "قربت کا بہترین وقت" ص۱۱۱

اس عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ زن و شوہر کی مباشرت کے لئے جو اوقات شرعاً درست ہیں اُن میں کا بہترین وقت بیان کیا جائے گا۔ لیکن آیت وہ دی گئی جو یہ بتاتی ہے کہ حالتِ حیض میں مباشرت درست نہیں۔ جب عورتیں حیض سے فارغ ہو جائیں تو مباشرت کی جائے۔ بھلا اس آیت پر مذکورہ عنوان کیا معنی رکھتا ہے۔ حالتِ حیض میں تو قربت حرام ہے جب کہ "بہترین" کا لفظ حرام کے مقابلے میں نہیں بولا جاتا۔

"دو گواہ بناؤ" ص۹۳

اس عنوان سے اور اس کے ذیل میں دی ہوئی آیت وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ سے آخر کوئی کیا سمجھے گا کہ کس معاملہ میں دو گواہ بنانے کی ہدایت ہے۔ گواہی کا نصاب تمام ہی شرعی اُمور میں تنہا یہی نہیں ہے، اور جن اُمور میں یہی ہے ان میں بھی ایک گواہ کی جگہ دو عورتیں لے لیتی ہیں اگر دوسرا مرد گواہ نصیب نہ ہو۔ حواشی کے ذریعہ اس طرح کی چیزوں کو واضح کرنا چاہیئے تھا۔

"نیک چلنی کی اصلاح" ص۸۸

یہ بھلا کیا عنوان ہوا۔ زیرِ عنوان آیت سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ اصلاح کا الف کتابت کی غلطی ہو۔ تاہم اگر ایسا ہی ہے تو "صلاح" بھی غلط ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ "صلاح" نہیں دیا کرتے حکم اور ہدایت دیتے ہیں۔

کچھ مقامات پر کتابت کی غلطیاں بھی نظر آئیں۔ مثلاً ص۶۴ پر دَكُنْ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ چھپا ہے۔ حالانکہ صحیح السّٰجِدِيْنَ ہے۔ صفحہ ۹۸ پر جَاهِدُوْا کو جَاهَدُوْا لکھا گیا ہے۔

خیر کتابت کی معمولی غلطیاں تو ایسی کتاب میں زیادہ قابلِ اعتراض نہیں جس میں بہت ساری عربی ہی عربی ہو۔ لیکن عنوانات، تراجم اور انتخاب میں یہ ملحوظ رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ جن عوام کی خاطر کوئی کتاب چھاپی جا رہی ہے وہ کن الفاظ سے کیا تاثر لیں گے۔ تھوڑے بہت فوائد آیات کے ساتھ ضرور ہونے چاہئیں۔

اس کتاب کے مرتب جناب مولانا حکیم حفیظ اللہ صاحب ہیں۔

(۲) آئینۂ رسول میں زیادہ تر ایسی احادیث کا خالی ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے۔ کیا شک ہے کہ اس طرح کی کتابیں عوام کے لئے بڑی نافع ہیں اور سنتِ رسولؐ کے بغیر دین کا کوئی مفہوم ہی نہیں، لیکن ایسی کتابیں ترتیب دینا کافی بالغ نظری کا متقاضی ہے۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ بہت مفید مواد جمع کر دینے کے باوجود اس کتاب میں احتیاط اور بالغ نظری سے کما حقہٗ کام نہیں لیا گیا ہے۔

عنوانات کا شوق تو اس میں بھی افراط و اسراف کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ خیر اسے چھوڑیئے۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ جن حدیثوں کے مقصد و منشاء تک پہنچنا بلا تفہیم عوام کے لئے ممکن نہیں انھیں بھی بلا تشریح ہی درج کر دیا گیا ہے مثلاً۔

"حضورؐ نے فرمایا عام گذرگاہ، ٹھیرنے کی جگہ سایہ دار درخت کے نیچے پیشاب کرنے والا ملعون ہے۔" ص۱۳

حالانکہ سایہ دار درخت کا معاملہ اتنا غیر مقید نہیں جتنا اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

"حضور پاکؐ نے فرمایا کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں پانی کی آخری بوند کے ساتھ آخری گناہ معاف ہو جاتا ہے۔" ص۱۷

حالانکہ قرآن و حدیث ہی کی رو سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کبائر یوں معاف نہیں ہوتے اور صغائر بھی خاص ہی حالات میں معاف ہوتے ہیں۔ بے عملی و جہالت کے اس دور میں عام آدمی کے ہاتھ تو یہ سستا نسخہ آجائے گا کہ ڈٹ کے گناہ کرو اور پھر وضو کر ڈالو۔ سارا جھگڑا ختم۔

"حضورؐ نے فرمایا جنت میں بداخلاق اور سخت گو

داخل نہ ہوں گے۔" ص۱۱۳

حالانکہ یہ ایک خاص سیاق وسباق میں خاص التزامات کے ساتھ ارشاد کی ہوئی بات ہے۔ عقیدۃً بالکل غلط ہے کہ بد اخلاق اور سخت گو کبھی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

اسی طرح کی بہت سی حدیثیں اس کتاب میں ایسی پائی جاتی ہیں جو بغیر تفہیم کے غلط تصورات وعقائد کو جاگزیں کرتی ہیں۔

اس کتاب کے مرتب بھی مولٰنا حفیظ اللہ صاحب ہیں۔ ان کی زبان وبیان میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں۔ عنوان ہے

"فخر وشہوت کا کپڑا نہ پہنئے۔" ص۲۴

شہوت کا کپڑا کیا ہوتا ہے؟

"فکر ونظر یا اللہ کے احسان کی قدر کرو۔"

کیا مطلب؟

"ایک صحابی نے کہا میرے ابا نے حضورؐ کو سلام کہا ہے آپ نے فرمایا علیك وعلٰی ابیك السلام

(علیك وعلیہ السلام کہنا چاہئے)" ص۲۷

بریکٹ کا فقرہ کچھ اس نوع کا ہے جیسے نعوذ باللہ حضورؐ کو اصلاح دی گئی ہو۔

"ماہر قرآن کا درجہ"

قرآن کے ساتھ ماہر کا لفظ اسلاف واخلاف میں مستعمل نہیں۔ صفحہ ۱ پر عنوان دیا گیا ــــ "پائخانہ"

پھر روایت بیان کی:-

"حضورؐ پاک رفع حاجت کے لئے بہت دور جایا کرتے تھے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ تذکرہ دشت وصحرا کا ہے۔ گھروں کے باقاعدہ بنے ہوئے بیت الخلاء کا نہیں۔ لیکن فوراً ہی وہ روایت بیان کی گئی جس میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت کیا پڑھتے تھے اور نکلتے ہوئے کیا۔ اب عام آدمی اس تضاد بیانی کو کیسے حل کرے گا۔

حدیث نقل کی گئی کہ سجدے میں توبہ کیا کرو۔ فرمائیے طے تو یہ ہے کہ سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جائے۔ اب کیا عام آدمی کو یہ خیال نہیں گذر سکتا کہ تمام علماء وفقہا تو اپنی رائے کے پیرو اور حدیث کے مخالف معلوم ہوتے ہیں جو سجدے میں توبہ واستغفار کی بجائے خالی حمد کا سبق دیتے ہیں۔

ہماری پختہ رائے ہے کہ حدیثوں کے اُردو تراجم مفید ہونے کے باوجود سخت خطرناک ہیں اگر اہل حضرات ان کے خاص خاص حصوں کی تشریح وتفہیم نہ فرمائیں۔ جو بات رسول اللہؐ کی زبان وحی ترجمان سے نکل گئی وہ اصلاً مفید ہی مفید ہے، لیکن مفید اشیاء کا استعمال بھی موقع محل اور قیود کا تقاضا کرتا ہے۔ بخار کے مریض کو خمیرہ مروارید اور ہیضے کے ہدف کو ماء اللحم نہیں دیا جاسکتا اسی طرح ہر حدیث کا ایک محل ہے اور بہت سے ارشادات نبوی کچھ پس منظر اور محذوف ومضمر التزامات بھی رکھتے ہیں۔ عوام کو بس وہ پہنچاؤ جو صاف وسادہ اور مسائل شرعیہ سے ہم آہنگ ہو وہ مت پہنچاؤ جو انہیں غلط فہمی اور ذہنی اندھیر گردی میں مبتلا کردے۔

(۳) آئینۂ ایمان کی حیثیت ترجمے کی ہے امام بیہقی کی کتاب شعب الایمان کا خلاصہ قزوینیؒ نے کیا تھا۔ یہ اسی کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں ایمان کی ۷۷ شاخوں کا بیان ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے لیکن حواشی کی احتیاج اسے بھی تھی۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ دینك لمعادك ودرهمك لمعاشك ولا خیر فی امرء بلا درهم۔ ہماری ذاتی تحقیق ہے کہ یہ قول حضرت ابوبکرؓ کا نہیں ہے، بلکہ غلط طور پر ان کی طرف منسوب ہوگیا ہے۔ یا پھر ان ہی کا ہے تو روایت بالمعنی میں اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ اسے بھی کوئی تسلیم نہ کرے تو بہرحال لا خیر کا ترجمہ "روکھی پھیکی" محل نظر ہے۔

یا مثلاً ایمان کی چودھویں شاخ میں ایک حدیث بیان ہوئی جس کا تاثر یہ ہے کہ اعمال کی کوئی خاص اہمیت

نہیں اہم چیز ہے اللہ اور رسول کی محبت۔ جو اللہ اور رسول سے محبت رکھتا ہے وہ بلا کسی خدشے کے نجات پائے گا۔ حدیث اپنی جگہ بلا ریب حق ہے۔ کیسے نہ ہوگی جب زبانِ رسالت سے صادر ہوئی ہے۔ لیکن بڑا عذاب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ص کی محبت کا مفہوم و مصداق ہمارے دورِ نفسانیت اور عہدِ بدعت و معصیت نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ محبت پہلے نام اطاعت و نیازمندی کا تھا۔ عملی انقیاد کا تھا۔ اب یہ اکثر حلقوں میں صرف اس سے عبارت ہوگئی ہے کہ آدھی رات تک میلاد پڑھو اور سنو چاہے فجر کی نماز قضا ہو جائے۔ سلام پڑھا جائے تو تعظیماً کھڑے ہو جاؤ چاہے گھٹنوں اور پنجوں کا سارا کس بل حرام لقموں کے پیدا کردہ لہو کا رہینِ منت ہو۔ آذان کے کلمۂ شہادت پر انگوٹھے چومو چاہے یہ انگوٹھے احکامِ شرعیہ کے بخیے اُدھیڑنے میں مہارتِ تامہ حاصل کر چکے ہوں۔ کسی کو شفاعتِ محمدی ص کا اتنا وثوق ہے کہ اوامر و نواہی کو محض تدِ فاضل سمجھتا ہے۔ کسی کو یہ جنون ہے کہ رسول اللہ ص کے لئے جتنے مبالغے متصور ہوں سب کو جزوِ ایمان بنا کر دعوۂ محبت کو ساتویں آسمان پر چڑھا دو۔ انھیں عالم الغیب، حاضر ناظر، مالک الکل کہو۔ غرض محبت کا مفہوم اب خالی ذہنی عیاشی اور خبط الحواسی ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ میزانِ عدل میں اُس محبت کا کوئی وزن نہیں جو زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھے۔ ضرورت تھی کہ ذیلی نوٹ دیکر مخفی گوشے اُبھار دیئے جاتے — ویسے یہ کتاب خاصی ایمان پرور ہے۔ آیات و احادیث کی تصحیح بھی قابل تعریف ہے۔

حرکتِ آفاق

کلام فارسی پر مشتمل یہ کتاب جناب حبیب پالنپوری کے فکرِ بلند پرواز کا شہ پارہ ہے۔ اس میں انھوں نے "حرکت میں برکت" کی معروف کہاوت کو بنیاد بنا کر دین اور اس کے اہم عناصر کے وہ جوہری گوشے اُبھارے ہیں جو کسی باریک بین مفکر ہی کی گرفت میں آسکتے ہیں۔

اکثر بیشتر عنوانات آیاتِ قرآنیہ سے مزین ہیں اور اشعار کے آئینہ میں ان کے معنوی پیغام اور حکیمانہ مضمرات کو بڑے تیکھے انداز میں جلوہ گر کیا گیا ہے۔ یہودیت، نصرانیت اور "روسیت" پر بھی حبیب صاحب کے فکرِ رسا نے جست کی ہے۔ ان کے لہجے میں اقبال کا پُرسوز شکوہ اور ان کے الفاظ میں مولانائے روم کی لہک ہے۔ وہ جس پائے کا فکر پیش کرتے ہیں اسی پائے کا اندازِ بیان بھی اختیار کرتے ہیں خودی کا وہ نغمہ جو اقبال کے اشعار میں گونج رہا ہے انکے یہاں بھی خاموش نہیں ہے۔ اقبال کے شاہین کی جگہ انکے مردِ آفاقی کو رکھ لیا جائے تو خدوخال کے سطحی فرق کے سوا روح اور مزاج میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ چند رواں اور دلپذیر اشعار سُنیئے:-

مقصدِ ملت وجودِ ملت است　　وحدتِ ملت نمودِ ملت است
قطرہا از جذبِ باہم نہرہا　　نہرہا از جذبِ باہم بحرہا
جذب مقصد فرد را جمعیت است　　جذبِ باہم آبروئے ملت است
مقصدے بالائے ہر بالا ترے　　آبروئے فرد و ملت پرورے
خلوتے را انجمن آموزگار　　از حرا آوردہ سوئے کارزار
بر کلہ نہ ایں پرِ طاؤس را　　"پشت پا زن تختِ کیکاؤس را"
وحدتے مرکز ز یک مقصود ہست　　ملتِ بے مرکزے مردود ہست
محفلِ انجم بہ مرکز بستہ　　خوار افتد ہر شہابِ رشتہ

اشتراکیت کے بارے میں سنیئے:-

مرگِ نو ایں فتنۂ خوش منظرے　　نوجواں را شاہدِ تازہ ترے
"روسیاں نقشِ نوی انداختند　　آب و ناں بردند دیں در باختند"
مقصدِ روسی ز نانے بیش نیست　　قلب او از فکرِ عالم ریش نیست
مقصدِ ما از شکم بالا ترے　　جانِ ما در فکرِ عالم پرورے
خوردن و خفتن خیالِ روس زاد　　حرفِ اوّل حرفِ آخر اقتصاد

پایاب اور سستے ادب کے اِس دَور میں حبیب پالنپوری جیسے شاعر کا پیدا ہونا اور پھر ان کے کلام کا شایانِ شان انداز میں چھپ کر بازار میں آجانا عجیب لگتا ہے۔ کم ہی امید ہے کہ اسے قبولیت حاصل ہوسکے گی۔ تاہم ایسے لوگ بالکل ہی ناپید نہیں ہوئے ہیں جو اس سے لطف اندوز ہوسکیں۔

کہیں کہیں کچھ جھول بھی نظر آئے - مثلاً :-

بے نیازم ناز ہا دارم دروں　　جبرئیل از شوخیم زار و زبوں

شوخی کو عام معنے میں لیجئے یا خاص مفہوم میں وہ بہرحال "ناز ہا دارم دروں" کا ثبوت نہیں، بلکہ تردید ہی ہے۔ علاوہ ازیں "زار و زبوں" کو بس قافیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

دیدہ وا کن خیرگی را خیرہ کن　　چشم را از سرمۂ دل تیرہ کن

لفظ "تیرہ" کو مقام تحسین میں استعمال کرنا شاذ ہے۔

اے نمود تو بہ از نہ نمود تو　　بے نمودی مرگ ہست و بود تو

پہلے مصرعہ کو عروض کے دائرے میں روکے رکھنے کے لئے جبر سا کرنا پڑتا ہے - دوسرے مصرعہ کا در و بست ہماری فہم کی گرفت میں نہیں آیا -

بلبلے را قوتِ بازے دہد　　شبنمے را ذوق پروانے دہد

"بلبلے" کے عوض اگر کنجشک جیسا کوئی لفظ آجاتا تو شاید بلاغت سے زیادہ قریب ہوتا۔ نیز شبنم کا ذوقِ پرواز "فنا" کا مرادف ہے۔ اس کی تمثیل اضافۂ قوت اور عروج و نمو کے سیاق میں فصیح نہیں کہی جا سکتی -

یمن حرکت از عدم آدم کند　　آدمے را سرورِ عالم کند

"آدم کند" ہمیں اچھا نہیں لگا - نہ آدم کو "سرورِ عالم" کہنا بھلا معلوم ہوا۔ گو شاعر کی مراد حضرت آدم کی معینہ شخصیت نہیں ہے بلکہ وہ نوعِ انسانی کے اشرف المخلوقات ہونے کی بات کر رہے ہیں جو بلاشبہ مسلمات میں سے ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "سرور عالم" کا خطاب قلب و ذہن میں کچھ ایسا رچ بس گیا ہے کہ ذرا سا سطحی اشتباہ بھی سوئی کی طرح چبھ جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ ہماری ہی مریض ذکاوتِ حس ہے یا دوسرے بھی یہ چبھن محسوس کر سکیں گے -

نہ جانے کیوں حبیب صاحب بار بار حضرت علیؓ ہی کی شخصیت کو مثالی انداز میں پیش کرتے ہیں حالانکہ زیادہ تر اُن اوصاف کے لئے ان کی شخصیت بیچ میں لائی گئی ہے جن اوصاف میں بوبکرؓ ان سے یقیناً آگے تھے - مثلاً :-

بوعلی چوں سینۂ حیدر نداشت　　قلب را با عقل خام خود گذاشت

کہا جا سکتا ہے :-

بوعلی چوں قلبِ صدیقی نداشت　　مدح را با عقل خام خود گذاشت

خصوصاً جب اگلا شعر یہ ہو کہ :-

از نبوت جا بجا میخانہ ہا　　سینہ ہا گنجینہ ہا آئینہ ہا

تو زیادہ بلاغت اسی میں تھی کہ اُس ہستی کو آئیڈیل بنایا جاتا جو منصب نبوت کے عین بعد ہے۔

محفلے حیدر بہ آدم گرے　　قیصر و کسرائے شکن عالم گرے

حالانکہ دوسرے مصرعہ کی مناسبت اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تبعاً حضرت عمر فاروقؓ سے ظاہر و باہر ہے۔ حضرت علیؓ کو "مرحب شکن" تو کہہ سکتے ہیں، لیکن قیصر و کسریٰ شکنی اور عالم گری تو کسی اور ہی کا مقسوم تھی۔

اے گرفتارِ علوم بوعلی　　باز آ سوئے ابوبکرؓ و علیؓ

اوّل تو ہمارے خیال میں قافیے قابلِ نظر ہیں۔ دوسرے اس پوری کتاب میں حضرت عمرؓ کا ذکر صرف ایک جگہ آیا ہے اور حضرت عثمانؓ کا ایک بھی جگہ نہیں آیا۔ حالانکہ بعض اوصاف میں حضرت عثمانؓ بھی منفرد ہیں اور کئی جگہ موقع تھا کہ ان کی ذات گرامی بھی مثالی حیثیت میں پیش کر دی جائے۔

تاہم یہ گوشے کتاب کی قدر و قیمت کم کر کے دکھانے کیلئے نہیں اُبھارے گئے، بلکہ فرض تبصرہ ادا کیا گیا ہے۔ کتاب ہر آئینہ بیش قیمت ہے اور سنجیدہ و باذوق اہلِ علم کیلئے تحفۂ دلپذیر -

ناشر ہیں :- کتب خانہ مشائخی۔ اسٹیشن روڈ۔ پالن پور۔ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات)

"مشائخی" نام عجیب سا لگا - اس کی لِم کون بتائے

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند۔ جامع مسجد دہلی ۶ - صفحات ہیں ۱۰۹ سائز متوسط۔ قیمت مجلد ڈھائی روپے

خدا کا انکار کیوں؟

مدیر "زندگی" سید حامد علی صاحب کی شخصیت اسلام پسند حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ نے تبلیغ دین کے لئے

چھوٹے چھوٹے رسائل کا ایک ماہوار سلسلہ شروع کیا ہے جس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ ویسے دوسرا شمارہ بھی شائع ہو چکا ہے، لیکن اس ایک ہی شمارے کے تبصرے سے اس سلسلے کی اہمیت وافادیت کا کافی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بظاہر اس بحث میں عام مسلمانوں کے لئے زیادہ کشش نہیں ہے کہ خدا موجود ہے یا نہیں۔ وہ خدا کی موجودگی پر مطمئن ہیں لیکن مغربی طرزِ فکر نے عموماً اور روسی اندازِ نظر نے خصوصاً الحاد ودہریت کے جو جراثیم فضائے عالم میں بکھیر دیئے ہیں وہ اس اطمینان کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں اور کتنے ہی مسلمان زبانی اعتراف کی حد تک مسلمان ہونے کے باوجود خدا بیزار نظریات سے پسپا ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کائنات کی سب سے بڑی اور اٹل حقیقت ۔ وجودِ باری ۔ پر قدیم دلائل کو جدید رنگ وبو عطا کرنا اور نئے نئے براہین سے عوام کو روشناس کرانا حق وصداقت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ پھر جب کہ یہ اہم کام سیّد حامد علی جیسے اہل حضرات انجام دینے پر آمادہ ہوں تو اس کے قابلِ تحسین وتعاون ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ مصنف کا مقصود محض فلسفیانہ بحثیں نہیں ہیں، بلکہ حسنِ ترتیب کے ساتھ احقاقِ حق ہے۔ حق کی پہلی بنیاد تو وجودِ باری ہی ہے۔ اس کا اثبات ہو جائے تبھی دین ہ اخلاق کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ اس پہلے پمفلٹ میں مصنف نے صرف اس نکتہ پر گفتگو کی ہے کہ خدا کے انکار کی پشت پر کیا واقعتہً کچھ دلائل بھی ہیں یا محض جہالت د نفسانیت کے تحت الحاد کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بڑے ہی دلنشیں، دلچسپ اور بلیغ ومتین انداز میں ثابت کر دکھایا ہے کہ انکارِ خدا کے لئے سرے سے کوئی دلیل ہی موجود نہیں ہے اور جن غیر ذمہ دارانہ لفاظیوں کو دلیل کا نام دیا جاتا ہے وہ خود اساطینِ دہریت اور علمائے سائنس کے نزدیک بھی اتنی پوچ، بے بنیاد اور صد فیصد غلط ہیں کہ انھیں دلیل کا نام دینا اس لفظ کا مذاق اڑانا ہے۔

حامد علی صاحب کے قلم میں گیرائی، رچاؤ اور روانی ہے اور ان کی ذہانت علم کے زیور سے مرصع ہو کر دو آتشہ بن گئی ہے۔ وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں اور گوناگوں مثالوں سے اپنی بات سمجھانا انھیں خوب آتا ہے۔ ہمیں سچ مچ رشک آیا ہے کہ کس طرح انھوں نے ایک خشک اور دقیق مسئلہ کو دلچسپ، خوشگوار اور شگفتہ طرز میں آئینہ کر کے رکھ دیا۔ ذلک فضل اللہ۔ وہ صرف علومِ دینیہ ہی کے عالم نہیں، بلکہ فلسفہ وسائنس پر بھی ان کی نظر گہری ہے اور ان کا بڑا وصف یہ ہے کہ حلم وبردباری کا دامن ذرا نہیں چھوٹتے ہماری رائے ہی نہیں آرزو بھی ہے کہ ان کا یہ رسالہ اور اس نوع کے اگلے رسائل ہندی، انگریزی اور دوسری زندہ زبانوں میں ترجمہ کر کے بیش از بیش عام کئے جائیں۔ کہنے کو پیش نظر رسالہ ۴۸ صفحات کا ہے اور قیمت بھی بہت معمولی یعنی صرف تیس پیسے ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایسا بیش بہا ہے کہ مادیت کے اساطین دائمہ بھی اسے تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو اس کا فکری وزن محسوس کئے بغیر نہ رہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ سیّد حامد علی صاحب کے اس نئے سلسلۂ تصانیف سے زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا، ان رسائل کو بڑی تعداد میں خرید کر پھیلانا اور ان کے تراجم کرا کے انھیں دُور دُور پہنچانا بے حد ثواب کا کام ہے۔

ہمیں اول نظر میں زیرِ تبصرہ رسالے کے بعض مندرجات پر کچھ کھٹک ہوئی لیکن پھر جو زیادہ تعمق سے کام لیا تو یہ کھٹک دُور ہو گئی اور بے اختیار فاضل مصنف کی اصابتِ فکر اور بصیرت وذہانت کے حق میں کلمۂ تعریف زبان سے نکلا۔ اللہ تعالیٰ انھیں عمرِ طویل عطا کرے اور خدمتِ حق کا یہ سلسلۃ الذہب دیر تک قائم رہے

اتفاق کی بات ہے کہ پہلی ہی سطر میں کتابت کی

غلطی رہ گئی:-

" یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں معرفت فرمائی"

ظاہر ہے " معرفت عطا فرمائی " ہوگا۔ ایک اور جگہ تصحیح کا نقص ہے:-

" گویا ہم خدا کا انکار کرنے کی پوزیشن میں ہیں نہ انکار کرنے کی" (صفحہ ۱۲۱)

ایک جگہ " اقرار" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۱۶۷ پر " برہان" کو مؤنث استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ لفظ مذکر ہے۔

صفحہ ۳۶ پر:-

" آپ تولنے والی مشین پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور دس نئے پیسے اس میں ڈال دیتے ہیں"

اگر رسالہ کا ترجمہ کسی اور زبان میں کیا جائے تو " دس نئے پیسے" کی جگہ " معتبرہ سکہ" بہتر رہے گا۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ رسالہ اور اس سلسلے کے دوسرے رسائل دوسری زبانوں میں ترجمہ کئے جانے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب خیر کو اس کی توفیق دے۔

واضح رہے کہ تصانیف کا یہ سلسلہ ماہنامہ رسالے کے انداز میں جاری کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ دو سال کے لئے ساڑھے پانچ روپے۔ کاغذ اچھا سفید ہے اور کتابت و طباعت پسندیدہ۔ چندہ خاصا کم رکھا گیا ہے جس سے حسنِ نیت اور جذبۂ خدمت کا پتہ چلتا ہے۔

پتہ:- ادارہ شہادتِ حق (وقف) ذکاتی محلہ نالا اسٹریٹ بریلی

یہ سطور جب تک شائع ہوں گی انشاء اللہ تیسرا شمارہ بھی منظرِ عام پر آچکا ہوگا۔ تعاونوا علی البرّ والتقویٰ۔

عثمان بطور

تالیف:- گوڈفرے لیاس۔
ترجمہ:- شاہد احمد دہلوی۔
ناشر:- نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی
صفحات ۳۵۲ کاغذ سفید۔ قیمت سوا روپیہ۔

بطوس چینی ترکستان میں سورما کو کہتے ہیں۔

یہ کتاب اشتراکیت کی جارحانہ چیرہ دستیوں کے مارے ہوئے اُن قازق مسلمانوں کی داستانِ ہجرت ہے جو اگرچہ تخت و تاج کے مالک نہیں ہو سکے، لیکن ان کی خود اعتماد جفاکوشی اور ناقابلِ تسخیر حوصلہ مندی کے تصوراتی افق پر آج بھی ایک دیکھنے والی آنکھ چنگیز خاں کی سطوت، مارکو پولو کا تہوّر اور مغل شہنشاہوں کے جبروت کی جھلکیاں دیکھ سکتی ہے۔ انھوں نے جدید ہتھیاروں سے مسلح اشتراکیت کے آستانے پر اپنی سرافراز گردنیں نہیں جھکائیں۔ کیونکہ وہ اپنی انفرادیت اپنے مذہب اور اپنی روایتی آزادی کو کسی قیمت پر اس شیطانی جبر و قہاوت کے حوالے کرنا نہیں چاہتے تھے جس سے بڑھ کر سنگین، پست اور نفرت انگیز جبر و قہاوت کا کوئی تصور — کم سے کم اجتماعی دائروں میں نسلِ انسانی کبھی نہیں کر سکی ہے۔ لیکن اس کی قیمت انھیں بہت بڑی ادا کرنی پڑی — وہ اپنا گھر بار تج کر ہولناک وادیوں کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے ہیں۔ یہ سفر آخری حد تک صبر آزما تھا مہینوں وہ ان ہمت شکن وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں جہاں بے رحم چٹانیں ہیں۔ بے آب و گیاہ میدان ہیں برف ہے۔ خون منجمد کر دینے والی ہوائیں ہیں۔ کہر کے طوفان ہیں۔ شدائد کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے جس کا تصور بھی وہی سخت کوش اور نڈر لوگ کر سکتے ہیں جن کی ماؤں کے دودھ میں بھوری چٹانوں کی صلابت حل ہو گئی ہو۔

ابھی چند ہی سال تو ہوئے جب پہاڑوں، برف زاروں اور سنگلاخ وادیوں کی گود میں پلے ہوئے بچے کھچے قازق تھکے ہارے مجروح و درماندہ کشمیر پہنچے تھے اور پھر ان کا بڑا حصہ ترکی جا پہنچا ان میں بہت سے آج بھی زندہ ہیں۔ ان سے ہی معلومات کا وہ ذخیرہ حاصل ہوا ہے جسے زیر تبصرہ کتاب میں بڑے سلیقے اور حسن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ بڑا شاندار ہے۔ بہت کم مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے فاضل مترجم نے نہ صرف زبان و بیان کی مہارت کا ثبوت دیا ہے، بلکہ ایسا رچاؤ ان کے لب و لہجے میں جیسے

اُس خاص ماحول و فضا کو بھی انھوں نے اپنے تصورات میں جذب کر لیا ہو جس میں یہ سچی کہانی نشو و نما پاتی ہے۔

اگر یہ کوئی ناول ہوتا تو ہم اعتراضاً کہہ سکتے تھے کہ بعض مقامات پر اس میں غیر معمولی خشکی اور بے کیفی آگئی ہے لیکن یہ طبعزاد کہانی کہاں ہے یہ تو ایک فکری توجہ کی مستحق داستانِ ہجرت ہے جس میں اُن سیاسی نکات و مسائل کا تذکرہ بھی ناگزیر ہی تھا جو قاری کو یہ بتا سکیں کہ اشتراکی سامراج اور مظلوم اقوام و قبائل کی آویزشیں کن کن خطوط پر آگے بڑھی ہیں۔ متعدد مقامات پر یہ روداد بڑی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ بڑی شوق انگیز اور محو کر دینے والی۔ مگر جاذبیت کا یہ طلسم اچانک ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ کیونکہ من گھڑت کہانیوں کی طرح اس میں یہ آزادی نہیں ہے کہ لکھنے والا جو چاہے لکھے اور جس طرح چاہے پلاٹ کے نوک پلک درست کرتا چلا جائے۔

پھر بھی یہ خلا ہمیں ضرور محسوس ہوا کہ جس "عثمان بطور" کو اس داستان کا ہیرو چُنا گیا ہے اور جس کے اوصاف و کردار کے خد و خال اُبھارنے میں خیال آرائی کو بھی کہیں کہیں معاون بنا لیا گیا ہے اس کے قتل کا تذکرہ اس انداز میں نہیں ہوا جسے "ہیرو" کے شایانِ شان کہا جا سکے۔ طائرانہ اور بے تعلق سا انداز۔ کہانی کے اسٹیج سے وہ اچانک اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے وہ کچھ بھی نہ تھا۔ جیسے سنسر کی قینچی نے فیتے کو بیچ میں سے کاٹ دیا ہو۔ یہ خلا اس لئے اور بھی محسوس ہوا کہ کتاب کا نام ہی عثمان بطور رکھا گیا ہے۔

اِس داستانِ ہجرت میں قازق مسلمانوں کی سخت کوشی، حوصلہ مندی، صلابت اور بے خوفی کی فضائے بسیط میں اگرچہ آذانوں اور تکبیروں کا کوئی غلغلہ نہیں، لیکن خدا پر اعتماد اور تقدیر پر اطمینان کے بڑے گہرے نقوش ان کے چھوٹے چھوٹے بے ساختہ جملوں میں ملتے ہیں۔ مذہب سے ان کا ذہنی رابطہ کتنا مضبوط اور عمیق ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قدم قدم پر وہ اپنے قیمتی مویشیوں اپنے دوستوں، اپنی اولادوں، بھائیوں اور بیویوں کا لہو سامراجی استبداد کے آستانے پر نچوڑتے جاتے ہیں۔ ابھی ابھی جو بیٹا یا بیٹی یا بیوی اچھی بھلی سامنے تھی چشم زدن میں گولی اس کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے یا عسکرِ ابلیس کا کوئی سپاہی اسے زندہ ہی اُٹھائے جاتا ہے مگر مجال نہیں آہ و بکا، فریاد، واویلا کی ہلکی سی آواز بھی آس پاس سُنائی دے جائے۔ آواز کیا معنی یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو۔

لیکن جب سفرِ ہجرت کے آخری مراحل میں اشترا کی لٹیرے گیارہ قازقوں کے سر تن سے جدا کر دیتے ہیں تو پہلی بار ہم دیکھتے ہیں کہ باقی ماندہ قازقوں کو صرف ایک شخص کی شہادت کا بہت رنج ہوا۔ وہ تھا محمد تروی کاری اس کا رنج صرف اس لئے ہوا کہ وہ عمدہ حافظِ قرآن تھا، صالح تھا اور اس کے زہد و اخلاق کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

گویا جدالِ پیہم اور حرب و ضرب کے اُس لہو آشام محاذ پر بھی جہاں سب سے بڑھ کر اہمیت ہتھیار، بارود اور جسمانی طاقت کی ہوتی ہے قازق مسلمانوں کو صرف اُس ساتھی کی شہادت پر صدمہ ہوا جو حافظِ قرآن تھا، صالح تھا، نیک نفس تھا!

اس سے ان کی کیفیتِ ایمانی اور ذہنی رُخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام بھی کہاں کہاں پہنچا ہے۔ اس کے شجرِ لازوال نے کیسے کیسے آہن و فولاد کی تہوں میں جڑیں پھیلائی ہیں یہ صداقت حیرتناک بھی ہے اور عبرتناک بھی!

بڑا رشک اُن نوعمر لڑکوں پر آتا ہے جن کی عمریں دس اور بارہ سال سے آگے نہیں بڑھیں، لیکن ان کی بے خوفی، مردانگی اور حوصلہ مندی دیکھکر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے گوشت اور پوست کے نازک جسموں سے نہیں ان سنگلاخ چٹانوں ہی کی کوکھ سے جنم لیا ہو جو بیکراں

بلندیوں میں سر اُٹھائے قرنوں سے اپنی صلابت اور استقامت کی پُر اسرار کہانیاں سُنا رہی ہیں ۔ ان لڑکوں میں وہ نو سال کا عبد المطلب تو ہیچ ایک مافوق ہستی معلوم ہوتا ہے جس کے ننھے ننھے قدموں نے کوہساروں، مرغزاروں، ناہموار وادیوں، دشوار گذار دّروں اور کہر سے ڈھکے ہوئے ان گھڑ راستوں کا چھ ماہی سفر تن تنہا طے کیا۔ اس کے ساتھ صرف چند مویشی تھے اور یخ کر دینے والے جاڑے کی کتنی ہی راتیں اس نے کھلے آسمان کے نیچے ایسے اطمینان سے گذاری تھیں جیسے سخت گیر عناصر فطرت سے اس کا کوئی برا نا سمجھوتہ ہو اور پھر یہ تنہائی مجبوری کی نہیں تھی۔ وہ تو خود ہی قافلہ سے جدا ہوا تھا۔ جب اس کے ماں باپ اس کی آنکھوں کے آگے گولیوں کا شکار ہوئے تو وہ چیخا نہیں۔ رویا نہیں۔ اس کا دماغ ماؤف نہیں ہوا، بلکہ حیرت ناک طور پر اس نے ایسی ذہانت اور برداشت کا ثبوت دیا جو ہماری زنانہ تہذیب کے پالے ہوئے بچوں میں شاید عنقا ہی کا مفہوم رکھتی ہو۔

حاصل تبصرہ یہ کہ عثمان بطور پڑھنے کی چیز ہے۔ پڑھ کر عبرت لینے اور سوچنے کی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے ایک ایسا وقت بھی آئے جب اشتراکیت خود ہمارے گریبانوں میں ہاتھ ڈالکر پوچھے کہ بولو اپنی آزادی اپنا دین اپنا سب کچھ دینے پر آمادہ ہو یا موت قبول کرتے ہو۔ ایسے لرزہ خیز وقت کے لئے ہمیں ابھی سے اپنے ذہنوں کو تیار کر لینا چاہئے اور یہی ذہن ہماری اگلی نسلوں میں بھی منتقل ہوتا چلا جائے تو ممکن ہے کہ قازقوں کی طرح ہم بھی تھوڑ، حوصلہ مندی اور اُلوالعزمی کی کوئی کہانی تاریخ کے سپرد کر سکیں۔

کہیں کہیں ترجمہ کا کوئی لفظاً تی نظر بھی ہے، مثلاً
صـ۱۸ پر ـــــ "... خطرناک تنسر پہاڑوں کو عبور کرکے ..."

خود پہاڑ کی صفت "تشنہ" ترقی پسندانہ لوشہ فصیح نہیں۔

صـ۱۶۲ پر ـــــ "اس کا کردار اس کے چہرے سے عیاں علم و عمل کا پتلا، کسی کی باتوں میں نہ آنیوالا، مشتبہ خود سر، بے رحم اور نڈر ...."

"مشتبہ" بے محل ہے۔ چوکنّا یا محتاط کہنا چاہئے تھا

صـ۱۶۸ پر ـــــ "اس کی کوئی استثنیٰ نہیں ہے ..."

"استثناء" کا یہ رسم الخط کاتب کا قصور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن تانیث بہر حال مترجم ہی کا سہو ہے۔ "استثناء" بالاتفاق مذکر ہے۔

بعض جگہ لفظ "مویشی" اس طرح استعمال کیا گیا ہے گویا یہ اسم جنس نہیں بلکہ اونٹ اور گھوڑے کی طرح کسی خاص جانور کا نام ہے۔

صـ۲۸۵ پر ـــــ "سب کو اپنا وطن چھوڑنے سے نفرت تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دوبارہ یہاں واپس آنا نصیب نہیں ہوگا"

لفظ "نفرت" کے استعمال کا یہاں موقع نہیں تھا۔

صـ۲۹ پر ـــــ "زمین اب پھر بہت شکستہ آگئی تھی ..."

"شکستہ زمین" کا کیا مطلب ہوگا۔

کتاب میں دیباچہ مولانا محمد عثمان فارقلیط ایڈیٹر الجمعیۃ کا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود پُرکار اور فکر انگیز ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم یہ بھی واضح نہ کر دیں کہ اس کتاب کو اردو میں شائع کرنے کا سہرا ان گوپال متل کے سر ہے جو مدّت سے بڑی لگن، بڑے حوصلے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اشتراکیت سے قلمی جنگ لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے ابھی "چین کے مسلمان" نامی کتابچہ چھاپا تھا۔ اب عثمان بطور لائے اور سجا بنا کر لائے ۔ قیمت بھی اتنی کم کہ لاگت بھی مشکل ہی سے پوری ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعتہً ان کے پیش نظر مقصد ہے تجارتی انتفاع نہیں۔ ہمیں بڑی شرم محسوس ہوتی ہے جب اپنی یہ کیفیت دیکھتے ہیں کہ

خدمتِ دین و ملت کے فلک شگاف دعوے تو پیدا ہوتے ہی زبانوں پر ابھر آتے ہیں اور ہر دینی کتاب ہمارے یہاں "خدمتِ دین" ہی کے نقطۂ نظر سے چھپتی ہے، لیکن قیمت رکھنے میں ہم پچاس فی صدی سے کم نفع کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ بجا ہے کہ ہماری مالی امداد امریکہ یا مصر و عرب نہیں کرتے جب کہ اینٹی کمیونزم لٹریچر کے لئے امریکن ایڈ کا تصور مسلمات میں شامل ہو گیا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ گوپال متل کی زبان پر خلوص خدمت کے بلند بانگ دعوے نہیں اور ہم دعووں پہ دعوے کئے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ وہ مسلمان نہ ہونے کے باوجود اشتراکیت کی قہرمانی کے مارے ہوئے مسلمانوں کا افسانۂ درد چھپ کر بیچنے کی تگ و دو میں ہیں۔ اس سے قبل "چین کے مسلمان" بھی انھوں ہی نے شائع کی تھی اور ہم مسلمان ہونے کے باوجود اس افسانۂ درد کو توجہ سے سننے تک پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ کیا قہر ہے کہ جو شیطانی نظریۂ حیات اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اسی کے لئے ہمارے جذبات میں کوئی گرمی، کوئی جوش، کوئی ہمہمہ نہیں۔

بہرکیف ہمارا مشورہ ہے کہ گوپال متل کی شائع کردہ کتابوں کو پڑھ تو ضرور ہی لینا چاہئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

رسائل و مسائل

علمِ غیب، حاضر و ناظر اور سجود لغیر اللہ کے مسائل

سوال: تفہیم القرآن زیرِ مطالعہ ہے۔ شرک کے مسئلہ پر ذہن اُلجھ گیا ہے۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔

تفہیم القرآن کے بغور مطالعہ سے یہ امر ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفات میں عالم الغیب ہونا اور سمیع و بصیر ہونا (جس کے تحت ہمارے مروّجہ الفاظ حاضر و ناظر بھی آ جاتے ہیں) بھی شامل ہیں۔ خدا کے سوا کسی کو بھی ان صفات سے متصف سمجھنا شرک ہے اور حقوق میں سجدہ و رکوع وغیرہ بھی ذاتِ باری سے مختص ہیں۔ شرک کو خداوند تعالیٰ نے جرمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جرم کا وہ خود کسی کو حکم نہیں دے سکتا۔ مگر فرشتوں کو آدمؑ کے لئے سجدہ کا حکم دیا۔ اسی طرح کوئی نبی نہ تو شرک کرتا ہے اور نہ کرواتا ہے۔ مگر حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کے بھائیوں اور والدین نے سجدہ کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کے لئے شرک ہے، تو مندرجہ بالا واقعات کی کیا توجیہہ ہوگی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ علمِ غیب اگر خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے تو یہ کسی بھی مخلوق میں نہ ہونی چاہئیے۔ لیکن قرآن و حدیث اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ انبیاء و رسل کو علمِ غیب ہوتا ہے۔ پھر کسی مخلوق میں یا کسی فرد میں اس صفت کو ہم تسلیم کریں تو مرتکبِ شرک کیوں ہوتے ہیں اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کا علم دے رکھا تھا تو آخر اسے مشرک کیوں کہا جائے؟ جن لوگوں کے خلاف اسی بناء پر شرک کے ارتکاب کا فتویٰ لگایا جاتا ہے۔ وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ علمِ غیب کو ذاتی یا نفسی نہیں کہتے، بلکہ خدا کی دین قرار دیتے ہیں۔ ان کا اور دوسرے علماء کا اگر اختلاف ہے تو صرف کم یا زیادہ پر ہے۔ جب مسئلہ کم و بیش کا ہی ہے تو پھر فتویٰ شرک کیوں؟

حاضر و ناظر کی صفت بھی خداوند تعالیٰ سے مختص قرار دی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں اور اور جنوں کی روحوں کو قبض کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور حاضر و ناظر ہونا خدا کی مخصوص صفت ہے۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرض کی انجام دہی کے لئے اپنی خاص صفت فرشتہ میں ودیعت کر رکھی ہے تو جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں صفت حاضر و ناظر کا ہونا اور خدا کی طرف عطا کیا جانا مانتے ہیں آخر انھیں مشرک کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: آپ نے شرک کے مسئلے میں اپنی جو الجھنیں بیان فرمائی ہیں وہ تفہیم القرآن کے مسلسل مطالعے سے بآسانی رفع ہو سکتی ہیں۔ میرے لئے ایک خط میں ان کو تفصیلاً

رفع کرنا مشکل ہے۔ تاہم چونکہ "شرک" کا معاملہ بڑا ہی نازک اور خطرناک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس الجھن میں زیادہ دیر تک مبتلا رہیں۔ اس لئے اختصار کے ساتھ چند الفاظ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں ہے بلکہ شرک کی علامت ہے۔ اصل میں شرک تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک فی الذات یا فی الصفات یا فی الحقوق ٹھیرانا ہے۔ سجدہ اگر اس طرح کے کسی عقیدے کے ساتھ ہو تو شرک ہے ورنہ اس فعل سے چونکہ مشرکین کے ساتھ عملاً مشابہت ہوتی ہے اسلئے اسے بجائے خود شرک ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ اس مشابہت کی بناء پر ممنوع ٹھیرایا گیا ہے۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اسلئے فرشتوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ عزوجل کے حکم صریح کی تعمیل میں تھا۔ بطور خود وہ آدم کو قابل پرستش یا قابل تعظیم سمجھ کر نہیں جھک گئے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا وہ اس رویائے صادقہ کی بناء پر تھا جو قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ نے خود دکھایا تھا جسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے الٰہی اشارہ قرار دیا تھا (سورۃ یوسف آیات ۴ تا ۶) اور جس کو حضرت یوسفؑ نے بھی آخر کار اسی خواب کا مصداق ٹھیرایا (سورۃ یوسفؑ آیت ۱۰۰) اس لئے یہاں بھی جو کچھ ہوا اللہ کے حکم سے ہوا اور ظاہر ہے کہ جو کام اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا جائے وہ شرک نہیں ہو سکتا۔

اب اس شخص کے معاملے کو لیجئے جو اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کو معظم و مقدس سمجھ کر بطور خود اس کے آگے سجدہ بجا لائے۔ کیا کسی دلیل سے اس فعل کو بھی غیر مشرکانہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے پہلے دونوں معاملوں میں سجدۂ لغیر اللہ کو جائز رکھا ہے تو یہ فعل مطلقاً جائز ہے؟ یا یہ کہ ہم خدا کے حکم کے بغیر جو چاہے چاہیں تعظیماً سجدہ کر سکتے ہیں؟ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ اپنے ایک خاص بندے کے متعلق ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے فلاں فلاں مصالح کی بناء پر حکم خداوندی سے کچھ مساکین کی کشتی عیب دار کر دی اور ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی مصلحت دیکھ کر جس کے مال کو چاہیں نقصان پہنچا دینے اور جسے چاہیں قتل کر دینے کے مجاز ہیں؟ جب اللہ اور اس کے رسولؐ نے نصوص شرعیہ کے ذریعہ سے غیر اللہ کے لئے سجدے کو حرام کر دیا ہے اور دوسروں کی جان و مال میں تصرف کے لئے حدود مقرر کر دیئے ہیں تو کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خصوصی افعال کو نظیر قرار دے کر اور ان پر قیاس کر کے ان ممنوعات کو اپنے لئے مباح کر لے؟

علم غیب کے مسئلے میں یہ بات سب مانتے ہیں کہ کلّی و ذاتی علم غیب اللہ کے لئے مخصوص ہے اور اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اپنے علم غیب کا جو حصہ اور جتنا حصہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے سکتا ہے۔ یہ جزئی اور عطائی علم غیب۔ اپنی نوعیت میں اس کلّی و ذاتی علم غیب سے بالکل مختلف چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے اور کسی بندے کے حق میں اس دوسری نوعیت کے علم غیب کا عقیدہ رکھنا کسی کے نزدیک بھی شرک نہیں ہے۔ دراصل خرابی جس مقام سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عقیدت میں غلو کر کے دو ایسی باتیں ایجاد کر لیتے ہیں جو اصل اسلامی عقیدے سے متصادم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اس عطائی علم غیب کو جزئی نہیں بلکہ کلّی بنا دیتے ہیں اور کسی بندے کے حق میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح جمیع ما کان وما یکون کا عالم بنا دیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ہے۔ بظاہر یہاں جزئی و کلّی کا فرق دور ہو جانے کے باوجود ذاتی اور عطائی کا فرق نظر آتا ہے جس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا

عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے، لیکن تھوڑا سا بھی آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنے میں کتنا عظیم خطرہ مضمر ہے۔ بالفرض اگر یہ جائز ہو کہ اللہ اپنی عطا سے کسی بندے کو اپنے ہی جیسا عالم الغیب والشہادۃ بنا دے تو آخر یہ کیوں نہ جائز ہو کہ وہ اسے اپنی ہی طرح قادر مطلق اور حیّ و قیوم اور خالق و رب بھی بنا دے۔ اس کے بعد خدا کی عطا سے کسی بندے کے خدا بن جانے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے۔ پھر کیا دو مساوی صفات و اختیارات رکھنے والے خداؤں کے درمیان صرف ذاتی اور عطائی کا فرق شرک سے بچانے کے لئے کافی ہوگا؟

دوسری زیادتی غالی حضرات یہ کرتے ہیں کہ اللہ کے عطیے کو خود بانٹنے کے مختار بن جاتے ہیں۔ یہ بتانا کہ عطا فرمانے والے نے کسی کو کیا عطا کیا ہے اور کیا نہیں کیا ہے۔ درحقیقت خود عطا فرمانے والے ہی کا کام ہے دوسرے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ معطی کے اپنے بیان کے بغیر وہ بطور خود یہ فیصلہ کر دے کہ دینے والے نے کیا کچھ کسی کو عطا فرمایا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں کہیں یہ فرمایا ہو کہ میں نے اپنے فلاں بندے کو جمیع ماکان و مایکون کا عالم بنا دیا ہے۔ یا اللہ کے رسولؐ نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت کی ہو تو اس کا حوالہ دے دیا جائے ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر نہ کوئی آیت اس کی تصریح کرتی ہے نہ کوئی حدیث صحیح تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے اس عطیے کی خبر لوگوں تک آخر کس ذریعہ سے پہنچی ہے؟

اس مسئلے میں یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ عقیدے اور خصوصاً عقیدۂ توحید کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر کفر و ایمان اور فلاح و خسران کا مدار ہے۔ اس معاملہ میں یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کہ مختلف احتمالات رکھنے والی آیات اور احادیث میں سے ایک مطلب نچوڑ کر کوئی عقیدہ بنا لیا جائے اور اسے داخلِ ایمانیات کر دیا جائے۔ عقیدہ تو صاف اور صریح محکمات سے ماخوذ ہونا چاہئے۔ جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک بات ماننے کی دعوت دی ہو اور یہ ثابت ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرماتے تھے اور صحابۂ کرامؓ و تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب والشہادہ ہونے یا جمیع ماکان و مایکون کے عالم ہونے کا عقیدہ یہ نوعیت رکھتا ہے۔ اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تو آخر آپ اپنے آپ کو اس خطرے میں کیوں ڈالیں

حاضر و ناظر کے معاملے میں آپ نے ملک الموت کی جو مثال پیش کی ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے اور نہ کسی حدیث صحیح میں یہ آیا ہے کہ ساری کائنات کا ملک الموت ایک ہی ہے۔ یہ بات بھی قرآن سے نہیں معلوم ہوتی کہ صرف ایک فرشتہ قبض ارواح کا کام کرتا ہے، بلکہ متعدد مقامات پر روح قبض کرنیوالے فرشتوں کا ذکر بصیغۂ جمع آیا ہے۔ مثلاً:-

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ۔ (النساء – ۹۷)	جن لوگوں کو ملائکہ نے اس حال وفات دی کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنیوالے تھے اُن سے ملائکہ نے پوچھا تم یہ کس حال میں تھے۔
(۲) فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (محمد – ۲۷)	پھر کیا بنے گی اُس وقت جب ملائکہ ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں کو پیٹتے ہوئے۔
(۳) الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ۔ (النحل – ۲۸)	جن لوگوں کی روحیں ملائکہ اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے ان سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔
+ + + + +	
(۴) حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنْتُمْ	یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے ان کے پاس روحیں قبض کرنے کیلئے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الاعراف - ۳۷) کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک الموت کے تحت دوسرے مددگار فرشتے بھی ہیں جو روحیں قبض کرنے پر مامور ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ابلیس ایک بڑا شیطان ہے اور اس کی ماتحتی میں بشمار شیاطین ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ نہ ابلیس جاتا ہے نہ ملک الموت۔

پھر خود اس زمین کی مخلوقات کے بارے میں بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تمام خشکی و تری اور ہوا کے جانداروں کا ملک الموت وہی ایک ہے جو انسانوں کی جان کے لئے مقرر ہے۔ قرآن میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ یتوفاکم ملک الموت (تمہاری روحیں ملک الموت قبض کرتا ہے) اس سے جو بات نکلتی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس زمین پر انسانوں کی روحیں قبض کرنے پر ایک فرشتہ مامور ہے۔ اگر بالفرض یہی ایک فرشتہ روئے زمین پر تمام مرنے والوں کی روحیں قبض کرتا ہے تب بھی یہ بہت ہی محدود پیمانے کی ایک طاقت ہے جو اللہ نے اپنے اس فرشتے کو عطا فرمائی ہے۔ اس کو آخر اللہ تعالیٰ کی اس لامحدود صفت سے کیا نسبت ہے کہ وہ ساری کائنات میں حاضر و ناظر ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم آپ کیا اب قیاسات پر اپنے عقائد کی عمارت کھڑی کریں گے؟ ملک الموت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ ہم نے اسے انسانی روحیں قبض کرنے پر مامور کیا ہے اس پر زیادہ سے زیادہ جو تصور قائم کیا جا سکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ یہ فرشتہ بیک وقت روئے زمین کے ہر حصہ میں لاکھوں انسانوں کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ مگر کیا اس پر یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں؟ ان دونوں باتوں میں آخر کیا مناسبت ہے کہ ایک کو دوسری پر قیاس کر لیا جائے۔ اور پھر قیاس بھی ایسا کہ وہ عقیدہ قرار پائے اور ایمانیات میں داخل ہو اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے اور نہ ماننے والوں کے ایمان میں نقص ثابت کیا جانے لگے۔ یہ عقیدہ اگر واقعی اسلامی عقائد میں شامل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس کی تصریح فرماتا کہ میرے رسول ﷺ کو حاضر و ناظر تسلیم کرو۔ حضور ﷺ خود یہ دعویٰ فرماتے اور اسے ماننے کی دعوت دیتے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں اور قیامت تک حاضر و ناظر رہوں گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ میں یہ عقیدہ عام طور پر شائع و ذائع ہوتا اور عقائد اسلام کی کتابوں میں اسے ثبت کیا جاتا۔

آپ نے بعض حضرات کو مشرک کہنے یا نہ کہنے کا جو ذکر فرمایا ہے اس کے بارے میں میری رائے شاید آپ کو معلوم نہیں ہے۔ میں ان مسائل میں ان کے خیالات کو تاویل کی غلطی سمجھتا ہوں اور اسے غلط کہنے میں تامل نہیں کرتا۔ مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ انھیں مشرک کہا جائے، اور مشرکین عرب سے تشبیہ دی جائے۔ میں ان کے بارے میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ شرک کو شرک جانتے ہوئے اس کے قائل ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ توحید ہی کو اصل دین مانتے ہیں اور اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لئے انھیں مشرک کہنا زیادتی ہے۔ البتہ انھوں نے بعض آیات اور احادیث کی تاویل کرنے میں سخت غلطی کی ہے اور میں یہی امید رکھتا ہوں کہ اگر ضد دلانے والی باتیں نہ کی جائیں بلکہ معقول طریقے سے دلیل کے ساتھ سمجھایا جائے تو وہ جان بوجھ کر کسی گمراہی پر اصرار نہ کریں گے۔

(منقول از ترجمان القرآن - لاہور)

باب الصحت

از حکیم محمد عظیم زبیری امروہہ

ذہنی کیفیت کا اثر صحت پر

انسان کے خیالات کا اثر صحت پر گہرا پڑتا ہے اُسکی ذہنی کیفیت براہ راست اُسکی جسمانی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے عام مشاہدہ ہے کہ خوشخبری انسان کے چہرہ کو شگفتہ اور تروتازہ بنا دیتی ہے اور بُری خبر پژمُردہ اور مضمحل۔ جو لوگ ہر وقت یہ کہتے رہتے ہیں کہ آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے آج سستی اور کمزوری معلوم ہوتی ہے رات اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ وہ کبھی کامل تندرستی حاصل نہیں کر سکتے خیالات میں بڑی طاقت ہوتی ہے اگر کوئی شخص ہر وقت اپنے آپ کو کسی بیماری میں مبتلا تصور کرے گا۔ تو وہ لازمی بیمار پڑ جائے گا۔ آپ کسی شخص سے خواہ نحیف ہو یا قوی۔ دبلا ہو یا موٹا اتنا کہہ دیں کہ "حضرت! آپ کو دق کی بیماری ہو گئی ہے" پھر دیکھئے کہ وہ کتنا بدحواس ہوتا ہے اگر کسی ڈاکٹر حکیم نے اُسے یقین دلا دیا کہ دق نہیں ہے تو خیر ورنہ اگر دو چار نے اُس کے دق میں مبتلا ہونے کی تصدیق کر دی تو واقعی چند دنوں میں اُسے دق (T.B) ہو جائیگی اور ایسا اُس کے ہر وقت کے خیال اور وہم کے سبب ہوگا۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل میں صحت و تندرستی کا تصور بٹھائے اور ہر اُس خیال کو جو بیماری کی طرف لے جائے دل سے دور کرنے کی کوشش کرے۔

میں اپنے پچیس سالہ تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ ادویات کے مقابلہ میں بیماریوں پر مریض کی ذاتی جدوجہد اور خیال کا زبردست اثر پڑتا ہے ہر انسان کو اُسی علاج کا سہارا لینا چاہیئے جس طریقہ علاج پر اُسکو کامل یقین ہو اور اُسے وہ تمام رائج الوقت علاجوں میں بہتر سمجھتا ہو۔ علاوہ ازیں اُس معالج کا علاج کرنا چاہیئے جسکی حذاقت مرکبات اور خلوص پر اُس کو بھروسہ اور اعتقاد ہو۔ یاد رکھئے کسی بھی پیتھی کی دوا ہو وہ اُسی حالت میں مفید نتائج پیدا کرے گی جب مریض خوش اعتقادی کے ساتھ استعمال کرے گا ورنہ بہتر دوائیں بھی بے اثر ثابت ہوں گی۔ اس نفسیاتی حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

محترم ناظرین سے گزارش ہے کہ اگر آپ خدانخواستہ کسی بیماری کا شکار ہیں یا متعلقین میں سے کوئی علیل چلا جاتا ہے تو آپ متفکر اور پریشان نہ ہوں گھبراہٹ اور تلوّن مزاجی۔ عجلت پسندی سے مرض میں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں آپ ہمارے یہاں سے مردانہ و زنانہ نہایت کارآمد لٹریچر مفت منگا کر مطالعہ کریں یہ بازاری قسم کا لٹریچر نہیں ہے یہ آپ کو صحت مند زندگی گزارنے اور بیماریوں سے چھٹکارا پانے کی صحیح راہ دکھائے گا۔ ہر قسم کے مرض میں مشورہ بلا فیس حاصل کر سکتے ہیں لیکن جواب کے لئے پتہ لکھا لفافہ یا ٹکٹ رکھنا نہ بھولیئے۔

آپ کے مرض کا دور نہ ہونا معالج کی غلط تشخیص کا نتیجہ ہو یا آپ کے جلد جلد معالج بدلنے کا یا مرض کی ایسی پیچیدگیوں کا جن پر آپ کا اور معالج کا کوئی بس نہ تھا ہر حال میں مایوس اور دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دل کو قوی رکھو۔ بیماری کا ہوّا اپنے دل و دماغ پر نہ بٹھاؤ۔ مرض کا نہایت دلیری سے مقابلہ کرو محض دوائیوں کے ذریعہ نہیں قوت باطنی سے بھی۔ آپ کا یہ عزم اور ارادہ قوی ہونا چاہیئے کہ مجھے صحت مند ہونا ہے اور تندرست بن کر زندگی گزارنا ہے تو یقیناً آپ جلد مرض سے نجات حاصل کر لیں گے ہر قسم کے جذبات پر پورا پورا کنٹرول ہونا صحت مند زندگی کے لئے ضروری ہے۔

دل کی طمانیت اور خیالات کی پاکیزگی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے

نومبر ۵۹ء

ماہنامہ تجلی دیوبند

تاریکیوں میں ایک چراغ

ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

سالانہ:- سات روپے / ۱۸ شلنگ

۶۲ نئے پیسے
دس آنے
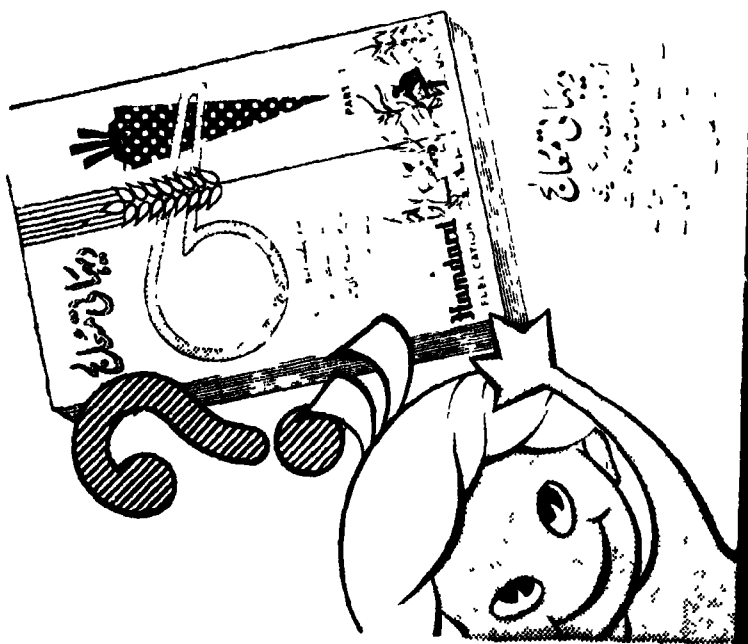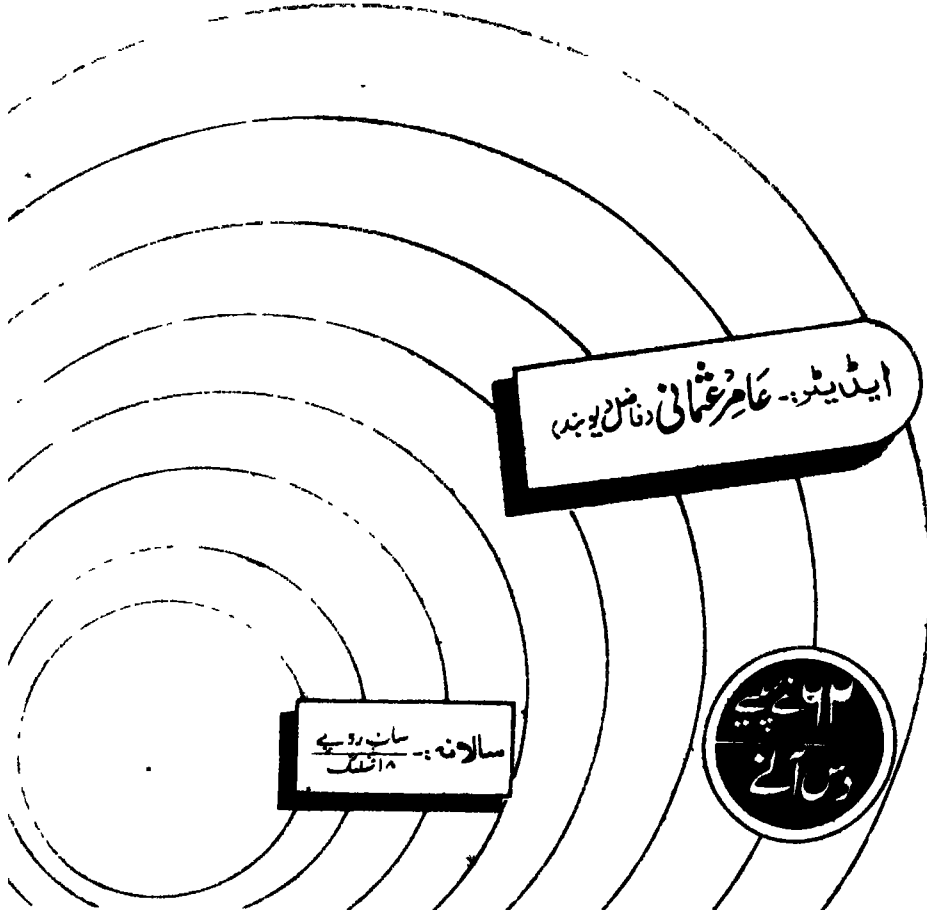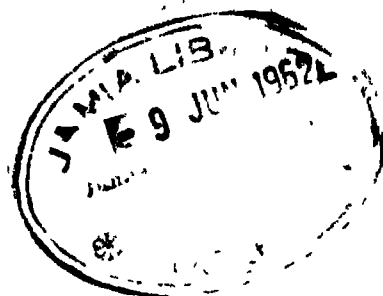
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سالانہ قیمت
سات روپے
فی پرچہ
دس آنے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت
۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
(پوسٹل آرڈر پر تجلی نہ لکھئے۔
بالکل
سادہ رکھئے)۔

انشاءاللہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

ماہنامہ
تجلی
دیوبند

جلد ۱۴ — شمارہ ۶

فہرست مضامین مطابق ماہ جون ۱۹۶۲ء

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

(وی پی سات روپے بائیس نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری کردیا جائے گا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

گذشتہ شمارے میں ہم نے تفسیر معالم التنزیل پر تبصرہ کیا تھا۔ مقامی طور پر اس کا بہت چرچا ہوا۔ اس سلسلے میں ایک فاضل دوست نے جنھیں عربی زبان و ادب پر عبور حاصل ہے اور مطالعہ بھی ان کا وسیع ہے ہمیں ہماری ایک غلطی پر متنبّہ کیا ہے جو اس اعتبار سے فاش غلطی کہلانے کی مستحق ہے کہ اس کا تعلق عربی گرامر کے ایک بالکل ابتدائی قاعدے سے ہے۔

ہم نے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کے اس ترجمے پر کہ:-

"پس اگر تم گذشتہ زمانہ میں بھی نہ کر سکے"

اعتراض کیا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ہمارا ایک تعریضی فقرہ یہ تھا:-

"اس ارشادِ ربّانی میں گذشتہ زمانے کا ذکر کہاں سے آداخل ہوا۔"

فاضل دوست نے ارشاد فرمایا ہے کہ گرامر کی رو سے لم داخل ہونے کے بعد ماضی ہی کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے یہ کہنا بے خبری کی دلیل ہے کہ "گذشتہ زمانے کا ذکر کہاں سے آداخل ہوا۔" اس سلسلے میں موصوف سے ہماری زبانی گفتگو بھی ہوئی۔ ہم نے ان سے گذارش کی تھی کہ وہ اپنی تفہیم و تنبیہ کو تحریری شکل دیکر ہمیں عنایت فرما دیں ہم اسے تجلّی میں شائع کر دیں گے۔ لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اب ہمارا ضمیر کسی طرح یہ گوارا نہیں کر رہا ہے کہ جس قصور پر ہمیں مطلع کیا گیا ہے وہ مخفی رہے۔ لہٰذا یہ سطور اعلانِ اظہار ہی کے مقصد سے سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔

ہم صفائی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ابتدائی گرامر کے جس قاعدے کا ذکر فاضل دوست نے کیا ہے تبصرہ کرتے وقت وہ ہمیں مستحضر نہیں رہا تھا۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ یہ بھی گذارش ہم ضرور کریں گے کہ ہمارے اعتراض کو گرامر کی جامد پیروی کے عوض حقیقت پسندانہ عدل کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

ہمارا بنیادی ذہن قرآن کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے الفاظ و معانی میں کتنی ہی نکتہ سنجیاں کی جائیں، لیکن یہ بات سب سے زیادہ اُبھر کر سامنے آنی چاہئے کہ مقصودِ خداوندی کیا ہے۔ ظاہر ہے نزولِ آیات کا مقصدِ اصلی تو یہی تھا اور ہے کہ ہدایاتِ ربّانی کو سمجھا جائے اور سمجھ کر عمل کیا جائے۔ صرف و نحو کے قواعد، ادبی صنائع و بدائع، نکاتِ غامضہ اور زبان و ادب کے محاسن و لطائف سب ثانوی درجے میں ہیں۔ لگے بندھے قواعد کو آیاتِ قرآنیہ پر اس طرح منطبق کرنا کہ منشائے کلام ہی بدل جائے صحیح طریقہ نہیں ہے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ منشائے کلام ہر حال میں مقدم اور نمایاں رہے چاہے صَرف و نحو کے کسی قاعدے میں تاویل ہی کرنی پڑے۔

آپ دیکھ سکتے ہیں مثال کے طور پر کَانَ اور اس کے صیغے قرآن میں بے شمار جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ کان قاعدے کی رو سے فعل ماضی ہے، لیکن قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہر جگہ اس کے معنی ماضی کے نہیں لئے جاتے، بلکہ موقع اور محل کے اعتبار سے یہ ماضی، حال اور مستقبل سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عموماً یہ استمراری مفہوم میں نازل ہوا ہے۔

اسی لم کی مثال لیجئے جو لم تفعلوا میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (بقرہ)	اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہئے۔

کنتم ماضی ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور لم تجدوا میں بھی قواعد کی رو سے ماضی ہی کے معنی پائے جاتے ہیں لیکن کیا اس میں کوئی شک ہے کہ آیت سے ماضی کا کوئی واقعہ یا حکم بیان کرنا ہرگز مقصود نہیں، بلکہ حال اور مستقبل دونوں کے لئے ایک دائمی ضابطہ دیا جا رہا ہے۔ اسی لئے کسی بھی مستند مترجم نے گرامر کی جامد پیروی کرتے ہوئے ماضی کا مفہوم پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اسی طرح سورۂ نور میں فرمایا گیا ہے:-

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ (نور)

اے ایمان والو! اپنے گھر کے سوا کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور سلام کر لو اُن گھر والوں پر۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو۔ پھر اگر نہ پاؤ اس میں کسی کو تو مت داخل ہو جبتک کہ داخلے کی اجازت نہ مل جائے۔

یہاں بھی ٹھیک اسی طرح فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا آیا ہے جس طرح وہاں فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا آیا تھا۔ دیکھ لیجئے کہ یہاں بھی زمانۂ ماضی سے ارشادِ خداوندی کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ حال اور مستقبل کے لئے ایک اخلاقی اصول بیان کیا گیا ہے۔

ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ گرامر کی پاسداری میں ایسے ہر مقام پر ایسا ترجمہ ممکن ہے جس میں ماضی کے صیغے استعمال کر لئے جائیں، لیکن چونکہ آیات کے مفہوم و مطلب کا ماضی سے کوئی حقیقی تعلق نہیں اس لئے اکابرین میں سے کسی نے بھی اس غیر ضروری گرامر پسندی کا التزام نہیں کیا اور مقصودِ قرآنی کو مقدم رکھ کر وہی ترجمہ کیا جو حال اور مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے نہ کہ ماضی کی۔

اب ایک نظر زیر بحث آیت پر ڈال لیجئے:-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار کی ہوئی کافروں کے واسطے۔

یہ ترجمہ ہم نے حضرت شیخ الہندؒ کا نقل کیا ہے جو ہمارے اور تفسیر معالم التنزیل کے مترجم کے مشترکہ اکابرین میں سے ہیں ملاحظہ کر لیجئے کیا اس میں ماضی کا کہیں نام و نشان بھی ہے۔ اس پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا تفسیری حاشیہ دیکھئے وہ لکھتے ہیں:-

"پھر اس پر بھی اگر تم ایسی ایک صورت نہ بنا سکو اور یہ بات یقینی ہے کہ ہرگز نہ بنا سکو گے تو پھر ڈرو اور بچو نارِ دوزخ سے۔"

گویا شیخ الہندؒ اور علامہ عثمانیؒ میں سے کسی نے فان لم تفعلوا کا یہ مفہوم نہیں لیا کہ:-

"پس اگر تم گذشتہ زمانے میں بھی نہ کر سکے۔"

مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ یہ ہے:-

"پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے۔"

مولانا محمد عبدالحق صاحب تفسیر حقانی ترجمہ کرتے ہیں:-

"پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔"

شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ یہ ہیں:-

"پھر اگر نہ کرو اور البتہ نہ کروگے۔"

موضح القرآن میں ان کی عبارت یہ ہے:-

"پھر اگر نہ بنا سکو قرآن کے مانند اور ہرگز نہ بنا سکو گے"

یہ معروف و مستند اکابرین کے ترجمے ہیں۔ کیا کسی نے بھی گرامر کی پاسداری میں ماضی کا ترجمہ کیا ہے۔

ان شہادتوں کے علاوہ خود آیت کے مطالب پر سلامتی فکر کے ساتھ غور کیجئے۔ چیلنج میں اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ بلاؤ اپنے اعوان و انصار کو پھر دکھاؤ ان کی مدد سے ایک سورۃ قرآن جیسی بنا کر۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ فان لم تفعلوا حال اور مستقبل کے لئے ہو۔ پہلے اگر کفار اپنے مددگاروں کو جمع کر کے حتمی جد و جہد کر چکے ہوتے تو چیلنج کا انداز یہ نہ ہوتا بلکہ پھر تو

خبر کے انداز میں بات بیان کی جاتی۔ چیلنج کا پیش نظر انداز منھ سے بول رہا ہے کہ للکار حال اور مستقبل کے لئے ہے۔

ایک اور قرینہ فَاِنْ کی فا بھی ہے۔ اگر کوئی مخالف قرینہ موجود نہ ہو تو اس کے مفہوم میں تاخیر و تعقیب یقیناً ماننی ہو گی۔ دیکھ لیجئے تمام متذکرہ مترجمین نے تعقیب ہی مان کر ترجمہ "پھر" کیا ہے جو "پس" کے مقابلے میں تعقیب کے مفہوم کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

مزید ایک استشہاد خود ان کنتم صٰدقین سے کیا جا سکتا ہے۔ کنتم صیغۂ ماضی ہی ہے۔ تو گرامر کی کورانہ پیروی کی صورت میں تو یہ معنی کرنے ہوں گے کہ:۔

"اگر تم سچے تھے۔"

حالانکہ تفصیل میں جائیے تو یہاں بلا شبہ ماضی ہی مناسب تھا، لیکن چونکہ مقصود کلام کا تعلق ماضی سے نہیں ہے لہٰذا ہر معتبر مترجم حال ہی کا ترجمہ کرتا ہے یعنی:۔

"اگر تم سچے ہو"

ایک اور دلیل ہماری تائید میں سورۂ سُبحٰن کی اس آیت سے ملتی ہے:۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

کہدو کہ اگر تمام انس و جن مل کر بھی اس قرآن جیسی چیز بنا کر لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے چاہے وہ ایکدوسرے کی کتنی ہی مدد کریں

اس آیت میں اجتمعت اور کان دونوں افعالِ ماضیہ ہی لائے گئے ہیں۔ کیونکہ جب بھی وہ جمع ہو کر ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیں گے لا سکنے یا نہ لا سکنے کا فیصلہ اس کے بعد ہی ہو گا۔ اس لحاظ سے ایتاء کے صیغے مضارع لائے گئے اور مذکورہ دونوں صیغے ماضی۔ لیکن کیا کسی بھی مترجم اور مفسر نے ان قواعدِ لسانیہ کے تحت ایسا ترجمہ یا مفہوم پیش کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ جن و انس کا اجتماع اور ان کا باہم دگر معاون ہونا کوئی گذرا ہوا واقعہ تھا جو اللہ نے بیان کیا۔

اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو فان لم تفعلوا ہی میں کیا خصوصیت ہے کہ واضح اور تقریباً متفق علیہ مفہوم لینے کے عوض یہ نکتہ سنجی کی جائے کہ چونکہ مضارع پر لَم داخل ہو کر ماضی کے معنی پیدا کرتا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ:۔

"پس اگر تم گذشتہ زمانے میں بھی نہ کر سکے۔"

ہم صرف اتنا ہی اور کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کسی تاویل و توجیہ سے یہ مطلب قابل قبول بھی ہو سکتا ہو تب بھی اسے واحد مفہوم کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیئے تھا بلکہ مفہوم تو وہی مقدم رکھنا چاہیئے تھا جس پر علمائے سلف و خلف مجتمع ہیں اور ضمناً یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ لَم نے داخل ہو کر ماضی کے معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس کے لحاظ سے فان لم تفعلوا کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ صاحبِ معالم التنزیل نے ایک دور کی بات اس طرح پیش کی جیسے وہی اقرب و اصوب ہو اور مترجم نے اسے جوں کا توں قبول کر کے کوئی تصریحی نوٹ نہیں دیا۔ لیکن اس اعتراض سے ہماری وہ کوتاہی بہرحال مسلّم رہتی ہے کہ عربی گرامر کے ایک معمولی سے قاعدے کو بھی ہم فراموش کر بیٹھے اور اعتراض کا وہ اسلوب اختیار کیا جو اختیار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

اصل بحث تو ختم ہوئی۔ اپنے تبصرے میں ہم نے ناشر کے مقدمے پر جو حرف گیری کی ہے اس کی تلخی پر ہمیں رنج ہے۔ ہم یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ناشر کے کاروبار کو نقصان پہنچانا حاشا و کلّا ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ لیکن اگر ہمارے تبصرے سے مکتبہ ندوۃ الفرقان کے بارے میں کسی کو سوءِ ظن پیدا ہو گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ مبالغہ آرائی آج کی روش عام ہے اس لئے ناشر کے قلم سے چند مبالغہ آمیز الفاظ بے ساختہ نکل گئے۔ ورنہ یہ مکتبہ بہرحال کسی سوءِ ظن کا مستوجب نہیں ہے اور اس کے مالک ایک سلیم الطبع نوجوان ہیں جن کے عزم و ہمت سے توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تفسیر معالم التنزیل کے ترجمے کے معائب ان پر واضح ہو گئے ہیں تو اب وہ کوئی دوسرا بہتر سلسلہ شروع کریں گے۔ اگر وہ ایسا کریں تو ہماری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔

عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

پڑوسی کے حقوق

(۳)

کافر پڑوسی بھی سلوک کا حقدار ہے

عن مجاھد قال کنت عند عبد اللہ بن عمرو و غلام لہ یسلخ شاۃ فقال:- یا غلام! اذا فرغت فابدأ بجارنا الیہودی فقال رجل من القوم:- الیہودی؟ اصلحک اللہ قال:- انی سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوصی بالجار حتی خشینا او رُئینا انہ سیورثہ- (اخرجہ ابوداؤد والترمذی والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ:-

بلند مرتبہ تابعی حضرت مجاہد سناتے ہیں کہ ہم عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حضور باریاب تھے۔ اس وقت ان کا ایک خادم مذبوحہ بکری کی کھال اُتار رہا تھا۔ انھوں نے خادم سے کہا:-

"دیکھنا جب کھال اُتار چکو تو گوشت کو بطور ہدیہ تقسیم کرنے کی پہل ہمارے یہودی پڑوسی سے کرنا"

ایک صاحب بولے۔ جناب اللہ آپ کو نیکی دے کیا آپ یہودی کو ہدیہ بھجوائیں گے؟" ابن عمرؓ نے فرمایا۔ "ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑوسی کے بارے میں اس شان سے نصیحت و وصیت کرتے سُنا ہے کہ ہمیں تو یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ آپ پڑوسی کو شریک وراثت فرمادیں گے۔"

تفہیم:-

عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی تھے اور سنتِ نبویؐ کی پیروی میں ان کا ذوق و شوق عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے پڑوسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے جو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پڑوسی چاہے کافر ہو، لیکن وہ بھی حسن سلوک کا مستحق ہے تو بالکل حق اخذ کیا۔ جیسا کہ پچھلی تفہیم سے معلوم ہوچکا پڑوسی کا گناہگار یا بدمزاج ہونا اس کے حق ہمسائگی میں قادح نہیں ہوتا وہ اگر کافر بھی ہے تو پڑوسی کی حیثیت میں حسن سلوک کا حقدار ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہر وہ بھلائی اور سلوک اس کے ساتھ کریں جس سے اسلام کی انسان دوستی، حسن اخلاق

اور مروت ورافت کا ثبوت بہم پہنچے۔

اہلِ خرد پر پوشیدہ نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں کفر و شرک سے بیزاری و نفرت کا درس دیا ہے نہ کہ خود کفا و مشرکین سے۔ اس لطیف بات کو یوں سمجھئے کہ جس طرح دق، سِل، برص، چیچک وغیرہ جسمانی امراض ہیں اسی طرح کفر و شرک روحانی امراض ہیں۔ حکیم ڈاکٹر امراض سے تو یقیناً بیزار ہوتے ہیں اور انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں، لیکن انھیں خود ان لوگوں کی ذات سے نفرت نہیں ہوتی جنھیں یہ امراض لاحق ہوگئے ہیں۔ اگر ان کی ذات ہی سے نفرت ہوجائے تو ان کی صحت بحال کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ مریضانِ کفر و شرک کا ہے کہ مسلمانوں کو، جو اللہ کی طرف سے شہداء علی الناس بنائے گئے ہیں اور ان پر واجب کیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین کو نرمی اور حکمت کے ساتھ مرضِ کفر و شرک سے نجات دلانے کی سعی کرتے رہیں خود مرض سے نفرت ہونی چاہئے نہ کہ مریضوں سے۔ مریضوں سے نفرت ہوگی تو ان کی ہمدردی اور ازالۂ امراض کی تگ و دو کیسے جاری رہ سکے گی۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ شاہد ہے کہ آپ کفر و شرک سے انتہائی بیزار ہونے کے باوجود کفار و مشرکین کے ساتھ نہایت خُلق و مروت سے پیش آتے۔ موقعہ اور ضرورت پیش آئے تو ان کی حاجت روائی کرتے ان سے بے شمار تکلیفیں آپؐ کو پہنچیں، انھوں نے آپؐ کو گھر سے نکالا جراحتیں پہنچائیں، قتل کی اسکیمیں تیار کیں، طعنے دیئے، پھبتیاں کسیں مگر کائنات کے سب سے بڑے انسانؐ کی پوری زندگی میں آپ ایک بھی ایسا واقعہ نہیں دیکھیں گے کہ کسی بد سے بدتر دشمن جانی کے ساتھ بھی اس سمندر جیسے دل والے نے ایسا سلوک کیا ہو جس پر حسنِ اخلاق کی رو سے انگلی اٹھائی جاسکے۔

ہاں بعض حالتوں میں کفر اور کافر، شرک اور مشرک کا فرق اتنا دھندلا ہوجاتا ہے کہ مشکل ہی سے اس کا لحاظ رکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص بے حد عادل ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ سراپا عدل ہے اور بے حد ظالم ہے تو بولا جاتا ہے کہ مجسّم ظلم ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا کفر و شرک حد سے بڑھا ہوا ہو اور حق دشمنی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا ہو تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ سراپا شرک اور مجسم کفر ہے۔ گویا کہ یہ اوصافِ خبیثہ اس کے پورے وجود پر چھاگئے اور اس کی ذات ہی سر بسر نجاست بن گئی۔ ایسی حالت میں فطرتِ انسانی کا بھی اور عدل کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اوصافِ رذیلہ کی نفرت ذاتِ موصوف تک منتج ہوجائے اور اس شخص پر تعین کرکے لعنت کی جاسکے۔ چنانچہ دورِ رسالت میں ابوجہل و ابولہب کی ناپاک شخصیتیں اس کی واضح نظیر ہیں۔ یہ ملعون سراپا کفر و شیطنت تھے اور یہی وجہ ہے کہ ابولہب کیلئے تو خود اس کے پیدا کرنے والے نے انتہائی بیزاری کے انداز میں فرمایا۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ۔

پھر بھی ہم صحیح ترین روایات میں دیکھتے ہیں کہ نبی کا بکرال حسنِ اخلاق ان تک کے معاملہ میں اپنی فلک بوس بلندیوں سے نیچے نہیں آیا اور حضورؐ نے ایسے سائلین کو بھی بخوشی صدقہ اور قرض عطا فرمایا جو ان کم بختوں کے ناصرین و اعوان میں تھے اور اسلام کو جڑ بنیاد سے ڈھا دینا ان کا سب سے بڑا ارمان تھا۔

غیر مسلم ہمسایوں سے حسنِ تعلق کا مسئلہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ دلوں کو فتح کرنے والی کوئی طاقت حسنِ اخلاق سے بڑھ کر نہیں ہے۔

آپنے تاریخ میں دیکھا کہ لمبے چوڑے مباحث سے نا آشنا کم گو، سادہ اور سر جھکا کر چلنے والے مسلمانوں کے حسنِ اخلاق ہی نے اُن بے شمار انسانوں کے قلوب کو فتح کر لیا جنھیں بڑے بڑے لشکر بھی مشکل ہی سے فتح کر سکتے تھے۔ پھر لشکروں کی فتح جسموں کی فتح ہوتی ہے۔ قلوب و ارواح مادّی طاقت سے فتح نہیں ہوا کرتے۔ لیکن مسلمانوں نے دلوں اور روحوں کو جھکایا جس کا واحد ذریعہ حسنِ اخلاق تھا۔ ٹھیک اسلامی مفہوم میں حسنِ اخلاق۔ ایک شخص بہت بڑا زاہد و عابد ہونے کے باوجود کسی کافر ہمسائے سے بدسلوکی کا مرتکب ہے تو اسلام اسے معاف نہیں کرے گا۔

ہماری زبوں حالیوں میں سب سے بڑا ہاتھ ہماری بداخلاقیوں کا ہے۔ حال کا ہر واقعہ ماضی میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جو دیوار آج رفتہ رفتہ گر رہی ہے اس پر آندھی، طوفان دھوپ اور دوسری متعدد اشیاء نے مسلسل اثر ڈالا ہے تب کہیں جاکر اس کی قوتِ ثبات کا خاتمہ ہوا ہے۔ ننھا بیج یونہی تناور درخت نہیں بن گیا۔ اس پر زمین، ہوا، چاند سورج اور بارش کے گوناگوں اثرات کی ایک طویل مسلسل اور لطیف و منظم کارفرمائی ہوئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح آج ہم مسلمانوں کا جو حال ہے اس کے پیچھے بھی ماضی قریب ہی کے نہیں ماضی بعید کے بھی تاریخی عوامل کارفرما ہیں اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی اور قوی تر عامل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انھوں نے اسلامی اخلاق سے وہ شغف ترک کردیا جس کا وہ مستحق تھا۔ مادّی موثرات اور حوادث و آفات کی کارفرمائیوں سے انکار ممکن نہیں، لیکن ہر پھر کر بات وہیں پہنچے گی کہ جس رفتار سے اسلامی اخلاق میں کمی آتی گئی اسی رفتار سے امتِ مسلمہ کی آبرو اور ساکھ برباد ہوتی چلی گئی۔

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی اگر ہمارے اسوۂ و کردار پر اسلامی اخلاق کا گہرا رنگ اس حد تک چڑھ جائے کہ غلبے اور کثرت کے اعتبار سے قومِ مسلم اسلامی اخلاق سے متصف کہی جاسکے تو ساری مصیبتیں، ساری ذلتیں اور ساری آفتیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آرہا ہے اس طرح چھٹتی چلی جائیں جیسے تیز ہوا سے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اسباب و علل کی منطق اتنی پیچیدہ ہے کہ دو اور دو چار کی طرح کوئی بھی مستقبل کی بات نہیں بتا سکتا، لیکن اس منطق کی زمام ایک حکیم و عادل ہستی کے ہاتھ میں ہے جس نے وعدہ فرمایا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (تم ہی سربلند ہوگے بشرطیکہ واقعۃً مومن ہو) اسلامی اخلاق اور ایمان ایک ہی حقیقتِ کبریٰ کی دو تعبیریں ہیں۔ مومن ہونا اور اخلاقِ اسلامی سے متصف ہونا ایک ہی بات ہے۔ لہٰذا سربلندی کے اسباب و وسائل تو وہ قادرِ مطلق خود ہی پیدا کردیگا، جس کا وعدہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔

آپ ہمسایوں سے ملنے جلنے والوں سے، سماجی تعلقات اور ہر طرح کے معاملات میں اسلامی اخلاق برت کر دیکھئے اور اسی پر ثابت قدم رہیئے پھر دیکھئے گا کہ کافر بھی آپ کی تعریف کرے گا اور بڑے سے بڑا بد دماغ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

لیکن یہ نکتہ خوب سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اسلام کی محبت اور اطاعتِ ربانی میں اسلامی اخلاق پر ثابت قدم رہنا اور بات ہے اور ہنگامی حالات اور وقتی مصالح کے تحت یا خوف و مرعوبیت سے خوش اخلاق بننا اور بات۔ پہلی آخرت کے لئے بھی مفید ہے اور دنیا میں بھی اس کے اچھے اثرات ظاہر ہوکر رہیں گے۔ مگر دوسری کسی خاص اُخروی انعام کی مستحق نہیں اور دنیا میں بھی اس کا بارآور ہونا ضروری نہیں۔ پہلی سیرت و کردار کی عظمت کے ہم معنی ہے اور دوسری بزدلی اور ابن الوقتی کے مرادف

حاصلِ تفہیم یہ ہے کہ ہمسایہ کافر و مشرک بھی ہو تو اس کا ایک حق ہے۔ جس نے اس حق کو ادا کیا اللہ اور رسول کو خوش کیا۔ ہاں یہ ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر حکم و ہدایت کے کچھ حدود ہیں۔ ایسی کوئی دلداری و مروّت جائز نہیں ہے جس میں معصیت اور شریعت کی مخالفت کا عنصر شامل ہو۔ مثلاً کافر و مشرک ہمسائے کی شادی اور موت میں ضرور شریک ہونا چاہیئے، لیکن انکے ایسے کھانے میں شرکت نہیں کی جاسکتی جن کا کوئی قریب یا بعید تعلق کسی بُت یا دیوی دیوتا سے ہو اور انکی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ ان کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔

استحقاق کا پیمانہ

عن عائشۃ قالت یارسول اللہ انّ لی جارین فالی ایھما اھدی؟ قال الی اقربھما

منك بابًا (اخرجه ابو داؤد والطحاوی والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ:- حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں - دونوں میں سے کس کی طرف ہدیہ بھیجوں؟ حضورؐ نے جواب دیا جس کا دروازہ تمہارے دروازے سے نسبتاً قریب ہو۔

تفہیم:-

مقصود یہ نہیں ہے کہ ہدیہ اور تحفہ دیئے جانے کا مستحق صرف وہ ہمسایہ ہے جس کا دروازہ سب سے زیادہ قریب ہو - باقی ہمسائے استحقاق سے خارج ہیں - نہیں بلکہ تعلیم یہ دینی مقصود ہے کہ اگر فرض کرو تمہارے پاس بطور ہدیہ بھیجنے کے لئے کوئی اتنی تھوڑی چیز ہے جو صرف ایک ہی گھر بھیجی جاسکتی ہو تو حقِ ہمسائگی کے اعتبار سے وہ گھر اس کا زیادہ مستحق ہے جو قریب ترین ہو - دوسری شکل یہ ہے کہ متعدد ہمسایوں کے یہاں تحفہ بھیجنے کو کوئی چیز کافی مقدار میں تمہارے پاس موجود ہے تو پہل اقرب سے کرو جیسا کہ ابھی تم نے دیکھا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے پہل اُس یہودی سے کی تھی جو باعتبار باب اقرب تھا۔

اس روایت سے یہ تصور اور گہرا ہو گیا کہ حقِ ہمسائگی مستقل بالذات ایک اہم ترین حق ہے - اب مان لو تمہارے ہمسایوں میں دو گھرانے اتنے غریب ہیں کہ ان کے پاس جاڑوں کے لئے کافی اوڑھنا بچھونا نہیں ہے - اللہ نے اگر تمھیں اتنا دیا ہے کہ اہل و عیال کے حقوق میں کمی کئے بغیر ان دونوں گھرانوں کو لحاف بچھونا مہیا کر دے سکو تو اگرچہ اسلام کا عدالتی قانون تمھیں سوائے زکوٰۃ کے کسی صدقے کا پابند نہیں بناتا اور اگر زکوٰۃ تم کچھ اور لوگوں کو ادا کر چکے ہو تو قانون تم سے نہیں کہے گا کہ ان ہمدردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گھرانوں کو لحاف بچھونے بنا کر دو، لیکن اخلاقِ حسنہ اور اللہ و رسولؐ کی مرضیات کا پاس اگر تمھیں ہے تو خود تمہارا ضمیر تمھیں حکم دے گا کہ کشادہ دلی کے ساتھ حقِ ہمسائگی ادا کرو - اب مان لو کہ تمھارے پاس صرف اتنی گنجائش ہے کہ ایک ہی لحاف بچھونا مہیا کر دے سکتے ہو تو رسول اللہؐ کی تعلیم یہ ہے کہ یہ لحاف بچھونا دونوں مستحق ہمسایوں میں سے اُس ہمسائے کو دو جس کا دروازہ تمھارے دروازے سے نسبتاً قریب ہو - یہ مت دیکھو کہ کون نیک ہے، اور کون بد - کس سے تمھارے تعلقات زیادہ ہیں اور کس سے کم - حتّٰی کہ یہ اقرب اگر کافر بھی ہے تو بھی بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ تم اسے ترجیح دو۔

اللہ اکبر - انسانیت دوستی کی کتنی فیاضانہ تعلیم - بے تعصبی کی کیسی عالی ظرفانہ ہدایت - سچ ہے کہ ہم نے تعلیماتِ دین کو بالائے طاق رکھدیا ورنہ تنہا حقِ ہمسائگی ہی ایک ایسا زرّیں باب ہے کہ اگر تمام مسلمان تنہا اسی کو دانتوں سے پکڑ لیتے تو بلا کسی رسمی تنظیم اور جماعت سازی کے انھیں ایک قابلِ رشک اور مضبوط ترین رابطہ ہوتا - مواسات ہوتی - مواخاۃ اور مروّت ہوتی - جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں حق ہمسائگی ادا کرنے کا التزام آدمی میں بے لوث فیاضی، انسانیت دوستی اور لحاظ و مروّت کے احساسات کو فروغ دیتا ہے - فکر و نظر کے زاویوں کو خود غرضی اور شقاوت کی کجی سے پاک کر کے عالی ظرفی اور جود و کرم کے رُخ پر استقامت عطا کرتا ہے اور یہ بات نفسیاتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے اوصاف اور احساسات جن اذہان و قلوب میں نشو و نما پاتے رہیں وہ دائرۂ ہمسائگی سے باہر کے انسانوں کے ساتھ بدسلوکی اور کج خلقی کو پسند کریں - خصوصاً جب اس بنیادی حقیقت پر ان کا ایمان ہو کہ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں تو ممکن ہی نہیں ہے کہ محلے سے باہر کے انسانوں سے ان کا سلوک اُن اوصافِ حمیدہ کے اثرات سے خالی ہو جن کی چمن بندی حقوقِ ہمسائگی ادا کرنے کے التزام سے ہوتی آ رہی ہے۔

علاوہ اس کے محلے سے باہر والوں کے ساتھ جو برتاؤ کرنا چاہئے اس کے باب میں بھی اسلام نے صریح و محکم ہدایات دی ہیں جو انشاءاللہ اپنے محل میں ذکر ہوں گی - اسلام نے تہذیب و تمدن، امن و جنگ اور سیاست و معیشت کے ہر ہر

[illegible]

تجلّی کی ڈاک

قلب بیدار

سوال ۱: — از عبدالباری - رحیم آباد - پاکستان۔

(رسائل کے پہلے سوال کا جواب گذشتہ ماہ دیا جا چکا ہے — تجلّی)

(۲) دوسری حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تنام عینای ولا ینام قلبی (میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا) اس کا مطلب بھی ظاہر طور پر نہایت واضح ہے، لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ رسول اکرم درحقیقت یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے میرا قلب ہر وقت بیدار رہتا ہے اگرچہ ظاہری طور پر آنکھیں بند بھی ہو جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ "لیلۃ التعریس" کا واقعہ تشویش انگیز ہے کہ آنحضرت سے نمازیں کس طرح قضا ہو گئیں جب کہ آپ کا قلب مبارک بیدار تھا اور کیا آنکھیں بند ہو جانے کے بعد کسی طرح رسول اکرم دیکھتے تھے؟ کیا کوئی آنکھوں کے علاوہ دوسرا آلہ دیکھنے کا تھا؟ اور اگر رسول اکرمؐ فرض کرو دیکھتے بھی تھے تو اس صورت میں کیا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلاً خواب میں کوئی واقعہ دیکھ رہے ہیں تو کیا بیک وقت خواب اور بیداری کے حالات منکشف ہو سکتے ہیں؟ خلاصۂ اشکال یہ ہے کہ قلب بیدار کے ساتھ نماز قضا ہونے کے کیا معنیٰ؟

جواب ۱: —

قلب بیدار، دلِ زندہ اور اسکی مقلوب اصطلاحیں (قلب خفتہ، دلِ مردہ) اُردو میں اس قدر مستعمل ہیں اور ادباء و شعراء وغیرہ نے ان کا اس قدر استعمال کیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کوئی اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی ان کے مفہوم و منشاء سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے۔

جس طرح دلِ دنیا ایک اصطلاح ہے اور دل واقعتہً سینے سے نکل کر دوسرے کی جیب میں نہیں چلا جاتا اور جس طرح ہاتھوں کے طوطے اُڑ جانا ایک اصطلاح ہے اور طوطے سچ مچ ہاتھوں پر بیٹھے نہیں ہوتے اسیطرح دل کا بیدار یا خفتہ اور زندہ یا مُردہ ہونا بھی اصطلاحیں ہیں جن کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ دماغ اور جسم کی طرح دل بھی معمولاً سوتا جاگتا اور رستا تا ہے یا اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے بھی معروف معنوں میں "مر" جاتا ہے، بلکہ ان اصطلاحوں کے ذریعے سیرت و کردار کی بعض خصوصیات کے بارے میں کنایہ کیا جاتا ہے جسے تمام باخبر لوگ جانتے ہیں — مثلاً ڈاکٹر اقبال نے کہا:-

> دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
> کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

تو ظاہر ہے کہ جس قوم کو ایک پیکرِ واحد کی حیثیت میں اقبال نے مخاطب کیا ہے اس کے افراد کے سینوں میں دل سچ مچ تو نہیں مرے ہیں بلکہ وہ اپنے مفوّضہ فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور اسی طرح

دھڑک رہے ہیں جس طرح ازل سے آج تک ہر انسان کے سینے میں دھڑکتے آئے ہیں۔ اگر وہ واقعتہً مرجاتے تو اجسام قبروں میں جاکر خاک بھی ہو چکے ہوتے۔

اس کے باوجود کسی اللہ کے بندے کو یہ تشویش اور حیرانی لاحق نہیں ہوتی کہ اقبال نے اچھے خاصے چلتے پھرتے کھاتے پیتے آدمیوں کے قلوب کو مُردہ کیسے کہدیا۔ سب کو معلوم ہے کہ دل کا مردہ ہونا کنایہ ہے اوصافِ عالیہ کی محرومی اور مقاصدِ رذیلہ کے اتباع سے۔

اسی طرح آپ کو بھی سمجھ لینا چاہئیے تھا کہ لدینام قلبی میں نوم سے مراد وہ نیند نہیں ہے جسے اُردو میں "سونا" کہتے ہیں، بلکہ قلب کا جاگنا اور سونا ایسی ہی اصطلاح ہے جیسی دل کا زندہ یا مردہ ہونا۔ حضورؐ کا منشا یہ بتانا تھا کہ اللہ کے فضل سے میرا قلب کسی وقت بھی تعلق مع اللہ سے خالی اور نفسانی وساوس سے مغلوب نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ جب میں بظاہر سویا ہوا ہوتا ہوں اس وقت بھی قلب پر غفلت اور ذکرِ الٰہی سے بے تعلقی مستولی نہیں ہوتی۔ یہ مطلب اگر نہ لیا جائے تو ارشادِ رسولؐ کی کوئی اور توجیہہ ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ جہاں تک طبعی نیند کا تعلق ہے وہ تو کسی بھی انسان کے قلب پر طاری نہیں ہوتی۔ ہر شخص کا دل سوتے میں بھی اسی طرح اپنے وظیفے میں مشغول رہتا ہے جس طرح بیداری میں اور وہ ایسی مشین ہے کہ اگر پانچ منٹ کو بھی معروف معنوں میں "سو" جائے تو اسے "ہارٹ فیل" قرار دے کر کفن دفن کی تیاری شروع کرنی پڑتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ قلبی طور پر اس قدر قوی اور دائمُ قائم تعلق باللہ ہوتے ہوئے بھی حضورؐ کی نمازِ فجر قضا کیوں ہوگئی تو اس کی تنقیح سے پہلے مختصراً لیلۃ التعریس کا واقعہ بیان کردینا ضروری ہے تاکہ جملہ قارئین بات کو سمجھ سکیں۔

مسلم شریف کتاب المساجد میں ایک روایت آئی ہے کہ جہادِ خیبر سے واپسی میں رات کے وقت حضورؐ پر غنودگی کا اثر غالب ہوا تو آپ مع اصحاب ایک جگہ ٹھیر گئے اور بلالؓ کو یہ حکم دیکر کہ شب کی نگہبانی تم کرو۔ مع اصحاب سو گئے۔ بلالؓ اگرچہ تہجد کے وقت تک جاگتے رہے، لیکن تہجد پڑھ کر انھیں بھی نیند آگئی اور نمازِ فجر کے وقت کوئی بھی بیدار نہ ہو سکا۔ آنکھیں اس وقت کھلیں جب دھوپ اچھی خاصی چڑھ گئی تھی۔ حضورؐ نے بلالؓ سے پوچھا کہ تمھیں کیا ہوا تھا تم نے کیوں نہ ہم سب کو بیدار کیا۔ بلالؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ جس نے آپ پر نیند طاری کردی اسی نے مجھ پر بھی نیند طاری کردی۔ اب حضورؐ نے حکم دیا کہ سب اپنی سواریاں یہاں سے بڑھالے چلو۔ کچھ دور جاکر سب نے نمازِ فجر قضا وقت میں پڑھی۔

یہ تھا لیلۃ التعریس کا واقعہ۔

اب سلامتی فکر کے ساتھ دیکھا جائے تو اس واقعہ سے قلبِ رسول کی بیداری کے سلسلے میں تو کوئی اُلجھن کھڑی نہیں ہوتی ہاں اس بنیادی عقیدۂ ویقین کی توثیق ضرور ہو جاتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ اپنی تمامتر عظمت ورفعت کے باوجود "بشر" ہی تھے۔ بشر کتنا ہی بلند وبرتر ہو لیکن جو اُمورِ وحی کے دائرے سے باہر ہوں ان میں وہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں شکستِ عزم، فروگذاشت، سہو ونسیان اور ضعف ومعذوری کا موردِ ضرور بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ عقیدت کا غلو کیسے کیسے گل کھلاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ مریض بھی ہوتے تھے۔ کفار سے مغلوب بھی ہوجاتے تھے، لیکن اس کے باوجود نصرانیوں نے انھیں خدا بنا چھوڑا تو اللہ علیم وحکیم کی حکمتِ بالغہ نے ہر پیغمبر کے لئے یہاں تک کہ آخری سب سے بڑے پیغمبر کے لئے بھی متعدد ایسے واقعات وحوادث مقدر فرما دیئے جو ان کے پیروؤں کو افراط وغلو کی طرف جانے سے روکیں، جو قطعی طور پر اس بات کی شہادت دیں کہ پیغمبر کسی بھی حیثیت اور درجہ میں خدا نہیں ہے، بلکہ اللہ کا ایک بے اختیار بندہ ہے۔ بشر ہے۔ بشری کمزوریوں کا ہدف ہے اور جن سے خدائے وحدہٗ لاشریک کی یکتائی روشن ستارے کی طرح اذہان وقلوب کے افق پر چمکتی رہے۔ ہماری ناقص رائے میں تو بعض اور واقعات کی طرح

لیلۃ التعریس کے واقعے کی بھی تکوینی حکمت یہی تھی اور اس سے اسی طرح آپ کے قلب پاکیزہ کی دائمی بیداری پر کوئی اثر نہیں پڑتا جس طرح تابیر[1] نخلہ یا واقعہ تحریم[2] یا بیعتِ رضوان[3] سے آپ کی رسالتِ کبریٰ اور صداقت بے داغ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لیکن اگر کسی کا منطقی شعور صرف حکمت کے بیان پر مطمئن نہ ہو اور حدیث کی منطقی توجیہہ و تاویل پر ہی اصرار کرے تو لیجئے ہم بعونہٖ تعالیٰ وہ بھی پیش کئے دیتے ہیں۔

سامنے کی بات ہے کہ انسان کے جسم میں مختلف اعضا ہیں جو مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ ہی کو لیجئے۔ جگر کا کام صالح خون تیار کرنا ہے۔ پھیپھڑے سانس کی آمد و شد میں تناسب و توازن قائم رکھتے ہیں۔ آنکھیں دیکھتی ہیں۔ دماغ سوچتا ہے۔ معدہ ہضم کرتا ہے۔ اب اگر آپ دیکھیں کہ زید کے پیٹ میں اچانک درد ہو گیا ہے تو یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ اس درد نے اس کے دماغ یا آنکھوں یا پھیپھڑوں کا ضعیف و مریض ہونا ثابت کر دیا ہے۔ بلکہ رائے زنی جو کچھ ہو گی معدے کے متعلق ہو گی۔ اسی طرح سینے کا درد آنکھوں اور کانوں کے بارے میں رائے زنی کا موقع نہیں فراہم کرے گا۔

حدیث مذکور میں نوم کا لفظ آنکھوں اور قلب دونوں کے لئے آیا ہے۔ آنکھوں کی حد تک اس نوم سے مراد وہی نیند ہے جو طبعی طور پر ہر شب آدمی کو لاحق ہوتی ہے، لیکن قلب کی حد تک اس سے مراد یہ نیند نہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ ہر شب لاحق ہونے والی نیند دل کا فعل ہے یا دماغ کا۔ آدمی پر موت جیسی بے خبری اور بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو ظہور دینے والا دل ہے یا دماغ۔ تو تجربہ اور اب تک کے علمی و تحقیقی انکشافات گواہ ہیں کہ نیند کا تعلق دماغ سے ہے نہ کہ دل سے۔ دماغ ہی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جسمانی مشینری کے بعض کل پرزوں کو آرام کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور جس آدمی کو نیند نہ آنے کا مرض ہو جائے معالجین اس کے دماغ ہی کا علاج کرتے ہیں نہ کہ دل یا پھیپھڑوں کا۔

دل کو جو ڈیوٹی اللہ نے سپرد کی ہے وہ تو ہمہ وقتی ہے۔ اسکی ساخت ہی میں یہ بات رکھی گئی کہ زندگی بھر بغیر سستائے یکساں، بے تکان پمپنگ کئے جائے۔ دماغ کو البتہ سستانے کی ضرورت ہے اور دماغ ہی کو اُن تمام اعضاء کا سربراہ بنایا گیا ہے جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ستائے بغیر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے اہل نہیں ہیں۔

اس صورتِ حال کی روشنی میں یہ بات عجیب ہی ہوگی کہ اللہ کے رسولؐ اگر کسی دن نماز فجر کے وقت سوتے رہ گئے ہیں تو کسی کے دل میں اُس قول کی بابت اشکال و اشتباہ پیدا ہو جو آپ نے اپنے قلب کے بارے میں ارشاد فرمایا نہ کہ دماغ کے۔ سینے کا درد اگر آنکھ اور کان کے بارے میں رائے زنی کا موقع فراہم نہیں کرتا تو وہ جاگنا اور سونا جس کا تمام تر تعلق دماغ سے ہے دل کے بارے میں رائے زنی اور اشکال کا موقعہ کہاں مہیا کر سکتا ہے؟ دل کے متعلق تو اس قت گفتگو ہو سکتی جب کوئی ایسا فعل صادر ہوتا جس کے صدور کی ذمہ داری دل پر ہو۔ مثلاً ہم دیکھتے کہ نعوذ باللہ من ذٰلک اللہ کے رسولؐ سے کوئی ایسا فعل یا قول صادر ہو گیا ہے جو عدل و دیانت، حسنِ اخلاق اور مجاہدانہ تب و تاب کے خلاف ہے تب بیشک یہ اشکال پیدا ہو سکتا تھا کہ دلِ بیدار

---

[1] نر اور مادہ کھجوروں کی قلم کاری کے بارے میں حضورؐ نے ایک بار ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ مگر جب آپ کی پسند کے مطابق عمل کیا گیا تو فصل خراب رہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ میں بھی ایک بشر ہوں۔ اپنے دنیاوی معاملات کے نشیب و فراز تم خود بہتر سمجھ سکتے ہو۔ ہاں دین کے باب میں جو ہدایت میں تمہیں دوں وہ بے شک تم پر واجب القبول ہے ۱۲

[2] ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک گھریلو قضیے کے تاثر میں قسم کھالی تھی کہ کبھی شہد نہیں چکھوں گا۔ اس پر قرآن میں اللہ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور قسم توڑ دینے کا حکم دیا ۱۲

[3] حضرت عثمان شہید نہیں کئے گئے تھے مگر صحابہؓ اور خود رسول اللہؐ نے یہ گمان کر لیا تھا کہ وہ مار ڈالے گئے اور اسی بنیاد پر حضورؐ نے صحابہؓ سے جہاد کی بیعت لی تھی۔ بعد میں کھلا کہ یہ گمان خلاف واقعہ تھا ۱۲

کی موجودگی میں یہ صدور کیسے ہوگیا۔ کیونکہ دل بیدار کی
اصطلاح سیرت وکردار کے اُنھی فضائل کا اشارہ یہ
ہوتی ہے۔ لیکن نماز فجر کے وقت سوتے رہ جانے
میں دل کا کوئی ارادہ شامل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ
ارادے کی جوہری تشکیل دماغ کی شرکت کے بغیر نہیں
ہوسکتی۔ جب دماغ مصروفِ خواب ہے، یا کم سے کم وہ
اعضاء مصروفِ خواب ہیں جو دماغ کی کارکردگی میں
معاون ہوتے ہیں تو دل پر اس کی ذمہ داری کیسے
عائد ہوسکتی ہے کہ سونے والا ٹھیک وقت پر نہیں اٹھا
اس نکتہ کو ذہن نشین کر لیا جائے تو کسی طرح کا
اشکال قلبِ رسول ﷺ میں باقی نہیں رہتا۔

دوسری توجیہہ یہ ہے کہ غالب پر حکم کُل کا لگتا ہے
ایک شخص کو ہم کہتے ہیں کہ اس کی صحت بہترین ہے تو اس کا
یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سال دو سال میں اسے کبھی معمولی سا
بخار بھی نہ آتا ہو۔ زید کو سالوں میں کبھی ہلکا سا نزلہ اور
کھانسی ہو جائے تو اس کی بنیاد پر اس شخص کو نہیں جھٹلایا
جائے گا جس نے یہ کہا ہو کہ زید کا سینہ مضبوط اور پھیپھڑے
قوی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح کی بات لیلۃ التعریس کی ہے اگر
یہ نہ بھی مانا جائے کہ سونے جاگنے کی ذمہ داری سے
قلب بالکل بری الذمہ ہے تب بھی زندگی بھر میں ایک
دو معمولی سے واقعات قلبِ رسول کی بیداری میں
قادح نہیں ہوسکتے۔ بیسیوں سال پر پھیلی ہوئی زندگی
کی بے شمار ساعتوں میں اگر رسول اللہ کے اسوۂ وکردار
سے "قلبِ بیدار" کا اثبات ہوتا رہا ہے تو دو ایک مرتبہ
کی اضطراری غفلت، اتفاقی فروگذاشت اور بالکل
معمولی سہو ونسیان سے اس اثبات پر اسی طرح حرف
نہیں آتا جس طرح کبھی کبھار کے بخار یا کھانسی سے کسی شخص
کے صحت مند اور توانا ہونے پر حرف نہیں آتا۔ گاہے
گاہے مریض ہونا تو بشریت کا خاصہ ہے۔ یہ بھی بشریت ہی
کا خاصہ ہے کہ انبیاء سے کبھی کبھار بھول چوک اور نسیان و
غفلت کا ظہور ہو جائے۔ ہر طرح کی خامی اور خطا سے پاک
تو اللہ واجب الوجود ہی کی ذاتِ گرامی ہے اور اسی نے
انبیاء کے دیئے ہوئے دینی احکام و ہدایات ریب و خطا
سے پاک ہوتے ہیں کہ وہ بواسطۂ وحی من جانب اللہ
ہوتے ہیں۔ نبی معصوم بھی اسی لئے ہے کہ اس کی نگرانی
اللہ کرتا ہے۔ اسے یہ مجال ہی نہیں کہ جس دعوتِ دین کے
لئے اسے مبعوث کیا گیا ہے اس میں وحی کی روشنی کے بغیر
اپنی طرف سے کمی یا اضافہ کرے۔

تیسری توجیہہ یہ ہے کہ جس طرح سورج پر بادل آ
جاتے ہیں تو دھوپ غائب ہو جاتی ہے اور زیادہ
گھرے بادل ہوں تو خاصا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ
پھر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خود سورج کی روشنی میں کچھ کمی
واقع ہو گئی ہے۔ سورج تو جوں کا توں روشن رہتا ہے،
لیکن بادلوں کا حائل شدہ پردہ دنیا تک پوری روشنی پہنچنے
میں حائل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح قلبِ رسول ﷺ تو بیدار ہی تھا مشیتِ ایزدی
سے نیند کے بادل ایسے امنڈے کہ بیداری قلب کی چاندنی
کا پھیلاؤ رُک گیا اور حضور ﷺ نمازِ فجر کے وقت نہ جاگ سکے۔
وقت پر جاگ جانا اسی طرح بیداریِ قلب کا ثبوت ہوتا
جس طرح دھوپ کا پھیل جانا سورج کے بے انتہا روشن اور
گرم ہونے کا ثبوت ہوتا ہے، لیکن نیند کے غیر معمولی غلبے
سے یہ ثبوت سامنے نہ آسکا تو قلب کا وصف بیداری
بہرحال اسی طرح اپنی جگہ موجود رہا جس طرح گھٹاؤں کے
پھیلاؤ اور موسم کی تبدیلیوں کے باوجود خود سورج میں اس کی
اعلیٰ درجے کی تابش اور حرارت جوں کی توں موجود رہتی ہے
ایک اور مثال پر نظر کیجئے۔ چمکتے ہوئے ہیرے پر
اگر ہوا کا کوئی جھونکا گرد کی اتنی تہہ پھیلا دے کہ اس کی
چمک دمک نظروں سے اوجھل ہو جائے تو کیا اس کا مطلب
یہ ہوگا کہ واقعتہً چمک دمک اور قدر و قیمت میں کچھ

فرق آگیا؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہوگا۔ تو ایسا ہی معاملہ رسول اللہ صلعم کے قلب بیدار کا ہے کہ اس کا "بیدار و زندہ" ہونا تو اس درجہ مسلّم ہے جس طرح سورج کا روشن اور آگ کا گرم ہونا۔ حکمتِ خداوندی نے اگر کسی وقت یہ مناسب سمجھا کہ اس بیداری و زندگی پر ایک ہلکا سا پردہ ڈال دیا جائے تو اس سے قلبِ رسول صلعم کے مسلّمہ اوصاف میں اسیطرح کوئی فرق واقع نہیں ہوا جس طرح گرد کی عارضی تہہ ہیرے کے اوصاف میں فرق نہیں ڈالتی۔

رہا سوال کا آخری حصّہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ طبعی اعتبار سے انبیاء کے اجسام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہمارے اور آپ کے۔ وہ ہماری ہی طرح آنکھوں سے دیکھتے کانوں سے سُنتے اور پیروں سے چلتے ہیں۔ ان کے جسم میں اللہ تعالیٰ کوئی مخصوص عضو ایسا نہیں لگاتا جو دوسرے انسانوں کے اعضاء سے زائد ہو۔ وہ جب سوتے تھے تو ہماری طرح ان کے بھی بعض اعضاء بے حرکت ہو جاتے تھے اور بےخبری کی وہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جسے اللہ کے رسول صلعم نے "موت" سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن یہ بھی مشاہدہ و تجربہ ہے کہ کُل پُرزوں کی یکسانی کے باوجود وہ صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں جو اللہ نے ان میں ودیعت فرمائی ہیں۔ سر سب کے یکساں ہیں مگر فکری صلاحیتیں کسی میں کم کسی میں زیادہ ہیں۔ اعضائے رئیسہ سب کے ایک جیسے ہیں لیکن ان کے مجموعی عمل سے مزاج اور طبیعتیں نوع بہ نوع بنتی ہیں آب و ہوا، خارجی محرکات اور افعال و اشغال کسی استعداد کو دباتے اور کسی کو اُبھارتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ دیکھتے ہیں خاص قسم کی مشق و ریاضت مسمریزم اور ہپناٹزم جیسی حیرت ناک چیزوں کو ظہور میں لاتی ہے۔ بزرگوں کی کرامات سے انکار ممکن نہیں۔ سادھو اور جوگی بھی ریاضت و مشقت کے ذریعے مافوق العادت امور پر قادر ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّمات میں سے ہے کہ حواس خمسہ اور اعضائے رئیسہ کے علاوہ بھی انسانی جسم میں گوناگوں صلاحیتیں موجود ہیں جو نشوونما پاکر وہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کام انجام دے سکتی ہیں جو حواس خمسہ دیتے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں میں یہ نشوونما جائز ذرائع سے ہو اور بعض میں ناجائز ذرائع سے۔ جادو، سفلی عملیات اور وہ ریاضت و عبادت جس کا مقصود عبادت نہ ہو، بلکہ غیر معمولی قوتوں کی تحصیل ہو ناجائز ذرائع ہیں اور وہ پاکیزہ عملیات، وظائف اور ریاضت و عبادت جس کا مقصود ثواب آخرت ہو جائز ذرائع نہیں۔

انبیاء علیہم السلام پر تو خیر وحی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ موقعہ بہ موقعہ ان پر اُمورِ غیب منکشف فرماتا تھا صحابۂ کرام سے بھی وقتاً فوقتاً کرامتیں ظہور میں آتی رہی ہیں اور بعد کے بزرگ بھی اس نعمت سے تہی دامن نہیں رہے ہیں۔ تو یہ سوال اُٹھانا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دیکھنے کے لئے آنکھوں کے علاوہ بھی کوئی آلہ تھا بیکار سی بات ہے۔ محسوس و مرئی آلات ہی سب کچھ نہیں ہوتے، بلکہ نظر نہ آنے والی مخفی صلاحیتیں بھی نمو پاکر بہت کچھ کرتی ہیں۔ عبادات و مجاہدات نے اس طرح کی صلاحیتوں کو حضور صلعم کے اندر جس قدر بھی نشوونما دیا ہو کم ہے۔ کیونکہ بحیثیت نبی یہ صلاحیتیں بھی اللہ نے آپ کے اندر مقابلتہً زیادہ ہی رکھی ہوں گی۔ علاوہ ازیں آپ کے لئے تو وحی کا دروازہ ہر وقت کھلا تھا۔ اللہ جب چاہتا آپ پر کوئی امرِ غیب منکشف فرما دیتا۔ وحی کے متعدد طرق ہیں۔ ضروری نہیں کہ فرشتہ ہی آئے۔ القا اور الہام تو آج بھی معروف ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے القا اور الہام میں غلطی کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ وحی کی نوع کے تھے اور ان کے خواب بھی خاص پیغامات کے حامل ہوا کرتے تھے۔

بہ یک وقت خواب اور بیداری کا اشکال حقیقت ہے۔ طبعی اعتبار سے تو انبیاء کی نیند اور بیداری میں بھی ایسا ہی فرق ہوتا تھا جیسا دیگر انسانوں میں ہوتا ہے۔ ہاں ایک بات رہ گئی۔ حدیث مذکورہ میں آپ کے

دیکھا کہ اللہ کے رسول ؐ نے سواریاں آگے بڑھالے جانے کا حکم دیا تھا اور نماز آگے ہی جاکر پڑھی تھی۔ اس کی وجہ ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس مقام پر آپ سوئے تھے وہاں شیطانی اثرات کا غلبہ تھا۔ آجکل کے نئے ذہن تو اس توجیہہ کو ہضم نہ کرسکیں گے۔ انھیں جدید مفسرین نے ملائکہ تک کا مفہوم دل سے گھڑکے بتایا ہے تو یہ بات ان کے دل میں کیسے اُترے گی کہ جادو ٹوٹکا، شیطانی اثرات حقائق ہیں، لیکن ہم کیا کریں کہ واقعات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بعید نہیں کہ حضورؐ اور ان کے اصحاب پر نیند کا غیر معمولی غلبہ شیطانی اثرات ہی کا شاخسانہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتفاقاً ہی نیندیں گہری ہوتی چلی گئی ہوں۔ دونوں صورتوں میں یہ بہرحال طے ہے کہ مشیتِ ایزدی ہی نے اسے مقدر فرمایا تھا اور حکمت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ کی بشریت کا اثبات کرنے والے احوال کی فہرست میں ایک اور حالت کا اضافہ ہوجائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عالمِ بالا کی باتیں

سوال ۲:۔ (ایضاً)

تیسرا سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب معراج پر تشریف لے گئے تھے تو بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ؐ نے ان حضرات انبیاء کرام ؑ سے ملاقات کی ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ، حضرت نوح ؑ، حضرت ادریس ؑ، حضرت موسیٰ ؑ، حضرت عیسیٰ ؑ وغیرہ اور رسول اللہ سے ان انبیاء کی گفتگو بھی ہوئی ہے۔ خاصکر حضرت موسیٰ ؑ سے تو مرارًا نماز کے بارے میں مشورے دیئے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کی کیا تخصیص ہے جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی زندہ آسمانوں میں سکونت پذیر ہیں؟ حالانکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ ہی آسمانوں میں ہیں اور کیا آسمانوں میں یہ انبیاء علیہم السلام اب بھی زندہ تشریف فرما ہیں؟ اگر یہ انبیاء بھی اسی طرح زندہ اُٹھائے گئے ہیں تو قرآن کریم نے ان کے اُٹھائے جانے کا ذکر کیوں چھوڑا؟ اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کی وفات جنگل دیہہ میں ہوئی۔ تو کیا وفات کے بعد زندہ کردیئے گئے اور آسمانوں میں بلائے گئے۔

میں نے اپنے استاد سے پوچھا تھا، لیکن اُنکی طرف سے بھی گول مول جواب ملا۔ براہِ کرم تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

جواب ۲:۔

سب سے پہلے اس اساسی نکتہ کو ذہن میں اچھی طرح جاگزیں کرلیجئے کہ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں محکمات کے ساتھ متشابہات بھی ہیں۔ ان کا ہونا اتفاقی نہیں، بلکہ قدرت کی طرف سے ارادۃً ان کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان بالغیب کی گہرائی ناپی جاسکے اور دیکھا جاسکے کہ کون خالصۃً اپنے علم وفہم کا تابع ہے اور کون اپنے علم وفہم کو اللہ اور رسول ؐ کے تابع بناکر ان کے ہر ارشاد ہر پیغام اور ہر ابلاغ واخبار پر آمنا وصدقنا پکار اُٹھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اللہ جل شانہٗ نے خود ہی آیات متشابہ نازل فرمائیں اور خود ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ متشابہات کے پیچھے پڑنے والے وہی ہوں گے جن کے دلوں میں کجی ہے۔ سلیم القلب مومنین تو محکمات سے جی لگاتے ہیں اور متشابہات کے مفہوم ومراد کو اللہ کے سپرد کرکے تہہِ دل سے اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے رب کیطرف سے نازل ہوا ہم اس سب پر ایمان لائے۔ اللہ نے اپنے ید، ساق، وجہ اور ضحک وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کی صحیح مراد کیا ہے۔ یہ فی الحقیقت استعارہ ہی استعارہ ہیں یا فی الواقع بھی اللہ کے ید وساق اور وجہ وضحک ممکن ہیں۔ پھر ممکن ہیں تو وہ کس طرح کے ہوں گے اور کیونکر تجسم کے اشتباہ سے بچا جاسکے گا۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں تو صرف اُن مومنین کے زمرے میں داخل ہونا ہے جن کا ذکر اللہ نے بایں طور فرمایا

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ	ایمان لایا رسول اور ایمان لائے مومنین ہر اُس آیت پر جسے اللہ نے رسول پر نازل فرمایا۔

+ + + +

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی جو اطلاع 'بشارت' اور خبر اللہ کے رسولؐ نے اپنے الفاظ میں دی ہے وہ اسی طرح واجب التصدیق اور حق ہے جس طرح قرآن کی آیت۔ ہم صرف یہ ماننے میں تو ہزار بحثیں کریں گے کہ جن ارشادات کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جارہا ہے ان کی نسبت آپؐ کی طرف قابلِ اعتماد بھی ہے یا نہیں۔ لیکن جب بحث و تحقیق کے نتیجہ میں یہ بات ثابت ہوجائے کہ نسبت درست ہے تو پھر چون وچرا اور این وآں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہم پکار اُٹھیں گے کہ آمنا وصدقنا۔ یہی تو وہ جذبہ ہے جس کے نقطۂ کمال کا نام ابوبکر صدیق ہے اور جس کے منتہائے زوال کو آپ ازراہِ اختصار "پرویز" کہہ سکتے ہیں۔ یاد کیجئے ایک زمانہ تھا جب انسان ایتھر اور ریڈیائی لہروں کا تو کیا ہوائی جہاز کا بھی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علم میں تیز رفتاری کا طول وعرض اُونٹوں اور گھوڑوں سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اسی دَور میں کچھ لوگ ابوبکرؓ کے پاس آتے ہیں۔ ابوبکرؓ ابھی تک "صدیق" کے لقب سے مشرف نہیں ہوئے ہیں۔ آنے والے ازراہِ تمسخر کہتے ہیں:۔

"سُن رہے ہو تمہارے پیغمبر صاحب کیا فرماتے ہیں؟"

"کیا؟"

"یہ کہ وہ راتوں رات بیت المقدس کی سیر کر آئے۔ حالانکہ تمھیں معلوم ہے بیت المقدس آنے جانے کے لئے دو ماہ چاہئیں۔"

"سچ کہو کیا رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا؟"

"جی ہاں انھی کا ارشاد ہے۔"

"تو خدا کی قسم سچ فرمایا۔ کیسے ہو تم لوگ کہ رسولِ خدا کے ارشاد پر شک کرتے ہو۔"

یہ تھا وہ ایمان، وہ اعتماد، وہ وثوق، وہ سکینت جس نے ابوبکرؓ کو "صدیق" بنایا۔ جو نبوت کے بعد ایمان بالغیب کا آخری نقطۂ عروج ہے۔ اس کے بالمقابل آج کے زمانے پر نظر ڈالئے جبکہ سائنس نے قدرت کی عجیب وغریب قوتوں سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ فی سکنڈ ایک لاکھ اسّی ہزار میل رفتار کا ادراک کیا جاچکا ہے۔ ایک ذرۂ بے مقدار کی ہولناک قوت کا تجربہ ہوچکا ہے۔ مگر تعقل کے ماروں کو ملائکہ اور جن وشیاطین تک کی حقیقت میں شک ہے۔ جنت اور دوزخ کے وجود میں شبہ ہے۔ عذابِ قبر کو مذاق تصور کیا جارہا ہے۔ حد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو حرفِ آخر ماننے سے انکار ہے۔ یہ بے یقینی کفرِ مبین نہ ہو تو ایمان کا وہ آخری درجہ ضرور ہے جسے نقطۂ موہوم سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں۔

ہم اخبارِ غیب کے باب میں توجیہہ وتاویل اور بحث ونظر کو پسند نہیں کرتے۔ منطق وہاں کیا کام دے گی جہاں عقل وحواس کا گذر ہی نہیں۔ قرآن نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ ہم تہہ دل سے ایمان لے آئے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ میں نے شبِ معراج میں فلاں فلاں انبیاءؑ سے ملاقات کی۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا صدقت یارسول اللہ۔ اب ہمیں اُن الجھنوں سے کوئی سروکار نہیں جو عقل ومنطق کے افق سے اُبھرتی ہیں۔ ہوگی اصل حقیقت جو کچھ ہوگی ہم صرف ظاہر مراد پر ایمان لائے ہیں اور مضمرات وعواقب کو متشابہات کے خانے میں رکھ کر دماغ سوزی سے دست بردار ہوگئے ہیں۔

یہ تو تھا ہمارا پسندیدہ جواب۔ لیکن آپ کو شاید ہی پسند آئے اس لئے تعقل کے رُخ سے بھی کچھ عرض کرتے ہیں۔

جو اللہ عدمِ مطلق سے پوری کائنات ظہور میں لا سکتا ہے اور ایک قطرۂ منی سے انسان جیسی شاہکار تخلیق کو جنم دے سکتا ہے اس کے لئے یہ بھی کچھ مشکل نہیں کہ اپنے کسی بندے کو زندہ آسمان پر بلالے۔ لوگ سمجھیں ہم نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو سولی دیدی مگر حقیقت یہ ہو کہ عیسےٰؑ تو

دیکھا کہ اللہ کے رسولؐ نے سواریاں آگے بڑھالے جانے کا حکم دیا تھا اور نماز آگے ہی جاکر پڑھی تھی۔ اس کی وجہ ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس مقام پر آپ سوئے تھے وہاں شیطانی اثرات کا غلبہ تھا۔ آجکل کے نئے ذہن تو اس توجیہہ کو ہضم نہ کرسکیں گے۔ انھیں جدید مفسرین نے ملائکہ تک کا مفہوم دل سے گھڑکے بتایا ہے تو یہ بات ان کے دل میں کیسے اُترے گی کہ جادو ٹوٹکا، شیطانی اثرات حقائق ہیں، لیکن ہم کیا کریں کہ واقعات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بعید نہیں کہ حضورؐ اور ان کے اصحاب پر نیند کا غیر معمولی غلبہ شیطانی اثرات ہی کا شاخسانہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتفاقاً ہی نیندیں گہری ہوتی چلی گئی ہوں۔ دونوں صورتوں میں یہ بہرحال طے ہے کہ مشیتِ ایزدی ہی نے اسے مقدور فرمایا تھا اور حکمت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہؐ کی بشریت کا اثبات کرنے والے احوال کی فہرست میں ایک اور حالت کا اضافہ ہوجائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عالم بالا کی باتیں

سوال ۳:۔ (ایضاً)

تیسرا سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب معراج پر تشریف لے گئے تھے تو بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ان حضرات انبیاء کرامؑ سے ملاقات کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ وغیرہ اور رسول اللہؐ سے ان انبیاء کی گفتگو بھی ہوئی ہے۔ خاصکر حضرت موسیٰؑ سے تو مراراً نماز کے بارے میں مشورے دیئے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کی کیا تخصیص ہے جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی زندہ آسمانوں میں سکونت پذیر ہیں؟ حالانکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہی آسمانوں میں ہیں اور کیا آسمانوں میں یہ انبیاء علیہم السلام اب بھی زندہ تشریف فرما ہیں؟ اگر یہ انبیاء بھی اسی طرح زندہ اٹھائے گئے ہیں تو قرآن کریم نے ان کے اُٹھائے جانے کا ذکر کیوں چھوڑا؟ اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات جنگل دیہہ میں ہوئی۔ تو کیا وفات کے بعد زندہ کردیئے گئے اور آسمانوں میں بلائے گئے۔

میں نے اپنے استاد سے پوچھا تھا، لیکن اُنکی طرف سے بھی گول مول جواب ملا۔ براہِ کرم تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:۔

سب سے پہلے اس اساسی نکتہ کو ذہن میں اچھی طرح جاگزیں کرلیجئے کہ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں محکمات کے ساتھ متشابہات بھی ہیں۔ ان کا ہونا اتفاقی نہیں بلکہ قدرت کی طرف سے ارادۃً ان کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان بالغیب کی گہرائی ناپی جاسکے اور دیکھا جاسکے کہ کون خالصۃً اپنے علم وفہم کا تابع ہے اور کون اپنے علم وفہم کو اللہ اور رسولؐ کے تابع بناکر ان کے ہر ارشاد، ہر پیغام اور ہر ابلاغ واخبار پر آمنا وصدقنا پکار اُٹھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اللہ جل شانہٗ نے خود ہی آیات متشابہات نازل فرمائیں اور خود ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ متشابہات کے پیچھے پڑنے والے وہی ہوں گے جن کے دلوں میں کجی ہے۔ سلیم القلب مومنین تو محکمات سے جی لگاتے ہیں اور متشابہات کے مفہوم ومراد کو اللہ کے سپرد کرکے تہہ دل سے اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے رب کیطرف سے نازل ہوا ہم اس سب پر ایمان لائے۔ اللہ نے اپنے ید، ساق، وجہ اور ضحک وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کی صحیح مراد کیا ہے۔ یہ فی الحقیقت استعارہ ہی ہیں یا فی الواقع بھی اللہ کے ید وساق اور وجہ وضحک ممکن ہیں۔ پھر ممکن ہیں تو وہ کس طرح کے ہوں گے اور کیونکر تجسم کے اشتباہ سے بچا جاسکے گا۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں تو صرف اُن مومنین کے زمرے میں داخل ہونا ہے جن کا ذکر اللہ نے بایں طور فرمایا

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ | ایمان لایا رسول اور ایمان لائے مومنین ہر اُس آیت پر جسے اللہ نے رسول پر نازل فرمایا۔

+ + + +

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی جو اطلاع، بشارت اور خبر اللہ کے رسولؐ نے اپنے الفاظ میں دی ہے وہ اسی طرح واجب التصدیق اور حق ہے جس طرح قرآن کی آیت۔ ہم صرف یہ ملنے میں تو ہزار بحثیں کریں گے کہ جن ارشادات کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جارہا ہے ان کی نسبت آپؐ کی طرف قابلِ اعتماد بھی ہے یا نہیں۔ لیکن جب بحث و تحقیق کے نتیجہ میں یہ بات ثابت ہوجائے کہ نسبت درست ہے تو پھر چون وچرا اور این وآں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہم پکار اُٹھیں گے کہ آمنا وصدقنا۔ یہی تو وہ جذبہ ہے جس کے نقطۂ کمال کا نام ابوبکر صدیق ہے اور جس کے منتہائے زوال کو آپ ازراہِ اختصار "پرویز" کہہ سکتے ہیں۔ یاد کیجئے ایک زمانہ تھا جب انسان ایتھر اور ریڈیائی لہروں کا تو کیا ہوائی جہاز کا بھی تصور نہیں کرسکا تھا۔ اس کے علم میں تیز رفتاری کا طول و عرض اُونٹوں اور گھوڑوں سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اسی دَور میں کچھ لوگ ابوبکرؓ کے پاس آتے ہیں۔ ابوبکرؓ ابھی تک "صدیق" کے لقب سے مشرف نہیں ہوئے ہیں۔ آنے والے ازراہِ تمسخر کہتے ہیں:۔

"سُن رہے ہو تمہارے پیغمبر صاحب کیا فرماتے ہیں؟"

"کیا؟"

"یہ کہ وہ راتوں رات بیت المقدس کی سیر کر آئے۔ حالانکہ تمھیں معلوم ہے بیت المقدس آنے جانے کے لئے دو ماہ چاہئیں۔"

"سچ کہو کیا رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا؟"

"جی ہاں انھی کا ارشاد ہے۔"

"تو خدا کی قسم سچ فرمایا۔ کیسے ہو تم لوگ کہ رسولِ خدا کے ارشاد پر شک کرتے ہو۔"

یہ تھا وہ ایمان، وہ اعتماد، وہ وثوق، وہ سکینت جس نے ابوبکرؓ کو "صدیق" بنایا۔ جو نبوت کے بعد ایمان بالغیب کا آخری نقطۂ عروج ہے۔ اس کے بالمقابل آج کے زمانے پر نظر ڈالئے جبکہ سائنس نے قدرت کی عجیب و غریب قوتوں سے پردہ اُٹھادیا ہے۔ فی سکنڈ ایک لاکھ اسّی ہزار میل رفتار کا ادراک کیا جاچکا ہے۔ ایک ذرّۂ بے مقدار کی ہولناک قوت کا تجربہ ہوچکا ہے۔ مگر تعقل کے ماروں کو ملائکہ اور جن و شیاطین تک کی حقیقت میں شک ہے۔ جنت اور دوزخ کے وجود میں شبہ ہے۔ عذابِ قبر کو مذاق تصور کیا جارہا ہے۔ حد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو حرفِ آخر ماننے سے انکار ہے۔ یہ بے یقینی کفرِ مبین نہ ہو تو ایمان کا وہ آخری درجہ ضرور ہے جسے نقطۂ موہوم سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں۔

ہم اخبارِ غیب کے باب میں توجیہہ و تاویل اور بحث و نظر کو پسند نہیں کرتے۔ منطق وہاں کیا کام دے گی جہاں عقل و حواس کا گذر ہی نہیں۔ قرآن نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اُٹھالیا گیا۔ ہم تہہِ دل سے ایمان لے آئے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ میں نے شبِ معراج میں فلاں فلاں انبیاء سے ملاقات کی۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا صدقت یا رسول اللہؐ اب ہمیں اُن الجھنوں سے کوئی سروکار نہیں جو عقل و منطق کے اُفق سے اُبھرتی ہیں۔ ہوگی اصل حقیقت جو کچھ ہوگی ہم صرف ظاہر مراد پر ایمان لائے ہیں اور مضمرات و عواقب کو متشابہات کے خانے میں رکھ کر دماغ سوزی سے دست بردار ہوگئے ہیں۔

یہ تو تھا ہمارا پسندیدہ جواب۔ لیکن آپ کو یہ شاید ہی پسند آئے اس لئے تعقل کے رُخ سے بھی کچھ عرض کرتے ہیں۔

جو اللہ عدمِ مطلق سے پوری کائنات ظہور میں لا سکتا ہے اور ایک قطرۂ منی سے انسان جیسی شاہکار تخلیق کو جنم دے سکتا ہے اس کے لئے یہ بھی کچھ مشکل نہیں کہ اپنے کسی بندے کو زندہ آسمان پر بلالے۔ لوگ سمجھیں ہم نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو سولی دیدی مگر حقیقت یہ ہو کہ عیسیٰؑ تو

جوں کے توں آسمان پر اُٹھا لئے گئے ہیں اور ان کی جگہ کوئی اور ایسا شخص سولی پا گیا ہو جو صورت اور جسم میں ان کے مشابہ ہو۔ آخر کیا آج بھی آپ نہیں دیکھتے کہ ہم شکل عنقا نہیں ہیں۔

پھر یہ بھی اللہ کے لئے مشکل نہیں کہ جن انبیاء کو دنیا والوں نے قتل کر دیا ہو یا وہ اپنی طبعی موت مر گئے ہوں ان کی روحوں کے لئے بالکل ویسا ہی دوسرا جسم عالمِ بالا میں تخلیق فرما دیں اور یہ روحیں ان میں جا بسیں تو کچھ بھی فرق ان کے دنیاوی وجود اور عالم بالا کے وجود میں نہ رہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ موت جسموں پر آتی ہے روحوں پر نہیں۔ جب دنیا والے جسم جیسا دوسرا جسم عالم بالا میں تخلیق کر دیا گیا اور روح اس میں جا بسی تو گویا جو نبی دنیا میں موت سے ہمکنار ہو چکا تھا وہی عالم بالا میں زندہ سلامت مع جسم کے موجود ہے۔

اس توجیہ سے یہ مفروضہ ختم ہو گیا کہ عالم میں اسی انسان سے ملاقات ہو سکتی ہے جو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہو۔ مفروضہ ختم ہوا تو آپ کے اشکال کا بھی حل نکل آیا کہ مانا سب انبیاء زندہ آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے اور جن انبیاء سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں ملاقات فرمائی ان میں سے بعض کی دنیاوی موت مضبوط روایات سے ثابت ہے، لیکن دنیا جیسا نیا جسم عطا فرما کر ارواحِ انبیاء کو ان میں منتقل کر دیا گیا ہو تو شبِ معراج میں ان سے ملاقات کیا استحالہ رکھتی ہے؟

(آپ نے بیک وقت پانچ سوالات کر دیئے ہیں لہذا بقیہ دو کے لئے انشاء اللہ آئندہ گنجائش نکالی جائے گی)

مسجدیں، کلینڈر اور کتبات

سوال:- از محمد یٰسین - سنڈر -

ادھر ایک واقعہ ہوا - میرے یہاں کی مسجد میں جماعت اسلامی کا کلینڈر ایک طرف آویزاں تھا اور دوسری طرف اسی سائز کا دوسرا پوسٹر جس میں چار احادیث نبوی مع ترجمہ درج تھیں - دونوں کے سرے پر گنبدِ خضرا کا فوٹو ایک خاص انداز میں چھپا تھا - میرے دوستوں میں سے ایک شخص آئے اور انھوں نے مسجد سے دونوں پوسٹروں کو ہٹا دینے پر اصرار کیا - وجہ پوچھنے پر ایک بات تو سمجھ میں آئی کہ مسجد میں کوئی شخص تاریخ دیکھنے نہیں آتا - اس لئے کلینڈر چاہے جماعت اسلامی کا ہو یا کسی اور کا ہٹا دینا ہی چاہئے تھا، لیکن دوسرا پوسٹر جس میں نیچے احادیث نبوی اور اوپر گنبدِ خضرا کا فوٹو ہے اسے بھی مسجد سے نکال دینے پر مصر تھے - بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تو کسی جاندار کا فوٹو نہیں ہے کہ مسجد میں یا اپنے گھر میں بھی شوق سے آویزاں کرنا باعث گناہ ہو - اس کے متعلق وجہ پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ جب خدا کے گھر کو ہم گنبد خضرا سے زینت دیتے ہیں تو بعض لوگ جو اپنے مکانات کو بزرگوں پیروں اور اولیاء اللہ کے مزارات کی تصویروں سے مزین کرتے ہیں، کیسے منع کیا جا سکتا ہے - اپنے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ جسے خدا کے بہت بڑے موحد بندے اور پیغمبرؑ نے بنایا تھا اور اسکی عبادت کے طریقے بھی اپنی اولاد اور وہاں کے بسنے والے کو بتلا گئے تھے پھر بت پرستی کا دروازہ کیسے کھلا اور ایک خدا کے گھر میں ۳۶۰ بتوں کی پوجا کیونکر ہونے لگی؟

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک زینت دینے کا سوال ہے ایک معمولی چیز کو اچھی چیز سے زینت دی جاتی ہے اور یہاں پر آکر میری زبان تھرتھرا رہی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہو کہ آگے بڑھیں تو خدا کے حبیبؐ کے گھر کی تضحیک کے مرتکب ہو جائیں - یقین ہے کہ آپ مفہوم سمجھ گئے ہونگے دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجدوں اور اپنے مکانات کو شوق سے اور احتراماً بھی ہم گنبد خضرا یا دوسرے بزرگان دین کے مزارات کے فوٹوؤں سے مزین کر سکتے ہیں یا نہیں اگر نہیں تو جماعت اسلامی ایسی بالغ نظر جماعت جس کے وہ بھی قائل ہیں اس میں ملوث کیوں ہے - اگر جائز ہے تو وہ کہتے ہیں کہ سلف صالحین جن کے دلوں میں اپنے رسولؐ کا احترام ہم سے ہزاروں گنا زیادہ تھا جب دارِ رسولؐ سے

بہت ڈور بود و باش اختیار کی تو انھوں نے احتراماً اپنے گھروں یا مسجدوں کو اس قسم کے فوٹوؤں سے زینت بخشی یا نہیں۔ ممکن ہے کوئی خیال کرے کہ اس وقت فوٹو گرافی کا رواج نہ تھا میں تو کہتا ہوں کہ اس سے لگے ہوئے زمانے کے عرب تصویر کشی ہی میں نہیں بلکہ بت گری میں یکتائے روزگار تھے اور یہ فن مردہ نہیں ہوا تھا۔

میرے دوست یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم سے محبت اور ان کے احترام کا طریقہ نہایت نادرست ہے کہ ان کے مزار کے فوٹو سے تو مسجد اور گھر کو مزین کریں اور عمل کے میدان میں ان کے ایک ایک ارشاد کو پیچھے ڈالتے جائیں۔ آپ کی رائے کی اشد ضرورت ہے اور بشارت سے انتظار رہے۔ امید ہے کہ تجلی میں ضرور شائع کریں گے

جواب :-

جہانتک ذوق ووجدان کا تعلق ہے خود راقم الحروف کو بھی یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ مسجد کے در و بام آراستہ و پیراستہ کئے جائیں یا ان پر پوسٹر اور کلینڈر وغیرہ لٹکائے جائیں۔ مسجدیں اسلامی سادگی و نفاست کا نمونہ ہونی چاہئیں اور ان کی اندرونی دیوار و منبر ایسی کوئی حسن کاری نہیں ہونی چاہئے جو نمازی کے خیالات کو اصل مرکز ---- توجہ الی اللہ ---- سے بھٹکائے اور کامل ذہنی یکسوئی میں حارج ہو، لیکن جہانتک عدل و دیانت کا تعلق ہے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ہمارا یا کسی بھی اُمتی کا ذوق و وجدان مسائل شرعیہ کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے' بلکہ ہمیں لازم ہے کہ خود کو درمیان سے ہٹا کر خالص شریعت کو جج بنائیں اور جن مسائل میں جتنا توسع شریعتِ حقہ نے رکھا ہے اتنا ہی توسع خندہ پیشانی سے تسلیم کریں، چاہے یہ ہمارے مزاج کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد ہم عرض کریں گے کہ آپ کے دوست کا طرزِ عمل درست نہیں ہے اور جو استدلال وہ اس کے جواز میں پیش فرما رہے ہیں وہ بھی مضبوط نہیں ہے۔ غور یہ کرنا چاہئے کہ کونسی چیز جائز ہے اور کونسی ناجائز۔ کس عقیدہ و عمل کا شریعت نے اذن دیا ہے اور کس سے روکا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم مسلمانوں ہی میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت میں اس درجہ غلو کرتے ہیں کہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر تک ماننے سے نہیں چوکتے اور حضورؐ کی بشریت کا اقرار و اعتراف بھی انھیں سخت گراں ہے۔ تو انصاف کیجئے کیا ہم غلامان محمدؐ کو اپنے پیارے رسولؐ کی جائز و مناسب ثناخوانی اور توصیف و نعت بھی اس اندیشے سے چھوڑ دینی چاہئے کہ غلو پسندوں کو شہ ملے گی اور وہ حضورؐ کو خدا بنا چھوڑیں گے۔

ہمیں حجرِ اسود کو چومنے کا اذن دیا گیا۔ کیا اس خوف سے ہم اسے چومنا چھوڑ دیں کہ یہ توہم پرستی کے لئے بنیاد جواز مہیا کرتا ہے۔ ہمیں طوافِ کعبہ کا حکم ملا۔ کعبہ بہر حال مٹی ہی کا ایک گھر ہے اور اس کا مالک اللہ وحدہٗ لاشریک آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ تو کیا اس خوف سے طوافِ کعبہ کو ترک کر دینا چاہئے کہ اس سے ہیکلِ محسوس کی عبادت اور قبروں کے طواف کا راستہ کھلتا ہے۔

گنبدِ خضرا کس نے کب بنایا۔ یہ ہمیں مستحضر نہیں، لیکن یہ توحید پرستی نہیں بلکہ گمراہی ہوگی کہ کوئی مسلمان گنبدِ خضرا کو اولیاء اللہ کی قبروں اور قبوں جیسا سمجھ لے ---- العظمۃ للہ۔ اللہ کے سچے نبی نے خود فرمایا کہ انبیاء کا جسم مٹی پر حرام ہے اور یہ بھی جملہ مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی نوع کی زندگی حاصل ہے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کہ یہ زندگی دنیاوی ہے یا برزخی۔ کیسی بھی ہو یہ بہر حال ربّ سے بالاتر ہے کہ حضورؐ کو ہمارا درود و سلام پہنچتا ہے اور نہ صرف آپؐ کا جسمِ مطہر قیامت تک صحیح و سالم رہے گا' بلکہ آپؐ کی روح پُرفتوح بھی دنیا سے اس طرح کا ترکِ تعلق نہیں کر چکی ہے جس طرح دوسرے انسانوں کی روحیں کر جاتی ہیں۔

اور یہ بھی نہ بھولئے کہ قبرِ نبوی پر حاضری بدعت نہیں
ایجادِ بندہ نہیں، بلکہ اس کی برکت و محمودیت متعدد روایات
سے ثابت ہے اور اسلافِ کرام میں جو حضرات توحید کے
معاملہ میں بہت شدید اور بدعت سے انتہائی گریزاں رہے
ہیں وہ بھی یہ جرأت نہیں کرسکے ہیں کہ دیارِ رسول میں جائیں
اور قبرِ رسول ؐ پر حاضر نہ ہوں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قبرِ رسول ؐ کا معاملہ اولیاء
اللہ کی قبور جیسا نہیں اور گنبدِ خضراء کو دیگر مقابر کے
گنبدوں پر قیاس کرنا ذہنی سلامتی سے بعید ہے۔ یہ گنبد
نہ بنا ہوتا تب بھی دیارِ رسول ؐ میں حاضر ہونیوالے کیلئے
قبر شریف کی حاضری اتنی ہی ضروری بھی جتنی آج ہے۔

اس کے برعکس مرشدین و مشائخ کی قبروں پر قبے اور
درگاہیں بنانا، ان پر میلے لگانا، ان سے طاعت و نیازمندی
کا سلوک کرنا، انھیں استغاثہ و استمداد کا مرکز قرار دینا ایسا
طریق کار ہے جس کے جواز کے لئے قرآن و سنت، تعاملِ صحابہؓ
اور اجتہاداتِ ائمہ میں کوئی بنیاد نہیں، بلکہ اس کی مخالفت و
قباحت پر بہت سی محکم دلیلیں ہیں۔ تو یہ کیسا انصاف ہوگا
کہ اُمورِ ممنوعہ پر سبقت کرنے والوں کے ڈر سے اُس گنبدِ
خضراء کی تقدیس بھی نظر انداز کردی جائے جس کے نیچے ہمارے
رسول ؐ بہ نفسِ نفیس استراحت فرما رہے ہیں اور زمین کی مجال
نہیں کہ ان کے گوشت پوست پر وہ مشقِ تصرف کرسکے جو وہ
دوسرے مرحوموں پر کرتی ہے۔

یہ درست ہے کہ رسول اللہ ؐ کی اصل محبت انکی اطاعت
کا نام ہے۔ فریب خوردہ ہے وہ شخص جو گنبدِ خضراء کی تصویریں
تو لٹکاتا ہے، درود تو پڑھتا ہے، نعت کے گیت تو گاتا ہے لیکن
عمل کے اسٹیج پر خلافِ شرع اعمال کا مرتکب ہے۔ ایسے شخص
کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظِ تحسین نہیں۔ لیکن یہ تو نہیں کہا
جاسکتا کہ جو شخص حرام سے نہ بچتا ہو وہ حضور ؐ کی نعت بھی چھوڑ
دے۔ گنبدِ خضراء کی تقدیس سے بھی دست بردار ہو جائے۔
درود بھی نہ پڑھے۔ حقا کہ عملی پیروی اصل ہے مگر حضور ؐ
کی قلبی محبت، تعظیم اور ادب بھی تو فرضِ عین سے کم نہیں

دعوت یہ دینی چاہیئے کہ گنبدِ خضراء سے پیار کرنے والو گنبدِ
خضراء کے مکین صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سے
بھی پیار کرو اور حضور ؐ کے احکام و سنن کی بھی پیروی کرکے
دکھلاؤ۔ یہ نہیں دینی چاہیئے کہ مکمل عملی پیروی نہیں کرتے تو
جذباتی لگاؤ اور تقدیس و تکریم سے بھی ہاتھ اٹھالو۔

احادیث اور گنبدِ خضراء پر مشتمل پوسٹر کو مسجد سے ہٹا
دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مسجد میں لٹکائے جانے والے
احادیث کے کتبوں سے نمازی عوام کو خاصا فائدہ پہنچتا ہے۔
عوام تو کیا خود عاجز کو بھی ـــ جسے آپ عوام میں داخل کرنے
پر مصر نہیں ہوں گے ـــ ان سے فائدہ پہنچا ہے۔ بعض ایسی
حدیثیں جنھیں کتابوں میں اگرچہ پہلے سے پڑھ رکھا تھا مگر جب
دیوارِ مسجد پر آویزاں نظر آئیں تو کئی ان میں سے حفظ کرلی گئیں
اور دل نے کہا کہ نالائق انھیں کیا اس لئے پڑھا تھا کہ طاقِ نسیان
میں رکھدو۔ یہ تو یاد کرنے اور سنت کے مطابق عمل کرنے کی
چیزیں ہیں۔ اگر خود ہم پر یہ گذری تو آخر دوسرے نمازیوں میں ایسے
متعدد حضرات کیوں نہ ہوں گے جنھوں نے انھی کتبوں سے یہ
سبق حاصل کیا ہو کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت کیا پڑھنا چاہیئے
اور خارج ہوتے وقت کیا۔ پہلے کونسا پیر رکھ کر مسجد میں داخل
ہوں اور واپسی میں کونسا قدم پہلے باہر نکالیں۔ وغیر ذلک۔

سلف صالحین نے اگر گنبدِ خضراء اور احادیث کے کتبات
گھروں اور مسجدوں میں نہیں لٹکائے تو اس سے آج کل ان کے
لٹکانے پر معارضہ قائم کرنا درست نہیں۔ یہ بات کہ سلف
صالحین نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا اُن امور میں دیکھنے کی ہوتی
ہے جو بطورِ عبادت اختیار کئے جائیں اور جن سے کسی خاص
عقیدے کا مظاہرہ ہوتا ہو۔ مثلاً مروجہ فاتحہ، نذر و نیاز،
قبروں پر قرآن خوانی، معین تاریخوں پر میلاد اور اس میں
قیام وغیرہ۔ یہ سب اُمور تعبدی حیثیت سے کئے جاتے ہیں
ان پر ثواب کی توقع کی جاتی ہے۔ ان میں ہم یقیناً دیکھیں گے
کہ جن سلف صالحین کے اقوال و اعمال ہمارے لئے شمع راہ
ہیں۔ انھوں نے ان کے بارے میں کیا روش اختیار کی ہے۔
لیکن مسجد میں لٹکے ہوئے گنبدِ خضراء کی تصویر تو عبادت کے

نقطۂ نظر سے نہیں لٹکائی گئی۔ لہٰذا ہمیں صرف اتنا دیکھنا ہوگا کہ یہ شریعت کی نظر میں بجائے خود حرام ہے یا مباح۔ اگر مباح ہے تو جس طرح ریل اور ہوائی جہاز میں سفر کرنا مباح ہے اسیطرح گنبدِ خضراء کی تصویر بنانا بھی اعتراض سے بالاتر ہوگا۔

اب رہا احادیث کے کتبات کا معاملہ تو حضور نے خود فرمایا کہ بلّغوا عنّی ولو آیۃ۔ اگر تمھیں میری ایک بھی حدیث یاد ہے تو اسی کو دوسروں تک پہنچا دو۔ سلف صالحین کو حدیثیں ازبر تھیں جنھیں ازبر نہیں تھیں وہ کتب احادیث کو زیرِ مطالعہ رکھتے تھے۔ معاشرے میں احادیث کا چرچا عام تھا۔ یہ حدیثیں جو آج کل کتبات کی شکل میں مساجد میں لٹکا دی جاتی ہیں اس قدر شائع ذائع تھیں کہ عوام کی بڑی تعداد ان سے باخبر تھی ـــ درانحالیکہ آج سب خواص بھی انھیں مستحضر نہیں رکھتے۔ فلہٰذا اسلاف صالحین کے دماغ میں یہ تصور پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ کتبے لکھ کر مساجد میں ٹانگو۔ آج یہ وجہ موجود ہے۔ لہٰذا جو شخص یا ادارہ خالصۃً للہ یہ کام کرتا ہے اور متفق علیہ احادیث کو اس طریقے پر لوگوں تک پہنچاتا ہے کہ انھیں وقت اور محنت صرف کئے بغیر یہ مفت برابر ہاتھ آجائیں تو وہ سلف صالحین کی پیروی اور ہدایت رسولؐ ہی کا اتباع کرتا ہے۔ ذرائع کا فرق ہے مدعا اور مفاد کا کوئی فرق نہیں۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ عرب تصویرکشی اور بُت گری میں یکتائے روزگار تھے لہٰذا اسلاف صالحین کیلئے گنبدِ خضراء کی تصویریں مہیا کرلینا بہت آسان تھا تو آپ کو معلوم ہے کہ پریس کا رواج بہت بعد میں ہوا ہے۔ قرونِ اولیٰ میں اگر مسلمانوں میں کچھ ماہرینِ تصویرکشی رہے بھی ہوں تو اوّل تو چونکہ اسلام نے تصویرکشی کی ہمت افزائی نہیں کی اور جاندار کی تصویر کو تو حرام ہی قرار دیدیا اس لئے یہ مشغلہ کثرت سے جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر گنبدِ خضراء کی تصویر کوئی مسلمان مصوّر بنا بھی لیتا تو یہ کہاں ممکن تھا کہ مشینیں اسے کھٹا کھٹ ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگ چھاپ دیں اور جس کا جی چاہے چند پیسے خرچ کرکے اسے خرید لائے۔

نیز یہ بھی سوچئے کہ گنبدِ خضراء قرونِ اولیٰ میں تھا کہاں یہ تو بعد کی تعمیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ مسجدِ نبوی اور بیت اللہ کی تصاویر زیرِ بحث آسکتی ہیں تو اول تو یہی ثابت کرنا مشکل ہے کہ سلف صالحین میں کسی کے پاس ان میں سے کسی کی تصویر نہیں تھی دوسرے جن سلف صالحین کا اُسوہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے ان کے تو مشاغلِ حیات ہی اس نوع کے تھے کہ ان میں اس طرح کے غیر بنیادی مشاغل کی طرف توجہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے شب و روز مجاہدہ و عبادت اور جہاد و اقدام کی تب و تاب کی نذر تھے۔ وہ تو روحانیت کی اس منزل میں تھے جہاں اللہ اور رسولؐ کی ذواتِ مقدسہ کاغذ کی بجائے دل اور روح کی الواح پر جلوہ ریز رہتی ہیں۔ وہ تو کعبے اور مسجدِ نبوی کو آنکھوں میں لئے پھرتے تھے۔ انھوں نے اگر مسجدِ نبوی اور بیت اللہ کی قلمی تصاویر گھروں اور مسجدوں میں نہیں لٹکائیں۔ انھوں نے اگر احادیث کے کتبے مساجد میں آویزاں نہیں کئے تو اس سے یہ سبق کہاں ملا کہ آج بھی یہ کام ناجائز ہے جبکہ قلوب و اذہان اور روح و ضمیر پر دنیا ہی دنیا طاری ہے اور بسا غنیمت ہے کہ دنیا زدہ مسلمانوں کو حضورؐ کی چند حدیثیں اسی طرح پہنچ جائیں یا گنبدِ خضراء کی تصویر دیکھکر یہ خیال آجائے کہ ہم پر اس گنبد کے نیچے استراحت فرمانے والے پیغمبر کا بھی کچھ حق ہے۔ ہمیں حشر کے دن اس گنبد والے کی لائی ہوئی شریعت کے سلسلے میں بھی جوابدہی کرنی ہے۔

کلینڈر کی بات یہ ہے کہ بے شک لوگ مسجدوں میں تاریخیں دیکھنے نہیں آتے لیکن تبعاً اور بلا تکلیف انھیں تاریخیں معلوم ہی ہوجائیں تو اس میں قباحت کیا ہے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ شمسی تاریخوں کے شیوع اور کثرتِ استعمال کے باعث چاند کی تاریخیں چند فی صد سے زیادہ مسلمانوں کو یاد نہیں رہتیں۔ اگر مسجد جیسی جگہ میں جہاں ہر مسلمان ہر وقت بے روک ٹوک آجاسکتا ہے چاند کی تاریخیں بتانے والا کلینڈر ٹنگا ہی ہوا ہو تو کیا بعید ہے کہ ضرورت کے وقت مسلمان اس سے فائدہ اٹھا ہی لیں۔ مضرت کا کوئی پہلو نہیں افادیت قطعاً ممکن بلکہ واقع ہے۔ لہٰذا اس

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

مقالات جمال الدین افغانیؒ
چودھویں صدی کے مجدد اور مفکر جمال الدین افغانیؒ کے زندگی افروز، ولولہ انگیز، روح پرور، عزم آفریں اور داعیانہ عربی خطبات و مقالات کا شستہ اردو ترجمہ
قیمت مجلّد چار روپے

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ
حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور ان کے فکر و نظر کی تشریح و توضیح۔ از۔ علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ چار روپے پچاس پیسے

سفینۃ الاولیاء
دارا شکوہ کی مشہور و مستند کتاب سفینۃ الاولیاء کا سلیس و با محاورہ اردو ترجمہ جس میں آنحضرت سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین و امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو یوسفؒ، امام مالک بن انسؒ و امام شافعیؒ و ائمہ اثنا عشری و ازواج مطہراتؓ و اسلام کی مشہور و نیک خواتین اور اولیائے کرام کے جامع حالات از تاریخ ولادت تا تاریخ وفات کو مستند ماخذوں سے جمع کیا گیا ہے۔
قیمت مجلّد چھ روپے بارہ آنے

البرامکہ
مصنفہ:۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری۔
عالم اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کون تھے۔ انھوں نے عہد عباسیہ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان دانشور اور مدبر وزیروں کے عروج و زوال کی حیرت انگیز و عبرت انگیز داستان۔ مکمل و مجلّد بارہ روپے۔

آئینۂ حقیقت نما
مصنفہ:۔ مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ہند اور مغربی مؤرخین گذشتہ برسوں سے ہندوستان پر مسلم فاتحین کے حالات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھکر پیش کر رہے تھے اور مسلمان حکمرانوں کی ساری خوبیاں خرابیاں ہوکر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں مؤرخ اسلام نے محققانہ قلم اٹھایا اور تمام الزامات کا مدلل اور دنداں شکن جواب تاریخ کی روشنی میں لکھا جو "آئینۂ حقیقت نما" کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب حیرت انگیز تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔

رسائل و مسائل
گوناگوں دینی و علمی سوالات کے جو مدلل اور مفکرانہ جوابات مولانا مودودی وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں ان کے مجموعے کا نام "رسائل و مسائل" ہے۔ نکتہ رسی، زورِ استدلال، فہم و بصیرت، تدبر و تفقہ اور فصاحت و بلاغت کا گنجینہ۔ مکمل دو حصے۔ بارہ روپے

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
دنیائے عرب کے مشہور عالم و محقق استاذ ابو زہرہ کی بیش بہا عربی تصنیف کا نفیس اردو ترجمہ۔ امام ابن تیمیہؒ پر سب سے جامع، مبسوط اور سیر حاصل کتاب ضخیم اور وسیع
قیمت مجلّد اکیس روپے

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیبؒ
مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء جس میں شاہجہاںؒ کے آخری دور کا حال، اورنگ زیبؒ کی بھائیوں سے کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پس پردہ واقعات اور اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
قیمت مجلّد بارہ روپے

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات
تاریخ کے بعض دلچسپ اہم اور تعجب خیز واقعات کا عبرت آموز بیان۔ قیمت تین روپے۔

نظام الملک طوسی
الپ ارسلان کے وزیر کبیر ابو علی حسن بن علی کی مبسوط سوانح عمری۔ قابل اعتماد تاریخی مواد۔ مؤلفہ:۔ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ۔ قیمت بارہ روپے۔

تاریخ اسلام کامل
از:۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ یہ تین جلدوں کی ضخیم تاریخ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قدیم و جدید تاریخوں کا نچوڑ سمجھئے۔ اسلام کی اس سے زیادہ جامع معتبر اور نفیس تاریخ اردو میں کوئی نہیں روشن کتابت و طباعت، سفید کاغذ، حسین گرد پوش۔ تین جلدیں الگ الگ مجلّد قیمت چھتیس روپے۔

مشاہیر اسلام کے آخری لمحات

از: جناب محمد احمد انصاری

ظاہر ہے ابوبکر و عمر رضوان اللہ علیہما کے حالات و کوائف تو مسلمانوں کے بچے بھی جانتے ہیں۔ نہ کیوں جانیں گے جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہی دنیا کے بڑے انسان ہیں۔ انھیں بھولنے والا مسلمان ہی کہاں سے رہیگا۔

پھر کیا ضرورت ہوئی کہ ان حضرات کے معلوم و معروف احوال و وقائع پر ہم آئے دن صفحات صرف کرتے رہا کریں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی محبت ہمارا ایمان ہے ان کا اسوہ ہمارے دل کی ٹھنڈک ہے ان کا ذکر و فکر ہماری روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ ان کی باتوں کو بار بار دہراؤ بار باران کا مقدس نام ہمارے سامنے لو۔ ان کے بیکراں ایمان و یقین کے قصے بار بار سناؤ ہم کبھی نہیں تھکیں گے۔ ان کی یادوں کا ہماری لوحِ حافظہ پر جاگزیں رہنا ہی ایمان کی تازگی اور حبِ رسول کی گیرائی کا آئینہ ہے آپ پچاس بار بھی وہ تفصیلات پڑھ چکے ہوں جنھیں بالکل سادہ انداز میں اس سلسلۂ مضمون میں پیش کیا جارہا ہے تب بھی انھیں ایک بار پھر پڑھئے نمازیں ہر روز پانچ بار پڑھنی پڑتی ہیں۔ اُن کا ذکر و بیاں کیوں بار بار نہ ہو جن کے واسطے سے یہ نماز ہم تک پہنچی ابوبکر و عمر نہ ہوتے تو مسلمانوں کی تاریخ دوسری امتوں کی تاریخ سے بہت کم مختلف ہوتی۔ مگر ہوتے کیوں نہ۔ اللہ کو تو یہی منظور تھا کہ آخری کامل ترین دین کی اقامت کے لئے سب سے بڑے پیغمبر کو ایسے ہی پیرو ملیں جنکا فولادی ایمان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے اور کفر و الحاد کے مہیب پہاڑوں کو پائے حقارت سے روندتا فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ والحمد للہ رب العالمین۔ (عامر عثمانی)

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بن ابو قحافہ

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کی شان میں فرمایا۔" اگر میں اللہ کے بعد کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا"

تعارف:- حضرت ابو بکرؓ صدیق قریش کی ایک شاخ بنی تیم کے تعلق رکھتے تھے آپ شروع ہی سے سلیم الفطرت اور راست باز تھے چنانچہ دورِ جہالت میں بھی آپ تمام لغویات سے محفوظ رہے اور اپنے دامن کو تمام آلائشوں سے پاک رکھا، دولت گھر کی لونڈی تھی کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے ہر شخص آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔

جب سرکار دو عالمؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو آپ کی فطرت صالحہ نے اسے اس طرح قبول کر لیا جیسے پیاسی ریت بارش کے چھینٹے جذب کر لیتی ہے آپ نہ صرف بلا توقف ایمان لے آئے بلکہ اسلام اور سرکار دو عالم کی محبت و عقیدت میں اپنے آپ کو سرتاپا غرق کر دیا اور نیازمندی و خودسپردگی کا وہ نمونہ پیش کیا جسکی نظیر رہتی دنیا تک پیش نہ کی جاسکے گی۔ آپ کے متعدد قابل فخر اور

دورس کارناموں میں سے ایک کارنامہ قرآن مجید کا یک جا جمع کرنا ہے آپ سے ایکسو بیالیس حدیثیں مروی ہیں۔"

بیماری: ۔ مدینہ منورہ میں شدت سے سردی پڑ رہی تھی انہی دنوں آپ نے ٹھنڈے پانی سے غسل فرمایا جس کی وجہ سے آپکو بخار ہو گیا۔ بیماری میں آپ پندرہ روز مبتلا رہے اس دوران امامت کے فرائض حضرت عمرؓ سر انجام دیتے رہے۔

وصیت: ۔ جب حالت زیادہ خراب ہو گئی اور بچنے کی امید کم رہ گئی تو آپ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو بلایا اور مندرجہ ذیل وصیت لکھوائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ وصیت ہے جو ابو بکرؓ بن ابو قحافہ نے اس جہان فانی سے رخصت ہوتے اور دار البقا میں قدم رکھتے وقت لکھوائی ہے یہ وہ وقت ہے جبکہ منکر ایمان لے آتا ہے اور بڑے سے بڑا مکار شخص حق گوئی پر اتر آتا ہے میں نے تم پر عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنایا ہے تم ان کے احکام کی کامل اطاعت کرو اگر عمر انصاف سے کام کریں اور تقویٰ برتیں تو ان کی بابت میرا یہی گمان ہے اور یہی امید ہے اور اگر خدا نخواستہ وہ بدل جائیں تو میں نے حتی الوسع بھلائی چاہی ہے اور غیب کا حال تو سوائے خدا کے کوئی بھی نہیں جانتا"

جب وصیت نامہ لکھا جا چکا تو آپ نے حضرت عثمانؓ اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مجمع عام میں اسے پڑھکر سنائیں اور آپ خود اپنی اہلیہ اسماء بنت عمیس کا سہارا لے کر بالا خانے پر پہنچے جب وصیت نامہ پڑھکر سنایا جا چکا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

" میں نے اپنے کسی بھائی بند کو تم پر خلیفہ مقرر نہیں کیا ہے بلکہ عمرؓ بن خطاب کو مقرر کیا ہے کیا تم لوگ اس پر راضی ہو؟"

سب نے یک زبان ہو کر بلند آواز سے سمعنا و اطعنا کہا اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور امور سلطنت کے متعلق بعض اہم ہدایات دیں جو حضرت عمرؓ کے لئے عمدہ دستور العمل ثابت ہوئیں۔

ذکر الٰہی ۔ حضرت ابو بکرؓ بستر پر نیم دراز ہیں آنکھیں بند ہیں سر جھکا ہوا ہے بخار کی شدت ہے اور آپ ذکر الٰہی میں مشغول ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاس بیٹھی ہوتی ہیں کہ اچانک آپ پر غشی کا دورہ پڑا حالت ابتر ہو گئی حضرت عائشہؓ اپنے باپ کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھیں اور دردناک لہجہ میں ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

ترجمہ۔ جب نزع کی حالت طاری ہوتی ہے اور سانس نہ آنے کی وجہ سے سینہ گھٹنے لگتا ہے تو زر انسان کے کام نہیں آتا" اتنے میں آپکو ہوش آگیا اور جب یہ شعر سنا تو آپ نے فیصلے انداز میں کہا اے عائشہؓ اس شعر کی بجائے یہ آیت پڑھو۔ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (ق رکوع ۲) نزع کی حالت طاری ہو گئی ہے یہ وہ وقت ہے جس سے تو خوف کھایا کرتا تھا۔ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد آپ نے حضرت عائشہؓ سے حسب ذیل سوالات کئے۔

حضرت ابو بکرؓ: ۔ اے عائشہؓ! حضور اکرمؐ کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟

حضرت عائشہؓ: ۔ تین کپڑوں میں۔

حضرت ابو بکرؓ: ۔ آپ نے کون سے دن رحلت فرمائی تھی۔؟

حضرت عائشہؓ: ۔ پیر کے دن۔

حضرت ابو بکرؓ: ۔ آج کونسا دن ہے؟

حضرت عائشہؓ: ۔ پیر کا دن ہے

اس کے بعد آپ نے خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! میری موت آج ہی کے دن واقع ہو" پھر آپ نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا اور فرمایا دو اور نئے کپڑے ملا کر اسی میں مجھے کفنا دینا" بولیں" یہ تو پرانا ہے اور ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ ہم نئے کپڑوں میں آپ کی تکفین و تدفین کر سکیں۔ فرمایا" اے بیٹی زندہ انسان بمقابلہ مردہ کے نئے کپڑے کا زیادہ مستحق ہے اور کفن تو اس لئے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جائے۔

عین وفات کے وقت آپ نے کافی بلند آواز سے دعاء یوسفی پڑھی رَبِّ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (یوسف رکوع ۱۱) (اے پروردگار! ہمیں اسلام پر موت دے اور نیک بندوں کا ساتھ عطا کر) اور اس کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور خلیفہ رسول اللہؐ کو رسول اللہ کے پہلو میں چھوڑ آئے تاحیات دونوں ساتھ رہے اور یہ رفاقت وفات کے بعد بھی ختم نہ ہوئی اور رسول اللہؐ کا پیارا خادم اپنے آقاؐ کے پہلو میں آرام کی نیند سو رہا ہے یہ سعادت حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے علاوہ

کسی اور کو نصیب نہوئی اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔
تاریخ وفات ۱۳ ہجری مطابق ۶۳۴ عیسوی

حضرت ابوبکرؓ کی وفات سے مدینہ کی فضا کرب و اضطراب کی طوفانی لہروں سے لبریز ہوگئی لوگوں کی غمگساری و بیقراری سے کم و بیش وہی کیفیت طاری تھی جس کا نظارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت دیکھنے میں آیا تھا حضرت علیؓ بن ابی طالب ضبط گریہ سے بیتاب تعزیت قدموں کے ساتھ آئے اور حجرے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر دردناک لہجے میں فرمایا:

اے ابوبکرؓ! واللہ تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہؐ کی آواز پر لبیک کہی۔ ایمان و اخلاص میں تمہارا ہم پلہ کوئی نہ تھا خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے اخلاق و قربانی، ایثار اور بزرگی میں تمہارا ثانی کوئی نہ تھا، واللہ! تم اسلام کے مضبوط قلعہ تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمہارے اجر سے محروم نہ رکھے اور ہمیں تمہارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے بلکہ ہمارے سہارے کیلئے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کردے۔"

آنکھوں کی قدر ابھی سے کیجئے تاکہ بڑھاپے تک بینائی قائم رہے۔
آپ غلطی کر رہے ہیں
بڑا زریں مقولہ ہے
قدرِ نعمت بعد زوالِ نعمت
یہ مت سوچئے کہ خدا نخواستہ جب آنکھوں پر کسی مرض کا حملہ ہو جائے گا یا بینائی کم ہونے لگے گی اُس وقت دُرِّ نجف استعمال کر لیں گے۔
دُور اندیشی اور دانش مندی کی بات یہ ہے کہ ابھی سے دُرِّ نجف کے استعمال کو معمول بنائیے تاکہ ممکنہ امراض کے لئے آپ کی بینائی کے خزانے میں بیش از بیش قوتِ مدافعت جمع ہوتی جائے اور داخلی یا خارجی اثرات اگر کبھی آنکھوں پر حملہ آور ہوں تو جمع شدہ قوتِ مدافعت انھیں پیچھے دھکیل دے۔
دُرِّ نجف
ایک جانا پہچانا قدیمی سرمہ جسے ہزاروں آدمی روزانہ استعمال کرتے ہیں

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

عکرمہ کی اسلام دشمنی کا اندازہ کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی کہ ان کی رگوں میں اسلام کے بدترین باغی ابوجہل کا خون گردش کر رہا تھا۔ کون سوچ بھی سکتا تھا کہ یہ خون اپنی سیاہ فطرت بدل کر ایمان کے شفاف نور میں ڈھل جائے گا۔

ابوجہل کا کفر — کفر کی وہ آخری شکل تھی جہاں انسانی وجود جیتے جی پتھر کی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ جہاں مسخ شدہ ضمیر سے نفس و شیطنت کا مکروہ کوڑھ ٹپکتا ہے تو آبادیاں گل سڑ جاتی ہیں۔ جہاں سچائی کی ہلکی سی آہٹ پر انسانی درندگی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ جہاں خلوص و محبت کی مقدس دلربیاں اُلٹا اثر کرتی ہیں اور حیوانی جبلت ہر اُس شے پر ڈنک مارتی ہے جو اس کو پیار کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے!

کوہ صفا سے جس دن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو بندگی کی بھولی ہوئی حقیقت یاد دلائی تو اس عظیم احسان کے جواب میں سب سے پہلے ابوجہل ہی نے رسالت کے سینے پر قاتلانہ وار کیا اور اس طرح ظلم و تشدد کی وہ خوفناک طاقتیں حرکت میں آگئیں جن کے ہاتھوں اللہ والوں کے خون سے زمین گلنار ہو کر رہ گئی۔ تاریخ کو اس تاریخی موڑ کا وہ مکالمہ بھلائے نہیں بھولتا جب ایک طرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں سے وحی کے پھول جھڑ رہے تھے تو دوسری طرف ابوجہل کی زبان شعلہ باریاں کرتی نہ تھکتی تھی۔

"لوگو!" رسولِ کریمؐ نے فرمایا تھا "بتاؤ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟" دامنِ کوہ میں ٹھاٹیں مارتا ہوا انسانی سمندر ایک بلند بانگ نعرے میں تبدیل ہو گیا:-

"امین اور صادق! — تیری زندگی کے چالیس سال ہمارے لئے کھلی کتاب ہیں۔ تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ ہم تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم تجھے پیار کرتے ہیں۔"

"اچھا اگر میں یہ کہوں" حضورؐ کی آواز میں لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی ہوئی سنجیدگی صاف بتا رہی تھی کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت عرش سے فرش پر اُتر تی آ رہی ہے "کہ اس پہاڑی کے عقب سے ایک غنیم تم سب پر یلغار کرتا آ رہا ہے تو کیا تم میرا اعتبار کر و گے؟"

ظاہر ہے یہ خطرے کی محض ایک تمثیل تھی خطرہ نہیں! — مگر سننے والے اس طرح چونک اٹھے جیسے سچ مچ خطرہ کا دھماکہ ٹھیک سر پر آگیا ہو! دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چہروں نے رنگ بدلا۔ سیکڑوں آنکھیں اس ایک معصوم چہرے پر اس طرح جم کر رہ گئیں، جیسے اس آئینے میں انسانی قسمت کی تحریر پڑھی جا سکتی ہے۔

"اے محمد!" ہزاروں آوازیں ایک آواز بن گئیں۔ "جلد کہہ! ربّ کعبہ کی قسم! ہم سب تیرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔"

جھوٹ اور سچائی کی تاریخ میں یہ ایک لمحہ کیسا ڈرامائی وقفہ تھا! ایک انسانی وجود کے مقناطیسی سنگم پر وہ طوفانی دھارے سمٹ کر ایک ہو گئے تھے جن کو آئندہ تمام عمر ایک دوسرے

سے ٹکراتے رہنا تھا۔ لیکن یہ دھارے اس سے بے خبر تھے
کہ ابھی ابھی حقیقت کی وہ آواز زندگی کی گہرائیوں میں گونج
اُٹھنے والی ہے جس کو سُنکر انسان کے اندر چھپا ہوا شیطان
اور فرشتہ باہر نکلتا ہے اور پھر ایک فیصلہ کن جنگ ہی یہ فیصلہ
کرتی ہے کہ ان دونوں میں حقیقی انسان کون تھا ؟

پتھروں کے پجاریوں کے غول بیابانی میں دردمندگی
سے بیکل جان نے تن تنہا خدائے واحد کا نعرہ لگایا۔

"ہوشیار! — تم سب ایک ایسے جوالامکھی کے
دہانے پہ کھڑے ہو جس کے اندر دوزخ کی بھوکی آگ ہے۔
شیطان تمھارا جانی دشمن ہے جو تم پر حملہ آور ہے۔ خدائے
واحد کے سوا کہیں پناہ نہیں۔ محمدؐ کی پکار پر اپنے خدا کی
پناہ میں آجاؤ! — میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتا — اور
کچھ نہیں چاہتا!" —

ایک ساعت کے لئے ہر طرف موت کی سی خاموشی
چھا گئی —

یہ خدا کا پیغام تھا —
یہ محمدؐ کی آواز تھی —
یہ مکہ کے مانے ہوئے امین وصادق کی پکار تھی۔

کوئی کیا کہہ سکتا تھا ؟ — کس میں جھٹلانے کا یارا
تھا! کون یہ بدگمانی کرتا کہ انسان کے معاملے میں چالیس
سال سے سچ بولنے والا خدا کے بارے میں جھوٹ بول سکتا ہے
لیکن نہیں! — یہاں ایک ایسا انسان بھی موجود تھا
جس کو انسانیت ہی سے چڑھ تھی۔ وہ ابوجہل جس کی انسانی
فطرت پتھروں کو پوجتے پوجتے پتھر کی طرح بے حس ہو چکی
تھی۔ اس پتھر پر سچائی کا یہ اعلان بجلی بنکر گرا۔ اس کے
پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ زخم خوردہ ناگ کی
طرح بل کھاتا ہوا اور غیظ وغضب کی دیوانگی میں منھ
سے کف اُڑاتا ہوا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ
کیا کرے اور کیا کہے ؟ نفرت کے پاگل پن میں درندوں
کی طرح دانت پیستا ہوا وہ آگے بڑھا اور جب انسان
کو جھٹلانے کی تاب اس میں نہ تھی اس کو کوسنا کاٹنا
دیوانہ وار چنگھاڑا۔

"تو ... تو کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں اکٹھا
کیا تھا .... ؟"

یہ قہر وستم کی خونیں آندھیاں اُٹھاتی ہوئی چنگھاڑ تھی
جو حیوانیت کو جگا کر انسانیت کو موت کی نیند سلا دینا چاہتی
تھی۔ مکے کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی یہی چنگھاڑ اپنی پوری
حشر سامانیوں کے ساتھ عکرمہ کے وجود میں جذب ہو گئی۔
ابوجہل اور عکرمہ — باپ اور بیٹے دوش بدوش نکلے اور
مکے کی فضاؤں کو اسلام دشمنی کی آگ سے نفرت کے جلتے
تنور میں بدل دیا۔ لیکن اس تنور میں جلتے ہوئے مظلوم مسلمان
اپنی ہڈیوں کی آگ سے اسلام کا چراغ روشن کرتے چلے گئے۔
یہ چراغ کسی طرح گل نہ ہوتا تھا۔ ایمان کی یہ حرارت کسی طرح
سرد نہ پڑتی تھی۔ ہزاروں ظالموں کی نفرت بھری سفاکیاں
ایک طرف تھیں اور ایک خدا پر اٹل ایمان دوسری طرف!
مسلمان جان دے کر بھی اس ایمان کو زندہ رکھنے کی قسم کھا
رہے تھے۔ دوزخ کی ہولناک آگ سے بچنے کے لئے انسان دنیا
کی بھٹیوں میں جل مرنے پر ہنسی خوشی تیار تھا۔ آخر اس "جنون"
کو ختم کرنے کے لئے جب بدر کے میدان کارزار میں
نفرت اور طاقت کی دودھاری تلوار نکالی گئی تو عکرمہ
یہاں بھی اسلام دشمنی کے محاذ پر صفِ اوّل میں دکھائی دیتے
گویا اس نفرت پر آج انھوں نے اپنی جان کی بازی لگادی
تھی۔ جیسے وہ عہد کر چکے تھے کہ یا ہیں نہیں یا اسلام نہیں۔

لیکن اچانک نفرت کے اس جنون کے سر پہ دھماکہ
ہوا — سچائی کی ایک زلزلہ انگیز دھمک سے نفرت اور طاقت
کی آہنی بنیادیں ہل گئیں۔ کفر کی صفوں میں تہلکہ ڈالتی ہوئی ابوجہل
کی کربناک چیخ بلند ہو رہی تھی۔ عکرمہ نے تڑپ کر دیکھا تو
اسلامی سپاہ کے دو بچے کفر کا آہنی پہاڑ ڈھاتے ہوئے نظر
آئے۔ مسعودؓ اور معاذؓ — دو معصوم ومقدس بچے جو محمدؐ
عربی کے پسینے پر خون بہانے آئے تھے۔ جن کی غیرتِ حق کی تازہ
دم معصومیت خدا کے سب سے بڑے دشمن کی تاک میں نکلی تھی۔
— جو کفر کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور ابوجہل کے سر پر قضا

بن کر ٹوٹ پڑے تھے۔

عکرمہ کو اس منظر نے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا۔ اپنے باپ کو ذلیل ترین موت سے بچانے کے لئے ان کا خون جوش میں آیا۔۔ وہ بجلی کی طرح لپکے لیکن معصوم مجاہدوں کی تلوار میں موت کی برق رفتاریاں سمٹ آئیں تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ابوجہل درد و کرب بھری چنگھاڑ کے ساتھ خاک و خون میں لت پت ہو گیا۔

خدا کے سب سے بڑے دشمن کی لاش کو خدا کے چاہنے والے دو بچوں کے قدموں میں جگہ ملی تھی! لیکن عکرمہ ابھی خدا کی قدرت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ابھی ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ابوجہل کے بیٹے ہیں۔ انتقام کے جنون میں تڑپتی ہوئی تلوار عکرمہ کے ہاتھوں میں چمکی اور معاذؓ کا معصوم بازو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔

لیکن یہ بازو اپنا کام کر چکا تھا! انتقام کے خونین حملے کے جواب میں معصوم بچے کے ہونٹوں پر ادائے فرض کا جاں نواز تبسم بکھر گیا۔ خون میں نہائے ہوئے اس انسانی فرشتے کا لہو چاٹ کر بھی "کافر" کی تلوار کی پیاس نہ بجھ سکی۔ فرض کی تلوار ابوجہل کو ہمیشہ کے لئے ختم کر چکی تھی۔

عکرمہ اپنے باپ ابوجہل کو کھو کر مکّے کی طرف پلٹے تو ان کی رگوں میں انتقام کی آگ بدستور بھڑک رہی تھی۔ اب یہ انتقام اسلام کی دشمنی میں ایک بے پناہ جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اب وہ دن رات اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں سے ایک دوسری فیصلہ کن جنگ ہو جس میں خود اسلام کو خون میں نہایا ہوا دیکھ سکیں۔

"کیا ابوجہل کا خون خشک ہونے دیا جائے گا؟" عکرمہ نے قریشی سردار ابوسفیان سے کہا۔ ان کی آواز جراحت اور جوش سے کانپ رہی تھی "کیا ابوجہل کی موت کے بعد بھی اسلام کو زندہ رہنے دیا جا سکتا ہے؟"

ابوسفیان نے چونک کر عکرمہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کسی کربناک سوچ میں سر جھکا لیا۔ بدر کے محاذ پر اسلام نے کفر کو ایسی شکست فاش دی تھی جس کا زخم مندمل کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش توجیہہ تک نہ کی جا سکے۔ بھری فوج میں دو بچوں کا ابوجہل کی لاش گرا دینا کفر کی غیرت کے لئے ایک آخری درجہ کا شرمناک واقعہ تھا۔ عکرمہ کا جوش و خروش دیکھ کر ابوسفیان کی ذہنی کش مکش پورے وجود کو پیسے ڈالتی تھی۔ لیکن آخر کار قریش کی سربراہی کا بھرم رکھنے کے لئے ایک کمزور آواز میں جواب دیا گیا۔

"ابوجہل کے بیٹے! ہم چین سے بیٹھنے والے نہیں۔ لیکن یہ مسلمان کوئی ایسا لقمۂ تر نہیں کہ جب جی چاہے انکو نگلنے کے لئے منہ کھول دیا جائے ۔۔ دوسری جنگ تیاری چاہتی ہے۔۔ تم اس کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہو؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" عکرمہ کی رگ رگ میں اسلام کی نفرت ایک آتشیں لپٹ بن کر لپکی اور ہونٹوں پر ایک جھلسا دینے والا طنز بن گئی "میں پوچھتا ہوں میں کیا نہیں کر سکتا؟ میری دولت۔ میرے ہتھیار۔۔ میری زندگی کے خون کا آخری قطرہ تک اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے تیار ہے۔۔ بے قرار ہے۔"

اور واقعی اُحد کے اگلے معرکے میں عکرمہ نے اسلام کے خلاف یہ سب کچھ کر دکھایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے باوجود وہ صرف مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگ سکے اسلام کے نہیں! اسلام کے سینے پر گہرا گھاؤ لگا کر بھی وہ اسلام کے وجود کو مٹا نہ سکے۔ اسلام اس جنگ میں بھی فاتح ہی رہا۔ ہاں کچھ مسلمان اپنے ہی قدموں کی ایک خوفناک لغزش سے اس غار میں جا گرے جسے کفر نے اسلام کی موت کے لئے تیار کیا تھا۔ لیکن عکرمہ کے نزدیک ابھی اسلام اور مسلمان ۔۔ سچائی اور انسانی جسم کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ وہ تکمیل انتقام کی وحشیانہ سرمستی کے عالم میں مکّے کی طرف لوٹ کر آئے ۔۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ابوسفیان کی بے چینی بدستور قائم تھی۔ ابوسفیان جس کو خوب احساس تھا کہ اسلام خون میں نہا جانے کے باوجود دلوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پوری قوت سے زندہ ہے۔

اسلام جس کے چمن میں شہیدوں کے خون ہی سے بہار آتی ہے جس کی رعنائیاں زخم پر زخم کھا کر کچھ اور نکھر جاتی ہیں۔ جس کی صداقت کے نقوش اشک ذخوں سے اُجاگر ہوتے ہیں۔ جہاں جنتِ گم شدہ کی بازیابی کا یقین آتا ہی اس وقت ہے جب بندہ اپنے خدا کے پاس اسطرح لُٹ لُٹا کر پہنچے کہ خدا کے سوا اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ ہو۔ لیکن عکرمہ ابھی اس رازِ نہاں سے ناواقف تھے۔ اس لئے ابوسفیان کی معنی خیز خاموشی ان کو محض ایک مہمل بزدلی ہی نظر آئی۔ جس پر انھوں نے نفرت و حقارت کا قہقہہ لگا دیا اور بس۔

لیکن اس خاموشی کے حقیقی معنی ان کی سمجھ میں اس وقت آئے جب کچھ ہی عرصے کے بعد مسلمانوں کی فوجیں مکے پر فاتحانہ پیش قدمی کرتی نظر آئیں۔ عکرمہ کی اسلام دشمنی نے اب بھی اسلام کی غیبی طاقت کو سمجھنے کا موقعہ نہ دیا۔ گہری، اٹل اور آخری نفرت جس نے بغاوت اور ٹکراؤ کی زمین تنگ ہوتے دیکھی تو راہِ فرار اختیار کی مگر سر جھکانا منظور نہ کیا۔ مسلمانوں نے اسلام کی محبت میں وطن چھوڑا تھا۔ عکرمہ اسلام کی نفرت میں وطن چھوڑ رہے تھے۔ مگر ٹھیک اس وقت جب حقیقت کی تاب نہ لاکر وہ اسلام سے دُور ساحل سمندر کی طرف بھاگ رہے تھے ان کی بیوی ان کی نصف زندگی اسلام کے قدموں پر عقیدت و اطاعت کی پیشانی ٹیک رہی تھیں۔ سچائی کے نور سے قلب و نظر میں چراغاں لئے ہوئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کر رہی تھیں:۔

"کیا اسلام کی ایک حقیر خادمہ کی آواز سُنی جائیگی؟ کیا آپ کا اخلاقِ گرامی اپنے بدترین دشمن کو معاف کر سکتا ہے۔ کیا میرے شوہر عکرمہ کی جان بخشی کر کے انکو اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کا موقعہ دیا جا سکتا ہے؟"

التجا کرتے کرتے محترم صحابیہؓ کچھ سوچکر چونک اٹھیں۔ کانپ گئیں۔ وہ کس کے لئے کس سے کیا کہہ رہی ہیں۔ جس کے قلب پر عکرمہ کے ہاتھوں نے پوری بے رحمی سے زخم لگائے تھے۔ جس کے چہرے کو اُحد کے میدان میں اسکے پاک لہو سے سُرخ کر دیا گیا تھا۔ جس کو کے سے اس جرم پر نکالا گیا ہو کہ وہ ایک بہترین انسان کیوں ہے؟ کیا اتنے بڑے مظالم سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے زخموں کی ٹیس کو بھول جائے اور ظالم کو پیار کرے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ محمد عربی کی فراخ دلی نے جن وسعتوں کا ثبوت دیا اسکا تصور تک وہ لوگ نہیں کر سکتے تھے جن کے لئے انتقام ایک لذیذ ترین مشغلے سے کم نہ تھا۔

"ڈرو نہیں!" اخلاق کے پیمانہ سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والے انسان کاملؐ نے کہا "عکرمہ کو امان دی گئی۔ محمدؐ نے عکرمہ کو معاف کر دیا ہے۔"

کتنا بلند تھا وہ انسانؐ جس کے اخلاق کا جاں نواز تبسم دوست اور دشمن دونوں کے لئے عام تھا! جس کے سینے میں نفرت کرنے والوں کے لئے بے لوث محبّت کی دولت تھی جو مجرموں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہوا دیکھ کر اپنے دل کے دروازے کھول دیتا تھا۔ محترم صحابیہؓ پر پیغمبرؐ کے اس اسوۂ حسنہ کے آگے فرطِ عقیدت سے کپکپی طاری ہو گئی، آنکھوں میں تشکر کے الفاظ آنسوؤں کر اُبھر آئے۔ اسلام کی عظمت کی گہری چھاپ قلب و روح پر لئے ہوئے اب وہ اپنے "کافر" شوہر کی تلاش میں نکلیں تاکہ بھٹکے ہوئے شریکِ حیات کو گمراہی کی دردناک موت مرنے سے بچا سکیں۔

یہ دیکھ کر محترم صحابیہؓ کی حیرت و مسرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کے شوہر عکرمہ مکّے کی طرف واپس آ رہے ہیں!۔۔۔

"آپ آ گئے!" بیوی نے بچوں کی طرح بیتاب ہو کر کہا "میں خدائے واحد پر ایمان لے آئی ہوں اور خدا کے رسولؐ نے آپ کو امان دیدی ہے۔۔۔ کاش آپ اس احسان کی قیمت چکا سکیں۔ کاش۔۔۔!!

"مجھے محمدؐ نے معاف کر دیا ہے؟۔۔۔ مجھے!!" عکرمہ کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلیں اور تحیّر آمیز عقیدت سے اس طرح بند ہو گئیں جیسے وہ جاگتے میں کوئی حسین خواب دیکھ

رہے ہوں ـــ خود فراموشی کے والہانہ عالم میں بے ربط
سے الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے تھے "یہ ..... کیسے
ہو سکتا ہے ... کیسے ... ہو سکتا ... ہے! ـــ اُف کتنی
بڑی سزا ہے یہ ـــ کہ ایک گردن زدنی مجرم ..... کو
پستیوں سے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا جائے ـــ مگر ... نہیں!
... بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے .... ؟"

"آپ کیوں لوٹ آئے جاتے جاتے ؟" بیوی نے
عکرمہ کو خود فراموشی سے جگاتے ہوئے کہا" اور اب کہاں
جانا چاہتے تھے ؟ـ"

"میں ؟" عکرمہ جیسے خواب سے چونک گئے" میں وہاں
جا رہا تھا جہاں سے تم آ رہی ہو!"

"رسولؐ خدا کے پاس ؟ ـــ کیوں ؟ ـــ کیا ... ؟"

محترم صحابیہؓ ایک حسین توقع کو قریب آتا ہوا محسوس
کر کے خوشی سے بے قابو ہو گئیں ـــ "کیا آپ بھی اسلام
قبول کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں ؟"

عکرمہ کچھ دیر سر جھکائے رہے۔ پھر اپنی بیوی کے
پُر شوق چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ایک ایسی بیچارگی
سے دیکھنے لگے جیسے جذبات کے نئے انقلاب کو سمجھانے
کے لئے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ آخر ہونٹوں کو
خفیف سی حرکت ہوئی اور ایک گہری سنجیدگی کیساتھ
جواب دیا:ـ

"میں جس وقت کشتی میں سوار ہو کر اسلام سے دُور
ـــ بہت دُور بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا اسلام
تیزی سے میری سمت بڑھ رہا تھا۔ کشتی میں قدم رکھتے
ہوئے میرے لبوں پر لات وعزیٰ کا نام آیا تو کسی نے کہا "یہاں
لات وعزیٰ کا کام نہیں۔ یہ سمندر کی طوفانی دنیا ہے
جہاں خدائے واحد کو پکارنے سے کام چلتا ہے"۔ میں نے
یہ آواز سُنی اور میرے دل کے بند دریچے کھل گئے۔
میں نے سوچا کہ اگر سمندر میں لات وعزیٰ بے بس ہیں تو
کیوں نہ اس خدائے واحد کے آگے سر جھکا دوں جو
ڈوبتے بیڑوں کو پار لگانے کی طاقت رکھتا ہے ـ کیوں نہ
خشکی پر بھی اسی خدا کا نام لوں جس کا اشارہ پا کر طوفان
سانس روک لیتے ہیں"۔

"الحمد للہ!" صحابیہؓ کی زبان پر دل کی دھڑکنیں
حرفِ شکر بن کر تڑپ گئیں ـــ "خدا کا شکر ہے کہ آپ نے
سچائی کا راستہ پا لیا ہے ـ آئیے اب ایک منٹ بھی ضائع
نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کسی کے انتظار میں کھڑی نہیں رہتی"

عکرمہ کچھ دیر ایک نامعلوم سوچ میں ڈوبے کھڑے
رہے ـ جیسے دل میں کوئی پھانس ابھی تک کھٹک رہی ہو۔
لیکن دوسرے ہی لمحے ایک فیصلہ کن انداز میں انھوں نے
بیوی کا ہاتھ پکڑا اور محمد عربیؐ کی طرف کشاں کشاں چل
پڑے۔

"سمجھ میں نہیں آتا مجھے وہ شخص کس طرح معاف کر سکتا
ہے جس پر میں نے کبھی ترس نہیں کھایا .. لیکن یہ معافی
کا اعلان حقیقت ہو یا میری گرفتاری کے لئے کوئی حکمتِ
عملی ـــ میں اب وہاں ضرور جاؤں گا جہاں کوئی نامعلوم
شے مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے ـــ"

"آپ نے ابھی خدا کو سمجھا ہے خدا کے رسولؐ کو نہیں"۔
صحابیہؓ نے دلربائی کے ساتھ دھیرے دھیرے کہا۔
"محمدؐ اسی طرح معاف کرتے ہیں کہ دنیا اس کا تصور تک
نہیں کر سکتی"۔

حُسن اتفاق سے محمد عربیؐ اس وقت مکّے ہی میں
تھے جب اسلام کی نادیدہ کشش میں جکڑے ہوئے عکرمہ نے
بارگاہِ رسالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ـــ دروازہ کھلنے سے
پہلے ان کا پورا وجود امید و بیم کے طوفانی تھپیڑے کھا رہا
تھا۔ چہرہ رہ رہ کر رنگ بدل رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں
جذبات کے مدّوجزر میں ہچکولے کھا رہی تھیں ـ لیکن
دروازہ کھلا تو آنحضرتؐ عکرمہ کو حاضر پاکر بہت مسرور
ہوئے اور انتہائی دل نوازی کے ساتھ آپؐ نے ان کا
خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا ـــ "خوش آمدید۔ خوش آمدید
اے پردیسی سوار!"

اخلاقِ کریمانہ کی عظمتوں کے آگے عکرمہ کچھ دیر کے لئے ہیبت و رعب سے سکتے میں رہ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس انسان پر میں نے عرصۂ حیات تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کیا یہ وہی انسان ہے جو میرے لئے۔ ۔۔ اپنے عمر بھر کے دشمنِ جانی کے لئے خلوص و دلنوازی سے فرشِ راہ ہوا جا رہا ہے!۔ کتنا بڑا ہے یہ انسان کہ اس کا بدترین دشمن بھی اس کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو شکوک و خطرات کی غلیظ تاریکی اس کے ایک فیاضانہ تبسم سے چھٹ جاتی ہے!۔۔ اور۔۔۔ یہ پردیسی سوار کے الفاظ کیا یہ شخص میرے فرار کے اس خفیہ مرحلے سے باخبر ہے جس کی خبر میرے سوا کسی کو نہیں۔ یقیناً میں ایک ایسے انسانی وجود کے سامنے ہوں جس کے قلب و روح کا تعلق خدائے عالم الغیوب سے ہے۔۔ اچانک یہ سوچتے سوچتے عکرمہ کو اپنے وہ سیاہ جرائم یاد آگئے جن کو معاف کرنے کے لئے خود ان کا اپنا ضمیر بھی تیار نہ تھا۔ لیکن جن کے متعلق حضورؐ کی معافی کی خوشخبری ان کی مومنہ بیوی نے سنائی تھی۔ اس خبر کی تصدیق اس ملاقات کا سب سے اہم عنوان بن کر ان کے لبوں پر آگئی۔

"اس سے معلوم ہوا ہے" عکرمہ نے بار انفعال سے سر جھکائے ہوئے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کہ ۔۔۔ آپ نے ۔۔۔ عکرمہ ۔۔ کو امان دیدی ہے؟"

امید و بیم، کشمکش و تذبذب کے بوجھ میں لپٹا ہوا ایک پل اس وقت ظالم اور مظلوم کے درمیان حائل تھا۔ ایک پل جس کو امید اور خوف کی خطرناکیوں نے قیامت کی طرح طویل بنا دیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے عکرمہ کی روح پر محمد عربیؐ کی سکینت ریز اور دلنواز میٹھی آواز سے وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔۔ ایک آواز جس میں شہد کے مٹھاس اور پھولوں کی نرمی سے بھی زیادہ لطیف تر کوئی شئے تھی۔ دل سے نکلتی ہوئی اور دل کو چھوتی ہوئی ایک عظیم ترین انسان کی آواز!۔

"ہاں عکرمہ! میں نے تمہیں امان دی ہے۔۔ میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔ کوئی تمہیں کچھ نہ کہے گا!"

کیا یہ محض ایک آواز تھی یا ایک حسین ترین روح کا سوز و گداز اور ایک پاکیزہ ترین دل کی مقدس دھڑکنیں الفاظ کے روپ میں ڈھل گئیں تھیں۔ عکرمہ کے لئے یہ معافی کی تصدیق محض چند جملے نہیں تھی۔ ان میں تو جیسے وہ ساری محبت سمٹ آئی تھی جو تخلیق کائنات سے لیکر آج تک مختلف صورتوں میں ایک انسان ایکدوسرے کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔۔ ایک اتھاہ، بیکراں محبت کی تڑپ جس کے آگے ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت ہیچ نظر آئے۔ عکرمہ نے محسوس کیا کہ جس باپ کے خونی تعلق پر وہ محمد عربیؐ سے نفرت کرتے آئے تھے، محمد عربیؐ کی ایک نگاہِ لطف پر ایسے ہزاروں ماں باپ نثار کئے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ انسان ہے جس کی انسان دوستی پر "فداہ امی و ابی" کا نعرۂ مستانہ دل اور زبان کے درمیان گونجتا ہوا اٹھتا ہے۔۔ عکرمہ نے محسوس کیا کہ پیغمبر کا پیار حاصل کئے بغیر اب تک انھوں نے جتنی عمر بسر کی تھی وہ زندگی نہیں موت تھی۔۔ زندہ تو وہ آج پہلی بار ہوئے تھے جب خدا کے آخری رسولؐ نے ان کی طرف محبت بھری نظر سے دیکھا تھا۔۔ جب ان کی نظر میں رسالتؐ کا حسن سمٹ آیا تھا اور دل میں خدائے کائنات کے عقیدے نے پورے وجود میں ابدی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔

اخلاقِ نبویؐ کی بارگاہ میں عکرمہ احساسِ گناہ کا ارتعاش بنے کھڑے تھے۔۔ ندامت کے قیمتی آنسو ان آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے جن میں کبھی اسلام کو دیکھ کر خون اُتر آتا تھا۔۔ عقیدت کی آنچ میں نفرت کی پتھریلی عمر پگھل پگھل کر آنسو بن رہی تھی۔۔۔ آنسو جو جذبات انسانی کا دردناک ترین نچوڑ ہیں۔۔ جہاں الفاظ کی دنیا گم ہو جاتی ہے اور جذبات کا رقت انگیز حسن و جمال بے حجاب ہو کر سامنے آتا ہے۔

"میں شہادت دیتا ہوں" آخر آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان سے ایک نئے مومن عکرمہؓ کی آواز سنائی دی۔

"میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا ایک ہی ہے۔۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔۔ آپؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔۔

— ہاں — آپؐ سب سے زیادہ نیک دل — سب سے زیادہ
سچے اور سب سے زیادہ عہد کو وفا کرنے والے ہیں —"
حضورؐ کے ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم تھا جیسے کسی ماں کا
لخت جگر موت کے جبڑوں سے زندہ نکل آیا ہو — اور عکرمہؓ
کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے عمر بھر کے گناہوں کی یاد دل کی
ایک ایک دھڑکن پر چوٹ لگا رہی ہو اور پیغمبرؐ کے پیار کی
تھپکی ہر چوٹ اور ہر زخم پر میٹھا میٹھا، ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم
رکھتی چلی جا رہی ہو۔

"اے خدا کے رسولؐ!" عکرمہؓ نے گلوگیر آواز میں
کہا "میں نے تمام عمر آپ سے دشمنی کی ہے — مسلمانوں سے جنگ
کی ہے — میری ساری زندگی خدا سے بغاوت میں کٹی ہے
— اُف میرے گناہوں کا بوجھ میری روح کو پیسے ڈال رہا ہے
— اب آپ ہی خدا سے درخواست فرمائیے کہ اپنے خطا کار
عکرمہ کو دامنِ عفو میں چھپا لے —" اور نبی الغیور محمد عربیؐ
نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور اخلاقِ گرامی کے نیم بسمل
نخچیر کے لئے رحمت و مغفرت کی دعائیں کیں — "اے اللہ
میں عکرمہ کو معاف کرتا ہوں — تو بھی معاف فرما دے!"
دعا کے بعد عکرمہؓ نے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس کیا اور
حضورؐ سے اسلام کی بنیادی باتیں سیکھ لیں — ایمان مکمل ہو چکا
تھا لیکن "عمل صالح" کی روحانی بھوک شروع ہوئی تھی۔ عمل
جو ایمان کو تپا کر کندن بناتا ہے۔ عمل — جو عقیدۂ و ایمان کا
جسم ہے — عمل — جس کے بغیر ایمان کا نور سمٹتا ہے اور ساری
زندگی کو ویران چھوڑ کر دل کے کسی نامعلوم گوشے میں محدود
ہو کر رہ جاتا ہے۔ عمل کا یہی سیلِ بیکراں حضرت عکرمہؓ کے
نوخیز ایمان کے سرچشمے سے پھوٹ نکلا تھا — ایک طرف
ماضی کے رستے ہوئے زخم تھے جن کو آنسوؤں سے دھونا ضروری
تھا اور دوسری طرف آخری مستقبل کی تعبیر کی دُھن تھی جس کا
سنگِ بنیاد وہ اپنے پورے وجود کی قربانی پر رکھنے کے لئے
سراپا اضطراب بنے ہوئے تھے۔ اسی موڑ پر انھوں نے اپنی
نئی زندگی کا مقدس عہد کرتے ہوئے یہ الفاظ ادا کئے:-
"کفر کے لئے میں نے بہت کچھ کیا تھا اب اسلام کیلئے
سب کچھ کرنا ہے — خدا کی دشمنی میں میں نے جان و مال کی
جو قربانیاں دی ہیں خدا کی اطاعت میں اس سے کئی گنی
قربانی دیئے بغیر عکرمہ چین سے نہ بیٹھے گا۔"

لیکن تلافی مافات کی اس جاں نثارانہ مہم پر پہلا قدم
اُٹھاتے ہی ان کو ایک ہوشربا نفسیاتی آزمائش سے دوچار
ہونا پڑا — خدا کے رسولؐ کی معافی سے سرفراز ہو کر جب
انھوں نے فخر و مسرت سے سر اُٹھا کر چلنا چاہا تو چاروں طرف
سے ہمت شکن طنز ان کو نرغے میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔
خدا اور اس کے رسولؐ نے معاف کر دیا تھا مگر اصحابِ
رسولؐ کی آنکھوں میں ان کی پچھلی حیاتِ مجرمانہ کانٹا بن کر
کھٹک رہی تھی۔

"یہ عکرمہ ہیں! — ابوجہل کے دست و بازو! —
— خدا کے دشمن کے بیٹے عکرمہ!!"

ایک تشنۂ انفعال کے لئے یہ طنزیہ آوازیں کس قدر
صبر آزما ہو سکتی ہیں! — جس کے عہدِ وفا کی خلوص کیشیوں
کا ردِّ عمل زمانے کے دل آزار شک و شبہ کی شکل میں برآمد
ہو اس کا پائے ثبات ڈگمگا جائے تو کوئی حیرت کی بات
نہیں — لیکن عکرمہؓ نے ان سب آوازوں کو سنکر جو کچھ
محسوس کیا وہ یہ تھا کہ میں واقعی "مجرم" ہوں۔ جن سنگین
خطاؤں کو ہر لمحہ ان کا ضمیر سوچنا چاہتا تھا یہ دنیا ان ہی
کو پوری قوت سے یاد دلا رہی تھی۔ خدا کے لئے اور خدا
کے رسولؐ کے لئے ان کی انتھا سپردگی کو اب یہ سوچنے
کا ہوش ہی کب تھا کہ یہ دنیا ان کو اپناتی ہے کہ نہیں؟ —
— یہ طنزیہ فقرے جب ان کے انفعال کا درد حد سے سوا
کر دیتے تو رات کی خاموش تنہائی ان کو نادیدہ خدا
کے آگے سربسجود دیکھتی — جہاں سجدہ گاہ کو گرم گرم
آنسوؤں سے تر کر دینے کے بعد ان کی پیشانی کو ایسا
سکون محسوس ہوتا جیسے ان کے سامنے روحانی زخموں
پر تسکین بخش پھائے رکھ دیئے گئے ہوں — لیکن ماحول
کی یہ صبر آزما گھاٹی بالآخر طے ہو گئی۔ خدا کے رسولؐ کو

جیسے ہی اس صورتِ حال کا پتہ چلا آپ غم و غصہ سے بیتاب ہو کر باہر نکلے اور یہ حقیقت افروز اعلان کیا:-

"ایک کافر کی وجہ سے ایک مومن کا دل نہ دکھاؤ۔ جاہلیت میں جو شخص معزز تھا اسلام میں بھی معزز ہے"۔

کس قدر عظیم الشان تھا وہ ایمان جس پر خدا کا رسولؐ برسرِ عام گواہی دینے کے لئے بیتابانہ باہر نکل آئے! طنزیہ جملے آناً فاناً بند ہو گئے۔ اب عکرمہؓ کو ابوجہل سے نہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت تھی۔ خدا سے تعلق تھا۔ خون کا رشتہ روحانی تعلق کے آگے ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا اور عکرمہؓ کی شکل میں اُبھرنے والی نئی نویلی مومنانہ زندگی اسلام کے اُفق پر ماہِ تمام کی سی جاذبیت کے ساتھ قلب و نظر کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔ لیکن اس "چاند" کے سینے میں اپنے ماضی کی تلخ یادوں کا سیاہ داغ اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ ضمیر کی ٹیس کا نشان تھا۔ یہ فطرتِ صالحہ کی اس تڑپ کا مظہر تھا کہ کس طرح کردار و عمل کی نئی روشنی سے حال و مستقبل کے ساتھ ساتھ ماضی کی سیاہیوں تک کو جگمگا دیا جائے۔

عکرمہؓ نے خدا کو کھو کر پایا تھا۔ خدا کا نام لیتے ہی اب نکا پورا ڈھانچہ جذبات کی شدت سے مرتعش ہو جاتا تھا۔ یہ نام ان کی دل کی دھڑکنوں میں عقیدت، پرستش اور خداکاری کی برقی رَو دوڑا دیتا اور اس نام پر مرمٹنے کے لئے ان کی روح نیم بسمل ہو کر رہ جاتی۔

لیکن فتح مکہ کے بعد کوئی بہت بڑا موقع ہاتھ نہ آسکا جہاں وہ آخری قربانی پیش کرنے کی حسرت نکال سکتے۔ شہادت کی جب کبھی کوئی راہ نظر آتی لوگوں نے عکرمہؓ کو پروانہ وار موت کی آرزو میں وجد کرتے ہوئے دیکھا لیکن یہ آرزو کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی۔ جس سر میں خود پرستی نہیں خدا پرستی کا مقدس جنوں تھا وہ سر ان کے لئے جسم پر بارِ دوش تھا۔ مگر سبکدوشی کی امید نظر آتی اور نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ میدانِ جنگ میں زخم کھا کر جب خون سے سرخ چہرہ آسمان کی طرف اُٹھتا اور شہادت کی تکمیل کے لئے دعا کو ہاتھ اُٹھ جاتے تو ایمان کے حسن و جلال کی یہ تصویر سیکڑوں دلوں کو رشک و عقیدت میں گم کر کے رکھ دیتی۔

عکرمہؓ اپنے دَورِ کفر پر خدا کے آگے اس طرح شرمسار اور اشکبار رہتے جیسے اس غم میں اپنی جان ہی دیدیں گے۔ زندگی کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جس سے انسان پیار کرتا ہو اور عکرمہؓ نے اس پیاری چیز کو تلافی مافات کے داؤ پر ہنسی خوشی نہ لگا دیا ہو ۔۔۔ راتوں کی میٹھی نیندیں۔ دولت کے سنہرے ڈھیر۔ خون کے گہرے تعلقات ۔۔۔ دن کی جد و جہد کے مواقع اور اپنی جان عزیز ۔۔۔ ہر شے آج ان کے لئے صرف اس لئے تھی کہ اس کو لٹا کر اپنے مولا کو راضی کر لے جائیں۔

راتوں کی خاموش تنہائی میں جب نرم و گداز بستر تھکن سے نڈھال بدن کے لئے پُر شوق بازو پھیلاتا، ستاروں کی کھلی آنکھیں ان کو جائے نماز پر جبیں سائی کرتے ہوئے دیکھتیں ۔۔۔ تلافی مافات کے جنوں میں گذشتہ گناہوں کے احساس کا داغ سینے سے ہٹ کر داغِ سجود میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ غفلت کے جو پردے کبھی بصیرت پر لٹکے ہوئے تھے انفعال و ندامت کی آندھیاں انھیں عدم کی لامحدود فضاؤں میں اُڑا لے جانے کیلئے بیتاب تھیں ۔۔۔ قرآن پاک ان کے بیقرار دل کا سہارا تھا جس کو وہ کبھی سینے سے لگاتے اور کبھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے آنکھوں سے لگا لیتے "کتابُ ربّی۔ کتابُ ربّی!" کی آواز ۔۔۔ گلوگیر آواز اس دَورِ جاہلیت کا ماتم کرنے لگتی، جب وہ اپنے رب کی اس مقدس کتاب کے قدر ناشناسوں میں تھے۔ درد بھری آواز اب اس کتاب کی تلاوت کرتے کرتے در و دیوار پر گریہ طاری کرتی محسوس ہوتی۔ اور ہر طرف ہُو کا عالم چھا جاتا۔

سر میں بندگی کا جو سودا سمایا تھا وہ کبھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی سجدہ گاہ پر تڑپتا تو کبھی فرطِ عقیدت سے تلواروں کی چھاؤں میں رقص کرتا نظر آتا ۔۔۔ جیسے اس سر کو تن سے جدا کئے بغیر وہ اپنے مالک کے روبرو پیش ہونے کیلئے تیار ہی نہ ہوں ۔۔۔ جیسے جان دیئے بغیر ان کی بیکل جان کو

سرا ہی نہ آسکے گا۔ آخر قسمت نے ان کو سرفروشی کے عظیم مواقع دیئے جن کے لئے نجانے کب سے وہ دامن شوق اور دستِ دعا پھیلائے ہوئے پہاڑ سی گھڑیاں کاٹ رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے بعد جب ارتداد کا خطرہ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ اسلام کی بنیادیں ہلانے کیلئے اُٹھا تو عکرمہؓ دوسری طرف سے دیوانہ وار اُٹھ کھڑے ہوئے اور شہادت کی سرمستیوں میں اپنے پورے جسم کو خوں چکاں زخموں سے چُور کر کے رکھدیا۔ ان کو بہی تو دُکھ تھا کہ ان کی زندگی اس وقت اسلام کے خلاف صف آرا رہی تھی جب وہ موت اور زندگی کے مرحلوں سے دوچار تھا۔ ٹھیک ایسا ہی موقعہ تلافیِ مافات کے لئے خدا نے ان کو دیا کہ جب ایک بار پھر اسلام مرگ و زیست کی کشاکش میں اُلجھا ہوا تھا تو بہی عکرمہؓ کی زندگی اسلام کے گیسو سنوارنے کے لئے زندگی کی راہ پر اپنا لہو ٹپکاتی چلی گئی۔ اس وقت کبھی کا یہ اسلام دشمن کافر آج کا بہت بڑا اسلام دوست اور اسلام کا سچا معتمد تھا۔ اسلام کی فوجیں اس کے اشاروں پر حرکت کرنے کیلئے اسکی کمان میں دیدی گئیں تھیں اور انھوں نے جس بے جگری سے اس اعتماد کا حق ادا خود کو ثابت کیا وہ قبیلۂ ازد، عمان کے قبائل اور بنی مہرہ کے علاقوں میں ارتداد کی بھرپور سرکوبی کی روشن تاریخ سے آج تک مینارۂ نور کی شکل میں وادیوں سے بیکراں فاصلوں سے جھلکتا نظر آرہا ہے۔ خاص طور پر یمن کے مرتدوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں ان کی سرفروشانہ شجاعت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ اسلام کی تاریخ کا ایک زریں باب کہلائے جاتے ہیں۔ یمن — جہاں ارتداد کی آندھی نے مسلم پولس ایکشن کی پہلی کوشش کو ناکام کر کے خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی وہاں جب تلافیِ مافات میں سر بکف پھرنے والا بندۂ مومن عکرمہؓ پہنچا تو جنگ کی بساط اُلٹ کر رکھدی اور خدا کی اطاعت سے سرتابی کرنے والوں کے مغرور سر گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالے۔

شام کی تاریخی فوج کشی میں وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے گھر سے نکلے تھے۔ امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ جب جنگی اجتماع کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو ایک خیمہ ایسا بھی دیکھا جس کے چاروں طرف عربی گھوڑوں کی تندرست قطاریں اور آلاتِ حرب کے انبار جمع تھے۔ امیر المومنین یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ مسلمانوں نے کس قدر جاں نثاری اور فداکاری سے اس خیمہ کو اسلام کے لئے آراستہ کیا ہے۔ مگر جب خیمہ کے اندر انھوں نے جھانک کر دیکھا تو اس کے اندر اس خیمہ کا اکیلا منصرم عکرمہؓ بندگی اور سرافگندگی کے جوش میں ادھر سے اُدھر ٹہلتا دکھائی دیا! — جیسے اس شخص کو نہ دولت کی فکر تھی نہ وقت اور زندگی کی پروا۔ جیسے اس کا سارا وجود آخرت کی دُھن کے عظیم محور پر دیوانہ وار گردش کئے جارہا تھا جیسے زندگی کا مسافر موت کی ٹرین کا منتظر ہو جو اس کو اس کے خدا تک پہنچا دے۔

"اے عکرمہؓ تم کو خدا سلامت رکھے!" امیر المومنینؓ نے خیمے میں مشتاقانہ داخل ہو کر کہا تو عکرمہؓ محویت سے چونک اٹھے۔ "اے عکرمہ! تم نے کتنا کچھ خرچ کر ڈالا ہے۔ بیت المال سے کچھ امداد تمہارے لئے بخوشی دیجائیگی"۔

"جی نہیں!" عکرمہؓ پر جیسے غیرتِ بندگی کا جنوں طاری ہو گیا ہو — "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں — مجھے اپنے خدا کی ضرورت ہے — للہ! مجھے کچھ نہ دیجئے — میں . . . میں تو یہ سب کچھ خرچ کرنے کے بعد صرف اپنے مولا کو پالینا چاہتا ہوں — ابھی . . . . ویسے بھی میرا حوصلہ نہیں نکلا۔ ابھی یہ دو ہزار دینار میرے ہاتھوں میں چنگاریوں کی طرح تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں"۔

اسلام کی دیوانہ وار لگن میں وہ کس بے جگری سے زخم پر زخم کھاتے تھے اور ان کو یوں گھائل ہو کر کتنا سکون ملتا تھا اسکا اندازہ دنیا کو اس وقت ہوا جب فحل کے معرکۂ کارزار میں وہ خون میں نہا نہا گئے مگر ان کے قدم کسی طرح نہ رکتے تھے زخم پر زخم کھا کر وہ ہر بار ایک اس سے بھی کاری زخم کی دُھن میں دشمن کی صفوں کے اندر گھستے چلے جاتے تھے۔ دیکھنے والوں سے دیکھا نہ گیا اور لوگوں نے بڑھ بڑھ کر منت سماجت کی کہ " اس طرح اپنی جان کے درپے نہ

نہ ہوجتے!" ــــ مگر عکرمہؓ اس ہمدردانہ مشورے پر اس طرح چراغ پا ہوگئے جیسے ان کی عزیز ترین آرزو کی توہین کردی گئی ہو ــ لہو میں نہایا ہوا گلنار و پُرنور چہرہ مڑا اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ نعرۂ مستانہ اپنے پیچھے گونجتا ہوا چھوڑ گیا:۔

"میں لات و عزیٰ کے لئے تو جان پر کھیلا کرتا تھا اور آج خدا اور رسول کے لئے جان بچا کر رکھوں! تُف ہے مجھ پر اگر ایسا خیال بھی آنے دوں ــــ قسم ہے خدائے واحد کی! عکرمہ اپنے خدا پر مر مٹنا چاہتا ہے"۔

کوئی نہیں جانتا کہ شہادت کا یہ پروانہ کس میدان فداکاری میں خاک و خون کی زینت بنا ــــ عکرمہؓ شہید ہوئے، مگر کہاں؟ ــ فحل کے میدان میں؟ ــــ یرموک کی وادی میں؟ ــــ کوئی یقین سے نہیں جانتا ــــ دنیا مگر اتنا جانتی ہے کہ خدا پر جان دینے کے دھنی نے آخر جان جاں آفریں پر لٹا ہی دی۔ رضی اللہ عنہ ــــ رضی اللہ عنہ! ــــ رضی اللہ عنہ!!

کیا یہ کوئی کہانی ہے یا تاریخ کا ٹھوس واقعہ؟۔ ۔کون ہے جو آج اسلام کی منکر اس دنیا کو یہ بات سمجھائے؟ نثر کروڑ مسلمان مل کر بھی اس جاں نثار صداقت ــــ اس سرفروش بندگی کا اظہار نہیں کرسکتے جس کی مثال ایک اکیلے عکرمہؓ نے اس طرح قائم کی کہ فانی انسان کا کردار نقشِ دوام بنکر رہ گیا ــ عکرمہؓ مسلمان ہی تو تھے ــــ انسان ہی تو تھے ــ فرشتہ نہیں! ــ کیا ہم بھی مسلمان ہیں؟ ــــ بولو ــــ کیا ہم بھی انسان ہیں؟ ـ

مسلسل

جب اسلام کارفرما تھا

از:- مولانا عبدالرؤف رحمانی

مختصر یہ کہ خلافت راشدہ کے دور میں تمام خلفاء راشدین نے اپنی سادہ زندگی اور ترک تعیش کو صرف اسلئے سامنے رکھا کہ ہم قوم کی امانت کے امین و محافظ ہیں اپنی ذات اور اپنے متعلقین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے اور عیش اڑانے کا جو رجحان حکومت کے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ عہدہ دار میں آج پیدا ہو چکا ہے اس سے تمام خلفاء راشدین کا دامن پاک ہے وہ ایسی پاکیزہ ہستیاں ہیں کہ ان کی مثال سے آج کی دنیا عاجز ہے۔

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے لکھا ہے کہ شاہ انگلستان کی تنخواہ ستر لاکھ پچاس ہزار روپیہ ماہوار ہے اور شہنشاہ جرمنی کی تنخواہ نوے لاکھ روپے ماہوار ہے جسے وہ جیب خرچ اور ذاتی ملازمین کی تنخواہ اور محلات کی آرائش پر خرچ کرتے ہیں (اسلامی جمہوریت ص۲۱) خلفاء اسلام اور امرائے دنیا کی زندگی کا فرق ملاحظہ کیجئے کہ سادہ زندگی کہاں ہے اور عیش و عشرت اور بربادئ رعایا کہاں؟

امریکہ کے صدر جمہوریہ کی تنخواہ دورہ کا بھتہ تار ڈاک ٹیلیفون وغیرہ کا خرچ عمارت کی حفاظت و آرائش وزینت کھیل کود اور خفیہ پولیس کا خرچ ذات واحد کے لئے لکھوکھا ڈالر سالانہ ہے صدر امریکہ کی سواری کے لئے دو سو موٹر ہر وقت حاضر رہتے ہیں ہوائی جہاز علیحدہ ہیں موٹر اور ہوائی جہاز چلانے والے ملازموں پر پچاس ہزار ڈالر سالانہ علیحدہ خرچ ہوتا ہے (الفرقان لکھنؤ ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد مبارک تک بیت المال سے شاہی سفراء یا دوسرے ممالک کے وزراء سلطنت کی آمد پر نہ کھانے پینے میں اسراف ہوتا اور نہ عوام کی دولت کو بے محابا چراغاں اور جشن شاہانہ وغیرہ میں خرچ کیا جاتا (طبقات ابن سعد جلد خامس ص۲۷۲)

اعلام حضرت عمرؓ یا دیگر خلفاء کرام اپنی زندگی کے تمام معاملات میں انتہائی سادگی رکھتے تھے تاکہ ان کے نفس کو معمولی کھانے پینے کی عادت پڑ جائے راہبانہ انداز میں تعذیب نفس ان کا مقصد ہرگز نہ تھا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے ارشاد نبوی ہے انّ لنفسك عليك حقًا کہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے آنحضرت نے خود بھی میسر آجانے پر حلوہ، شہد، گوشت وغیرہ کا استعمال فرمایا ہے البتہ فی الجملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء کرام کی زندگی اسباب عیش و عشرت کی متلاشی نہ تھی بلکہ سادگی اور قناعت کا نمونہ تھی (الاعتصام جلد ثانی ص۸)

حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں رعایا کی بربادی شاہانہ عیش و عشرت و تبذیر کے سبب ہو رہی ہے چند بادشاہ ایک دوسرے پر حسد کرتے ہیں کہ کس کے پاس سامان عشرت زیادہ ہے کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے کس کے تاج شاہی میں زیادہ جواہر ٹکے ہیں اس طرح ارباب حکومت کی عیش پسندی نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا ہے امیرانہ تکلفات و شاہانہ لوازمات عیش کی کوئی حد نہیں رہی ہے

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ شاہی زمانہ تو گیا اب تو جمہوریت کا عہد ہے عاجا
کوئی نہیں اہل ملک کی اپنی حکومت ہے۔

لیکن سوائے اندھوں کے کون نہیں دیکھتا کہ صرف ناموں، اصطلاحوں اور قالبوں کی تبدیلی سے اصل حقائق نہیں بدلے بلکہ بیکرداری مفاد پرستی، لذت پسندی اور بد اخلاقی کا آج تو وہ دور ہے کہ پچھلے کتنے ہی بادشاہ آج کے صرف وزراء کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے، اسراف و تبذیر، مکر و فن، خود غرضی خویش پروری، حرام خوری، عیاشی سبھی کچھ آج پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہے بس فرق یہ ہے کہ آج کے فنکاروں نے الفاظ کی بازی گری میں کمال حاصل کر لیا ہے ہر برائی کو اچھے اچھے نام دیدیئے ہیں۔ ناچ گانے، عریانی، فحاشی ثقافت اور آرٹ بن گئے ہیں۔ شراب خوری جزو تہذیب ہوگئی۔ مرد و زن کا اختلاط شائستگی کی دلیل بنا۔ فاحشائیں سوسائٹی گرل کہلائیں شہوانی رجحانات کو عشق اور رومان کا نام ملا۔ حق پرستی کی جگہ قوم پرستی نے لے لی۔ برائیاں وجہ فخر بن گئیں اچھائیاں حماقت اور رجعت پسندی کہلائیں، پہلے برے بادشاہوں کے اثرات محدود رہتے تھے اب برے افسروں کے اثرات لامحدود ہیں۔ عوامی اخلاق پر اتنا ہمہ گیر زوال کبھی نہیں آسکتا تھا اگر حکمراں گروہ اور کلیدی مناصب والے افسران بے کرداری و بے ضمیری میں تمام سابقہ ریکارڈ نہ توڑ جاتے، و نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

خلفاء اسلام کی سادگی و قناعت

خلفائے راشدین کا ذکر تو آپ نے سنا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ بعد کے خلفاء و ملوک میں قابل رشک خصوصیتوں کا کال ہو۔ نہیں بعد میں بھی کتنے ہی ایسے خدا ترس اور صاحب کردار سلاطین پیدا ہوتے رہے ہیں کہ جن کی سادگی و قناعت کو واقعات آج کل کے مسلم حکمرانوں کے لئے مستقل درس عبرت و بصیرت ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں خلیفہ مقتفی باللہ کا زیادہ وقت ایام شاہزادگی میں دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔ دینی علوم پر کتابیں لکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا مگر جب خلیفہ منتخب ہوا تب بھی اسکے زہد و عبادت و تقویٰ و طہارت کی خصوصیتوں میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی ساتھ ہی عدل و انصاف کے چمن میں ایک تازہ بہار آئی اور طرح طرح کی نیکیوں کے دروازے کھل گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے زمانہ میں بغداد اور عراق خلیفہ کے قبضۂ اقتدار میں واپس ہوئے ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ خلیفہ کا صرف نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی جنھوں نے جبراً خلیفہ کو اپنا تابع فرمان بنالیا تھا۔

مقتفی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف، مستنجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ حافظ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے مستنجد عدل و انصاف اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا سارے عراق سے ناجائز محصولوں کو اس نے اٹھا دیا تھا اور ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستنجد کے متعلق یہ ہے کہ۔
کان احسن الخلفاء سیرۃ مع الرعیۃ (ص ۱۲۵ ج ۱۱) عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک کرنے میں مستنجد بہت اچھا خلیفہ تھا۔

مستنجد کے بعد اس کا بیٹا حسن المستضئ باللہ کے نام سے سریر آرائے خلافت ہوا۔ علامہ ابن الجوزی نے مستضئ کو بہت قریب سے دیکھا تھا کیونکہ وہ ابن الجوزی کی مجلس وعظ میں اکثر شریک بھی ہوتا تھا۔ علامہ ابن الجوزی منتظم میں اپنی چشم دید گواہی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

اظہر من العدل والکرم مالم نرہ فی اعمارنا عدل وکرم کا مظاہرہ المستضئ نے ایسے بہترین طریقہ پر کیا کہ ہم لوگوں نے ساری زندگی اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

ایک دین پسند خلیفہ سلطان نور الدین زنگی کے نام سے نظر آتا ہے طویل عریض زرخیز علاقے اس کے زیر نگیں ہیں۔ حرمین اور یمن تک اس کا نام خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا رہا۔ لیکن زندگی گذارنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنکو خلیفہ نور الدین زنگی نے مال غنیمت کے حصہ سے خرید ا تھا) ان ہی تین دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی خلیفہ نے ملکہ کے لئے مختص کردی تھی سالانہ کل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے (ابن اثیر)

ملکہ نے نور الدین سے تنگی کی شکایت کرتے ہوئے
اس مشاہرہ میں اضافہ چاہا تو سلطان نور الدین نے

کہا: میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے میرے
قبضہ میں حکومت کی جو کچھ آمدنی ہے تو میں اس کا
صرف خزانچی ہوں۔ میں اس میں خیانت کرکے جہنم
کی آگ میں تمہارے لئے گھس نہیں سکتا۔

اسی طرح نورالدین زنگی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمراں تھا۔ محل ۱۹ سال کی عمر میں اس بیچارے کی قولنج کے مرض میں وفات ہوئی۔ جب یہ قولنج میں مبتلا ہوا تو اطباء نے یہ تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجئے مرض کا ازالہ ہوجائیگا۔ اطباء اصرار کررہے تھے تو جوان شاہزادہ نے کہا۔ لا افعل حتی اسئل الفقهاء من فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا۔ یہ نہ کروں گا۔ فقہاء بلائے گئے شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا۔ اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا آپ لوگ کیا کہتے ہیں۔

صاحب بدائع علامہ ابوبکر کاشانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حال میں آپ ہیں شرعاً شراب کا استعمال آپ کے لئے جائز ہے مگر اس پوچھ گچھ کے بعد اس نوجوان شہزادے نے پوچھا کہ میری موت کی اگر مقررہ مدت آچکی ہے تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی۔ اس کا جواب جو ہو سکتا ہے وہی دیا گیا۔ یعنی قرآن جس چیز کو موجل قرار دے چکا ہے اس میں گھڑی بھر کے لئے بھی تقدیم وتاخیر نہیں ہو سکتی۔ بھلا دوا اور علاج سے اس کو کون ٹال سکتا ہے۔ شاہزادے نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

تو اے لوگو سن لو کہ ایک ایسی چیز جسے اللہ نے
حرام قرار دیا ہے اسے استعمال کرکے خدا کی قسم
میں اللہ سے ملاقات نہیں کروں گا۔ (صاحب شذور
الذھب)

کہتے ہیں۔ مات ولم یشربه رحمة الله تعالیٰ (شذرات الذہب جلد رابع ص۲۵۰) شاہزادہ اسماعیل مرگیا لیکن اس نے بہرحال شراب نہیں استعمال کی۔ خدا کی رحمت اس پر نازل ہو۔

سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صلیبی جنگوں کی قیادت ایک دین پسند سلطان صلاح الدین ایوبی کے حصے میں آئی۔ ان کی مجاہدانہ زندگی سے تو پوری اسلامی دنیا بلکہ مغربی دنیا بھی واقف ہے ایک بڑی عظیم الشان سلطنت پر حکومت کے باوجود اس سلطان کی قناعت و درویشی کا یہ حال تھا کہ وفات کے بعد اس کے ذاتی خزانے کا جب جائزہ لیا گیا تو۔ ما اخرج غیر دینار صوری اربعین درهما ناصریه۔ ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درہم کے سوا اور کچھ نہ نکلا (ابن اثیر ج۱۲ ص۴۲)

ابن اثیر نے تو صرف دینار و درہم کے متعلق لکھا ہے مورخ ابوالفدا جو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ لم یخلف عقارا ولا دارا۔ سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی نہ کوئی ذاتی مکان چھوڑا۔

بیشتر سلاطین اسلام کی دیانت وامانت اور سادگی و قناعت کے واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ آمریت اور عیاشی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ بیت المال اور عوام کی دولت کے وہ ایک سچے امین اور ایک بہترین خزانچی اور رعایا کے اعلیٰ درجہ کے مربی و سرپرست تھے وہ پورے ملک کے آرام کو اپنا آرام اور رعایا کی تکلیف عسرت کو اپنی ذاتی تکلیف و عسرت سمجھتے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ وجزاھم اللہ خیرا۔

تجلی کی ڈاک

بقیہ از صفحہ ۲۱

دملی سے کلینڈر اُتار پھینکنا کہ نمازی سجدہ میں تاریخیں دیکھنے نہیں آتے بھپسپھسی بات ہے۔

الحاصل یہ کہ مساجد میں گنبد خضراء کی تصویر والے کلینڈر لٹکانا مزاج و مذاق کے اعتبار سے تو خود ہمیں بھی پسند نہیں لیکن شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں اور انھیں اتار پھینکنا ایسا تشدد ہے جو اضرار کی معصیت میں داخل ہو سکتا ہے۔ رہے احادیث کے کتبے تو ان سے ہمارا مزاج و مذاق بھی اباء نہیں کرتا اور انھیں اُتار پھینکنا تو ہمارے خیال میں ذہن و قلب کے مریض ہونے کی علامت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔

مستقل عنوان　　طنز و مزاح

مسجد سے میخانے تک

ملا ابن العرب مکی

ظاہر ہے آپ اس بار یہ سننے کے مشتاق ہونگے کہ صوفی بدرالدجیٰ کے احسان کا بدلہ ملا نے کیسے چکایا۔ عاجز بھی آپ کے اشتیاق کا لحاظ کر کے یہ داستان سنانے پر ہمہ تن تیار تھا کہ چیف صاحب کا آرڈر ملا:-

"یہ مہینہ عید الضحیٰ کا ہے لہٰذا قربانی کا موضوع نظرانداز نہیں ہونا چاہیئے"۔

حکم حاکم مرگ مفاجات۔ لیجئے ایک اور داستان سپرد قلم کرتا ہوں جس میں ہر آئینہ قربانی کا بھی تذکرہ ہے اور آپ سب حضرات کے لئے ایسی ذہنی رہنمائی بھی ہے جیسی مار دھاڑ سے بھرپور جاسوسی ناولوں اور فلموں میں اولوا الابصار کے لئے ہوتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مدرسۂ "بیت العلم" کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اس میں بڑا بڑا فنکار پڑا ہے۔ فدوی اگر آپ کے سامنے اپنی یادداشت کا وہ البم کھول دے جس میں ان فنکاروں کے بے پناہ آرٹ کے رنگارنگ نمونے محفوظ ہیں تو یقین کیجئے آپ عش عش کرتے کرتے پاگل ہو جائیں گے۔ آپ ہی نصیب اعداء پاگل ہو گئے تو تجلی پڑھنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے۔ لہٰذا فقط حکم حاکم کی تعمیل میں ایک آدھ نمونہ پیش خدمت ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ایک روز عاجز بیٹھک کے تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا بین الاقوامی مسائل پر فکرِ شدید کر رہا تھا اور قصد کچھ ایسا پیدا ہو چلا تھا کہ ایٹمی تجربات کے خلاف ایک زوردار اپیل شائع کر کے اپنا نام روشن کیا جائے۔ اتنے میں مرزا فیاض علی تشریف لائے۔ یہ میرے ہمسائے ہیں اور گاہے گاہے ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسے محکمے میں ملازم ہیں جہاں بالائی آمدنی کے زرّیں مواقع کی فراوانی ہے، لیکن ان پر کسی وہابی نے ایسا جادو کا ڈنڈا پھیر دیا ہے کہ دستِ غیب کو رشوت کہتے ہیں اور تنخواہ کے سوا ایک پیسہ کمانا حرام قرار دے رکھا ہے۔ دوست احباب نے لاکھ سمجھایا کہ میاں حلال حرام کو معاشی معاملات میں گھسیٹ کر لانا غیر سائنٹفک نقطۂ نظر ہے۔ مذہبی احکام اپنی جگہ۔ پیٹ کا معاملہ اپنی جگہ۔ بال بچوں کے لئے کچھ پس انداز نہ کیا تو دین و دنیا دونوں میں روسیاہ ہوگے مگر ان کی وہابیت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ محکمے والے الگ بیزار ہیں۔ ایسے وہابی قسم کے ماتحت جس آفیسر کے پلے پڑ جائیں وہ بھلا خوش کیسے رہ سکتا ہے۔ کلرک بھنّا بھنّا کے کہا کرتے ہیں کہ مرزا فیاض علی تم تو بیسویں صدی میں غلط پیدا ہو گئے جاؤ کسی مزار پر یا کسی پہاڑ کی گپھا میں دھونی رماؤ۔ تم نے تو مفت کام کر کر کے ہماری دودھ دینے والی گاؤں ہی کو مرکھنا کر دیا۔

اس وقت ان کا چہرہ کچھ اترا ہوا سا تھا۔

"کیا بات ہے ڈیر مرزا۔ اداس کیوں ہو؟" میں نے علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

"کیا بتاؤں یار بڑی مصیبت میں ہوں۔ آپ ایک بات تو بتائیے"۔

"پوچھئے"

"کیا مدرسہ بیت العلم میں بھی کچھ رشوت وغیرہ چلتی ہے؟"

میں چونکا — "کیوں کیا بات ہے؟"

"بڑی آفت ہے یار - آپ جانتے ہی ہیں میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ہے - تین بچے ہیں - ایک بہن ہے - اللہ کا شکر ہے عزت سے دو روٹی تو مل جاتی ہیں مگر بچتا بچاتا کچھ نہیں جتنا مدت سے سینے کی مشین کی سخت احتیاج محسوس کر رہا ہوں مگر کہاں سے خریدوں - قسطوں پر لینے میں سود دینا پڑتا ہے - آپ یہ بتائیں کہ یہ جو مدرسے کے منشی عین الحق ہیں ان کی کیا تنخواہ ہے؟"

"ڈیڑھ سو روپے - کیوں انھی کی یاد آپ کو خصوصیت سے کیوں آئی؟"

"جناب انھی کے یہاں کل میری گھروالی گئی تھی بس پھر وہاں سے دماغ ہی خراب کر کے لائی ہے۔"

"ذرا وضاحت فرمائیں۔"

"اجی کیا وضاحت - وہاں سے لوٹی تو بس منہ چڑھا ہوا تھا - کہنے لگی کہ آخر منشی عین الحق کی تنخواہ بھی تو ڈیڑھ ہی سو روپے ہے - ان کے یہاں تو ریڈیو بھی ہے - دو تین بجلی کے پنکھے بھی ہیں - ایک سے ایک چائے کا سیٹ بھی ہے - چینی کا وہ وہ برتن ہے کہ کیا کسی لاٹ صاحب کے ہوگا - پانچ بچے ہیں اور ہر ایک سوتے وقت پیالہ بھر دودھ چڑھا کے پڑتا ہے منشیائن سونے میں پیلی ہیں - بڑی لڑکی کا جہیز ایسا تیار کر رہی ہیں کہ ہائے اللہ - تو آخر تمھاری ہی تنخواہ میں کیا بے برکتی ہے کہ گھر میں کسی پاس ڈھنگ کے چار کپڑے بھی نہیں - زیور ٹوٹا پڑا ہے اسی میں ۵ ماشے کا ٹانکا نہیں لگ سکتا - ریڈیو تو کیا ہوتا توے کا باجا تک نہیں - ہاتھ ٹوٹ گئے ٹکے ٹکے کے پنکھے ہلاتے ــــ غرض صاحب وہ میرا دماغ چاٹ گئی ہے - میں نے سمجھایا کہ بھاگوان دس روپے اپنے لئے رکھ کر باقی تنخواہ تو تمھیں ہی دیدیتا ہوں ریڈیو کیا تم ٹیلی ویژن خرید لو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا - کہو تو وہ دس بھی نہ لیا کروں - اس پر وہ اور بھی بھنا گئی - کیا بتاؤں یار کتنی مشکل سے پیچھا چھڑایا ہے - یہ عورتیں خدا کی پناہ میں تو سچ کہتا ہوں اس کی چوٹی پکڑ کے نکال دیتا مگر . . ."

"مگر کیا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا:-

"شاید مولانا اشرف علی کی کسی کتاب میں حضرت محمدؐ کا یہ قول پڑھا تھا کہ بیوی کو دن میں ستر دفعہ معاف کرو۔"

میرے نابکار قلب میں اس انگریزی داں وہابی کیلئے دفعتاً رشک و حسد کا شعلہ اٹھا - ایک طرف تو یہ شخص اتنا بھی نہیں جانتا کہ ایسے موقعہ پر پڑھے لکھے مسلمان "حضرت محمدؐ" نہیں "رسول اللہؐ" بولتے ہیں اور حضورؐ کے ارشادات کو "قول" نہیں "ارشادِ مبارک" کہا جاتا ہے لیکن دوسری طرف اس کا یہ حال ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات کو کردار و عمل کا بھی جزو بنانے پر تُلا بیٹھا ہے۔

"ہاں بھئی یہ نصیحت تو اللہ کے رسولؐ نے ضرور کی ہے مگر وہ منشی عین الحق . . . . ."

"جی ہاں - میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ منشی عین الحق کے ڈیڑھ سو آخر کس ٹکسال میں ڈھلے ہوئے ہیں؟"

میں ہنسا — "آپ غالباً مدرسے کے دیگر ارباب فن سے واقف نہیں ورنہ اکیلے منشی عین الحق کے بارے میں فکر مند نہ ہوتے۔"

"جی نہیں مجھے تو زیادہ واقفیت نہیں ہے - میں ٹھیرا گناہگار دنیا دار - ان حضرات کی صحبت کے قابل کہاں۔"

"خواجہ تعمیر الدین مدرسے کے محکمۂ تعمیرات کے انچارج ہیں" — میں نے عرض کیا - "ان کی تنخواہ بھی دو سو سے کم ہی ہے لیکن آپ ان کے اندرونی حالات دیکھیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کی تنخواہ کا ہر روپیہ بسبب برکت اپنی کے ایک ڈالر سے کم فائدہ نہیں دیتا - اسی طرح منشی ظہور الدین کی تنخواہ تین چار سو نہیں ہے مگر اہل و عیال پر تقریباً پانچ ہزار روپے سالانہ خرچ کرنے کے بعد بھی وہ اتنا پس انداز کر لیتے ہیں کہ چیف آف اسٹاف کی جو دو تین دعوتیں ہر سال انھیں کرنی ہیں ان پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جا سکے۔"

مرزا صاحب کا فرطِ استعجاب سے کھلا ہوا منہ دائرے کی شکل اختیار کر گیا تھا - شکایت کے لہجے میں ٹھنکے — "بھئی آپ تو ہر معاملے میں مذاق کرتے ہیں ملا صاحب - یہ تو مذاق کی کوئی مناسب قسم نہیں ہے کہ خاصانِ خدا کے بارے میں افتراء کیا جائے۔"

"خاصانِ خدا" میں قہقہہ ضبط نہ کر سکا۔ "مرزا صاحب
آپ بھی کتنے معصوم ہیں۔ خود وہابی کیا ہوئے ساری ہی دنیا کو
وہابی تصور کئے بیٹھے ہیں۔ اچھا بتایئے منشی عین الحق کے ٹھاٹ
باٹ کی آپ کیا توجیہہ کریں گے۔ ان کے باپ تو کئی ہزار کے
مقروض مرے تھے۔ زمین جائداد بھی سب زندگی ہی میں بیچ
کھوچ کے برابر کردی تھی۔ پھر یہ چاندنی آخر کیا امریکہ کے
مصنوعی چاند کی ہے؟"

"یہی مجھے بھی حیرت ہے" وہ بولے "مگر یہ کیسے باور
کرلوں کہ اتنے زبردست مدرسے میں خدانخواستہ کوئی حرامخور
بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہ کیجئے۔ اب میں جناب کی معصومیت پر عش عش کرنے
کے لئے کرائے کے آدمی تو لانے سے رہا۔ آخر کیا آپ کا خیال یہ
ہے کہ مدرسہ بیت العلم کرۂ مریخ میں واقع ہے؟"

"جی نہیں... کیا مطلب؟"

"ارسطو کا قول ہے۔" زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"
آپ جیسے پرہیزگار تو استثنیات میں سے ہیں۔ کچھ زمانہ اور
گذرنے دیجئے پھر انشاء اللہ آپ جیسے فرشتے عجائب خانے میں
سجائے جایا کریں گے۔"

"آپ کی بات پھر بھی مبہم رہی۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے
ہیں کہ خدانخواستہ خاکم بدہن مدرسہ بیت العلم کے حدود میں بھی
غیر جائز امور کا گذر ہو سکتا ہے۔"

"ڈیئر فیاض۔ یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسے آپ
یوں پوچھیں کہ کیا عرب کے حدود میں بھی کوئی شخص ریڈیو پر گانے
سن سکتا ہے۔ ٹانگیں پسار کے سو رہو مائی فرینڈ۔ اگر فردوسی نے
اسرارِ درونِ پردہ کی نقاب کشائی شروع کردی تو جناب پر
ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں بھئی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اچھا آخر منشی عین الحق
کوئی بڑے آفیسر تو ہیں نہیں۔ بہت ہوا تو ان کا عہدہ ہیڈ کلرک
جیسا ہوگا۔ بچارے غریب طالب علم تو رشوتیں دینے سے رہے..."

"یہ بھی آپ کی خوش فہمی ہے۔ سائنسداں کوئلے سے مکھن
نکال سکتے ہیں تو کیا شرعی سائنس کے ماہرین آپ کی نظر میں
کچّی گولیاں کھیلے ہوئے ہیں۔ آپ اگر اپنی کیچلی سے نکل کر سرکاری
دفتروں کے چکر لگائیں تو ایسے ایسے ماہرین آپ کو نظر آئیں گے
جو بدن سے لنگوٹی تک اتروا لیتے ہیں اور لنگوٹی والا اس خیال
سے لنگوٹی نذر کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر لنگوٹی نہ دی تو وہ پاجامہ
بھی واپس ملنے کی کوئی توقع نہیں جو زبردستی اس سے چھین لیا
گیا ہے۔ ہاں یہ بے شک درست ہے کہ غریب طلباء کی جیب
ریڈیو اور بجلی کے پنکھوں والے معیارِ زندگی کا پیٹ نہیں بھر سکتی
اس سے تو بس اتنا ہی جھٹکا جا سکتا ہے کہ کھانے کے بعد فرنی اور
پھل مہیا ہو سکیں۔"

"آپ ملّا صاحب بات کو ہمیشہ لمبا کر دیتے ہیں۔ اوروں
کو چھوڑ کر مجھے صرف منشی عین الحق کی حقیقت سے آگاہ فرمایئے۔"

"حقیقت کو کیا پوچھتے ہیں۔ حقیقت تو بس اتنی ہی ہے۔
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے"

"اب آپ شاعری میں گھس گئے۔" وہ الجھ کر بولے۔
"آخر کچھ بتا تو چلے کہ منشی عین الحق جیسے فرشتہ صورت ایک
زبردست دینی درسگاہ میں مکر و فریب کا کونسا کھیل کھیل
سکتے ہیں؟"

مجبوراً میں نے پوری تفصیل کے ساتھ مرزا صاحب پر
اپنی ان بے شمار معلومات کا ایک حصہ منکشف کیا جن کا تعلق منشی
عین الحق کی ذات سے تھا۔ میری معلومات کا بڑا ذریعہ وہ
منشی خیر الدین ہیں جن کی "ہابی" ہی یہ ہے کہ لوگوں کے پوست کندہ
حالات کا سراغ لگائیں اور ہر فنکار کی جزئیاتِ فن کو ڈھونڈ
ڈھونڈ کر حافظے کی سیف میں محفوظ کرتے رہیں۔ وہ مدرسے ہی
میں ملازم ہیں اور میرے پرانے کرم فرماؤں میں ہیں۔ ان کی خوبی
یہ ہے کہ بڑی جلدی ہر شخص کے یار بن جاتے ہیں اور جہاں
یارانے کا موقعہ نہ ہو وہاں مرید اور مصاحب بننے میں بھی دریغ
نہیں کرتے۔ باخبر ہر ایک کی کمزوریوں سے ہیں مگر نقصان کسی کو
نہیں پہنچاتے۔ ان کا قول ہے کہ بھئی قوم کا مال ہے بھر لینے دو جس
سے جتنا پیٹ بھرا جائے۔

میں نے ایک دفعہ ان سے کہا تھا کہ منشی جی! آپ آخر
حرام خوروں کو پکڑوا کیوں نہیں دیتے۔ مہتمم سے شکایت کیجئے۔

مجلس شوریٰ میں رکھئے۔ یہ تو بڑا اندھیر ہو رہا ہے۔"
وہ تنک کر بولے تھے" تم ہو مُلّا بچے۔ میں پاگل نہیں ہوں
کہ اپنی روزی پر لات ماروں اور بال بچوں کی فاقہ کشی کا خطرہ
مول لوں۔"
"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے تعجب سے کہا تھا۔
"اب تک کا ریکارڈ یہ ہے کہ جس کسی نے چور پکڑوانے کی
کوشش کی ہے خود اسی کو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں اور چور صاحب کو
ترقی مل گئی ہے۔"
"باپ رے" میں ہکلایا تھا۔ "یہ آخر کیا منطق ہے۔"
"منطق یہ ہے باؤلے ملّا کہ الف بھی مجرم اور ب بھی مجرم۔
دلی راولی می شناسد۔ الف کے الزام کی تحقیق ب کے سپرد ہوئی
تو الف آنکھ مار کے کہے گا کہ بے صاحب! آپ بھی بال بچوں
والے ہیں ذرا آگا پیچھا دیکھ کر کام کیجئے گا۔ قصہ ختم ہوا۔ ب کو کیا
پڑی ہے کہ الف کے جرم کی تصدیق کر کے خود کو خطرے میں ڈالے۔
نتیجہ یہ ہوگا کہ الزام دینے والے صاحب حدِ قذف کے مستوجب
ٹھہریں گے اور ان کا گریبان پکڑ کے پوچھا جائے گا کہ کیوں جناب
یہ الزام تراشی چہ معنی دارد!"
"کمال ہے منشی جی۔ کیا اوپر والے بھی جرائم پیشہ ہیں؟"
"جرائم کی قسمیں ہوتی ہیں برخوردار! فرض کرو الف
چوری کرتا ہے تو ب اور ت اسے کیوں پکڑیں جب کہ گھر بیٹھے انھیں
چوری کے مال کا ایک حصہ نقدا نقد پہنچ جاتا ہے۔ ہلدی لگے نہ
پھٹکری رنگ آئے چوکھا۔ نقد کے علاوہ بعض لوگ "خوشامد" کی
رشوت پسند کرتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جنھیں گاہے گاہے شاندار
دعوتیں چاہئیں۔ وہ چوری کے مال سے حصہ نہیں لیتے مگر آنکھیں
بند کئے رکھنے کی شرط یہ طے ہے کہ کبھی کبھی دعوتیں کھلاتے رہو۔
بعض اس پر قانع ہیں کہ ہمارے مرید ہو جاؤ پھر کوئی مائی کالال تمہاری
طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

●

خیر تو منشی خیرالدین کے ذریعہ منشی عین الحق کی جن عظیم فنکاریوں
کا حال بندے تک پہنچا ان میں سے کچھ کی اطلاع ازراہِ خیر خواہی
ناظرین تجلّی کو بھی دی جاتی ہے۔

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

کافی دنوں کی بات ہے کہ مولوی اطعام الدین — بروزن
اکرام الدین — گھر سے نکل رہے تھے کہ منشی عین الحق نے بڑی
محبت سے ملاقات کی۔ مولوی اطعام الدین بیت العلم کے طعام
خانے کے منصرم ہیں۔ سیکڑوں طلباء کا دونوں وقت کا کھانا انھی
کے زیرِ انتظام تیار ہوتا ہے۔ بچارے نیک آدمی ہیں۔ اُن دنوں
فکر مند تھے کہ معمولی تنخواہ میں گھر کا خرچ کیسے چلے۔ منشی عین الحق
نے بڑے خلوص و محبت کا اظہار کرنے کے بعد کہا:۔
"آپ بے کار فکر مند ہوتے ہیں، لیجئے میں حل پیش کرتا ہوں۔"
"عنایت ہوگی۔ میں واقعی بہت پریشان ہوں۔"
"سب سے پہلے تو آپ یہ طے کرلیں کہ مطبخ کا تمام سامان کوڑی
مل کی دکان سے لیا کریں گے وہ اپنا ہی آدمی ہے جتنے کا بجٹ
آپ چاہیں گے اتنے ہی کا دیدیا کرے گا۔"
بچارے اطعام الدین سیدھے آدمی تھے یہ سُنکر کہ اس طرح
چونکے جیسے کوئی بالکل انوکھی بات کان میں پڑی ہو۔ طبیعت کچھ
کھٹی پھر کہنے لگے:۔
"ہے تو بڑی عجیب ترکیب مگر۔۔۔ یہ شائد جائز تو
نہ ہوگی۔"
"جائز ناجائز کو ہم پر چھوڑئیے۔ یہ تو کمیشن کا معاملہ ہے۔
اس طرح سوچئے کہ مثلاً مرچیں وہ بجٹ میں دو روپے سیر لکھتا ہے
تو آخر تھوک خریدار ہونے کی حیثیت میں آپ کو بھی تو حق ہے کہ
اس سے کمیشن لیں۔ وہ پونے دو روپے کے حساب سے رقم لینے پر
بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے تو یہ فی سیر چار آنے آپ کا کمیشن ہوا۔
ہمیں ایک آنہ دیدیجئے کیونکہ اسے ہم نے ہموار کیا ہے تین آنے
آپ رکھئے۔ ذرا میزان لگا کر دیکھئے کہ اس طرح مہینے بھر کے
سودوں میں کتنی یافت ہوتی ہے۔"
یہ علم دریاؤ پہلے تو مولوی اطعام الدین کے گلے میں ذرا
اٹکا مگر پھر سانس روک کر نگل ہی گئے۔ در اصل ان دنوں انکی لڑکی
کی شادی بھی سامنے تھی۔ جہیز نامکمل پڑا تھا۔ انھیں یقین ہوگیا
کہ یہ اچانک اچھی خاصی آمدنی کی راہ کھل جانا من جانب اللہ

سفرنامہ ابن بطوطہ

مکمل — مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے عربی سفرنامے کا شگفتہ ترجمہ۔ جناب رئیس احمد جعفری کے قلم سے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ کی چند خصوصیات

(۱) دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو (۲) مشرق اور ایشیاء کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس من چلے سیاح کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ (۳) سرزمین مغرب کے بعض مقامات کی بھی ابن بطوطہ نے سیاحت کی (۴) اور اپنے تأثرات و مشاہداتِ سفر پوری سچائی، بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلم بند کر دیئے۔

قیمت مجلّد پندرہ روپے

حافظ ابو محمد امام الدین کی مفید تصنیفات

ان کے مطالعہ سے روح ایمان تازہ ہوتی ہے

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم .... ڈیڑھ روپیہ

حضرت خدیجہؓ .... ایک روپیہ

حضرت فاطمہ زہرہؓ .... بارہ آنے

خاصانِ خدا کی نماز .... بارہ آنے

نماز کے فضائل .... پندرہ آنے

خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت .... ایک روپیہ

ان چھ کتابوں کی یکجائی قیمت .... ساڑھے پانچ روپے

تذکرہ مجدد الف ثانی

حضرت مجددؒ نے کن حالات میں کس حیرتناک پامردی سے کس نوع کا کارنامۂ تجدید انجام دیا۔ اس بارے میں نہایت مفصّل اور بلند پایہ کتاب۔ بہت دلچسپ اور دل نشین۔

قیمت مجلّد چار روپے

فارابی

تالیف :- عباس محمود (مصری)
ترجمہ :- رئیس احمد جعفری۔

معلّم ثانی حکیم ابو نصر فارابی کے فضل و کمال، شخصیت، حالات و سوانح، علمی مقام اور تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل اور مستند حالات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر

منکرینِ حدیث کے ر... میں ایک مبسوط و... اور دلچسپ کتاب۔ ان کے ہر ہر اشتباہ کا جواب ان کے انکا... کی پوست کندہ حقیقت اور ان کے موقف کی لغویت کا اظہار... پُر لطف اور دل نشین نقد۔ مکمل سہ حصہ ساڑھے تیرہ روپے۔

اسلامی معاشیات

از:- مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک ج... فن کا اضافہ۔ اسلام کے معاشی نظام کا ایک تحقیقی مرقع۔ ہوئے ز... کے مسلمانوں کے قلوب کی پکار کا بروقت جواب۔ مولانا گیلانیؒ مجتہدانہ کارنامہ۔ قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں۔

قیمت مجلّد بارہ روپے۔

فقہ الاسلام

اسلامی اصول و قوانین پر ایک عظیم عربی تصنیف جس کا سلیس اردو ترجمہ نہایت سلیقے سے چھا... گیا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک معلوماتِ مفیدہ سے لبریز ہے۔ مجلّد بارہ روپے۔

تفسیر سورۂ والتین

از:- مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہدیہ چھ آنے

اردو فارسی ڈکشنری

اردو سے فارسی بنانے کے ل... ایک مختصر لیکن اہم مفید ڈکشن...

قیمت بارہ آنے

دعوتِ حق

شعری زبان میں اس تاریخی حقیقت کی سرگذشت کہ "دعوتِ حق" آغازِ عالم سے آج تک کن کو... مراحل و منازل سے ہو کر گذری۔ قیمت چار روپے۔

ضبط ولادت

وقت کے اس اہم مسئلے پر مولانا مفتی محمد شفیع... کے مدلل فرمودات۔ پروفیسر خورشید احمد... فکر انگیز اور دستاویزی مقدمے کے ساتھ۔ مجلّد ڈیڑھ روپیہ۔

باندیوں کا مسئلہ

باندیوں سے متعلق ایک کتاب پر مفصل تنقید جس سے اس موضوع کے متعدد گو... اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ۔

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں بھی تو کہا گیا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ایسے ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جن کا تصور تک نہیں ہو سکتا مجھے ہی کہاں تصور تھا کہ منشی عین الحق فرشتۂ رحمت بنکر آئیں گے اور ایسی زریں راہ دکھلائیں گے۔ واقعی کمیشن لینا تو ناجائز نہیں ہے

مولوی اطعام کو آمادہ پاکر منشی صاحب نے فرمایا:۔

"یہ تو جزوی ترکیب تھی۔ اب اصلی تجویز سُنیئے۔ یہ بھوندو قصائی ہے نا جس کا گوشت مدرسہ خریدتا ہے اسے چھوڑ کر ناٹا قصائی سے معاملہ کرنا ہوگا۔"

"لیکن بھوندو قصائی تو بڑا ایمان دار آدمی ہے۔ اچھا گوشت دیتا ہے۔"

"یہی تو قباحت ہے۔ میں نے اسی کو ہموار کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ خبیث آمادہ نہیں ہوا۔ آپ ایسا کیجئے ایک رپورٹ لکھکر اوپر پہنچا دیجئے کہ گوشت خراب آرہا ہے۔ بھوندو قصائی بیمار جانور کاٹ رہا ہے۔ اجازت نہ ہو تو کسی اور بہتر قصائی سے معاملہ کیا جائے۔ ہم دو چار درخواستیں طلباء کی طرف سے بھی پہنچوادینگے۔ ساتھ ہی یہ بھی کرنا کہ مولانا شہید الحق کی دعوت کردینا۔ یہ کام انھی کے اختیار کا ہے کھانے ہی کے دوران ذرا ڈھنگ سے عرض کرنا کہ بھوندو قصائی کی جگہ ناٹا قصائی سے معاملہ کی اجازت دی جائے۔ وہ ہمیشہ عمدہ جانور کاٹتا ہے — تول جھونک میں بھی سچّا ہے۔ بس بھاؤ کچھ معمولی سا زیادہ لگاتا ہے سو دو پیسے زیادہ خرچ کرکے رسول اللہؐ کے مہمانوں کو اچھا گوشت کھلانے کو مل جائے تو وہ حضور کو دعائیں دیں گے اور ان دو پیسوں کی کسر بھی یوں نکل جائے گی کہ جب کھانا اچھا ملے گا تو بیماریاں کم پیدا ہوں گی اور مدرسہ جو طلباء کے دوا علاج میں صرف کرتا ہے اس میں نمایاں کمی آجائے گی۔"

اس اسکیم پر عمل درآمد مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جس دن بھوندو کی جگہ ناٹا قصائی کی تبدیلی طے پاگئی اس روز ناٹا قصائی منشی عین الحق کی بیٹھک میں دیکھا گیا۔ وہ وعدے کے مطابق پچاس روپے نذر کرنے لایا تھا۔ نوٹ گن کر منشی صاحب نے فرمایا:۔

"معاملے کی نوعیت تو سمجھ گیا ہے نا اچھی طرح۔"

"جی مولوی جی بالکل سمجھ گیا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"کیا سمجھ گیا ایک دفعہ دُہرا دے۔"

"یہ سمجھ گیا سرکار کہ مدرسے سے تو بھوندو کے بھاؤ سے ایک آنہ فی سیر زیادہ لیا جایا کرے گا' مگر آپ ہمیں بھوندو والے بھاؤ سے ایک آنہ فی سیر کم دیں گے۔ اس طرح دو آنے فی سیر آپ کا کمیشن ہوگا۔"

"ابے میں اکیلا تھوڑی سب جیب میں رکھ لوں گا۔ اس میں کئی کا حصّہ ہے۔"

"یہ بھید بھاؤ تو آپ جانیں مولوی جی۔ میری تو بس وہی ایک عرض ہے دھیان میں رکھئے گا۔"

"کیا؟"

"آپ بھول گئے سرکار! اجی وہی۔ بات یہ ہے اس بھاؤ میں اچھے ڈنگر تو مشکل ہی سے۔۔۔۔"

"ہاں ہاں ہمیں یاد آگیا۔ ابے کون تجھ سے کہتا ہے کہ دلامیت سے لاکر جانور کاٹنا۔ بس ذرا اس کا دھیان رہے کہ رسول اللہؐ کے مہمانوں کو مُردار مت کھلادینا۔"

"توبہ توبہ مولوی جی ایسا بھلا ہو سکتا ہے۔ بس یہ ہے کہ ڈنگر ہلکے بھاری سبھی طرح کے آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے زیادہ منطق مت بگھار۔ یہ کان کھول کر سن لے کہ بات باہر نہیں جانی چاہیئے ورنہ ہمارا تو کچھ نہ بگڑے گا تیرا پتّہ کٹ جائے گا۔"

"نہیں مولوی جی میں اپنی روزی پہ لات کیوں مارنے لگا۔"

اس کاروباری پیش رفت کے نتیجے میں نفع تو مولوی اطعام الحق اور منشی عین الحق دونوں کو برابر ہی کا ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی ایک آنہ فی سیر۔ لیکن منشی عین الحق نے یہ سوچا کہ دماغ تو میرا کام کر رہا ہے اور ناٹے سے معاملات بھی میں نے ہی کئے ہیں اس لئے از روئے انصاف میں ہی نسبتاً زیادہ حقدار ہوں۔ پس مولوی اطعام کو انھوں نے یہ بتایا کہ بھاؤ ناٹے سے بھی در پردہ وہی طے ہوا ہے جو بھوندو سے تھا بس ایک آنہ فی سیر وہ ہم لوگوں کے کمیشن کا لحاظ کرکے مدرسہ سے زیادہ وصول کر لیا کرے گا۔ اس ایک آنے میں دو پیسے آپکے دو ہمارے۔ مولوی اطعام نے تصور ہی تصور میں حساب پھیلایا

تو طبیعت خوش ہوگئی۔ روزانہ تقریباً تین من گوشت کا خرچ تھا۔ دو پیسے فی سیر کے حساب سے کمیشن کے چار روپے چھ آنے روز بنے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک۔ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ مگر منشی عین الحق بڑے ظرف کے آدمی تھے وہ چھ پیسے فی سیر کی بچت پر بھی زیادہ مسرور نہیں ہوئے۔ دل کا حال اللہ جانے ظاہر میں ان کے چہرے کی بردباری کچھ ایسی ہی تھی جیسے کہہ رہے ہوں :-

"اماں ایسے ایسے نفعے تو اپنے ناخنوں میں پڑے ہیں۔"

اور واقعی ان کا یہ ارشاد غلط نہیں تھا۔

عید الضحیٰ کے موقع پر بیت العلم میں پچاس ساٹھ سے کم قربانیاں نہیں ہوتیں۔ بعض طلباء بھی فریضہ ادا کرتے ہیں اور باہر کے کتنے ہی لوگ اپنی اپنی قربانیوں کا نقد روپیہ بیت العلم کو بھیجتے ہیں۔

اپنی مساعی جمیلہ سے منشی عین الحق ایک شعبے کی نظامت پر متمکن ہو چکے تھے۔ ذہانت ان کی از بسکہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عید الضحیٰ کی قربانیوں میں فی راس دو روپے تو ہر صورت میں ان کے تھے۔ لیکن ایک بار ان کی ذہانت نے اس سلسلے میں کمال ہی کر دکھایا۔ عید الضحیٰ کی آمد آمد تھی انھوں نے اپنے بھانجے سے کہا جو انھی کے زیر پرورش تھا:-

"برخوردار اس مرتبہ سو پچاس ڈنگر تم بھی خرید لاؤ۔ دنیا میں کچھ کر کے کھانا بھی سیکھو گے۔"

"آپ جیسا حکم دیں، مگر ڈنگر تو شاید پنجاب سے آتے ہیں۔"

"وہ آسمان سے بھی آتے ہوں، مگر میں نے تمھارے لئے اب کی ایک تجویز سوچی ہے۔"

پھر انھوں نے ناٹے قصائی کو بلوایا اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سوائے بھانجے بادشاہ کے آس پاس کوئی نہیں ہے فرمایا:-

"دیکھو میاں۔ اب کی سو ڈنگر ہمیں بھی چاہئیں۔ یہ میرا بھانجا عید پر دو پیسے کمانا چاہتا ہے۔"

"ضرور سرکار۔ جتنے ڈنگر کہئے انھیں دیدوں گا۔"

"یوں نہیں۔ تم اپنے لئے جہاں سے منگاتے ہو وہیں سے اسے بھی منگا کر دو۔ روپیہ ہم دیں گے۔ مگر تم ان پر نفع نہیں لوگے"

"بالکل نہیں سرکار آپ جیسا حکم دیں ویسا ہی ہو جائیگا۔"

عید قریب آئی تو سو ڈنگر بھانجے بادشاہ کے بھی آ چکے تھے مگر وہ ناٹے ہی کی تحویل میں تھے۔ خاصے سستے پڑے تھے۔ اگر وقت کے مقامی ریٹ سے بیچے جاتے تو پانچ روپے فی راس نفع تو ہو ہی جاتا مگر منشی عین الحق کا ذہن رسا کہیں اور تھا۔ انھی دنوں بیت العلم کے خاص خاص ہادیانِ کرام کی انھوں نے دعوت کی اور تقریباً سو روپے کے ماکولات و مشروبات ان کے پیٹ میں اُتار دیئے۔ پھر بڑے ادب سے عرض پذیر ہوئے :-

"کیا بتاؤں حضرت اس مرتبہ بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ وہ میرا بھانجا ہے نذر الحق۔ وہ بے وقوف قربانی کے سو جانور خرید لایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ادھر ادھر بیچ دے گا لیکن عملاً جو دشواریاں ایک ایک کی الگ الگ فروخت میں ہو سکتی ہیں ان کا اسے تصور تک نہ تھا۔ اب خود بھی پریشان ہے اور مجھے بھی پریشانی میں ڈال رکھا ہے۔ حضرت اگر کوئی مضائقہ نہ سمجھیں تو ان جانوروں کو قیمت خرید ہی پر مدرسے کو دیدیا جائے۔ جانور بہت اچھے ہیں اس سے مدرسے کو بھی کفایت ہوگی اور میں بھی سمجھوں گا کہ میری گردن چھوٹی۔"

"ہاں ہاں بھئی کیا حرج ہے۔" بڑے حضرت نے فرمایا مگر ایک چھوٹے حضرت ٹانگ اڑا بیٹھے۔

"ناظم صاحب۔ یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کی طرح آپ کے بھانجے سلمہٗ بھی سچ ہی کے عادی ہوں۔ جانوروں کے بل اور بجک تو ہوتے نہیں ہیں! ہوتے ہوں تو ان کے اصلی اور نقلی کے فرق کو ہم اور آپ کیا سمجھ سکتے ہیں۔"

منشی عین الحق نے فوراً ایک بڑا سا سنگترہ معترض صاحب کی طرف بڑھایا۔

"کھائیے نا مولانا! آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔" پھر انھوں نے بھانجے کو بلایا۔

"برخوردار۔ وہ سامنے کانس پر قرآن رکھا ہے۔ اسے ہاتھ میں لیکر قسم کھاؤ کہ مدرسے کو تمام جانور قیمت خرید ہی پر دو گے۔"

"مگر ماموں جان پچاس روپے تو انھیں لانے میں خرچ

ہوگئے ہیں۔" بھانجے نے حفظ کیا ہوا سبق دہرایا۔

"ہاں بھئی" ایک اور حضرت بسبب نرم دلی اپنی کے گویا ہوئے "خرچ تو ضرور ہوئے ہوں گے اور پچاس روپے نفع کے بھی لگا لو تو اتنے جانوروں پر یہ نفع بیجا نہ ہوگا۔"

"جی ہاں بات معقول ہے" بڑے حضرت نے کہا "میاں ناظم صاحب آپ کا نقصان ہمیں پسند نہیں ہے۔ غالباً یہ قصائی لوگ تو ایک جانور پر چار پانچ روپے نفع لے لیتے ہوں گے۔"

"اجی حضرت چار پانچ تو گری پڑی حالت میں لیتے ہیں۔ عموماً دس پندرہ سے کم نہیں لیتے۔"

حاضرین میں بعض ایسے بھی تھے جو اس موضوع پر خاصی بحث کر سکتے تھے، مگر نمک کھا کر آنکھ سے آنکھ ملانا آسان نہیں ہوتا۔ پھر ابھی تو فیرنی اور شاہی ٹکڑوں کا ذائقہ بھی ڈکاروں میں بسا ہوا تھا۔ سامنے رکھے ہوئے انواع و اقسام کے پھل بقول منشی خیرالدین آنکھ مار رہے تھے۔

"حضرت جی جیسا حکم فرمائیں" منشی عین الحق نے پوچھ جانے کے انداز میں فرمایا "اگر قیمت خرید پر خرچ اور نفع ملا کر سَو روپے کا اضافہ حضور کی نگاہ میں بیجا نہیں ہے تو خدا کی قسم اس سے ایک پیسہ بھی زیادہ لینا نذرالحق کے لئے حرام ہے۔"

محفل برخاست ہوئی۔ بھانجے بادشاہ چکر میں تھے۔ ویسے تو سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہی ہوا تھا مگر اب تک ان پر یہ نکتہ لطیف منکشف نہیں کیا گیا تھا کہ فقط سَو روپے کا نفع کیا بار بسائے گا جب کہ دعوت ہی پر سو سے کم خرچ نہیں ہوئے تھے۔

"ماموں جان ایک ڈیڑھ روپیہ فی راس کے نفع سے تو ویسے بھی سب ڈنگر بک جاتے۔"

"تم بچے ہو برخوردار۔ خدا نے عقل دی ہے تو اس سے کام لینا سیکھو۔ اگر اس سودے میں ہزار بھی نہ بچے تو ماموں پاگل ہی ہے کہ اتنا جھنجھٹ باندھا۔"

بھانجے بادشاہ کی آنکھیں مارے استعجاب کے تارا بن گئیں منھ اس طرح کھلا رہ گیا کہ ایک مکھی بھی حلق میں کود گئی۔ حق تھو کرکے پانی پیا پھر منمنائے۔

"مگر ماموں جان آپ نے تو قسم کھائی ہے۔ اور مجھے بھی آپ نے حلف اٹھانے کا مشورہ دیا تھا۔"

"جبھی تو کہتا ہوں بھیجا استعمال کرنا سیکھو۔ قسم بھی اپنی جگہ رہے گی اور انشاء اللہ اسی سودے میں تمہارے لئے دالان کی چھت پر کمرہ بھی بن جائے گا۔" وہ بڑے ذومعنی اور حسین انداز میں مسکرائے۔ بھانجے بادشاہ کو خیال ہوا کہ معلوم ہوتا ہے ماموں جان نے انگوٹھا موڑ کر قسم کھائی ہے۔ انگوٹھا موڑ کر قسم کھانے کا فلسفہ آج تک اس کی نگاہ میں محض مسخرے پن کے سوا کچھ نہ تھا مگر آج وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ غلطی پر تھا۔

"مگر میں نے تو ماموں جان مفتی مسیح الزماں سے خود یہ بات سنی ہے کہ انگوٹھا موڑ کر کھائی ہوئی قسم بھی قسم ہی ہوتی ہے۔"

"ابے پاگل ہوا ہے" ماموں بھبکے "یہ انگوٹھے کا ذکر کہاں سے آٹپکا۔"

قصہ کوتاہ عید الضحیٰ سر پر آپہنچی۔ اب سو کے سو ڈنگر بیت العلم کو جانے تھے منشی عین الحق نے بھانجے بادشاہ کو ساتھ لیا اور راستے بھر زریں قسم کے نکات سمجھاتے ہوئے نانٹے قصائی کے یہاں پہنچے۔ یہ زریں نکات ایسے ہی بیش بہا تھے کہ بھانجے بادشاہ کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھل اٹھا۔ ایک بڑے سے گھیر میں ڈنگروں کا جم غفیر تھا۔ منشی جی کے حکم پر نانٹے نے ان کے سو ڈنگر ایک طرف کر دیئے۔ اب منشی جی نے بھانجے بادشاہ سے کہا:-

"یہ ڈنگر تمہاری ملکیت ہیں۔ میں انھیں خریدنا چاہتا ہوں بولو کتنے میں دوگے۔"

بھانجے بادشاہ نے راستے میں پڑھے ہوئے سبق کے مطابق پوری قیمت خرید پر صرف سَو روپے کا اضافہ کرکے دام بتلائے۔ ماموں قبلہ نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور بھانجے بادشاہ کو دام گن دیئے۔ ان کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگے — "دیکھو برخوردار! اگرچہ تمہارا یہ سودا مدرسے کے ساتھ نہیں ہوا ہے پھر بھی معاملہ قسم کے دائرے سے باہر نہیں گیا۔ اب یہ ڈنگر ہمارے ہوئے۔"

بھانجے بادشاہ نے سر تسلیم خم کیا۔ پھر چہکے:-

"اچھا ماموں جان ہزار روپے مجھے اور قرض دیدیجئے،"

ضرورت ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" شفیق ماموں نے جیب سے سو سو کے دس نوٹ اور نکال کر بھانجے بادشاہ کو پکڑا دئے۔ یہ بھی معاملہ شریعت ہی کے دائرے میں تھا۔ آخر کون مفتی اسمیں کیڑے ڈال سکتا ہے کہ ایک سعادت مند بھانجا اپنے دریادل ماموں سے ہزار روپے قرض لے۔ ناٹا قصائی گھیر کے دُور افتادہ گوشے میں بیٹھا حقہ سٹک رہا تھا۔ یقین اسے بھی تھا کہ ماموں بھانجے میں یہ جٹ پٹی کی تجارت کوئی گہرے معنی رکھتی ہے مگر ابھی تک تہہ کو نہیں پہنچ سکا تھا۔ یکایک بھانجے بادشاہ نے کہا:۔

"ماموں جان یہ جو ڈنگر میں نے آپ کو بیچے ہیں انھیں میں اب آپ سے خریدنا چاہتا ہوں۔ فرمائیے کتنے میں دیں گے۔"

ماموں جان نے فی ڈنگر دس روپے بڑھا کر مجموعی قیمت میں ایک ہزار اضافہ کر دیا۔ بھانجے بادشاہ نے قرض لئے ہوئے ایک ہزار کو اُن نوٹوں میں ملایا جو ماموں جان سے ڈنگروں کی قیمت کے طور پر وصول کئے تھے اور کُل کے کُل آگے بڑھا دیئے۔ ماموں جان نے انھیں اندر کی جیب میں رکھا اور گویا ہوئے۔

"اب تم اپنے ڈنگر مدرسے کو پہنچا دو۔ ظاہر ہے تمھاری قیمت خرید اب یہ ہے جو تم نے ہمیں ادا کی ہے۔ اس پر صرف سَو روپے زائد لینے کا تمھیں مدرسے سے اختیار ہے۔"

ناٹے کی کھوپڑی میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اس نے اچنبھے میں آکر حقہ کا ایسا گھونٹ بھرا کہ پانی حلق میں اُتر گیا۔ غوں غوں کرتے ہوئے وہ ماموں بھانجے کے قریب آیا اور بڑی عقیدت سے کہنے لگا:۔

"قسم رب کی مولوی جی۔ آپ استادوں کے استاد ہیں۔ اجی واکیا ترکیب نکالی ہے۔"

منشی جی نے جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر ناٹے کی طرف بڑھایا۔

"یہ تمھاری مٹھائی کے پیسے ہیں۔ معاملہ تمھارے سامنے ہوا ہے اگر اتفاق سے ایسی ضرورت پیش آجائے کہ تمھیں بھی اس معاملہ میں کوئی تصدیق کرنی پڑے تو تم ایمانداری کے ساتھ قسم کھا کر بیان دے سکتے ہو کہ میاں نذرالحق کی قیمت خرید یہ ہے۔"

●

عید کے دن ماموں نے بھانجے کو دُو روپے عیدی دی تو بھانجے بادشاہ تنک کر بولے:۔

"ہائے ماموں جان بس یہ دُو روپے۔ کم سے کم دس تو دیجئے۔"

"نہیں برخوردار! فضول خرچی بہت بُری شے ہے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہٗ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ مِنْ اِخْوَانِ الشَّیَاطِیْنَ۔ فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔"

بھانجے بادشاہ قرآن کے مقابلے میں کیا بولتے۔ مگر ڈنگروں کے معاملے میں کھٹک سی ابھی تک ان کے دماغ میں تھی۔ دبے دبے کہنے لگے:۔

"روپے تو مدرسے سے کُل کے کُل مل گئے ماموں جان، مگر کچھ ایسا لگتا ہے جیسے ۔۔۔ جیسے ۔۔۔"

"کیا بکتے ہو" ماموں گرجے "معاملے میں کونسی قباحت رہی ۔۔ آؤ ادھر بیٹھو۔"

ماموں نے بھانجے کو پاس بٹھا لیا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اس وقت کوئی نہیں تھا۔

"دیکھو عزیزم! عقل اللہ نے اسی لئے دی ہے کہ اس سے بیش از بیش کام لیا جائے۔ تم غور کرو تمام ہی معاملہ شریعت کے عین دائرے میں اختتام کو پہنچا ہے۔ ایک ایک جز تمھارے سامنے ہے۔ بتاؤ کیا میری قسم کا مطلب اس کے سوا بھی کچھ تھا کہ تم مدرسے سے قیمت خرید پر سو سے زیادہ نہیں لوگے۔"

"جی ہاں یہ تو تھا۔"

"پھر کس مسئلے کی رو سے تمھارے لئے یہ چیز ناجائز ہو سکتی ہے کہ مدرسے کی بجائے تم اپنا مال کسی اور کے ہاتھ بیچو۔ آخر یہ تو قسم نہیں کھائی گئی تھی کہ مدرسے کے سوا ڈنگر کسی کو فروخت نہیں کئے جائیں گے۔"

"جی ہاں یہ تو نہیں کھائی تھی۔"

"پھر؟ اس میں کیا بات خلاف شرع ہوئی کہ تم نے ابتداءً وہ میرے ہاتھ بیچ دیئے اور اس پر شریعت کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ دوبارہ جب تم نے مجھ سے خریدے تو میں نے ان پر ہزار روپے نفع لگا لیا۔ آخر میں نے تو یہی قسم کھائی تھی ناکہ میرا بھانجا اپنے مال پر مدرسے سے سو روپے سے زیادہ نفع نہیں لے گا۔ یہ تو نہیں کھائی تھی کہ خود میں بھی اپنی مملوکہ اشیاء کو کسی کے ہاتھ فروخت کرتے ہوئے فلاں شرح سے نفع لوں گا۔ جب مال تم سے میں نے خرید لیا تو مجھے اختیار ہو گیا کہ جتنے میں چاہے اسے بیچوں۔ تم نے دام پوچھے میں نے ہزار روپے نفع لگا کر بتا دیئے۔ تم نے انھیں منظور کر کے رقم مجھے گن دی۔ اب ظاہر ہے تمھاری قیمت خرید تو وہی ہوئی جو تم نے مجھے ادا کی۔ اس پر اگر سو روپے زائد تم نے مدرسے سے لے لئے تو قسم پر کیا آنچ آئی؟ سوچنے کی عادت ڈالو۔ فضول کی وہم بازیوں میں رہے تو عمر بھر فقیر بنے پھرو گے۔"

بھانجے بادشاہ کو شرح صدر ہو گیا۔ بھیجے میں جو پھانس سی چبھ رہی تھی وہ ماموں جان کی مبسوط شرح سے ایسی غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب وہ محبت بھری ضد کے ساتھ ماموں کی طرف جھکے اور ان کی سفید داڑھی کی نوک سے کھیلتے ہوئے کہنے لگے:۔

"دو روپے تو بہت کم ہیں ماموں جان۔ ہم تو آج شاہ ہارون پور جائیں گے۔ ریل کا ٹکٹ ہی ایک طرف کا ایک روپیہ ہوتا ہے۔"

"کیوں وہاں کیوں جاؤ گے؟"

"وہاں لال یمن چل رہا ہے بہت مشہور اسلامی کھیل ہے۔ قسم قرآن کی ماموں سنا ہے اس میں حج شریف کی فلم بھی دکھاتے ہیں۔"

"ابے فلم دیکھنا بری بات ہے۔"

"نہیں ماموں جان۔ بھیا رمزالدین بھی تو ہمارے ساتھ جائیں گے وہ تو بڑے مولانا صاحب کے لڑکے ہیں۔"

"ہائیں ــ وہ بھی جا رہے ہیں ــ اچھا اچھا تو تم بھی ہو آؤ۔" منشی جی کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ انھوں نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر بھانجے بادشاہ کو دیئے۔

"لو یہ رکھو۔ دیکھو سارا خرچ تمھی اٹھانا۔ میاں رمزالدین کو کچھ مت خرچ کرنے دینا۔"

بھانجے بادشاہ کو ماموں جان کی اس اچانک دریا دلی پر ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ان کا سفید داڑھی والا پُرنور چہرہ اور بھی زیادہ پُرنور ہو گیا ہو جیسا کہ حق ہے پُرنور ہونے کا۔

پھر منشی عین الحق نے بیت العلم کے اعیان و اکابر کو پوری طرح اس پر مطمئن کر دیا تھا کہ ہر سال ہی عید الضحیٰ کی قربانیوں کے لئے جانوروں کا انتظام خود وہی براہ راست پنجاب سے کیا کریں گے اور جو کچھ خرچ آئے گا اس پر کوئی نفع نہیں لیں گے۔ تقوے کی حد ہے کہ انھوں نے وہ پچاس بھی جو پہلی بار نفع کے لئے گئے تھے یہ لکھ کر مدرسے کو لوٹا دیئے تھے۔

"میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ عید الضحیٰ کی مبارک تقریب میں جو ناچیز خدمت مجھ نابکار سے بیت العلم طال اللہ بقائہ کی بن آئی اس پر میرا کوئی عزیز قریب ایک پیسہ نفع کا لے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو اور پوری قوم کو بیت العلم کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ انشاء اللہ ہر سال نہایت اچھے جانور براہ راست منڈی سے بالکفایت قیمتوں پر مہیا کئے جاتے رہیں گے۔ واللہ التوفیق وہو المستعان۔"

(ملا زندہ صحبت باقی)

کھرے کھوٹے

عقائد وہابیہ اور علمائے دیوبند

● مؤلف :- مولانا محمد مطیع الحق رح
● ناشر :- ابن المؤلف محمد انیس الحق
مکتبہ ضیاء العلوم - دیوبند۔
● صفحات ۶۸ قیمت بارہ آنے۔

"وہابی" کا خطاب بریلوی حضرات نے اصلاً تو اہلِ حدیث کے لئے وضع فرمایا تھا لیکن پھر علمائے دیوبند بھی اس لئے اس لقب سے نواز دیئے گئے کہ وہ اُن عقائد واعمال سے متفق نہیں ہو سکے تھے جنھیں بریلوی بزرگوں کے شوقِ ایجاد نے سائنسی انداز میں اختراع کیا تھا اور اب تو یہ بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ جو شخص بھی علم وعقل کی روشنی میں بریلوی اعمال وعقائد پر کلام کرے اور بدعت وضلالت پر نکیر واحتساب کا مرتکب ہو اس سے جان چھڑانے کا آسان سا نسخہ یہ ہے کہ بُرا سا منھ بنا کر "وہابی" کی پھبتی کس دی جائے۔

تنابز بالالقاب کا یہ نسخہ نیا نہیں بہت پُرانا ہے۔ پہلے بھی یہ ہوتا آیا ہے کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگوں نے جسے چاہا ایک بُرا سا لقب دے ڈالا اور آج بھی تقریباً ہر شعبۂ زندگی میں یہ چلتا ہوا حربہ بہت عام ہے مثلاً ہندوستانی مسلمان اگر اپنے اُوپر کی جانے والی زیادتیوں کا تذکرہ کر کے فریاد واحتجاج کریں تو اس کا کم خرچ بالانشین علاج یہی رہ گیا ہے کہ انھیں فرقہ پرست، علیحدگی پسند اور پاکستانی قرار دے دیا جائے۔

دُور کیوں جائیے خود دیوبندی ارباب ہنر میں بھی تنابز بالالقاب کا یہ چلن خاصا عام ہو گیا ہے۔

جہاں کسی غریب شہر کو دیکھا کہ وہ غیر مشروط نیازمندی اور کورانہ عقیدت کے دائرے سے باہر نکل کر براہِ راست قرآن وسنت کو ہاتھ لگا رہا ہے اور اپنے فہم ودرایت سے دست برداری دینے پر آمادہ نہیں بلا تکلف اسے ٹھیک اسی لہجے میں "مودودی" کا خطاب دے ڈالا جس لہجے میں بریلوی ہمیں "وہابی" کہتے ہیں۔ اگر زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مؤلف زندہ ہوتے تو ہم ضرور انھیں توجہ دلاتے کہ جو شکایت بریلویوں سے آنجناب کو ہے ٹھیک وہی شکایت آپ سے جماعت اسلامی کو بھی ہے۔ فقروں کو سیاق وسباق سے اکھیڑ کر فتوے جڑنے اور عبارتوں کے من ملنے مفاہیم نکالنے کا جو گھٹیا کھیل ارباب بدعت علمائے دیوبند کے خلاف کھیلتے ہیں بالکل ایسا ہی کھیل آپ کے حلقۂ مقدس میں بھی جماعت اسلامی اور مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف کھیلا گیا ہے

پیش نظر کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیوبندیوں کو "وہابی" قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ وہ وہابی تو کیا ہوتے وہ تو خود وہابیت کو جہالت وزندقہ سمجھتے ہیں۔ اس کوشش کو یقیناً ہم کامیاب قرار دیتے اگر مؤلف اس کا بھی کوئی علمی وتاریخی ثبوت مہیا کر جاتے کہ ابن عبدالوہاب کی طرف جن واہی عقائد واعمال کی نسبت انھوں نے کی ہے وہ امر واقعہ ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس طرح دیوبندی علماء کی تحریر وتقریر سے غلط طور پر فاسد و کاسد مطالب نکال کر بریلوی حضرات نے انھیں پرلے سرے کا بدعقیدہ اور باطل پرست قرار دیا، بلکہ بعض نے تو کافر ہی ٹھیرا دیا اسی طرح ابن الوہاب کے ساتھ بھی اسی نوع کی زیادتی کی گئی ہو اور ان کے قول وعمل کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے

وہ طبع زاد ہو۔

علمائے دیوبند کے ایک ممتاز ترین عالم اور مقتداء مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ محمد بن عبدالوہاب کو لوگ وہابی کہتے ہیں وہ اچھا آدمی تھا سُنا ہے کہ مذہب حنبلی رکھتا تھا اور عامل بالحدیث تھا بدعت و شرک سے روکتا تھا مگر تشدید اس کے مزاج میں تھی۔

کتاب ہٰذا کے محشی صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ایسا جواب مولانا گنگوہی نے غلط اطلاعات کی بناء پر دیا ہے بعد میں علمائے دیوبند کو اس کے خلاف اطلاعات ملیں تو انھوں نے ابن عبدالوہاب کی تفسیق و تجہیل کی۔

بات وزنی ہے لیکن جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ پہلی اطلاع غلط اور دوسری صحیح تھی اس وقت تک یہ وزن معلق ہی رہتا ہے۔ خود تبصرہ نگار کی نظر سے دونوں طرح کا مواد گذرا ہے وہ بھی جو ابن عبدالوہاب کے خلاف تھا اور وہ بھی جو ان کے حق میں تھا۔ سچی بات ہے غیر جانبدارانہ تنقید کے اعتبار سے پہلی قسم کا مواد بے جان سا نظر آیا اور دوسری نوع کا مقابلتہً جاندار محسوس ہوا۔ مولٰنا مسعود عالم ندویؒ کی مستقل کتاب " ابن عبدالوہاب " کے نام سے بازار میں موجود ہے اسے پڑھئے اور پھر اُن تصانیف کو دیکھئے جن میں تاریخ کی اس شخصیت کو بُری طرح مجروح کیا گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغ تعصبات سے خالی ہے اور فنِ روایت و درایت میں درک رکھتے ہیں تو انشاءاللہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ تاریخی شخصیت اگر تحسین و تکریم کی مستحق نہیں تو کم سے کم سکوت کی ضرور مستحق ہے تفسیق و تذلیل تو بہر حال عدل و احتیاط کے مطابق نہیں۔

ہمارے محترم استاد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ قابلِ رشک زہد و تقویٰ کے سرمایہ دار تھے اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے ہم جیسے سیاہ کار تو ان کی خاکِ پا کا بھی رتبہ نہیں رکھتے، مگر یہ احسن الخالقین کی حکیمانہ صنعت ہی ہے کہ اپنی مخلوق میں اس نے صرف انبیاء علیہم السلام کو معیارِ حق بنایا اور دوسرے تمام انسانوں میں سہو و نسیان،

قصور و لغزش اور کوتاہی و نارسائی کے عناصر ضرور رکھدیئے تاکہ کسی بھی مرحلے میں ان کو ماوی صفات سے متصف نہ کیا جا سکے۔ شاید اللہ کی اسی صنعتِ خاص کا مظاہرہ یہ بھی ہے کہ استادِ محترم علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب "الشہاب الثاقب" میں (جس کا خلاصہ زیر تبصرہ کتاب ہے) ابن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں حسن ظن یا سکوت کے بجائے انتہائی سوءِ ظن، غیظ و غضب اور تخطیہ و تغلیط کی روش اختیار فرمائی۔ حالانکہ ایسا قابلِ اعتماد تاریخی مواد کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ ضمانت مل سکے کہ واقعی ابن عبدالوہاب کے اعمال و عقائد وہی تھے جنھیں ان سے منسوب کر کے سب و شتم کی راہ نکالی جاتی ہے، بلکہ ڈھونڈنے والے کو ایسا بہت سا مواد مل سکتا ہے جس سے اس قیاس کے لئے راہ نکلتی ہے کہ ابن عبدالوہاب کو قصداً بدنام کیا گیا ہے۔ وہ ایک مصلح تھے، اور ہو سکتا ہے بدعات و منکرات کے شیوع نے ان میں کچھ شدید قسم کا ردِ عمل پیدا کر دیا ہو مگر ردِ عمل ایسا قبیح تو نہیں ہے کہ ان کے حق میں بدکلامی کا جواز نکل سکے۔ شدت ابن تیمیہ اور ابن جوزی جیسے اکابرین کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ عیب اگر ہر حالت میں عیب ہی ہے تو پھر اُن لوگوں کو برسرِ حق سمجھنا چاہئے جو ابن تیمیہ جیسے مردِ جلیل کو اسی طرح خبیث اور بدباطن وغیرہ کہتے ہیں جس طرح زیر تبصرہ کتاب کے مؤلف نے " الشہاب الثاقب " کے اتباع میں ابن عبدالوہاب کو کہا ہے۔ اللھم اعوذ بك من التعصبات الجاهلية۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ کسی متنازعہ شخصیت کے بارے میں حسن ظن یا سکوت آخرت کے نقطۂ نظر سے ایک محتاط طرزِ عمل ہے، لیکن سوءِ ظن اور گالی گفتار بہت خطرناک ہے، کیونکہ اگر آخرت میں یہ ثابت ہوگیا کہ اس شخصیت پر افتراء کیا گیا تھا تو سوءِ ظن کا مظاہرہ کرنے والوں کو جوابدہی کرنی پڑے گی۔

مؤلف نے ایک مقام پر اوّل ماخلق اللہ نوری کی ناقابلِ اعتماد روایت کو مسلمات کے سیاق پر

سپرد قلم کیا ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو ہم عرض کرتے کہ جن روایات کا متن متشابہات کی نوع کا ہو وہ جبتک مضبوط ہی اسناد سے مروی نہ ہوں ان کی توجیہہ و تاویل کے چکر میں نہ پڑنا چاہئیے۔ یہ روایت ضعف کی اُن حدوں کو پہنچی ہوئی ہے جن کے ڈانڈے کذب و ضع سے ملتے ہیں۔ کمزور ترین روایتوں کو کسی خیال و رائے کی بنیاد بنا لینا ہی وہ اساسی کمزوری ہے جو ایجاد و بدعت اور وقت برباد کرنے والے مباحث کا دروازہ کھولتی ہے۔

صفحہ ۲۵ پر یہ روایت مذکور ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے کعبہ میں ایک رات ایک پیر پر کھڑے ہو کر پورا قرآن پڑھا۔

لیکن اوّل تو یہ واقعہ امام صاحب کے کسی مستند تذکرہ نگار نے شاملِ تذکرہ نہیں کیا۔ دوسرے امام موصوف کا جو مزاج ان کی مجموعی سیرت اور افکار و کردار سے سامنے آتا ہے وہ اس مبتدعانہ طریق سے جوڑ نہیں کھاتا یہ طریق رہبانی ریاضتوں کے خاندان سے ہے اور اس میں عبادت یا تکریم کے عوض بازیگری کے تیور جھلکتے ہیں۔ روایتوں کو روایت و درایت کے محتاط پیمانوں سے ناپے بغیر قبول کر لینا ہی تو وہ بے احتیاطی ہے جس سے لاحاصل نکتہ سنجیوں اور بے تہہ نیاز مندیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

شیخ طریقت مرشدِ کامل حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرّہٗ العزیز کی "امداد السلوک" سے وہ عبارت بھی اس کتاب میں نقل کی گئی ہے جس سے منکشف ہوتا ہے کہ شیطان جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نہیں آسکتا اسی طرح متبعِ شریعت پیر کی شکل میں بھی نہیں آسکتا۔

ہمیں اپنی محرومی کا اعتراف ہے کہ تعلیم حدیث کے دوران ہمیں کسی بھی استاد نے یہ نکتہ نہیں بتایا۔ اگر حضرت حاجی صاحب نے یہ نکتہ حدیث سے استدلال کئے بغیر بیان فرمایا ہوتا تو ہم اسے اسرار طریقت میں شمار کر کے ہونٹ بند ہی رکھتے لیکن حدیث کو مستدل بنایا گیا ہے تو ہم یہ کہنے کی جرأت ضرور کریں گے کہ استدلال کی یہ قسم حیرت ناک ہے! آگے حدِّ ادب۔

اس کتاب میں حواشی بھی ہیں۔ محشی ماشاء اللہ ذکی اور ہونہار ہیں جگہ جگہ بڑے سلجھے ہوئے حاشیے دیئے ہیں۔ مگر بے عیب ذات اللہ کی ہے۔ وہ ازراہِ تقلید شاہ عبد القادر جیلانیؒ کو "غوث اعظم رضی اللہ عنہ" لکھ گئے ہیں۔ ہماری نگاہ میں تکریم و تمجید کی یہ زبان اُسی کارگہِ فکر سے تعلق رکھتی ہے جس نے بریلوی ذہن کا سانچہ بنایا ہے۔ نہ مانیئے اسے کہ رضی اللہ عنہ کا معزز ترین فقرہ اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم ہی کے ساتھ خاص رہے تو بہتر ہے مگر "غوث اعظم" کے مطالب و مضمرات پر ضرور غور کرنا چاہئیے۔ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ بدعت و غلو کے اس دورِ نامسعود میں ان کا استعمال احتیاط سے ہونا چاہئیے۔

صفحہ ۵۳ کے حاشیے میں ایک فقرہ تفسیر کبیر کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ ضرورت تھی کہ ٹھیک ٹھیک مقام کا بھی حوالہ دیا جاتا۔ صفحہ ۶۲ پر طارق المکرہ پر بھی حاشیے کی ضرورت تھی اس کے بغیر عام قارئین کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ اگر عقائد وہابیہ وہی ہوں جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اور ابن عبد الوہاب ایسے ہی بُرے آدمی ہوں جیسے مصنف نے متعارف کرائے تو یقیناً یہ کتاب اپنے موضوع و مدعا کے اثبات میں خاصی کامیاب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا

● مرتبہ:۔ شاعرِ خوش گلو جناب انور صابری۔

● شائع کردہ:۔ صابری بکڈپو۔ دیوبند ● صفحات ۲۲۴

لکھائی چھپائی، کاغذ پسندیدہ۔ قیمت مجلّد چار روپے۔

شعر و سخن سے مس رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو آل انڈیا شہرت رکھنے والے شاعر جناب انور صابری نہاد اللہ لحمراً کے نام نامی سے واقف نہ ہو۔ آپ بڑے پُر گو شاعر ہیں اور فی البدیہہ کہنے میں بھی ملکہ رکھتے ہیں گلے میں لوچ آواز میں سوز اور لہجے میں ترنگ ہے۔ پڑھتے ہیں تو سامعین وجد میں آجاتی ہیں۔ ترنم کے علاوہ ان کی شخصیت بھی کچھ اس طرح کی ہے کہ ایک بار دیکھ کر کوئی انھیں مشکل ہی سے بھلا سکتا ہے۔ پہلے دیوبند ہی رہتے تھے اب دہلی قیام فرما ہیں۔ ان کی نثر اب تک ہماری نظر سے نہیں گذری تھی مگر پیش نظر کتاب نے اس سعادت سے بھی نواز دیا۔ ان کی نثر میں بڑی دلکشی اور روانی ہے۔ ہر فقرہ ان کی شوخیِ طبع اور چلبلے پن کی جھلکیاں رکھتا ہے۔

پیش نظر کتاب میں انھوں نے پونے دو سو کے قریب ایسے شعراء کو متعارف کرایا ہے جو یا تو بالکل ہی گمنام ہیں یا بہت محدود شہرت رکھتے ہیں۔ مختصر تعارف کے ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ نمونوں کے انتخاب سے جناب صابری صاحب کے حسن مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ لاریب کہ یہ کتاب اپنی نوع کی ایک دلچسپ چیز ہے جس کے مطالعہ سے ادبی حلقوں کو لطف اندوز ہونا چاہیئے۔

مگر اندیشہ ہے کہ محترم صابری صاحب کو کہیں یہ شکایت نہ ہو کہ تجلّی کے تفصیل پسند تبصرہ نگار نے میری کتاب پر حقِ تفصیل ادا نہیں کیا۔ اس ممکن شکایت کے ڈر سے کچھ اور کہنا بھی تقاضائے احتیاط معلوم ہوتا ہے۔

شروع میں صفحہ بہ صفحہ متعدد مشاہیر کے وہ فرمودات دیئے گئے ہیں جنھیں اس کتاب پر تقریظ کی حیثیت حاصل ہے۔ سجاد ظہیر، مولانا ابو الکلام، مولانا احمد سعید، جگر مراد آبادی، حافظ محمد ابراہیم، ذاکر حسین، کرنل بشیر حسن زیدی، سمپورنانند، اجیت پرشاد جین، موہن لال گوتم، روش صدیقی اور شوکت تھانوی۔ یہ سب جانے پہچانے حضرات ہیں۔ ان کی آراء نے اس کتاب کی لٹریری حیثیت کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان

یہ الگ سوال ہے کاروباری اعتبار سے بہرحال ان ناموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صابری صاحب نے "میری سنو" کے عنوان سے دو صفحے کا پیش لفظ بھی سپردِ قلم کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب یونہی کرسی پر بیٹھ کر نہیں ہوگئی بلکہ مؤلف کو خاصی تگ و دو بھی کرنی پڑی ہے۔

اصل کتاب حکومتِ ہند کے ایک مقتدر فرد جناب حافظ محمد ابراہیم کے تعارف اور نمونۂ کلام سے شروع ہوتی ہے۔ نمونے میں صرف دو شعر ہیں مگر جاندار اور سچے ہوئے۔ مؤلف کے قلم کی حسن کاری کا اندازہ کرنے کے لئے اس تعارف کے چند فقرے دیکھیئے:-

"رات کو گیارہ بجے تک مجلس گرم رہتی ہے۔
۱۲ بجے کے بعد فائل دیکھتے ہیں اور دو بجے تک دن
بھر کا کام ختم کر کے لیٹتے ہیں تین بجے تک مطالعہ
جاری رہتا ہے عمدہ کتاب نہ ہو تو نیند نہیں آسکتی
یہ ان کے داخلی حسن نظر کی علامت ہے۔"

"داخلی حسن نظر" کا کیا جواب ہے۔ معمولات کے بیان میں اگر صابری صاحب یہ بھی بتا دیتے تو قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا کہ تین بجے تک مطالعہ کے بعد حافظ صاحب اُٹھتے کے بجے ہیں!

دوسرا نمبر مشہور دیش بھگت جناب سمپورنانند جی کا ہے ان کے "تعارف نامے" سے ہماری ایک غلط فہمی دُور ہوگئی ہم آج تک یہ سمجھتے تھے کہ سمپورنانند جی اُن حضرات میں سے ہیں جنھوں نے اُردو سے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن اب انکا خاص قسم کا قومی مزاج اس زبان کو زندہ و پائندہ دیکھنے کا پل بھر کو بھی روادار نہیں ہے مگر صابری صاحب نے انکشاف فرمایا:-

"وہ پکے ہندی دوست ہیں، لیکن اردو دشمن نہیں"

اس کے بعد صابری صاحب نے ان کی اس بے بسی کے رُخ سے بھی پردہ اُٹھایا کہ اُردو کو:-

"ماحول کی ناسازگاری اور خود اُردو پرستوں کی
غلط اظہارِ حمایت کی بدولت وہ ابھی تک اس کا

حقیقی مقام نہیں دلوا سکے۔" ص۲۷

کاش صابری صاحب اس کتاب کی تالیف و ترتیب میں اپنے سیاسی مزاج اور قومی طرزِ فکر کو در انداز نہ ہونے دیتے۔ اوّل تو یہی بات کھٹک پیدا کرنے والی ہے کہ ترتیب میں اربابِ کرسی کی تقدیم کا اہتمام کیا گیا حالانکہ موضوع کے تعلق سے ترتیب کا مدار کرسی کے عوض شاعرانہ صلاحیتوں کے تناسب پر ہونا چاہیئے تھا۔ اس مجموعے میں بعض گمنام اور بے مایہ شعراء کا ایسا نمونۂ کلام موجود ہے، جس پر اربابِ عزّ و جاہ کے پورے پورے دیوان نچھاور کئے جا سکتے ہیں۔

دوسرے یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ کسی لیڈر قسم کے شاعر کے تعارف میں نفسِ موضوع سے ہٹ کر ایسے گوشے بھی اُبھار دیئے جائیں جو ایک آفت زدہ اقلیت کے کسکتے ہوئے زخموں پر نمک کی بوچھار بن جائیں۔ کیسی تکلیف دہ بات ہے کہ خود مظلوموں ہی کو اپنی تباہیوں کا ذمہ دار قرار دینے کا جو شیطانی حربہ حکومت و سیاست کے میدان میں استعمال کیا جا رہا ہے اسے تائید و تصویب کے سیاق میں پیش کر دیا گیا ہے۔ ہمیں صابری صاحب کی نیت پر شک نہیں مگر قلم کو وہ شعر و ادب ہی کے دائرے میں پابستہ رکھتے تو بہتر ہوتا۔ حیرت ہے سمپورنانند جی کے کلام سے جو تین شعر بطور نمونہ دیئے گئے ہیں ان میں ایک قافیے سے آزاد ہے۔ باقی دو بھی سپاٹ اور پھیکے ہیں۔ تعجب ہے اُردو فارسی پر کافی عبور رکھنے والے سمپورنانند جی نے یہ مصرعہ کیسے کہدیا:۔

دیش سیوا کے لئے جینا مرادِ آرزو

"مرادِ آرزو" کوئی بات نہیں ہوتی۔

یہ بتانا تو ہم بھول ہی گئے کہ بالکل شروع میں جناب مؤلف کی تصویر بھی ہے۔ یہ تصویر شریعت، تصوف، شوخی اور قلندرانہ دروبست کا بڑا خوش گوار امتزاج ہے تنہا اسی کے لئے چار روپے خرچ کر دیئے جائیں تو سودا مہنگا نہیں ویسے بازار کی شرح سے چار روپے قیمت اس کتاب کی زیادہ ہے ڈھائی سے زیادہ کا موقعہ نہیں تھا۔

تعبیر کی خامیاں کہیں کہیں بڑی دلچسپ ہیں مثلاً:۔

"علم کی افراط نے طلب زر سے مستعفی کر دیا تھا۔" ص۲۱۵

حالانکہ یہ "مستعفی" "مستغنی" ہوگا۔ البتہ "افراط" کتابت کی غلطی نہیں الفاظ کا ایسا پُر لطف استعمال صابری صاحب کی نثر میں بہت ہے ان کی شاعرانہ محویتیں اس سے بالاتر ہیں کہ وہ ہر ہر لفظ کے موزوں محل استعمال کی غیر شاعرانہ کھنچ کاوی میں پڑیں:۔

"بلوچستان کی ادبی فضاؤں میں آج کل چھائے ہوئے ہیں۔" (ص۱۵۷)

کتابت میں "پر" "کا" "میں" بن گیا۔ صحیح زبان "فضاؤں پر چھانا" ہے۔

ہماری دعا ہے کہ یہ کتاب مقبول ہو اور صابری بکڈپو پھلے پھولے جس کے ناظم خود مرتب کے جواں سال صاحبزادے ہیں اگلی کسی کتاب کی اشاعت کے وقت وہ ذرا قیمت کے توازن پر توجہ دیں تو اچھا ہوگا۔ وما علینا الاّ البلاغ۔

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص

● تالیف:۔ جناب سلیم اللہ صدیقی جونپوری۔

● شائع کردہ:۔ مکتبہ اسلامی ادب۔ بنارس

● صفحات ۱۵۴۔ کتابت عمدہ۔ طباعت عمدہ سے کچھ کم کاغذ سفید۔ قیمت مجلد سوا دو روپے۔

تدبر و سیاست کی تاریخ اسلام کے ان تین جلیل القدر مدبروں کو کبھی نہیں بھول سکتی جنھیں خوبی قسمت سے دنیا کے سب سے بڑے انسان اور سلامتی فکر و نظر کے سب سے بڑے محیط سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا فخر حاصل ہوا تھا۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان۔ حضرت عمرو بن العاص حضرت مغیرہ بن شعبہ۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

لیکن یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ ان دانشوروں کے فکر و تدبر کے اعتراف اور قدر شناسی کی راہ میں امتِ مسلمہ کے وہ اختلافات دیوار بن کر حائل ہوتے چلے گئے جنکا ہیج خلافتِ راشدہ

کے بعد کی ہنگامہ خیز تاریخ نے بویا تھا اور پھر نفوس امارہ کی زمین میں شیطان اس بیج کو ایک ایسا تناور درخت بناتا چلا گیا جو آج بھی کسی بوڑھے برگد کی طرح اپنی جٹائیں پھیلائے ڈراؤنے انداز میں کھڑا ہے۔

پیشِ نظر کتاب انھی تینوں میں سے ایک ممتاز مدبر کی داستانِ حیات ہے جسے تاریخ نے "فاتح مصر" کے شاندار لقب سے نوازا ہے۔ اس کا مبارک نام ہے عمرو بن العاصؓ ان کا امتیاز مذکورہ دونوں مدبروں کے مقابلہ میں یہ ہے کہ ان میں تدبر اور عسکری تہوّر دونوں کا اجتماع تھا۔ یہ سیاست کی گتھیاں سلجھانے والے ذہنِ رسا کے ساتھ میدانِ جہاد میں پہاڑ کی طرح جم جانے والے قدم اور تلوار کے دستے پر کبھی نہ تھکنے والے بازو بھی رکھتے تھے۔ یہ حکیم و مدبر بھی تھے اور مجاہد و سالار بھی۔ یہ دو جداگانہ صلاحیتیں کم لوگوں میں جمع ہوتی ہیں۔

ایک مفکّر نے ٹھیک ہی لکھا ہے

"عمرو بن العاص کے سوانح کی چھان بین اور ان کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پورے عالم اسلام میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ماؤں نے ایسے بچے کم جنے ہیں جنھیں عمرو بن العاص کی سی صلاحیتیں اور خاصیتیں پائی جاتی ہوں....."

پھر ان صلاحیتوں کے علاوہ ان کے بنیادی فکر کی بلندی بھی دیکھو۔ حضرت معاویہؓ نے پوچھا سب سے زیادہ سخی کون ہے؟ فاتح مصر جواب دیتے ہیں

"وہ جو اپنی دنیا اپنے دین کی بہتری میں صرف کردے"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مردم شناسی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کا ایک طرزِ عمل عمرو بن العاص کے تدبر، قوتِ فکر اور بالغ نظری کی ترجمانی خوب خوب کرتا ہے وہ جب کسی ضعیف الرائے، کم سمجھ اور بے بصیرت آدمی کو دیکھتو تو حیرت سے کہا کرتے۔

"یا للعجب۔ اس کا اور عمرو بن العاص کا خالق

ایک ہے"!

اس سے بڑھ کر ابن العاص کی دانشمندی اور تدبر کو کس شہادۃ کی ضرورت ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ جناب سلام اللہ صدیقی نے بلند پایہ کتب تاریخ و سیر سے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس صحابی جلیل کی داستانِ حیات کے بکھرے ہوئے اوراق سمیٹے ہیں اور عام فہم لیکن سلیس و شگفتہ انداز میں فاتح مصر کا تذکرہ سپرد قلم کر دیا ہے۔ کچھ نہ کچھ حوالے تو وہ حواشی پر بھی دیتے گئے ہیں۔ لیکن اختتام پر انھوں نے صفحہ اور سطر کے التزام سے حوالوں کا گوشوارہ دیکر کتاب کی قدر و قیمت کافی بڑھا دی ہے۔ عوام بہت کم حضرت عمرو بن العاص کے حالات سے واقف ہیں، انھیں اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے یہ ایمان افروز ہونے کے ساتھ بہت دلچسپ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے۔

یہ مشورہ ہم مؤلف کو ضرور دیں گے کہ انھیں زبان و انشاء کے معاملہ میں ذرا زیادہ احتیاط برتنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ فی الحال ان کی انشاء میں جھول اور خامیاں کافی ہیں۔

"فتح و نصرت نے آپ کے حوصلہ جہاد کے قدم کو بڑھکر چوما" صفحہ ۷۹۔

عبارت یوں ہونی چاہئے تھی

"فتح و نصرت نے بڑھ کر آپ کے قدم چومے"۔

صفحہ ۷۶ پر:- "خوف و ہراس نے ان کے دل کو کم ہمت اور بزدل بنا دیا تھا"۔ "دل کو" کے الفاظ حشو ہیں۔ اسی صفحہ پر

"جب انتظار کی حد گذر گئی"۔

درست نہیں۔ یا تو کہتے "جب انتظار کی حد ہو گئی" یا کہتے

"جب انتظار حد سے گذر گیا"۔

صفحہ ۷۹ پر:- "عقل کا جوہر وہ شے ہے جس کی کوئی قیمت نہیں"

بے قیمت ہونا تو تحقیر کے لئے آتا ہے۔ یہاں قیمت کی جگہ "مول" کا لفظ موزوں ہوتا۔ اس سے زیادہ فصاحت یوں کہنے میں تھی۔

"عقل کا جوہر انمول ہے"۔

صفحہ ۷۶ پر:- "یہ طفیل تھا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس

یت کا جو آپ نے باشندگان مصر کے متعلق فرمایا تھا۔"
" فرمائی تھی" ہونا چاہئے تھا۔
" اس کے قبلہ کو اسّی صحابہ نے مل کر بنایا تھا" صـ۸۴
قبلہ بنانا نہیں بلکہ" درست کرنا" یا" مقـرر کرنا" بولا
تا ہے۔
" جس نے سب سے پہلے امتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی بکھیری" صـ۸۸
یہ نوآموزوں کا سا فقرہ ہے۔ کہنا یوں چاہئے تھا" جسنے
ب سے پہلے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرا"۔
" اور حضرت علی قصاص میں تساہلی برت رہے ہیں" صـ۹۰
تساہلی نہیں" تساہل" لکھا کیجئے۔
" اینٹ و پتھر" (صـ۱۰۴) جیسی تراکیب غلط ہیں۔ اس طرح
ے لفظوں میں عطف" اور" کے ساتھ ہونا چاہئے۔
" واقدی کی غلط بیانی اور افسانہ سرائی متفقہ علیہ
ہے"۔ صـ۱۰۱
" متفق علیہ" درست ہوگا۔
" .... اور آپ کے ساتھیوں کی تنقیس لازم آتی ہے" صـ۱۱۱
یہ شاید کتابت کی غلطی ہے کہ" تنقیص" سین سے لکھا گیا۔
" تو پھر عصمت صحابہ کی آبرو لٹ کر رہ جائے گی" صـ۱۱۴
" عصمت صحابہ کی آبرو" کیا بات ہوئی۔
" خوشا نصیب ہیں وہ نفوس قدسیہ...." صـ۱۲۰
" خوش نصیب" کا محل تھا۔ خوشا نصیب کے ساتھ" ہیں"
ہمل ہے۔
" یاد رکھو دنیا لازوال اور فنا کی جگہ ہے" صـ۱۳۰
زوال میں" لا" کا اضافہ ضرور کاتب ہی کا کرشمہ ہوگا۔ لیکن
تصحیح میں اس کا نظر انداز ہو جانا افسوسناک ہے۔
" رات کو جب دنیا والے خواب عشرت میں مسرت خرام
ہوتے"۔ صـ۱۳۲
" مست" کو مسرت تو خیر کاتب نے بنا دیا مگر" مست خرام"
کا بھی یہ محل نہیں ہے۔ نہ" عشرت" کا موقع تھا۔
کہنا یوں چاہئے تھا
" جب دنیا والے خوابِ راحت میں مست ہوتے"۔

صفحہ ۱۴۳ پر۔ حضرت عمرو بن العاص کے ہر اقوال...."
" تمام اقوال" کہنا تھا یا پھر" ہر قول" مناسب ہوتا۔
اسی صفحہ پر " ان اقوال کو بزرگان دین نے بڑے
اہتمام کے ساتھ اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں"۔
" نقل کیا ہے" لکھنا چاہئے تھا، یا پھر" ان اقوال کو" کی جگہ
" یہ اقوال" لکھتے۔
صفحہ ۱۵۲ پر۔ " رسالے اور مضامین سے افادہ حاصل
کیا گیا ہے"۔
" افادہ حاصل کرنا" بیجا تکلف ہے۔" استفادہ" اولٰے
ہوتا۔
زبان کے ایسے جھول لطیف طبائع کو بہت کھلتے ہیں۔
انھیں دور کر دیا جائے تو جناب سلام اللہ صدیقی کی تحریر میں
دلکشی اور روانی کی کمی نہیں۔ آئندہ وہ اور لحاظ رکھیں کہ اس طرح
کے دقیع تذکروں میں کسی بھی جگہ وہ اسٹائل نہیں آنا چاہئے
جو گھٹیا تاریخی ناول لکھنے والوں سے مخصوص ہے۔ یہ مشورہ اسلئے
دیا کہ وہ آگے کو بھی مشاہیرِ اسلام کے تذکرے سپرد قلم کرنے کا
مبارک خیال رکھتے ہیں۔
حاصل تبصرہ یہ کہ زبان و ادب کی جزوی خامیوں سے
قطع نظر یہ کتاب بڑی قدر و قیمت کی حامل اور ایک صحابی
جلیل کے وجد انگیز کارناموں کی روح پرور یاد تازہ کرکے سلام اللہ
صاحب نے دینی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس کی
مطبوعہ قیمت ہمیں کچھ زیادہ معلوم ہوئی تھی لہٰذا مکتبہ تجلی کی طرف
سے اس کا اعلان" دو روپے" کرایا گیا ہے۔ ارباب توفیق
کو ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اُردو　　اُردو

نفیس اور ایمان افروز کتابیں

مکتبہ تجلّی دیوبند (یو۔پی)

اس فہرست میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو عام طور پر نہیں ملتیں۔ جلد فائدہ اٹھائیے۔

گذارش

آرڈر دینے کے ساتھ چند باتوں کا لحاظ ضرور رکھیئے

- فرائش کے ساتھ کم سے کم چوتھائی رقم ضرور ارسال فرمائیے۔
- اپنا پتہ صاف لکھئے۔
- اپنا ریلوے اسٹیشن بھی لکھیئے تاکہ وزن زیادہ ہو تو کتابیں ریل سے بھیجی جائیں۔ ڈاکخانہ سے خرچ زیادہ ہوتا ہے۔
- ڈاک یا ریل خرچ خریدار ہی کے ذمے ہوگا۔
- ہو سکتا ہے جس وقت آپ آرڈر دیں اس وقت اس فہرست کی کوئی کتاب ختم ہو چکی ہو لہذا یہ ضرور لکھئے کہ کسی کتاب کے ختم ہو جانے کی صورت میں آپ کی مطلوبہ دوسری کتابیں بھیجی جائیں یا نہیں؟
- آرڈر دے کر وی پی واپس کرنا قانوناً بھی جرم ہے اور اللہ کے نزدیک بھی گناہ ہے۔
- پارسل وصول کرنے کے بعد اگر کوئی بھی شکایت پیش آئے تو غصہ اور بدگمانی مت کیجئے۔ اطلاع دینے پر مکتبہ تجلی انشاء اللہ ہر جائز شکایت کی تلافی ضرور کرے گا۔

منیجر مکتبہ تجلی دیوبند

تاریخ اسلام کامل

از۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی

یہ تین جلدوں کی ضخیم تاریخ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قدیم وجدید تاریخوں کا نچوڑ سمجھیئے۔ اسلام کی اس سے زیادہ جامع معتبر اور نفیس تاریخ اُردو میں کوئی نہیں۔ روشن کتابت وطباعت۔ سفید کاغذ حسین گرد پوش۔ تین جلدیں الگ الگ مجلد۔

قیمت چھتیس ۳۶ روپے

ازالۃ الخفاء

امام وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی یہ کتاب خلفائے راشدین کے اسوۂ و عمل، خلافت کی حقیقت اور خلافت سے متعلق لطیف و نازک مباحث کی تنقیح و تشریح میں لاجواب مانی گئی ہے اردو ترجمہ سلیس۔
لکھائی چھپائی روشن۔ دو جلدوں میں الگ الگ مجلد مکمل۔

قیمت بیس روپے

حجۃ اللہ البالغہ

یہ شاہ ولی اللہؒ کی وہ تصنیف ہے جس نے مصر و حجاز شام و عراق تک کے جلیل القدر علماء سے خراج تحسین حاصل کیا۔ دین کے اہم ترین موضوعات پر لاجواب تحقیقی مواد تاریخ فلسفہ، تصوف، فقہ، اصول اور دیگر فنون شریفہ کا بیش بہا گنجینہ۔ ترجمہ شستہ۔ عربی متن ساتھ ساتھ ہے۔
دو جلدوں میں مکمل۔ مجلد

قیمت بیس روپے

ریاض الصالحین مترجم اردو (مع عربی)

۳۴۴ آیات قرآنی اور ۱۸۹۶ احادیث نبوی صلعم کا

بیش بہا ذخیرہ

امام محی الدین ابی ذکریا یحییٰ بن شرف النووی متوفی ۶۷۶ھ نے اس بے نظیر کتاب کو بڑی تحقیق و جستجو کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ ایمان افروز قابل مطالعہ مجموعہ ہے۔
ترجمہ و فوائد۔ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی
قیمت مکمل مجلد بیس روپے

البرامکہ

مصنفہ مولانا عبد الرزاق کانپوری

عالم اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی، اور جعفر برمکی کون تھے انھوں نے عہد عباسیہ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان دانشور اور مدبر وزیروں کے عروج و زوال کی حیرت انگیز و عبرت انگیز داستان۔

قیمت مکمل مجلد بیس روپے

آئینۂ حقیقت نما

مصنفہ:- مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

ہندو اور مغربی مورخین گذشتہ دو سو سال سے ہندوستان پر مسلم فاتحین کے حالات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر پیش کر رہے تھے اور مسلمان حکمرانوں کی ساری خوبیاں خامیاں ہوکر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں مورخ اسلام نے محققانہ قلم اٹھایا اور تمام الزامات کا مدلل اور دندان شکن جواب تاریخ کی روشنی میں لکھا جو "آئینۂ حقیقت نما" کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب حیرت انگیز تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔ قیمت مکمل مجلد بارہ روپے

الادب المفرد مترجم اردو (مع عربی)

دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدث امام بخاریؒ کی جمع کردہ اُن احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و آثار صحابہ کا انمول ذخیرہ، جو تمام تر شخصی اخلاق خاندانی تعلقات، انسانی حقوق، معاشرے اور قومی فرائض سے متعلق ہیں اس عظیم کتاب میں روزمرہ زندگی کے وہ زرّین اصول درج ہیں، جو ہر انسان کیلئے سرچشمۂ ہدایت ہیں قیمت مجلد بارہ روپے
نوٹ:- یہی کتاب بغیر عربی کے صرف اردو ترجمہ "کتاب زندگی" کے نام سے آٹھ روپے کی مل سکتی ہے۔

. . . .

مکاتیبِ زنداں

مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل احمد کے وہ خطوط جو زمانۂ قید و بند میں جیل سے لکھے گئے۔ سبق آموز دلپذیر۔ قیمت دو روپے۔

تجلّی کا خلافت نمبر

اس نمبر کو بفضلہٖ تعالیٰ کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسکی دائمی افادیت ہی کے پیش نظر اسے زائد چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی کچھ مقدار موجود ہے۔ جلد طلب فرمائیں۔
قیمت ایک روپیہ

تذکیۂ نفس

مولانا امین احسن اصلاحی کی مشہور کتاب جس میں تذکیۂ نفس کے تمام پہلوؤں پر فکر انگیز اور مفید و مؤثر گفتگو کی گئی ہے۔ قیمت مکمل و مجلّد چھ روپے۔

تجلّی کا خاص نمبر ۱۹۵۷ء

ایمان و عمل کے علمی و دینی مسئلہ پر معرکہ آرا بحث۔ بدعات کا مفصل رد اور دوسری مفید و دلچسپ چیزیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

مکاتیبِ سلیمانؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطوط مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام۔ قیمت مجلّد تین روپے۔

بدعت کیا ہے؟

بدعت کے رد اور سنت کے اثبات میں ایک عظیم الشان مقبول ترین کتاب یہ آپ کو عقائد کے باب میں بہت مدد دے گی۔ مجلّد تین روپے

عقائد الاسلام

تفسیر حقانی کے شہرۂ آفاق مفسّر مولانا عبد الحق حقانیؒ کی جلیل القدر کتاب جو اسلام کے عقائد سے روشناس کراتی ہے۔ مجلّد چار روپے

خالد سیف اللہ

اُس مردِ مجاہد کا مستند تذکرہ جسے اللہ کے سچّے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سیفٌ من سیوف اللہ کے لقب سے نوازا۔ جس کی شمشیر زنی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ عربی سے ترجمہ۔ ڈھائی روپے۔

اسلام کا نظامِ عدل

دنیائے عرب کے مشہور صاحبِ قلم عالم استاذ سید قطب کی بلند پایہ عربی تصنیف کا عمدہ اُردو ترجمہ جس میں اسلام کے نظامِ عدل کی سیر حاصل تشریح کی گئی ہے۔ مجلّد چھ روپے۔

نظام الملک طوسی

الپ ارسلان کے وزیر کبیر ابو علی حسن بن علی کی مبسوط سوانح عمری۔ قابلِ اعتماد تاریخی مواد۔
مؤلفہ:۔ مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ
قیمت بارہ روپے

تاریخِ اسلام کے حیرت انگیز لمحات

تاریخ کے بعض دلچسپ، اہم اور تعجب خیز واقعات کا عبرت آموز بیان۔ قیمت تین روپے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر

منکرینِ حدیث کے رد میں ایک مبسوط، مدلل اور دلچسپ کتاب۔ ان کے ہر ہر اشتباہ کا جواب۔ انکے افکار کی پوست کندہ حقیقت اور ان کے موقف کی لغویت کا اثبات۔ پُر لطف اور دلنشیں نقد۔ قیمت مکمل سہ حصہ ساڑھے تیرہ روپے

● امارتِ شرعی۔ مصنفہ:۔ سید محمد رشید رضا مدیر المنار مصر۔ مترجم:۔ مولانا ابو الفتح عزیزی۔ دو روپے دس آنے۔ ● خاصانِ خدا

چراغِ راہ (کراچی) کا

اسلامی قانون نمبر

یہ ضخیم نمبر مثالی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اسے اسلامی قانون کی انسائیکلوپیڈیا کہئے جس کی تدوین و تکمیل میں عرب و عجم کے بڑے بڑے فضلاء و ائمہ نے حصہ لیا ہے۔ ایک سے ایک اعلیٰ مقالہ۔ نفیس منتخب منظومات۔ نقشے۔ گوشوارے۔ خاکے۔ دو مبسوط حصوں میں۔ قیمت مکمل آٹھ روپے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی چار کتابیں اُردو لباس میں

الوسیلہ وسیلے کی حقیقت اور شرعی حدود کیا ہیں۔ کیا سنت ہے اور کیا بدعت۔ کونسا راستہ فلاحِ آخرت کا ہے اور کونسا گمراہی کا۔ لاجواب تحقیقی مواد۔ قیمت مجلد نو روپے۔ **تفسیر آیت کریمہ** تین روپے (مجلد ساڑھے تین روپے)

وجد و سماع گانا بجانا، قوالی، عرس وغیرہ کے بارے میں بے نظیر گفتگو۔ پیش لفظ مدیر تجلی کا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

مناسک حج حج اور مقامِ حج کے بارے میں محققانہ مواد۔ قیمت مجلد تین روپے۔

خلافتِ مُعاویہؓ و یزید

جناب محمود عباسی کی وہ ہنگامہ خیز کتاب جس کے دلائل قاہرہ اور تحقیقی مواد کا جواب نہ پاکر شیعہ اور اہلِ بدعت حضرات نے حکومت کا دروازہ جھانکا اور بعض مقامات پر اسے ضبط کرا دیا۔

واقعاتِ کربلا، اسوۂ یزید، موقف حسین اور شیعی انداز نظر کی گہری تنقیح و تنقید۔ سنجیدہ زبان۔ علمی لہجہ۔ باوقار استدلال۔ تاریخ کربلا کے متعلق ایک نیا لیکن تحقیقی زاویۂ نظر۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

علامہ ابن جوزیؒ کی ممتاز اصلاحی تالیف

تلبیس ابلیس (اردو)

مترجمہ: مولانا ابو محمد عبدالحق اعظم گڈھی

مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشان دہی۔ مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد کا بیان۔ مکائد شیطانی کی مبسوط اور عبرت انگیز داستان۔ قیمت دس روپے۔

● فضائل ذکر (مجلد) تین روپے ● احکام سلطانیہ۔ مصنفہ۔ علامہ ابوالحسن ماوردی مترجم مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مجلد چھ روپے

ساٹھ ہزار الفاظ کی مکمل عربی اُردو ڈکشنری

محاورات وضرب الامثال نیز اہم اشیاء کی
نادر تصاویر کا شاہکار

المنجد (اُردو)

المنجد کو تمام عربی زبان کی لغات میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ ابتک اس سے صرف عربی داں ہی فائدہ اُٹھا سکتے تھے لیکن اب اُردو داں بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس مترجم ایڈیشن میں متعدد خوبیاں اور بھی ہیں نیا مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں لغت کی تاریخ اور ماہرینِ لغت کے حالات درج ہیں۔

ضخامت ڈیڑھ ہزار سے زائد
قیمت مجلّد ستائیس روپے

عربی سیکھنے والوں کے لئے تحفۂ نادرہ

القاموس الجدید۔

ایک رفیع الشان اُردو عربی ڈکشنری

بے شمار اُردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال، محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔

مفید بیش قیمت اور جلیل القدر
قیمت مجلد سات روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کی چند کتابیں

● تذکرہ۔ سات روپے ● آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ چھ روپے
● مقالات آزاد۔ دو روپے ● مضامین البلاغ۔ پونے چار روپے
● عیدین۔ ڈیڑھ روپیہ ● شہادت حسین۔ ڈیڑھ روپیہ۔
● حقیقت الصلوٰۃ۔ ۷۵ نئے پیسے ● مضامین آزاد۔ دو روپے ● ملفوظات آزاد۔ ڈھائی روپے۔

مشہور دینی انشاپرداز نعیم صدیقی کی چند کتابیں

تحریک اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں	ڈیڑھ روپیہ
معروف و منکر	تین روپے
تخریب و تعمیر	تین روپے

شاہجہاں کے ایامِ اسیری اور

عہدِ اورنگ زیب

مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ (۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء) جس میں

شاہ جہاں کے آخری دور کا حال، اورنگ زیب کی بھائیوں سے کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پس پردہ واقعات اور اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

تازیانے

زین القضاۃ احمد بن محمد کی مشہور کتاب المنبہات کا اُردو ترجمہ (مع عربی متن) عبرت آموز حکایتیں۔ سبق آموز تمثیلیں۔ قیمت مجلد تین روپے

امام احمد ابن حنبل۔ ڈھائی روپے ● فضائل درود و سلام۔ ڈیڑھ روپیہ ● اسلام زندہ باد (اسلام کی حقانیت پر غیر مسلموں کے اعترافات) ایک روپیہ

TAJALLI DEOBAND U.P. Regd. NO. A 972

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی مشہور و معروف تفسیر

مکمل تفسیر بیان القرآن عکسی اردو

اصل نسخہ مطبوعہ تھانہ بھون ــــ فوٹو آفسیٹ کے ذریعے

مثالی خوبیوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے

تقریباً چالیس سال سے یہ تفسیر بیشتر مقامات سے بار ہا شائع ہو چکی اور ہو رہی ہے۔ لیکن جس حسن انتظام اور خوبیوں کے ساتھ حضرت تھانویؒ نے اپنی نگرانی میں "تھانہ بھون" سے شائع کرائی تھی آج تک کوئی دوسرا مطبع شائع نہیں کر سکا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اب ادارۂ تفسیر دیوبند نے تھانہ بھون کے مطبوعہ ۱۳۴۲ھ نسخے کا فوٹو لیکر نہایت موزوں سائز پر ماہانہ پروگرام کی شکل میں طبع کرنے کا اہتمام کیا ہے!

طریق اشاعت

۱- اس اشاعتی پروگرام میں شریک ہونے کے لئے صرف ایک روپیہ "فیس ممبری" ارسال کر کے اپنا نام اور پتہ خریداروں کے رجسٹر میں درج کرالیں۔

۲- قیمت فی جلد تین روپے (۳/-) محصولڈاک ایک روپیہ۔

۳- ممبران کو ہر ماہ ایک جلد صرف تین روپے میں بذریعہ وی پی ارسال کی جائیگی محصولڈاک معاف ہوگا۔

۴- مکمل تفسیر ۲۴ جلدوں میں تیار ہوگی، ہر ایک جلد میں تقریباً سوا پارہ کی تفسیر ہوگی۔

۵- پانچ احباب ملکر ایک پتہ پر پانچ جلدیں طلب کرینگے تو صرف بارہ روپے میں پیش کی جائیں گی۔

۶- ایجنٹ حضرات اور تاجران کتب کو معقول کمیشن دیا جائے گا معاملات خط و کتابت سے طے فرمالیں۔

تعاون کا طالب: منیجر ادارۂ تفسیر دیوبند (یوپی)

نومبر ۱۹۶۱ء
ماہنامہ
دیوبند
تجلی
تاریکیوں میں ایک چراغ
ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)
سالانہ:- سات روپے
۱۸ شلنگ
۶۲ نئے پیسے
دس آنے

ماہنامہ تجلی دیوبند

شمارہ نمبر ۵ — جلد نمبر ۱۴

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے)

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام و مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں سالہ جاری کردیا جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۲ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر: عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات: مکتبہ عثمانیہ ۲۲ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

ایک مسلمان بھی ان ملکوں کا صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف ہو سکتا ہے تو اب اس کے جواب میں مسلم اکثریت کے ملکوں کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسی طرز حکومت اختیار کریں جن کے تحت ان ملکوں کی غیر مسلم اقلیتوں کو بھی وہی مراعات اور وہی حقوق حاصل ہوں جو مسلمان اقلیتوں کو غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں حاصل ہیں یعنی وہاں سکولر جمہوریت ہو تو یہاں بھی وہی ہو۔

یاد رکھنا چاہئے کہ آج کل کا زمانہ پہلے زمانہ سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے ایک قوم دوسری قوم کو فتح کرتی تھی اور اس پر من مانے طریقوں سے اچھے ہوں یا برے، حکومت کرتی تھی۔ لیکن آج کوئی ایک ہی قوم کسی دوسری قوم کو تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کر سکتی۔ یہ دور عوامی تحریکات اور عوامی سرگرمیوں کا ہے اور ان تحریکات میں ملک کے سب عوام جو مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب کے اختلاف کے باوجود مل جل کر ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرتے ہیں اور تب ہی ملک آزاد ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں اور خود الجزائر میں بھی صورت حال یہی ہے۔ غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ہے جو وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہے۔ پس اب اگر ان سب کی متفقہ مساعی اور اشتراک عمل سے الجزائر آزاد ہوتا ہے اور الجزائر کے مسلمان تمام باتوں کے پیش نظر جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں الجزائر کے لئے سکولر جمہوریہ گورنمنٹ پسند کرتے ہیں تو اس میں برا ماننے کی یا ان پر لعن طعن کرنے کی کون سی بات ہے ایک سکولر جمہوریہ میں اسلامی مفادات کے تحفظ اور قانون حق کے اعلاء کا سروسامان کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس پر ہم آئندہ لکھیں گے

تجلی اگرچہ مدیر برہان کی خدمت میں پابندی سے جاتا ہے لیکن غالب گمان یہ ہے کہ ان کے اس اداریئے میں ہمارے اس شذرے کی طرف کوئی اشارہ نہیں جو اپریل مئی ۶۲ کے تجلی میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اول تو یوں کہ جس وقت برہان مئی ۶۲ کا شذرہ سپرد قلم کیا گیا ہوگا اس وقت تک مذکورہ تجلی اشاعت پذیر نہیں ہوا ہوگا۔ دوسرے یوں کہ الجزائری مجاہدوں کو مجاھدین فی سبیل اللہ اور غازی و شہید کے خطابات سے نوازنے کی جو پر شوق جلد بازی ان کی نگاہ میں قابل اعتراض ہے ہم نے خود بھی اپنے شذرے میں اس کی تحسین و حمایت نہیں کی ہے بلکہ وعظ و تذکیر کے انداز میں اس پر تنبیہ ہی کی ہے لہٰذا ان کے ایراد و اعتراض کا رخ ہماری طرف نہیں ہو سکتا۔

مگر چونکہ نچوڑ ہمارے شذرے کا بھی یہی ہے کہ الجزائری فاتحین کو اعلائے کلمۃ الحق پر توجہ دینی چاہئے اور یہی وہ آرزو ہے جسے مولانا موصوف نے شد و مد کے ساتھ نشانۂ تردید و ملامت بنایا ہے اس لئے ان کی عدالت علم و تفقہ میں ہم خود کو بھی ملزموں ہی کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرتے ہیں اور قانون عدل ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی صفائی میں زبان کھولیں۔

سب سے بڑی بات جو ہمارے استعجاب کا باعث ہے، یہ ہے کہ مولانا کا پورا شذرہ اس اساسی یقین کی ذرا بھی نشاندہی نہیں کرتا کہ اس کے مصنف کے نزدیک اسلامی نظام عدل، اسلامی نظام حکومت، اسلامی نظام معاشرت اور اسلامی آئین و دستور کو دنیا کے دوسرے ازموں اور نظاموں پر کوئی فوقیت حاصل ہے بلکہ صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کی نگاہ میں اسلام اور غیر اسلام اصولی طور پر یکساں ہیں۔

گستاخی معاف اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہم یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ اس شذرے میں صاف طور پر اس یقین کا اظہار کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام حکومت و سیاست اقلیتوں کے ساتھ صریح ناانصافی اور نمایاں ظلم و زیادتی پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اقلیتوں کے ساتھ جو حسن سلوک لادینی دستور جائز رکھتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصنف کی دانست میں اللہ اور رسول کا معین فرمودہ اسلامی دستور اقلیتوں کے حق میں ظلم و غصب اور حق تلفی پر مبنی ہے۔

ان فقروں کو ہم نے کئی بار غور سے پڑھا۔

"لیکن جس ملک میں آپ کی ذرا سی بھی اکثریت ہوتی ہے وہاں آپ اس ملک کی غیر مسلم اقلیتوں کا

ذرا خیال نہیں کرتے اور جھٹ اپنی حکومت کے "اسلامی" ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔"

یہ فقرے اگرچہ غیر مسلموں کی طرف سے ایک مفروضہ اعتراض کے ضمن میں آئے ہیں لیکن مولانا نے ان کو تصویب ہی کے سیاق میں سپرد قلم کیا ہے۔ اس صورت میں ہماری ناقص عقل اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی کہ موصوف کے نزدیک اسلامی آئین جو حقوق غیر مسلموں کو دیتا اور جو سلوک ان کے ساتھ کرتا ہے وہ عدل کے تقاضوں سے نہ صرف فروتر ہے بلکہ اتنا ناقص اور خود غرضانہ ہے کہ اسے اقلیتوں کی طرف سے مجرمانہ قسم کی لاپروائی پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔

"غیر مسلم اقلیتوں کا ذرا خیال نہیں کرتے"

کے الفاظ کی وسعت پر نظر کیجئے۔ کیا ان سے یہی واضح نہیں ہوتا کہ اسلامی آئین غیر مسلم اقلیتوں کے حق میں تھوڑا بہت بے انصاف نہیں بلکہ کامل طور پر ظالم و غاصب ہے۔ یہ ہولناک عقیدہ شعوری طور پر تو کسی ہوشمند مسلمان کا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا مآل تو اس خدا اور رسولؐ کو ظالم و خائن قرار دینا ہے جس نے اسلام ہی کو واحد دین حق اور اسلام ہی کے مطابق فیصلے کرنے کو واحد راہِ نجات ٹھیرایا ہے۔ البتہ غیر شعوری طور پر یہی ہولناک عقیدہ متذکرہ فقروں سے خاص طور پر اور پورے اداریے سے عام طور پر مترشح ہوتا ہے۔

اعتراض کا ہدف

کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کا ہدف دراصل حقیقی آئین اسلام نہیں ہے بلکہ وہ نام نہاد اسلامی حکومتیں ہیں جو لیبل تو اسلام کا لگاتی ہیں مگر عمل من مانا کرتی ہیں۔

لیکن یہ توجیہہ کئی وجوہ سے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ اولاً یوں کہ پورے ہی اداریہ میں مخالفت مطلق نظام اسلامی کی گئی ہے نہ کہ دوغلی حکومتوں کی۔ ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ مولانا کو اعتراض اسلامی نظام کی کسی بگڑی ہوئی شکل پر ہے یا وہ منافقت اور دورنگی پر لے دے کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ بر ملا اور اصرار کے ساتھ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی بہتر سے بہتر اور صحیح سے صحیح شکل بھی ایسی نہیں ہے جو خود ملت اسلامیہ میں پائے جانے والے گروہوں اور ملت سے باہر کی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کا حق ادا کر سکے۔

ثانیاً یوں کہ وہ خود ہی تصریح فرما گئے ہیں کہ میرے اعتراضات کا رخ صرف ان حکومتوں کی طرف نہیں جو برائے نام اسلامی حکومتیں ہیں بلکہ اس حکومت کی طرف بھی ہے جو درحقیقت اسلامی حکومت ہو۔ یہ الفاظ کہ:۔

"اس سے قطع نظر کہ وہ درحقیقت اسلامی ہے یا محض برائے نام ہی"

اس خیال کے صریح اعتراف کا درجہ رکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کی حقیقی سے حقیقی شکل بھی آج کے معروف و مقبول تصور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور ایک حقیقی اسلامی حکومت کا قیام بھی ان وجوہ کی بنا پر جرم و گناہ قرار پا گیا ہے جنھیں مولانا نے شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گویا جو بات متجددین کہتے آئے ہیں اسی کا یقین مولانا بھی دلا رہے ہیں کہ اسلامی حکومت و خلافت ایک مخصوص دور کے حالات و کوائف تک محدود تھی۔ بعد کے زمانوں میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انصاف کے تقاضے سب سے بڑھ کر اور بہتر طور پر اللہ اور رسولؐ ہی کے پسند فرمودہ نظام کے تحت پورے ہو سکتے ہیں جہل بات ہے۔

ثالثاً یوں کہ اس وقت دنیا میں وہ حکومتیں موجود ہی کہاں ہیں جنھوں نے باضابطہ خود کو "اسلامی" قرار دے رکھا ہو ایک دو کے بارے میں تو آپ جو چاہے کہہ لیجئے۔ باقی تمام دنیا میں مسلمانوں کی حکومتیں تو ماشاء اللہ بہت سی ہیں۔ لیکن کسی نے بھی یہ تکلف نہیں فرمایا کہ اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے "اسلامی" کا لیبل لگائیں۔ یوں نہیں لگایا کہ تانبے کو سونا کہہ کر فریب کار آدمی صرف اس وجہ سے کہتا ہے کہ سونے کا قیمتی ہونا تو مسلم ہے۔ لیکن اسلام کا قیمتی ہونا صرف مسلمانوں کی نظر میں مسلم نہیں رہا بلکہ اس نام سے تو انھیں ایسی شرم آتی ہے

جیسے پیچ بازار کے سکے کر دیئے گئے ہوں اس لئے اپنی دنیا پرستی اور بے کرداری کا پردہ " اسلام " کو کیوں بنانے لگے ۔ تو جب برائے نام " اسلامی " حکومتوں کا وجود ہی عنقا ہے تو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا نشانۂ ملامت " برائے نام اسلامی حکومتیں " ہو سکتی ہیں ۔

یہ سہ گونہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر مولانا کا مطمع نظر یہی طے پاتا ہے کہ نظری سطح پر بھی سکولر نظام حکومت اسلامی نظام حکومت کے مقابلہ میں عدل و انسانیت کا فائق ترین مظہر ہے اور مسلمان کے لئے یہ تمنا کرنا بھی مجرمانہ حماقت کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس وسیع دنیا کے کسی چھوٹے ہی سے قطعۂ ارض پر اسلامی نظام و آئین برپا ہو جائے ۔

ہمیں یہی بات کھلی ہے کہ زیر بحث اداریئے کی رو سے اسلامی آئین و سیاست کو عقیدۃً بھی ہر انسانی نظام سے بہتر اور عادلانہ تصور کرنا جرم ٹھیر گیا ہے ورنہ جہانتک نظام اسلامی کے عملاً قائم و برپا ہونے کا تعلق ہے اس کی دشواریوں پیچیدگیوں اور رکاوٹوں کے احساس و اعتراف سے ہم بھی گریز نہیں کر سکتے ۔

سطحی موانع

اداریئے کے دوسرے پیرے میں ملت کے مختلف الخیال فرقوں کے تعلق سے جو مشکل نمایاں کی گئی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو پاکستان میں اسلام پسند حلقوں کے بالمقابل مغربیت اور تجدد کے شیدائی زور و شور سے نمایاں کرتے آئے ہیں ۔ ہمیں تعجب ہے کہ مولانا کی نظر اس حل کی طرف نہیں گئی جو پاکستان کے متعدد علماء نے اس دشواری کا پیش فرمایا تھا ۔ اور اس امر واقعہ کو بھی افسوس نظرانداز کر دیا کہ کھلے کافروں کے مقابلہ میں نہیں بلکہ مسلم نما کافروں کے مقابلہ میں ہی پاکستان کے ۳۱ علماء اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو گئے تھے حالانکہ یہ وہی مختلف الخیال علماء تھے جنھیں سنی ، شیعہ ، حنفی ، شافعی ، بریلوی ، دیوبندی وغیرہ کہا جاتا ہے اور جن کے فروعی اختلافات کو مولانا نظام اسلامی کی راہ کا اٹل ہمالیہ قرار دے رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ فروعی اختلافات کے باوجود مسلمان علماء کی اکثریت کے قلوب میں آج بھی یہ عقیدہ

راسخ نہیں ہے کہ غیر اسلامی نظام کے مقابلہ میں اسلامی نظام بہرحال اتنا ارفع ہے کہ اس کی خاطر باہمی نزاع کو کم کیا جا سکتا ہے ، اگر حالات انھیں کبھی موقع دیں تو یقیناً وہ اتنی عقل اور استعداد رکھتے ہیں کہ اسلام کی مشترک قدروں اور اصولوں پر متفق ہو کر اسلامی نظام کا ڈھانچہ بنا سکیں ۔ خصوصاً جب اسلامی نظام کی حیثیت محض تخیلی نہیں ہے بلکہ وہ اسی زمین پر کچھ دنوں قائم بھی رہ چکا ہے تو دوبارہ اس کے قیام کو محالات میں شمار نہیں کیا جا سکتا ۔

یہ بات نہایت عجیب ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کو عملاً ایک پہیلی ثابت کرنے کے سلسلے میں یہ معارضہ بھی پیش فرمایا گیا ہے کہ اگر اسلامی حکومت میں آخری فیصلے عددی اکثریت پر منحصر ٹھیرے

" تو سنی یا شیعہ (مثلاً) جو فرقہ بھی اقلیت میں رہ جائے گا وہ محسوس کرے گا کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے "

موانع کی حقیقت

ہم عرض کریں گے کہ مولانا جس سکولر نظام کی برتری اور معدلت کو نمایاں فرما رہے ہیں اس کا تو مسلمہ اصول ہی یہ ہے کہ مسائل کے فیصلے عددی اکثریت سے ہوا کریں اور ننانوے میں اکیاون سر بھی جس رائے میں ہمنوا ہو جائیں اسے برحق مان کر یہ پروا نہ کی جائے کہ باقی انچاس کے دلوں پر کیا گزر گئی ہے ۔ تو اس " عجیب " کے سوا کیا کہا جائے گا کہ سیکولرازم میں اگر عددی اقلیتوں کو قدم قدم پر ظلم اور پسپائی کا احساس ہوتا رہے تو اس سے سیکولرازم کی عفت و تقدیس پر کوئی حرف نہ آئے ۔ لیکن یہی چیز " اسلامی حکومت " کے معاملہ میں اتنی بھیانک ، ایسی وحشتناک ، اس قدر ظالمانہ بن جائے کہ اسکی بنیاد پر اسلامی حکومت کے قیام ہی کو خارج از بحث اور محال قرار دیا جا سکے ۔

علاوہ ازیں ہم کہیں گے کہ جن اقدامات کی صحت و محمودیت پر حکمراں طبقہ ایمان رکھتا ہو ان کو روبہ کار لانے کے سلسلہ میں یہ اندیشہ ہرگز کوئی وزن نہیں رکھتا کہ فلاں فرقے کو احساس ظلم ہوگا اور فلاں گروہ شکایتیں لے دوڑے گا ۔ اگر مجرد یہ اندیشہ ہی مستحسن اقدامات کے لئے عذر معقول مان لیا جائے تو دنیا کی

کوئی بھی حکومت کسی برائی کے خلاف اقدام کرنے کی مجاز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ معاشرے میں پھیلی ہوئی ہر برائی، بہتیرے افراد اور جماعتوں کی ایسی عادت ثانیہ بن جاتی ہے کہ اسے مٹایا جائے تو انھیں لازماً احساس مظلومیت ہوگا۔ شراب، قمار، رشوت ستانی، چور بازاری، سودخواری کونسی برائی ایسی ہے جسے مٹایا جائے تو بے شمار لوگ کبیدۂ و محزون نہ ہوں۔ دنیا کا کوئی مقبول سے مقبول نظام ایسا نہیں ہے جس میں دعویٰ کیا جاسکے کہ ہر ہر فرد اس کے ہر ہر قانون سے متفق اور مسرور رہے وہ خلافت راشدہ جس کے آئیڈیل ہونے پر ہم مسلمان متفق ہیں اس میں بھی یہ ہرگز نہیں تھا کہ کسی کو کوئی شکایت ہی نہ رہی ہو۔ ہاشمی خانوادے کے اکثر افراد تو برابر اسی کو اپنے اوپر ظلم محسوس کرتے رہے تھے کہ بجائے حضرت علیؓ یا کسی اور ہاشمی کے ابوبکرؓ و عمرؓ خلیفہ بنتے چلے جارہے ہیں۔

مصدر انوار و محامد —— سیکولرازم ہی میں کہاں، ہر گروہ شکایت سے خالی اور احساس مظلومیت سے مبرّا ہے، صرف ٹیکسوں ہی کے معاملہ کو لے لیجئے کیا ہند و پاک کے بے شمار افراد اور ادارے اس بات کو ظلم نہیں محسوس نہیں کرتے کہ دستور نے حکمراں طبقے کو حسب دلخواہ ٹیکس لگانے کی آزادی دے رکھی ہے۔ کیا جرأت مند لوگ آئے دن کھل کر نہیں کہتے کہ ٹیکسوں کی یہ بھرمار ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ آفت ہے۔ اسی طرح سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین کو ظالمانہ قرار دینے والوں کی کیا کمی ہے ہم ان ناانصافیوں کی بات نہیں کررہے ہیں جو سیکولرازم کے سربراہ آئین و دستور کے خلاف روا رکھتے ہیں۔ اگر ان پر نظر کی جائے تب تو مسلمان سراپا شکایت ہی شکایت ہیں اور خود مولانا نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے اداریوں میں مسلمانوں کی مظلومیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ہم عین آئین و دستور کے بارے میں عرض کررہے ہیں کہ جب سیکولر اسٹیٹوں میں بھی اس کے بعض قوانین اور اصول و قواعد کو مبنی بر ظلم سمجھنے والے بھاری تعداد میں موجود ہیں اور رہیں گے۔ تو بیچارے نظام اسلام ہی کے قیام کے لئے یہ شرط کیوں ناگزیر ہے کہ ہر فرقہ، ہر گروہ، ہر شخص خوشی سے جھوم کر اعتراف کرنے لگے کہ ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے اور ہم پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے کیونکہ نہیں ہمیشہ یہ ناممکن رہا ہے اور ناممکن رہے گا۔ اجتماعی عمرانی مسائل میں بعض گروہوں کے نظریات و عقائد کو نظرانداز کردینا اکیلے اسلام ہی کا ظلم نہیں پوری دنیا میں ایک بھی نظام حکومت اور ازم آپ ایسا نہیں دکھا سکتے جو اجتماعی قوانین میں ایک ایک فرد اور ایک ایک گروہ کی خوشنودی کا لحاظ رکھتا ہو۔ اپنے ہندوستان ہی میں دیکھ لیجئے۔ چھوت چھات کو قانوناً جرم قرار دیا گیا حالانکہ یہ مذہبی عقیدے کا مسئلہ ہے اور اس ملک کا صرف ایک دو گروہ ہی نہیں، لاکھ دو لاکھ افراد ہی نہیں۔ بیشمار گروہ اور کروڑوں افراد چھوت چھات پر ایمان رکھتے ہیں — جی ہاں ایمان جسکا تعلق جذباتی شیفتگی سے ہے۔ دھرم سے ہے ان کا خیال ہے چھوت چھات کو خلاف قانون قرار دینا دھرم کا اپمان ہے۔ ظلم ہے۔ نکاح و طلاق اور ورثے وغیرہ کے مسائل میں جو اصلاحیں حکومت اپنے نقطۂ نظر سے کرتی جارہی ہے اور کرتی جائیگی وہ بھی اسی نوع کی ہیں کہ ملک کے کروڑوں باشندے انھیں ظلم ہی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں یہ ٹھیک ایسی ہی صورت ہے جیسی مولانا نے سنی اور شیعہ فرقوں کی تمثیل میں پیش فرمائی ہے، وہاں بھی مذہبی عقائد کا معاملہ ہے اور یہاں بھی۔ تو سیکولر اسٹیٹ کا یہ طرز عمل اگر افراتفری اور بدنظمی نہیں پھیلاتا تو ایک حقیقی اسلامی حکومت کا یہ طرز عمل کیوں افراتفری اور بدنظمی پھیلانے کے مرادف قرار دیا جائے گا کہ وہ بعض فرقوں کے ان عقائد و مرضیات کو نظرانداز کردے جو سماج اور تمدن کو ناپاکیوں اور حرام کاریوں کا چوبچہ بناتے ہیں۔ مانا کہ متعہ اور سودخواری اور صریح قبر پرستی پر بھی بعض مدعیان اسلام عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن یوں تو اپنے دیس میں کتنے ہی لوگ قمار کے جواز چوری ڈکیتی کی افادیت، چھوت چھات کی حقانیت، بیوا کے ستی ہوجانے کی مذہبی اہمیت یہاں تک کہ کمیونزم تک پہ ایمان رکھتے ہیں جو زنا سے لیکر قتل تک کسی بھی فعل کو بالذات غیر اخلاقی نہیں مانتا —— اگر ان سب حضرات کے نظریات و مرضیات کے خلاف قوانین بنا دینا سیکولرازم اور جمہوریت کے لئے جرم و عیب نہیں ہے تو اسلامی حکومت ہی کے لئے یہ بات کیوں جرم و عیب اور ظلم و زیادتی بن جائے گی کہ اس نے

بعض ایسے باطل و ناز یبا افعال و اعمال کو خلاف قانون قرار دیا
جنھیں مسلمانوں کے کسی گروہ نے اسی طرح حق سمجھ کر داخل عقیدہ
کر لیا ہے جس طرح اہل ہنود نے چھوت چھات اور ستی ہو جانے کی
رسم وغیرہ کو مذہبی عقائد کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

مغالطہ اندوزی

مغرب زدہ متجددین نے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا ہے اور
کر رہے ہیں کہ جب بھی کسی طرف سے اسلامی نظام حکومت
اور اقامت دین کا مطالبہ کیا جائے اس کا لازمی مطلب یہ ہوتا
ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی سود اکدم بند کر دیا جائیگا
چوروں کے ہاتھ دھڑا دھڑ کاٹے جانے لگیں گے۔ زانیوں
پر فوراً کوڑے برسائے جائیں گے یا رجم کیا جائے گا، سنیماؤں
تھیٹروں، ناچ گھروں میں آگ لگا دی جائے گی۔ شراب کا
کوئی قطرہ جاں بلب مریضوں تک کو نصیب نہیں ہو پائے گا۔
وغیر ذلک۔

ظاہر ہے اس طرح کے پروپیگنڈے سے عوام کا خوف و
دہشت میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ کیونکہ کسی دیو ہیکل مشین کو
یکلخت بریک لگا دینے کا تصور ہی ہولناک خطرات سے بھرپور
ہے۔ وہ یقیناً ایسے داعیان اسلام سے پناہ مانگیں گے جو تمدن و
معاشرت کی گاڑی کو یک قلم ٹھپ کر دینے کا ارادہ رکھتے ہوں
اور اتنا بھی شعور انھیں نہ ہو کہ تناور درختوں کو اکھاڑ کر ان کی جگہ
دوسرے درخت اگانا بھونچالی قسم کے اقدامات کے
بس کا نہیں ہوا کرتا۔

کوئی حیرت کی بات نہیں اگر مغرب زدہ حضرات عوام کو
یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلامی نظام آندھی اور طوفان کی طرح
معاشرے کو الٹ پلٹ کر رکھ دے گا اور اس نظام کو چلانے
والے یہ بالکل نہیں سوچیں گے کہ کونسی برائی ایسی ہے جسے
شدت و قوت کے ساتھ فوراً مٹانا ضروری ہے اور کونسی برائی
اس زنگ کی مانند ہے جسے شدید و قوی ضربوں سے نہیں رفتہ رفتہ
ریتی اور ریگ مال سے گھس کر ہی زائل کرنا ممکن ہے۔ مگر حیرت
اس پر ہے کہ مولانا اکبرآبادی جیسا فہمیدہ فاضل بھی اس قسم کا
تاثر دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

سود ہو یا جوا۔ بدکاری ہو یا عریانی۔ رشوت ہو یا شراب
کوئی برائی ایسی نہیں ہے جسے مٹا کر اس کا متبادل بھی اور مفید چیز
سے پر کرنے کی صلاحیت اسلام میں نہ ہو۔ لیکن ظاہر یات سے
کہ باطل افکار و تصورات نے صدیوں میں تہذیب و تمدن کے
جو ڈھانچے اور اقتصاد و معیشت کے جو محل تیار کئے ہیں انھیں
چشم زدن میں توڑ پھوڑ کر ان کی جگہ بالکل نئے ڈھانچے اور محل
کھڑے کر دینا کسی بھی سمجھدار داعی اسلام کے حیطہ خیال میں نہیں
ہو سکتا۔ ہر سمجھدار داعی خوب جانتا ہے کہ اگر اسلام پسندوں
کے ہاتھ میں کسی قطعہ ارض کی باگ ڈور آ جائے تو کرنے کا کام
سب سے پہلے یہ ہے کہ وہ قانون خداوندی کو بندوں کے
خود ساختہ قوانین پر غالب و نافذ کرنے کا تہہ دل سے جہاد
کریں۔ اس کے بعد تمام وسائل و ذرائع جو آج عموماً باطل تصورات
کے فروغ و شیوع کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں قانون خداوندی
کے احیاء و تجدید کی خدمت پر لگا دیں۔ تب ہی یہ ممکن ہے
صدیوں کے ساختہ پرداختہ نظام کی دیواریں رفتہ رفتہ منہدم
ہوں اور ان کی جگہ اسلامی نظام کی دیواریں تعمیر ہوتی چلی جائیں
محل بنتے بنتے بنتے ہیں اور قلعے ٹوٹتے ٹوٹتے کھنڈر کی شکل اختیار
کرتے ہیں۔ ہم پہلے یہ طے کریں کہ فلاں عمارت کو توڑنا اور
اس کی جگہ فلاں قسم کی عمارت بنانا ہمارا واحد مقصد حیات
ہے۔ رہا اگر یہ ہو کہ ہم عملی جدوجہد اور ایثار و قربانی سے
بے تعلق رہکر گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے لگائے ہر مسئلہ کا حل ڈھونڈ
نکالنا چاہیں تو بےشک کوئی گتھی نہیں سلجھ سکتی۔

تیسرے پیرے میں مولانائے محترم نے سوال پر
سوال قائم کئے ہیں۔ ان سوالات کی پیدائش بھی ہماری
رائے میں بعض مسلمات کو نظر انداز کر دینے اور بعض حقائق
الٹ دینے کا نتیجہ ہے۔ ہم سے کہیں زیادہ مولانا کو علم ہے کہ دنیا
کے کسی بھی مذہب کے پاس ایسا کوئی نظام نہیں ہے جو حیات
زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں پر حاوی ہو۔ یہ ہم
نہیں کہتے بلکہ خود ان مذاہب کے ائمہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے

۔ان کا مذہب زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے
س کے برخلاف اسلام ایک ہمہ گیر و جامع مذہب ہے اور
اس کے قوانین دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے
یہ قدرتی بات ہے کہ مسلمان اپنے اوپر عیسائی یا یہودی یا ہندو
نظام کے تسلط پر معترض ہوں کیونکہ جب ان مذاہب نے اصطلاحی
عبادتوں کے سوا کوئی جامع اور تفصیلی نظام پیش نہیں کیا تو اسکے
سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ حکمراں طبقہ من مانے قوانین نافذ کریگا
جن کے بارے میں پہلے سے یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس
کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ کس قماش کے ہوں گے۔ قرینہ یہی
کہتا ہے کہ وہ ہمارے مذہبی اور انسانی حقوق کو پامال کرنیوالے
ہوں گے کیونکہ من مانے قوانین عموماً خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ
ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً جس مذہب کے حاملین اپنے ہی ہم مذہب
بھائیوں میں ہولناک نوعیت کی اونچ نیچ اور چھوت چھات کے
معتقد ہوں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ غیر مذہب والوں کو
فراخدلی کے ساتھ انسانی و مذہبی حقوق دے سکیں گے۔

مگر اسلامی نظام میں من مانے قوانین کا کوئی مقام نہیں
کوئی بھی غیر مسلم آج بھی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اسلامی نظام غیر مسلموں
کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے اور مسلمان اپنے ہی عقیدے کی
رو سے طے شدہ دستور اسلامی کی پابندی پر کس درجہ مجبور و مامور ہے۔

اگر مولانائے محترم کے نزدیک آج بھی یہ صداقت، صداقت
ہی ہے کہ اسلامی آئین و دستور خدا کی مخلوق کے لئے بہترین عدل
پر مبنی ہے، وہ سیکولرازم کے نفاق سے خالی، جمہوریت کی
دورنگی سے بیزار اور انسانی حقوق کا سب سے بڑا علمبردار ہے
اس نے اپنے دامن کے سائے میں پرورش پانے والے غیر مسلموں
کو اولاد جیسا سمجھا ہے اور اپنی ذمہ داری میں آئے ہوئے غیر مسلموں
کے جان و مال اور عزت و آبرو کو اتنا ہی عزیز رکھا ہے جتنا خود
مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو۔

تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس منطقی تقابل کا کیا موقع رہا۔
جو اسلام اور غیر اسلام کے مابین ابھار کر پیش کیا گیا ہے اور اس کا
کیونکر جواز ہوا کہ عقائد کی سطح پر بھی اسلام کی برتری کا تصور جرم
قرار پاسکے۔

جو فلسفہ مولانا نے پیش کیا ہے اس کا تو واحد مطلب یہ
ہے کہ اب قیامت تک کے لئے کسی بھی مصر و دیار میں قانون
اسلامی کو نافذ و غالب کرنے کی سعی کرنا اور اعلائے کلمۃ الحق کو
نصب العین قرار دینا کار ثواب تو کجا یکسر فتنہ پردازی ہے دانشی
ملت دشمنی اور ظلم و تنگدلی کے مرادف ہوگا اور یہ یقین و عقیدہ لغویت
کہلائے گا کہ اسلام آج بھی ہماری ہر مشکل کا حل، ہر بگڑی کا کارساز اور
انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح کا پوری طرح ضامن ہے۔

ہم پریشان ہیں اس فلسفہ کو کیا نام دیں۔ ہمارے علم میں
ایمان کا کوئی درجہ ایسا نہیں جہاں قانون الٰہی اور اسلامی نظام کے
بارے میں اس طرح کے تحقیر انگیز اور مایوس کن زاویہ کی گنجائش
نکل سکے۔

مکہ مکرمہ سے نکلنے والا "الندوۃ" ہمارے سامنے ہے
(بابت ۱۴ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۱ھ) اس میں ۸ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۱ھ کے عکاظ
سے عراق، پاکستان، ہندوستان اور حجاز کے علماء کے کچھ فتاویٰ
نقل کئے گئے ہیں۔ ان میں ہی عراق کے فضیلۃ الشیخ محمد
محمود الصواف کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

ومن اعتقد ان الاسلام	جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اسلام
غیر صالح لحیاتنا الیوم	موجودہ زمانے میں ہمارے لئے
فقد کفر و ارتد	فتنے اور ضرر کے سوا اصلاح و
عن الاسلام۔	فلاح کی صلاحیت نہیں رکھتا
+ + + + +	وہ کفر کا مرتکب ہے اور اسلام سے
+ + + + +	خارج ہو چکا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مولانا اکبرآبادی ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے
ان کے جو افکار آج تک سامنے آتے رہے ہیں وہ اس عقیدے اور
اس کے مضمرات کے برخلاف ایمان اور صالحیت کے مظہر رہے ہیں
پھر انھوں نے یکلخت ایک ایسا اداریہ کیوں سپرد قلم کر دیا جو اسی
عقیدۂ فاسدہ کا آئینہ دار نظر آتا ہے تو یہ کسی ماہر نفسیات ہی کے
حل کرنے کا معمہ ہے۔ ہم صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکے ہیں کہ شاید
یہ اس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آب و ہوا کا اثر ہے جو بقول
مولانا عبد الماجد دریابادی "شدھی کی راہ پر" قدم زن
ہو چکی ہے۔

حیرتناک باتیں

تیسرے پیرے کو بار بار پڑھئے۔ یہ حیرتوں کا منبع ہے مولانا اس میں اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ثابت کرنے کے لئے یہ اندیشہ خوب ابھار کر پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمان اکثریت والے ممالک نے اسلامی حکومت قائم کی تو سیکولر ممالک مسلمانوں کو خود غرض اور موقع پرست قرار دیں گے اور اکثریت کا دل ان کی طرف سے میلا ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا کی دانست میں فی الحال اکثریت کا دل مسلمانوں کی طرف سے بالکل صاف ہے اور انھیں خود غرض اور موقع پرست خیال کرنے کی اکثریت کو ہرگز مجال نہیں ہے۔

اب ہم کیا کہیں، مولانا نے اپنے اسی اداریئے کے آغاز میں مسلمانوں کو حقیقت پسندی سے گریز اور جذباتیت سے لو لگانے کا طعنہ دیا ہے۔ لیکن خود ان کا یہ خیال کس حد تک حقیقت پسندانہ ہے اس کا فیصلہ ہر ہوشمند بہ ادنیٰ تامل کر سکتا ہے سیکولرازم کے زیر سایہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اسے بار بار یاد دلاتے ہوئے بڑا انقباض ہوتا ہے۔ یہ پانچ سو سے اوپر فسادات جن میں مسلمانوں ہی کا قتل عام ہوا۔ اور یہ ہر شعبۂ زندگی میں قدم قدم پر لطف و کرم کی بارشیں خود مولانا بھی تو کبھی کبھی ان کا ماتم کرتے رہے ہیں اور ابھی اس تحریر کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے جو مولانا ہی نے مسٹر چھاگلہ کی گل افشانی پر نقد کرتے ہوئے سپرد قلم کی تھی اور اسمیں مسلمانوں پر توڑی جانے والی بعض قیامتوں کا ذکر کیا تھا۔

یہ سب کیا دل صاف ہونے کی باتیں ہیں؟ کیا مسلمان پھولوں کی سیج پر سو رہے ہیں جو انھیں کانٹوں کا خوف دلایا جائے؟ خود غرض اور موقع پرست کی بھی ایک ہی رہی۔ مولنا ان ہلکے پھلکے الفاظ کو لئے پھرتے ہیں حالانکہ اکثریت انھیں اس سے کہیں زیادہ بھیانک، سخت اور تلخ خطابات دینے سے نہیں چوک رہی ہے۔ غدار، وطن دشمن، علیحدگی پسند، فرقہ پرست جنونی۔ کونسی سیاسی گالی ہے جو انھیں آزادی کے روز اول سے آج تک نہیں دی جا رہی ہے۔ اور یہ عطا صرف عوام کی نہیں، وہ لوگ اس میں پیش پیش ہیں جنھیں خیر سے سیکولرازم کے خداوند اور کانگریسی وسیع النظری کے مہبط و مصدر ہونے کا شرف حاصل ہے دور نہ جائیے ابھی ہمارے وزیر داخلہ لال بہادر شاستری صاحب نے ہی کھل کر اس کا ثبوت پیش فرما دیا ہے کہ مسلمان بن کر زندہ رہنے کی تمنا کرنے والوں کے لئے ان کے سیکولرازم میں کوئی جگہ نہیں۔

اس معلوم و معروف صورت حال کے باوجود مولانا نے اس طرح کی باتیں فرمائی ہیں جیسے مسلمان جنت میں بس رہے ہوں اور کسی جگہ اسلامی حکومت کے قیام سے اس جنت کو خطرہ لاحق ہو۔

کاش مولانا اس پر غور کرتے کہ کسی بھی ملک میں سیکولرازم کا قیام اس لئے نہیں ہوا ہے کہ چونکہ اکثریت کے دل مسلمانوں کی طرف سے صاف ہیں۔ اس لئے وہ انھیں مراعات سے نوازنا چاہتی ہے سیکولرازم کو اپنانے کی بنیادی وجہ پوری دنیا پر مغربی افکار کا رعب تسلط ہے۔ مغرب نے اپنی لادینی ذہنیت کے تحت سیکولرازم کو اپنایا۔ جب وہ مسلمان بھی مغرب کی ذہنی غلامی اختیار کر سکتے ہیں جنکے پاس اپنا ایک مستقل نظام حیات ہے تو دوسری قومیں کیوں نہ اس غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں گی جن کے پاس اپنا کوئی جامع نظام حیات سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ گمان کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ چونکہ مسلمان اکثریت کی مملکتیں "اسلامی حکومت" نہیں بنا رہیں بلکہ سیکولرازم ہی کو گلے لگائے ہوئے ہیں اس لئے ہمارے غیر مسلم اکثریت کے ملک میں سیکولرازم قائم کر دیا گیا ہے اور اگر اسلامی حکومتیں بننی شروع ہو گئیں تو جھٹ سے وہ سیکولرازم کو تہہ کر کے مستند مذہبی نوعیت کا نظام بنالیں گی۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ اندیشہ بے بنیاد ہے۔ بھلا سیکولر اسٹیٹ چلانے والوں کو انتقاماً کوئی دوسرا نظام قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے جب تجربہ نے انھیں اطمینان دلا دیا ہے کہ سیکولر دستور ہوتے ہوئے بھی حکمراں طبقہ من مانی کرنے کے لئے آزاد ہے اور کسی بھی اقلیت کے مفادات، کلچر، زبان، تہذیب، معاش حتیٰ کہ ان کی جانوں اور آبروؤں تک سے جو چاہے سلوک کرتے ہوئے اپنے کلچر

پنی آئیڈیالوجی، اپنے عقائد اور اپنے افراض و مفادات کو فروغ دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

جس گروہ کو یہ پارس کی پتھری ہاتھ آجائے کہ سیکولرازم کا لیبل لگا کر نیک نام بھی رہو اور تمام وہ من مانیاں بھی کرتے رہو جن کا سیکولرازم سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس کی عقل پر کیا پتھر پڑ جائیں گے کہ بھونڈے پن سے اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو وہ جوش انتقام میں اس پارس کی پتھری کو دریا برد کر دے۔ آج سیکولرازم کے ہوتے ہوئے بھی اگر وہ تمام ناانصافیاں ارتکاب میں آسکتی ہیں جن کا اقرار خود مولانا کو بھی ہے تو کون سی ناانصافی ہے جس کا ارتکاب کرنے کے لئے کسی اور نوع کی حکومت قائم کرنا ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی کچھ عجیب نہیں کہ اگر کہیں حقیقی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تب بھی مولانا کے نزدیک وہ لازماً بے انصافیوں اور ستم رانیوں پر مبنی ہو گی جس کا انتقام لینے کے لئے سیکولر حکومتیں تڑپ اٹھیں گی۔ حالانکہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ جب کبھی کسی جگہ حقیقی اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے وہاں کی اقلیتوں نے اسے اپنے حق میں نعمت تصور کیا ہے اور علمی و نظری سطح پر بھی یہ بات اٹل ہے کہ مجموعی طور پر جو تحفظات اور حقوق اسلامی نظام اپنے دائرۂ عاطفت میں بسنے والے غیر مسلموں کو دیتا ہے وہ اس لادینی نظام سے کہیں زیادہ ہیں جو دعویٰ تو رواداری اور مساوات کا کرتا ہے لیکن عملاً اس میں اکثریت کے ذاتی افکار و عقائد کی عملداری ہوتی ہے اور اقلیتوں کا ہر حق اکثریت کے رحم و کرم پر معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارا ملک اس کی زندہ مثال ہے یہاں دستور نے تو اقلیتوں کو مساوات کا درجہ دیا لیکن عملاً ہماری زبردستی اور بے کسی اس مرحلہ میں ہے کہ ہم پہ نئے دن یلغار ہو ہمارے خاندان کے خاندان زندہ جلا دیئے جائیں، ہماری جائدادیں برباد کر دی جائیں، ہماری آبروئیں لوٹ لی جائیں، ہمارے اقتصادی وسائل پے در پے حملے ہوں۔ ہمیں ملازمتوں میں صحیح تناسب نہ مل سکے، ہمیں درد سے کراہنے اور ناانصافیوں پر احتجاج کرنے کے صلہ میں فرقہ پرست کہا جائے۔ مگر نہ قاتلوں کو پھانسی ملے۔ نہ لٹیروں سے بھرپور محاسبہ ہو۔ نہ زخموں پر پھاہے رکھے جائیں بلکہ الٹا مجرم گردانا جائے اور رواداری اور مساوات کے فلک شگاف دعووں کا پرچم جوں کا توں آسمانوں میں لہراتا رہے۔

یہ بالکل الگ مسئلہ ہے کہ حقیقی اسلامی نظام کا قیام اس وقت کس جگہ کس قدر دشوار ہے۔ بحث عملی امکانات کی نہیں عقیدہ و فکر کی ہے۔ زیر گفتگو شذرے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی نظام مولانا کی نگاہ میں حقیقتاً بھی ایک برائی اور ظلم ہی سے عبارت ہے جس کے جواب میں غیر مسلم حکومتوں کی طرف سے انتقام ہی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اچھا اثر لیا جائے اور اس کی تعریف کی جائے۔ حالانکہ ہم اس کے برخلاف یہ یقین رکھتے ہیں کہ مرکھپ کے اگر کہیں حقیقی اسلامی نظام قائم ہو جائے تو اسلام کے بارے میں وہ رفتہ رفتہ دیگر اقوام کی غلط فہمیوں کا بہترین ازالہ کر سکے گا اور جب وہاں کی اقلیتیں اسلام کے عطا کردہ حقوق و تحفظات سے بہرہ ور ہو کر دنیا کو بتائیں گی کہ ان کی زندگی کس قدر امن و عافیت سے گذر رہی ہے تو نتائج وہ نہیں پیدا ہوں گے جنسے مولانا ڈرا اور ڈرا رہے ہیں۔ مولانا خوب جانتے ہیں کہ اسلام نفاق کا متحمل نہیں۔ حقیقی اسلامی نظام اسی نظام کو کہہ سکیں گے جس میں ہر مسلم و کافر کے ساتھ ٹھیک وہی سلوک ہو جو دستور میں طے کر دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ شہری حقوق کی یکسانیت کے جس وعدے کو مولانا سیکولرازم کی رفیع الشان خوبی کے طور پر پیش کر رہے ہیں اسی طرح کے خوبصورت دعوے تو اسلام برابر اچھالتا رہے لیکن عمل کرے اس کے برعکس۔ عمل ہی اصل ہے۔ کاغذی تحریروں کے تمام انبار اسی لئے تیار کئے جاتے ہیں کہ انسانوں کی عملی زندگی امن و عدل کے ساتھ گذرے۔ اسلام کے نزدیک وہ کاغذ زیادہ قیمتی ہے جس میں دیئے گئے حقوق کو عملاً بھی دیا جائے۔ اسکے مقابلہ میں وہ کاغذ کم قیمت ہے جس میں حقوق کی فہرست تو مقابلۃً بہت لمبی ہو مگر عملاً ادائیگی حق کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ لیکن اسلام کا معاملہ تو یہ ہے کہ اقلیتوں کے لئے اس کی فہرست حقوق بھی بخیلانہ نہیں فراخدلانہ ہے اور ہر ہر حق کی ادائیگی کو بھی وہ بلا اتفاق اور بغیر دجل و دغا کے فرض قرار دیتا ہے۔

چوتھے پیرے میں مولانا نے ایک فقہی جزئیے کا ذکر فرمایا ہے اس کے متعلق بھی ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم اس نتیجے پر گفتگو کریں گے جو اس جزئیے سے اخذ کیا گیا ہے۔

کلیدی مناصب کا مسئلہ

آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ مولانا نے سیکولرازم کی اس قانونی دفعہ کو کہ اس میں بڑے سے بڑے عہدہ پر مسلمان بھی فائض ہو سکتا ہے اس انداز میں پیش کیا ہے گویا یہ اتنی بڑی عطا اور اتنا عظیم حسن سلوک ہے کہ جو دستور اس سے خالی ہو وہ ہرگز منہ لگانے کے لائق نہیں چاہے وہ اس کے علاوہ کتنے ہی حقوق و تحفظات اقلیتوں کو عطا کرتا ہو۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ اسلامی نظام میں چونکہ کلیدی مناصب پر غیر مسلمین کے تقرر کا جواز نہیں ہے اس لئے دوسروں ہی کی نظر میں نہیں خود مولانا کی نظر میں بھی اسلامی نظام اقلیتوں کو حقوق و مراعات دینے میں تنگدل ہے۔ اور سیکولرازم اس سے بڑھ کر فراخ دل اور انسانیت نواز ہے۔ یہ خیال کسی غیر مسلم کا ہو تو جائے شکایت نہیں لیکن خود ہم مسلمان بھی اس پر ایمان لے آئیں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے ایمان و اسلام کو اللہ تعالیٰ کس زمرے میں رکھے گا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہماری سیکولر اسٹیٹ میں کچھ مسلمانوں کا اونچے عہدوں پر فائض ہو جانا کسی بھی مرض کا علاج نہیں۔ اس کے برخلاف مجموعی طور پر اس سے عامۃ المسلمین کو نقصان ہی پہنچا ہے۔ یہ لوگ اس دبیز پردے کی حیثیت رکھتے ہیں جسے اس لئے لگایا گیا ہو کہ اس کی آڑ میں وہ سب کچھ کیا جا سکے جسے کھل کر کرنا رسوائی کا موجب بن سکتا ہو۔ یا پھر ان کی حیثیت شطرنج کے مہروں جیسی ہے۔ یہ لوگ مسلمان ہونگے تو اپنے لئے ہوں گے۔ امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کے لئے انکی اہمیت ان بھیڑوں کے گلے سے زیادہ نہیں جسے اکثریتی ارباب اقتدار اپنی مرضی کے مطابق ہنکاتے ہیں، ان کی بے ضمیری، بے حمیتی اور مفاد پرستی کا عام نمونہ یہ ہے کہ ملک میں جگہ جگہ مسلمانوں پر قیامت توڑی جائے تو یہ زبانی ہمدردی اور ظلم و تشدد کی صرف لفظی مذمت تک نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے مزاج یار پر غبار آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مگر پاکستان کے خلاف زبان کھولنے میں ان کی ذکاوت حس کا جواب نہیں ہے اور وقتاً فوقتاً یہ نہایت صفائی سے کہتے رہتے ہیں کہ یہاں اسلام خوب پھل پھول رہا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جاتی۔

مسئلہ کی حیثیت و نوعیت

خیر یہ تو عملی حالات تھے۔ ہم خالص اصولی و آئینی سطح پر بھی عرض کرتے ہیں کہ کلیدی مناصب کے سلسلہ میں اسلام کو غیر روادار اور سیکولرازم کو فراخدل باور کرانا ایک مغالطہ ہے اور بس۔

دنیا کا متعینہ اصول اور آئین یہ ہے کہ کلیدی مناصب پر وہی شخص فائض ہو سکتا ہے جو دستور سے نہ صرف متفق ہو بلکہ اس کی وفاداری کا بھی حلف اٹھائے۔ اس کے بعد یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ حکمراں پارٹی انھی افراد کو کلیدی مناصب تفویض کرے گی جو اس کے نظریات، اس کے ڈسپلن، اس کے مقاصد اور اس کے میلانات سے کم سے کم بظاہر اتفاق رکھتے ہوں۔

اسلام کا اس سے زیادہ کوئی قصور نہیں کہ دوسروں کی طرح وہ بھی اسی اصول و آئین کی پابندی کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سیکولر دستور چونکہ اس طرح کے تصورات و قواعد پر مشتمل ہوتا ہے کہ کسی مسلمان یا ہندو یا عیسائی کا اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی اس سے متفق ہونا اور اس کی وفاداری کا حلف اٹھانا محال نہیں ہے اس لئے کسی مسلمان یا عیسائی کو کلیدی عہدہ اسلئے دیا جاتا ہے کہ وہ دستور سے متفق اور اس کا وفادار ہے۔ اس لئے نہیں دیا جاتا کہ وہ مسلمان یا عیسائی یا ہندو ہے۔ اگر وہ صاف طور پر کہدے کہ میں اس دستور پہ یقین نہیں رکھتا، اس کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھا سکتا بلکہ میں تو ان عقائد و نظریات پہ ایمان رکھتا ہوں جنھیں یہ دستور جرم و گناہ قرار دیتا ہے تو کیا پھر بھی اس شخص کو اونچے مناصب تفویض ہونے ممکن ہیں؟ ۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا اسے

تنگ دلی کہا جائے گا؟ - ایسا بھی نہیں۔ ہر ہوشمند یہی کہے گا کہ یہ تو بالکل درست اور منصفانہ طرز عمل ہے۔ جب دستور ہی سے ایک شخص متفق نہیں ہے اور برسر اقتدار پارٹی کے مقاصد و مزعومات سے منحرف ہے تو اسے کیونکر ایسے عہدے دئیے جاسکتے ہیں جن پر دستوری مقاصد کے بار آور ہونے نہ ہونے کا مدار اور کامیابی سے حکومت چلنے نہ چلنے کا انحصار ہے۔

کیمونزم ہو یا سیکولرازم۔ کوئی بھی ازم ہو۔ اس کا یہی عمل، یہی اصول اور یہی فیصلہ ہے کہ کلیدی مناصب پر وہی لوگ فائز ہوں جو دستور کے وفاکیش اور منفقہ مقاصد کے حامی ہوں۔ بس یہی اصول وعمل اسلام کا بھی ہے۔ وہ یہی کہتا ہے کہ ہم بھی کلیدی مناصب انہی لوگوں کو دیں گے جو دستور میں یقین رکھتے ہوں اور حکمراں پارٹی کے مقاصد سے متفق ہوں۔

تو آخر یہ کیسا انصاف اور کس طرح کی منطق ہے کہ ایک ہی اصول پر کمیونزم، سیکولرازم اور دوسرے تمام ازم عمل پیرا ہوں تو انھیں دل کھول کر سراہا جائے، لیکن جب اسی اصول کو اسلام اپنائے تو اس پر تنگ نظری، حق ماری اور فرقہ پرستی کے الزام عائد کر دئیے جائیں۔ مانا کہ مولانا یہ الزام کھل کر نہیں لگا رہے ہیں۔ لیکن کیا ان کا پورا شذرہ اور اس کا بین السطور منھ سے نہیں بول رہا ہے کہ سیکولرازم کے مقابلہ میں اسلام کو وہ بھی تنگدل اور کوتاہ عدل ہی تصور کرتے ہیں۔

اسلام اور غیر اسلام میں ایک فرق یہ بھی بنیادی ہے کہ غیر اسلامی نظاموں میں تو قانون کے تقاضوں کو خالص مشینی انداز میں نبھا دینا بھی کافی ہو جاتا ہے۔ مثلاً سیکولر حکومت کی پالیسی اگر یہ قرار پائے کہ فلاں صوبے میں شراب نوشی کو ناجائز قرار دیدیا جائے تو اس صوبے کے وزیر کی ذمہ داری صرف اتنی ہی ہوگی کہ عدم جواز کا قانون نافذ کردے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ وہ دل سے بھی شراب کی حرمت پر ایمان رکھتا ہو۔ ایمان تو کجا اگر وہ ڈھکے چھپے خود بھی پیتا رہے یا کوئی عذر تراش کر کھلے بندوں بھی پیئے تو کوئی اس پر دار و گیر کرنے والا نہ ہوگا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ وہاں صرف یہی کافی نہیں کہ اسلامی نظام کو چلانے والے افراد شراب و زنا اور قمار و سود وغیرہ کی بندش کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کی حرمت پر تہہ دل سے ایمان رکھتے ہوں اور ذاتی طور پر ان کے پاس پھٹکنے کا تصور بھی نہ کریں۔ یہی حال معروفات و اوامر کا ہے کہ نماز اور روزے وغیرہ کی مشینی نوع کی ادائگی کافی نہیں سمجھی گئی بلکہ ان چیزوں سے ایک جذباتی تعلق بھی لازم قرار دیا گیا۔

اس صورت میں ان لوگوں کو کلیدی مناصب نہ دینا کیونکر ظالمانہ قرار دیا جاسکتا ہے جن کو اسلامی دستور سے جذباتی تعلق تو کجا اتنا سا سطحی تعلق بھی نہ ہو کہ زبانی ہی اس سے اتفاق کرسکیں۔ اسلامی دستور کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ کسی شخص کا غیر مسلم ہونا صریح طور پر یہی تو معنی رکھتا ہے کہ وہ قرآن و سنت پر ایمان نہیں رکھتا بلکہ کسی ایسے دین کا پیرو ہے جسے قرآن و سنت درست تسلیم نہیں کرتے۔ ایسی حالت میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دین پر قائم رہے اور اسلامی دستور کی وفاداری کا حلف بھی اٹھا سکے۔ حلف تو درکنار وہ تو محض دکھاوے کے طور پر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسلامی دستور سے متفق ہوں کیونکہ کسی شخص کا غیر مسلم بھی ہونا اور اسلامی دستور — قرآن و سنت سے متفق بھی ہونا ایسا ہی متضاد ہے جیسے دن اور رات زمین اور آسمان۔ پھر آخر کیسا انصاف ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو کلیدی مناصب نہ دینے پر اسلام تنگدل قرار پائے حالانکہ سیکولرزم اور ہر ازم اسی اصول وعمل کا حامل ہے۔

فقہی جزئیے کی بحث

جب یہ واضح ہوگیا کہ اسلامی نظام میں غیر مسلموں کو کلیدی عہدے نہ دینا ٹھیک اسی اصول کے مطابق ہے جو تمام دنیا میں معقول سمجھا گیا ہے اور اسی پر ہر حکومت کا عمل ہے تو اب آئیے دیکھیں کہ متذکرہ فقہی جزئیے کی کیا حیثیت و اہمیت ہے۔

ہمیں گمان یہ ہوتا ہے کہ نحن احق بالمکارم والاخلاق میں کتابت کی غلطی ہوگئی ہے ورنہ صحیح فقرہ نحن احق بمکارم الاخلاق ہے یا پھر بمکارم اخلاق (یعنی اخلاق بغیر الف لام کے) بخاری جلد اول باب بنیان الکعبہ میں باب اسلام ابی ذرؓ کے تحت یہ الفاظ ہیں فقال له رأيتهٗ

یا مریا لمکارم اخلاق۔ پھر بخاری جلد دوم کتاب الادب۔ باب حسن الخلق میں بھی الفاظ اخلاق کے الف لام کے ساتھ آئے ہیں۔ هدایه۔ باب فی من یمر علی العاشر میں بھی انا احق بمکارم الاخلاق ہی کہا گیا ہے۔

خیر یہ توضمنی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کتابت کی غلطی نہ ہو ہمارے علم کا قصور ہو۔ کلام الفاظ میں نہیں اس مدعا میں ہے جو اس استدلال سے حاصل کیا جا رہا ہے۔

اولاً ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ ہم مسلمان اخلاقی فضائل کو اختیار کرنے کے زیادہ مستحق ہیں تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ کفار کی دی ہوئی رعایت کے مقابلہ میں ٹھیک دوگنی رعایت مسلمانوں پر فرض ہو دو آنے کے مقابلہ میں ڈھائی اور تین آنے بھی تو فضیلت رکھتے ہیں۔ اور کوئی فقیہہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ دو آنے کے مقابلہ میں آٹھ آنے معاف کرنا صحیح معیار اخلاق ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ٹھیک دوگنی ہی رعایت کو نہ صرف مناسب بلکہ فرض قرار دیا جائے۔

ثانیاً یہ کہ اگر یہ ارشاد پیغمبرؐ قانونی معاملات میں لامحدود استدلال کا متحمل ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ فقہا کہتے ہیں۔

وان علموا انھم یأخذون	اور اگر پتہ چلے کہ دار الحرب کے
منا ربع عشر اور نصف	کفار ہم مسلمانوں سے ڈھائی
عشر یأخذ بقدرہ	فیصد یا پانچ فیصد محصول وصول
(ھدایہ۔ باب فی من یمر	کرتے ہیں تو انسے بھی ہماری حکومت
علی العاشر)	میں اتنا ہی وصول کیا جائے گا

حالانکہ مکارم اخلاق کا تقاضا تو یہ چاہئے تھا کہ جتنا وہ وصول کرتے ہیں ہم اس سے آدھا وصول کریں۔ پھر فقہا نے یہ بھی کہا

ویؤخذ من المسلم	اور لیا جائے گا مسلمان سے ڈھائی
ربع العشر ومن الذمی	فیصد اور ذمی سے پانچ فی صد
نصف العشر ومن الحربی	اور حربی سے دس فی صد۔ ایسا
العشر، ھکذا امر عمرؓ	ہی حکم دیا تھا حضرت عمرؓ نے
سعاته (حوالہ مذکور)	اپنے کارپردازوں کو۔

تو عجیب بات ہے کہ اس معاملہ میں مکارم اخلاق کا لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برخلاف ذمی اور حربی سے زیادہ وصول کر لیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو قانون کا معاملہ ہے۔ مولانا نے محصول کا ایک حصہ معاف کر دینے کے سلسلہ میں مکارم اخلاق کو دلیل بنایا ہے۔ معاف کر دینا چونکہ اخلاقی چیز ہے اس لئے اس کے باب میں مکارم اخلاق کا اصول رہنمائی کر سکتا ہے

تو ہم کہیں گے کلیدی مناصب کسے دئیے جا سکتے ہیں یہ کوئی اخلاقی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ٹھیک قانونی و اصولی مسئلہ ہے سیکولرازم اگر کسی مسلمان کو وزیر اعظم بنا سکتا ہے تو یہ کوئی ایسی رعایت نہیں جو اس نے اپنے قانون کے خلاف دی ہو بلکہ یہ تو اس کے قانون ہی کے مطابق ہے اور اسلامی نظام اگر غیر مسلم کو وزارت عظمیٰ تفویض نہیں کر سکتا تو یہ بھی ایسا فعل نہیں ہے جو کسی قوم کی دشمنی اور عناد میں اختیار کیا گیا ہو بلکہ یہ تو دنیا بھر کے طے شدہ اصول کے تحت ہے۔ بحیثیت آئینی شے ہے لہٰذا مکارم اخلاق والی نصیحت اس کے سلسلہ میں اسی طرح کام نہیں آ سکتی جس طرح اللہ کا یہ ارشاد کہ کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ۔ (سب مسلمان بھائی بھائی ہیں) وراثت اور نکاح وغیرہ کے قوانین میں مؤثر نہیں ہوتا۔

ثالثاً یہ کہ وہ دور گیا جب چنگی اور کسٹم وغیرہ میں کسی فرد کا حسن اخلاق اثر انداز ی کر سکتا تھا۔ اب تو محصولات کی حیثیت خالصۃً آئینی و اقتصادی ہے جس کا کوئی تعلق اخلاق سے باقی نہیں ایک محصل یا کسٹم آفیسر مجبور ہے کہ ہر حال پر ٹھیک وہی ڈیوٹی وصول کرے جو قانون نے متعین کر دی ہے۔ پس مکارم اخلاق والی نصیحت کو چنگی وغیرہ کے سلسلہ میں استدلال بنانا اب سخن کج سے زیادہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔

رابعاً یہ کہ اب ہر حکومت چنگی اور کسٹم وغیرہ کی شرحیں مقرر کرتی ہے اس کا دار اپنے ملکی حالات، اپنے معاشی مصالح اور اپنی ضروریات پر ہوتا ہے نہ کہ اس بات پر کہ دوسری حکومتیں کیا شرحیں مقرر کر رہی ہیں۔ لہٰذا آج اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ بھی محصول کی شرحیں اپنے اقتصادی نظام کی مناسبت سے مقرر کرے گی نہ کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی ۔۔۔ خاشاں کہ تذکرہ بالا گزشتوں کو قانونی حیثیت دینا تو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مکارم اخلاق کے تحت حرام
افعال بھی اختیار کئے جاسکتے ہیں؟ یا مکارم اخلاق کے تحت
ان ضابطوں کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے جو دستوری اعتبار سے
ناقابل تبدیل ہوں۔ مثلاً سیکولر حکومتیں اگر مرد وزن کی مکمل
مساوات اور صنفی اعتبار سے کسی بھی شہری میں فرق نہ کرنے کی
وسیع النظری میں مبتلا ہیں تو کیا مسلمان حکومتوں کو بھی مکارم
اخلاق کے تحت نہ صرف اسی وسیع النظری کو اختیار کر لینا ہوگا
بلکہ ٹھیک دوگنی وسیع النظری فرض ہو جائے گی؟ سیکولر حکومتیں
رقص وسرود کو جائز رکھتی ہیں، پرمٹ سے شراب پینے اور جوا کھیلنے
کو ممنوع نہیں قرار دیتیں۔ سنیما، تھیٹر، بال روم، کلب گھر
ان کے یہاں تہذیب وتمدن کی جان ہیں تو کیا مسلمان حکومت
پر بھی مکارم اخلاق کے تحت ان رعایتوں اور سخاوتوں میں دوگنی
پیش قدمی کرنا فرض مانا جائے گا؟

مالی معاملات ہی سے ایک مثال لیجئے۔ اسلامی حکومت
میں کچھ دولت مند مسلمان اور کافر، حکومت کی وفاداری میں پیش
پیش ہیں۔ ان کی خدمات کا ریکارڈ بڑا شاندار ہے۔ انکی کارکردگی
کے سب معترف ہیں تو کیا ان اوصاف کے صلہ میں حکومت
مسلمہ اس کی مجاز ہو سکیگی کہ مکارم اخلاق کی دلیل سے زکوٰۃ وخراج
کی ان متعینہ شرحوں میں ان کے لئے کوئی تبدیلی کردے یا انکے
اموال پران حقوق سے دستکش ہو جائے جو اللہ اور رسول نے
دستوری طور پر متعین فرما دیئے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں مولانا اس نتیجہ سے متفق نہیں ہوسکتے پھر
آخر وہ اس نتیجہ سے کیونکر متفق ہوگئے کہ مکارم اخلاق
کے تحت اسلام اپنے اس بنیادی اصول سے منحرف ہو جائے
جس سے انحراف کا دوسرا نام خودکشی ہے۔ اس خودکشی کا مشورہ
سیکولرازم یا کسی اور ازم کو تو کبھی کسی نے نہیں دیا۔ شاید اسلئے
نہیں دیا کہ سلامتی ہوش وحواس کے ساتھ ایسا مشورہ دینا
ممکن بھی نہیں ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ چنگی اور کسٹم کی شرحیں دستوری
نوع کی چیز نہیں ہیں۔ مسلمان حکمراں ہوں یا غیر مسلم حکمراں ان کا
متعلقہ محکمہ سیاسی ومعاشی مصالح کے پیش نظر مختلف اشیاء
پر مختلف شرحوں سے ڈیوٹی لگاتا ہے اور وقتاً فوقتاً ان شرحوں میں
تبدیلیاں بھی اسی کا کام ہے۔ اس کے لئے جائز ہے کہ کسی مال پر
دو آنے محصول لگائے یا تین آنے یا ایک روپیہ۔ مکارم اخلاق
کے تحت محصول میں کچھ کمی یا معافی دستور کے کسی تقاضے یا دفعہ کے
خلاف نہیں ہے مگر کلیدی مناصب کا مسئلہ تو ایک انتہائی اہم اور
بنیادی مسئلہ ہے۔ دستوری وکلیدی مسئلہ ہے۔ ایسا مسئلہ ہے
جس پر حکومت کے مقاصد اصلیہ کا انحصار ہے۔ جسکے نتیجہ میں تمام
مقاصد فوت بھی ہوسکتے ہیں اور فروغ بھی پاسکتے ہیں۔ اگر مکارم اخلاق کے تحت
منشیات، سود، قمار اور دیگر منکرات کے احکام میں کتر بیونت
نہیں کی جاسکتی تو بھلا اس اہم تر اصول کو کیسے بدلا جا سکتا ہے جو کسی
نظام اور دستور کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اتنا ہی ضروری
ہے جتنا انسانی زندگی کے لئے ہوا اور غذا۔

ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ مطلوبہ مقصد کے لئے مکارم اخلاق
والی نصیحت سے زیادہ قوی استدلال مؤلفۃ القلوب کے
جزئیے سے ہو سکتا تھا۔ یعنی اللہ نے تالیف قلب کو زکوٰۃ کے ایک
مستقل مصرف کی حیثیت دی ہے۔ لہذا تالیف قلب ہی کے تحت
غیر مسلموں کے لئے کلیدی مناصب کا دروازہ کھول دیا جائے۔

لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ زیادہ قوی استدلال بھی رسولؐ
اور صحابہؓ اور ائمہ وفقہاء کی نگاہ میں اس لائق نہیں ٹھیرا کہ اس کے
تحت اصول دین کی بھینٹ دینے کا جواز نکل آتا۔ کیونکہ احسان و
اخلاق اور تالیف ودلداری کے کچھ حدود ہیں۔ خودکشی پر آمادہ
ہو جانے کو حسن اخلاق اور تالیف کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ خودکشی
تو دور کی بات ہے اتنی بھی اجازت اسلام نہیں دیتا کہ دلداری
وتالیف کی خاطر معزز مہمان کے پیش کردہ شراب وشاہد کو قبول
کر لیا جائے۔ نہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ مکارم اخلاق کے طور پر
ان تمام آزادیوں، عیاشیوں اور ترقی پسندیوں کو اسلامی حکومت
جائز قرار دیتی رہے جنھیں سیکولر اسٹیٹ میں نہ صرف جائز بلکہ تہذیب و
ترقی کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

فطرت کا فرق

مچھلی، بکری، چڑیا، ہاتھی سب حیوان ہی ہیں لیکن انکی ساخت

ان کے مزاج، ان کی صلاحیتیں جدا جدا ہیں۔ مچھلی مر جائے گی اگر بکری کی طرح چٹیل پہاڑوں کی راہ لے۔ بکری ہلاک ہو جائے گی اگر مچھلی کی طرح دریا کو رہائش گاہ بنائے۔ اسی طرح اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام اپنے اپنے جدا مزاج رکھتے ہیں۔ ان میں بعض چیزیں تو اسی طرح مشترک ہیں جس طرح کچھ اوصاف اور جبلتیں تمام جانداروں میں مشترک ہیں لیکن بعض چیزیں اتنی مختلف بھی ہیں کہ اگر ان میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اسلامی نظام کا وہی حشر ہوگا جو مچھلی کا خشکی میں اور بکری کا پانی میں ہوتا ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے اس مرکزی عقیدے پر نظر کیجیے جس سے ذیلی عقائد و نظریات کی نہریں نکلتی ہیں اور جس کی حیثیت مبدء و مصدر کی ہے۔

مرکزی عقیدہ

اسلام کہتا ہے کہ اصلی حکمرانی اللہ کے لئے ہے۔ اللہ نے جس شئے کو حرام قرار دیدیا وہ حرام ہی رہے گی چاہے پوری دنیا اس کی حلّت کا ووٹ دے۔ اور جسے فرض و واجب یا محمود و مطلوب ٹھیرا دیا اس کی یہی حیثیت برقرار رہیگی خواہ سارا عالم اس پر طنز و طعن کرے۔

دوسرے تمام نظام اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں ان کی نظر میں اجتماعی دوائر میں اللہ کا کوئی دخل نہیں۔ حلّت اور حرمت، درست اور نادرست کے تمام فیصلے خود وہی کریں گے وہ پرمٹ اور لائسنس دیدیں تو شراب و شاہد میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اپنی صوابدید سے جو چاہے قانون بنالیں۔ جس شئے کو چاہے لائق انعام یا قابل سزا ٹھیرادیں۔ کوئی نادیدہ طاقت ان کے فیصلوں میں دخل نہیں دے سکتی۔

اس بیّن فرق کی موجودگی میں یہ مشورہ دینا درست نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو بھی ٹھیک اسی طرز کی حکومتیں قائم کرنی چاہئیں جیسی غیر مسلم کرتے ہیں اور خوب و ناخوب کے انھی اضافی معیاروں کو اپنانا چاہیے جنھیں دوسرے اپنائے ہوئے ہیں۔

دینی نقطۂ نظر

خالص دینی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ مومنوں کی شان قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انھیں اقتدار حاصل ہو تو وہ نماز و زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں اور اللہ کے واضح فرمودہ اوامر و نواہی کے نفاذ میں سرگرم رہتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ سیکولرازم اس کے منافی ہے۔ وہ قطعًا اجازت نہیں دیتا کہ حکومت کسی بھی مذہب کے حق میں جانبدار ہو۔ اسے چھوڑیئے کہ ہمارے سیکولر دیس میں اس غیر جانبداری کا کیا حال ہے۔ بحث قانون کی ہے۔ سیکولرازم کا بنیادی قانون یہی ہے کہ ذاتی حیثیت میں حکام چاہے نماز پڑھیں یا مندر میں جائیں، بھجن گائیں یا کیرتن سنیں لیکن انھیں یہ حق نہیں ہے کہ اجتماعی دائرے میں کسی بھی مذہب کو فروغ دینے کی کوشش کریں یا خزانے کا ایک پیسہ بھی اپنے طور پر کسی مذہب کے شیوع میں لگائیں۔ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا سکھ یہ ان کی انفرادی حیثیت ہے۔ نماز جس طرح ایک عام آدمی پڑھ لیتا ہے اسی طرح وہ بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن سرکاری سطح پر وہ اقامتِ صلوٰۃ اور اشاعتِ دین کی جدّ و جہد ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ ہیں دو متضاد پوزیشنیں۔ تو کیا اب ہمیں یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ اللہ نے مسلمان حکمرانوں کو جن امور کا ذمہ دار بنایا تھا وہ ناانصافی کے مرادف ہیں اور سیکولرازم جو دائرہ کھینچتا ہے وہ عین انصاف ہے۔

اور کیا غیر مسلموں کی طرح ہمیں بھی یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ قانون سازی کا تمام تر حق انسانوں ہی کو ہے اور کم سے کم اجتماعی زندگی میں خدا کو بے دخل کر دینا ہی اعلیٰ درجہ کا عدل ہے۔

اگر یہ تعلیم مولانا نہیں دے رہے ہیں تو آخر اس ترغیب و تحریک کا کیا منشاء ہے کہ جس طرح کے دستور غیر مسلم بناتے ہیں اسی طرح کے دستور مسلمانوں کو بھی اپنی مملکتوں میں بنانے چاہئیں اعمال و افعال کا تعلق ذہنی عقائد و عزائم سے ہوا کرتا ہے۔ جو شخص یہ ترغیب دیتا ہے کہ تم فلاں آدمی یا گروہ جیسا عمل اختیار کرو، چاہے وہ تمہارے اصول و عقائد کے مطابق نہ ہو۔ وہ اس کے سوا کیا ترغیب دیتا ہے کہ اپنے عقائد و عزائم بھی تم اسی جیسے کرلو۔

آج مسلمانوں کی دینی حالت کس درجہ زبوں ہے اس کی بحث نہیں۔ مسلمان حکمران اپنی مملکتوں میں جو کفریات پھیلائے ہوئے ہیں ان سے بھی یہاں تعرض نہیں۔ قطعًا ظاہر ہے کہ کسی

ملک میں اسلامی نظام کی بسم اللہ کے بھی آثار نہیں پائے جاتے مگر گفتگو تو عقیدے کی ہے، نصب العین کی ہے۔ تمنا کی ہے۔ ایسے اداریئے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے جو یہ ترغیب دیتا ہو کہ عدل شرافت، انسانیت اور دیگر اوصاف عالیہ کے اعتبار سے اسلامی نظام کو غیر اسلامی نظاموں سے فائق و برتر ماننے کا عقیدہ ذہن سے جھٹک دو اور یقین کرو کہ قرآن نے سیاسی و اجتماعی دائروں میں مسلمان حکمرانوں کے جس کردار کو پسندیدہ و مطلوب قرار دیا ہے وہ ترقی یافتہ تصور عدل کے اعتبار سے پس ماندہ و کمتر ہے اور زیادہ عادلانہ وہی کردار ہے جو سیکولرازم نے اپنے علمبرداروں کے لئے تجویز کیا ہے۔

بات طویل ہوگئی۔ ڈر ہے کہ اس طول میں ہم ادب و احترام کے تقاضے پورے نہ کر سکے ہوں اسے ہماری نا اہلی تصور کیجئے قلبی طور پر اب بھی ہم مولانا اکبرآبادی کے نیازمندوں ہی میں خود کو شامل سمجھتے ہیں۔ یہ بھی بجا ہے کہ الجزائر کی جس اندرونی صورت حال پر انھوں نے اشارہ کیا ہے اس کے ہوتے ہوئے نظام اسلامی کی باتیں کرنا خوش فہمی کے دائرے کی چیز ہے لیکن زبان اس لئے کھولنی پڑی کہ عملاً چاہے پورے عالم میں لادینی سیاست و تمدن کا تسلط ہو جائے اور اسلامی قدریں خواہ اس درجہ مغلوب ہو جائیں کہ اسلامی نظام کے برپا ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو مگر عقیدہ و فکر کی سطح پر ہم پھر بھی اسی عقیدے کو برحق تصور کریں گے کہ اللہ کا نازل فرمودہ قانون ہر قانون سے برتر اور عادلانہ ہے۔ اور اسے لادینی حکومتوں کے فکر و عمل کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا

پس نوشت

مندرجہ بالا معروضات کتابت کے مرحلہ سے گذر چکی تھیں کہ جون کا برہان چھپ کر آگیا اس میں بھی "نظرات" اسی موضوع پر ہیں اور ان کا لب و لہجہ کچھ ایسا ہے کہ بعض ارشادات میں بالکل وہی لطف آگیا جو ابھی وزیر داخلہ لال بہادر شاستری کی ان گل افشانیوں میں آیا تھا جن کا صدور ان کی زبان سے پارلیمنٹ میں ہوا ہے۔ انھوں نے بھی علم و عدل اور حلم و دیانت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے خلاف ایسے الفاظ ارشاد کئے تھے جن سے نفرت و عناد کا لاوا ابلتا نظر آتا ہے اور مدیر برہان نے بھی ایک بہت بڑے مسئلے کے گوناگوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف چند پہلوؤں کو بڑے سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے ایسی شعلہ فشانی کی ہے جو غیظ و اشتعال سے بھرپور ہے۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ دنیا اس وقت جس ماحول و فضا میں سانس لے رہی ہے اس میں اسی نوع کی باتیں داد و تحسین کی مستحق ہیں جیسی مدیر برہان کے قلم سے نشر ہوئی ہیں اور جو شخص ان پہ لے دے کرے گا اسے ابنائے زمانہ کی ترچھی نظریں برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ لیکن حق اور ناحق کو التباس سے بچانے کی کوشش اگر آخرت میں کسی انعام کی توقع دلا سکتی ہے تو اس توقع کے تحت ہم انشاء اللہ اگلے شمارے میں مدیر برہان کے نقش ثانی پر بھی کچھ عرض کریں گے بشرطیکہ زندگی اور عافیت نے ساتھ دیا۔

وما التوفیق الا باللہ وھو المستعان

مستقل عنوان

تفہیم الحدیث

پڑوسی کے حقوق

۴

ہمسایوں کے حقوق پر تین قسطیں صرف ہو چکی ہیں، لیکن یہ موضوع اپنی دائمی اہمیت وضرورت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے اس لئے اس بار بھی اسی موضوع کو باقی رکھا گیا ہے۔

ضرورتمند ہمسایوں کیلئے سالن میں اضافہ کرو

حضرت ابوذر غفاریؓ جو بڑے پائے کے صحابی گذرے ہیں فرماتے ہیں :۔ اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم بثلاث۔ (۱) اسمعُ واطیعُ ولو لعبد مجدّع الاطراف (۲) واذا صنعت مرقۃً فاکثر ماءھا ثم انظر اھل بیت من جیرانك فاصبھم منہ بمعروف (۳) وصلّ الصلوٰۃ لوقتھا فان وجدت الامام قد صلیٰ فقد احرزت صلوٰتك والّا فھی نافلۃ (اخرجہ مسلم والنسائی والترمذی وابن ماجہ وابن خزیمہ وابو عوانۃ وابن حبان واحمد والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ:۔

میرے دوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی ایک یہ کہ فرمانبرداری کروں حاکم وقت کی چاہے وہ نکٹا اور کنکٹا غلام ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جب شوربہ تیار کروں تو اس میں پانی زیادہ کر لوں پھر پڑوسیوں کے گھر والوں پر نظر ڈالوں اور شوربہ میں سے کچھ حصہ انھیں معروف طریقے پر پہنچاؤں تیسرے یہ کہ ٹھیک وقت پر نماز ادا کروں ـــــ پھر اگر تم دیکھو کہ نماز با جماعت ہو رہی ہے تو یا تو تم اپنی نماز پر قائم رہو یا پھر شریک جماعت ہو جاؤ تو یہ نماز نافلہ ہو جائے گی۔

تفہیم:۔

یہ حدیث تین مختلف النوع ہدایات پر مشتمل ہے اسلئے مختلف عنوانوں کے تحت بیان ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مسلم نے پہلی ہدایت کے تعلق سے اسے کتاب الامارۃ میں لیا ہے اور دوسری کے تعلق سے کتاب البرّ میں۔ ترمذی، ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے کتاب السیاست کے ذیل میں بیان کیا ہے اور ابوعوانۃ نے کتاب الامامۃ کے تحت۔

• "سمع وطاعت" کہتے ہیں بلاعذر وتساہل فرمانبرداری کرنے کو۔ اللہ کے رسولؐ نے بارہا تاکید فرمائی ہے کہ تم بر مشیت ایزدی سے جو بھی امیر وحاکم مسلط ہو جائے اس کی فرمانبرداری

کر دیا ہے وہ اپنی شخصیت، اپنے حسب و نسب اور اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے گھٹیا ہی درجے کا کیوں نہ ہو۔ "ناک کان کٹا غلام" ایک تنظیر و تمثیل ہے جس سے مراد یہی بتانا ہے کہ فرمانبرداری صرف ان ہی حکام کی ضروری نہیں جو شاندار شخصیت کے مالک ہوں، عالی نسب ہوں وغیرذلک۔ حالات اگر کسی ایسے حاکم کو بھی مسندِ حکومت پر متمکن کر دیں جو صورت کے اعتبار سے کریہہ المنظر اور نسب کے اعتبار سے کمتر ہو تب بھی اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں نہیں پھیلانی چاہئیں۔ قانون شکنی نہیں کرنی چاہیئے۔

یہ بات اسلام میں ایک غیر متبدل کلیے کی حیثیت رکھتی ہے کہ فرمانبرداری صرف جائز اُمور میں ہے۔ حرام امور و احکام میں کسی کی بھی اطاعت اللہ نے جائز نہیں رکھی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی حضورؐ نے سمع و طاعت کا حکم دیا ہے چاہے وہاں کوئی استثناء نہ کیا ہو لیکن یہ طے ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت حلال نہیں ہے۔

اگر غلط قسم کے حاکم ہم پر مسلط ہو جائیں تو ان سے جان چھڑانے اور اسلامی معیار کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کے لئے اسلام کیا ہدایات دیتا ہے یہ بحث طویل ہے اور ہمارے اس وقت کے موضوع سے خارج۔ یہاں تو بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ حاکموں کے مقابلے میں اسلام کو سرکشی ریشہ دوانی اور بغاوت و سازش کے فتنہ پرورانہ حربے پسند نہیں ہیں کیونکہ ان سے ملک اور سماج کو نفع کم اور نقصان زیادہ پہنچتا ہے۔ وہ خراب حکومتوں کو بدل کر اچھی حکومت لانے کی کوششوں کا بہت خاص معیار و نہج معین کرتا ہے اور حتی الوسع ایسے طریقوں کی تعلیم دیتا ہے جو فتنہ و شر اور خونریزی و خانہ جنگی کی آفتوں سے پاک ہوں۔

دوسری وصیت میں، جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے اللہ کے رسولؐ نے شوربہ زیادہ کرنے کی ہدایت کی ہے یہ بھی تمثیلی انداز ہے۔ منشاء یہ ہے کہ اگر تمہاری مالی حالت اس کی متحمل نہ ہو کہ ضرورت مند ہمسایوں کا پیٹ بھرنے کے لئے مستقل کھانے پکوا سکو تب بھی اتنا تو ضرور کرو کہ جو ہانڈی تم اپنے لئے پکوا رہے ہو اسی میں پانی بڑھا دو تاکہ شوربہ زائد ہو جائے اور جو ہمسائے اتنے مفلس ہیں کہ انھیں معمولی شوربہ تک نصیب نہیں انھیں سالن ہاتھ آجائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اللہ نے مالی گنجائش دی ہے ان پر یہ بھی لازم ہے کہ ان کے جو پڑوسی فقیر و مسکین ہوں ان کے لئے اپنے شایانِ شان کھانا تیار کرائیں۔ یہ کافی نہیں ہے کہ وہ خود تو اعلیٰ درجے کی غذائیں کھائیں اور محتاج ہمسایوں کے لئے شوربے کی ہانڈی میں پانی کا اضافہ کرتے رہیں۔ ابوذر غفاریؓ درویش قسم کے صحابہ میں سے تھے لہٰذا ضرورتمند ہمسایوں کی فاقہ کشی دُور کرنے کا ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ اپنے لئے جو ہانڈی پک رہی ہو اسی میں پانی کا اضافہ کر کے مقدار بڑھا لیں۔ پس حضورؐ نے اسی کے مطابق تلقین فرمائی۔ اس تلقین سے ہمسایوں کے اِس حق کا اثبات ہوتا ہے کہ ان کی ضرورت تو نہیں کام آنے کے لئے ہمارا دولت مند ہونا ہی ضروری نہیں۔ ہماری جو حیثیت بھی ہے اسی کے مطابق اعانت و غمخواری ہمارے اخلاقی فرائض میں شامل ہے۔

فاصبهم منه بمعروف کا مفہوم بعض علماء صرف اتنا ہی بیان کرتے ہیں کہ شوربہ پڑوسیوں کو پہنچا دیا جائے۔ لیکن ہماری نظر میں معروف کا لفظ یہاں اس ہدایت کا حامل ہے کہ شوربہ پہنچانے کا انداز ایسا نہ ہو جو ہمسایوں کی خودداری اور غیرت کے لئے نشتر بن جائے۔ معروف کی اصطلاح قرآن میں بھی متعدد بار استعمال ہوئی ہے۔ اس کا مطلب وہ طریق کار ہوتا ہے جو معاشرہ میں مروّج بھی ہو اور حسنِ اخلاق کے بھی مطابق ہو۔ گویا دنیا والے بھی اسے پسند کرتے ہوں اور اللہ کے نزدیک بھی اس میں برائی نہ ہو تب واضح ہوا کہ پڑوسیوں کی امداد میں ایسے ہر طریق سے اجتناب کرنا چاہیئے جو ان کی تحقیر پر مشتمل ہو یا ان کی عزتِ نفس پر ضرب لگاتا ہو۔

حسنِ اخلاق کی بنیاد ہی یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی عزت کرے، استکبار میں مبتلا نہ ہو۔ برتری جتلا جتلا کر اذیت نہ پہنچائے اکڑ اور رعونت میں گرفتار نہ ہو۔ یہ یقین رکھتا ہو کہ حسنِ سلوک اور

خوش اخلاقی کسی پر احسان نہیں ہے، بلکہ اس کا انسانی فریضہ ہے اور جو پیسہ وہ کسی ضرورت مند کو دے رہا ہے وہ اللہ کی عطا ہے جسے ضرورتمند تک پہنچانے کے لئے اللہ نے اسے صرف ذریعہ بنادیا ہے اور جو سلوک وہ اس دادودہش کی شکل میں ضرورتمندوں کے ساتھ کر رہا ہے اس سے کہیں بڑھکر احسان اللہ نے خود اس پر کیا ہے کہ دادودہش کی توفیق بخشی۔ توفیق نہ ملے تو بدنصیب آدمی عین دریا کے کنارے پیاس کی شدت سے دم توڑ سکتا ہے۔ توفیق ہی سے محرومی کا کرشمہ ہے کہ بعض غیر مسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اسلام کی برتری کے برملا معترف ہیں لیکن ہیں وہی کافر کے کافر۔

حاصل یہ کہ توفیق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے غریب بندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے پر اکڑو نہیں، احسان مت جتاؤ، بلکہ اللہ کے آگے فرطِ تشکر سے جھک جاؤ کہ اس نے تمھیں بھلائی کی توفیق بخشی۔ ہر بھلائی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور ہر برائی کا سہرا خود بندے کے سر ہے۔

حدیث میں تیسری وضاحت نماز کے بارے میں ہے:۔

دورِ رسالت میں نہ تو قدم قدم پر مسجدیں تھیں۔ نہ ٹھیک ٹھیک وقت بتانے کے لئے گھڑیوں کا وجود تھا۔ ایسا بارہا ہوتا تھا کہ ایک شخص نے اندازہ کیا کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ ضروری نہیں کہ وہ مسجدِ نبوی یا کسی اور مسجد کے آس پاس ہی رہتا ہو۔ نماز با جماعت کا فوری انتظام نہ پاکر اس نے تنہا ہی نماز ادا کرلی۔ اب اس کے بعد وہ گھر سے نکلتا ہے تو کسی جگہ نماز با جماعت منعقد دیکھتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیا کرے۔ آیا شریک جماعت ہو جائے یا جو نماز وہ تنہا ادا کر چکا ہے اسی پر قناعت کرلے۔

اس کا جواب حدیث دیتی ہے کہ اس کے لئے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ چاہے شریک ہو جائے چاہے نہ ہو۔

لیکن بعض اور احادیث اور اصول و کلیات کے تحت ائمہ و فقہاء میں اس بارے میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ کیا یہ دوبارہ پڑھ لینے کی اجازت پانچوں میں سے ہر نماز کے لئے ہے یا کچھ نمازیں اس سے خارج ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ پانچوں کے لئے ہے۔ لیکن احناف صرف ظہر اور عشاء کو خاص کرتے ہیں باقی تین کے لئے درست نہیں سمجھتے۔

ایک اور لطیف اختلاف اس میں بھی ہے کہ یہ جو کہا گیا کہ وہ نماز نفل ہو جائے گی تو وہ سے مراد کونسی نماز ہے۔ آیا وہ جو پہلے تنہا پڑھ چکا ہے یا وہ جو دوبارہ جماعت کے ساتھ پڑھی ہے۔ حدیث کے متن میں دونوں ہی کے لئے گنجائش موجود ہے تفصیل کا اس باب میں موقع نہیں۔ اطمینان بخش راستہ یہ ہے کہ اگر شریک جماعت ہو ہی رہا ہے تو نیت نہ فرض کی کرے نہ نفل کی۔ بس اتنی ہی نیت کافی ہے کہ شرکت کرتا ہوں میں مثلاً نماز ظہر یا نماز عصر میں۔ اب چاہے اللہ تعالیٰ اس باجماعت ادائگی کو نفل کے درجے میں قبول فرمائے یا تنہا ادا کی ہوئی کو نفل قرار دے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ اگر کوئی شخص گھر میں یا کسی ایسے مقام پر جو باقاعدہ مسجد نہ ہو جماعت سے نماز ادا کرلے پھر وہ دیکھے کہ مسجد میں جماعت ہو رہی ہے تو کیا اسے بھی اسی طرح شریک جماعت ہو جانا چاہیئے جس طرح تنہا ادا کرلینے والے کے لئے اجازت تھی؟

اس کی تفصیلی بحث ابواب الصلوٰۃ میں ہو سکتی ہے۔ یہاں تو اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ قوی اور راجح دلائل کی رو سے اس شخص کو جماعت میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

مسجد نبوی کے ستون سے جکڑا ہوا کافر قیدی ہی خشتناک اضطراب کے عالم میں سینے پر اپنا سر ڈھلکائے زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اپنے ہی دل کی دھڑکنیں اسے موت کے قدموں کی دہشت ناک آہٹ میں تبدیل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

یہ ثمامہ تھے۔ جن کو یمامہ کے جنگی معرکوں میں مسلمانوں نے گرفتار کرلیا تھا وہ نہ صرف سرکشی کے مرتکب تھے بلکہ مسلمانوں کیخلاف مسلح بغاوت کے بھی مجرم تھے اور رسول خدا کے شہر مقدس میں پابجولاں لائے گئے تھے۔

ثمامہ اسلام کے کوئی معمولی دشمن نہ تھے۔ وہ مسلمانوں کی شہ رگیں کاٹنے کے لئے میدان جنگ میں شمشیر بکف نکلے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں اسلام کے خلاف نفرت و بے رحمی کی زہرناکیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے۔ ان کا وجود انتقام کی مکروہ خشونت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لیکن اب جب کہ ان کی طاقت سلب ہو چکی تھی وہ محسوس کر رہے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں قید کیا ہے ان کی نظر میں ان کا وجود سینۂ گیتی پر ایک سیاہ داغ ہے جس کو مٹانے کے لئے ایک اشارے پر سیکڑوں ہاتھ حرکت میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان کو بچانے کے لئے کسی دل میں کوئی گنجائش نہ ہونی چاہئے۔ مسلمانوں پر انھوں نے کبھی ترس نہیں کھایا تھا۔ پھر مسلمان اتنی کاری زخم خوردگی کے بعد ان پر کیوں ترس کھانے لگے! یہ سوچ کر مضبوط بندشوں میں جکڑا ہوا ابدیت دیا "کافر" اسلام کی جنگی عدالت میں ہر لمحہ اپنی جان کی خیر منا رہا تھا۔

خوف — کشمکش — عجز و بیچارگی اور جاں گداز مایوسی کے عالم میں انھوں نے انسانی قدموں کی آہٹ سنی اور گھبرا کر نظر اٹھائی۔ رسول خدا اپنے دشمن جاں کیطرف تشریف لا رہے تھے۔ ثمامہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کو یقین تھا کہ یہ آہٹ ان کی موت کی آہٹ ہے — زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ تیزی سے ختم ہوا جا رہا ہے۔ موت کے فولادی ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف بڑھتا ہوا محسوس کر کے انھوں نے فرط خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ دل کی دھڑکن دھک دھک کرتی ہوئی حلق میں پھنستی محسوس ہوئی۔ لیکن اسی لمحے انھیں کچھ ایسا احساس بھی ہوا جیسے آنے والے کی آہٹ میں انتقام کی دھمک کے بجائے نرم رو جذبات کا پُر سکون آہنگ ہے۔ جب آہٹ ان کے نزدیک آکر رُک گئی تو ان کے سراسیمہ کانوں نے ایک ایسی انسانی آواز سُنی جس میں پھولوں کی سی نرمی اور شہد کا سا مٹھاس گُھلا ہوا تھا۔ جس میں حلاوت اور درد کا بہترین امتزاج تھا۔

"ثمامہ! کہو کیا ہوا؟" اللہ کے رسول نے استفسار فرمایا۔

موت کے خوف سے لرزہ براندام قیدی نے اس آواز میں دلسوزی کا رچاؤ اور ایک شفیق درد کی کسک محسوس کر کے حیرت سے آنکھیں کھول دیں — محمد عربی کی مقدس شکل میں اسلام اپنے مکمل حسن و جمال کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ انتقام کی بھرپور ٹھوکر کی توقع کرنے والے نے دیکھا کہ دو آنکھیں — اخلاق کے نور اور انسانیت کی لطافت

سے لبریز دو آنکھیں ان کے چہرے پر درد و گداز کے ساتھ مرکوز ہیں! نفرت کی جوابی دھتکار کے منتظر نے سنا کہ ایک انسان اسکو درد بھری آواز میں پکار رہا ہے! دشمن جانی پر ترس کھانے کا یہ جاں نواز انداز! انتقام کی خشونت کے جواب میں یہ خندہ پیشانی! — خون آشامی کی سزا کے بجائے یہ دلپسندی کی روحانی چوٹ! "ثمامہ! کہو کیا ہوا؟" کے درد بھرے الفاظ ثمامہ کے پورے وجود کی وسعتوں میں گونجتے چلے گئے۔ جیسے ان الفاظ کے پردے میں مامتا سے بھی زیادہ حسین تر کوئی جذبہ کارفرما ہو! — جیسے کوئی چاہنے والی روح ثمامہ کو ان تمام خود فریبیوں اور حماقتوں کی عبرتناک یاد دلا رہی ہو جن میں اسلام کی دشمنی اور طاقت کی سرمستی نے انکو عرصہ تک مبتلا رکھا تھا۔ جیسے کوئی انتہائی عدل گستر ضمیر مجرم کو خود ہی اپنی سزا طے کرنے کی آزادی دے کر پوچھ رہا ہو کہ کہو کیا ایسے مجرم کو کسی حال میں معاف کیا جا سکتا ہے؟

ثمامہ آخر انسان تھے پتھر نہیں تھے۔ اس غیر متوقع صورت حال نے ان کی پتھریلی اسلام دشمنی کو موم کی طرح پگھلانا شروع کر دیا تھا وہ انتقام کے جنون سے چونک اٹھے۔ خوف، مایوسی، نفرت اور بیگانگی کے سارے جذبات تھرتھرائے اور حیرت و عقیدت کے قدموں پر ڈھیر ہو گئے۔ فرط خوف سے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں نے ایک نئی امید کی حرارت پاکر حرکت کی اور ایک ہکلاتی ہوئی آواز میں ثمامہ نے جواب دیا:-

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا۔ اگر... تم مجھے قتل... کر دو گے تو... ایک جاندار کو... قتل... کرو گے — اور اگر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو... ایک احسان شناس پر احسان ہوگا..."

رسول خدا نے یہ جواب سنا اور ثمامہ کو جوں کا توں زندہ چھوڑ کر خاموشی سے واپس تشریف لے گئے۔ وہ قیدی جو ہر لمحہ موت کو سر پر منڈلاتا ہوا محسوس کر رہا تھا یہ دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا کہ کم سے کم زندگی کا ایک دن بھیک میں مل گیا ہے لیکن ان کو خوف تھا کہ اگلا دن ان کی موت و ہلاکت کا یقینی دن ہوگا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ جس شخص کو انھوں نے ناکردہ گناہی پر ستایا ہو وہ ان کی خطاکاریوں کو ہمیشہ کیلئے کس طرح بھول سکتا ہے! خون کے پیاسے دشمن پر اس سے زیادہ احسان کیسے کیا جا سکتا ہے آخر؟

دوسرے دن کا سورج نکلا تو ثمامہ اسی امید و بیم کی ادھیڑ بن میں گم تھے۔ آج پھر خدا کے رسول اپنے جانی دشمن کے پاس تشریف لائے۔ ثمامہ نے دیکھا کہ محمد عربی کی آنکھوں میں درد انسانیت کی جو ہوک کل نظر آئی تھی آج بھی اپنی اسی شان سے موجود تھی — آج پھر آپ نے مجرم سے وہی سوال کیا اور پھر وہی جواب پاکر اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ ثمامہ پھر زندہ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر اطمینان و سکون کا گہرا سانس لیا۔ لیکن جسم پر کسی ہوئی بندشوں پر حسرت ناک نظر ڈال کر سوچا کہ غالباً یہ احسان — آخری احسان ہے — گردن زدنی مجرم کو زندگی کے دو دن بھیک میں دیئے جا چکے تھے ایک مظلوم اپنے "ظالم" قیدی پر اس سے زیادہ رحم کر کے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالنے لگا آخر؟

"لیکن یہ رحم کیوں کیا جا رہا ہے — کیسے کیا جا رہا ہے — کیسے کیا جا سکتا ہے؟" ثمامہ سوچتے رہ گئے "میرے وجود میں اسلام دشمنی کی مکروہ ظلمت کے سوا اور ہے کیا! وہ کونسی کشش ہے جو محمد عربی کو سراپا درد بنا کر بار بار میری طرف کھینچ رہی ہے؟ — میرے جرائم کی سزا کا فیصلہ میرے خون سے لکھ دینا کتنا آسان تھا اسکے لئے، لیکن وہ تو خود اپنے خون جگر اور اشک آلود دلسوزیوں سے میرے قلب و روح پر نجانے کونسی درد بھری حقیقت تحریر کرتا چلا جا رہا ہے! — آخر کیوں؟ — آخر کیسے ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟" اس احسان عظیم پر عقیدت کے جذبات دل کی گہرائیوں سے امنڈتے اور جرائم کے احساس اور خوف سزا کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر دل کی گہرائیوں میں پلٹ جاتے۔ "کل کیا ہوگا؟" وہ انتہائی کرب کے عالم میں یہ فیصلہ کن بات سوچ رہے تھے۔ ان کو رہ رہ کر اپنی بے رحمانہ زیادتیوں کا خیال آتا اور مایوسی کے منوں بوجھ تلے وہ حسین امید بستی چلی جاتی جس کی جاں نواز جھلک انکو زندگی میں پہلی بار محمد عربی کی روشن آنکھوں میں نظر آئی تھی۔

آخر اس آس اور یاس کے ہنگامہ پرور آغوش مرحلہ کا تیسرا دن آیا۔ آج ثمامہ کا ذہنی اضطراب اپنے نقطۂ عروج پر

تھا۔ ان کے خیال میں آج کا دن ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کن دن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر قیدی کے پاس تشریف لائے تو ثمامہ نے بے قراری کے ساتھ آپ کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جس میں التجا، انفعال اور عقیدت کا تلاطم برپا تھا۔ حضور کے روئے مبارک پر گہری سنجیدگی تھی جس کو ایک پرسوز مسکراہٹ کی لطیف چاشنی نے دلکشی کی انتہاؤں تک پہنچا دیا تھا۔ آپ نے ثمامہ سے وہی سوال پھر کیا۔ ڈرتے ڈرتے ثمامہ نے انھی الفاظ میں جواب دیا۔ ایک ساعت کے لئے دونوں انسان خاموش ہو گئے۔ ایک طرف وہ "ظالم" تھا جس کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ دوسری طرف ایک "مظلوم" تھا جس کو خدا نے یہ موقعہ دیا تھا کہ ظالم سے اس کے ایک ایک ستم کا بھرپور انتقام لے سکے۔ اس لئے "کافر" کے دل میں اس خاموشی نے امید اور خوف کے جذبات کی ہلچل بپا کر دی۔ لیکن پیغمبر کی خاموشی سے اچانک انتقام کی فطری خواہش کی جگہ ایک ایسی عظیم جذباتی قربانی کا نور پھوٹ نکلا جس کو صرف وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس نے اپنا تمام تر وجود خدا کی خوشی اور نوع انسانی کی خیر اندیشی میں گم کر کے رکھ دیا ہو۔ ٹھیک اس وقت جب "مجرم" یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا سر تن سے جدا کیا جانے ہی والا ہے خدا کے رسول کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور ثمامہ کی بندشوں کو کھولتے ہوئے اعلان کیا:-

"جاؤ ثمامہ! تم آزاد ہو!"

یہ چند الفاظ "مجرم" کے وجود میں زلزلہ بن کر پیوست ہو گئے معاف کر دو اور بھول جاؤ کی اس عظیم مثال نے دشمن کو حیرت و عقیدت سے گنگ کر کے رکھ دیا۔ جرائم سے چشم پوشی کے اس اسوۂ حسنہ کو دیکھ کر خطاکار کا ضمیر جاگ اٹھا اور احساسِ گناہ کی بے پناہ تڑپ اس کے ہر رگ و ریشہ سے اٹھی اور اس کے پتھر جیسے دل کو آناً فاناً پانی پانی کر گئی۔ نفرت، سنگدلی اور وحشت و بربریت کی حیوانی زندگی نے اس احسانِ عظیم کے قدموں پر سر رکھ کر دم توڑ دیا۔ لیکن اس وقت جب کہ ثمامہ کا پورا وجود ایک جذبۂ شکر میں ڈھل گیا تھا ان کی زبان یکسر خاموش تھی۔ الفاظ جذبات کے آگے بے ہوش پڑے تھے۔ ثمامہ اسی کیفیت میں اٹھے اور مسجد نبوی سے باہر نکل گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد "مجرم" خود اپنی خوشی سے پلٹا تو اس کا جسم آزاد تھا مگر قلب و روح اسیر ہو چکے تھے۔ لوہے کی زنجیروں نے صرف جسم کو قابو میں کیا تھا، لیکن عفو و درگذر اور احسان و اخلاق نے روح کو پابجولاں کر دیا تھا۔ ایک دل کو خرید لیا تھا۔ ایک زندگی کو مسخر کر لیا تھا۔ کشاں کشاں ثمامہ بارگاہِ رسالت میں پہنچے اور سپردگی کے بے پناہ جنوں میں یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا:-

"خدا کی قسم! آج سے پہلے آپ کی ذات، آپ کے مذہب اور آپ کے شہر سے زیادہ مجھے کسی شے سے نفرت نہ تھی۔ لیکن اب آپ کی ذات، آپ کے دین اور آپ کے دیار سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بالکل سچے ہیں اور آپ کا پیغام ایک آخری سچائی ہے۔ کل تک میں آپ کا دشمن تھا، لیکن آج سے آپ کا غلام ہوں۔"

یہ عہد وفا کر کے ثمامہ اپنے وطن یمامہ لوٹ گئے اور جس اسلام کو مٹانے کی کوشش میں ان کی عمر گذری تھی اسکی تبلیغ و اشاعت میں پروانہ وار منہمک ہو گئے۔ دنیا حیران تھی کہ وہ آخر کس طرح اس حد تک بدلے کہ ان کو پہچاننا دشوار ہو گیا! وہی انسان جس کی عمر اسلام کو مٹانے کی دُھن میں گذری تھی اچانک اسلام کا ایسا شیدائی ہو گیا کہ اس کی تبلیغ و اشاعت ہی اس کا واحد مقصدِ حیات بن کر رہ گئی۔ ان کی زندگی کا یہ حیرت ناک انقلاب اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر دکھائی دیا تھا جب یمن کے افق سے مسیلمہ کذاب کا ہولناک فتنہ اٹھا اور یمامہ کے طول و عرض میں ارتداد کی زہریلی آندھیاں چل پڑیں۔

"نبوت کا یہ مدعی جھوٹا ہے" اس طوفانِ بلا میں ثمامہ کی آواز گونج رہی تھی۔ "لوگو! مجھ سے پوچھو کہ سچے پیغمبر کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ بجز اس جھوٹی روشنی سے جس میں سیاہی کے سوا کچھ نہیں۔" اسلام کی حفاظت کی دُھن میں جو مکمل جنگ لڑنے والا سپاہی جب یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا کہ اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو اس نے وطن عزیز کو چھوڑ دیا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کے لئے تیار نہ تھا

جس کی فضاؤں میں اسلام دشمن فتنہ کا زہر سمایا ہوا ہو۔ وطن کی عزیز دنیا کو چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے ان جنگی دستوں سے جا ملا جو اس فتنے کا مقابلہ کرتے پھر رہے تھے، اسلام کی راہ میں اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا اور آخر مسیلمہ کذّاب کے ایک حمایتی کے ہاتھوں شہادت حق کا کاری زخم کھا کر یمامہ چھوڑنے والی روح نے اپنے خدا کے لئے ساری دنیا چھوڑ دی۔

کیسے تھے وہ لوگ جو احسان شناس تھے! — جن کی جان کو اس وقت تک قرار نہ آتا تھا جب تک رسول اللہ ؐ کے احسانات کے جواب میں جان ہی قربان کر کے نہ دکھا دیں، لیکن کیسے ناشکرے ہیں ہم لوگ جو اپنے اس محسن اعظم کو بھول گئے جس نے ہمارے درد میں زندگی کے ۶۳ سال کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ جس ہستی نے ہماری ابدی نجات و فلاح کے غم میں اپنی پوری زندگی گھلا دی کیا اسکے لئے ہمارے وجود میں خونِ حیات کا ایک قطرہ اور اشکِ انفعال کی ایک حقیر بوند بھی نہیں؟ پھر کتنی آنکھیں ہیں جو اپنی اس تہی دامانی اور بے حسی پر آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں — کتنے دل ہیں جو سینے کی گہرائیوں میں اس صورت حال پر تڑپ اُٹھتے ہیں — کتنے ہاتھ ہیں جو خدا کے آگے اس دعا کی ہوک میں دراز ہوتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس روحانی موت سے نجات عطا فرما — ہمیں توفیق دے کہ اسلام کی قیمت ادا کرنے کے لئے ہمارا ناکارہ وجود ایک جذبۂ بیتاب میں ڈھل جائے"۔ جہاں بے حسی کے ساتھ یہ احساس بے حسی بھی نہ ہو وہاں "ہم مسلمان ہیں" کا دعویٰ آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ . . .

جی ہاں ہم مسلمان ہیں۔ تسلیم و انقیاد کی ہر ادا سے عاری اور پھر بھی مسلمان!

تجلّی کی ڈاک

جبلّت کبھی نہیں بدلتی

سوال ؁:- از عبدالباری - رحیم آباد - پاکستان -

(رسائل کے تین سوالوں کے جواب گذشتہ دو شماروں میں دیئے جا چکے ہیں)

چوتھا سوال یہ ہے کہ احادیث میں غالباً مشکوٰۃ میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اگر تم یہ سنو کہ ایک پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو تم اس خبر کی تصدیق کرو لیکن اگر یہ سنو کہ ایک آدمی نے اپنی جبلّت تبدیل کردی اور اخلاق رذیلہ چھوڑ دیئے تو تم مت مانو" یہ حدیث کا مفہوم ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ حدیث سننے کے بعد جب کہ اس کا کیا ہوا فیصلہ اٹل ہے اخلاق حسنہ کی تبلیغ رائیگاں نہیں جائیگی جب کہ اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ حالانکہ اس کے برعکس بہت بُرے کردار و گفتار والے لوگ بہت بُرے اخلاق اور ناشائستہ کردار چھوڑ کر خدا کے نیک بندے ہوگئے ہیں۔ حالانکہ حدیث کا فیصلہ یہ نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔

الجواب ؁:-

آپ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں آپ کے لئے دشوار نہ تھا کہ جس حدیث کے بارے میں آپ کو الجھن پیش آرہی ہے اسے حدیث کی کسی کتاب میں تلاش کرکے خود ہی اپنی الجھن دُور کرنے کی سعی کرتے۔ لیکن افسوس آپ نے یہ زحمت گوارا نہیں کی اور صرف سنی سنائی پر سوال قائم کردیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ جبلّت کے ناقابل تغیر ہونے کا ذکر بے شک حدیث میں آیا ہے، لیکن اخلاقِ رذیلہ کا ناقابل تغیر ہونا ہرگز حدیث میں نہیں آیا۔ اخلاق رذیلہ والا فقرہ کسی نے اپنی طرف سے گھڑ دیا ہے۔

کیا شک ہے کہ جبلتیں اٹل ہیں وہ بدلا نہیں کرتیں لیکن جبلّت کا اطلاق صرف اُن فطری تقاضوں پر ہوتا ہے جو انسان یا حیوان کے اندر سے خود بخود اُبھرتے ہیں اور بیرونی محرکات ماحول اور خارجی مؤثرات پر ان کے وجود و عدم کا مدار نہیں ہوا کرتا۔ مثلاً بھوک، پیاس، شہوت، نیند وغیرہا۔ بچھو ڈنک مارتا ہے۔ بلّی چوہا پکڑتی ہے یہ جبلّت ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ مصنوعی طور پر ان میں سے کسی جبلّت کو دبا دیا جائے۔ اس طرح کے موانع پیدا کردیئے جائیں جو اس جبلت کو کارفرما ہونے سے روک دیں لیکن اسے جبلّت کی تبدیلی ہرگز نہیں کہیں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ زمین کی گہرائی میں پڑے ہوئے تخم پر پتھر رکھ کر اسے بارآور ہونے سے روک دیں۔ ظاہر ہے وہ درخت تو نہیں بنے گا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی جبلت تبدیل ہوگئی۔

اخلاق فاضلہ اور اخلاق رذیلہ دونوں اپنے مظاہر کے اعتبار سے خالصتہً کسبی چیز ہے۔ آپ مہمان سے تواضع کے ساتھ پیش آئیں یا کج خلقی برتیں، ہمسائے سے حسن سلوک اختیار فرمائیں یا نزاع روا رکھیں، آذان سُن کر مسجد کی طرف دوڑے جائیں یا عین نماز کے وقت شراب پئیں یہ سب اختیاری اعمال ہیں ان میں سے کسی پر بھی جبلت

کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

ہم نہیں جانتے کہ اس تصریح کے بعد حدیث مذکور میں کسی کے لئے کیا الجھن باقی رہ سکتی ہے۔

بے بنیاد اعتراضات

سوال ۵:- (ایضاً)

پانچواں سوال یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے سنت کے بارے میں متعدد سوالات کئے گئے ہیں منجملہ انہیں سے ایک یہ ہے کہ کیا سنت کا کوئی مجموعہ کتابی شکل میں موجود ہے تو مولانا نے صاف کیوں یہ نہیں کہا کہ ہاں بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ موجود ہیں گول مول جواب کیوں دیا، حالانکہ دوسرے سوالات کے جوابات نہایت تسلی بخش ہیں۔

الجواب ۵:-

آدمی اعتراض ہی پر اُتر آئے تو نہایت اطمینان سے قرآن پر بھی اس طرح کے اعتراضات بلا کسی محنت کے کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں سورت میں حضرت عیسیٰ یا موسیٰ کا پورا قصہ کیوں بیان نہیں فرمایا۔ فلاں مقام پر معراج کی پوری تفصیل کیوں نہ دی۔ فلاں آیت کے ساتھ وہ متعلقہ تفصیل کیوں بیان کردی جو قرآن میں دوسرے مقام پر بیان کی ہے۔

خدا جانے کب مولانا مودودی سے کیا سوالات کئے گئے تھے اور انھوں نے ان کے کیا جوابات دیئے تھے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ سنت کے بارے میں ان کا موقف و مسلک اتنا ہی روشن ہے جتنا اس کا حق ہے اور منکرین سنت کا رد کرتے ہوئے اپنے رسالے ترجمان القرآن کا جو "منصب رسالت نمبر" انھوں نے پیش فرمایا ہے تنہا وہی ہر منصف مزاج کو یہ اطمینان دلانے کے لئے کافی ہے کہ سنت کے بارے میں عالی مرتبہ اسلاف کا جو عقیدہ و مسلک رہا ہے اسی عقیدے پر مولانا مودودی بھی پہاڑ کی طرح اٹل ہیں اور اس کے خلاف بڑے سے بڑے استدلال کو پارہ پارہ کردینے کی جرأت و توفیق اور اہلیت و قابلیت اللہ تعالیٰ نے انھیں فیاضی سے عطا فرمائی ہے۔

آپ کے سوال کا جواب تو ہوگیا۔ غور طلب صرف یہ ہے کہ آخر یہ لایعنی سا سوال آپ کے دماغ میں پیدا کیوں ہوا۔ تو ہمارا حاصلِ فکر تو یہ ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں علماء و فقہاء اور اولیاء و مشائخ کے خلاف شیطان وسوسہ اندازیوں کی مہم چلاتا رہا ہے اسی طرح مولانا مودودی کے خلاف بھی اسکی سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔ شیطان کانوں پر سینگ لگا کر بنفسِ نفیس ہر جگہ نہیں آیا کرتا۔ وہ اپنے چیلے چانٹوں سے کام لیتا ہے اور یہ چیلے چانٹے بسا اوقات آدم ہی کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مولانا مودودی پر وقتاً فوقتاً چاروں ہی طرف سے اعتراض و تبرّا کی بوچھاریں کی جاتی ہیں۔ بدعتی بھی ان سے خفا۔ اہلحدیث بھی ان سے ناراض۔ دیوبندی بھی ان سے کبیدہ۔ قادیانی بھی ان سے بیزار۔ یہاں تک کہ وہ مغرب زدہ بھی ان سے بُری طرح روٹھے ہوئے ہیں جن کا دین سوائے شاہد و مینا و جام کے کچھ بھی نہیں ہے۔

اس صورتِ حال کی وجہ سوائے اس کے کیا ہے کہ شیطان نے ہر گروہ کو یہ اطمینان دلادیا ہے کہ اصول سے لیکر فروع تک اور کلیات سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی جزئی تک جو کچھ اسکے پاس ہے وہی سراپا حق ہے اور اس کے خلاف جو کوئی زبان کھولے وہ حق کا دشمن اور قابلِ مذمت ہے۔ اب مولانا مودودی اگر گروہی ذہنیت سے بالاتر ہوکر خالصۃً قرآن اور سنت کی روشنی میں ہر گروہ کے عقائد و مسالک پر نقد کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ نقد کسی بھی گروہ کے حق میں سو فی صدی تحسین و تائید پر مشتمل نہیں ہوسکتا۔ جب ہر گروہ کے تصورات و افکار میں غلط اجزاء و عناصر کا اختلاط ہوگیا ہے تو وہ قرآن و سنت کیوں کر اس کی کامل تصویب کرسکتے ہیں جو حق کے سوا کسی شے کو قبول ہی نہیں کرتے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مولانا مودودی پر اعتراضات جڑتے رہنے کا مشغلہ اختیار کرنے والوں کے چکر میں پڑ کر دین کے محاذ کو کمزور اور شیطان کے ہاتھ مضبوط مت کیجئے۔ بخاری و مسلم وغیرہ احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہیں یہ امر واقعہ تمام امت مسلمہ کے نزدیک ایسا امر واقعہ ہے کہ جس کا بیان کرنا اور نہ کرنا برابر ہی ہے۔ مولانا مودودی نے اگر کسی موقعہ پر ان کا نام نہیں لیا اور قبول

آپ کے گول مول جواب دیدیا تو اس سے آخر کیا قباحت پیدا ہوگی ویسے اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ صحاح ستہ میں بھی ایسی کتنی ہی روایات موجود ہیں جن کی صحت پر اونچے درجے کے اہلِ علم نے کلام کیا لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ حدیث کی کسی بھی کتاب کا ایک ایک لفظ اسی طرح اٹل اور یقینی ہے جس طرح کلام اللہ کا ایک ایک لفظ۔

زکوٰۃ کے مسائل

سوال :- از عثمان شبنم - کراچی -

زکوٰۃ کے احکام یعنی خصوصاً اس کے آٹھ مصارف کے بارے میں الجھنیں پیش آرہی ہیں۔ یہاں بعض علماء سے اس کے متعلق تصریحات دریافت کی گئیں لیکن ان کے جوابات سے دل کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس لئے یہاں آپ سے چند معروضات کر رہا ہوں امید ہے کہ جناب ان کا مفصّل جواب تجلّی کے آئندہ پرچہ میں ضرور دیں گے۔

(۱) زکوٰۃ کی رقوم قومی ادارے مثلاً یتیم خانے۔ مدرسے۔ شفاخانے۔ دار العلوم وغیرہ میں دی جاسکتی ہیں یا نہیں ؟ کیا ان میں یہ شرط ہے کہ جس کو یہ رقوم دی جاویں اس کو انکا مالک بنادیا جائے ؟ کیا یہ کافی نہیں کہ جس ادارہ کو یہ رقوم دی جاتی ہیں وہ خود ان کا مالک ہوجاتا ہے اور پھر وہ خود اپنے مقررہ انتظام سے ان میں سے سال بھر جہاں جہاں ضرورت ہو اس کا تصرّف کرتا رہے چاہے بچوں اور طالبعلموں کی تعلیم، ان کے کپڑے، لحاف بستر، بیماروں کی دوائیں اور طالب علموں کی تعلیم و تربیت پر ؟ کیا ان میں سے ہر طالب علم، یتیم، بیمار کو فرداً فرداً اس رقم کا مالک بنادینا لازمی ہے ؟ بغیر اس کے زکوٰۃ کی ادائیگی کی شرط پوری نہیں ہوتی ؟ کیا زکوٰۃ دینے والا بعد ادائے زکوٰۃ اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوجاتا ؟

(۲) جواب دیا جاتا ہے کہ رفاہ عام کے کاموں پر مثلاً اسکول مدرسہ - شفاخانہ - کالج وغیرہ اداروں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی - کیونکہ پورے کے پورے ادارہ کو اس کا مالک نہیں بتلایا جاسکتا کیا یہ صحیح ہے ؟

(۳) کیا خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بیت المال میں الگ الگ خانے رکھے جاتے تھے جن میں مالِ غنیمت کا الگ خانہ۔ صدقہ کا الگ۔ خیرات کا الگ۔ مال گذاری کا الگ ؟ اور پھر ہر مد زکوٰۃ میں سے مختلف کاموں میں الگ الگ تصرف ہوا کرتا تھا ؟ کیا اس قسم کا انتظام ممکن تھا ؟ کیا اس کا تحریری ریکارڈ رکھا جاتا تھا ؟

(۴) کیا رفاہ عام کے تمام کام مثلاً راستے بنانا۔ پل۔ مسافر خانے شفاخانے۔ اسکول۔ مدرسے۔ کالج۔ یونیورسٹی وغیرہ فی سبیل اللہ میں نہیں سماجاتے ؟ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط (توبہ — ۸۰) خلفائے راشدین کے زمانہ میں کیا زکوٰۃ کی رقوم ان اداروں پر صرف نہیں ہوتی تھیں ؟ فی سبیل اللہ کے تو بہت وسیع معنی ہیں۔ (حجۃ البالغہ باب زکوٰۃ دیکھئے)

(۵) ہماری مین قوم مذہبی واقع ہوئی ہے۔ اس میں سے بہت سے صاحبان ہر سال حکومت کو مختلف ٹیکس جو تقریباً 80/ فی صد ادا کرنے کے بعد بھی اللہ کی مقرر کردہ زکوٰۃ کی رقم بھی ادا کرتے ہیں ان میں سے بہت سے لوگ یہ عذر پیش کرکے زکوٰۃ کی رقم ادا کرنے سے اعراض کرتے ہیں کہ حکومت کو اس قدر بھاری ٹیکس کی رقوم ادا کرنے کے بعد اللہ میاں کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے جو ہم اس کو دیویں ! لیکن پھر بھی بیشتر دین دار مین صاحبان زکوٰۃ متعدد قومی اداروں کو زکوٰۃ کی رقوم ادا کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی ان علماء کی طرف سے فرداً فرداً زکوٰۃ کے مستحقین کو ان رقوم کا مالک بنادینے کی شرط لازمی قرار دینے کے سبب سے جو الجھنیں یہ دقیانوسی خیالات کے علماء کی طرف سے پیدا کرائی جاتی ہیں اس کو بنیاد بنا کر اب یہی زکوٰۃ دینے والے صاحبان بھی آئندہ زکوٰۃ دینے سے دور رہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے دقیانوسی علماء جو تھوڑے بہت زکوٰۃ ادا کرنے والے لوگ اس زمانہ میں باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی زکوٰۃ سے دور بھاگنے والے بنا کر چھوڑیں گے۔ کیا آپ ہم سے اس امر میں متفق نہیں ہیں

کہ ان علماء کو آج کے حالات اور چودہ سو برس کے پیشتر حالات میں مناسب تطبیق کرتے ہوئے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ فتوے دینے چاہئیں؟

(۶) کیا ایک فرد زکوٰۃ لینے والا اور ایک قومی ادارہ کا مہتمم (جو ادارہ کی طرف سے زکوٰۃ کی رقوم وصول کرتا ہے) شریعت اسلام کی رو سے دونوں کی قانونی پوزیشن یکساں نہیں ہے؟

(۷) جواہرات کے اُوپر زکوٰۃ نہیں اور جائداد کے کرایہ پر زکوٰۃ ہے۔ لیکن ایک کروڑپتی زکوٰۃ سے بچنے کے لئے ساری رقم جواہرات میں لگا دیتا ہے اور دوسرا کروڑپتی ساری کی ساری رقم جائدادیں خریدنے میں لگا دیتا ہے تاکہ بیٹھا بیٹھا مزے سے کرائے وصول کرے اور کروڑوں روپے پر واجب الادا زکوٰۃ سے بچ جائے صرف کرائے کی رقم پر زکوٰۃ ادا کرتا رہے اسکے برخلاف ایک معمولی درجے کا تاجر صبح سے شام تک عرق ریزی کرنے کے بعد چند ہزار روپیہ بچا لیتا ہے۔ کچھ رقم بیوی بچوں کے زیور میں لگا دیتا ہے اور کچھ رقم نقد ہے اس پر اس کو شرع کے مطابق زکوٰۃ ادا کئے بغیر چھٹکارا نہیں ٗلیکن اس کے مقابلہ میں تو جواہرات اور جائدادوں میں کروڑوں روپیہ لگا دینے والا سرمایہ دار تو بڑا سستا چھوٹ گیا۔ ان دونوں قسم کے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے درمیان ہمارے ان علماء کے نزدیک کوئی شرعی فرق ہے کہ نہیں؟ کیا اس پہلی قسم کے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ ان کے منہ پر واپس مار دینے کے لائق نہیں؟ کیونکہ ان کی نیت اللہ کو دھوکا دینا ہے۔

الجواب:—

جب پاکستانی علماء آپ کی تشفی نہ کر سکے تو ہم کیا تشفی کر سکتے ہیں جب کہ ہماری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی آپ کی تشفی نہیں کر سکتا جب تک آپ دین اور احکام دین کے بارے میں اپنے فکر و نظر کے زاویے درست نہ کر لیں۔ آپ کا طرزِ سوال آپ کا لب و لہجہ اور آپ کے الفاظ سبھی اس المناک حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ زکوٰۃ کو آپ کے ذہن نے اُس حیثیت سے قبول نہیں کیا ہے جس حیثیت سے اسلام اسے قبول کرانا چاہتا ہے۔ آنجناب کو معلوم ہے کہ قرآن میں کثیر مقامات پر صلوٰۃ کے پہلو بہ پہلو زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ سے بڑھ کر کوئی فریضہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس شدّ و مد اور تاکید و تکرار کے ساتھ بیان فرمایا ہو۔ زکوٰۃ ہی وہ شے ہے جس کی ادائیگی سے انکار کرنے والوں کو خلیفۂ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین کی صف میں رکھ کر ایک نازک ترین وقت میں ان سے جنگ کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ زکوٰۃ صلوٰۃ و صوم ہی جیسا ایک اہم ترین فریضہ اور عبادت ہے۔ اسے دنیاوی حکومتوں کے عائد کردہ ٹیکسوں جیسا سمجھ لینا یا یہ خیال کر لینا کہ فاضل دولت کا بہت بڑا حصہ ٹیکس میں دیدینے کے بعد زکوٰۃ سے سبکدوشی ہو جانی چاہیئے ایسا فاسد انداز فکر ہے کہ اس کی جتنی جلدی اصلاح کی جا سکے ضرور کی جائے۔

شق نمبر ۲ میں جو کچھ جس انداز میں آپ نے سپرد قلم کیا ہے اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ آپ کی نگاہ میں عبادت نہیں مصیبت ہے۔ شوق و ذوق سے ادا کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسی طرح بادلِ ناخواستہ ادا کرنے کی شے ہے جس طرح دنیاوی حکومتوں کے عائد کردہ ٹیکس ادا کئے جاتے ہیں۔

جب یہ صورتِ حال ہو تو جتنی بھی اُلجھنیں آپ کے دماغ میں پیدا ہوتی چلی جائیں کم ہیں۔ ہم آج کی جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اسلامی احکام و ہدایات کے ساتھ یہی مذاق جاری ہے کہ ٹھیک اُن پیمانوں سے انھیں نایا اور ان کسوٹیوں سے انھیں پرکھا جا رہا ہے جن پیمانوں اور کسوٹیوں سے اینٹ اور پتھر، آٹا اور نمک، سونا اور چاندی ناپے اور پرکھے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اسلام کی پوری عمارت تو اس بنیاد پر استوار کی گئی تھی کہ اصل اہمیت آخرت کو ہے۔ رضائے الٰہی کو ہے اور دنیا دوسرے درجے پر ہے، لیکن عصرِ نو کے مسلمانوں کا عام ذہن مغربی فکر و تہذیب کے استیلاء نے یہ بنا دیا ہے کہ اصل شے دنیا ہے، دنیا کے منافع ہیں، مادی ترقیاں ہیں، جسمانی عیش و راحت ہے اور آخرت تو فقط ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ذہن جب اسلامی اوامر و نواہی کا جائزہ لینے چلتا ہے تو قدم قدم پر

ٹھوکریں کھاتا ہے، الجھتا ہے، نخوت اور غصہ دکھاتا ہے۔ پھر جب کسی طرح اس کے خود ساختہ قالب ان اوامر و نواہی پر چست نہیں ہو پاتے تو قالب بدلنے کے عوض وہ ان اوامر و نواہی میں ہی کانٹ چھانٹ کرتا ہے انھیں رندتا ہے ان پر چھینٹی اور رتی چلاتا ہے، انھیں توڑتا مروڑتا ہے۔

یہ کوئی خیالی داستان سرائی نہیں۔ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ آج ہندو پاک مصر و عراق، شام و ترکی سب جگہ یہی ہو رہا ہے۔ مرد و زن کی کامل مساوات کا جنون، مخلوط زندگی کا شوق، بے پردگی، ناچ گانا، شراب خوری، ریس بازی، سود لین دین، بیموں کا قمار، ان میں سے کونسی چیز ہے جس پر اسلام کا لیبل لگانے اور اسے جواز و اباحت سے مشرف کرنے کا فخر نام نہاد متجددین کو حاصل نہیں ہے۔ یہ دیوانگی آخر کیوں؟ یہ بدترین قسم کا کمینہ پن آخر کس لئے؟ یہ فاسقانہ و کافرانہ جرأتیں آخر کس ذہن کی تراوشیں ہیں؟

یہ وہی ذہن ہے جس نے ٹھیٹ مادہ پرستوں کی طرح دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے جس کی نظر میں عقبیٰ دُردِ تہ ساغر غفلت کے سوا کچھ بھی نہیں جو کھل کر تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم عاقبت کو نہیں مانتے، مگر فی الحقیقت اس کے دل و دماغ میں آخرت، رضائے الٰہی اور محاسبۂ قیامت کا کوئی جاندار تصور موجود نہیں ہے جب عالم یہ ہو تو ایک زکوٰۃ، ایک سود، ایک انشورنس اور ایک ناچ گانے پر ہی موقوف نہیں اسلام کے کسی بھی امر و نہی پر اسے تشفی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جب تشفی حاصل نہیں ہو سکتی تو وہ اپنی نفسانیت اور ذہنی گمراہی پر پردہ ڈالنے کے لئے علمائے اسلام کو دقیانوسی، رجعت پسند، احمق، جاہل، سازشی اور نہ جانے کیا کیا کہہ گذرتا ہے۔ گویا نفس امارہ کو کد تو اللہ اور رسول کے احکام سے ہے۔ مگر معاشرہ چونکہ ابھی تک اس پستی کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ اور رسول کی برائی سنے اس لئے مقصد برآری کے لئے وہ علمائے اسلام کو آڑ بناتا ہے۔

بات بظاہر غیر متعلق ہو گئی، لیکن فی الاصل اس کا تعلق آپ کے سوالات سے بڑا گہرا ہے۔ آپ نے جو الجھن پیش فرمائی ہیں انکی علمی اور فقہی حیثیت کچھ بھی نہیں وہ تو دو غلط مفروضوں کی پیداکردہ ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے زکوٰۃ کو ایک عبادت اور طاعت الٰہی سمجھنے کی بجائے ٹیکس اور آفت قرار دے لیا۔ دوسرے یہ کہ علماء کے بارے میں ایک ایسے سوءِ ظن کو آپ نے دل و دماغ میں جاگزیں کر لیا جس کے لئے متانت کی سطح پر کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

آپ علماء کے بارے میں اس انداز سے رائے زنی کرتے ہیں گویا فقہی مسائل اور شرعی جزئیات انکی اپنی گھڑی ہوئی ہیں۔

جب تک یہ دونوں فاسد ترین مفروضے آپ دیوار پر نہیں ماریں گے کسی دینی مسئلہ میں آپ کو کوئی تشفی حاصل نہیں ہو سکتی۔ میری سمجھ میں قطعاً نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کے کس سوال کا جواب دوں۔

سوال کی پہلی شق کا تعلق ادائگی زکوٰۃ کی ایک خاص شرط سے ہے جو علمائے سلف کے مابین مختلف فیہ رہی ہے۔ متعدد اکابرین کی یہ رائے ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط لازم نہیں ہے لیکن علمائے احناف ۔ جن میں بڑے بڑے ائمہ گذرے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ میں تملیک لازمی ہے یعنی جس کو مالِ زکوٰۃ دینا ہے اسے اس مال کا مالک بنا دیا جائے۔ یہ درست نہیں ہے کہ مستحقین کی بجائے کسی اور شخص یا اشخاص کو بایں طور مالِ زکوٰۃ سونپ دیا جائے کہ وہ اپنی صوابدید سے جس طرح چاہے اسے مستحقین میں صرف کریں۔

ہم یہاں اس سے بحث نہیں کرتے کہ احناف کا مسلک درست ہے یا دوسرے فریق کا۔ بحث طلب یہ بات ہے کہ جب احناف کا یہ مسلک دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم بھی فقہِ حنفی ہی کا پیرو ہے تو کیا کسی انصاف پسند اور سلیم الطبع آدمی کو سوال کا یہ انداز اختیار کرنا زیبا ہے جو اس پہلی شق میں اختیار کیا گیا ہے؟ اس انداز سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائل یا تو تجاہلِ عارفانہ برت رہا ہے یا پھر وہ واقعتہً اتنا بے خبر ہے کہ اسے احناف کا شہرۂ آفاق مسلک بھی معلوم نہیں دونوں ہی صورتیں افسوسناک ہیں۔

بہرحال اس شق کا جواب یہ ہے کہ احناف کے نزدیک

بغیر تملیک کے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی اور تملیک کی شرط انھوں نے دل سے نہیں گھڑ لی ہے بلکہ اس کے لئے ان کے پاس مضبوط دلائل ہیں۔ ہم اُن لوگوں کو غلطی پر نہیں سمجھتے جنھوں نے ان دلائل کو مضبوط نہیں سمجھا بلکہ ان کا رد کیا اور ان کے مقابلے میں قرآن و سنت کے ذخیرے سے ایسے دلائل لائے جو ان کی دانست میں تملیک کی قید ختم کر دینے والے تھے۔ یہ لوگ اگر تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا کرتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی کیونکہ ان کا یہ فعل کسی لاپرواہی یا بے راہ روی یا جہالت اور خود پرستی پر مبنی نہیں ہے بلکہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے جس بات کو حق سمجھا ہے اسی پر عمل کر رہے ہیں اور حکم الٰہی سے روگردانی کا کوئی شائبہ ان کے فکر و عمل میں نہیں پایا جا رہا ہے۔

لیکن جن لوگوں کا عالم یہ ہو کہ نہ تو وہ تملیک کو ضروری قرار دینے والے علماء کے دلائل سے واقف ہونے کی کوشش کریں نہ ان نصوص و آثار سے واقفیت بہم پہنچائیں جن کی بنیاد پر تملیک کا قول کیا گیا تھا نہ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کریں کہ آخر تملیک کو لازم کرنے کی کیا مصلحتیں ہو سکتی ہیں اس کی بجائے وہ صرف یہ کریں کہ چند سطحی سے مفادات و مصالح کے پیش نظر فیصلے دینے شروع کر دیں اور متین علمی انداز اختیار کرنے کے عوض علماء کو دقیانوسی اور کج فکر قرار دے کر کام نکال لیجانا چاہیں تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے غلط فیصلے تو درکنار ان کے صحیح فیصلے بھی عنداللہ مقبول نہ ہوں گے۔ ان کی اصابتِ فکر بھی اُخروی نقطۂ نظر سے کسی تحسین کی مستحق قرار نہیں پائے گی۔ کیونکہ ان کی نیت صاف نہیں ہے۔ وہ شریعت کے انقیاد و اتباع کا جذبہ نہیں رکھتے اور ان کے صحیح فیصلوں کی حیثیت محض اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیروں کی ہے جو اگر کبھی کبھار نشانے پر بیٹھ بھی جائیں تو تیر انداز کو نشانہ باز نہیں کہا جائے گا۔

ہم یہاں مسلک حنفی کی وکالت کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کیا سائل ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ مالِ زکوٰۃ وصول کرنیوالے جتنے ادارے ظہور میں آ گئے ہیں ان کے کرتا دھرتا واقعۃً اتنے دیانتدار اور امین اور خدا ترس ہیں کہ جو شخص بھی انھیں زکوٰۃ دے وہ پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ اس کا دیا ہوا پیسہ پیسہ ٹھیک اسی مصرف میں صرف کیا جائے گا جس میں اسے ہونا چاہئے؟

بات کی پچ اور دھاندلی تو اور چیز ہے لیکن حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو کوئی بھی ہوشمند یہ باور نہیں کر سکتا کہ خیانت، غرض پرستی، بے ایمانی اور مکر و فریب سے لبریز معاشرے کی گود میں پرورش پائے ہوئے افراد جب کوئی دینی ادارہ قائم کریں گے تو اچانک ایسے متدین، خوش کردار اور صاحب ایمان ہو جائیں گے کہ زکوٰۃ دینے والوں کو ان کی کامل دیانت داری پر پوری طرح مطمئن ہو بیٹھنا چاہئے۔

عام صدقات کی بات اور ہے۔ ان کا درجہ فضائل و نوافل کا ہے، لیکن زکوٰۃ ایک فریضہ ہے۔ ایک عبادت ہے، ایک امر مکتوب ہے اس کی کامل ادائگی کے لئے وہی طریقہ افضل و اولیٰ ہو سکتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اطمینان کی صورت ہو۔

شق نمبر ۲ کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں فقہ حنفی کی رو سے یہی بات درست ہے کہ زکوٰۃ اس کے مستحقین کو اطمینان بخش طریقے پر پہنچنی چاہئے اور یہ اطمینان بخش طریقہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ جو مستحق ہے اسی کو دی جائے درمیان میں کوئی کھیل نہ کھڑا کیا جائے۔

شق نمبر ۳ کی بحث ہم فضول سمجھتے ہیں کیونکہ خلفائے راشدین کے فعل و عمل اور طریق و نہج کی تلاش و تحقیق اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب آدمی نیک نیتی کے ساتھ ارادہ رکھتا ہو کہ ہم ان مقدس حضرات کے اسوے پر عمل کریں گے۔ لیکن جب حال یہ ہو چکا ہو کہ مسائل کے بارے میں رائے تو پہلے قائم کر لی جائے اور بعد میں خلفائے راشدین اور قرآن و حدیث سے ایسے دلائل تلاش کئے جائیں جو اس رائے کی مؤید ہوں تو تحقیق و تفحص سے کوئی فائدہ نہیں۔ خلفائے راشدین کے بارے میں معلوم ہے کہ رعایا ان کی دیانت و امانت اور اسلام دوستی پر مطمئن تھی۔ ان خلفاء کے لیل و نہار خود اس بات کا روشن

ت تھے کہ یہ لوگ ہر معاملہ میں شریعت کی پیروی کریں گے۔
ہیں مال زکوٰۃ سپرد کرتے ہوئے اطمینان کے مضبوط ترین
رائن موجود تھے۔ ان کے دفتری انتظام کی چھان بین اور
ہر فاتر کے ریکارڈ کی تفتیش سے کیا حاصل ہوگا جبکہ آج کے
ادروں اور حکومتوں پر بھروسے کیلئے قرائن ہی موجود نہیں ہیں

شق نمبر ۴ کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ
مصارفِ زکوٰۃ کی تصریح کرنے والی منقولہ آیت امام ابوحنیفہؒ
اور ان کے ہزاروں پیروؤں کے سامنے بھی رہی ہے۔ آپ
ا مغربی طرزِ فکر کا پردہ ہٹا کر دیکھئے کیا وہ اسکول کالج
ر یونیورسٹیاں بھی فی سبیل اللہ کے پاکیزہ زمرے میں شمار
و سکتی ہیں جن کے نصاب ہائے تعلیم، جن کا نظامِ تربیت، جن
ی تعلیمات اور جن کا ماحول اسلام سے ذہنی بغاوت اور
مادہ پرستی سے گریز و فرار کے سوا کچھ نہیں سکھاتا؟ جن اداروں
یں جوان مرد و زن پہلو بہ پہلو بیٹھ کر لکچر سنیں، جن اسکولوں
کالجوں میں اینٹی اسلام دل و دماغ ڈھالے جاتے ہوں، جنکی
طرح ناچ گانے تھیٹر سنیما "ثقافت" "کلچر" کے ہم معنی ہوں
نہیں فی سبیل اللہ میں سمانے کی کوشش ایک ایسا ہی ذہن
کر سکتا ہے جسے اسلام کی آئیڈیالوجی اور روح سے کوئی مس نہ
رہ گیا ہو۔

رہے وہ ادارے جہاں واقعی اسلام کی تعلیم ہوتی ہے یا مسافر
خانے، پل اور ہسپتال وغیرہ۔ تو آخر ان کے لئے اُسی زکوٰۃ کو
کیوں تاک لیا گیا ہے جو غریبوں کا حق ہے۔ پل سے امیر بھی فائدہ
اٹھائیں گے۔ مسافر خانوں اور ہسپتالوں سے وہ لوگ بھی انتفاع
کریں گے جو زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں تو کیوں نہ ان کاموں کے
لئے صدقاتِ نافلہ سے کام لیا جائے۔ حکومت اگر اسّی
فی صدی تک ٹیکس لگا دے تو آپ بغاوت نہیں کرتے لیکن
دین اگر ہدایت دے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں فاضل دولت
کا وہ حصہ صرف کرو جو ڈھائی فی صد زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بچتا
ہے تو آپ ہر طرح کا احتجاج لے دوڑتے ہیں۔ مجبوریاں پیش فرما
دیتے ہیں۔

شق نمبر ۵ بہت بُرے ذہن کی غماز ہے۔ اللہ نے کبھی
نہیں کہا کہ آپ بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر زکوٰۃ ادا کیجئے۔ وہ
تو فاضل مال پر زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں۔ اگر حکومت کو اسّی فیصد
ٹیکس ادا کرنے کے بعد بھی آپ کے پاس اتنی فاضل دولت بچتی
ہے جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہونی چاہیئے تو یہ کہنا سوائے
کفر و زندقہ کے کیا ہے کہ اللہ میاں کے لئے کیا باقی رہا جو ہم
اس کو دیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ ایسا کہنے والوں کو سمجھائیے کہ
بدنصیبو تمہارے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون اور تمہارے مال کا
ایک ایک حبّہ اللہ ہی کا عطا فرمودہ ہے اس نے صرف اسی
مال پر زکوٰۃ رکھی ہے جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے۔ اگر
اس زائد مال کا بڑا حصہ حکومت کا جبری قانون اینٹھ لیتا
ہے تو کیا اس کا انتقام تم اللہ سے لوگے؟ کیا حکومت کا غصہ
اپنے رب پر اُتارو گے؟

اور یہ کیا بے تکی بات ہے کہ اگر علمائے احناف نے
بدلائل تملیک کو شرط لازم قرار دیا تو آپ انھیں دقیانوسی
قرار دیتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ ان کی یہ دقیانوسیت
زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو روگردانی کی راہ دکھاتی ہے۔ یوں
کیوں نہیں کہتے کہ جن دیندار میمن صاحبان کا تذکرہ آپ فرما
رہے ہیں انھوں نے خود بھی زکوٰۃ کو دنیاوی ٹیکس ہی جیسا سمجھ
لیا ہے اسی لئے اس کے ساتھ بھی ان کا سلوک وہی ہے جو
ٹیکسوں کے ساتھ ہے۔ جس طرح ٹیکس ادا کرتے ہوئے صرف یہی
مطمحِ نظر ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح قانون کا مُنہ جھلسا جائے اور
سرکاری مطالبے سے بری الذمہ ہوا جائے۔ اس سے کوئی
دلچسپی نہیں ہوتی کہ اس ٹیکس کا ایک ایک پیسہ صحیح طور پر خرچ
کیا جائے گا یا نہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ میمن بھائی زکوٰۃ کسی بھی
ادارے کے حوالے کر کے مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں کہ چلو چھٹی ہوئی۔
ضابطے کا پیٹ بھر گیا۔ حالانکہ زکوٰۃ کو اگر واقعی عبادت سمجھا
جائے تو یہ "جان چھڑاؤ" قسم کا طرزِ عمل ہرگز روا نہیں رکھا جاسکتا
زکوٰۃ کی رقمیں دینی و ملی اداروں کے حوالے کرنے سے پہلے ان
میمن بھائیوں کو اہل علم سے یہ تحقیق کرنی چاہیئے کہ آیا اس طریقے
پر زکوٰۃ ادا ہو بھی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر اس مسلک کے علماء
جس مسلک کو ان بھائیوں نے عام زندگی میں اختیار کر رکھا ہے

یہ فیصلہ دیں کہ قومی اداروں کو زکوٰۃ ادا کر دینا درست ہے تب تو انھیں اطمینانِ قلب کے ساتھ ادائیگی کا یہی طریقہ اختیار کر لینا چاہیئے لیکن اگر فیصلہ اس کے خلاف ہوا تو زکوٰۃ مستحقین کو براہ راست ادا کرنی چاہیئے اور قومی اداروں کی امداد اُس فاضل روپے میں سے کرنی چاہیئے جو ادائے زکوٰۃ کے بعد بھی ساڑھے ستانوے فیصد جوں کا توں موجود رہے۔

شق نمبر ۷ بھی اسی المناک ذہنیت کی مظہر ہے جس پر ابھی ہم نے افسوس کیا یعنی زکوٰۃ عبادت نہیں مصیبت ہے۔ اس ذہنیت کو پیدا کرنے میں پرویزی فکر کا بڑا ہاتھ ہے، بشرطیکہ ہرزہ سرائی کو فکر کا نام دیا جا سکے۔ پرویزیوں کے نزدیک زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے اسی لئے وہ اس کی شرح کو گھٹانا بڑھانا درست قرار دیتے ہیں۔ جب یہ فاسد خیال ذہن میں راہ پا جائے تو آپ سے آپ یہ لغو خیالی بھی سر ابھارے گی کہ حکومت جب ڈھائی فی صد سے کہیں زیادہ ٹیکس وصول کر رہی ہے تو زکوٰۃ کے واجب رہنے جانے کا کیا سوال باقی رہا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ دنیاوی ٹیکس اور زکوٰۃ کی جداگانہ حیثیتوں کو پہلے اچھی طرح سمجھ لیجئے تب ہی متعلقہ مسائل صاف ہو سکتے ہیں۔ دنیاوی ٹیکس ایک جبر ہے۔ کون ہے جو خوشدلی سے ٹیکس ادا کرتا ہو۔ لیکن حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ٹیکس ادا کرتے ہوئے آپ کی دلی کیفیت کیا تھی۔ آپ نے کتنی گالیاں دل ہی دل میں حکومت کو دیں اور کس بددلی سے قہر درویش بجان درویش ٹیکس کی رقم حکومت کے منھ پر ماری۔ یہاں کا تو قصہ یہ ہے کہ آپ نے رقم داخل کر دی قانون کا حق ادا ہو گیا۔ اب آپ پر کوئی دارو گیر نہیں کوئی نکیر نہیں۔ کوئی قدغن نہیں۔

مگر زکوٰۃ کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔ وہ تو ایک عبادت ہے جس میں ظاہری ادائیگی کے ساتھ باطنی میلان و شوق اور خوشدلی بھی انتہائی ضروری ہے۔ کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ اللہ سے دوسری دعاؤں کے علاوہ یہ دعا بھی کرنی چاہیئے کہ اے اللہ ہماری عبادتیں مقبول فرما لیجئے۔ یہ دعا اسی لئے تو کی جاتی ہے کہ اللہ کا معاملہ دنیا جیسے حاکموں کا نہیں ہے کہ ٹیکس کا پیسہ ادا کر دو اور ردّ و قبول کے چکر سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اللہ کے یہاں تو نیتیں اور جذبے دیکھے جاتے ہیں۔ دلی کیفیات دیکھی جاتی ہیں۔ ذہن و شعور کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اگر آپ کے دل کی وہی کیفیت ہے جو دنیاوی ٹیکس ادا کرتے ہوئے ہوتی ہے تو یقین کیجئے کہ یہ زکوٰۃ مقبول نہیں ہوگی جس طرح قربانی کے بارے میں قرآن نے تصریح کر دی کہ جانوروں کا لہو اور گوشت اللہ کو نہیں پہنچتا۔ اللہ کو تو تمہارا حسن نیت، جذبۂ عبودیت، شوقِ فرمانبرداری اور خشوع و خضوع پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام عبادات کا معاملہ ہے۔

جب یہ فرق آپ نے ذہن نشین فرما لیا تو اب ساری الجھنیں آپ سے آپ رفع ہو گئیں۔ مثلاً شق نمبر ۷ کے مطابق ایک شخص اپنے تمام سرمائے کو محض زکوٰۃ سے بچنے کے لئے ایسی اشیاء میں تبدیل کر دیتا ہے جن پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں تو کسی کا کیا بگڑا خود اسی کا سب کچھ بگڑ گیا۔ زکوٰۃ تو ایک عبادت تھی کیا اللہ عالم ذات الصدور نہیں دیکھ رہا کہ اس شخص نے عبادت سے جان چھڑانے کے لئے کیا چال بازی کی ہے؟ اگر دیکھ رہا ہے تو وہ ضرور آخرت میں اس سے احتساب کرے گا۔

رہا وہ دوسرا شخص جس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ وہ صبح سے شام تک عرق ریزی کرنے کے بعد چند ہزار روپے بچا لیتا ہے اس پر اس کو شرح کے مطابق زکوٰۃ ادا کئے بغیر چھٹکارہ نہیں تو جناب کے الفاظ نہایت مکروہ ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کو آپ ایک مصیبت سمجھ رہے ہیں نہ کہ عبادت۔ جناب والا! یہ شخص تو خوش نصیب ہے کہ اللہ نے جو ہاتھ پیر اور توانائی اسے دی تھی اسے استعمال کرنے کے بعد وہ اس لائق ہوا کہ حاصلِ محنت کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں بھی صدقہ کر سکے۔ آپ اس عبادت اور شکر نعمت کو عذاب قرار دے کر اسے چھٹکارہ دلانے کے درپے ہیں۔ اس زاویۂ نظر سے آپ کسی بھی حکم شریعت پر غور و فکر کریں گے تو اس میں کیڑے ہی کیڑے نظر آئیں گے۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جو فقہ حنفی کی تقلید میں تملیک کو

ضروری سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک مصارفِ زکوٰۃ والی آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد اور متعلقاتِ جہاد ہیں لیکن کسی بھی دینی موضوع پر بحث اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک مندرجہ ذیل اُمور پر اتفاق نہ کر لیا جائے۔

(۱) اصل اہمیت آخرت کی ہے۔ دنیا دوسرے درجے پر ہے۔ جب کبھی حکمِ الٰہی اور دنیاوی مصالح میں ٹکر ہوگی حکمِ الٰہی کو غالب و مقدم رکھا جائے گا۔

(۲) زکوٰۃ اسی طرح عبادت ہے جس طرح نماز اور حج اور قربانی اس کے نصاب اور مصارف میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ حالاتِ زمانہ اور دنیاوی مصالح کا لحاظ یقیناً ضروری ہے لیکن اس لحاظ میں اگر زکوٰۃ کی حیثیتِ عبادت ہی بدل جائے تو اس لحاظ کو بے دینی و بغاوت کہیں گے۔

(۳) زکوٰۃ میں تملیک کا مسئلہ ہو یا کوئی اور دینی مسئلہ۔ اس کے طے کرنے کا یہ طریقہ انتہائی لغو ہے کہ اس کے بارے میں اسلاف نے جو گفتگو کی ہے اسے تو چھوا بھی نہ جائے، بلکہ چند ظاہری منافع کو مصالح قرار دے کر مسئلہ کو من مانے طریقے پر طے کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جن پر متفق ہونے کے بعد ہی زکوٰۃ اور سود اور ضبطِ تولید اور انشورنس جیسے کسی بھی موضوع پر بحث و نظر کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ لیکن اگر ذہن وہی ہو جو آج کل عام ہے یعنی ماحول و فضا سے متاثر ہو کر پہلے تو ایک رائے قائم کر لو پھر اس کی تصدیق و تائید کے لئے قرآن و حدیث کی ورق گردانی کرو اور قدم قدم پر علماء پر دقیانوسیت اور کج فکری کی الزامات لگاتے چلو تو بحث کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔

(واضح رہے کہ مصارفِ زکوٰۃ کی جو آیت آپ نے نقل کی ہے اس کا نمبر ۸۰ نہیں ہے ۶۰ ہے)

انزال و تنزیل

سوال:- از سید مصطفےٰ۔ حیدر آباد۔

اپریل و مئی سنہ ۶۲ء کی تجلی کی ڈاک میں تفسیر صدیقی پر انزال و تنزیل کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے آپ نے جو یہ بتایا کہ قرآن نجماً نجماً اُترا ہے تو پھر مفسّرین نے جو سورۃ قدر کی پہلی آیت اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن پورا کا پورا ایک مرتبہ اترا ہے اس کا کیا مطلب ہوگا۔ یہ مفسرین نسائی، بیہقی، مستدرک، مصنف ابن شیبہ، طبرانی اور مفسرِ اعظم حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حوالوں سے یہ بات کہتے ہیں تو انکے مقابلہ میں آپ کی بات کا کیا وزن ہوگا؟

الجواب:-

آپ نے ہماری متذکرہ معروضات کو زیادہ توجہ سے پڑھا ہوتا تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی۔ خوب سمجھ لیجئے کہ سورۃ قدر کی تفسیر میں جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ پورا قرآن یکبارگی نازل ہوا ان کا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ نزول ہماری دنیا میں اور ہمارے پیغمبر پر ہوا، بلکہ وہ ایک توجیہ کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ پورا قرآن آسمانِ دنیا پر یکبارگی نازل ہوا۔

رہا حضورؐ پر اس کا نزول ـــ جو اصل نقطۂ بحث ہے تو اس کے بارے میں سبھی متفق ہیں کہ نزول نجماً نجماً ہی ہوا ہے۔ مشاہدات و واقعات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ قرآن کا تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتے رہنا ایک ایسا مسلّمہ واقعہ اور مشاہدہ ہے جیسے یہ بات مسلّم ہے کہ حضورؐ حضرت آمنہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور آپ کے دادے کا نام عبد المطلب تھا۔

نیز یہ بھی ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نزول ظاہراً تھا اور باطناً حضورؐ پر تمام ہی قرآن یکبارگی نازل ہو گیا تھا۔ اس کے غلط اور محال ہونے کی وجوہ پر ہم مئی والے جواب میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

سچ پوچھئے تو اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ کی تفسیر میں بھی ہمیں وہ علماء زیادہ اقرب الی الحق نظر آتے ہیں جنہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ لیلۃ القدر میں نزولِ قرآن سے مراد یہ نہیں ہے کہ پورا قرآن اس رات میں نازل ہوا، بلکہ نزولِ قرآن کا آغاز شبِ قدر میں ہوا ہے اور پہلی آیت ہی کو قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ پورا قرآن یکبارگی آسمانِ دنیا پر نازل کیا گیا۔

تاہم بحث یہ نہیں ہے کہ کونسی بات اصح و انسب ہے، دوسری ہی صورت مان لی جائے تب بھی یہ بات طے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول تدریج و تقسیط ہی کے ساتھ نجماً نجماً ہوا ہے چاہے وہ ساتویں آسمان سے ہوا ہو یا سمائے دنیا سے۔

چرم قربانی

سوال :- از محمد فضل اللہ خاں۔ میسور اسٹیٹ۔

(۱) حال ہی میں ایک اشتہار "احکام عید الاضحیٰ" نظروں سے گذرا جس میں تحریر تھا کہ چرم قربانی یا اس کی قیمت کسی معاوضہ میں دینا مثلاً امام مؤذن کو بسبب اُس کی امامت اور اذان کے درست نہیں اور قربانی کی کھال اگر فروخت کردی جائے تو اُسکی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

مگر چرم قربانی یا اس کی قیمت سے کسی دینی ادارہ کی تائید کرنے پر دوہرا ثواب ملتا ہے کرکے تحریر کردہ ہے۔

(۲) مجبوری چرم قربانی کی قیمت مؤذن یا امام کو دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ یا کوئی دینی مدارس کے لئے چندہ یا مدرسوں کو تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۳) کوئی قربانی کا جانور خرید لایا۔ جانور لانے کے وقت آدھی قیمت ادا کی اور آدھی قیمت بعد میں دینے کا وعدہ کیا تو اس جانور کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ اگر ادا نہ ہو تو اس کی صورت ثانی کیا ہے؟

الجواب :-

جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے قربانی کا چمڑا تو خود بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کو دیا جاسکتا ہے چاہے وہ مستحق زکوٰۃ ہو یا نہ ہو، لیکن اسے اگر فروخت کردیا گیا تو اس کی قیمت اسی طرح صدقہ کرنا ضروری ہے جس طرح زکوٰۃ کا پیسہ صدقہ کیا جاتا ہے۔ یعنی مستحقین کو براہ راست۔ لہٰذا یہ جو صورت رائج ہوگئی ہے کہ قربانی کے چمڑے مدرسوں کو دیدیئے جاتے ہیں اور مدرسے کے ارباب انتظام انھیں فروخت کرکے مدرسہ کی مختلف ضروریات میں صرف کرتے ہیں یہ حنفی فقہ کی رو سے جائز نہیں ہے۔ جب قربانی کی کھالیں فروخت ہوگئیں تو ان کے پیسے سے نہ تو کسی مدرس یا مؤذن کی تنخواہ دی جاسکتی ہے نہ مدرسے یا مسجد کے لئے فرش، چٹائیاں، تیل وغیرہ کچھ خریدا جاسکتا ہے، بلکہ اسے تو غریب طلباء کو نقد یا خوراک یا پوشاک وغیرہ کی صورت میں دینا ضروری ہوگا۔

ہمارا مدرسہ دارالعلوم دیوبند بھی چرم قربانی کا پیسہ اور مال زکوٰۃ قبول کرتا ہے لیکن ہمارے یہاں یہ اہتمام ہے کہ اس پیسے کو طلباء کی خوراک و پوشاک وغیرہ ہی پر صرف کیا جائے۔ مدرسے کی دیگر ضروریات، تنخواہیں، تعمیر وغیرہ اُس دوسرے روپے سے ہوتی ہیں جو ارباب استطاعت بطور صدقۂ نافلہ دیتے ہیں۔ یہی طریقہ درست بھی ہے، لیکن یہ جو ہر جگہ ہر مدرسہ چرم قربانی وصول کرنے کے لئے بڑے بڑے اشتہار شائع کرنے لگا ہے اس سلسلہ میں اُن لوگوں کو احتیاط برتنی چاہئے جو فقہ حنفی کے پیرو ہیں۔ آفت یہ آگئی ہے کہ جو منتظمین مدرسہ حنفی ہی ہیں اور تملیک کو زکوٰۃ کی شرط لازم سمجھتے ہیں وہ بھی چرم قربانی کے معاملہ میں عموماً بے راہ روی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ جب کھالیں بکنکر پیسہ جمع ہوجاتا ہے تو اسے مدرسہ کی تمام ہی ضروریات میں صرف کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ اس روپے کو طلباء کے کھانے کپڑے تک محدود رکھیں اور مدرسین کی تنخواہیں دوسرے روپے سے دیں لہٰذا وہ خود کو یہ فریب دے لیتے ہیں کہ چلو خرچ تو سب دین ہی کے کاموں میں ہو رہا ہے۔

لیکن یہ فریب ہی ہے۔ مدرسہ چلانے کیلئے وہ فعل جائز نہیں ہوسکتا جسے ان کا مسلک ناجائز قرار دے چکا ہے۔ چرم قربانی دینے والوں کو یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ جس مدرسے کو وہ دے رہے ہیں اسکے کرتا دھرتا لائق اطمینان بھی ہیں۔

قرض لئے ہوئے جانور کی قربانی ادا تو ہو جائیگی لیکن یہ ادائیگی اُس وقت تک کے لئے معلق رہے گی جب تک یہ قرض ادا نہ کردیا جائے۔ ویسے قوی اور ارجح قول یہی ہے کہ قربانی کا جانور پوری نقد قیمت ادا کرکے لینا چاہئے۔

سونے چاندی کی زکوٰۃ

سوال :- از شمس نوید عثمانی - رام پور

اگر کسی خاتون کے پاس سونے کا زیور بقدر نصاب زکوٰۃ
ین ہے — چاندی بھی زیور کی شکل میں نہیں ہے - لیکن
ٹوں پر کامدانی کے تار اور لچکے گوٹے وغیرہ کی صورت میں
راز چند تولہ چاندی موجود ہے تو کیا اس زیور اور کامدانی
ے تار وغیرہ کو ملا کر یہ دیکھا جائے گا کہ ان کی قیمت ۵۲ تولہ
ندی یا ۷½ تولہ سونے کے برابر ہوتی ہے کہ نہیں ؟ - ظاہر
ہے چند تولہ سونے کی قیمت ہی ۵۲ تولہ چاندی کے برابر ہو
ئے گی — تو کیا کامدانی کے تار اور گوٹہ وغیرہ کے باعث ایسی
تون پر فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ فرض ہو جائے گی ؟ یہ ملحوظ
ہے کہ الگ الگ نہ سونا بقدر نصاب ہے اور نہ تار اور گوٹہ
ی چاندی — یہاں کچھ لوگوں سے پوچھا تو ان کی رائے یہ
ہے کہ زکوٰۃ فرض ہو جائے گی - مولانا عروج صاحب بھی
ی فرماتے ہیں -

جواب :-

اگر بات احتیاط اور تقوے کی ہو تو صاف اور سیدھا
ا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے - کیونکہ قانونِ فقہی یہ
ہے کہ چاندی یا سونا بقدرِ نصاب موجود ہے تب تو اعتبار
زن کا ہوگا نہ کہ قیمت کا لیکن اگر سونا اور چاندی دونوں
تنے کم مقدار میں ہیں کہ کسی کا بھی نصاب پورا نہیں ہوتا تو
دونوں کی مجموعی قیمت لگا کر دیکھی جائے گی کہ اس قیمت سے
قدر نصاب چاندی خریدی جا سکتی ہے یا نہیں - اگر خریدی
ا سکتی ہے تو اس کے باوجود زکوٰۃ فرض ہو جائے گی کہ سونا یا
چاندی بجائے خود نصاب کے برابر موجود نہیں ہیں -

تمثیلاً یوں سمجھیئے کہ آپ کے پاس دو تولہ سونے کے بندے
ہیں اور دس تولے چاندی کی چوڑیاں - ظاہر ہے نہ تو دو تولہ
سونا زکوٰۃ فرض کرتا ہے نہ دس تولے چاندی - مگر اس صورت
میں دونوں کی قیمت لگا کر دیکھا جائے گا کہ اس سے اتنی
چاندی خریدی جا سکتی ہے یا نہیں جس پر زکوٰۃ فرض ہو -
اگر خریدی جا سکتی ہے اور ضرور خریدی جا سکتی ہے تو دونوں
زیوروں کی مجموعی قیمت پر ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ
فرض ہو جائے گی -

بظاہر اسی نوع کا معاملہ آپ کے سوال میں درپیش ہے
سونا اگر صرف ایک تولہ بھی ہو اور لچکے گوٹے میں مثلاً دس
تولے چاندی موجود ہو تب بھی دونوں کی مجموعی قیمت اتنی
ضرور ہو جاتی ہے کہ ساڑھے باون تولے چاندی خریدی
جا سکے - لہٰذا اصولِ مذکورہ کے تحت تو زکوٰۃ فرض ہو ہی
جانی چاہیئے -

لیکن جزئیاتِ فقہ میں غور و فکر کرنے کے بعد یہ اندازہ
ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ٹھیٹ قانونی نقطۂ نظر سے اتنا صاف
نہیں ہے - بلکہ اس میں خاصی پیچیدگی ہے - اگر ہم خالی حنفی
فقہ تک محدود رہیں تب بھی مضبوطی کے ساتھ صرف یہ بات
کہی جا سکتی ہے کہ ملبوسات پر لگے ہوئے گوٹے ٹھپے میں اگر
بقدر نصاب چاندی موجود ہے تب اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی -
لیکن یہ تصریح ہمیں نہیں مل سکی کہ گوٹے ٹھپے کی چاندی بقدر نصاب
نہ ہو تب بھی اسے سونے کے زیور کے ساتھ اسی طرح جوڑ دیا جائیگا
جس طرح چاندی کے زیور جوڑ دیئے جاتے ہیں -

بادی النظر میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب چاندی
کی ایک چوڑی بھی سونے کی قیمت کے ساتھ شامل کر کے زکوٰۃ
کا نصاب دیکھا جائے گا تو گوٹے ٹھپے کی چاندی بھی چاہے وہ
کتنی ہی کم مقدار ہو سونے کے ساتھ شامل کر لینی چاہیئے لیکن
ایک خاص فرق ہے جو اس قیاس کے لئے فارق سمجھا جا سکتا
ہے - وہ یہ کہ جو ملبوسات تجارت کے لئے نہ ہوں، بلکہ استعمال
کے لئے ہوں وہ چاہے کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں ان پر زکوٰۃ
عائد نہیں ہوتی - تب یہ کھلی بات ہے کہ سچا گوٹا اور لچکا وغیرہ
بجائے خود کوئی زیور نہیں ہے، بلکہ وہ ملبوسات کی زینت
بڑھانے کے لئے ان میں ٹانکا جاتا ہے - جب وہ ٹانک دیا گیا تو
اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ بھی نہیں ہوتی، بلکہ لباس ہی کا
جز بن جاتا ہے - اس سلسلہ میں مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ
فتویٰ بھی توجہ کے قابل ہے جو مجموعۃ الفتاویٰ کی جلد اول کتاب الزکوٰۃ

میں درج ہے۔ (دھوھذا)

سوال:۔ عورتوں کے کپڑوں میں جو گوٹہ ٹھپہ بنت وغیرہ ٹکی ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

جواب:۔ نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں من قبیل عروض ہیں اور عروض میں جب تک تجارت کی نیت نہ ہو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جیساکہ بحرالرائق میں ہے۔

اس سوال و جواب میں اگرچہ یہ تصریح نہیں کہ یہ گوٹہ ٹھپہ وغیرہ سچا ہے یا جھوٹا۔ لیکن قرینہ یہی کہتا ہے کہ سچے کے بارے میں گفتگو ہے جو چاندی کے تاروں پر مشتمل ہوتا ہے اور خاص حالتوں میں سونے کے تار بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ہماری ناقص رائے میں گوٹہ ٹھپہ اگر اتنی کثیر مقدار میں ہو کہ اس سے چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہو تب تو اس کی یہ معتد بہ مقدار اس لائق ہے کہ اسے مستقل حیثیت دیکر زکوٰۃ کا لزوم کر دیا جائے۔ لیکن اگر اتنی مقدار میں نہیں ہے تو اس کی حیثیت نقد مال اور چاندی کی نہیں، بلکہ لباس کے جزء کی ہے۔

آپ دیکھتے ہی ہیں کہ قرآن نے چاندی اور سونے پر زکوٰۃ لازم کرتے ہوئے ان کا نصاب نہیں بتایا یہ بظاہر اس بات کا قرینہ تھا کہ چاندی اور سونے کی معمولی سے معمولی مقدار پر بھی زکوٰۃ لازم ہو جانی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ کے رسولؐ نے ایک مقدار واضح کی جس سے کم پر زکوٰۃ کا لزوم نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ثبوتِ حکم اور حیثیت کی تعیین میں مقدار بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چوری کی سزا کا بھی یہی معاملہ ہے سب کو معلوم ہے کہ کتنی قسم کی چوریاں ہیں جن پر ہاتھ کاٹنے کی حد جاری نہیں ہوتی۔ حالانکہ قرآن نے السارق والسارقۃ والی آیت میں کوئی استثناء نہیں کیا۔

ان حقائق پر قیاس کرکے ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ، ملبوسات میں بطور زینت ٹنکے ہوئے گوٹے ٹھپے میں چاندی اگر اتنی وافر ہے کہ نصاب کی مقدار پوری ہو جاتی ہے تب تو اسے مستقل چاندی کی حیثیت دیکر زکوٰۃ کا لزوم ہونا چاہیئے، لیکن اگر کم مقدار میں ہے تو اس کی وہ مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی جو چوڑی یا ایک انگوٹھی کی ہوتی ہے۔ چاندی کی چوڑی یا انگوٹھی چاہے کتنی ہی کم وزن ہوں، لیکن وہ بجائے خود ایک مستقل زیور ہے اور چاندی سونے کے زیورات پر احناف کے نزدیک ہر حال میں زکوٰۃ لازم ہے، لہٰذا چاندی کی چوڑی یا انگوٹھی کا موجود سونے کے ساتھ ملاکر قیمت کے حساب سے نصاب کا تعین کرنا اصول حنفیہ کے عین مطابق ہے، لیکن جو تھوڑی سی چاندی گوٹے ٹھپے کی شکل میں ملبوسات کا جزو بنالی گئی ہے اسے وہ حیثیت نہیں دینی چاہیئے جو شئی مستقل کی ہوتی ہے۔ شئی مستقل اس صورت میں ملبوس ہے اور ملبوس پر زکوٰۃ واجب نہیں چاہے وہ کتنا ہی بیش بہا ہو۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوال میں مذکورہ خاتون پر زکوٰۃ کے لازم ہونے نہ ہونے میں ٹھیک حنفی قانون فقہ کی رو سے بھی دونوں راہوں کی گنجائش موجود ہے اور آئینی سطح پر ہماری ناچیز رائے اس فیصلہ کو زیادہ ترین قیاس تصور کرتی ہے کہ زکوٰۃ لازم نہیں ہونی چاہیئے۔ خصوصاً جب ہم زیورات کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں دیگر ائمہ کے مسالک پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ فیصلہ اور زیادہ ارجح نظر آتا ہے۔ زیورات میں بلا استثناء لزوم زکوٰۃ صرف احناف کا مسلک ہے۔ شوافع، مالکیہ اور حنابلہ متعدد مستثنیات نکالتے ہیں خصوصاً شوافع کا مسلک تو بہت ہی زیادہ اس بات کو اقرب الی الصواب گمان کراتا ہے کہ زیورات اور عورتوں کی زیب و زینت کی اشیاء میں زکوٰۃ کے پہلو سے نرمی اور توسع برتنا چاہیئے۔

گوٹے ٹھپے کو چاندی کے مستقل زیور سے جداگانہ حیثیت دینے کے لئے ہمیں فقہ حنفی کے اس آئینی فیصلے سے بھی مدد ملتی ہے کہ مَردوں کے لئے گوٹے ٹھپے کے استعمال کا جواز و عدم جواز اُس چاندی یا سونے کے وزن پر منحصر نہیں جو اس میں پایا جاتا ہے، بلکہ مساحت پر ہے یعنی اس کی چوڑائی پر۔ اگر یہ صرف دو یا تین انگشت چوڑا ہے تو اسے جائز کہیں گے اور یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس میں چاندی کی مقدار اتنی ہی ہے جتنی مَردوں کے لئے جائز ہے یا اس سے زیادہ۔ یہاں تک کہ ملبوسات یا استعمال کی کسی بھی چیز پر خالص چاندی کے پترے بھی استعمال کئے جائیں تو مَردوں کے لئے ان کے جواز اور عدم جواز کا انحصار وزن پر

نہیں ہوگا بلکہ مساحت پر ہوگا

اس سے معلوم ہوا کہ جو چاندی بجائے خود زیور نہیں بنائی گئی بلکہ اسے کسی لباس کا جزء بنالیا گیا ہے اس کی فقہی حیثیت بعینہٖ وہ نہیں ہے جو زیورات یا خام سونا چاندی کی ہے۔ اس صورت میں یہ دعویٰ کرنا۔ کم سے کم قانونی سطح پر دشوار ہی ہوگا کہ گوٹے ٹھپے میں پائے جانے والے چاندی کے تار و تکمہ چاندی ہی کی حیثیت دیگر اُس تھوڑے سے سونے کے ساتھ ملا لیا جائے جو نصاب سے کم ہے اور ان کی مجموعی قیمت سے نصاب کی تشخیص کی جائے۔

اتنی تفصیل میں ہم اس لئے گئے کہ مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے اور جیسا کہ سائل نے ظاہر کیا اہلِ علم حضرات کا خیال یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ لازم ہو جائے گی۔ فقہ میں چونکہ قیاس و انطباق کا معاملہ بڑا نازک ہے اس لئے خفی سے خفی تر پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے ہو سکتا ہے ہمارے تفقہ نے ٹھوکر کھائی ہو اور خیال مذکورہ اہلِ علم ہی کا درست ہو، لیکن بہتر ہوگا اگر مولانا عروج صاحب "زندگی" میں اس مسئلہ کو منقح فرمائیں۔ یہ ہم بھی ہر حال میں تسلیم کرتے ہیں کہ احتیاط اسی میں ہے کہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ ادا کی جاتی رہے مگر بحث احتیاط سے نہیں ٹھوس قانون سے ہے۔ زکوٰۃ دین کا اہم ترین رکن ہے۔ اس کے بعض غامض پہلوؤں پر اگر تحقیق و تفقہ کی روشنی ڈالی جائے تو اس کا فائدہ عام بھی ہوگا اور دوامی بھی۔ ہم اسی لئے نہ صرف صورۃِ مسئولہ پر گفتگو کرنے کی گذارش کرتے ہیں، بلکہ ایک اور پہلو بھی پیش کرتے ہیں جو لائقِ توجہ ہے۔

وہ یہ کہ چاندی اور سونے کا نصاب عام طور پر ساڑھے باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولے سونا مشہور ہو گیا ہے۔ بلکہ مفتیٰ بہ بنالیا گیا ہے۔ تو کیا واقعی یہ شبہ سے بالاتر ہے یا اس میں گفتگو کی گنجائش ہے۔ ہمارا اسبابِ علم بہت کم ہے لیکن جب بحر الرائق اور ہدایہ جیسی وزندار کتابوں پر نظر کرتے ہیں تو ان کے مندرجات بھی نصابِ مشہورہ کی تصدیق نہیں کرتے۔

جہاں تک ہمیں علم ہے سونے چاندی کا نصاب درہم و دینار پر منحصر ہے۔ اس پر غالباً سب متفق ہیں کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے اور سونے کا بیس مثقال (مثقال کو اگر دینار کا مرادف نہ مانا جائے بلکہ حنابلہ کی رائے کے مطابق دینار کو مثقال سے چھوٹا قرار دیا جائے تو نصاب ۲۵ دینار بنتا ہے کما فی الکتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

اب ظاہر ہے کہ نصاب کی تعیین کا مدار اس پر ہوگا کہ ایک درہم کتنے وزن کا ہوتا ہے اور ایک مثقال کتنے وزن کا۔ اہلِ علم کو معلوم ہے کہ دورِ رسالت اور دورِ خلافت صدیقی میں عرب کے مروجہ درہموں کا وزن یکساں نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے متعدد معاملات میں پیچیدگیاں اور جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے حضرت عمر فاروق رضؓ نے جب یہ دیکھا تو اپنی خلافت کے زمانے میں اس دشواری کا حل یوں نکالا کہ مختلف اوزان والے درہم لیکر ایک ساتھ گلوا دیئے پھر اس دھات سے تین مساوی وزن والے درہم بنوائے۔ یہ ہر درہم چودہ قیراط کا تھا۔ اب اسی درہم پر تمام صحابہ نے اتفاق فرمایا اور تمام وہ اُمورِ دینیہ جن میں دراہم سے واسطہ پڑتا تھا اسی درہم کو معیار مان کر فیصل ہونے لگے۔

ظاہر بات ہے کہ یہی چودہ قیراط کا درہم آج بھی اور آئندہ بھی ہم سب کیلئے واجب القبول معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب دیکھا جائے کہ ہمارے مروجہ اوزان (رتی، ماشہ، تولہ) میں یہ چودہ قیراط کیا بنتے ہیں تو معلوم ہے کہ ایک قیراط پانچ جو کا ہوتا ہے اور ایک رتی چار جو کی مانی جاتی ہے۔ چودہ قیراط اس لحاظ سے ساڑھے سترہ رتی کے مماثل ہوئے اور ساڑھے سترہ رتی کا مطلب ہوا دو ماشہ اور ڈیڑھ رتی کیونکہ ایک ماشہ آٹھ رتی کا تسلیم کیا گیا ہے۔

جب ایک معیاری درہم کا وزن دو ماشہ اور ڈیڑھ رتی طے ہو گیا تو دو سو درہم ۳۶ تولے ساڑھے چار ماشے کے ہونگے۔ گویا چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ نہیں ۳۶ تولہ ساڑھے چار ماشے نکلا۔

یہی حساب ایک اور طرح بھی بنتا ہے۔ یوں کہ ایک مثقال کو

تین ماشے اور ایک رتی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے اور فقہا بالاتفاق کہتے ہیں کہ چاندی کی زکوٰۃ میں اُس درہم کا اعتبار ہے جو اگر دس عدد ہوں تو سات مثقال کی برابر ہو جائیں۔ اب حساب پھیلائیے سات مثقال کے ۲۱ ماشے اور سات رتی بنتے ہیں۔ کیونکہ ایک مثقال کو تین ماشے اور ایک رتی کا تسلیم کیا گیا ہے۔ لہٰذا دس درہم کا معیاری وزن بھی یہی ہوا۔ جب یہی ہوا تو ایک درہم وہی دُو ماشے اور ڈیڑھ رتی کا نکلا۔

سونے کا نصاب بھی اسی طرح کی حسابی دیدہ ریزی سے نکالیئے تو وہ نہیں بنتا جو مشہور ہو گیا ہے۔ جب نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال تین ماشے ایک رتی کا تسلیم کر لیا گیا تو صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے اس سے زیادہ کیا کرنا ہوگا کہ تین ماشے ایک رتی کو بیس سے ضرب دے لیں۔ اس ضرب کا نتیجہ پانچ تولہ ڈھائی ماشہ نکلتا ہے نہ کہ ساڑھے سات تولہ۔

عوام کے لئے تو یہ طرزِ عمل درست ہے کہ جو کچھ اہلِ علم کہتے ہیں اس پر آنکھیں بند کر کے آمنا و صدقنا کہدیں۔ لیکن خود اہلِ علم کے لئے یہ روش درست نہیں کہی جا سکتی کہ کسی اہم ترین مسئلے کے فیصلے کو صرف اس لئے قبول کر لیں کہ وہ فیصلہ کسی وجہ سے مشہور و مروّج ہو گیا ہے۔ جو تفصیل ہم نے عرض کی وہ اگر غلط ہے یا اس میں کوئی جھول ہے اور مشہور نصاب کے لئے فقہ میں کچھ مضبوط دلائل موجود ہیں تو ہم درخواست کریں گے کہ انھیں سامنے لایا جائے۔ معاملہ کسی ایسے ویسے عمل کا نہیں زکوٰۃ جیسے فریضۂ مقدسہ کا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ چھ تولہ سونے یا ۳۷ تولے چاندی پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہو اور کتنے ہی مسلمان ایسے ہوں جو اس مقدار پر اس لئے زکوٰۃ نہ نکالتے ہوں کہ نصابِ مشہورہ اس سے زائد ہے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ مکمل

مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامہ کا شگفتہ ترجمہ۔

(جناب رئیس احمد جعفری کے قلم سے)

سفرنامہ ابن بطوطہ کی چند خصوصیات

(۱) دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو (۲) مشرق اور ایشیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس من چلے سیاح کے قدم نہ پہونچے ہوں (۳) سرزمین مغرب کے بعض مقامات کی بھی ابن بطوطہ نے سیاحت کی (۴) اور اپنے تاثرات و مشاہدات سفر پوری سچائی۔ بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلم بند کردیئے۔ قیمت مجلد پندرہ روپے۔

حافظ ابو محمد امام الدین کی مفید تصنیفات

ان کے مطالعے سے روح ایمان تازہ ہوتی ہے

سچے رسول کی سچی تعلیم ۔۔۔۔۔۔ ڈیڑھ روپیہ
حضرت خدیجہؓ ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
حضرت فاطمہ زہرہؓ ۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
خاصان خدا کی نماز ۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
نماز کے فضائل ۔۔۔۔۔۔ پندرہ آنے
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
ان چھ کتابوں کی یکجائی قیمت ۔۔۔۔۔۔ ساڑھے پانچ روپے

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجددؒ نے کن حالات میں کس حیرت ناک پامردی سے کس نوع کا کارنامۂ تجدید انجام دیا۔ اس بارے میں نہایت مفصل اور بلند پایہ کتاب۔ بہت دلچسپ اور دل نشیں۔

قیمت مجلد چار روپے

فارابی

تالیف:۔ عباس محمود (مصری)
ترجمہ:۔ رئیس احمد جعفری۔

معلم ثانی۔ حکیم ابو نصر فارابی کے فضل و کمال، شخصیت حالات و سوانح۔ علمی مقام اور تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل اور مستند حالات۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر

منکرین حدیث کے رد میں ایک مبسوط، مدلل اور دلچسپ کتاب۔ ان کے ہر ہر اشتباہ کا جواب ان کے افکار کی پوست کندہ حقیقت اور ان کے موقف کی لغویت کا اثبات پرلطف اور دلنشیں نقد۔ مکمل سہ حصہ ساڑھے تیرہ روپے۔

اسلامی معاشیات

از:۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ۔ اسلام کے معاشی نظام کا ایک تحقیقی مرقع۔ اٹھئے زمین کے مسلمانوں کے قلوب کی پکار کا بروقت جواب۔ مولانا گیلانیؒ کا مجتہدانہ کارنامہ۔ قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں

قیمت مجلد بارہ روپے

فقہ الاسلام

اسلامی اصول و قوانین پر ایک عظیم عربی تصنیف جس کا سلیس اردو ترجمہ نہایت سلیقے سے چھاپا گیا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک معلومات مفیدہ سے لبریز ہے۔ مجلد بارہ روپے۔

تفسیر سورۃ والتین

از:۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہدیہ چھ آنے

اردو فارسی ڈکشنری

اردو سے فارسی بنانے کے لئے ایک مختصر لیکن اہم مفید ڈکشنری۔ قیمت بارہ آنے۔

دعوتِ حق

شعری زبان میں اس تاریخی حقیقت کی سرگزشت کہ "دعوتِ حق" آغاز عالم سے آج تک کن کن مراحل و منازل سے ہوکر گذری۔ قیمت چار روپے۔

ضبط ولادت

وقت کے اس مسئلے پر مولانا مفتی محمد شفیع کے مدلل فرمودات۔ پروفیسر خورشید احمد کے فکر انگیز اور دستاویزی مقدمے کے ساتھ۔ مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

باندیوں کا مسئلہ

باندیوں سے متعلق ایک کتاب پر مفصل تنقید جس سے اس موضوع کے متعدد گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

مکتبہ تجلی دیوبند

مستقل عنوان

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

دیوبند کا آل انڈیا مشاعرہ

صوفی بدرالدجیٰ والی داستان تقریباً مکمل ہی پڑی تھی کہ مشیت ایزدی سے پھر گاڑی رُک گئی۔ بقول شخصے صبح کا سہانا وقت تھا اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں کہ شیخ اصرار حسین نے سوال کیا:-

"کیوں ملّا اب کی تمہاری خرافات کس موضوع پر آرہی ہیں؟"

"خدا آپ پر رحم کرے۔ جب ناچیز کے شہ پارے آپکو خرافات نظر آتے ہیں تو ہر ماہ پڑھنے ہی کی زحمت کیوں گوارا فرمائی جاتی ہے۔"

"آدمی زندگی میں بہتیرے فضول کام کرتاہے، ایک یہ بھی سہی۔ غیر متعلق باتیں مت کرو۔ بتاؤ کیا اب کی مشاعرے پر کچھ لکھ رہے ہو؟"

"کیوں؟" میں نے انھیں گھور کر سوال کیا۔ ان کے لب ولہجے سے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ فرمائش کر رہے ہیں یا منع کرنا چاہتے ہیں۔

"تم بھی برخوردار کنویں کے مینڈک ہی ہو۔ اماں اپنے دیوبند میں اتنا شاندار آل انڈیا مشاعرہ ہو گیا اور تم آنکھیں نکال کے پوچھ رہے ہو کیوں؟"

"اوہ.... غالباً اس لئے بھی لکھنا ضروری ہے کہ اس میں آپ کی غزل بہت کامیاب رہی تھی۔"

"نہ خیر یہ بات تو نہیں۔ مگر مشاعرے پر لکھنا دیگر وجوہ سے ضروری معلوم ہوتاہے۔"

"دیگر وجوہ" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو گئی تھی جس میں کچھ خواب سے لہراتے نظر آرہے تھے۔ وہ شرمیلے سے انداز میں مسکرائے بھی تھے، گویا کسی خاص نکتے کی طرف اشارہ کیے گئے ہوں۔

"دیگر وجوہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ان کی مسکراہٹ اب ذرا نکھر گئی۔ شگفتہ لہجے میں بولے:-

"اب تم اتنے احمق بھی نہیں ہو کہ دیگر وجوہ کا مطلب نہ سمجھ سکو — ایمان سے کہو کیا نئی شاعرہ شبنم اٹاوی نے سماں نہیں باندھ دیا تھا؟"

میری ریڑھ کی ہڈی میں لہر سی دوڑ گئی۔

"آہا... تو یہ بات ہے — مگر شیخ صاحب آپ کی عمر ساٹھ سے کم تو نہیں ہوگی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ تم لغو گوئی سے باز نہیں آسکتے۔"

"کچھ بھی کہیئے قبلہ۔ مجھے محترمہ شبنم صاحبہ کی عمر بیس بائیس سے زیادہ نظر نہیں آتی۔"

"اماں تو میں کونسا پیغامِ نکاح بھیج رہا ہوں" وہ جھنجلا کے بولے "تم اتنے دنوں سے صوفیوں کی صحبت اُٹھا رہے ہو پھر بھی تمہاری جمالیاتی حس مُردہ کی مردہ ہے — اچھا بتاؤ کبھی غالب کو پڑھا ہے؟"

"غالب پر تو میں سند ہوں آپ مدعا بیان فرمائیے۔"

میں چکرا سا گیا تھا کیونکہ موضوعِ کلام سے ان کے سوال کا جوڑ ابھی میں نہیں آیا تھا۔

"نہیں پہلے بتاؤ غالب کو تم کیسا شاعر سمجھتے ہو"

"بہت بڑا — مگر آپ سے کچھ کم"

"چانٹا کھاؤ گے — اماں وہ یاد نہیں غالب کیا کہہ گئے ہیں۔

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

"اوہو… میں آپ کو اتنا زندہ دل نہیں سمجھتا تھا پھر تو ارادہ کچھ دور نہیں ہے مجھے بھی سرونیٹ کی حیثیت سے لے چلیئے بڑا رعب پڑے گا"

"تمسخر نہ کرو" وہ خشک لہجے میں بولے پھر یکایک ان کا چہرہ بڑا سنجیدہ اور لہجہ فلسفیانہ ہو گیا — "عورت — کچلی ہوئی مظلوم عورت صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی و مساوات کی کھلی فضا میں قدم رکھ رہی ہے۔ ہم اگر بالکل ہی جانور نہیں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں، اس کی ہمت بڑھائیں، اس کی دلداری کریں…"

"یا پیر درسے۔ اب آپ اخلاقیات پہ لیکچر دیں گے — ہمیں تو شیخ صاحب خود بھی مغرب کی مکمل پیروی کے حق میں ہیں یہ کیا آدھا تیتر آدھا بٹیر — شبنم بیچاری نے ٹھیک اپ ٹو ڈیٹ انداز کیا تھا مگر آپ جانتے ہی ہیں ایسی گرمی میں زیادہ شائستہ لڑکیاں ہلکا پھلکا اسکرٹ پسند کرتی ہیں"

"تمہارا بھیجا سڑ گیا ہے۔ ہمیں مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مشرقی قدروں کا بھی لحاظ رکھنا ہے"

"پھر تو میں شبنم صاحبہ کو آپ کی طرف سے لکھ بھیجوں گا کہ مشاعرے میں برقعہ پہن کر غزل پڑھا کریں"

"یہ مطلب نہیں ہے۔ برقعہ تو ایک جاہلانہ رسم ہے یہ رسم مرد کی خودداری اور دیانت کے لئے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ تم جس چیز کو پردوں میں چھپاؤ گے دوسروں میں اسے پالینے کی تحریک ضرور پیدا ہوگی"

"زندہ باد" میں نے نعرہ لگایا — "غالباً یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں پردہ نہیں ہے وہاں آدمی اور فرشتے میں فرق کیا مشکل ہو گیا ہے۔ کیا مجال کوئی مرد اپنی بیوی کے سوا کسی کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی لے — اچھا شیخ صاحب ہم اگر چلیں تو کیا آپ شبنم کو بیٹی کہہ کر مخاطب کر سکیں گے؟"

"بیٹی ہوگی وہ تمہاری" — وہ تڑپ کر بولے مگر فوراً ہی جیسے اپنی غلطی محسوس کر لی ہو۔ حلق کے بل غرائے — "کیا مطلب؟"

"مطلب آپ سمجھ چکے ہیں — نہ سمجھے ہوں تو کوئی رومانی ناول پڑھیے یا فلم دیکھیے"

ان کے چہرے کی فلسفیانہ یبوست شگفتگی میں بدل گئی یعنی رخسار پر — جی ہاں داڑھی والے رخسار پر بڑی محبت سے ہلکا سا چپت جھاڑتے ہوئے بولے۔

"یار بڑے مکار ہو تم — خیر جھک جھک چھوڑو۔ ابکی اگر مشاعرے میں نہ لے گیا تو کہنا … … گا"

"بہت مشکل ہے" میں نے طویل سانس لیکر کہا "مشاعرے کی روداد لکھیں تو ظاہر ہے شبنم صاحبہ کے ذکر پہ قلم دو چار قلابازیاں ضرور کھائے گا — آپ جانتے ہی ہیں میں ایک عدد بیوی کا شوہر بھی ہوں"

"پھر؟"

"آپ صرف سر توڑ سکتے ہیں مگر شکی قسم کی بیویاں دل اور جگر تک کچا چبا جاتی ہیں"

"مگر ہم نے تو سنا ہے تمہاری اہلیہ دقیانوسی نہیں ہیں۔ تم نے ہی تو لکھا تھا کہ ایک بار وہ گنگا جمنا تک دیکھنے بے پردہ پہنچی تھیں"

"جی ہاں وہ خاصی ماڈرن ہیں مگر منطقی بھی ہیں۔ انکا خیال ہے کہ عورت صرف محرم ہو سکتی ہے یا نامحرم — بس"

"یہ تو بڑی تنگ خیالی ہے"

"کیا کیا جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سارے فنونِ لطیفہ سارے جمالیاتی فلسفے صرف ایک ہی سادہ سی حقیقت کے گرد گھوم رہے ہیں — جنس!"

"ہٹاؤ بات کو طول نہ دو۔ اگر اب کی مشاعرے پر نہ نہیں لکھا تو یار ہی کٹ —"

ان کے چہرے پر یکایک اداسی چھا گئی۔ آنکھیں نم

آگیا۔ میں کیا اب بھی [illegible] گے۔ وہ اسی قسم کے آدمی ہیں ہم میں تو لیدم میں [illegible]

"اچھا تو [illegible] گا۔ لیکن کیا کچھ شرائط بھی ہیں؟"

"نہیں۔ بس دو باتوں کا لحاظ رکھنا۔ اول تو یہ دلداری مشاعرہ کرانے والے صاحب کی بھی ہو جائے کیا خبر اسی سے خوش ہو کر وہ آئندہ بھی مشاعرہ کرا دیں۔ دوسرے مسن بھم [illegible] شرافت کے ساتھ ہمراہ دینا۔ دل بدست آور کہ حجِ اکبری ست۔"

مصرعہ پڑھتے ہوئے ان کی آواز میں بڑی صوفیت آگئی تھی۔

"شرافت سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"شرافت کا مطلب شرافت یعنی خباثت پرست آتر آنا۔"

"اب میں خباثت کا بھی مطلب پوچھوں گا۔"

"تمہارا سر۔ جاؤ بس لکھو میں چل رہا ہوں۔"

تو جناب چونکہ شیخ اسرار حسین میرے ہمسائے ہیں اور ہمسائے کے حقوق پر محلّے میں وعظ پر وعظ چلا آ رہا ہے اس لئے ایسے ہمسائے کی دلداری نہایت ضروری ہے جو سر توڑنے کی دھمکی دیتے دیتے رد بھی سکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سُن لینا ضروری ہے کہ یکم جون ۶۲ء کا آل انڈیا مشاعرہ اس اعتبار سے آل ورلڈ قسم کی نوعیت رکھتا ہے کہ وہ "ختنہ" کی تقریب میں منعقد ہوا تھا۔

غلط نہ سمجھیے۔ ختنہ کا تعلق شعراء یا سامعین سے نہیں ہے اُن بلند اقبال صاحب زادے سے ہے جو ایک صاحبِ ثروت جہلانے محمد حنیف قریشی صاحب کے گھر میں سونے کا چمچہ منھ میں لئے پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ختنہ کی تقریب میں کسی بادشاہ تک کو مشاعرہ کرانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اس لحاظ سے اس مشاعرہ کو "تاریخی" بھی کہا جا سکتا ہے۔

مجھ پر اس سلسلہ میں بڑی قیامت گذر گئی۔ ظاہر ہے مشاعرے میں مجھے کچھ پڑھنا میرا بھی دلی فرض تھا۔ بڑے جوش و خروش سے تازہ غزل کی تیاری شروع کی تو اچانک خیال گزرا کہ مجھے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہاں سے آگو۔ اگر مشاعرہ جب ختنہ کی تقریب میں ہے تو اشعار میں بھی اس کی رعایت ضرور ہونی چاہئے جیسے یوم آزادی کے مشاعرے میں آزادی کی ہوتی ہے اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف مشاعرہ کرانے والے بزرگ کی باچھیں کھل جائیں گی بلکہ تمام شعراء و سامعین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

مگر نتیجہ بڑا دردناک نکلا۔ نصف درجن پیالیاں چائے کی چڑھا کر اور اتنے ہی پیکٹ سگریٹ کے پھونک کر چار گھنٹے کی دماغ سوزی کا حاصل بس ایسے ہی چند اشعار تھے جنھیں اگر غلطی سے مشاعرے میں پڑھ دیا جاتا تو بعید نہیں کہ مشتعلق قسم کے سامعین ملا کی گردن توڑ کر ہاتھ میں تھما دیتے۔

ویسے بھی مشاعرہ ایک بڑے سرکاری شریمان کی صدارت میں تھا۔ گردن ہی تک بات نہ رہتی، ہو سکتا تھا کہ جائداد بھی بحقِ شائستگی ضبط ہو جاتے۔ مال و جائداد مجھ جیسے حقیر فقیر کا بیوی بچوں کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

باپ رے۔ میں کانپ گیا اور کھوپڑی کو جلدی جلدی زور زور جھٹکے دیتے تاکہ نازل شدہ اشعار ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔

دوسرے روز یہ سوچ کر جنگل کی طرف نکلا کہ موضوع پر لعنت۔ موضوع کے چکر میں رہا تو ایک بھی شعر ڈھنگ کا نہ بن سکے گا۔ فضا خوشگوار تھی۔ موسم کسی اسمارٹ حسینہ کی طرح چھل بل دکھا رہا تھا۔ افق پر شفق کی رنگینیاں اس طرح بکھری ہوئی تھیں کہ بے اختیار ایک نظم الہام کی طرح نازل ہونی شروع ہو گئی۔

میری محبوب، مری جانِ تمنّا [illegible]
[illegible] دور بہت دور۔ افق کے [illegible]
رقص کرتے ہوئے گاتے ہوئے اٹھلاتے ہوئے
نغمۂ شوق بہ لب، سازِ تمنّا بہ کنار
عشق اور حسن کو دنیا نہیں ملنے دیتی
آؤ ہم بھاگ چلیں۔ بند نہیں راہِ فرار

دفعتاً دماغ کے کسی دُور افتادہ گوشے سے مہین سی آواز آئی یہ شاید عذرا بولی تھی۔ اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔ بالکل غیر شاعرانہ۔ کہنے لگی:۔

کیا کہا بھاگ چلیں؟ — ٹھیک کہا، بھاگ چلو
ہاں مگر — کونسا ٹاؤن ہے افق کے اُس پار؟
بمبئی؟ دارجلنگ؟ ٹوکیو؟ پیرس؟ لندن؟
نام بتلاؤ کہ آئے دلِ مضطر کو قرار
چند زیور تو مرے پاس ہیں — لے آؤں گی
تم مگر نقد مہیا کرو دو چار ہزار

میرا موڈ اکدم بگڑ گیا۔ ہُنہہ دو چار ہزار! — مجھے بھی پگلی نے محمد حنیف قریشی سمجھا ہے۔

اتنے میں کہیں دور سے ریڈیو کی آواز آئی:۔

پاپی پپیہا رے پی پی نہ بول بیری پی پی نہ بول

ستیاناس۔ پپیہا پی پی نہیں بولے گا تو کیا ڈھیچوں ڈھیچوں کرے گا۔ اب میں سرپٹ دوڑا چلا گیا۔ جب آواز کے رینج سے نکل گیا تو ذہن پھر نظم کی طرف مائل ہوا۔ عذرا کی لغو گوئی کا جواب تو دینا ہی تھا۔

جانِ من تم نے یہ کیا کہدیا — لاحول ولا
عشق کے بندوں کو دولت سے بھلا کیا سروکار
میں تمھیں چاند ستاروں کے خزانے دوں گا
تم کو پہناؤں گا رنگین تمناؤں کے ہار
ساتھ زیور کے زرِ نقد بھی تم ہی لے آؤ
میں بھی لیلوں گا کسی دوست سے دس بیس اُدھار

معاً ایک چھناکے دار قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہ تو عذرا کی ہنسی تھی جو دیر تک صدائے بازگشت کی طرح میری کھوپڑی کی دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ پھر وہ بڑے جلے بُھنے لہجے میں بولی:۔

تم لفنگے ہو۔ چلو یوں نہ ہمیں بور کرو
کان مت کھاؤ۔ ہٹو آئے بڑے عاشقِ زار
آج میں سمجھی کہ تم سے تو کہیں بہتر ہے
مس فریدہ کا بڑا بھائی وہ عبدالستار
بنک بیلنس بھی رکھتا ہے۔ مہذب بھی ہے
کم سہی عقل میسر ہے مگر موٹر کار

میں نے آگ بگولا ہو کر اپنی کھوپڑی پر دو چار گھونسے رسید کئے۔ ایسی بورژوائی ذہنیت کی محبوبہ کو مجھ جیسا کلرکی سطح کا عاشق تھیلیاں کہاں سے پیش کر سکتا ہے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ ریڈیو کی آواز پھر آئی:۔

پی پی نہ بول بیری پی پی نہ بول

مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پی پی مجھے چڑانے کے لئے ہو رہی ہے۔ اِدھر عذرا کے سنگین الفاظ بھیجے میں ٹھونگیں سی مار رہے تھے۔ طبیعت چورنگ ہو کر رہ گئی قمیص کے دامن سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے میرے مُنھ سے نکلا:۔

اف یہ توہین، یہ تضحیک، یہ کوری انسلٹ
ہائے یہ کم نظری وائے یہ گھٹیا افکار
مس فریدہ کا بڑا بھائی وہ موٹا کنجوس
پیٹ پر جس کے بنا ہے کسی ہاتھی کا مزار
کر دیا خود کو اگر اس کے حوالے تم نے
پھر تو سمجھو کہ تمھارا بھی ہوا بیڑا پار
بوٹیاں نوچو گی، جھلاؤ گی، پچھتاؤ گی
تم اکیلی ہی افق پار چلی جاؤ گی

کچھ دیر بعد میں نے تالاب کے پانی سے مُنھ دھویا تو حواس کچھ تر و تازہ ہوئے۔ نظم پر لعنت بھیجکر میں نے غزل کی طرف توجہ دی۔ اب ذہن کی فضا میں کئی حسین آنچل لہرا رہے تھے۔ ایک خالص مشرقی محبوبہ کا تصور جو مہینوں کھائے پیئے بغیر خالی پیمانِ وفا کے سہارے جیتی ہے۔ غرارے اور شلوار کے کئی نادیدہ بنے اور بگڑے۔ پھر تصور نے ساری اور بلاؤز پر حبست کی۔ یکایک ایک نازک بدن حسینہ کے فرقِ سیمیں پر فرانسیسی طرز کا اسکرٹ نظر آیا گویا غزل کی ساری سرشاریت رنگ بدل بدل کر پھوار کی طرح میری چٹیل کھوپڑی پر برس رہی تھی اور میں شعر بدل بدل کر مختلف بحروں میں ایک ایک شعر کہتا جا رہا تھا تاکہ دیکھوں کونسے طرز میں یاد بہتر پڑھ سکوں گا۔

مگر جب غروب آفتاب کے بعد گھر کی طرف لوٹا تو یکلخت

یہ عجیب و غریب بات محسوس کی کہ ہر شعر میں کسی نہ کسی انداز سے موضوع کی طرف لطیف سا اشارہ ہو گیا ہے۔ طبیعت پھڑک اٹھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اشعار میں کسی قسم کی صنعت رکھنا استادی کا ثبوت سمجھا گیا ہے۔ ایک اتنے بڑے مشاعرے میں اگر ملّا ابن العرب کی استادی مان لیا جائے تو کیا تعجب ہے کہ جنابِ صدر کے توسّل سے اسے بھی "پدم وبھوشن" جیسا کوئی خطاب ہاتھ لگ جائے۔

ذرا آپ بھی بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

خط نہ بھیجا نہ آپ خود آئے
اب کسی اور کو تلاش کریں

"خط" بے شک ط سے ہے مگر مشاعروں میں قرأت نہیں چلتی ہے۔ تجوید کا استعمال نہ ہو تو "خط نہ" اور "ختنہ" کی صوتی یکسانیت میں کس کافر کو شک ہو سکتا ہے۔

یا مثلاً:۔

جو پیتے ہیں تو بسم اللہ کہہ کر جام لیتے ہیں
کسی عالم میں بھی اپنی مسلمانی نہیں جاتی

اگر مائک پر عرض کر دیا گیا کہ حضرات ذرا قافیہ ملحوظ رہے تو کیا پھر بھی کسی تشریح کی حاجت رہ جاتی ہے۔

یا مثلاً:۔

وہ زخم لگاتے ہیں، ہم جشن مناتے ہیں
ہنس ہنس کے لہو دینا عشاق کی سنّت ہے

اس کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ شاید جنابِ صدر محظوظ نہ ہو سکتے۔ مگر اس خطرے کا ازالہ بھی اسی طرح ایک ذومعنی سی تمہید کے ذریعہ ہو سکتا تھا جس طرح نشور واحدی صاحب نے اپنے اکثر اشعار کو فنکارانہ تمہیدوں کے ذریعہ ممکنہ خطرات سے بچا لیا تھا۔

یا مثلاً:۔

مہک رہی ہیں وہ زلفیں کچھ اس طرح ملّا
کہ لوگ نافۂ مشکِ ختن کو بھول گئے

ختن ـــ بروزنِ چند بے شک ختنہ کے خاندان سے نہیں ہے مگر جیسے چھوٹے میاں کو چھٹّن کہہ دیتے ہیں اسی طرح ختن کی لفظی اشتراکیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اگر نشور واحدی صاحب کے اسوۂ حسنہ کی تقلید میں خاکسار بھی اس شعر سے قبل مائک پر عرض کر دیتا کہ حضرات یہ مشاعرہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بہ تقریب ختنہ ہو رہا ہے۔ ایک شعر عرض کرتا ہوں اس کے قافیہ کو اسی پس منظر میں ملاحظہ فرمائیے گا تو گدھے سے گدھا سامع بھی لطف اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

الحاصل اپنی کارگذاری پر آپ ہی آپ بڑا فخر محسوس ہوا۔ مشاعرہ اگلے روز تھا۔ صورت یہ ذہن میں آئی کہ مختلف زمینوں کے ہر شعر میں ایک ایک شعر بڑھا کر قطعے تیار کر لوں گا۔ مشاعروں میں قطعے خاصی داد لے بھاگتے ہیں۔

مگر شامتِ اعمال کو کون روک سکتا ہے مشاعرے والے دن عین دوپہر میں میر نفیس احمد تشریف لائے۔ وہ آئے تھے اس چکر میں کہ میرے ذریعے اسٹیج کا پاس حاصل کر لیں۔ ایسی حالت میں مکھن بازی بھی ضروری تھی۔ چنانچہ بڑے صاحبِ ذوق بن کر کہنے لگے:۔

"ارے بھئی سنائیے تو ملّا صاحب آپ نے کیا لکھا ہے"

میں بیتاب تھا ہی۔ سوچا ریہرسل بھی ہو جائے گی۔ بس پھر تو یہی تصور جما لیا کہ مشاعرہ جم رہا ہے۔ مائک سامنے ہے۔ آنکھیں بند کر کے شروع ہو گیا اور اشعار کے ساتھ تمہیدی فقرے بھی دہراتا چلا گیا۔

اب یہ کس مسخرے کو خبر تھی کہ گھر میں ملک الموت بھی نازل ہو چکا ہے۔ یعنی وہی ہمارے سالے دام ظلہٗ۔ جب میر صاحب منوں داد بٹور کر میں گھر میں آیا تو تن بدن میں سناٹا سا نکل گیا۔ مدیر تجلی سامنے ہی جلوہ افروز تھے اور خونخوار نظروں سے میری ہی سمت گھور رہے تھے۔ ان کی بہن کا چہرہ بھی اقلیدس کے ایک ستے زاویے کی خبر دے رہا تھا۔

"اِدھر آؤ" مجھے ٹھٹکتا دیکھ کر انھوں نے سڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں من من بھر کے قدموں سے چلتا قریب پہنچا تو نہایت خشک انداز میں بولے:۔

"تو یہ شُہدہ پن پھیلاؤ گے تم مشاعرے میں"

"جی... وہ تو... یعنی... جی" میری قوتِ گویائی چھننے چلی گئی۔

"شرم و حیا تو تمہارے نام کی رہی ہی نہیں۔ خبر بھی ہے ایک لڑکی بھی شاعرہ کی حیثیت سے مشاعرے میں آرہی ہے"

اب میں نے قدرے ہمت سے کام لیکر عرض کیا:—

"جی... لڑکیوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے"

"دلچسپی کے بچے — تم نے اگر ایک خاتون کی موجودگی میں یہ شیطانی قطعے پڑھ دیئے تو... تو میں دیوبند میں کسی کو منھ دکھلانے کے قابل بھی نہیں رہ جاؤں گا"

"بھلا آپ کے منھ پر میرے پڑھنے سے کیا اثر پڑیگا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

ان کا چہرہ سرخ در سرخ ہو گیا۔ یعنی سرخ تو وہ پہلے ہی سے تھا اب لالۂ صحرائی کی طرح تمتمانے لگا۔

"تم سے زیادہ چکنا گھڑا میں نے نہیں دیکھا — خیر جھک مارے جاؤ۔ دیکھوں گا مشاعرے میں کیسے پڑھ پاتے ہو"

یہ کہہ کر وہ بھناتے ہوئے چلے گئے۔ حق یہ ہے کہ ان کے رخصتی قدم زمین پر نہیں، ہم ملا ملا تن کی کھوپڑیوں پر پڑ رہے تھے۔

خیر صاحب۔ رات آئی۔ مشاعرہ دس کے بعد شروع ہونا تھا۔ احاطہ بہت کشادہ تھا اور اسٹیج بھی کافی عریض و طویل بنایا گیا تھا، مگر نو ہی بجے یہ اندازہ ہو گیا کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ یہ خبر تو جنگل کی آگ کی طرح کئی دن پہلے سے پھیلی ہوئی تھی کہ چشم بد دور ایک نو عمر شاعرہ شبنم صاحبہ بھی تشریف ارزانی فرمانے والی ہیں۔ مگر جب مغرب سے قبل ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ موصوفہ تشریف لے آئی ہیں تو صوفی الہام الدین کی روایت کیمطابق شائقین کے کلیجے گز گز بھر کے ہو گئے۔ صوفی صاحب قسم کھا کر بتا رہے تھے کہ بہت سے پابندِ صلوٰۃ حضرات نے آج عشاء بھی مغرب ہی کے ساتھ پڑھ لی تھی اور نو بجے سے مشاعرہ گاہ میں آ سلئے تھے تاکہ آگے جگہ لے سکیں۔

میرے پاس اسٹیج کا پاس تھا لیکن ساڑھے نو پر جماعت پڑھ لینے کے بعد جب وہاں پہنچا ہوں تو [illegible] پڑا کہ کیوں نہ میں نے بھی مغرب ہی میں جمع بین الصلوٰتین [illegible] فارمولے پر عمل کیا اور عشاء کو اگلے دن کے لئے اٹھا رکھا۔ مسندِ صدارت کے آس پاس جگہ پُر ہو چکی تھی اور محترمہ شبنم اتاوی ایسی گھری ہوئی بیٹھی تھیں کہ اُن کا پڑوس بھی مجھے نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

دُور سے نظر پڑی تو طبیعت اور بھی بے چین ہو گئی۔ اگر آپ نے کبھی تھرڈ کلاس میں بیٹھ کر تھیٹر دیکھا ہو گا تو آپ ضرور میرے اس تاثر کی تائید کریں گے کہ میک اپ کی ہوئی ادا کارائیں اور اداکار تیز لائٹ میں دُور سے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ کوئی اپسرا اپنے باڈی گارڈ سمیت کوہِ قاف سے خاکدانِ دیوبند میں اُتر آئی ہے — سفید براق لباس۔ روشن چہرہ، بال بڑے رکھ رکھاؤ سے بنے ہوئے۔ آنکھوں پر چشمہ — گو چشمے کا فریم سنہری نہیں تھا۔ کچھ ایسا تھا جیسے پروفیسرنیاں لگاتی ہیں۔ مجھے بے اختیار جگر علیہ الرحمۃ یاد آئے۔ ان کے دورِ آخر کی غزلوں میں حسن و رعنائی کے ساتھ جو وقار و متانت جلوہ گر ہے یہ چشمہ اسی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ کچھ دیر کیلئے تو سچ مچ میری اوندھی کھوپڑی میں یہی خیال سمایا رہا کہ جگر صاحب نے عالمِ بالا سے اپنی غزل بھیجی ہے۔ مگر پھر جو شائقین کا ریلا آیا تو ایک ڈاڑھی والے نیک بخت کا صاف شفاف سر میری کنپٹی سے ٹکرایا اور تصورات کے باغ میں بت جھڑ سی ہوتی چلی گئی۔ کسی صاحب کا گھٹنا بھی کوکھ میں رسید ہوا تھا۔ مگر فائدہ ان آفات کا یہ نکلا کہ میں نے کسی ڈوبنے والے کی طرح ہاتھ پیر جو مارے تو اگلے ہی لمحے تقریباً دو گز آگے پہنچ چکا تھا۔

اب شبنم صاحبہ کے خد و خال اتنے واضح نظر آ رہے تھے کہ کسی پُر اسرار آفاقی تصور کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے بھی کوکھ کی چوٹ نے خوابوں کے غباروں کی ہوا نکال دی تھی۔ آس پاس ہی نشور واحدی نظر آئے۔ ان کے اگلے دو دانت اتنے فاصلے سے بھی ان کی معروف شخصیت کا اعلان کر رہے تھے۔ میں نے تقابلی مطالعہ کیا، ارادۃً نہیں بلکہ یہ اضطراری فعل تھا۔ جدید اسلوب میں آپ اسے تحت الشعوری بھی کہہ سکتے ہیں، بلکہ لاشعوری بھی کہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ واقعی ہر شے اپنی ضد سے خوب

[illegible]
بیوں کی کیا [illegible]
اف نہیں [illegible] مشاعرے کے [illegible] غزل [illegible]
رتی ہے تو آئینہ [illegible] اپنا رخ زیبا دیکھ لیتا ہوں بس گویا
ے باسی پھول پر نظر پڑی اور دنیا کے تصور میں گلاب کھلنے
شروع ہو گئے۔ لوگ کہتے ہیں دنیا امید پر قائم ہے میں کہتا
ہوں دنیا تضاد پر قائم ہے۔

القصہ جیسی منظر میں تشریف رکھنے والے خوش نصیبوں کو
سرت ورقابت کی نظروں سے تکتے ہوئے میرے سینے کی تہوں میں
سی اپنے ہی جیسے یتیم شاعر کا ایک شعر کیچوے کی طرح کلبلا رہا تھا۔

ان کا حصہ من وسلویٰ   اپنی قسمت در کا جلوہ

"کیوں ملا صاحب آپکے پاس تو اسٹیج کا پاس ہوگا وہیں
جائیے نا۔" دفعتاً پیچھے والے صاحب نے کہا جو اُچک اُچک کر میری
گردن کے عقب سے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک پڑھے لکھے [illegible]
تھے۔

"ہاں بھی جاؤں گا۔ ذرا پیش منظر دیکھ لوں۔ اسٹیج پر تو اب
پیچھے ہی جگہ ملے گی۔"

"آپ تو گردنیں پھلانگ کر بھی آگے پہنچ سکتے ہیں آپکو کون
روکے گا۔"

"کیوں میں کیا لاٹ صاحب ہوں" میں غرایا۔

"ارے نہیں۔ آپ بُرا مان گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپکو
تو سب جانتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد اسٹیج سے تقاضا شروع ہوا کہ بیٹھو بیٹھو۔ اب
یہ تو اینٹی کیٹ کے خلاف ہوتا کہ میں بھی وہیں پلتھی مار بیٹھتا۔ مجبوراً
لٹا اور دھکے کھا کھا کر کنارے والے راستے سے اسٹیج پر پہنچا۔ ارادہ
سچی بات ہے یہی تھا کہ کھسکتا سرکتا اتنا آگے ضرور پہنچ جاؤں گا کہ
کم سے کم یہ تو دیکھ سکوں کہ اتنے بڑے مجمع میں جب ایک نوجوان
لڑکی اپنے محبوب کا ذکر جمیل کرتی ہے تو اس کے چہرے پر کس قسم
کی کیفیات ظاہر ہوتی ہیں۔ گویا شبنم صاحبہ کو علی وجہ البصیرت
سُننا میرا مدعا تھا مگر مدعا پہ پڑے خاک۔ اگلے ہی لمحے سارا
جوش وخروش ہانڈی کے اُبال کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ مدیر تجلی

[illegible] کی موجودگی میں گردنیں
[illegible] ممکن نہیں تھا جس کی روح
[illegible] منتقل فرما گیا ہے۔
خون کے سے گھونٹ پی کر وہیں بیٹھا رہا۔

مشاعرے کی پوری کامنٹری کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح
سُنانا تو مشکل ہے۔ ویسے بھی میرے حاشیہ خیال تک میں یہ بات
نہیں تھی کہ یہ رات کی کہانی دن میں بھی سُنانی پڑے گی۔ ورنہ
وہیں کاغذ قلم سے کام لیتا۔ اب تو صرف یادداشت سے کام لینا
ہوگا۔

مشاعروں کے بارے میں میرا تاثر کچھ ایسا ہے جیسے چھٹانک
بھر حلوہ کھانے کے لئے من بھر تھپر چبانے ضروری ہوں۔ دس بیس
شعر سنئے تب کہیں جاکر ایک اچھا شعر پلے پڑتا ہے۔ وہی تضاد کا
فلسفہ۔ مگر کبھی کبھی یہ فلسفہ اُلٹ بھی جاتا ہے۔ فرض کیجئے مسلسل گھٹیا
قسم کے اشعار ہضم کرتے کرتے دماغ سنڈاس میں تبدیل ہو گیا ہو
تو کسی اچھے شعر کی بھی گت وہاں جاکر اس کے سوا کیا بنے گی کہ۔

ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد اے دوست

یہ مشاعرہ اس اعتبار سے "قومی" بھی تھا کہ صدارت تھی
از بسکہ جناب لالہ شام ناتھ کی جو ڈپٹی منسٹر ہیں محکمۂ اطلاعات و
نشریات کے بھارت سرکار اپنی کے۔ موصوف ایک گھنٹے سے
زیادہ نہ ٹھیرے ہوں گے گویا تبرک کا مزا دے گئے۔ وہ چلے
گئے تو ان کی جگہ ایک بزرگوار سعید مرتضیٰ صاحب نے لی۔ میر
حیرت علی اس تبادلے کے دس منٹ بعد آئے تھے۔ میرے ہی
پاس بیٹھے تھے۔ انھیں تبادلے کا علم نہیں تھا۔ مجھ سے بڑے
رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے۔

"اماں لالہ شام ناتھ ایسے ہوتے ہیں؟"

"جی نہیں یہ سعید مرتضیٰ صاحب ہیں۔"

"کیوں؟" انھوں نے آنکھیں نکال کر اس طرح پوچھا جیسے
اس تبادلے کی ذمہ داری مجھی پر رہی ہو۔

"اللہ کی مرضی یوں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔
—"ڈپٹی منسٹر صاحب آئے بھی تھے چلے بھی گئے—

—اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر"

لاؤڈ اسپیکر اتنے شاندار تھے کہ کم از کم سلیم کھتولوی کی آواز تو پاکستان تک پہنچ گئی ہوگی سلیم بڑے اچھے شاعر ہیں۔ مشیت نے ان کی آنکھیں چھین لیں مگر ان کے داخلی مشاہدات بڑے غضب کے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ محبوب کے ایک ایک عضو کو چھو کر شعر کہتے ہوں۔ کاش انھیں کوئی صحیح مشورہ دینے والا مل جاتا۔ ان کی آواز بڑی ہنگامہ خیز قسم کی ہے، مگر وہ اشعار بھی اتنے بلند سُروں میں لے لیتے ہیں کہ انترے کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ انترے کے بغیر نغمہ ایسا ہی ہے جیسے روٹی کے بغیر سالن۔ اگر کبھی سامعین داد دینے میں کنجوسی کرتے ہیں تو سلیم صاحب انترا بھی اُٹھانے کی کوشش فرماتے ہیں، مگر اس وقت کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے جیسے مصرعہ ان کے دماغ سے نہیں معدے کی تہہ سے کھنچ کر آرہا ہو۔ قاری سماعت علی کا تو ایک کان کا پردہ بھی پھٹ گیا۔ وہ شامت کے مارے—یا یوں کہئے ہجوم شوق کے مارے بالکل مائک کے پاس بیٹھے تھے سلیم صاحب نے جو ایک مرتبہ گردن موڑ کر پنچم کا سُر لیا تو قاری صاحب کا کان مائک بن گیا۔ بس پھر تو ایٹمی دھماکے کا مزا آگیا۔

میں اگر سکریٹری ہوتا تو شاعروں کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے رکھتا۔ گویا سین کے بعد شین۔ سلیم کھتولوی کے بعد شبنم اٹاوی۔ یہ خاصی معنی خیز ترتیب رہتی۔ اندازہ کیجئے سلیم صاحب کی گھن گرج کے فوراً بعد ہلکا پھلکا شبنمی ترشح۔ توازن اور تضاد دونوں کے تقاضے پورے ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے قاری صاحب کے پھٹے ہوئے پردۂ سماعت کے لئے بھی شبنم صاحبہ کی مہین اور لوچدار آواز فرسٹ ایڈ کا کام دیتی۔

ایک دو ایسے بھی شاعروں نے اپنا کلام سُنایا جنکا ہیولیٰ دیکھکر میں نے خیال کیا تھا کہ وہ مثنوی مولانا روم پڑھیں گے مگر جب ان کے شعر سُنے تو خیال بدلنا پڑا۔ وہ تو بڑے من چلے قسم کے عاشق نکلے۔ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کرتے کرتے انھوں نے کچھ دھمکیاں بھی دی تھیں، بلکہ ایک مرتبہ تو مجھے اُچک کر دیکھنا پڑا کیونکہ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے گھونسہ بنا کر کسی میرپل پڑنا چاہتے ہوں۔

خیر صاحب شبنم صاحبہ کا بھی نمبر آیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا ایڈیٹر تجلی کے ماتھے پر تین شکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا مگر جملہ حاضرین میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ذرّہ ذرّہ چیخ رہا تھا۔

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

میرے قریب ہی ایک متشرع قسم کے بزرگ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے آسودہ انداز میں بیٹھے تھے۔ جب شبنم کی مترنم آواز فضا میں کھنکھنائی تو ان بزرگ کے دونوں ہونٹ گول دائرے کی شکل میں کھل گئے۔ ہلکی سی "بدر بدر" کی آواز بھی میرے کانوں میں آئی۔ غالباً وہ ٹھنڈا سانس لیکر کہہ رہے تھے:—

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

میں نے جھک کر چپکے سے کہا:—

"عمرِ رفتہ آگے ہے۔ میری گردن پر سے گذر جائیے"

انھوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔

—"کیا فرمایا؟"

میں نے سٹ پٹا کے جواب دیا— "جی کچھ نہیں۔ ماشاءاللہ آواز بڑی لہکدار ہے"

شبنم صاحبہ کا ترنم منجھا ہوا تھا شعر بھی اتنے اچھے ضرور تھے کہ مجھے حیرت ہوئی۔ حیرت یوں ہوتی کہ انھوں نے بعض ایسے الفاظ بھی رشتۂ غزل میں پروئے تھے کہ جن کے بارے میں میرا دعویٰ ہے، عورت کو تیس سال سے پہلے انکی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ دعویٰ منھ دیکھتا رہ گیا۔ مجمع بھڑک اٹھا۔ مگر مجموعی طور پر شبنم صاحبہ کی یہ پہلی کوشش کامیاب نہیں رہی۔ طرز انھوں نے کچھ ایسا لیا تھا جو ان سے چلا نہیں طرز نہ چلے تو آج کل کے مشاعرے میں غالب اور میر بھی حقہ بھرتے نظر آئیں گے۔ خدا جانے محترمہ کے دلِ نازک پر کیا گذر گئی ہوگی جب کہ میں نے بڑے بڑے پرستم شاعروں کو اسٹیج پر ناکام ہو جانے کی حالت میں خودکشی کے منصوبے بناتے دیکھا ہے۔

ترتیب تو یاد نہیں۔ نہ سب شاعروں کے نام یاد ہیں شعر بہرحال اچھے اچھے سننے میں آئے۔ خیر سے ایڈیٹر تجلی بھی نظم

کہہ کر لائے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ان کا نام فہرست سے اُڑا دیا گیا
ہے کیونکہ آدھی رات ہو گئی اور انھیں کسی نے کوڑی کو نہیں پوچھا
۔مگر عین تہجد کا وقت تھا جب نام پکارنے والے نے حاضری
بھرنے کے انداز میں پکارا:۔

"جناب عامر عثمانی صاحب!"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔۔ "حاضر جناب"

وہ اپنی مٹھی بھر ہڈیاں سنبھالے مائک پر پہنچے۔ اب میں سوچ
رہا تھا کہ ذرا شروع ہونے دو نہ کبھی کبھی کے بدلے چکائے تو مُلّا
نام نہیں۔ اسکیم یہ ذہن میں تھی کہ ایک دو شعر پڑھ لینے دو یکلخت
سانپ سانپ کہہ کر چیخ پڑوں گا۔ پھر لوگ ہڑبڑا کے اٹھیں گے
تو اس ہڑبونگ میں جلا ہوا سگریٹ شبنم کی طرف اُچھال دوں گا۔
ان کے نائلون کے دوپٹے نے آگ پکڑ لی تو بس مزا ہی آجائے گا۔
بعید نہیں بھائی جان کی داڑھی بھی لپیٹ میں آجائے۔

مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ تو مائک پر فرمانے لگے کہ بھائیو میں
شعر کہہ تو لیتا ہوں پڑھ نہیں سکتا۔ میری نظم فلاں صاحب پڑھینگے۔
استغفر اللہ۔ ان سے کوئی پوچھے جب پڑھنا آپ کے بس کا نہیں
تو شعر کہنا کس حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے۔ اب جو شخص دوسروں
سے پڑھوا سکتا ہے کیا ضمانت ہے کہ وہ دوسروں سے لکھوا نہیں
سکتا۔ میرا تو جی چاہا پکار کر کہہ دوں کہ آپ پیچھے لوٹ آئیے۔
آپ کی نظم سنے بغیر بھی ہر مسلمان کی مغفرت ہو سکتی ہے۔

اتنے میں فلاں صاحب نے ان کے ہاتھ سے پرچہ لیکر نظم
شروع بھی کر دی اور وہ وہیں رونمائی کی خاطر بیٹھ گئے۔ مجھے
اندیشہ ہوا کہ یہ فلاں صاحب نظم کو کامیاب کیے جائیں گے
مگر صدقے نیلی چھتری والے کے اِن کی آواز کچھ ایسی بھنچی بھنچی
نکلی کہ مدیر تجلی کو شاید رات میں سورج نظر آگیا ہو۔ پڑھنے کی
رفتار چھاپہ مار دستوں جیسی تھی۔ پہلے ہی جب ٹیپ کا یہ بند
انھوں نے پڑھا:۔

جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں
کہاں گئی وہ نیند کی شراب ڈھونڈتا ہوں میں

تو سامعین کو ایسا لگا جیسے کوئی بھوکا شرابی ڈوبتی ہوئی
آواز میں ہانک لگا رہا ہو۔

گو اب ڈھونڈتا ہوں میں شراب ڈھونڈتا ہوں میں

لوگ ابھی کان کے کوکرو ہی کر رہے تھے کہ انھوں نے بند
شروع کیا:۔

جو رُک سکے تو روک دو یہ سیل رنگ و نور کا
مری نظر کو چاہیئے وہی چراغ دور کا
کھٹک رہی ہے ہر کرن نظر میں خار کی طرح
نگاہ شوق جل اٹھی حجاب ڈھونڈتا ہوں میں

معاذ اللہ۔ اس رجعت پسندی پر کون داد دے سکتا تھا۔
بلکہ سنا ہے محمد حنیف قریشی صاحب تو بُرا بھی مان گئے تھے۔ بُرا
ماننے کی بات بھی تھی۔ اُن بیچاروں نے تو صد ہا روپے خرچ
کر کے مشاعرہ گاہ سے لیکر اپنی کوٹھی تک ہزاروں بلب لگوائے
تھے اور بھائی صاحب فرما رہے ہیں:۔

مری نظر کو چاہیئے وہی چراغ دور کا

چاہیئے تو گھر جائیے اور ایک آنے کی موم بتی جلا کر ہاتھ
تاپیئے۔

گاڑی پھر آگے چلی:۔

یہ زرد زرد آندھیاں ، یہ کہکشاں دھواں دھواں
یہ تنگ تنگ سی زمیں ، یہ گرد گرد آسماں
یہ تابشیں بجھی بجھی ، یہ داغ داغ کہکشاں

میرا بے اختیار جی چاہا کہ پکار کر کہوں ۔۔ "عینک
کا نمبر بدلوا لیجئے"

مگر پڑھنے والے صاحب اتنے صبا رفتار تھے کہ پل کی
پل میں اگلے بند پر پہنچ گئے:۔

یہ تلخ تلخ راحتیں ، جراحتیں لئے ہوئے
یہ خونچکاں لطافتیں ، کثافتیں لئے ہوئے
یہ خندہ زن صداقتیں ، قیامتیں لئے ہوئے

"ارے بھئی رُک کیوں گئے" میں بڑبڑایا۔ "ایک
مصرعہ اور لگاؤ نا:۔

یہ لفظ لفظ نظم کا ، حماقتیں لئے ہوئے"

مگر کسی صاحب نے پیٹھ میں کہنی مار کر کہا:۔

"صاحب چین سے بیٹھئے نا۔ کروٹیں کیوں بدل رہے ہیں"

اتنے میں فلاں صاحب آخری بند پر پہنچ چکے تھے

خوشا وہ دورِ بیخودی ، کہ جستجوئے یار تھی
جو درد میں سرور تھا ، تو بیکلی قرار تھی
تڑپ میں بھی سکون تھا ، خلش بھی سازگار تھی
وہ لعل و لب کے تذکرے ، وہ زلف رخ کے زمزمے
وہ کاروبارِ آرزو وہ ولولے وہ ہمہمے
مگر حریم ناز تک پہنچ گئے تو کیا ملا؟
بتاؤ کیا صنم ملے؟ بتاؤ کیا خدا ملا؟
جواب چاہئیے مجھے جواب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

مانا کہ روش صدیقی جیسے بعض نستعلیق حضرات نے داد بھی دی مگر شاعروں کی داد کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ داد لینے کے لئے بھی داد دیا کرتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اب میرا نمبر آئے گا۔ رات کی جوانی ڈھلتی جارہی تھی۔ لیکن وہاں تو ایک اور صاحب کی حاضری بھری گئی۔ میرے دل کو دھکا سا لگا مگر فوراً ہی یہ سوچ کر خوشی بھی ہوئی کہ جس قدر بعد میں نمبر آئے گا اتنا ہی بڑا شاعر سمجھا جاؤں گا۔

نشور واحدی خوب شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے نمبر پر فرمایا:۔

"حضرات چار پانچ شعر پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ نے دل کھول کر داد دی تو ایک غزل اور پیش کروں گا۔"

پھر انھوں نے تقریباً ہر شعر سے پہلے کچھ اس طرح کی منثور تمہیدیں بھی ارشاد کیں جن کا منشا کم و بیش یہ تھا کہ شعر تو سمجھنے والے ہی سمجھتے ہیں مگر خیر آپ لوگ بھی کوشش کر دیکھئے مجھے اندیشہ ہوا وہ کہیں جھینپ ہیں۔ یا پھر سرکاری ہندی میں نہ پڑھ بیٹھیں۔ مگر نہیں۔ وہ تو سیدھی سادی اُردو میں پڑھ رہے تھے۔ پھر شاید یہ تمہیدیں اس افتاد کا نتیجہ ہوں کہ حاضرین میں داڑھیوں کی کثرت تھی۔ انھوں نے سوچا ہوگا یہ داڑھی والے حسن و عشق کے معاملات کیا سمجھیں گے۔ اب معزز مہمان کو کون بتاتا کہ داڑھیاں صرف مردوں ہی کے اُگتی ہیں۔ مرد اگر حسن و عشق کے معاملات میں کورے ہوں تو اکیلا حسن تو چڑیا کا بچہ بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

مگر یہ بے شک کہا جاسکتا ہے کہ بعض اشعار شبنم صاحبہ نہ سمجھ سکی ہوں۔ وہ عورت ہیں۔ میری بیوی نسیمہ بھی عورت ہے۔ اس نے ہمسائے کی چھت سے مشاعرہ سنا تھا۔ اگلے دن کہنے لگی:۔

"نشور صاحب بڑے اچھے شاعر ہیں مگر ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"بہت اچھا ہوا۔ شعر جتنے کم سمجھوگی اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"نہیں سچ آپ مطلب سمجھائیے۔" انھوں نے لِلّک کے کہا اور پھر یہ شعر پڑھا:۔

آنکھیں ہیں، ستارے ہیں، وقتِ خلشِ دل ہے
دن ہو تو گذر جائے، رات آئی تو مشکل ہے

"اس میں کیا نہیں سمجھ میں آیا؟" میں نے دریافت کیا

"اوّل تو یہ کہ فرض کیجئے کسی وقت ہمارے پیٹ یا سر میں درد ہو رہا ہو تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ درد کا وقت ہے مصیبت کا وقت تو سنا ہے مگر درد یا خلش کا وقت نہیں سنا"

"تم نے ابھی سنا ہی کیا ہے۔ گھر میں تو قید ہو ــ خیر آگے کہو۔"

"دوسرے یہ کہ "دن ہو تو گذر جائے" سے معلوم ہوتا ہے اس وقت دن نہیں ہے۔ مگر "رات آئی تو مشکل ہے" سے پتا چلتا ہے کہ رات بھی نہیں ہے ــ پھر آخر کیا ہے؟"

"یہ شعر مغرب کے وقت کہا گیا ہوگا ــ اور بولو؟"

"مذاق میں نہ اُڑائیے۔ میری اور ہر حقیبن کی بحث ہو گئی ہے۔ وہ اس کا یہ مطلب بتاتی ہے کہ شاعر نے آنسو کو ستارے کہا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ وہ اپنے عالم گریہ کو رات سے تشبیہہ دے رہا ہے۔ "رات آئی" سے کسی آنے والے خطرے کا اظہار مقصد نہیں بلکہ "رات آگئی" مراد ہے۔ وہ کہتی ہے کہ دن ہوتا تو گذر جاتا مگر یہ تو رات آگئی لہذا گذرنی ہے ــ"

"بزرگ نے ٹھیک کہا۔ تمھیں کیا اعتراض ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مطلب تو زبردستی کا ہے — کم سے کم بیجا تکلف تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" میں نے تسلّی دی "یاد کرو تمھاری خلیا ساس کا نواں منّا کتنی مشکل سے تولد ہوا تھا۔ جان کے لالے پڑ گئے تھے — تو کیا تم اسے منّا نہیں مانتیں۔"

"ہٹیئے ... توبہ توبہ —" وہ کھسیا گئیں۔

"نہیں میں ایک بات کہہ رہا ہوں۔ اگر کسی شعر کا مطلب نکالنے میں تھوڑی سی مشقت ہی اٹھانی پڑے تو مطلب بہرحال مطلب ہے۔"

"پھر بھی اتنے بڑے شاعر کو زبان تو ذرا صاف استعمال کرنی چاہئے۔"

"اوہو ... لو میں منّے کے سلسلے میں کیا تم خدا کو قصوروار ٹھیراؤگی۔ اگر نہیں تو پھر شاعر قصوروار کیوں؟"

"اچھا آپ جائیے۔" وہ جھنجھلا گئیں "میں تو سوچ رہی تھی ایک دو باتیں اور پوچھوں گی مگر آپ زمین پر کب رہتے ہیں۔"

"نہیں پوچھو اور پوچھو — لو میں زمین پر اتر آیا —"

"نشور صاحب کا ایک شعر تھا:۔

جوشِ گل و گلشن میں یہ رنگ کہاں ہوتا

شاید کہ لہو میرا اس دَور میں شامل ہے"

"جی ہاں تھا۔ پھر؟"

"یہ جوش میں رنگ کیا بات ہوئی؟" وہ مسکرا کے بولیں۔

"ارے وا۔ رنگ میں بھنگ ہو سکتا ہے تو جوش میں رنگ کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"یہ آپ زمین پر ہیں" وہ مسکرائیں۔ "اچھا اور بتائیے۔

ہر گوشۂ ارماں میں غم اور ہجوم غم

تم اس میں کہاں آئے یہ انجمن دل ہے

کیا "ارماں" بھی دل و دماغ جیسی کوئی شے ہے جس کے گوشے ہو سکتے ہوں؟"

"ضرور ہو سکتے ہوں گے۔ نہ ہوتے تو ایک آل انڈیا شاعر کیسے کہہ دیتا — تم دراصل شعر فہمی کے چکر میں مت پڑو۔ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں کیونکہ ان کے داڑھی نہیں نکل سکتی۔"

اس وقت شاہدہ بھی کہیں سے آکودی تھی۔ وہ بڑی نٹ کھٹ قسم کی لڑکی ہے۔ چنچل، زباں دراز، بے جھجک، اسکول کی تعلیم نے اسے بالکل ہی مینڈ ان انگلینڈ بنا دیا ہے۔ داڑھی سے بہت جلتی ہے۔ اگر کسی مولوی سے شادی ہو گئی تو مجھے یقین ہے کہ موقع پاکر وہ ان کی داڑھی میں ماچس ضرور دکھائے گی چاہے نتیجے میں عالمگیر جنگ ہی کیوں نہ برپا ہو جائے۔ ناک سکوڑ کے کہنے لگی:۔

"شرم تو نہیں آتی آپ کو۔ بہن شبنم نے اچھوں اچھوں کے چھکے چھڑا دیئے اور عورتیں اب بھی ناقص العقل ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں شدّو۔ بعض داڑھیاں پیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ ایکسرے کے بغیر قطعی فیصلہ مشکل ہے۔"

"آپ تو عورتوں سے تعصب رکھتے ہیں۔" وہ بھُن گئی۔

"اب عورتیں ملتی ہی کہاں ہیں — تم اپنے آپکو عورت سمجھتی ہو؟"

"نہیں عورت تو بس آپ ہیں — بڑے آئے لڑکیوں کو عورت کہنے والے۔"

"آہا — گلہری خانم میں نے تو ملا ئن کے سلسلے میں عورتوں کو ناقص العقل کہا تھا۔ تم یا شبنم عورت نہیں تھیں تو یہ ٹوپی تم نے کیوں اوڑھ لی۔"

"خوشی ہماری اوڑھ لی۔ ہزار دفعہ اوڑھیں گے۔ مگر آپ ذرا زبان کو لگام دیا کریں۔"

"تو یوں کہو لڑنے آئی ہو۔ چلو یوں ہی سہی۔ وہ ترکاری کاٹنے کی چھری رکھی ہے اٹھالاؤ پہلے تم حملہ کرو۔"

"جائیے جائیے باتیں نہ بنائیے۔ اللہ قسم آپا۔" وہ یکایک شبنم کیطرف متوجہ ہوئی "اب کبھی بہن شبنم دیوبند آئیں تو ہم اپنے یہاں ٹھیرائیں گے۔ ہائے اللہ کیسا اچھا کہتی ہیں۔"

"تم شعر کب سے سمجھنے لگیں" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"جب سے آپکے دودھ کے دانت ٹوٹے ہیں۔" اس نے منہ چڑا

الغرض نشور صاحب نے خوب پڑھا۔ پیٹ بھر کے داد وصول کی۔ ایک مطلع تو بڑا برمحل قسم کا تھا:۔

اک کشمکش غم ہے اور شوق کی منزل ہے
دامن بھی بچانا ہے، شعلہ بھی مقابل ہے

شعلے کا لفظ سنتے ہی ذہن شبنم پر جست کر جائے تو قصور اس میں جوش ملیح آبادی کے سوا کس کا ہو سکتا ہے جو اپنے مجموعے کا نام "شعلہ و شبنم" رکھ کر پاکستان رفو چکر ہو گئے۔ یہ الفاظ معنوی اعتبار سے کتنے متضاد ہیں مگر چہرے مہرے کے لحاظ سے کس قدر یکساں، بالکل جڑواں بھائی۔ دفعتاً وہی بزرگ جنھوں نے عمر رفتہ کو آواز دی تھی تڑپ کر بولے:۔

"ہائے نشور صاحب کیا کہہ دیا ہے۔ شعلہ بھی مقابل ہے۔ شو۔۔۔ شا۔۔۔ شب۔۔۔"

"سنبھل کے مولانا۔ شب نہیں شو" میں نے فوراً ٹوکا۔ مگر وہ تقریباً عالم وجد میں تھے۔ شین جیسے ان کی زبان سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھے مشہور ماہر نفسیات کا گانوف چیاؤں کا وہ ناول یاد آیا جس میں اس نے لکھا ہے کہ عورت ایک برمے کی مانند ہے جو سو سال پرانی کھوپڑی میں بھی بڑی آسانی سے سوراخ کر سکتی ہے۔

چیاؤں کے بڑے بھائی بھاگانوف میاؤں نے بھی یہی بات دوسرے الفاظ میں کہی ہے کہ موت اور عشق کا کوئی وقت نہیں بڑھاپے کو دور رکھنا چاہتے ہو تو ڈٹ کے عشق کرو۔

دفعتاً موصوف نے اپنا ہاتھ اپنی ہی ران پر زور سے مارا اور نعرے کے انداز میں لپکے:۔

"ہائے ہائے۔ شعلہ بھی مقابل ہے ——— بر عکس نہند نام زنگی کافور"

میں نے پھر ٹوکا ——— "یہ فارسی کا مشاعرہ نہیں ہے جناب ——— آپ اردو میں داد دیجئے۔"

انھیں جھٹکا سا لگا۔ بھویں تان کے بولے ——— "آپ عجیب قسم کے آدمی ہیں۔"

"جی نہیں ——— میں شاعر قسم کا آدمی ہوں۔ ابھی دیکھئے گا میرا بھی نمبر آئے گا۔ دھوئیں اُٹھ جائیں گے۔"

"اوہو۔ شاید آپ کا نمبر صدر صاحب کے بعد آئیگا۔"

"جی ہاں۔۔۔۔۔ ار ر ر۔۔۔"

میرے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ واقعی آل انڈیا شاعروں تک نوبت آ چکی تو مجھے اب گھانس کون ڈالے گا۔ مگر نہیں ہو سکتا ہے مجھے سب سے آخر میں حرفِ آخر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

صفحات اتنے سیاہ ہو گئے مگر ابھی درجنوں شاعروں کا تذکرہ باقی ہے۔ کاش کبھی یوں بھی ہو تا کہ ایڈیٹر تجلی میری نکیل ڈھیلی چھوڑ کر فرما دیتے کہ لکھو ملا دل کھول کر۔ ایک شمارہ تمھاری ہی نذر ہے۔ مگر آہ:۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

مجبوراً شارٹ ہینڈ میں دی اینڈ کی طرف آتا ہوں۔

عالم فتحپوری کے کیا کہنے۔ جگر صاحب پر ان کی نظم زلفِ دوتا کی طرح طویل تھی۔ مگر بڑی دلچسپ۔ بڑی خوبصورت بڑی رواں۔ پڑھنے میں بھی انھوں نے کمال کر دیا۔ جیسے فرنٹیر میل دھوئیں اُڑاتا اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتا چلا رہا ہو۔ مجازاً نہیں بلکہ حقیقتاً وہ خونِ جگر میں قلم ڈبو کر لکھتے ہیں شاید اسی لئے ان کے چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی ہیں اور لب و عارض کی ویرانی نچوڑے ہوئے سنگترے کی یاد دلاتی ہے۔ کاش وہ داڑھی رکھ لیں تو میرا دعوی ہے کہ برنارڈ شا سے زیادہ جچیں گے۔

ایک شاعر۔ جن کا نام یا تو بلبل فدائی تھا یا سنبل قدائی ۔ یا شاید دلدل بقائی۔ تینوں نام یادداشت کے خانے میں ایسے گڈمڈ ہو رہے ہیں کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال وہ اوسطاً دو شاعروں کے برابر تھے، بلکہ عامر عثمانی، نشور واحدی اور روش صدیقی تینوں کی ایک ساتھ مشکیں کس دی جائیں تو گولائی ان سے زیادہ نہیں نکلے گی۔ رنگ پکا جامنی، آنکھیں گول جن کا قطر نئے پیسے سے زیادہ نہ ہو گا۔ دہانہ کم و بیش نصف بالشت چوڑا۔ انھیں دیکھ کر میں نے میر حیرت علی سے پوچھا تھا:۔

"کیوں میر صاحب کیا آپ کو یقین ہے کہ ان کا اور شبنم آرادی کا خالق ایک ہی ہے ؟"

"اماں کیوں کفر بکتے ہو" وہ آنکھیں پھڑپھڑا کے بولے تھے مگر ان کی آواز ایک کرشمہ ثابت ہوئی۔ بڑی باریک اور دوشیزہ۔ جب وہ نکلی تو میرے آس پاس والے چونک گئے۔ میں تو سمجھا شبنم کے علاوہ کوئی اور خاتون بھی آ گئے موجود ہیں اور موصوف کو روک کر انھی کو نمبر دیدیا گیا ہے۔ عمر رفتہ والے بزرگ بھی یہی سمجھتے تھے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ دبی زبان میں مجھ سے پوچھنے لگے :۔

"کیوں جناب یہ کون صاحبہ ہیں ؟"

"یہ میری عمر رفتہ ہیں۔ اب کیا آپ ان پر بھی دانت رکھیں گے" میں نے تشویش کا اظہار کیا وہ بگڑ کر بولے :۔

"آپ بڑے واہیات آدمی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ"

مجمع کروٹیں سی بدل رہا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل اُچک کر دیکھا تو یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا کہ آواز اسی نصف بالشت چوڑے دہانے سے نکل رہی تھی۔ حیرت ہی حیرت پھر اشعار بھی عجیب و غریب تھے۔ اپنے انداز کے بالکل یکتا اتنے ہلکے پھلکے کہ شاید نائلون کا دوپٹہ بھی ان سے زیادہ ہی وزن رکھتا ہو۔ وہ دراصل قطعات تھے جن میں سے ہر ایک کا مستقل عنوان بھی تھا۔ جنابِ شاعر پہلے عنوان بتاتے پھر قطعہ عرض کرتے۔

پہلا قطعہ تھا — "وصل سے محرومی"

فرمایا — "حضرات ! احقر کی شاعری واقعات پر مبنی ہے۔ قطعہ ملاحظہ فرمائیے اور ذرا قافیے پر بھی نظر رکھئے گا"

علی گڑھ ہوتا تو ضرور کوئی سخن فہم چیخ پڑتا کہ بھائی جان نظر تو آپ ہی کو دیکھ کر خیرہ ہو چکی ہے۔ قافیہ کس سے دیکھا جائے گا تشریف لے جائیے"

مگر یہ دیوبند تھا۔ بچارے نیک قسم کے لوگ صرف ہنس رہے تھے یا پھر آنکھیں گھما گھما کر تقابلی مطالعہ کر رہے تھے۔ لیجئے وہ قطعہ شروع ہوا :۔

میں انھیں یاد کیا کرتا ہوں — وہ مجھے یاد نہیں کرتے ہیں
میری تجویزِ وصل پر افسوس — وہ کبھی صاد نہیں کرتے ہیں

مجمع لہرا اٹھا۔ اسٹیج والے بھی کلبلائے۔ میں اس کشمکش میں تھا کہ داد دوں یا غش غش کروں۔ قطعہ ہر آئینہ غش غش کا مستحق تھا۔ ایک تو "صاد" کا قافیہ پھر شاعر کا حسنِ طلب دیکھئے کہ محبوب کے آگے خودکشی کی ایک نئی تکنک رکھتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ اُلّو کا پٹھا — یا اُلّو کی پٹھی اس پر صاد بھی کر دے۔

اگر مدیر تجلی موجود نہ ہوتے تو میں یقیناً کھڑے ہو کر کہتا۔

"بڑے بھائی ! محبوبہ اگر خودکشی ہی پر مجبور ہو گی تو زہر کھالے گی، ریل کے آگے لیٹ جائے گی، بجلی کا تار پکڑ لے گی، مگر مٹرک کو شنے کے انجن کا انتخاب ہرگز نہ کر سکے گی"

اتنے میں دوسرا قطعہ آیا۔ عنوان تھا "یکطرفہ محبت"

میری طرف دیکھ کے وہ ہنس دیئے + انکی طرف دیکھ کے میں رو دیا
میری محبت انھیں بالکل نہیں + انکی محبت نے مجھے کھو دیا

"کیا ریختی ہے" میں نے عمر رفتہ والے بزرگ کی طرف دیکھ کر مشورہ طلب انداز میں کہا۔ ان کے دونوں ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ تیوری پر بل تھے۔ وہ ابھی تک یقین نہیں کر پائے تھے کہ آواز مرد ہی کی ہے۔ میری داد کو تنظرانداز کرتے ہوئے بولے۔

"یہ آواز مرد کی کیسے ہو سکتی ہے"

"میں نے کب کہا کہ مرد کی ہے۔ مگر نکل مرد ہی کے منہ سے رہی ہے"

"کیا بات ہوئی" وہ غرائے۔

"جنس کی تبدیلی اب کوئی عجوبہ نہیں رہی — ہو سکتا ہے ان کے معاملہ میں ابتدا گلے سے ہو رہی ہو"

وہ لحظہ بھر غور کرتے رہے پھر سر ہلا کے بولے — "نہیں یہ بات دل کو نہیں لگی"

"تو پھر ایک اور بات ہو گی —"

"کیا ؟" انھوں نے ناخوشگوار لہجے میں سوال کیا۔

"تجویزِ وصل پر صاد نہ کرنے والی محبوبہ کو ہو سکتا ہے انھوں نے تاؤ میں آ کر سموچا نگل لیا ہو۔ اب وہ اندر ہی سے

چیخ پکار کر رہی ہے ـــــ دہانہ تو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہی ہوگا؟"

"آپ فضول باتیں کرتے ہیں۔ ہٹائیے شعر سُننے دیجئے"

مائک میں پیپہا پھر بولا۔

"سنیئے حضرات و خواتین ـــــ ایک قطعہ اور حاضر ہے۔ اس کا عنوان باندھا ہے "صاف انکار" ـــــ دُور سے کسی نے چیخ کر پوچھا ـــــ "آپ کتنے قطعے پڑھیں گے بڑے بھائی۔"

"اس کاپی میں تو بس دس ہیں" انھوں نے نوٹ بک کو فضا میں لہرایا۔

"بہت کم ہیں" کوئی بولا "کیا اور بھی کوئی کاپی ہے؟"

"جی ہاں بڑی بیاض سوٹ کیس میں رکھی ہے۔ آپ لوگ اصرار کریں گے تو دوسرے نمبر تک وہ بھی اُٹھالائیں گے۔"

قریب ہی سے کسی نے کہا ـــــ "پہلے ہی نمبر پر اُٹھالائیے تو بہتر ہوگا بڑے بھائی۔ فقط دس قطعوں میں ہمارا کیا بھلا ہوگا۔"

"خاموشی سے سُنیئے حضرات" سکریٹری صاحب نے جلدی اُٹھ کر مائک میں کہا۔ "بلبل فدائی صاحب بہت دُور سے آئے ہیں۔"

یا شاید انھوں نے سُنبل قدوائی کہا تھا یا پھر دُلدل بقائی بہرحال اب محترم شاعر پھر گویا ہوئے:۔

"تو حضرات و خواتین۔ قطعہ کا عنوان تھا "صاف انکار۔"

"تمھارے کیا مطلب ہے بڑے بھائی" کسی نے بات کاٹی "اب جو عنوان ہو وہ فرمائیے۔"

"اب اور تب کیا کہتے ہو بھئی" وہ خفا سے ہو کر بولے۔ "عنوان کوئی روز روز بدلتا ہے۔"

"آپ قطعہ پڑھیئے حضرت" سکریٹری صاحب نے اُکتا کر کہا۔

"جی ہاں ـــــ تو خواتین و حضرات۔۔۔"

"خواتین بار بار آپ کو کہاں نظر آرہی ہیں" ایک بھاری آواز غراہٹ کا انداز لئے ہوئے بلند ہوئی۔

"جی۔۔۔جی" موصوف نے گھبرا کر اسٹیج پر دائیں بائیں دیکھا۔ چشم بددور اسٹیج پر اکیلی شبنم صاحبہ ہی نہیں تھیں نیلی چھتری والے کی قدرت سے کئی اور خواتین بھی بحیثیت سامعین کے موجود تھیں۔ ایک تقریباً تیس پینتیس سال کی محترمہ تو شبنم صاحبہ کے قریب ہی تشریف فرما تھیں۔ ان کے جسم پر ساری اور بلاؤز تھا۔ یقیناً وہ ہندو یا کرسچین رہی ہوں گی ورنہ دیوبند کی رجعت پسند عورتیں ابھی کلچرل ترقی میں اتنی آگے نہیں بڑھ سکی ہیں کہ مردوں کے اعصاب کو اتنا کھلا چیلنج کر سکیں۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سہارنپور یا مظفر نگر کی کوئی مس گُلفام یا مسز جمال ہوں۔ ضلع قسم کا اب کوئی بھی شہر اتنا پسماندہ نہیں رہا ہے کہ وہاں ہر فرقے میں دس بیس سوسائٹی گرل قسم کی الٹرا ماڈرن خواتین دستیاب نہ ہو سکیں۔

ایک خاتون برقعے میں بھی آئی تھیں۔ ان کے ساتھ غالباً ان کے شوہر تھے جن کا اجڑا ہوا چہرہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہا تھا کہ ہاں میں ایک نیم مہذب خاتون کا شوہر ہوں۔ یہ جوڑا غالباً پونے بارہ والی سے مظفر نگر سے آیا ہوگا کیونکہ بارہ کے بعد ہی یہ اسٹیج پر پہنچا تھا اور میرے قریب سے گذرتا ہوا آگے کہیں جا بیٹھا تھا۔

"بڑے بھائی" نے ہو سکتا ہے انھیں نہ دیکھا ہو، مگر محترمہ شبنم اور وہ ساری بلاؤز والی خاتون بہرحال مائک کے قریب ہی تشریف فرما تھیں تثنیہ پر جمع کا اطلاق کب نہیں ہوتا۔ بڑے بھائی نے "خواتین" کہہ کر گرامر کی غلطی بہرحال نہیں کی تھی۔ مگر وہ بوکھلا سے گئے۔ میں اُچک اُچک کر دیکھ رہا تھا۔ انکی گول آنکھیں دونوں خواتین کی طرف اس طرح اٹھی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں ـــــ آپ بولئے تاہم خواتین یہاں موجود ہیں

"آپ شعر پڑھئے جناب" سکریٹری صاحب نے جھلا کر کہا۔ موصوف کھنکارے۔ کھنکار کے ساتھ شاید لعاب دہن کی پھوار آرکسٹرا والے ایمپلیفائر تک پہنچ گئی ہوگی کسی کی للکار بلند ہوئی۔

"ارے صاحب تھوکئے تو نہیں۔"

موصوف نے جلدی سے رومال نکال کر باچھیں صاف کیں۔ رومال گہرے سرخ رنگ کا تھا۔ اب وہ ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولے:۔

"ہاں تو صاحب۔ قطعہ بہ عنوان "صاف انکار" پیش

خدمت ہے۔ اس میں ہم نے ایک لفظ "پکنک" باندھا ہے۔ لیکن ممکن ہے آپ حضرات اس کا معنیٰ نہ سمجھتے ہوں تو پہلے معنیٰ سمجھ لیجئے۔"

مجھے بڑا صدمہ پہنچا — یہ بڑے بھائی بھی نشتور صاحب کی طرح ہم دیوبندیوں کو نرا مولوی ہی سمجھ رہے ہیں۔

"تو پکنک کا معنیٰ یہ ہیں صاحب کہ وہ . . . وہ لڑکیاں اور لڑکے مل کر سیر کو جاتے ہیں۔ بہت سا کھانا پینا پھل فروٹ، تاش، کیرم وغیرہ بھی ساتھ لے جاتے ہیں . . . بڑا مزا آتا ہے . . ."

"آپ بھی کبھی گئے ہیں بڑے بھائی" میں نے حلق پھاڑ کر پوچھا۔ یہ کوئی بیجا سوال نہیں تھا، مگر آس پاس والوں نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کئی ہنسے کئی نے بُرا سا منھ بنایا بڑے بھائی نے بھی چونک کر گردن پشت کی طرف موڑی۔ وہ شاید میرے الفاظ کو ٹھیک طرح سن نہیں سکے تھے معصوم سے انداز میں بولے:—

"کیا پوچھا آپ نے ؟"

"یہ پوچھا بڑے بھائی کہ پکنک کا مطلب تو اب کچھ کچھ سمجھ میں آگیا۔ "صاف انکار" کا مطلب اور سمجھا دیجئے۔"

معلوم نہیں جواب میں انھوں نے کیا کہا۔ فضا قہقہوں اور سیٹیوں سے لبریز ہو گئی تھی سیکریٹری صاحب مجمع کو خاموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر مجمع اپنے قہقہوں کا گلا گھونٹ کر ہارٹ اٹیک کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

بمشکل تمام شور کم ہوا۔ بڑے بھائی دہانے کی پوری چوڑائی کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے سب داد ہی کی فہرست میں شامل ہے آخر کار قطعہ شروع کیا:—

کہا میں نے کہ آجاؤ — وہ بولے ہم نہیں آتے
کہا میں نے کہ مر جاؤں گا — وہ بولے کہ مر جاؤ
کہا غیروں نے پکنک کو چلو — بولے کہ ہاں چلئے
کہا میں نے چلوں میں بھی — کہا تم اپنے گھر جاؤ

مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے آواز دبا کے میر حیرت علی سے پوچھا:—

"کیا خیال ہے میر صاحب۔ اتنے ہلکے پھلکے شعر کیا زمین پر رہ کر کہے جا سکتے ہیں ؟"

"نہیں تو کیا آسمان پر جا کر کہے ہوں گے" وہ اُلجھ کر بولے۔

"میرا تو یہی خیال ہے کہ زمین کی کشش کے حدود سے نکل کر کہے گئے ہیں۔ وہاں کسی شے میں کوئی وزن نہیں رہتا۔"

"سُنئیے صاحبان" بڑے بھائی کی آواز نے ہماری سرگوشی پر شبنم ڈال دی — "ایک قطعہ اور ہے۔ عاشق کی التجا۔ — یا عاشق کی گذارش کہہ لیجئے۔"

"ہم کیوں کہہ لیں "کوئی دل جلا چیخا" عاشق آپ ہیں آپ ہی کہئیے۔"

"اُنھ . . . کہہ تو ہم ہی رہے ہیں . . . مطلب یہ ہے کہ دونوں عنوان برابر کے ہیں ہم نے اوپر نیچے دونوں ہی لکھ لئے ہیں —"

"اوپر نیچے — شیم شیم۔ تہذیب کے دائرے میں رہیئے بڑے بھائی۔"

"ارے وا — اسمیں بدتہذیبی کی کیا بات ہے — قطعہ ملاحظہ فرمائیے حضرات و خواتین۔"

"پھر خواتین "کوئی غرایا — "ہماری داڑھیاں آپ کو نظر نہیں آتیں بڑے بھائی۔"

"بڑے بھائی بڑے بھائی کیا لگا رکھی ہے آپ لوگوں نے — میں تو آپ کا چھوٹا ہوں۔"

"بہت اچھا چھوٹے بھائی۔ ہم بڑے بھائی گذارش کرتے ہیں کہ آپ مہربانی کر کے اسٹیج سے تشریف لیجائیے چھوٹے بھائی۔"

"بس یہ قطعہ اور سُن لیجئے۔ اس میں ایک نئے پیرائے میں محبوب کو دعوتِ محبت دی گئی ہے۔"

"وہ نہیں مانے گا چھوٹے بھائی آپ چاہے کان پکڑ کر مرغا بن جائیں۔"

اب مجمع میں پھر بھونچال آگیا تھا — خدا خدا کر کے ڈبل عنوان کا قطعہ بھی زیب سماعت ہو ہی گیا۔

قسم خدا کی تمہارا تو کچھ بھی حرج نہیں
اگر مجھے بھی گلے سے کبھی لگا لو تم
بہت دنوں سے بسے ہو مرے خیالوں میں
مجھے بھی اپنے خیالات میں بسالو تم

میں نے میر صاحب سے کہا۔

"ذرا سوچئے میر صاحب۔ یہ شخص اگر کسی کے خیالات میں بس جائے تو خیالات پر کیا گذرے گی"

"ہمیں کیا معلوم کیا گذرے گی' چپکے بیٹھو" انھوں نے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

اب میں نے ڈرتے ڈرتے عمر رفتہ والے بزرگ سے پوچھا۔

"مولانا کیا آپ کو خیالات کے کسی ایسے سائز کا علم ہے جس میں یہ صاحب سما سکیں؟"

"صرف آپ کا سانچا ایسا معلوم ہوتا ہے" وہ بھنّا کے بولے "شعر سنئے دیکھئے جناب"

"یہ شعر ہیں مولانا؟ — پھر تو میں معافی چاہوں گا"

(باقی مشاعرہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے)

تھے۔ لیکن اب اہل علم کے طبقوں سے وابستہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوگا جو عباسی صاحب اور اُن کی شہرہ آفاق تصنیف "خلافت معاویہ و یزید" سے بے خبر ہو۔ یہ کتاب ایک ایسے نازک مسئلہ سے متعلق تھی۔ جس کے ساتھ لوگوں کو عقل سے زیادہ جذباتی اور سیاسی دلچسپی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر حلقوں سے اس کی شدید مخالفت ہوئی اور فی الواقع ایسی شکل پیدا ہوگئی کہ اس کی تعریف کرنا خواہ مخواہ اپنے لئے مشکلات کے دروازے کھول لینے کے مترادف بن گیا۔ ہمارے نزدیک گروہی عصبیتوں یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اگر کسی محققانہ تصنیف کی مخالفت کی جائے یا اس کے مصنف کی حوصلہ شکنی کی جائے تو یہ خود علم کی بیقدری ہے۔ پھر اس بے قدری کے ذمہ دار جب خود اہل علم ہوں تو اسکی قباحت دوچند ہو جاتی ہے۔ لیکن چیز اچھی ہو تو اپنا وزن منوا کے رہتی ہے چنانچہ عباسی صاحب کی کتاب نے بھی ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر کے اپنا مقام اب تسلیم کرا لیا ہے۔

"خلافت معاویہ و یزید" کا بنیادی نقطۂ نظر، جیسا کہ "میثاق" کے قارئین جانتے ہوں گے یہ ہے کہ حادثہ کربلا کے جو واقعات شیعہ ذاکروں کی زبان سے سُنے جاتے ہیں یا عام تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ من و عن صحیح نہیں ہیں بلکہ ان کے بیان میں بہت سی حقیقتوں پر پردہ ڈال کر من گھڑت قصوں کا سہارا لیا گیا ہے عباسی صاحب نے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر ان من گھڑت قصوں کی حقیقت واضح کردی ہے، اور جو اصلی حقائق ہیں ان کو نہایت وضاحت اور نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کر دیا ہے ہمارے نزدیک فاضل مصنف کے یہ نتائج تحقیق اتنے نادر نہیں جتنے نادر سمجھ کر ان کے مخالفین نے درجنوں کتابیں ان کے خلاف تصنیف کر ڈالی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فاضل مصنف نے خلافت راشدہ کے آخری دور اور بنی امیہ کے زمانہ کی تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیق اتنے جزم اور اعتماد کے ساتھ پیش کئے ہیں اور ان پر دلائل کا اس قدر انبار لگا دیا ہے کہ اب نہیں مسئلہ زیر بحث میں پچھلے محققین کے پہلو بہ پہلو ایک سند کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ "خلافت معاویہ و یزید" اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جو امام ابن تیمیہؒ وغیرہ کے نقطۂ نظر کو نسبتاً زیادہ منقح صورت میں پیش کرتی ہے۔

"خلافت معاویہ و یزید" کو پڑھ کر ہم اس رائے کو بالکل مبنی بر انصاف نہیں سمجھتے کہ عباسی صاحب نے ذہن میں پہلے سے یزید کی پاکدامنی اور حضرت حسینؓ کے موقف کی غلطی کا تصور بٹھا لیا ہے اور بعد میں اسے ثابت کرنے کے لئے اپنی مرضی سے دلائل جمع کرنے شروع کر دیئے ہیں، حتیٰ کہ اگر انہوں نے ضرورت محسوس کی ہے تو بعض اقتباسات کی قطع و برید کرنے سے بھی باز نہیں آئے ہیں ہماری رائے یہ ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب ایک غیر جانبدار محقق کی حیثیت سے تحریر کی ہے انہوں نے ہر واقعہ کی صرف وہی توجیہ قبول کی ہے جو ان کے کڑے معیار پر پوری اُتر سکی ہے۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا اونچا معیار تحقیق ہی ہے عباسی صاحب نے نہایت محنت کر کے ان لوگوں کا سُراغ لگا لیا ہے جن کے ذریعہ سے ہماری تاریخ میں بہت سی بے سرو پا باتیں داخل ہوئی ہیں اور فتنوں کا موجب بنی ہیں ان کی تحقیق کے مطابق حادثہ کربلا سے متعلق جو روایات زبان زد عوام ہیں وہ بیشتر محمد بن السائب کلبی، ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی اور ہشام بن محمد کلبی کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ ائمہ حدیث و رجال نے ان تینوں راویوں کو کٹر رافضی، کذاب اور غیر معتبر قرار دیا ہے فاضل مصنف حسب واقعات کربلا کی اس معروف بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو جب تک کوئی دوسرا محقق ان راویوں کی ثقاہت و امانت کو پہلے ثابت نہ کر دے۔ عباسی صاحب کی کسی دلیل کو توڑنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

زیر نظر کتاب "تحقیق مزید" خلافت معاویہ و یزید ہی کے سلسلہ کی دوسری کڑی ہے فاضل مؤلف نے اس کتاب میں بھی بڑی اہم بحثیں اٹھائی ہیں۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ ازواج مطہرات کے علاوہ پونے تین سو صحابہؓ (جن میں اصحاب عشرہ مبشرہ، بدری صحابہ اور اصحاب بیعت الرضوان کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے) کے مختصر احوال لکھے ہیں جو یزید کی ولیعہدی اور خلافت کے زمانہ تک بقید حیات تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی حضرت حسینؓ کے موقف کی تائید نہیں کی۔ یہاں فاضل مؤلف ایک قاری کے لئے دو راہیں متعین کر دیتے ہیں یا تو وہ

حضرت حسینؓ کے موقف کو صحیح سمجھے اور ان تمام صحابہؓ و صحابیاتؓ کو معاذ اللہ عزیمت سے عاری یا مداہنت کے مرتکب قرار دے یا اس کے برعکس یہ رائے قائم کرے کہ حضرت حسینؓ کو صحیح موقف متعین کرنے میں اضطراب پیش آیا۔ عباسی صاحب یہی دوسرا نقطۂ نظر بدلائل پیش کرتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے المناک قتل کے سلسلہ میں طالبین قصاص نے جو جدوجہد کی، اور اس کے نتیجہ میں ہولناک جنگیں ہوئیں، فاضل مؤلف کی تحقیق میں اسے ناکام بنانے میں سبائیوں کا زبردست ہاتھ تھا وہ چونکہ حضرت علیؓ کے لشکر میں بکثرت موجود تھے۔ اس لئے قصاص کی کسی بھی تحریک کے آڑے آتے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس مطالبہ کے پورا کرنے پر قادر نہ ہوسکے اور قصاص بالآخر امیر معاویہؓ نے لیا۔ اس بحث کے ضمن میں پہلی بار عباسی صاحب نے ان وضعی روایات کی قلعی کھولی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ طلب قصاص کی جدوجہد میں نکلنے پر ہمیشہ نادم رہا کرتی تھیں۔ اس بحث میں حضرت معاویہؓ کا رول ہم پروا ضح نہیں ہوسکا۔ فاضل مؤلف کے نزدیک اس زمانہ کی خانہ جنگی طلب قصاص ہی کے مسئلہ پر ہوئی، مسئلہ خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کی خلافت کو قائم خلافت سمجھتے تھے تو ان کے ساتھ ان کی آویزش کس بنیاد پر تھی؟ اور شام میں ان کی حکومت کیا اس خلافت کے متوازی نہیں ہوگئی تھی، جسے وہ خود قائم خلافت تسلیم کرتے تھے[۵۱]؟ ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھی صحابہؓ حضرت علیؓ کی قائم خلافت کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کرتے تو کیا حالات اتنے دگرگوں ہو گئے تھے کہ سبائی ملت کی سیاست پر اسی طرح چھائے رہتے۔ جس طرح تاریخ اب انہیں دکھاتی ہے[۵۲]؟ وقتی طور پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دینا آسان ہوتا ہے لیکن اسے سالہا سال تک قوم کی مرضی کے خلاف مسلط رکھنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔

یہاں یہ بحث بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کیا وہی نقطۂ نظر اپنانے میں حق بجانب نہ تھے جو بدوانے خلافت کے بارے میں حضرت عثمانؓ کا تھا[۵۳]؟ پھر اگر تحکیم کے موقعہ پر انہوں نے معزولی کے حکم کو ثالث کے اختیارات سے باہر

---

[۵۱] حضرت معاویہؓ کی طرف سے قصاص عثمان کا مطالبہ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اصلاً خلافت علیؓ سے منحرف نہیں تھے بلکہ اسے تسلیم کرنا اس بات پر معلق تھا کہ عثمانؓ جیسے مظلوم خلیفہ کے قصاص کے بارے میں ان کا رویہ کیا رہتا ہے حالات ایسے تھے کہ ایک انتہائی مخلص آدمی بھی پوری دیانت کے ساتھ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ قتل عثمانؓ کی ذمہ داری سے حضرت علیؓ بری الذمہ نہیں ہیں اس غلط فہمی کے ہوتے ان کی خلافت کو صدق دل سے تسلیم کرنا ارباب ضمیر کے لئے دشوار تھا۔ اس کا ازالہ صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ قصاص کے معاملہ میں حضرت علیؓ ایسا رویہ اختیار کریں جو اس حقیقت کو واضح کر دے کہ قاتلین عثمانؓ سے انہیں بھی عداوت و نفرت ہی ہے مشیت ایزدی کہیئے کہ زولیدہ تر حالات نے حضرت علیؓ کو اس کا موقع نہیں دیا اور غلط فہمی کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی گئی۔ لیکن جس چیز نے حضرت معاویہؓ کو ایک متوازی خلافت پر آمادہ کیا وہ حضرت علیؓ کا یہ اقدام تھا کہ بیک بینی و دو گوش انہوں نے عزل معاویہ کا پروانہ بھیجدیا اور پھر اس کی تعمیل نہ ہوئی تو فوج کشی کا اقدام فرمایا۔ غیر متوازن جذبات کو علیحدہ رکھکر سوچا جائے تو ایسی صورت حال میں حضرت معاویہ کا مد مقابل بن جانا ایک ایسا فطرتی سا فعل تھا جس پر گمراہی اور حق دشمنی کا فتویٰ نہیں لگ سکتا۔ [۵۲] حالات جتنے دگرگوں ہوتے چلے گئے ان کا علم پہلے سے تو کسی بھی فریق کو نہیں تھا دونوں ہی اپنی اپنی جگہ یہ توقع رکھتے تھے کہ بگڑی ہوئی صورت حال کو سنوار لے جائیں گے اب مشیت ہی کو سدھار منظور نہ ہو تو آدمی کیا کر سکتا ہے۔ جیسے جس طرح یہ قیاس کرنا ممکن ہے کہ حضرت معاویہؓ خلافت علیؓ کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیتے تو حالات بہتر ہو جاتے اسی طرح یہ قیاس کرنا بھی ممکن ہے کہ حضرت علیؓ اگر حضرت ابن عباسؓ اور دیگر ارباب حل و عقد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے فوری عزل پر مصر نہ ہوتے تو نتائج نہایت اچھے نکلتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ حضرت معاویہؓ کو ہر طرح کا مشورہ دینے میں پیش پیش رہتے ہیں مگر حضرت علیؓ کو مشورہ دینے کی جرأت گوارا نہیں فرماتے یہی وہ چیز ہے جو اس بات کی مظہر ہے کہ حضرت علیؓ کو مافوق البشر اور معصوم گمان کر لیا گیا ہے حالانکہ اجتہادی غلطیوں کا جتنا امکان معاویہؓ جیسے مدبر کے لئے ہے اتنا ہی امکان حضرت علیؓ کیلئے تسلیم کرنا چاہیئے ان کا مراتب میں حضرت معاویہؓ سے فائق ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اجتہاد و تدبر میں ہر آئینہ وہی حرف آخر تسلیم کئے جائیں۔ [۵۳] دو باتوں کو ملحوظ رکھئے ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت اپنے انعقاد کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سمجھا ہو تو کیا اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ بہر حال اس بحث میں یہ چند سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب اس کتاب کے صفحات سے تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہیں آسکا۔

کتاب کے ایک باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شروع سے اہل بیت میں موروثی خلافت کا تصور پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے برابر اس بات کی کوشش کی کہ وہ خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ فاضل مصنف نے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم خلافتوں کے خلاف علویوں کے چھیاسٹھ خروج بیان کئے ہیں مصنف نے بتایا ہے کہ علویوں کی اس سلسلہ کی کوششوں کا اتنا چرچا تھا کہ بعض تحریکیں اگر بغاوت کی خاطر بھی اٹھیں تو ان کے بانیوں نے بھی اپنا حسب ونسب علوی ہی جتایا حالانکہ علوی نہ ان کے حق میں تھے اور نہ سیاسی طور پر ان سے متفق تھے۔

اس کتاب میں بے شمار انکشافات ایسے ہیں جو تاریخ کے طالب علموں کے لئے یقیناً تعجب خیز ہوں گے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں نمایاں حصہ زبیر بن عبدالمطلب کا تھا نہ کہ ابو طالب کا۔ زبیر بن عبدالمطلب کی وفات کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نوجوان تھے۔ ابو طالب کا حضورؐ سے تعلق قبیلہ کی سربراہی کا تھا۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت حضرت علیؓ کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ حضرت حسینؓ کی ازواج میں شہر بانو نام کی کوئی ایرانی شہزادی نہ تھی۔ علی زین العابدینؒ کی والدہ سندھی خاتون تھیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک بات جو ہم نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف جن روایات سے خود استفادہ کرتے ہیں ان کے حسن وقبح یا معیار صحت پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے حالانکہ جب وہ خلاف مقصد روایات پیش کرتے ہیں تو ان پر ہر لحاظ سے بحث کرتے ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ انہیں ایسی تمام روایات کی صحت پر بھی بحث کرنی چاہیے تھی جن سے وہ معروف نظریات کے خلاف استدلال کرتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مجموعی طور پر مصنف نے نہایت اعتدال سے کام لیا ہے اور کتاب میں مناظرہ بازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دی ہے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ فاضل مصنف دوران تحریر میں بعض اوقات ایسی چیزیں بھی پیش کر دیتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر ان سے صرف نظر بھی کر لیا جاتا تو مولف کے استدلال کی قوت قائم رہتی۔ یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف اشارتاً صفحہ ۱۱۳ کے نوٹ کا ذکر کریں گے جس کی صحت مشکوک ہے لیکن اس سے ہر اس قاری پر برا اثر پڑے گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو عملی اعتبار سے بہت بلند سمجھتا ہو۔

مندرجہ بالا بحثیں کتاب کے تین سو صفحات کو محیط ہیں۔ آخری دو سو صفحات میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو "خلافت معاویہ ویزید" کے بارے میں اٹھائے گئے تھے یہ تمام بحثیں پہلے شائع ہو چکی ہیں اور ان کا صرف ایک حصہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ باقی دوسرے اہل قلم کا ہے ہمارے نزدیک کتاب کے شایان شان طرز عمل یہ ہوتا کہ پہلی کتاب کے جو حصے بحث ونظر کا سبب بنے تھے، نئے ایڈیشن میں انہیں مزید وضاحت سے لکھ دیا جاتا اور اگر ضمنی بحثوں کے کتابی شکل میں شائع کرنے کی واقعی ضرورت ہوتی تو انہیں الگ کر کے شائع کیا جاتا۔ اسی طرح ایک اختلاف ہمیں مصنف سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے زیر نظر کتاب کی کتابت وطباعت اور تصحیح وغیرہ کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ یہ کتاب کسی وقتی اور ہنگامی مسئلہ پر نہیں لکھی گئی ہے کہ اسکی ضرورت چند سال بعد محسوس نہیں ہوگی بلکہ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوگا جو علم کی تاریخ میں باقی رہتی ہیں اسی لئے ہم اس کے عمدہ کاغذ پر اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کئے جانے کے حق میں ہیں موجودہ شکل میں کتاب میں پروف کی متعدد غلطیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انتہا سے بے غبار تھی متفق علیہ تھی آئینی معیار پر سو فی صد کھری اتری۔ اس کے برخلاف حضرت علیؓ کی خلافت نہ بے غبار تھی نہ متفق علیہ۔ ان کی خلافت کو غیر منعقد سمجھنے والے ایک دو نہیں بہت زیادہ تھے اور ایسے بھی نہیں تھے کہ ناقابل لحاظ ہوں۔ پایہ کے لوگ تھے حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے اعاظم واکابر جن کے خلاف تلوار سونت کر نکل پڑے ہوں اس کی خلافت کو کسی نہ کسی درجہ میں مضطرب اور ضعیف البنیان تو ماننا ہی پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عثمانؓ نے جو مرتے دم تک خلافت سے مستعفی ہونا منظور نہیں کیا اس کی بنیاد ارشاد پیغمبرؐ پر تھی ان کی دانست میں یہ حضورؐ کا حکم تھا کہ جان دیدینا مگر اس قمیص کو نہ اتارنا جسے اللہ نے تمہیں پہنایا ہے۔

یہیں دو وجوہ جن کے پیش نظر حضرت عثمانؓ کے موقف میں کوئی کمزوری نہیں نظر آتی لیکن حضرت علیؓ کے لئے اسی موقف کو اختیار کرتا ایسی ہی مضبوط وجوہ کا متقاضی تھا جو آج تک ہمیں کسی فاضل کی تصریحات میں نہیں ملے ہاں قصیدہ نگاری اور مبالغہ آرائی کی کمی نہیں۔ ایک بات یہ بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ حضرت عثمانؓ کو معزول کرنے کا مطالبہ جن لوگوں کی طرف سے کیا گیا تھا وہ صف اول کے لوگ نہیں تھے ان میں سے شاید چند ہی صف ثانی کے ہوں گے ورنہ غالب اکثریت تیسرے درجے کے لوگوں کی تھی۔ پھر جن بنیادوں پر یہ مطالبہ کیا گیا تھا وہ بھی ایسی تھیں کہ اس عہد کے اکابر نے انہیں لغو و باطل قرار دیا تھا اور آج تک انصاف پسند اور بالغ نظر مورخین انکی لغویت وبطلان پر متفق ہیں لیکن حضرت علیؓ سے جو مطالبہ کیا گیا تھا وہ بیشتر صف اول کے لوگوں نے کیا۔ اُن ارباب حل وعقد نے کیا جن کی عظمت ومنزلت پر پہلے دو اول خلیفہ صاد کر چکے تھے . . . .

ہندی سکھانے والی ماہرانہ کتابیں

ہندی اردو ماسٹر ۔۔۔۔۔۔ ۳۰ نئے پیسے
اردو ہندی ماسٹر ۔۔۔۔۔۔ ۵۰ " "
ہندی اردو لغت ۔۔۔۔ ساڑھے تین روپے
اردو ہندی لغت ۔۔۔۔ ساڑھے تین روپے
ہندی دفتری مراسلات ۔۔۔۔۔۔ دو روپے

وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا اس کتاب میں بہت سے ایسے شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار جمع کئے گئے ہیں جنھیں شہرت حاصل نہیں ہے۔ لیکن انکی شاعرانہ صلاحیتیں خاصی نکھری ہوئی ہیں۔ ہر شاعر کا تعارف بھی ساتھ ہے۔ دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

وجد و سماع از:۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ گانا بجانا، قوالی، عرس وغیرہ کے بارے میں بے نظیر گفتگو۔ پیش لفظ مدیر تجلی کا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

تعزیہ علمائے اسلام کی نظر میں ایک مختصر لیکن مفید و قیمتی کتاب صرف چھ آنے

فارسی تعلیم کا ایک عمدہ نصاب

جسکے ذریعے بغیر معلم کے بھی خود ہی اپنے بچوں کو فارسی سکھلا سکتے ہیں

اصول فارسی مکمل ہر دو حصہ ۔۔۔۔ سوا روپیہ
معین فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۷۴ پیسے
دروس فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۵۰ پیسے
نصائح فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۶۲ پیسے
ترجمان فارسی ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
(مکمل نصاب کی مجموعی قیمت تین روپے ۶۲ نئے پیسے)

عمرو بن العاصؓ اس صحابی رسولؐ، فاتح مصر، سلطان کے ذہنی اور بلند پایہ مدبر کی داستانِ حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے مدبر اسلام کے خطاب سے نوازا۔ بیحد دلچسپ اثر انگیز اور مستند۔ قیمت مجلد دو روپے۔

اشرف الجواب اسلام پر کئے جانے والے نوع بنوع اعتراضات کے دلپذیر جوابات حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کی زبان سے۔ مثلاً خدا بغیر زبان کے کیسے کلام کرتا ہے؟ جنت و دوزخ کیسے اور کیوں ہیں؟ کیا خدا کافر کی مغفرت پر قادر نہیں؟ وغیر ذلک۔
قیمت ایک روپیہ

بزم پیغمبر منتخب احادیث رسول کا مفید ترجمہ و تشریح
قیمت سوا روپیہ

جواہر رسالت قدم قدم پر کام آنے والی احادیث مع ترجمہ و تشریح۔ قیمت سوا روپیہ۔
(یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر بجائے ڈھائی کے سوا دو روپے)

مصر کے شہرۂ آفاق مصنف محمد حسین ہیکل کی دو بے نظیر کتابیں

ابوبکرؓ:۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی کی حیات مبارک کا ہمہ گیر جامع اور بھرپور مطالعہ۔ قیمت پانچ روپے۔

عمر فاروق اعظمؓ خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی کی مفصل اور سیر حاصل سوانح حیات۔ قیمت نو روپے۔

مسلم یونیورسٹی اور جارحانہ فرقہ پرستی

ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور جان و مال پر جو یورشیں ہیں ان کا بصیرانہ جائزہ اور ممتاز لوگوں کے فرمودات پر نقد و تبصرہ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

فسادات جبل پور اور اس کے بعد

حال ماضی کی قبر میں دفن ہوجاتا ہے لیکن اس سے سبق حاصل کرنا جبھی ممکن ہے کہ وہ حافظے کی سطح پر زندہ رہے۔ یہ کتاب اسی امکان کو پائندہ رکھنے کی ایک مؤثر، سنجیدہ اور فکر انگیز کوشش ہے۔ قیمت دو روپے۔

مکتبہ تجلی دیوبند

تصانیف مولانا مودودی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	۲۵	
اسلام کا نظامِ حیات	۵۰	۱
رسالہ دینیات	۵۰	۱
جماعت اسلامی کی دعوت	۲۵	
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔	۳۷	
قرآن اور پیغمبرؐ	۳۵	
نشانِ راہ	۳۷	
تجدید و احیائے دین	۵۰	
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۳۱	
حقیقتِ ایمان	۵۰	
حقیقتِ اسلام	۴۰	
حقیقتِ صوم وصلوٰۃ	۶۰	
حقیقتِ زکوٰۃ	۴۴	
حقیقتِ حج	۴۰	
شہادتِ حق	۳۱	
دعوتِ اسلامی	۸۷	
میلاد النبیؐ	۱۳	
ایک اہم استفتاء	۱۶	
قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۱۹	
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	-	۱
معراج کی رات	۶	
حروف قدر	۱۵	
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۴۰	
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۵۰	۱
زندگی بعد موت	۱۲	
اسلام اور جاہلیت	۳۷	
مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	۷۵	
لباس کا مسئلہ	۱۹	
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔	۳۷	
دعوتِ اسلامی میں خواتین کا حصہ	۲۵	
سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام	۱۹	
اسلام اور ضبطِ ولادت	۷۵	
تفہیمات حصہ اول	۵۰	۵
" حصہ دوم	۵۰	۶
تفہیم القرآن اول مجلد ہدیہ	-	۱۲
" دو "	-	۱۵
رسائل و مسائل مکمل	-	۱۲
اسلام اور جدید معاشی نظریات	۲۵	۲
ترجمان القرآن کا منصبِ رسالت نمبر	۵۰	۳
حدیث اور قرآن	-	۱

مولانا صدر الدین اصلاحی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
فریضۂ اقامتِ دین	۵۰	۱
حقیقتِ نفاق	۵۰	۱
اسلام کا نظامِ معیشت	۵۰	

افضل حسین ایم۔ اے

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
اخلاقی کہانیاں مکمل در چار حصص	۱۷	۱
عام معلومات ۔ حصہ اول	۳۰	
" " دوم	۴۰	
" " سوم	۸۰	
" " چہارم	۳۰	۱
" " پنجم	۴۰	۱
پیارے رسولؐ ۱	۵۰	

مولانا امین احسن اصلاحی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حقیقتِ توحید	۱۲	۱
حقیقتِ تقویٰ	۶۹	
تزکیۂ نفس	-	۶

مولانا ابواللیث

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
جماعت اسلامی کا مقصد اور اس کا طریقۂ کار	۵۶	
بھارت کی تعمیرِ نو اور ہم	۵۰	

سید حامد علی صاحب

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حج کیا ہے؟	۵۰	
قوموں کا عروج و زوال	۵۰	

وحید الدین خاں

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حقیقت کی تلاش	۵۰	
کیا ہندوستان ترقی کر رہا ہے؟	۵۰	
ایک انسان ایک نظام	۳۷	
نئے بھارت میں اسلامی نظام کی دعوت	۴۴	
نئے عہد کے دروازے پر	۳۷	
ہندوستان کی منزل سوشلزم یا اسلام	۳۷	
معاش کا مسئلہ اہم کیوں ہوا	۴۴	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	۳۲	

مکتبہ تجلّی دیوبند یو۔پی

نقد و تبصرہ

کھرے کھوٹے

اہم کتابوں کو پورا پڑھکر تفصیلی تبصرہ کرنے کی عادت ایک ایسی وزنی زنجیر ہے جسے خود ہم نے اپنے پیروں میں ڈالا ہے اب اس کا لازمی نتیجہ یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ بہت سا تبصرہ طلب لٹریچر مہینوں یونہی پڑا رہے اور مطالعہ کی نوبت نہ آپائے۔

" خلافت معاویہ ویزید " کے مصنف جناب محمود احمد عباسی کی تازہ تالیف " تحقیق مزید " تبصرے کے لئے کئی مہینے سے ہمارے پاس آئی رکھی ہے اور اگر ہم واقعۃً ویسے ہی " حسین دشمن " ہوتے جیسا بعض شیعی ذہنیت کے سنی کرم فرماؤں نے مشہور کر رکھا ہے تو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اسپر تبصرے کو مطالعے پر موقوف رکھ چھوڑتے۔ اندھی یزیدیت اور کورانہ حسین دشمنی کے لئے زرین موقعہ تھا۔ کہ ہاتھوں ہاتھ تعریفی تبصرہ اڑا دیا جائے۔

مگر ہمیں خدا کے یہاں جانا ہے اور دل چیر کر دکھانا ہے کہ اے اللہ ہم نے تبصرہ و تنقید میں ہمیشہ دیانت و حق گوئی کو ہی ملحوظ رکھا ہے کسی کی محبت یا نفرت میں ہم نے کبھی ان باتوں کو نوک قلم پر نہیں آنے دیا جنھیں ہمارا ضمیر، ہماری ناچیز بصیرت اور ہمارے ناقص علم و فہم حق و صداقت کے خلاف باور کرتے ہوں یہ عین ممکن بلکہ ضروری ہے کہ خدمت لوح و قلم کے طویل عرصہ میں ہمارا سوجھ بوجھ نے متعدد ٹھوکریں کھائی ہوں ہم سے اجتہادی لغزشیں ہوئی ہوں۔ ہم دھوکہ کھا گئے ہوں مگر ہر خطا اور کوتاہی نادانستہ ہوئی ہے ارادے اور نیت کی حد تک بفضلہ تعالیٰ ہم مطمئن ہیں کہ تا ایں دم کوئی غبار ہمارے ضمیر پر نہیں ہے واللہ علیٰ ما

اقول شہید۔

اس مرتبہ ہم کسی بھی کتاب پر تبصرہ نہیں کر سکے کیونکہ مطالعہ کا وقت نہیں نکلا۔ لیکن اتفاق سے مئی ۱۹۶۰ء کے ماہنامہ میثاق میں جو مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں لاہور سے نکلتا ہے " تحقیق مزید " پر تبصرہ آیا ہے مناسب معلوم ہوا کہ اسی کو نقل کر دیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خود تبصرہ نہیں کریں گے نہ یہ مطلب ہے کہ پیش نظر تبصرے سے ہم لفظاً لفظاً متفق ہیں اتفاق و اختلاف کا سوال تو مطالعے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے ہاں میثاق چونکہ ایک معیاری پرچہ ہے اسلئے اس میں شائع شدہ تبصرے کو نقل کرتے ہوئے ہمیں یہ اطمینان ضرور ہے کہ کوئی غیر ذمہ دارانہ چیز نقل نہیں کر رہے ہیں۔

تبصرے میں چند سوالات بھی کئے گئے ہیں جنکا جواب فاضل تبصرہ نگار کو کتاب میں نہیں ملا۔ ہم تفصیل سے تو نہیں مختصراً ان کا جواب حاشیے میں دینا پسند کریں گے۔ وباللہ التوفیق۔

تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہ و یزید

تالیف۔ محمود احمد عباسی

صفحات:۔ ۵۱۲ قیمت آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ محمود ہیلر بی ایریا لالوکھیت کراچی

و مکتبہ علم و حکمت سوتر منڈی لاہور

آج سے دو سال قبل بہت کم لوگ محمود احمد عباسی صاحب کو

باب الصحت

از حکیم محمد عظیم زبیری امروہہ

بینائی کی حفاظتی تدابیر

انیسویں صدی تک عینک لگانے والوں کی تعداد بہت کم تھی زیادہ تر بوڑھے لکھنے پڑھنے کے وقت عینک لگاتے تھے اور بڑھاپے تک سینے پرونے کے وقت ضرورت ہوتی تھی لیکن بیسویں صدی میں عینک لگانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے قریب کی نگاہ خراب ہونے کی شکایت عام طور پر پائی جاتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم اپنی بینائی کی طرف سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ کریم۔ پوڈر۔ اور دیگر فیشن کی چیزوں پر فضول رقم گنوا دیتے ہیں لیکن عمدہ سرمہ خرید کر استعمال نہیں کرتے اور نہ حفاظتی تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔

محترم ناظرین! آنکھیں بڑی نعمت ہیں ان کی قدر کرنی چاہیے ذیل میں چند ایسی مخصوص تدابیر لکھی جاتی ہیں جن پر عمل کرنے سے بینائی دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔

(۱) **پلک جھپکانا۔** ۔ کمزور نگاہ کے لئے بہتر طریقہ بینائی کی حفاظت کرنے کا یہ ہے کہ وہ اپنی پلکوں کو بار بار جھپکنے کی عادت ڈالیں اس سے نگاہ کو بہت کافی آرام ملتا ہے نگاہ قائم رہتی ہے۔

(۲) **دھوپ**۔ روزانہ صبح کو سورج نکلتے وقت سورج کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوں آنکھیں بند کرکے اپنے سر کو داہنے بائیں آہستہ آہستہ حرکت دیتے رہیں تاکہ ہر حصۂ چشم پر روشنی کا اثر پڑ سکے دس منٹ سے لیکر آدھ گھنٹہ تک یہ عمل کیا جائے۔

(۳) **مطالعہ**۔ عام طور پر لوگ پڑھنے میں پلک نہیں جھپکاتے یہی غلطی نگاہ کو کمزور بناتی ہے پڑھتے وقت ہر سطر کے پہلے اور آخری لفظوں پر پلک جھپکاتے رہیے۔ مطالعہ کے وقت سامنے روشنی نہ رکھیں بلکہ پیچھے سے روشنی کتاب پر پڑے یا بائیں طرف سے۔ طالبعلمی کے زمانہ میں پہلے ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جن کے حروف موٹے ہوں عمر کی زیادتی کے ساتھ باریک حروف کی کتابیں پڑھی جائیں۔

(۴) **وٹامنز**۔ قریب کی نگاہ کا کمزور ہونا اور ڈھلکا (EPIPHORA) عام مرض بن گئے ہیں منجملہ اور اسباب کے عام تندرستی کی خرابی اور غذا میں وٹامن اے (A) کی کمی بھی ایک سبب ہے جن لوگوں کی نگاہ کمزور ہو اگر وہ ایسی غذائیں استعمال کریں جن میں وٹامن A زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہو تو بغیر کسی دوسرے علاج کے بینائی کی طاقت بڑھنے لگتی ہے کمزوری دور ہوکر پہلے سے بھی زیادہ نگاہ قوی ہو جاتی ہے وٹامن A (اے) کی کمی دور کرنے کے لئے تازہ سبزی کا استعمال ضروری ہے گاجریں وٹامن اے کافی مقدار میں ملتا ہے گاجروں کے موسم میں جو شخص روزانہ چار پانچ نرم و نازک اودے رنگ کی گاجریں کچی کھاتے اس کی بینائی کمزور نہ ہو بڑھاپے تک قائم رہے۔

(۵) **سرمہ کا استعمال**:۔ سرمہ اور کاجل کو لوگوں نے ایک فضول سی چیز سمجھکر چھوڑ دیا ہے حالانکہ روزانہ سوتے وقت سرمہ یا کاجل لگانا بینائی کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ معتبر سرمہ استعمال کرنا چاہیے۔ بازاری سستے قسم کے سرمے بینائی کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان بھی پہنچاتے ہیں میں خود "درِ نجف" دار الفیض روحانی دیوبند کا استعمال کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک چشمہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ لکھنے پڑھنے کا کثرت سے کام کرنا پڑتا ہے۔

دُرِّ نجف مشہور و معروف سرمہ
جو تقریباً سولہ سال سے آپ کی خدمات انجام دے رہا ہے
ایک قدیمی نسخے سے تیار کیا ہوا جس میں سچے موتی اور دیگر مفید اجزاء شامل ہیں
ایک تولہ پانچ روپے
آدھا تولہ تین روپے
ڈاک خرچ ڈیڑھ روپیہ
مضبوط شیشی
ایک ساتھ تین شیشی کے خریداروں کو ڈاک خرچ معاف
بغیر کسی مرض کے بھی ہمیشہ اسے استعمال کرتے رہیے کیونکہ یہ آخری عمر تک نگاہ کو قائم رکھتا اور مرض کے حملوں سے بچاتا ہے
SURMA
DURR-E-NAJAF
دھند جالا، رتوندا، پڑبال، سرخی، اور آنکھیں دکھنے میں مفید ہے۔
آنکھوں کے آگے تارے اڑتے ہوں، یا بینائی کمزور ہوتی جا رہی ہو، یا آنکھیں تھکاوٹ محسوس کرتی ہوں تو اسے استعمال فرمائیے۔
ضروری ہدایات ساتھ بھیجی جاتی ہیں
جن حضرات نے تجربہ کے بعد تعریفی تحریریں مرحمت فرمائیں ان میں سے چند کے اسماءِ گرامی
حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب استاذ دار العلوم دیوبند۔ حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب عثمانی۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (ندوۃ المصنفین دہلی)۔ ڈاکٹر ظفر یار خاں صاحب سابق ملٹری سرجن۔ حکیم کنہیا لال صاحب وید سہارنپور۔ ڈاکٹر انعام الحق، صاحب ایل، ایم، ایس ہومیوپیتھک۔ ساہو جوالا پرشاد صاحب رئیس اعظم مراد آباد۔ جناب امتیاز نسیمی ایڈیٹر اسلامی دنیا دیوبند
ہندوستان کا پتہ دار الفیض رحمانی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور۔ (یو۔پی) انڈیا
پاکستان کا پتہ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان

تاریکیوں میں ایک چراغ

ایڈیٹر:- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

سالانہ:- سات روپے / ۱۸ شلنگ

۶۲ نئے پیسے
دس آنے

تاریخ اسلام کامل
اُردو۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
کی تین جلدوں کی ضخیم تاریخ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ قدیم و جدید تاریخوں کا نچوڑ سمجھئے۔ اسلام کی اس سے زیادہ جامع معتبر اور نفیس تاریخ اُردو میں کوئی نہیں۔ روشن کتابت و طباعت سفید کاغذ، حسین گردپوش۔ تین جلدیں الگ الگ مجلد قیمت چھتیس روپے

نظام الملک طوسی
الپ ارسلان کے وزیر کبیر ابوعلی حسن بن علی کی مبسوط سوانح عمری۔ قابل اعتماد تاریخی مواد۔ مؤلفہ:۔ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ۔ قیمت بارہ روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات
تاریخ کے بعض دلچسپ اہم اور تعجب خیز واقعات کا عبرت آموز بیان۔ قیمت تین روپے۔

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیبؒ
مشہور فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ (۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء) جس میں شاہجہاںؒ کے آخری دور کا حال، اورنگ زیبؒ کی بھائیوں سے کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پس پردہ واقعات اور اس دور کے سیاسی معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ
دنیائے عرب کے مشہور عالم و محقق استاذ ابو زہرہ کی بیش بہا عربی تصنیف کا نفیس اُردو ترجمہ۔ امام ابن تیمیہؒ پر سب سے جامع، مبسوط اور سیر حاصل کتاب۔ ضخیم اور وقیع۔ مجلد اکیس

رسائل و مسائل
گوناگوں دینی و علمی سوالات کے جو مدلّل اور مفکرانہ جوابات مولانا مودودی وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں ان کے مجموعے کا نام "رسائل و مسائل" ہے نکتہ رسی، زورِ استدلال، فہم و بصیرت، تدبر و تفقہ اور فصاحت و بلاغت کا گنجینہ۔ مکمل دو حصے۔ بارہ روپے۔

اُمّ الکتاب
مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ۔
پونے پانچ روپے

آئینۂ حقیقت نما
مصنفہ:۔ مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ہندوستان پر مسلم فاتحین مغربی مؤرخین گذشتہ بیسوں سے ہندوستان پر مسلم فاتحین حالات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر پیش کر رہے تھے اور مسلمان حکمرانوں کی ساری خوبیاں خرابیاں ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں مؤرخ اسلام نے محققانہ قلم اٹھایا اور تمام الزامات کا مدلل اور دندان شکن جواب تاریخ کی روشنی میں لکھا جو "آئینۂ حقیقت نما" کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب حیرت انگیز تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔ مکمل مجلد بارہ روپے

البرامکہ
مصنفہ:۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری۔
عالم اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کون تھے۔ انھوں نے عہد عباسیہ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئیے۔ ان دانشور اور مدبّر وزیروں کے عروج و زوال کی حیرت انگیز و عبرت انگیز داستان۔ مکمل مجلد بارہ روپے

سفینۃ الاولیاء
داراشکوہ کی مشہور و مستند کتاب سفینۃ الاولیاء کا سلیس و بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں آنحضرت سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین و امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو یوسفؒ، امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ و ائمہ اثنا عشریؒ و ازواج مطہراتؓ و اسلام کی مشہور و نیک خواتین اور اولیاء کرام کے جامع حالات از تاریخ ولادت تا تاریخ وفات کو مستند ماخذوں سے جمع کیا گیا ہے۔ مجلد چھ روپے بارہ آنے۔

مقالات جمال الدین افغانیؒ
چودھویں صدی کے مجدد اور مفکر جمال الدین افغانیؒ کے زندگی افروز، ولولہ انگیز، روح پرور، عزم آفریں اور داعیانہ عربی خطبات و مقالات کا شستہ اُردو ترجمہ۔ مجلد چار روپے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ
حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور ان کے فکر و نظر کی تشریح و توضیح۔ از علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

مکتبہ تجلّی دیوبند (یو۔پی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلی دیوبند

شمارہ نمبر ۶ — جلد نمبر ۱۴

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے)

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو

سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائینگے

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ اگست ۱۹۶۲ء

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلی دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر آلہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

آغازِ سخن

مدیرِ "برہان" نے اپنے اداریئے کی قسط اول کے اختتام پر فرمایا تھا:-

" ایک سیکولر جمہوریہ میں اسلامی مفادات کے تحفظ
اور قانونِ حق کے اعلاء کا سروسامان کیونکر ہو سکتا ہے
اس پر ہم آئندہ لکھیں گے "۔

یہ اعلانیہ بڑا مسرّت انگیز تھا۔ جس وطن میں بدحال امتِ مسلمہ کے عام انسانی حقوق بھی مالِ یتیم سے بدتر حیثیت اختیار کر چکے ہیں وہاں اسلامی مفادات کے تحفظ اور قانونِ حق کے اعلاء جیسے مقاصدِ عالیہ کی راہیں سجھانے کی بات واقعتہً ایک مژدۂ جانفزا سے کم نہ تھی، لیکن جو اداریہ اس وعدے کے ایفاء میں مدیرِ برہان نے سپردِ قلم کیا ہے اسکی حیثیت کم سے کم ہم جیسے کوتاہ فہموں کے لئے تو رہنمائی کی بالکل نہیں ہے، بلکہ اس کو پڑھنے کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ جو فردِ جرم ہمارے وزیرِ خارجہ نے جماعت اسلامی پر لگائی ہے فاضل مدیر اسی کی توثیق و تصویب کر دینا چاہتے ہیں اور کفر و نفاق کی ظلمتوں سے معمور اس دنیا میں اگر اعلائے کلمۃ الحق اور احیائے دین کی آرزوؤں کے معدودے چند چراغ کہیں ٹمٹما رہے ہیں تو موصوف کی خواہش ہے کہ انھیں بھی فوراً گُل کر دیا جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے طرزِ فکر پر دیوانگی کا حکم لگانے کی حد تک تو ان کے ارشادات کا دائرہ ہند و پاک دونوں کو محیط ہے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی مشکلات، یہاں ان کے دینی و دنیاوی مفادات کے تحفظ اور یہاں کے نازک مسائل سے انھوں نے کوئی بحث نہیں کی ہے بلکہ پورے جوش کے ساتھ پاکستان ہی کو محورِ گفتگو بنایا ہے اور تمام زور مولانا مودودی کی تنقیص و تحقیر پر صرف کیا ہے ہم نہیں جانتے کہ ایک ایسے نازک وقت میں جب خود اپنے ملک میں ہمیں زندگی اور موت کی کشمکش کا سامنا ہو کوئی شخص مولانا مودودی کی ذات پر تبرّا کر کے اور " اسلامی حکومت" کے موضوع پر دادِ بلاغت دے کر کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر مولانا موصوف کا مقصود اپنے تازہ اداریوں سے حکومتِ وقت کو یہ تأثر دینا تھا کہ اس سے قبل میری کسی تحریر میں جماعت اسلامی کی تائید و تحسین اور اسلامی نظامِ حکومت سے دلچسپی کے جو عناصر پائے جاتے ہیں میں ان سے دستبردار ہو چکا ہوں تو یہ مقصود مولانا مودودی پر لے دے کئے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جو رُخ اور اسلوب مولانا نے اختیار فرمایا ہے وہ ہماری نگاہ میں سوائے مضرّت کے اور کسی ثمرے کا حامل نہیں ہے۔ نیز وہ اُن توقعات کے مطابق بھی نہیں ہے جو ہم جیسے نیازمندان کی ذات والاصفات سے بجا طور پر رکھتے تھے

اداریئے کی تازہ قسط[1] میں مولانا نے پانچ صفحات کے پھیلاؤ میں جو کچھ لکھا ہے اس پر تفصیلی بحث کے لئے تو بڑا وقت چاہیئے۔ یہ وقت ہم ضرور نکال لیتے اگر بحث کا کوئی حقیقی فائدہ ہمیں نظر آتا لیکن " اسلامی حکومت" جیسے موضوع پر بحثیں کرنا اس وقت ہم ہندی مسلمانوں کے لئے تقریباً ایسا ہی ہے جیسے مشہور کہاوت ہے کہ،

---

[1] برہان جون ۶۲ء کا اداریہ مراد ہے۔ اس کے بعد جولائی میں بھی اس موضوع پر کچھ آیا ہے وہ فی الوقت پیش نظر نہیں۔ تجلّی۔

ثبوت نہ کیا اس مقالے سے لشم لشما۔ لہٰذا ہم خاص خاص پہلوؤں پر ہی عرض و معروض کو محدود رکھیں گے۔

تازہ اداریئے میں سب سے پہلے مولانا نے یہ بات کہی ہے کہ اسلامی حکومت بنائی نہیں جاتی وہ خود بخود بن جاتی ہے۔ اسلام کے تصورِ حیات میں حکومت مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ طبعی نتیجہ ہے اس نظامِ زندگی پر عمل کرنے کا جس کا نام اسلام ہے۔

ہماری نگاہ میں اس دعوے کے دونوں جز محلِ نظر ہیں۔ دنیا میں معمولی سے معمولی جماعت کا ظہور و قیام بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ لوگ ایسے بنانے کا ارادہ کریں اور ارادے کے بعد مثبت اور منفی دونوں قسم کی کوششوں کو بروئے کار لائیں۔ پھر حکومت جیسے مہتم بالشان ادارے کا قیام اس کے بغیر کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں میں اس کی طلب پائی جاتی ہو۔ اس کے لئے وہ قصد و عزم رکھتے ہوں۔ اس کی خاطر وہ جدوجہد کریں اور جو بھی خالی جگہ انھیں آگے قدم بڑھانے کے لئے نظر آئے اس پر قدم رکھنے سے نہ چوکیں۔ دنیا میں کبھی کوئی حکومت اس طرح قائم نہیں ہوئی ہے کہ اس کے قیام کا ارادہ نہ کیا گیا ہو اور وہ آپ سے آپ قائم ہو گئی ہو۔ ایک معمولی سی مشین اگر ارادے اور محنت کے بغیر نہیں بن سکتی تو ایک ایسی دیوہیکل مشین بغیر ارادے اور جدوجہد کے کیسے بن سکتی ہے جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں پر مشتمل معاشرے کے بے نہایت مسائل پر کنٹرول رکھنے کے لئے وضع کی گئی ہو۔

دوسرا جز یعنی حکومت کا مقصود بالذات نہ ہونا بھی مغالطے سے خالی نہیں۔ ہم یہاں قرآن و حدیث اور فقہاء و مجتہدین کی اُن تصریحات کو نقل کر کے کلام کو طول نہیں دیں گے جنمیں مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی حد تک اللہ کے قانون کو نافذ و غالب کرنے کی سعی کرتے رہیں۔ ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ جہاں تک مقصود بالذات ہونے کا تعلق ہے اسلام میں صرف رضائے الٰہی ہی مقصود بالذات ہے اس کے سوا ہر شے محض وسیلہ و ذریعہ ہے اور کچھ نہیں۔ نماز، روزہ، حج، قربانی۔ حتٰی کہ رسول کی رسالت پر ایمان اور اُس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی بھی مقصود بالذات نہیں، بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے تو کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ مقصود بالذات نہ ہونے کے باعث یہ سب اُمور غیر ضروری ہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر معاشرے کے سدھار اور بگاڑ میں حکومت کی بے نہایت اثر اندازی کا انکار کسی ہوشمند کے لئے ممکن نہیں ہے تو اُس حکومت کے قیام کو بھی مقاصدِ اسلامیہ کے دائرے سے خارج کرنا ممکن نہیں ہے جس کو قائم کئے بغیر اسلام کا مطلوبہ معاشرہ ظہور میں نہیں آ سکتا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ نماز روزہ وغیرہ اصل مقصود یعنی رضائے الٰہی کے حصول کیلئے وسائل کا درجہ رکھتے ہیں لیکن انھیں تمام امت نے بجائے خود مقاصدِ عالیہ کی فہرست میں اس لئے شامل کر لیا کہ اصل مقصد کی تحصیل میں یہ نہایت کارگر ہیں۔ پھر حضورؐ کی رسالت پر ایمان اور آپ کے ارشادات کو برحق تسلیم کرنا تو اس حد تک ضروری قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر مسلمان ہی نہیں بنا جا سکتا۔ یہ اسی لئے ہے کہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس وسیلے کو اساسی و کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہی حال اسلام کے جملہ اوامر و نواہی کا ہے کہ اصل مقصد تک پہنچانے والے اہم ذرائع کو بھی بجائے خود مقصد کی اہمیت دیدی گئی۔ مثلاً مقصود صرف زنا سے روکنا ہے، لیکن حرام شد و مد کے ساتھ بوس و کنار اور لمس اور راز و نیاز کو بھی قرار دیا گیا۔ حالانکہ یہ محض وسائل و مبادی ہیں اصلاً زنا نہیں ہیں۔

تو سوچنے کی بات یہی ہے کہ جن قوانین کو اللہ نے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے صاف طور پر پسند فرمایا ہے اور قرآن و حدیث میں ان کی صراحت موجود ہے ان کا اجرا اور ظہور ہی اگر اسلامی حکومت کے قیام پر منحصر ہو تو یہ دعوےٰ کیا جان رکھتا ہے کہ اسلامی حکومت مقصود بالذات نہیں ہے۔

اس موضوع پر مزید گفتگو کی بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود مولانا کے کچھ ارشادات انھیں یاد دلائیں۔

فروری [illegible] کا برہان اُٹھا کر دیکھئے۔ مولانا "نظرات" میں لکھتے ہیں:۔

"اس وقت جب کہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظامہائے حکومت خود اُن کے ہاتھوں سے برباد ہو رہے ہیں اور انھوں نے دنیا کی اجتماعی مشکلات کے حل کرنے کے لئے جو خاکے بنائے

تھے اُن کی ناکامی خود اُن کے عمل سے ظاہر و ثابت ہو رہی ہے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے نظامِ حکومت کا صحیح اور مبسوط و مفصل خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور مدبرینِ سیاست کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ دوسرے دولتی نظاموں کا مقابلہ و موازنہ کر کے خدائی قانون اور الٰہی تشریع کی اہمیت و عظمت کا اعتراف کریں۔ حق باطل کے دھندلکے میں عارضی طور پر نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے لیکن فنا نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس وقت عہدِ حاضر کے بڑے بڑے افکار و آراء کا عملی تجربہ کر رہی ہے اور اگر اُس کو ان سب میں مایوسی اور نامرادی نہ ہوئی تو اُسے لامحالہ اپنے اجتماعی مصائب کے حل کے لئے پھر اسلام کے اسی قانونِ الٰہی کے دامن میں پناہ لینی ہوگی جو عین فطرت اور سرتاسر منشاءِ قدرت ہے۔"

اس کے بعد برہان مئی ۱۹۵۸ء کے نظرات پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ مولانا رقمطراز ہیں:-

"اصل سوال یہ ہے کہ اسلام ہے کیا؟ کیا عیسائیت، یہودیت اور بودھ مت کی طرح وہ ایک ایسا مذہب ہے جو صرف چند رسوم اور عبادات کے چند مخصوص طور طریقوں کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل و معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اس بنا پر وہ ہر نئے فکر کے ساتھ مصالحت کر سکتا ہے، ہر جدید نظریۂ اجتماع و تمدن کو اپنا سکتا ہے۔ گویا خود اُس میں اس بات کی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اجتماعی اور تمدنی مسائل میں قیادت کا فرض انجام دے اور نظریات و افکار کی بین الاقوامی مجلس میں بیٹھ کر اپنا کوئی مستقل اور ٹھوس نظریۂ حیات پیش کرے یا اس کے برخلاف اسلام درحقیقت ایک جامع اور ہمہ گیر نظامِ اجتماع و تمدن کا حامل ہے۔ وہ کسی وقت بھی منجمد اور ساکن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور ہر عہد اور ہر دور کے باطل نظامہائے حیات اور غلط افکارِ زندگی کے خلاف مسلسل دعوتِ انقلاب و احتجاج دیتا رہتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا (۱) کنتم خیر امة اخرجت للناس (۲) لتکونوا شهداء على الناس (۳) کونوا قوامین بالقسط۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری آیتیں اس بات پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسلمان صرف اپنے لئے زندگی بسر نہیں کرتا، بلکہ ساری دنیا اور سارے جہان کی خدمت کرنے اور انھیں امن و سلامتی کی راہ دکھانے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں فتنہ و فساد ہوگا، باطل کا غلبہ ہوگا، شر کو فروغ ہوگا، جہاں انسانی معاشرہ تباہ و برباد ہوتا ہوگا، انسانیت پر ظلم و ستم ہوگا اور انسانی عظمت مجروح ہوتی ہوگی اسلام اسکے خلاف احتجاج کرے گا اور اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ جب کہ دنیا میں آگ لگ رہی ہو اور انسانیت کی متاعِ گرانمایہ اس میں جلی جا رہی ہو اسلام ایک خاموش تماشائی کی طرح اُس کا نظارہ نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ آگ بجھانے کی کوشش کرے گا اور اس کا ذخیرہ کو سرانجام دینے کے لئے صلاح و نکوکاری کی جتنی طاقتیں ہیں اُن کو اپنے ساتھ لیکر میدانِ عمل میں آجائے گا۔ اگر اسلام نام درحقیقت اسی دوسری صورت کا ہے اور وہ ہر زمانہ اور ہر دور کی ایک متحرک انقلابی طاقت ہے تو اب سوچنا چاہیئے کہ اسلام اتنی بڑی اور ایسی طاقت کب بن سکتا ہے؟ اس کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ اسلام موجودہ عہد کے تمام اجتماعی اور تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مسائل جن کا براہِ راست تعلق انسانی معاشرہ کے صلاح و فساد سے ہے اُن کا بہترین اور کامیاب حل پیش کرے اور یہ حل اُسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ غیر اسلامی افکار و نظریات کی خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر تحلیل و تنقید کی جائے اور اُن کے ہر ہر پہلو پر بحث کر کے انسانی سماج کے لئے اُن کے مہلک ہونے کو ثابت کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسری چیز جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس اسلامی فکر کی حامل ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو فکر و عمل، اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہو۔ اپنے مخصوص نظامِ فکر و عمل کے ساتھ وابستگی میں سخت کٹر اور متعصب ہو۔ یعنی کسی ایسے فکر یا عمل کے ساتھ مصالحت کرنے کیلئے ہرگز

آمادہ نہ ہو جو خود اس کے نظامِ حیات (اسلام) کے ساتھ ٹکراتا ہو۔ جب تک کسی جماعت میں کٹرپن اور تعصب پیدا نہیں ہوتا اُس میں کسی تحریک کو لے چلنے کی صلاحیت ہرگز پیدا نہیں ہوتی

پس اسلامی جماعت کی مقبولیت اور اُس کی روزافزوں ترقی کا اصل راز یہی ہے کہ اس جماعت کے زعماء نے اسلام پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور اُن کی تمام جدوجہد اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہے۔ اس کوشش میں ان حضرات نے اسلامی تعلیمات کی جو تشریحات و توضیحات کی ہیں آپ کو کلاً یا جزاً اُن سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نقطۂ نظر اصل مقصد بالکل درست اور قرآن کے عین مطابق ہے۔ آپ کو اگر ان تشریحات سے اختلاف ہے تو اس کے مقابلہ میں اپنی تشریحات اور آج کل کے اجتماعی اور تمدنی مسائل کا حل پیش کیجئے اور بتائیے کہ اس حل کو دنیا سے منوانے کی صورت کیا ہے؟ لیکن خدا کے لئے میدان میں تو آئیے ذرا دیکھئے تو دنیا کدھر جا رہی ہے، اس کا رُخ کیا ہے کیسی تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں اور اسلام کی شمع حقانیت و ربانی ان آندھیوں میں کس طرح پھنس کر رہ گئی ہے اور اس کو ان ہواؤں کی زد سے بچانے کے لئے آپ کا کیا فرض ہے۔ جب کبھی دنیا میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں تو اسلافِ کرام نے کیا کیا ہے اور ہم آج کے حالات میں کیا کر رہے ہیں ان سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے"

اس طرزِ فکر، اس اندازِ گفتگو، اس دلسوزی کو دیکھئے اور پھر مولانا کے موجودہ دونوں اداریوں کو پڑھ جائیے کوئی مطابقت اور ہم آہنگی نظر نہیں آئے گی۔ ہم نہیں جانتے کہ اسلامی حکومت اگر اسی ردو قدح اور بے قدری کی مستحق تھی جس کا اظہار تازہ اداریوں سے ہو رہا ہے تو یہ کچھ سال قبل کے رشحات کس خانے میں رکھے جائیں؟

دوسری بات مولانا نے یہ کہی ہے کہ کسی حکومت کا نام "اسلامی حکومت" رکھنا بالکل غلط ہے۔ اس بات پر انھوں نے پچھلے اداریئے میں بھی زور دیا تھا اور تازہ اداریئے میں بھی بڑا زور دے رہے ہیں۔

پس منظر یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت سے بعض اسلام پسندوں نے یہ مطالبہ کیا کہ جب آپ اسلام ہی کے غلبہ و نفاذ کے دعوے کر رہے ہیں اور دستور میں بھی آپ نے یہ بات شامل کی ہے کہ کوئی قانون قرآن کے خلاف نہیں بنایا جائے گا تو مناسب ہے کہ حکومت کا رسمی نام بھی اسلامی جمہوریہ رکھئے۔

اس مطالبہ کو پاکستانی گورنمنٹ نے نہیں مانا اور ماننا بھی نہ چاہئے تھا۔ جن لوگوں کے اسلام کا جغرافیہ یہ ہو کہ وہ حدیثِ رسول اور سنت کو دین میں کوئی مقام ہی نہ دیتے ہوں اور اسلامی مسائل پر فیصلے دینے کا حق ان کی نگاہ میں درسگاہِ مغرب کے شاگردوں کو حاصل ہو وہ بین الاقوامی دنیا میں "اسلامیت" کی ذلت کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔

لیکن مولانا موصوف کو بھی اسلام پسندوں کا مطالبہ سخت ناگوار گذرا ہے اور اسی کے پس منظر میں وہ "اسلامی" کے لفظ پر طنزاً کامے لگا کر "لیبل" جیسے الفاظ سے اس کی تحقیر کر رہے ہیں۔

ہماری ذاتی رائے کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں یہ بات بہتر ہی معلوم ہوتی ہے کہ پاکستانی گورنمنٹ نے اپنا نام "اسلامی" نہیں رکھا۔ ایک ایسی گورنمنٹ جو قرآنی اسلام کے نام پر مغربی کارگہِ فکر میں ڈھلا ہوا اسلام رائج کرنے کے درپے ہو اگر اپنا نام اسلامی رکھ لے گی تو یہ اسلام کی اُس رسوائی میں اضافے کا باعث ہوگا جو شاگردانِ مغرب کی اب تک کی گل افشانیوں اور بے کرداریوں سے اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ خیر ہی گذری کہ نام اسلامی نہیں رکھا گیا۔ اب اگر وہاں صدر جمہوریہ کا مسلمان ہی ہونا قانوناً ضروری قرار دیدیا گیا ہے تو اس کا اسلامی اصول سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو قوم پرستی کا شاخسانہ ہے۔ قوم پرستی چاہے کافروں کی ہو، یا مسلمانوں کی، اسلام اس سے کلّی طور پر بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ مولانا نے نام رکھنے کی مخالفت اس نقطۂ نظر سے نہیں کی بلکہ وہ بصریح طور پر یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ کسی بھی ملک میں مسلمان اکثریت اگر واقعۃً ایسی حکومت

قائم کرے جس کا مقصد قرآن والے اسلام کو ایمانداری کے ساتھ نافذ کرنا ہو تب بھی اس کا نام اسلامی حکومت رکھنا سخت غلط ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہمیں اختلاف ہے اور ہم اس پر افہام و تفہیم کی خواہش رکھتے ہیں۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو اور اعلان بھی وہ یہی کر رہے ہوں کہ ہم اسلام کو غالب و نافذ کرنے کا عزم کر چکے ہیں ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی حکومت کا رسمی نام بھی حکومتِ اسلامی ہی رکھیں گے ایسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان زن و شوہر سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنے ہونے والے بچے کا نام عبدالرحمٰن یا فخرالدین ہی رکھیں گے موہن سنگھ یا جارج برنارڈ شا نہیں رکھیں گے۔ سادہ سی حقیقت ہے کہ ہندو اپنے بچے کا نام بدری پرشاد رکھتا ہے قطب الدین نہیں رکھتا۔ عیسائی اپنی بچی کا نام روزی رکھتا ہے عائشہ یا فاطمہ نہیں رکھتا تو پھر آخر اسی مطالبہ میں دنیا بھر کے کیڑے کیوں پڑ گئے کہ جو حکومت اسلامی قوانین کے نفاذ کا قصد کر رہی ہو وہ کم سے کم نام تو اپنا "اسلامی حکومت" رکھ لے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ فقط نام جادو کی چھڑی ثابت نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ایک مسلمان گھرانہ اگر نومولود کا نام فخرالاسلام یا محمد شمیم رکھتا ہے تو کسی نے آج تک اس پر اعتراض نہیں کیا۔

مولانا نے نام رکھنے کی مخالفت میں متعدد دلائل پیش کئے ہیں پہلی دلیل یہ ہے :۔

"پورے قرآن کو پڑھ جائیے اس میں کہیں یہ حکم نہیں کہ مسلمان ایسی حکومت قائم کریں جس پر "اسلامی" کا لیبل لگا ہوا ہو بلکہ جو دعوت ہے وہ ایمان و عمل صالح کی ہے۔"

یہ کیا واقعی دلیل ہے؟ — اگر ہے تو پھر یہ عجیب و غریب کام دے سکتی ہے۔ مثلاً کچھ مسلمانوں نے تبلیغ اور تذکیر کے مقاصد سے ایک انجمن بنائی مگر نام رکھ دیا "جگت موہن منڈل" اب ایک مسلمان کہتا ہے کہ بھائی مقصد تو تم نے تبلیغ دین لیا مگر نام رکھا غیر اسلامی۔ تو ٹھیک یہی دلیل جو مولانا نے دی ہے انجمن سازوں کی بھی پشت پناہی کر سکتی ہے۔ علیٰ ہذا مسلمان اپنی بچی کا نام اوشا کرن یا پاربتی رکھ لے تب بھی یہ دلیل اس کی مدد کرے گی بتائیے قرآن میں کس جگہ یہ لکھا ہے کہ جب تم نیک مقاصد کیلئے جماعتیں بناؤ تو ان کا نام بھی اسلامی رکھو یا جب تمہارے بچہ پیدا ہو تو اسے اسلامی ہی نام سے موسوم کرو۔

حیرت ہے مولانا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس معلوم و معروف سنت پر توجہ نہیں دی کہ جب کوئی کافر اسلام لاتا تھا تو آپ اس کا غیر اسلامی نام بدل کر اسلامی نام رکھ دیا کرتے تھے اس سنت کے رد میں بھی وہ سب دلیلیں استعمال ہو سکتی ہیں جو اسلامی حکومت کے نام کے رد میں دی گئی ہیں۔

ایک اور خرابی اس دلیل میں یہ ہے کہ مولانا حکومتِ راشدہ کے قیام کو عملِ صالح کے دائرے سے باہر خیال فرماتے ہیں، حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے — اور خود انھیں بھی اس کا علم ہے کہ ایک صالح اور اسلام دوست حکمراں کے درجات اللہ کے یہاں بہت بلند ہیں۔ زمین پر اللہ کے قانون کا نفاذ اور اسلام کی مدد کرنا وہ عظیم عمل صالح ہے کہ انفرادی عبادتیں تو اس کے سامنے بہت ہی محدود افادیت رکھتی ہیں۔

دوسری دلیل مولانا نے یہ دی ہے :۔

"اسلام حقائق کا مذہب ہے اس کی نگاہ اصل مقصد پر رہتی ہے اور وہ کبھی عنوان پرستی کا قائل نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو صلح حدیبیہ کے موقع پر جبکہ صلح نامہ لکھا جا رہا تھا نمائندہ قریش کے کہنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو حکم نہ دیتے کہ سرِ صلحنامہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے عربوں کے قدیم طریقے کے مطابق بسم اللہ اللھم لکھیں۔"

اگر امتیازی نام رکھنا "عنوان پرستی" ہے تو یہ اعتراض سب سے پہلے نعوذ باللہ من ذلک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وارد ہوتا ہے جن کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ اسلام لانے والے کا غیر اسلامی نام ایک منٹ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

نیز تمام دنیا ہی عنوان پرست ٹھیری کہ ہر والدین اپنے بچے کا نام ایسا ہی امتیازی رکھتے ہیں جو فوراً واضح کر دے کہ وہ کس قوم کا فرد ہے۔

سخت حیرت ہے کہ اسلام کو مولانا حقائق پسند بھی کہہ رہے ہیں اور جو طریق کار حقیقت پسندی کی بسم اللہ ہے اسی پر پردے بھی کر رہے ہیں۔ یہ تو پہلے سرے کی منافقت ہے کہ نام ایسا رکھو جس سے موسوم کی اصل حقیقت کا پتہ ہی نہ چلے یا کم سے کم وہ مشتبہ ہو جائے۔ یہ منافقت دورِ حاضر کے ذہن کو زیب دیتی ہے کہ نام رکھ دیا سیکولرازم اور دعویٰ کر دیا کہ ہر شہری کے حقوق برابر ہیں مگر عملاً اقلیتوں کو پیس کے رکھ دیا لیکن اسلام اس سے بالاتر ہے۔ وہ سب سے زیادہ منافقت اور دورنگی کا دشمن ہے۔ اس کا تو بنیادی اعلان ہی یہ ہے کہ اسلام لانے کے لئے تصدیق بالجنان کافی نہیں اعتراف باللسان بھی ضروری ہے۔ مولانا اسے عنوان پرستی کہیں تو کہیں ہم اور ساری امتِ مسلمہ اسے حقیقت پسندی کا نام دیتی ہے۔ اسلام کا طرۂ امتیاز صاف گوئی ہے۔ ظاہر و باطن کی مکمل ہم آہنگی ہے۔ وہ شخص مقصد کی راہ میں کے قدم چل سکے گا جو یہ بھی پسند نہ کرے کہ اس مقصد کی طرف اشارہ کرنے والا نام تک اس کی زبان پر آئے

صلح حدیبیہ کی تمثیل مولانا کا ساتھ نہیں دیتی۔ حضور نے بسم اللہ کاٹ کر کوئی غیر اسلامی فقرہ نہیں لکھوایا تھا۔ جس طرح عبدالقدوس ایک اسلامی نام ہے اسی طرح رشید الدین یا عبدالرحمٰن بھی اسلامی نام ہیں۔ یہ لفظی فرق اس بات کی دلیل نہیں کہ مسلمان کا نام کرتار سنگھ یا بائرن رکھ دینا درست ہو گا۔ ایسے ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور بسم اللہ اللھم کا معاملہ ہے کہ معمولی سے لفظی فرق کے باوجود دونوں ایک ہی معنوی نوعیت رکھتے ہیں بسم اللہ اللھم کو کفر چھو کر نہیں گیا یہ الفاظ بھی اسی خدا پرستانہ طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کر رہی تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اسلامی حکومت کے قیام و انصرام کا عزم رکھنے والے اپنی حکومت کا ایسا نام رکھ لیا کریں جو غیر اسلامی طرزِ فکر کا نمائندہ ہو۔

غور کی جا ہے۔ "اسلامی نظام" کے علاوہ کوئی نظامِ حکومت ایسا نہیں ہے جس میں اصولی اعتبار سے اللہ کو قانون ساز اور آمر و حاکم مانا گیا ہو۔ طرزِ حکومت کی بحث نہیں۔ طرزِ حکومت کے اعتبار سے آپ کسی حکومت کو ریپبلکن کہیں یا سیکولر اسٹیٹ یا وفاقی حکومت یا جو چاہے نام دیں۔ جب تک اسلام کا عنوان نہیں دیا جائے گا لازماً یہی تصور قائم ہو گا کہ اس حکومت میں قانون سازی کا تمام تر اختیار انسانوں ہی کو ہے۔ اس اختیار کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی فعل و عقیدے کے جائز و ناجائز اور حرام و حلال ہونے کے بارے میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہو گا انسان ہی شارع و مقنن مانے جائیں گے۔ یہ اصولی اعتبار سے خالص کافرانہ نظریہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان حکومت دعویٰ کر رہی ہے کہ ہم اسلام کو نافذ و غالب کریں گے تو لازماً اسے اپنا نام بھی اسی طرح اسلامی رکھنا چاہئے۔ جس طرح آپ نے جمعیۃ العلماء کا نام جمعیۃ العلماء رکھا دھوان منڈل یا پرجا پریشد نہیں رکھا اور جس طرح ہر مسلمان اپنے بچے کا نام اسلامی ہی رکھتا ہے۔ ہندوانہ یا یہودیانہ نہیں رکھتا۔ اگر وہ حکومت اس نام سے گریز کر کے دوسرا کوئی بھی نام رکھتی ہے تو دو ہی باتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہ اسلام کا دعویٰ محض سیاستاً کر رہی ہے اور فی الاصل اسلامی قوانین کے ایماندارانہ نفاذ کی نیت نہیں رکھتی۔ یا پھر وہ منافق اور فریب کار ہے کہ ارادہ تو رکھتی ہے ایک خاص مذہب اور ایک خاص کلچر کے غالب و متسلط کرنے کا لیکن نام سے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی صورتیں اسلام کے نزدیک حرام ہیں۔ آج فریب و دغا کی سیاست اور غیر اخلاقی ڈپلومیسی چاہے کتنی ہی جائز بلکہ قابلِ تعریف سمجھ لی گئی ہوں، لیکن اسلام کی نظر میں یہ جوں کی توں ناپاک ہیں۔ وہ دھوکے بازی، ریاکاری، منافقت اور گندم نما جو فروشی کو نہ پہلے مباح رکھتا تھا نہ قیامت تک مباح رکھے گا۔

مگر مولانا کی اسلام دوستی پر حیرت ہے کہ وہ مسلمان اکثریت کے ملکوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کو ساتھ ملا کر قومی حکومت قائم کریں اور اس کو سیکولر قرار دیں۔ پھر ٹھیک اسی طرح اسلامی اغراض و مقاصد کی تکمیل کریں جس طرح ہندوستان کی سیکولر حکومت ہندو کلچر اور ہندو تہذیب کو غالب و متسلط کر کے اپنے مقصد کی تکمیل کر رہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اپنی بات کو زوردار بنانے کے لئے انھوں نے ارشاد فرمایا ہے۔

"اسی طرح ہند کی حکومت سیکولر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اگر وہ ہندو گورنمنٹ ہوتی تو جہاں تک ہندو مذہب ہندو کلچر اور ہندو تہذیب کے فروغ و ترقی کا تعلق ہے وہ

اور کیا کرتی۔"

یہ ارشاد فرماتے ہوئے انھوں نے یہ مستحضر نہیں رکھا کہ اس سے تو انھوں نے خود ہی اپنے اس استدلال کی عمارت ڈھادی جسے پہلے اداریئے میں شد و مد سے پیش فرمایا تھا۔ انھوں نے یہی تو کہا تھا کہ اگر کوئی مسلم اکثریت والا ملک اپنے یہاں "اسلامی حکومت" بنائے گا تو غیر مسلم اکثریت والے ملک انتقاماً اپنے یہاں اپنی مذہبی حکومتیں قائم کریں گے۔

اس استدلال کی کمزوری ہم پچھلے جائزے میں واضح کر چکے ہیں۔ ہم نے بھی تو یہی کہا تھا کہ سیکولرازم والوں کو بھلا اس کھٹراگ کی کیا ضرورت پڑے گی کہ انتقام کی خاطر مذہبی حکومت بناتے پھریں جبکہ انھیں سیکولرازم کی پارس پتھری ایسی ہاتھ آگئی ہے کہ اس کی آڑ لیکر وہ سب کچھ وہی کر سکتے ہیں جو کسی تنگدل مذہبی حکومت میں کرنا ممکن ہے۔ اسی حقیقت کو مولانا صاف طور پر تسلیم کر رہے ہیں۔

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اصل گفتگو یہاں اس پر ہے کہ ایک طرف تو مولانا مسلمانوں کے لئے سیکولرازم ہی والی راہ منافقت تجویز فرما رہے ہیں دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر سیکولرازم قائم کرنے والے مسلمان۔

"فکر و عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان ہوں۔"

تو اس راہ سے بھی اسلامی اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

یہ سادہ فکری نہیں تو کہنا چاہئے کہ اتنی بلند فکری ہے جس تک ہمارا شہپر فہم نہیں پہنچ سکا۔ ہمارے علم کی حد تک تو قومی حکومت اور سیکولرازم اسی کا نام ہے کہ حکومت مذاہب کے بارے میں قطعاً غیر جانب دار رہے گی اور مذہب کی بنیادوں پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔ یہی تصریح ہمارے ہندوستانی دستور میں موجود ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی حکمراں اگر ہندو معاشرت اور مذہب کو فروغ و ترقی دینے کے لئے وہ تمام کوششیں صرف کر رہے ہیں جن سے زیادہ کا تصور تک مولانا نہیں کر سکتے اور دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کو حتی الوسع کچلا جا رہا ہے یہانتک کہ مسلمان تمام اجتماعی شعبوں میں مفلوج بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں تو یہ دستور کی وفاداری نہیں اس سے غدّاری ہے۔ قوم پرستی نہیں تعصب ہے۔ فراست نہیں منافقت ہے۔ عدل نہیں ظلم ہے۔ مسلمان اکثریت والے ممالک کی مسلم حکومتوں کو اس پست اور گھناؤنے طرز حکومت و سیاست سے پرہیز کرنے کی تلقین کرنی چاہیئے نہ یہ کہ اسے اسوۂ حسنہ قرار دے کر اس کی تقلید کا سبق دیا جائے۔ پھر جو مسلمان اس ظالمانہ منافقت پر بخوشی آمادہ ہو جائیں ان کے بارے میں یہ حسین توقع بھی کرنا کہ "وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان ہوں۔" ایسی ہی معصومانہ توقع ہے جیسے ایک مسلمان کو شراب نوشی اور لوٹ مار کا درس دیتے ہوئے یہ امید باندھی جائے کہ وہ زاہد و متقی بھی ہو۔ غالباً مولانا نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ اسلام میں مقاصد ہی کی اہمیت نہیں ذرائع کی بھی انتہائی اہمیت ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ اہم مقاصد کے لئے بھی حرام وسائل و ذرائع اختیار کرنے کو اسلام مباح نہیں سمجھتا۔ لہٰذا اگر ایسی ہی فریب کاری اور منافقت کے ذریعے کسی جگہ اسلامی قوانین کا نفاذ ہو گا جیسی ہندو تہذیب و کلچر کے تسلط میں سیکولرازم برت رہا ہے تو اس کا نام اسلامی اغراض و مقاصد کی تکمیل نہیں رکھا جائے گا بلکہ یہ اسلام کو رسوا اور خدا کو ناراض کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

یا تو یہ طے کر دیا جائے کہ سیکولرازم کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیتوں کے تہذیب و کلچر کی ہڈیوں پر اپنے کلچر اور مذہب کا محل تعمیر کرے تب تو بے شک مولانا کا مشورہ قابل غور ہو سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں دغا بازی اور منافقت کا الزام نہیں آئے گا۔

لیکن اگر سیکولرازم کے وہی خوبصورت معنی ہیں جن سے کسی بھی اقلیت کو تعرض نہیں ہے یعنی تمام مذاہب کے ساتھ یکساں منصفانہ سلوک۔ مذہبی استبداد سے اجتناب اور مذہبی بنیادوں پر کسی بھی شہری سے امتیازی طرز عمل نہ برتنا تو پھر اس طریق کار کو ظلم و تعصب کے سوا کیا کہیں گے جو ہماری سیکولر حکومت نے اختیار کر رکھا ہے۔

تمام مسلمان جن میں مولانا بھی شریک ہیں حکومت کے اس طریق کار کو غیر منصفانہ اور خلافِ دستور ہی قرار دیتے ہیں

کیا اسلام دوستی اور عدل پسندی اسی کا نام ہے کہ اسی ظلم و جور کی ترغیب مسلمان اکثریت والے ملکوں کو بھی دی جائے۔ کیا اسلام نے یہ جائز رکھا ہے کہ اگر ایک ملک میں غیر مسلم حکمراں مسلمانوں کے ساتھ فریب و منافقت کا سنگدلانہ طریق اختیار کئے ہوئے ہیں تو دوسرے مسلمان اکثریت والے ممالک کے مسلمانوں کو بھی ایسا ہی پست طریق اختیار کر لینا چاہئے۔ حاشا ثم حاشا۔ دنیا کسی بھی معراجِ ظلمت کو پہنچ جائے۔ اسلام کبھی اپنی اعلیٰ قدر اور اخلاق کو گھٹیا قدروں میں نہیں بدلے گا۔ وہ دغا اور مکر و تزویر سے بالاتر ہے۔ بالاتر رہے گا کیونکہ وہ خدا اور رسول کا نازل فرمودہ ہے جو کبھی ناپاک قدروں کو پسند نہیں کرتے۔

ہم قرآن و سنت کی بنیاد پر بانگِ دہل کہتے ہیں کہ ہندوستان یا ایران طوران کہیں بھی کوئی غیر مسلم حکومت مسلمانوں کے ساتھ چاہے کیسا ہی دجل و فریب کیوں نہ کرے یہاں تک کہ ان کی مذہبی آزادی تک پر پابندیاں عائد کر دے لیکن پاکستان یا کسی بھی مسلمان حکومت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے یہاں کی اقلیتوں سے اس بدسلوکی کا انتقام لے اور انھیں ان حقوق سے محروم کر دے جو اسلام نے انھیں عطا کئے ہیں۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ مولانا نے یہ مشورہ اسلام کو نظرانداز کر کے دیا ہے کہ مسلمان اکثریت والے ممالک ہندوستان کی طرح قومی حکومت بنائیں، سیکولرازم کا بورڈ لٹکائیں اور پھر اپنے مذہب کو غالب و نافذ کرنے کے لئے بے کردار ہی منافقت کا وہی کھیل کھیلیں جو ہندوستان میں کھیلا جا رہا ہے۔

"نام" کے سلسلہ میں مولانا نے صلح حدیبیہ کی جو تمثیل پیش فرمائی تھی اس کا شافی جواب اگرچہ ہو چکا، لیکن ایک بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ کسی اہم معاہدے کے وقت فریق ثانی کی کوئی ایسی ضد وقتی طور پر مان لینا جو اپنے بنیادی عقائد کی تنسیخ نہ کرتی ہو بالکل الگ بات ہے اور بلا کسی وجہِ معقول کے اسلامی حکومت کے نام سے گریز کرنا بالکل دوسری بات۔ جب ارباب حکومت واقعۃً اسلام کو نافذ و غالب کرنے کا عزم رکھتے ہوں اور اپنی حکومت کا کوئی نام رکھنے میں کسی معاہدے کے ہونے نہونے اور کسی اہم کام کے رکنے نہ رکنے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلامی صداقت پسندی کے نقطۂ نظر سے ان کے لئے کسی ایسے نام کا کیا جواز ہو سکتا ہے جو ان کے عزائم کے بارے میں دوسروں کو مبتلائے فریب کر سکتا ہو۔

مولانا نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ اسلامی حکومت کی کوئی شکل متعین نہیں ہے لادینی حکومت کے سوا حکومت کی جتنی بھی شکلیں ہو سکتی ہیں وہ اسلامی حکومت کی بھی ہو سکتی ہیں۔ اس دعوے کو مدلل کرنے کے لئے مولانا نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی یہ تحقیق بھی پیش کی ہے کہ:۔

> "مدینہ ایک متحدہ ریاست تھی جس میں مسلمانوں، یہودیوں، غیر اہل کتاب عربوں اور عیسائیوں سے آباد خود مختار دیہات شریک تھے۔ اس اسٹیٹ کی اصل ساخت ہی مذہبی رواداری کی متقاضی تھی، چنانچہ اس اسٹیٹ کے لئے جو دستور مرتب کیا گیا تھا اس میں رسمی طور پر بھی اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔"

ہم عرض کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہدفِ اعتراض بنانے کی خاطر یہ تمہید اٹھائی گئی ہے وہ خود بھی یہی کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت ڈھانچے، خدوخال اور طرز و انداز کے اعتبار سے مختلف شکلوں کی ہو سکتی ہے۔ ان کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوا کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے خلافتِ راشدہ ہی کو جوں کا توں بیسویں صدی میں لاکر رکھ دینا ہوگا ان کا موقف یہ ہے کہ حکومت کے اسلامی ہونے اور نہ ہونے کا انحصار انتظامی ڈھانچوں اور شکل و ہئیت کی رنگا رنگیوں پر نہیں بنیادی اصول و عقائد پر ہے۔ حکمراں طبقہ اصولاً یہ تسلیم کر لے کہ زمین کا مالک اللہ ہے، وہی قانون ساز بھی ہے۔ شارع بھی ہے۔ اس نے جو احکام انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے نازل فرمائے ہیں وہ اٹل ہیں۔ اس کے رسول نے قرآن کی جو تشریحیں کی ہیں وہ عینِ قرآن ہیں اور اسٹیٹ کسی ایسے قانون کے بنانے کا اختیار نہیں رکھتی جس سے قرآن و سنت کے

صریح وقطعی اقدار و تصورات پر زد پڑتی ہو۔ یہ بنیادی عقیدہ تسلیم کرلیا جائے تو حکومت کا اسلامی ہونا طے پا گیا۔ اب یہ حالاتِ زمانہ اور وقتی مصالح کی بات ہے کہ اس اصول اور اس کے تقاضوں کو جاری وساری کرنے کا اہتمام وفاقی طرزِ حکومت سے کیا جائے یا صدارتی طرز سے۔ یا کسی اور اسلوب سے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس صاف وسادہ معاملہ میں بھی مولانا کا ذہن ایک چونکا دینے والا موڑ لے رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

"اسلام کا قانون عدل کسی خاص ملک اور قوم کی میراث نہیں ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک اسے اپنا سکتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے ہندوستان کی حکومت کے لئے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کی حکومت کے طرز پر ہو۔"

اس کے بعد وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی سیکولر حکومت بھی اگر اسلام کا قانونِ عدل اپنے یہاں نافذ کر دے تو وہ اسلامی حکومت ہے !

جہاں تک الفاظ اور سیاق وسباق سے ہم سمجھ سکے ہیں مولانا اس کے سوا کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ کسی حکومت کو "اسلامی حکومت" ماننے کے لئے یہ دیکھنا ضروری نہیں ہے کہ اس کے دستور میں خدا اور رسولؐ کی مکمل بالادستی اور اسلام کے تمام اوامر و نواہی پر ایمان کو لازم قرار دیا گیا ہے، بلکہ صرف اتنی ہی بات اسے اسلامی بنا دیتی ہے کہ اس میں اسلام کا قانونِ عدل ـــ پورا اسلام نہیں، صرف اسلامی قانونِ عدل نافذ کر دیا گیا ہو چاہے حکمراں طبقہ مومن ہو یا کافر۔ آپ نے دیکھا مولانا گاندھی جی کی آرزو کا حوالہ دے رہے ہیں۔ اس کا منشا صریح طور پر یہ ہے کہ اگر ہماری سیکولر حکومت گاندھی جی کی خواہش کے مطابق حکومتِ فاروقی کے وہ ظاہری خدوخال اپنے یہاں نمایاں کر لیتی جو گاندھی جی کو پسند تھے تو مولانا کی رائے میں اس حکومت کو بھی بلا تکلف "اسلامی حکومت" کہا جا سکتا تھا۔

یہ نقطۂ نظر بے شک ایسا ہے کہ اس کے سہارے مولانا ایک مولانا مودودی ہی کو نہیں امت کے تمام ائمہ وفقہاء کو بھی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتے ہیں کیونکہ ان سب کا نقطۂ نظر یہی رہا ہے کہ جس طرح قرآن کی صرف ایک آیت کا منکر اور اللہ و رسولؐ کے صرف ایک حکم کو ناقابلِ تسلیم قرار دینے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے چاہے وہ باقی قرآن کو سینے سے لگائے لگائے پھرے اسی طرح اسلامی حکومت صرف وہی ہو سکتی ہے جس کے چلانے والے صرف قانونِ عدل ـــ صرف قانونِ معیشت ـــ صرف چند شعبہ ہائے زندگی میں نہیں بلکہ تمام اقسام کے قوانین اور ہر شعبہ زندگی میں خدا اور رسول کی بالادستی کو تسلیم کریں اور ایمان رکھیں کہ برا وہ ہے جسے اسلام نے برا کہا اور اچھا وہ ہے جسے اسلام نے اچھا کہا۔ اہلِ کفر کے اقتدار پر مشتمل حکومت اگر محض اس لئے اسلام کا کوئی ایک یا چند قوانین اپنی فہرستِ آئین میں شامل کر لیتی ہے کہ یہ اس کی نظر میں دنیاوی اعتبار سے مفید ہیں تو اسے "اسلامی حکومت" قرار دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

رہا جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق انیق کا معاملہ تو اگرچہ اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے وہ مدعا ہرگز حاصل نہیں ہوتا جو مولانا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغازِ اسلام میں جب اقتدار کے تمام وسائل اسلام کے ہاتھ میں نہیں آئے تھے۔ اللہ کے رسول نے ایک ایسا آئینی ڈھانچہ قبول کر لیا تھا جس میں غیر مسلموں کی بھی شرکت تھی ـــ یہ قبول کرنا اس لئے تھا کہ اسلام اس وقت گھٹنیوں چل رہا تھا۔ مسلمانوں کے اختیار و قدرت میں یہ بات نہیں تھی کہ خود مختار دیہاتوں اور خیرہ سر قبیلوں کو نظرانداز کر کے خالص اپنی حکومت بنالیں۔ لہٰذا جو کچھ اس وقت کیا گیا وہ اُن امور میں شامل نہیں ہے جنھیں اسلام اسوۂ حسنہ کے ذیل میں لائقِ تقلید قرار دیتا ہو پھر غور کرنے کی جا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق سے یہ کہاں ثابت ہو رہا ہے کہ حضورؐ نے کلیدی مناصب بھی غیر مسلمین کے سپرد کر دئیے تھے۔ نفسِ شرکت اور بات ہے۔ ہم خود اس کے قائل ہیں کہ مسلمان اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت بنائیں تو وہاں کی اقلیتوں کو بھی ان کے تناسب کے اعتبار سے جائز نمائندگی ضرور دینی چاہئے یہ ہرگز درست نہیں ہے کہ انھیں اچھوت قرار دے کر حکومت و اقتدار کے ایوان سے بالکل ہی خارج کر کے رکھ دیا جائے۔ یہ ظلم

ہوگا۔ مگر سوال تو صرف کلیدی مناصب کا ہے۔ صدارتِ عظمیٰ اور وزارت جیسے مناصب کا۔ کیا مذکورہ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس طرح کا کوئی منصبِ اعلیٰ غیر مسلمین کو تفویض کرنا پسند فرمالیا ہو۔

یہ گفتگو تو اس اعتبار سے تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کو مستدل بناکر بھی مولانا کا مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ دینی عقائد و تصورات کے لئے کیا اس طرح کی تحقیقات کو مستدل بنایا بھی جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ ایسا کرنا تقریباً اس کے مماثل ہے کہ ہم نماز اور روزے اور شراب نوشی وغیرہ کے معاملات میں اُن ابتدائی آیات و احادیث کو مستدل بنائیں جو ابتدائی دَور کی تھیں اور بعد میں دوسری آیات سے انھیں منسوخ کردیا گیا۔ ابتداءً تو نماز میں بول چال بھی جائز تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ لینا بھی جائز تھا روزے کے عوض فدیہ بھی دیا جاسکتا تھا۔ تھوڑا سا سود بھی لیا جاسکتا تھا۔ اوقات نماز کے علاوہ شراب بھی پی جاسکتی تھی۔ یہ سب قرآن و حدیث میں موجود ہے، تو کیا کسی مسلمان کے لئے جائز ہے کہ بعد کے واضح و ثابت احکام کو نظر انداز کر کے اِس ابتدائی صورتِ حال کو دلیل و نظیر بنائے۔

اگر نہیں — اور ہرگز نہیں تو یہ کیسے درست ہوگا کہ بالکل ابتدائی دَور کے بارے میں کسی محقق کی تحقیق کو مستدل بنایا جائے اور اس حقیقت پر بالکل توجہ نہ دی جائے کہ جب پورے اختیارات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آگئے اس وقت آپ نے کیا کیا اور پھر خلفائے راشدین کا طرز و اسلوب کیا رہا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ جس طرز حکومت کو "قومی" کے نام سے پیش کیا جارہا ہے اور ساتھ ساتھ اس کے سیکولر ہونے کو بھی بار بار دُہرایا جارہا ہے اس کا کوئی سوال ہی قرونِ اولیٰ میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسے نہیں معلوم کہ قرآن والے اسلام کا محور نہ قوم ہے نہ وطن، نہ حسب و نسب ہے نہ کوئی اور شے۔ وہ صرف اور صرف خدا پرستی پر گردش کرتا ہے اور اصول و عقائد اس کے نیل پائے ہیں۔ حضورؐ یا ان کے اصحابؓ کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ کلیدی مناصب ایسے لوگوں کے سپرد کردیں جو اسلام کے اصول و عقائد سے صریح طور پر منحرف ہوں جو اسلام کی کتابِ دستور — قرآن کو خدا کا کلام نہ مانتے ہوں اور جن کی نگاہ میں اساسی عقائد کی کوئی وقعت نہ ہو۔ مولانا اگر اسلامی مقاصد و اغراض کی تکمیل کا راستہ معروف معنوں میں "قومی" اور سیکولر حکومت بنانے کو خیال کرتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ کانگریسی اصول و عقائد کی تکمیل کا راستہ یہ تجویز کریں کہ وزیر و گورنر جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا میں سے بھی بنائے جانے چاہئیں۔ بلکہ یہ تعارض تو مولانا کے پسند فرمودہ تعارض سے ہلکا ہے۔ کانگریس اور جن سنگھ میں وہ بُعد نہیں جو اسلام اور کفر میں ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ حکومت کی بنیاد تو اس نظریہ پر ہو کہ اصل حاکم و مقنن اللہ اور رسول ہیں۔ ان کی دی ہوئی مستقل قدروں کو بدلا نہیں جاسکتا لیکن وزارت و صدارت ایسے لوگوں کو دیدی جائے جو اس بنیاد سے کھلم کھلا منحرف ہیں اور دستور کے لئے ان کے قلوب میں اس احترام کا شائبہ تک موجود نہ ہو جو اس دستور کو خدائی دستور ماننے کی صورت میں قدرۃً موجود ہونا چاہئے۔

ایک نکتہ کی طرف ہم مولانا کو اور توجہ دلائیں گے۔ انھوں نے کہا ہے کہ:-

> "حکومت کے معاملہ میں بھی اسلام کی نظر اصل مقصد پر ہے یعنی دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کا قیام اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی رفاہیت کا سر و سامان۔"

یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ اسلام کے اور موجودہ زمانے کے تصورِ انصاف میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوچکا ہے۔ اسلام کے نزدیک انصاف یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں آدھا ترکہ پانے کی حقدار ہے۔ مرد ایک سے زیادہ شادی کرسکتا ہے۔ وہ تمام تفریحات حرام ہیں جو معاشرے میں جنسی رجحانات اور شہوانی تصورات کو فروغ دینے کا ذریعہ بنیں۔ سودی کاروبار بدترین جرم ہے۔ شراب کسی قیمت پر

نہیں چل سکتی وغیرہ ذالک۔ مگر آج کے طرز فکر میں یہ سب باتیں ناانصافی اور تنگ نظری کے خانے میں رکھی جاتی ہیں یہاں تک کہ بے شمار مغرب زدہ مسلمان بھی اسی جدید طرز فکر کے حامل ہیں اور ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ کیا پاکستان اور کیا مصر ہر جگہ بے شمار ایسی آزادیوں اور روشن فکریوں کو مسلّمہ اقدار عدل میں شامل کر لیا گیا ہے جو اسلام کے نزدیک ظلم و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔

تو ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ بات کسی مسلمان حکومت کا قانونی نام ہی طے کر سکتا ہے کہ وہ کونسے تصور انصاف کے تحت عدل رانی کرے گی۔ اگر اس کا نام "اسلامی حکومت" ہے تب تو طے ہو گیا کہ وہ اسلام کے تصور عدل کی پابند ہے اور موجودہ دنیا کے لعن طعن کی پروا کئے بغیر اسلام ہی کے اقدار و عقائد پر ثابت قدم رہے گی۔ لیکن اگر وہ اس کے سوا کوئی اور نام رکھتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہو گا کہ معاشرے کو وہ اسی انصاف اور رواداری سے معمور کرے گی جسے انسان ساختہ پرداختہ قوانین نے انصاف اور رواداری قرار دیا ہے۔ اسلام کس شئے کو انصاف اور کسے رواداری کہتا ہے اس سے اسے کوئی مطلب نہیں ہو گا۔ اس کی اپنی صوابدید اور فکر و بصیرت فیصلہ کریں گے کہ عدل کیا ہے اور ظلم کیا۔ نیکی کیا ہے اور برائی کیا۔

مسائل کی حد تک بات ختم ہو گئی۔ مگر تازہ اداریئے کے دو جز اور ہیں جن پر ہمیں کچھ کہنا ہے۔ اس لئے کہنا ہے کہ ان میں اشتعال اور غیر معتدل جوش کی جو کیفیت نمایاں ہے وہ مولانا کے شایان شان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے ان میں حسن اخلاق کا آئینہ بھی غبار آلود محسوس ہوتا ہے۔

انھوں نے ایک ایسی رپورٹ سے جسے ۱۹۵۳ء میں پاکستانی حکومت کے ایک کمیشن نے مرتب کیا تھا جسٹس منیر کے ایک سوال کا جواب نقل کیا ہے۔ مجیب مولانا مودودی ہیں اور اس رپورٹ کی تصریح کے مطابق سید عطاء اللہ شاہ بخاری، میاں طفیل احمد، غازی سراج الدین اور دوسرے اصحاب نے بھی زور و قوت کے ساتھ تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ یہی جواب دیا ہے۔

اس پر مدیر برھان ریمارک دیتے ہیں:۔

"محسوس ہوتا ہے کہ چند مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ہے جس نے دماغی توازن کو برطرف کر کے رکھ دیا ہے اور جذب و سرمستی کے عالم میں جو اُس کے منھ میں آتا ہے کہے چلا جاتا ہے۔ وہ نہ اسلام سے آشنا ہے اور نہ زندگی کے موجودہ معاملات و مسائل سے باخبر!"

مطالب پر زبان کھولنے سے پہلے ہم مولانا سے ان کے الفاظ اور لب و لہجے کے بارے میں مؤدبانہ استفسار کریں گے کیا اس طرح کا ادّعا آمیز، متکبرانہ اور خود پرستی سے لبریز نہج انداز بردباری کے شایانِ شان ہے؟ کیا اس کا تنفر آمیز اور آمرانہ اسٹائل بالکل ایسا ہی نہیں ہے جیسا ابھی ہمارے وزیر خارجہ نے جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے سلسلہ میں پارلیمنٹ میں اختیار فرمایا تھا۔

ہم مانتے ہیں کہ مولانا بڑے عالم ہیں اور صاحبِ فہم و ذکا بھی، لیکن یہ ماننا تو ہمارے لئے سخت دشوار ہے کہ ان کے مقابلے میں وہ تمام معروف حضرات محض ناٹے اور بالشتیے ہیں جنھیں وہ اسلام اور مسائل زندگی سے جاہلِ محض قرار دے رہے ہیں۔

ان حضرات کی تردید علمی متانت کے ساتھ بھی کی جا سکتی تھی "ہم چو ما دیگرے نیست" کا نہج اختیار کر کے قلم سے جھاگ اُڑانا ہم جیسے چھوٹے آدمیوں کو زیب دے تو دے مگر مدیر برہان جیسے بڑے آدمیوں کو زیب نہیں دیتا۔

جس جواب پر یہ اظہار غیظ کیا گیا ہے وہ کس حد تک اتنی سخت خفگی کا مستحق ہے اس پر بھی ہم بحث کرتے لیکن یہ بحث اس لئے لاحاصل ہے کہ اس جواب کا دستاویزی ثبوت کچھ بھی نہیں مولانا نے عالم جوش میں ایک ایسی رپورٹ کو قرآن کا درجہ دے دیا ہے جو دین و دانش کی بارگاہ میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہوشمند لوگ انصاف فرمائیں پاکستان کی ایک پچھلی

حکومت نے اپنی ہی تھیلی کے چٹوں بٹوں کا ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں حکومت کس طرح کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ وہ لوگ جو صورت اور سیرت کسی بھی اعتبار سے اسلام دشمنی کے چلتے پھرتے اشتہار سے کم نہیں رہے۔ جو نام تو اسلام کا لیتے تھے لیکن زندگی کے ہر شعبے میں انھیں صرف وہ پسند تھا جسے مغرب نے پسند یدہ قرار دیا ہے۔ اسلام سے انھیں کد تھی۔ قرآن کے صریح احکام کو انھوں نے وحشیانہ کہا۔ حدیثِ رسول سے ان کی بیزاری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس ٹائپ کے نسلی مسلمان قرآن وسنت والے اسلام کی دشمنی اور بیخ کنی میں کفار سے بھی آگے رہے ہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو دنیا ابھی نہیں بھولی۔ مصر کے اخوانی شہداء کا لہو بھی ابھی ماند نہیں پڑا۔ یہ بھی کل ہی کی بات ہے کہ مولانا مودودی کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی تھی حالانکہ جس جرم پر یہ آخری سزا تجویز کی گئی وہ اتنا بھی تو نہیں تھا کہ کوئی کافر سے کافر حکومت اس پر دو چار سال قید ہی کی سزا دے سکے۔ مگر یہ مسلّمات میں سے ہے کہ قرآن وسنت والے اسلام کے داعیوں سے مغرب کے وفادار مسلمانوں کو ہمیشہ بدترین قسم کی عداوت رہی ہے۔ کوئی ناپاک سے ناپاک حربہ نہیں جو وہ ان کے خلاف استعمال نہ کرتے ہوں۔

اب تماشا دیکھئے کہ یہی مغرب کے وفادار اپنے ہی ٹائپ کے افراد کا ایک کمیشن مقرر کرتے ہیں اور وہ کمیشن پوری قوم کے اخلاقی زوال کا ایک ایسا نقشہ مرتب کرتا ہے جس میں سب سے بڑے مجرم علماء ہی قرار پاتے ہیں اور اس گروہ پر کسی بھی عیب کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جس کے افراد خود یہ کمیشن والے ہیں اور جس کی حکومت کے زیر سایہ مغربی تہذیب وتمدن کی ساری ناپاکیاں مسلمان معاشرے میں زہر پھیلا رہی ہیں۔

اسی رپورٹ میں دکھلایا گیا ہے کہ کمیشن کے صدر جناب جسٹس محمد منیر نے علماء سے ایک سوال کیا اور علماء نے اس کا یہ جواب دیا۔

اب جو شخص جوش میں بالکل ہی آپے سے باہر نہیں ہو جاتا اسے سوچنا چاہئے تھا کہ علماء کے بارے میں اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے کس قدر متعصب ومعاند ہیں۔ کسی بھی عقل و منطق سے اس رپورٹ کے کم سے کم وہ حصے تو قابل اعتماد ہرگز نہیں ہو سکتے جن میں علماء کو احمق، پاگل اور جاہل ثابت کرنے کی سعی مبارک کی گئی ہے۔ لیکن حیرت ہے مدیر برہان کی اس سادگی پر کہ وہ پہلے تو اس رپورٹ کی توصیف میں رطب اللسانی فرماتے ہیں پھر اس سے ایک اقتباس لیکر علماء پر برس پڑتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان کے نام نہاد فسادات کے سلسلے میں کسی جن سنگھی یا مہا سبھائی کمیشن کی رپورٹ کو صحیفۂ مقدس قرار دے کر مسلمانوں پر فرقہ واریت، سفاکی، فتنہ انگیزی اور جارحیت کے الزامات ثابت مان لئے جائیں۔ یا پھر مولانا اشرف علیؒ کو کافر ثابت کرنے کے لئے کسی بریلوی کمیشن کی رپورٹ کو بنیاد بنا لیا جائے۔

کیا تماشا ہے۔ مولانا مودودی کی سیکڑوں کتابیں بازار میں موجود ہیں جن میں انھوں نے صاف صاف اپنے افکار و عقائد کا اظہار کیا ہے۔ کسی کو مولانا مودودی ہی پر ترکش خالی ہی کرنے ہیں تو ان کتابوں سے اقتباسات لے کر کرے۔ یہ کیسا انصاف اور کیسی دانش مندی ہے کہ تبرّا کیلئے ایسے لوگوں کی مرتب کردہ رپورٹ کا سہارا لیا جائے جن کی علماء دشمنی اور قرآن وسنت والے اسلام سے بیزاری کا یہ عالم ہے کہ جب بھی انھیں موقع ملتا ہے بہانے تراش تراش کر داعیانِ حق کو دار پر لٹکا دیتے ہیں۔ جسٹس منیر اور کمیشن کے دیگر افراد عام اخلاق وکردار اور صلاحیتوں کے اعتبار سے کیسے ہی ہوں، لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اسی گروہ کے افراد تھے جو سنت کے نام سے چڑتا ہے، جو قرآن کی تفسیر ولایت سے لاتا ہے، جو ناچ گانے کو ثقافت کا نام دیتا ہے، جو مغربی طرزِ فکر کا بے دام غلام ہے اور جس کی نظر میں ہر وہ عالم گردن زدنی ہے جو اس کی اسلام دشمن سرگرمیوں پر نکیر کرے۔ سچ مچ ہمیں اس بات پر بڑا اچنبھا ہوا کہ علماء کو دیوانہ قرار دینے کے لئے مدیر برہان نے مذکورہ رپورٹ کا سہارا لیا ہے۔ حالانکہ مولانا مودودی میں کیڑے ڈالنے کے لئے تو تحریف وتلبیس کا وہ طریقہ

بھی بہ آسانی اختیار کیا جا سکتا تھا جو دیوبند اور بیرونِ دیوبند کے علماء اختیار کرتے رہے ہیں۔

فرمایا گیا ہے:۔

"غور کیجئے یہ ذہنیت جو آج دنیا میں اسلام اور مسلمانوں
کی رسوائی کا سب سے بڑا سبب ہے کس چیز کا نتیجہ ہے؟
اور غیر مسلم اکثریت کے ملکوں کے تیس کروڑ مسلمانوں کو
کفر و شرک کے ہاتھوں فروخت کر دینے کا حوصلہ کس نے
پیدا کیا؟ صرف مسلم اکثریت کے ملکوں میں "اسلامی
حکومت" قائم کرنے کے جذبے اختیار نے۔"

ایک بار ورق اُلٹ کر آپ مدیر برہان کے اُن ارشادات پھر دیکھ لیں جو ہم نے فروری ۱۹۶۱ء اور مئی ۱۹۵۷ء کے برہان سے نقل کئے ہیں۔ جس ذہنیت کو وہ کٹڑ پن کی حد تک سراہ چکے ہیں آج اسی کے بارے میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

یا اللہ! کیسے دانش مند آدمی اور کیسی بے مغز تحکیم!۔

— دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کا سب سے بڑا اور واضح ترین سبب ان کی بے عملی ہے۔ بے کرداری ہے۔ عقیدہ و عمل کی دو رنگی ہے۔ اپنے اُصول و عقائد کو چھوڑ کر کافروں کے فکر و نظر سے دل بستگی ہے — مگر مدیر برہان بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں کہ رسوائی کا سب سے بڑا سبب ان کی اسلام پسندانہ ذہنیت ہے۔

اور یہ حصہ تو بہت ہی لاجواب ہے کہ صرف مسلم اکثریت کے ملکوں میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے جذبے نے تیس کروڑ مسلمانوں کو کفر و شرک کے ہاتھوں فروخت کر دینے کا حوصلہ پیدا کیا — افسوس ہماری محدود عقل اس انکشاف کی وسعتوں کو نہیں پا سکی — کوئی ہے جو اس متن کی شرح کرے۔ — یا خود مولانا ہی زحمت فرمائیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ پاکستان میں ایک دن کے لئے بھی اسلامی حکومت نہیں بنی مگر ہم ہندی مسلمانوں کی ایک ایک چول ڈھیلی کر دی گئی ہے۔ کیا مولانا کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ مولانا مودودی اور چند اور علماء وہاں اسلامی حکومت کی خواہش کرتے رہے ہیں اس لئے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو یہاں کی اکثریت مزے چکھا رہی ہے۔ اگر مذکورہ حضرات یہ قیامت نہ ڈھاتے — یعنی اسلامی حکومت کا نام نہ لیتے تو ہندوستان مسلمانوں کے لئے بہشتِ بریں بن گیا ہوتا۔

نہیں۔ بخدا ہم مولانا کے ارشاد مذکور کا مطلب نہیں سمجھ سکے ہیں۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ شاید خود مولانا بھی مطلب کی پروا کئے بغیر صرف جوش کی رو میں قلم چلا گئے ہیں ورنہ پہیلیاں بجھانا ان کا کبھی شیوہ نہیں رہا۔

دوسرا جز اس لائق ہے کہ اسے جوں کا توں نقل کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو:۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مذکورہ بالا بیان میں یہ بھی کہا ہے "اور آج بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ سچ مچ معاملہ بھی یہی ہو رہا ہے"۔ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ چند برس بھی نہ ہوئے تھے کہ مولانا کا یہ کہا خود اُن کے سامنے آ گیا۔ ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ وہاں اسلامی حکومت میں جماعت اسلامی ممنوع اور غیر قانونی جماعت ہے۔ اس کے کارکن نظر بند ہیں۔ اُس کے فنڈ پر حکومت کا قبضہ ہے اور اس جماعت کا بانی اور صدر جو اسلام کا سب سے بڑا غازی اور مجاہد ہے اپنے ملک میں اپنے اور اپنی جماعت کے بنیادی شہری حقوق حاصل کرنے کے لئے جدّ و جہد کرنے کے بجائے نجد و حجاز کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے میں وقت گذارتا پھر رہا ہے، لیکن اس کے برخلاف یہاں سیکولر حکومت کے زیر سایہ جماعت اسلامی کو تحریر و تقریر، تبلیغ و اشاعت اور فعل و عمل کی مکمل آزادی حاصل ہے اور اس جماعت کی کانفرنسیں ہوتی ہیں تو مقامی میونسپل کمیٹیاں اُن کے ساتھ تعاون کر کے سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچاتی ہیں۔ جھوٹ کا یہی وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے بولتا ہے۔"

بیشک طنز و طعن کا بھی علم و ادب میں ایک مقام ہے لیکن اس کے کچھ فنی حدود بھی ہیں۔ اگر ان حدود کو پامال کر دیا جائے تو

طنز و طعن کی حیثیت محرّمی تبرّا سے زیادہ کچھ نہیں رہ
تی۔ ہمارا احساس یہ ہے کہ طعن و تشنیع کے میدان میں مولانا
اشہبِ قلم فن کے حدود پھلانگ گیا ہے۔

الف کہتا ہے فلاں مقام پر میرے بھائیوں کے ساتھ
سلوک کی جا رہی ہے۔ کچھ دن بعد الف کے اپنے شہر میں زلزلہ
تا ہے اور بہت سے اور گھروں کے ساتھ خود اس کا گھر بھی
جاتا ہے۔ اس پر جیم صاحب اُٹھ کر کہتے ہیں کہ دیکھا لوگو الف
اپنے بھائیوں کی مظلومیت کا رونا رو رہا تھا اس کا کہا منھ پر
یا اور خود اس کا مکان دھڑام سے گر گیا۔

انصاف سے کہئے جیم کے اس طعن کو مذاقِ سلیم اور
شرافتِ نفسی اخلاق اور دانش کے کس خانے میں رکھے گی؟۔

مولانا اکبر آبادی نے مولانا مودودی پر جو طعن کیا ہے وہ
بالعینہ اس تمثیل جیسا نہیں ہے۔

چند روز ہوئے تھے کہ یہی طعن وزیر داخلہ نے بھی
کیا تھا۔ کیسا نادر اتفاق ہے کہ یہی طعن اُس قلم پر بھی آگیا
جس سے اس کی سابق دلسوزیوں اور شعلہ نوائیوں کی روشنی
میں توقع کی جا سکتی تھی کہ اس لغو لاطائل طعن کا بھرپور جواب
دے گا۔ اس کی توجیہ اس کے سوا کیا کیجئے کہ جب کسی قوم کے
برے دن آجاتے ہیں تو اس کے اچھے خاصے فہیم و ذکی افراد
بھی فکر و بصیرت کے لحاظ سے دھواں دھواں ہو کر رہ
جاتے ہیں۔

پاکستان میں مارشل لا آیا۔ تمام سیاسی جماعتیں ممنوع قرار
دی گئیں۔ جماعت اسلامی چونکہ انتخابات میں حصہ لینے
کا اعلان کر چکی تھی۔ لہٰذا اس پر بھی سیاسی جماعت کا اطلاق
ہوا اور بعض کارکنوں کی نظر بندی سے لیکر فنڈ کی ضبطی تک
وہ سب کچھ ہوا جسے مولانا نے مولانا مودودی کے چہرے کا
داغ بنا کر پیش کیا ہے۔ کوئی بتاؤ اس صورت حال میں کونسا
پہلو ایسا ہے جو لال بہادر شاستری کی طرح مولانا اکبر آبادی
کے لئے بھی طعن و تضحیک کا موقع فراہم کرتا ہو —— ہم مانتے
ہیں کہ بیشک بعض بد دماغ عورتیں کسی غریب کی جوان اولاد
کی موت تک پر یہ کہنے سے نہیں چوکتیں کہ دیکھا اس نے فلاں

وقت مجھے ایسی بات کہی تھی مر گیا جوان بیٹا اور آیا اپنا کہا
اپنے ہی سامنے۔

لیکن یہاں تو اس اسوے کی تقلید کا بھی موقع نہیں نظر آتا۔
مولانا مودودی نے اگر کسی موقع پر یہ کہا بھی تھا کہ ہندوستان
میں مسلمانوں کے ساتھ سو دو روز جیسا سلوک کیا جا رہا ہے اور
ان کے شہری حقوق پامال ہو رہے ہیں تو یہ کوئی صریح جھوٹ
اور افتراء تو نہ تھا۔ آج کرسی کے غلاموں کے سوا مسلمانوں
کا کونسا حلقہ ایسا رہ گیا ہے جس نے اپنے جائز حقوق کی پامالی
کا رونا نہ رویا ہو۔ خود مولانا بھی جانتے اور مانتے رہے ہیں کہ
یہاں سو سے زیادہ فسادات ہو چکے ہیں جس میں مسلمانوں کی جانیں بھی
گئیں، آبرو اور دولت بھی لٹی۔ مگر نہ تو قاتل اور لٹیرے کیفر کردار
کو پہنچے نہ مسلمانوں کو ان کے نقصانات کا کوئی بدل دیا گیا۔
اُلٹا انھیں مجرم ٹھیرایا گیا اور آج بھی وہی فرقہ پرست
قرار دیئے جاتے ہیں۔ اُردو جو مسلمانوں کی شہ رگ ہے اسے جس
کھنڈی چھری سے بالقسط ذبح کیا جا رہا ہے اسکی کسک کون
مسلمان محسوس نہیں کر رہا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے
کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اقتصادی میدانوں میں ان کیلئے روڑے ہی
روڑے ہیں۔ اچھوتوں کی فلاح و بہبود پر تو حکومت کروڑوں
خرچ کرتی ہے لیکن مسلمانوں کے لئے اس کی فراخ دلی کا حدود
اربعہ یہ ہے کہ لے دے کے ایک اُردو یونیورسٹی تھی اسے بھی
بالجبر ختم کر دیا گیا۔ گویا مسلمانوں سے اچھوت بہتر۔

مختصر یہ کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے معاملے میں اکثریت
کی تنگدلی تو ایسی حقیقت ہے جو جمعیۃ العلماء جیسی قوم پرست
اور کانگریس نواز جماعت تک کے اخبار میں ہر روز پڑھی جا سکتی
ہے۔ پھر کونسا جرم تھا جو مولانا مودودی سے سرزد ہوا ——
زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی کے الفاظ
صورتِ حال کو اس سے زیادہ بھیانک کر کے دکھاتے ہیں جیسی
وہ ہے، لیکن یہ تو ایسا جرم نہیں تھا کہ کوئی شخص پاکستانی
مارشل لا کو اس جرم کا وبال ثابت کرنے لگ جاتا۔ جب فسادات
کے بارے میں آپ ہی کی جمعیۃ العلماء اور امارتِ شرعیہ وغیرہ
کی رپورٹیں کوئی دور افتادہ شخص پڑھے گا اور پھر آپ ہی کی

تحریروں میں حکومت کی نوع بہ نوع زیادتیوں کی دہائی دیکھے گا تو آخر وہ اس کے سوا کیا کہے گا جو مولانا مودودی نے کہا۔

ہوسکتا ہے وطن پرست مسلمانوں کو آج قرآن کے ارشاد[1] اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ سے اختلاف ہوچکا ہو، لیکن مولٰنا مودودی جیسے لوگ ـــــ جن کی زندگی کا معروف و معیّن نصب العین صرف قرآن و سنت کے سوا کوئی نہیں یقیناً آج بھی اسی ارشادِ باری پر ایمان رکھتے ہوئے ساری دنیا کے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ ایک بھائی دور بیٹھا بیٹھا اگر اپنے بھائیوں اور بہنوں کی دردناک مصیبتوں کا وہ حال پڑھے گا جو جمعیۃ العلماء اور امارتِ شرعیہ کی رپورٹیں اور ہندوستان کے مسلم پریس کا بڑا حصہ آئے دن پیش کرتا رہتا ہے تو بالکل فطری بات ہے کہ اس کا ذہن صدمے سے متأثر ہوگا اور وفورِ جذبات میں اس کے منھ سے بعض ایسے الفاظ بھی نکل جائیں گے جنھیں قدرے مبالغہ آمیز کہا جاسکتا ہو ـــــ اگرچہ مولانا مودودی کی طرف جو الفاظ منیر کمیشن کی رپورٹ کے حوالے سے منسوب کئے گئے ہیں ان کا اعتبار ہرگز نہیں ہے، لیکن چلئے مانے لیتے ہیں مولانا مودودی نے ہندوستانی مسلمانوں کے حالِ زار پر بَین کرنے میں آواز قدرے زیادہ بلند کردی تو پھر بھی یہ جرم ایسا نہیں مانا جاسکتا کہ مولٰنا اکبرآبادی بھی اس پر طنز و طعن کے ترکش خالی کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں

ہماری عرض یہ ہے کہ اگر پاکستانی حکومت تنہا جماعت اسلامی ہی کو ممنوع قرار دیتی اور اس کے ارکان کو خدانخواستہ پھانسیوں تک پر لٹکا دیتی تب بھی کسی شریف النفس مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ اس افتاد کو مزے لے لے کر بیان کرے اور اسے جماعت اسلامی کی تحقیر و تضحیک کے لئے نعرے کی حیثیت دے۔ امام احمد ابن حنبلؒ کو کوڑوں سے مارا گیا، امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں سڑا دیا گیا، امام بخاریؒ پر اللہ کی زمین تنگ کردی گئی مجددالف ثانیؒ قید میں ڈال دیئے گئے، شاہ ولیؒ اللہ کے پہنچے اُتروا دیئے گئے ـــــ اور لطف یہ ہے کہ ستم توڑنے والے اسی طرح مسلمان تھے جس طرح پاکستانی اربابِ اقتدار مسلمان تھے اور ہیں ـــــ تو کیا ہمیں تذکرۂ علمائے حق کے بارے میں بھی کہنا چاہئے کہ قدرت کی ستم ظریفی سے ان سب کا کہا ان کے منھ پر آیا! کیا ان سب کی تضحیک و تحقیر بھی اسی منطق کے ذریعے جائز ہے جس کے ذریعے مولانا مودودی پر لعن کیا جارہا ہے۔ اگر جائز ہے تب تو کوئی شکایت نہیں، لیکن اگر جائز نہیں ہے تو ہم ادب کے ساتھ کہیں گے کہ دل کا بخار نکالنے کا یہ طریق مولانا اکبرآبادی نے کچھ مناسب اختیار نہیں فرمایا ـــــ غازی اور مجاہد کے طنزیہ الفاظ بھی مولانا کے قلم کو زیب نہیں دیتے۔ ایسی گھٹیا باتیں آ[پ] ہم جیسے غیرذمہ داروں کے لئے چھوڑ دینی چاہئیں۔

اس سے بڑھ کر رنجدہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کے اُس عمل و حرکت پر بھی بڑے ناخوشگوار انداز میں تعریض کی گئی ہے جس کا تعلق نجد و حجاز وغیرہ میں تبلیغ اسلام سے ہے۔ اس ک[ا] مطلب یہ ہے کہ چاہے کوئی معقول بات ملے یا نہ ملے مگر مولانا اکبرآبادی کو یہ اطلاع حکومت کے کانوں میں پہنچا دینی ہے ک[ہ] میں مولانا مودودی کا سخت مخالف اور جماعت اسلامی کے طر[ز] فکر کا کٹّر دشمن ہوں۔ اگر یہ مطلب نہیں ہے تو کوئی منصف فیصل[ہ] دے کہ مولانا کے پیش نظر اسلوب میں اور اُس ظالم ساس کے اسلوب میں کیا فرق ہے جسے بہو کا بردباری کے ساتھ چلنا اکڑ بازی نظر آتا ہے اور وہ تیز چلے تو اس پر بےحیائی کا الزام لگتا ہے۔ طعن ہ[ی] کرنا ٹھیرا تو پھر دنیا کا کون شخص ہے جس کے بہتر سے بہتر عمل پ[ر] پھبتیاں نہ کسی جاسکیں۔

یہ فردِ جرم بھی خوب ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملک میں اپنے اور اپنی جماعت کے شہری حقوق حاصل کرنے کی جدّوجہد نہیں کرتے! ـــــ کوئی بتائے کہ وہاں کے مارشل لا کو ابھی کے برس گذرے ہیں اور کس نوع کی جد و جہد کا موقع اس قلیل عبوری دور میں مولانا مودودی یا کسی بھی سیاسی جماعت کو حاصل تھا جس نہ کرنے کا طعنہ دیا جارہا ہے ـــــ دیکھنے کی بات تو یہ تھی کہ عین مارشل لا کی دھار پر مولانا مودودی نے اُن عائلی قوانین پر بے محا[با] تنقید کی ہے جو وہاں کے نئے حکمرانوں نے مارشل لا کے دوران میں بنائے ہیں۔ اس جرأت میں بفضلہٖ تعالیٰ وہاں کے اور بھی بہت علماء ان کے ساتھی ہیں، لیکن جس میں قوتِ تمیزی موجود ہو وہ تنقید کو پڑھکر دیکھ لے کہ سوائے مولانا مودودی کے اور ...

[1] ہمیں رنج ہے کہ پچھلے ادارئیے میں یہ آیت لفظاً غلط لکھی گئی ہے۔ عامر

کس کے قلم کی ہو سکتی ہے۔

ہماری اپنی حق پرستیوں کا عالم تو یہ ہے کہ تمام دستوری آزادیوں کے باوجود ہم حکومت کی نیازمندیوں میں کسر اُٹھا کر نہیں رکھتے اور حکومت کا رجحان اگر جماعت اسلامی کی مزاج پُرسی کی طرف منعطف ہوتا ہے تو ہم بھی اپنی پچھلی گل افشانیوں کو بھول کر فوراً جماعت اسلامی اور اس کے سابق امیر پر تبرا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے لئے ہمارا طرز فکر یہ ہے کہ اسے مارشل لا سے ٹکرا کر سولی پر چڑھ جانا چاہئیے تھا۔ اگر نہیں چڑھا تو اس پر طعنے کسو۔ اسے بزدل قرار دو۔

اور مولانا کو کیسے معلوم ہوا کہ مولانا مودودی نے حقوق کے سلسلہ میں کوئی جدوجہد نہیں کی — کیا وہ خط لکھ کر ہمیں بتاتے کہ میں جدوجہد کر رہا ہوں — جدوجہد کا جتنا میدان میسر تھا، انھوں نے یقیناً اس پر قدم مارے ہوں گے، لیکن کون نہیں جانتا کہ مارشل لا کے دوران دنیا کے کسی بھی ملک میں دستوری نوع کی جدوجہد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں — لیکن یہ مولانا مودودی اور دیگر ارباب ہمت کی جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ پاکستانی پارلیمنٹ میں سیاسی جماعتوں سے پابندی ختم کر دینے کا مسودۂ قانون مارشل اٹھنے کی صبح ہی کو پیش کیا جا رہا ہے۔

رہے وہ آخری فقرے جس میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کے لئے تحریر و تقریر کی آزادی کو مولانا مودودی کے منھ پر چپت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے تو اس پر ہم خود کچھ کہنے کی بجائے ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ کا شعر پڑھیں گے:۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مولانا یہ بھول رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کو تحریر و تقریر کی آزادی خوان میں لگا کر پیش نہیں کی گئی ہے، بلکہ وہ تو اس طرح اس کے حصے میں آئی ہے جیسے میونسپلٹی والے سڑکوں پر بلب جلا دیتے ہیں اور اس کی روشنی میں وہ غریب بھی سڑکوں پر چل لیتے ہیں جن کا وجود میونسپلٹی والوں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے — اور مولانا بھول گئے کہ تحریر و تقریر کی آزادی کے باوجود جماعت اسلامی کے متعدد افراد کو جیل کی ہوا کھلائی جا چکی ہے۔

— کیا مولانا بتائیں گے کہ کونسا جرم تھا جس کی بنیاد پر یہ قید و بند منصفانہ کہی جا سکتی ہے؟ پھر کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے بعض اخبارات پر ایسی خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں حکومت مقدمہ چلاتی رہی ہے جس سے کہیں بدتر، اشتعال انگیز، جھوٹی اور فتنہ پردازانہ خبریں ہندو پریس آئے دن شائع کرتا رہتا ہے۔

رونا تو یہی ہے کہ سیکولرازم کے دستور نے ہمیں بہت کچھ دیا تھا مگر دستور چلانے والوں نے ہماری مٹی پلید کر دی۔ خود مولانا بھی تو اس شکایت ہمارے ہم نوا ہیں پھر وہ کونسا جھوٹ ہے جس کا جادو مولانا کی دانست میں مولٰنا مودودی کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ہم سچ کہتے ہیں یہ کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ ہماری گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے باقاعدہ اعلان کر دیتی کہ انھیں مساویانہ حقوق نہیں دئیے جا سکتے۔ یہ اکثریت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ انھیں صرف یہ اور یہ دیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ دینا دلانا ہے وہ اسی طرح ایمانداری سے درج قانون کر دیا جائے جس طرح اسلام صداقت اور صفائی سے درج کرتا ہے اور پھر بلا دجل و فریب کے یہ دیدیا جائے۔ یہ حالت اس سے کہیں بہتر ہے کہ کاغذ پر تو ہمیں برابر کا شہری کہا جائے مگر عمل کا عالم وہ ہو جو ہماری زبان سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی سب سے بڑی قوم پرست اور وطن دوست جماعت جمعیۃ العلماء کے آرگن کی زبان سے آپ سنتے رہتے ہیں۔ اچھوت اور شودر ہم سے اچھے کہ انھیں ہر طرح نوازا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ داؤگھات ہیں، چالیں ہیں، ہمارے بائیس لاکھ دستخطوں پر بھی زبان تک سے کچھ کہنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔

مولانا مودودی پر مارشل لا کے مختصر زمانے میں جدوجہد نہ کرنے کا طعن کسنے والے ذرا یہ تو بتائیں کہ اپنی فراخ دل سیکولر حکومت کے زیر سایہ انھوں نے سالہا سال میں جدوجہد کا کونسا کارنامہ انجام دیا ہے — کیا وہ اتنا بھی کر سکے کہ نصاب کی کتابوں سے صریح اسلام دشمن مواد کو خارج کرا دیں — کیا وہ اتنا بھی کر سکے کہ غیر مسلموں کے قبضے میں پہنچی ہوئی صدہا مساجد کو واپس لے لیا ہو — کیا وہ اُردو کو اس کا حق دلوا سکے۔

کیا وہ مسلمانوں کے جان و مال پر آئے دن ٹوٹنے والی قیامتوں کو روک سکے — کیا وہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا مسئلہ حل کر سکے — اور تو اور لیجئے اب اسکولوں میں مسلمان بچوں کے لئے بھی لازم کیا جا رہا ہے کہ وہ ہندو تہواروں کی عملی رسوم اور عبادات میں عملاً شرکت کریں۔ ہے کوئی جو سیکولر اسٹیٹ کی اس جارحیت کے منھ میں لگام دے سکے۔

آخر ہمیں بتایا تو جائے کہ دوسروں سے مارشل لا کے پہاڑ توڑنے کی آس باندھنے والے خود جد و جہد کا کونسا شاندار ریکارڈ قائم کر سکے ہیں۔ اگر انھوں نے واجبی جد و جہد کی ہے اور پھر بھی چودہ سالوں میں اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا ہے تو مولانا مودودی پر غازی اور مجاہد کی پھبتی کسنا کیا زیب دیتا ہے۔ مولانا مودودی نے تو پھانسی کا حکم پانے کے بعد بھی حکومت کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا کہ معافی مانگ لو اور رہا ہو جاؤ۔ رحم کی درخواست کرو اور جان بچا لو — ہمیں کم سے کم انبٹی مودودی حلقوں میں تو کوئی ایسا جیالا نظر نہیں آتا جو ان زیادتیوں کے سلسلے ہی میں سیکولر اسٹیٹ کے خداوندوں سے ٹکرا جائے جن پر وہ آئے دن ماتم و فریاد کرتا رہتا ہے۔

اداریئے کے خاتمے پر مولانا نے بڑے دردمندانہ انداز میں فرمایا:—

> "مسلمانو! خدا کے لئے عقل و ہوش سے کام لو۔ زمانے کی ہوا کا رُخ پہچانو۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ دین کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ پیغمبرانہ طریق دعوت و تبلیغ کیا تھا؟ ہر زمانے کے ہتھیار جُدا ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اقامتِ دین کا مقصد کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ جو قوم حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت ترک کر کے محض چند نعروں کو اپنا سرمایۂ حیات بنانے پر قناعت کر لے اسکی زندگی کو استحکام و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ کفی بنفسك حسیبا۔"

مولانا کے دونوں ہی اداریئے چونکہ پاکستانی حالات و ا[illegible] کے گرد گھوم رہے ہیں اس لئے قرینہ تو یہی کہتا ہے کہ "مسلمانو" کا خطاب ہم ہندی مسلمانوں سے نہیں پاکستانی مسلمانوں سے ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کے اداریئے قطعاً بیکار گئے۔ جہاں تک مولانا مودودی اور ان کی جماعت کا تعلق ہے وہ تو مدت ہوئی مذکورہ تمام سوالات کو سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ وہ سمجھ پائے ہیں اسے پورے شرح و بسط کے ساتھ اپنے لٹریچر میں پیش بھی کر دیا ہے۔ اب انھیں اس تحصیل حاصل کی ضرورت نہیں کہ دین کیا ہے اور مقصدِ دین کیا۔ اب تو انھیں آپ یہ رہنمائی دیجئے کہ اس ذی اقتدار گروہ سے وہ کیسے نمٹیں جو کہنے کو مسلمان ہے مگر ذہنی و فکری اعتبار سے اکدم یورپین اور عملی اعتبار سے اسلامی معاشرت پر چلتا پھرتا طعن ہے۔

اور جہاں تک باقی پاکستانی عوام کا تعلق ہے تو اہلِ اقتدار کے تتبع میں ان میں کی اکثریت زمانے کی ہوا کا رُخ اس حد تک پہچان چکی ہیں کہ لاکھوں روپے روز کی شراب لیکلے کراچی میں لنڈھا دی جاتی ہے اور مسلم خواتین غازہ و لپ اسٹک لگا کر کھلے نقاب کے برقعے اوڑھے بازاروں میں مردوں کی داڑھیو پر پھبتے لگاتی پھرتی ہیں۔

لیکن اگر "مسلمانو" کا خطاب ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی ہے تو یہ تصریح بھی مولانا ہی کے ذمے ہے کہ اس حسن خطاب کے ذیل میں وہ ہمیں کیا سبق دینا چاہتے ہیں۔ بظاہر تو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کونسے حقائق ہیں جن پر سنجیدگی سے غور و فکر کا مطالبہ ہے۔ — نیز سنجیدگی سے مراد کیا ہے یہ بھی مبہم ہے۔ آخر ہمارے کس تصور پر یہ تنبیہ و سرزنش ہے؟

اگر کہنا صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کو اخلاقِ عالیہ اور امانت و تقویٰ اختیار کرنا چاہئے تو بے شک یہ ہدایت سر آنکھوں پر مگر اس کے لئے ان غیر متعلق اداریوں کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہدایت تو براہ راست بھی دی جا سکتی تھی اور جماعت تبلیغی یہی کام کر بھی رہی ہے۔

لیکن اگر مولانا مودودی کی آڑ میں ہندوستانی جماعت اسلامی کو تنبیہ کرنی مقصود ہے تو گردن کے پیچھے سے ناک پکڑنے کا انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آپ کی بلا سے پاکستانی مسلمان اور مولانا مودودی کچھ بھی کر رہے ہوں۔ آپ تو یہ بتائیے کہ ہندوستانی مسلمان کیا کریں اور ہندوستانی جماعت اپنی کن کن غلط فکریوں سے رجوع فرمائے۔ صاف صاف آپ نے ہندوستانی جماعت اسلامی کا نام نہیں لیا، مگر آپ کی شعلہ بیانیوں کی تمام زد اسی پر پڑتی ہے، کیونکہ پہلے کبھی اگرچہ آپ بھی مولانا محمد میاں بھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی بڑے زور شور سے "اسلامی نظام" اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کا نام لیا کرتے تھے، لیکن اب یہ جرم صرف جماعت اسلامی کر رہی ہے اور ایک ایسے نازک وقت میں جب کہ حکومتِ وقت کی نگاہوں میں جماعت اسلامی کے لئے نفرت وانتقام کی چنگاریاں صاف نظر آرہی ہیں آپ کے اداریئے جماعت کے خلاف ایک "شہ" ایک ایک ایماء اور ایک ترغیب کا کام دے سکتے ہیں ــــ کیا سچ مچ آپ بھی یہی سمجھنے لگے ہیں کہ ہندوستاں کی جماعت اسلامی فرقہ پرست ہے۔ باؤلی ہے۔ اسلام سے جاہل اور زمانے کے تقاضوں سے بے بہرہ ہے؟ اگر سمجھنے لگے ہیں تو خدا کے لئے آپ ہی صحیح اسلام کی نشاندہی کیجئے اور اس احمق جماعت کو بتلایئے کہ کام یوں نہیں یوں ہوتا ہے۔ ہم اور ہمارے جیسے لاکھوں مسلمان نامردی کی تدریجی موت سے تنگ آچکے ہیں۔ جماعت اسلامی کی خوش خیالیوں سے تو ہمیں کچھ نہ ملا جمعیۃ العلماء کی قوم پرستیوں نے بھی ہمیں کوئی روشن راہ نہیں دکھائی۔ آپ اگر پراگندہ و پریشاں بھیڑوں کی قیادت فرما سکیں تو یہ وہ کارنامہ ہوگا جس پر تاریخ آپ کا نام سونے کے حرفوں سے لکھے گی۔

اس وقت جب یہ پرچہ تکمیل پاچکا ہے مدیر برہان کا تیسرا اداریہ بھی جولائی ۶۳ء کے برہان میں آگیا ہے یہ نسبتاً طویل ہے لیکن اس کی طوالت میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے فکر پر بھونڈے انداز میں چھینٹے اڑانے کے سوا اگر کچھ ہے تو جستس محمد منیر کی ثنا خوانی اور علماء کی تحقیر و تضحیک۔ پورے اداریئے میں قرآن وحدیث اور ائمۂ وفقہاء کا سایہ تک نہیں ملتا۔ ہر دعوے اور تخیل کی اساس اسی بیسویں صدی کے اُن مفکرین و محققین کے خیالات پر رکھی گئی ہے جنھیں اسلام کے اہم اساسی مسائل میں کوئی مبتدی ہی مستدل بنائے تو بنائے سے اس کی توقع نہیں ہوسکتی۔

لطف یہ ہے کہ جو بنیادی عقیدہ کسی حکومت کو اسلامی بناتا ہے یعنی خدا اور رسول کو حرفِ آخر ماننا اسے مولانا اکبرآبادی نے نہ پہلے دو اداریوں میں چھوا ہے نہ تیسرے اداریئے میں اس کا ذکر ہے۔ سیکولرازم کی تحسین وتائید میں اِدھر اُدھر کے غیر اصولی دلائل بے محابا سپرد قلم فرماتے چلے گئے ہیں، لیکن قرآن و سنت اور صحابہ وائمہ کے توثیق فرمودہ اصول ومبادی کی پرچھائیں تک قلم پر نہیں پڑنے دی۔

ہم دلی رنج کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے مشفق بزرگ کے اداریوں کا تعاقب ہمارے لئے کوئی خوشگوار مشغلہ نہیں لیکن جو اداریئے نہ صرف حق اور باطل میں التباس پیدا کرنے والے ہوں، بلکہ وہ صاف طور پر اُس گروہ کی تحقیر وتنقیص کرتے ہوں جو اسلام پر جان نچھاور کرتا ہے اور اُس طائفے کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوں جو مغرب زدہ استادوں اور مستشرقین کی کتابوں سے اسلام کا علم حاصل کرکے اسلام کا سب سے بڑا دشمن بنا ہوا ہے تو ہمیں اپنا سکوت ایک جرم معلوم ہوتا ہے۔ ہم خود کو مجبور پاتے ہیں کہ دین وملت کے مفاد کی خاطر ان کے تیسرے اداریئے پر بھی اگلے ماہ زبانِ نقد دراز کریں۔ وباللہ التوفیق۔

مستقل عنوان

عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

حسن اخلاق

حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

ما من شیئ فی المیزان أثقل من حسن الخلق (الادب المفرد للبخاری)

ترجمہ :-

کوئی شئ حسن اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ہے ترازو میں -

تفہیم :-

اخلاق کسے کہتے ہیں

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام میں اخلاق (حسن خُلق) کا کیا مفہوم ہوتا ہے - یہ سمجھ لینا اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ دور میں باطل افکار و تصورات کے غلبہ و تسلط نے کتنے ہی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و مصداق میں من مانی تبدیلیاں کر دی ہیں اور بدقسمتی سے یہی تبدیل شدہ مفہوم و مصداق نہ صرف غیر مسلموں کے اذہان میں بلکہ بے شمار مسلمانوں کے دماغوں میں بھی جاگزیں ہو کر رہ گیا ہے اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم آگے اس باب کی متعدد روایات بیان کرنے والے ہیں - ان سب کو صحیح طور پر سمجھنے کا مدار اسی پر ہے کہ اخلاق کا اسلامی مفہوم و مصداق اچھی طرح سمجھ لیا جائے -

انسان کی طبیعت میں اللہ نے اجتماعیت اور مدنیت رکھی ہے، لہٰذا ناگزیر ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اسے مختلف قسم کے رشتہ و پیوند سے سابقہ پڑے - اولاد، زوج، قریب و دور کے رشتے دار، احباب، پڑوسی، اہلِ وطن، برادرانِ دین و ملت بڑے چھوٹے، ہم عمر سبھی طرح کے انسانوں سے اس کا رشتہ ہوتا ہے یہاں تک کہ جانوروں کے ساتھ بھی اسے بسا اوقات کسی نہ کسی نوع کے تعلق سے واسطہ پیش آتا ہے - مثلاً اس نے گائے بھینس، مرغیاں، کبوتر، بکریاں وغیرہ پال رکھی ہیں - یا ایک بلی اس کے یہاں آتی جاتی ہے - یا ایک کتا اس کے دروازے کی چوکیداری کرتا ہے - انسان و حیوان کے ان تمام تعلقات میں اسلام نے واضح ہدایات دی ہیں اور انھی ہدایات پر عمل کرنے کا نام حسنِ اخلاق ہے -

جب ایک انسان کا دوسرے انسان یا جانور سے حسنِ اخلاق برتنا اسلام میں محمود ٹھیرا تو یہ بات خود بخود بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کا جو تعلق اپنے مالک و خالق سے ہے اس کی رو سے جتنے بھی فرائض انسان پر عائد ہوتے ہیں، ان سب کو ٹھیک طور پر ادا کرنا حسنِ اخلاق کا بنیادی پتھر ہے ایک انسان یا جانور کو ایذا دینا، ان کا دل دکھانا، ان کا حق مارنا اگر بد اخلاقی اور ظلم ہو سکتا ہے تو اللہ اور رسول کو ناراض کرنے انھیں اذیت دینے اور ان کی ہدایات کو نظر انداز کر دینے سے بڑھ کر بد اخلاقی اور ظلم کیا چیز ہو سکتی ہے -

اسی لئے یہ کلیہ یاد رکھئے کہ انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ

نرمی، ایثار، دوستی اور محبت کا کوئی بہتر سے بہتر سلوک بھی اسی وقت حسنِ اخلاق میں شمار ہو سکتا ہے جب وہ اللہ اور رسولؐ کی ناراضگی کا باعث نہ ہو۔ اگر کسی دوست، عزیز یا کسی حیوان کے ساتھ آپ اس نوع کا حسنِ سلوک برتتے ہیں جو عام دنیاوی نقطۂ نظر سے تو اوصافِ حسنہ کے ذیل میں آتا ہو، لیکن فی الحقیقت وہ اللہ اور رسولؐ کی تعلیم و ترغیب کے خلاف ہو تو اسلام کی نظر میں یہ اخلاقِ ذمیمہ میں شامل ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے اندمالِ زخم کے لئے نشتر کا استعمال کرتے ہوئے آدمی اپنی شہ رگ کاٹ لے۔ یا یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ بخار اور نزلے کا علاج ایسی دوا سے کرنے لگیں جو اختلاج یا سوءِ ہضم پیدا کرنے والی ہو۔

مثال کے طور پر آج کی تہذیب میں یہ بات اخلاق کے خانے میں رکھی جاتی ہے کہ میزبان اگر شراب پیش کرے تو اسے قبول کرنا چاہئے یا وہ ناچ کرائے تو اسے خندہ پیشانی سے دیکھنا چاہئے یا کوئی نامحرم عورت جسمانی سہارہ چاہے تو اسے سہارہ پیش کرنا چاہئے۔

بلکہ یورپ میں تو یہ تک اخلاق کا جزءِ لازم ہے کہ مہمان اپنی میزبان عورت کا بوسہ لے۔ اسی طرح بے شمار ایسے طریقے یورپ کیا اور ایشیا کیا ہر جگہ "اخلاق" کی حیثیت سے رائج ہو گئے ہیں جو اسلام کے نزدیک جرم و گناہ ہیں — خوب سمجھ لیجئے کہ ان کے ساتھ رواداری برتنے کو اسلام اخلاق نہیں بداخلاقی قرار دیتا ہے۔ نیکی نہیں بُرائی ٹھیراتا ہے۔

اس بنیادی نکتے کو قلب و دماغ میں اور زیادہ جاگزیں کرنے کے لئے چند مثالیں اور سامنے رکھ لیں۔

ایک شخص قتل کرتا ہے — اب ظاہر ہے اسے پھانسی پر لٹکا دینے سے مقتول تو زندہ نہیں ہو جائے گا۔ لہٰذا حسنِ اخلاق کا تقاضا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے پھانسی دیکر ایک اور جان ضائع نہ کی جائے۔

لیکن قاتل کو معاف کر دینا اپنے مضمرات و ثمرات کے اعتبار سے نہایت خراب ہے اس لئے دنیا نے اسے حسنِ اخلاق میں شامل نہیں کیا بلکہ ثابت شدہ قاتل کو سزا دینا ہی اخلاقی آئین اور اوصافِ محمودہ کے اعتبار سے پسندیدہ قرار پایا۔

یہی حال چوری، ڈکیتی، غصب، رشوت ستانی اور دیگر معائب کا ہے کہ ان کے مرتکبین کے ساتھ عفو و درگذر کا سلوک کرنا جرم و عیب قرار پایا اور انھیں قرار واقعی سزا دینا ہی حسنِ اخلاق کے دائرے میں شمار کیا گیا۔

جب یہ شکل ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ افعال و حرکات تو ہرگز ہرگز حسنِ اخلاق کے دائرے میں نہیں آسکتے جن کے نتیجے میں آخرت کا ہولناک عذاب طے کیا گیا ہو۔ جن سے اللہ ناخوش ہوتا ہو اور جن کے نتائج پایانِ کار دنیا میں بھی خراب ہی نکلتے ہوں —

اصول کی حد تک دنیا ہم سے متفق ہے لیکن وہ چونکہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے اور آخرت کا کوئی واضح اور جاندار تصور اس کے ذہن و قلب میں نہیں ہے اس لئے وہ اخلاقی اُمور کی تشخیص و تعیین ان کی سطحی شکل و صورت سے کرتی ہے اور مادّی اعتبار سے بھی وہ بالکل قریبی ثمرات و اثرات کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی عادی ہوتی جارہی ہے اسی لئے اخلاق کے معاملہ میں جا بجا اس کے اور اسلام کے نظریات میں بھاری فرق ہے۔ اسلام صرف مفادِ عاجلہ اور فوری نتائج کا طالب نہیں وہ دور تک دیکھتا ہے اور ایک ایسی زندگی پر اطمینان رکھتا ہے جس کے مقابلہ میں یہ دنیاوی زندگی ایک لمحۂ گریزپا سے زیادہ نہیں ہے۔

اصولی نکتے پر اتنی سطریں ہم نے اس لئے سپردِ قلم کی ہیں کہ آپ ہر معاملے میں خود بھی حسنِ اخلاق اور سوءِ اخلاق کی تمیز و تشخیص کر سکیں۔ اس دور میں خاص طور پر یہ آفت آگئی ہے کہ بے شمار بداخلاقیوں کو حسنِ اخلاق کا نام دیدیا گیا ہے اور خود ہمارے مسلمان معاشرے میں حسنِ اخلاق کے کتنے ہی مظاہر ایسے پائے جارہے ہیں جو اپنے بطن میں خدا اور رسول کی ناراضگی کا سامان چھپائے ہوئے ہیں۔ رواداری، نرمی، درگذر اور دلداری وغیرہ بے شک اخلاقِ حسنہ کی جزئیات ہیں، مگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی حد بندی بھی ضروری ہے۔ ان اوصاف کو ایسے سمندر کی شکل دیدینا جسکی طوفانی موجیں کناروں کو بھی بہالے جائیں اسلام کی نظر میں معیوب

مذموم ہے۔

میزان

ترازو کسے کہتے ہیں یہ محتاج تشریح نہیں۔ قرآن وحدیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال کو ترازو میں تولے گا اور دونوں پلڑوں میں بھلائیاں اور برائیاں رکھی جائیں گی۔

لیکن کیا یہ ترازو اسی شکل کی ہوگی جس سے ہماری نگاہیں آشنا ہیں یا اس کی کوئی اور شکل ہوگی ـــ اس کا واضح جواب دینا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عجیب وغریب اور خیال وقیاس سے بلند تر اشیاء کا تعارف ایسی تمثیلات سے کراتا ہے جنھیں ہم سمجھ سکیں لہٰذا بعید نہیں کہ میزان کی حیثیت محض تمثیل کی ہو اور جس شے سے انسانوں کے نیک وبد اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ہوگا وہ فی الحقیقت ایسی ہو کہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی اس کا خاکہ نہ آسکتا ہو۔ زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ بے شمار اعمال ایسے ہیں جو کوئی جسم کوئی کمیت، کوئی طول وعرض نہیں رکھتے ـــ پھر جو اساسی شے اعمال کو مؤثر بناتی ہے وہ تو نیت ہے اور نیت ایک کیفی شے ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ بھلائی اور برائی کے وزن، نسبت اور قدر وقیمت کی ٹھیک ٹھیک تعیین کے لئے اللہ نے کوئی ایسا طریقہ رکھا ہو جس کا ہم تصور بھی نہ کر سکیں۔ مگر چونکہ ترازو ہمارے دن رات استعمال کی چیز ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ وزن بتلانے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لئے کہ آخرت میں ہر ہر عمل کی قدر وقیمت سامنے آجائیگی میزان کی تمثیل اختیار فرمائی۔

تاہم یہ مان لینے میں بھی کوئی استحالہ نہیں ہے کہ سچ مچ ترازو ہی کی شباہت رکھنے والی کوئی شے اللہ نے اعمال تولنے کے لئے تخلیق فرمائی ہو اور اعمال کو جسمانی اشکال میں تبدیل کر کے ان میں تولا جائے۔

ویسے اعمال کا مجسم کرنا بھی ضروری نہیں۔ ہم بندوں ہی نے جب گرمی، سردی، کھٹاس مٹھاس اور بے شمار غیر کمی (جن کا کوئی جسم نہیں ہوتا) اشیاء کے لئے پیمانے اور میٹر بنا لئے ہیں تو اللہ کو اعمال کی قدر وقیمت کا بے مثال بیرومیٹر بنا دینے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے جبکہ بے ستون کا بیکراں آسمان اور پوری کائنات ہی اس نے کن فیکون کے اعجاز سے بنا دی ہے۔

حاصل یہ کہ اعمال کی ترازو کے بارے میں کسی بھی شخص کو اس ذہنی کنج کاوی میں نہیں پڑنا چاہئے کہ وہ کس شکل کی ہوگی یا اعمال کیسے تل سکیں گے نیات وکیفیات کا وزن کیونکر ممکن ہے وغیر ذلک۔ یقین کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہم دنیا میں کر گئے ہیں وہ فضا میں تحلیل نہیں ہوگیا، بلکہ نکتہ نکتہ محفوظ ہے اور اس کا حساب کتاب ہمیں آخرت میں دینا ہے۔

مرزا غالب خوب کہہ گئے ہیں:ـــ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اخلاق کا اصطلاحی مفہوم

جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہوا حقیقتاً تو اخلاق کے مفہوم میں تمام عبادات بھی داخل ہیں بلکہ عبادات کو راس الاخلاق اور اُمّ الاخلاق سمجھئے، لیکن جب اسے ایک اصطلاح کی حیثیت سے بولتے ہیں تو اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے تمدنی تعلقات میں نرمی، شفقت، مروّت، ایثار، رواداری اور فیاضی برتنا اور تمدن کے ذیل میں صرف انسانی تعلقات ہی نہیں آتے، بلکہ حیوانات کو بھی یہ دائرہ شامل ہے۔ ایک کتے کو آپ بیدردی سے ماریئے، ایک بلی کو بھوک سے بے حال دیکھتے ہوئے یونہی گذر جائیے، ایک فاختہ پال کر اُس کے چگنے کا ٹھیک انتظام نہ کیجئے، اسے بھی اسلام اتنی اہمیت دیتا ہے کہ آپ کو آخرت میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ آپ کے نامۂ اعمال میں بد اخلاقیاں درج ہو جائیں گی۔ کیا آپ نے نہیں سُنا اللہ کے رسولؐ نے اطلاع دی ہے کہ ایک عورت کو اس جرم میں اللہ نے مبتلائے عذاب فرمایا کہ اس نے ایک بلی کو باندھکر رکھا تھا اور کھانے پینے کو نہیں دیتی تھی جس کے نتیجے میں بلی مر گئی ـــ اور کیا آپ نے نہیں سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کے مطابق ایک نہایت بد قماش عورت کو اللہ نے صرف اس حسنِ اخلاق کے صلہ میں بخش دیا کہ اس نے

ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تھا۔

حاصل یہ ہے کہ اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اسلام کی اخلاقی قدریں غیر اسلامی طرزِ فکر کی طرح اضافی نہیں ہیں۔ تہذیب و تمدن کے دنیاوی نظریات میں تو اخلاق کا معیار بدلتا رہتا ہے، مگر اسلام میں یہ معیار نہیں بدلتا۔ کیونکہ اسلام انسانی فکر و ذہن کی صفت نہیں ہے، بلکہ اُس خالقِ کائنات کا دین ہے جس کی سنت میں تبدیلی محال ہے۔

جگر لخت لخت

ہمارے آقا!

ابھی چند ہفتے ہوئے وزیر داخلہ جناب لال بہادر شاستری نے پارلیمنٹ میں جماعت اسلامی پر جس جوش وخروش اور تنفر آمیز لہجے میں الزامات کی توپ داغی ہے اس کا دھماکہ تمام باخبر حلقوں میں پہنچ چکا ہے۔ الزامات بھی ایسے ویسے نہیں۔ فرمایا گیا:۔

"جماعت اسلامی نہ صرف ایک مذہبی جنونی اور فرقہ وارانہ جماعت ہے، بلکہ یہ ایک خطرناک اور وطن دشمن جماعت بھی ہے۔ اس کا مقصد ملک میں اسلامی روح قائم کرنے کا ہے اور یہ بار بار اپنے پیرؤں کو جہاد کی تیاریاں کرنے کو کہہ چکی ہے اور یہ تخریبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لے رہی ہے۔"

گویا جن جرائم پر پھانسی تک دی جاسکتی ہے انکا الزام مسندِ اقتدار کے اتنے ممتاز فرد نے جماعت اسلامی پر لگایا ہے، لیکن لگانے کے بعد نہ گرفتاریوں کے لئے پولیس بھیجی نہ کسی عدالت میں کیس دائر کیا گیا ـــــ اگر وزیر داخلہ کو اپنے سچا ہونے کا یقین تھا تو ان پر لازم تھا کہ صرف زبانی شعلہ فشانی پر قناعت نہ کرتے، بلکہ خوفناک مجرموں کی اس جماعت کو سیدھے عدالت کے کٹہروں میں پہنچا کر دم لیتے۔ ایسا نہیں کیا گیا تو دنیا وہی نتائج اخذ کرے گی۔ یا تو وزیر داخلہ کو خود بھی اپنی سچائی کا یقین نہیں یا پھر وہ خود بھی وطن دشمن ہیں کہ قدرت کے باوجود وطن دشمنوں کو آزاد چھوڑے ہوئے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ فرقہ پرستی اور مذہبی جنون کے سلسلے میں کسی ہندو جماعت کا شبہ نام موصوف کی بارگاہِ نطق میں شرفِ باریابی نہیں پاسکا۔ حالانکہ برائے بیت تو پنڈت نہرو تک بعض ہندو جماعتوں کی فرقہ واریت کا اعتراف واعلان کرچکے ہیں۔ اسکا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ بعض اور اربابِ اقتدار کی طرح موصوف بھی سیکولرازم کا عملی مفہوم یہی قرار دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کبھی انصاف نہ ہو، انھیں جی بھر کے رگیدا جائے، ان سے بیر رکھنے والے عناصر کی کمر تھپکی جائے اور کردار، ضمیر اور عدل و دیانت کا کوئی تقاضا کم سے کم عدالت کے حدود سے باہر ان کے معاملہ میں ہرگز ہرگز پورا نہ ہونے پائے

اگر وزارت داخلہ کا ذہن بھی یہی ہے تو سمجھنا چاہئیے کہ ہولی کے رنگ ابھی اور گہرے ہوں گے، بسنت کے پھول ابھی اور آگ اُگلیں گے، درد سے کراہتے زخمیوں کی رگوں سے ابھی اور لہو نچوڑا جائے گا اور جس کذب وافتراء کو دلیل سے سچ کر دکھانا ممکن نہ ہوگا اسے یا تو سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین کی آنچ دیکر کیمیا گری کا کمال دکھایا جائے گا یا پھر مقدس بھارت ماتا کی سرزمین سے نئے جبلپور و ساگر اور نئے علیگڑھ اور سیتا مڑھی بھجن گاتے ہوئے اُبھریں گے۔

کون نہیں جانتا کہ انسانی گوشت کا ایک لوتھڑا ابھی نو دس مہینے کی پخت و پز کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کھیتیاں تخم ریزی والے روز ہی نہیں لہلہا اُٹھتیں۔ ہر نام نہاد فساد جو مسلمانوں کے جان و مال پر قیامتیں توڑتا ہوا ایکا ایکی اُبھرا وہ بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا مصداق نہیں تھا، بلکہ اسکے

بیج پہلے ڈالے گئے تھے۔ اس کی آبیاری پہلے کی جاتی رہی تھی اب اگر کل پرسوں یا دو چار ماہ بعد کہیں فساد کی نئی فصل بہار لہلہاتی ہے تو یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اس کے بیج آج ڈالے گئے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وطن دشمن جماعت اسلامی ہے یا اس کے عناد میں مسلمانوں کے کسی بھی فرد یا گروہ پر اب جو حملہ ملک کی کسی بستی میں ہوگا اس کی تمام تر ذمہ داری وزیر داخلہ ہی پر ہے۔ فساد کی حیثیت تو طوائف کی اولاد جیسی ہے، کون دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ طوائف زادے کا اصلی باپ کون ہے، لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پیدائش بغیر باپ کے ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ بات عموماً مشکوک ہی رہے گی کہ فساد کی تخم ریزی کس نے کی۔ کب کی۔ زمین پر ہل کس نے چلایا تھا، آبیاری کا فریضہ کون کون ادا کرتا رہا۔ کھاد کہاں سے مہیا ہوا وغیر ذلک۔ مگر یہ بہر حال یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان دشمن عناصر کو وزیر داخلہ کی گل افشانی سے شہ ملی ہے۔ موصوف تو ایک شوشہ چھوڑ کر اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اب یہ کیا برگ و بار لاتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائیاں امن دشمن عناصر کو کن نئے اقدامات پر ابھارتی ہیں اس کا انتظار ہم مسلمانوں کو سانس روک کر کرنا چاہئے۔

غنیمت ہے کہ جماعت اسلامی سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے مسلمان بھی اس کھلے راز کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں کہ حکومت کی جماعت اسلامی سے معاندانہ روش کا کیا مطلب ہے۔ اسی لئے وزیر داخلہ کی گوہر افشانی پر مسلم پریس نے تقریباً متفقہ طور پر احتجاج کیا ہے۔

ویسے اس احتجاج کے سلسلے میں ہمیں یہ رنج ضرور ہے کہ بعض حضرات نے اس نازک موقعہ پر بھی جماعت اسلامی سے اپنے اختلاف کو ایسے الفاظ میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جن میں سیکولرازم کی خوشامد اور متعفن قسم کی "انا" جھانکتی نظر آتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک سیکولرازم کا تعلق ہے اس کے وفادار تو ہم بھی ہیں اور جماعت اسلامی بھی۔ وہ اگر اقامتِ دین اور نظام اسلامی کا نام لیتی ہے تو اسکی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے ہندوستان کی مختلف پارٹیاں اپنے اپنے نظریات و عقائد کے اظہار میں پیش پیش ہیں۔ ایک کمیونسٹ اگر یہ تمنا کرنے میں حق بجانب ہے کہ ہماری حکومت اشتراکی اصولوں کو قبول کرے، ایک جن سنگھی اگر یہ اعلان کرنے میں گردن زدنی نہیں ہے کہ ہندوستان میں رام راج قائم ہونا چاہئے۔ تو کوئی مسلمان یہ آرزو رکھنے اور اسے ظاہر کرنے میں کیوں حق بجانب نہیں ہے کہ نہ ہندوستان میں ان پاکیزہ اُصول و آئین کی بالادستی چاہتا ہے جن سے بڑھ کر پاکیزہ منصفانہ اور انسانیت نواز اصول و آئین کا اس کے نزدیک دنیا میں وجود ہی نہیں ہے۔ لہذا یہ ضروری نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کی مظلومیت کا اعتراف کرتے ہوئے سیکولرازم کی وفاداری کی بھی غیر معمولی نمائش کا اہتمام کیا جائے۔

اور جہاں تک "انا" کا تعلق ہے تو جماعت سے اختلاف رکھنے والوں کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ وقت کبھی کا آچکا ہے جب تمام چھوٹی چھوٹی اناؤں کو ایک بڑی انا میں تبدیل کئے بغیر چین کے دو سانس بھی لینے دوبھر ہیں۔ قدرت کا دستِ انتقام رُکے گا نہیں جبتک ہماری افتراق پسندیاں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے آستانے پر سجدۂ سہو نہیں کریں گی۔

سخن طرازی کا حاصل یہ ہے کہ وزارت داخلہ جیسے منصب پر فائض ہونے والے کسی بھی بزرگ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کسی فرد یا جماعت پر ایسے الزام لگائے جنھیں وہ عدالت میں ثابت نہ کرسکتا ہو۔ حکومت کا نشہ بُری شے ہے، مگر صاحب کردار لوگ وہی ہیں جو اس نشے کو معدے میں پچا جائیں نہ کہ پہلی ہی لہر میں خدائی کا دعویٰ شروع کر دیں۔ حد ہے کہ جماعت اسلامی نے وزیر داخلہ سے افہام و تفہیم کا وقت مانگا تو تادم تحریر اس کے جواب میں بھی خاموشی ہی خاموشی ہے۔ گویا خود وزیر داخلہ بھی اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہیں پاتے کہ ملزم کے سامنے اپنے الزامات کی کوئی معقول دلیل پیش کر کے سرخرو ہو سکیں[1]۔

---

[1] معلوم ہوا ہے کہ وزیر داخلہ نے ملاقات فرمائی ہے۔ خدا کرے اس کے نتائج بہتر ہوں۔ تجلی۔

اُلٹی گنگا

ہندو مہا سبھا کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کرکے مطالبہ کیا ہے کہ:-

"نہرو لیاقت معاہدے کے تحت ایک کمیشن حکومتِ ہند مقرر کرے جو ان علاقوں کا دورہ کرے جہاں مشرقی پاکستان میں فساد ہوا ہے۔ فسادات میں جو اقلیت کو نقصان پہنچا ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کے متعلق تمام تفصیلات اقوام متحدہ میں پیش کی جائیں۔"

ہم ان لوگوں میں ہیں جو اس بات کو بالکل درست سمجھتے ہیں کہ ہندو مہا سبھا یا کوئی بھی جماعت ہندوستان میں اپنے مذہب کی حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں عوام کو اپنے نظریات سے پُر امن اور متین انداز میں متفق کرنے کی جدوجہد کرے۔ یہاں خدا بیزار نظریات کی اشاعت جائز ہے تو مذہبی عقائد کی اشاعت کیونکر قابل اعتراض ہو سکتی ہے۔

لیکن شکایت اور اعتراض اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مذہب کے نام لیوا اپنے باطن کی کثافتوں اور اپنے ذہن کی ناپاکیوں کا نام مذہب رکھتے ہیں ذرا سوچئے۔ دنیا کا کوئی معقول مذہب ایسا ہو سکتا ہے جو آدمی کو اندھا، بہرا، کمینہ اور جلاد بن جانے کی دعوت دے۔ ہندو مذہب عبادت و روحانیت کے مسائل میں کچھ بھی تصورات رکھتا ہو، لیکن انسانی حقوق کے بارے میں وہ ہرگز ایسے عقائد کی تعلیم نہیں دے سکتا جو انسان تو انسان کتوں اور چمگادڑوں کے لئے بھی ننگ کا باعث ہوں۔

پھر یہ کیا تماشا ہے کہ ہندوستان میں برپا ہونے والے سیکڑوں فسادات کے سلسلہ میں تو مہا سبھا کے کانوں پر عدل و دیانت کی جوں بھی نہ رینگے مگر پاکستان کا جو فساد مالدہ کے فساد کا ردعمل ہے اس پر اس کے پیٹ میں اتنی زور کا مروڑ اٹھے کہ واویلا سے آسمان سر پر اُٹھا لے۔

اس تنگ نظری، قساوت اور بے ایمانی کو کسی مذہب سے منسوب کرنا مذہب کی سخت توہین ہے۔ یہ تو وہ ظلمتِ خیال ہے، جس کے سامنے آماس کی سیاہ راتیں ہیچ ہیں اور جس سے جنگل کے درندے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ بے حیائی کی ایک حد یہ ہے کہ بیوی میاں کی موجودگی میں غیر مرد کے گلے میں باہیں ڈالے لیکن ایک انتہا یہ بھی ہے کہ وہ سرِ بازار الف ننگی ہو جائے۔ — ہندو مہا سبھا آس پاس رُکنا پسند نہیں کرتی وہ اُن آخری حدوں تک پہنچنا پسند کرتی ہے جہاں عدل، حیا، ایمان اور خیر و صلاح نام کی کسی شے کا وجود نہیں۔

دوستو۔ مشرقی پاکستان کے فساد پر ضرور احتجاج کرو ہم خود بھی یہ کہنے میں تمھارے شریک ہیں کہ بے گناہوں پر ہاتھ اٹھانا دنیا کا بدترین گناہ ہے۔ پاکستانی حکومت کو شرم سے ڈوب مرنا چاہئے اگر اس کے یہاں کی کسی اقلیت کے ایک فرد کا بھی صرف ناخون تک ناحق اُکھیڑ لیا جائے، لیکن ساتھ ہی اُن فسادات کے بارے میں بھی تو منھ سے پھوٹو جو تمھاری ناک کے نیچے آئے دن برپا ہیں۔ انسانیت اگر تمھیں چھو کر بھی گئی ہوتی تو تمھاری قرارداد میں یہ مضمون ضرور شامل ہوتا کہ ہندوستان کے فسادات میں اقلیت کو جو نقصانات پہنچے ہیں اس کا بھی جائزہ لے کر اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے —— اقوام متحدہ کس چڑیا کا نام ہے یہاں کے فسادات کی تلافی تو خود ہماری ہی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ تم حکومت ہی سے کہتے کہ اقلیت کے آنسو پونچھو اور ایسا انتظام کرو کہ آئندہ کسی بدمعاش کو پُر امن لوگوں پر حملہ کرنے اور لوٹ مار مچانے کی جرأت نہ ہو۔

مگر تم کیوں کہتے —— فسادات کے گلزار تو تم ہی سینچ رہے ہو۔ پھل پھول بھی تمھارے ہی گھروں میں جا رہے ہیں —— تمھاری ہی آرزو یہ ہے کہ بھارت ورش میں اسلام کا نام و نشان تک باقی نہ رہے —— اور اپنی خوش قسمتی پر رشک کرو کہ حکومت بھی تمھاری آرزوؤں کو غذا تو فراہم کر سکتی ہے انھیں کچل نہیں سکتی۔

سن لو اے دنیا والو! ہندوستان میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کے نزدیک مسلمانوں کا لہو تو ٹکے سیر بھی مول نہیں رکھتا لیکن اپنے ہم مذہبوں کے لہو کی ایک ایک بوند وہ سونے اور ریڈیم سے

زیادہ قیمتی قرار دیتے ہیں۔ یہیں قوم و وطن کی پوجا کا حکم دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی مذہب پرستی کا عالم یہ ہے کہ دوسرے کسی ملک میں نکے ہم مذہبوں پر کوئی آنچ آئے تو وہ بلبلا اُٹھتے ہیں مگر اپنے ملک میں مسلمانوں پر کیسی ہی قیامتیں ٹوٹتی رہیں ان کے ماتھے پر تشویش کا ایک بل بھی نہیں اُبھرتا۔ مگر پھر بھی وہ وطن پرست ہیں اور ہم وطن دشمن! وہ قوم پرور ہیں اور ہم فرقہ پرست! فیاللعجب!

شدھی سنگھٹن

اسلامی تہذیب و ثقافت کو بیخ و بن سے اُکھیڑ کر ہندو کلچر اور بھارتی کی پراچین ذہنیت کے محل تعمیر کرنے کا جو سلسلہ ہمارے وطن میں آکاس بیل کی طرح پھیلتا جا رہا ہے وہ اب ایک شدید و نازک مرحلے میں آپہنچا ہے۔ اسکولوں کی کتابوں میں تعصب اور جہالت کے مشترکہ تعاون سے جو زہر بھر اگیا تھا وہی مسلمان بچوں کو بے دین بنانے کے لئے کچھ کم نہیں تھا، لیکن اب بیسک اسکولوں کے نئے پیراسیکٹس کی رُو سے یوپی کے محکمۂ تعلیم کی ہدایت کے مطابق اسکولوں کے تمام طلباء کو بلا تفریق مذہب و ملت ہندو تہوار اور جینتیاں منانی ضروری ہوں گی اور منانے کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ پوجا پاٹ اور جو بھی دوسری رسوم ان سے متعلق ہیں ان میں عملی شرکت لازمی ہوگی۔

ہندوؤں کے مذہبی تہوار سات اور جینتیاں چھ رکھی گئی ہیں ـــ خیر سے سیکولرازم کی لاج رکھنے کے لئے مسلمانوں کے بھی دو تہوار شامل کئے گئے ہیں ـــ محرم اور عید الفطر ـــ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ جس طرح ہندو تہواروں کے ہندوانہ آداب و رسوم میں تمام مسلم و غیر مسلم طلباء کی عملی شرکت لازمی قرار دی گئی ہے اسی طرح محرم اور عید کے آداب و مراسم میں بھی سب کی شرکت لازمی ہوگی۔ ـــ جی نہیں۔ ان دونوں تہواروں میں تو صرف صفائی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے گا اور کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر ناٹک پورا کرنے کے لئے غیر مسلموں سے ماتم بھی کرا دیا جاتا اور نماز بھی پڑھوا دی جاتی تب بھی اسلامی نقطۂ نظر سے یہ مسخرے پن کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

جہاں تک محرم کا تعلق ہے یہ اسلام میں سرے سے کوئی تہوار ہی نہیں ہے۔ اسلام کے صرف دو "تہوار" ہیں۔ عید الفطر اور عید الضحیٰ۔ ان دونوں تہواروں میں ظاہری خصوصیت کے اعتبار سے عید الضحیٰ ممتاز ہے نہ کہ عید الفطر۔ عید الفطر میں ظاہری اعتبار سے اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں کہ عام دنوں کے مقابلے میں نماز کی دو رکعتیں زائد ہیں۔ نماز مسلمان کا روزانہ کا پنج وقتہ معمول ہے اس لئے دونوں عیدوں میں سے عید الفطر کا انتخاب غیر مسلمین کی نظر میں کسی معقولیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ہاں عید الضحیٰ میں بیشک یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مسلمان قربانی کرتے ہیں اور جن میں استطاعت ہوتی ہے حج کو جاتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم کو اگر سیکولرازم چھو کر بھی گیا ہوتا تو وہ عید الفطر کے ساتھ عید الضحیٰ کو بھی تہواروں کی فہرست میں شامل کرتا اور سوال اگر دونوں میں سے صرف ایک ہی کے انتخاب کا ہوتا تو عید الفطر کو چھوڑ کر عید الضحیٰ کو منتخب کرتا ـــ پھر جس طرح ہندو تہواروں کے مخصوص آداب و عبادات کی ریہرسل مسلمان لڑکوں پر بھی لازم کی گئی ہے اسی طرح عید الضحیٰ کی مخصوص عبادت ـــ قربانی کو بھی کم سے کم اس حد تک تو تمام مسلم و غیر مسلم لڑکوں کے لئے ضروری قرار دیتا کہ مسلمان لڑکوں کے سرپرست اسکول ہی میں لاکر اپنی قربانیاں کیا کریں اور تمام طلباء اس تقریب میں شریک ہوں۔ پھر نماز عید مع خطبہ پڑھی جائے اور غیر مسلمین بھی اس میں حصہ لیں۔

بات بظاہر تمسخر کا انداز رکھتی ہے، مگر غور کیجئے تو اس میں شمہ برابر تمسخر نہیں۔ جو نفرت اکثریت کی طرف سے قربانی کے باب میں ظاہر کی جاتی ہے اس سے بڑھ کر نفرت اسلام کو بت پرستی سے ہے اور دنیا کے تمام عیوب بھی مل کر شرک و کفر کی برابری نہیں کر سکتے۔ اگر اسی کا نام سیکولرازم ہے کہ مسلمان بچوں سے بت پرستی اور اس کے لحقات میں عملی شرکت کرائی جائے اور بار بار کرائی جائے تو اسی سیکولرازم کا ادنیٰ سا تقاضا یہ بھی ہونا چاہئے کہ غیر مسلم کو سال میں کم سے کم ایک بار تو قربانی کے مناظر سے بہرہ اندوز کیا جائے، بلکہ اگر تہواروں میں کام آنے والے ساز و سامان کا انتظام اسکولوں ہی کو کرنا ہے تو قربانی کے جانوروں کا اہتمام بھی اسکول ہی کے ذمے قرار پاتا ہے۔

مگر یہ درسِ انصاف ہم کہاں لے بیٹھے ـــ مذہبی جارحیت کے چہرے پر دبیز پردے تو پہلے بھی نہیں تھے ـــ ریشم اور حریر

چھپتے چھپتے:۔ شکر ہے کہ ایک تازہ اطلاع کے مطابق محکمۂ تعلیم نے اپنے اس طرفہ پراسپکٹس کو واپس لے لیا ہے۔ تجلی

گھونگٹوں سے اس کے خدوخال پہلے ہی صاف نظر آرہے تھے۔
اب یہ ہیں گھونگٹ بھی اُٹھتے جارہے ہیں اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے کہ قومی ایکتا، جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد جیسے خوبصورت الفاظ سے ہمارے نیتاؤں کی کیا مراد ہے۔
تمام ہندی مسلمانوں کے لئے بیحد فکر کا مقام ہے کہ انھیں کیا کرنا ہے ــــ خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے اکابرین پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس صورت حال کے بارے میں فتویٰ جاری کریں۔ ابھی انھوں نے کرنل ناصر کے ایمان کی تصدیق میں فتویٰ صادر کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی ــــ متذکرہ صورت حال بہر نوع اتنی اہم ہے کہ اس کے بارے میں دارالعلوم کی توضیح و افتاء کی شدید ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔
مگر ــــ اللہ معاف کرے ــــ ہمیں اُمید نہیں ہے کہ ہمارے اکابرین اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوسکینگے۔ ان کی غالب اکثریت کا یہ حال ہے کہ جب تک انھیں تنخواہ ملتی رہے وہ اس سے بالکل بے نیاز ہیں کہ ان کے ملک میں دین ملت پر کیا گذر رہی ہے اور آنے والی نسل کے لئے زمانہ کون سے سانچے تیار کر رہا ہے۔
پھر کیسے رہنما کرے کوئی ؟
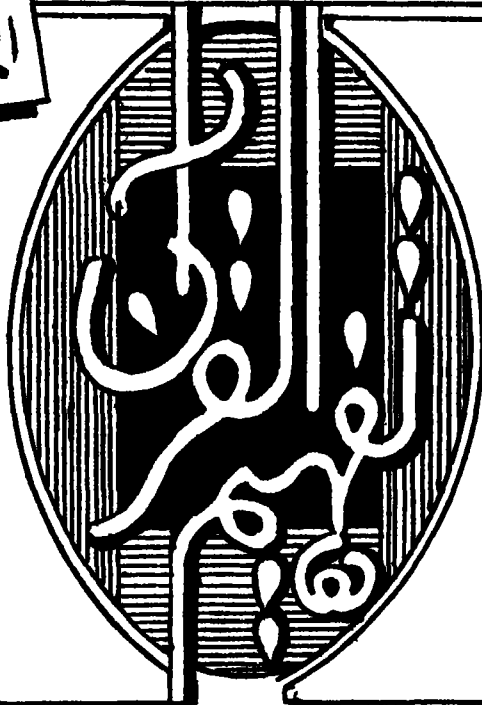
اللہ نور السمٰوات والارض
سورۂ نور
تفہیم القرآن
ابوالاعلیٰ مودودی
مفسرین و مجتہدین اور محدثین و فقہاء کی قانونی بصیرت اور اجتہاد و تفقہ کا شاہکار
اس سورۃ کی اہمیت و ضرورت اور اسکی گرانمایہ تفسیر کی رفعت و افادیت ہی کے پیش نظر اسے "تفہیم القرآن" سے الگ مستقل شکل میں چھاپا گیا ہے
جلد طلب فرمائیے ورنہ پھر شاید نہ مل سکے۔
سورۂ نور اسلام کی اہم ترین اور بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس کی تفسیر میں مولانا مودودی کے علم و فہم اپنے شباب پر نظر آتے ہیں۔
یہ تفسیر آپ کو بتائیگی کہ ائمۂ مجتہدین نے کتنی ژرف نگاہی، محنت شاقہ اور بیدار ذہنی کے ساتھ قرآن و سنت کے اصولوں سے فروعات کا استنباط کیا ہے۔
• محققانہ لیکن عام فہم
• گہری لیکن سلیس
قسم اوّل
چار روپے
ایک ساتھ ۵ طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف
مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

عامر عثمانی

فشار کی زبان

اپریل و مئی سنہ ۶۲ء کے تجلی میں آسام کے کسی حسین احمد صاحب نے ایک سوال کیا تھا اور ہم نے اس کا جواب دیا تھا۔ جن قارئین کو مستحضر نہ رہا ہو وہ یہ شمارہ اٹھا کر سوال و جواب پھر ایک بار پڑھ لیں اور اس کے بعد وہ ریمارک ملاحظہ فرمائیں جو اس پر حافظ امام الدین رام نگری صاحب نے فرمایا ہے۔

حافظ صاحب ہم سے بہت دنوں سے خفا ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی خفگی بجا ہو، لیکن اس خفگی کے اظہار میں وہ جو روش اختیار کرتے ہیں وہ کسی طرح اس لائق نہیں ہوتی کہ کسی شریف اور فہمیدہ انسان کے شایانِ شان سمجھی جا سکے۔ عیب کو بھی ہنر چاہیئے۔ گالیاں بھی اگر دینی ہیں تو سلیقے اور ہنرمندی کو بالائے طاق نہیں رکھ دینا چاہیئے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ایک کہنہ مشق اور معروف قلمکار ہوتے ہوئے بھی ان کا قلم جوش اور غصے سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ ان کی صلواتوں میں ذوقِ سلیم کو کُند کرنے والی گراوٹ اور طبعِ سلیم کو متوحش کرنے والا بھونڈا پن بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

تازہ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"رہے عامر صاحب تو وہ اس قماش کے انساں ہیں کہ جن مولانا مودودی کی حمایت میں وہ اپنے استاد مولانا مدنیؒ سے ٹکر لیتے ہوئے نہ جھجکے، ضال و مضل علمبردار یزیدیت محمود احمد عباسی کی حمایت میں خود مولانا مودودی سے ٹکرا گئے عامر صاحب کے نزدیک ہم کس شمار میں ہیں۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر مفتی اور اساتذہ سب بدعقیدہ ہو چکے۔ دیوبند کی آبرو صرف عامر صاحب ہیں۔

اپریل و مئی سنہ ۶۲ء کے تجلی میں احمد حسین صاحب کا سوال اور عامر صاحب کا جواب شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"قیام نحو جیشہ کے برگ و بار میں سے ہے جس کی تہ میں افراط و تفریط اور شرک کی زمین میں پھیلی ہوئی ہیں"

دینی اجارہ داری کا یہی متکبرانہ زعم اور حق پرستی کا یہی سودائیانہ کبر ہے جس نے ملت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی تحقیق اور اپنا مسلک بیان کرنے کی بجائے دوسروں پر شرک و بدعت کا حکم لگائے گا تو دوسرے اسکو کیوں نہ کافر اور بدعقیدہ قرار دیں گے؟ کتاب و سنت کے برخود غلط زعیم عامر صاحب ادھر آئیں اور دیکھیں، اکابر دیوبند کے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ العزیز اپنے "فیصلۂ ہفت مسئلہ" میں میلاد و قیام کے متعلق کیا فرماتے ہیں:۔

"مشرب فقیر کا یہ ہے کہ ہر سال محفل مولد شریف ذریعۂ برکات سمجھ کر منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لذت محسوس کرتا ہوں"

حضرت حاجی صاحبؒ نے اس بارے میں علماء کو وصیت فرمائی ہے "کہ وہ اپنی اپنی تحقیق پر عمل کریں اور عوام اس اختلاف کو حنفی و شافعی کے اختلاف کے مثل سمجھیں"

ہم مفتیٔ تجلی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ حضرت حاجی صاحبؒ کے عمل و وصیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور کیا کہتے ہیں اکابر دیوبند کے بارے میں۔ حدیث میں ہے کہ

ہر بدعت ضلالت ہے اور ہر ضلالت دوزخ میں لیجانے والی ہے اور بدعتی کا احترام بھی دین کے انہدام کا باعث ہے پھر بدعتی اور مشرک سے تصوف کی بیعت کس کتابِ سنت کی رو سے جائز ہے؟ عامر صاحب بغلیں نہ جھانکیں سامنے آکر جواب دیں۔

عامر صاحب نے جو یہ فرض کر کے کہ مولانا ابو الوفا صاحب بھدوہی کے جلسے میں پھنس گئے تھے ان کی حمایت میں خامہ فرسائی کی ہے وہ بالکل لغو ہے اگر وہ اپنے مسلک میں صادق ہوتے تو جب قیام ہوا وہ جلسے سے اٹھ جاتے اور جب ان کو تقریر کا موقع دیا گیا قیام کے بدعت ہونے پر واشگاف تقریر کرتے۔

عامر صاحب کی حق پسندی کا یہ حال ہے کہ جن مولٰنا ابوالوفا صاحب کے بارے میں خود انھوں نے دو سال ہوئے تجلی میں شائع کیا تھا کہ مولانا شاہجہانپور سے چادر لیکر بہرائچ آتے ہیں اور غازی میاں کے مزار پر چڑھاتے ہیں، وہ تو ہیں موحد، متبع سنت اور قیام کرنے والے مشرک اور بدعتی ہیں۔ ع

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود"

طنز و طعن اور عناد و اشتعال سے لبریز اس قلم پارے کا ادبی مقام کیا ہے اسے ہم ادب شناس قارئین کی قوت تمیزی پر چھوڑتے ہیں۔ حافظ صاحب تمام حالات میں بہت اچھا لکھتے ہیں، لیکن جب غیظ و غضب کی شدت ان کی [illegible] بجلی گرا رہی ہے تو ایسا ہی نظر آتا ہے جیسے کسی نے کھال کھینچکر چربی اور گوشت کے لوتھڑے سامنے رکھدیے ہوں۔ بڑھاپے میں ان کے جوش و خروش کا یہ عالم ہے تو نہ جانے جوانی میں کیا رہا ہوگا۔

بہرحال ان کے اندازِ گفتگو اور اسٹائل پر نقد کرنا ہمیں مقصود نہیں ہے۔ البتہ اُن مغالطہ انگیز مطالب پر ضرور کچھ کہیں گے جنھیں انھوں نے اپنے اس پاکیزہ شہ پارے میں سمو دیا ہے۔

حافظ صاحب انگلینڈ میں نہیں رہتے۔ تجلی بھی برابر ان کے پاس پہنچتا ہے انھیں خوب معلوم ہے کہ حضرت مہتمم صاحب ہوں یا جناب صدر مفتی صاحب، عامر نے کبھی ان کے بارے میں علی الاطلاق یہ نہیں کہا کہ یہ بدعقیدہ ہوگئے ہیں۔ ان حضرات سے جب بھی بقول حافظ صاحب "ٹکر" ہوئی مسائلِ علمی و دینی ہی کے سلسلے میں ہوئی۔ مثلاً صدر مفتی حضرت مہدی حسن صاحب مدظلہ نے فتویٰ صادر فرمایا کہ رسول اللہؐ کا سایہ نہ ہونے کا عقیدہ علمائے دیوبند کے نزدیک برحق ہے تو ہم نے شد و مد کے ساتھ اس کی تردید کی۔ تجلی کا فائل اُٹھا کر دیکھیے۔ یہ تردید یاوہ گوئی کے انداز کی نہیں تھی اس میں ثبت اور منفی دونوں طرح کے وافر دلائل مہیا کئے گئے تھے اور خدا کے فضل سے یہ اس حد تک کافی شافی ثابت ہوئی کہ اس کا رد نہیں کیا جا سکا۔

اب اگر اسی صورتِ حال کو حافظ صاحب ان طعن آمیز الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں کہ عامر کے نزدیک مفتی اور اساتذہ سب بدعقیدہ ہیں تو انصاف سے کہیے کیا یہ اندازِ تعبیر متین اور شریفانہ ہے؟—

مہتمم صاحب دام ظلہ اور استاذ مکرم حضرت مولٰنا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے "ٹکرانے" کا جہاں تک تعلق ہے تو پہاڑ اور چیونٹی کی ٹکر ہی کیا، لیکن حافظ صاحب اچھی طرح جانتے ہیں اور تجلی کے بیشتر قارئین بھی واقف ہیں کہ یہ معاملہ کس نوعیت کا تھا۔ صورت یہ تھی کہ ان محترم حضرات کی طرف سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف نہایت مغالطہ انگیز قسم کے اعتراضات والزامات اُچھالے جا رہے تھے۔ اس وقت ہم نے خود کو مجبور پایا کہ تلخ کو تلخ اور شیریں کو شیریں کہہ کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں۔ ہمیں اس کا یقیناً اعتراف ہے کہ مسائل کی بحث میں ہم نے یہ پروا بالکل نہیں کی کہ کون ہمارا استاد ہے اور کون غیر۔ کس سے ہمارا خونی رشتہ ہے اور کس سے سوائے اخوتِ اسلامی کے کوئی رشتہ نہیں۔ ہم نے صرف یہ دیکھا کہ نفسِ مسئلہ کیا ہے اور علمی و عقلی دلائل اس کے بارے میں کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ یہی وہ جرم ہے جس پر آج حافظ صاحب طنز و طعن کے ترکش خالی کر رہے ہیں، لیکن ارتکابِ جرم کے دور میں تو انھوں نے بھی اس طرزِ عمل کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ خود بھی مولانا مدنی اور دیگر علماء

سخت تنقیدیں کی تھیں جو مطبوعہ رسائل کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔

سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ دشمن کی نظر میں ہنر بھی عیب بن جاتا ہے۔ مختلف فیہ مسائل میں رشتہ و پیوند کا لحاظ کئے بغیر خالص عدل و آئین کے مطابق فیصلے دینا کل تک خوبی تھی آج حافظ صاحب اسے بُرائی اور عیب کے خانے میں رکھ رہے ہیں غالباً یہ ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں بھی ہمارے طرز عمل کو انھوں نے عیب ہی کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ یعنی عامر جو ہمیشہ مولانا مودودی کی حمایت میں پیش پیش رہا ہے اگر کسی مسئلہ میں مولانا مودودی سے اختلاف کر بیٹھا تو یہ بھی اس کا جرم قرار پایا۔

کوئی منصف مزاج اور فہمیدہ انسان تو عامر کے اس طرز عمل سے اس کے سوا کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ عامر اندھی عقیدت اور شخصیت پرستی میں مبتلا نہیں ہے۔ وہ مولانا مودودی کی ہزار تعریفیں کرنے کے باوجود ان کے ہر فکر اور ہر فیصلے پر آنکھیں بند کر کے آمنّا و صدّقنا نہیں پکار اٹھتا بلکہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اسے برملا ظاہر کر دیتا ہے۔

لیکن جب تعصب اور غصہ کسی آدمی کے فکری زاویوں کو ٹیڑھا کر کے رکھ دے تو اس کے نزدیک عدل، شرافت، منطق اور دیانت داری کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ دیکھ لیجئے حافظ صاحب کی نظر میں یہ بات بھی مستقل جرم ہی ہے کہ عامر کو مولانا مودودی سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اسے بھی اس منہ پھوڑ ہونے کھلے بندوں ظاہر ہی کر کے چھوڑا اور بقول ان کے "مولانا مودودی سے ٹکرا گیا"۔

میلاد کے قیام پر ہمارا ایک فقرہ نقل کر کے جو کچھ حافظ صاحب نے فرمایا ہے اس پر بے اختیار غلام احمد پرویز یاد آ گئے۔ یاد ہے پرویز ابھی کئی سو علمائے پاکستان نے ان کے کفر کا فیصلہ صادر فرمایا ہے۔ اس پر وہ کیسے کیسے جھلائے ہیں یہ داستان پُر لطف ہے مگر طویل بھی ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی بتانا کافی ہوگا کہ دیگر دل آزاریوں کے علاوہ وہ گل افشانی بھی انھوں نے کی ہے جو ہمارے حافظ صاحب کے ذہن مبارک پر آئی ہے۔ یعنی انھوں نے کہا کہ علماء کی تکفیر بازی نے ہمیشہ امت کو پارہ پارہ کیا ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ ایک مدعی اسلام کو کافر قرار دے وغیرہ وغیرہ

گویا پرویز صاحب اور حافظ صاحب کم سے کم اس نکتے پر متفق ہیں کہ شرک کو شرک، کفر کو کفر، بدعت کو بدعت نہ کہا جائے ورنہ امت میں انتشار پیدا ہوگا اور مشرکین و مبتدعین پلٹ کر خود کہنے والے پر یہی الزام عائد کریں گے۔

حافظ صاحب ہمیں ہٹلر اور مسولینی سے تشبیہ دیں یا فرعون و ہامان بنائیں ہم بہرحال ایمان کے اس آخری درجے سے فرار اختیار کرنے پر تیار نہیں کہ جن برائیوں کو ہم قوت سے مٹانے پر قادر نہیں ہیں انھیں بشرط استطاعت زبان سے بھی بُرا کہنا چھوڑ دیں۔ ہمارے نزدیک جلیل القدر بزرگوں کا یہی قول مشعل راہ ہے کہ جب اہل علم برائیوں پر نکیر کرنی چھوڑ دیں اور بدعت و معصیت کے معاملہ میں چشم پوشی، رواداری اور مفاہمت و مسامحت کی روش اختیار کر لیں تو وہ دین کے لئے بدترین زمانہ ہے۔ ہم اس ڈر سے کبھی شرک کو شرک اور بدعت کو بدعت کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اس کے جواب میں مشرک و بدعت کے رسیا ہمیں بھی کافر و مشرک قرار دینے لگیں گے۔ جس مسلمان کے دل میں شریعت سے محبت اور منکرات و بدعات سے نفرت کا جذبہ پژمردہ ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ رواداری اور رفق و نرمی اور مفاہمت ہی کے ظاہر فریب پردوں میں اپنی کمزوری کو چھپاتا ہے یہاں تک کہ وہ منزل آ جاتی ہے جس پر پہنچ کر بڑے معصوم اور صلح پسندانہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ بھائی سب اپنی اپنی جگہ حق ہیں کیوں مذہبی اختلافات اُبھار کر قوم کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرتے ہو۔

اور ذرا ہمارے الفاظ پر ایک بار اور نظر ڈال لیجئے۔

"یہ قیام اس شجر خبیثہ کے برگ و بار میں سے ہے جس کی جڑیں افراط و غلو اور شرک کی زمین میں پھیلی ہوئی ہیں"

یعنی ہم نے قیام کو براہ راست شرک نہیں کہا ہے بلکہ مشرکانہ طرز فکر سے اس کا رابطہ ظاہر کیا ہے۔ اس میں ہٹلر اور

مسولینی کی روح کہاں سے آگھسی اس کا فیصلہ ناظرین پر ہے۔ بات تو جب تھی کہ حافظ صاحب دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرتے کہ قیام کو مشرکانہ طرزِ فکر سے جوڑنا غلط ہے اس کے لئے توجیہی انداز نظر میں بھی پوری گنجائش موجود ہے۔ اس کے بعد وہ یہ کہنے میں حق بجانب نکلتے کہ اس کا رشتہ شرک سے مت جوڑو لیکن دلیل نام کی ان کے پاس کوئی چیز نہیں بس طنز و طعن ہی سے کام نکال لے جانا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر وہ ترشح کہیں گے کہ واہ میاں یہ تم نے کیا کہدیا۔ دلیل تو ہم نے پہاڑ جیسی پیش کی ہے۔ یعنی دیوبند کے شیخ الشیوخ حضرت حاجی صاحبؒ کا ارشاد عالیہ۔

اس کے جواب میں پہلی بات تو ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر حافظ صاحب کے نزدیک یہی طرزِ استدلال کافی شافی ہے تو انھوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے بزرگوں پر نقد و جرح کر کے خواہ مخواہ وقت برباد کیوں کیا۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ مولانا مدنیؒ بھی اپنے وقت کے بہت بڑے مرشد و شیخ تھے اور ان کے زہد و ورع سے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر حافظ صاحب نے ان کے آگے کیوں اسی نیازمندی سے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جس نیازمندی کے ساتھ حضرت حاجی صاحب کے آگے سراپا تسلیم ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک پیر، ایک شیخ و مرشد کا کسی مسئلہ میں اپنا تاثر ظاہر کر دینا اگر اتنا ہی فولادی استدلال ہے کہ حافظ صاحب عامر بیچارے سے بغلیں جھنکوا سکتے ہیں تو پھر کیوں وہ اُن تأثرات و خیالات سے متفق نہیں ہوئے جو مولانا مدنی جیسے شیخ اور بعض اور مشائخ کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ اس وقت تو ان کے قلم نے طوفان برپا کر دیا کہ کسی کا پیر ہونا مسائلِ دینیہ میں حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ مگر آج جب ان کی محبوب بدعت "قیام" کا مسئلہ درپیش ہے تو اکیلے حضرت حاجی صاحبؒ ہی کے چند الفاظ آہنی برہان بن گئے ہیں۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

تجلّی میں پہلے بھی کسی موقع پر ہم یہ تذکرہ کر چکے ہیں کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم المرتبت بزرگ ہونے کے باوجود عرفی و اصطلاحی معنوں میں عالم نہیں تھے۔ آج پھر حافظ رام نگری صاحب کی مغالطہ انگیزی پر تنبیہ کی خاطر دہرا لیتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحبؒ بیشک بہت بڑے شیخ طریقت تھے مگر علماء میں ان کا شمار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میلاد اور قیام میلاد کے بارے میں ان کا جو تأثر اور وصیت نما مشورہ حافظ صاحب نے نقل فرمایا ہے اس سے آگاہ ہونے کے باوجود اکیلے عامر عثمانی نے ہی نہیں تقریباً تمام ہی علمائے دیوبند نے میلادِ مروجہ کو بدعت اور قیام کو مذموم قرار دینے میں تأمل نہیں فرمایا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا مفتی عزیز الرحمان، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ نیز مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام ظلہ یہ سب حضرات وہ ہیں جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی ارادت و عقیدت پر فخر کرتے اور انھیں بہت بڑا مرشد و شیخ تصور کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے میلاد اور قیام میلاد کے متعلق حضرت موصوف کے تأثر، عمل اور وصیت کو نظرانداز کر کے برملا ان اُمور پر نکیر کی ہے، ان کے بدعت ہونے کا حکم لگایا ہے۔ ان کی تردید و مذمت میں فتوے دیئے ہیں، رسالے لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر فتاویٰ رشیدیہ کا ایک سوال و جواب دیکھئے:-

سوال:- مروّجہ مجلس میلاد بدعت ہے یا نہیں؟

جواب:- مجلس مولود مروّجہ بدعت ہے اور بہ سبب خلط اُمور مکروہہ کے مکروہ تحریمہ ہے اور قیام بھی بوجہ خصوصیت کے بدعت ہے۔

حکیم الامۃ مولانا اشرف علیؒ نے مولود کے بارے میں استفتاء کا جواب دیتے ہوئے اس کے مروّجہ طریقے کو بدلائل بدعت ثابت فرمایا اور پھر قیام کے بارے میں فرماتے ہیں:-

" ذکر ولادت کے وقت کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر اس میں بعض کا عقیدہ تو یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف رکھتے ہیں۔

یہ تو بالکل شرک ہے اگر علم یا قدرت بالذات کا عقیدہ
ہو۔ ورنہ کذب وافتراء علی اللہ والرسول ہے اور
بعض کہتے ہیں کہ ہم واسطے تعظیم ملائکہ کے جو کہ اس
وقت موجود ہیں کھڑے ہوتے ہیں یہ بھی جہل ہے۔
اوّل تو ملائکہ ہر وقت آدمی کے ساتھ رہتے ہیں محفل
ذکر کی کیا تخصیص ہے اور اگر محفل ذکر ہی کی تخصیص ہے
تو محفل ذکر ولادت کی کیا تخصیص ہے اور اگر اسکی
بھی تخصیص ہے تو خاص وقت ذکرِ ولادت کی کیا تخصیص
ہے کہ اس وقت ملائکہ کی تعظیم ہو اور وقت نہ ہو اور
اگر محض تعظیم ذکر کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اگر سوا
اس محفل کے اور کسی جگہ کوئی ذکر کرے کہ حضرتؐ پیدا
ہوئے تو کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی
ایک حرکتِ لغو و بیہودہ ہے۔"

(امداد الفتاوی جلد پنجم کتاب البدعات)

دیکھ لیجئے اکابر دیوبند مولود اور قیام کے سلسلے میں اپنے
مقتدائے طریقت حضرت حاجی صاحبؒ کی اس وصیت پر
بالکل عمل نہیں کرتے کہ اس سلسلہ کے اختلاف کو حنفی و شافعی
اختلاف کی حیثیت دی جائے بلکہ کھُل کر، ڈٹ کر، اصرار و تکرار
کے ساتھ بدعت و معصیت ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ یہ حال
کسی ایک دو دیوبندی عالم کا نہیں، بلکہ جو علماء حضرت حاجی
صاحبؒ سے مرید بھی تھے انھوں نے بھی میلاد کے معاملہ میں
ان کی پیروی نہیں کی نہ عملاً نہ عقیدتاً۔

کیوں؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ حافظ صاحب
کی سمجھ میں تو اس لئے نہیں آئیں گے کہ عامر جیسے سر پھرے
کی بات پر متانت سے توجہ کرنا ان کے بس سے باہر ہے
لیکن عام قارئین انھیں بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحبؒ مولود کی جو
محفل منعقد فرمایا کرتے تھے وہ اس انداز کی نہیں ہوتی تھی جس
انداز کی محفلیں بعد میں رواج پا گئی ہیں۔ نہ تو ان کی محفل
میں روشنی اور پنڈال وغیرہ کا بیجا اسراف ہوتا تھا۔ نہ
اس میں فسّاق و فجّار اور بازاری قسم کے لوگ شریک
ہوتے تھے۔ نہ گانے بجانے کے انداز میں نعتیں اور درود و سلام
پڑھے جاتے تھے۔ نہ مبالغہ آمیز واہی تباہی روایتیں بیان
ہوتی تھیں۔ نہ مٹھائیوں کا اہتمام تھا نہ اتنا وقت صرف کیا
جاتا تھا کہ تہجد گذاروں کا تہجد اور جماعت سے پڑھنے والوں
کی نماز فجر غارت ہو جائے۔

اس طرح کی سادہ و پاکیزہ مجلس اگرچہ ہر سال کی پابندیِ وقت
کے باعث علمائے دیوبند کے نزدیک بدعت ہی ہے، لیکن
بہر حال اُن لغویات و منکرات سے خالی ہونے کے باعث
جو آج کی محفلوں میں پائے جاتے ہیں اس کی قباحت دبی ہوئی اور
مغلوب تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحبؒ اپنی اس
بدعت پر مصر نہیں تھے۔ وہ اپنے اُن مریدوں تک کو شرکت میلاد
پر مجبور نہیں کرتے تھے جنھیں علمی اعتبار سے میلاد کے انعقاد سے
اختلاف تھا۔ چنانچہ جو بعض علماء ان کے جوتے اُٹھانے باعث
فخر سمجھتے تھے انھوں نے میلاد کی حد تک ان سے عملی اور ذہنی
اختلاف ہی قائم رکھا۔ وہ شیخ کے بارے میں یہ تاویل کر لیتے
تھے ــــ اور اس میں حق بجانب بھی تھے کہ حضرت شیخ نیک دل
اور معصوم صفت انسان ہیں۔ علمی مباحث کی اُن باریکیوں سے
واقف نہیں ہیں جن سے واقف ہونے کا مدار اصطلاحی
معنوں میں عالم ہونے پر ہے۔ وہ حبِّ رسول کی رو میں میلاد
منعقد کرتے ہیں اور قیام کرتے ہوئے ان کے تصورات میں
شرک کی آمیزش نہیں ہوتی۔ رہی یہ بات کہ حضرت موصوف
میلاد اور قیام میں لطف و لذت محسوس کرنے کا اعلان و اظہار
کرتے ہیں تو اس اعلان کو ان کے خادموں نے مسئلہ شرعی کے
تصفیہ میں اس لئے مفید نہیں سمجھا کہ وہ جانتے تھے جہاں تک
ذہنی و روحانی لطف و لذت کا تعلق ہے وہ علمی مسائل میں کسی
کام نہیں آسکتی۔ لطف و لذت تو وہ نیک دل ہندو بھی محسوس
کرتے ہیں جو توجہ اور انہماک کے ساتھ من رہن بھجن سنتے ہیں
یا پہاڑ کی گپھا میں دھونی رماتے ہیں۔ ذہنی سرور و تسکین اور
روحانی لطف و لذت تو نیک طبع یہود و نصاریٰ کو بھی اپنی عبادتوں
میں حاصل ہوتی ہے۔ قوال جب ہارمونیم اور طبلے کے تال سُر پہ

قوالی الاپتا ہے تو نام نہاد صوفیاء کو بھی یقیناً لطف و لذت کا احساس ہوتا ہے۔ رات کے سناٹے میں کوئی فنکار بانسری بجا رہا ہو تو بڑے بڑے ثقہ حضرات کو بھی اس سے پیام کیف و سرور مل سکتا ہے۔

غرض لطف و لذت کا حاصل ہونا کسی فعل کے مستحسن ہونے کی دلیل نہیں۔ بسا اوقات اس لطف و لذت کی بنیاد آدمی کے اپنے ذہن و قلب میں ہوتی ہے۔ خیالات کی پاکیزگی اس فعل کے قبیح پہلوؤں پر توجہ نہیں کرنے دیتی۔ اِن لطیف حقائق سے حضرت حاجی صاحبؒ کے اہلِ علم ارادت مند آگاہ تھے، اسی لئے انھوں نے شیخ کے تأثر اور وصیت کو یہ اہمیت نہیں دی کہ قرآن و سنت کے دلائل جن امور کو بدعت باور کرا رہے ہوں انھیں مستحسن مان لیں اور بدعت و سنت کے اختلاف کو حنفی و شافعی جیسا اختلاف خیال کر لیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے تمام عقائد و تصورات سب کے سامنے تھے ان میں ان کے اہلِ علم ارادتمندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشرکانہ اور غالیانہ واہی عناصر کی شمولیت نہیں پائی، بلکہ یہی دیکھا کہ توحید ان کے دل و دماغ میں رچی بسی ہے۔ لہٰذا یہ قیاس کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ سال بہ سال میلاد منعقد کرنے کے پیچھے حبِ رسول کا سیدھا سادھا ذہن کار فرما ہے اور قیام کی تہہ میں ایک معصوم سے تصورِ تعظیم کے سوا کوئی غلو آمیز عقیدہ موجود نہیں ہے۔ اس قیاس کے تحت انھوں نے شیخ کے طریق کو صرف گوارا کیا پیروی پھر بھی نہیں کی۔

اس کے برخلاف اب جو لوگ میلاد اور قیام جیسی بدعات کے علمبردار ہیں ان کی عملی اور ذہنی حالت کو حضرت حاجی صاحبؒ کے عقیدہ و عمل سے کوئی نسبت نہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ تو اپنے مریدوں تک سے شرکتِ میلاد کا اصرار نہیں کرتے تھے مگر آج کے ائمہ میلاد اُن لوگوں کو کافر و بے دین کہنے تک میں تأمل نہیں کرتے جو میلاد اور قیام کو بدعت قرار دیں۔ شرکت نہ کرنیوالوں کے لئے وہابی بے دین کا طعنہ تو عام ہے۔ میلاد بازی کو مستقل جشن بنا لیا گیا ہے۔ اس کے مخالفین کے لئے بد سے بدتر خطابات وضع کئے گئے ہیں۔ نماز، روزہ، حج قضا ہو جائے مگر قضا نہ ہو تو سال کے سال میلاد قضا نہ ہو۔ پھر اسراف و تبذیر کا یہ عالم کہ چراغاں بھی ہے۔ شیرینیوں کی تقسیم بھی ہے۔ ڈیرے اور پنڈال بھی ہیں۔ بوالفضولی کا یہ عالم کہ جتنی مبالغہ آمیز اور دیو مالائی انداز کی باتیں ہو سکتی ہیں سب کا ورد۔ حضورؐ کی اصلی تعلیم غائب،[۱] ان کی تعلیم پیش میش عملی پیروی سے کوئی سروکار نہیں زبانی مدح سرائی میں ساتویں آسمان تک پرواز۔

مزید یہ کہ ایک میلاد تک بس نہیں اب تو بدعات کا ایک پورا کنبہ میلاد کے شجرۂ نسب سے منتھی ہو گیا ہے۔ میلادی عوام و خواص کو آپ دیکھیں گے کہ عرس و قوالی، نذر و نیاز، فاتحہ، چہلم اور الاپلا نہ جانے کن کن ایجادات و بدعات سے ان کا رشتۂ عقیدت استوار ہے۔ شریعتِ حقہ کے بالمقابل ایک مستقل قبوری شریعت ایجاد کر لی گئی ہے اور انتہائی اصرار ہے کہ اس نو ایجاد شریعت کو کفر و اسلام کی کسوٹی مانا جائے۔ خوش عقیدگی اور بدعقیدگی کا مقیاس قرار دیا جائے۔

یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ آج کل کے ائمہ میلاد کے بارے میں وہ حسن ظن قائم کیا جا سکے جو حضرت حاجی صاحبؒ کے بارے میں قائم کرنا قرین قیاس تھا۔ ان حضرات کی ذہنیت اور آئیڈیالوجی تو یہ ہے کہ ان اللہ کے بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بھی وثوق نہیں۔ کچھ تو صاف طور پر بشریت کے منکر ہیں اور جو شخص حضورؐ کو بشر کہے اسے گمراہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ بین بین ہیں کہ نہ صاف اقرار نہ انکار۔ حضورؐ کے حاضر و ناظر ہونے کا صریح مشرکانہ عقیدہ ان کی کتاب عقائد میں سرِ عنوان نظر آتا ہے حضورؐ کے عالم الغیب ہونے پر اس حد تک اصرار ہے کہ جو ان کی ہمنوائی نہ کرے وہ وہابی بے دین۔

ان حالات میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ رسم قیام پر عمل کرتے ہوئے ان کے تصورات سادہ و معصوم ہو سکتے ہیں۔ پھر جو عوام ان کے بھرے میں آئے ہوئے ہیں — اور ان کی تعداد بڑی وافر ہے — ان سے یہ توقع رکھنا مضحکہ خیز حد تک غلط ہے کہ رسمِ قیام کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے اذہان ایسی توجیہات کے حامل ہو سکیں گے جو اس فعل کو شرک کی آلودگی سے بچا لے

ہیں۔

آپ نے دیکھ ہی لیا کہ اگر قیام کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا عقیدہ ہو تو حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ اس پر صریح الفاظ میں شرکِ خالص کا حکم لگاتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے دیگر ارادت مند علماء بھی اسی فیصلے سے متفق ہیں۔ اب حافظ صاحب ان حضرات کو ہٹلر کہیں مسولینی یا تفریقِ امت کا مجرم قرار دیں بہرحال یہ بالکل مسلّم ہے کہ بدعتی پیشواؤں کے چکّر میں آئے ہوئے عوام محفلِ میلاد میں درود و سلام کے وقت جب قیام کرتے ہیں تو شعوری اور نیم شعوری طور پر ان کا یہی نقطۂ نظر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نہ کسی حیثیت میں تشریف لے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک عام آدمی صاف طور پر نہ بتا سکے کہ وہ کیوں قیام کرتا ہے لیکن یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ تعظیماً کھڑے ہونا صرف اس لئے نہیں ہو سکتا کہ درود اور سلام بجائے خود محترم چیزیں ہیں۔ وہ بچپن سے جانتا اور مانتا ہے کہ کائنات کی سب سے مقدس کتاب — کتاب اللہ کو بھی بیٹھ کر ہی تلاوت کرنے کا حکم ہے نہ کہ کھڑے ہو کر۔ نماز میں درود بھی بیٹھ کر ہی پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا قیام کا تعلق کسی ہستی اور شخصیت ہی کی تعظیم و تکریم سے ہو سکتا ہے نہ کہ الفاظ و اوراد کی تعظیم سے۔ یہ تخیل ہر مسلمان کے ذہن میں رچا بسا ہے اس لئے میلاد میں قیام کرتے ہوئے چاہے وہ شعور کی پوری بیداری کے ساتھ یہ تصور نہ کرے کہ اللہ کے رسولؐ تشریف لے آئے ہیں، لیکن نیم شعوری اور تحت الشعوری اعتبار سے اس کے اس عمل کا محرک یہی غلط ترین اور مشرکانہ تصور ہوگا کہ اللہ کے رسولؐ تشریف لے آئے ہیں۔

اگر ہمارا تجزیہ غلط ہے تو حافظ رام نگری صاحب تصریح فرمائیں کہ قیام کے جواز و استحسان پر وہ کیا دلائل رکھتے ہیں اور کب سے انھوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ بدعات و شرکیات کے ساتھ رواداری اور مفاہمت کا برتاؤ کیا جائے۔

انھوں نے فرمایا:۔

"اگر ایک شخص اپنی تحقیق اور اپنا مسلک بیان کرنے کی بجائے دوسروں پر شرک و بدعت کا حکم لگائے گا تو دوسرے اس کو کیوں نہ کافر و بدعقیدہ قرار دیں گے۔"

اس پر ہمیں پھر پرویز صاحب یاد آئے۔ وہ اور ان کے ہم مسلک بھی یہی شور مچا رہے ہیں کہ مولویوں نے ہمیں کافر و گمراہ کیوں کہا۔

خیر پرویز صاحب کو اللہ کے سپرد کیجئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا جرم اس سے زیادہ کیا ہے کہ جو امور قرآن و سنت کی رو سے شرک و بدعت قرار پاتے ہیں انھیں ہم شرک و بدعت کہہ ڈالتے ہیں۔ اسلام کا سب سے پہلا کلمہ ہی گواہ ہے کہ آغاز نفی سے ہوتا ہے اثبات سے نہیں۔ لا الٰہ الا اللہ۔ پہلے تمام معبودانِ باطل کی نفی کی گئی پھر معبودِ حقیقی کے اعتراف کی نوبت آئی۔ زمین کو اچھی فصل کے لئے تیار کرنا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے زمین کے جھاڑ جھنکاڑ اور روڑے صاف کئے جائیں۔ قرآن و حدیث کو دیکھئے۔ ان میں مسلکِ صحیح کے اثبات و ایضاح کے ساتھ ساتھ شد و مد کے ساتھ باطل مسالک و عقائد کی تردید و مذمت بھی موجود ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے بار بار تصریح و اعلان کے ساتھ معبودانِ باطل کی تغلیط و تردید، بدعات و معاصی کی مذمت اور باغیوں کی تکفیر کی ہے۔ عامر بھی اسی روش کا اتباع کرتا ہے۔ خود حافظ صاحب بھی عام حالات میں اسی چلن کے متبع ہیں۔ مگر قیام اور بعض دیگر تصوراتِ غالیہ سے ان کے مزاج نے ساز باز کر لی ہے اس لئے ان کی بحث میں وہ جو چاہے منطق اختیار فرما سکتے ہیں۔

ایک اور مغالطہ اندوزی ہے جس سے حافظ صاحب نے اپنے شذرۂ مذکورہ میں کام لیا ہے۔ وہ یہ کہ عامر نے اگر قیام کو زمینِ شرک پر اُگے ہوئے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار سے تشبیہ دی تو انھوں نے اس کا مطلب یہ باور کرانا چاہا کہ عامر قیام کرنے والوں کو مشرک قرار دے رہا ہے۔

ان کی اس عبارت پر غور کیجئے:-

"پھر بدعتی اور مشرک سے تصوف کی بیعت کس کتاب و سنت کی رو سے جائز ہے؟"

یہ الفاظ بھی غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے تو کہے گئے ہیں کہ جب عامر کے نزدیک قیام شرک ہے اور حضرت حاجی صاحبؒ قیام کے عامل تھے تو وہ عامر کے نزدیک مشرک ہوئے!

انا للہ وانا الیہ راجعون

علوم دینیہ کے مبتدی بھی جانتے ہیں کہ کسی فعل کو مشرکانہ یا کافرانہ کہنے کا لازمی مطلب یہ نہیں ہوا کرتا کہ اس کا مرتکب مشرک یا کافر قرار پایا۔ قرآن و حدیث میں زنا، چوری، شراب نوشی اور سود خواری وغیرہ کو افعالِ کفر قرار دیا گیا ہے، لیکن اللہ کے رسولؐ سے لیکر آج تک کسی ثقہ عالم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان اعمالِ کافرانہ میں سے کسی کا مرتکب ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو کر کافر و مرتد قرار پائے گا۔ حدیث میں ریا کو بھی شرک قرار دیا گیا ہے لیکن پوری تاریخ اسلام میں کبھی کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جو شخص ریا کا مرتکب ہوا وہ مشرک ہو گیا اب یا تو اسے قتل کر دو یا توبہ کرا کے دوبارہ مسلمان بننے پر آمادہ کرو۔

اہل علم وقتاً فوقتاً اس بارے میں توضیح و تنبیہ بھی کرتے رہے ہیں اور خود ہم نے بھی تجلّی میں متعدد بار اسے اُبھارا ہے کہ جو عقائد و اعمال ہماری دانست میں کفر و شرک کے شجرۂ نسب سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حیثیت و حقیقت کی نشاندہی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے حاملین و مرتکبین کافر و مشرک قرار پا گئے۔

لیکن شاباش ہے حافظ صاحب کو کہ تجربات اور علم و مطالعہ کی ایک طویل عمر گذار کر بھی وہ اس ابتدائی قاعدے سے واقف نہ ہو سکے اور اگر واقف ہونے کے باوجود انھوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے تو اس پہلو سے شاباش کے مستحق ہیں کہ بڑھاپے کی منزل میں پہنچ جانے کے باوجود ان میں تلبیس و تدلیس کے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے کی جرأت و ہمت موجود ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے بارے میں ہم بہت کچھ کہہ چکے پھر بھی ایک نکتہ کو ذرا اور منقح کر دیں۔ حدیث کی یہ تصریح بے شک آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ:-

"بدعتی کا احترام انہدام دین میں معاونت کرنے کے مرادف ہے۔"

لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ میلادِ مروّجہ اور قیام کو بدعت تسلیم کرنے کے باوجود کیا یہ انصاف ہوگا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو "بدعتی" قرار دیا جائے؟

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں جس شخص کا جسم گٹھا ہوا، چہرہ سُرخ و سفید اور توانائی پوری طرح بحال ہو اسے صرف اتنی سی بات پر "بیمار" قرار نہیں دیا جائے گا کہ اس کی انگلی میں کبھی کبھی ایک دانہ نکل آتا ہے۔

یا ایک شخص بہت عابد و زاہد ہے، خوش کردار ہے، لوگوں کے کام آتا ہے، مصیبت زدوں کی مدد کرتا ہے، اخلاقِ عالیہ سے متصف ہے لیکن دن میں ایک گھنٹہ اس نے ایسا مقرر کر رکھا ہے کہ جس میں وہ کسی سے نہیں ملتا۔ کوئی مہمان بھی آجائے تو اسے مُنھ نہیں لگاتا، یہ فعل ظاہر ہے اخلاقِ عالیہ کے معروف معیار سے نیچا ہے۔ اس پر بعض حالات میں بد اخلاقی کا بھی اطلاق ہو سکتا ہے لیکن کیا تنہا اس فعل کی وجہ سے یوں کہہ دیا جائے گا کہ یہ شخص بد کردار ہے؟

اسی طرح آپ متعدد مثالیں سوچ سکتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسمائے صفت غالب احوال کے اعتبار سے بنتے ہیں۔ غالب بھی نہ سہی کم سے کم یہ تو طے شدہ ہے کہ کسی بھی اسم صفت کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جب اس صفت کا ظہور نمایاں طور پر ہو۔ اگر کسی انسان کو فاسق یا عاصی و خاطی کہنے کے لئے صرف اتنی ہی بات کافی ہوتی کہ کبھی نہ کبھی اس سے فسق یا خطا و معصیت کا صدور ہو گیا ہے تو دنیا میں کوئی شخص بھی انبیاء کے سوا ان مکروہ اسمائے صفت سے نہ بچ سکتا، کیونکہ انبیاء کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں

اس سے ثابت ہوا کہ محض میلاد اور قیام کی بدعت کو سادگی کے ساتھ اختیار کرنے کی وجہ سے حضرت حاجی صاحبؒ کو "بدعتی" نہیں کہا جا سکتا جب کہ ان کے غالب احوال و اعمال باطل کی آمیزش سے پاک اور ان کے عقائد و تصورات شرک و

شرک و زندقہ کی تلویث سے مبرّا نظر آ رہے ہوں۔

ہم جو میلاد کے شیدائیوں کو "بدعتی" کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ صرف میلاد کسی شخص کے بدعتی قرار پانے کے لئے کافی ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ میلادی حضرات کے دیگر احوال و افکار بدعات کی چھاپ سے خالی ہوتے اور صرف میلاد اور قیام ہی کا معاملہ وجہ نزاع ہوتا تو مستقلاً بدعتی کا خطاب ہرگز استعمال نہ کیا جاتا۔ مگر کون نہیں جانتا کہ جس طرح تنہا کوٹ پتلون یا محض داڑھی مونڈنا ایک مستقل بالذات مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پوری تہذیب مغربی سے ہے اور یہ چیزیں ایک خاص طرزِ فکر کے مظہر کی حیثیت رکھتی ہیں اسی طرح میلاد اور قیام میلاد بھی ایسے اُمور بن چکے ہیں جن کی حیثیت محض ایک فعل کی نہیں، بلکہ وہ خاص طرز فکر کے مظہر اور خاص آئیڈیالوجی کے نمائندے ہیں۔ جو لوگ میلاد اور قیام کے شد و مد سے قائل ہیں انھیں آپ نذر و نیاز، عرس و قوالی، قبر پرستی اور اولیاء و انبیاء کی شان میں غلو کیشی کا بھی رسیا ضرور پائیں گے انھیں "بدعتی" دراصل ان کے غالب یا کم سے کم نمایاں احوال و افکار ہی کے باعث کہا جاتا ہے نہ کہ محض میلاد اور قیام میلاد کے باعث۔

ابھی کچھ روز ہوئے دار العلوم دیوبند کے ایک مبلغ صاحب نے دوران گفتگو میں فخر کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ہم تو اب اس روش کو صحیح سمجھتے ہیں کہ نزاعی مسائل میں مفاہمت اور رواداری کی راہ اختیار کی جائے۔ آخر ہمارا کیا حرج ہے اگر اتنی سی بات پر صبر اور سمجھوتہ کرلیں کہ میلاد میں قیام کرلیا جائے۔

عاجز نے جواب دیا کہ مولانا بات اگر تنہا میلاد اور قیام کی ہوتی تو صبر اور سمجھوتہ بے شک ممکن تھا، لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ نزاع تو اس وسیع الذیل طرز فکر میں ہے جو تنہا میلاد و قیام تک محدود نہیں ہے، بلکہ اختلافی مسائل کا ایک پورا لشکر اس کے ذیل میں آتا ہے۔ اگر میلادی حضرات اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ میلاد اور قیام کی مخالفت سے باز آ جانے پر "وہابیوں" سے انھیں کوئی لڑائی نہیں رہے گی تو ہزار بار ہم رواداری کی راہ اختیار کر سکتے ہیں، لیکن جس طرح قرآن کی تصریح کے مطابق اہل کفر مسلمانوں سے اس وقت تک راضی نہیں ہوتے جب تک مسلمان پوری طرح ان کی ملت کا اتباع نہ کرنے لگیں اسی طرح یہ میلادی حضرات بھی ہم سے ہرگز راضی نہیں ہو سکتے جب تک ہم تمام ہی نزاعی مسائل میں اپنی آراء کو ترک کر کے ان کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

یہ سنکر مبلغ صاحب کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آئے اور انھوں نے فرمایا کہ یہ بات تو بے شک قابل غور ہے۔

لاریب رواداری اور ایجابی دعوت و تبلیغ کی تعریف کی جانی چاہیئے، لیکن یہ رواداری نہیں موت اور بے حسی ہے کہ تمام مذاہب کا برحق ہونا تسلیم کر لیا جائے اور شرک بدعت پر مشتمل افکار و اعمال کی نشاندہی میں نفاق و تساہل برتا جائے۔

پھر یہ امر واقعہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ جارحیت اور شخصی تکفیر کی روش بدعتیوں نے اختیار کی۔ علمائے دیوبند نے اور ہم نے صرف دفاع کیا ہے اور شخصی تکفیر سے مجتنب رہے ہیں بدعتیوں کے ائمہ نے دیوبندیوں کو وہابی کہتے کہتے کافر بھی کہہ ڈالا۔ پھر تو تکفیر کی ہوا ایسی چلی کہ دو دو بالشت کے بدعتی بھی اسمٰعیل شہیدؒ جیسے بزرگوں کو بے دین قرار دینے لگے اور بدعات کے شیوع پر وہ زور دیا کہ سنتوں کو پاؤں رکھنے کی جگہ ملنی مشکل ہو گئی۔ بدعت اور سنت میں آگ اور پانی کا بیر ہے ایک بدعت جمی تو سمجھو کہ ایک سنت اُکھڑ گئی۔ اب اگر علمائے حق ملت کے پارہ پارہ ہونے کے ڈر سے شرک و بدعت پر نکیر نہ کرتے اور خالی ایجابی انداز میں اپنا مسلک بیان کئے جاتے تو یقین کیجئے کہ یہ جو آج مبتدعین کے بالمقابل سنت پسندوں اور توحید پرستوں کا ایک محاذ پر موجود ہے یہ کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا اور ہر گلی کوچے میں بدعت ہی بدعت نظر آتی۔

مولانا ابوالوفاء کے تعلق سے حافظ صاحب نے جو اعتراض عام پر وارد فرمایا ہے وہ بھی لطیفے سے زیادہ نہیں۔ دو سال پہلے اگر ہم نے مولانا ابوالوفاء پر بعض نازیبا افعال کے

تعلق سے کوئی اعتراض کیا تھا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مولانا موصوف کے کسی فعل کی کبھی تعریف ہی نہ کیجائے تجلّی اُٹھا کر دیکھئے۔ سائل نے مولانا کے ایک ایسے عمل کا ذکر کیا ہے جو بظاہر جرأتِ ایمانی پر مبنی نظر آتا ہے۔ یعنی سارے مجمع کے قیام کرنے کے باوجود انھوں نے قیام نہیں کیا۔

نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے اور اگر بعض قرائن ایسے ہوں جن کی رو سے یہ فیصلہ دینا ممکن ہو کہ مولانا ابوالوفاء کا فعل مذکور جرأتِ ایمانی کے تحت نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کوئی گھٹیا جذبہ و احساس کارفرما تھا تو اس سے بھی ہمیں کوئی بحث نہیں۔ ہم تو سوال کی حد تک ذمہ دار تھے اور سوال میں اس فعل کو اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اسے جرأتِ ایمانی پر مبنی قرار دینا ممکن نظر آتا ہے لہذا ہم نے اسی کی حد تک مولانا کی تحسین کر دی۔ یہ اپچ تو خود حافظ صاحب کی ہے کہ عامر نے مولانا ابوالوفاء کو موحّد اور متبع سنت قرار دیا۔ بجلی دیکھ لیجئے ایسا بالکل نہیں ملے گا۔ عامر نے زیر بحث معاملہ کی قید کے ساتھ توصیفی کلمات سپردِ قلم کئے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص اوباش اور بدکردار ہو تو ہم اسکی برائی کریں گے لیکن کچھ دنوں بعد اگر ہمیں اطلاع دی جائے کہ اس نے ایک مظلوم کو کسی ظالم کے پنجے سے رہائی دلائی ہے اور سوال کیا جائے کہ اس کا یہ فعل کیسا ہے تو ہم [illegible] جواب دیں گے کہ یہ فعل لائق صد آفریں ہے۔

اس پر کوئی شخص یوں کہنے لگے کہ لیجئے صاحب جو آدمی جوا کھیلتا ہے، خائن اور آوارہ ہے اس کی یہ صاحب تعریف فرما رہے ہیں تو انصاف کیجئے کہ یہ معترض کتنا فتنہ پرداز یا پھر غبی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مظلوم کی حمایت کوئی بدترین شخص بھی کرے تو اس فعل کے تعلق سے وہ تعریف کا مستحق ہوگا اور اس تعریف کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جائے گا کہ اسکی تمام خراب حرکتوں کی توصیف کر دی گئی۔ ٹھیک اسی طرح مولانا ابوالوفاء اپنے اس فعل کی حد تک لائق تحسین ٹھیریں گے کہ مجمع سے مرعوب ہو کر انھوں نے اُس قیام کا ارتکاب نہیں کیا جسے وہ بدعت سمجھتے ہیں۔ مگر اس تحسین کا یہ مطلب نہیں لیا جائے گا کہ غازی میاں کے مزار پر چادریں چڑھانے والی حرکت کو مستحسن قرار دیدیا گیا اور انھیں موحد اور متبع سنت مان لیا گیا۔

بات خاصی لمبی ہوگئی، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس طوالت میں قارئین کو کام کے نکتے بھی ہاتھ آئے ہوں گے۔ چھوٹوں کا منصب بڑوں کو نصیحت کرنا نہیں اس لئے ہم نصیحت کی بجائے اس التماس والتجا پر کلام کو ختم کرتے ہیں کہ:-

محترم حافظ صاحب! آپ ستیارتھ پرکاش کے نقد و تبصرے اور اسی نوع کی دیگر چیزوں کے جائزے کا جو قیمتی کام کر رہے ہیں، نا یہی اگر اپنی ما بقی زندگی کے تمام لمحے اور اپنی تمام صلاحیتیں مرکوز فرما دیں تو آپ کے اور ملت کے حق میں بہتر ہوگا۔ خواہ مخواہ آپ ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ نہ تو یہ بات مفید ہے کہ آپ عامر سے اُلجھ کر اپنا اور اس کا وقت برباد کریں۔ نہ ہی یہ مفید ہے کہ رہ رہ کر آپکو محمود عباسی کی یاد ستاتی رہے۔ نہ صرف اپنے زیر بحث شذرے میں آپ نے اس پر تبرا کیا ہے بلکہ "خلافت معاویہؓ یزید" کے خلاف آپ کا ایک گرماگرم اور بھڑکتا دہکتا تازہ بتازہ مضمون بھی سامنے نظر آ رہا ہے جس میں آپ کی شیریں بیانی اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ:-

"خلافت معاویہؓ و یزید اس دنیا کی سب سے جھوٹی کتاب ہے اور اس کی ایک بات بھی قابلِ اعتماد نہیں۔"

اس انتہا پسندانہ لب و لہجے میں گفتگو کرنے والا اگر عامر کو ہٹلر اور مسولینی سے تشبیہ دے تو یقین کیجئے ہوشمندوں کو اسکی صحیح الدماغی میں شبہ ہو جائے گا۔

ہندی لٹریچر پر آپ نقد و تبصرہ کرتے ہیں تو یہ اس لئے مفید و قیمتی ہے کہ آپ ہندی جانتے ہیں، لیکن خلافت معاویہؓ و یزید پر زہر اُگلتے ہوئے آپ اخبار الطوال اور کتاب المعارف اور اشعۃ اللمعات اور بخاری و ترمذی سے استدلال کرتے ہیں تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جب ان میں سے بعض کتب کی تو آپ نے صورت تک نہیں دیکھی اور جن کی دیکھی ہے ان کی دو سطریں بھی آپ اپنی استعداد سے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ پرویزی

طریقہ جانے دیجئے کہ عربی سے تو فارغ البالی مگر دعویٰ ہے تفسیر قرآن اور اجتہاد و تفقہ کا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جن مسائل کی بحث میں عربی کتب کے بغیر چارہ نہ ہو انھیں آپ دوسروں کے لئے چھوڑ دیجئے اور اگر حکیم ہی نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ ٹانگ ضرور اڑاؤ تو پھر کم سے کم اتنی دیانت تو برتیئے کہ جن اُردو کتابوں سے آپ نقل فرماتے ہیں ان کا حوالہ دید یا کیجئے نہ یہ کہ براہِ راست اصل عربی کتابوں کے نام لکھ کر بے خبر قارئین پر یہ تأثر نازل فرمائیں کہ عربی لٹریچر پر ہماری بڑی گہری نظر ہے۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ ہماری اس تحریر پر آپ کا پارہ پھر چڑھ جائے گا اور دنداں شکن جواب دینے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن اے محترم بزرگ! ہماری التجا ہر حال میں یہی ہے کہ عمرِ گریزاں کی بقیہ ساعتوں کو غنیمت سمجھ کر اپنے شایانِ شان کاموں میں لگائیے اور عمِ حسین کے نوک پلک درست کرنے کے لاحاصل چکر میں مت پڑیئے۔ عامر اور محمود عباسی دونوں جہنم کے کندے ہیں تو آپ کیوں پرائے شگون کی خاطر اپنی ناک کٹواتے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

حقِ نصیحت تو ادا ہو گیا۔ میلاد و قیام کے سلسلے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ارشاد ہم نقل کئے دیتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے دیرینہ مداح ہونے کے باوجود حافظ صاحب کے لئے اگرچہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسئلہ میں ان سے اتفاق ہی کریں، لیکن اختلاف قوی دلائل کی بنا پر ہونا چاہیئے نہ کہ مجہولیتِ محض اور غائب دماغی کی بنیاد پر۔

زیر بحث قیام کا لغو و فاسد ہونا ہماری نگاہ میں ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس پر وثوق کرنے میں کسی ہوشمند کو کبھی تأمل نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص برسہا برس تک جماعت اسلامی کا بھی ہمنوا رہتا ہے اور پھر اچانک مبتدعین کے جھرمٹ میں بھی آجاتا ہے تو اس کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو بیس سال دلّی میں رہ کر صرف بھاڑ جھونکتا رہا۔

"تلاش راہِ حق" میں نقل شدہ ایک خط میں مولانا مودودی رقمطراز ہیں:۔

"اب فرمائیے کیا آپ مولانا مودودی کے اس بیان کو سچ سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ مولانا مودودی کی اس بات کو نہیں مانتے تو پھر لیجئے وہی بات آپ سے عرض کرنے دیجئے جو آپ نے مولانا عامر عثمانی کے بارے میں کہی ہے۔ یعنی "میدان میں آیئے اور بغلیں نہ جھانکئے"۔ اگر آپ مولانا مودودی کی بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ یہ بدعت ہے تو پھر بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے کہ آپ اور مولانا عثمانی ہم خیال ہیں!

محترمی! کسی بدعت کو محض طنز و استہزاء اور آتش بیانیوں سے برحق نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اگر آپ اسے بدعت نہیں سمجھتے تو کتاب و سنت سے دلیل لائیے۔ ویسے اگر آپ کو اس عمل پر محض ضد کی بناء پر اصرار ہو تو ذاتی حد تک محدود رکھئے۔ دوسروں کو خواہ مخواہ کیوں اس راہ پر لگانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

ایک گذارش اور کہ کم از کم "انوار اسلام" کو ان بکھیڑوں سے آلودہ نہ کیجئے۔ جس مقصد اور جس تحریک کو آپ لے کر آگے چلنا چاہتے ہیں اس کا میدان بہت وسیع ہے۔ اگر آپ ان بحثوں میں اُلجھ گئے تو پھر آپ کا اصل مقصد پہلے صفحہ ہی کی حد تک دفن ہو جائے گا۔ ہمیں انوار اسلام سے بہت کچھ مل رہا ہے (۱) غیر مسلموں کے اعتراضات کی نوعیت معلوم ہوتی ہے (۲) ان کے جوابات دینے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ (۳) غیر مسلموں کے مذہب کی اندرونی باتوں سے واقفیت ہوتی ہے (۴) دیگر مذاہب پر اسلام کی فوقیت کے دلائل معلوم ہوتے ہیں (۵) مسائل حاضرہ پر اصولی تنقید سے مستفید ہوتے ہیں (۶) سورۂ یٰسین پر آپ کے اضافات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غرض بے شمار طریقوں سے ہم مستفید ہو رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔"

مستقل عنوان — عامر عثمانی

تجلّی کی ڈاک

فنڈ کی زکوٰۃ

سوال:۔ از شمس نوید عثمانی - رام پور

سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے مختلف فنڈس میں جو ماہ بماہ رقم جمع کرائی جاتی ہے وہ رقم ختم ملازمت کے بغیر ملازم کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی۔ تو کیا ایسے روپے پر بھی سو سے زیادہ ہونے اور سال بھر کی مدّت گزرنے کے بعد زکوٰۃ فرض ہوجائے گی؟

الجواب:۔

مختصر جواب یہ ہے کہ فنڈ پر اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی جب اس پر قبضہ ہوجانے کے بعد سال بھر گذر جائے۔ اور زمانۂ ماضی کی زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی۔

لیکن فنڈ کا معاملہ چونکہ بہت عام ہے اور بعض علماء یہ بھی فتویٰ دیدیتے ہیں کہ زکوٰۃ پچھلے سالوں کی بھی ادا کرنی ہوگی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدرے تفصیل اختیار کی جائے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک فنڈ ملکیت میں نہیں آجاتا اسے محکمہ کے ذمّے قرض ہی تصور کیا جائیگا۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ کیا تمام قرضوں کی نوعیت یکساں ہوتی ہے؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہر طرح کے قرضوں کو ایک جیسا قرار دے کر ایک ہی جیسا حکم ان پر جاری کرنا عدل کے مطابق نہیں ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے جو قرضوں کی تین قسمیں کرکے ان کے جدا جدا احکام مستنبط کئے ہیں یہی بات آئینی انصاف کے مطابق بھی ہے اور دل لگتی بھی

امام صاحبؒ کے نزدیک قرضے تین نوع کے ہیں:۔

دَینِ قوی - دَینِ ضعیف - دَینِ متوسط -

(۱) دَینِ قوی وہ ہے جو نقد دیا گیا ہو یا مالِ تجارت کے بدلے واجب ہوا ہو (سونا چاندی نقد ہی میں شمار ہیں) مثلاً آپ زید کو ہزار روپے بطور قرض دیتے ہیں۔ یا آپ جنرل مرچنٹ ہیں اور زید آپ کی دوکان سے مختلف نوع کے سامان اُدھار خریدتا رہا ہے۔ یا زید نے دس تولہ سونا آپ سے قرض لے رکھا ہے۔ یہ سب صورتیں دینِ قوی کی ہیں۔ اس کا حکم امام صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ اس پر جتنے بھی سال گذرتے جائیں گے سب کی زکوٰۃ فرض ہوتی جائے گی۔ البتہ ادائگی اس وقت لازم ہوگی جب کم سے کم چالیس درہم کے بقدر وصولیابی ہوجائے۔

(۲) دینِ ضعیف وہ ہے جو کسی ایسی شے کے بدلے عائد نہ ہوا ہو جسے عرفِ عام میں "مال" کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً عورت کا

مہر۔ یا وہ رد یہ جسے عورت نے خلع کے بدلے ادا کرنا طے کیا ہو۔ یا وہ مالِ وراثت جو کسی وجہ سے بہت دنوں تک قبضے میں نہ آسکے۔ معلوم ہے کہ مہر مرد کے ذمے قرض ہی ہوتا ہے، لیکن یہ قرض "مال" کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ اس کا حکم امام صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب وصول ہونے کے بعد اس پر سال گذر جائے گا اس وقت اسی سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح مالِ خلع اور مالِ وراثت کو بھی کسی مال کا عوض قرار نہیں دے سکتے۔

(۳) دینِ متوسط وہ ہے جو اگرچہ مال ہی کے بدلے واجب ہوا ہو، مگر یہ مال نہ تو تجارت کا ہو نہ نقد کی حیثیت رکھتا ہو۔ مثلاً آپ مکانوں کی تجارت نہیں کرتے، بلکہ کسی وقتی ضرورت و مصلحت کے تحت اپنا ایک مکان زید کے ہاتھ قرض فروخت کر دیا تو یہ قرض دَینِ متوسط میں داخل ہے۔ مکان کے علاوہ جتنی بھی چیزیں انسان کی ضرورتِ اصلیہ میں شمار ہوتی ہیں جیسے ملبوسات، غذائیں، پانی پینے کا کنواں وغیرہ ان کی حیثیت قرض فروخت کرنے کی صورت میں مکان ہی جیسی ہے۔ دینِ متوسط کے متعلق امام اعظمؒ کی دو رائے منقول ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح دَینِ قوی پر تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح اس پر بھی واجب ہوگی، لیکن ادائگی ضروری اس وقت قرار پائے گی جب کم سے کم دو سو درہم یا چاندی کے نصاب کے بقدر وصولیابی ہو جائے۔ دَینِ قوی کی طرح صرف چالیس درہم کی وصولیابی پر ادائگی کا لزوم نہیں ہوگا۔

دوسری رائے یہ منقول ہے کہ دَینِ متوسط دینِ ضعیف جیسا ہے۔ دونوں کے احکام یکساں ہیں اور اسی رائے کو محققین نے زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیا ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے کہ ملازمین کے جو فنڈ زیرِ بحث ہیں ان کی کیا حیثیت ہے۔ انھیں قرض کی کس قسم میں داخل سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک ان کی حیثیت دَینِ ضعیف کے سوا کچھ بھی نہیں بنتی۔

دَینِ قوی ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اوّل تو خود محکمہ بھی اپنی طرف سے کچھ رقم اس رقم میں شامل کرتا ہے جو ملازم کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے۔ لہٰذا مجموعی رقم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ملازم ہی کی تنخواہ کا حصّہ ہے۔ دوسرے جتنی رقم تنخواہ میں سے کاٹی جاتی ہے اس کا بھی سسٹم یہ نہیں ہے کہ پہلے تو ملازم کو پوری تنخواہ ادا کر دی جائے پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ اتنے پیسے تم اپنے فنڈ کے لئے قرض دیدو۔ اسکی بجائے طریقہ یہ ہے کہ تنخواہ فنڈ کی رقم کاٹنے کے بعد ہی دی جاتی ہے اور ملازم کو اس کے بارے میں وہ اختیارات حاصل نہیں ہیں جو قرض دینے والے کو اپنے مال پر حاصل ہوتے ہیں لہٰذا اس قرض کی نوعیت دینِ قوی جیسی ہو ہی نہیں سکتی۔

رہا دَینِ متوسط تو اس کا بھی اطلاق اس پر مشکل ہے تنخواہ خدمت کا بدل ہے۔ خدمت کی حیثیت مال کی نہیں فقہاء میں اگر خدمت کے "مال" ہونے نہ ہونے پر اختلاف بھی ہے تو اس کا تعلق "غلام" کی خدمت و محنت سے ہے۔ چونکہ "غلام" بجائے خود "مال" ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض حالتوں میں اس کی خدمت بھی "مال" کے قائم مقام ہو جائے، لیکن مردِ آزاد کی حیثیت "مال" کی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی خدمت و محنت کو بھی فقہاء نے بالاتفاق "مال" کے زمرے سے خارج مانا ہے۔ اس صورت میں فنڈ کے روپے کا دینِ متوسط ہونا بھی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر احتمالاً اسے دینِ متوسط ہی سے جوڑ دیں تب بھی دَینِ متوسط کے بارے میں عرض کیا جا چکا کہ اسے دَینِ ضعیف کی صف میں رکھنا ہی امام اعظم سے قوی طور پر منقول ہے۔

پس حنفیہ کا صحیح ترین مسلک یہی ہے کہ فنڈ پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب وہ یا اس کا بقدرِ نصاب حصہ قبضے میں آکر سال بھر تک باقی رہ جائے۔ گذشتہ سالوں کا کوئی حساب نہیں کیا جائے گا۔

ہاں صاحبین (قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کی طرف بعض کتب میں یہ رائے منسوب کی گئی ہے کہ الدّیون کلہا سواء وکلہا قویۃ تجب الزکوٰۃ فیما قبل القبض (سارے قرضے ایک ہی جیسے ہیں اور انھیں دینِ قوی ہی سمجھا جائے گا جس کے نتیجے میں ان پر قبضے سے پہلے ہی زکوٰۃ واجب ہوتی رہے گی)

چونکہ صاحبین کی حیثیت طائفۂ احناف میں امراؤ ورؤسا کی سی ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا تو یہ ہو سکتا ہے کہ فنڈ پر آپ اُس دن سے زکوٰۃ کا حساب لگالیں جب وہ بقدرِ نصاب ہو گیا تھا۔ لیکن یہ درست نہ ہوگا کہ فقہی سطح پر بھی اسی احتیاط کو فتوے کی شکل دیدیں۔ ہم نے جتنا بھی غور کیا آئینی اعتبار سے اسی نقطۂ نظر کو عادلانہ اور موزوں ترین محسوس کیا کہ مختلف النوع قرضوں کے احکام میں فرق کیا جائے اور فنڈ جیسے قرضوں پر قبضے سے پہلے زکوٰۃ کا سوال نہ اُٹھایا جائے۔ لہٰذا نگی زکوٰۃ کو تو صاحبین بھی قبضے سے پہلے واجب قرار نہیں دیتے، لیکن چونکہ ان کی نظر میں ہر طرح کے قرضے پر زکوٰۃ قبل القبض ہی عائد ہوتی رہتی ہے اسلئے جب وہ وصول ہو جائے تو پچھلے سب سالوں کی ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ اُس وسعت، ہمہ گیری، اعتدال اور رفق و شفقت کے مطابق نہیں ہے جسے امام اعظمؒ نے قانون سازی اور اجتہاد کے ہر مرحلے میں ممکن حد تک ملحوظ رکھا ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم

طنز و مزاح — از :- مُلّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

دیوبند کا آل انڈیا مشاعرہ

(۲)

خدا خدا کرکے قطعات کی بارش بند ہوئی۔

شاعر بڑے اچھے اچھے آئے ہوئے تھے۔ جام اکبر آبادی عارف عباسی۔ واقف مراد آبادی۔ عندلیب نگینوی۔ نور تقی میرٹھی۔ امیر دہلوی۔ کامل قریشی۔ رفیق نجیب آبادی۔ شاہد نوحی۔ فانی لکھنوی۔ حفیظ میرٹھی۔ روشن صدیقی۔

ان کی آوازیں، ان کے لہجے، ان کے اشعار یادداشت کے خانے میں کچھ ایسے شیر و شکر ہوگئے ہیں کہ تجرید و تجزیہ سخت مشکل ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کچھ کام چلے۔

حفیظ میرٹھی پختہ گو ہیں، پاکیزہ گو ہیں۔ پڑھتے بھی خاصا ہیں۔ مگر دو باتیں کبھی انھیں آل انڈیا نہیں بننے دیں گی۔ ایک تو یہ کہ ان کے پاس آل انڈیا گلا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ دین و اخلاق کے حکم سے نہیں نکلے سکے ہیں۔ کلب گھر میں آپ برقعے کے فوائد پر لکچر دینے لگیں تو لوگ آپکے چہرے پر دیوانگی کے آثار ضرور تلاش کرینگے۔

مشاعرے ثواب کے لئے منعقد نہیں ہوتے۔ پہلے وہ ادبی مشغلے کی حیثیت سے منعقد ہوتے تھے۔ اب انکی حیثیت ذہنی اعتبار سے تھیٹر سنیما کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تفریح اور کاروبار کے دو اجزاء کا مرکب! ــــ آل انڈیا تھا تو کو تو کیا کہئیے۔ بالشت بالشت بھر کے شاعر وہ پیٹھ کے ہاتھ دکھاتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ مثلاً دعوت نامے کے جواب میں وہ لکھیں گے۔

جناب والا!

دعوت نامہ ملا۔ اس اتفاق کو کیا کہئیے کہ جس تاریخ میں آپ کا مشاعرہ ہے اسی تاریخ میں لنکا میں بھی بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ بیس سکنڈ کلاس کے کرایہ اور سو روپے نذرانے پر وعدہ دے چکا ہوں۔ آپ سے بھی بدلحاظی برتنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا سوچ رہا ہوں کہ لنکا کی بجائے آپ ہی کے یہاں حاضر ہو جاؤں۔ پچاس کا منی آرڈر تار سے بھیج دیجئے۔ سو میں حاضر ہونے کے بعد لے لوں گا۔ تنگ آگیا ہوں دعوت ناموں سے۔ ایک درجن دعوت نامے اسوقت بھی میری میز پر رکھے ہوئے ہیں۔ فقط والسلام۔

آپ کا جلوہ روہیلکھنڈی

حالانکہ اکثر حالتوں میں خط کا یہ مسودہ بھی کسی غیر شاعر ہی سے لکھوایا ہوا ہوتا ہے اور میز کا جہاں تک تعلق ہے آپ کبھی اچانک جلوہ صاحب کے یہاں تشریف لیجا کر دیکھیں انشاء اللہ ٹھنڈے سانسوں کے ہجوم میں یہ شعر پڑھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھانس کے ہے میرے درباں کا

مشکل یہ ہے کہ ان بالشتیوں کو پیدا اللہ میاں نے گانے بجانے کے لئے کیا تھا۔ اسی نسبت سے سریلا گلا بھی عطا کر دیا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ فلمی گانوں نے تال سُر بھی گھر بیٹھے بھیج دیئے۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا۔ بس پھر تو یہ شاعر ان کے گھر کا کتا بھی شاعر — اب یا تو خود رنگ برنگے الفاظ جوڑ لئے یا کسی فاقہ نوش شاعر کی، ہتھیلی پر اٹھنی رکھی اور یہ کہہ کر غزل مانگ لی کہ اٹھنی بطور ایڈوانس ہے۔ دس روپے مشاعرے سے لوٹ کر ملیں گے۔ شاعر سوچتا ہے چلو اٹھنی تو نقد آئی چار پیالی چائے پئیں گے اور ہر پیالی کے ساتھ ایک تازہ غزل اور کہہ لیں گے۔ دس بعد میں مل گئے تو گھر والی کے زچہ خانے میں کام آ جائیں گے۔

یہ تو کاروباری گوشے تھے۔ دوسرا گوشہ جنسی بھی ہے یعنی ثقافتی۔ ہو سکتا ہے آپ گانے بجانے کو جنسیات سے تعبیر کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ چلیئے وہ روحانی سہی، مگر کیا یہ نیرنگ زمانہ آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہند و پاک دونوں میں اب جنسِ لطیف بھی مشاعروں کے اسٹیج پر پورے میک اپ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی جا رہی ہے اور سامعین کی صف میں تو وہ ہر اونچے مشاعرے میں افراط کے ساتھ ملے گی۔

اعتراض مقصود نہیں منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی یہ دور ہی ایسا ہے کہ عورت کو شمعِ محفل کی حیثیت سے ہر کلچرل اجتماع میں موجود رہنا ہی چاہیئے۔ اسے دیکھ مردہ دلوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور حرکت میں برکت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔

اب اس پس منظر میں سوچئے تو بھلا ایسے شعروں کی عوام کی نظر میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

نا محکم بنیاد ہوس
عشق سراپا صدق و ثبات

یہ حفیظ صاحب کا شعر ہے۔ کوئی بتاؤ جس "ہوس" پر آج کے جگ مگ کرتے تہذیب و تمدن، آج کے ثقافت و کلچر، آج کے آرٹ، آج کے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد ہو اس کی تحقیر کر کے کوئی مولانا قسم کا شاعر کیسے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔ عشق! ہا ہا ہا — یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ کہاں ہے کوئی عاشق لا کے دکھاؤ۔ میں نے تو دسیوں عاشق دیکھے۔ ان میں اور بوالہوس میں صرف چھلکے کا فرق تھا۔ اندر سے وہی جبلت۔ وہی جذبہ — جس کا پیٹ گوشت کی بوٹیوں کے سوا کسی چیز سے نہیں بھرتا۔

یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے اندر کا وہ قریب المرگ ملّا کہہ رہا ہے جس کی نظروں کے سامنے پرانے علم الاخلاق کی ایک ایک دیوار گرتی جا رہی ہے۔ ایک ایک ستون لرزہ براندام ہے۔ ایک ایک سانچا ٹوٹتا جا رہا ہے۔ لوگ چیخ رہے ہیں کہ قدامت کی ہر یادگار کو تحس نحس کر کے رکھ دو۔ فرسودہ قدروں کے ایک ایک نشان پر نئے تہذیب و تمدن کے ٹریکٹر چلا دو۔ عورت اور مرد برابر ہیں۔ انھیں قریب لاؤ۔ اتنا قریب لاؤ کہ درمیان میں کوئی پردہ کوئی بھید بھاؤ کوئی رکاوٹ حائل نہ رہے۔ مغرب اس راہ میں بہت آگے بڑھ گیا ہے مشرق کو بھی ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہیئے۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ حفیظ صاحب اگر یہی شعر چین یا روس میں پڑھ دیتے تو ان کا کیا حشر ہوتا۔

میں بتاؤں کیا حشر ہوتا۔ پارٹی کا کوئی گماشتہ رپورٹ مرتب کرتا کہ حفیظوف کے خیالات اب بھی بورژوائی اخلاق کی غلاظتوں سے خطرناک حد تک زہر آلود ہیں۔ وہ کسی سامراجی طاقت کے اشارے پر زہریلے خیالات کا پرچار کر رہے ہیں۔ ان کا پڑھنے کا طرز بھی کچھ ایسا ہے جس میں نوآبادیاتی نظام کیلئے احیائی ذہنیت کے لاشعوری عزائم کا سراغ ملتا ہے۔

اگلے روز ایک پولیس کار آتی اور حفیظوف کو بغیر کچھ بتائے پکڑ لے جاتی۔ پھر ذہنی تطہیر کے متعدد زندگی بخش مراحل سے گذارنے کے بعد انھیں عظیم عوام کی عظیم عدالت میں پیش کیا جاتا اور گوشت پوست کی کٹ پتلیوں کے ایک لگے بندھے رقص کے بعد عظیم جج صاحب فرماتے ہے۔

"حفیظوف — عظیم عوام کے مقدس جنسی رجحانات کی تحقیر کر کے تم نے ملک دشمن تخریبی ذہنیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کس سامراجی طاقت کے ایجنٹ ہو۔"

"پورا آنر مجھے اپنا قصور تسلیم ہے۔ اپنا اعتراف نامہ میں انسپکٹر صاحب کو پیش کرچکا ہوں۔"
"وہ ہم نے دیکھ لیا مگر تم نے اس میں اس پوزردائی طاقت کا نام نہیں بتایا جس کے اشارے پر تم جاگیردارانہ تصورِ اخلاق کی نشاۃِ ثانیہ کے منصوبے بنا رہے ہو۔"
"میرا حافظہ کچھ خراب ہے حضورِ عالی — مگر انسپکٹر صاحب نے مجھے یاد دلایا ہے کہ یہ سب میں امریکہ کے اُکسانے پر کر رہا ہوں۔ اب میرا بھی یہی یقین ہے کہ وہ پوزردائی شعر مجھے امریکہ ہی سے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ وصول ہوا ہوگا۔"
"خیر خیر ہم تم پر رحم کرتے ہوئے اس پہلی غلطی کو معاف کرتے ہیں — ترولی ذف اکامرٹہ حفیظ وٹ کو صرف پانچ سال کے لئے عوامی محنت کے کیمپ میں پہنچا دو اور انھیں سمجھاؤ کہ اب عشق و ہوس کی بجائے یہ بڑے بیتوں کی گوبھی اُگانے کے مسئلے پر غور کیا کریں۔"

استغفر اللہ۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ حفیظ میرٹھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا مطلع بھی مجھے یاد ہے کیونکہ اگلے روز اس پر مُلّائن سے جھک جھک ہوئی تھی۔

سوز نہ ہو تو سازِ حیات
صرف اک روکھی پھیکی بات

ظاہر ہے مطلع نہایت کامیاب اور پاکیزہ ہے مگر عورتوں کی ناقص العقلی خدا کی پناہ!

گھر میں مشاعرے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں حفیظ صاحب کی تعریف کر رہا تھا اور کئی بار یہی مطلع گنگنا چکا تھا۔ نسیمہ یعنی مُلّائن خربوزہ کاٹتے کاٹتے بولیں :-

"حفیظ صاحب واقعی بڑا پاکیزہ کہتے ہیں، مگر آپ مطلع ہی کیوں دُہرائے جا رہے ہیں اور بھی تو اچھے اچھے شعر تھے۔"

"کیوں مطلع میں کیا نقصان ہے؟" میں نے تحیر سے کہا
"اس میں جھول ہے۔" وہ منمنائیں۔
"ہائیں — ماشاء اللہ۔ جھول تو تمھیں مجھ میں بھی نظر آتا ہے۔ صاف صاف کہو۔"
"کیا ساز پر بات کا اطلاق ہو سکتا ہے؟"
میں گڑبڑا گیا — "اطلاق — یعنی اب تم اتنے موٹے موٹے لفظ بولو گی۔ اُردو میں کہو۔"
"چلئے آپ دس منٹ اطمینان سے جواب سوچ لیجئے میں جلدی نہیں کروں گی۔"
"ارے واہ۔ سوال تو صاف ہوا نہیں جواب کیا اپنا سر دوں گا۔"
"سوال تو صاف ہوگیا۔ اوّل تو یہی نکتہ بحث طلب ہے کہ سوز ساز کی صفت ہوتی ہے یا نغمے کی۔"
"تم غلط سمجھیں۔ شاعر یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ساز میں سوز نہ ہو، بلکہ وہ کہہ رہا ہے کہ اگر ساز بجانے والے میں سوز نہ ہو تو سازِ حیات روکھی پھیکی بات سے زیادہ کچھ نہیں۔"
"یہ شاعر نہیں آپ کہہ رہے ہیں — شعر میں تو نہ سازندے کا ذکر ہے نہ نغمے کا۔"
"کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ شعر میں محذوفات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"
"چلئے مان لیا سوز کا تعلق نغمہ کار سے ہے۔ یا جس سے بھی آپ کہیں مگر کیا یوں بولنا درست ہوگا کہ فلاں ساز ایک لذیذ و شیریں بات ہے اور فلاں ساز اک روکھی پھیکی بات؟"
میں نے کھوپڑی سہلائی — خود اپنی کھوپڑی۔ اس پر خود رو گھانس کی فصل بہار لہلہا رہی تھی۔ تیل نہ جانے کب سے نہیں پڑا تھا پھر رات کی جگار معاذ اللہ۔
"اُف کتنا سر میں درد ہے" میں نے بالوں کو مٹھی میں بھر کر کھینچا "ذرا ٹھیرو حجامت بنوا آؤں پھر دیکھوں گا تمھارے دماغ کا کون اسکرو ڈھیلا ہوا ہے۔"
"کھانا اُتر رہا ہے۔ میں اپنا اعتراض واپس لیتی ہوں۔"
اُڑومت۔ یہ بہت بُری بات ہے کہ تم آئے دن بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں کیڑے نکالتی ہو۔ میں تمھیں پہلے بھی اطلاع دے چکا ہوں اور اب پھر دیتا ہوں کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔"

"اس سے میں نے کب انکار کیا مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ہر ادیب و شاعر پیغمبر ہوتا ہے۔"

"اب تم عقائد کی بحث اٹھاؤ گی ـــ لاؤ خربوزے ادھر لاؤ ـــ یہ شاید تمہارے بھیا نے بھیجے ہوں گے ـــ"

"جی ہاں۔"

"واپس کر دو ـــ دیکھا تم نے انھوں نے میری زندگی تباہ کر دی۔ رات یقیناً انھی کی سازش سے میرا نام کاٹا گیا ہے۔"

"اس کی تو مجھے بھی شکایت ہے۔ عورتیں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ تمہارے میاں بھی تو شاعر ہیں انھوں نے مشاعرے میں کیوں نہیں پڑھا۔ میں نے کہدیا کہ وہ مُلّا آدمی ہیں کسی ایسے مشاعرے میں نہیں پڑھ سکتے جس میں عورتیں بھی پڑھ رہی ہوں۔"

"شاباش ـــ بہت مناسب جواب دیا ـــ پھر عورتوں نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں چپ ہوگئیں، مگر وہ مولوی شریف الحسن کی بڑی لڑکی سلمیٰ کہنے لگی کہ اے ہے ایک بچاری شبنم ہی تو تھی کونسا وہ انھیں کھالیتی۔"

"خیر خیر۔ یہ خربوزے واپس بھجواؤ۔ تمھارے بھیا سے اب میں کسی قسم کا گھریلو تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔"

یہ کہتے کہتے میں نے آگے بڑھ کر بس بے ارادہ ہی ایک پھانک اُٹھا کر مُنھ میں رکھ لی۔ پھانک کیا تھی شبنم کی پھوار تھی۔ آتشِ اشتعال پر چھینٹا سا پڑتا چلا گیا۔

"آپ کی یہ رائے ہے تو میں واپس بھجوائے دیتی ہوں۔" ملّانی سینی اُٹھانے لگیں۔

"ٹھیر جاؤ یہ تو کافی میٹھے معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے ایک اور قاش مُنھ میں رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ سینی سے ہٹا دیا۔

کھانے کے دَوران میں انھوں نے غالباً ازراہِ شرارت پھر وہی سوال کیا:۔

"آپنے بتایا نہیں ساز پر بات کا اطلاق ۔ ۔ ۔ ۔"

"گولی مارو اطلاق کو ـــ میں حفیظ صاحب کا پرسنل سکریٹری نہیں ہوں۔"

غرض اچھے شاعروں کے بعض اشعار عورتوں کی ذہنی سطح سے بلند ہوتے ہیں۔ مشاعرے کی بقیہ روداد لمبی نہیں ہے۔ روشن صاحب کی وہ غزل بہت عمدہ تھی:۔

ہم اُٹھے دامن جھٹک اے روشن
لوگ اپنی جھولیاں بھر کر چلے

جب روشن صاحب پڑھنے کھڑے ہوئے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ ان کے بعد یقیناً میرا ہی نمبر ہے کیونکہ حاضر شاعروں میں یہی سب سے پرانے اور بڑے آل انڈیا تھے۔ اچھے بُرے سب پڑھ چکے تھے۔ یہ خیال کر کے طبیعت بڑی ہی مسرور ہوئی کہ سکریٹری صاحب نے کم سے کم احقر کے معاملے میں تو حقیقی وطن پرستی کا لحاظ رکھ ہی لیا۔ مجھے سب کے بعد میں پڑھوانا صاف اعلان تھا اس حقیقت کا کہ مُلّا سے بڑا شاعر اس مشاعرے میں کوئی نہیں آیا۔ ہپ ہپ ہرّے۔

میرے حلق تک بے اختیار یہ دعا بھی آئی کہ اے اللہ روشن صاحب کی غزل پٹ جائے۔ اے مستجاب الدعوات ان کے گلے میں بلغم اٹکا دیجئے یا پھر ان کے شعروں کو بحر سے گرا دیجئے۔ آپ بڑے کارساز ہیں آپ ہی نے آتشِ نمرود سرد کی تھی۔ آپ ہی نے حضرت نوحؑ کے طوفان کو کشتی سے بچایا تھا۔

اس دعا کی رمز شاعروں کی قوم تو خوب سمجھتی ہے مگر غیر قوم کے لوگ شاید ہی سمجھ سکیں۔ دراصل ایک مشاعرے میں یہ راز مجھے ایک بڑے شاعر سے ہاتھ لگا تھا جن کا تخلص غالباً گُھل سم سم تھا یا شاید بالم ـــ جو کچھ بھی رہا ہو وہ بہرحال میرے قریب ہی بیٹھے تھے، بڑے چہک رہے تھے۔ یکایک انھیں ایک باخبر آدمی نے بتایا کہ انکا نمبر مرحوم اجملی کے بعد ہے۔ یہ سنتے ہی انکے چہرے پر سایہ سا پھیلتا نظر آیا۔ ساری خوش طبعی رفوچکر ہوگئی۔ پھر کچھ دیر بعد مرحوم اجملی غزل سرا ہوئے تو ان کی رفیع ٹائپ آواز مشاعرے پر چھا گئی۔ داد کے ڈونگرے برس گئے۔ میں کنکھیوں سے بالم صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ کیا بتاؤں کیسا دردناک منظر تھا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹ کبھی کھلتے کبھی بھنچتے۔ رنگت زرد تھی۔ میں تو ڈر گیا کہ ہو نہ ہو روح قبض ہونے کا عمل جاری ہے اب یہ مرمرا کے مقدمہ

کھڑا کرائیں گے۔ ایک دفعہ تو جب مترنم صاحب کے کسی شعر پر لوگوں نے سہ کرّر اور چو کرّر کا نعرہ لگایا تو مجھے محسوس ہوا کہ بالم صاحب کی گردن کا منکا بھی ڈھلک گیا ہے اور ناک کے بانسے میں بھی کچھ کجی آچلی ہے۔

اسی دن سے میں نمازوں کے بعد یہ دعا مانگنے لگا ہوں کہ اے اللہ اگر مجھے مشاعروں میں بھیجنا ہے تو میری باری ہمیشہ کسی ایسے شاعر کے بعد لگا جو مائک سے پٹ کر رخصت ہو یا حاضرین اس کے اشعار پر کم سے کم تالیاں ضرور پیٹ دیں۔

مگر ہائے روّش صاحب کو تو اتنی داد ملی کہ میری گھڑی کا تسمہ ڈھیلا پڑ گیا۔ دل کی دھڑکنیں کھوپڑی کی چھت سے ٹکرا رہی تھیں۔ خون خشک ہونے کی آواز اتنی صاف آرہی تھی جیسے کڑھائی میں گھی جل رہا ہو۔ ہائے روّش صاحب فارغ ہوئے اور اب میں آٹومیٹک طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن یہ کیا —— وہاں تو اعلان کیا گیا کہ مشاعرے کا دَورِ اول ختم ہوا۔ اب خاص خاص شعراء دَورِ ثانی میں آپ کو محظوظ فرمائیں گے۔ یہ سنکر میں دھڑام سے گرا۔ عمر رفتہ والے بزرگ "ارے ارے" کہتے رہ گئے۔ مگر میں کٹے ہوئے درخت کی طرح ان کے شانے پر جھول گیا۔ ٹانگیں میر حیرت علی کی ٹھوڑی سے اس طرح ٹکرائی تھیں کہ ان کے سر کی پشت ان کی ریڑھ کی ہڈی سے جا لگی تھی۔ اب بھی جب ملتے ہیں تو دانت کچکچا کے کہتے ہیں کہ انشاء اللہ گھبراؤ مت میری گردن میں موچ آئی ہے تمھارے طاعون کی گلٹی نکلے گی خبیث کہیں کے۔

"خدا کے قہر سے ڈرئیے میر صاحب" میں جواب دیتا ہوں "یہاں تو ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا آپ اپنی گردن لئے پھرتے ہیں۔"

عمر رفتہ والے بزرگ بھی کچھ کم خفا نہیں ہوئے تھے۔ بڑی بے رحمی سے مجھے دوسری طرف اچھالتے ہوئے فرمایا تھا "خدا تمھیں غارت کرے کیا بھنگ پی کر آئے ہو۔"

قرب و جوار والے گردنیں ابھار ابھار کر پوچھ رہے تھے —— "کیا ہوا —— کیا ہوا؟"

اس کے جواب میں کرخت سی آواز ابھری جو ایڈیٹر تجلی کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

"کچھ نہیں۔ ان صاحب کو غالباً مرگی کا دورہ پڑا ہے ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میرا خون کھول گیا —— یا اللہ یہ میرا سالا ہے یا دشمن جانی —— اگر خون نہ کھولتا تو ارادہ تھا کہ دس بیس منٹ بیہوش پڑا رہوں گا تاکہ دورِ ثانی کی داد دینے پولیس والے بھی تشریف لے آئیں۔ مگر "مرگی" کا الزام سر آتا دیکھ کر ارادہ بدلنا پڑا۔ اب میں اکدم مشینی انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے اوپر جھکے ہوئے حضرات کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوا بولا:۔

"ارے ارے آپ لوگ مجھ پر کہاں سوار ہوئے جا رہے ہیں —— اپنی اپنی جگہ بیٹھیے۔"

"کیا ہوا تھا —— آپ گر کیسے گئے تھے؟" ملی جلی آوازیں ابھریں۔

"دورِ ثانی ہوا تھا —— ارے صاحب چھپکلی یا مینڈک وغیرہ کوئی چیز میرے پیر کے نیچے آگئی تھی بس میں الٹ گیا ——"

یہ کہتے ہوئے میں کنکھیوں سے ایڈیٹر تجلی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ہمدردی اور تاسف کے عوض بڑی سنگین قسم کی بیزاری کے آثار پائے جا رہے تھے۔ وہ پاس والوں پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے کہ میرا ان کا کوئی ادنیٰ سا بھی تعلق ہے۔ یہ ایکٹنگ چل بھی اس لئے گئی کہ قریب کے اکثر حضرات بیرونی تھے۔ رہے میر حیرت علی جیسے دو چار شناسا تو وہ ایڈیٹر صاحب کی وہابیت سے اس درجہ بیزار ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ سوچنے کو بھی تیار نہیں۔ مجھے یاد ہے جب ایڈیٹر صاحب کا نام پکارا گیا تھا تو میر حیرت علی نے مارے خفگی کے اپنی داڑھی مٹھی میں بھر کر صوفی عفران سے کہا تھا: دیکھ رہے ہیں آپ' یہ وہابی بھی شاعر بن گیا۔ حالانکہ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو یہ ناک چاٹتا پھرتا تھا۔"

آخر کار بات رفع دفع ہوئی۔ دورِ ثانی شروع ہو گیا اس میں چند اور شاعروں کے علاوہ محترمہ شبنم صاحبہ بھی ترنم ریز ہوئیں۔ انھوں نے پے در پے ۲ دو غزلیں عنایت کیں اور

تنی دادلی کہ پہلی ناکامی کی بوجوہ احسن تلافی ہوگئی۔ میں ان کے اشعار تو نہ سُنا سکوں گا کیونکہ صدمے اور حیرت کے غیر معمولی باؤ سے اس وقت میرا حافظہ فیوز ہوگیا تھا اور کھوپڑی کی کیفیت کسی گندے انڈے سے بہتر نہیں رہ گئی تھی۔ صدمے کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک تو اتنے زبردست مشاعرے میں اپنے جوہر نہ دکھا پانے کا غم۔ دوسرے اس توہین کا احساس کہ مدعو ہوتے ہوئے بھی نام غائب ہوگیا۔ تیسرے سالے بزرگوار کی روش یہ تہرا صدمہ تو کسی کمزور اعصاب والے کو قبر کی تہہ تک بھی پہنچا سکتا تھا میرے صرف حافظے تک بات رہی تو اسکی وجہ فقط یہ سمجھئے کہ میں ڈالڈا کو ہیر آئل کی جگہ استعمال کرتا ہوں۔ ڈالڈا کا خاص فائدہ یہ ہے کہ اندر کا سارا بڑھاپا بالوں میں کھنچ آتا ہے اور اندر جوانی ہی جوانی کی ریل پیل ہوجاتی ہے۔

حیرت کی وجہ بھی زیادہ باریک نہیں۔

شبنم صاحبہ کے اشعار بڑے عمدہ تھے۔ بعض شعر تو اتنے پختہ تھے کہ اگر پکانے کا کوئی مصنوعی طریقہ استعمال نہ کیا جائے تو پختگی کی اس حد تک پہنچنے کے لئے کم از کم دس سال درکار ہوں گے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس ہونہار شاعرہ نے دس بارہ سال ہی کی عمر میں مشقِ سخن شروع کردی تھی زندہ باد۔ اپنے یہاں کی لڑکیاں تو اِس عمر میں گڑیاں کھیلتی ہیں یا ہنڈکلیا پکاتی ہیں۔

مصنوعی طریقے کی بات الگ ہے۔ مرغی کے نیچے انڈا رکھیئے پندرہ بیس دن سے پہلے بچہ نہیں نکلے گا۔ مگر مشین کے ذریعے چٹکی بجاتے آپ چوزوں کی کھیپ حاصل کرسکتے ہیں۔ چوزے کس شمار میں ہیں اب تو سائنس کی عنایت سے آدمی کے بچے بھی چٹکی بجاتے پیدا کئے جارہے ہیں۔ اپنے ہندوستان میں اس کا تجربہ کیا جاچکا ہے اور روشن فکر خواتین خوش ہیں کہ اب انھیں نو دس مہینے کی غیر شاعرانہ گھس گھس سے نجات مل جائے گی۔

الحاصل سائنس کے اِس دور میں سب کچھ ممکن ہے تو یہ بھی یقیناً ممکن ہے کہ ذہنی صلاحیتوں کو غیر معمولی رفتار سے فروغ دیا جاسکے۔ چنانچہ محترمہ شبنم صاحبہ کا کمالِ شعر گوئی اسکا زندہ

ثبوت ہے۔ کچھ اسلوب اور ترکیبیں تو ان کے اشعار میں ایسی بھی تھیں جنھوں نے مجھے اپنے اس نظریے میں ترمیم پر مجبور کردیا کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ اب میں تہہ دل سے اس میں یہ ترمیم طے کرچکا ہوں کہ فقط شادی شدہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں ہرگز ہرگز ناقص العقل نہیں ہوتیں۔ شاید یہی نکتہ فلم ایکٹرسوں کے ہاتھ آگیا ہوگا۔ اسی لئے ان میں سے اکثر بوڑھاپے تک شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔

آواز بھی شبنم صاحبہ کی بڑی سریلی اور لوچدار تھی۔ اگر فلمی گانوں کی بے تحاشا بہتات نے ہم مردوں کے اعصاب کو ایک سے ایک روح نواز اور مترنم آواز جھیل جانے کا عادی نہ بنادیا ہوتا تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ حسین شاعرہ کی سامعہ نواز آواز پر کئی کمزور دماغ کے شوقین تو گریبان پھاڑ لیتے اور دو چار ضعیف قلب والے جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اسے آپ مبالغہ سمجھیں گے۔ سمجھتے رہیئے۔ مگر میں ایک مثال کے ذریعے آپ کے ٹھس دماغ کو سہل دینے کی کوشش ضرور کروں گا۔ فرض کیجئے آپ کو جام لنڈھانے کی سعادت کبھی نصیب نہ ہوئی ہو اور اچانک آپ کے حلق میں اسکاچ یا وھسکی کا ایک ڈوز اُتار دیا جائے تو کیا آپ پر چودہ طبق روشن نہیں ہوجائیں گے ـــــ ضرور ہوجائیں گے۔ مگر یہی ایک ڈوز کسی بلانوش کے معدے میں پہنچا دیجئے تو انشاءاللہ اس پر ایک بھی طبق روشن نہیں ہوگا۔ بس اسی تمثیل کی روشنی میں عاجز کی قسم کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہم لوگ سینما، گراموفون اور ریڈیو کے صدقے میں گانے بجانے کی حد تک پورے بلانوش ہوچکے ہیں۔ ہمارے علماء و صلحاء تک کا ریڈیو اندھیرے اُجالے نورانی گلے والی گلوکاروں کی رُوح نوازتانوں سے روحانیت کشید کئے بغیر نہیں رہتا۔ صوفی، شیخ کون ہے جو ارادۃً نہ سہی مجبوراً ہی سہی دکانوں، ہوٹلوں اور شادی بیاہ کی نغمہ ریزی سے بچ کر نکل سکتا ہو۔ تو ظاہر ہے دیوبند کے مولوی اور نیم مولوی سامعین بھی اسی دنیائے رنگ و نغمہ کے باسی ہیں وہ اسی لئے شبنم صاحبہ کی دل کش آواز پر پچھاڑ نہیں کھاسکے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی آواز بقول غالب "مرد افگن" تھی۔ بقول تان سین "دیپک راگ" تھی۔ بقول صوفی بدرالدین ایک ایسا کارگر وسیلہ تھی جو گھنٹوں کا سلوک منٹوں میں طے کرا سکتا ہے۔

خیر آواز کیسی بھی اچھی ہو مگر وہ تو قدرت کا عطیہ ہے صحت آواز کے کمال کا اس میں کچھ دخل نہیں نہ ہی یہ بات شبنم صاحبہ کے کمالات میں شمار ہو سکتی ہے کہ اللہ نے انھیں ایسا سراپا عطا کیا ہے جو کم سے کم دور سے تو بڑا دل کش نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بات یقیناً ان کے کمالات میں داخل ہے کہ ان کا پڑھنے کا طرز بڑا تربیت یافتہ تھا۔ تال، سُر، مُر کی سب کے نوک پلک درست۔ زیر و بم میں طویل ریاض کی جھلکیاں۔ میں تو سچ جانئے ان کے اندر ایک لتا، ایک آشا بھونسلے کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بلبلانِ فلستان ماں کے پیٹ سے اتنا اچھا گاتی ہوئیں نہیں نکلی تھیں۔ ان کے پاس گلا تھا۔ استادوں کے فیضِ صحبت اور مسلسل ریاض نے انھیں چمکایا۔ اُبھارا اور سیٹھانی بنادیا۔ عاجز کا مشورہ تو محترمہ شبنم صاحبہ کے لئے بھی یہی ہے کہ مشاعروں وُشاعروں میں کیا دھرا ہے فقط رسمی واہ واہ اور سو دو سو روپے۔ وہ بھی سفر کی سختیاں جھیل کر اور رات کالی کرنے کے بعد۔ موقع اگر مل جائے تو پلے بیک سنگر بننے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ بلکہ ان کے لئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اداکارہ اور گلوکار دونوں بن جائیں۔ اس سے بھی بڑھ کر تہری پوزیشن حاصل کی جا سکتی ہے۔ اداکارہ۔ گلوکار اور نغمہ نگار ——— یہ پوزیشن اب تک کی تاریخ فلم میں یکتا ہوگی۔ آرٹ کی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ بقول شخصے:۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

یہ مشورہ طنز نہیں تفنن نہیں۔ انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ ہے۔ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں جب آرٹسٹوں کو رنڈیاں، نچنیاں، بیسوائیں اور نہ جانے کیسے بُرے بُرے نام دیئے جاتے تھے اب تو خیر سے وہ آرٹسٹ ہیں، فنکار ہیں، اسٹار ہیں۔ وزیر اور گورنر ان کے پہلو بہ پہلو فخر سے فوٹو کھنچواتے ہیں۔ انھیں اعزاز و انعام سے نوازا جاتا ہے۔ وہ ہمارے اخلاقی فلسفہ کا ضمیر ہیں، ہماری روحانی منطق کا شعور ہیں۔ ہمارے ثقافت و کلچر کا مکھن ہیں۔ ہمارے سماج کا نفس ناطقہ ہیں۔ وہ کروڑوں نوجوانوں کے دل کی دھڑکن ہیں۔ اُدھیڑ اور بوڑھے بھی ان سے بقدر ظرف درسِ حیات لیتے ہیں۔

میرے دیرینہ کرم فرما مسٹر منہاج کی عمر اس وقت ستر سے کم نہیں ہوگی اس کے باوجود ان کا زیادہ وقت ریڈیو پر فلمی گانے سننے میں کٹتا ہے اور رات کا ابتدائی حصہ عموماً سنیما ہالوں میں گذارتے ہیں۔ عمر کی طرف توجہ دلائیے تو لہرا کر کہتے ہیں کہ، ارے بھائی:۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

خواجہ مسیح الزماں صاحب کا نقطۂ نظر قدرے مختلف ہے ان کی عمر بھی ستر سے اوپر ہی ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ کے بڑے شیدائی ہیں۔ ریڈیو، گراموفون، فلم وغیرہ سے بھی عشق ہے۔ کبھی کبھی بمبئی بھی جاتے ہیں۔ ایک بار کسی ناصح مشفق نے عرض کیا کہ حضرتِ والا اِس عمر میں یہ گرما گرمی، یہ زندہ دلی، یہ ہماہمی، یہ سرمستی! فلسفیانہ لہجے میں کہنے لگے:۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

تو مغز پاشی کا حاصل یہ کہ عاجز تو نیک مشورہ پیش کرکے اپنے قومی و ملّی فریضے سے سبکدوش ہوا۔

مانیں نہ مانیں آپ کو یہ اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائیں گے

مشاعرہ آذانِ فجر سے تقریباً دس منٹ قبل ختم ہوا ہوگا۔ میں نے تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ مدرسہ دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر پر آذان شروع ہوئی۔ عام حالات میں یہ آذان مجھے بڑی پیاری لگتی ہے۔ جیسے روح پر سوز و مستی کی شبنم برستی چلی جائے مگر آج ——— خدا میری مغفرت کرے ——— یہ ہتھوڑے کی طرح دماغ پر پڑ رہی تھی۔ پلکیں ایک دوسرے سے چپکی جا رہی تھیں۔ بھیجا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ملّانی فرمانے لگیں:۔

"کیا آپ نماز پڑھے بغیر سوئیں گے؟"

مجھے محسوس ہوا جیسے یہ آواز افق پار سے آرہی ہو۔ جواب کیا دیتا کروٹ لیکر ایک دو خرّاٹے اُبھارے مشکل یہ تھی کہ جماعت میں ابھی تقریباً ایک گھنٹہ تھا۔ اتنا انتظار کیسے کیا جاتا۔ وہ پھر بولیں:۔

"خراٹے تو میں کھڑے کھڑے بھی لے سکتی ہوں۔ نماز پڑھکر اطمینان سے سو جائیے گا۔"

"توبہ" میں جھنجلا کر بڑبڑایا "تم سمجھتی کیوں نہیں نیکبخت۔
مرا دل تو ہے صنم آشنا مجھے کیا ملیگا نماز میں۔"

"آپ کچھ بھی کہیں مَیں سونے نہیں دوں گی۔"

"ہائیں — کیا تم بھی اپنے آپ کو ایڈیٹر تجلی سمجھنے لگی ہو۔"

"سنیئے مؤذن کیا کہہ رہا ہے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم"

"جی نہیں۔ تم اپنے کانوں کا میل نکالو۔ مشاعرے میں سارا مدرسہ ڈھل گیا تھا اس لئے آج مؤذن نے بھی ترتیب بدل دی ہے اَلنَّوْمُ خَیْرٌ مِّنَ الصَّلٰوۃِ۔"

"اللہ توبہ۔ آپ تو بعض دفعہ کفر کی حدوں میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"تو کیا تم سمجھتی ہو رات بھر مشاعرے سن کر اسلام پھیلے گا — سو جاؤ نیک بخت تم بھی چادر تان کر سو جاؤ۔ وہ سنو پھر آواز آئی النوم خیر من الصلوٰۃ۔"

"اے ہے زبان کو لگام دیجئے۔"

"اللہ کی بندی یہ میں نہیں بول رہا ہوں نیند کے دیوتا بول رہے ہیں۔ یاد نہیں تمہارے خالو سے بھی ایک دفعہ ایسی ہی حرکت سرزد ہوئی تھی۔"

"کون خالو؟"

"ارے وہی نشی مردار ید علی . . . ."

"خاک پڑے وہ میرے خالو کیوں ہوتے۔"

"پھر کیا میرے خالو ہیں۔" مجھے تاؤ آگیا۔

"یہ کیا ضروری ہے جو میرا خالو نہ ہو وہ آپ ہی کا خالو ہو۔" انھوں نے کسی فاضل استاد کے انداز میں کہا۔

"پھر وہ کس کے خالو ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ کسی کے خالو ضرور ہیں۔"

"بہن وسیمہ کے خالو ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ نسیمہ اور وسیمہ میں کوئی خاص فرق نہیں تو خیر ان کا واقعہ تو تمھیں یاد ہی ہوگا۔"

"کونسا واقعہ؟"

"وہی جب وہ سہارنپور کے مشاعرے سے رات بھر جاگ کر لوٹے تھے۔"

"مجھے تو یاد نہیں۔ آپ ہی دہرائیے کیا ہوا تھا؟"

میں اگر اپنے ہوش میں ہوتا تو ان کے چہرے پر تجاہل عارفانہ کی تحریر فر فر پڑھ ڈالتا۔ مگر اس وقت تو خود مجھ پر معرفتِ جاہلانہ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اُکتا کے بولا:۔

"پھر سُن لینا۔ خدا کے لئے سونے دو۔"

"اب بات اُٹھائی ہے تو پوری ہی کر کے سوئیے۔ — کیا کیا تھا وسیمہ کے خالو نے۔"

"مجھے قتل کیا تھا۔ بابا سو جاؤ۔ وہ دیکھو نیند کی پریاں ملھاریں گا رہی ہیں . . . . سو جا راج دُلارے سو جا۔ سو جا . . . . م . . . ئلا . . . پ . . . پیارے . . . س . . سو جا. . . . اخ . . . خا . . . ."

میں اسپٹنک کی رفتار سے آسمانوں میں اُڑ گیا۔ مگر زیور کی بہن ڈائن سے کم نہیں ہوتی۔ نسیمہ نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔

"سوئیے مت . . . . اُٹھ بھی جائیے . . . . گھر ہی میں چار رکعت پڑھ لیجئے . . . اُٹھیئے . . . ."

"ذبح کر دو مجھے . . . کباب بنا کے کھا جاؤ میرے — خدا کے لئے سونے دو —"

"خدا کے لئے تو اس وقت جاگنا ہو سکتا ہے — سونا تو شیطان کے لئے ہے — اُٹھ بھی جائیے —"

میں عاجز آ کر اُٹھ بیٹھا۔ زمین و آسمان گھومتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گردن پر سر کی بجائے چٹان رکھی ہوئی تھی کہاں کی نماز۔ کس کا خدا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں شل پڑی تھیں۔ تکیے سے کمر لگا کر میں نے چُندھی آنکھوں سے ڈائن کی طرف دیکھا۔

"تم بھی تو آخر رات بھر جاگی ہو۔ سو جاؤ نا۔ ایک وقت کی نماز نہ سہی۔ اُٹھنے کے بعد سر کے بل کھڑے ہو کر توبہ کر لیں گے۔ خدا بڑا غفور رّحیم ہے۔" میں بلغمی آواز میں غرغراتا چلا گیا۔

"یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اب سونے کے بعد ہم اُٹھنا

بھی ضرور ہی نصیب ہو گا ۔۔ کیا بھول گئے مولوی نادر علی کا واقعہ ۔۔ اچھے خاصے سوئے تھے پھر کبھی نہیں اُٹھے ۔"

" یا اللہ تم کیسی عورت ہو ۔۔ شریف بیویاں تو اپنے شوہروں کے بارے میں ایسی بد فالی دوسروں کی زبان سے بھی سُننا برداشت نہیں کرتیں ۔۔ تم خود اپنے منھ سے یہ کہہ رہی ہو ۔"

" میں اس معاملہ میں بالکل شریف نہیں ہوں ۔۔ میں اور آپ کسی بھی وقت مر سکتے ہیں ۔۔ چلئے چھوڑیئے وہ وسیمہ کے خالو کا کیا قصہ تھا ؟"

" قصہ اور خالو سب گئے جہنم میں ۔ تم تیمم کا ڈلا اٹھا لاؤ میں دو فرض پڑھ کر ضرور سوؤں گا ۔ سو نہیں صدی سوؤں گا ۔ گھوڑے بیچکر سوؤں گا ۔"

" ہاں ہاں بالکل سوئیے گا ۔ ۔ ۔ مگر دیکھئے گرمی کس قدر ہے ۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے وضو کیجئے تو طبیعت بڑی فرحت محسوس کرے گی ۔"

" محسوس کہاں سے کرے گی ۔ قوتِ حاسہ پتھر میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ چلو بابا تم پانی ہی لاؤ ۔"

وہ نل سے لوٹا بھر لائیں ۔ میں نے جوں توں وضو کی ۔ اس میں شک نہیں ٹھنڈے پانی کے چھپکوں نے نیند کی پریوں کا منھ پھیر دیا ۔ کڑکتی ہوئی آنکھوں کو بڑی فرحت محسوس ہوئی

" ہاں تو وہ آپ نے بتایا نہیں وسیمہ کے خالو کا ۔ ۔ "

" ارے وسیمہ کا خالو میری چڑھ ہے کیا ۔۔ جاؤ تم بھی وضو کرو ۔"

" بات تو آپ ہی نے اُٹھائی تھی ۔ اب مجھے کرید لگی رہے گی ۔"

" تم تو سر ہو کر رہ گئیں ۔۔۔ پہلے بھی تو ایک بار تمھیں سُنا چکا ہوں یہ قصہ ۔"

" یاد نہیں آ رہا ۔۔ ایک بار پھر سنا دیجئے ۔"

" معاذ اللہ ۔ قصہ ہی کونسا لمبا چوڑا ہے منشی مروارید سہارنپور سے مشاعرہ سنکر صبح پانچ والی سے گھر لوٹے تھے ۔ سونے لیٹے تو برابر کے گھر سے کسی بچے کے ڈھائیں ڈھائیں رونے کی آوازیں آئیں ۔ انھوں نے بیوی سے کہا کہ ذرا معلوم کر کے آؤ کیا آفت آ گئی ہے ۔ منشیائن نے جا کر سراغ لگایا تو معلوم ہوا کہ ہمسائن کے بڑے برخوردار ۔۔ عمر دس سال ۔۔ نے ایک مینا بڑے شوق سے پال رکھی تھی ۔ وہ کئی روز سے بیمار تھی ۔ کئی ڈاکٹر بدلے جا چکے تھے ۔ پنسلین کے دس انجکشن بھی لگ چکے تھے ۔ مگر ابھی کچھ دیر پہلے وہ دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئی ۔ برخوردار اسی کے داغ مفارقت سے بے چین ہو کر محرم منا رہے ہیں ۔ منشیائن بُرا سا منھ بنائے لوٹیں اور ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے بڑبڑائیں ۔

" خاک پڑ جائے ایسے چونچلوں پر ۔۔ ہوتا کیا بڑے لڑکے کی مینا مر گئی ہے وہی ڈھینگڑے مار رہا ہے ۔"

انھوں نے یہ جواب منشی صاحب کے لئے صادر کیا تھا ۔ منشی صاحب اب بیداری اور خواب کے سنگم پہ پہنچ چکے تھے ۔ ان کی سماعت نے منشیائن کے الفاظ کچھ اس طرح دماغ تک پہنچائے :-

" خاک پڑ گئی سارے چونچلوں پہ ۔ ہوتا کیا مینا کا بڑا لڑکا مر گیا ہے وہی ڈھینگڑے مار رہی ہے ۔"

لیکن اس وقت دماغ اور احساس کے درمیان نیند کی دیوار کھڑی تھی اس لئے کوئی تأثر ظاہر کئے بغیر خواب خرگوش میں گم ہو گئے ۔ ظہر کے وقت تک ٹھاٹ سے سوئے پھر آنکھ کھلی تو منشیائن گھر میں نہیں تھیں ۔ سوچنے لگے کہاں چلی گئی ۔ دفعتاً یاد آیا کہ کسی نے آپا مینا کے لڑکے کی رحلت کا حال سنایا تھا ۔ آپا مینا ان کی خالہ زاد بہن تھیں ۔ ان کا بڑا لڑکا کچھ دنوں سے بیمار بھی تھا ۔ دماغ پر زور ڈالنے سے یاد آیا کہ اس کی اطلاع تو خود منشیائن نے دی تھی ۔ منشیائن اور آپا مینا کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے ۔ شاید اسی لئے منشیائن نے ان کے گریہ و بکا کو ڈھینگڑے سے تعبیر کیا تھا ۔ پھر بھی رسماً تو وہ بھی پُرسے کو گئی ہی ہو گی ۔ یہ یقین کر کے کہ منشیائن آپا مینا کے گئی ہے وہ بازار پہنچے دو پیالی چائے نوش جان کیں پھر آپا مینا کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔ انھیں یہ بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ منشیائن کی دی ہوئی اطلاع کی نشان

نزدیک کیا تھی۔ راستے میں ایک دو عزیزوں سے ملاقات ہوئی تو انھیں بھی آگاہ کرتے چلے گئے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بیٹھے بٹھائے اچھا خاصا فساد برپا ہوگیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی منھ لٹکائے آپا مینا کے گھر پہنچ رہا ہے اور آواز میں گمبھیرتا پیدا کرکے تعزیت کے لئے اسٹارٹ لے رہا ہے۔ آپا مینا جھاڑو ہاتھ میں لئے چیخ رہی ہیں۔

"ہائے ہائے بجلی گر جائے اس لنکا منتیا ئن پر۔ مریل سی لگے سگے کیسی مری بیٹی نے بھکیں اڑائی ہیں۔" پھر وہ اپنے میاں سے کہتی ہیں ——"ارے تم کیا بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ نا اس حرّافہ کی ناک چوٹی کاٹ کے لاؤ —— اور تھو حرام خور تو کیا دیدے نچا رہا ہے جا لاٹھی لیکے دروازے پر بیٹھ جا اب کوئی مرا پیٹا منھ بسورتا آئے تو سر کے دو کر دینا۔"

ملّائن بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسیں مگر اس میں نکھار نہیں تھا۔ مجھے ہنسی نہیں آ رہی تھی مگر تواضعاً ہنسا۔ پھر جا نماز کی طرف بڑھا۔

"دیکھیے سنتوں کی نیت باندھیے گا۔ اب تو اتنی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"خوب۔ اب تم مجھے نیت باندھنا بھی سکھاؤ گی۔"

"نہیں۔ آپ کہہ رہے تھے نا دو فرض پڑھ کر سو رہوں گا۔"

"استغفراللہ۔ تم شاید یہ سمجھتی ہو کہ میری عبادت کا ثواب بھی تمھی کو پہنچے گا —— تمھاری بلا سے میں فرض پڑھوں یا سنتیں —— واہ جی واہ۔"

تاہم میں نے سنتوں ہی کی نیت باندھی۔ اب نیند کا خمار اتنا زیادہ نہیں تھا کہ فجر کی سنتوں کی اہمیت یاد نہ آتی۔ بات ہی کیا تھی تین منٹ میں دو رکعتیں۔ اسٹارٹ لیا اور بس ختم۔

سلام پھیر کر میں فرضوں کے لئے کھڑا ہی ہو رہا تھا کہ اچانک ملّائن کی سسکی کانوں میں پڑی۔ وہ دروازے کے قریب اپنی پنڈلی پکڑے جھکی کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کے پوچھا۔

"اکدم پیر ٹیڑھا پڑ گیا —— پنڈلی میں سخت جھٹکا آگیا ہے۔" وہ کربناک آواز میں بولیں —— "ذرا سہارا دیجئے نا ادھر آ کے۔"

میری شوہرانہ مامتا بھڑک اٹھی۔ جھپٹ کے ان تک پہنچا۔ مگر وہ دفعتاً سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے دوسرے ہاتھ کی کلائی میری آنکھوں کے سامنے کر دی جس پر ان کی ننھی منی گھڑی صبح صادق کے اجالے میں صاف پانچ بجا رہی تھی۔

"دیکھیے جماعت میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں" وہ بولیں "مسجد پہنچتے ہی آپ کو نماز تیار ملے گی۔"

"اوہ تو یہ تھا پنڈلی کا جھٹکا" میں کھسیا گیا۔ "اب میں دعوے سے کہوں گا کہ عورتیں ناقص العقل ہی نہیں فاطر العقل بھی ہوتی ہیں —— بڑی آئیں چار سو بیس...."

"دیکھیے نا۔ بھیّا نے بتایا تھا کہ جب پاس کی مسجد میں جماعت تیار ہو تو بغیر عذر کے گھر میں مردوں کی نماز نہیں ہوتی۔ جہاں اتنا وقت گذرا ہے پانچ منٹ اور سہی۔"

"تمھارے بھیّا کے مسئلے تمھی کو مبارک —— میں مولوی منفدرالدین کے مسلک پر عمل کرتا ہوں۔ جاؤ دیکھ آؤ اگر وہ سو نہ رہے ہوں تو میری داڑھی مونڈ دینا۔"

"وہ گاؤں در گاؤں وعظ کرکے ہی اتنا ثواب کما لیتے ہیں کہ انھیں مزید ثواب کی اتنی احتیاج نہیں۔ آپ تو صبح سے شام تک نہ جانے کیا کرتے پھرتے ہیں۔"

"اچھا" میں نے آنکھیں نکالیں "یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ —— مجھ سے۔ اپنے مجازی خدا سے —— ہلاک ہو جاؤ گی۔ زبان میں چھالے پڑ جائیں گے۔ شیم شیم۔"

"بس اب جائیے دو منٹ رہ گئے۔"

"نہیں جاؤں گا۔ پہلے تم اپنے الفاظ واپس لو۔"

"لے لیے —— اللہ قسم بڑے اچھے ہیں آپ —— دیکھیے جماعت کے بعد بغیر دعا مانگے نہ بھاگ آئیے گا۔"

"گلا گھونٹ دو میرا۔ آخر روز روز پانچ وقت کیا دعا مانگوں...."

"مانگیے گا کہ اے اللہ ہم میاں بیوی کا خاتمہ ایمان پہ کیجیو اور ہمیں جنت میں ملائیو ——"

"بہت خوب جنت —— تم شاید اسی لئے گنگا جمنا دیکھنے

گئی تھیں ... :

"دیکھا کب تھا۔ چلو دیکھ بھی لیتی تو وہ کوئی کفر نہیں تھا۔ نماز کے بغیر تو مسلمان مسلمان ہی نہیں ۔"

"ہائیں تم خارجی کب سے ہوگئیں۔ کیا یہی سبق تمھارے بھیّا نے پڑھایا ہے ۔"

"وہ کیوں پڑھاتے۔ میں نے تو خود مولانا اشرف علیؒ کی ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ کافر اور مسلمان میں امتیاز کا سب سے بڑھ کر ذریعہ نماز ہے ۔"

"ہاں مگر ڈاکٹر اقبالؔ بھی کچھ معمولی آدمی نہیں تھے انھوں نے کہا ہے :۔

مجھے شرع سے کوئی ضد نہیں پر اس اتفاق کو کیا کروں
وہی وقت بادہ کشی کا ہے وہی وقت عین نماز کا
جب بادہ کشی ترکِ نماز کا عذر معقول بن سکتی ہے تو نیند کیوں نہیں بن سکتی ۔"

"اب جائیے۔ میں چائے بنا کے رکھتی ہوں۔ لوٹ کر آئیے پھر بحث کریں گے ۔"

اور میں اس ناطر العقل بیوی کی ملائیت پر عش عش کرتا مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔ (ملّا زندہ صحبت باقی)

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

حضرموت کی سرزمین پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں ارتداد کا دردناک فتنہ سر اٹھا رہا تھا۔ "روحانی خودکشی" کی اس خونچکاں تحریک کا لیڈر اور قبیلہ کندہ کا سربراہ اشعث پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا کہ "عرب اپنے آبائی عقیدوں کی طرف لوٹ رہا ہے ــــ" ایمان و یقین کے وہ چراغ جن میں دل و جگر کا خون پوری طرح شامل نہ ہو سکا تھا۔ شیطان اور منافقوں کی زہریلی پھونک سے گل ہوتے جا رہے تھے۔ کیسی خوفناک تھی وہ تاریکی جو در و دیوار کے بجائے آدمی کے دل و دماغ پر چھائی جا رہی تھی۔ کیسی مہیب تھی وہ ویرانی جس میں روحوں کی بنی بنائی دنیائیں اُجڑ رہی تھیں

لیکن ٹھیک اسی خوفناک تاریکی میں وہ ایماندار انسان چاند ستاروں کی طرح طلوع ہو رہے تھے جن کو خدا نے اپنے آخری رسولؐ کے نورِ یقیں سے تراشا تھا۔ خدا جو کہیں دکھائی نہیں دیتا' ان انسانوں کے ایمان و عمل کا جیتا جاگتا پیکر اسی خدا کا آئینہ دار تھا۔ خدا کی وفاکیش مخلوق احسانِ شکر اور احسان شناسی کے جذبۂ بیتاب میں ڈھل گئی تھی۔ اپنے محسنِ عظیم ــــ اپنے نادیدہ خدا سے تعلق کا سوزِ بیکراں اِن لوگوں کے رگ و ریشہ سے پھوٹا پڑتا تھا۔ آخرت کی روشنی میں تمام دنیا کے ٹھوس تعلقات دھندلا رہے تھے' ماند ہو رہے تھے ــــ گم ہوتے جا رہے تھے۔

حضرت امرء القیسؓ ایک ایسے ہی خدا شناس بزرگ تھے جو اپنے قبیلہ کندہ کے ارتداد کا سر کچلنے کے لئے ہمہ تن جہاد' سراپا اضطراب بنے ہوئے تھے۔ اسلام کو خطرہ میں دیکھ کر ان کو اپنی کسی ذاتی بربادی کا خوف ہی نہ رہا تھا۔ خاندانی تعلقات' کاروباری مفادات اور جانِ عزیز ہر شے وہ اسلام کے دفاع پر نچھاور کئے دیتے تھے۔ ان کے آتش ریز اشعار سرپھرے قبیلے کی بھرپور قوت کے سر پر صورِ اسرافیل کی سی گرج پیدا کر رہے تھے۔ سورج ان کو تمام دن حق پرستی کی دُھن میں دوڑتا ہوا پاتا اور چاند ستارے ان کو اسلام کی تڑپ میں سجدہ گاہ پر نیم بسمل حالت میں پھڑپھڑاتا ہوا دیکھتے۔ اسلام کے درد سے معمور دل کبھی خدا کے سامنے خون کے آنسو روتا تھا تو کبھی انسان کے سامنے ذوقِ شہادتِ حق اور اعلائے کلمۃ الحق کے نشے سے جھومتا ہوا مردِ مومن تلوار کی چھاؤں میں وجد کرتا تھا۔

آخر اس اکیلے انسان کی انتھک جدوجہد پورے ماحول پر غالب آئی ــــ حق جب سچ مچ سامنے آتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ باطل ٹھیر سکے۔ ارتداد کے سیلاب کا منہ پھیر دینے والے مجاہد نے ولولہ انگیز اشعار میں یہ فاتحانہ پیغام خلیفۂ وقت کی خدمت میں روانہ کیا کہ:۔

"میں اب چین سے بیٹھا ہوں جب میرے پڑوس
میں کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں رہا جہاں ہمارے
نبیؐ کی شانِ صداقت میں کوئی گستاخی کرنیوالی
زبان موجود ہو ــــ ایسی ہر زبان قلم کر دی گئی۔ ایسی
ہر آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کی جا چکی ہے۔"

بغاوت کا فتنہ فرو ہو چکا تو خدا کے باغیوں کو مقتل میں پابجولاں لایا گیا۔ یہاں بھی امرء القیسؓ کی شمشیر بے نیام

عبودیت کے نشے میں وجد کر رہی تھی۔ اس تلوار کے لئے امرء القیسؓ اس کے تھے جو ان کے خدا کا تھا۔ جو ان کے خدا کا نہ ہوا اس سے امرء القیسؓ کا کیا تعلق؟ ہر تعلق اس عظیم ترین واحد تعلق کے ذیل میں آتا ہے جس کا نام خالق و مخلوق، عبد و معبود اور بندے اور خدا کا مقدس ترین تعلق ہے۔

ٹھیک اس وقت جب امرء القیسؓ کی تلوار اسی جذبۂ بندگی میں خدا کے باغیوں پر "بزن" بول رہی تھی ان کی تلوار کے نیچے ان کے اپنے چچا کا سر آگیا۔ ان کی آنکھوں نے یہ دردناک منظر دیکھا۔ ان کے کانوں نے اپنے مرتد چچا کی یہ جانگداز چیخ سنی — "میرے بھتیجے! کیا تمھاری تلوار اپنے چچا کو بھی کاٹ ڈالے گی؟"

کیسا نازک مقام تھا! کتنا زہرہ گداز موڑ! امرء القیسؓ کے ہاتھوں کی رگوں میں گردش کرتا ہوا جو خون تلوار کو حرکت دے رہا تھا وہی خون باہر کھڑا ہوا ان کے مجازی باپ — ان کے حقیقی چچا کا روپ دھار کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

لیکن وہ انسان جو اس وقت نہ کسی کا بیٹا اور بھتیجا تھا نہ کوئی اس کا باپ اور چچا — جو محض خدا کا بندہ تھا فرط بندگی سے بیتاب ہو کر آگے بڑھا۔ جسم و جاں، خون و ایماں کی اس لرزہ خیز کشمکش میں ان کی فاتحانہ آواز گونج اٹھی۔

"ہاں بیشک آپ میرے چچا ہیں۔ لیکن خداوند ذوالجلال میرا رب ہے — وہ میرا مالک ہے۔ وہی سب کچھ ہے!"

زبان سے یہ زلزلہ خیز اعلان حق ہوا — دل کی مجاہدانہ دھڑکنوں نے اس کی تائید کی اور — مومن بھتیجے کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی ننگی تلوار نے مرتد چچا کی گردن اڑاتے ہوئے عزیمت مومنانہ کا منھ بولتا ثبوت پیش کیا۔ عبودیت کے پیکر بیتاب نے ایمان کے ایک اشارے پر خون کی شہ رگ کاٹ کر دکھا دی تھی — ثابت کر دیا تھا کہ اللہ پر ایمان کا جذبۂ کامل رگوں میں دوڑتے ہوئے خون سے بھی بڑی حقیقت ہے۔ جلّ جلالہٗ وعمّ نوالہٗ۔

—————— (((۲))) ——————

ضعف پیری سے کانپتے ہوئے حسیلؓ بن جابر جہاد سے معذوروں کے ساتھ مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے اور خدا کے نام پر جان و دل کی بازی لگانے والے مجاہد محاذِ اُحد پر جا چکے تھے ان مجاہدوں میں حسیلؓ کے لخت جگر حضرت حذیفہؓ بھی شامل تھے، لیکن عمر میں بوڑھے اور ناتواں اور ایمان میں جواں و توانا حسیلؓ کی تسکین کے لئے یہ بات کافی نہ تھی کہ انھوں نے حق و صداقت کی قربانگاہ پر اپنے پیارے بیٹے کو بھینٹ چڑھ جانے کے لئے ہنسی خوشی بھیج دیا ہے۔ جب شہادت کا بازار گرم ہو رہا ہو سر دھڑ کی بازی لگانے والوں پر رحمت کے لامتناہی خزانے لٹتے ہوئے دیکھ کر خدا کے بندے تیر و تلوار کی ایمان و عزیمت کا مظاہرہ کر رہے ہوں تو بھلا حسیلؓ جیسے انسان کو مدینہ کی بستی اور گھر کے گوشۂ عافیت میں کس طرح قرار آ سکتا تھا۔ جھریوں میں لپٹا ہوا ضعیف و ناتواں چہرہ حسرت بھرے آنسوؤں سے تر ہو ہو جاتا تھا۔ رہ رہ کر کانپتے ہوئے ہاتھ دعائے شہادت کے لئے پھیل جاتے اور دھندلائی ہوئی بوڑھی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھتیں تو روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ آخر کس قدر دلکش ہے وہ موت جو خدا کی راہ میں آئے کہ خدا کے بندے اس کے عشق میں اس طرح تڑپتے تھے جیسے وہ بے طرح پیاسے ہوں اور خدا کی راہ میں موت ہی ان کی پیاس کا واحد علاج ہو۔

اس حال میں مدینہ میں یہ خبرِ بد پہنچی کہ جنگِ اُحد کی بساط اچانک اسلام کے خلاف الٹ گئی ہے۔ اسلام جان و دل سے زیادہ پیارا اسلام موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوا خدا کے بندوں کو پکار رہا ہے — رسولِ خدا کی شہادت کی جھوٹی خبر نے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دنیا تاریک ہو گئی، وہ پاؤں اکھڑ گئے جن میں پہاڑوں کی صلابت نظر آتی تھی۔ یہ نقشہ دیکھ کر مدینہ سے معذوروں کا وہ قافلہ راہِ مولا میں سر کٹانے نکل کھڑا ہوا جس کو جہاد کی تکلیف سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ ان سرفروشوں اور جاں نثاروں کی بیتاب بھیڑ میں بوڑھے حسیلؓ بھی شامل تھے۔

میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو قیامت کا منظر سامنے تھا۔ بدحواسی اور خوف کی تاریکی میں اپنے اور بیگانے کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ اندھی تلواریں اور بہرے نیزے فضا میں کوند رہے تھے۔

اور کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ کس کی تلوار سے کون کٹ کٹ کر گر رہا ہے — لیکن حسیل رضؓ کو اس منظر نے ذرا بھی خوفزدہ نہ کیا۔ شہادت کی والہانہ تڑپ ان کو آگے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ آخر وہ اُس بھنور میں جا پھنسے جہاں مسلمانوں کی تلواریں بے خبری کے عالم میں مسلمانوں ہی پر گر کر زمین کو لالہ زار بنا رہی تھیں۔ ان کے بیٹے حذیفہ رضؓ نے بوڑھے باپ کو شہادت کے لئے بیتابانہ دوڑتا ہوا دیکھا — پھر وہ مسلمانوں کی تلواروں کے نرغے میں دکھائی دیئے۔ حذیفہ رضؓ چیخ اُٹھے "مسلمانو! — میرے باپ! — ارے میرے باپ!!" لیکن یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اس سے پہلے کہ مسلمان سوچ سمجھ سکتے، حسیل رضؓ مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ شہادت کے بوڑھے متوالے کو مومنوں کے ہاتھوں جام شہادت ملا تھا۔ کتنا بلند تھا وہ شہید جس کو کافر کی تلوار چھو بھی نہ سکی!

اب دیکھنا یہ تھا کہ حسیل رضؓ کے صاحبزادے حذیفہ رضؓ پر اس حادثہ کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟ مسلمانوں کی تڑپ میں اور خدا و رسول صؐ کے عشق میں جو بے پایاں ذوقِ شہادت سے جھومتا ہوا نکلا تھا اس کو خود مسلمانوں کی تلوار نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا — یہ دردناک غلطی جتنی لرزہ خیز تھی یہ حادثہ اتنا ہی جانگداز حادثہ تھا۔ تمام مسلمان اس حادثے سے بے حد متاثر تھے اور خود اللہ کے رسول صؐ کو شدید صدمہ تھا، لیکن حذیفہ رضؓ ٹھیک اس وقت انتقام و عصبیت سے آگ بگولہ ہونے کے بجائے خدا کے آگے اس طرح گڑگڑا رہے تھے "میرے مولا! میں نے ان غلطی کرنے والوں کو معاف کیا — تو بھی ان کو معاف کر دے — تیری رحمت، تیرے عفو و درگذر کی کوئی حد نہیں!"

یہ تھے وہ لوگ جن کے مصفّا قلوب کو اللہ کی محبت نے سمندر جیسی وسعت عطا کر دی تھی اور یہ تھے وہ نفوسِ مقدسہ جن کی جاں نثاریوں اور سرفروشیوں کی سینچی ہوئی کھیتی کو ہم آج تک کاٹ رہے ہیں — رضوان اللہ علیہم اجمعین

عدل و انصاف کے پیکر اور درد و غمگساری کے عظیم ترین مظہر حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حذیفہ رضؓ کو مسلمانوں کی طرف سے "دیت" ادا کریں — لیکن ان کی غیرتِ ایمانی نے اس خون کی قیمت لینا گوارا نہ کیا جو خدا کی راہ میں نثار ہوا تھا۔

"نہیں اے اللہ کے رسول صؐ" — حذیفہ رضؓ نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مسلمانوں کی بھول قابلِ رحم ہے، لائقِ سزا نہیں — پھر خدا کا بندہ خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے، دیت اور قصاص کچھ نہیں۔ میں تو خوش ہوں کہ میرے باپ کی بوڑھی ہڈیاں خونِ شہادت میں نہا کر وہاں پہنچ گئیں جہاں جوانمرد شہیدوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔"

———— ((۳)) ————

حضرت سعید بن العاص رضؓ مومن تھے ان کے باپ عاص کافر۔ وہ کفر پر ہی زندہ رہے اور کفر پر ہی ہلاک ہوئے۔ حضرت سعید رضؓ نے غزوۂ بدر میں ان کی لاش کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھا جن کو حضرت علی رضؓ کی تلوار نے کاٹ ڈالا تھا۔ لیکن سعید رضؓ نے یہ سنسنی خیز منظر کمال ضبط و سکون کے ساتھ دیکھا۔ ان کے ہونٹوں سے نہ کوئی درد بھری کراہ نکلی نہ رگوں میں عصبیت و انتقام کے شعلے بھڑکے انکی نظر میں ان کے باپ اُسی وقت مر چکے تھے جب انھوں نے اسلام و ایمان کی پکار سے مُنہ موڑا اور خدا سے بغاوت و انکار ہی کی کافرانہ زندگی پسند کی تھی۔ اس لئے وہ خود اپنے قاتل تھے۔ خود ہی ظالم تھے اور خود ہی مظلوم بھی! — حضرت علی رضؓ کی تلوار نے ایک زندہ انسان نہیں، ایک انسان کی زندہ لاش کے ٹکڑے کئے تھے۔ اس لئے سعید رضؓ کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کا ماتم کریں —

حضرت عمر رضؓ نے اپنے ماموں عاص کو قتل کیا تھا ایکبار کسی مجلس میں حضرت عمر رضؓ اور حضرت سعید رضؓ دونوں بزرگ یکجا ہوئے اور بدر کے اُن مشرک مقتولین کا ذکر چھڑ گیا جن کو ان کے مومن عزیزوں نے موت کی سزا دی تھی۔

حضرت عمر رضؓ نے حضرت سعید رضؓ کی طرف رُخ کیا اور ایک ممکن غلط فہمی رفع کرنے کی غرض سے کہا "میں بھی ایک عاص کا قاتل ہوں — مگر وہ میرے ماموں تھے آپ کے باپ نہیں!"

وہی سعید رضؓ جنھوں نے صبر و رضا کی عظیم کیفیت میں اپنے

کافر باپ کی ہلاکت دیکھی تھی — جو اس وقت بھی مشرک مقتولوں کی کہانی میں اپنے باپ کا تصور کر کے ذرا بھی آزردہ نظر نہیں آتے تھے — یکایک حضرت عمرؓ کی اس گفتگو پر چونک پڑے!۔ اس غلط فہمی کی صفائی کے معنی انھوں نے یہی نکالے کہ لوگوں کو میری اسلام دوستی میں شک ہے — وہ سوچتے ہیں کہ میں اپنے باپ کو خاک و خوں میں تڑپتا ہوا دیکھکر یہ حقیقت بھول گیا تھا کہ یہ میرے باپ کا نہیں خدا کے ایک باغی کا نجس خون تھا!۔

یہ سوچتے سوچتے حضرت سعیدؓ نے غیرتِ ایمانی سے تمتمایا ہوا گلرنگ چہرہ اوپر اٹھایا اور خلوص کی دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔ "اے عمر! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ نے کونسے کافر کو مارا - خدا کی قسم آپ حق پر تھے اور — میرے باپ باطل پر! — کیا برا تھا اگر وہ آپکے ہاتھوں قتل ہوئے ہوتے؟"

یہ نوائے حق سُنکر تمام مجلس پر گہرا سناٹا چھا گیا - یہ اسی بنی اُمیّہ کے خاندان کا ایک فرد نسلی عصبیت پر ایمان کی ضرب کاری لگا رہا تھا جس کے متعلق خاندانی، خونی اور نسلی تعصب کے شبہات ہوا کرتے تھے - کچھ لوگ سر جھکائے ہوئے اس "آواز" پر غور کر رہے تھے اور کچھ لوگ خود حضرت سعیدؓ کو فرطِ عقیدت سے تکتے رہ گئے! سب لوگ اس حسین چہرے میں ان کے دل کی یہ تحریر پڑھ رہے تھے کہ - "میں مومن ہوں — اور مومن کی جان خون میں نہیں ایمان میں ہوتی ہے"

کیا اس تحریر کا کوئی دھندلا سا نقش بھی ہمارے وجود کے کسی بھی گوشے میں کسی کو نظر آرہا ہے؟ کیا زندگی کے کسی بھی موڑ پر ہم نے اس حقیقت کا ثبوت دیا کہ ہم مومن ہیں اور مومن کی جان خون میں نہیں "ایمان" میں ہوتی ہے — سوچو — نفاق بے کرداری، دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے مسلمانو! اگر بیان غیرت کی اگر کوئی دھجی باقی ہے تو اس میں منہ ڈال کر سوچو کہ تم کہاں ہو — اور تمہارے وہ اسلاف کہاں تھے جنھوں نے حق کے قدموں میں اپنے کلیجے، اپنے دلوں کے ٹکڑے، اپنی پوری کائنات اس طرح نچھاور کر دی تھی جیسے یہ سب کچھ انھیں لٹانے اور قربان کر دینے ہی کے لئے ملا تھا — العظمة لله - العظمة لله -

سورج ڈھونڈتا پھر رہا ہے، چاند تلاش میں سرگرداں ہے، آسمان کھوج لگا رہا ہے کہ مسلمان کہاں گئے — وہ اُمت کہاں گئی جو حق کی تڑپ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر مسکراتی تھی — جس کے قدموں کی دھمک سے پہاڑوں پر رعشہ طاری ہوتا تھا اور جس کی نظر میں یہ دنیا — یہ گھریلو، حقیر، کم قیمت دنیا متاعِ کاسد سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی — لیکن ہم فخر سے سر اُبھار کر کہہ رہے ہیں۔

ہم ساٹھ کروڑ ہیں — ہم ساٹھ کروڑ ہیں!

باب الصحت

خطرہ کی گھنٹیاں

بیگم عظیم زبیری

بار بار نزلہ زکام کھانسی۔ کبھی کبھی حرارت، آئے دن سر کا بھاری پن۔ سانس کا پھولنا۔ روزمرّہ اعضاء شکنی۔ ہفتہ عشرہ میں درد سر کا دورہ۔ غذا کے بعد پیٹ میں بوجھ گرانی۔ بات بات پر جھنجھلاہٹ غصہ۔ طبیعت کا چڑچڑاپن۔ نیند کی کمی۔ ہر چیز میں پھیکا پن اور ہر بات میں بے لطفی، یہ سب خطرہ کی گھنٹیاں ہیں جو قدرت کی جانب سے محض اس غرض سے بجائی جاتی ہیں کہ نظام جسمانی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کیا جائے تاکہ زندگی بوجھ بن کر نہ رہ جائے۔

لیکن جب ہم اپنی جوانی کے زعم میں یا اپنی لاپرواہی کے باعث ان گھنٹیوں پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ بدپرہیزی پر بدپرہیزی کرتے چلے جاتے ہیں۔ کھانسی ہو رہی ہے، سانس کا زور ہے۔ بلغم ہے کہ غٹ کا غٹ آرہا ہے لیکن سگریٹ یا بیڑی منہ سے نہیں چھوٹتی۔ پیٹ میں گرانی ہے لیکن کھانا ڈٹ کر کھایا جا رہا ہے۔ سر بھاری ہے، حرارت ہو رہی ہے لیکن بجائے آرام کرنے کے دماغی یا جسمانی محنت کی جا رہی ہے۔ چار پینے کا یہ عالم ہے کہ وقت بے وقت جب چاہا ہوٹل میں جا پہنچے۔ پیالی پر پیالی چل رہی ہے۔ خواہ معدہ میں حدت بڑھے، قوت ہاضمہ خراب ہو یا اعصاب کمزور پڑیں کوئی پروا نہیں۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد ایک چھوڑ دو دو پیالیاں پی جا رہی ہیں۔ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ سانس پھولنے لگا ہے اعصاب کمزور پڑ چلے ہیں لیکن کولھو کے بیل کی طرح کاروباری کاموں میں جٹے ہوئے ہیں۔ کافی تعداد ایسے لوگوں کی ملے گی جنھیں عاقبت سنوارنے کی فکر نہیں، تندرستی کا خیال نہیں، روپیہ جوڑنے کا خبط ہے، دولتمند بننے کی خاطر کاروبار میں اتنے مشغول کہ تن بدن کا ہوش نہیں، کھانا بھی وقت بے وقت حلق سے اتار لیا، تھکے ہارے آکر رات کو جلدی جلدی کھانا کھا کر پڑ رہے۔ نہ ورزش کے لئے ان کے پاس وقت نہ چہل قدمی کے لئے ٹائم۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ان خطرہ کی گھنٹیوں کی پروا نہیں کی جاتی اور صحت و تندرستی کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی ہے تو آہستہ آہستہ جسم اس کی قوتیں اور اعصاب سب کمزور پڑتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ مدت گذر جاتی ہے کہ مرض آسانی سے دفع کیا جا سکتا ہو تو پھر نہ صحیح تدابیر کام دیتی ہیں اور نہ مناسب دوا۔ زندگی بوجھل اور اجیرن بن کر رہ جاتی ہے۔ انسان جیتا ہے لیکن مردوں سے بدتر ہو کر۔

ہر سمجھدار انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی صحت کا حد درجہ خیال رکھے۔ جتنی کوشش وہ معاشی سرگرمیوں میں کرتا ہے اتنی ہی کوشش صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہو۔ اگر کمزوری ہو تو طاقت کے تمام غیر ضروری مصارف مثلاً فالتو چلنا، فالتو بولنا فالتو سوچنا وغیرہ سب بند کر کے قوت کو صحت و جسم بنانے کے لئے کام میں لایا جائے۔ بکثرت چائے پینے والوں کو چاہئے کہ دودھ۔ دہی۔ مکھن۔ چھاچھ۔ انڈا۔ بادام کا استعمال بھی بقدر ہضم کرتے رہیں تاکہ بدن میں کیلسیم کی کمی نہ ہو۔ اگر آئے دن نزلہ زکام کھانسی کی شکایت ہوتی رہتی ہو، کبھی کبھی حرارت ہو جایا کرتی ہو۔ شام کے وقت بدن ٹوٹنے لگتا ہو ہتھیلیاں تلوے جلنے لگتے ہوں تو "زندگی" کا استعمال کیا جائے یا کسی حاذق طبیب کے مشورے سے کوئی اور کامیاب دوا اور ضروری پرہیز اختیار کیا جائے۔

منشائے کلام یہ ہے کہ امراض کو ان کے شباب پر پہونچنے سے قبل ہی زائل کرنے کی کوشش دانشمندانہ طریق ہے، ابتدائی مراحل میں لاپرواہی برتنے کا مطلب ہے بیماری کی جڑوں کو خوب جمنے اور پھیلنے کی چھٹی دیدینا۔

مؤلفہ:- شہرۂ آفاق محدث و فقیہہ ادیب و خطیب علامہ ابن الجوزی بغدادی
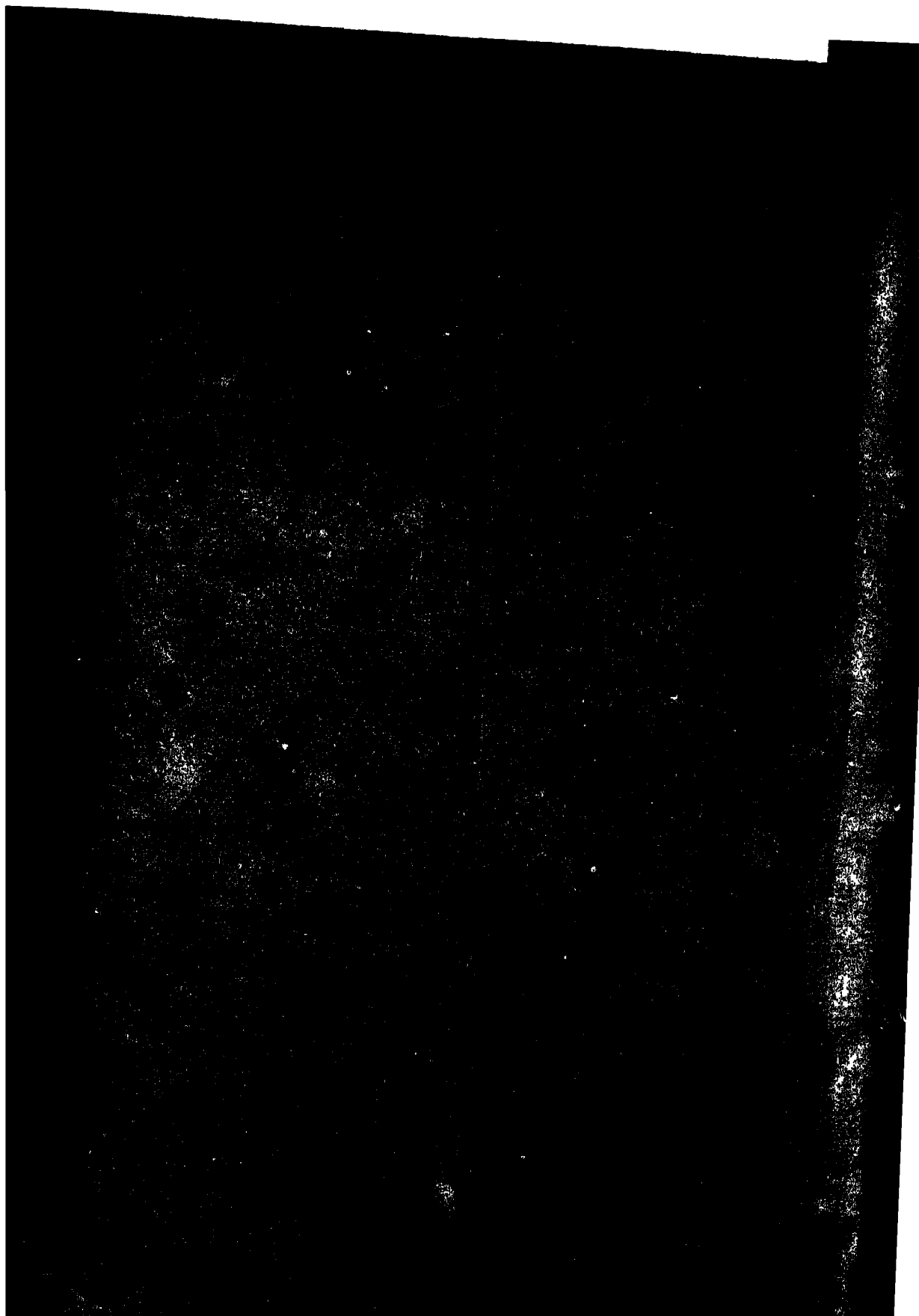
اس کتاب کے مصنف چھٹی صدی ہجری کے جلیل القدر محدث فقیہہ علامہ امام ابن الجوزی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جن کے بلند علمی مقام اور تبحر و تفقہ سے دینی و علمی حلقے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کے تعارف میں عوام کو اتنا ہی بتانا کافی ہوگا کہ آپ کے ہاتھ پر بیس ہزار یہود و نصاریٰ نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے توبہ کی۔ حدیث سے متعلق آپ کے حسنِ تعلق اور شغف کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جن قلموں سے آپ احادیث لکھتے تھے اُن کے تراشے محفوظ رکھتے تھے۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ میرے غسلِ میت کا پانی ان ہی تراشوں سے گرم کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تراشوں کا ایک ذخیرہ پھر بھی باقی بچ گیا۔ ایسے عالی مقام مصنف کی تصانیف جس قدر اعلیٰ و ارفع ہو سکتی ہیں ظاہر ہے۔ مختلف علوم میں آپ کی تین سو چالیس تصانیف ہیں مجلدات کی کل تعداد دو ہزار ہے۔

اس کتاب میں

سات سو ایسے قصص و لطائف مذکور ہیں جس میں ہر ایک ذکاوت یا حاضر جوابی یا نکتہ رسی یا دانشورانہ مزاح یا ایسے ہی کسی کارنامۂ عقل و فراست کا آئینہ دار ہے۔ **یہ کتاب تینتیس ۳۳ ابواب پر مشتمل ہے** جن میں عقل و فراست کے فضائل و مناقب اور فہم و ذکا کی علامات کے علاوہ انبیاء، صحابہ، علماء و مشائخ، فقہاء و ادباء، عباد و زہاد، رؤسا و غرباء، عوام و خواص غرض سب ہی سے متعلق دلچسپ قصص ہیں۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں حتیٰ کہ چوپایوں تک کی ذکاوت کے حالات دلپذیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ **اصل کتاب** عربی میں تھی اور عبارات نہایت دقیق تھیں۔ فاضل مترجم حضرت مولانا **اشتیاق احمد صاحب** استاد دار العلوم دیوبند نے بڑی محنت و جانفشانی سے اس ادبی کتاب کو نہ صرف اردو لباس پہنایا بلکہ بہت سے مفید اضافے بھی کئے۔ بات کو سمجھنے کے لئے عربی محاوروں کی توضیح اور تاریخی واقعات کی ضروری وضاحت کے علاوہ جہاں اختصار کے باعث مطلب سمجھنا مشکل تھا وہاں عبارت بڑھا دی گئی۔ جن حکایتوں میں کوئی خاص نکتہ ذرا چھپا ہوا تھا تو بین میں اسکی طرف اشارہ کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ غرض افادیت کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ حضرت مولانا قاری **محمد طیب** صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے اس کا پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔ ہم ناظرین سے اس کتاب کے مطالعہ کی پرزور اپیل کرتے ہیں۔

ضخامت:- چار سو اسی صفحات۔ **قیمت:-** مجلد مع خوشنما گرد پوش صرف پانچ روپے (ﷲ)

ہر قسم کی عربی فارسی اردو کتب نیز قاعدے پارے
قرآن مجید حمائلیں معری و مترجم ارزاں ملنے کا پتہ

مکتبہ تجلی دیوبند ضلع سہارنپور یو. پی. انڈیا

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs. 7. 62 nP.

دیہاتی معالج
Hamdard

ہمدرد
دہلی ، کانپور ، پٹنہ
cinkara

ہندوستان کے عظیم قومی رہنما مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی یاد میں ادارہ فیض القرآن دیوبند کا
دینی ماہنامہ "مشرب دیوبند" پیش کرتا ہے:-

مجاہد ملت نمبر

جو
کتابت و طباعت کے خاص اہتمام کیساتھ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر ۱۵ اکتوبر سنہ ۶۲ء کو شائع ہو رہا ہے

جس میں

- مجاہد ملت کی دینی اور سیاسی خدمات
- ملک بھر کے نامور اہل قلم کے مقالات
- اس شعلہ بیان مقرر کی لافانی تقاریر
- مولانا کے وصال کا آنکھوں دیکھا حال
- اور بے شمار مرثیئے اور قطعات ہوں گے۔

مجاہد ملت نمبر کی قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے

زائد رقم سے بچنے کے لئے

پہلی فرصت میں ماہنامہ مشرب کا سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپے ذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیے۔ تاکہ یہ عظیم الشان تاریخی نمبر آپ کو سالانہ چندے کی رقم ہی میں مل جائے۔

ایجنٹ حضرات

اپنی مطلوبہ کاپیوں کی فرمائش یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء تک دفتر میں بھیج دیں۔ اس کے بعد آنے والے آرڈروں کی تکمیل کے لیے دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔
(ایڈیشن محدود)

پاکستانی حضرات

جملہ رقوم حافظ عزیز الرحمٰن صاحب مکان نمبر ۲۲۳ P مین بازار۔ محلہ سنت پورہ لائل پور کو ارسال فرماکر رسید براہ راست دفتر کے پتے پر دیوبند روانہ کردیں۔

مکمل خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ مشرب دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی)

ماہنامہ تجلی دیوبند

جلد نمبر ۱۴ — شمارہ نمبر

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے ۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے)

فہرست مضامین مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء

اشتہار ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو

سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا)۔ منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی دیوبند ضلع سہارنپور یو پی۔

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:- مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

آہ مولانا حفظ الرحمٰن!

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ مرتے ہیں تو احباب واقرباء کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے ـــــ لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو ادھر سے ادھر تک فضا میں اندوہ وملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے اور کوئی نہیں گن سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے نہا گئیں۔ صرف اشکوں ہی کی بات نہیں، ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں، دماغ لو دے جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر پگھلی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر پھیل جاتی ہیں۔

کیا شک ہے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن قدس اللہ سرہ العزیز ایسی ہی بلند مرتبہ اور ذی شان ہستیوں میں سے تھے جن کی موت نے ہر اس شخص پر غم کا پہاڑ توڑ دیا ہے جسے مرحوم ومغفور کے اوصاف عالیہ اور محاسن محامد کا ادراک ہے۔ جس کے سینے میں دل مر نہیں چکا ہے اور جو اپنے ملک وملت کے مخصوص حالات ومسائل کا شعور رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ ثراہٗ کا وجود ناموافق حالات کی ماری ہوئی امت مسلمہ کے لئے آج کس قدر اہم تھا۔

کوئی برا مانے یا حیرت کرے ہم تو بلا خوف تردید عرض کریں گے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کی موت کا حادثہ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے مجاہد ملت کی موت امت مسلمہ کے لئے زیادہ کاری زخم ہے۔ مولانا آزاد اپنے اچھے اور برے بنگلے اور بھاری اعمال کا سرمایہ سنبھالے دوسری دنیا میں جا چکے ان کے لئے سوائے حسن ظن، سوائے عقیدت، سوائے دعائے مغفرت کے ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ ان کے علم وفہم، ان کی ذکاوت وجودت ان کی تحریر وتقریر، ان کی امتیازی آن بان سے صرف نظر تو بھلا کون کم سواد کر سکتا ہے لیکن یہ صداقت بہر حال اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ ان کی رنگا رنگ صلاحیتوں کا پورا شباب، ان کی ساری توانائیاں جنگ آزادی کی نذر ہوئی تھیں اور جب آزادی کا سورج ہم پر طلوع ہوا تو وہ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا دامن سمیٹ کر اعزاز ومنصب کی ان بلندیوں پر جا بیٹھے تھے جو اگرچہ بجا طور پر فاتح سپاہ کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تاریخ کی چند منفرد یا ادر خال خال مثالوں کے سوا وہاں تک عوام کے دل کی دھڑکنیں اور جذبا[ت] کے احساسات کی آہٹیں کبھی نہیں پہنچا کرتیں۔

لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ تو ان مجاہدوں میں تھے جنھوں نے عین میدان جنگ میں جان دی ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد بھی تعصب، تنگ نظری، فرعونیت اور ظلم کی طاقتوں کے ہاتھوں ہمارا وطن امت مسلمہ کے لئے ایک جنگاہ [illegible] بنا ہوا ہے جہاں مسلمان مسلسل مدافعت، فریاد واحتجاج اور کرب واضطراب کا مجسمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ایک جابر سماج ذہن بے تکان ان پر جبر وتعصب کے ترکش خالی کر رہا ہے مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمہ ظلم وطغیان کی ان [illegible]

[illegible]

[illegible] جسمانی اعتبار سے نحیف تھے لیکن جرأت و ہمت کے لحاظ سے بڑے شجاع تھے۔ شیر دل تھے، بے باک اور نڈر تھے۔ انکی زندگی کے تقریباً چالیس سال اس جنگ جو سورما کی طرح گزرے ہیں جو اپنا کفن سر سے باندھے حریف کے آگے مستقل ڈٹا ہوا ہو۔ انھوں نے دہری ابتلائیں جھیلی ہیں۔ جو کبھی جنگ لڑی ہے۔ ایک طرف انھیں اپنی ہی ملت کے ان افراد سے دست و گریباں ہونا پڑا جو ان کی دانست میں غلط فکر و نظر کے علمبردار تھے۔ لیگی عقائد کے حاملوں سے وہ بڑی بیجگری کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں اور دوسری طرف امت مسلمہ کو باطل اور جارحانہ عزائم کے بے تحاشہ برسنے والے تیروں سے بچانے کی انتھک جد و جہد انھوں نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک تقدیر الٰہی نے انھیں بستر کا بیمار بنجانے پر مجبور نہیں کر دیا۔ اللہ اللہ۔ کیسے انتھک۔ بے باک۔ سیماب وش۔ سرگرم اور جفاکوش تھے مولانا حفظ الرحمن رحمہ اللہ تعالیٰ ——— ایک شعلۂ جوالا ——— ایک موج رواں ——— ایک جہد مجسم ——— ایک نہ سرد ہونے والی لگن ——— ایک ایسا پیکر امید جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا اور مسلمانوں کو للکارا کہ نادانو! بھاگو مت، خوف زدہ مت ہو، یہ ملک تمہارا ہے، یہ زمین و آسمان تمہارے ہیں۔ متحد ہو کر ظلم کی طاقتوں کا مقابلہ کرو اور ثابت کر دو کہ وطن کی محبت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جمعیۃ العلماء کے سیاسی فکر سے ہمیں کامل اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ ہمارے پاس اختلاف کے متعدد دلائل تھے اور ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اعتراف سے بھی ہمیں کوئی نہیں روک سکتا کہ مولانا حفظ الرحمن خداداد صلاحیتوں اور قابل رشک [illegible] محاسن کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ ان کے [illegible]

[illegible] ہے۔ ان کی حیات قوم و ملت کے لئے بڑی [illegible] وہ مضبوط سہارا تھے۔ اور آج جبکہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جا ملے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک یاس انگیز ساعت ہے۔ ایک کربناک لمحہ [illegible] ایک حادثۂ عظیم ہے۔ موت کا فرشتہ اگر اللہ جل شانہ کا [illegible] فرمان نہ ہوتا تو ہم فرط غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ [illegible] ملت کی روح قبض کرنے میں اس نے جلد بازی کی ہے۔ موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے کہ ہم غالب کی زبان میں کہہ سکیں

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس بیس سال [illegible] جیئے جانا عجوبہ کہلاتا۔

مگر ہمارے منہ میں خاک ——— کوئی شے [illegible] حادثہ اور عظیم سے عظیم ابتلا بھی خالقِ حکیم و دانا کی مصلحت سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ ہر قیامت جو ہم پر ٹوٹتی ہے [illegible] حق ہے کہ ٹوٹے کیونکہ جو کچھ جس وقت ہوتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو۔ تقدیر الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں۔ تعالیٰ اللہ عزّ و جلّ۔

حاصل تعزیت یہ ہے کہ جس وقت ہمیں شیر دل اور مخلص مجاہدوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت مولانا حفظ الرحمن جیسے سخت کوش، بلند حوصلہ اور انتھک بزرگ کا اٹھ جانا ایک ایسے ستون کا گر جانا ہے جو [illegible] کے عزم و ہمت کی گرتی ہوئی دیواروں کا سہارا بنا [illegible] جس نے ۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں آگ اور خون کے سیلِ تند سے گزرتے ہوئے بے شمار انسانوں کو پیام حیات دیا تھا۔ اور اس کے بعد سے مسلسل اب تک ہر محاذ پر اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے [illegible]

[illegible] ملت ہی کی خدمت اور ملی وصداقت ہی کے [illegible]
[illegible] لواسنے پر کھپا رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری قوم ایک طویل عرصے سے مردہ پرست ہے! وہ زندوں کو بہت کم شمار میں لاتی ہے مگر جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی عقیدت و محبت کا پرچم ساتویں آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔ آپ دیکھتے ہی ہیں کہ جب کوئی بزرگ دار فانی سے تشریف لے جاتے ہیں تو کتنے ہی دنوں تک ماتم سرائی کا وہ غلغلہ بلند رہتا ہے کہ گویا سینے پھٹ جائیں گے اور دل و جگر اشک بن کر بہہ جائیں گے۔ جا اور بیجا صحیح اور غلط ہر طرح کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کی ساری استعدادیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ لیکن مرنے والے کی زندگی میں ان قصیدہ سراؤں نے کس حد تک عقیدت و انقیاد کا ثبوت دیا اور عملاً اس کے کاز کو کتنی تقویت پہنچائی یہ سوال دردناک [illegible] دردناک ہے۔ خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی زندگی میں [illegible] ملال رہا کہ جس محاذ پر انھیں زبانی جمع خرچ کی نہیں عملی تعاون کی ضرورت تھی وہاں وسیع معنوں میں انھیں تعاون نہ مل سکا۔

جو لوگ مولانائے مرحوم کی محبت کے دعویدار ہیں انھیں ماتم و شیون اور قصیدہ سرائی سے جلد فراغت حاصل کر لینی چاہئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کا [illegible] سالہ ماتم کسی مرض کا علاج نہیں بن سکا تو اور کسی کی طویل عزاداری کیا ثمرہ دیگی۔ محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ جس جہد مسلسل کو مرحوم نے اپنایا تھا آپ بھی اسی کو حرز جاں بنائیے۔ آپ اگر نظریاتی پہلو سے ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں تو جدوجہد، سرگرمی، تہوّر، تندہی اور ایثار و اخلاص میں تو بہرحال ان کی تقلید امر لازم ہے۔ اگر انیس و دبیر کی طرح مرثیے ہی پڑھنے ہیں تو سمجھ لیجئے مرحوم کی روح آپ کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے

[illegible] فضل و رحمت سے نوازے اور ہمیں [illegible] ملت کی توفیق دے۔ مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے ہم تہِ دل کے ساتھ اپنی غمگساری اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز جمعیۃ العلماء کے ارباب حل و عقد سے ملتمس ہیں کہ مایوس و دلگرفتہ نہ ہو جائیں۔ انسان جدوجہد ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جدوجہد کا میدان بہرحال جوں کا توں ہے۔ مایوسی اور باہمی جنگ اقتدار سے دامن بچا کر مولانائے مرحوم کے کاز کو تکمیل تک پہنچانا ہی چاہئے اور اگر طبع نازک پر گراں نہ ہو تو یہ گذارش بھی ہم ادب کے ساتھ کریں گے کہ نظری اور عملی اعتبار سے بعض خامیاں [illegible] میں پائی جاتی ہیں ان پر بھی بے نفسی اور دیانت کے ساتھ توجہ کرنی چاہئے۔ خود تنقیدی ترقی کا زینہ ہے۔ اگر جمعیۃ کے ارباب حل و عقد خلوص کی سطح پر آ کر غور کریں گے تو انھیں پہلے ہی مرحلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگی کہ [illegible] خطوطِ عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ [illegible] محض اشارہ ہے۔ تفصیل پر غور کرنا ارباب جمعیۃ کا کام ہے۔

ایک اور سانحہ

ابھی اس تحریر کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری کے انتقال کی خبر بھی کانوں نے سن ہی لی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ ایک عظیم مرشد تھے۔ اس دور قحط الرجال میں آپ کی ہستی مغتنمات میں سے تھی۔ دلی صدمے کے ساتھ ہم حضرت کے تمام متعلقین و متوسلین کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں آخرت کے اعلیٰ درجات سے نوازے۔ آمین۔

آغازِ سخن

بعض اتفاقات عجیب ہوتے ہیں۔ کیا یہ عجیب نہیں ہے
[گ]زشتہ شمارے کے مضمون "شرفاء کی زبان" میں مولانا مودودی
[کا پو]را اقتباس کتابت سے رہ گیا اور اس کا علم طباعت کے
[بعد] مختلف حضرات کے خطوط سے ہوا۔

مگر اس سے بھی بڑھ کر عجیب یہ سنئے کہ راقم الحروف
[نے] اس مرتبہ اس اقتباس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن
[عی]ن اس وقت جب رسالہ پریس جانے کے لئے تیار تھا نہ جانے
[کہ]اں اور کیسے وہ ماخذ گم ہو گیا جس سے اقتباس لینا تھا۔ تلاش
[میں] کسر نہیں چھوڑی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی اب اس کے
[سو]ا چارہ نہیں کہ یہ معمولی سا خلا، خلا ہی رہنے دیا جائے۔ معمولی
اس لئے کہہ رہے ہیں کہ قیام و میلاد جیسے مسائل میں مولانا
[مو]دودی کے افکار و عقائد کسی دوست اور دشمن سے پوشیدہ
[نہ]یں۔ وہ متعدد بار اپنے موقف و مسلک کا اظہار بھی کر چکے
[ہی]ں اور کسی بھی ایسے شخص سے جو جماعت اسلامی کا رکن یا ہمدرد
[ہو] یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مولانا موصوف کے خیالات سے
ناواقف ہوگا۔

اس اقتباس کا حاصل یہی تھا کہ میلادی قیام کیلئے کتاب و
[س]نت یا صحابہ و ائمہ کے ارشادات میں تو کیا بنیاد ملتی
[ع]قل و عادت کے اعتبار سے بھی یہ دور از کار اور بے معنی ہے۔
[سو]ائے اس کے کہ آدمی مغفلین کا شکار ہو جائے کوئی بنیاد
[ع]قلی نہ نقلی قیام کے لئے موجود نہیں ہے۔

تجلّی کی ڈاک

ہمیں احساس ہے کہ "تجلّی کی ڈاک" کا خانہ کچھ دنوں سے
ویران ویران سا چل رہا ہے ۔۔۔ اس بار تو وہ سرے سے ہے
ہی نہیں ۔۔۔ ناظرین کو اس سے جو بدمزگی ہوتی ہے وہ ہم سے
پوشیدہ نہیں، لیکن حالات ہی کبھی کبھی ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ
اپنی بے بسی کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ اب تین ماہ
سے برہان کے اداریوں کا جائزہ کافی صفحات لے رہا ہے۔
نیز دیگر مضامین بھی کچھ کم اہم نہیں چل رہے۔ نتیجہ یہ کہ دو ماہ
تک "کھرے کھوٹے" کے صفحات غائب رہے۔ اب اس بار
دس بارہ صفحات دیئے جا رہے ہیں مگر تبصرہ طلب کتابیں اب
بھی بڑی تعداد میں جمع ہیں اور آمد کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

ان سب امور کو پیش نظر رکھئے تو ہماری معذوریاں آپ کی
سمجھ میں آ جائیں گی۔ برہان کے اداریوں کا جائزہ تو پورا ہوا
اب ارادہ ہے کہ اگلے ماہ سے "تجلّی کی ڈاک" کو حتی الوسع
رونق دی جائے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ اس
ماہ علالت نے بھی دو ہفتے ہمیں ناکارہ بنائے رکھا ہے قارئین
دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید توانائی، توفیق اور صحت و
ہمت سے نوازے۔ تجلّی کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا کر پیش
کرنا ہی ہماری سب سے بڑی
آرزو ہے

اسلامی اخلاق کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل سورہ نور کی ایک عظیم محققانہ تفسیر

تحقیق مزید "خلافت معاویہؓ و یزید" کے سلسلہ میں تاریخ کی مزید چھان بین۔ شیعی پروپیگنڈوں کا ابطال۔ صحابہؓ کی عظمت کا تحفظ، ذہنی دلائل، کھرا نقد۔ یہ کتاب آپ کو نئی حیرتناک معلومات دے گی۔ مبسوط اور دلچسپ۔
مجلد آٹھ روپے (خلافت معاویہؓ و یزید چھ روپے)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی چند کتابیں

● قرآن کا قانون عروج و زوال۔ ڈھائی روپے ● اسلامی جمہوریہ ڈیڑھ روپیہ ● مسئلہ خلافت۔ پانچ روپے ● آزادؒ کی کہانی خود آزادؒ کی زبانی۔ سات روپے ● مقالات آزادؒ۔ دو روپے ● نگارشات آزادؒ۔ چھ روپے ● عیدین۔ ڈیڑھ روپیہ ● مضامین البلاغ۔ ساڑھے تین روپے ● امر بالمعروف۔ ڈیڑھ روپیہ ● شہید اعظم۔ ڈیڑھ روپیہ ● صدائے رفعت۔ ساڑھے تین روپے ● انسانیت موت کے دروازہ پر۔ ساڑھے تین روپے ● غبار خاطر۔ چھ روپے ● اصحاب کہف۔ سوا دو روپے ● ولادتِ نبوی مکمل۔ دو روپے ● ام الکتاب۔ پونے پانچ روپے ● مضامین آزادؒ۔ دو روپے۔ ● حضرت یوسفؑ۔ دو روپے۔

حافظ ابو محمد امام الدین کی مفید تصنیفات

ان کے مطالعہ سے روح ایمان تازہ ہوتی ہے

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم .... ڈیڑھ روپیہ
حضرت خدیجہؓ .... ایک روپیہ
حضرت فاطمہ زہرہؓ .... بارہ آنے
خاصانِ خدا کی نماز .... بارہ آنے
نماز کے فضائل .... پندرہ آنے
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت .... ایک روپیہ
ان چھ کتابوں کی یکجائی قیمت .... ساڑھے پانچ روپے

نشر الطیب

حضورؐ کی سیرت پر مولانا اشرف علیؒ کی مشہور کتاب۔
قیمت تین روپے (مجلد چار روپے)

مناسک حج

حج کے متعلق امام ابن تیمیہؒ کے محققانہ افاضات
مجلد تین روپے

المنجد دنیا کی مشہور ترین عربی ڈکشنری اردو لباس میں۔ بے شمار تصاویر۔ ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات۔ مجلد ستائیس روپے۔

مکتبہ تجلی دیوبند

برہان کا تیسرا اداریہ (جولائی ۶۲ء)

ہم بتا چکے ہیں کہ مدیر برہان کا تیسرا اداریہ نسبتاً طویل ہے۔ طویل ہونا کوئی عیب نہیں بشرطیکہ مطالب جاندار ہوں لیکن ہم اپنی کم نگاہی اور کوتاہ ذوقی کا اعتراف کریں گے کہ ہمیں اس طول میں فکر و بصیرت کا سرمایہ بہت کم اور غیر ضروری، بے جان اور مغالطہ انگیز تفصیلات کا انبار زیادہ نظر آتا ہے۔ مولانا کے مقام بلند کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر مولانا مودودی کے اسلامی حکومت کے تصور کا رد اور بزعم خویش صحیح ترین تصور کا اثبات کسی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا تو پہلے مستند مآخذ سے مولانا مودودی کا موقف سلک وضاحت کے ساتھ پیش کرتے پھر اس کی خامیوں پر انگلی رکھتے، پھر اپنے بے عیب تصور کی تصریح فرماتے اور یہ سب کچھ قرآن و سنت اور ائمہ و فقہاء کے ارشاد کی روشنی میں ہوتا لیکن مدیر برھان کے موجودہ قلم پارے تو بس یہی تاثر دیتے ہیں کہ قرآن کے ابدی اصول، حدیث کی رہنما ہدایات، صحابہؓ و ائمہ کے محکم فرمودات اور اسلام کے انفرادی خدوخال کسی توجہ کے مستحق نہیں ہیں۔ توجہ کی مستحق اگر کوئی چیز ہے تو صرف یہ کہ اسلام کو اپنے اساسی تصورات اور یکتا امتیازات سے دستبردار ہو کر ہر اُس سانچے میں ڈھل جانا چاہئے جو مادّی اور سطحی اعتبار سے مفید معلوم ہو۔ اس خواہش اور فیصلے کے لئے وہ قرآن و سنت اور علمائے سلف سے تو کوئی استشہاد نہیں کرتے۔ البتہ ان کا سب سے بڑا سہارا جسٹس محمد منیر کی رپورٹ ہے ـــــ وہ رپورٹ جس کی حقیقت ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس رپورٹ کے علاوہ اگر انھیں کچھ ملا ہے تو وہ ہے ڈاکٹر اقبال، محمد علی جناح اور ڈاکٹر حمید اللہ کے چند فرمودات کا سرمایہ جس کا سہارا لیکر انھوں نے اس نادر دعوے کا اثبات کرنا چاہا ہے کہ اسلامی نظام سیکولر بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ آدمی اکثریت کے فیصلوں کو صرف آخرت احبار انسانوں ہی کو قانون سازی کا مکمل اقتدار

ماننے ہوئے بھی یہ اعلان کرتا رہا ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ کو حجت تسلیم کرتا ہے! یا للعجب۔

فاضل مدیر برہان اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت کی کوئی معین شکل نہیں ہے۔ ہم نے گذشتہ جائزے میں ان کے اس ارشاد کو حسن توجیہ کا م لیکر قابل تسلیم گردانا تھا اور عرض کیا تھا کہ بیشک اسلامی حکومت ڈھانچے اور طرز روانانہ کے اعتبار سے مختلف شکلوں کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے تمام فرمودات پر غور کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس معاملہ میں بھی ان کے اور ہمارے خیال میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہم جو اسلامی حکومت کی ظاہری شکل و صورت کی رنگارنگی کو تسلیم کرتے ہیں وہ ایسا ہی ہے جیسے ایک سُنار سونے کو پگھلا کر متعدد ڈزائنوں کے زیور بناتا ہے گوشوارے، چوڑیاں، بازوبند، ہار اور جھومر وغیرہ ظاہر ہے کہ صورت کے اعتبار سے یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کا نام بھی ایک نہیں ہوتا ـــــ پھر بھی یہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان سب پر سونے کا اطلاق ہوتا ہے اور اجزاء ترکیبی کے لحاظ سے ان میں کوئی تخالف نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر اسلامی حکومت کے بنیادی اجزاء و مادہ کو باقی رکھتے ہوئے حکومت کا ڈھانچا بنایا جائے تو اسے اسلامی تسلیم کرنے میں کوئی استحالہ نہ ہوگا چاہے اصطلاحی طور پر وہ وفاقی کہلائے صدارتی یا کچھ اور۔

لیکن مدیر برھان جس رنگارنگی اور توسّع پر زور دے رہے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف شے ہے۔ وہ تو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سونے کے زیور بنانے والے سُنار اگر پیتل اور تانبا پگھلا کر بھی زیور بنا دیں تو ان زیوروں میں اور سونے کے زیوروں میں کوئی تضاد نہ ہوگا۔

یہ بدگمانی یا الزام تراشی نہیں ہے۔ مدیر برہان اسلام اور کمیونزم کے ظاہری خدوخال اور چند مشترک و مشابہ اجزاء کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اُس جوہری تضاد کو قابل ذکر تک نہیں سمجھتے جو اسلام کو کمیونزم سے جدا کرتا ہے۔ یعنی آئین و دستور کا منبع و ماخذ اور مقصد و غایت۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ زیوروں کی سطحی یکسانی اور جنسی مشابہت پر تو زور دیا جائے لیکن نہ دیکھا جائے کہ ان کے بنانے میں سونا استعمال کیا گیا ہے یا تانبا۔ ان میں پیتل غالب ہے یا رانگ۔ دوسرے لفظوں میں امیٹیشن اور طلائی زیورات میں بنیادی فرق تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

منیر رپورٹ کی مدح سرائی اور اس کا نفسیاتی پس منظر

یہ تو تھا ایک پہلو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ منیر رپورٹ کی جس مدح سرائی کا آغاز وہ دوسرے اداریئے میں کرچکے تھے وہ تیسرے اداریئے میں پورے شباب پر ہے۔ انھوں نے صرف تحسین اور چھوٹے چھوٹے اقتباسات ہی پر بس نہیں کی بلکہ آخر میں تو پورے ڈھائی صفحات کا اقتباس دے ڈالا ہے۔ اس اقتباس کی کیا قدر و قیمت ہے اس کا جائزہ تو ہم بعد میں لیں گے پہلے ہمیں یہ اظہار رنج و حیرت کرنا ہے کہ مدیر برہان ایک فہیم عالم ہونے کے باوجود یہ محسوس نہ کرسکے کہ منیر رپورٹ جیسے ماخذ سے مولانا مودودی اور دیگر علماء کا تخطیہ کرنے کے لئے حوالے لینا سنجیدہ فعل نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی نصرانی یا یہودی اسلام پر اعتراض کرے کہ اس کا فلاں حکم ظلم پر مبنی ہے اور جب اس سے پوچھا جائے کہ بھائی اسلام نے یہ حکم کہاں دیا تو وہ انجیل یا توریت اُٹھا کر دکھانے لگے کہ دیکھیئے اس میں یہ درج ہے،

انجیل و توریت تو پھر آسمانی کتابیں ہیں جن کا کوئی نہ کوئی حصہ تحریف سے بچ ہی رہا ہوگا مگر جسٹس محمد منیر کی رپورٹ کا تو ایک شوشہ بھی آسمانی نہیں۔ اس کے باوجود اسے "صحیفۂ مقدس سمجھنا" اس پر "توحید کرنا" اس کے ذریعہ مولانا مودودی اور اسلام پسند علماء کو تختۂ مشق بنانا اس کے سوا کیا معنے رکھتا ہے کہ یہ اداریئے لکھتے وقت مدیر برہان ذہنی طور پر اپنے معروف مقام و منصب سے ہٹ کر اُن حضرات کی صف میں پہنچ گئے ہیں جن کے نزدیک مغربی طرز فکر ہی سب کچھ ہے اور قرآن و سنت کا ورد کرنے والے اسلاف و اخلاف "ملّا" کے سوا کچھ بھی نہیں ــــ وہ ملّا جسے طعن و تشنیع کا ہدف بنانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

یہ بھی محض بدگمانی نہیں۔ اس کے لئے کھلے شواہد ان کی تحریر میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اسلام اور سیکولرازم کے تضاد کی نفی کرنے کے لئے وہ استدلال کرتے ہیں کہ:۔

"یہ نظام (اسلامی نظام) چونکہ ترقی پسندانہ ہے، اس لئے وہ حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا۔"

ہر ہوشمند اور باعلم آدمی جانتا ہے کہ اسلام کی توصیف "ترقی پسندانہ" کی اصطلاح حلقۂ علماء کی اصطلاح نہیں ہے یہ اصطلاح اُن مغرب زدہ زنادقہ کی گھڑی ہوئی ہے جو خوشنما الفاظ اور اصطلاحوں کے ذریعہ مادی تہذیب و تمدن کے ناپاک لوازمات کو مسلمانوں کے لئے مباح قرار دیدینا چاہتے ہیں خدا بیزار نظریات کا پرچار کرنے والے ادیبوں کو ان کے عقیدتمندوں نے "ترقی پسند ادیب" کا نام دیا تاکہ ان کی بے راہ روی کا جواز نکل آئے۔ اسی طرح عریانی و فحاشی، بے قید آزادی، مغربی فیشن زدگی اور تمام مقبول و مروّج خرافات کو مباح کرنے کے لئے شاگردانِ مغرب نے اسلام کو "ترقی پسند" کے خطاب سے نوازا۔ اس کے پیچھے صرف یہ عیاری کارفرما تھی کہ ہر وہ عقیدہ و عمل جسے مغرب کی مقتدر تہذیب نے ترقی کی علامت و مظہر قرار دیا ہے اسے اسلام بھی "ترقی" ہی مانے کیونکہ وہ "ترقی پسند" ہے!

یہی فائدہ اس اصطلاح سے مدیر برہان اٹھا رہے ہیں۔ بالکل بھول گئے کہ ترقی پسندی کی ذومعنی اصطلاح کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ایک اور اصطلاح انھوں نے استعمال کی ہے ــــ فرماتے ہیں:۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی حکومت کا تصور کس قدر رجعت پسندانہ ہے؟ یہ کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے۔"

"رجعت پسندی" کی اصطلاح بھی ہر باخبر جانتا ہے کہ اسلامی علوم و فنون کی اصطلاح نہیں، بلکہ یہ تو سیاست حاضرہ کی ایک گالی ہے جو سیاسی رہنما اپنے حریف کو دیتے ہیں۔ یہ اصطلا

[illegible] کر کے
مادی فکر و تہذیب کی آمریت قائم کرنے کے درپے ہیں۔ اصلاً یہ شاید روس سے آئی ہے۔ کمیونسٹ ممالک کا عام وطیرہ ہے کہ وہاں کے مقتدر افراد جسے بھی نشانۂ ستم بنانا چاہیں اسے ایسی ہی اصطلاحوں کے تیروں سے چھلنی کرتے ہیں۔ رجعت پسند، انفرادیت کیش، سامراجی ایجنٹ، بورژوا وغیر ذلک۔ ہر وہ شخص ان اصطلاحوں کی زد میں آتا ہے جو دین، اخلاق اور عدل و دیانت کی بات منہ پر لائے۔ اسی اسوے کی تقلید میں متجددین نے دینی رہنماؤں کے لئے رجعت پسند اور ملّا جیسی اصطلاحیں گھڑی ہیں۔ کسی مذہبی شخصیت کے لئے ان اصطلاحوں میں سے کسی اصطلاح کا استعمال وہی شخص کر سکتا ہے جو ڈپلومیسی اور نعرہ بازی کا کھیل کھیلنا چاہتا ہو۔

اگر مدیر برہان کوئی سیاسی لیڈر یا شاہدِ مغرب کے دلدادہ ہوتے تو ہمارے لئے "رجعت پسندی" کے طعن کا مفہوم سمجھنا مشکل نہ ہوتا لیکن جس صورت میں کہ وہ ایک عالم دین کی سطح سے گفتگو فرما رہے ہیں ہمارے لئے اس طعن پر حیرت زدہ ہونا قدرتی بات ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ اسلام تو تمام تر رجعت ہی رجعت ہے۔ مسلمان اسی کو کہیں گے جو کسی بھی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے اُس کتاب کی طرف رجعت کرے جو پونے چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی اُس "سنت" کی طرف رجعت کرے جس کا تعلق پونے چودہ سو سال قبل کے ایک پیغمبرؐ سے تھا اور ان ائمہ و فقہا کی طرف رجعت کرے جو صدیاں ہوئیں پیوندِ خاک ہو چکے۔ مولانا مودودی کا تصورِ حکومت بے شک رجعت پسندانہ ہے کیونکہ اس کے تمام خطوط اور خد و خال چودہ سو برس پرانے دین سے لئے ہوئے ہیں اور مولانا مودودی یقیناً بہت بڑے دقیانوس ہیں کہ کفر و الحاد اور سیکولرازم کی موجودہ دنیا میں وہ صدیوں پرانے قرآن اور صدیوں پرانی سنتِ رسولؐ کو رہنما اور معیار و مستدل بناتے ہیں۔

حاصل یہ کہ مذہبی علوم کی اصطلاح میں تو رجعت پسندی کوئی برائی نہیں، بلکہ عین دین ہے۔ یکسر بھلائی ہے۔ البتہ مذہب دشمن سیاست اور روحانیت کُش مادّیت کی زبان میں یہ بیشک عیب ہے، الزام ہے لیکن گفتگو جب ایک عالم دین کر رہا ہو تو ترقی پسندی اور رجعت پسندی جیسے الفاظ کو سیاسی معنوں میں استعمال کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بحری جہاز کو ریت پر گھسیٹنا یا بیل گاڑی کو سمندر میں ہنکانا۔

کمزور ماخذ غلط استدلال

یہ تو تھی اس پس منظر کی نشاندہی جس سے مدیر برہان کا موجودہ ذہنی رُخ معیّن ہوتا ہے۔ اب ذرا اس عدل و دیانت کی داد دیجئے کہ مولانا مودودی کے تصورِ حکومت پر پے بہ پے حملے کرنے کے باوجود مدیر برہان یہ بالکل نہیں بتاتے کہ وہ تصور آخر ہے کیا؟ مولانا مودودی کے افکار میں دین و دانش کے اعتبار سے کہاں کہاں خامی ہے؟ انھوں نے کیا رجعت پسندی دکھلائی ہے؟ ۔۔۔ کُل کائنات اگر ہے تو بس یہ کہ منیر رپورٹ سے ایک دو فقرے نقل کر دئیے ہیں جو اس صحیفے میں مولانا مودودی کی طرف منسوب ہیں اور انھی سے ایک من مانا تصور اخذ کر کے تقلیل و تنقیص کے ترکش خالی کئے گئے ہیں۔

ہم اصولی اعتبار سے اس بات کو نہایت غیر ذمہ دارانہ اور شرانگیز سمجھتے ہیں کہ جن مولانا مودودی کی صدہا کتابیں اور مضامین ان کے جملہ تصورات کی توضیح کرنے کے لئے ہر جگہ موجود ہیں ان کے کسی تصور اور موقف کو اُس رپورٹ سے اخذ کیا جائے جس کے مرتبین نیز ان کی صداقت و دیانت پر اعتماد کرنے کے لئے اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی حجت موجود نہیں۔ اس کے برخلاف اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ اس رپورٹ کی ترتیب میں ایک خاص زاویۂ نظر سے موقع بہ موقع تلبیس، فنکاری، سیاست اور ملمع کاری سے کام لیا گیا ہے۔ مدیر برہان جانتے ہیں کہ اسلام قبولِ روایت کے لئے ایک خاص معیار رکھتا ہے۔ کسی راوی کے معتبر ہونے کے لئے جو کم سے کم اوصاف اس میں ہونے چاہئیں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ مذکورہ رپورٹ مرتب کرنے والوں میں وہ موجود تھے۔ اگر نہیں تھے تو کیوں ان کے اعتماد پر مدیر برہان علمائے اسلام کی تنقیص کے اس حد تک درپے ہیں کہ اس رپورٹ سے وہ افسانوی واقعہ بھی پیش کر دیتے ہیں جس کا نچوڑ یہ ہے کہ مولانا مودودی سمیت پاکستان کے تمام نامور علماء اتنے غبی، کم سواد، بے بہرہ اور بے بصیرت ہیں کہ جب ان سے اسلامی اسٹیٹ کی تعریف پوچھی گئی تو وہ مختلف بلکہ اُلٹے سیدھے جواب دینے لگے۔ حالانکہ وہ صحیح طور پر نہ بتا سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے۔

مدیر برہان لکھتے ہیں:-

"آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

[illegible] دولفظوں میں جواب ارشاد فرماکر سائل کو مطمئن کر دیا لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ علمائے اسلام جمع ہیں، زعمائے ملت موجود ہیں اور پھر کوئی ڈھنگ کا بالکل قطعی اور محکم جواب نہیں دیتا ــــ" (ص ۶۹۵)

ہم کہاں تک یہ ماتم کریں کہ منیر رپورٹ کے رعب کو محترم مدیر برہان نے غیر معمولی طور پر قبول کر لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو لفظوں سے تو سائل اسلئے مطمئن ہو جاتے تھے کہ وہ واقعتہً تحقیق حق کی نیت لیکر حاضر ہوتے تھے اور مسئول کو زچ کرنے کے قصد کی بجائے وہ دماغ کے سوراخوں کو قبولِ حق کے لئے کھولے رکھتے تھے ــ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے دماغ کے سوراخ بند ہی رکھے، نیت صاف نہیں کی اور حضورؐ کی باتوں کو جذبۂ انقیاد سے نہیں سُنا انھیں دو لفظ تو کیا حضور کی تمام تعلیمات بھی مطمئن نہیں کر سکیں اور وہ کفر پر ہی ثابت قدم رہے۔

جسٹس منیر کے تحقیقاتی کورٹ نے علماء سے اسلامی اسٹیٹ اور مسلمان کی تعریف اُس جذبے سے نہیں پوچھی تھی جس جذبے کی موجودگی میں کوئی سائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو لفظوں سے مطمئن ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے عوض کورٹ کا مقصود تھا ہیر پھیر کر کے علماء کو زچ کرنا، ان کا خاکہ اُڑانا، ان کی تحریک اقامتِ دین کو اضحوکہ ثابت کرنا۔ اس مقصد کے تحت اگر مدیر برہان اور ان سے بھی بڑھ کر فاضل حضرات کو گھیر گھار کے کوئی کورٹ صرف یہ سوال کرنے لگے کہ انسان کسے کہتے ہیں اور حیوان اور انسان میں کیا فرق ہے۔ تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے جوابات کو بھی ایسا ہی مضحکہ خیز اور مضطرب پوز بنایا جا سکے گا جیسا علمائے اسلام کے جوابات کو کیا گیا ہے۔ اسلامی سٹیٹ اور اسلام تو بڑے مسائل ہیں۔ ایک حریفانہ اندازِ نظر رکھنے والے [illegible] پسند کورٹ کی بارگاہِ اقتدار میں تو بڑے سے بڑا ارسطو بھی یہ تک ثابت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا کہ اس میں اور گدھے میں کیا فرق ہے [illegible] اور سورج کی تعریف پر بھی کسی ایسے سائل کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا جس نے یہ طے کر رکھا ہو کہ ہر قیمت پر مسئول کا مضحکہ اُڑائیگا۔ اسے [illegible] کہے گا۔ اسے بے عقل، کم سواد اور ادنیٰ ثابت کر کے رہیگا۔ [illegible] دستانی کرنے والا کورٹ اگر تقدیر کے ہاتھوں کبھی علماء کیسامنے

[illegible] سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے افراد اپنے تمام [illegible] یہ تک نہ بتا سکیں گے کہ ان کی ناک منہ پر کیوں ہے گدی میں ہوتی تو کیا حرج تھا۔

جس چیز کو مدیر برہان نے منیر رپورٹ کی شہادت پر [illegible] ذہنی انتشار اور پریشان دماغی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقت میں سکے جارحانہ مقاصد اور علماء دشمن قصد و نیت کا غبار ہے۔ و[illegible] وہی دو لفظ جو مدیر برہان کے ارشاد کے مطابق حضور صلی اللہ [illegible] کی زبانِ مبارک سے نکل کر سائل کو مطمئن کر دیا کرتے تھے کتب میں موجود نہیں ہے اور کیا نامور علمائے اسلام کو ان کا علم نہیں۔ اِن دو لفظوں سے معاندانہ اور فنکار سائل کے آگے بھی کام چل سکتا [illegible] دشوار تھا کہ علماء انھی کو دہرا دیتے، لیکن مدیر برہان کو معلوم ہو کہ دو لفظ تو کیا جسٹس منیر جیسے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرہ سے بھی مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ ان کا تو موقف یہ ہے کہ حدیث گذر گیا۔ اب تو قرآن ہی سب کچھ ہے اور قرآن عربی والا قرآن [illegible] بلکہ وہ انگریزی یا اُردو قرآن جسے کسی مستشرق یا کسی اپٹوڈیٹ مفسر تفسیر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ محترم مدیر برہان کو یقیناً معلوم کہ حدیثِ رسولؐ کو بے قیمت قرار دینے کی جو تحریک قرآن کی آڑ میں چلائی جا رہی ہے اس کے دو ہی تو خاص عناصر ہیں۔ ایک خوبصورت اصطلاح میں دوسرے علماء کی تضحیک و تحقیر۔ علماء سے تفسیر قرآن کا حق چھین کر اپنی من مانی تفسیر و تعبیر کو عینِ قرآن قرار دینے کی خاطر ہدفِ ستم علماء ہی کو بنایا گیا ہے تاکہ ان کی ہوا اُکھڑ جانے اور اسلام کا خالص مغربی ایڈیشن تیار کرنے میں کوئی طاقت حائل نہ رہے۔

بالحاصل منیر رپورٹ کو ایک مستند ماخذ کی حیثیت سے پیش کرنا ہی ہماری نظر میں صریح غلطی ہے اسی لئے ہم نے پچھلی [illegible] میں اس پہلو کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ منیر رپورٹ کے انکشافات بجائے خود کس حد تک اُن مضمرات کے حامل ہیں جنھیں مدیر برہان نے اپنے ریمارک میں پیش کیا ہے۔

لیکن اب ہم پر یہ رنجیدہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ منیر رپورٹ سے اقتباس لینے میں بھی مدیر برہان نے نقل [illegible] کے اونچے معیار کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اس انکشاف کا [illegible]

[illegible]

ان کے ادادیں پر تصوف نے ہوئے تازہ زندگی میں
م کیا ہے۔ منیر رپورٹ ان کے سامنے ہے۔ وہ بتاتے ہیں
، تو مولانا مودودی کا ایک فقرہ مدیر برہان نے کم نقل کیا ہے
نا مودودی کے منقولہ ارشاد کا صحیح منشاء متعین کرتا تھا۔
ے یہی قول انھوں نے عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف
ب کر دیا ہے حالانکہ رپورٹ میں تصریح موجود ہے کہ شاہ صاحب
ت کا جواب کچھ اور تھا۔ تیسرے انھوں نے مولانا مودودی
کے اقوال کو ایک ایسے مسئلے سے منسلک کر دیا ہے جس سے ان کا
نہیں تھا، بلکہ وہاں تو گفتگو ہی کسی اور نکتے پر تھی۔

ناظرین تجلّی تک پوری بات پہنچانے کے لئے ہم وحیدالدین
صاحب کے مضمون کا یہ حصہ شکریے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ مدیر
ن نے منیر رپورٹ سے جو اقتباس لیا ہے اسے نقل کرنے کے
حمید الدین صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اس اقتباس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
جواب نقل کیا گیا ہے وہ مکمل شکل میں نہیں ہے۔ اصل رپورٹ
ورِ بالا جواب کے ساتھ آخر میں یہ فقرہ بھی موجود ہے:۔

"درحقیقت ہندوستان میں اس وقت اسی قسم
کی ایک ریاست قائم ہے۔"

(رپورٹ آف دی کورٹ آف انکوائری معروف بہ
"منیر رپورٹ" (لاہور سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۲۸)

یہ جملہ شامل کرنے کے بعد پورا جواب اپنے مفہوم کے
بارے یہ بتاتا ہے کہ عدالت نے اپنے سوال میں اسلامی
مت کے قیام کی صورت میں جس اندیشہ کا اظہار کیا ہے وہ
لفعل موجود ہے۔ پھر اب کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں
لامی حکومت قائم نہ کریں جس کے لئے بحیثیت مسلمان ہم خدا
طرف سے مکلف ہیں اور جس کے لئے دراصل پاکستان حاصل کیا
تھا۔ مگر جواب کی یہ صورت چونکہ مضمون نگار کے اعتراض کو
ور کر رہی تھی اس لئے انھوں نے آخری جملہ کو حذف کر دیا۔
دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ صاحب مضمون نے یہی جواب

[illegible]

رپورٹ میں اس سوال کے سلسلے میں جن جوابات کا ذکر ہے انہیں
کم سے کم ایک جواب یقینی طور پر اس سے مختلف ہے۔ رپورٹ
کہتی ہے کہ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے
عدالت نے پوچھا ——— "ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان
بستے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "چار کروڑ" اس کے بعد
عدالت نے دوسرا سوال کیا ——— "کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا
اگر (ہندوستان کے ان مسلمانوں پر) منو کا قانون نافذ ہو جس
کے تحت وہ شہری حقوق سے محروم ہو جائیں اور ان سے
ساتھ ملیچھوں اور شودروں کا سا برتاؤ کیا جائے" مولانا بخاری نے جواب دیا۔

I AM IN PAKISTAN AND I
CANNOT ADVISE THEM (P 228)

یعنی میں پاکستان میں ہوں اور میں ہندوستانیوں کو کوئی مشورہ
نہیں دے سکتا۔ جواب کے یہ الفاظ میرے نزدیک نسبتاً زیادہ موزوں
اور مناسب ہیں۔ اس چھوٹے سے فقرے میں بیک دو باتیں کہہ دی
گئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ عدالت کا یہ سوال ہی غلط ہے۔ کیونکہ ہندوستان
ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے وہ اپنے رویّے کے تعین میں ہماری
اجازت اور ہمارے مشوروں کا محتاج نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس شخص سے
سوال کیا جا رہا ہے اس کے سامنے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان
میں کیا ہو رہا ہے، بلکہ اصولی طور پر اس کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ خود
جن حالات میں ہے ان حالات کے اعتبار سے اس پر خدا کی طرف سے
کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

یہ بات نقل و اقتباس کے پہلو سے ہے ورنہ اصولی حیثیت سے
دیکھئے تو زیر بحث صورتِ حال میں مسئلہ دراصل یہ تھا ہی نہیں کہ مسلم
علاقوں میں بسنے والے مسلمان ان ملکوں کے مسلمانوں کو کس حال میں دیکھنا
چاہتے ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ اگر سوال یہ ہو تو ہر شخص وہی جواب
دے گا جو مضمون نگار کے نزدیک اس کا بہتر سے بہتر جواب ہوگا۔ اس
کے برعکس یہاں سوال دراصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے نام سے
مسلموں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کی بناء پر اگر یہ اندیشہ ہو کہ
مسلم اکثریت کے ملک میں اسلامی حکومت کے اعلان کا ابتدائی
عمل یہ ہوگا کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں بسنے والی مسلم اقلیت کو

مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا تو ایسی حالت میں مسلمان ملک کو کیا کرنا چاہئے۔

اس کا جواب یقیناً ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی اندیشے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس کی وجہ سے خدا کے حکم کو چھوڑ دیا جائے۔ حوالہ جواب کے الفاظ سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ معنوی حیثیت سے ایک مومن اس کے سوا کوئی دوسرا جواب نہیں دے سکتا۔ مسلمان کی ساری مصلحت اسی میں ہے کہ وہ بے چون وچرا خدا کے حکم کو مان لے۔ کسی بھی دوسری مصلحت کا یہ مقام نہیں ہے کہ خدا کے حکم پر اس کو ترجیح دی جائے بلکہ میں تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ دوسری تمام مصلحتیں چھوٹی مصلحتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری مصلحتوں کا راز خدا کے حکم کی تعمیل میں ہے۔ اگر مسلمان خدا کے تابعدار بن جائیں تو ان کے اندر اور باہر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہ ہو تو ان کا ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔ خواہ سطحی قسم کے مصلحین کو کسی دوسری تدبیر میں کتنے ہی فائدے نظر آتے ہوں۔

جسٹس منیر نے اپنے سوال نامہ میں جس ملک کے بارے میں وہاں کے علماء سے پوچھا تھا وہ ایک ایسا ملک ہے جو کفار کے تسلّط سے آزاد ہو چکا ہے اور وہاں فیصلہ کا اختیار کلیۃً مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ایک ایسے ملک کے بارے میں شریعت کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہاں کے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات مکمل طور پر شریعت کے قانون کے مطابق طے ہونے چاہئیں۔ مسلمان کے لئے مسلمان رہتے ہوئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی اطاعت کے بجائے خدا کی بغاوت کے لئے استعمال کرے اور ایک ایسی حالت میں جب کہ وہ خدا کی منشاء کے مطابق فیصلہ کر سکتا تھا وہ بالقصد اس کی منشاء کے خلاف فیصلہ کر ڈالے اور ظاہر ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی کا شریعت کے مطابق انجام پانا اسی وقت ممکن ہے جبکہ اسلام کی بنیادوں پر حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ مضمون نگار کو جس دین کی تعلیمات میں جنگی میں رعایت کا بھی جزئیہ مل گیا اسی دین کی تعلیمات میں کیا انھیں شرعی احکام کی تنفیذ کے لئے نصب امامت کا حکم نہیں ملا۔ حالانکہ اس کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ فقہ تو درکنار کلام وعقائد کی بھی کوئی کتاب اس کے ذکر سے خالی نہیں۔ آپ جس کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں یہ مل جائے گا کہ "اپنے اوپر ایک امام مقرر کرنا مسلمانوں کا لازمی

[illegible] کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اہل سنت والجماعت اس کو سمعاً یعنی شرعی حکم کے طور پر واجب مانتے ہیں اور بعض فرقے مثلاً زیدیہ اور معتزلہ کا قول یہ ہے کہ یہ ازروئے عقل واجب ہے۔"
(زندگی اگست [illegible])

خرد کا نام جنوں

گزشتہ "آغاز سخن" میں تجلّی کے صفحہ ۱۳ پر ہم نے ڈاکٹر حمید اللہ کے اُس ارشاد پر کچھ عرض کیا تھا جسے مدیر برہان نے ایک تحقیق نو کے طور پر پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ خود اللہ کے رسول نے بھی ایک "قومی" اور "سیکولر" اسٹیٹ بنانے کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ اسٹیٹ خالص اسلامی حکومت کی شکل میں اس وقت بدلی جب معاہد کفار نے عہد شکنی کی اور حضورؐ مجبور ہو گئے کہ "قومی" حکومت نہیں رہی تو لاؤ اسلامی ہی حکومت بنالو!

ہم سمجھے تھے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی یہ تحقیق کوئی جدید کارنامہ ہے جس کا سُراغ تاریخ وسیر کی کتابوں میں نہیں مل سکتا، لیکن وحیدالدین خاں صاحب کے نقارے سے منکشف ہوا کہ اس تحقیق کا تعلق تو دراصل اُس تاریخی صحیفے اور نوشتے سے ہے جو اسلامی تاریخ اور سیرت کی اکثر کتابوں میں کلاً یا جزءاً موجود ہے۔ یہ پورا نوشتہ جو ایک دستور یا معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے موصوف نے سیرت ابن ہشام سے پورا کا پورا نقل کر دیا ہے۔

اب اس صورتِ حال پر ہم حیرت نہ کریں تو کیا کریں کہ جس تاریخی دستاویز کا ایک جز ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے نام سے پیش

سلہ مثال کے طور پر یہاں صرف دو حوالے درج کئے جاتے ہیں۔

نصب الامام عندنا واجب (شرح مواقف)	مسلمانوں کیلئے اپنے اوپر امام مقرر کرنا ہمارے نزدیک واجب ہے۔
لابد للامة من امام (شرح عقائد)	مسلمانوں کا اپنا ایک امام ہونا ضروری ہے۔

مگر یہ حوالے بھی شاید مضمون نگار کے لئے کافی نہ ہوں۔ کیونکہ استدلال کا جو نادر طریقہ انھوں نے اختیار کیا ہے اس کے مطابق [illegible] کہ یہاں "امام" سے مراد مسجد کا امام ہے نہ کہ نظامِ اجتماعی کا [illegible]

کرکے مدیر برہان نے ... [illegible] ... وہ دستاویز تو ان کی تلقین سے یکسر مختلف ٹھیک اسلامی ہی نقطۂ نظر کا اثبات وانکشاف کرتی ہے۔ ذرا سنئے اس معاہدے کا نچوڑ کیا ہے:۔

(۱) سب سے اہم اور بنیادی نکتہ اس کا یہ ہے کہ اُس میں صاف طور پر یہ طے کر دیا گیا ہے کہ تمام مختلف فیہ اور متنازعہ مسائل میں خدا اور رسول ہی کو سند و حجت مانا جائے گا۔ گویا اگر کسی اور نکتہ کا ذکر نہ کیا جائے تب بھی یہ ایک ہی نکتہ مدیر برہان کے اُس سیکولرازم کی نفی کر دیتا ہے جس میں خدا اور رسول کوئی چیز نہیں عوام ہی جج ہیں اور اکثریت کا فیصلہ ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔

(۲) اس دستور میں یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے تمام معاملات میں آزاد ہوں گے اور اپنے مجرموں کو اپنے اسلامی قانون کے مطابق سزائیں دینے کے لئے اپنی عدالتیں قائم کر سکیں گے۔

(۳) مسلمانوں کے کسی دشمن کو ملک کا کوئی گروہ یا فرد مدد نہیں دے سکے گا۔

(۴) مسلمانوں کے کسی دشمن کو پناہ نہیں دی جا سکے گی۔

یہ چند ہی شقیں مدیر برہان کے مدعا کی اس حد تک بیخ کنی کر دیتی ہیں کہ اس مفصل دستور کے مزید تجزیے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

پھر یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ یہ دستور کسی ایسی مملکت کا نہیں تھا جہاں مسلمان سیاسی و عسکری اعتبار سے تمام غیر مسلم طاقتوں پر غالب آ کر مکمل طور پر خود مختار ہو چکے ہوں۔ نیز اس وقت وہ اس ملک میں اکثریت میں بھی نہیں تھے بلکہ ان کی عددی پوزیشن اقلیت کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی بنیاد پر کسی ایسے ملک کو تو مشورہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہ دستور سازی کے معاملہ میں پوری طرح آزاد و خود مختار ہوں۔ ہاں اس کی بنیاد پہ مدیر برہان ہندوستان یا کسی ایسے ملک کے مسلمانوں کو مشورہ ضرور دے سکتے تھے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے نام سے جس تاریخی معاہدے کو مدیر برہان نے قومی اور سیکولر حکومت کی تحسین و تکریم کا برہان بنانا چاہا ہے وہ تو دراصل ان کے مدعا کی اس حد تک ضد ہے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا تو ذکر ہی کیا جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں بھی وہ انھیں یہ سبق دیتا ہے کہ مسلم معاشرے میں اسلامی قانون کو صحیح طور پر نافذ کرنے کیلئے اسلامی عدالتیں قائم کرنے کی جد و جہد کرنی چاہئے اور متنازعہ امور میں خدا اور رسول ؐ کو سند منوانے کی کوششوں کو مسلسل جاری رکھنا چاہئے۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

پلٹے چوبیں

مدیر برہان نے تقریباً ڈیڑھ صفحے پر مسٹر محمد علی جناح کی ایک تقریر پیش کی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ مسٹر جناح پاکستان کو خوش حال اور مسرور بنانے کے لئے تمام شہریوں کے حقوق کی یکسانی پر زور دیتے تھے۔

یہ تقریر نقل کرنے کے بعد مدیر برہان کو احساس ہوا کہ مسٹر جناح مذہب کے عالم تو تھے نہیں جو قارئین ان کے ارشاد کو مذہبی مباحث میں مؤثر مان سکیں ـــ لہٰذا فرمایا:۔

"ظاہر ہے مسٹر جناح مذہب کے عالم نہیں تھے اس بنا پر ان کا کوئی قول یا ارشاد مذہبی حکم یا فتویٰ کی سند نہیں رکھتا لیکن جہاں تک اس تقریر کی اسپرٹ اور اس کے اصل معز و مغنی کا تعلق ہے ہماری رائے میں وہ اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے"

مدیر برہان کے یہ فقرے ہمارے اس خیال کو اور مضبوط بناتے ہیں کہ وہ اُن مادہ پرستوں کی سطح سے اسلامی حکومت کے مسئلے پر نظر ڈال رہے ہیں جن کے نزدیک خدا اور رسول ؐ کی خوشنودی، اطاعت، رضا جوئی کوئی بھی اہمیت نہیں رکھتی بس اسٹیٹ کا خوشحال اور نئے معنوں میں ترقی یافتہ ہو جانا ہی سب کچھ ہے۔ اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو مدیر برہان ایک ایسی تقریر کا حوالہ ضرور دیتے جس میں اسلام، اخلاق، خدا اور رسول ؐ کسی کا برائے نام بھی تذکرہ تک نہیں ہاں ذکر ہے تو اُن مقاصد کا جن کی کوئی خصوصیت مسلمانوں کے ساتھ نہیں آخر کون یہودی، نصرانی، ہندو یا مجوسی ہے جو اپنے ملک کو خوشحال اور مسرور دیکھنے کی تمنا نہیں کرتا، اپنے عوام کی غربت دور کرنے کا آرزومند نہیں۔ مسٹر جناح ایک قومی لیڈر تھے، ان کی ہزار تعریفیں ہمارے سر اور آنکھوں پر لیکن ان کے کسی ارشاد کو

[illegible] دائرے سے نکال کر اسلامی حکومت کی بحث میں [illegible]
کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر محمد علی جناح بھی یہی چاہتے تھے کہ خدا
اور رسولؐ کی رضا جوئی کے مقصود کو کالعدم قرار دے کر اصل مقصود
وہی بنایا جائے جو دوسری مسلم و غیر مسلم حکومتیں رکھتی ہیں یعنی مادی
ترقی اور اس مقصد کی تحصیل اسی سیکولر انداز میں کی جائے جس کی رو
سے قانون بنانا اور خیر و شر کے دائرے معین کرنا اکثریت کا حق ہوا
کرتا ہے تو محمد علی جناح کے اس چاہنے سے قرآن و سنت کے محکم
اصولوں کا استرداد نہیں ہو سکتا۔

جزو کو کل باور کرانے کی سعی

جب آدمی کسی غلط کو صحیح اور باطل کو حق گمان کر لیتا ہے تو کیسے
کیسے کمزور سہارے لیتا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اسلامی
اسٹیٹ کے جس معاہدے کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اس کے بارے
میں مدیر برہان فرماتے ہیں:۔

"انھوں نے (ڈاکٹر حمید اللہ نے) اس حکومت کے
لئے "سیکولر" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اس کی
غالباً وجہ یہی ہے کہ سیکولرازم کے عناصر ترکیبی صرف
دو چیزیں ہیں۔ ایک مملکت کے ہر شخص کا شہری حقوق میں
مساوی ہونا اور دوسرے تمام مذاہب کا آزاد ہونا اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اسٹیٹ کیلئے جو دستور
منظور فرمایا تھا اس میں یہ دونوں چیزیں صراحت کے
ساتھ مذکور تھیں۔"

پہلی مغالطہ اندوزی تو اس شہ پارے میں یہ ہے کہ سیکولرازم
کے عناصر ترکیبی بیان کرنے میں مدیر برہان نے تجاہل عارفانہ سے کام
لیا ہے۔ موصوف سے کوئی پوچھے کہ اگر سیکولرازم کی تمام کائنات
یہی دو عناصر ہیں تو پھر آپ اور ہندوستان کے دیگر پڑھے لکھے
مسلمان آئے دن یہ احتجاج کیوں کرتے رہتے ہیں کہ حکومت کی فلاں
تقریب ہندوؤں کی مذہبی مراسم سے شروع کی گئی۔ فلاں بند کے افتتاح
پر ناریل پھوڑا گیا، فلاں کارخانہ کے ادوہ گھاٹن میں اشلوک پڑھے
گئے۔ یہ وطیرے ظاہر ہے مذکورہ دونوں عناصر کے مباین و مخالف
نہیں ہیں پھر کس لئے انھیں سیکولرازم کے خلاف قرار دیکر شور مچایا جاتا ہے

سیکولرازم کے حذف کردہ عناصر

مدیر برہان خوب جانتے ہیں کہ سیکولرازم کے چند عناصر اور بھی
ہیں جنھیں وہ اس لئے حذف کر گئے ہیں کہ وہی اس بحث میں فیصلہ کن
حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک عنصر یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کا حکمراں گروہ
مذاہب کے معاملہ میں کلی طور پر غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ اس بات میں
اور اس بات میں بڑا فرق ہے کہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہو۔ کون
مسخرہ کہتا ہے کہ اسلامی حکومت میں تمام مذاہب کو آزادی نہیں ہوگی،
لیکن خود حکومت کا رویّہ مذہب کے رُخ پر کیا ہونا چاہیئے یہیں سے اسلام
اور سیکولرازم میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک مسلمان حکومت
کا فرض منصبی یہ ہے کہ زمین پر وہ معاشرہ برپا کرنے کی کھلی جدوجہد کرے
جو اللہ کو مطلوب ہے، اور جس میں فحاشی، ظلم، رشوت ستانی، سود، قمار،
جنسی فسطائیت اور شہوانی محرکات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اسکے برخلاف
سیکولرازم اپنے مقتدر گروہ کا فرض منصبی یہ بتاتا ہے کہ اس کے افراد
ذاتی طور پر خواہ کوئی بھی مذہب رکھتے ہوں لیکن اجتماعی و معاشری
دائروں میں انھیں مکمل غیر جانبداری اختیار کرنی ہوگی اور حکومت کے وسائل و
ذرائع کسی بھی مذہب کے غلبہ و تسلط کے لئے استعمال نہیں کئے جاسکیں گے۔

دوسرا عنصر جسے مدیر برہان نے نظر انداز کر دیا یہ ہے کہ اسلامی
دستور میں زمین کا مالک اللہ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور زندگی کے انفرادی
یا اجتماعی کسی بھی دائرے میں جو قانون اللہ اور رسولؐ نے طے کر دیا ہے
اس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ کوئی بھی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا
جو قرآن و سنت کے مسلمات اور اسلامی اقدار کے منافی ہو۔

لیکن سیکولرازم میں اس طرح کا کوئی تصور سرے سے ہی نہیں۔
وہاں تو زمین کے مالک عوام ہیں۔ ہر قسم کی قانون سازی انکا پیدائشی
حق ہے۔ اکثریت کی رائے جس شے کو جائز قرار دیدے وہ جائز ہوگی اور
جسے جرم قرار دے وہ جرم بن جائے گی۔ آئینی اعتبار سے نہ خدا کوئی چیز،
نہ مذہب کی کوئی حیثیت۔ شراب نوشی کی بقا پر پچاس فی صد سے زیادہ
اراکین حکومت متفق ہو جائیں تو کسی کی مجال نہ ہوگی کہ زندہ رہنے کو روک
سکے۔ عریانی، شائستگی، آرٹ اور اخلاق کی جو حدیں، جو خانے یا جو حدود
خالِ اکثریت کی رائے سے طے پا جائیں وہ اعتراض سے بالاتر ہی ہونگے
علی ہذا ہر معاملے میں انسان ہی آخری سند اور مرجع ہوگا [illegible]

کی حیثیت [illegible]

انھیں یاد فرمائیں سیاسی و معاشرتی مسائل ہی میں ضابطۂ آئین کی سطح پر خدا اور رسولؐ اور ایمان و اخلاق کی دہائی نہیں دی جاسکے گی۔

تیسرا عنصر جو سیکولرازم کے خمیر کا جوہری جزء ہے یہ ہے کہ وہ "قوم پرستی" کی دعوت دیتا ہے اور اس کی قوم اسٹیٹ کی جغرافی حدود سے بنتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت ایک خالص نظریاتی اسٹیٹ سے عبارت ہے جس میں قوم پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں اور جس انسانی گروہ کو وہ قوم کی حیثیت دیتا ہے اس کی قدر مشترک یہ نہیں ہوتی کہ اس گروہ کے افراد ایک خاص وطن ایک خاص قطعۂ ارض پر بستے ہیں بلکہ وہ اساسی تصورات اس کی قدر مشترک ہوتے ہیں جو انسانوں میں نسل و نسب اور امصار و دیار کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ نظریات و عقائد ہی کو فرق و امتیاز کا معیار قرار دیتے ہیں

اب ہم مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور ان کے ہمنوا حضرات سے پوچھتے ہیں کہ دو مختلف چیزوں کے صرف مشترک اجزاء کو لے لینا اور متضارب و متباین اجزاء سے صرف نظر کر لینا کیا ایسا ہی نہیں ہے جیسے آپ چند ایسے اخلاقی اصول و اقدار کا حوالہ دے کر جن میں اسلام اور ہندومت اور نصرانیت متحد و متفق ہیں یہ دعویٰ کریں کہ اسلام اور ہندومت اور نصرانیت میں کوئی تضاد و تخالف نہیں۔ بیشک انسانوں کے بھی دو آنکھیں دو کان اور چار ہاتھ پیر ہوتے ہیں اور جانوروں کے بھی۔ آدمی بھی زمین ہی پر چلتا ہے اور جانور بھی، آدمی کو بھی غذا کی ضرورت ہے اور حیوانوں کو بھی۔ لیکن اس طرح کے اجزاء و اوصاف کا اشتراک انسان و حیوان کے قدرتی فرق کو تو نہیں مٹا سکتا۔ اسی طرح بعض عناصر کا اشتراک اسلام اور سیکولرازم کے تضاد کی نفی نہیں کرسکتا۔ ان واضح حقائق کی موجودگی میں مولانا موصوف کا یہ تک کہہ گذرنا کہ:-

"سیکولرازم اسلام کی ضد نہیں بلکہ جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا عین اسلام کی تعلیم ہے۔" ص۲۷ سطر ۱۶ برہان جولائی [illegible]

ایسی حیرتناک جسارت ہے جس پر ہم جیسے کم ہمت اظہارِ حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اسلام [illegible] الزام

مدیر برہان بار بار یکساں شہری حقوق کی بات کرتے ہیں اور

[illegible] سیکولرازم کی حمایت کے اداریوں کا [illegible] دراصل اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ ان کی دانست میں اسلام تمام شہریوں کو یکساں حقوق عطا نہیں کرتا۔ اگر وہ یہ یقین نہ فرماتے تو اسلامی حکومت سے وحشت و نفرت اور سیکولرازم کی مدح سرائی کا کوئی سبب ہی نہیں تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ مفروضہ نہایت شرانگیز، انتہائی افترا آمیز اور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ جن معنوں میں سیکولرازم تمام شہریوں کو یکساں حقوق عطا کرتا ہے ان معنوں میں اسلام بھی حقوق عطا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ اس لحاظ سے آگے ہی ہے کہ اس کے دائرے میں سیفٹی ایکٹ جیسے کسی کالے قانون کی گنجائش نہیں ہے جس کے ذریعے آپ کا محبوب سیکولرازم جرم ثابت کئے بغیر کسی شہری کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ اسلام نہایت فراخدلی سے یکساں حقوق عطا کرتا ہے اور ان کو سلب کرنے کا کوئی نقلی حربہ بھی استعمال نہیں کرتا۔

البتہ ہم مدیر برہان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ایک سیکولر اسٹیٹ میں بھی یہ ضابطے موجود نہیں ہیں کہ جج وہ شخص نہیں ہو سکتا جو قانون سے باخبر نہ ہو۔ پروفیسر وہ شخص نہیں ہو سکتا جس نے اسکول اور کالج کی اسناد حاصل نہ کی ہوں، پوسٹ ماسٹر اور انجینئر، بینک منیجر، فوجی افسر، ڈاکٹر وہ شخص نہیں ہو سکتا جس نے متعلقہ تعلیم اور ٹریننگ حاصل نہ کی ہو۔

یہ ضابطے اگر موجود ہیں اور ضرور ہیں — تو کیا ان کے باوجود آپ بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ سیکولرازم تمام شہریوں کو یکساں حقوق عطا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوصاف اور اہلیتوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا یکساں حقوق کے منافی نہیں ہے نہ یکساں حقوق عطا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ مناصب عطا کرنے میں اہلیت اور ضروری قیود کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

بالکل اسی بدیہی قاعدے کے مطابق اسلام بھی تمام شہریوں کو یکساں حقوق دینے کے باوجود یہ ملحوظ رکھتا ہے کہ کسی منصب پر [illegible] شخص فائز ہو جو اس کا اہل ہو۔ پچھلے جائزے میں ہم شرح و بسط کے ساتھ واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کلیدی مناصب نہ ملنے کا معاملہ کوئی نرالا معاملہ نہیں ہے نہ اس [illegible] فرقہ پرستی پر ہے۔ نہ اسے کسی بھی منطق سے ظلم قرار دیا جا سکتا ہے

... ہے جو وہ ... اسی اصول کے تحت ہے

جس اصول کے تحت سیکولرازم یا کوئی بھی ازم کچھ لوگوں کو عہدوں سے محروم رکھتا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ دنیا کے اور سارے ازم تو دستور سے انحراف کرنے والے افراد کو ایوانِ اقتدار کے پاس نہ پھٹکنے دیں، نااہلوں کو کوئی عہدہ تفویض نہ کریں لیکن اسلام سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ معمولی سرکاری ملازمتیں نہیں بلکہ صدارت ووزارت پر بھی ان لوگوں کا حق ضرور تسلیم کرے جو ان مناصب کے اہل ہونے تو درکنار سرے سے دستور ہی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

یہ مطالبہ کہ اسلامی حکومت کو بھی صدارت ووزارت کے دروازے غیر مسلموں کے لئے کھول دینے چاہئیں ٹھیک ایسا ہی مطالبہ ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ جب ہندوستان میں سیکولرازم قائم ہے اور سب شہریوں کو یکساں حقوق ملے ہوئے ہیں تو سشن اور ہائی اور سپریم کورٹوں کی ججی کا دروازہ نہ صرف جاہل مطلق لوگوں کے لئے کھول دینا چاہئے، بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کا حقدار قرار دینا چاہیئے جو سرے سے یہاں کے قانون ودستور کو مانتے ہی نہ ہوں، جنھیں دستور کے بنیادی کلیات سے کھلم کھلا گریز ہو، جو یہاں کے سماجی فلسفے جمہوری تصورات اور بنیادی مقاصد سے انکار کرتے ہوں۔

قرآن کیا کہتا ہے

اسلام اور سیکولرازم کے فرق وتضاد کو ہم نے کافی واضح کر دیا۔ قرآن وحدیث میں اس فرق کی توثیق کے لئے بہت سی نصوص ہیں یہاں ہمیں برملا ایک آیت یاد آگئی ہے جو سیکولرازم کے نظریاتی فلسفے کی شہ رگ پر ضرب لگاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ میں فرماتے ہیں:۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ (رکوع ۱۳)	کہدو اے محمد! خبیث اور طیب برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ تجھے اچھی لگے خبیث کی کثرت۔

کیا اس آیت سے صاف طور پر یہ کلیہ مستنبط نہیں ہوتا کہ حلال وحرام، خیر وشر اور خبیث وطیب میں جو فرق اللہ نے واضح فرما دیا ہے وہ اٹل ہے۔ انسانوں پر لازم ہے کہ ... کو معیار بنائیں۔ حرام وخبیث اشیاء کی چاہے کتنی ہی ریل پیل ہو، لوگوں میں وہ کتنی ہی مقبول ومروّج ہو چکی ہوں، ان کی پسندیدگی پر کتنا ہی کثیر اتفاق رائے ہو لیکن ان کی حرمت وخباثت میں کوئی فرق نہیں آتا اور مسلمان پر لازم ہے کہ ان سے دور بھاگے اور دوسروں کو دور بھگائے۔

مگر سیکولرازم کا معروف ومسلم اصول یہ ہے کہ عوامی نمائندوں کی اکثریت جس چیز کو حلال وطیب قرار دیدے وہ حلال وطیب اور جسے ممنوع ٹھیرادے وہ قابل اجتناب ہے۔

کیا ان دونوں اصولوں میں بعد المشرقین نہیں؟ اور کیا ان کے مظاہر سب کے سامنے موجود نہیں ہیں؟ — مثال کے طور پر سود کو لیجئے۔ اپنے ملک میں تو خیر سے ہندو اکثریت ہے لہذا سود کی قباحت کا سوال ہی نہیں اُٹھتا مگر پاکستان میں دیکھ لیجئے بچشم بد دور یوم اول سے اب تک سیکولر جمہوریہ ہی کے ڈنکے بجتے آرہے ہیں اور قانون ساز مومن ہی مومن ہیں۔ کیا انھوں نے سود کو ایک دن کے لئے بھی ممنوع قرار دیا، کیا شراب ان کے یہاں ایک ساعت کے لئے بھی حرام ٹھیری؟ کیا شہوانی محرکات اور ہوس انگیز عوامل پر کوئی آئینی پابندی لگی؟ —

یہ سیکولرازم ہی کی برکت تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ عوامی نمائندوں کو "خبیث" کی کثرت دل سے بھائی ہوئی تھی اور نمائندوں کی غالب اکثریت اس موقف پر جمی ہوئی تھی کہ ہم تو خبیث کو طیب ہی مانیں گے چاہے قرآن کچھ کہتا رہے۔

اِس صورتِ حال پر قانوناً کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قومی نمائندوں کی اکثریت جس فیصلے پر متفق ہو وہ سیکولرازم کی رو سے عین حق ہے۔ لیکن اگر سیکولرازم کی جگہ "اسلام" مقتدر رہتا تو اکثریت کیا پورے ملک کی رائے بھی اُن خبائث کو طیبات کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتی تھی جنھیں اللہ اور رسولؐ نے خبائث قرار دیدیا ہے۔

ٹھیٹ مادّی نقطۂ نظر

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت ...

ت کیے ہوئے محترم مدیر برہان کے ذہن سے اسلامی حکومت کے اساسی مقاصد بالکل محو ہو گئے ہیں جو اسے دوسری مادہ پرست حکومتوں سے ممتاز کرتے ہیں اور مادی طرزِ فکر کے مارے ہوئے مادہ پرست مفکرین کی طرح وہ ملکی خوش حالی، اقتصادی ترقی، زرعی آسودگی اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کو اسلامی حکومت کا مقصدِ ضروری تصور کئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ان کی نوکِ قلم پر قرآن و سنت کے براہین آتے ہیں نہ صحابہؓ و ائمہ کے ارشادات۔ نہ خدا اور رسولؐ کی رضاجوئی کا تذکرہ ملتا ہے نہ منیر رپورٹ کے سوا کسی صحیفے اور ماخذ کو وہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برملا ایسی باتیں لکھتے ہیں جن سے اتفاق مشکل ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:-

> "حقیقت یہ ہے کہ خلافت اور ریاست میں بہت بڑا فرق ہے خلیفہ بجز مسلمان کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا لیکن خلافت تو خلافت راشدہ کے بعد ہی ختم ہو گئی، اور اب اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ رہی ریاست تو وہ ملی جلی اور مخلوط بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ ایک جمہوریہ میں قانون سازی کی اصل طاقت پارلیمنٹ یا نیشنل اسمبلی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو عوام کے نمائندہ ہوتے ہیں پس اگر پارلیمنٹ میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو وزیر اعظم چھوڑ صدر جمہوریہ اگر غیر مسلم بھی ہے تو وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔" (ص)

ہم سوال کرتے ہیں اس دعوے کی کیا دلیل ہے کہ خلافت تو خلافت راشدہ کے بعد ہی ختم ہو گئی؟ — اول تو تاریخ اس دعوے کا ساتھ نہیں دیتی۔ ایک دو، دس پانچ نہیں بے شمار خلفاء خلافتِ راشدہ کے بعد بھی چشمِ فلک نے دیکھے ہیں۔ اسلامی تاریخ کا کوئی بھی طالب علم دس بیس خلفاء کے نام تو فرفر گنوا سکتا ہے۔ عین دوپہر میں سورج کا انکار جیسی ہے یہ بات کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سرے سے خلافت ہی ختم ہو گئی — دوسرے اس دعوے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز حالات کے بگاڑ سے ایک بار ختم ہو گئی ہو اسے نشاۃ ثانیہ سے نئے [illegible] کی سعی بھی ترک کر دینی چاہئے۔ فرض کیجئے یہ روایت بالکل صحیح ہو کہ [illegible] خلافت راشدہ [illegible] سال رہے گی۔ تو کیا اس ایک

کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ اس کے بعد کسی مسلمان کو قیام خلافت کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر یہی مطلب ہوگا تو پھر عمر ابن عبدالعزیزؒ تو مدیر برہان کی نظر میں بہت بڑے مجرم قرار پائیں گے کہ انھوں نے نہ صرف کوشش کی بلکہ خلافتِ راشدہ کا عملی نمونہ پیش کر کے بھی دکھلا دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پاکستان یا کسی بھی مسلم اکثریت والے ملک میں جو لوگ آج "اسلامی حکومت" کے قیام کی تمنا اور لگن رکھتے ہیں انھوں نے یہ دعویٰ آخر کب کیا ہے کہ اسلامی حکومت سے ہماری مراد ٹھیک ایسی حکومت ہے جو ہیولیٰ، خدوخال اور تمام ہی اقتضاءات سے "خلافت" کے اُس قدیم اصطلاحی مفہوم کے مطابق ہو جس کی طرف فاضل مدیر برہان کا روئے سخن ہے۔ ہمارے خیال میں مدیر برہان مولانا مودودی کے افکار و عزائم کو صحیح طور پر نہیں سمجھے ہیں۔ مولانا مودودی اپنی تحریر و تقریر میں اسلامی حکومت کے لئے بسا اوقات "اسلامی ریاست" کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ انھیں لفظِ خلافت پر اصرار نہیں نہ الفاظ و اصطلاحات ان کی بحث کا موضوع ہیں۔ وہ تو معانی سے بحث کرتے ہیں۔ ظاہری ڈھانچوں کے عوض انھیں روح اور جوہر مطلوب ہے۔ مدیر برہان کو اگر یہ اصرار ہی ہے کہ خلافت ہمیشہ کے لئے مدفون ہو چکی اور اب ریاستوں کا دور ہے تو اسلامی حکومت کے تمنائیوں پر حرف نہیں آتا کیونکہ اسلامی حکومت کا جو تصور وہ رکھتے ہیں وہ کوئی ایسا انوکھا اور فرسودہ تصور نہیں ہے جس پر "خلافت" کا اطلاق تو ہو "اسلامی ریاست" کا اطلاق نہ ہو سکے "ریاست" ایک وسیع لفظ ہے۔ خود مدیر برہان بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست ہر طرح کی ہو سکتی ہے مخلوط بھی اور غیر مخلوط بھی۔ لادینی بھی اور مذہبی بھی۔ تو انھوں نے کیسے طے کر لیا کہ جس حکومت میں صدرِ مملکت کا مسلمان ہونا لازمی ٹھیرا دیا جائے وہ صرف "خلافت" کہلائے گی "ریاست" نہیں کہلائے گی۔ یہی غیر علمی مفروضہ قائم کر کے انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ خلافت کا زمانہ چونکہ ختم ہو گیا اس لئے ایسی حکومتوں کا زمانہ بھی ختم ہو گیا جن میں صدرِ مملکت صرف مسلمان ہو سکتا ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ مدیر برہان لفظی تنازع کو معانی و مطالب کا [illegible] نہ بنائیں۔ اول تو یہ دعویٰ ہی محتاج دلیل ہے کہ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد مجرد خلافت بھی شجر ممنوعہ بن گئی کہ اس کی تمنا کرنے والوں کو جاہل، کم سواد اور دین سے بے بہرہ قرار دیا جائے۔ دوسرے [illegible]

[illegible] یا کسی بھی اسلام پسند کے پیشِ نظر محض اصطلاحیں اور الفاظ نہیں بلکہ وہ معانی ومفاہیم اور اوصاف وخواص ہیں جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتے ہیں۔ مدیر برہان اگر معانی واوصاف سے اتفاق کرتے تو الفاظ کا تنازع زیادہ اہم نہیں تھا' لیکن وہ تو اُس بنیادی نقطے ہی میں غیرِ اسلام کو اسلام قرار دینے کی سعی فرماتے ہیں جہاں سے اسلام اور غیرِ اسلام کی گاڑیوں کا کانٹا بدلتا ہے اور پھر دونوں لائنیں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ یعنی قانون سازی کا مکمل اختیار وہ عوامی نمائندوں کی پارلیمنٹ کو سونپ دینا اس حد تک اسلام کے مطابق سمجھتے ہیں کہ ان کی دانست میں شرعی طور پر اس میں کچھ قباحت نہیں۔ حالانکہ یہی وہ بنیادی تصور ہے جو اسلام کا حریف اور اس کی مکمل نفی کرنے والا ہے۔ خلافت وریاست اور دوسرے تمام الفاظ واصطلاحات کی بحثوں کو ایک طرف رکھ کر یہ اساسی نکتہ بہرحال ہمالیہ کی طرح اٹل ہے کہ اسلامی حکومت وہی ہوسکتی ہے جس میں عوامی نمائندوں کو قانون سازی کا مکمل اختیار ہرگز نہ ہو بلکہ جو قوانین اللہ اور رسول ؐ نے محکم طور پر طے کردیئے ہیں انھیں دستور کے ناقابلِ تغیر اصولوں کی حیثیت دی جائے جن کی تنسیخ نہ کی جاسکے اور عوامی نمائندے صرف ایسے ہی قوانین بناسکیں جو ان اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ اس نکتے کی نفی کرنا اور پھر بھی اسلامیت اور شریعت کا دعویٰ کئے جانا نہایت جلی تضاد ہے۔

ورق پلٹ کر دیکھئے۔ مدینے کی جس حکومت کو مدیر برہان نے ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالے سے ریاست اور اسٹیٹ کا نام دیا ہے اس کا دستور بھی ریاست کے اُس تخیل کی سراسر ضد ہے جس کی تبلیغ موصوف فرمارہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں اس دستور کے مطابق خدا اور رسول ؐ کو حرفِ آخر مان لو پھر اس یقین اور عقیدے کی بنیاد پر کسی بھی قسم کی حکومت بنالو وہ اسلامی ہوگی مگر مدیر برہان اسی بنیاد سے گریز کرکے محض ایسی حکومت کو اسلامی قرار دینے کے درپے ہیں جس میں حرفِ آخر خدا اور رسول ؐ نہیں سروں کی گنتی ہوتی ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کوئی شخص یا گروہ شیفتہ اندازمیں ساری عباداتِ اسلامیہ بھی ادا کرے تو اس کی کوئی قیمت نہیں نہ اسے مسلمان تسلیم کیا جاسکتا ہے جب تک وہ خدا اور رسول ؐ کے حرفِ آخر ہونے کا صراحتہً قائل نہ ہو۔

خلافت وریاست

موصوف فرماتے ہیں کہ ملی علیحدگی طور ریاست کے شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں۔ خدا جانے ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ جہاں تک قرآن وسنت والی شریعت کا تعلق ہے اس میں تو حکومت قائم کرنے کا مقصدِ اوّل ہی یہ قرار دیا گیا کہ حدودِ سلطنت میں اُن قوانین اور تصورات کو نافذ و غالب کیا جائے جو اللہ اور رسول ؐ کو پسند ہیں۔ ان احکامات کا اجراء کرنا جن کو قرآن وسنت میں منصوص کیا گیا ہے۔ اگر خالی دنیاوی مقاصد ہی نہیں بلکہ مخصوص اسلامی مقاصد بھی کسی کے پیشِ نظر ہیں تو اسلام نے یہ اجازت کہیں نہیں دی کہ بظاہر سیکولرازم کا لباس یعنی مذاہب کے معاملہ میں غیر جانبداری کا اعلان با جہر کرو اور بہ اسلام کے غلبہ ونفاذ کی تگ ودو میں لگے رہو۔ اس کا تو کھلا فرمان یہ ہے کہ نفاق سے الحذر' قول وفعل کی دورنگی سے استغفار۔ صاف کہو اور دیانت سے عمل کرو۔ اگر کسی ملک میں تمھیں حکمرانی کا موقع مل گیا ہے تو لومتِ لائم کے خوف سے بلند ہو کر صاف صاف کہو کہ ہم اسلام کے بندۂ بے دام ہیں اور اسی کو نافذ وغالب کرنا ہمارا مشن ہے۔ پھر وہ تمام حقوق شہریوں کو دو جو اسلام نے معین کئے ہیں۔ ان میں یہ حق بھی ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو وہ عہدے تفویض کئے جائیں جن کے وہ مستحق اور اہل ہیں۔ سیکولر جمہوریہ ہندوستان میں تو دستور کی تصریح کے بالکل خلاف مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں دینے میں اہلیت اور استحقاق کی بجائے عموماً فرقہ پرستی کو معیار بنالیا گیا ہے لیکن اسلامی حکومت کے لئے ہرگز ایسا خلافِ دستور تعصب جائز نہیں ہے نہ وہ انتقاماً کسی کافر کا کوئی حق سلب کرسکتی ہے۔

لیکن جو کلیدی عہدے اسلام کے مقاصدِ عالیہ کے فروغ اور منزلِ مطلوب کی طرف پیش قدمی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہوں ان کا استحقاق تو اُن افراد کو نہیں ہوسکتا جنھیں ان مقاصدِ عالیہ اور منزلِ مطلوب سے نہ صرف یہ کہ ہمدردی نہ ہو' بلکہ [illegible] حریفانہ نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو ان عہدوں سے [illegible] رکھنا ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے سیکولر جمہوریہ اپنے مناصب [illegible] ناموزوں لوگوں کو دور رکھنا پسند کرتی ہے۔ ایک [illegible]

ہے کہ آپ اگر ایک خاص نقشے پر خاص التزامات کے ساتھ کوئی عمارت بنانا چاہتے ہیں تو اس کی تعمیر کا کام ایسے ہی انجینیروں کے سپرد کریں گے جو اس نقشے اور التزامات کو نہ صرف سمجھتے ہوں بلکہ ان کے مطابق عمارت بنانے پر خوشی سے آمادہ بھی ہوں۔ اگر اس کے عوض آپ کسی ایسے انجینیر کو دخل اندازی کا موقع فراہم کرنے لگیں جو اولاً تو اس نقشے کی نزاکتیں اور ان التزامات کی لطافتیں سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتا ہو، ثانیاً جتنا کچھ وہ سمجھ سکتا ہے اس سے بھی اسے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اختلاف ہو تو اس کے سوا کیا سمجھا جائے گا کہ یہ خاص انداز کی عمارت آپ کو فی الاصل مطلوب ہی نہیں ہے بلکہ محض ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ آپ کو کوئی پروا نہیں کہ عمارت کیسی بنے اور کیسی نہ بنے۔

یہی وہ صورت جسے مدیر برہان نے پیش فرمایا ہے کہ پارلیمنٹ کی مسلمان اکثریت تو اسلامی قوانین کے نفاذ پر متفق ہو مگر وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ کوئی ایسا آدمی بنا دیا گیا ہو جو اسلامی قوانین سے معاندانہ تعلق رکھتا ہو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے قابل قانون دانوں کی مجبوری پر کسی قانون سے بے بہرہ اور جذبۂ عدل سے عاری شخص کو جج کی حیثیت سے مسلط کر دیا جائے اور اس تسلط کو معقول منوانے کے لئے صرف دلیل کافی سمجھی جائے کہ جج کے کسی فیصلے کا نفاذ جیوری کی رضامندی پر مشروط کر دیا گیا ہے۔

ہم کہتے ہیں عدلیہ یا انتظامیہ یا اقتدار اعلیٰ کے کسی بھی شعبے میں ماہرین کی ٹیم کا ہیڈ اور سربراہ کسی جاہل یا نیم جاہل کو بنا دینا اتنا خطرناک نہیں جتنا کسی حقیقی اسلامی حکومت میں صدر یا وزیر اعظم غیر مسلم کو بنا دینا۔ کیونکہ مطلق جہل ایک بے ضرر سی منفی شے ہے جس میں جارحیت نہیں پائی جاتی۔ متعلقہ علم و فن سے جاہل ہیڈ اپنے منصب اور مشاہرے کی خیر مناتے ہوئے شاہِ شطرنج کی حیثیت پر خوشی قناعت کر سکتا ہے۔ اس کی نفسیات میں ماہرین کی ٹیم کے نظریات و مرغوبات کے خلاف کچھ کرنے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے کیونکہ وہ جاہل ہے۔

لیکن غیر مسلم جاہل مطلق کا نام نہیں ہے۔ کفار و مشرکین خود اپنے ایجابی نظریات و عقائد رکھتے ہیں اور قدرتاً ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ ہر دوسرے نظریے کے مقابلے میں ان کے اپنے نظریات کو بالادستی، مقبولیت اور فروغ حاصل ہو۔ اس صورت میں یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اکثریت کی ٹیم پر ہیڈ کی حیثیت سے مسلط کیا ہوا غیر مسلم ہر حال میں شاہ شطرنج ہی کی پوزیشن پر صبر کرے گا اور اپنے غیر اسلامی نظریات و عقائد کے فروغ کا جذبہ اس کے اندر اسلام کے خلاف جارحانہ عزائم پیدا نہیں کریگا۔ نفسیات کے عین مطابق ہے یہ اندیشہ کہ مسلم اکثریت والی پارلیمنٹ کی اسلام نواز سرگرمیوں اور پالیسیوں کو غیر مسلم صدر یا وزیر اعظم عناد و نفرت کی نگاہ سے دیکھے اور ان کو بے اثر بنانے یا ان کا رُخ موڑنے کی خاطر اندر ہی اندر جال پھیلائے۔ اسکیمیں بنائے۔ سازشیں کرے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اُس اکیلے کی وسیسہ کاری سے کیا بنتا ہے تو یہ بھی اتنا سطحی معاملہ نہیں کہ محض دو لفظ اس کا فیصلہ کر دیں۔ اونچے مناصب بہرحال اپنا ایک حلقۂ اثر رکھتے ہیں اور حکومت کے بنیادی دستور سے منحرف صدر یا وزیر اعظم ضابطوں سے نظر بچا کر بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو تب بھی یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ جس منصب کو حکومت کے مقاصد کی تکمیل میں مثبت اعانتوں کا منبع و مصدر ہونا چاہیئے تھا وہ جمود و تعطل یا پھر تخالف و تخریب کا مرجع و مبنیٰ بن کر رہ گیا۔

اور اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اسلامی حکومت کا قصہ ہی ختم ہے۔ یہ بات ناممکنات میں سے نہیں ہے کہ اکیلا صدر یا وزیر اعظم اپنی حکمت عملی یا شخصی وجاہت کے زور سے پارلیمنٹ کی اکثریت مسخر کر لے۔ مثال آپ کے سامنے ہے۔ ہمارے وزیر اعظم پنڈت نہرو اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ایسی ساحرانہ قوت تسخیر کے مالک ہیں کہ اگر وہ کسی بات کو منوانے کا فیصلہ کر لیں تو یا تو پارلیمنٹ کی اکثریت انھی کی بولی بولتی نظر آتی ہے یا پھر کچھ ایسا چکر چلتا ہے کہ پارلیمنٹری ضوابط کو آئینی رسمیات کا ڈرامہ اسٹیج ہو کر نہرو جی کی بات ایک

فیصلے کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

تو یہ بات کیسے خارج از امکان قرار دی جاسکتی ہے کہ اسلامی حکومت میں بھی قانونی اذن کا دروازہ کھلا ہوا ہونے کی صورت میں کوئی ایسا ہی شخص صدارت و وزارت کی کرسی پر فائض ہو جائے جس کی شخصیت کے آگے پارلیمنٹری فوج کا ہر ہر فرد بالشتیا بن کر رہ جائے اور پالیسیاں بنانے میں اسی کے چشم و ابرو کی طرف نیازمندی کے ساتھ دیکھا جایا کرے۔

کاش مدیر برہان خود فرمائیں کہ امریکہ کی صدارت و وزارت کسی کھلے کمیونسٹ کو اور چین و روس کی وزارت کسی کھلے اشتراکیت دشمن کو عطا کرنے کا مشورہ دینا جس قدر ناخوشگوار ہے اسی قدر ناخوشگوار یہ مشورہ بھی ہے کہ اسلام کی ایک نظریاتی اسٹیٹ میں کلیدی مناصب کے دروازے ان لوگوں کے لئے بھی کھلے رہنے دیئے جائیں جو ان نظریات کے کھلے اور خود معترف حریف ہوں۔

ایک اور غلط فہمی

مدیر برہان کے متذکرہ بالا قلم پارے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے خیال میں پارلیمنٹ میں اگر اکثریت مسلمانوں کی ہے تو پھر اسلام اس حد تک محفوظ ہو گیا کہ صدر یا وزیر اعظم غیر مسلم کو بھی بنا دینا مقاصد اسلامیہ کے لئے مضر نہیں۔

یہ خیال تجربہ و مشاہدے کے سراسر خلاف ہے۔ کیا پاکستانی پارلیمنٹ شروع ہی سے مسلمانوں ہی کے مجموعے کا نام نہیں ہے اور کیا مصر و ترکی میں مسلمانوں ہی کی حکومت قائم نہیں ہے — پھر کیا نتیجہ نکلا — کیا اسلام نافذ ہو گیا — کیا باطل کو مسند اقتدار سے اُتار دیا گیا؟

سب دیکھ رہے ہیں کہ تمام تر مسلمانوں ہی کی پارلیمنٹیں سراسر غیر اسلامی قوانین پر شاداں اور اسلامی قوانین سے گریزاں ہیں۔ سود و شراب جیسے متفق علیہ محرمات بھی آئینی جرائم کی فہرست میں نہ آسکے پھر اسلام کی طرف پیش رفت اور اقدام کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کھلی بات ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی اقدار کے احیاء کی خاطر سیکولر آئین کو چھوڑنا پڑے گا اور اس کی جگہ ایسے آئین کو دینی ہوگی جو پارلیمنٹ کو مجبور کر دے کہ اس کی اکثریت چاہے نہ چاہے اسلامی قوانین و کلیات کو [illegible] پڑے گا۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جو معاشرے اور سیاست کی گاڑی کو باطل سمتوں سے ہٹا کر حق کی سمت چلانے میں [illegible] انجام دے سکتا ہے اور اسی راستے کا انتخاب کرنے کی [illegible] اسلامی حکومت اور اقامت دین وغیرہ کے عنوانات سے [illegible] رہتی ہے جس پر مدیر برہان کو اعتراض ہے۔

حضرت عمرؓ کا حوالہ

مدیر برہان رقمطراز ہیں:۔

"ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ جہاں کوئی معاملہ (خواہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کیسا ہی ہو) اُن کے سامنے آیا اور وہ جھٹ حضرت عمرؓ کی مثال لے آئے کہ آپ نے یہ کیا اور ایسا کیا، حالانکہ آج اگر فاروق اعظمؓ ہوتے تو [illegible] ایک جنبش نگاہ امریکہ اور روس دونوں کو چونکا دینے کے لئے [illegible] ہوتی اور اُن کا دارالخلافہ تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت، علوم کی تعلیم و تعلّم، وسعت و نزہت صفائی اور شائستگی کے باعث غیرت ماسکو و واشنگٹن ہوتا۔ اس لئے جہاں تک معاملات دینیہ کا تعلق ہے اُن کے بارہ میں حضرت عمرؓ کے انداز فکر، طریق [illegible] اور اصول و اجتہاد و استنباط کو سامنے رکھ کر سوچنے اور غور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوتے تو کیا کرتے؟ [illegible] لئے ضرورت اجتہاد کی ہے مگر یہ کون کرے۔ اس سلسلے میں [illegible] حضرات سے کیا توقع ہو سکتی ہے جنھیں حیات النبی۔ تراویح کی رکعات، میلاد میں قیام اور آپس میں ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق سے ہی فرصت نہیں ہے۔ فیا الغربۃ الاسلام و [illegible]۔"

یہاں مولانا نے حضرت عمرؓ کی تعریف کا کچھ ایسا ہی [illegible] اختیار کیا ہے جیسا متجددین رسول اللہؐ اور صحابہؓ کی توصیف کا کرتے ہیں۔ یعنی توصیف تو شاندار مگر ان کی معروف و محکم روایات اور ان کے محبوب نظریات سے صرف نظر — ہم [illegible] اجتہاد تو بعد کا قصہ ہے ہو سکتا ہے تمام علماء اجتہاد کے [illegible] اور انھیں آپ جیسے اہل بصیرت سے سبق سیکھنے کی [illegible] کیا یہ معلوم کرنے کے لئے بھی اجتہاد کی ضرورت [illegible]

...اللہ اور رسول کو ...
... مانتے تھے جس طرح اصطلاحی عبادات ہیں؟ کیا یہ واقعہ بھی
...ںا کے نزدیک اجتہاد، تحقیق اور تحلیل و تجزیئے کا محتاج ہے کہ
...نت، اقتصاد، تہذیب، حیاتِ عائلی، سیاست اور معاشرت
...بھی شعبۂ زندگی میں جو قوانین اللہ اور رسول ؐ نے مصرح فرما دیئے
...وہ حضرت عمرؓ کے نزدیک عین دستور تھے، اٹل تھے۔ انھیں سو
...دی اکثریت بھی اپنی رائے کے زور سے بدلنے کی مجاز نہیں
...۔ ان کا انکار کرنے والا کافر و مرتد تھا؟ ان کے اجراء میں عوامی
...ندوں سے استصواب اور ووٹنگ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا
کیا اس صداقت سے آگاہی حاصل کرنا بھی خوردبینی مطالعہ
...ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دستور و آئین کے رُخ سے خلیفہ
...کا نمائندہ نہیں تھا وہ تو رسول ؐ کا خلیفہ اور اللہ کے احکام کا
...تھا؟

کیا اس میں بھی کسی شک کی گنجائش ہے کہ حضرت عمرؓ کے
...دیک آج کل کی سیکولر جمہوریہ کی طرح اسلامی حکومت و خلافت
...قانون سازی کی اصل طاقت عوام کی نمائندہ اسمبلی کے ہاتھوں
...نہیں تھی بلکہ اللہ اور رسول ؐ کے قبضے میں تھی۔ عوام کے نمائندے
...بس اسی حد تک قانون سازی کے مختار تھے کہ جن معاملات
...ں اللہ اور رسول ؐ نے صریح قوانین نہیں دیئے ہیں ان کیلئے
...یسے قوانین وضع کریں جو اللہ اور رسول ؐ کے طے فرمودہ اصول و
...لیات سے ہم آہنگ ہوں اور ان کے پیچھے اللہ اور رسول ؐ کی
رضیات ہی کی بجا آوری کا جذبہ کارفرما ہو۔

اگر یہ حقائق مسلمات میں سے ہیں ـــــ ترجیحات النبیؐ
...در قیام میلاد وغیرہ کی بحثوں میں پڑنے والے علماء سے کیا آپ ایسے
...جتہادات کا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں جو اِن مسلمات پر خطِ تنسیخ
...کھینچ دیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ دورِ نبوی کی جگمگاہٹوں سے
...خیرہ ہو کر مولانا مودودی یا دوسرے علماء اس اساسی عقیدے
...کو بھی طاق پر رکھ دیں کہ اسلامی حکومت کا مدار قانونِ الٰہیہ
...کی بے چون و چرا تسلیم پر ہے نہ کہ انسانی سروں کی گنتی پر۔

فروعی بحثوں کا آپ نے جو طعنہ دیا ہے اتفاق سے مولانا
مودودی ... ہی ... جنہیں مطعون کرنا اور جنکے

... تصورات کو رجعت پسندانہ قرار دینا آپ کو مطلوب ہے۔ انکی تحریروں
کو دیکھ لیجئے ایسی بحثوں کا اوسط برائے نام ہی نکلے گا زیادہ تر
ایسی تحریریں ملیں گی جن میں اقامتِ دین کے گوشے واضح
کئے گئے ہوں گے اور اُن فتنوں کا استیصال کیا گیا ہوگا جو
عصرِ حاضر کے مادہ پرست ذہن نے پیدا کئے ہیں۔

اس خوش گمانی سے بھی ہم متفق نہیں ہیں کہ اگر آج حضرت
عمرؓ ہوتے تو ان کا دارُالخلافہ تہذیب و تمدن کے معاملے میں
غیرتِ ماسکو و واشنگٹن" ہوتا۔ اس سے اتفاق جبھی ممکن ہے جب
ہمیں معلوم ہو جائے کہ تہذیب و تمدن سے آپ کی کیا مراد ہے۔
دنیائے حاضر کی زبان تو تہذیب و تمدن کے دائرے میں سینما
ہالوں، بال روموں، تھیٹروں، باروں، کلبوں، آرٹ گیلریوں
میوزیموں اور بینکوں کی عالیشان عمارتوں کو سب سے پہلے شامل
کرتی ہے بلکہ انھی کو تہذیب و تمدن کا کمین قرار دیتی ہے۔
اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کی صورت گری کرنے والے سماجی
تصورات و آداب میں بھی اسلامی تہذیب اور واشنگٹن و ماسکو
کی تہذیب کے مابین بنیادی اور جوہری تضاد و تخالف پایا
جاتا ہے۔ پھر آخر تہذیب و تمدن کے الفاظ سے آپ واشنگٹن
اور ماسکو کی کن چیزوں کا ذکر کر رہے ہیں جن میں حضرت عمرؓ
مسابقت فرماتے۔

خدارا اس نزاکت پر غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کے دارالخلافہ
کو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے غیرتِ ماسکو و واشنگٹن باور
کرنے اور کرانے کی خواہش کن وحشت ناک مضمرات کی حامل ہے
ان دونوں مثالی شہروں کے تہذیب و تمدن، قمار، سود، جوئے
شراب، عورت، فحاشی، تھیٹر، سینما، مادہ پرستی اور اخلاقی
انارکی کے سوا آخر کس چیز سے عبارت ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ
امریکنوں اور کمیونسٹوں کے بعض قومی اوصاف اور محدود قسم
کے محاسنِ اخلاق کا قصیدہ پڑھ سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تہذیب و
تمدن کا دائرہ صرف ان جزوی خصائص تک ہی تو محدود نہیں
ہوتا بلکہ ماسکو اور واشنگٹن کے تہذیبی مظاہر زیادہ تر وہی ہیں
جن کا ہم نے ذکر کیا۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ آج عمرؓ ہوتے
تو وہ بھی تہذیب و تمدن کے میدان میں امریکہ اور روس ...

[illegible] کی بازی کھیلتے۔ العیاذ باللہ اور خصوصیات میں تو ہم آپ کی خوش گمانی کو باور کر سکتے ہیں یعنی ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بھی صنعت و حرفت، سائنس اور دوسرے عصری [illegible] میں ترقی کی جدوجہد کرتے، مسلمانوں کو اخلاقی بندشوں کے ساتھ آگے بڑھاتے۔ لیکن "تہذیب وتمدن" کے باب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ فی الوقت اسلام کے اصل مقاصد اور اسلامی حکومت کی روحانی اساس کو نظر انداز کر کے تفکر فرما رہے ہیں ورنہ آپ کو ہرگز یہ توقع نہ ہوتی کہ حضرت عمرؓ بھی ہماری طرح مرعوب ہو کر اور اپنے بنیادی [illegible] کو تج کر مادہ پرستانہ تہذیب وتمدن میں امریکہ و روس کو شکست دینے کا کارنامہ انجام دیتے تہذیب وتمدن آج جن چیزوں سے عبارت ہے اس سے تو زمین و آسمان بھی پناہ مانگتے ہیں۔ العیاذ باللہ

منیر رپورٹ کی تلبیس کا بیان

خاتمۂ کلام کی طرف آتے ہوئے ہم منیر رپورٹ کے اس اقتباس پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جسے مدیر برہان نے ڈھائی صفحات پر پھیلا دیا ہے۔

اس اقتباس میں جسٹس منیر نے متجددین کے معروف اسلوب کی مانند پہلے تو صحرانشینانِ عرب کے شاندار کارناموں کی توصیف کی ہے لیکن ان کا جو کچھ مقصد ہے وہ آگے چل کر ان الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے۔

> "اسلام کو ایک عالمی نصب العین کی حیثیت سے محفوظ رکھنے اور مسلمانوں کو حال اور مستقبل کی دنیا کے شہری میں تبدیل کر دینے کی راہ بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ اسلام کی تجدید جرأت کے ساتھ کی جائے تاکہ ضروری اور زندۂ جاوید حصہ کو غیر ضروری اور بے جان چیزوں سے الگ کر لیا جائے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدیر برہان نے فرطِ عقیدت میں "تجدید" کا وہی مفہوم سمجھ لیا ہے جس کے آگے ہر سچا مسلمان سرِ عقیدت جھکاتا ہے اور جس کے حاملین کو "مجدد" کا ممتاز لقب دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم محترم مدیر برہان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ دھوکا کھا گئے۔ تجدید و تجدد کا فرق ان سے زیادہ کون جانتا ہے [illegible] کیوں نظر نہیں آتا کہ پاکستانی متجددین اسلامی اصطلاحات کو جس کثرت کے ساتھ من مانے مطالب کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی زہریلی تعبیروں سے ہزار بار الحذر۔ جب وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی تجدید کی جائے تو ان کا منشاء اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جو اسلامی تصورات مغربی فکر و تہذیب کے مقبول عام تصورات سے ٹکرا رہے ہیں انہیں یا تو کھینچ تان کر مغربی تصورات کے مطابق بنایا جائے یا پھر خارج المیعاد (آؤٹ آف ڈیٹ) قرار دے کر طاق پر رکھ دیا جائے اور جب یہ ضروری اور غیر ضروری کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا موعود ذہنی صرف یہ ہوتا ہے کہ ملا جو مرد و زن کی مخلوط سوسائٹی سود اور شراب و قمار کے آئینی جواز، شہوانی محرکات کی کھلی اباحت اور مغربی تہذیب و تمدن کی اندھا دھند نقالی کے خلاف شور مچاتا ہے یہ در اصل غیر ضروری چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ سب بے جان باتیں ہیں۔ اسلام کا ضروری اور زندہ جاوید حصہ صرف وہ ہے جسے ہم شاگردانِ مغرب ایسا قرار دیں اور جو ہماری زندگی کے معمولات و مشاغل میں حارج نہ ہو۔ جو ہماری مغرب زدگی پر انگلی نہ اٹھائے۔ جو ہم سے یہ نہ کہے کہ تمہاری زندگی کی ایک ایک ساعت خدا کی امانت ہے اور پل پل کا حساب تمہیں آخرت میں دینا ہوگا۔

انتہا یہ ہے کہ اسلام کی تجدید اور ضروری و غیر ضروری کی تشخیص کا حق بھی یہ لوگ اپنے ہی لئے رزرو رکھتے ہیں گویا جن لوگوں نے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تعلم میں عمریں کھپا دی ہیں اور دین کو اس کے اصل سرچشموں سے مستند اساتذہ کے ذریعہ حاصل کیا ہے وہ تو ہیں ملا ——رجعت پسند—— بے سمجھ —— بوالفضول —— مگر جن لوگوں نے اپنی ساری صلاحیتیں علوم دنیاوی کی تحصیل میں صرف کرتے ہوئے اسلامی علوم کو ان سرچشموں سے حاصل کیا ہے جن میں اسلام دشمن مفکرین نے اپنے تعصبات کے زہر آمیز کر رکھے ہیں اور جن کی زندگی کے تمام مشاغل و مظاہر اسلام سے انحراف کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں وہ ہیں اصلی مجتہد و مفکر کہ جس طرح چاہیں اسلام کی تجدید کریں اور جیسے چاہیں ضروری و غیر ضروری کا [illegible]

کوئی متلاشیٔ حق اگر ہمارے اس تجزیئے کی صداقت [illegible] چاہتا ہے تو وہ مشتے نمونہ از خروارے [illegible]

دیکھ لے [illegible]

کی ہے۔ ان قوانین کے [illegible] ہونے پر تمام حلقوں کے علماء متفق ہیں۔ کیونکہ ان کی بنیاد اسلام کے بجائے اُسی معروف مادی طرز فکر پر رکھی گئی ہے جسے مغرب زدہ متجددین انتہائی پندار و استکبار کے ساتھ اسلام کی بیخ کنی اور تحریف کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا منشاء تجدید کے نعروں سے یہی ہوا کرتا ہے کہ علماء کو طاق میں بٹھاؤ، مفسر، محدث، مجدد اور امام ہمیں مانو ہم تمہیں اسلام کا وہ نیا ایڈیشن دیں گے جو تمہاری مادہ پرستانہ زندگی کے ہر آئیٹم پر صاد کرتا چلا جائے گا ——— اور جب یہ لوگ تجدد کے ساتھ "جرأت" کا لفظ شامل کرتے ہیں تو ان کا واحد مقصود یہ ہوتا ہے کہ من مانی تجدید پر علماء شور مچائیں تو ان کی مت سنو۔ انھیں مثلاً کہکر نشانۂ تمسخر بناؤ' انھیں رجعت پسند کہو' نعروں کی باڑھ پر رکھو' قرآن وحدیث کے حوالوں پر توجہ مت دو' آیات کی تفسیر زبان ولغت' سیاق وسباق اور اجماع سلف سے بالاتر رہ کر کرو۔ یہی ہے نئے ائمۂ اسلام کی جرأت مندی کا مفہوم جس کی تحسین کے لئے قسمت سے انھیں مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسا عالم بھی آج میسر آہی گیا ہے۔

جسٹس منیر اس اقتباس کے خاتمے پر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے سیاست دانوں کو سمجھنا چاہئے کہ اگر خدا کے احکام کسی شخص کو مسلمان نہیں بنا سکتے یا اسے مسلمان نہیں رکھ سکتے تو ان کے بنائے ہوئے قوانین ہرگز اس راہ میں کارگر نہیں ہو سکتے۔"

بادی النظر میں بڑی دلکش بات ہے' لیکن ذرا گہرائی میں اُترئیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کو معاشرے میں غالب ونافذ کرنے کی جدوجہد کو بے اثر بنانے کے لئے جو نوع بہ نوع استدلال کئے جاتے ہیں یہ بھی انھی میں سے ایک ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ جب خدا کے احکام چودہ سو برسوں سے سامنے موجود ہیں اور پھر بھی مسلمانوں کا کردار ان کے مطابق نہیں ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ آپ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنانے کے لئے خدائی احکام کے مطابق کچھ قوانین نافذ کریں۔

عجیب وغریب منطق ہے ——— دنیاوی مقاصد کے سلسلے میں تو آپ کا یہ طریق ہے کہ رشوت' غصب' چوری' بددیانتی اور فتنہ وفساد کا غوغا جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی اتنا آپ تعزیرات کی دفعات کو وسیع اور سخت کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہاں آپ یہ منطق نہیں چلاتے کہ جھوٹ' چوری' رشوت ستانی اور اسی نوع کے دیگر جرائم کے ناپاک ہونے پر تو ہمیشہ سے پوری دنیا کا اتفاق ہے اگر یہ دنیا بھر کا اتفاق بھی لوگوں کو ان جرائم سے اجتناب پر آمادہ نہ کر سکا تو ہمارے قوانین ہی کیا فائدہ دیں گے۔

کیوں؟ ——— حالانکہ مہذب ممالک کی جرائم سے متعلق سالانہ رپورٹیں دستاویزی ثبوت ہیں اس بات کا کہ ہر نئے سال میں جرائم کا تناسب پہلے سے زیادہ ہی ہے کم نہیں ہے۔ تعزیری قوانین جوں کے توں موجود ہیں بلکہ بندشیں سخت کی جا رہی ہیں مگر جرائم کا سدِ باب نہیں ہوتا ——— تو کیوں آپ قوانین کو منسوخ نہیں کر دیتے؟ کیوں وہی منطق یہاں جلوہ نہیں دکھاتی جس کے ذریعے آپ قوانین اسلامیہ کا اجراء فضول بتا رہے ہیں؟

وہی بات ہوئی جو مدیر برہان نے کہی تھی یعنی مسلمان پہلے سراپا اسلام بن جائیں اسلامی حکومت آپ سے قائم ہو جائے گی ——— بیچارہ اسلام ہی ایسا بے قیمت ہے کہ دنیا کے اور تمام چھوٹے بڑے مقاصد کے حصول کے لئے منفی اور مثبت ذرائع اختیار کرنا دانشمندی قرار پائے' جرائم کو روکنے کیلئے قوانین بنانا سمجھداری ٹھیرے لیکن تنہا اسلام ہی کے مقاصد کے بارے میں یہ نادر فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ آپ سے آپ حاصل ہو جائیں تو فبہا ورنہ یہ ہرگز مفید نہ ہوگا کہ ان کے حصول کی خاطر مثبت قوانین بنائے جائیں اور اُن سرگرمیوں کو خلاف قانون قرار دیا جائے جو ان مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں مسٹر منیر جج رہے ہیں اور اب تو غالباً وزیر قانون ہیں۔ انھیں خوب معلوم ہوگا کہ جیب تراشی سے لیکر قتل تک تمام جرائم ہمارے معاشرے میں کس قدر عام ہیں۔ پھر کیوں نہ انھوں نے اپنے کسی دور میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ جن ازلی وابدی جرائم سے لوگ [illegible]

[illegible] سامنے ما متنا در تمام مذاہب کی تلقین و تعلیم بھی لوگوں کو [illegible] رکھ سکی ان کو روکنے کے لئے قوانین بنانا اور قوانین کے [illegible] عوام سے خوش کرداری کی توقع کرنا عبث ہے — اگر [illegible] یہ مشورہ دیتے تو ہم سمجھ لیتے کہ اسلام کے بارے میں بھی یہی مشورہ دیتے ہوئے وہ مخلص ہیں لیکن اکیلے اسلام ہی کے بارے میں یہ نصیحت کرنا کہ جب خدا کے احکام ہی مسلمانوں کو سچا مسلمان نہ بنا سکے تو اس مقصد کے لئے قوانین نافذ کرنا بیفائدہ ہوگا انصاف و دیانت کی نرالی قسم ہے۔

اور ہم عرض کریں گے کہ خدائی احکام کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کی اخلاقی خامیاں اور اسلام فراموش سرگرمیاں زیادہ تر اُسی گروہ کی عنایات کا ثمرہ ہیں جس نے معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے عوض غیر اسلامی سانچے میں ڈھالا۔ آپ ایک طرف مرد و زن کی مخلوط زندگی کو نشو و نما دیں، دوسری طرف ہوس کو انگیز کرنے والے عوامل کی ہمت افزائی کریں، تیسری طرف مقاصد و عزائم کو خالص مادہ پرستانہ مفادات و لذائذ کے محور پر گردش دینے کی ذہنیت عام کرتے چلے جائیں اور یہ تاثر عام کر دیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے مزے اُڑا لو جتنے اُڑائے جائیں۔ تو اس سے جو ہمہ گیر اخلاقی بگاڑ پیدا ہوگا اس کی ذمہ داری خدائی احکام پر نہیں جائے گی آپ پر جائے گی۔ آپ اس وقت کہنے لگیں کہ صاحب جب خدائی احکام ہی لوگوں کو بدکرداری سے باز نہ رکھ سکے تو ہم اس بدکرداری کا خاتمہ کرنے کی سعی آئین و قانون کے ذریعہ کیوں کریں تو یہ فی الاصل کوئی معقول استدلال نہ ہوگا بلکہ اسے ہٹ دھرمی دھاندلی اور عقل دشمنی کہیں گے۔ آپ نفس کے شیطان کو مسلسل حیات بخش غذائیں مہیا کئے جائیں اور الزام سارا رکھ دیں مولوی ملّا پر — آپ ہر برائی کی پشت پناہی کئے جائیں اور طعنہ دیں ملّا کی بحث بازیوں کو جیسا آپ سمجھے ہوئے ہوں شاہد مغرب کی اداؤں پر اور ملّا کو رجعت پسند کہہ کر گوشہ نشین ہو جانے کی تلقین کریں — یہ فنکاری مدیر برہان کی دانست میں لائق تحسین ہو تو ہماری محدود عقل تو اسے پرلے سرے کی منافقت اور

گمراہی کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتی۔

اس سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ علماء میں بھی بہت زیادہ [illegible] ہیں۔ ان پر غیر ضروری بحثوں میں پڑنے اور بوالفضولی اختیار کرنے کا الزام بڑی حد تک درست ہے۔ ان کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے۔ ان کی نفسانیت ایک تلخ حقیقت ہے۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کے حلق میں پتھر ٹھونس دیئے جائیں اور انگلیوں پر چمڑا چڑھا دیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ بعض تو اس قابل ہیں کہ ان کو دار پر لٹکا دینا بھی ناانصافی نہیں قرار دیا جائے۔

لیکن سب عالم اس درجہ بُرے نہیں ہیں۔ ان میں استثناء بھی ہے اور ہم اکیلے مولانا مودودی ہی کو نہیں متعدد اور علماء کو اس حد تک فرخندہ اوصاف سمجھتے ہیں کہ ان کے بارے میں مدیر برہان کا طعنۂ جہل اور طنز بوالفضولی کو گوارا نہیں مانا جا سکتا۔

اس کے علاوہ ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ علماء کیسے بھی ہوں ان کے احتساب، تعزیر، قدغن اور دار و گیر کا حق اسلام کو ہے، کفر و زندقہ کو نہیں۔ اسلام کا دُرّہ ہماری کھالیں بھی ادھیڑ دے تو یہ اُس کا حق ہے۔ اللہ کے دین کو برپا کرنے کیلئے ہماری نفسانیتوں کا علاج دار و رسن اور سلاسل و زندان سے کیا جائے تو یہ عین اصلاح ہے۔ اسلام کی خاطر ہمارے ایک ایک عضو کو کاٹ کر پھینک دو۔ ہم پر دُرّۂ فاروقی برساؤ یہ عدل کے عین مطابق ہوگا۔

لیکن یہ ہرگز قابل برداشت نہیں ہو سکتا کہ مولویوں کے خلاف جلادی کا کارنامہ وہ لوگ انجام دیں جن کا اپنا اسلام کفر و نفاق سے مکمل سمجھوتہ کر چکا ہے۔ اُن باطل نظریات کے کوڑے مولویوں پر برسانا گوارا نہیں کیا جا سکتا جن کا خمیر غلاظت سے اُٹھایا گیا ہے۔ مولوی ہزار برائیوں کے باوجود اُن متکبرین اور جہلاء سے بہتر ہیں جن کے تمام فکر و نظر، تمام علم و فہم اور تمام استعداد [illegible] نظریات کی خدمت اور اسلامی اقدار کی جڑیں کاٹنے میں لگی ہوتی ہیں۔

لہجہ ہمارا تلخ ہو گیا۔ یہ تلخی مولانا مودودی یا کسی اور کی جنبہ طرف داری کا ثمرہ نہیں ہے نہ ہم محترم مدیر برہان کے حق میں گستاخی کی جسارت کر سکتے ہیں بلکہ تلخی کا تعلق در اصل اُس دین کی محبت سے ہے جو اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں زخم [illegible]

[illegible] جا رہا ہے [illegible] زمانے کی نگہبانی کا راستہ اختیار کرنا نظر آتے تو طالبانِ عزم کا تڑپ اٹھنا غیر فطری نہیں ہو سکتا۔ مان لیا کہ بدقسمتی سے مادی دنیا کا غلبہ و اقتدار اس وقت طاغوت ہی کے ہاتھوں میں ہے اور اسلام سیادت و قیادت کی بازی ہار چکا۔ اسلام صید ہے اور باطل صیاد۔ اسلام یتیم و یسیر ہے اور کفر و زندقہ کے دو جتوں والدین ہیں ـــ مگر ہم عقائد و نظریات کے میدان میں شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمارا آج بھی یہی یقین ہے کہ اسلام ہر غیرِ اسلام سے برتر ہے ـــ اس کی یکتائی، فوقیت اور بلندی میں کوئی کمی نہیں آئی۔

مولانا مودودی کی پوزیشن

جائزہ پورا ہوا۔ صرف اُس طعنے کا جواب ہم قدرے تفصیل سے دینا چاہتے ہیں جو مدیر برہان نے دوسرے اداریئے میں مولانا مودودی پر ان الفاظ میں کسا تھا:۔

"اس جماعت کا بانی اور صدر جو اسلام کا سب سے بڑا غازی اور مجاہد ہے اپنے ملک میں اپنے اور اپنی جماعت کے بنیادی شہری حقوق حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنے کے بجائے نجد و حجاز کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے میں وقت گذارتا پھر رہا ہے۔"

مدیر برہان کے ذہن پر اس وقت چونکہ مادیت کا غلبہ ہے اس لئے انھوں نے یہ معلوم و معروف حقیقت نظر انداز کر دی کہ مولانا مودودی اقامتِ دین کے داعی ہیں نہ کہ صرف حکومت پر قبضہ کرنا اور سیاسی غلبہ حاصل کرنا ان کا واحد مقصد ہے۔ اقامتِ دین ایک وسیع و ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ جس طرح لفظ "مسلمان" بولنے کے بعد یہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے کہ جس کے لئے یہ لفظ بولا گیا ہے وہ نماز کو بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوگا جس طرح روزے اور زکوٰۃ کو۔ اس کا نام بھی مسلمانوں جیسا ہوگا ـــ وہ محمدؐ کو رسول اور صحابہؓ کو خیرالامۃ بھی مانتا ہوگا وغیر ذلک۔

ٹھیک اسی طرح جب ایک شخص "اقامتِ دین" کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو آپ سے آپ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ صرف حکومت سازی ہی قائم کرنے کو جس کھڑا ہوا [illegible] صرف حکومت [illegible] ہی اس کا مقصود نہیں بلکہ پورے کا پورا دین اور اس کے مطابق ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و تطہیر اس کا نصب العین ہے۔ جس وقت جس شعبۂ زندگی میں جس درجے کی اصلاح اس کے بس میں ہوگی اس سے گریز نہیں کرے گا اور جن خرابیوں کا انسداد فی الحال اس کے بس میں نہیں ہوگا ان کے لئے وہ مزید قوت اور وسائل فراہم کرنے کی تگ و دو کرتا رہے گا۔

اب غور کیجئے کہ مارشل لا اچانک جماعتی پیمانے کی سیاسی جد و جہد کا دروازہ بند کر دیتا ہے تو براہِ راست سیاسی نوع کی کوششیں تو خود بخود بس سے باہر ہو جاتی ہیں۔ بس سے زیادہ کی تکلیف تو اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو نہیں دی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس وقت اگر مولانا مودودی پہلی جیسی سیاسی نوع کی جد و جہد سے کنارہ کش نظر آتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان کے پاس سفرِ حج کے وسائل نہ ہوں تو وہ صبر و سکوت کے ساتھ اُس وقت کا انتظار کرے جب اللہ تعالیٰ [illegible] وسائل کا انتظام فرما دے۔ اس کے صبر و سکوت پر طعنے کسنا اور اس کے جذبۂ و نیت پر طنز کے تیر برسانا کسی ہوشمند کے نزدیک روا نہیں ہو سکتا۔ یہی پوزیشن مارشل لا کے دوران مولانا مودودی کی رہی ہے۔ لیکن کیا وہ ایک دن کے لئے بھی اپنے نصب العین "اقامتِ دین" سے غافل ہوئے؟ کاش مدیر برہان اس کی تحقیق فرما لیتے۔ پاکستان کے متعدد جریدے گواہ ہیں کہ مارشل لا کے دوران بھی مولانا مودودی نے اقامتِ دین کی وہ ساری سرگرمیاں جاری رکھی ہیں جن کی انھیں استطاعت تھی۔ انھوں نے مسجد میں باقاعدگی کے ساتھ قرآن اور حدیث کا مستقل درس دیا۔ وہ برابر اپنی تفسیر القرآن لکھتے رہے، انھوں نے اسلامی نظریات کے رد اور مغربی فکر کے پھیلائے ہوئے مغالطوں کی تردید و تنقید کا کام بلا انقطاع جاری رکھا۔ تو کیا یہ سب اقامتِ دین ہی کی جد و جہد کے اجزاء نہیں ہیں۔ کیا آٹا گوندھنے والے اور چولھا جلانے والے کے بارے میں یہ طعنہ درست ہوگا کہ وہ روٹی پکانے کے ارادے سے دستبردار ہو گیا اور [illegible] کی کوشش سے دامن کش ہو گیا؟ ـــ ہر معترض کو [illegible]

کہ مولانا مودودی کا سمجھ میں درس قرآن وحدیث تنخواہ سے کبھی ساتھ نہیں تھا نہ وہ پیشہ ور واعظ ہیں۔ ان کے یہ مشاغل تو خالصتہً ان کے نصب العین، اقامتِ دین ہی کا حصہ تھے اور ہیں۔ اسلامی حکومت قائم کرنے کیلئے اس سے بڑھ کر جد وجہد اور کیا ہوگی کہ جب مارشل لا کی تلوار سر پر لٹکا دی جائے اور آدمی عام قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی سے عند الناس اور عند اللہ بری الذمہ ہو جائے تو وہ لوگوں کو اس قرآن و حدیث کی طرف منعطف کرنے میں لگا رہے جس کے سرچشمہ صافی سے اقامتِ دین اور غلبۂ حق کے جذبوں کو غذا ملتی ہے۔ محترما! تنخواہ لیکر درس و تدریس کی محفل سجانا اور بات ہے، مشاہرے کے عوض اسلامیات پر لیکچر دینا دشوار نہیں، نذرانے لیکر وعظ دینا روش عام ہے لیکن بلا کسی دنیاوی اجر کے درس و وعظ کا التزام کرنا صرف انھی لوگوں کا شیوہ ہو سکتا ہے جو اپنے لمحاتِ زندگی کو ہر آئینہ خدمتِ دین و ملت ہی میں کھپا دینا مقصدِ زندگی قرار دے چکے ہیں ۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ فاتحینِ مکہ ایسے مرحلوں سے بھی گذرے تھے جب ظلم و تشدد کے جواب میں صبر ہی ان کا شیوہ تھا۔ پھر ایسے مراحل سے بھی گذرے کہ بظاہر دب کر صلح کی اور متعدد ایسے مراحل سے بھی گذرے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ۔۔۔ یہ سب مراحل اقامتِ دین ہی کے تو تھے ۔۔۔ مارشل لا کے دور میں مولانا مودودی کا خود کشی نہ کرنا اگر زہریلے طنز کا مستحق ہے تو سوچئے فتح مکہ سے قبل کے مراحل میں صحابہؓ اور خاکم بدہن گستاخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی آسانی سے موردِ طنز بنائے جا سکیں گے۔

آپ مولانا مودودی کے سفر نجد و حجاز کو وقت گذاری کا نام دیتے ہیں اور اس طرح اس کا ذکر کرتے ہیں گویا مولٰنا موصوف پاکستان کی مارشل لائی فضا سے گھبرا کر آپ سے آپ جہاز میں جا بیٹھے تھے۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ وہ حکومتِ حجاز کی دعوت پر گئے تھے اور یہ دعوت اس لئے دی گئی تھی کہ ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیا جائے ۔۔۔ دوسری مرتبہ دعوت ایک اسلامی کانفرنس کی تقریب میں دی گئی تھی۔ اِن دونوں دعوتوں سے قبل وہ ارض القرآن کے مشاہدے کا رفیع الشان مقصد لیکر تشریف لے گئے تھے۔ آخر یہ کس قسم کا طرزِ فکر ہے جو ان اسفار کو ہدفِ ملامت بنانے کی ہمت کر رہا ہے۔ قلم کی نوک پر پہرے نہیں لیکن قلم کو حرکت دیتے وقت بالکل ہی ایک رخ پر تو نہ بہہ جانا چاہئے۔ حجاز تو مولانا مودودی کی طرح ہندوستان کے مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی تشریف لے گئے تھے کیا ان پر بھی طعنہ کسنا چاہئے کہ اپنے وطن میں اسلام دشمن سرگرمیوں کے خلاف جد وجہد کرنے کے بجائے وہ نجد و حجاز میں وقت گذاری کرتے پھر رہے ہیں۔

اور خیر سے خود مدیر برہان بھی اُس وقت شاید کنیڈا میں ہونگے جب یہ سطور چھپ کر قارئین تک پہنچیں گی۔ انھیں کسی مغربی انسٹیٹیوٹ نے معقول معاوضہ پر چند ماہ کے لئے لکچر دینے کے لئے بلایا ہے۔ کیا موصوف پسند کریں گے کہ ان کا ہی طعن انھی کی طرف لوٹا دیا جائے؟ ۔۔۔ اگر وہ غور کریں تو ایک معاند اس طعن کو خود ان کے حق میں دو آتشہ بھی بنا سکتا ہے۔ یعنی وہ کہہ سکتا ہے کہ جس وقت وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو ہر رخ پر پسپا کیا جا رہا تھا اور ان کے بچوں کو کفر ساز نصاب کی تعلیم دی جا رہی تھی اس وقت مولانا اکبر آبادی مسلمانوں کو یتیم چھوڑ کر کنیڈا چلے گئے کیونکہ اس کا انھیں معقول معاوضہ پیش کیا گیا تھا۔ جب کہ مولانا مودودی اور مولانا ندوی کو اخراجات سفر کے علاوہ ایک دھیلا بھی بطور معاوضہ نہیں پیش کیا گیا۔

پناہ بخدا! ہم ان میں سے نہیں جو ایسے طنز و طعن کو پسند کریں، لیکن مدیر برہان کو انصاف کرنا چاہئے کہ جب وہ بیٹھے بٹھائے طنز و طعن کے دفتر کھولیں گے تو مولانا مودودی یا دیگر علماء سے عقیدت رکھنے والے کسی اور مٹی سے تو بنے نہیں کہ ہونٹوں پر قفل چڑھا کر بیٹھ جائیں گے اور کوئی پتھر مدیر برہان کے شیش محل سے نہیں ٹکرائے گا۔ ولنعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

کمیونزم کے خدوخال

عثمان بطور چین کے قازق مسلمانوں کی داستانِ ہجرت، اشتراکیت کے بے پناہ جبر و تشدد کے سایۂ ظلمت میں مسلمانوں پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے ایک کہانی ایک تاریخ ایک قیمتی دستاویز۔ سوا روپیہ۔

چین کے مسلمان کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف چار آنے۔

سرخ چین سے فرار اشتراکی ممالک اپنے دعوے کے مطابق جنت میں ہیں، مگر ایسی جنت جہاں بیڑیوں، تازیانوں، جلادوں اور شعلوں کے سوا کچھ نہیں۔ خوب ہے یہ جنت جس سے بھاگنے کے لئے لوگ اپنا جان و مال سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ خیر آپ یہ کتاب پڑھیئے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

اور یانگسی بہتا رہا ذرا دیکھو۔ وہ کروڑوں خمیدہ کمر انسانوں کی قطار جو بے معنی جد و جہد کا بے تحاشا بوجھ پشت پر لاد لئے جانوروں کی طرح چلی جا رہی ہے ہر آن ان میں سے کتنے ہی بدنصیب تھک کر گرتے ہیں اور دم توڑ دیتے ہیں۔ یہ چین ہے۔ جبر و استبداد کا ایک وسیع و عریض جیلخانہ۔ پڑھیئے یہ حقیقت افروز کہانی ضرور پڑھیئے۔ صرف ایک روپیہ

کمیونزم اور کسان کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بیشمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ ڈھائی روپے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں چھ ٹھوس عقلی و نقلی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی صفحات ۔۔۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

آزادی کا ادب بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ۔ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ مجلد تین روپے۔

ورکُٹا ایک بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز آپ بیتی جس سے روس کے جبری محنت کے ظالمانہ نظام کا بھیانک منظر سامنے آتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

آزادی کی طرف ایک بڑے روسی افسر کی خود نوشت سوانح۔ جس نے امریکہ میں پناہ لی یہ بیحد دلچسپ لیکن عبرتناک کتاب روس کے حقیقی حالات سے متعارف کراتی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کمیونزم کے حسین نعروں اور مصنوعی دعووں سے کبھی دھوکا نہیں کھائیں گے

مجلد تین روپے

پتھر کے دیوتا چھ آپ بیتیاں۔ دلچسپ، سبق آموز اور لائق مطالعہ۔ جن سے کمیونزم کے متعدد گوشے روشنی میں آتے ہیں۔ ایک روپیہ۔

سوویٹ روس کی حقیقت اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ روس کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کی سچی تصویر۔ عبرت ناک اور تحیر خیز۔ دو حصوں میں مکمل دو روپے۔

لینن انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔

ایک روپیہ

ادب میں ترقی پسندی کمیونزم ادب و ثقافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے۔ ؟ اس کا مستند جواب۔ یہ کتاب اپنی اہمیت کی بنا پر متعدد ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ قیمت ۔۔۔

عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

حُسنِ اَخلاق

(۲)

عن ابی هریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال :- انما بُعثتُ لاتمم صالحی الاخلاق (اخرجه البخاری فی الادب المفرد و احمد والحاکم)

ترجمہ :- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ پاکیزہ و محمود اخلاق کی تکمیل کردں۔

تفہیم :-

جیسا کہ اس باب کی تمہید سے واضح ہوچکا یہ حدیث [illegible]ی تصریح کرتی ہے کہ اسلام میں "اخلاق" کا مفہوم [illegible]ں مفہوم سے زیادہ وسیع ہے جس کے لئے یہ لفظ عام طور پر [illegible]ستعمل ہے۔ اللہ کے رسول نے جن اعمال وعقائد کی تلقین کی [illegible]ن سے روکا چاہے وہ اصطلاحی عبادات کے دائرہ کے [illegible]ل چاہے سیاست واقتصاد و صنعت وتجارت کے [illegible]ن کا تعلق اخلاق ہی سے ہے۔

اتمام کسی ایسی شے کی تکمیل کو کہتے ہیں جو پہلے سے [illegible]مکمل شکل میں موجود ہو۔ معلوم ہے کہ تمام ہی آسمانی مذاہب [illegible]کیزہ اخلاق کی تعلیمات پر مبنی رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ آفاقی [illegible]ر دائمی نہیں تھے اس لئے ان کے نظامِ اخلاق کو بھی اللہ [illegible]الی نے اس درجہ کمال کو نہیں پہنچایا تھا جتنا کسی آفاقی [illegible]بدی مذہب کے نظامِ اخلاق کو ہونا چاہئے۔ اصلاً یہ تمام [illegible]اہب بھی اسلام ہی تھے۔ اسلام سپردگی اور تسلیم وانقیاد

کو کہتے ہیں۔ اللہ نے جو مذہب بھی جس وقت نازل کیا اس کا اصطلاحی نام چاہے نصرانیت رکھ لیا گیا ہو یا یہودیت لیکن اللہ کا مطالبہ یہی تھا کہ اللہ کے بندے خود کو مرضیاتِ الٰہی کے تابع بنا دیں اور اس اخلاق کو اختیار کریں جو اللہ کو پسند ہے۔

لیکن اصطلاحاً اسلام صرف اسی دین کا نام ہے جو آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے دنیا کو ملا اور یہ چونکہ ہر اعتبار سے مکمل، ابدی اور ہمہ گیر تھا اس لئے اس میں پچھلے مذاہب کے محاسنِ اخلاق کو بھی سمو دیا گیا اور جن تکمیلی اضافوں کی ضرورت تھی ان سے مزین کر دیا گیا۔ اسی لئے یہ عظیم اعلان بھی فرمایا گیا

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	آج ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا تم پر اکمال فرما دیا اور ہم اس بات پر

دِيْنًا . . . .   راضی ہوئے کہ دین کی حیثیت

. . . . (مائدہ) . . . . .   سے تم اسلام ہی کو قبول کرو۔

اور فرمایا گیا

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ   دین اللہ کے نزدیک اسلام

الْإِسْلَامُ . . . (آل عمران)   ہی ہے۔

اور فرمایا گیا

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ   تو کیا لوگ اللہ کے دین کے علاوہ

وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي   کوئی دین ڈھونڈتے ہیں حالانکہ

السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا   اسلام اختیار کئے ہوئے ہے

وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ   (اطاعت و فرمانبرداری) ہر وہ

يُرْجَعُوْنَ ۔   شے جو آسمانوں اور زمین میں

+ + + + +   ہے، خوشی سے یا با دل ناخواستہ

+ + + + +   اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

اور فرمایا گیا

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ   اور کوئی شخص سوائے اسلام کے

دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔   کسی دین کو پسند کرے تو اللہ کی

+ + + + + +   بارگاہ میں وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا۔

ان آیات کا ربط دیکھیے تو حسن اخلاق کے باب سے کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی یکتائی اور ناگزیر حیثیت کو ختم کرنے کے لئے بظاہر فریب پروپیگنڈہ بھی زور شور سے کیا جا رہا ہو کہ سبھی مذاہب حق ہیں کیونکہ سبھی کا مقصود خالق کی عبادت اور قلب و روح کا تزکیہ ہے —— تو یہ بات ضروری ہے کہ ان آیات کو ہم اکثر و بیشتر دہراتے رہیں اور تمام دینوں کی یکساں حیثیت کے لغو و باطل پروپیگنڈے سے ہمیں علی وجہ البصیرت بیزاری قائم رہے۔

ذرا سوچیے تو ایک محدود و منتشر چیز کو وسیع تر اور مربوط و مکمل کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ ایک رسول بھیجتا ہے۔ ایک کتاب نازل کرتا ہے اور اہتمام کی انتہا یہ ہے کہ اپنی نازل فرمودہ پچھلی کتابوں کے برخلاف اس کی حفاظت کا بھی ذمہ فرماتا ہے۔ پھر یہ رسول طویل عرصے تک آخری مکمل ترین دین کی تبلیغ و ترویج میں ایسے اسوۂ کریمانہ، ایسی سیاست و تہذیب، ایسی امامت و قیادت کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ عالم میں موجود نہیں۔

اب اگر کچھ لوگ اس آخری کامل ترین دین کو اختیار کرنے سے گریز کرتے ہوئے پچھلے کسی دین سے لپٹے رہتے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ ان کی دانست میں خالق و مالک کا مذکورہ فعل عبث ہی رہا۔ خالق تو کہے کہ مکمل اور لائق پذیرائی شے میں اب تمہیں دیتا ہوں لیکن ہم کہیں نہیں صاحب آپ کی یہ شے اور ہماری ناقص شے یکساں ہی ہے۔ ہمارا مقصود بہرحال آپ کی خوشنودی ہے اس لئے آپ پر لازم ہے کہ جس دین کو بھی ہم اختیار کریں اسے وہی قدر و قیمت دیں جو اسلام کو دے رہے ہیں! —— العیاذ باللہ۔

حدیث باب یہ نکتہ بھی ابھارتی ہے کہ پچھلا کوئی بھی دین صرف اسی لئے لائق پرہیز نہیں ہے کہ اس کی کتابوں میں رد و بدل کر دیا گیا ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہا ہے بلکہ اس لئے بھی لائق پرہیز ہے کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں ناتمام ہے۔ اگر انجیل و توریت جوں کی توں موجود رہتیں اور قرآن کی طرح ان کا بھی کوئی شوشہ نہ بدلا جاتا تب بھی نزول قرآن اور بعثت محمدی کے بعد اسلام ہی کو اختیار کرنا امر لازم ہوتا دین کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ خالق و مالک جس عقیدہ و عمل کو پسند کرے اسے اختیار کر لو۔ اور جسے ناپسند کرے اس سے دور بھاگو۔ انجیل، توریت اور زبور اپنے اپنے زمانوں میں محض ایک ذریعہ رہی ہیں یہ جاننے کا کہ کسی فرد یا قوم کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کیا ہیں۔ بعد میں قرآن نازل ہوا تو یہ بھی اسی طرح ایک ذریعہ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور تعلیمات خدا کی پسند و ناپسند کے جاننے کا ذریعہ ہیں۔ جب صریح و محکم الفاظ میں یکسر [illegible] ساتھ

بتا دیا گیا کہ اب [illegible] اسلام ہی کو قبول کرنا
بندوں کا فرض ہے۔ اگر وہ اسلام کے سوا کسی دین کو قبول
کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ پھر اس سے
بڑھ کر بیہودہ اور نامعقول بات کیا ہو سکتی ہے کہ کسی اور
دین کو اختیار کرنا بھی اتنا ہی درست سمجھا جائے جتنا اسلام
کو اختیار کرنا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ حاکم وقت کے تازہ احکام
کو تو آپ نہ مانیں اور رٹ یہ لگائے جائیں کہ پچھلے منسوخ شدہ
قوانین ہی ہمیں پسند ہیں۔ حاکم کہے کہ ہرگز نہیں — تازہ
قوانین ہی تمہیں قبول کرنے ہوں گے ورنہ ہم تمہیں باغی
اور سرکش قرار دیں گے۔ آپ کہیں کہ نہیں صاحب تازہ
قوانین کو نہ ماننے اور پچھلے ہی قوانین کو سینے سے لگائے رکھنے
پر بھی آپ ضرور ہم سے خوش ہوں گے۔ آپ ضرور ہمیں
انعام دیں گے۔ آپ کے حکم سے سرتابی کر کے بھی ہم وفادار
ہی کہلائیں گے۔ بغاوت و سرکشی کا الزام ہم پر عائد
نہیں ہوگا۔

اگر یہ مضحکہ خیز موقف کسی کا ذہن قبول کر سکتا ہے
تو شوق سے وہ ہر دین کو باعثِ نجات سمجھے۔ لیکن اگر اس کو قبول
کرنا بغیر دھاندلی اور بے عقلی کے ممکن نہیں ہے تو پھر تنہا وہی
دین واجب القبول رہ جاتا ہے جس کی یکتائی کا صریح بیان
مذکورہ آیت میں ہوا ہے اور جس کے بارے میں حدیث مذکورہ
بتا رہی ہے کہ وہ محاسن اخلاق کا ایک مکمل ترین مجموعہ ہے
جو شخص اسے نظر انداز کر کے کسی اور دین کو قبول کرے گا وہ
مکمل کو چھوڑ کر نا تمام اور کامل کو چھوڑ کر ناقص چیز قبول
کرے گا۔

ہو سکتا ہے کسی کے دل میں خیال گزرے کہ قدرے
ناقص شے بہرحال کچھ نہ کچھ افادیت تو رکھتی ہی ہوگی۔ جتنا
اس میں نقص ہے اسی کی مناسبت سے نفع میں کمی آ سکتی
ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ اسلام سے ناقص شے کی افادیت
سے بالکل [illegible]
امکان ہی ختم کر دیتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو بعض نسخوں میں ایک یا چند
ہی اجزاء ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے اجزاء کے ضرر رساں
خواص کو مغلوب کر کے مفید خواص کی کارفرمائی کا موقع بہم
پہنچاتے ہیں۔ آپ کسی حکیم ڈاکٹر سے مل کر تحقیق کریں۔ کتنے ہی
نسخے ایسے نکلیں گے جو بعض مہلک امراض میں مفید ہیں لیکن
ان کی یہ پوزیشن نہیں ہوگی کہ انھیں اگر ناقص حیثیت میں
استعمال کر لیا جائے تو تھوڑا بہت فائدہ پھر بھی حاصل ہو۔
اس کے برخلاف بعض نسخوں میں صرف ایک یا دو دوائیں
ہی ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انھیں نسخے سے خارج کر دیا جائے
تو نسخے کا مزاج ہی تبدیل ہو جائے اور فائدے کی بجائے
وہ ضرر رساں ثابت ہو۔

سائنسی تحقیقات نے یہ حقیقت بڑے وثوق کیساتھ
واضح کر دی ہے کہ کسی فارمولے کا جو مزاج اور اثر اس کی
مکمل شکل میں ہوتا ہے اس کا خاتمہ فارمولے کے صرف ایک
ادنیٰ سے جز کو کم کر دینے پر بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض فارمولے
ایسے ہیں جن کے متعدد اجزاء و عناصر سے مطلوبہ نتائج حاصل
کرنے کا مدار کسی ایک یا دو اجزاء پر ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ اجزاء
نہ شامل کئے جائیں تو نتائج بالکل الٹے بھی نکل سکتے ہیں اور
تریاق زہر بھی بن سکتا ہے۔

دوسرے پچھلی تمام آسمانی کتابوں میں تبدیلیاں
ہو چکی ہیں۔ یہ یقین کرنا سخت مشکل ہے کہ ان کا کون سا حصہ
آسمانی ہے اور کونسا تحریف زدہ۔ اس صورت میں اگر یہ
بھی اطمینان محال ہے کہ جس نا تمام مجموعے کو ہم دین خیال
کر رہے ہیں وہ فی الاصل ایسا ہے بھی کہ اس کے اجزاء کو
دین کے اجزاء کہا جا سکے۔ نسخے کی دس دواؤں میں سے دو کم کر کے
باقی آٹھ کا مکسچر بنا لیجئے تو اسے ناقص کہیں گے۔ لیکن اگر باقی
آٹھ کے بارے میں بھی یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو [illegible]

یا نقلی۔ یہ وہی ہیں جو مطلوب ہیں یا ان کے دھوکے میں محض اور ہی گھانس پھونس جمع کئے بیٹھے ہیں تو پھر نقص سے بڑھ کر بات خطرناک اشتباہ اور فریب خوردگی کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کسی قانون و دستور کی پچاس دفعات کو آپ تسلیم کر لیں مگر صرف ایک دفعہ سے انکار کر دیں تو آپ باغی قرار پائیں گے۔ اور اگر آپ اس بنیاد ہی کو تسلیم نہ کریں جس پر دستور کی عمارت کھڑی کی گئی ہے تو پھر آپ کامل طور پر منکر دستور قرار پائینگے چاہے آپ دستور کی بعض دفعات سے اتفاق رکھنے کا اعلان پر اعلان ہی کرتے رہیں۔ یہی حال اسلام کا بھی ہے وہ اس شخص کو کلی طور پر کافر قرار دیتا ہے جو اسلامی دستور کی اس بنیاد سے انحراف اختیار کرے کہ پسندیدہ وہ ہے جسے خدا پسندیدہ قرار دے اور برا وہ ہے جسے خدا برا ٹھیرائے اس بنیاد سے انکار کرنے کے بعد آدمی اگر سراپا زہد و ورع بن جائے تب بھی وہ کافر ہی رہے گا، کیونکہ اس کے زہد و ورع کی بنیادیں جذبۂ اطاعت پر نہیں، خود سری پر ہیں۔

الحاصل حدیث بالا کا تجزیہ یہ ہے کہ گذشتہ مذاہب میں پاکیزہ اخلاق کے جو اجزاء تھے انھیں اللہ نے اسلام میں جمع کر دیا ہے اور جس اضافے، جس زینت و آرائش اور جس تہذیب و تکمیل کی ضرورت تھی اس سے بھی اسلام کو آراستہ فرما دیا ہے۔ اب اللہ کی رضا حاصل کرنے کا واحد —— قطعی طور پر واحد راستہ اسلام کا راستہ ہے۔ اکیلا —— لاشریک کا راستہ۔

یہ ملحوظ رہے کہ اقوام عرب قبل اسلام بھی متعدد اخلاقی اوصاف میں نہایت ممتاز تھیں۔ مہمان نوازی، پاس عہد دوستداری، شجاعت وغیرہ میں ان کا جواب نہیں تھا لیکن پچھلے مذاہب کی تعلیمات جتنی جتنی محو اور مسخ ہوتی گئیں جہالت اور بد اخلاقی اتنی ہی اتنی ان میں راہ پاتی گئی، بعض اعلیٰ اخلاق اگرچہ جوں کے توں موجود رہے لیکن بہت سے رذائل نے بھی راہ پالی اور ان کی زندگی بہترین اور بدترین اخلاق کا ملغوبہ بن گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ محاسن اخلاق کو مزید تقویت حاصل ہو اور برے اخلاق مٹا دیئے جائیں۔

تکمیل اخلاق کا جہاں یہ مطلب ہے کہ بعض نئی اخلاقی قدریں عطا کی جائیں اور بعض نئے آداب و مراسم سے آشنا کیا جائے وہاں تکمیل اخلاق کا مطلب یہ بھی ہے کہ مذموم اخلاق کی نشاندہی کر کے انھیں ختم کیا جائے۔ اچھے اخلاق کے ساتھ برے اخلاق کا موجود ہونا ایسا ہی ہے جیسے مریض مفید دواؤں کے ساتھ بد پرہیزی بھی کرتا ہے۔ دوا کتنی ہی اکسیر ہو لیکن اس میں نقصان دہ اجزا بھی شامل کر لئے جائیں یا اس کے ساتھ ضرر رساں غذاؤں کا بھی استعمال ہو تو نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جہاں محاسن اخلاق کے بعض ترقی یافتہ آداب عطا کئے وہیں بُرے اخلاق کی بیخ کنی بھی فرمائی تاکہ محاسنِ اخلاق اپنے حقیقی اثرات و ثمرات پیدا کریں گویا ترقی یافتہ اخلاقی قدریں عطا کرنے کا مثبت کام اور برے اخلاق کی بیخ کنی کا سلبی طرز عمل —— دونوں ہی "اتمام اخلاق" کے اجزاء ہیں۔

ہماری اس تطویل کا منشاء در اصل اس پہلو کو واضح کرنا ہے کہ اسلام صرف ایک مثبت اور ایجابی ہی عمل نہیں منفی اور سلبی بھی ہے —— جو لوگ صرف معروفات کی تبلیغ اور فرائض و واجبات کی تعمیل میں مگن رہنے کو کافی سمجھتے ہوئے منکرات کی بیخ کنی اور [illegible] کی سرکوبی پر توجہ نہیں دیتے وہ اسلام [illegible]

ان کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو دوا تو اچھی تجویز کرے لیکن پرہیز کا سبق نہ دے۔ یا ان کی مثال اس شخص کی سی ہو جو تخم تو اچھا بوئے اور پانی بھی ڈٹ کر دے لیکن زمین کو روڑوں اور پتھروں سے صاف نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی ایک ایک نص صراحتہً یا اشارۃً یہ سبق دیتی ہے کہ محاسن اخلاق کو دانتوں سے پکڑنے کے ساتھ ساتھ ذمائم اخلاق اور منکرات و معاصی کو فروغ دینے والی طاقتوں سے بھی برسرِ پیکار رہنا برابر کا اسلامی فریضہ ہے۔ ہمارے زمانے میں خالص ایجابی ابلاغ و تبلیغ کو ایک سنجیدہ علمی طریق کہا جاتا ہے، اور باطل پر نقد و جرح کو عموماً انتشار پسندی اور فتنہ پردازی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے اس حد تک تو اتفاق ہے کہ نقد و جرح اشتعال تضحیک اور ترش و تلخ اسلوب پر مشتمل نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن اس سے اتفاق نہیں ہے کہ محض ایجاب و اثبات سے واسطہ رکھا جائے۔ مذموم و باطل نظریات و تصورات پر نشتر نہ لگائے جائیں۔ جس دین کا پہلا ہی کلمہ لا الٰہ سے شروع ہوتا ہو اس دین کا حقِ خدمت ادا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کا فریضہ بھی استقلال و قوت کے ساتھ نہ ادا کیا جائے۔ باغ لگانا ہے تو زمین کو روڑوں سے بھی صاف کرنا ہوگا۔ عمارت بنانی ہے تو کھنڈر کے در و بام ضرور ڈھانے ہوں گے۔ بنیادیں بھی کھودنی ہوں گی۔ باطل نظریات پر جرح و تنقید ایوانِ حق کی تعمیر کے لئے بنیادیں ہی کھودنے کے مرادف ہے۔ بغیر بنیادوں کے عمارت کھڑی کر دو گے تو کے دن چلے گی اور کتنی اونچی جا سکے گی۔

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

عشقِ رسولؐ

خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دور کے ایمانداروں نے جس طرح والہانہ پیار کیا تھا وہ تاریخ انسانیت کا ایک حسین ترین باب ہے۔

دنیا کی مختلف قوموں کی روایات میں عشق و محبت کی مختلف کہانیاں ملتی ہیں جن میں کسی خیالی ہیروئن کے ساتھ کسی تخیلاتی ہیرو کی بے پناہ محبت کی داستان سنائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ میں عشقِ رسولؐ کا ایک ایسا ٹھوس تاریخی واقعہ اور ایسی تحیر انگیز سچی کہانی ملتی ہے جہاں ایک مرد کی عظیم ترین شخصیت مردوں عورتوں اور بچوں تک کے سینے میں ایک انتہائی مقدس عشق کا سیماب کوٹ دیتی ہے۔ جہاں جنسی کشش اور خد و خال کی حیوانی اپیل کی بجائے سیرت و کردار، حقیقت شناسی اور حق کوشی کا حسن و جمال ایک مرد کے وجود سے مقناطیسی سوتے کی طرح ابل پڑتا ہے اور ریگستان کے اجڈ وحشیوں کو مسحور کر کے حقائق پر پروانہ وار نثار ہو جانے کے لئے بیتاب کر دیتا ہے۔

خدا پرستی کے نور میں نہائی ہوئی یہ شخصیت روح و دل کے ان اندھوں کو بھی دکھائی دیتی ہے جن کو ان کا خدا نظر نہیں آتا۔ پتھروں کے جیسے پجاری بھی اس دل کش کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو فرطِ عقیدت سے سر دھننے لگتے ہیں اور کامل چالیس سال تک اس کو "امین و صادق" کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھنے لگتی ہیں۔ پھر جب انسانیت تک اپنا آخری پیغام پہنچانے کے لئے خدا نے [illegible] کو رسالت کے خلعت فاخرہ سے مشرف فرما دیتا ہے اور اس وقت کے کفار و مشرکین کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کو اس بلندی پر پہچاننے سے عاجز ہو کر قہر و انتقام کی آگ اگلنے لگتی ہیں ...... تو روشن ضمیر روحوں کے قافلے آگے بڑھتے ہیں "اور ہم تجھ پر نثار۔ ہمارے ماں باپ تجھ پر قربان!" کے والہانہ نعروں سے حرم کی فضائیں گونج اٹھتی ہیں۔

یہ نعرے کھوکھلے الفاظ نہ تھے بلکہ دلوں کی دھڑکنیں اور روحوں کی بیتاب چیخیں ان میں سمٹ آئی تھیں۔ یہ سپردگی و جاں نثاری کے نعرے آج بھی تاریخ کے سینے پر خونِ دل و جگر سے سرخ و تازہ نظر آتے ہیں۔

عرب کے پیدائشی غلاموں اور کچلے ہوئے پامال غریبوں کا ناتواں طبقہ جس کو دنیا نے اس کی تمام انسانی صلاحیتوں سے یکسر مایوس ہو کر جانوروں کی ذلیل سطح پر لا پھینکا تھا۔ دیکھا جب اس انسانؐ کے "فیضِ نظر سے" سرفراز ہوتا ہے تو تہذیب و انسانیت کے جوہرِ لطیف اور معاشرہ کے مکھن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نئی زندگی، نئے ایمان، نئے مقصدِ حیات اور نئی لگن کے ساتھ اس جہاں نواز ہستیؐ کی طرف بڑھتا ہے تو ایک بار پھر ماحول کی قہرمانیت آڑے آنا چاہتی ہے اور اس کی راہ میں ظلم و استبداد کی آتشیں دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔ لیکن جو کارواں بڑھ نکلا تھا وہ کسی طرح نہیں رکتا۔ آگ کی بھٹیاں آتی ہیں لیکن خون، پسینے اور آبلوں کے پانی سے بجھ کر رہ جاتی ہیں — سنگ دہشت کی بوچھار ہوتی ہے مگر صبر و تحمل کی فولادی دیوار سے ٹکرا کر اینٹ اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔ خون سے چکاں [illegible] کیے جاتے ہیں لیکن حق کی آواز کا [illegible] سے پہلے [illegible]

رہ جاتے ہیں۔ اور یہ کاروانِ شوق خون، آگ اور پتھراؤ کے درمیان سے کشاں کشاں گزرتا ہوا اس نادر و نایاب انسانی شخصیت کے گرد عقیدت و حلقہ بگوشی کا اٹوٹ ہالہ بنا دیتا ہے۔

سماجی اعزاز اور دولت و ثروت کی بلندیوں پر متمکن حقیقت شناس لوگ فداکاری و جاں نثاری کا یہ حیرتناک منظر دیکھتے ہیں اور اس سنسنی خیز فضا میں اس انسان کاملؐ کی شخصیت سے مسحور ہو کر اپنی تمام مادّی سربلندیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اس کے قدموں پر آگرتے ہیں۔ اس طرح کمزور اور طاقتور کے انمٹ امتیازات چشم زدن میں محو ہو جاتے ہیں اور انسانیت کے آستانے پر غلام اور آقا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔

کتنا بیش بہا اور کس قدر دل نواز ہوگا وہ انسانؐ جو گلیم پوشانہ سادگی میں بھی اتنا بلند و پُرجلال نظر آتا تھا کہ تخت و تاج پر ایک نگاہِ غلط انداز سے زلزلے طاری کر دے سیم و زر کے جگمگاتے ہوئے خزانے اپنے قدموں کی خاک سے گہنا کر ماند کر دے اور انسانی رگوں میں دوڑتے ہوئے خونِ حیات کو اپنے نقوشِ پا سے اجاگر کرنے کے لئے رگ و پے سے ٹپک پڑنے پر بیتاب کر ڈالے — ہاں — اس نے یہ سب کچھ کیا — یہ شاعری نہیں — تاریخ ہے! وہ کونسی شے ہو سکتی ہے جس کو انسان دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو اور وہی شے اس انسان کاملؐ کے قدموں پر فرطِ شوق میں لٹا نہ دی گئی ہو؟ اس کی ایک نگاہِ کرم کی بھیک حاصل کرنے کے لئے لوگوں نے راہِ مولا میں گھربار لٹا دیئے — کفر و اسلام کے درمیان حق اور باطل کا خطِ امتیاز کھینچنے کے لئے شہ رگوں کا لہو نچوڑ دیا گیا — اولاد اپنے ماں باپ سے کٹ کر نکل گئی۔ ماں باپ نے چہیتی اولاد کی ساری چاہت خدا اور اس کے رسولؐ کی چاہ پر بھینٹ چڑھا دی تمام دنیائے رنگ و بو سے دامن چھڑا کر گوشت پوست کے انسان روح و قلب کی پکار پر دوڑ پڑے اور اسؐ کے پیوند در پیوند دامن سے اس طرح جا لپٹے جس طرح ایک معصوم بچہ تڑپ کر ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا ہو۔ دولت کے [illegible] لہ خزانوں کو خالی کر کے لوگوں نے اس بات میں عظیم مسرت فخر محسوس کیا کہ اس کے در کے بھکاری کہلائے جائیں۔ [illegible] کی فطری محبت مغلوب ہو گئی — لوگوں نے [illegible] میں سانس لینا گوارہ نہ کیا جہاں اس انسان کاملؐ کے خلا[ف] نفرت و انتقام کا زہر سرایت کر گیا تھا، اپنے کاروبار — عزیز و اقربا — دوست و احباب اور تمام تر [illegible] کی "جنت" کو ٹھکرا کر ان محمدؐ کے دیوانوں نے خانہ ویرانی اور خانہ بدوشی کے خارزاروں کو لبیک کہا، دشت و صحرا کی خاک چھانی اور دلیس دلیس کی ٹھوکریں کھائیں — اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ محمد عربیؐ کی حسین نگاہ نے ان کے سینوں میں حق و صداقت کی جو چنگاری روشن کر دی تھی وہ بجھانے نہ پائے۔

پھر یہ سب کچھ لٹا دینے کے بعد امتحان شوق کی وہ آخری گھاٹی آئی جہاں خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو قربان کر دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو عقیدت و شوق کے ان بیتاب پیکروں نے آبدار خنجروں پر گردنیں رکھ دیں۔ اپنے خون میں نہا نہا کر وہ یہی کہتے رہے "اے خدا کے رسول! ہم تجھ پر نثار — ہمارے ماں باپ تجھ پر نثار!!" زخموں سے چور اور جراحتوں سے چھلنی اجسام ایک اس سے بھی کاری گھاؤ کھانے کے لئے سپردگی کی لذت میں جھومتے ہوئے بڑھتے تھے ستّر ستّر زخموں کا "تاریخی اسکور" بنانے کے بعد بھی شہادتِ حق کا خوں چکاں کھیل کھیلنے والے اپنے ذوقِ جانبازی میں کمی نہ پاتے تھے۔ جو آنکھ ترچھے تیوروں سے محمد عربیؐ کی طرف اٹھی وہ فولادی ڈھالوں کے پیچھے بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ جو ہتھیار اس کے خلاف اٹھے جان دینے والوں نے ان کے آگے جسمانی گوشت کی دیواریں کھڑی کر دیں جن پر سیکڑوں [illegible] ترکش خالی کئے گئے مگر اس دیوار میں جنبش نہ ہوئی۔ [illegible] کی طرف سے تیروں کی باڑ چلتی تھی تو ادھر عقیدت کے متوالے برہنہ سینے کھولے ہوئے سامنے آتے تھے۔ ادھر سے [illegible] کی آندھیاں اٹھتی تھیں تو ادھر سے حق [illegible]

وجد کرتے ہوئے سر ابھرے تھے۔

کتنا طاقتور ——— کتنا جلال آمیز ——— کتنا مستحکم تھا یہ "عشقِ رسول" کہ زمانے بھر کی نفرت بھری طاقتیں مل کر بھی اس کو زیر نہ کر سکیں۔ آخر آخر یہ عشق ——— یہ "جنوں" ہی فاتح رہا۔ محمد عربی کی سچائی کا حسن و جمال جزیرہ نمائے عرب پر چھاتا چلا گیا۔ ماحول کا نقشہ بدل گیا انسانیت کی کایا پلٹ گئی اور جو انسان کامل انسانیت سوز دنیا میں خدا اور انسان کا نام لیتا ہوا تنہا اٹھا تھا اس نے ۲۳ سال کے بعد بستر وفات سے اس دنیا پر نگاہِ واپسیں ڈالیں تو ایک لاکھ سے زیادہ انسانی سر خدائے واحد کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے تھے۔ کیا دنیا نے کبھی بھی کسی انسان سے اتنا والہانہ پیار کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں ——— تو پھر یہ ماننا ہی پڑے گا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے محمد عربی نے اپنی آخری رسالت کا جو دعویٰ کیا تھا وہ ایک زبردست حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا ایک عدیم النظیر واقعہ بھی تھا، ایسا واقعہ جو ان گنت صدیوں اور قرنوں پر پھیلی ہوئی اس دنیا میں صرف ایک ہی بار پیش آنا تھا ——— صرف ایک ہی بار!۔

لیکن ٹھیریئے! ———

دنیائے کفر ——— دنیائے شرک اور دنیائے دہریت کے سامنے یہ تاریخی للکار بلند کرتے ہی ایک دوسرا سوال فوراً ہی پیدا ہوتا ہے ——— "آج سے چودہ سو سال پرانے انسان نے حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں حق و صداقت کو چشم سر سے دیکھا تھا اس کو آج کا انسان کہاں اور کس طرح دیکھے؟ ——— تاریخ ایک واقعہ کی یاد دلا سکتی ہے ——— ایک احساس ——— ایک تصور ہی دے سکتی ہے، مشاہدہ نہیں!" ———

دنیا کو ماضی کے اس تصور کا مشاہدہ کرانے والے ہم تھے ——— ہم، کہ خود کو مسلمان کہتے ہیں! لیکن یہ آئینہ آئینہ ہوتے ہوئے بھی شقاوتِ قلب، بےحسی اور آخرت فراموشی کی زنگ آلود تہوں میں دبا پڑا ہے۔ جس میں ہمیں تو اپنی بگڑی ہوئی شکل بھی نظر نہیں آتی! کیا دنیا اس آئینہ میں رسالتِ محمدیؐ پر کسی زندہ گواہی کو آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے؟ کیا ہم مسلمان ہیں؟۔

سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

عکاظ کے تاریخی بازار میں "انسانیت" نیلام ہو رہی تھی! انسان ہی سوداگر تھے۔ انسان ہی خریدار تھے۔ اور انسان ہی کا سودا ہو رہا تھا ——— ایک معصوم و بے گناہ ننھے سے انسانی جسم کا سودا، جس کا نام زید تھا۔

زید یمن کے ایک شاندار قبیلے بنی قضاعہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے باپ حارثہ اور ان کی ماں سُعدیٰ کے پیار نے ان کو دنیا کے سرد و گرم کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ زید نے انسان کی بے لوث چاہت ہی دیکھی تھی جانوروں کی سی خون آشامی نہیں ——— وہ محبت ہی سے واقف تھے۔ نفرت کے معنی انھیں معلوم نہ تھے۔

لیکن حالات نے ہولناک پلٹا کھایا۔ اور انسانیت کی خود غرضی و نفرت کا تاریک پہلو پوری ہولناکیوں کے ساتھ ان کے سامنے آگیا۔

بنی قین کے خونخوار ڈاکوؤں نے بنی قضاعہ کے اوپر تاخت کی اور لوٹ کے بےجان ساز و سامان کے ساتھ جاندار بچے کو بھی ممتا کے سینے اور باپ کے شفیق سائے سے دور گھسیٹ لائے۔ بچہ گوشت پوست کے مرکز سے کٹتا ہوا بچہ شدت درد سے بلبلا اٹھا۔ اس کا ننھا سا دل شق ہونے لگا۔ کلیجہ پھٹنے لگا لیکن پہلی بار اس نے دیکھا کہ دردناک پکار کا جواب بے رحمانہ ٹھوکر سے دیا جا رہا ہے۔ ان کی فریاد سن کر ڈاکو ان کی طرف دوڑے اور ایک بھرپور تھپڑ سے کومل رخساروں کو تمتما دیا۔ نفرت کی یہ چوٹ کھا کر معصوم آواز سہم گئی۔ گناہوں کی خشونت سے مسخ بشروں، دلوں کی سیاہی سے لتھڑے ہوئے چہروں، آتشیں آنکھوں اور پتھریلے دلوں کے نرغے میں زید کو "انسان" کا پہلا تجربہ ہو رہا تھا۔ کیسا تند و تیز! ——— کڑوا ——— زہر

اور آنکھ دینے والا تجربہ! ۔

پھر بکا زید کے بازار میں انسانوں کی دوسری ٹولی لگائی گئی۔ ان سب کی شکل آدمیوں کی سی تھی مگر یہ لوگ آدمی تھے اس کے درد کو نہ پہچانتے تھے۔ ان کی ان گنت آنکھیں زید ہی کو گھور رہی تھیں۔ زید کے گوشت پوست، تن و توش اعضا کی ساخت اور طاقت و توانائی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا اور ناپا جا رہا تھا تاکہ جسم میں انسانی غلامی کا بوجھ ڈھونے جیسی صلاحیت پائیں ویسے ہی دام لگائیں۔ لیکن کیسی تھیں یہ آنکھیں جو زید کے پورے وجود میں گھسی جاتی تھیں لیکن ان کا خونچکاں مجروح سینہ ان کو کسی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکوؤں کی بولی پر سب ہی گوش برآواز تھے اس مظلوم بچے کی خاموش فریاد کسی نے نہ سنی! ۔

"تم کون لوگ ہو آخر؟"

زید کی روح اجنبیت و دحشت کے بوجھ تلے ہانپتی ہوئی اٹھی "تم کون ہو؟ ـــــ تم آنکھوں والے ہو کر بھی بے نئے اندھے ہو ـــــ کانوں کے باوجود میری تڑپ نئے بہرے ہو ـــــ تم سب میرے باپ کی ہم شکل ہو تمہیں ایک لٹے لٹائے کمزور بچے پر ذرا پیار نہیں آتا! ۔ ڈاکوؤں کے ساتھی ہو ـــــ تم ظالموں کے ساتھی ہو مظلوم پر تمہیں ترس کیوں نہیں آتا؟ ـــــ تمہیں ظلم سے نفرت کیوں نہیں ہوتی؟"

مگر روح کی یہ درد بھری پکار کون سنتا! جن کانوں تک خدا کی آواز نہ آئی ہو وہ انسان کی آواز کہاں سن سکتے لٹیروں کے بعد آدمی کے خریدار کی بھیڑ میں "انسان" کی یہ زید کا دوسرا تجربہ تھا۔ ویسا ہی ہمت شکن اور روح فرسا جیسا پہلا! ـــــ نہیں بلکہ پوری انسانیت سے مایوس کر دینے والا یاس آفریں تجربہ!! ۔

آخر نیلام کی آخری بولی حکیم بن حزام نامی خریدار نے دی اور انسان فروشی کا یہ صبر آزما مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ حکیم بن حزام زید کو لئے ہوئے مکے کی شریف اور متمول خاتون اپنی پھوپی حضرت خدیجہ کے گھر پہنچے اور غلام کو ان کے حوالے کر دیا۔ [illegible] تقدیر الٰہی نے زید کو اس حسین راہ پر لگا دیا جہاں سے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس پناہ میں پہنچنا تھا۔

حضرت خدیجہ کے سائے میں آکر زید نے اطمینان کا پہلا سانس لیا۔ لیکن ماضی کی دکھ بھری یاد نے یہاں بھی ان کی روح کو چین نہ لینے دیا۔ حضرت خدیجہ کی فطری شرافت نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا تھا کہ ان کے "درد" کو پہچان لیا تھا۔ مگر اس درد کے درماں کی کھوج ابھی تک باقی تھی۔ نفرت و گناہ کی ٹھوکروں میں گھائل ہونے کے بعد شرافت و اخلاق کی اس نئی دنیا میں زید کی روح کو آرام تو مل گیا تھا مگر سکون نہیں۔ گمشدہ ماں باپ کا خلا کسی طرح پُر نہ ہوتا تھا۔ اندر ہی اندر سلگتی ہوئی روح ایک ایسے مرہم کے لئے تڑپ رہی تھی جو دل و جگر کے زخموں کو مندمل کر سکے۔

خود حضرت خدیجہ کا یہ حال تھا کہ وہ بیوگی کے دن گزار رہی تھیں۔ لیکن نکاح کے بڑے سے بڑے پیغام کو قبول نہ کرتی تھیں۔ مالداران سے شادی کے متمنی تھے۔ قبیلوں کے سرداران کو اپنی شریک زندگی بنانے کا خواب دیکھتے تھے مگر خدیجہ کو نہ اس سرداری سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ دولت کی جھنکار میں کوئی کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ تو جوہر انسانیت کی جویا تھیں۔ وہ ایک ایسے عظیم انسان کی منتظر تھیں جو دولت دل کا بادشاہ اور اخلاق و انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے کا سربراہ ثابت ہو سکے۔ اس طرح مالکہ اور غلام ـــــ خدیجہ اور زید دونوں ہی "انسانیت" کو ڈھونڈ رہے تھے۔

آخر یہ "انسان" محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہوا۔

وہی خاتون مکہ جو بڑے بڑے لکھ پتی سرداروں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں انسانیت کے اس جوہر لطیف کے آگے خود ہی جھک گئیں اور خود ہی ہمہ تن سوال بن کر آگے بڑھیں۔ حضور سے شادی کے بعد خدیجہ اب اس گھر میں داخل ہوئیں جس کو بہت جلد حرم نبوی کے روحانی قصر میں تبدیل ہونا تھا ان کے ساتھ زید بھی اس انسان کامل کی غلامی میں [illegible]

جس کی غلامی نے سارے ... کی [illegible] بدلنے والی تھی۔

حضورؐ کی قربت میں آتے ہی زید بن حارثہ کی غمناک روح جیسے غشی سے چونک اٹھی!۔

انھیں محسوس ہوا کہ وہ بالکل نئی ـــــــ بالکل مختلف ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیئے گئے ہیں جہاں صرف ایک ہی "انسانؐ" بستا ہے جس کو مکہ والے فرطِ عقیدت میں اس کا نام لینے کے بجائے کبھی "امین" کبھی "صادق" کہہ کر پکارتے ہیں۔

"کیسا عجیب و غریب ہے یہ انسان!" زید نے سوچنا شروع کیا" جو اپنے خدمت گار کی خدمت کے لئے بےچین رہتا ہے!۔ جو کمزوروں پر خدائی کرنے کے بجائے ان کو خدائے حقیقی کی قیمتی امانت سمجھتا ہے۔ جب نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے ساری دنیا کی محبت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔ جب بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی دل جگر پر معطر شبنم ٹپکا رہا ہو جب مسکراتا ہے تو دل ہر غم کو بھول جاتا ہے اور زندگی ایک نامعلوم لذت سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتی ہے ـــــــ جو اس طرح بات سنتا ہے جیسے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہا ہو! اس کے سینے میں میرے باپ کا درد بھرا دل بھی ہے اور میری ماں کی مامتا بھی! نہیں! وہ تو اس سے بھی زیادہ کوئی شے ہے! اس کو دیکھ کر تو دل پکار اٹھتا ہے" میرے والدین نثار ہوں تجھ پر"

یہی وہ انقلاب کا نیا موڑ تھا جہاں زیدؓ نے محسوس کیا کہ کوئی چپکے چپکے ان کا دل خرید رہا ہے! ان کو عکاظ کے بازار میں اپنے جسم کے خریدار یاد آئے اور خوف و دہشت سے جھرجھری آ گئی ـــــــ انھوں نے اپنے روح و دل کے خریدار ـــــــ آقا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو ان کے بندۂ بےدام ہو جانے کا احساس سپردگی اور کیف کا نشہ بن کر ان کے پورے وجود پر چھا گیا ـــــــ دونوں نیلام کتنے مختلف تھے۔ اب تک انھوں نے جن انسانوں کو دیکھا اور برتا تھا یہ نیا انسانؐ ان سے کس قدر الگ، کتنا اونچا اور کیسا دل کش تھا!۔

آخر میں انسانی جاذبیت کا راز سربستہ حل ہونے کا وقت آیا ...

غارِ حرا کی تنہائی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کے فرشتے جبرئیلؑ نے ملاقات کی اور خیر و شر کے آخری فیصلہ کن معرکے کی ذمہ داریاں آپ کے شانوں پر آ گئیں ـــــــ ایمان کی روشنی میں زیدؓ نے پہلی بار اس عرفانِ حقیقت کے ساتھ دیکھا کہ محمد عربی کی شخصیت میں ماں باپ کے خالق خدا کا لافانی پیار عکس فگن تھا، دل کی نامعلوم کشش عرفانِ حق کے وجد انگیز سرور میں ڈھل گئی۔ سپردگی نے یقین و جاں نثاری کا روپ دھار لیا اور زید پروانہ وار شمعِ رسالت کا طواف کرنے لگے۔

دور ـــــــ یمن کی فضاؤں میں زیدؓ کے والدین اپنے گمشدہ لال کے لئے سالہا سال سے تڑپ رہے تھے کہ یکایک مکے سے آنے والے ایک یمنی نے ان کو یہ خوشخبری سنائی کہ تمہارا زیدؓ محمدؐ عربی کے پاس زندہ و سلامت موجود ہے۔ یہ خبر سن کر ماں باپ خوشی کی شدت سے رو پڑے اور فوراً ہی حارثہ اپنے بھائی کعب کو لئے ہوئے حضورؐ سے زید کی بھیک حاصل کرنے کے لئے کشاں کشاں مکے میں داخل ہوئے۔

"لوگو! ہم محمدؐ سے ملنا چاہتے ہیں" انھوں نے بیتابانہ سوال کیا۔

"محمدؐ اس وقت مسجد میں ہیں" جواب ملا۔ حارثہ اور کعب مسجد میں پہونچے اور خدا کے رسولؐ سے التجا کی:۔

"اے عبداللہ کے بیٹے! ـــــــ اے عبدالمطلب کے پوتے!! اے اپنی قوم کے سردار کے بیٹے!!! آپؐ حرم کے رہنے والے اور اس کے پڑوسی ہیں۔ آپؐ بےکسوں کی مدد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم آپؐ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ ہمارے بیٹے کو آزاد کر کے احسان کیجئے۔ اگر آپ کوئی معاوضہ چاہیں تو بڑی سے بڑی رقم پیش کی جائے"۔

یہ کس کی "رہائی" اور "آزادی" کی التجا ہو رہی ہے؟ ـــــــ کیا اسی زیدؓ کی جس کو نبی آخرالزماں کی غلامی کی برکت سے غیراللہ کی ہر غلامی سے نجات مل چکی تھی! جس زیدؓ کو رسولِ خداؐ نے زلوث خلوص اور آخری سچائیوں کے ذریعہ خرید لیا تھا کیا یہ لوگ اسی کو سونے اور چاندی کے مادی ٹھیکروں سے خرید لینے کی نادان حسرت میں مبتلا تھے؟ ہاں ـــــــ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا۔

اس پر اللہ کے رسولؐ نے سوال کیا کہ وہ کس غلام کی رہائی چاہتے ہیں؟ ۔

"تمہارا بیٹا کون ہے"؟ آپؐ نے دریافت فرمایا۔

دلی تڑپ اور بیتاب التجاؤں سے لبریز جواب ملا ....

زید! ....."

نوواردوں کو اندیشہ تھا کہ دیکھئے اس بار کیا جواب ملے؟

..... دو اجنبی انسانوں کی پکار پر ایک غلام کی بھیک ملنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہو سکتی۔ پھر یہاں تو ایک اس سے بھی زیادہ نازک سوال تھا۔ کیا ایک مومن زیدؓ کو ایمان سے محروم حارثہ کے حوالہ کیا جانا اسلام کے مفاد میں ہوگا؟ ۔ لیکن وہ ذاتِ گرامی جو اپنے پرائے کا غم کھانا خوب جانتی تھی ۔ نوواردوں کے خوف و اندیشے اور درد و کرب سے بیتاب ہو چکی تھی۔ آپؐ نے کمال درد کے ساتھ سوال کیا :۔

"کیا کوئی اور بھی کام ایسا ہے جس کو ہم تمہارے لئے انجام دے سکیں؟"۔

یہ سوال گواہ ہے کہ مانگنے والوں نے جس شدتِ درد سے مانگا تھا دینے والا اس سے کہیں شدید درد کے ساتھ اور سوال سے کہیں زیادہ دینے کے لئے بیتاب ہو چکا تھا۔

"نہیں! —— اے عظیم محسن! —— اور کچھ نہیں!!"

ممنونیت سے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں حارثہ نے جواب دیا

"ہم سے پوچھئے کہ آپ کا یہی احسان ہمارے لئے کیا کچھ ہوگا!"۔

ایک ساعت کے لئے حضورؐ نے کچھ سوچا، ایک طرف زید کے ساتھ آپ کی وہ دلی محبت تھی جس نے زید کو محبوبِ رسولؐ بنا چھوڑا تھا۔ دوسری طرف ایک باپ کی مجبورانہ فغاں تھی۔ جو اسی قیمتی شے کے لئے مچل اٹھی تھی۔ اپنے درد پر آپؐ نے پرائے درد کو ترجیح دی اور ایک دل گرفتہ آواز میں ارشاد ہوا:۔

"اچھا —— زیدؓ کو بلایا جائے ۔ وہ میری طرف سے آزاد ہے ۔ تم اپنے بیٹے کو لیجا سکتے ہو بشرطیکہ وہ خوشی سے جانا چاہے"۔

"بشرطیکہ وہ خوشی سے جانا چاہے" کے فقرے نے حارثہ اور کعب کو ...... [illegible] ہے کہ باپ اور ماں سے بچھڑا ہوا ایک "بیٹا" [illegible] ماں باپ کو سالہا سال کے بعد پا کر دوبارہ اپنی خوشی سے [illegible] کے لئے تیار ہو جائے؟ —— لیکن "تم اپنے بیٹے کو لیجا سکتے ہو" کا فیاضانہ اعلان اس قدر نشاط انگیز تھا کہ حارثہ و کعب کو خوشی کے عالم میں پہلی بات پر حیران ہونے کی بھی فرصت نہ ملی۔

اس کیفیت میں زید بن حارثہ حاضر ہوئے۔

وہ اس وقت ایک نازک ترین جذباتی دوراہے پر کھڑے تھے۔ ایک طرف وہ انسان تھا جس کے خون سے وہ پیدا ہوئے تھے۔ جو ایک چاہنے والے "باپ" کے بیتاب بازو پھیلائے ہوئے اس بات کا منتظر تھا کہ اس کا "بیٹا" اس کے سینے سے پیوست ہو کر خوشی کی شدت سے روئے اور رُلا دے، دوسری طرف وہ انسانؐ تھا جو خاندانی اور نسلی اعتبار سے کوئی نہیں تھا —— لیکن "باپ" کی ترسی ہوئی بیٹے کی نگاہیں اس بار بھی سب سے پہلے اسی انسان کی طرف اٹھیں جس کو وہ خدا کا رسولؐ مان چکا تھا۔ خاموش نگاہوں نے اس طرح ادب و احترام کے ساتھ فرمانبرداری کا اعلان کیا اور ادب و عقیدت کے ساتھ نظریں فرشِ خاک پر جھک گئیں۔ —— یہ اد[illegible] سپردگی قلبِ رسالتؐ نے کتنی شدت سے محسوس کی؟ [illegible] نہیں جانتا —— کوئی نہیں جان سکتا۔ انتہاء جذبات [illegible] آواز زبانِ وحیِ ترجمان سے سنائی دی تو باپ اور بیٹے کے ملاپ کی عظیم انسانی خوشی کے ساتھ اس میں ایک متاعِ عزیز کے چھن جانے کی کسک بھی شامل تھی۔

"زید! —— تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟" —— خلیق مسکراہٹ کے ساتھ مسکرانے والے مگر کبھی نہ قہقہہ لگانے والے انسانِ کامل نے سوال کیا۔

"جی ہاں" —— زیدؓ بولے "خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں ...... یہ میرے باپ ہیں اور وہ میرے چچا کعب [illegible]

خدا کے بندے اور رسولؐ کے چاہنے والے [illegible] اتنا ہی کہا اور کچھ نہیں —— اس کے بعد زبان [illegible] ...... سر جھک گیا اور نگاہیں ان [illegible]

ادیقہ

...ے عبادت کی حالت میں ... ہو رہے تھے

ید؄ ـــــ روح کے بندھنوں اور ایمان ویقین میں جکڑے

ے زید؄ کو ابھی اتنی فرصت کہاں تھی کہ گوشت پوست کے

توں کو نظر بھر کر دیکھ سکے۔ حارثہ نے یہ صورت دیکھی اور حیرت

سے گنگ ہو گئے۔ کعب نے یہ منظر دیکھا اور کسی گہری سوچ میں گم

ہو گئے۔ خدا کے رسول کی جاں نواز آواز نے ان کو اس کیفیت سے

نکا دیا ـــــ آپ؀ زید سے فرما رہے تھے :۔

"میں کون ہوں؟ ـــــ تم خوب جانتے ہو۔ اور یہ بھی

تم جانتے ہو کہ تمہارے ساتھ میرا سلوک کیا رہا ہے۔ اب۔

تمہارے لئے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ چاہو تو میرے ساتھ رہو

اور چاہو تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے عزیزوں کی طرف

لوٹ جاؤ"۔

پھر ایک بار خاموشی چھا گئی! ـــــ حارثہ پر امید و بیم کی آخری

کیفیت طاری تھی۔ کعب زید کو تک رہے تھے۔ رسولِ خدا متانت کی

تصویر بنے کھڑے تھے۔ اور زید؄ ـــــ زید نہ جانے اس وقت

کہاں تھے! خود فراموشی اور محویت میں ڈوبے ہوئے وہ سر جھکائے

ہوئے کھڑے تھے۔ بہت جلد یہ سر اٹھا ـــــ لوگوں نے

دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ نہیں آنسو تھے۔ ایک بے پناہ

چاہ اور بے قرار سپردگی تھی۔ خون اور ایمان ـــــ جسم اور جان

کی اس جذباتی جنگ میں ایمان ہی فاتح رہا۔ اور روح کی

کانپتی ہوئی آواز نے زید؄ کے اس فیصلہ کا اعلان کیا جس کا گمان

بھی انسانی نفسیات اس فضا میں نہ کر سکتی تھی "اے خدا کے

رسول میں وہ نہیں جو آپ؀ کے مقابلہ میں دوسرے کو پسند کر سکے!۔

میرے لئے تو آپ؀ ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہیں"

حضور؀ اس آواز کو سن کر مسکرائے۔ حارثہ اور کعب نے

یہ فیصلہ سنا اور حیرت سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ یہ کیا سن رہے

ہیں؟ ـــــ کیا دیکھ رہے ہیں؟ وہ کونسا تعلق تھا جس نے

باپ اور بیٹے کے تعلق کو شکستِ فاش دیدی تھی؟۔

"زید! ـــــ کیا تم ہوش میں ہو؟" حارثہ چیخے، حیف

ہے تم پر! ـــــ تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو۔ باپ

کے مقابلہ میں ایک اجنبی انسان کو پسند کرتے ہو! ـ آخر تمہیں

ہو کیا گیا ہے؟"۔

پہلی بار زید؄ نے باپ کو نظر بھر کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں

سے کسی بلند ترین حقیقت کا نور جھلک رہا تھا۔ روح تڑپ کر سامنے

آ گئی تھی اور جسم چھپ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بالکل مختلف

"زید" ہیں۔ حارثہ کے خون سے نہیں! ایمان کے نور سے ڈھالے

ہوئے۔

"ہاں ـــــ میں ہوش وحواس کے ساتھ یہ فیصلہ کر رہا ہوں"

عرفان و سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی آواز میں زید نے جواب دیا "میں نے

اس ذاتِ گرامی میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں جو کسی بھی دوسرے میں

نہیں ہیں۔ آپ لوگ مجھے بھول جائیے۔ میں اب کسی کا نہیں، صرف

خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں"۔

یہ الفاظ زمین و آسمان کے درمیان گونج اٹھے حضور؀ بیتابانہ

اور زید؄ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے مقام حجر کے پاس آکر پکار

اٹھے۔

"لوگو! ـــــ گواہ رہنا ـــــ زید؄ آج سے میرا

بیٹا ہے"۔

کیسا بیکراں تھا یہ تعلق یہ باہمی تعلق جو ایمان اور صداقت

کی بنیاد پر دو انسانوں میں قائم ہوا تھا!۔

زید بہر حال ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے حضور؀ کی زندگی

میں داخل ہوئے تھے۔ چپٹی ناک، گندمی رنگ اور پست قد کے

اس "غلام" کو بھولے سے بھی یہ گمان نہ ہوا ہوگا کہ مکہ کی انسانیت

سوز اور انسانیت فروش آبادی میں کوئی انسان اس کو سینے سے

لگا لے گا ـــــ ان کی آواز سنتے ہی بے اختیار گھر سے نکل آیا

کرے گا اور ان کی پیشانی کو، غلامی سے داغدار پیشانی کو اپنے

پاک ہونٹوں سے چوم لیا کرے گا اور اس طرح ان کو یقین دلا دیگا

کہ "غلام" اور "آقا" دونوں خدا کے غلام اور بندے ہیں۔

حضرت عائشہ؄ کا بیان ہے کہ جب کبھی زید باہر سے آتے

اور دروازے پر حضور؀ کو پکارتے تو آپ خواہ کسی حال میں ہوں فوراً

اس پکار پر دوڑتے تھے اور زید؄ کی پیشانی کو فرطِ شفقت سے

چوم لیتے پھر ان کی عافیت معلوم فرماتے تھے۔ ایک غلام نہیں

[illegible] نوازی
[illegible] فراوانی اور دردمندی کا مظاہرہ فرمایا تھا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ زیدؓ حضور پر دل وجان سے نثار ہو گئے تھے۔

ایک طرف زیدؓ تھے جنہوں نے توحید و رسالت کی گرویدگی پر گھر بار، ماں باپ اور وطن کی پوری دنیا قربان کر دی تھی، تو دوسری طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنہوں نے ایک زرخرید "غلام" کو اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے بیاہ کر عرب کی نسل پرستی کے بت پاش پاش کر دیئے تھے ایک طرف زیدؓ تھے جو طائف کی نازک گھاٹی میں اس وقت حضور کے آگے سینہ سپر تھے جب کفر کی بے رحم طاقتیں حق وصداقت کے نور پر بدترین پتھراؤ کر رہی تھیں۔ تو دوسری طرف حضورؐ تھے جنہوں جس فوجی مہم پر زیدؓ کو روانہ کیا اس کی سپہ سالاری کا تاج زرنگار اپنے اسی غلام کے سر پر رکھا۔ آخری معرکہ غزوۂ موتہ میں بھی جہاں حضرت زیدؓ خدا کی راہ میں شہید ہوئے۔ تین ہزار جاں بازوں کی کمان ان کے ہاتھوں میں دی جا رہی تھی تو حضرت جعفرؓ نے حضورؐ سے کہا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ اس دستے میں مجھے دیکھ کر اس کی باگ ڈور آپ مجھے دیں گے زیدؓ کو نہیں...."

"چپ رہو!" زید کی عظمت کو شک سے دیکھنے والے کو خدا کے رسولؐ نے تنبیہ کی تھی۔ "تم نہیں جانتے کہ خدا کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے"۔

پھر جب یہ "بہتر بندۂ خدا" شہید ہو گیا اور اس کی شہادت کی خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ بے اختیار اشکبار ہو گئے اور گلوگیر آواز میں یہ دعا آپؐ کے ہونٹوں پر جاری تھی: "اے خدا زید کو بخش دے! .... اے خدا زید کو بخش دے!!"۔

عشقِ رسولؐ کے سوزِ بیکراں نے زیدؓ کو کن بلندیوں پر پہنچا دیا تھا! انھوں نے حضور کو اس طرح چاہا کہ خود حضورؐ آپ کو ایک محبوب ــــ ایک لختِ جگر ــــ ایک بیٹے کی طرح چاہنے لگے! اور پھر دنیا کو یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا کہ کون چاہنے والا ہے اور کس کو چاہا جا رہا ہے! ــ محبت اور محبت نوازی کی یہ تاریخ ایک بے مثال تاریخ ہے جو توحید و رسالت کے سوا دنیا میں کسی کے

پاس نہیں ہے۔

یہ تاریخ حضورؐ اور زیدؓ کی تاریخ نہیں [illegible] چاہنے والے صحابہ نے پوری شان سے زندہ کر دکھایا! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے "دیوانے" تھے بلکہ ہر اس انسان ہر اس شئے کو بھی دل وجان سے پیار کرتے تھے جس پر حضورؐ کی پیار بھری نگاہ پڑ گئی ہو ــــ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس وقت معرکۂ شام کو جانے والی فوج کا سپہ سالار حضرت زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو بنانے کا اعلان کیا تو دنیا حیرت سے گنگ ہو گئی! ــــ بڑے بڑے ہوشمندوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کمسن لڑکے کو یہ نازک ذمہ داریاں کیوں سونپی جا رہی ہیں۔ خلیفۂ وقت نے جب لوگوں کے اعتراض کا جواب دیا تو معلوم ہوا کہ عشقِ رسولؐ کا جذبۂ بیکراں اس فیصلے کے پس منظر میں کام کر رہا تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر میں اسامہؓ کی عظمت کے لئے یہ بات کافی تھی کہ اللہ کے پیارے رسولؐ نے ان کو محبت کی خاص نظر سے دیکھا تھا۔ اور یہ کہ اسامہؓ اس انسان کے بیٹے تھے جس نے عشقِ رسولؐ کے آگے حیاتِ دنیا کے حسین ترین تعلقات پر ٹھوکر مار دی تھی۔ "جس کو رسول اللہؐ نے سردار بنایا ہو" خلیفۂ وقت نے شدتِ جذبات میں اعلان کیا "تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں اس کی سرداری چھین لوں!" ــــ رسالت کی شمعِ محبت سے دمکتے ہوئے سینے اس نعرۂ شوق پر تیزی سے دھڑکنے لگے اور عشقِ رسولؐ کے مشترک جذبے نے اسامہؓ کی سرداری کا فیصلہ دل وجان سے تسلیم کر لیا۔

پھر جب اسامہؓ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کے لئے روانہ ہوئے تو اقتدار اور گھمنڈ کی ماری دنیا کی آنکھیں عشقِ رسولؐ کا ایک ایسا جذبہ دیکھ رہی تھیں جس کو دیکھ کر رقت طاری ہو جائے۔ اسامہؓ کو رخصت کرنے کے لئے خلیفۂ وقت ایک "غلام" کی طرح پیادہ پا چلا آ رہا تھا! ــ ایک "غلام" کا بیٹا سردار کی شان سے گھوڑے پر سوار تھا اور ایک مردِ آزاد ــــ محمد عربیؐ کے بعد سب سے بڑا مسلمان اس کو خراجِ عقیدت دینے کے لئے اپنے پیروں [illegible] کو غبار آلود کر رہا تھا ــــ یہ منظر دیکھ کر حضرت اسامہؓ [illegible] گئے اور کہا: ــ

ہیں؟ یا آپ ... اسامہ بھی فرشِ خاک پر اتر آئے گا۔"

لیکن خلیفۂ وقت کو عشقِ رسول کی محویت میں سرافرازی و سرافگندگی کے مسائل پر غور کرنے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ماضی کی وہ یادیں جلوہ طراز تھیں جب حضورؐ زندہ تھے۔ جب انھوں نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ حضورؐ کے ایک زانو پر حضرت حسنؓ ہیں اور دوسرے پر اسامہؓ لیٹے ہیں ـــ اور آں حضرت ان کو اس طرح لوری دے رہے ہیں" اے خدا! میں ان سے پیار کرتا ہوں آپ بھی انھیں اپنی محبت کے سائے میں رکھئے گا ـــــ"

کبھی چھوٹے سے اسامہؓ اس حالت میں حضورؐ کے سامنے آتے ہیں کہ ان کی ناک بہہ رہی ہے تو خدا کا رسولؐ بہ نفس نفیس ان کی ناک صاف کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ یہ صورت حال دیکھ کر تڑپ جاتی ہیں ـــــ" اے خدا کے رسولؐ! میرے ہوتے ہوئے آپؐ یہ تکلیف نہ فرمائیں..." لیکن رسولِ خدا پلٹ کر دلی جراحت اور دلسوزی کے ساتھ جواب دیتے ہیں" اے عائشہ! میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھی ان سے محبت رکھو۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اس محویت کو جب اسامہؓ کے اصرار نے توڑا تو آپ نے جواب دیا:ـ

" نہیں اچھے اسامہؓ! ـــــ تم اسی طرح بیٹھے رہو گے! میں اسی طرح اپنے قدموں کو غبار آلود کرنا چاہتا ہوں ـــــ اے اسامہؓ! ـــــ یہ تو خدا کی راہ کا گرد وغبار ہے ـــ یہ عشقِ رسولؐ کی گردِ راہ ہے ـــــ اس میں کیا حرج ہے اگر یہ گرد وغبار مجھے لت پت کر دے! ـــــ اے اسامہؓ کیا یہ وہی حسین راہ نہیں جس پر ایک قدم اٹھانے کا انعام سات سو نیکیاں ہیں مجھے اس راہ کی گرد سے اَٹا ہوا دیکھ کر تمہیں غمگین نہیں خوش ہونا چاہئے۔"

ضروری: حضرات خط وکتابت میں اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

چند اہم کتابیں

مآثرِ عالمگیری
شہنشاہ عالمگیر کے پچاس سالہ دورِ حکومت کے چشم دید حالات۔ بڑے ۴۸۰ صفحات
قیمت پونے دس روپے (مجلد)

تجدید تصوف و سلوک
اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی مبسوط تحقیق۔
بڑے ۳۳۶ صفحات
قیمت سوا آٹھ روپے (مجلد)

تجدید دین کامل
مسلمان کس راہ پر چلکر اپنی عظمتِ رفتہ واپس لے سکتے ہیں؟ اس سوال کا مفصل جواب۔ بڑے چار سو صفحات
پونے دس روپے (مجلد)

تجدید تعلیم و تبلیغ
تعلیم و تبلیغ کے میدان میں تعمیری اور اصلاحی راہوں کی مفصل نشاندہی۔ بڑے ۴۲۴ صفحات
چھ روپے (مجلد)

تجدید معاشیات
اسلامی اور غیر اسلامی معاشی مسائل کا تقابلی مطالعہ۔ بڑے ۳۸۴ صفحات۔
پونے دس روپے (مجلد)

التکشف
تصوف کے موضوع پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مفصل کتاب۔ بڑے ۷۶۲ صفحات
پونے گیارہ روپے (مجلد)

سیرت ائمہ اربعہؒ
امام ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے مستند حالات۔
پونے سات روپے (مجلد)

مقالات احسانی
تصوف کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی سیر حاصل کتاب جو تعارف سے بے نیاز ہے۔
ساڑھے چھ روپے (مجلد)

تدوین حدیث
حدیث کی شرعی حقیقت، اہمیت، ضرورت، اسکے معیار اور تدوین و حفاظت وغیرہ کے بارے میں لاجواب مواد۔ ساڑھے چھ روپے (مجلد)

المصالح العقلیہ
مولانا اشرف علیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب جس میں اسلامی احکام کی عقلی مصلحتیں واضح کی گئی ہیں
ساڑھے چار روپے (مجلد)

اشرف الجواب
اس میں مولانا اشرف علیؒ نے اسلام پر کئے جانے والے گوناگوں اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں
ایک روپیہ (مجلد)

حیات انورؒ
دورِ آخر کے محدث علامہ انور شاہ صاحبؒ کے کمالاتِ علمی پر ایک تفصیلی نظر۔
چار روپے (مجلد)

تقاریر امام غزالیؒ
اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے۔
قیمت سوا دو روپے
(مجلد)

مقالات جمال الدین افغانیؒ
اپنے دور کے مجدد علامہ جمال الدینؒ کے فرمودات
چار روپے
(مجلد)

اشاعت اسلام
اسلام کس طرح پھیلا؟ اس کے بارے میں سب سے مفصل اور دلچسپ کتاب۔ چھ روپے۔
(مجلد سات روپے)

اسلام
از مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ
چاہ زمزم سے لیکر وصالِ نبویؐ تک کے تفصیلی حالات
سات روپے (مجلد)

سیرۃ النعمانؒ
امام ابو حنیفہؒ کی سیرت پر مولانا شبلیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب۔ تین روپے۔
(مجلد چار روپے)

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

ملّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

معلوم نہیں صوفی بدرالدجیٰ کی کہانی میں کیا جادو ہے، ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ ہی جاتی ہے۔ پچھلی بار مشاعرے نے ٹانگ اڑا دی اور اس مرتبہ تو۔۔۔۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔

میں بڑی سے بڑی مصیبت خندہ پیشانی سے جھیل سکتا ہوں۔ آپ مجھے ہمالیہ کی چوٹی سے بحرالکاہل میں دھکا دیجئے انشاء اللہ شام ہی کو ہنستا کھیلتا آپ سے آملوں گا۔ آپ میرے سینے پر ہاتھیوں کی فوج کھڑی کر دیجئے میرے ہنسنے اور گانے کے معمول میں کوئی فرق نہیں آنے گا۔ یقین کیجئے ہجر کی پوری پوری راتیں میں نے سو کر گذاری ہیں۔ کیا مجال ہے عشق کے زہرہ گداز آلام نے میری صحت پر ذرا بھی برا اثر ڈالا ہو، بلکہ ۔۔۔ خدا معاف کرے تجربے سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ عشق جتنا جتنا دو آتشہ ہوتا جاتا ہے بھوک اتنی ہی کھلتی جاتی ہے اور کھانے کے بعد منہ میٹھا کئے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔

لیکن اس بار جو قیامت کبریٰ مجھ پر ٹوٹی ہے اسکو جھیل جانے کی سکت میں اپنے اندر نہیں پا رہا ہوں۔ سکت نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ کھوپڑی گندے انڈے کی طرح ہل رہی ہے اور کہانی لکھنا تو درکنار صوفی بدرالدجیٰ کا نام تک یاد نہیں آ رہا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک منحوس دن میں ایڈیٹر تجلی بڑا خراب موڈ لئے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں غسل خانے میں تھا۔ وہ اپنی بہن سے کہنے لگے:۔

"نسیمہ! میں تو عاجز آگیا ہوں اس خبیث سے۔ اب تو آ صرف بھی ایسے نہیں گذرتے جن میں کوئی نہ کوئی شکایت لیکر نہ آتا ہو کہ ملّا نے یہ کر دیا اور ملّا نے وہ کر دیا۔"

میرا اٹھنے والا ہاتھ سر کے قریب ہی رک گیا۔ معاملہ بے ڈھنگا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے خشک اور کھردرے لہجے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ آج کوئی خطرناک ارادہ لے کر آئے ہیں۔ "خبیث" کی ث کو انھوں نے تجویدی قاعدے کے بالکل خلاف حلق کی آخری تہہ سے نکالا تھا جو ان کے معاملے میں ہمیشہ اس بات کی علامت رہی ہے کہ کسی نہ کسی کو کچا چبا ئیں گے۔ خیریت اسی میں نظر آئی کہ جب تک وہ ہیں غسل کو ملتوی کر کے صرف کان لگانے پر اکتفا کیا جائے۔

"تشریف رکھیئے بھیّا" ملّائن کی آواز آئی "میں چائے بناتی ہوں۔ سوجی کے شکر پارے بھی بنائے تھے وہ بھی چکھ لیجئے گا۔"

"بالکل نہیں۔ جب بھی کوئی شکایت لیکر آتا ہے کم سے کم ایک وقت کی بھوک تو غارت ہو ہی جاتی ہے۔"

"اے ہے بھیّا۔ آپ بھی کس کا اثر لیتے ہیں۔ انکی تو عادت ہی ایسی ہے۔"

"عادت کس چڑیا کا نام ہے۔" وہ غرائے "تم ہمیشہ اس کی خباثتوں کو معصومیت کا رنگ دینے کی کوشش کرتی ہو مجھے حیرت ہے تمہاری زبان سے کبھی اس کی شکایت میرے کانوں میں نہیں پڑی حالانکہ وہ تمہارا بھی ناک میں دم ضرور رکھتا ہوگا۔"

"نہیں نہیں بھیّا۔ اللہ قسم وہ اتنے برے نہیں جتنے آپ سمجھتے ہیں۔" نسیمہ کی آواز میں بڑی شفقت تھی۔

[illegible] ارے "بھائی نے کیا ... ہوئے ہیں

جس کا دیکھو دماغ چاٹ جائے گا۔ جسے دیکھو بیوقوف بنانے کی کوشش کرے گا ــــ چلو اس پر بھی صبر کرلو، مگر مزاروں کی چادریں غائب کرادینا اور مجاوروں وغیرہ کو طرح طرح سے تنگ کرنا خباثت نہیں تو اور کیا ہے ــــ آج ہی سنو کیا ہوا ــ صوفی عندلیل صاحب آئے تھے۔ بتا رہے تھے کہ ملّا نے ان کی درگاہ کی کسی زائرہ کو بہکا سکھا کر ان سے بیزار کردیا ہے۔ دو چادریں بھی غائب ہیں۔ ایک پوسٹر اس مضمون کا شہر میں لگا ہوا ہے کہ پیر زلف دراز کا مزار فراڈ ہے۔ اس میں ایک شرابی دفن ہے جو شراب کے دھوکہ میں ٹنکچر پی کر مر گیا تھا ــ بتائیے یہ باتیں قابلِ برداشت ہیں؟"

نسیمہ کی گھٹی گھٹی ہنسی بلند ہوئی مگر فوراً بریک بھی لگ گیا۔ غالباً بھائی صاحب نے لال پیلی نظروں سے گھورا ہوگا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں بھیا کہ وہ پوسٹر انھوں ہی نے چھپوایا ہے۔"

"مضمون سے ــ پیرائے سے۔ صوفی صاحب ایک پوسٹر بھی درگاہ کے دروازے سے چھڑا کے لائے تھے اس کا لفظ لفظ منھ سے بول رہا ہے کہ کسی شریر قلم کی تراوش ہے۔"

ایک لمحے خاموشی رہی۔ ملائن غالباً جواب سوچ رہی تھیں۔ پھر بعد ان کی دبی دبی آواز آئی:۔

"خیر بھیا۔ جھوٹ تو وہ کبھی لکھ نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوگی ــ"

"چرب زبانی مت دکھلاؤ ــ سچ اور جھوٹ کا سوال نہیں تو یہ بھی ہے کہ تمھاری سہیلی زہرہ کی سسرال والے خالص ایرانی النسل ہیں مگر وہ اپنے آپ کو اصلی سید بتلاتے ہیں پھر کیا میں ان کی تشہیر کا اشتہار شائع کروں گا؟ ــ تم باتیں بنائے جاؤ ہوگا ایک دن یہ کہ کوئی اسے جان سے مار دے گا۔ جان سے نہ سہی اتنا ضرور ہے گا کہ وہ اپنے پیروں سے گھر نہیں لوٹ سکے گا۔"

بہن پھر سوچ میں پڑ گئیں۔

"وہ ہے کہاں؟" دفعتاً بھائی صاحب نے سوال کیا۔

"جی ... جی ابھی تو یہیں تھے ... مگر بھیا قانون بھی تو

[illegible] ہے کہ [illegible]

"زبان چلائے جاتی ہو ــ قانون کسی کے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکتا ــ بڑی آئیں قانون والی ــ جاؤ تمہاری قسمت تم وہ بچ گیا، ورنہ پچھلے ہی مہینے جنگل شاہ کی درگاہ کے سامنے اسے چار آدمیوں نے گھیر لیا تھا۔"

"ہائے اللہ ــ مجھے تو انھوں نے نہیں بتایا۔"

"بتاتا کیا ــ وہ ایسے خطرات کو اہمیت ہی نہیں دیتا ــ حالانکہ یہ بہادری کی نہیں دیوانگی کی علامت ہے۔ کسی دن بات نکل آئی تو ضرور تمھیں مزے لے لیکر سنائے گا۔"

"تو کیا ہوا تھا؟" بہن نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"میرا سر ہوا تھا" بھائی صاحب جھلّائے۔ "اب میں تمھیں کہانیاں سنایا کروں گا۔ خبطی ــ احمق ــ وہ دیکھ لینا یا تو پاگل ہو جائے گا یا جیل میں سڑ جائے گا۔"

"ج .. جیل میں" ملائن گھگھیائیں۔

"اور کیا جنت میں ـ چار میں سے ایک کا سر پھاڑ دیا۔ ایک کے چار دانت توڑ دیئے ـ مردود نے نہ جانے کہاں سے باکسنگ بھی سیکھ لی ہے۔"

"اللہ توبہ ــ کیا گھونسوں سے سر بھی پھٹ جاتا ہے۔"

"استغفراللہ۔ ارے کسی کو پکی سڑک پر پٹخو گی تو کیا سر میں بال اُگیں گے ــ اُنھ ... تم میں بھی اس کے اثرات کافی آگئے ہیں۔ بات میں بات نکالتی ہو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی ــ ہولناک، پراسرار خاموشی ــ پھر بھائی صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:۔

"میں نے طے کرلیا ہے کہ اب اسے بھی باضابطہ پابندی سے دفتر آنا ہوگا۔ دن بھر ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے اسی لئے اور بھی لغویات سوجھتی ہیں ــ آجائے تو کہہ دینا فوراً مجھ سے ملے۔"

اور اس طرح ایک پیدائشی مردِ آزاد کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ شاید اسی لئے شاعر نے کہا تھا۔

بچپن ہی سے لکھی تھی مقدر میں اسیری
ماں باپ کہا کرتے تھے دلبند جگر بند

[illegible] صبح سات سے بارہ تک، پھر دو سے پانچ تک پورے آٹھ گھنٹے کی جوشس ڈیوٹی۔ اس دوران میں صرف ایک نماز کا وقت آتا تھا یعنی ظہر کا۔ عام حالات میں یہ نماز دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں لیتی، لیکن مصیبت میں خدا بڑی شدت سے یاد آتا ہے۔ چنانچہ سوا دو بجے آذان سنتے ہی میں دفتر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"آذان کے بعد سوائے مسجد کے کہاں جایا جا سکتا ہے ——"

میں نے نہایت عابدانہ انداز میں کہا۔

"یہ مغرب کی آذان نہیں ہے —بیٹھ جاؤ——"

میں ان کے لہجے کی گرج سے سہم کر بیٹھ تو گیا مگر اندر ہی اندر خون اُونٹ رہا تھا۔ اسے فرعونیت نہیں تو تاناشاہی ضرور کہیں گے کہ وہ عبادت کے معاملہ میں بھی دخل انداز ہو رہے تھے۔ مجھے اچانک وہ عربی فقرہ یاد آیا جو کچھ روز پہلے انھی کے ایک مضمون میں پڑھا تھا میں منمنایا:۔

"لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔"

وہ میری منمناہٹ سنکر ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے کیلئے مسکرائے پھر ہونٹ بھینچکر کڑوی نظروں سے مجھے گھورا۔

"یہ قلم روک کر کیوں بیٹھ گئے" انھوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"بات یہ ہے جناب۔ آذان کی پکار سننے کے بعد دل و دماغ کسی دنیاوی کام کے قابل نہیں رہ سکتے —سنتیں وغیرہ بھی تو پڑھنی ہیں——"

"وغیرہ تو جیسی تم پڑھتے ہو میں خوب جانتا ہوں —میرا خیال ہے سنتیں بھی شاید تم نے عرصے سے نہ پڑھی ہوں——"

میری کھوپڑی سے شعلہ سا اٹھا —یہ شعلہ اُس مسکراہٹ کا رہین منت تھا جو منشی شہید الزماں کے ہونٹوں پر نظر آرہی تھی۔ وہ دوسری میز پر بیٹھے قلم چلا رہے تھے اور مسکراتے ہوئے انھوں نے کنکھیوں سے مولوی برہان الدین کی طرف بھی دیکھا تھا۔ مولوی برہان الدین ہونٹوں سے تو نہیں ہنس رہے تھے مگر ان کی ناک اس طرح سکڑ رہی تھی جیسے اُبلتے ہوئے تبسم کو [illegible] سے دبا رہے ہوں۔

تیسرے پہلے روز تو ڈھائی سے قبل مسجد جانے کی نوبت [illegible] لیکن یہ نہایت روح فرسا تھا۔ روح فرسا یوں تھا کہ نماز سے قبل میں ہوٹل میں ایک پیالی چائے ضرور پینا چاہتا تھا۔ بارہ بجے دفتر سے اُٹھنے کے بعد ایک بجے تو کھانے ہی سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر قیلولے کے لئے کمر سیدھی کرنے میں ڈیڑھ بج گیا اور پھر حقے کے کش لیتے ہوئے اخبار کی دو چار سرخیاں پڑھیں تو پونے دو ہو گئے۔ اخبار پڑھتے پڑھتے میٹھی نیند کے گہوارے میں پہنچ جانا میرا روز کا معمول تھا۔ آج بھی ہلکا ہلکا نشہ آنے لگا تھا مگر قہر ایڈیٹر بجان ملا ٹھیک پونے دو پر اُٹھ جانا پڑا کیونکہ ایڈیٹر صاحب کا فرمان یہ تھا کہ ڈیوٹی پر ہمیشہ پانچ منٹ پہلے پہنچو...

...ہُنھ ڈیوٹی ——لعنت ہے ایسی ڈیوٹی پر۔ نیند آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔ سر بقول شاعر زانوے یار پر ہونے کی بجائے بارِ دوش محسوس ہو رہا تھا۔ ایک پیالی گرم چائے اس وقت وہی کام کرتی جو... جو اسے کرنا چاہیئے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کیوں نہ سوا دو بجے ہی ہوٹل سے دفتر ہی میں چائے منگا کر زہر مار کی گئی۔ یہ کیا ضروری تھا کہ ہوٹل ہی میں جایا جاتا۔ تو سمجھ لیجئے آپ غلطی پر ہیں۔ جمہوریت اور آزادی کہیں اور آئی ہو تو آئی ہو کم سے کم دفتر تجلی میں نہیں آئی۔ یہاں وہ ڈکٹیٹر شپ ہے جو انگریز کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مثلاً شام کی چائے کا وقت گرمیوں میں چار اور پانچ کے مابین مقرر ہے، لیکن اوقات نماز کی طرح وہ موسم کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ سخت گرمی میں ٹھیک پانچ بجے کم گرمی میں چار بجے۔ درمیانی گرمی میں ساڑھے چار بجے۔ جاڑوں میں تین بجے۔ سخت برفانی جاڑوں میں دو بجکر سولہ منٹ پر۔ اب کیا مجال ہے اوقات کے خلاف کوئی چائے کا تصور بھی کر سکے۔

اِن دنوں ساڑھے چار کا ٹائم تھا۔ اسٹاف میں سے کسی کی بھی مجال نہیں تھی کہ اس سے قبل چائے کا نام بھی لے سکے۔ ——بتائیے مجھے آذان سنکر خدا کیسے نہ یاد آتا!

جماعت میں کتنی رکعتیں ہوئیں یہ یاد نہیں۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ آج ظالم امام صاحب نے قیام بہت طویل اور سجدے [illegible]

بہت مختصر کئے تھے۔ حالتِ قیام میں ایک بار تو غنودگی نے میرے قدم اکھاڑ ہی دیئے بمشکل برابر والے صاحب کا سہارا لیکر سنبھلا تھا اور ان صاحب نے تاؤ میں آکر کوکھ میں کہنی بھی رسید کر دی تھی۔ عام حالات میں میں ضرور فتویٰ دیتا کہ ان کی نماز فاسد ہو گئی لیکن فی الحال تو خود اپنی نماز کے بارے میں فتویٰ زیرِ غور تھا۔ کھڑے کھڑے سونا مفسدِ نماز ہے یا نہیں یہ مسئلہ بہشتی زیور تک میں نہیں ملا۔

سلام پھیر اگیا تو آخری دو سنتوں کا نمبر تھا۔ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی میں نے بھی نیت باندھی لیکن بجائے حمد و ثنا کے یہ سوال ابھر کر سامنے آگیا کہ اگر نارمل ہی رفتار سے سنتیں پڑھی گئیں تو وہی ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی ہوگی پھر ظاہر ہے ہوٹل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — یہ بھی جی میں آئی کہ بغیر سنتوں کے بھاگ چلوں لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ دیوبندی ہوٹلوں کی بھٹیاں گرمیوں کی دوپہر میں عموماً نیم مردہ ہی رہتی ہیں۔ جاتے ہی چائے میسر آنی محال تھی — جب تک بھٹی گرم ہو کر چائے پینے کی نوبت آتی ایڈیٹر صاحب مسجد سے واپس آ لیتے اور پھر دفتر میں مجھے نہ پاکر چپراسی ہی کے ذریعے طلبی ہوتی۔

بہتر یہی معلوم ہوا کہ پہلے ایڈیٹر صاحب کو رخصت ہو لینے دیا جائے۔ اس صورت میں وہ یہی گمان فرمالیں گے کہ شاید نوافل پڑھی جا رہی ہیں۔

وہ سنتوں سے فارغ ہو کر مڑے تو میں ابھی پہلی ہی رکعت میں تھا۔ وہ ٹھٹکے۔ ٹھٹک کر دیوار کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ میں کنکھیوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار نظریں چار بھی ہو گئیں تو انکی آنکھوں میں غیر آشنائی کی جھلک نظر آئی۔ میں سجدے میں گر گیا۔ تقریباً اکتالیس تسبیح پڑھ کر سر جو اٹھایا تو وہ اب بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ دوسرے سجدے میں یہ تعداد میں نے اکھتر تک پہنچا دی لیکن وہ نہیں سرکے۔ اب تو دوسری رکعت کے قعدے میں میں یہ تہیہ کر کے بیٹھ گیا کہ جب تک وہ رخصت نہیں ہوں گے سلام نہیں پھیروں گا۔

آخر کار وہ چلے گئے اور میں تیر کی طرح مسجد سے نکلا۔ سنا ہے تیر کمان سے نکل کر لوٹا نہیں کرتا مگر ان کے معاملہ میں یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہوا۔ ایڈیٹر صاحب دروازے ہی پر موجود تھے — میں نے جھلک دیکھی تو ٹھیک وہیں لوٹ گیا۔

[illegible]

میں گردن لٹکائے دفتر میں داخل ہوا ہوں۔ یقین تھا کہ [illegible] شرعی گالیاں ضرور سننے کو ملیں گی۔ مگر ہائے پیا آہنگ تھا..... توبہ۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے..... مگر یہ بھی نہیں...! موقع کے لئے شاعر نے کہا تو ضرور ہے کوئی مصرعہ جو ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں کلبلا رہا ہے، لیکن حافظے کی گرفت میں نہیں آرہا۔

انھوں نے صرف ایک غلط انداز سی نظر مجھ پر ڈالی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ میرا خیال ہے یہ انھوں نے عقلمندی ہی کی ورنہ اسٹاف کے سامنے صلواتیں سن کر میں شاید ان سے لڑ ہی جاتا۔ پھر دوسری عقلمندی یہ کی کہ شام کو غریب خانے پر تشریف لاکر چلے تو دل کی بھڑاس نکالی پھر یہ رعایت دے ہی دی کہ چائے اور نماز دونوں سے فارغ ہو کر دفتر حاضر ہوا کروں۔

دفتر میں میرے سپرد فی الحال پتے لکھنے کا کام ہوا تھا۔ ویسے تو خریداروں کے پتے چھپے ہوئے رہتے ہیں، لیکن چار پانچ سو پھر بھی ایسے باقی رہتے ہیں جن کے چھپنے کی نوبت فوری طور پر نہیں آتی۔ یہ کام میرے لئے سخت بور کن تھا۔ نقل را چہ عقل۔ گویا ایک گدھے میں اور ابن العربی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ میری تخلیقی صلاحیتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کبھی اپنے مسودے یا خط کی نقل کرنی پڑی ہے تو وہ بھی کبھی جوں کی توں نہیں ہو سکی۔ ایک زمانے میں میں کاتب بھی تھا لیکن لوگوں نے مجھے کام دینا اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کا خیال تھا میں مسودوں میں حذف و اضافہ کر کے کتابت کرتا ہوں۔

آٹھ دن بڑی بیزار کن یکسانیت کے گذرے۔ بارے نویں دن کچھ فضا بدلی۔ میں ٹھیک ساڑھے تین بجے اپنی میز پر پہنچا ہی تھا کہ غراہٹ کی آواز سنائی دی۔

"اِدھر آؤ"

خدا خیر کرے۔ غراہٹ میں بڑی تندی تھی۔ میں پہنچا تو ایک لمبا سا خط ایڈیٹر صاحب نے میرے آگے بڑھا دیا اس کے ساتھ ہی ایک چِٹ بھی پن سے نتھی تھی۔

"اسے پڑھو"

میں نے تعمیل کی۔ خط کیا تھا انگاروں کی انگیٹھی تھی۔ [illegible] والے تجلی کے خریدار ہی تھے۔ انھوں نے بہت کچھ [illegible]

۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا" میں نے بے تعلقانہ انداز میں کہا۔

"میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا ——— پتے کی چٹ پڑھو۔ تمھاری ہی تو لکھی ہوئی ہے ——"

"جی ہاں۔ ۔ ۔ مگر اس میں کیا نقص ہے۔" میں نے دل ہی دل میں پتا پڑھکر سوال کیا۔

"زور سے پڑھو —— منشی جی —— مولوی برہان صاحب اور میاں مرغوب حسین آپ لوگ بھی سُنیئے گا —— پڑھو ——"

میں نے زور سے پڑھا۔

"خمیرہ بانو بنت حکیم جوارش علی —— محلہ جمال گھونٹہ"

دفعتاً فضا دبی دبی ہنسی کی سرسراہٹوں سے لہرا اٹھی —— منشی جی نے تو منھ پر رومال رکھ لیا تھا اور مولوی برہان ناک بھینچ بیٹھے تھے جس کی وجہ سے قہقہہ ہچکی کا انداز اختیار کر گیا تھا۔ میاں مرغوب کھلکر ہنسنے والے تھے مگر انھی کی طرف ایڈیٹر صاحب نے قہر آلود نظروں سے گھورا تھا جس کے نتیجے میں قہقہے کو بریک لگ گئے تھے۔

"پتا تو ٹھیک ہے" —— میں نے کہا —— "یہ صاحب خفا کس بات پر ہو رہے ہیں ——"

"بات اڑانے کی کوشش مت کرو —— یہ حرکتیں میں برداشت نہیں کروں گا۔"

"ارے صاحب بتائیے بھی تو کچھ —— پتے اور نسخے میں اگر فرق نہیں رہ گیا ہے تو اس کی ذمہ داری پتوں کے رجسٹر پر ہے۔ میں تو صرف ٹیپ ریکارڈر ہوں۔"

"منشی جی" وہ دوسری طرف متوجہ ہوئے "ذرا پتوں کے رجسٹر میں ۳۳۹ نمبر کا پتا نکالیے ——"

منشی جی ہنسی ضبط کرنے کی خاطر نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبائے رجسٹر قریب لائے اور مذکورہ پتا کھول کر سامنے کر دیا۔

[illegible] ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے کہا "ذرا اسے پڑھو۔"

میں نے پڑھا —— "خمیرہ بانو ۔ ۔ ۔ ۔"

"خ کا نقطہ کہاں ہے؟" انھوں نے کھلے ہوئے صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھا۔

"یہ رہا ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے نقطے پر انگلی رکھ دی۔

ان کے چہرے پر ہوائیاں سی چھوٹ گئیں۔ منھ کو صفحے کے قریب کر کے بغور معائنہ فرمایا پھر کرسی کی پشت سے ٹکتے ہوئے بولے۔

"تمھیں اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ یہ نیلی روشنائی کا نقطہ نہیں ہے بلکہ سیاہی مائل نشان ہے جو یقیناً مکھی ہی کی کارگزاری ہو سکتی ہے۔ —— آخر تمھیں سوچنا تو تھا کہ خمیرہ بانو بھی کوئی نام ہوتا ہے۔"

"جناب نقل را چہ عقل کا قاعدہ میرا بنایا ہوا تو نہیں ہے۔ پھر والد صاحب کا نام حکیم جوارش علی ہے تو بیٹی کا نام خمیرہ بانو کیوں نہیں ہو سکتا ——"

ان کے چہرے پر تبسم کی ایک گریز پا سی لہر آئی۔

"بکواس کئے جاؤ گے —— یہ حکیم جوارش علی ہے؟ ——"

میں نے جھک کر دیکھا ۔ ۔ ۔ "اررر ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ مجھے مستفسرانہ نظروں سے گھورے جا رہے تھے ۔ ۔ ۔ "ہوں کیا پڑھا؟"

"جی ۔ ۔ ۔ جی یہاں واقعی مجھ سے چوک ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ مگر آپ خود سوچیئے جب شروع ہی میں بیٹی صاحبہ کا نام خمیرہ بانو آ جائے تو حکیم نوازش علی کو جوارش علی پڑھ لینا ایک قدرتی سا فعل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ جیسے ۔ ۔ ۔ ۔"

"خیر خیر —— آگے پڑھو ——"

"اب تو آگے بھی پڑھ لیا۔ جمال کوٹ اور جمال گھونٹہ کی مشابہت سے آپ انکار نہیں کر سکتے —— آخر حافظوں کو بھی تو متشابہ لگتا ہے ——"

"بس چپکے اپنی جگہ بیٹھو۔ یہ پہلی شرارت معاف کرتا ہوں آئندہ معاف نہیں کیا جائے گا۔"

پھر انھوں نے منشی جی سے فرمایا "آپ منشی جی ان کے لکھے ہوئے پتے چیک کئے بغیر نہ جانے دیا کریں۔"

[illegible] پھر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ منشی جی نے [illegible]

منتی باربردار علی عرف بابو جی - محلہ چھالی کتھہ -

اس میں بھی میرا قصور نہیں تھا۔ رجسٹر لکھنے والے کا خط ہی ایسا تھا کہ مشابہ لگے اور پڑھ لگے۔ اس نے شکستہ انداز میں بربار علی لکھا تھا مگر پڑھا وہ باربردار ہی جاتا تھا۔ میں ٹھٹکا بھی تھا کہ یہ کیا نام ہوا مگر خیال ہوا کہ لوگ کلب علی اور غلام علی بھی نام رکھتے ہیں تو اضافت کے ساتھ باربردارِ علی کیوں نہ رکھیں گے۔ باربرداری گدھوں اور خچروں کا کام ہے۔ گدھے اور خچر بھی کتوں سے بہرحال زیادہ ثقہ سمجھے گئے ہیں۔

رہا بابو جی تو "با" کا نقطہ ہی لکھنے والے نے ایسا گھسیٹوا دیا تھا کہ "یا" پڑھے بغیر چارہ نہ تھا اور توجیہہ یہ ذہن میں آئی کہ "باربرداری" ہی کے تعلق سے ان کی عرفیت یابو جی پڑ گئی ہوگی۔ کسی منشی کو لوگ بابو جی تو کہنے سے رہے۔ محلہ کا قصہ ایسا ہے کہ دنیا میں سب طرح کے محلے ہوتے ہیں۔ کٹ گیاں - بھاڑ - کوچہ بھوندو ناتھ - تو چھالی کتھہ تو یقیناً ان سے بہتر ہی ہے۔ اصل میں لکھا گیا تھا "جھال کہنہ" - ہوگی یہاں کوئی پرانی جھال۔ اب دیکھ لیجئے منشیانہ تحریر میں جھال کہنہ کو چھالی کتھہ پڑھ لینا بڑی حد تک قرین قیاس ہی ہے۔

ایسے ہی متشابہات برابر سامنے آتے رہے۔ ایک مرتبہ ایک ڈاکخانہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے بہت غور کیا مگر ایک ہی لفظ بنتا نظر آیا — "ملو شام کو" — دماغ نے ذرا بھی کیا کہ یہ کیسا نام ہو سکتا ہے۔ مگر فوراً ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ اپنے قریب ہی ایک قصبہ "کھتولی" بھی تو ہے۔ "کھاتولی" ہی کی طرح "ملو شام کو" بھی ایک فقرہ ہے۔ کیا بعید ہے نام پڑ ہی گیا ہو۔

بعد میں ثابت ہوا کہ یہ اصل میں میلو شارم تھا۔

ایک مرتبہ غیاث الدین کو قیاس الدین لکھنا پڑا کیونکہ غیا رجسٹر میں ٹھیک قیا لکھا ہوا تھا۔ اب اتنا جاہل تو میں بھی نہیں تھا کہ قیاس کو ث سے مان لیتا۔ سوچا لکھنے والے سے چوک ہوئی ہے اصلاح میرا فرض ہے۔

ایک مرتبہ پاکستان کا ایک پتہ انگریزی میں درج تھا۔

[illegible]

میں نے شہر کا نام اردو میں مَارْدَن لکھ دیا۔ یہ تھی اصلیت MARDAN تھا۔

ایک ہی ماہ میں اس طرح کے جوق در جوق کارنامے سن کر ایڈیٹر صاحب نے میری ڈیوٹی بدل دی — ڈیوٹی کیا بدل کھڑے کھڑے گولی مار دی ....

(ملا زندہ صحبت باقی)

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

احیاء الاسلام • تالیف:- جناب سید علی صفدر- • مطبوعہ:- ادارہ ادب و دانش-
۳- بی جوبلی بلڈنگ- سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸
• صفحات ۲۵۳- کاغذ سفید- لکھائی چھپائی گوارا- قیمت تین روپے

یہ اُس سلسلۂ تصنیف کا حصۂ اول ہے جو مؤلف — تصحیح تفاسیر کے عنوان سے معرض وجود میں لا رہے ہیں- فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ پچھلے تمام مفسرین نے نہ قرآن کو سمجھا نہ آیاتِ الٰہیہ کی صحیح تعبیریں کر سکے نہ اس کی حقیقی گہرائیوں تک انکی رسائی ہوئی- انھوں نے تفسیر قرآن کی بنیاد ایسے مفروضات پر رکھی جو سراسر باطل تھے اور ان کی وجہ سے قرآن کو متعدد عیوب سے ملوث قرار دینا پڑا-

ایک شخص جب اتنا بلند بانگ دعویٰ لیکر اٹھے تو پھر تفصیلی تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی- ہم نے اس کتاب کے متعدد ابواب غور سے پڑھے ہیں- پوری اس لئے نہیں پڑھ سکے کہ جب کسی مصنف کا بنیادی زاویۂ نظر ہی ہماری دسترس سے باہر ہو تو اس کی ژرف نگاہیوں پر سر کھپانا کم سے کم ہمارے لئے اضاعت وقت کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتا-

ہماری تحریریں گواہ ہیں کہ کورانہ تقلید، جمود اور گمرہی تعصبات کے ہم بھی قائل نہیں ہیں- نہ نکتہ آفرینی اور تحقیق و تدقیق ہی سے ہمیں بیر ہے، لیکن جو شخص خود کو عقل کل سمجھتے ہوئے تمام سلاف کو بے عقل، کوتاہ نظر اور قرآن فہمی سے عاری قرار دینے لگے اس کے لئے تحسین کا کوئی لفظ ہماری جھولی میں نہیں ہے-

ہو سکتا ہے بڑے سے بڑے مفسر نے کہیں ٹھوکر کھائی ہو- بعید نہیں بعض ناقابل اعتماد روایات کو صحیح سمجھ کر اہل علم کی کوئی جماعت غلط تصورات پر بھروسہ کر بیٹھی ہو، مگر احیاء الاسلام کے فاضل مؤلف تو علی الاطلاق تمام ہی مفسرین سلف کے متعلق — خواہ وہ صحابی ہوں یا تابعی یا تبع تابعی — دو ٹوک انداز میں فیصلہ دیتے ہیں کہ وہ سب کے سب کم سواد و بے شعور تھے-

حدیث سے مؤلف کو چڑ ہے- کسی روایت کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو نام نہاد اہل قرآن کا اختیار فرمودہ ہے- یعنی کسی آیت کی ایک تفسیر اپنی طرف سے متعین کر کے ہر اُس حدیث کو غلط قرار دیتے چلے جانا جو ان کی دانست میں اس تعینہ تفسیر سے ٹکراتی ہو-

مؤلف کے خیالات ملنا کے تعارف میں ان کی صرف ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کریں گے- سابق مفسرین کے انداز نظر پر نقد و جرح کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:-

"پس آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مفسرین کا طریقہ تفسیر کیا ہے ایسے لوگ گم کردہ راہ ہیں ... راسخون فی العلم سے ہوں اور جب ان کا یہ حال ہے تو اور علمائے امت تو ان سے ... اور انھی کے کاسہ لیس- وہ بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوئے"

اب اس [illegible] سے زیادہ کیا تبصرہ کریں کہ جو کام پاکستان میں پرویزی گروہ کر رہا ہے اسی کو فاضل مؤلف نے بھی سنبھالا ہے۔ ہمیں ان کی نیت پر شک کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ مشورہ ضرور دیں گے کہ "ہم چو ما دیگرے نیست" کا خبط آدمی کو مسخرہ تو بنا سکتا ہے مجدد اور مصلح نہیں بنا سکتا۔ احیاء الاسلام نام رکھ کر تمام ائمہ اسلام کے منہ پر کالک ملنے کی کوشش کرنا ٹھیک وہی کارخیر ہے جس نے پاکستان کے پرویز صاحب کو وادیٔ کفر میں پہنچا دیا ہے العصمۃ حفظنا۔

اس کتاب میں مؤلف نے بعض مقامات پر خاصی ذہانت کا بھی ثبوت دیا ہے اور مفسرین کی بعض غلطیوں پر ان کا نقد بھی جاندار ہے۔ ان کی عرق ریزی میں بھی شک نہیں، اور ہو سکتا ہے وہ دین کے حق میں مخلص بھی ہوں، لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود مؤلف کو سوچنا چاہئے تھا کہ پچھلے تمام مفسرین و محدثین کو نااہل اور بے بہرہ قرار دینے کے بعد ملت مسلمہ کے پاس بچتا کیا ہے اور اُس شخص کے خود پرست و متکبر ہونے میں کون شک کرے گا جو زمین پر رہتے ہوئے فلک ہفتم پر قدم زن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کتاب کے خاتمے پر کچھ مشکل الفاظ کی شرح بھی دی گئی ہے۔ یہاں اسی کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ مؤلف نے بہت زیادہ ذمہ داری کا راستہ اختیار نہیں فرمایا ہے۔

الغیب:۔ وہ ذات جو حواس سے محسوس نہ ہو۔

"ذات" کا یہاں کیا موقع تھا۔

الوھیت:۔ معبود کے موجود ہونے کا اعتقاد۔

"الوہیت" کے یہ معنی دنیا کی کسی لغت میں آپ کو نہیں مل سکیں گے۔

انھدام:۔ منہدم ہونا

اس کا نام شرح ہے تو پھر متن کیا ہوگا۔ جو شخص منہدم کا مفہوم جانتا ہو اسے "انہدام" کی شرح سمجھانا تحصیل حاصل ہے اور جو نہ جانتا ہو وہ اس شرح سے کیا سمجھے گا۔

کتابت و تصحیح کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔ تفریح کو تفریغ [illegible] کیا گیا ہے۔

مؤلف کا ارادہ ہے کہ وہ حصہ وار اس تالیف کو آگے بڑھاتے جائیں۔ ادھان کی تفسیر قرآن بھی اس سلسلہ کا ایک جز ہے۔ تبصرہ نگار کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اس سلسلہ کو تہہ کر کے رکھ دیں تو اُن کے اور قوم و ملت کے حق میں بہتر ہوگا۔ حدیث سے دامن کش اور ائمہ و اساطین سے بیزار ہو کر، خود کو افلاطون و ارسطو سمجھ کر جو تفسیر لکھی جائیگی وہ اہوائے نفسانیہ کی گندگی سے پاک نہیں رہ سکے گی اور اس طرح کے مفسروں کا مآل آخر کار وہی ہوگا جو پرویز صاحب کا ہوا ہے۔

حد ہے کہ اتنے فلک شگاف دعووں کا حامل اتنا بھی نہ کر سکا کہ اپنی کتاب میں آیاتِ قرآنیہ کو اعراب کے ساتھ لکھوا دے۔ ہم اپنے اس خیال کا اظہار متعدد بار کر چکے ہیں کہ جو شخص آیات کو مع اعراب ڈھنگ سے لکھوانے کا اہتمام نہیں کر سکتا اسے حق نہیں ہے کہ آیات سپرد قلم کرے۔ متنِ قرآن کے معاملے میں سہل انگاری، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے والوں سے تفسیرِ قرآن میں حزم و احتیاط اور احساسِ ذمہ داری کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

اہتمامِ جہاد

- مؤلفہ:۔ جناب سردار محمد اکبر خاں۔
- شائع کردہ:۔ ملٹری پریس۔ صدر بازار کیمبل پور
- صفحات ۱۲۷ (تجلی سائز) قیمت درج نہیں۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے اسلام کے ارکان خمسہ (نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، قربانی) کی فکر انگیز و سبق آموز توضیح کی ہے اور توجہ دلائی ہے کہ یہ تمام عبادات اُس جہادِ عظیم کے اجزائے ترکیبی اور عناصر مقومہ میں سے ہیں جس کا اطلاق رضائے الٰہی کے حصول کی ہر جد و جہد پر ہوتا ہے خواہ وہ پُر امن ہو یا ہنگامہ خیز۔

مؤلف کا انداز فکر بڑا اثر انگیز اور مستقیم ہے۔ ان کی دلسوزی و دردمندی نے سادہ مطالب کو بھی کافی دلکش اور جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ اسے شوق و ذوق سے پڑھا جائے۔

رنج یہ ہے کہ اچھے کاغذ اور ڈھنگ کے کاتب کا انتظام نہیں کیا جا سکا۔ کاغذ رف ہے۔ کتابت و طباعت ناقص ہے۔ خصوصاً عربی کتابت تو بالکل ہی گئی گذری ہے۔

صراطِ مستقیم

یہ بھی مؤلف مذکور ہی کی تالیف ہے۔ یہ دراصل سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جس میں فاضل مؤلف نے خلوص و دردمندی کے ساتھ اُن مطالب و مفاہیم کو نمایاں کرنے کی

[illegible] باب [illegible] سے ملی ہے جو ام الکتاب سورۂ فاتحہ کے بلیغ متن سے مستنبط ہوسکتے ہیں۔ خاص طور پر ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تشریحات نہ و دار اور وقیع ہیں۔

صفحات ۱۹۲ (ناول سائز) کاغذ رف۔ لکھائی اچھی چھپائی غیر معیاری۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ناشر:۔ تعمیری کتب خانہ۔ اردو بازار۔ راولپنڈی۔

فلسفۂ دعا

● مصنفہ:۔ پروفیسر فضل احمد عارف ایم۔ اے
● شائع کردہ:۔ مکتبہ رشیدیہ۔ غلہ منڈی منٹگمری

سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۴۷۔ کاغذ سفید۔ قیمت مجلد چار روپے۔

ویسے تو ہمیں "فلسفے" کے لفظ سے چڑ ہے۔ جن حقائق کو کھولنا بتانا مقصود ہو انھیں "فلسفے" کا عنوان دیدو عملی افادیت کا قصہ خود بخود تمام ہو جائے گا۔

مگر اس نادر تالیف میں "فلسفے" کا لفظ اس بربادکن مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی اور تفحص کے بعد ایک بیش قیمت چیز پیش کی ہے۔ "دعا" پر آج تک کوئی کتاب اس انداز کی نظر سے نہیں گذری مؤلف نے مشرق و مغرب سب کو کھنگالا ہے اور اپنے موضوع پر کثیر مواد پیش کیا ہے۔ ابواب کے عنوان ہی کتاب کی جامعیت اور بسط کا اعلان جلی ہیں۔

باب اوّل:۔ دعا کی حکمت اور افادیت۔

اس باب میں دعا کے متعلق دنیا کی مشہور شخصیتوں کے احساسات و افکار پیش کئے گئے ہیں۔

باب دوم:۔ اسلام کا تصور دعا۔

یہ باب اسلام کے مخصوص و ممتاز تصور دعا سے بحث کرتا ہے۔

باب سوم:۔ قبول دعا کے طرق۔

یہ باب اسلامی انداز فکر کی بڑی فکر انگیز ترجمانی کرتا ہے

باب چہارم:۔ قرآنی دعاؤں کے خصائص۔

باب پنجم:۔ قرآنی دعائیں۔

ہر باب وقیع اور گنجینۂ معلومات ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے اور ان کی سعی کو مقبول فرمائے۔

کہیں کہیں بعض عبارتیں نظر ثانی کی بھی محتاج ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۵ پر ہے:۔

"موجودہ دور میں تو دعا کی قدر و قیمت و ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ تباہکاری آلاتِ جنگ کی وجہ سے دنیا کا امن خطرے میں ہے۔ جنگ کے سیاہ بادل اُفق عالم پر منڈلا رہے ہیں اور جوہری جنگ کا نتیجہ کشت حیات کی مکمل تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مگر اس یاس آفریں ماحول میں بھی اُمید کی ایک کرن چمک اُٹھتی ہے اور یہ دعا ہے بلاشبہ عالمی جنگ کے اس خطرے کو پُر خلوص دعائوں ہی سے ٹالا جا سکتا ہے۔"

یہ عبارت نہ تو اسلوب کے اعتبار سے بلند پایہ ہے نہ فکر کے اعتبار سے کوئی وزن رکھتی ہے بلکہ گستاخی معاف اس میں بچکانہ انداز اُبھر آیا ہے۔ وہ شخص ذہنی اعتبار سے بچہ ہی کہلائے گا جو یہ گمان کرے کہ لامحدود تکوینی مصالح پر مشتمل نظامِ امن و جنگ کے سلسلہ میں دعائیں بھی کچھ کام آسکتی ہیں۔ جس طرح بارش، آندھی، طوفان قدرت کے نظامِ تکوین کے اجزائے لاینفک ہیں اور دعائیں ان کی ہمہ گیر تکوینی تکنک پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں اسی طرح جنگ بھی نظامِ فطرت کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی خاص موقع پر کسی محدود قسم کی جنگ اور آویزش کے خطرے پر دعا کوئی اثر ڈال سکے لیکن وہ ہولناک جنگ جس کا تذکرہ مؤلف نے کیا ہے سنۃ اللہ کے زمرے کی چیز ہے جس میں ہزار دعائیں بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتیں یا مثلاً:۔

"آج یو۔ این۔ او۔ میں دھواں دار تقریروں کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کارخانوں میں آتشیں اسلحہ سازی کی حاجت ہے بلکہ ڈاکٹر نیبر DR NIEBUHR کے نقطۂ نظر کے مطابق ان پرسوز دعاؤں کی ضرورت ہے جو ہمارے باطن میں انقلاب پیدا کرکے ہمارے دشمنوں کو بھی یقین دلا دیں کہ ہم امن پسند ہیں۔ دشمن کی تخریبی نیتوں اور ارادوں کو بدلنے کی خاطر دعاؤں سے بخوبی کام لیا جا سکتا ہے [illegible]"

یہ گل افشانیاں بہت بھلی ہیں جو [illegible] شایان نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]

غیر یہ مقصد [illegible] ہیں ہے باطن
میں انقلاب دعائیں نہیں لاتیں انسان کا مسلسل کردار لاتا ہے۔
مسخرے ہیں وہ لوگ جو اس خوش فہمی کا اظہار کرتے ہیں کہ جس جنگ وجدل کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے غالب قوموں کا خود غرضانہ اندازِ فکر، مفاد پرستانہ زاویۂ نگاہ اور خدا فراموشانہ تصورِ حیات سرگرم کار ہے اس کے سلسلہ میں دعائیں بھی کچھ کر سکتی ہیں۔ عاجز کی رائے تو یہ ہے کہ جو شخص اگلی عالمگیر جنگ کے نہ ہونے کی دعائیں کرتا ہے وہ تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں کرتا۔

صفحہ ۲۸ پر:—

"دعائیں اطمینان قلب کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کے حضور میں جو دعائیں بھی کی جائیں گی ان میں غیر ضروری خواہشات کو دخل نہیں ہوگا۔"

یہ کیا بات ہوئی۔ سٹرے کو یہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دعائیں کم سے کم ساٹھ فیصدی غیر ضروری ہی خواہشات کیلئے کیجاتی ہیں۔

صفحہ ۲۹ پر — اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب کے ترجمے میں "الا" کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے حالانکہ یہ اس جملہ کی جان ہے۔

اس طرح کی فروگذاشتیں اور بھی ہیں۔ متعدد مقامات اسو جہ سے بے مزا ہوگئے ہیں کہ وہاں برجستگی اور روانی کی بجائے آورد اور نجاد کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ضروری نہیں تھا کہ ہر وہ قول جو موضوع سے تعلق رکھتا ہو کسی نہ کسی طرح داخلِ کتاب کر ہی دیا جائے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کتاب کی قدر و قیمت مشکوک ہے۔ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور دلچسپ ہے۔ ہم اسے من حیث المجموع ایک سعیٔ مشکور قرار دیتے ہیں۔

تحریک خصوصی اشاعت

کمیونزم کے نظریاتی اور عملی فلسفے کی فتنہ انگیزیوں کو متین و مدلل طور پر واشگاف کرنے والا ماہنامہ "تحریک" اب کوئی غیر معروف جریدہ نہیں رہا ہے جس کے تعارف کی ضرورت ہو۔ اس کے مدیر جناب گوپال متل کو اشتراکیت کی قہرمانیوں سے اتنی ہی شدید بیزاری ہے جتنی کسی شریف اور باضمیر انسان کو ہونی چاہئے۔ ان کا "تحریک" اس لحاظ سے ہند و پاک میں منفرد حیثیت کا مالک ہے کہ وہ [illegible] ملک کی مسلسل نقاب کشائی" اور کمیونزم کے خلاف [illegible] طرزِ فکر کی بیخ کنی کے لئے وقف ہے۔

کچھ دنوں پہلے تک روس کا رونا تھا۔ اب چین کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ نظریاتی اعتبار سے بھی جنگ ہی کو کمیونزم کی پیش رفت کے لئے مناسب بلکہ ناگزیر سمجھنے والا ملک ہے بلکہ اس کی جارحیت ہمارے ملک کے لئے ایک عذاب مستقل بنتی جا رہی ہے۔ خطرناک بات یہ ہے کہ خود ہمارے ملک میں ایسے تاریک خیال اور غلط بین لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کمیونزم کے گن گاتے ہوئے چین کی صریح مدح سرائی میں پیش پیش ہیں اور احمقوں کی وہی جنت ان کا بھی مسکن و مامن ہے جس میں رہ کر آدمی حقائق سے آنکھیں بند کر کے چند خوشنما نعروں اور ظاہر فریب خوش کلامیوں سے لو لگاتا ہے۔

ابھی خیر سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے اپنی کتاب کا انتساب چین کے صدر ماؤ سی تنگ کے نام فرمایا ہے۔ کیسی بے حیائی، ڈھٹائی اور خر مستی ہے کہ اس انتساب کی راہ میں نہ تو چین کی بھارت دشمنی حائل ہوئی نہ پروفیسر صاحب کو یہ سوچنے کی توفیق ہوئی کہ وہ ایک ایسی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں جس کے نام میں "مسلم" کا لفظ سرِ عنوان ہے۔ اس یونیورسٹی کا نمک کھاتے ہوئے خدا بیزار چین کے صدر سے گہری عقیدت کا اعلانِ جلی کرنا بے کرداری ہی نہیں بد کرداری کے دائرے میں بھی آتا ہے۔ جہل مرکب کی مثالیں دنیا میں کم نہیں ہیں، لیکن اس سے بڑا جہل مرکب اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ یہاں بیٹھکر روس اور چین کے قصیدے پڑھے جائیں۔

تحریک کی اس خصوصی اشاعت کا مقصد اسی جہل مرکب کو ناقابلِ تردید دستاویزی شواہد سے واشگاف کرنا ہے۔ باریک لکھائی کے ۱۳۵ صفحات میں ادارۂ تحریک نے ایسی ہی چیزیں جمع کی ہیں جو دو اور دو چار کی طرح واضح کرتی ہیں کہ جبر و تشدد اور بھیانک ترین آمریت کی راہ میں چین بھی روس ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ ایسا ہونا حیرتناک نہیں بلکہ ایسا نہ ہوتا تو جائے حیرت تھی۔ آگ کی فطرت جلانا ہے۔ اسی طرح کمیونزم کی فطرت جور و قہر، سفاکی، انسانیت دشمنی، مطلق [illegible] اور جلادی ہے۔ کمیونزم دو قدم نہیں چل سکتا اگر وہ [illegible]

اس خصوصی اشاعت کی فہرست مضامین بہت مختصر ہے کیونکہ بہت سا انبار کباڑ جمع کرنے کی بجائے ادارۂ تحریک نے چند تجزیے پیش کی ہیں جو مبسوط و مفصل بھی ہیں، دلچسپ بھی اور دستاویزی اعتبار سے جاندار بھی۔

حرف اول کے بعد پہلا مضمون خود گوپال متّل کا ہے جس میں انھوں نے بڑی عرق ریزی سے یہ دکھلایا ہے کہ چین میں ادیبوں شاعروں اور دانشوروں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہمارے بعض ہم وطن کمیونسٹ نظم و نثر کے ذریعہ یہ بشارت دیتے ہیں کہ چین کی جنت میں ارباب فن اب چین کی بنسری بجا رہے ہیں اور پچھلے جاگیردارانہ نظام کی غلامی سے چھوٹ کر انھوں نے آزادی کی راحت بخش فضا میں سانس لیا ہے۔ لیکن دوسرے بے شمار شواہد کی طرح گوپال متّل کا یہ مقالہ بھی شہادت دیتا ہے کہ کسی بد سے بدتر جاگیردارانہ نظام میں بھی ادیبوں اور عالموں کے پیروں میں اتنی وزنی بیڑیاں کبھی نہیں پڑیں جتنی موجودہ اشتراکی نظام نے ڈالی ہیں اور دانشور ایسی کتے کی موت کہیں نہیں مارے گئے جیسے اشتراکیت کی جولانگاہ میں مارے جا رہے ہیں۔ اٹھارہ صفحات کا یہ بیش بہا مقالہ وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ طرز نگارش کے کیا کہنے۔ گوپال متّل اپنا انفرادی انداز رکھتے ہیں اور نازک سے نازک جذباتی موقعے پر بھی سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہ ضرور ہے کہ اس مقالہ میں کہیں کہیں ان کی نگارش ترجمے کا سا انداز اختیار کر گئی ہے۔ جیسے:—

"قبرستانوں میں اجتماع اور اظہار خیال کی آزادی
شکی مزاج سے شکی مزاج حکمرانوں کے لئے ایک قابلِ
اعتبار تجویز ہو سکتی ہے۔" ص ۲۴

یا۔ "کمیونسٹوں کو اس وقت ذی وقار اور ذی شہرت
عالموں کی مدد کی ضرورت تھی خواہ وہ خاموش ہو یا
برملا۔" ص ۲۰

"تمدن" کو انھوں نے مؤنث لکھا ہے ہمارے خیال میں یہ بلا اتفاق ہے۔

دوسرا مقالہ "چینی کا ادیب ..." ہے جس میں مصنف نے سو سے متعدد ابواب میں قابل اعتماد حوالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ چینی ادیب کس ہمہ گیر دباؤ کا شکار ہیں۔ انھیں کس ہولناک طریقے سے ذہنی غلامی کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے اور ادنیٰ سی سرتابی کے نتیجے میں وہ کس طرح شدید عذاب اور دار و گیر کا شکار ہوتے ہیں۔

تیسری بیش قیمت چیز "دھان کا گیت" ہے جو ایک ناول ہے۔ اس کی مصنف ایک ایسی چینی ادیبہ ہے جو ۱۹۵۲ء تک چین ہی میں مقیم رہی۔ یہ ناول بس اسلوب اظہار ہی کے اعتبار سے ناول کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقتاً ایک المناک ٹریجڈی ہے جس کا تعلق محض خیال سے نہیں واقعات سے ہے۔ بڑا خوبصورت، دلچسپ اور اثر انگیز ناول ہے جسے پڑھ کر آنسو ضبط کرنے مشکل ہیں۔

آخری مضمون "گھن گرج" ہے جس کے چینی مصنف "جی وانگ" نے یہ بتایا ہے کہ کمیونسٹ چین کے اساتذہ و طلباء کے ذہنی رجحانات کیا ہیں، ان کی اکثریت نے توپوں اور بموں کے سہارے قائم رہنے والے کمیونزم کی حیوانی تعلیمات کو قبول نہ کرنے میں کس جرأت کا ثبوت دیا ہے اور کس طرح وہ ابھی تک کمیونزم کے اس انقلابی تصور کو ہضم کرنے سے منحرف ہیں جس کا ماحصل ظلم و تشدد، انسان کشی اور اخلاق بیزاری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

حق یہ ہے کہ تحریک کا یہ بیش قیمت نمبر وقت کی وہ اہم ترین ضرورت پوری کرتا ہے جسے پورا کرنے کی توفیق دوسروں کو نہیں ہے۔ چشم فلک نے آج تک اشتراکیت جیسا ناپاک نظام نہیں دیکھا۔ ڈکشنریوں میں ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو کمیونسٹوں کی شقاوت، انسانیت دشمنی، فرعونیت اور گراوٹ کی کما حقہ ترجمانی کر سکیں۔ ہم گوپال متّل کو ان کی لگن اور تب و تاب کیلئے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور بہت دنوں جیتے رہنے کی دعا دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ نظریاتی میدان میں جو اسلام کمیونزم کو شکست فاش دے سکتا تھا اس کے حاملین غفلت کی نیند سو رہے ہیں اور اگر کہیں کسی مسلم مملکت میں برائے نام ہی جگا رہے بھی تو وہ بجائے خود مفاد پرستی اور خود غرضی کی بنیاد پر استوار ہے۔

ہم محض رسماً نہیں بلکہ دلی خواہش کے ساتھ ہر شخص سے ...

کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ خصوصی اشاعت بلکہ ماہنامہ تحریک بجائے خود ایسا جریدہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ تعاون دینا چاہئے۔ اس کا سالانہ چندہ بھی زیادہ نہیں صرف چار روپے ہے جب کہ یہ سفید کاغذ پر بہت سا مواد لئے ہر ماہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔ اس خصوصی اشاعت کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ لیکن خریداروں کو غالباً ان کے سالانہ چندے ہی میں پیش ہے۔

پتہ:۔ دفتر ماہنامہ تحریک۔ دریا گنج۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ دہلی۔

زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک

● تالیف:۔ مولانا الحاج شیر محمد شاہ صاحب سندھی۔
● شائع کردہ:۔ مولانا قاری غلام محمد یوسف صاحب نورگت ترکیسری تبلیغ آفس۔ صوفی باغ۔

صفحات ۴۹۴ سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ سفید۔ قیمت سات روپے

شیخ وقت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تالیف زبدۃ المناسک حج کے مناسک و مسائل پر ایک مشہور ترین کتاب ہے۔ کئی سال ہوئے مولانا شیر محمد صاحب نے اس کتاب کے مطالب ضروریہ مع کچھ اضافات کے اپنی تالیف قرۃ العینین میں جمع کیا تھا۔ اب یہی کتاب دیگر اضافات مفیدہ کے ساتھ مندرجہ بالا نام سے شائع کی گئی ہے جس کے دو حصے ہیں اور دونوں ہی کو بینڈنگ کرا کے مکمل کتاب کی شکل دیدی گئی ہے۔

اس تکمیلی ایڈیشن کی قدر و قیمت کو مؤلف کی اس کاوش نے دوبالا کر دیا ہے کہ حواشی پر فقہ کی معروف کتابوں مثلاً شامی فتح القدیر اور عالمگیری وغیرہ سے وہ عبارتیں درج کی گئی ہیں جو بیان شدہ مسائل کا فقہی ماخذ ہیں۔

ہم کتاب کو حرفاً حرفاً نہیں پڑھ سکے لیکن متعدد مقامات سے بغور مطالعہ کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ حضرت مؤلف کی اردو نثر قدرے قدیم انداز کی ہے اور کوئی لائق گرفت چیز نظر نہیں آئی۔ پوری کتاب کے متعلق بہتر رائے قائم کرنے کے لئے مولانا بدر عالم کی فہیم کی وہ چند لفظی رائے کافی ہے جو کتاب ہذا کے شروع میں دی گئی ہے:۔

"مولانا شیر محمد صاحب کو میں حج کے مسائل میں امام مانتا ہوں جیسے تحریک موجودہ زمانے میں حج کے مسائل کی یہ کتاب عظیم الشان خدمت ہے۔"

مولانا بدر عالم جیسے متدین بزرگ جس کتاب اور مصنف کے بارے میں ایسی تقریظ فرما دیں اس کی ثقاہت میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ عربی حواشی کی طباعت و کتابت بیشتر جگہ غیر معیاری بلکہ ناقص ہے جبکہ اردو متن کا یہ حال نہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں تأمل نہیں کہ اپنے موضوع پر یہ کتاب لاجواب ہے۔ عوام و خواص دونوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ردّ بدعت

● تالیف:۔ پروفیسر محمد فرمان۔ ایم۔ اے۔
● ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ مجددیہ۔ نور پور شرقی گجرات
● صفحات ۷۲ ● سائز ۲۰×۲۶/۸۔ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی متوسط قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہٗ کے نام نامی سے کون مسلمان واقف نہیں فاضل مؤلف نے آپ ہی کی تعلیمات کی روشنی میں بدعت و سنت کے موضوع پر ایمان افروز گفتگو کی ہے بڑا مفید مواد جمع کیا ہے۔

حضرت مجدد رقم فرماتے ہیں:۔

"علماء نے کہا ہے کہ بدعت دو قسم کی ہے حسنہ اور سیئہ حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسّلام کے زمانے کے بعد پیدا ہوا ہو اور وہ سنت کو رفع نہ کرتا ہو لیکن یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت مشاہدہ نہیں کرتا۔ ظلمت اور کدورت کے سوا کچھ مشاہدے میں نہیں آتا۔" (ص ۲۵)

گویا تبصرہ نگار جو مدت سے بار بار دہرا رہا ہے کہ بدعت کو حسنہ اور سیئہ دو قسموں میں تقسیم کرنا محض ایک لفظی مغالطہ اندوزی ہے ورنہ کسی فعل کا شرعی اصطلاح کے مطابق بدعت بھی ہونا اور حسنہ بھی ہونا اجتماع ضدین کے سوا کچھ بھی نہیں اس حقیقت کو عرصہ ہوا مجدد الف ثانیؒ طرح طرح سے واضح فرما چکے ہیں۔ تبصرہ نگار بھی دراصل ایسے ہی بزرگوں کا خوشہ چیں اور قرآن و سنت کا غلام ہے ورنہ اتنی شدت اور اصرار کے ساتھ بدعت کی تقسیم مذکور کو فریب و تلبیس کا نام کبھی نہ دیتا

اور فرماتے ہیں:-

"جب تک بدعت حسنہ سے بدعت سیئہ
کی طرح پرہیز نہ کریں تب تک اس دولت اطمینان
نفس کی بوشمام جان تک نہیں پہنچ سکتی" ص۲۸

ایسے ہی ایسے جواہر ریزوں سے مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات مالامال ہیں اور پروفیسر محمد فرمان صاحب نے رد بدعت اور اثبات سنت کی خاطر ان ہی جواہر ریزوں میں سے کچھ اس کتاب کے سلک مضامین میں پرو دیئے ہیں۔ بدعت کیا ہے؟ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ' بدعت کے نقصانات' بدعت اور سنت' کشف اور احکام دین کا تعلق' حضرت مجددؒ کا طریق کار اور عہد مجددی کی چند بدعات ـــــ ان عنوانوں کے تحت بڑے کام کے اقتباسات جمع کئے گئے ہیں۔

کتاب کے بعض پیروں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ کتاب نہایت عمدہ ہے اور ترویج بدعت کے موجودہ دور میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

دریا نگسی بہتا رہا

● مصنف:- نان کنگ پو۔
● مترجم:- جلیس عابدی۔

صفحات ۲۰۸ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی غنیمت۔ ایک روپیہ
ناشرین:- نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج دہلی

یہ ایک چینی ناول ہے جو کہنے کو ناول ہے مگر فی الحقیقت لہو دیتے ہوئے زخموں کی طرف ایک بھرپور اشارہ ہے جو نزم کے حیوانی فلسفہ نے انسانیت کے تن سیمیں پر لگائے ہیں لسی ایک دریا کا نام ہے جس میں طوفان آتے رہتے ہیں۔ ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں چین کی موجودہ نسٹ حکومت کس طرح ذی روح' ذی حس اور ذی شعور انسان کو لوہے اور پتھر کی طرح استعمال کرتی ہے اسی المناک رلا دینے والی ٹریجڈی کا خاکہ یہ ناول پیش کرتا ہے۔ فنی اس ناول کا ایک نہایت لطیف رومان ہے' لیکن فاضل مصنف ہد کے تانے بانے اس کے ارد گرد اس طرح پھیلائے ہیں کہ نکی ایک رلا دینے والی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی صد حیف کمیونزم نے شرف انسانی کے کسی بھی گوشے کو پامال کئے بغیر نہ چھوڑا۔ عورت کا پیار' بہن کی معصوم محبت' ماں کی ممتا باپ کی شفقت بھی کچھ تو اس کے بنائے استبداد کی ٹھوکروں پر اس طرح ذلیل و مقہور ہے کہ کلیجہ منھ کو آتا ہے ـــــ لاریب کہ انسانی تاریخ نے اتنا وسیع نظام جبر اور ایسا ہمہ گیر طغیان کبھی نہیں دیکھا ہر اصول اخلاق' ہر انسانی قدر' ہر تصور عدل کے منکر کمیونسٹوں کی سفاکی' شقاوت اور درندگی نے کروڑوں انسانوں پر زندگی کا میدان تنگ کر دیا اور لطف یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ مقاصد رذیلہ حاصل نہ ہو سکے جن کی خاطر شیطنت کا کھیل کھیلا گیا تھا اور کھیلا جا رہا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقیوں کا پروپیگنڈہ کتنا ہی کیا جائے' خلائی جہازوں اور اسپٹنکوں کے ذریعہ آسمان میں تھگلی لگانے کی مساعی کتنی بھی کامیاب ہوں لیکن روس اور چین دونوں ہی کے باشندے ضروریات زندگی تک کیلئے پالتو گائے اور بھینس سے زیادہ محتاج ہیں۔ وہ سسک رہے ہیں۔ انکا ہر فطری جذبہ' ہر امنگ' ہر خواہش ایک پتھریلے اقتدار کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ "دریا نگسی بہتا رہا" ناول ہونے کے باوجود کوئی خالص تفریحی چیز نہیں ہے' بلکہ اپنی دلچسپ کہانی میں صداقتوں کا ایک قیمتی سرمایہ سمیٹے ہوئے ہے۔ کسی اور کے بارے میں تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا مگر تبصرہ نگار تو اسے پڑھتے ہوئے اپنے آنسو نہیں روک سکا۔ دل کیسے پارہ پارہ نہ ہو وہ مظلوم و مقہور عوام بھی تو آخر ہمارے جد امجد حضرت آدم ہی کی اولاد اور گوشت پوست ہی کے انسان ہیں جن کی رگ رگ پر کمیونزم چرکے لگا رہا ہے۔ انھیں تڑپا تڑپا کر ذبح کر رہا ہے۔

قاعدے کے مطابق تبصرے کے لئے دو نسخے آئے تھے ہم نے جس نسخے کو پڑھا تھا اتفاق سے وہی نسخہ ایک عزیز اٹھا لے گئے اور تبصرہ لکھتے وقت یہ ہمیں میسر نہ آسکا۔ اسی میں ہم نے حسب عادت بعض خامیوں پر نشان لگائے تھے۔ اب وہ نسخہ ہی سامنے نہیں تو نشان زدہ مقامات پر اظہار رائے کیسے کریں ـــ مگر یہ بہر حال کہہ سکتے ہیں کہ ان نشانوں کا تعلق بہت معمولی جزوی خامیوں سے تھا۔ یہ خامیاں ناول کے مقصد اشاعت اور دلچسپی میں حائل ہونے والی نہیں ہیں۔ ہم نیشنل اکاڈمی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس نے یہ کتاب پیش کی [illegible]

لٹریچر میں نہایت وقیع اضافہ کیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ورنہ عام معیار کے مطابق یہ کتاب دس روپے کی ہونی چاہئے تھی

ناظرین یہ کتاب اور کمیونزم کی حقیقت آشکارا کرنے والی دوسری کتابیں مکتبہ تجلی سے بھی منگا سکتے ہیں۔ مکتبہ ان کتابوں کو صرف تجارتی ہی نقطۂ نظر سے نہیں اس یقین کے ساتھ فروخت کرتا ہے کہ ان کو پھیلانا ثواب بھی ہے اور خدمتِ ملک و قوم بھی۔

تحقیق مزید بسلسلۂ خلافت معاویہؓ و یزید

● مصنفہ:- جناب محمود احمد عباسی۔
● شائع کردہ:- مکتبہ محمودیہ 1/26 بی ایریا۔ لالوکھیت۔ کراچی ۱۹
● سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ رف۔ صفحات ۲۹۶ علاوہ مقدمہ۔ ● قیمت مجلّد آٹھ روپے۔

اس کتاب پر ماہنامہ میثاق (لاہور) کا تبصرہ قارئین جولائی ۶۲ء کے تجلّی میں ملاحظہ فرما چکے۔ ہم مطالعہ کے بعد جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ مذکورہ تبصرے سے مختلف نہیں ہے۔ جو شخص موروثی معتقدات، مبالغہ آمیز تصورات اور جوشِ فراواں کے عناصر سے بنے ہوئے شیشوں کی عینک اُتار کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ بعض جزئیات سے تیئں اختلاف کرسکتا ہے لیکن منہ پھاڑ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ مصنف نے علم و تحقیق کا حق ادا نہیں کیا ہے۔

شیعی اوہام و اکاذیب نے تاریخ اسلام، حرمتِ صحابہؓ، تقدیس رسولؐ اور دین و ایمان کے اجسادِ مطہرہ پر کہاں کہاں کیسے کیسے ڈنک مارے ہیں یہ داستان بڑی دردناک ہے ہمارے اچھے اچھے اسلاف بھی فرطِ معصومیت میں شیعی آئیڈیالوجی کا شکار ہوئے بغیر نہ رہے اور آج اہلِ سنت ہی کے معتقدات میں کتنے ہی ایسے عقائد شامل ہیں جنھیں وہ خود تو بڑا پاکیزہ و معتدل تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اُس زہر کی مانند ہیں جو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا ہو۔

حد ہے کہ وہ امام وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سرا ہی جو ازالۃ الخفاء کے صدہا صفحات میں اہلسنت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے گئے ہیں آخر میں جب فضائل و مناقب کی منزل میں آتے ہیں تو حضرت علیؓ کی توصیف میں برملا ایسی روایات سپردِ قلم کرتے چلے جاتے ہیں جن کا دور از کار ہونا بہت ہی ظاہر ہے۔ جناب محمود احمد عباسی نے اس صورتِ حال کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ خاصا وزندار ہے اور اس سے یہ قیاس کرنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک ثقہ اور فہیم عالم بھی حالات کے دباؤ اور خارجی محرکات و عوامل کی اثر اندازی سے کس طرح اثر پذیر ہو سکتا ہے۔

حضرت علیؓ کے تعلق سے شیعوں اور سنیوں میں فرق یہ ہے کہ شیعہ تو حضرت علیؓ کو معبودیت کے سنگھاسن پر بٹھا کر تمام صحابہؓ کی آبرو اور محاسن و مناقب کو ان کے پائے ناز پر نچھاور کئے ہوئے ہیں اور سنی حضرات بزعم خود معبودیتِ علیؓ کی منزل سے بہت دُور ہیں۔ لیکن شیعی پروپیگنڈے کی قوت کا لوہا ماننا پڑتا ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں توسط اور اعتدال کا دعویٰ رکھنے والے سنیوں نے بھی بیسیوں ایسی روایات کو سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے جو اپنے منطقی نتائج اور نفسیاتی اثرات کے اعتبار سے اسی منزل کی طرف لے جانے والی ہیں جس منزل پر شیعی فکر ملتِ اسلامیہ کو لے جانا چاہتا ہے اور ان روایات کا کوئی مستحکم رشتہ اُس موقف و مسلک سے نہیں ہے جس کا دعویٰ سنیوں کی زبانوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود احمد عباسی کی تہلکہ انگیز کتاب "خلافت معاویہؓ و یزید" کو پڑھ کر اچھے اچھے دانشمند سنیوں کے قلوب میں جذبات کا وہ طوفان اٹھا کہ علم و عقل غرق ہو کر رہ گئے اور اس کے رد میں ایسے ایسے مضامین و رسائل تصنیف کئے گئے جن پر علم و تحقیق قیامت تک ماتم کرتے رہیں گے۔ وجہ یہی ہے کہ سنیوں نے غیر شعوری طور پر خود ہی تضادات پال رکھے ہیں اور انھیں نبھانے کیلئے وہ ایسی منطق بگھارنے پر مجبور ہیں جسے اندھی عقیدت و محبت کے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔

"تحقیق مزید" کے مؤلف نے اولاً اُن برگزیدہ اصحاب رضی اللہ عنہم کی فہرست مع مختصر سوانح پیش کی ہے جو امیر یزید کے دور میں بقیدِ حیات تھے۔ ان میں ازواجِ مطہراتؓ بھی ہیں اصحابِ عشرہ مبشرہؓ بھی ہیں۔ اصحابِ بدرؓ بھی ہیں۔ اصحابِ بیعتِ رضوانؓ بھی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تعداد ۲۷۲ ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ اصحاب اس میں شامل نہیں کئے گئے ہیں جن کے سنینِ وفات کتبِ تاریخ میں نہیں ملتے

ظاہر ہے کچھ نہ کچھ ان میں سے بھی دورِ یزید میں زندہ رہے ہونگے اس طرح تقریباً تین سو صحابہ رضؓ کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عہد یزید میں زندہ تھے اور ان میں سے ایک نے بھی حضرت حسین رضؓ کے خروج کو نہیں سراہا۔ ان کا ساتھ نہیں دیا۔ انھیں ان کے اقدام میں حق بجانب نہیں مانا۔ بلکہ بعض نے نکیر کی سمجھایا بجھایا۔ اعتراض کیا۔

اب جس کا جی چاہے یہ مانے کہ تمام صحابہ رضؓ دین کے تقاضوں سے بے خبر تھے۔ اکیلے حسین رضؓ ہی نے دین کو سمجھا اور یزید کے خلاف خروج کیا اور جس کا جی چاہے یہ مانے کہ تمام صحابہ رضؓ کا بے خبر، نافہم اور بے شعور ہونا مستبعد ہے اقرب یہ ہے کہ حضرت حسین رضؓ ہی سے اجتہاد میں غلطی ہوئی۔

اس کے بعد مصنف نے بعض مشہور و مقبول مگر موضوع یا محرّف روایات کا پول کھولا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بنی اُمیّہ تو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور ان کا ایمان دباؤ اور مجبوری کا تھا اس کی تردید میں مصنف نے مستقل باب قائم کر کے نہایت مضبوط اور دل نشین دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بنو اُمیہ سابق الایمان ہونے میں بھی بنو ہاشم سے پیچھے نہیں رہے آگے ہی رہے۔ دورانِ بحث میں فاضل مؤلف شیعی تصورات و عقائد کی جو جھلکیاں ان کے معتبر علماء کے حوالوں سے دکھاتے جاتے ہیں وہ اُن سنیوں کے لئے آئینۂ عبرت ہیں جنھیں پتا ہی نہیں کہ حضرت علی رضؓ کے بارے میں ان کی عقیدتمندیوں کا ذہنی سانچا تیار کرنے میں شیعی فنکاروں کی کاریگری کو کس قدر دخل ہے۔ سخت حیرت ہوتی ہے جب دیکھتے ہیں کہ اہلِ سنت جن کتب تاریخ کو "اپنا" سمجھتے ہیں اور انکی مدد سے حضرت علی رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کا ایک بہت ہی بلند و برتر ذہنی خاکہ تیار رکھتے ہیں وہی اُن خرافات و اکاذیب کو بھی اپنے وسیع دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جن سے شیعی تصورات کو غذا ملتی ہے اور اہلِ سنت کے صحیح ترین عقائد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مثلاً شیعی لٹریچر میں روایت ملتی ہے کہ حضور نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا:۔

"تم میرے بھائی ہو، میرے وزیر ہو، میرے وصی ہو، میرے وارث ہو اور میرے بعد میرے خلیفہ ہو۔۔۔

اب یہی روایت ابن جریر طبری کی تاریخ اور تفسیر دونوں میں ملاحظہ فرمائیے۔ حالانکہ اس کا من گھڑت ہونا اتنا ہی واضح ہے جتنا صبح کے بعد شام کا آنا۔ اگر یہ صحیح ہو تو پھر شیعہ سنی جھگڑا کیا رہا۔ خلافت ایک خاندانی و موروثی شے ہو گئی اور خلفاء ثلاثہ شیعوں کی تصریح کے مطابق غاصب ٹھیرے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

تاریخ کے قیمتی جواہر بکھیرنے اور واہی روایات کا جائزہ لینے کے بعد مصنف نے بڑی تحقیق سے ایک گوشوارہ مرتب کیا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ یزید کے بالمقابل حضرت حسین رضؓ کا خروج اگرچہ اسلام میں حاکمانِ وقت کے بالمقابل خروج کا پہلا واقعہ ہے لیکن بعد میں حضرت حسنین رضؓ کی اولاد اور دیگر علویوں نے امویوں اور عباسیوں کے خلاف بہت سے خروج کئے ہیں ان کی تعداد ٦٦ ہے۔ کس نے کس کے خلاف کس سن میں خروج کیا یہ پوری تفصیل مصنف نے دی ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کے خروج کی داستانیں بیان کی ہیں، جو حسنی اور حسینی ہونے کے مدعی رہے ہیں۔

اس تجزیہ کا وہی کا حاصل یہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کو اپنی موروثی جاگیر سمجھنے کا زعم باطل برابر دسیسہ کاریاں کرتا رہا ہے اور شیعیت کا ترقی یافتہ مذہب اسی بنیادِ باطل پر استوار ہے۔

خاتمے پر مصنف نے سن وار ایک فہرست اُن امرائے حج کی پیش کی ہے جنھیں ۸ھ یعنی دورِ رسالت سے لیکر ۱۳۱ھ تک حج کی امارت کا امتیازی شرف حاصل ہوا۔ اس فہرست میں دیکھئے غالب ترین اکثریت امویوں ہی کی نظر آئے گی۔ یہ بھی ہر باخبر جانتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں بنی امیّہ ہی کو کثرت سے ذمہ دارانہ مناصب تفویض ہوئے۔ یہ اٹل تاریخی صداقت ثابت کرتی ہے کہ اللہ نے بنو امیہ کو حکمرانی کی مخصوص صلاحیتوں سے خوب خوب نوازا تھا۔ اب جسے اللہ کی یہ مشیت ناگوار ہو وہ اللہ سے شکوہ کرے۔ تاریخی حقائق کا چہرہ مسخ کرنا اور دن کو رات کہنا آخر کہاں کی خدمت دین ہے۔

"خلافت معاویہ رضؓ و یزید" میں مصنف نے تاریخ کو [illegible] کرنے کا ایک قاعدہ بیان کیا تھا جس کے ذریعے بعض [illegible]

سمجھ پاتے ہیں۔ بعض حضرات تو اسے بسبب اختصار سمجھ نہیں سکے اور بعض نے قصداً اس میں کج بحثی کی۔ مصنف نے کج بحثی کا جواب دیتے ہوئے اس قاعدے کو پھر سے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کتاب کی تکمیل کے بعد وہ متعدد مضامین منسلک کئے گئے ہیں جو اس موضوع پر تجلی یا کسی اور جریدے میں چھپ چکے ہیں انہیں چونکہ خلافت معاویہؓ و یزید پر کئے گئے متعدد اعتراضات کا جائزہ ہے اس لئے انھیں بھی کتاب کا تتمہ ہی سمجھنا چاہئیے۔

فرض تبصرہ ادا نہیں ہوگا اگر ہم ان گوشوں کا بھی ذکر نہ کردیں جو ہمارے لئے خوشگوار ثابت نہیں ہوئے۔

(۱) شروع میں بابائے اردو مولوی عبدالحق ؒ کے ایک خط کا فوٹو شائع کیا گیا ہے۔ عاجز کے خیال میں کتاب کا لٹریری مزاج اس خط کے رنگ و بو سے توافق نہیں رکھتا۔

(۲) اُس فوٹو کی بھی ضرورت نہیں تھی جس میں بابائے اردو اور خود مصنف تشریف فرما ہیں۔ کیوں ضرورت نہیں تھی؟ — اس کا جواب ہم نہیں دیں گے۔

(۳) بعض روایتیں کتاب میں ایسی شامل ہیں جو تفہیم و توضیح کی متقاضی تھیں۔ مثلاً صفحہ ۶۵ پر وہ روایت جس میں بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر سنکر فرط مسرت میں حضرت عائشہ کو چوم لیا تھا یا صفحہ ۶ پر وہ روایت جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ صرف عائشہ ہی ہیں جن کے لحاف میں ہوتے ہوئے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔

یہ روایات بالکل درست ہیں لیکن توضیح و تفہیم کے بغیر یہ ان لوگوں کو زبان اعتراض دراز کرنے کا موقع دیتی ہیں جن کے زاویہ ہائے فکر و نظر فتنۂ انکار حدیث نے کج کردئیے ہیں۔

(۴) بعض ایسی روایتیں جو مصنف کے موقف و مسلک سے ٹکراتی ہیں ان کا نقد کہیں کہیں تشنہ رہ گیا ہے جبکہ بعض اجزائے موضوع کا ذکر و بیان خاصا طویل ہوتا چلا گیا ہے۔

تبصرہ طلب کتابوں کا اتنا ہجوم ہوگیا ہے کہ بہت مفصّل تبصرے دشوار ہیں۔ حاصل تبصرہ یہ سمجھئے کہ "تحقیق مزید" اپنے مواد اور تحقیقی اجزاء کے اعتبار سے ایک ایسی کتاب ہے جو غیر جانبدار محققین کیلئے تاقیامت ایک ماخذ، ایک مستدل ایک سنگ میل کا کام دے گی پڑھئیے اور غور کیجئے کہ کن کن حقائق کو جھٹلا سکیں گے۔ نعرے اچھالنا اور جھاگ اُڑانا آسان ہے، لیکن سنجیدگی سے دلائل کا سامنا کرنا ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

بیگم عظیم زبیری

معدہ و جگر کی درستگی کی تدابیر

معدہ اور جگر کی درستگی پر تمام اعضاء جسم کی تندرستی کا انحصار ہے۔ کیونکہ جملہ اعضاء جسم کی خوراک کا معدہ ہی کفیل ہے۔ ہر عضو کے لئے غذا کا انتظام معدہ ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ جب معدہ اور جگر کا فعل بگڑ جاتا ہے تو غذا ہضم ہو کر جزوِ بدن نہیں بنتی۔ خون کی پیدائش کم ہو جاتی ہے اور کمزوری حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو مختلف امراض غالب آ کر زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ اس زمانے میں جو مردانہ و زنانہ مخصوص بیماریاں عام ہیں ان کے اسباب میں معدہ و جگر کی خرابی بھی ایک بڑا سبب ہے بڑھی ہوئی کمزوری سے مردانہ مخصوص امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا زور پکڑ جاتے ہیں اور تجربہ یہ ہے کہ جب تک معدہ و جگر کا فعل درست نہیں کیا جاتا یہ امراض پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جب مخصوص بیماریوں کی بات چھڑ ہی گئی تو اتنا اور سن لیجئے کہ جو معالج مریض کے معدہ و جگر کے فعل کو درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے بلکہ اندھا دھند مغلظ اور مقوی معجونیں سفوف، حلوے اور ایسے وغیرہ مریض کو استعمال کراتے ہیں وہ مریض کا پیسہ لوٹتے ہیں اور اس کی رہی سہی صحت کا بھی ستیاناس کر ڈالتے ہیں آپ خود سنجیدگی سے سوچئے تو سہی کہ کوئی شخص مخصوص بیماری میں مبتلا ہے۔ معدہ و جگر کا فعل خراب ہے۔ ہلکی غذا بھی دیر میں ہضم ہوتی ہے، خون کم بنتا ہے اور عام تندرستی بگڑ چکی ہے تو ایسی حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ معدہ و جگر کی اصلاح کی جائے نہ یہ کہ مغلظ دوائیں اور مقوی حلوے کھلائے جائیں اس قسم کا معالجہ اس وقت مفید پڑتا ہے جب عام صحت زیادہ بگڑی نہ ہو، معدہ و جگر کا فعل ٹھیک ہو۔ بدن میں خون کی کمی معمولی نہ ہو۔ پس اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی صحت برقرار رہے بگڑی تندرستی سنور جائے۔ یا مخصوص بیماریوں سے چھٹکارا حاصل ہو تو آپ سب سے زیادہ توجہ معدہ و جگر کی درستگی پر دیجئے۔ وہ دوائیں استعمال کیجئے جو معدہ و جگر اور آنتوں کا فعل درست کریں تاکہ غذا صحیح طور پر ہضم ہو کر جزوِ بدن ہو۔ یہاں ایسی دواؤں میں جوارشِ سنبل الطیب ہے جو فولادی ہیں۔ بیس سال سے ان کا تجربہ کیا جا رہا ہے سینکڑوں مریض ان کے استعمال سے ٹھیک ہو چکے ہیں۔ المختصر اپنی محنت، مشقت کی کمائی اناڑی معالجوں کے پھندے میں پھنس کر برباد نہ کیجئے اپنا باقاعدہ علاج کیجئے۔

ذیل میں معدہ و جگر کی درستگی کی تدابیر لکھی جاتی ہیں اگر آپ ان پر عمل کرتے رہے تو حکیموں اور ڈاکٹروں کے آستانہ پر حاضری کی ضرورت بہت کم ہو گی۔

(۱) اگر آپ ایک وقت گوشت۔ مچھلی۔ انڈا۔ میدا چاول۔ دھلی دالیں۔ تلی ہوئی اشیاء استعمال کریں تو دوسرے وقت سبزیاں، دودھ، اور پھل ضرور کھائیے تاکہ جسم کا کیمیاوی توازن قائم رہے۔

(۲) روٹی موٹے اور بغیر چھنے آٹے کی استعمال کیجئے اگر آٹا باریک ہو تو پاؤ بھر آٹے میں دو دو تولے کے تناسب سے بھوسی اور (چھان) ملوا لیا کیجئے۔

(۳) دالیں ہمیشہ چھلکے دار کھائیے (۴) موسمی پھل ضرور روز کھائیے۔ پھلوں میں ضروری نہیں کہ آپ سیب موسمی، سنترہ اور انگور ہی استعمال کریں۔ امرود، ٹماٹر، گاجر کیلا کھا سکتے ہیں (۵) جب بھوک محسوس ہو غذا تب ہی کھائیں (۶) گھبراہٹ۔ غم و غصہ اور تھکن کی حالت میں خواہ تھکن جسمانی ہو یا دماغی کھانا ہرگز نہ کھائیے اور اگر ایسی ہی جلدی ہو تو تازہ یا نیم گرم پانی سے ہاتھ منہ اور پاؤں اچھی طرح دھو کر عصبی تناؤ رفع کر لیجئے۔ پھر آہستہ آہستہ نوالے کو اچھی طرح چبا کر کھائیے (۷) خون کی کمی اور معدہ و جگر کی کمزوری میں گھی۔ مکھن اور دالیں کم سے کم استعمال کیجئے

موسم کی
تبدیلی کے
دنوں میں
صافی
استعمال کیجیے
صافی آپ کو خون کی خرابی سے
پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچائے گی
اور آپ کے نظامِ عصبی میں توازن
پیدا کرکے آپ کے جسم میں تازہ خون
کی لہر دوڑا دے گی۔ معدے کے فعل
کو درست کرے گی اور جسم کو چست
اور پھرتیلا بنائے گی۔
دلّی - کانپور - پٹنہ

Regd. No. A- 972 *Sep. '62*

TAJALLI MONTHLY

DEOBAND, U. P

62 "

Annual Rs 7

دیہاتی مُعالج
Hamdard
PUBLICATION
PART 1

روغن اکسیر دماغ

روغن اکسیر دماغ کوئی معمولی اشتہاری تیل نہیں قیمتی جڑی بوٹیوں اور مفید اجزاء کا مرکب ہے جو دماغی قوت اور بالوں کے لئے ٹانک کی حیثیت رکھتا ہے۔

دائمی نزلے کو دور کرتا ہے۔ بے خوابی رفع کر کے میٹھی نیند سُلاتا ہے۔ دماغی کام کرنیوالوں کیلئے خاص تحفہ ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ ۸۷ پیسے

ڈاک خرچ ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ

ہلال فارمیسی - دیوبند یو-پی

مایوسوں کے لئے بشارت

مفید، مجرب، قابل اعتماد علاج

تجربہ ہماری صداقت کی گواہی دے گا

اگر آپ مدتوں علاج ومعالجہ کے بعد ہمت ہار کر مایوسی وانتشار کی زندگی گذار رہے ہیں وقت کے تقاضے یا غیر محتاط زندگی کے باعث جسم کی طاقتیں زائل ہو رہی ہیں تو مندرجہ ذیل دوائیں استعمال کر کے اپنی زندگی کو شاد وخرم بنائیے۔

معجون نشاط زندگی۔ مکمل کورس .... دس روپے

محبوبی ــــ ستو گولیاں .... دس روپے

رسیقو ــــ ایک شیشی ڈھائی تولہ .... پانچ روپے

انیس نسواں ــــ مکمل کورس .... دس روپے

نیز جملہ امراض کا علاج ہمارے یہاں ہوتا ہے۔

حکیم ابوسعید عبید اللہ۔ اسلام نگر۔ ڈاکخانہ دربھنگہ ضلع دربھنگہ صوبہ بہار

ہمدرد کا ماءاللحم

بھوک کو بڑھاتا ہے اور دوران خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور جسم کے اندر ایک نئی طاقت انیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

دہلی
کانپور
پٹنہ

ماہنامہ **تجلّی** دیوبند

نمبر ۸ شمارہ — نمبر ۱۴ جلد

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے ۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے)

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا، منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہوجائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
دفتر تجلّی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ میناباز ار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپواکر دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا۔

آغازِ سخن

تجلّی جولائی ۶۲ء میں زکوٰۃ سے متعلق شمس نوید عثمانی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ہم نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدیر زندگی جناب مولٰنا عروج قادری بھی اپنے ماہنامے میں اس مسئلے پر تفصیلی اظہارِ خیال فرمائیں تو بہتر ہو۔ اس خواہش کی وجہ یہ تھی کہ سائل موصوف نے پہلے مدیر زندگی ہی سے زبانی یہ سوال پوچھا تھا اور انھوں نے جو جواب دیا تھا اس سے ہم کلّی اتفاق نہیں کر سکے تھے۔ جائے تشکر ہے کہ فاضل مدیر زندگی نے ہماری اس خواہش کا پاس کرتے ہوئے ستمبر ۶۲ء کے زندگی میں اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

یہ تو ہم نے اپنے مذکورہ جواب ہی میں عرض کر دیا تھا کہ معاملہ نازک و خفی ہے کوئی بعید نہیں ہمارے ہی فکر و تفقہ نے ٹھوکر کھائی ہو۔ اب مدیر زندگی نے وقیع عالمانہ نقد و نظر کے ذریعہ اور بھی زیادہ یہ بات قرینِ قیاس بنا دی ہے کہ قصور ہماری ہی کوتاہ فکری کا ہو اور وہ اپنی رائے میں باصواب ہوں۔

لیکن فی الحقیقت ہم ابھی تک اتنے مطمئن نہیں ہو سکے ہیں کہ اعتراف و رجوع کا اعلان کر کے اُن کے موقف پر صاد کر سکیں بلکہ ہمارا خیال ہے یہ مسئلہ ابھی مزید دراست اور مذاکرے کا طالب ہے۔ انسب تو یہی ہوتا کہ آج ہی کی صحبت میں ہم اپنی معروضات پیش کر دیتے، لیکن حالات کچھ ایسے پیش آئے ہیں کہ اس پورے مہینے میں بعض غیر متعلق مصروفیات نے ہمیں بُری طرح الجھائے رکھا ہے جس کے نتیجے میں یہ شمارہ بھی چند روز لیٹ ہو گیا ہے اور زندگی کے مطالعہ کی نوبت بھی اتنی دیر میں آئی ہے کہ مفصل اظہارِ خیال کی گنجائش اس شمارے میں باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اجمالاً کچھ کہا جا سکتا تھا، لیکن اجمال نہ تو زیرِ گفتگو مسئلہ کے تصفیے میں سازگار ہوگا نہ قارئین پوری طرح لطف اور فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ لہٰذا زندگی اور عافیت رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ اس باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ قارئین یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ بیٹھے بٹھائے ایک نئی بحث اور نئے جدل کا دروازہ کھُل گیا۔ یہ بحث و مناظرہ نہیں مذاکرہ اور تبادلۂ خیال ہے۔ اس سے ناظرین کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ فقہی مباحث کتنی دِقّتِ نظر اور بیدار ذہنی کے متقاضی ہوتے اور یہ بھی اندازہ ہوگا کہ علمی اختلافات میں فریقین کو کس حلم و برداشت، کس انکسار و اخلاص اور کس رواداری و متانت کی راہ اختیار کرنی چاہئیے۔ آج کل غلبۂ نفسانیت کے باعث یہ فساد بڑا عام ہو گیا ہے کہ ہر فرد اور گروہ چھوٹے اور بڑے، اصولی اور فروعی تمام مسائل میں اپنے ہی کو سراپا صدق و صفا، یکسر محفوظ عن الخطاء اور اخلاص و للّٰہیت کا مکمل ٹھیکے دار سمجھتے ہوئے دوسروں کی ٹوپیاں اُچھالتا ہے، بغلیں بجاتا ہے پھبتیوں، طعنوں اور رسوائی کے تیر چلاتا ہے۔ گمراہی اور فسق کے فتوے داغنے سے بھی باز نہیں رہتا اس فساد سے کسی نہ کسی درجے میں تو مسلمانوں کا ہر فرقہ اور ہر حلقہ ملوّث ہے یہاں تک کہ ہم خود اپنے آپ کو بھی مستثنا نہیں کرتے ہم بھی نفسانیت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، ہم سے بھی لغزشیں ہوا رہتی ہیں، لیکن سب سے بڑا مرکز و منبع اس فساد کا بدعتی حلقہ ہے۔ وہ بدعتی حلقہ جس نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، امام ابن تیمیہؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا اشرف علیؒ اور ان جیسی دوسری معظم شخصیتوں کو نہ صرف بدعقیدہ بلکہ کافر کہا، نہ صرف انھیں کافر کہا بلکہ ہر اس شخص کو کافر کہا جو ان حضرات کے کفر میں شک کرے۔ یہی وہ حلقہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت، حیاتِ قبر اور اسی نوع کے متعلق مباحث کا دروازہ کھول کر امت کو لایعنی امور میں پھ

مناظرہ وجدل کے ایسے مظاہر پیش کئے کہ اگر دورِ فاروقی لوٹ
آتا تو ان لوگوں کے بدن کی کھالیں درۂ فاروقی کی مار سے
دُھنی ہوئی روئی کی شکل اختیار کر جاتیں۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ بد کلامی،
پلید الذہنی اور احمقانہ تعصبات کا یہ زہر دوسرے حلقوں میں
بھی پھیلا۔ احناف، اہل حدیث، دیوبندی، سہارنپوری
سب بقدر ظرف اس سے اثر پذیر ہوئے، بدعتی اگر دیوبندیوں
کی تذلیل و تفضیل میں بے لگام ہیں تو دیوبندی جماعت اسلامی
اور مولانا مودودی کی تفسیق و تحقیر میں کف در دہن۔ اہل حدیث
احناف کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور احناف کے بعض کارہی گر
اہل حدیث کے بارے میں احتیاط و نجابت سے بلند ہو کر
زبان اور قلم کے رہوار دوڑاتے ہیں۔ زہر کی تھیلیاں ہر
گروہ کی آستین میں ہیں بس فرق کم و بیش کا ہے۔ نفسِ امارہ
کی دسیسہ کاریاں ہر سمت زوروں پر ہیں بس فرق ضعف و
شدت کا ہے۔ یہی مجادلہ و مبارزہ، یہی نفرت و افتراق،
یہی خود پرستیاں اور بے لگامیاں ہماری رسوائیوں کا مصدر،
ہماری نکبتوں کا سرچشمہ اور ہمارے زوال و انحطاط کا مرکزِ
مبنیٰ ہیں۔ ان کی آخری تہہ میں اُتریئے تو معلوم ہوگا کہ انھیں
خدا فراموشی کے فساد نے جنم دیا ہے۔ خدا کو یاد رکھنے کی طرح
یاد رکھنے والے کبھی خود پرست، بے رحم اور ہٹ دھرم نہیں ہوتے۔
وہ دوسروں کی سنتے اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں،
اپنی خطاؤں کو بارد تاویلات کے پردے میں نہیں چھپاتے
اور دوسروں پر فسق، کفر یا گمراہی کا فتویٰ داغنے سے پہلے
سو بار غور کرتے اور جھجکتے ہیں۔ انھیں احساس ہوتا ہے کہ عقل و
علم صرف ہماری میراث نہیں دوسروں کو بھی اللہ نے ان
نعمتوں سے نوازا ہے اور عین ممکن ہے کہ ہم ہی سے چوک
ہو رہی ہو۔

بات کہاں سے کہاں گئی۔ کہنا یہ تھا کہ زکوٰۃ کے ایک خاص
جزئیے پر جو مذاکرہ شروع ہوا ہے اسے مناظرہ کوئی نہ سمجھے۔ یہ
ایک تبادلۂ خیال، ایک افہام و تفہیم ہے جس کا مقصود اپنی
دسترس کی حد تک حکم شرعی تک پہنچنا ہے۔ دوسرے لوگ — اور
خود ہم بھی اگر دینی و علمی اختلافات میں ہمیشہ اعتدال و رافت،
عجز و ادب، سیر چشمی و شیریں زبانی اور غمگساری و دلداری
کی راہ اختیار کریں تو اس حدیث کا مفہوم کھل کر سامنے آسکتا
ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ میری امت کا اختلاف بھی رحمت
ہے (او کما قال)

ہاں اگست کے تجلی میں شمس نوید صاحب ہی کے سوال
کا جواب فنڈ کی زکوٰۃ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ مدیر زندگی کو
اس سے بھی اختلاف ہے جسے انھوں نے اپنے ایک عنایت
نامے میں ظاہر فرمایا ہے اگر انھیں اعتراض نہ ہوا تو ہم اس عنایت
نامے کو بھی شاملِ اشاعت کر کے جواب عرض کریں گے و باللہ
التوفیق۔

عامر عثمانی

مستقل عنوان　　　　عاصم عثمانی

تفہیم الحدیث

حسن اخلاق

(۳)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں :-

لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشاً ولا متفحشاً وکان یقول خیارکم احاسنکم اخلاقا

(بخاری، مسلم، ترمذی)

ترجمہ :-

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو خود بداخلاق تھے نہ بداخلاقی کو پسند فرماتے تھے۔ آپؐ کا کہنا تھا کہ تم میں سے بہتر وہ ہیں جنکے اخلاق عمدہ ہوں۔

تفہیم :-

فحش کاری کا اطلاق ننگے پن، بے حیائی اور فسق و فجور پر تو خصوصیت سے ہوتا ہے لیکن عمومیت کے ساتھ اس کے ذیل میں ہر طرح کی بداخلاقی داخل ہے۔ مثلاً ہم مہمان کے ساتھ کھلی بے مروتی برتیں، بزرگوں کے ساتھ بے توقیری سے پیش آئیں، چھوٹوں کے ساتھ سنگدلانہ سلوک کریں یہ سب فحش میں داخل ہوگا۔ جن اعمال و افعال کو اسلام نے صاف طور پر ناپسندیدہ قرار دیا ہے ان کا ارتکاب کرنا فحش کاری ہے۔ ضروری نہیں کہ عام دنیاوی اصطلاح کے اعتبار سے بھی اس میں ننگا پن ہو۔

اللہ کے رسولؐ سراپا اخلاق تھے اور یہ ایسا عقیدہ نہیں جو بطور حسن ظن قائم کر لیا گیا ہو بلکہ اس پر حضورؐ کی حیات مقدسہ کا ایک ایک لمحہ شاہد عدل ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات سیاست ہو یا تجارت حضورؐ ہر میدان میں مجسمۂ اخلاق ہی نظر آئیں گے۔ حق یہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے لفظی شکل میں حضرت جبریلؑ کے ذریعہ اتارا تھا اسی کے مفہوم و معنی کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی ہیئت میں تخلیق فرمادیا تھا۔ قرآن کے معانی کو ٹھوس اور محسوس شکل و صورت میں جسے دیکھنا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرے۔ اُس شخص سے زیادہ بدبخت بیہودہ اور گمراہ کوئی شخص نہیں ہو سکتا جو قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے حضورؐ کے اقوال و افعال کو نظر انداز کر دے۔

ظاہر ہے حضورؐ جب خود سراپا اخلاق تھے تو دوسروں کو بداخلاق دیکھنا کیسے پسند کر سکتے تھے۔ آپ نے مختلف پیرایوں میں متعدد بار یہ بات دہرائی ہے کہ تم میں سے وہی زیادہ بہتر ہے جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق اور تقویٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اللہ نے فرمایا۔ اَکْرَمُکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ تم میں سے جو شخص زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک زیادہ معزز ہے۔ حضورؐ نے تقوے کی تعبیر لفظ اخلاق سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ

اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ فعل و قول بداخلاقی میں شامل ہے جو اللہ اور رسول کو ناپسندہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ بطور دعا فرمایا کرتے تھے:۔

اللھم حسنت خَلقِی فَاَحسن خُلقِی (رواہ احمد)	اے اللہ آپ نے میری پیدائش اچھی کی تو میرے اخلاق کو بھی اچھا بنا دیجئے

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو چلتے وقت متعدد نصیحتیں فرمائیں اور سب سے آخر میں یہ نصیحت فرمائی:۔

یامعاذ اَحسِن خُلقَکَ لِلنّاس۔	اے معاذ عوام کے لئے اپنے اخلاق کو بہتر رکھنا۔

یہ مختصر سی نصیحت معنوی اعتبار سے نہایت جامع ہے اور چونکہ اسلامی اصطلاح کے مطابق اخلاق کے دائرے میں عدل، مروت، ادائگی حقوق اور اچھے کاموں میں معاونت بھی شامل ہے اس لئے ایک ایسے شخص کیلئے جسے حاکم بنا کر بھیجا جا رہا ہو اس سے بہتر اور بڑھکر نصیحت کوئی نہیں ہو سکتی جو حضورؐ نے فرمائی۔ تمام نصیحتوں کے آخر میں اسے ارشاد فرمانا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس نصیحت کو بنیادی سمجھا جائے اور ذہن میں جاگزیں کر لیا جائے۔

حضورؐ کو جوامع الکلم کہا گیا ہے۔ ہمارا موضوع اس وقت حضورؐ کا کمال فصاحت و بلاغت نہیں لیکن تفہیم الحدیث کے قارئین کو چاہئے کہ حضورؐ کے ہر ارشاد کو اس پہلو سے بھی ضرور دیکھا کریں کہ کس طرح آپ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بسیط و بلیغ معانی کو سمو دیا کرتے تھے اور بے ساختہ کہے ہوئے جملوں میں بھی کیسی بلیغ معنویت اور صنعت ایجاز ہوا کرتی تھی۔ بہت کم روایتیں ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے الفاظ من وعن ہم تک پہنچے ہوں ۔۔۔ مگر جب پہنچ گئے ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے جیسے قرآن ہی کے حسن بیان کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک نگینہ جگ مگ کر اٹھا ہو۔ اللہ اکبر۔ ایک امی۔ جسے پڑھنا اور لکھنا کچھ نہیں آتا جب زبان کھولے تو ایسے پھول برسائے جن کی نظیر گلستان تقریر میں دور دور نہ مل سکے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علی آلہ واصحابہ اجمعین۔

ایک اور فصیح و بلیغ حدیث ملاحظہ کیجئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اباذر لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالکف ولا حسب کحسن الخُلق (مشکوٰۃ)	اے ابوذر نہیں ہے کوئی عقل مانند تدبیر کے اور نہیں ہے کوئی تقویٰ مانند باز رہنے کے اور نہیں ہے کوئی حسب مانند خوش خلقی کے۔

+ + + +

تدبیر کہتے ہیں ایسے طریق کار کو جس میں بعد میں نکلنے والے نتائج کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ بے شمار کام ایسے ہیں جن کے قریبی نتائج تو خوشگوار ہوتے ہیں، لیکن اس خوشگواری کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انجام کار انسان سخت نقصان اٹھاتا ہے۔ علیٰ ہذا بعض کاموں کے قریبی نتائج خوشگوار نہیں ہوتے مگر بالآخر وہ نہایت عمدہ ثمرات لاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جس انداز فکر نے پوری دنیا پر قبضہ جما لیا ہے وہ تدبیر کی عین ضد ہے۔ یعنی فوری لذت و منفعت پر نظر اور مآل سے لاپروائی۔ بہت تیر مارا تو دس پانچ برس بعد کی بات سوچ لی۔ گر موجودہ زندگی کے خاتمے پر جس نئی زندگی سے دوچار ہونا ہے اس کو دائرۂ خیال سے خارج ہی کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام کی نگاہ میں اصل زندگی وہی ہے جسکو بہتر بنانے کے لئے ہمیں دنیاوی زندگی میں تدبیریں کرنی ہیں۔ اس اخروی زندگی کے علاوہ بھی اسلام کے تمام احکام میں دنیاوی زندگی کے دور رس نتائج و ثمرات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً سود ہے۔ جوا ہے۔ مرد و زن کا اختلاط ہے۔ شہوانی محرکات ہیں، دولت کا غیر معقول ارتکاز ہے۔ یہ امور فوری و ہنگامی لذت و منفعت کے لئے تو خوب ہیں اسی لئے موجودہ دنیا ان کی والہ و شیدا ہے لیکن اخروی زندگی سے قطع نظر اسی دنیا میں ان امور کے نتائج اس قدر خراب ہیں کہ خود تہذیب نو کے شیدائی بھی ان نتائج پر سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ جڑوں سے صرف نظر کرتے ہیں اور ثمرات کا رونا روتے ہیں۔ اسلام فتنوں کی جڑ ہی پر کلہاڑا چلاتا ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں لا عقل کالتدبیر کا مطلب صاف ہو گیا یعنی اعلیٰ درجہ کی عقل وہی ہے جو اپنے طریق کار میں قریب و دور کے تمام ثمرات و عواقب کا لحاظ رکھے نہ کہ وہ جو کہ مفاد عاجلہ پر ریجھ جائے اور بعید نتائج کی پروا نہ کرے۔ مسلمان کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی موعظت یہی ہے کہ تدبیر سے غافل مت ہو یعنی ہر فعل کے

تمام قریبی اور دُور رس نتائج کو نظر میں رکھو۔ آج اگر سود یا جوے سے تم نے کوٹھیاں اور کاریں فراہم کرلی ہیں تو یہ عقلمندی کی بات نہیں کیونکہ نتیجے میں تمھیں عذابِ الیم سے دوچار ہونا پڑیگا عقلمندی کی بات یہ ہے کہ جو بھی عیش کمانا چاہو حلال ذرائع سے کماؤ۔ جو بھی عمل کرو وہ ایسا نہ ہو جس پر آخرت کا مواخذہ قائم ہو۔ چند روزہ زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اور بعد مرگ کی دائمی زندگی کو نظر انداز کردینا پرلے سرے کی حماقت ہے چاہے بظاہر ایسے لوگ بقراط و ارسطو ہی نظر آیا کریں۔

(۲) ورع کا لکفّ سے مراد یہ ہے کہ زہد و ورع ترکِ دنیا کو نہیں کہتے۔ خود ساختہ ریاضتوں سے خود کو ضیق میں ڈالنا ورع نہیں ہے۔ ورع اصل میں یہ ہے کہ جن امور سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے ان سے رکے رہو۔ حرام کے پاس مت پھٹکو۔ حلال پر جمے رہو۔ یہی ہے زہد و ورع اور اخلاق و تقوی۔ ایک شخص شب و روز عبادت کرتا ہے مگر ایک یا ایک سے زیادہ امورِ ناجائز سے بھی ملوث ہے تو اس کا زہد و ورع ناقص ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ شخص زاہد و متورع ہے جو بہت زیادہ عبادت گذار تو نہ ہو، مگر ممنوعاتِ شرعیہ سے اپنا دامن بچائے رکھتا ہو۔

(۳) حسب کحسن الخُلق (حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب و نسب نہیں) کا منشاء ظاہر و باہر ہے۔ مسلمانوں ہی کے جن حلقوں نے حسب و نسب کو مستقل ایک شرف بنا رکھا ہے وہ دراصل ہندو مت سے متاثر ہیں۔ اسلام میں حسب و نسب کی کوئی ایسی حیثیت نہیں ہے جیسی ہندو مت میں اعلیٰ ذات کی ہے۔ قرآن اور حدیث بار بار واضح فرماتے ہیں کہ اصل انسانی شرف تقوی میں ہے۔ حسنِ خلق میں ہے۔ نیکی میں ہے۔ ایک نکو کار جُلاہا، پٹھان، موچی، گھسیارا، غلام، حبشی اُس سیّد اور شیخ سے بہتر ہے جس نے بدکاری پر کمر باندھ رکھی ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور صحابہؓ کی نظر میں اُن قریشی اشراف کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا، لیکن وہ معمولی حسب و نسب والے آنکھوں کا تارا بن گئے جنھوں نے اسلام قبول کرکے حسن عمل کا ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سیّد نہیں تھے۔ لیکن امتِ محمدیہ کے ایک ناقابلِ لحاظ گروہ کو چھوڑ کر تمام سوادِ اعظم نے انھیں حضورؐ کے بعد سب سے بڑا انسان تسلیم کیا اور یہی سوادِ اعظم اس پر بھی متفق ہے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سیّد ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے کم رتبہ ہیں۔ حضرت علیؓ جو نہایت قریبی نسبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نسب ہیں انھیں بھی امت تینوں خلفاءؓ کے بعد ہی گنتی ہے پہلے نہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ عظمت و فوقیت کا جو اصول قرآن و حدیث نے دیا تھا امت نے اسی کو رہنما بنایا اور اُن لوگوں کی حیثیت اسلام کے باغیوں کی سی ہے جو حسب و نسب کو سب سے بڑا شرف قرار دینے کے درپے رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اخبرکم باحبّکم الیّ واقربکم منّی مجلساً یوم القیامۃ۔ فسکت القوم فاعادھا مرّتین اوثلاثاً قال القوم نعم یارسول اللہ قال احسنکم خُلقاً (اخرجہ احمد وابن حبان)	عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ــ "کیا میں تمھیں بتاؤں کہ قیامت کے دن کون مجھے محبوب ہوگا اور کون میری مجلس میں زیادہ قریب ہوگا مجھسے؟"۔ پس مخاطبین خاموش رہے۔ حضورؐ نے اسی بات کو دو یا تین مرتبہ دہرایا تب مخاطبین نے کہا ہاں یارسول اللہ ضرور بتائیے۔ حضورؐ نے فرمایا تم میں سے وہ شخص جسکے اخلاق زیادہ بہتر ہوں۔

+ + + + +

تفہیم:۔ عمرو ابن شعیب کے پردادا حضرت عمرو بن العاص ایک زبردست مدبر صحابی تھے۔ وہی اس حدیث کے راوی اول ہیں۔ حضورؐ کی عادت شریفہ تھی کہ اپنے اصحاب کے آگے وقتاً فوقتاً بشارتیں، وعیدیں، موعظت کی باتیں اور اہم نکات بیان فرماتے رہتے تھے۔ جب کسی بات پر زور دینا مقصود ہوتا تو یکلخت ارشاد فرمانے کی بجائے آپ سوالیہ انداز اختیار کرتے۔ سوالیہ انداز کا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب پوری طرح متوجہ ہوجاتا ہے۔ روایت میں جو یہ بیان کیا گیا کہ قوم (حاضرین مجلس) خاموش رہی تو اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ اس نے ارشاد رسولؐ پر التفات ہی نہیں کیا۔ صحابہ جانتے تھے کہ اس طرح کا سوالیہ انداز حضورؐ اسی وقت اختیار فرماتے ہیں جب کسی خاص بات پر متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے

ایسی حالت میں وہ عموماً یہ جواب دیا کرتے تھے کہ ہاں یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ لیکن اس طرح کی صورت چونکہ آئے دن پیش آتی رہتی تھی، اس لئے کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ صحابہؓ فرطِ توجہ میں رسمی اظہارِ آمادگی بھی بھول جاتے تھے اور سراپا گوش بن کر سماعت کے لئے تیار ہو بیٹھتے تھے۔ اس وقت بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ اہم باتوں کو مکرر اور سہ کرر فرمانا بھی حضورؐ کی عادتِ شریفہ تھی۔

قیامت کے دن جو وصف ایک مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب بنادے اور آپؐ سے قریب ترین کردے اسکی رفعت و افادیت کا کیا ٹھکانا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ وصف موجود نہ ہوگا وہ قیامت میں قربِ حضورؐ سے بھی محروم ہی رہے گا۔

قرب کی نعمت بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک شخص خوشگوار ہوا اور شامہ نواز خوشبو کے ماحول میں بیٹھا ہو۔ آپ کو اس کا قرب نصیب ہو جائے تو ہوا اور خوشبو سے آپ بھی لطف اندوز ہوں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ اللہ کی جو رحمتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ قیامت کے دن شدید گرمی، نفسا نفسی اور ہنگامے کا جو سخت ماحول ہوگا اس میں کسی شخص کا رسول اللہؐ کے قرب سے فیضیاب ہو جانا بھی اتنی عظیم نعمت ہے جس کا تصور بھی مشکل ہے۔

خوش مزاجی، شگفتہ روئی، تبسم، شیریں زبانی، رحم و رافت یہ سب اخلاقِ حسنہ کی نہ صرف شاخیں ہیں، بلکہ لوازمات میں سے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ میں یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور امت کو بھی آپؐ نے ان کی ترغیب فرمائی ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں:۔

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیخالطنا حتی یقول لاخ لی صغیر یا ابا عمیر ما فعل النغیر؟ (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی۔ الادب المفرد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بچوں سے خوب گھل مل کر باتیں کرتے تھے یہانتک کہ میرے بھائی سے پوچھا کرتے۔ اے ابو عمیر! تمھاری چڑیا کیا کر رہی ہے؟

+ + + +

کمسن ابو عمیر کے پاس ایک چڑیا تھی جسے وہ گاہے گاہے ساتھ لئے باہر نکلتے تھے۔

نغیر "لال" کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے اسے بلبل کا مرادف بتایا ہے، لیکن صحیح تر "لال" ہی ہے۔ جب ابو عمیر بغیر لال کے ہوتے تو حضورؐ مذکورہ فقرہ ارشاد فرماتے۔ اس فقرے میں مزاح کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ نُغَیر اور عُمَیر ہم قافیہ ہیں۔ ایک بچے سے جب یہ الفاظ متبسم انداز میں کہے جائیں تو ذہن ان سے ایک کیفیتِ نشاط قبول کرتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ فعل کی نسبت ابو عمیر کی طرف نہیں کی گئی یعنی یوں نہیں کہا گیا کہ ابو عمیر تم اپنی چڑیا کہاں چھوڑ آئے بلکہ ایسے الفاظ کہے گئے گویا معصوم چڑیا ابو عمیر کے ساتھ آنے نہ آنے کی مختار ہے۔ یہ بھی مزاحِ لطیف کا ایک معروف اسلوب ہے۔ منشا اس روایت کو حسنِ اخلاق کے تحت ذکر کرنے کا یہ ہے کہ بچوں سے شفقت، ملاطفت اور پیار سے پیش آنا بھی اخلاقِ حسنہ ہی کے زمرے میں داخل ہے۔ ایک طرف حضورؐ کے رعب و ادب کا یہ عالم تھا کہ جری سے جری آدمی آپؐ سے آنکھ ملانے کی تاب مشکل لا سکتا تھا۔ صحابہؓ کی نگاہیں آپ کے حضور جھکی رہتی تھیں اور کفار کے بڑے بڑے جیالے اور سورما آپکے آگے پہنچکر ساری ہیکڑی بھول جاتے تھے مگر دوسری طرف آپؐ کی شگفتہ روئی، نرم گفتاری اور خندہ جبینی کمال کی تھی۔ بولتے تو پھول برستے۔ تبسم فرماتے تو آس پاس کی فضا ایک موج نور سے دمک اٹھتی۔ یہ شاعرانہ مدح سرائی نہیں ہے۔ حضورؐ کو واقعۃً اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال کے ایسے زاویئے عطا فرمائے تھے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں:۔

جاء رجل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یستحملہ فقال انا حاملک علی ولد ناقۃ قال یارسول اللّٰہ ما اصنع بولد ناقۃ؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھل تلد الابل الا النوق (ترمذی۔ ابوداؤد۔ احمد)	ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سواری عنایت فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمھیں اونٹنی کے بچے پر سوار کراؤں گا۔ یہ شخص حیران ہو کر بولا حضورؐ میں اونٹنی کے بچے کا کیا کرونگا؟ حضورؐ نے فرمایا اے میاں اونٹ کو کو اونٹنی کے سوا کون جنتا ہے۔

مزاحِ لطیف کا یہ نمونہ حضورؐ کی خوش طبعی کی ایک مثال ہے۔ یہ

خوش طبعی اخلاقِ حسنہ ہی کے ذیل میں تھی۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جو لوگ لطیف قسم کے مزاح کو بھی سنجیدگی کے خلاف سمجھتے ہیں اور ناک بھوں چڑھائے بغیر بات کرنا پسند نہیں کرتے وہ غلطی پر ہیں۔ حضورؐ کا ہر وصف، ہر طبعی صلاحیت، ہر مذاق و رجحان پوری امت کے لئے معیار ہے۔ حجت ہے۔ جتنا صالح امتزاج حضورؐ کے اندر پایا جاتا تھا اس سے زیادہ کا تصور کسی بشر کے لئے ممکن نہیں۔ مناسب مواقع پر لطیف قسم کا مزاح، لوگوں سے خندہ جبینی کے ساتھ پیش آنا، شیریں زبانی، تواضع، علم، رافت و شفقت، یہ تمام اوصاف حسن اخلاق کے اجزائے ترکیبی ہیں اور وہ لوگ بدنصیب ہیں جو ان کے متضاد اوصاف میں سے کسی وصف کو پسندیدہ قرار دیتے ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ ہمہ وقت تیوری چڑھائے رکھتے ہیں۔ ان کو سلام کیجئے تو جواب ایسی گھٹی ہوئی مُردار آواز میں دینگے جیسے انھیں ہونٹ اور حلق استعمال کرنے میں بڑی مشقت اُٹھانی پڑ رہی ہو۔ بعض لوگ گفتگو کرتے وقت پیشانی پر بل ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ خد و خال سے ترشی اور بیزاری ٹپکتی رہتی ہے۔ نظروں کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے مخاطب کو بہت حقیر سمجھ رہے ہوں۔ یہ سب طریقے اور حرکتیں عدالتی سطح کا جرم نہ سہی لیکن ایمان و اسلام کے رُخ سے یقیناً معصیت ہیں۔ رسول اللہؐ کے اسوۂ و کردار کے خلاف ہیں۔ ہمیں لازماً حضورؐ ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہئے یہی سب سے بڑا شرف سب سے بڑی شائستگی سب سے بڑھکر معیاری طریق ہے۔ واللہ الموفق۔

تین کتابوں کا روح نواز سٹ

ان میں سے ہر کتاب عام فہم بھی ہے اور مستند بھی
مقبول عام ہونیکے باعث کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں

رسولِ عربیؐ ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ بارہ نئے پیسے
خلافت راشدہ (حصہ اول) ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
خلافت راشدہ (حصہ دوئم) ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
تینوں کی مجموعی قیمت تین روپے

محاسنِ اسلام

مولانا اشرف علیؒ کے ارشادات و مواعظ ہمیشہ حکمت و موعظت سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہ ایمان افروز کتاب بھی اس خصوصیت کی نمایاں طور پر حامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

حافظ ابو محمد امام الدین کی مفید تصنیفات

ان کے مطالعہ سے روح ایمان تازہ ہوتی ہے

سچے رسولؐ کی سچی تعلیم ۔۔۔۔۔۔ ڈیڑھ روپیہ
حضرت خدیجہؓ ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
حضرت فاطمہ زہرہؓ ۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
خاصانِ خدا کی نماز ۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
نماز کے فضائل ۔۔۔۔۔۔ پندرہ آنے
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
معلم نماز ۔۔۔۔۔۔ آٹھ آنے
حضرت بلالؓ ۔۔۔۔۔۔ دس آنے
مسلمان شوہر و بیوی ۔۔۔۔۔۔ بارہ آنے
اِن نو۹ کتابوں کی یکجائی قیمت

فارسی تعلیم کا ایک عمدہ نصاب

جس کے ذریعے آپ بغیر معلم کے بھی خود ہی اپنے بچوں کو فارسی سکھلا سکتے ہیں۔

اصول فارسی مکمل ہر دو حصہ ۔۔۔۔۔۔ سوا روپیہ
معین فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۴۴ پیسے
دروس فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۵۰ پیسے
نصائح فارسی ۔۔۔۔۔۔ ۶۲ پیسے
ترجمان فارسی ۔۔۔۔۔۔ ایک روپیہ
(مکمل نصاب کی مجموعی قیمت تین روپے باسٹھ ۶۲ نئے پیسے)

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم ”مسلمان“ ہیں؟

دس ہزار اسلامی مجاہدوں کا لشکرِ جرّار طوفانی رفتار سے مکّہ بڑھتا چلا آرہا تھا۔

قدموں کی مجاہدانہ دھمک سے کفر و شرک کی دنیا تہہ و بالا کرتا ہوا۔

ہتھیاروں کی چمک سے حق و صداقت کے دشمنوں کو چندھیاتا ہوا خدا کی عظمت و جبروت کے ولولہ انگیز نعروں سے جھوٹے خداؤں کا دل دہلاتا ہوا۔

اسلام کے کٹّر حریف — اس وقت تک کفر و شرک کے سرغنہ ابوسفیان نے فرازِ کوہ سے یہ ہوشربا منظر دیکھا تو ان کا خون خشک ہوگیا! — وہ خوب جانتے تھے کہ یہ دس ہزار مظلوموں کا زخم خوردہ لشکر ہے جس پر اسی مکّے کی سرزمین میں تیرہ سال تک وحشیانہ ستم ڈھائے جاچکے ہیں۔ بدترین سفّاکیوں کا یہ خونین پس منظر اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ ان کی نظروں میں گھومنے لگا۔

آگ — جس میں نحیف و ناتواں مظلوموں کی ہڈیوں کو تپایا اور جھلسایا گیا۔

سُرخ شعلے — انسان کی کروٹ کروٹ پر لپستے ہوئے چھالوں کی چھاپ ڈالتے اور آبلوں کے پانی سے بجھتے ہوئے — کوڑوں کی بے رحمانہ بوچھار — شائیں شائیں کی دلخراش آواز کے ساتھ مظلوم خون کی چھینٹیں اڑاتی ہوئی۔

لہولہان انسانی ڈھانچے تڑپ تڑپ کر فرشِ خاک پر گرتے ہوئے — جن کو کبھی جلتے ہوئے پتھروں سے باندھا گیا اور کبھی بھسکتے ہوئے ریت پر ننگا کر کے مردار جانور کی طرح گھسیٹا گیا

درد و کرب کی پکار پر زبان کے زہر آلود تیر — بھرپور ٹھوکریں عرصۂ حیات تنگ کرتی ہوئیں۔ ذلّت و رُسوائی کے شکنجے اور نفرت و حقارت کے طوق ایک ایک گردن میں پڑتے ہوئے۔

اوجھڑیوں اور غلاظتوں کے سڑتے ہوئے ڈھیر نماز پڑھنے والوں کے مقدس سر پر برستے ہوئے —

شعب ابوطالب کی خوفناک گھاٹی! — جہاں ان مظلوموں کو تین برس تک سماجی اور معاشی طور پر مکمل اچھوت بنا کر موت اور زندگی کے درمیان بُری طرح سسکایا گیا — جہاں ان کو آب و دانہ کے بجائے درختوں کی چھالیں اور بھُنے ہوئے سوکھے چمڑے کھا کھا کر خون تھوکنے پر مجبور کیا گیا۔

پھر جن کو وطن سے دھکّے دے کر نکال دیا گیا تھا ان کو پردیس میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، بلکہ جنگ کی آگ بھڑکا کر ان کے شہیدوں کی لاشیں لگاڑی گئیں — دل و جگر نکالے اور چبائے گئے — خدا کے عظیم ترین رسول ﷺ کو ... بے رحمی سے گھائل کر ڈالا گیا —

اور یہ سب کچھ اس گناہ کی سزا میں کہ ان کا گناہ کوئی نہ تھا

”اب کیا ہوگا؟ — —“

ابوسفیان وحشت و اضطراب کے عالم میں سوچ رہے تھے۔ انقلاب کی گرج نزدیک سے نزدیک تر آرہی تھی۔ زمانہ کروٹ لے رہا تھا — ظالم آج مظلوموں کے رحم و کرم پر تھے — جس سچائی کو ضعیف و ناتواں سمجھ کر نکالا گیا تھا وہ ایک طاقت کی شکل میں واپس آرہی تھی —

کون ہے جو ابوسفیان کی وحشت و بدحواسی کو بے جا کہے؟ — کیا حیوانیت و خونخواری کا جرم ایک لمحے کے لئے

بھی قابلِ معافی ہے؟ — پھر یہاں تو زندگی کا تیرہ سالہ جشنِ وحشت تھا جس کی ٹیسیں ان مظلوموں کے ایک ایک زخم میں محفوظ تھیں۔ یہاں گھائل جسم تھے۔ گھائل جسم ہی نہیں، ٹوٹے ہوئے دل بھی تھے۔ زخموں، چھالوں اور ناسوروں سے لدی ہوئی یہ تیرہ سالہ جاں کنی کیسے بھلائی جا سکتی تھی آخر؟ یہاں تو اگر ہر رگ و پے سے انتقام کی آگ شعلہ بار ہو جاتی تو کم تھا۔ آج تو انتقام ہی انصاف تھا — ظلم کی طاقتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی حق کوشی اور امن کیشی کا شاندار ثبوت تھا۔

لیکن ابوسفیان حیران تھے کہ نفرت و انتقام کی کوئی آواز اس لشکر کی طرف سے اب تک سنائی نہیں دی تھی! وہاں صرف ایک آواز تھی۔ انسان کی بندگی اور خدا کی خدائی کا بلند بانگ اقرار — خدا کی کبریائی کا نعرۂ پُرشوق! — ایک نعرہ جو ایک ہی جوش اور ایک ہی جذبۂ بیکراں کے عالم میں دس ہزار زبانوں پر جاری و ساری تھا — دس ہزار سینے ایک ہی حقیقت کی پکار سنا رہے تھے — ظالموں کی بستی کو اپنے فاتحانہ قدموں کے نیچے آتا ہوا دیکھ کر بھی ان کی مظلومیت کا سر غرور و تکبر سے اونچا نہ ہوا تھا، بلکہ اس عظیم انقلاب کو انسانی کارنامہ تصور کرنے کے بجائے وہ اسکو خدائے ذوالجلال کی قدرت سے منسوب کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ابوسفیان کو دل و دماغ سے اُبلتے ہوئے خوف و ہراس سے نجات نہ تھی — مجرم ضمیر کے اندر ہی اندر احساسِ جرم اور خوفِ سزا کے دھماکے ہو رہے تھے۔ نعرۂ تکبیر کی ہر آواز انکو آتش فشاں کے پھٹنے کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ جوش و خروش کی ہر نئی لہر میں ان کو خون کی طغیانی کا تھپیڑا لگتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اچانک اسلامی سپاہ کی طرف سے اسلامی پرچم اُٹھانے والے مجاہد کی آواز بلند ہوئی جس نے ابوسفیان کے اوسان خطا کر دیئے — یہ آواز انتقام کی پہلی اور آخری آواز تھی! — ایک انسان بیتاب ہو کر دس ہزار مظلوموں کی ٹیس سے چیخ اٹھا تھا — اعلان کر دیا تھا کہ انسانیت کے ڈاکوؤں کو مقدس زمین کی روایات میں پناہ نہ لینے دی جائے گی۔

"الیوم یوم الملحمۃ — آج کا دن — جنگ و جدل کا دن ہے۔ آج بیت اللہ کی حرمت اُٹھا دی جائے گی۔۔۔"

ابوسفیان نے یہ رجزیہ للکار سُنی اور تھرا گئے۔

"مارے گئے!" وہ کراہ اٹھے "ہلاک ہو گئے! — آج تو۔۔۔ ۔۔۔کعبہ۔۔۔ بھی پامال کر دیا جائے گا۔۔۔!"

"ٹھیرو!"

حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا — جو آنحضرتؐ کے حکم پر ابوسفیان کو اسلامی طاقت کا شاندار منظر دکھلانے کے لئے ان کو اس پہاڑ کی چوٹی پر اپنے ساتھ لائے تھے — "دیکھ رہے ہو! — اُدھر کیا ہو رہا ہے؟ یہ دوسری آواز سُنی تم نے؟"

ابوسفیان نے بیتابانہ سر اٹھایا تو سکتے میں رہ گئے۔

دور — اسلامی لشکر کے قلب میں خدا کا آخری رسولؐ شکر و فقر کے عجیب عالم میں تھا۔ سادہ سی اونٹنی پر وہ پیوند زدہ لباس میں دنیا کا انوکھا فاتحِ اعظم! — آج بھی زندگی کی اس شاندار کامیابی پر اسکو سر اُٹھا کر چلنا پسند نہ تھا۔ فرطِ شکر اور احساسِ بندگی سے جھکا ہوا سر اس طرح جھکا تھا کہ اُٹھتا ہی نہ تھا! — کائنات و حیات کے ذرّے ذرّے پر ایک قادرِ مطلق خدا کی خدائی کا اعلان کرنے والا اس وقت بھی بندگی کا اقرار کر رہا تھا جب انسانی طاقت اپنے شان و شکوہ کے نقطۂ عروج پر تھی۔ سچائیوں کا یہ فاتحانہ منظر آپؐ کے روئے مبارک پر مسرت کا نور بکھیر رہا تھا تو ہونٹوں پر یہ الفاظ اس دنیا کے بعد آنے والی دنیا کی حقیقت فاش کر رہے تھے "میرے اللہ! — سچا عیش تو عیشِ آخرت ہی ہے!—"

ایک ساعت کے لئے ابوسفیان اس حسین منظر میں کھو گئے — وہ بھول گئے کہ ابھی ابھی انھوں نے اسلامی پرچم اُٹھانے والے مجاہد سعدؓ بن عبادہ کی للکار میں موت اور ہلاکت کا فیصلہ سُنا تھا۔ لیکن پھر اچانک یہ آواز ان کو یاد آئی اور ان کے چہرے کی بیچارگی نے امید و بیم کی دو آتشہ کیفیت میں خاموش سوال کیا :-

"کیا رسولؐ کا یہ جذبہ دس ہزار انسانوں کے جذبات پر بھی غالب آ سکتا ہے؟ — کیا امن و رحمت کا یہ پیغام ان بیتاب دلوں کو موہ لے گا جو مظلومیت کی تیرہ سالہ گھٹی ہوئی چیخوں کو آج نعرۂ انتقام میں تبدیل کرنے کے لئے ظالموں کی تکا بوٹی کرنے چلے آ رہے ہیں؟ — کیا یہ طوفان بھی دب سکتا ہے جو اُمنڈ چکا ہے — کیا۔۔۔"

لیکن رسولؐ کی جاں نواز شخصیت کی بے پناہ تاثیر نے اس سوال کو

لفظ وبیان تک پہنچنے کا موقعہ نہ دیا — حالات وواقعات اس سوال کا پورا پورا جواب دینے کے لئے پوری قوت سے سامنے آگئے۔ ابھی الیوم یوم الملحمۃ کی انتقام انگیز آواز فضاؤں میں پوری طرح گونجنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور بلند وبالا آواز اس کو کچلتی ہوئی زمین وآسمان کے درمیان گونجتی چلی گئی — خوف وخشیت سے دہکتی ہوئی آواز — درد وکرب سے کسکتی ہوئی آواز — مقناطیسی کشش سے چھلکتی ہوئی بیتاب وبے قرار آواز!

"الیوم یوم المرحمۃ — الیوم یوم المرحمۃ! — آج کا دن رحم کھانے کا دن ہے — رحم کھانے کا دن ہے!! —"

یہ خدا کے رسولؐ کی پکار تھی — یہ حضرت سعدؓ بن عبادہ کی للکار کا بھرپور جواب تھا — یہ دس ہزار انسانوں کے امنڈتے ہوئے جذبات کے خلاف، سپاہ کے علی الرغم سالار کی آواز تھی — لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ آواز فضا میں گونجتی ہوئی سینوں کی گہرائیوں میں اتر گئی — روحوں میں سما گئی — دل ودماغ میں بس گئی اور دس ہزار دلوں کی بے شمار دھڑکنیں اسی آواز کے محور پر گردش کرتی ہوئیں دس ہزار زبانوں پر یہی آواز بن کر گونج اٹھیں — ہونٹوں کی ایک حسین حرکت نے دلوں کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا — نگاہ کے ایک اشارے نے جذبات کے بھرپور طوفانوں کا دھارا موڑ دیا تھا — وہ آنکھیں جن سے نفرت وانتقام کے خونیں جذبات چھلک نکلے تھے عفو ورقت کے آنسوؤں سے نم ہوگئیں — وہ ہاتھ جن میں ننگی تلواریں ظالموں کے خون کی پیاس سے زبانیں نکالے ہوئے تھیں وہی ہاتھ ان ظالموں کے سروں پر پیار سے تھپکی دینے لگے — وہی سینے جن کو مکافات کے جذبے نے امن کی دنیا تہ وبالا کرنے کے جوش سے سنسنا دیا تھا وہی سینے ظالموں کو پناہ دینے کے لئے فرط شوق سے پھٹنے لگے — انتقام کا نعرہ لگانے والا مجاہد پرچم اٹھانے کے اعزاز سے محروم کر دیا گیا اور وہ خود بھی پوری بیتاب فوج کے ساتھ رحمتِ عام کی صلائے عام بلند کرنے لگا۔ یہ نعرہ پھیلتا بڑھتا ہوا آخر دنیا کے اس عظیم ترین اعلانِ امن میں تبدیل ہوگیا جس میں نہ صرف ظالم سے ظالم شخص کو سر چھپانے کے لئے جگہ دی گئی تھی، بلکہ بدترین ظالموں کے گھروں کو "پناہ گاہ" کا شاہانہ اعزاز عطا کیا گیا تھا!

جس نے مقابلے سے دست کش ہوکر اپنا دروازہ بند کرلیا — امن میں ہے!

جو ابوسفیان کے مکان میں چلا گیا ——— ہاں وہ بھی امن میں ہے!

جو خانہ کعبہ میں داخل ہوا ——— امن میں ہے!!

جس نے ہتھیار ڈال دیئے ——— امن میں ہے!

جس نے گھر کے کواڑ بند کر لئے ——— امن میں ہے!

جو حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہوگیا ——— امن میں ہے!

جو ابی رویحہ کے پرچم تلے آگیا ——— امن میں ہے!!

امن! — امن!! — امن!!! ہر طرف امن کی پکار تھی — امن کی پکار عفو ودرگذر کا خزانہ لٹاتی ہوئی! — انسان کے خون کا احترام کرتی ہوئی پکار — سیاہ کاروں کو دامنِ کرم میں چھپاتی ہوئی — ظالموں کو سینے سے لگاتی ہوئی پیغمبرانہ پکار! — سارا مکہ اس دامن میں آگیا — ظلم وستم کی پوری دنیا پناہ لینے کے لئے محمد عربیؐ کے نرم ونازک دل میں آ چھپی! — اس دل میں ہر اس شخص کے لئے جگہ تھی جس نے اسی دل پر کاری سے کاری وار کیا تھا — یہ سینہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا تھا جس نے سفاکی واستبداد کے بدترین جنون میں اسی سینے کو زخموں سے چھاپ دیا تھا! — اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی رحمت کا چلتا پھرتا پیکر بن کر مکے میں داخل ہوئے اور صحنِ حرم میں اپنے چاروں طرف ظالموں کی خوں آشام بھیڑ کو آج عجز وبیچارگی سے گریبانوں میں سر ڈالے ہوئے دیکھا تو یہ منظر دیکھ کر آپؐ کا دل ان لوگوں کے لئے بھی رو دیا جو آپؐ کے مقدس خون سے اپنی نفرت کی پیاس بجھانے کے لئے درندوں کی طرح چنگھاڑتے پھرتے تھے۔

"لوگو! تمہارا کیا گمان ہے کہ محمدؐ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟" مفتوح آبادی کے ستم کاروں سے آپؐ نے جیسے ہی یہ سوال کیا سینوں پر جھکے ہوئے سر کچھ اور ڈھلک گئے — احساسِ جرم نے نظر اٹھانے اور آنکھیں چار کرنے تک کی جرأت سلب کر لی تھی — اخلاقِ کریمانہ کے آنسوؤں نے پتھر دلوں کو بھی پانی پانی کر دیا تھا لرزتی ہوئی آواز میں ہر طرف سے یہ کانپتی ہوئی بازگشت سنائی دی — اعترافِ خطا اور عفو طلبی کی آخری کراہتی ہوئی بازگشت!

"آپؐ سب سے زیادہ شریف النفس ہیں۔ آپؐ سب سے زیادہ معاف کرنے والے ہیں۔ ۔ ۔"

اپنے شدید درد مظلومی کو سینے میں دباتے ہوئے ـــ اپنے آنسوؤں کے سمندر کو پیتے ہوئے خدا کے رسولؐ نے ظالموں کو عفو و رحمت کی مسکراہٹ عطا کی اور اپنا گھائل سینہ عظیم ترین محبت کے ساتھ کھول دیا ـــ

"لا تثریب علیکم الیوم! ـــ آج تم پر کوئی دار و گیر نہیں ـــ جاؤ! ـــ تم سب آزاد ہو!"

اس "اسوۂ حسنہ" پر جان و دل نثار کرنے والے دس ہزار ایمان کے پروانے سپردگی و عقیدت کے ساتھ پکار اٹھے "ہاں ـــ تم پر کوئی دار و گیر نہیں! ـــ رسولؐ خدا کا یہ فیصلہ ہمیں بھی جان و دل سے منظور ہے۔"

رسالت کی نورانی شمع آج بھی تاریخ کی انجمن میں پوری آب و تاب سے روشن ہے۔

اسلام ـــ آج بھی اس تاریک روشنی کے دور میں محرومی کی آواز کو نشر کر رہا ہے ـــ

"مسلمان" آج بھی یہی اعلان کر رہا ہے کہ میں اس محبوب ترین شخصیت کا پروانہ ہوں۔

لیکن ـــ یہ "اعلان" آج حلق سے نیچے نہیں اترتا ـــ زبانوں پر سب کچھ ہے ـــ دلوں میں کچھ بھی نہیں!! ـــ پھر بھی ہمیں اصرار ہے کہ "ہم مسلمان ہیں!" ـــ یہ کوئی نہیں سوچتا "کیا ہم مسلمان ہیں؟" ـــ آستینوں میں نت نئے "بت" چھپائے ہوئے ہم کعبے کی طرف رخ کر کے نعرۂ تکبیر لگائے جا رہے ہیں کہ شاید دنیا توحید و رسالت کی طرف دوڑ سکے! ـــ اور دنیا ہماری آستینوں کی طرف اشارہ کر کے قہقہہ لگاتی ہے اور پوچھتی ہے۔ ـــ "کیا... تم مسلمان ہو؟ ـــ تم؟!"

تجلّی کی ڈاک

اصول پسندی یا شخصیت پرستی؟

سوال: ازعبد المغنی صاحب لکچرار شعبہ انگریزی پٹنہ کالج۔ پٹنہ ۵

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ابھی جولائی کے تجلّی میں سعید احمد اکبرآبادی صاحب کے فتنہ انگیز "سیاسی ارتداد" (بقول صوفی نذیر احمد کاشمیری) کی مؤثر تردید پڑھ کر نہایت مسرّت ہوئی۔ آئندہ شمارے میں حسب وعدہ مزید تردید کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ خدا آپ کے قلم کو سلامت رکھے۔ اس دور میں جب کہ سعید احمد اکبرآبادی جیسے عالم کا بھی ایمان اسلامی نظام کی حقانیت پر سے اُٹھ گیا ہے، آپ جیسے چند مردِ مومن کا دم بسا غنیمت ہے۔

میں طویل عرصے سے یا تجلّی کی تاریخ اشاعت سے ہی آپ کی تحریروں کا مشتاق طالب علم رہا ہوں اور آپ کے قلمی جہاد کو پسندیدہ نگاہِ تحسین سے دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن خلافت معاویہؓ و یزید کے معاملے میں کافی غور و فکر کے بعد بھی آپ کے موقف کا قائل نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں آپ کی تمام تحریروں کو اس کے علاوہ بھی دوسری موافقانہ و مخالفانہ تحریروں کو بغور پڑھ چکا ہوں، لیکن شدت بلکہ اضطراب کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہوں کہ اس معاملے میں آپ سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے۔ آپ کی نیت پر شک نہیں کر سکتا۔ مگر بصیرت کا قائل نہیں۔ ابھی جولائی ہی کے شمارے میں "میثاق" کے تبصرہ نگار کے اُٹھائے ہوئے سوالوں کا جو جواب آپ نے دینے کی کوشش کی ہے اس سے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے آپ خلافت معاویہؓ و یزید کی حمایت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور جب کبھی اس پر صحیح سے صحیح جہت سے بھی اعتراض ہوتا ہے تو فوراً کوئی نہ کوئی جواب ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر معلوم ہوتا ہے آپ کا یہ نقطۂ نظر بن گیا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے اقدامات بالکل غلط تھے اور حضرت معاویہؓ اور یزید کی حرکات بالکل صحیح۔ چنانچہ اب آپ اس مسئلے کے ہر جزیے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت، کتنی ہی مخلصانہ ہو، غلط ہے۔

آپ کے زیرِ نظر جوابات ہی کے حوالے سے چند حقائق جو مجھے بُری طرح کھٹک رہے ہیں عرض کرتا ہوں:۔

(۱) بحث صرف اس اصول سے ہونی چاہیئے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جس پر سنتِ رسولؐ اور اصحابؓ نے عمل کر دکھایا ہے نہ کہ لوگوں کی، وہ بجائے خود کتنے ہی بزرگ کیوں نہ ہوں، اکثریت و قلیت سے۔ حضرت معاویہؓ اور یزید کے مقابلے میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے اقدامات کے متعلق ان کے ہم عصروں کا کیا رد عمل ظاہر ہوا، قولاً یا عملاً، چنداں لائق اعتنا نہیں۔ دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ اپنے اقدامات میں اصولی طور پر کہاں تک حق بجانب تھے۔ اس سلسلے میں کسی مصلحتِ وقت کا حوالہ دینا سراسر غلط ہے۔

(۲) آپ نے حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں مسئلۂ قصاص کو اتنی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے گویا یہ خلافت کی بنیادی اصولوں میں ایک ہو۔ چنانچہ اگر حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قتلِ ناحق کا قصاص لیکر نہیں دکھا دیتے تو ان کی بیعت سے اعراض درست ہے۔ یہ بات اس صورت میں شاید اہم ہوتی جب یہ واضح اور متعین طریقے پر معلوم ہو جاتا کہ حضرت علیؓ

قتلِ عثمانؓ پر راضی ہیں۔ قاتلوں سے ساز باز کئے ہوئے ہیں اور قصاص کا ارادہ قطعاً نہیں رکھتے۔ کیا کوئی مسلمان یا صاحبِ فہم و عقل حضرت علیؓ کے متعلق اس قسم کا گمان کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! چنانچہ جو بات ٹھیرتی ہے وہ یہی ہے کہ حضرت علیؓ خود قتلِ عثمانؓ پر ملول تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے، بلکہ امیر المومنین کی حیثیت سے یہ قصاص ان کا فرضِ منصبی بھی تھا اور وہ اس کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔ لیکن اس فرض کی فوری تعمیل میں موانع تھے، ناگزیر موانع۔ حضرت علیؓ کی خلافت جن پراگندہ حالات میں قائم ہوئی تھی اس سے ہم سب واقف ہیں۔ پھر یہ کہاں کا تدبر تھا کہ ایسے وقت میں حضرت علیؓ کا بازو مضبوط کرنے کی بجائے ان کے خلاف بغاوت کر کے ان کے لئے فرائضِ خلافت کی ادائیگی کو مشکل تر بنا دیا جائے؟ اگر حضرت علیؓ کے مسلّم الثبوت کردار کے متعلق آپ بالکل بدگمان نہ ہوں تو آسانی سے اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کے لشکر جمل و صفین میں خلیفۂ وقت سے جنگ کرنے کی بجائے اگر ان کے ساتھ مل کر تعاون کرتے تو قصاص کی تعمیل آسان ہی نہیں یقینی ہو جاتی۔

(۴) حضرت علیؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے مشورے پر عمل نہ کر کے ممکن ہے ایک سیاسی غلطی کی ہو۔ لیکن حضرت علیؓ کے فرمانِ عزل کو بجا نہیں لا کر حضرت معاویہؓ نے امیر کی اطاعت کا نہیں بغاوت کا ثبوت دیا۔ اس بغاوت کے لئے قصاص کا عذر کسی اصولِ شرعی کے لحاظ سے معتبر نہیں۔ معزولی کا اس سے بھی زیادہ شدید واقعہ اس وقت رونما ہوا تھا جب حضرت عمرؓ نے اسلام کے فاتحِ اعظم حضرت خالدؓ بن ولید کو عینِ عالمِ کامرانی میں ایک لشکرِ جرار کے بیچ معزول کر دیا تھا۔ مگر حضرت خالدؓ کا جذبۂ اطاعت و ایثار دیکھئے کہ زبان سے بھی اُف تک نہ کی! کیا حضرت معاویہؓ بھی اسی اطاعت و ایثار کا ثبوت نہیں دے سکتے تھے؟

(۴) حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ مجرد شرفِ صحابیت میں بلا شبہ مساوی ہیں۔ لیکن کیا کوئی واقف شخص اول الذکر کی ثانی الذکر پر مجموعی اور بمراتب فضیلت سے انکار کر سکتا ہے؟ اس فضیلت کی تعیین میں ہماری آپ کی تو مجال نہیں کہ حَکَم بن سکیں۔ اس کی تعیین تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور دورِ نبوت سے دورِ خلافتِ ثلاثہ تک دونوں بزرگوں کے معلوم طرزِ عمل اور ان مبنی صلحاء کے اعتراف سے ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کو کوئی صحیح العقیدہ مسلمان معصوم اور فوق البشر نہیں مانتا لیکن اتنی بات تو بہرحال مسلّم ہے کہ دیانت و تقویٰ اور علم و فہم میں وہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ اتباعِ رسولؐ میں ان اربع عناصر کی تشکیل کرتے ہیں جو امت کی تاریخ رجال میں جا... رتبہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے بڑھ کر خلافتِ خدا اور رسولؐ کا مستحق کوئی پانچواں آدمی نہیں قرار پا سکتا۔ اس پس منظر میں آپ ہی بتائیے کہ حضرت معاویہؓ کا نہ صرف عدمِ بیعت پر اصرار بلکہ اپنی ایک متوازی خلافت کے قیام کی جد و جہد خالص شرعی لحاظ سے کیا حیثیت رکھتی ہے؟

(۵) حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح پسندی کی انتہا یہ کہ انھوں نے اپنے حصے کا اقتدار بھی حضرت معاویہؓ کو سونپ دیا تاکہ خلافت میں جو رخنہ پڑ گیا ہے وہ اب بھی بند ہو جائے۔ دوسری جانب حضرت معاویہؓ اپنے دورِ حکومت میں اس خلافت کی صالح روایت کو مستحکم کرنے کی بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ عام مسلمان ان کے نامزد کئے ہوئے "ولی عہد" کو محض اس لئے امیر المومنین تسلیم کر لیں کہ وہ حاکمِ وقت کا "لائق" فرزند اور ایسے قبیلے کا چشم و چراغ ہے جو عملاً حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لہٰذا اگر اس معاملے کو عام مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا جائے گا تو بنو امیہ سے باہر کسی دوسرے شخص کو، خواہ وہ کتنا ہی بہتر اور پسندیدہ ہو، مقرر کیا گیا، تو صاحبِ دولت بنو امیہ اس فیصلے کو نہیں مانیں گے اور نتیجۃً سیاسی انتشار پیدا ہو جائے گی۔ آپ ہی بتائیے کہ اسلام کے اصولی نظام میں اس قسم کی حکمتِ عملی (ڈپلومیسی) کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی ہے؟ کیا واقعی حضرت معاویہؓ جیسا مدبر اور باجبروت حکمراں اپنے ہی اعزاء و احباب کے ہاتھوں اتنا بے بس یا بے بصر تھا کہ اس نے خلافت کے بنیادی اصول کو چھوڑ کر بادشاہت کی بے اصولی کو گوارا کر لیا اور اس بے اصولی کو ہمیشہ کیلئے امت پر مسلط کر دینے کی کوشش کی؟

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ ناسازگار حالات سے سابقہ درپیش تھا؟

یا آخر الذکر نے جو کچھ تابعی ہو کر اور ایک بدرجہا زیادہ بگڑے ہوئے ماحول میں کر دکھایا وہ اول الذکر صحابی ہو کر ایک نسبتاً بہت بہتر ماحول میں نہیں کر گذر سکتے تھے؟

(۶) حضرت معاویہؓ کی اس اجتہادی غلطی کے خلاف حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو علم جہاد بلند کیا، اگر وہ خدانخواستہ نہ کر لیتے تو آج اسلام کے ممتاز نظامِ سیاسی نام کی کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی جس کی طرف امت اور انسانیت کو امن و فلاح کے بلایا جا سکتا۔ یہ حضرت حسینؓ ہی کا کارنامہ ہے کہ ہم خلافتِ راشدہ کا نام ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر لیتے ہیں۔ ورنہ اگر حضرت حسینؓ بھی سکوت اختیار کر لیتے تو اس حقیقت پر صدیوں کے اتنے غبار پڑ جاتے کہ آج اس کا نام بھی ذہنوں سے محو ہو جاتا۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ مر کر بھی اسلام کو زندہ کر گئے۔ مومن کی معراج خلافتِ الٰہی ہے۔ اس خلافت کی اساس ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتی اگر اہلِ بیت رسولؐ اپنے خون کے چھینٹوں سے اسکا نشان جریدۂ عالم پر ثبت نہ کر جاتے ؎

سر داد و دست نہ داد در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؓ (اقبال)

برادرِ مکرم!

اس نفس درازی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اپنے ایمان و علم کی حد تک تبلیغ فرض ہے۔ لہذا یہ چند سطور لکھ کر بری الذمہ ہوتا ہوں۔ اس مسئلے پر آپ سے بحث قطعاً مقصود نہیں ایسے اگر آپ مسئلے کی جزئیات میں اُلجھے بغیر میری بیان کی ہوئی کلیات کا سیدھا سادھا جواب دینا پسند کریں تو براہِ کرم اس پورے خط کو شائع فرما کر اس پر اپنے تبصرے سے میری طرح بہتیرے طالبانِ حق کو استفادے کا موقع دیں۔

اُمید کہ آپ ہر طرح بعافیت ہوں گے۔

ملا کی ڈائری کو کتابی صورت میں اگر مرتب کر دیجئے تو اُردو ادب میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ ہو۔

(ضروری نوٹ) اصل مسودہ آپ پر اس کامل اعتماد کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں کہ اسے بہرحال محفوظ رکھیں گے اور عدم اشاعت کی صورت میں واپس کر دیں گے۔ والسلام۔ عبدالمغنی۔

الجواب:-

یہ آپ کی عنایت ہے کہ میری رائے کو غلط قرار دیتے ہوئے بھی آپ نے میرے خلوصِ نیت کا تو کسی نہ کسی حد تک امکان تسلیم کیا ورنہ عام حالت یہ ہے کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ اور یزید وغیرہ کے بارے میں جو تصورات ذہنوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں ان کے خلاف زبان کھولنے والے کو پہلے ہی دہلے میں یزیدی، بدباطن، فتنہ پرداز، ناصبی، خارجی اور نہ جانے کیا کیا قرار دیدیا جاتا ہے خواہ اس نے کتنی ہی احتیاط، متانت اور قوتِ استدلال کے ساتھ زبان کھولی ہو۔

اس موضوع پر میری تمام تحریروں کو پڑھ لینے کے باوجود آپ کو میری رائے سے اتفاق نہیں ہوا اور وہ تمام اعتراضات و شبہات اپنی جگہ قائم رہے جنھیں آپ نے پیش فرمایا ہے تو اب یہ توقع لاحاصل ہوگی کہ میں آپ کی تشفی کر سکوں گا، کیوں کہ اپنی استطاعت اور فہم کی حد تک ان سب کی تنقیح و توجیہہ میں اپنی پچھلی تحریروں میں پیش کر چکا ہوں۔ اس تنقیح و توجیہہ کو آپ کے ذہن نے قبول نہیں کیا تو اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو میں ہی پوری طرح حقِ استدلال ادا نہیں کر سکا یا پھر آپ غیر جانبداری کے ساتھ میری معروضات پر غور نہ کر سکے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جو تصورات و عقائد انسان کے قلب و دماغ میں گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہوتے ہیں ان سے دست برداری آسان نہیں ہوا کرتی۔ تاریخ اسلام کی متذکرہ شخصیتوں کے بارے میں جو تصورات و عقائد بالعموم قائم کر لئے گئے ہیں آنجناب بھی انھی کو مسلّمہ حقائق تصور کئے بیٹھے ہیں اس لئے ایسی کسی دلیل کا وزن آپ کو مشکل ہی سے محسوس ہو سکتا ہے جو ان تصورات کو مسترد کرنیوالی ہو۔ کوئی شخص یہ تسلیم نہیں کیا کرتا کہ کسی مسئلے کے نقد میں اس نے جانب داری اختیار کی ہے، لیکن امرِ واقعہ عموماً یہی ہوا کرتا ہے کہ ہم نیم شعوری یا لاشعوری طور پر بعض تعصبات اور جانبداریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عاجز کا خیال ہے خود آنجناب بھی زیرِ بحث مسائل میں موروثی تصورات اور جانبداری کا شکار ہیں۔ اس خیال کی شہادتیں میں جوابی معروضات میں پیش کرتا

ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

---

(۱) یہ پہلی ہی شق اس حقیقت کی شاہد ہے کہ آپ نے اصل صورتحال کو بے لاگ انصاف کے زاویئے سے نہیں دیکھا۔ اصول پسندی کا سبق دیتے ہوئے شخصیت پرستی کا جو الزام آپ نے عاجز پر چسپاں کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس الزام کے مورد تو وہ حضرات ہیں جن کے موقف کو آپ برحق تصور کر رہے ہیں۔ اصول و آئین کیا ہے۔ انصاف کے تقاضے کیا کہتے ہیں۔ اسے حضرت علیؓ و حسینؓ کے نام نہاد شیدائیوں میں کوئی خاطر میں نہیں لاتا؛ ہاں تو سارے معتقدات و دعاوی کی اساس یہی واحد برہان ہے کہ چونکہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ سے اور حضرت حسینؓ یزید سے شخصی مناقب میں افضل ہیں، اس لئے علیؓ و حسینؓ کا ہر فکر و عمل برحق ہے اور معاویہؓ و یزید کی ہر روش فاسد و باطل۔ اس کے برخلاف عاجز تو شروع سے کہتا آرہا ہے اور اب بھی کہتا ہے کہ علیؓ و حسینؓ کی شخصی برتری اپنی جگہ مسلّم لیکن اس برتری سے یہ ضمانت حاصل نہیں ہو جاتی کہ اب یہ برتر حضرات جو کچھ بھی کریں گے وہ لازماً برحق ہی ہوگا اور جو کچھ سوچینگے وہ ہر آئینہ تدبر ہی کا شاہکار ہوگا۔ اصل چیز اصول و آئین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی معاملہ میں ایک افضل شخص سے فکر و عمل کی چوک ہو جائے اور مفضول شخص صراط مستقیم اختیار کرلے۔ میرا موقف شخصیت پرستی کا نہیں اصول و قانون کو فوقیت دینے کا ہے جب کہ مقبول عام مسلک کا خمیر شخصیت پرستی اور غلوئے عقیدت سے اُٹھایا گیا ہے۔

آپ خالی الذہن ہو کر غور فرما سکیں تو یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ تاریخ کی متذکرہ شخصیتوں کے بارے میں جو تصورات و نظریات قبول عام حاصل کر چکے ہیں وہ دراصل اسی غلط فکری کا نتیجہ تو ہیں کہ لوگوں نے اصول و آئین کو چھوڑ کر افراد و اشخاص کو معیار بنالیا۔ مثلاً حضرت علیؓ تخت خلافت پر ممکن ہوتے ہی حضرت معاویہؓ کو بلا کسی قصور کے، بغیر کوئی الزام لگائے معزول کر دیتے ہیں۔ اب اس اقدام کے صحیح و غلط، اچھے اور بُرے ہونے پر گفتگو آتی ہے تو جس موقف کی تائید آپ کر رہے ہیں اس موقف کے حاملین اصول و آئین کو نظر انداز کر کے خالص شخصیت پرستی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ہو حضرت علیؓ کے اس اقدام کو برحق ثابت کر دیا جائے۔ کس کا اصول، کہاں کا آئین، کیسی تعلیماتِ شرعیہ۔ ہر رُخ سے ایسی بارد تاویلیں کیجاتی ہیں کہ شخصیت پرستی کے دھارے میں حق پرستی تنکے کی طرح بہہ جاتی ہے۔ میری نظر سے حکم عزل کو برحق ثابت کرنے والے جتنے دلائل آجتک گذرے ہیں وہ سب شخصیت پرستی، تعصب اور جانبداری کے کھُلے مظہر ہیں۔ مثلاً سینہ تان کر کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کو عمّال کے عزل و نصب کا کلی حق ہے۔ ہر افسر کا فرض ہے کہ خلیفہ کا حکم مانے اور سرکشی کی راہ اختیار نہ کرے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ تاویل شخصیت پرستی اور اصول آئین سے بے نیازی کی بدترین مظہر نہیں ہے؟ مطلق العنان ڈکٹیٹر کی زبان تو قانون کہی جاسکتی ہے، لیکن کیا اسلام نے بھی خلیفہ کو ایسا ہی مطلق العنان مانا ہے کہ وہ محض اس دلیل سے دوسروں کو حلق تلف کرتا رہے کہ اسے تختِ خلافت ہاتھ آگیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلامی آئین میں خلیفہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ ناحق دوسروں کو ایذا پہنچائے۔ تمام اختیارات کے باوجود خلیفہ کو اتنا بھی حق نہیں ہے کہ وہ پھونس کی ایک جھونپڑی ہی جلا سکے یا کسی مزدور سے صرف گھنٹے بھر کی بیگار لے سکے۔ لا ضرر ولا ضرار اسلام کا اصولِ کلّی ہے۔ کسی کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کے لئے خلیفہ کے پاس کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔ اس کے کسی اقدام کو محض اس دلیل سے برحق کہہ دینا کہ وہ خلیفہ ہے ایسا ہی ہے جیسے زید ایک گائے خرید کر شب و روز اس پر ڈنڈے برسائے اور جب اس پر اعتراض کیا جائے تو آپ کہیں کہ زید گائے کا مالک ہے لہٰذا اسے حق ہے کہ گائے کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ یہ تاویل کسی منکرِ آخرت گروہ کو قبول ہو جائے تو ہو جائے لیکن جو لوگ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان ہو یا جانور، .....

..... خلیفہ ہو یا غلام کسی کو کسی پر ظلم زیادتی اور بے رحمی کا حق نہیں ہے وہ کس طرح یہ دعویٰ مان لیں گے کہ خلیفہ اپنے اختیارات کو جس طرح چاہے استعمال کرے اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت معاویہؓ اگر حضرت علیؓ ہی کے مقرر کردہ گورنر ہوتے تب بھی انصاف کا یہ تقاضا اٹل تھا کہ ان کو معزول کرنے کے لئے حضرت علیؓ کے پاس کوئی معقول وجہ جواز ہو۔ لیکن یہاں تو لطف

یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نہ تو حضرت علیؓ کے مقرر کردہ ہیں۔ نہ انھوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کی ہے۔ اس صورت میں دنیا کا وہ کونسا قانون اور اصولِ انصاف ہے جو حضرت معاویہؓ کو اس بات پر مجبور کرتا ہو کہ وہ اپنے بیس اکیس سالہ منصب کو محض ایک بنیاد، ایک ناگہانی اور نا قابلِ فہم حکم کے قدموں پر سجدہ ریز کر دیں۔

حضرت معاویہؓ کے دشمن حضرت علیؓ کی طرف داری میں یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ حضرت علیؓ کن حالات میں خلیفہ بنے اور انکی خلافت کو ایک ہولناک سازش سے منسوب کرنے کیلئے دور افتادہ اہلِ شام کے سامنے کتنے قرائن موجود تھے۔ قاتلینِ عثمانؓ کی پشت پناہی میں خلافت کا تاج پہننے والا خلیفہ اگر اہل الرائے کے مشورے کے خلاف خالص آمرانہ انداز میں اُس گورنر (معاویہؓ) کو معزول کرنے کا حکم صادر کر دیتا ہے جو ایک شاندار، قدیم اور مدبر ترین گورنر ہونے کے علاوہ شہیدِ عثمانؓ کا رشتہ دار بھی ہے تو آخر دنیا کا کونسا اصولِ انصاف ہے جو حضرت معاویہؓ کو اس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے کی ترغیب دیتا ہو؟

یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا اقدام ایک معزز خادمِ ملک و ملت کی حق تلفی کے علاوہ اس لحاظ سے بھی آمرانہ تھا کہ اس میں اسلام کی بنیادی تعلیم مشاورت فی الامر کا دُور دُور پتہ نہیں چلتا۔ اس کے برخلاف وہ اس تعلیم کے استرداد پر مبنی نظر آتا ہے کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہل الرائے نے حضرت علیؓ کو اس اقدام سے روکنے کی کوشش کی تھی اور جب وہ نہیں مانے تھے تو آخری درجے میں یہ رائے دی گئی تھی کہ کم سے کم ایک سال تک اسے ملتوی رکھا جائے۔ مگر وہ نہیں مانے۔ انھوں نے خدا جانے کن مخفی دلائل کی بنا پر یہی مناسب سمجھا کہ تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی اپنی مطلق العنانی اور قاہریت کا لوہا منوا لیں۔

آپ اپنے بہترین جذبۂ عدل و دیانت سے کام لیکر فیصلہ فرمائیے کہ کیا شخصیت پرست وہ لوگ ہیں جو حضرت علیؓ کے اس اقدام کو اسلام کے تصورِ عدل کی کسوٹی پر کس کر ایک غلط اجتہاد قرار دینے پر مجبور ہوتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو ہر قیمت پر یہ چاہتے ہیں کہ عدل و آئین کے ساتھ چاہے کیسی ہی کھینچ تان کرنی پڑے مگر حضرت علیؓ کا دامن غلطیِ اجتہاد کے دھبے سے صاف ہی رہنا چاہئے۔

حالانکہ اس اقدام کی تائید اور تحسین کرنے کا حقیقی مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مطلق العنانی اور لاقانونیت کی تائید کی جائے۔

آپ فرماتے ہیں:-

"حضرت معاویہؓ اور یزید کے مقابلے میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے اقدامات کے متعلق انکے ہمعصروں کا کیا رویہ ظاہر ہوا، قولاً یا عملاً، چنداں لائقِ اعتنا نہیں۔"

تو اگرچہ عاجز اپنے موقف کے اثبات میں اصول و آئین ہی سے استدلال کرتا رہا ہے اور ہمعصر صحابہ کے رویہ کو ایسی زائد شہادت کے طور پر سامنے لایا ہے جو نہ بھی لائی جائے تو استدلال کمزور نہیں پڑتا۔ لیکن آپ کا یہ خیال بھی نظرِ ثانی ہی کا محتاج ہے کہ کسی فعل و عمل کے حق اور ناحق ہونے کا فیصلہ کرنے میں ہم اُن تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے کو نظر انداز کر دیں جن کا گمراہی پر متفق ہونا سوائے شیعہ حضرات کے تمام امت کی نگاہ میں محال ہے۔ شخصیت پرستی اسے تو ضرور کہیں گے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم کسی بھی بڑے سے بڑے امتی کو حتیٰ کہ ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کو یہ درجہ دیدیں کہ جو کچھ اس نے کہا یا کیا وہ اس حد تک برحق تھا کہ قرآن و سنت کے ذریعہ اسے چیلنج کیا ہی نہیں جا سکتا، لیکن یہ شخصیت پرستی ہرگز نہیں ہے کہ جملہ صحابہ جس بات پر متفق ہوں اسے ہم بطورِ دلیل استعمال کریں۔ صحابہؓ کا اجماع بہت بڑی قیمت رکھتا ہے اور یہ گمان کرنا کہ صحابہؓ کا اجماع بھی گمراہی پر مبنی ہو سکتا ہے رفض و تشیع کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حاصلِ جواب یہ ہے کہ اصول پرستی کا جو درس آپ فدوی کو دے رہے ہیں وہ حضرت معاویہؓ سے بغض رکھنے والوں کو دیجئے اور اپنے ذہن کے تمام گوشوں کا جائزہ لیکر دیکھئے کہ کہیں وہاں بھی تو شخصیت پرستی نشیمن نہ بنائے ہوئے ہو۔ اگر آپ واقعی اصول پسند اور حق پرست ہیں تو فضیلتِ علیؓ کو ایک طرف رکھ کر اصول و آئین کی روشنی میں جواب دیجئے

کہ خلیفہ بنتے ہی حضرت معاویہؓ جیسے قدیم خادمِ ملک و ملت کو بے محابا بلا قصور معزول کرنے کا حق حضرت علیؓ کو اسلام اور انصاف کے کس اصول نے عطا کیا تھا؟ اگر دلیل یہی تنہی ہے کہ خلیفہ کی حیثیت میں انھیں اس کا حق تھا تو مطلق العنان ڈکٹیٹر شپ اور اسلامی جمہوریت کا فرق بھی واضح فرما دیجئے گا۔

---

(۲) یہ شق بھی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ آپ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کو بے لاگ عدل کے ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ایک کے ساتھ نا انصافی اور دوسرے کے ساتھ رعایت برتنا چاہتے ہیں۔

ذرا سوچئے آپ نے یہ تو فرمایا:-

"یہ کہاں کا تدبّر تھا کہ ایسے وقت میں حضرت علیؓ کا بازو مضبوط کرنے کی بجائے ان سے بغاوت کرکے ان کے لئے فرائض خلافت کی ادائیگی کو مشکل تر بنا دیا جائے؟"

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ یہ کہاں کا تدبر تھا کہ قاتلینِ عثمانؓ کو کیفر و کردار تک پہنچانے کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو دُور کرنے اور تخریبی قوتوں کا استیصال کرنے کے عوض حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کو بکلخت معزول کر گذریں اور حضرت معاویہؓ اس ظلم صریح کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کریں تو حضرت علیؓ فوج لے کر نکل کھڑے ہوں۔

آپ تمام حقوق حضرت علیؓ کو دینا چاہتے ہیں اور صرف فرائض حضرت معاویہؓ کو۔ آپ حضرت معاویہؓ کی سرتابی پر کفِ افسوس ملتے ہیں اور اس کے قبیح نتائج کو اُبھار کر پیش فرماتے ہیں لیکن حضرت علیؓ کا جو اقدامِ عزل حضرت معاویہؓ کی سرتابی کا سبب بنا تھا اس پر اس پہلو سے نگاہ نہیں ڈالتے کہ اگر حضرت علیؓ ایسا نہ کرتے تو متذکرہ قبیح نتائج کا سامنا نہ ہوتا۔ گویا ردِّ عمل کے نقد میں تو آپکا ذہن خوب چلتا ہے لیکن جس عمل پر اس ردِّ عمل کی پوری ذمہ داری ہے اسے نقد و نظر سے بالا ایک پیغمبرانہ عمل کی حیثیت دیدیتے ہیں

یہ جانبداری اور شخصیت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر اس بھول پن کی بھی کوئی انتہا ہے کہ جس معاویہ کو چٹکی بجاتے معزول کیا جا رہا ہے اسی کو یہ سبق دیا جائے کہ وہ سرتابی نہ کرے، بلکہ خلیفہ کا ہاتھ بٹائے۔ حضرت علیؓ کی نگاہ میں اگر حضرت معاویہؓ اور ان کے ہمنواؤں کا تعاون ملک و ملت کے لئے مفید ہوتا تو انھیں معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھ بٹانے کی راہ تو خود حضرت علیؓ ہی نے حکمِ عزل کے ذریعہ بند کر دی۔ اب کیا معاویہؓ کے لئے اس خوش فہمی کی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ جس خلیفہ نے تاجِ خلافت زیب کرتے ہی انھیں بلا وجہ گورنری کی مسند سے اُٹھا پھینکا ہے وہ ملک و ملت کے معاملات اور سیاست وغیرہ میں ان کا تعاون قبول کرے گا!

میرے محترم! انصاف کیجئے انصاف! یہ الزام مجھ پر نہیں آپ پر راست آتا ہے کہ اصول کو چھوڑ کر شخصیت پرستی کو محورِ فکر بنا رہے ہیں۔ اصول ہے البادیُ اظلم پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ خلیفہ بنتے ہی نزاع و جنگ کی پہل حضرت علیؓ نے حکمِ عزل کے ذریعہ کی اور جب یہ نارواحکم نہیں مانا گیا تو لشکر کشی بھی آپ ہی نے فرمائی۔

اصول یہ ہے کہ فقیر سے لیکر بادشاہ تک کسی کو اللہ نے یہ اجازت نہیں دی ہے کہ بلا دلیلِ معقول کے دوسروں کا حق تلف کرے۔ محض آئینی اعتبار سے کسی شخص کا صاحبِ اختیار بن جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ ان اختیارات کو اکیم من مانے طریقے پر استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ گورنر تو بڑی چیز ہے بادشاہ اگر ایک چپراسی کو بھی بلا کسی معقول وجہ اور مصلحت کے محض ذاتی پرخاش کی بنا پر اس کی روزی اور ملازمت سے محروم کریگا تو عند اللہ مسئول ہوگا۔ لیکن اقدامِ علیؓ پر نگاہِ نقد ڈالتے ہوئے یہ اصول آپ نظر انداز کر گئے ہیں اور حضرت علیؓ کی شخصی افضلیت نے آپ کے ذہن کو اس رُخ پر موڑ دیا ہے کہ جس طرح بھی ہو حضرت علیؓ کے اقدامِ عزل کا جواز اور حضرت معاویہؓ کی سرتابی کا عدمِ جواز ثابت ہو جائے۔ آپ یہ سیدھی سی بات نہیں کہہ پاتے کہ خلیفہ بنتے ہی حضرت معاویہؓ کو معزول کر دینا

تدبر کے خلاف تھا۔ ہاں یہ ٹیڑھی بات ضرور لگتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی بغاوت تدبر کے خلاف تھی۔ حملہ آور کے اقدام میں آپ کو کوئی خامی اس لئے نظر نہیں آتی کہ اس کی شخصیت آپ کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے، لیکن جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کی مدافعت بھی آپ کو ایک جرم، ایک غلطی، ایک بے تدبیری نظر آتی ہے کیونکہ اس کی کوئی تکریم آپ کے ذہن کو قبول نہیں ہے۔ بندہ نواز! یہ تمنا تو عملی اعتبار سے قطعاً دور از کار ہے کہ حضرت معاویہؓ بغاوت کرنے کی بجائے ہاتھ بٹاتے تو حالات بہتر ہو جاتے۔ ہاتھ بٹانا چہ معنی دارد جب خلیفۂ وقت اس درجہ بیزار اور کبیدہ ہے کہ معاویہؓ کی بیس سالہ خدمات اور اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے انھیں حکومت و سیاست سے کلّی طور پر بے دخل کر دینا چاہتا ہے۔

ہاں یہ تمنا ہر طرح معقول محسوس ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ معاویہؓ کا تختہ اُلٹنے کی بجائے دوسرے بہتر کاموں میں منہمک ہوتے اور پچھلے خلفاء کی روش کے مطابق حضرت معاویہؓ کی اعلیٰ صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھاتے۔ ہمیں بتاؤ وہ کونسی قیامت حضرت معاویہؓ نے توڑی تھی جس کے صلے میں ان کا عزل ایک ایسے نازک وقت میں بھی انتہائی ضروری قرار پا گیا جب کہ ملک و قوم کو گوناگوں فتنوں سے سابقہ تھا، جب کہ خلیفۂ ثالث کو دن کی روشنی میں ذبح کر دیا گیا تھا، جبکہ معاویہؓ جیسے مدبّروں کی ضرورت ملک و قوم کو پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اگر آپ شخصیت پرست نہیں ہیں تو خدا کے لئے اس رُخ سے بھی تو سوچئے۔ حضرت علیؓ کو پیغمبر مت بنا دیجئے کہ جو کچھ وہ کریں یا کہیں گے حق ہی حق ہوگا۔ وہ بھی ایک امتی ہی تھے اور حضرت معاویہؓ سے افضل ہونے کے باوجود فکری و عملی تصوران سے بھی یقیناً ممکن تھا۔ حقوق اور فرائض میں توازن ملحوظ رکھیئے۔ خلیفہ بنتے ہی اگر حضرت علیؓ کو ہر عامل کے عزل کا اختیار حاصل ہو گیا تھا تو یہ فریضہ بھی بہر حال انپر عائد تھا کہ کسی اعلیٰ سے ادنیٰ فرد کو ناحق ایذا نہ پہنچائیں۔ کسی سے بلا وجہ اس کا منصب نہ چھینیں۔ کسی کی شاندار خدمات پر بغیر معقول سبب کے خاک نہ اُڑائیں۔ نیز یہ بھی ایک فریضہ ہی تھا کہ مشاورت کی ترغیب شرعی کا لحاظ فرمائیں۔ اہل الرائے کے علی الرغم خالص آمرانہ انداز میں اسٹیٹ کے ایک معزز ترین، مدبّر ترین، قدیم ترین حاکم کو بغیر کوئی الزام لگائے، بغیر صفائی کا موقع دیئے، بغیر کوئی معقول وجہ ظاہر کئے معزول کر دینا اگر کسی کے جذبۂ عدل و آئین کو نہیں چونکاتا تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ غلوئے عقیدت نے اس کے قوائے فکریہ میں خلل ڈال دیا ہے۔ گستاخی معاف ہو، حضرت علیؓ کی ذات سے مفرط اور غیر معتدل عقیدت کوئی نیا حادثہ نہیں ہے اس کا سلسلہ تو صدیوں سے چل رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اکابرین اہل سنت سے بھی ایسے تصورات کا اظہار ہوتا چلا گیا ہے جن کا سرا ایک معصوم قسم کی فریب خوردگی سے جا ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ نظامِ خلافت جن ہنگاموں سے دوچار ہوا اور ملک و ملت کو جو ابتلائیں پیش آئیں ان کی ذمہ داری تنہا حضرت معاویہؓ پر ڈال دینا اُسی شخصیت پرستی اور اصول دشمنی کا کرشمہ ہے جس کے خلاف آپ نے پہلی شق میں احتجاج کیا ہے۔ بے لاگ عدل تو یہ کہتا ہے کہ اس کی ذمہ داری حضرت علیؓ پر ہے اور تمام تر ذمہ داری ان پر نہ مانی جائے تب بھی غالب حیثیت سے وہ اس میں ضرور شریک ہیں۔

آپ ہی کی طرح اوروں سے بھی عاجز یہ حسین تمنا سنتا رہا ہے کہ کاش معاویہؓ بغاوت نہ کرتے مگر کوئی اللہ کا بندہ یہ تمنا کرتا نظر نہیں آتا کہ کاش حضرت علیؓ عزلِ معاویہ کا اقدام نہ فرماتے۔ کیا اس کا بنیادی سبب اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ معاویہؓ کو تو لوگوں نے ایک عام آدمی سمجھ رکھا ہے مگر حضرت علیؓ کو ارادةً یا بے ارادہ ذہن کے اُس خانے میں جگہ دی ہے جہاں اللہ اور رسولؐ کے سوا کسی کا جگہ پانا ہزار مفاسد کا ایک مفسدہ ہے۔ اللہم احفظنا۔

(۴) غنیمت ہے اس شق میں آپ نے حضرت علیؓ کیلئے امکانِ خطا تو مانا۔ اب رہا آپ کا یہ فرمانا کہ حضرت معاویہؓ نے امیر سے بغاوت کا ثبوت دیا تو میں کتنی بار عرض کروں کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت ہی نہیں کی تھی۔ تعمیل حکم کی آئینی پابندی اس وقت عائد ہوتی جب معاویہؓ خلافتِ علیؓ کو تسلیم کر چکے ہوتے۔ ابھی تک حضرت علیؓ معاویہؓ کے امیر تھے ہی نہیں۔ پھر لشکر کشی کس نے کی؟ تاریخ متفق ہے کہ فوجی اقدام کی پہل حضرت علیؓ نے کی۔

علاوہ ازیں یہ کہنا کہ قصاص کا عذر کسی اصول شرعی سے معتبر نہیں ہے۔ فدوی کی نظر میں بہت بڑی جسارت ہے کیا قرآن میں صریح طور پر قانون قصاص بیان نہیں ہوا؟ کیا اسی قانون کے تحت حضرت عائشہ اور طلحہؓ و زبیر جیسے اکابرین نے حضرت علیؓ کے خلاف عسکری اقدام نہیں کیا؟ — فدوی کے نزدیک حضرت معاویہؓ کو ایک عام فرد کی حیثیت سے بھی اور مقتول خلیفہ کے رشتے دار کی حیثیت سے بھی شرعاً، قانوناً اور عقلاً یہ حق تھا کہ قصاص کا مطالبہ کریں اس پر زور دیں۔ اُن اشرار کے غلبۂ و تسلط سے بیزار ہوں جنھوں نے خلیفۂ ثالث کو گھیر کر ذبح کیا تھا اور جو خلافت علیؓ کے پائے اپنے کاندھوں پر اُٹھائے آج بھی مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ البتہ معاویہؓ کی جس بغاوت کو آپ مطالبۂ قصاص سے جوڑ رہے ہیں وہ محض اس مطالبہ کا شاخسانہ نہیں تھی، بلکہ وہ تو نتیجہ تھی حضرت علیؓ کی اس ناقابل فہم اور نامنصفانہ روش کا کہ انھوں نے اقتدار پاتے ہی معاویہؓ کی معزولی کا حکم صادر فرمایا۔ اس حکم کو مان لینے کا مطلب یہ تھا کہ معاویہؓ اُس گروہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیں جس نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا تھا اور جو حضرت علیؓ کی آڑ میں اس وقت بھی مسلّط تھا۔ فدوی کو بتائیے کہ اگر معاویہؓ کو خواہ مخواہ معزول کرنے پر قاتلین عثمانؓ کے گروہ نے مجبور نہیں کیا تھا اور خود حضرت علیؓ کے دل میں بھی ذاتی پرخاش سلسلہ جنباں نہیں تھی تو پھر آخر وہ کیا آفاقی مصلحت تھی جو اقدامِ عزل کو منصفانہ باور کرا سکتی ہو؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ قصاص سے گریزاں نہیں تھے بلکہ اس وقت کے پیچیدہ تر حالات میں قصاص لینا عملاً ممکن ہی نہیں تھا — ٹھیک ہے۔ اسی امرِ واقعہ کو جب حضرت علیؓ نے سمجھانے کی طرح حضرت عائشہؓ کو سمجھا دیا تو وہ مخالفت سے دستکش ہو گئیں۔ تو کیا تدبر کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ حضرت معاویہؓ اور دیگر طالبینِ قصاص کو بھی مطمئن کرنے کی راہیں نکالی جاتیں لیکن حضرت علیؓ نے یہ راہیں ڈھونڈنے کے عوض عزلِ معاویہ کا آرڈر جاری کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ مقتول خلیفہ کے انصار و اعزّا ء کے زخمی دلوں پر مزید چرکے لگے اور ظاہری قرائن کے نتیجے میں شریکِ سازش ہونے کا جو سوءِ ظن حضرت علیؓ کے بارے میں ذہنوں پر ہتھوڑے برسا رہا تھا وہ قوی سے قوی تر ہوتا چلا جائے۔ ہم نے کبھی نہیں کہا اور اب بھی نہیں کہتے کہ حضرت علیؓ قتل عثمانؓ کی سازش میں شریک تھے۔ نہیں حضرت علیؓ سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کا بیدردی سے مار ڈالا جانا پھر انکی خون آلود مسندِ خلافت پر حضرت علیؓ کا بیٹھ جانا اور قاتلین عثمانؓ کی پشت پناہی میں کاروبار خلافت چلانا ہر غیر جانبدار مبصر کی نظر میں ایسی صورتِ حال یقیناً تھی جو حضرت علیؓ کے بارے میں ان کے ہم عصروں کے لئے بدگمانی کا قدرتی موقع فراہم کرتی ہے۔ حضرت معاویہؓ کو دفعتاً معزول کر کے حضرت علیؓ نے گویا اس بدگمانی پر صاد کر دیا۔ حضرت علیؓ کا طرزِ فکر کچھ بھی رہا ہو لیکن معاویہ دشمنی کا مظاہرہ یقیناً ایسا فعل تھا جو کسی بھی لحاظ سے تعمیری نتائج کا حامل نظر نہیں آتا بلکہ وہ بد سے بدتر سوءِ ظن کی راہ دکھاتا ہے۔ ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ حضرت علیؓ نے قصداً تخریبی راستہ اختیار کیا۔ ان کے حسن نیت پر ہمیں بھروسہ ہے لیکن سوال تو اجتہاد و تدبّر کا ہے۔ تدبر تو اسی کا نام ہے کہ قریب و دُور کے تمام نتائج پر نظر رکھی جائے۔ حضرت علیؓ بے حد ذہین و ذکی تھے، لیکن کیا انسانی فطرت کا یہ تجربہ آئے دن آپ کے سامنے نہیں آتا کہ کبھی کبھی کوئی تہ نشین جذبہ اس قوت و شدت سے اُبھرتا ہے کہ تمام فکر و دانش پر چھا جاتا ہے اور عقل و تدبر ہتھیار ڈال دیتے ہیں عاجز کے خیال میں حضرت علیؓ کے ساتھ بھی فطرت نے یہی کھیل کھیلا ہے۔ اگر معاویہؓ کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ پھینکنے کا جذبہ طوفانی شدت کے ساتھ ان کے اندر نہ اُبھر آتا تو عزلِ معاویہؓ کے اقدام کے نقصانات ایسا راز نہیں تھے جن تک ان کا ذہن رسا نہ پہنچ پاتا یا پھر یوں کہئے کہ وہ گروہِ قاتلین کے ہاتھوں بے بس ہو گئے تھے اور عزلِ معاویہ کا فرمان اسی کے ایماء پر جاری فرمایا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت معاویہؓ کے عزل میں جو متعدد فارق ہیں انھیں ہم متعدد بار تجلی میں واضح کر چکا ہوں

اب بار بار دہرانا بیکار ہوگا۔ صرف ایک ہی فارق کا ذکر کرتا ہوں یہ کہ خالد بن ولید حضرت عمرؓ کی بیعت کر چکے تھے۔ انھیں خلیفہ مانتے تھے۔ انھی کے احکام کے مطابق میدان جنگ میں پہنچے تھے۔ اس صورت میں وہ ان تمام اسلامی تلقینات کا مخاطب تھے جو اطاعتِ امیر کے سلسلے میں وارد ہیں' لیکن معاویہؓ کا معاملہ یہ کہاں۔ وہ تو مملکت کے دیرینہ ملازم تھے۔ خون سے لتھڑے ہوئے تختِ خلافت پر بیٹھنے والے نئے خلیفہ کو انھوں نے امیر تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔

غیر شعوری جانبداری کا مظاہرہ آپ کے اس سوال میں بھی ہے۔ حضرت علیؓ' عبداللہؓ ابن عباس کے مشورے پر عمل نہ کرتے ہوئے من مانا اقدام کر گذریں تو اسے تو آپ محض ایک سیاسی غلطی کا سادہ سا نام دے کر گذر جائیں' لیکن اس اقدام کا جو ردّ عمل معاویہؓ کی طرف سے ظاہر ہوا اسے پوری اہمیت کے ساتھ بھیانک جرم باور کرانا چاہیں یہ ذہنی جانبداری نہیں تو کیا ہے۔ آخر حضرت علیؓ کے کسی اقدام کو فقط سیاسی غلطی کا معصوم نام دے کر نا قابلِ لحاظ قرار دیا جا سکتا ہے تو حضرت معاویہؓ کے ردِّ عمل کو بھی ایک سیاسی لغزش مان کر نظر انداز کیوں نہیں کیا جا سکتا

ایک اور تضاد آپ کے افکار میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف آپ پہلے آئیٹم میں کہتے ہیں کہ اصل چیز اصول و آئین ہے یہ دیکھنا قطعاً لائقِ اعتناء نہیں کہ حضرت حسینؓ کے اقدامات کے متعلق ان کے ہم عصروں کا قولی و عملی رویّہ کیا رہا۔ گویا آپکی نگاہ میں پورے گروہِ صحابہؓ کا اتفاقِ رائے بھی کوئی دلیل نہیں ہے — دوسری طرف آپ اس تیسرے آئیٹم میں حضرت خالدؓ کے عزل کو مسلمہ طور پر ایک منصفانہ اور لائقِ تقلید اقدام قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کا انتساب حضرت عمر فاروقؓ کی طرف ہے حالانکہ آپ کی اصول پرستی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ حضرت خالدؓ کا عزل ہو یا معاویہؓ کا اس کے لئے اصولی دلائل جواز سامنے لائیں۔ اگر دلائل کی کسوٹی پہ پرکھے بغیر ہی حضرت عمرؓ کا اقدام آپ کے نزدیک برحق تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملے میں آپ شخصیت پرستی کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ہاں دوسروں سے یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ تمام صحابہؓ کے اجماع و اتفاق کو بھی نظر انداز کر دو۔

---

(۴) جس موقف کو آپ درست سمجھ رہے ہیں وہ دراصل شخصیت پرستی ہی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں آپ دوسروں کے لئے تو یہ نصیحت پیش فرماتے ہیں کہ اقدامات حسینؓ کی جانچ پرکھ میں صحابہؓ کی کثرتِ رائے اور بزرگی وغیرہ کا لحاظ مت کرو ——— اور اپنے لئے شخصی مراتب ہی کو دلیل راہ بناتے ہیں۔ دیکھئے ایک آئینی بحث میں آپ نے خود ہی حضرت علیؓ کی شخصی فضیلت کو مستقل دلیل کی حیثیت میں پیش فرما دیا۔ حالانکہ حضرت معاویہؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت زیر بحث نہیں تھی اور فدوی نے کبھی حضرت علیؓ کی افضلیت کا انکار نہیں کیا ہے۔ پھر یہ بحث بھی نہیں تھی کہ علیؓ و معاویہؓ میں کون خلافت کا زیادہ مستحق تھا۔ یہ بحث اس وقت ہوتی جب یہ دونوں حضرات نارمل حالات میں خلافت کے لئے رائے حاصل کرتے۔ مگر یہاں تو اصل بحث یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو شریعت یا عام تصورِ عدل کے کس قانون نے یہ حق دیا تھا کہ مملکت کے ایک وفادار خادم' رسول اللہؐ کے معظم صحابی' فکر و تدبر کے ایک معروف پیکر حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو کسی ادنیٰ سی خطا کے بغیر یکایک ——— آندھی اور طوفان کی طرح نہ صرف معزول کر دیں بلکہ انکی عزتِ نفس اور غیرت پر ایک تلملا دینے والی ضرب لگانے کے لئے نئے گورنر کو چارج دے کر بھی روانہ فرما دیں۔۔ اصل نکتہ بحث سے ہٹ کر حضرت علیؓ کے مناقب شخصی کا راگ چھیڑنا حقیقت میں اسی شخصیت پرستی کا شاخسانہ ہے جسے آپ دوسروں کے لئے مذموم قرار دے رہے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے اپنی متوازی خلافت اس لئے قائم نہیں کی کہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ کو استحقاقِ خلافت نہیں تھا ——— معاویہؓ تو حضرت علیؓ کو خلیفہ ماننے کے لئے بالکل تیار تھے بشرطیکہ وہ مقتول عثمانؓ کے قصاص کے سلسلے میں غیر مشتبہ طرزِ عمل اختیار کرتے۔ لیکن خلافتِ معاویہ کا قیام تو اس لئے عمل میں آیا کہ حضرت علیؓ نے

ان کی گورنری پر بھی پہلے ہی ہلے میں ٹھوکر رسید کرنی چاہی اور معاویہؓ کو یہ باور کرنے کا موقع فراہم کیا کہ مقتول خلیفہ کے خاندان بھر سے انھیں بیر ہے۔

شریعت کہتی ہے ہر شخص کو اپنے جائز حق کے لئے جدوجہد کرنے کا استحقاق ہے۔ معاویہ اگر بیٹھے بٹھائے دعوٰۂ خلافت کر بیٹھتے تب تو آپ کا اعتراض بجا تھا، لیکن انھیں تو دعوٰۂ خلافت اس لئے کرنا پڑا کہ انتہائی مضطرب اور اشتباہ انگیز حالات میں خلیفہ بننے والے حضرت علیؓ ان سے گورنری بھی چھین لینا چاہتے تھے حالانکہ یہ گورنری ان سابق خلفاء کی عطا کردہ تھی جو حضرت علیؓ سے افضل تھے اور اس گورنری کی بیس اکیس سالہ مدت میں معاویہؓ نے ملک وملت کی نمایاں خدمات انجام دینے کے سوا کوئی ایسا قصور نہیں کیا تھا جس کی سزا وہ نئے خلیفہ کے ہاتھوں بھگتنے پر آمادہ ہوجاتے۔ گورنری کا منصب ان کا جائز حق تھا۔ ایک خلیفہ انتظامی مصلحت کے تحت ان کا تبادلہ تو کر سکتا تھا، انھیں کسی کوتاہی پر سرزنش بھی جائز ہوتی۔ انھوں نے اگر کوئی جرم کیا تھا تو ان پر فردِ جرم بھی عائد کی جاسکتی تھی، لیکن یہ کیا کہ ایک جلیل القدر خلیفہ کے خون اور ہڈیوں پر قائم شدہ خلافت اچانک بلا کسی معقول وجہ کے معاویہؓ کی معزولی کا پروانہ جاری کردے۔ شریعت کا وہ کونسا اصول ہے جو اس طرح کے موقع پر یہ آرڈر دیتا ہو کہ معاویہؓ اپنے جائز حقوق کے لئے جدوجہد نہ کرتے اور گورنری کی مسند اُس گروہ کے لئے خالی کردیتے جو عثمانؓ جیسے شفیق، کریم، رفیع المرتبہ، پاکباز اور داماد رسولؐ کو انتہائی شقاوت کے ساتھ شہید کردینے کے بعد پورے خاندانِ اُمیہ سے اپنی جاہلی عصبیتوں کا خراج وصول کرنا چاہتا ہو۔

---

(۵) یہ پانچویں شق بھی اس لائق ہے کہ گہرا غور و فکر کیا جائے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح پسندی کو آپ نے ایک پسندیدہ و مستحسن فعل کی حیثیت سے پیش فرماتے ہوئے یہ آرزو کی ہے کہ کاش معاویہؓ بھی اسی نوع کی روش اختیار کرتے۔ اب عاجز گذارش کرتا ہے کہ کیا تقاضائے عدل یہ نہیں ہے کہ ٹھیک ایسی ہی آرزو حضرت علیؓ کے لئے بھی کی جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی حضرت حسنؓ کو پسند نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے والدِ محترم سے برملا کہا تھا کہ اے ابا جان اس ارادے سے باز آجائیے ورنہ اس کا حاصل فقط یہ ہوگا کہ باہمی خونریزی و اختلاف کی فصلِ بہار لہلہا اُٹھے گی۔"

اس صورت میں جس طرح آپ اور دیگر حضرات حضرت معاویہؓ کو مشورہ دینے میں سبقت فرماتے ہیں اسی طرح حضرت علیؓ کو بھی کم سے کم ایک آدہ بار تو یہ مشورہ دے ہی دیجئے کہ اپنے بیٹے اور دیگر اہل الرائے کے مشورے کے مطابق امن و صلح کی راہ اختیار فرمائیں۔ معاویہؓ سے تلوار سے سیدھا کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور اُس خونریزی کا افتتاح نہ فرمائیں جس سے ملتِ مسلمہ کو بچانے کے لئے حضرت عثمانؓ نے اپنی جان کی قربانی دی تھی۔

حضرت حسنؓ بہت مدبر تھے۔ مدبر سے بڑھ کر وہ نیک بخت تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق انھیں مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرانے کا موقع ملا اور معاویہؓ کے حق میں دست برداری دیکر انھوں نے ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ بے لاگ انصاف کہتا ہے کہ ان کی صلح پسندی جس شخص کو پسند ہو وہ صرف معاویہ ہی سے ایسی صلح پسندی کا آرزو مند نہ ہو بلکہ حضرت علیؓ سے بھی یہی التجا کرے کہ آپ بھی امن و صلح کا راستہ اختیار فرمائیں۔ حضرت معاویہؓ کی دفاعی جنگ سے بیزاری اور حضرت علیؓ کی اقدامی لشکر کشی کی تحسین و تصویب ایسی جانبدارانہ روش ہے جس کا سرا شخصیت پرستی کے سوا کسی اصول و آئین سے نہیں ملتا۔ آخر معاویہؓ ہی کو تلوار میان میں کرنے کا مشورہ کس لئے جبکہ وہ اپنی عزت اور حقوق کے تحفظ میں تلوار کھینچنے پر مجبور ہوئے ہیں اور حضرت علیؓ کو تلوار رکھ دینے کا مشورہ کس لئے نہیں جب کہ وہ اپنے کسی ثابت ہونے حق کے دفاع کی خاطر نہیں، بلکہ تمام عاملینِ عثمان کو ناکردہ گناہی کی سزا دینے کے لئے ایک ہولناک خانہ جنگی کا دروازہ کھول رہے ہیں۔ آنجناب اگر شخصیت پرستی سے بالا تر ہوکر سوچ سکتے ہیں تو سوچیں کہ پچھلے تمام آفیسروں کی یکلخت معزولی اس فتنہ پرداز گروہ کی دلجوئی اور خواہشات کی تکمیل کے سوا کیا تھی جس نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان کو انتہائی شقاوت کے ساتھ ذبح کیا تھا۔ حضرت عثمان اور ان کے عمال کے بارے میں جو ناپاک پروپیگنڈہ منصوبہ

ریقے پر کیا گیا تھا اگر اس کے بعض اجزاء کو ایک دو عاملین کے بارے میں درست مان بھی لیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ معاویہؓ بھی مجرم ٹھیرا کر معزول کر دیئے جائیں جو نقط عثمانی عامل نہ تھے بلکہ دورِ فاروقی سے منصب عالیہ پر چلے آرہے تھے اور سیاست و سیادت کے میدان میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

یہ کہدینا کہ خلیفہ کو ہر افسر کے عزل و نصب کا حق حاصل ہے بے لاگ انصاف سے جان چرانے کی راہ ہے۔ حق نہیں صرف اختیار کہئیے۔ اختیار کے جائز اور ناجائز استعمال کا فرق دنیا کے ہر تصورِ عدل میں بنیادی اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ آئین بیشک خلیفہ کو اختیار دیتا ہے کہ انتظامی و سیاسی مصالح کے پیش نظر جسے چاہے افسر بنائے جسے چاہے معزول کرے لیکن وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ سرکاری ملازمین کے کچھ حقوق ہیں۔ ان کی خدمات کا کوئی صلہ ہے۔ انھیں ایسے غلاموں کی حیثیت نہیں دی جاسکتی جنھیں آقا جب چاہے ٹھوکر مار دے اور جب چاہے سیج پر سُلا دے۔ ایک بکری خرید کر گھر میں باندھ لیجئے۔ وہ کلیتہً آپ کی مملوک ہوگی۔ آپ اسے ذبح کریں، عمدہ چارہ کھلائیں، بھوکا رکھ رکھ کر دُبلا کر دیں۔ صبح و شام ڈنڈا برسائیں۔ کوئی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑے گا کیونکہ آپ اس کے مالک ہیں۔ اس سے طاقتور ہیں۔ اس سے من مانے سلوک کا آپ کو اختیار حاصل ہے ــ لیکن اسلام کا تصورِ عدل یہاں بھی آپ سے محاسبہ کئے بغیر نہیں رہے گا۔ وہ کہے گا کہ بظاہر آپ مالک و مختار ہیں لیکن بے رحمی، حق تلفی، درندگی کا حق آپ کو اللہ نے نہیں دیا۔ بکری کو وقت پر چارہ نہیں دیں گے، ناحق ایذا پہنچائیں گے تو اللہ کے یہاں آپ کو ظالم قرار دیدیا جائے گا اور سزا ملے گی۔

جب جانوروں تک کے حقوق کا یہ عالم ہے تو کسی دیرینہ خادمِ ملک و ملت کو عزت و سیادت کے مقام سے گرانے کے اقدام پر تو بہرحال بجا اور بے جا ــــ روا اور ناروا ــــ عدل اور ظلم کی بحث اُٹھنی ہی چاہئیے۔ خصوصاً جب عزلِ معاویہ صریح طور پر قاتلینِ عثمانؓ کے مقاصد کی تکمیل اور ان کی خواہشات کی پابجائی کے ہم معنی ہو تو یہ بات اور بھی قرینِ قیاس ہوجاتی ہے کہ معاویہؓ تعمیل حکم سے انکار کر دیں اور حصولِ خلافت کے لئے نہیں بلکہ اپنے حقوق کی صیانت کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ حضرت حسنؓ کی صلح پسندی، اہل الرائے کی تلقینِ صبر اور شہادتِ عثمانؓ کے خون سے لبریز فضا کے پس منظر میں جب حضرت علیؓ کے یہ تیور سامنے آتے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں معاویہؓ کو نیچا دکھانا ہے تو بے اختیار فردوسی کا وہ شعر یاد آجاتا ہے

اگر جز بہ کامِ من آید جواب
من و گرز و میدانِ افراسیاب

پھر ایک اور پہلو بھی نظر میں رکھئیے۔ دو مشابہ اُمور میں قیاس اسی وقت درست ہوتا ہے جب فارق موجود نہ ہو ہمارے نزدیک حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے معاملات میں متعدد فارق موجود ہیں۔

حضرت حسنؓ کا حال یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ انھیں نہایت عزتمندانہ طور پر صلح کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ معاویہؓ ان کی پوری عزت کرتے ہوئے دعوتِ صلح دیتے ہیں اور حضرت حسنؓ اپنی شرائط پیش کر دیتے ہیں۔ جواب یہ ملتا ہے کہ نہ صرف پیش فرمودہ شرائط منظور بلکہ سادہ کاغذ دستخط کرکے پیش کر دیا جاتا ہے کہ جو چاہے لکھ دو مجھے منظور ہے ــــ یہ معاویہؓ کی فراخدلی تھی، حلم تھا، تکریمِ اہل بیت تھی۔ حضرت حسنؓ کی خودداری پر حرف نہیں آیا انھوں نے پوری سرافرازی کے ساتھ اپنی شرائط منواتے ہوئے معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری دیدی

اب ذرا اُس صورتِ حال پر بھی منصفانہ نظر ڈال لیجئے جو معاویہؓ کو پیش آئی۔ کہاں کی پاسداری، کیسی تکریم، کس کی دلجوئی۔ حضرت علیؓ برملا حکم عزل جاری کرتے ہیں اور دوسرا گورنر بھی روانہ فرما دیتے ہیں۔ معاویہؓ کو شرائط وغیرہ پیش کرنیکا موقع تو کجا اس کا موقع بھی نہیں دیا جاتا کہ اُس پُر اسرار اور نامعلوم الزام کی صفائی پیش کر سکیں جس کی تعزیر میں انکی عزت اور خوش حالی ان سے چھینی جا رہی ہے۔ انصاف کیجئے کیا اس صورتِ حال کو حضرت حسن والی صورتِ حال پر قیاس کرنا درست ہوگا۔ حضرت حسنؓ نے صلح کی روش اختیار کرتے ہوئے باضابطہ معاہدے کے ذریعہ اپنی جانی و مالی عافیت کا انتظام

کرلیا تھا۔ مگر معاویہؓ کے لئے تو اس کا کوئی چانس ہی نہ تھا وہ تو دفعتاً معتوب ہوگئے تھے اور انھیں ایک نااہل کام چور اور بدعنوان ملازم کی طرح علیحدہ کیا جا رہا تھا حالانکہ ان کا طویل المدت ریکارڈ ایسے داغ دھبوں سے بالکل پاک صاف تھا۔

دوسرا فرق یہ بھی نظر میں رہے کہ جب حضرت حسینؓ کے والدِ محترم حضرت علیؓ معاویہؓ کو شکست نہ دے سکے اور حضرت حسینؓ نے دیکھ لیا کہ معاویہؓ کی سیاست و عسکریت کو شکست دینا آسان نہیں تو قدرتاً ان کا رجحان صلح کی طرف ہو جانا چاہیئے تھا جو دین اور دنیا دونوں کے لحاظ سے بہتر تھی اس کے برخلاف حضرت معاویہؓ کے سامنے کوئی ایسا تجربہ نہیں تھا جو انھیں گورنری چھوڑنے اور حزبِ علیؓ کا نشانہ بننے کا رجحان دیتا۔

تیسرا زبردست فرق یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور ان کے ہم عصر خوب جانتے تھے کہ اسلامی اسٹیٹ کو کامیابی سے چلانے اور کفر و شرک کے عساکر کو شکست دینے میں معاویہ بہترین آدمی ہیں۔ اگر حضرت حسینؓ نے معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری دی تو یہ بہت اچھا کام کیا جس سے ملک و ملت کو فائدہ ہی فائدہ پہنچا۔ مگر معاویہؓ کے سامنے ایسی امید افزا صورتِ حال نہیں تھی۔ ذاتی ذلت و نقصان سے قطع نظر ملک و ملت کے حق میں بھی اس خطرے کا احساس کرنا ان کے لئے بالکل بجا اور قدرتی تھا کہ اگر میں نے گھٹنے ٹیک دیئے تو حضرت علیؓ کے پس پردہ اُن فتنہ پردازوں کا اقتدار مضبوط ہوتا چلا جائے گا جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا تھا اور جن کی تلواروں کے زیرِ سایہ حضرت علیؓ خلیفہ بنے تھے۔ ان شریروں کا مقتدر ہوتے چلے جانا ملک و ملت کے لئے زبردست خطرہ تھا ایسا خطرہ جو بنے جڑے نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا اور اُس اسلام کو تنگ سے تنگ دائرے میں محدود کر سکتا تھا جسے دیارِ کفر میں پھیلانے کے خواب حضرت معاویہؓ دیکھتے رہے تھے اور آخر کار ان خوابوں کی حقیقی عملی تعبیر بھی انھوں نے دنیا کے آگے پیش کی۔

اگر معاویہؓ صرف بدگمانی ہی بدگمانی کے مستحق نہیں بلکہ حسنِ ظن کا بھی ان کے حق میں کوئی جواز ہے تو آخر ان کے انحراف کو ایک ہی صرف ایک ہی معنی پہنانے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے۔ وہ معنی جو سراسر مذموم اور بھیانک ہیں۔ دوسرے ممکن زاویوں سے کیوں ان کے طرزِ عمل کی توجیہہ نہیں کی جاتی۔ صحابیت کے شرف، کردار کی نفاست اور عظیم صلاحیتوں کے لحاظ سے یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان سے حسنِ ظن برتا جائے اور انھیں ہر معاملہ میں محض اس لئے مطعون نہ کیا جائے کہ وہ مرتبے میں حضرت علیؓ سے کم ہیں۔ علیؓ پر ہزار سلام وہ تو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ان کی عظمت کا کیا ٹھکانا معاویہؓ ان کی ہمسری نہیں کر سکیں گے، لیکن بڑوں سے بھی تو چوک ہو سکتی ہے، ہوتی ہے۔ کیوں نہیں مانا جاتا کہ بے قصور معاویہؓ کو اچانک معزول کرنے کا اقدام اور اس پر غیر معمولی اصرار تدبّر کے خلاف تھا، سیاست تو ایک دلدل ہے۔ ایک قدم غلط اُٹھ جائے گا تو دوسرا قدم آپ سے آپ آگے بڑھے گا۔ ردِ عمل میں کتنے ہی کیڑے کوئی ڈالے مگر اس کی ذمہ داری سے خود عمل بالاتر نہیں ہو سکتا۔

رہا یزید کو ولیعہد بنانے کا معاملہ تو اس پر ہم جتنا کچھ تجلّی میں کہہ چکے ہیں اس سے زیادہ اب کچھ کہنا نہیں۔ ولیعہد بنانا اصولاً ہمارے نزدیک بھی اسلامی نظامِ حکومت سے جوڑ نہیں کھاتا لیکن جن مخصوص حالات میں حضرت معاویہؓ نے یہ کام کیا تھا وہ بہرحال ایسے تھے کہ ان کی رعایت سے حضرت معاویہؓ کے لئے خوش گمانی کی گنجائش نکلتی ہے۔ یزید کو بدسے بدتر مشہور کر دیا گیا ہے اس لئے اس بارے میں اذہان عموماً جذباتی لگاوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یزید اتنا بُرا ہرگز نہیں تھا جتنا بُرا مشہور کیا گیا ہے۔ لہٰذا طریقۂ ولیعہدی کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے بھی ہم معاویہؓ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ نہیں کہہ سکتے جو صحابیت کے مقدس وصف پر کیچڑ اُچھالنے کے مرادف ہوں۔ یہی موقف ہمارا شروع سے ہے۔ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ ولی عہد بنانے کا طریقہ اختیار کر کے معاویہؓ نے کوئی قابلِ تقلید کارنامہ انجام دیا۔ مگر یہ ہمیشہ کہا اور آج بھی کہیں گے کہ اس عمل کے پیچھے معاویہؓ کی بدنیتی نہیں حسنِ نیت کی کارفرمائی تھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب ہم اجتہادِ معاویہ کے غلط ہونے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ان کے طریقِ ولی عہدی کی تصویب نہیں ہوتا، بلکہ مطلب اُس روش سے ہوتا ہے جو انھوں نے حکم عزل کے سلسلے میں اختیار کی۔ ہم آج تک نہیں جان سکے ہیں کہ معاویہؓ کو برملا معزول کر دینے میں حضرت علیؓ کا اجتہاد کیونکر

بر حق تھا۔

---

(۶) یہ چھٹی شق وضاحت طلب ہے، بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ حضرت حسینؓ یزید کے خلاف نہ اُٹھتے تو دورِ خلافتِ راشدہ کس کونے میں جا چھپتا اور کیوں اسے مثالی حیثیت میں پیش کرنا ناممکن ہوتا۔ یہ عجیب ہی خیال ہے کہ حضرت حسینؓ کا سکوت خلافتِ راشدہ پر مٹی ڈال دیتا۔

ناچیز کا خیال ہے کہ اس چھٹی شق میں آپ اسی شاعری کے موڈ میں پہنچ گئے ہیں جو کربلا کے موضوع پر صدیوں سے عام ہے اس طرح کی طبع طرازیاں تو مدت سے ہو رہی ہیں مگر بحث دراصل ٹھوس حقائق کی ہے حسنِ کلام اور سخن طرازی کی نہیں۔ مزید بات یہ ہے کہ فارسی کے اس کمل شعر کو آپ نے اقبال سے منسوب کر دیا ہے جو عام طور پر حضرت معین الدین چشتیؒ سے منسوب ہے حالانکہ وہ ارسطوہ معین الدین کا شانی کا ہے۔ تجلی میں اس پر تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ اگر وہ اقبال یا ارسطو کا بھی ہو تو اس سے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر حضرت حسینؓ نے یزید کی بیعت اسی لئے نہیں کی تھی کہ بیعت کرنے کا مطلب یزید کو اراتسلیم کر لینا ہے تو پھر ماننا چاہئے کہ وہ سیکڑوں صحابہؓ کتنے گمراہ ہی تھے جنھوں نے یزید کی بیعت کی اور علم بغاوت بلند نہیں کیا۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

مولانا مودودی کے ارشادات

گذشتہ محرم میں مولانا مودودی نے اسی موضوع پر ایک تقریر کی تھی جسے ہم نے رسائل میں پڑھا تھا — کتنے ہی حضرات نے ہمیں لکھا کہ اس تقریر پر رائے زنی کریں لیکن ہم نے نہیں کی۔ اس لئے نہیں کی کہ اپنے موقف کے سلسلہ میں جتنا ہمیں کہنا تھا کہہ چکے۔ اب کیا ضروری ہے کہ برابر ردّ و قدح کئے ہی جائیں۔

مگر تازہ ترجمان القرآن (بابت ستمبر ۶۲ء) میں ایک خط کے جواب میں مولانا نے جو کچھ رقم فرمایا ہے اس پر ادب کے ساتھ کچھ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا۔

مکتوب نگار نے ان کی تقریر کے تعلق سے یہی سوال اُٹھایا تھا کہ آخر حضرت معاویہؓ پر حضرت علیؓ کی بیعت کیوں ضروری تھی؟

جواب میں مولانا نے رقم فرمایا ہے :-

"آپ نے جو سوالات چھیڑے ہیں ان کا مفصل جواب دوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طویل مضمون لکھوں جس کے لئے میرے پاس وقت نہیں اور مختصر جواب دوں تو وہ آپ کو مطمئن کرنے میں اس سے زیادہ ناکام ہوگا جتنی اس تقریر کی رپورٹ ناکام ہوئی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مختصراً جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ بجائے خود بحث طلب ہے اسے جوں کا توں صحیح مان لینے کے باوجود یہ سوال بالکل حل نہیں ہوتا کہ معاویہؓ کو معزول کرنے کے اقدام اور اس پر شدید اصرار میں حضرت علیؓ کیوں بر حق تھے؟

"امام ابوحنیفہؒ جیسے محتاط فقیہ کی رائے بھی یہی تھی کہ حضرت علیؓ کی جتنی لڑائیاں بھی مختلف گروہوں سے ہوئیں ان میں حق حضرت علیؓ ہی کے ساتھ تھا۔"

اولاً یہ دعویٰ مضبوط شہادتوں کا محتاج ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی واقعتہً یہی رائے تھی۔ ہمارا مطالعہ محدود اور علم ناقص ہے۔ نہیں معلوم کہ کس مقام پر کن راویوں کے ذریعہ امام صاحبؒ کی یہ رائے نقل ہوئی ہے۔ اگر مولانا نشاندہی فرما سکیں تو ہم بھی روشنی حاصل کر سکیں گے۔

ثانیاً یہ مسئلہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ امام اعظمؒ کی بینظیر خوبیوں کا اعتراف کرنے والے ہر شخص کے لئے ضروری تو نہیں ہے کہ تمام ہی مسائل میں ان کے خیال و رائے کو حرفِ آخر مانے۔ اگر حقیقتاً وہ حضرت علیؓ کو برسرِ حق اور حضرت معاویہؓ کو غلطی پر تصور فرماتے رہے ہیں تو ضرور ان کے ذہنِ رسا نے عزلِ معاویہ کی صحت و معدلت کا کوئی برہان

تو ہی ڈھونڈ نکالا ہو گا۔ ہماری نگاہ میں چونکہ یہ اقدام عزل ہی اس بحث کا اصل محور ہے اس لئے جبتک امام اعظمؒ کا تلاش فرمودہ برہان معلوم نہ ہو جائے کیونکر اُس فیصلے تک رسائی ہو سکتی ہے جس تک امام صاحب پہنچے ہیں۔ امام صاحب کی کسی رائے پر ردو قدح ہماری مجال نہیں ہے مگر انھیں ہمنے امام معصوم بھی نہیں مانا ہے کہ ہر حال میں سمعنا واطعنا کی روش اختیار کریں۔

حضرت معاویہؓ کے غلط کار ہونے کے ثبوت میں مولانا مودودی نے حضرت عمارؓ بن یاسر کی شہادت والی روایت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے اور اسی کی روسے یہ وضاحت کی ہے کہ گروہِ معاویہ کے باغی ہونے پر اہلِ سنت کا اجماع ہو گیا تھا۔

ہمارا ناچیز خیال یہ ہے کہ متذکرہ روایت اس درجے کی نہیں ہے کہ اس کی صحت میں کلام جائز نہ ہو۔ انکارِ حدیث کو ہم ترکِ اسلام ہی کی ایک شکل سمجھتے ہیں اور جس روایت کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قوی طور پر ہو جائے اس سے گریز وانحراف کرنا ہمارے نزدیک کفر ہے لیکن جن روایات کا معنوی تعلق حضرت علیؓ و معاویہؓ کی ذات سے ہو ان کی قبولیت میں محققین سلف نے بھی انتہائی احتیاط کی تلقین کی ہے اور ہم بھی اسی احتیاط کے قائل ہیں۔ یہ روایت اس درجہ قوی نہیں ہے کہ اس کی شہادت پر معاویہؓ اور بہت سے دیگر جلیل القدر صحابہؓ کو بدترین معنوں میں باغی قرار دے دیا جائے۔

ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ ایک خلیفۂ راشد کا باغی اگر کامیاب ہو کر تختِ خلافت پر متمکن ہو جائے تو اس کی حکومت کو جائز حکومت نہیں مانا جائے گا — مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ اسی باغی کے حق میں دست برداری دیدیتے ہیں اور دوسرے صحابہ بھی بیعت سے انحراف نہیں کرتے تو دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ سب اصحابِ دین اور اصولِ اسلام سے بے بہرہ تھے۔ یا پھر بہرہ رکھتے ہوئے بھی قصداً مرتکبِ گناہ تھے۔ ہمیں یہ دونوں توجیہیں قبول نہیں لہٰذا آخری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ معاویہؓ کے طرزِ عمل کو لغوی معنوں میں بغاوت مان لیا جائے مگر اُس اصطلاحی مفہوم میں بغاوت نہ سمجھا جائے جس کی روسے باغی کا ٹھکانا جہنم قرار پاتا ہے۔ یہ تاویل بارد نہیں ہے، بلکہ ایسی ہی تاویل ہے جیسی حضرت حسینؓ کے معاملے میں کی جاتی ہے۔ حضرت حسینؓ کے طرزِ عمل کو خود صحابہؓ نے خروج سے تعبیر کیا۔ لیکن ہم اسے لغوی مفہوم میں لیکر حضرت حسینؓ کو جنتی سمجھتے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے خروج کا مرتکب رسول اللہؐ کا نافرمان ہے کیونکہ آپؐ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے مگر حضرت حسینؓ کو نانے جان کا نافرمان قرار دے کر مستحق عذاب ماننے کی جسارت ہم نہیں کر سکتے۔

مولانا مودودی نے فرمایا ہے کہ اہل سنت بالاتفاق حضرت علیؓ کو خلیفۂ راشد مانتے ہیں جب کہ امیر معاویہؓ کو کسی قابلِ ذکر عالم نے خلفائے راشدین میں شمار نہیں کیا۔

ٹھیک ہے۔ محمود احمد عباسی بھی حضرت علیؓ کے خلیفۂ راشد ہونے سے انکار نہیں کرتے اور یہ لقب چونکہ ایک اصطلاحی لقب ہے اس لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اسے چار خلفاء کے لئے محدود کر دیا جائے۔ لیکن خلیفۂ راشد اور "نبی" ہم معنے تو نہیں ہیں کہ جسے خلیفۂ راشد قرار دیں اسے معصوم عن الخطاء بھی ضرور مانیں۔ حضرت علیؓ تو آخری خلیفۂ راشد تھے اصولاً تو پہلے تینوں خلفاء میں سے بھی کوئی یہ پوزیشن نہیں رکھتا کہ اسکے کسی فکر و عمل کو صرف اس دلیل سے برحق ماننے پر مجبور ہونا پڑے کہ وہ خلیفۂ راشد تھا۔ معیارِ حق صرف اللہ اور رسولؐ ہیں۔ ان کے ماسوا ہر فرد سے غلطی ہو سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کے اجتہاد کو مبنی بر خطا مان لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انکے خلیفۂ راشد ہونے میں شک کیا جا رہا ہے۔ ہاں یہ فرق بہرحال ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت علیؓ بعض پہلوؤں سے اتنی کامل نہیں تھی جتنی پچھلی تینوں خلافتیں تھیں۔ اس فرق کا ذکر اکثر متقدمین و متاخرین نے کیا ہے اور شاہ ولی اللہ کے یہاں تو اس کا نمایاں تذکرہ ملتا ہے۔

مولانا مودودی نے یہ بھی فرمایا کہ تمام فقہائے اہلسنت اپنی کتابوں میں خلفائے اربعہ کے فیصلوں کے نظائر سے استدلال کرتے ہیں مگر بنی اُمیّہ میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے

فیصلوں کے سوا انھوں نے اور کسی کے فیصلوں کا حوالہ فقہی مسائل میں نہیں دیا ہے۔

یہ تبیین ان لوگوں کے لئے تو نقصان دہ ہو سکتی ہے جو حضرت علیؓ کے فہم وذکا، علم وبصیرت، تفقہ اور دینی تجربے کے بارے میں مذبذب یا بدگمان ہیں۔ ہمیں اس باب میں کوئی شبہ اور سوء ظن نہیں۔ حضرت علیؓ کی ذہانت وذکاوت، قوتِ فیصلہ، بالغ نظری اور تفقہ کا وافر سرمایہ ہمارے لئے باعثِ فخر ہے مگر گفتگو جس خاص معاملہ میں ہے اس پر اس فضل وتفوق کا کوئی فیصلہ کن اثر نہیں پڑتا۔ حضرت علیؓ ایک بہترین جج تھے۔ زہد وتقویٰ میں بھی وہ امیر معاویہؓ سے کہیں بڑھ کر تھے۔ پھر وہ تینوں پچھلی خلافتوں میں خلفاء کے ہم نوالہ وہم پیالہ بھی رہے ہے۔ ان کے مشوروں سے خلفاء نے اور خلفاء کے فکر ونظر سے انھوں نے فائدہ اُٹھایا۔ ان کے کاندھوں پر سیادت وخلافت کا بار نہیں تھا اس لئے انھیں اپنی صلاحیتوں کو عام مسائل و معاملات کی گرہ کشائی میں صرف کرنے کا خوب خوب موقع ملا۔ اس کے برخلاف امیر معاویہؓ کے حالات بالکل اور ہیں ان کا ماحول بھی جدا ہے۔ ان کے فکر وتدبر کا نہاک ایسے سیاسی وانتظامی اُمور میں رہا جن کا تعلق فقہی جزئیات سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے یہاں ان کا ذکر نہ بیان نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول صلعم نے ہدایت کی جو دعا امیر معاویہؓ کے لئے کی تھی وہ بیکار رہی گئی۔ ممدوح اللہ کے فضل سے اونچے درجے کے فقیہہ تھے اور فقاہت میں بھی کسی کو شک ہو تو بہر حال ایسے کسی جرم و گناہ کا سراغ ان کی فردِ عمل میں ہرگز نہیں ملتا جو حضرت علیؓ کے لئے ان کی معزولی کو برحق قرار دیدے

سائل نے مولانا مودودی سے یہ بھی پوچھا ہے کہ حضرت حسینؓ کو جملہ صحابہؓ نے کوفہ جانے کو منع کیا تھا لیکن آپ نہیں رُکے۔ تو کیا ایک معظم حکومت کے مقابلے میں جب کہ ہلاکت کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو مقابلہ کے لئے نکل کھڑا ہونا دانشمندانہ اقدام ہے؟ کیا اسلام یہی تعلیم دیتا ہے؟

مولانا مودودی نے اس سوال کے جواب کو بھی ایک مفصل مضمون لکھنے کی فرصت میسر آنے پر ملتوی کر دیا ہے مگر مختصراً یہ ضرور کہا ہے کہ:-

"اگر ان حضرات کا نقطۂ نظر اختیار کر لیا جائے (جو اقدام حسین کو دانشمندانہ قرار نہیں دیتے تجلی) تو مسلمانوں کی حکومت ایک دفعہ بگڑ جانے کے بعد پھر اس کی اصلاح کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا پھر تو اسے بدلنے کی ہر تدبیر گناہ قرار پائے گی اور بگڑے ہوئے حاکموں کی اطاعت میں سر جھکا دینا صواب بن جائے گا۔ یزید کی خلافت بھی برحق ہو تو آج کے ظالم وجبار لوگ کیا بُرے ہیں انکے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں"

اس سے واضح ہوا کہ حضرت حسینؓ کے بارے میں مقبولِ عام مسلک وموقف سے اتفاق مولانا مودودی نے محض رواج اور فیشن کے طور پر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے پیشِ نظر ایک اونچا مقصد ومدعا ہے۔ یہی توقع ان جیسے مردِ حق آگاہ سے ہوتی بھی چاہئے لیکن چھوٹا منھ بڑی بات نہ ہو تو ہم عرض کریں گے کہ مولانا موصوف نے اس معاملہ کو زیادہ عمیق اور دقیقہ رس نظروں سے نہیں دیکھا ہے۔

اولاً تو یہ کہ انھوں نے یزید کو اتنا ہی بُرا تسلیم کر لیا ہے جتنا وہ مشہور ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کے نقطۂ نظر پر انھیں اعتراض ہے وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ یزید سچ مچ اتنا ہی بُرا تھا۔ ان کے پاس دلائل بھی ہیں اور دلائل میں بعض اتنے قوی و محکم ہیں کہ انھیں کسی متضاد رب دلیل سے نہیں توڑا جا سکتا۔ آخر اس کی کیا تاویل کریں گے کہ راویانِ حدیث میں تقریباً دو سو راویوں کا نام "یزید" رہا ہے حتیٰ کہ جن راویانِ حدیث کو شیعوں نے اپنایا ان میں بھی سو سے اُوپر "یزید" موجود ہیں۔ غور کی جا ہے کہ اگر یزید اتنی ہی رسواکن شہرت کا حامل ہوتا جتنی یاروں نے آج اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ملتِ مسلمہ دھڑا دھڑ اپنی اولادوں کا نام یزید رکھتی چلی جاتی۔ یہ برملا نام رکھنا ہی ایک ناقابلِ تردید تاریخی شہادت ہے اس

امر کی کہ یزید کی سادہ تصویر میں ناپاک رنگوں گلکاری بعد میں کی گئی ہے اور اس گلکاری سے خصوصی دلچسپی شیعہ حضرات کو اس لئے ہوئی کہ اس کے توسّط سے حضرت معاویہؓ کی آبرو خاک میں ملانی تھی۔ معاویہؓ حضرت علیؓ کے حریف تھے اس لئے انکی ہر ممکن تضحیک و تحقیر شیعہ آئیڈیالوجی کی جان ہے اور بدقسمتی سے سنّی حضرات بھی اسی فاسد و کاسد آئیڈیالوجی کے پھیر میں آگئے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو اجتہادی غلطی کہنے کا لازمی مطلب یہ ہرگز نہیں نکلتا کہ بگڑی ہوئی مسلمان حکومتوں کی اصلاح کا راستہ بند ہو جائے۔ اگر نتیجہ نکالنے میں لطیف پہلوؤں کو نظرانداز کر دینا روا ہو تو پھر اُن تمام حدیثوں سے بھی جن میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج و بغاوت مت کرو جب تک ان سے کفرِ بواح ظاہر نہ ہو یہ مطلب نکالنا آسان ہوگا کہ انھوں نے بگڑی ہوئی مسلمان حکومتوں کی اصلاح کا راستہ روک دیا ہے۔ آخر غور تو کیجئے اطاعتِ امیر کی حدیثوں پر وہ اعتراض آخر کیوں وارد نہیں ہوتا جو حضرت حسینؓ کے اجتہاد کو غلط سمجھنے والوں پر وارد کیا گیا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ جن اصلاحی تدابیر کا اشارہ مولانا نے کیا ہے وہ صرف خروج و بغاوت ہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ یزید اگر واقعتہً بھی بہت برا ہوتا تب بھی اس کا تختہ اُلٹ کر اپنی خلافت قائم کرنے کی جد و جہد کے علاوہ بھی اصلاح کی تدبیریں ممکن تھیں۔ تن تنہا حصولِ خلافت کی کوشش کے عوض حضرت حسینؓ کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ ارباب حل و عقد سے مشورہ کر کے اور صحابہؓ کا تعاون لیکر پرائیویٹ پُرامن اصلاح کرتے۔ آخر مولانا مودودی کو بھی تو برابر ایسی حکومتوں سے واسطہ پیش آ رہا ہے جو اسلام دشمنی میں یزید کی استاد، مغرب نوازی میں یزید کی چچا اور نفاق و زندقہ میں یزید سے دس ہاتھ آگے ہیں، مگر نہیں دیکھا گیا کہ مولانا نے بغاوت کی راہ اختیار کی ہو۔ اس کی بجائے وہ پُرامن اور آئینی جد و جہد میں منہمک ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بگڑی ہوئی حکومتوں کی اصلاح خود ان کے نزدیک بھی صرف بغاوت میں منحصر نہیں ہے بلکہ صحیح طریقۂ اصلاح ان کی نگاہ میں امن اور آئین کے دائرے میں رہ کر جد و جہد کرنا ہے۔ یہ شہادت اتنی مضبوط اور تر و تازہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص عقیدتوں کی کیچلی سے باہر نکل کر فکر و تدبّر کرے گا یہ مانے بغیر نہ رہے گا کہ حضرت حسینؓ کے اقدام سے جو معانی و ثمرات منسوب کئے جاتے ہیں وہ در اصل نکتہ بعد الوقوع ہیں۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ اقدام حسین میں وہ فوائد موجود تھے جو آج متشرح کئے جاتے ہیں اور یہ اقدام ظہور میں نہ آتا تو نتائج وہ نکلتے جو آج نکلے جا رہے ہیں۔ ہماری نظر میں اقدام حسین ظہور میں نہ آتا تب بھی بگڑی ہوئی مسلمان حکومتوں کی اصلاح کا ہر وہ راستہ کھلا ہی رہتا جو آج کھلا ہوا ہے۔ یہ محض زبردستی ہے کہ تنہا خروج و بغاوت ہی کا نام اصطلاح رکھ دیا جائے اور اقدام حسین کو اجتہادی غلطی قرار دینے کا لازمی مطلب یہ نکالا جائے کہ اصلاح کا دروازہ بالکل بند ہوا جاتا ہے۔ اس زبردستی کی زد اُن تمام حدیثوں پر پڑتی ہے جن میں معروف کی حد تک بگڑے ہوئے حاکموں کی بھی اطاعت ہی کا درس — بلکہ حکم دیا گیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد حسین کو مبنی بر خطا ماننے کی صورت میں تو بھیانک اور مذموم نتائج نکالنے میں لوگ بڑی دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں لیکن اس اجتہاد کو برحق ماننے سے جو واضح نتائج اُبھرتے ہیں ان پر کیوں توجہ نہیں کرتے۔ ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ مشورت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ مکمل خودرائی کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ صدہا صحابہؓ کے فکر و نظر کے بارے میں بڑی رائے قائم کرنی پڑتی ہے اور عبداللہ ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی فکر و عمل کے فساد سے غیر ملوّث نہیں رہ پاتے۔ تیسرا نتیجہ یہ کہ ان تمام حدیثوں کو بارد تاویلات کی خراد پر چڑھانا پڑتا ہے جن میں مسلمان حکومتِ قائمہ کے خلاف خروج و بغاوت کو جرم قرار دیا گیا ہے چاہے وہ حکومت ظالم و فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغاوت کی ممانعت اُس صورت میں ہے جب کہ حکومت کے بالمقابل کافی قوت اور

وسائل مہیا نہ ہوں۔ اگر کامیابی کے امکانات پچاس فیصد سے
زائد ہوں تب ظالم و فاسق حکومت کے خلاف علم بغاوت
بلند کرنا بھی برحق ہے۔ اس تشریح سے بھی اقدام حسین کی حقانیت
نہیں نکلتی۔ کیونکہ مادّی اعتبار سے دس فیصدی بھی امکان انکی
کامیابی کا نہ تھا۔۔۔ اور اگر تھا تو صرف اس صورت میں کہ اہل
کوفہ بہادروں کی طرح ان کا ساتھ دیتے۔ لیکن جب اہل کوفہ کی
بزدلی اور بدعہدی کا پورا پورا انکشاف ہو چکا تو اس کے بعد
کوئی سوال ہی حضرت حسینؓ کی کامیابی کا پیدا نہیں ہوتا تھا۔
۔۔ پھر کیونکر خروج کو برحق مانا جا سکتا ہے۔۔۔ ہمارے خیال کے
مطابق تو وہ خروج سے دست برداری دے چکے تھے اور اسی لئے
ان کی شہادت ہر پہلو سے مظلومانہ رہی، لیکن جو حضرات اس
دستبرداری کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ خروج ہی کو عین حق قرار
دیئے چلے جاتے ہیں اور "سر داد نہ داد دست در دست یزید"
کو فخر کے ساتھ دہراتے ہیں وہ غور کریں کہ احادیث متعلقہ کی
توجیہہ کیا کی جائے گی۔

آثار مبارک!

سوال :۔۔۔ از احمد بن عوض مہدی۔ حیدر آباد۔ دکن۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو موئے مبارک کی ماہ ربیع الاول
میں زیارت کی جاتی ہے وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔
اس سلسلے میں چونکہ آثار مبارک کا ادب ہمارے مکانوں میں
نہیں ہو سکتا اسی لئے اس کو مساجد میں رکھا جاتا ہے اور سال
میں ایک مرتبہ اس کی زیارت کی جاتی ہے۔ ہمارے لحاظ سے
آثار مبارک کی جتنی بھی تعظیم کی جائے وہ کم ہے۔ چنانچہ
زیارت کے وقت اس مبارک چیز کو سروں پر اٹھایا جاتا ہے
اور لوگ اس پر سے پانی وار کر پیتے ہیں۔ اسی روز ایک صاحب
نے کہا کہ یہ جو تعظیم کی جا رہی ہے یہ ناجائز ہے۔ مساجد جو صرف
اللہ کی تعظیم کا مقام ہے اور جس میں صرف اللہ ہی کی عبادت
ہوتی ہے وہاں پر یہ تعظیم کیسے؟ چنانچہ اس آثار مبارک کے رکھنے
کی جگہ پر ایک کپڑا باندھا گیا ہے اس پر وہ کہنے لگے کہ اس کو
نعوذ باللہ دیول بنا دیا گیا ہے اور اس کی جو تعظیم کی جاتی ہے وہ
بالکل غلط اور ناجائز ہے اور اگر جائز بھی ہے تب بھی اس کا
شریعت اور فقہ میں کیا مقام ہے اور اسلام اس کی کہاں اجازت
دیتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی بہت سے سوالات
کئے اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ نہ اس کو برا کہو نہ بھلا یعنی بالکل
غیر جانبدارانہ اس کی زیارت کرے۔

کیا یہ آثار مبارک خلفائے راشدین کے زمانے میں موجود
نہیں تھا اور کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے تابعین اسکی
تعظیم نہیں کرتے تھے اگر یہ لوگ اس کی تعظیم نہ کرتے تھے تو یہ
ہم لوگوں تک کس طرح پہنچا؟ کیا کوئی نئی ایجاد تو نہیں؟ اسی سلسلہ
میں حضور صلعم اور حضرت غوث پاکؒ کے موئے مبارک میں کیا
فرق ہے؟ ہر سال ان موئے مبارکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا
ہے اس کی تمیز کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب :۔۔۔

معلوم ہوتا ہے آنجناب تجلی کے قدیم قاری نہیں ہیں ورنہ
کچھ عرصہ پہلے "بال مبارک" کے موضوع پر ہم تفصیلاً گفتگو کر چکے
ہیں۔ اگر "تجلی کی ڈاک" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہوتی تو
ہم آپ سے عرض کر دیتے کہ اس میں یہ گفتگو ملاحظہ فرمالیں، مگر ابھی
تک ایسا نہیں ہو سکا ہے اور پرانے پرچے مہیا کرنا ادارے کے
لئے دشوار ہے اس لئے جواب عرض کیا جاتا ہے۔

نفس امّارہ اور شیطان کی باہمی مفاہمت اور سازش نے
مذہب کے نام پر جو نوع بہ نوع خرافات و لغویات مسلمانوں میں عام
کر دی ہیں یہ "موئے مبارک" کا تماشا بھی انھی میں سے ایک ہے
یہ تو بعد کی بحث ہے کہ مساجد کو اس تماشے کا اسٹیج بنانا حلال ہے
یا حرام۔ مقدم تو یہی دیکھنا ہے کہ اس کھیل کی حقیقت کیا ہے۔

ہم عقلی و نقلی ہر اعتبار سے غور و فکر کرنے کے بعد بلا ریب
یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج پونے چودہ سو برس گذر جانے کے بعد کسی
"بال" کے بارے میں یہ یقین کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے
کہ وہ ختمی مرتبت سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بال
ہے۔ یقین تو کجا گمان غالب کا بھی قرینہ نہیں۔ گمان غالب تو
کہاں اُلٹا یہ باور کرنے کے قرائن موجود ہیں کہ یہ انتساب محض
من گھڑت ہے اور موئے مبارک کا تماشا ایسا ہی تماشا ہے

جیساکہ بعض لوگوں نے نشانات قدم ایجاد کرلئے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی شے کی نسبت کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے اور قوی دلائل اس کے لئے بہت ضروری ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص جھوٹ میری طرف کوئی چیز منسوب کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ وعید جہاں حضورؐ کے ارشادات کے باب میں حزم و احتیاط کا سبق دیتی ہے وہیں یہ ہر قسم کے انتساب کے متعلق تنبیہ کرتی ہے جو لوگ کسی "بال" کو حضورؐ کا بال بتاکر تعظیم و تکریم کا ڈرامہ اسٹیج کرتے ہیں ان سے ذرا پوچھ کر تو دیکھئے کہ آخر یہ نادر انکشاف آپ پر کیونکر ہوا کہ یہ بال حضورؐ کا ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی اس دعوے کی صداقت پر تیسرے درجے کی شہادت بھی مہیا نہیں کرسکتا۔ حالانکہ حضورؐ کی ذات سے کسی شے کو منسوب کرنے کے لئے اول درجے کی شہادت ہونی چاہئے۔ گئی گذری حالت میں دوسرے درجے کی شہادت کا کچھ اعتبار ہوسکتا ہے، مگر تیسرے درجے کی شہادت سے تو ارباب احتیاط دور بھاگتے ہیں۔ اور جہاں تیسرے کیا کسی بھی درجے کی شہادت موجود نہ ہو بلکہ محض عوام کی کم سمجھی، ضعیف الاعتقادی اور عجوبہ پسندی سے فائدہ اٹھاکر ایک ڈھونگ چالیا گیا ہو وہاں کسی ہوشمند اور خدا ترس مسلمان کے لئے سوائے استغفار پڑھنے کے کیا چارہ رہ جاتا ہے۔

یہ تو تھا اس دعوے کے رد میں کہ فلاں بال حضورؐ کا اور فلاں غوث پاک کا ہے۔ اب اگر چند لمحے کے لئے یہ فرض بھی کرلیں کہ یہ انتساب درست ہے تب بھی وہ طریقہ بدعت کے سوا کیا ہے جو تعظیم و تکریم کے نام پر ایجاد کرلیا گیا ہے۔ حضورؐ کا بال حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس بھی تھا۔ انھوں نے اسے برکت حاصل کرنے کی نیت سے اپنی ٹوپی اور عمامے وغیرہ میں رکھا۔ یہ ہرگز نہیں کیا کہ دن مقرر کرکے اس کی نمائش میں مجمع لگائیں نہ کسی اور مسلمان نے ان سے مطالبہ کیا کہ اس بال کی زیارت اوروں کو بھی کرایا کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بال ہو یا ناخن۔ یہاں تک کہ تھوک بھی یقیناً مبارک اور متبرک ہے۔ کافر ہی ہوگا وہ شخص جو حضورؐ سے منتسب کسی شے کے لئے تقدیس و احترام کا احساس نہ کرے، لیکن ہر شے کے لئے اسلام نے کچھ حدود متعین کئے ہیں۔ عقیدت ہو یا نفرت ہر ایک کے کچھ پیمانے کچھ معیار ہیں۔ حضورؐ کے کسی بال یا ناخن یا مزعومہ نقش قدم کی زیارت کے لئے دن مقرر کرکے مجمع لگانا اور مجلسیں سجانا ایک غلط طریق ہے جسے نہ تو صحابہؓ، تابعینؒ، ائمہ اور محدثین نے پسند کیا نہ اسلام کی نفسیات اس کی اجازت دیتی ہے مسلمان کو حکم دیا گیا کہ عملی سرگرمیوں پر زور دے۔ جسم اور اسکی توانائیوں کو عبادت و اطاعت، خدمتِ خلق اور دین و ملت کے فلاح و ارتقاء کی غیر منقطع جد وجہد میں لگائے رکھے۔ صدیوں پہلے دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کے عملی قوا کو معطل کرنے اور وہم و خیال کی دنیا میں سرگرداں پھرانے کی خاطر تقدیر، امکانِ کذب، رویت باری جیسے دور از کار مسائل کھڑے کئے تھے وہ زمانہ فلسفے اور علم کلام کا تھا اس لئے ایسے ہی دماغ سوز مسائل دانۂ دوام کا کام دے سکتے تھے۔ اب علم و تعقل مسلمانوں کے عوام سے رخصت ہوا اور جہل و توہم نے ڈیرہ ڈال دیا لہٰذا انھیں شیطان ان کی صلاحیت اور نفسیات کے مطابق دوسری قسم کی فضولیات و ہفوات میں پھنسا رہا ہے تاکہ وہ اصل اسلام سے بے تعلق ہی رہیں اور ان کی روحانی پیاس خوشنما سرابوں سے دھوکہ کھاتی رہے۔ یہ قبوری شریعت کے عناصرِ خبیثہ۔ یہ قوالی بازی، یہ عرس، یہ اولیاء کی تکریم کے نام پر شرک و زندقہ کا زور، یہ حیات النبیؐ اور علم غیب وغیرہ کی بحثیں، یہ موئے مبارک اور قدم شریف کی تقریبیں ـــــ یہ سب خرافات و لغویات اسی لئے تو ہیں کہ اسلام کی وہ بنیادی قدریں، وہ اہم اصول و احکام اور وہ انقلاب انگیز سرگرمیاں موت کی نیند سوتی رہیں جو شرک و زندقہ کے لئے پیغامِ مرگ اور شیطان کے لئے درّۂ فاروقی ثابت ہوسکتی ہیں۔

بات لمبی ہوگئی۔ مگر جس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرانا ہے وہ اسی لائق ہے کہ تفہیم میں بخل نہ کیا جائے۔ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اور ائمہ و فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی زندگیوں کا مطالعہ کرکے آگاہی حاصل کیجئے کہ کس قسم کے مشاغل تھے جنھیں انھوں نے اہمیت دی اور کس نوع کے ان کا رد اعمال تھے جن سے وہ کنارہ کش

ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اچھا مسلمان وہ ہے جو
یعنی چیزوں کو ترک کر دے۔ گناہ کا ارتکاب تو بہر حال مسلمان
ے شایانِ شان ہے ہی نہیں مگر وہ افکار و اعمال بھی مسلمان کے شایانِ
ان نہیں ہیں جو گناہ نہ ہوتے ہوئے بھی لایعنی اور بے فائدہ ہوں
۔ بھلا وہ مشاغل اور معتقدات مسلمان کو کیا زیب دے سکتے ہیں
راس کی توانائیوں اور صلاحیتوں کو اصل کام سے ہٹا کر ایسے کاموں
ے رُخ پر موڑ دیں جن کا نتیجہ جگ ہنسائی، پس ماندگی، زوال اور
لوبیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

بال مبارک کی رونمائی اور تکریم کا ہنگامہ لفظاً ہر بڑی
بصورت اور مقدس شے معلوم ہوتا ہے مگر اصلاً یہ انھی مشاغل
ں سے ایک ہے جنھیں شیطان نے دامِ ہم رنگِ زمیں کے طور پر بچھایا
ہے۔ یہ بجائے خود کیسا ہی معصوم اور بے ضرر معلوم ہو مگر اثرات
ے اعتبار سے یہ اُن غذاؤں میں سے ایک ہے جو لایعنی امور میں
ہماک کے رجحان اور سنت کی عملی پیروی سے فرار کی ذہنیت کو
نویت پہنچاتی ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ جو شخص فٹ پاتھ پر مجمع لگانے
لے بازیگر کے تماشے میں دلچسپی لیتا ہے وہ صرف اتنا ہی نقصان
یں کرتا کہ اپنی زندگی کے چند قیمتی لمحے برباد کر دیتا ہے بلکہ وقت
ناقدری اور لایعنی مشاغل میں دلچسپی لینے کے جو بچکانے اور مضر
جانات اس کے اندر پلتے جاتے ہیں انھیں تقویت اور نشوونما
ینے والے مزید جراثیم بھی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ دین و ملت
ے اہم کاموں سے غفلت برت کر بے اہمیت اور فاضل کاموں میں
ت گنواتے ہیں وہ گویا ایک تخریب مستقل کے مرتکب ہیں اور ان کی
صروفیت خود انھیں اور ان کے مقلدین کو دین کے مطلوبہ
اغل و مراحل سے بعید تر کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

حاصل اس طول بیانی کا یہ ہے کہ آثار مبارک کا قضیہ ہی
ُس لایعنی ہے کجا کہ اس کا مامن و مسکن مساجد کو بنایا جائے۔ اللہ
لی رحم فرمائے یہ وہی زمانہ ہے جس میں فتنے خودرو گھانس کی طرح
ُگتے ہیں اور ہم جیسے ٹوکنے والوں کی آوازیں قطعاً صدا بصحرا ثابت
تی ہیں۔

یہ بات اور سُن لیجئے کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا
ب غوث پاک بھی مبالغہ پسند ہی لوگوں کا ایجاد کردہ ہے۔۔۔
"غوث" حقیقی معنی میں سوائے خدا کے کوئی نہیں اور اگر مجازاً کسی
کسی کے لئے اس کا استعمال ہو بھی تو اس کے ساتھ "پاک" لگانا
وہی مہلک ذہنیت ہے جس نے ترقی پاکر حضرت مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا بنا
چھوڑا۔ غوث پاک یعنی چہ؟ پاک سیدھے سادے معنوں میں تو
ہر دُھلا ہوا کپڑا بھی ہوتا ہے اور ساری زمین ہی اللہ کے فضل سے
پاک ہے۔ مگر حضرت جیلانیؒ کے ساتھ "پاک" کا لفظ اُس مجرمانہ
ذہن کی ایجاد ہے جو اللہ کے لئے مستعمل لفظ سبحان کو عیاری کے
ساتھ بندوں کے ساتھ جوڑ دینا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی
تنزیہہ اور پاکی بیان فرمائی۔ یہ وہ چیز تھی جس میں انبیاء تک شریک
نہیں، لیکن شیطان کے بھرّے میں آئے ہوئے غلو پسندوں نے ذرا
لفظی ہیر پھیر دیکر اسے بھی حضرت جیلانیؒ کے ساتھ نتھی کر دیا۔ یہ بات
اگر نہیں ہے تو پھر سوچئے کہ "غوث پاک" کیا مفہوم رکھتا ہے؟
پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے موئے مبارک تک بات تھی
اب غوث پاک کے موئے مبارک بھی پیدا کرلئے گئے —— ہائے یہ
گم کردہ راہ ملت جس کی مسخ شدہ توحید سے مشرک بھی شرماتے ہیں۔
نصرانی اگر حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہہ کر کافر ہو گئے تو سمجھ میں نہیں آتا
کہ وہ لوگ عند اللہ مومن کیسے ہو سکتے ہیں جو کسی انسان کو خدا
کا بیٹا تو کیا عینِ خدا بنائے بیٹھے ہیں اور ان کی تاویلات بُت
پرستوں کی اُن تاویلات سے بھی زیادہ گئی گزری ہیں جنھیں
عقل سلیم ایک لمحے کو قبول نہیں کرتی۔ اللہم احفظنا اللہم احفظنا۔

سیدنا زید بن حارثہؓ

سوال ۳: —— از ایم۔ احمد۔ اُناؤ۔

مستقل عنوان "کیا ہم مسلمان ہیں" کے تحت ستمبر ۶۲ء کے
تجلّی میں بسلسلۂ عشقِ رسولؐ سیدنا زید بن حارثہؓ کا جو واقعہ
لکھا ہے یہی واقعہ روزنامہ "دعوت دہلی" مؤرخہ ۴ ستمبر ۶۲ء نے
بھی "ذکر و فکر" میں بیان کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ شروع کا بیان
کردہ واقعہ تجلّی کے تحریر کردہ واقعہ سے [illegible] مطابقت نہیں
رکھتا۔ انھوں نے عیسائی پیشوا کا لڑکا بتایا اور قیدِ غلامی کا
سبب عیسائی اور مسلمانوں کی جنگ۔ جبکہ "تجلّی" میں بنی قضاعہ
کے قبیلے سے تعلق و نیز خود نخواہ اُڑا کر جو بنی قین سے۔ بھی کی لوٹ مار

میں ان کا لے جانا اور نیلام سے حکیم بن حزام کا اپنی پھوپی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچانا ثابت ہے۔ براہ کرم بواپسی ڈاک صحیح صورتِ حال سے مطلع فرمائیں۔

الجواب:-

"کیا ہم مسلمان ہیں" کا مستقل فیچر ہمارے برادرِ خورد جناب شمس نوید سلمہ لکھتے ہیں اور اولیٰ یہی تھا کہ آپ کے سوال کا جواب وہی دیتے۔ لیکن ان کا قیام مدرسہ عالیہ کی تدریس کے سلسلے میں رام پور رہتا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا خط انھیں ہی بھیجکر جواب لینے کا لمبا راستہ اختیار کیا جائے بلکہ ہم ہی جواب عرض کئے دیتے ہیں۔

اخبار دعوت میں "ذکر و فکر" کے تحت جو کچھ شائع ہوتا ہے وہ عموماً دوسرے اخبارات و رسائل سے نقل کیا جاتا ہے اور بخل ارباب دعوت یہ برتتے ہیں کہ مضمون نگار اور ماخذ کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے ماخذ لکھدینے کی سخاوت کی ہو۔ ہمارے خیال میں انکا اور بعض دوسرے اخبارات و رسائل کا یہ وطیرہ اخلاقی اعتبار سے قابلِ فخر نہیں ہے کہ نقل تو جہاں سے جو چاہے بلا تکلف کرلیں مگر اس معاملہ کو گول ہی رکھیں کہ یہ نقل ہے یا خود ادارے کا کارنامہ ہے۔ یہ بڑی خراب ذہنیت ہے جس کی اصلاح ہونی چاہئیے۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ کہنا یہ ہے کہ متذکرہ "ذکر و فکر" میں جن زید کا تذکرہ ہے وہ بلا شبہ وہی ہیں جنھیں شمس نوید نے اپنے مضمون میں لیا ہے، لیکن ذکر و فکر میں ان کا نام بھی غلط شائع ہوا ہے۔ صحیح نام زید بن حارثہ ہے بن حارث نہیں۔ زید نامی تقریباً ساٹھ صحابی ہوئے ہیں ان میں صرف ایک کا نام زید بن حارث ہے جو انصاری بدری تھے۔ ان ایک کے بارے میں بھی مورخین میں اختلاف ہے کہ صحیح نام زید ہی تھا یا یزید تھا۔ اگر زید ہی مان لیا جائے تب بھی یہ طے ہے کہ وہ اُن زید بن حارثہ سے جدا شخصیت ہیں جن کا تذکرہ دعوت اور تجلی میں آیا ہے۔

واقعات وہی درست معلوم ہوتے ہیں جو شمس نوید نے سپردِ قلم کئے ہیں۔ صحابہ کے تعارف کی مشہور کتاب اسد الغابہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں زید بن حارثہ کا نسب نامہ بھی ہے جو ابن عمران بن الحاف بن قضاعہ تک پہنچتا ہے۔ ان کی والدہ سُعدیٰ بنت ثعلبہ بن عبد عامر بنی معن طاری کے خاندان سے تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ انھیں ساتھ لے کر اپنے خاندان سے ملنے جارہی تھیں کہ بنی قین بن جسر کے کچھ سواروں نے ڈاکوؤں کی حیثیت سے تاخت کی اور زید کو پکڑ لے گئے

راجح روایت یہی ہے کہ ان کا نیلام بازار عکاظ میں ہوا جیسا کہ شمس صاحب نے لکھا ہے مگر ایک روایت یہ بھی ہے کہ حکیم بن حزام نے انھیں بازار حباشہ سے خریدا تھا۔ انھوں نے انھیں اپنی پھوپی خدیجہ ہی کے لئے خریدا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضورؐ خلعتِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ زید اُس وقت آٹھ سال کے تھے۔

دعوت کے مضمون میں جو تقریر زید بن حارثہ سے کرائی گئی ہے وہ بھی مضمون نگار کی طبع زاد ہے۔ تاریخ میں منقول مکالمہ وہی ہے جو شمس صاحب نے سپردِ قلم فرمایا۔ شمس صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے منفرد طرزِ تحریر سے دلوں کو سوز و گداز سے لبریز کرتے ہیں، آنکھوں کو آنسو اور روح کو سرشاری دیتے ہیں، لیکن جذبات کی رو میں تاریخی حقائق میں تحریف و تغیر نہیں کرتے۔ مناسب بھی یہی ہے کہ اسلوب اور انشاء کے رکھ رکھاؤ میں تاریخی صداقت کا چہرہ نہ بگڑنے پائے۔

عقلاً بھی وہ روایت درست نہیں جو دعوت کے مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے معرکہ کا کیا سوال ہے جب کہ اس وقت مصطلحہ اسلام تھا ہی نہیں۔ خدا جانے یہ بات کہاں سے نقل کی گئی ہے کہ زید اسلام اور عیسائیت کے معرکہ میں ہاتھ آئے۔ اگر کسی طرح یہ بھی فرض کرلیں کہ اعلانِ رسالت کے بعد زید حضورؐ تک پہنچے ہیں تب بھی اس وقت تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگ کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جب کہ مسلمان نام کا کوئی قابلِ ذکر گروہ تھا ہی نہیں۔ زہری کی روایت کے مطابق یہ زید ہی تو سب سے پہلے مسلمان ہیں لیکن جن حضرات نے یہ ترتیب بیان کی ہے کہ پہلے حضرت

ریبہؓ نے اسلام قبول کیا پھر حضرت علیؓ نے پھر حضرت زیدؓ
حارثہ نے۔ ان کے اعتبار سے بھی مسلمانوں اور عیسائیوں
معرکہ کی بات خارج از بحث رہتی ہے۔

جواب پورا ہوا۔ قارئین کی ضیافت کے لئے ہم وہ
شعار بھی نقل کرتے ہیں جو باپ بیٹوں سے اسد الغابہ
ں منسوب ہیں۔

زید کے والد نے ان کی جدائی میں یہ شعر کہے تھے:۔

یتُ علیٰ زید ولم ادر ما فعل
حیّ یرجیٰ ام اتی دونہ الاجل
فواللہ ما ادری وان کنتُ سائلاً
اغالک سہل الارض ام غالک الجبل
الیت شعری ھل لک الدھر رجعۃٌ
سبی من الدنیا رجوعک لی علل
تذکرنیہ الشمس عند طلوعھا
ولعرض ذکراہ اذا قارب الطفل
ان ھبت الارواح ھیجن ذکرہ
اطول ما حزنی علیہ ویا وجل
ساعمل نص العیش فی الارض جاھدا
ولا اسأم التطواف او تسأم الابل
باتی او تاتی علی منیّتی
کل مرئ فان وان غرّہ الامل
ساوصی بہ قیساً وعمراً کلاھما
واوصی یزید اثم من بعدہ جبل

رجمہ:۔

میں زید کے لئے رو رہا ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ اسے
ا ہوا۔ آیا وہ زندہ ہے کہ اس کی بازیافت کی امید کی
سکے یا موت اسے نگل گئی۔ خدا کی قسم میں نے اگرچہ تجسس کیا
ر مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ تجھے زمین نگل گئی یا کسی پہاڑ نے چٹ
ر لیا۔ کاش مجھے پتہ چل جاتا کہ تو ایک نہ ایک دن ضرور
ٹے گا۔ تیرے لوٹنے کی امید ہی میرا دل بہلنے کے لئے کافی
وتی۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو مجھے زید کی یاد دلاتا ہے
اور جب وہ غروب ہوتا ہے اس وقت بھی یہ یاد تازہ رہتی
ہے۔ اور جب ہوائیں چلتی ہیں تب بھی اس کی یاد ابھر آتی
ہے۔ اس کے لئے میرا حزن و ملال بہت بڑھ گیا ہے۔ اب
میں اسی غم میں اپنی زندگی بتاؤں گا اور میرے خیالات اسی
یاد کے گرد مسلسل طواف کرتے رہیں گے الّا یہ کہ اونٹ ہی تھک
جائے (کعبے کا طواف اسلام سے قبل بھی کیا جاتا تھا اور اس
میں لوگ اونٹ کی سواری استعمال کرتے تھے۔ شاعر کا منشأ
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب میں بے تکان طواف کعبہ کئے جاؤں گا۔
ہاں وہ اونٹ ہی تھک کر بیٹھ جائے تو الگ بات ہے جس پہ بیٹھکر
طواف کیا جا رہا ہے) یہانتک کہ موت مجھے آلے اور موت تو
سبھی کو آنی ہے' یہ الگ بات ہے کہ تمنائیں انسان کو دھوکا
دیتی اور خود فریبی میں مبتلا رکھتی ہیں۔ میں قیس و عمر دونوں کو
زید کی تلاش کی وصیت کر کے جاؤں گا اور یزید و جبل کو بھی
وصیت کروں گا (یہ سب زید کے بھائی تھے)

پھر جب قبیلۂ کلب کے کچھ آدمی حج کے لئے آئے تو انھوں
نے زید کو پہچان لیا اور زید نے بھی انھیں پہچان لیا۔ اسوقت
زید نے چند شعر انھیں سنائے کہ یہ میری طرف سے میرے
گھر والوں کو پہنچا دینا۔ وہ شعر یہ ہیں:۔

احنّ الیٰ قومی وان کنت نائیا
فانّی قعید البیت عند المشاعر
تکفوا من الوجد الذی قد شجاکم
ولا تعملوا فی الارض نص الاباعر
فانی بحمد اللہ فی خیر اسرۃ
کرام معد کابراً بعد کابر

ترجمہ:۔

میں اگرچہ بچھڑ کر دور پڑا ہوں مگر اپنی قوم کیلئے بہت
روتا ہوں۔ ویسے میرا قیام اس وقت ایک ایسے گھر میں ہے
جو کعبے کے نزدیک ہے۔ پس آپ لوگ میری جدائی کے اس غم
کو جس نے آپکو بسمل بنا رکھا ہے تہہ کر کے رکھ دیجئے اور اونٹ
کی طرح تکلیف میں نہ پڑیئے۔ اللہ کا شکر ہے قید ہو کر میں ایک

نہایت معزز اور عمدہ گھرانے میں پہنچ گیا ہوں جہاں بزرگی و عظمت نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہے۔ (معاذ کے گھرانے سے مدعا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھرانہ ہے)

یہ سطور قلم سے نکل چکی تھیں کہ ۲۵ ستمبر ۶۲ء کا دعوت زیر مطالعہ آیا۔ لیجئے اس میں شمس صاحب کا یہی شہ پارہ "عشق رسول" کے عنوان سے نقل کر دیا گیا ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ شمس صاحب کا نام حذف نہیں کیا گیا، لیکن وہ بخل اپنی جگہ موجود ہے جس کا شکوہ ہم نے شروع میں کیا۔ یعنی ماخذ کا نام ندارد۔ اللہ ادارہ دعوت کو اور اس جیسے دوسرے اداروں کو نیک توفیق دے کہ ماخذ کے ذکر سے شرمانا چھوڑ دیں۔ اللہ اور بندوں کا شکر دونوں مامور بہ ہیں معلوم نہیں تقویٰ اور اخلاق کی یہ کونسی قسم ہے کہ جس جریدے یا کتاب سے بلا تکلف اور بلا اذن و معاوضہ کوئی بھی چیز نقل کر لی جاتی ہے اسے لگنے سے تشکر کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ اس کا نام ہی لے دیا جائے۔ ہم نے تو جب بھی کہیں سے کچھ نقل کیا ہے نمایاں طور پر اسکا تذکرہ کر دیا ہے۔ داعیان حق ہی کے جریدے اگر اخلاق کی اس ابجد کو فراموش کر دیں گے تو اور کسی کی شکایت کس منہ سے کی جا سکے گی۔ ہم تمام اخلاق دوستوں سے گذارش کریں گے کہ جب بھی وہ کسی جریدہ کی اس حرکت پر آگاہ ہوں، اسکے ذمہ داروں کو فہمائش اور تنبیہ کرنا نہ بھولیں۔ یہ بہت بُری بات ہے کہ نقل تو کھڑٹ سے کر لی جائے مگر منقول عنہ کا نام نوکِ قلم پر لانے میں حیا آئے۔ حیا ایک جرم بھی ہو سکتی ہے اگر وہ اخلاق کی مسلمہ قدروں سے انحراف پر مبنی ہو۔

چند ادبی کتابیں
اُردوئے معلّٰی
غالب کے شہرۂ آفاق خطوط جن کے مطالعہ سے لوگ آج بھی اُردو لکھنا سیکھتے ہیں۔ دل آویز۔ تیکھے، رواں، ذہانت کے مظہر۔ حسنِ اتفاق سے مطبع مجتبائی کے چھاپے ہوئے کچھ نسخے فراہم ہوگئے ہیں۔ شائقین جلد فائدہ اٹھائیں۔ ہر دو حصّہ مکمل پانچ روپے (مجلد چھ روپے)
آزادی کا ادب
کمیونزم کی جارحانہ تحریک ادب کو کس طرح اپنا نقاب بناتی ہے۔ مرتبہ گوپا متل۔ تین روپے۔
غبارِ خاطر
مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور قلم پارے چھ روپے
کلیاتِ اقبال
ڈاکٹر اقبال کے کلام کا انتخاب پانچ روپے
ارمغانِ حجاز
ڈاکٹر اقبال کا اُردو اور فارسی کلام۔ ساڑھے تین روپے
شاہنامۂ اسلام (جدید)
مدیر تجلّی جناب عامر عثمانی کا شعری کارنامہ۔ وصالِ پیغمبرؐ اور اس کے بعد کیا ہوا کیسے ہوا؟ مجلد تین روپے
مضامینِ رشید
مشہور مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔ ساڑھے پانچ روپے
گفتنی
مجموعۂ کلام جناب محمود سعیدی۔ دو روپے
جانے پہچانے اور وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا
معروف و غیر معروف شعراء کے مختصر حالات اور نمونۂ شعر۔ مرتبہ انور صابری۔ چار روپے۔
نبضِ دوراں
مشہور شاعر جناب انور صابری کا مجموعۂ کلام۔ ساڑھے تین روپے
آتشِ گل
جگر مرادآبادی کا وہ مجموعۂ کلام جس پر بھارت سرکار نے ہزاروں کا انعام دیا۔ پانچ روپے۔
کلیاتِ جگر
جگر صاحب کے منتشر کلام کا شیرازہ۔ چھ روپے
نقشِ حکمت
مزاح نگار شاعر احمق پھپھوندوی کا مجموعۂ کلام۔ تین روپے
شرحیں
شرح بانگِ درا
از یوسف سلیم چشتی۔ نو روپے
شرح بالِ جبریل
از یوسف سلیم چشتی۔ نو روپے
بیانِ غالب شرح دیوانِ غالب
از آغا محمد باقر چھ روپے بارہ آنے
مکتبہ تجلّی دیوبند

تصانیف مولانا مودودی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	۲۵	
اسلام کا نظامِ حیات	۵۰	
رسالہ دینیات	۵۰	۱
جماعتِ اسلامی کی دعوت	۲۵	
نشانِ راہ	۳۷	
حقیقت ایمان	۵۰	
قرآن اور پیغمبر	۳۵	
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۳۱	
حقیقتِ اسلام	۴۰	
حقیقتِ صوم و صلوٰۃ	۶۰	
حقیقتِ زکوٰۃ	۴۴	
حقیقتِ حج	۴۰	
شہادتِ حق	۳۱	
دعوتِ اسلامی		۱
میلاد النبیؐ	۱۳	
ایک اہم استفتار	۱۶	
قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۱۹	
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	۰	۱
معراج کی رات	۶	۰
جبر و قدر	۱۵	
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۴۰	
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۵۰	۱
زندگی بعد موت	۱۲	
اسلام اور جاہلیت	۳۷	
مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	۷۵	
لباس کا مسئلہ	۱۹	
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۳۷	
دعوتِ اسلامی میں خواتین کا حصہ	۲۵	
سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام	۲۰	
اسلام اور ضبطِ ولادت	۷۵	
تفہیمات حصہ اول	۵۰	۵
تفہیمات حصہ دوم	۵۰	۶
تفہیم القرآن اول مجلد ہدیہ	۰	۱۲
" " دوم	۰	۱۵
رسائل و مسائل حصہ اول	۰	۵
پردہ	۵۰	۳
ترجمان القرآن کا منصب رسالت نمبر	۵۰	۳
حدیث اور قرآن	-	۱

مولانا صدر الدین اصلاحی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
فریضۂ اقامتِ دین	۵۰	۱
حقیقتِ نفاق	۵۰	۱
اسلام کا نظامِ معیشت	۵۰	

افضل حسین ایم۔اے

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
اخلاقی کہانیاں مکمل در چار حصص	۱۷	۱
عام معلومات حصہ اول	۳۰	
" دوم	۴۰	
" سوم	۸۰	
" چہارم	۳۰	۱
" پنجم	۴۰	۱
پیارے رسولؐ	۵۰	
ہماری کتاب قاعدہ		
ہماری کتاب۔ حصہ اول عکسی	۴۰	
" دوم	۶۲	
" سوم	۸۰	
" چہارم	۸۰	
" پنجم		۱

مولانا امین احسن اصلاحی

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حقیقتِ توحید	۱۲	۱
حقیقتِ تقویٰ	۶۹	

مولانا ابو اللیث

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
جماعتِ اسلامی کا مقصد اور اس کا طریقۂ کار	۵۶	
بھارت کی تعمیر اور ہم	۵۰	

سید حامد علی صاحب

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حج کیا ہے؟	۵۰	
قوموں کا عروج و زوال	۵۰	

وحید الدین خاں

نام کتاب	نئے پیسے	روپے
حقیقت کی تلاش	۵۰	
کیا ہندوستان ترقی کر رہا ہے؟	۵۰	
ایک انسان ایک نظام	۳۷	
نئے بھارت میں اسلامی نظام کی دعوت	۴۴	
نئے عہد کے دروازے پر	۳۷	
ہندوستان کی منزل سوشلزم یا اسلام	۳۷	
معاش کا مسئلہ اہم کیوں ہوا	۴۴	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	۳۲	

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

از مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

بڑی ذمہ داری اس کی منشی شہید الزماں پر تھی۔ انھوں ہی نے رونی صورت بنا کر ایڈیٹر تجلی کو مشورہ دیا تھا کہ پتے لکھنے کا کام اگر کچھ روز اور ملّا صاحب کے سپرد رہا تو تحریر بلند و ال میں بغاوت پھیل جائے گی۔ مناسب ہوگا اگر آپ انھیں میرا ہاتھ بٹانے پر مامور کر دیں۔

یہ کہتے ہوئے انھوں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا بھی تھا۔ یہ کنکھیاں خدا کی پناہ۔ ان میں طنز بھی تھا انتقام کی پیاس بھی اور تمسخر بھی۔

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی
کسے بتائیں کہ اس اک نگہ میں کیا کیا تھا

یہ بھی ظاہر ہے کہ عاجز کے نام کے ساتھ "صاحب" لگاتے ہوئے ان کے حلق میں کڑواہٹ ضرور گھلی ہوگی۔ صاحب کس چڑیا کا نام ہے اگر ان کا بس چلے تو مجھے زندہ دفن کر دیں ان کی رائے میرے بارے میں بہت ہی بری ہے۔ میرے اور ایڈیٹر تجلی کے پیچھے وہ جس انداز میں قاروی کا ذکر خیر کرتے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"یہ ملّا دوپہر کی پیدائش ہے۔ کسی دن بلوہ کرا کے رہے گا۔"

"یہ ملّا خدا جانے کیا بلا ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔"

"یہ ملّا تجلی کا بیڑہ غرق کئے بغیر نہیں مانے گا۔ اسکی اونچی سیدھی تحریروں سے خریدار بہت خفا ہیں۔"

"یہ ملّا سارے اسٹاف کو کچہری پہنچوائے گا۔ درگاہ چھنے شاہ کے مجاور اسے مار ڈالنے کی فکر میں ہیں۔"

ایسی روایات سنتے سنتے میرے کان پک گئے تو ایک روز میں نے ان سے کہا تھا۔

"منشی جی! اپنے بڑھاپے پر رحم کھائیے میں بہت اوت پٹانگ آدمی ہوں۔"

ان کا ہاتھ بے اختیار اپنی داڑھی پر پہنچا تھا جس کے دس فی صدی بال سفید ہونے سے رہ گئے ہیں۔ پھر وہ غرائے تھے

"بڑھاپا تو ابھی دور ہے ملّا صاحب۔ مگر آپ خفا کس بات پر ہو رہے ہیں؟"

"آپ کبھی راوت پور گئے ہیں؟"

"جی راوت پور...؟!" وہ چکرائے تھے۔

"ہاں راوت پور ضلع کانپور"

"جی نہیں..."

"میں وہیں پیدا ہوا تھا — جب آپ وہاں گئے ہی نہیں تو آپ کو میری پیدائش کا وقت کیسے معلوم ہوا...؟"

"ہی ہی ہی" وہ پھوڑپن سے ہنسے پھر بوکھلا کر کہنے لگے — "جی ہاں جی نہیں تو..."

"خیر آپ جانئے۔ آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے میں اتنا اور بتا دوں کہ میری پیدائش ٹھیک اس وقت ہوئی جب چیل انڈے دے رہی تھی۔ آپ نے اپنی زبان کو لگام نہ دی تو خسارے میں رہیں گے۔"

اس تنبیہ کے بعد کچھ دنوں تو انھوں نے سعادتمندی اختیار کی مگر بزرگوں نے جو کہا ہے کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ پھر وہی لچھن شروع ہو گئے۔ ایک دن تو انھوں نے غضب ہی کیا۔ ایڈیٹر تجلی کبھی مجھے بلوانے۔ کبھی اپنی بہن سے کچھ کہلوانے انھیں میرے یہاں بھیجا کرتے تھے

ایک دن میں گھر پر نہیں تھا کہ وہ تشریف لائے۔ اور بجائے اس کے کہ مجھے غیر حاضر پاکر الٹے پیروں لوٹ جاتے۔ ملائن کے کان بھرنے کا آرٹ شروع کر دیا۔ باتوں باتوں میں وہ ملائن کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ملّا آج کل درگاہ مُرمُرے شاہ کی کسی مجاورہ سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یہ سفید جھوٹ تھا۔ حقیقت اس کی اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ درگاہ مرمرے شاہ کے سجادے جناب خواجہ سلسبیل صاحب سے اپنی صاحب سلامت تھی کبھی کبھار آنا جانا بھی ہو جاتا تھا رہا جنس لطیف کی کیا کی۔ منشی جی نے کبھی مجھے وہاں دیکھ لیا ہوگا۔ بس اسی بنیاد پر وہ مَیل کا بیل بنانے کی سعی جمیل فرما رہے تھے۔

اب یہ ان کی بد قسمتی کہ ملائن مجھے ان سے زیادہ جانتی ہے۔ اس نے پہلے تو بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"اجی منشی جی ان کی بھلی چلائی۔ آپ ان کا فکر چھوڑیئے"

مگر بھولے بھالے منشی جی پھر بھی اپنی کوشش سے باز نہیں آئے تو ملائن بھنا گئی اور شعلہ بار لہجے میں بولی۔

"اپنی کھلی میں رہئے منشی جی۔ وہ کچھ بھی کرتے پھرتے ہیں آپ سے مطلب۔ جائیے اپنا کام کیجئے۔"

اس پر ظاہر ہے منشی جی منھ لٹکائے لوٹ گئے ہوں گے مگر جب ملائن نے مجھے یہ روداد سنائی تو مارے غصّے کے میرا بھیجا پگھلنے لگا۔

"چھوڑیئے بھی" ملائن نے اہمیت گھٹانے کی سعی کی" وہ بیچارے سیدھے آدمی ہیں۔"

"آدمی نہیں بے دال کا بودم کہو — ایسے آدمی کا دفتر تجلّی میں رہنا بھی خطرناک ہے۔"

"خدا خدا کیجئے" ملائن نے جلدی سے کہا" اب کیا آپ ان کے پیٹ پر لات ماریں گے۔"

"آدمی خود اپنا گلا کاٹ لے تو اسے قتل نہیں خودکشی کہتے ہیں"۔ میں نے تاؤ اور منطق میں توازن پیدا کرتے ہوئے کہا "انھیں سمجھا چکا ہوں کہ اپنی عادت خبیثہ سے باز آجائیں مگر وہ نہیں مانتے تو نتائج کی ذمہ داری بھی انھی کے سر ہوگی۔"

"آپ جانے بھی دیجئے — کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا"

جب میں غصے میں ہوا کروں تو شعر مت پڑھا کرو — سچ کہتا ہوں منشیائن کا خیال آجاتا ہے ورنہ ....."

"ہاں ہاں ورنہ تو میں بھی جانتی ہوں — مگر یہ خالہ کی بجائے منشیائن کب سے کہنے لگے؟"

"جب سے طبیعت چاہی تمہیں کیا؟"

"اے واہ منشی جی کا غصہ مجھ پر اتار رہے ہو — چلو اتار لو مگر انھیں کچھ مت کہنا۔"

"کیسے نہیں کہوں گا — فرض کرو تمہیں ان کی کذب بیانی کا یقین آجاتا تو ....."

"تو کیا ہوتا۔ میں رو دھو کر آنکھوں کا میل کچیل صاف کر لیتی بس۔"

ملائن کی ملین یا لبسی ہمیشہ میرے غصے کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس وقت بھی سارا تاؤ بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر اگلے روز یہ بہرحال مناسب معلوم ہوا کہ منشی جی سے دو دو باتیں ضرور کر دوں۔ عصر پڑھ کر ان کے گھر پہنچا مگر معلوم ہوا کہ موجود نہیں ہیں۔ لوٹنے لگا تو منشیائن کواڑ کی اوٹ سے بولیں۔

"اے ہے بیٹا بھاگے کہاں جاتے ہو چائے پی کے جانا۔"

منشیائن مجھ سے پردہ ضرور کرتی ہیں مگر یہ کانی قسم کا ہے یعنی برائے بیت۔

"نہیں خالہ جان۔ منشی جی کا دل کمزور ہے جب انھیں معلوم ہوگا کہ ملّا ان کی چائے پی گیا ہے تو ممکن ہے کہ ہارٹ فیل کر جائیں۔"

"کیا کہا اطریفل — پگلے چائے کے ساتھ اطریفل کون کھاتا ہے" استغفر اللہ۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ خالہ اونچا سنتی ہیں اب میں نے حلق پھاڑ کر کہا۔

"اطریفل نہیں خالہ جان ہارٹ فیل۔ دل کی حرکت بند۔"

"اللہ کی مار — چائے سے نصیب دشمناں دل کی حرکت کیوں بند ہونے لگی۔"

"نعوذ باللہ" میں بڑبڑایا پھر زور سے کہا" میں یہ کہہ رہا تھا خالہ جان کہ آپ نے اگر مجھے چائے پلا دی تو منشی جی بہت رنجیدہ ہوں گے وہ آجکل میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

"اللہ کا نام لے بیٹا۔ وہ نوج تیرے دشمن کیوں ہوتے"۔

"آپ کو نہیں معلوم خالہ جان۔ بات ہی کچھ ایسی ہے ۔۔ مگر چھوڑئیے ان کا فعل ان کے ساتھ ہے میں تو بہر حال ان کا اور آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آجائیں تو کہہ دیجئے گا کہ خدا کے لئے آج رات مشتری خانم کے گھر پر نہ جائیں...."

مجھے اچانک ایک خباثت سوجھ گئی تھی۔ خالہ چکرا کر بولیں۔

"مستری خالہ کون؟"

"مستری خالہ نہیں مشتری خانم" میں نے بلند آواز سے تصیح کی۔

"مشتری خانم کون کلمہی ہے؟"۔

"آپ اس کی تحقیق میں نہ پڑیں منشی جی خود سمجھ جائیں گے ۔۔ میں تو انھیں یہ بتانے آیا تھا کہ مشتری خانم کے خسر نے داروغہ جی سے شکایت کردی ہے۔ داروغہ جی پولیس کے جوان لیکر ٹھیک عشاء کی آذان پر چھاپہ ماریں گے۔ منشی جی روز کی طرح آج بھی اس وقت وہاں رہے تو ہتھکڑی پڑ جائے گی ۔"

"پولیس... ہتھکڑی، ہائے اللہ یہ تو کیا بھکیں اڑا رہا ہے۔ صاف صاف بتا کیا جھگڑا ہے؟"۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھئے خالہ جان۔ منشی جی بگڑیں گے کہ ملّا نے شکایت کردی ۔۔"

"کیا نہ ٹھیک تھا منشی جی کا"۔ خالہ دہاڑیں "ارے تو بتا تو کیا شترہ چھوڑا ہے تیرے منشی جی نے۔ کیا آفت آئی ہے"۔

"آفت کچھ نہیں خالہ جان۔ بات معمولی ہے۔ مگر آپ جانیے یہ رشوت کا زمانہ ہے۔ مشتری خانم کے خسر نے جیب گرم کردی ہوگی داروغہ جی کی۔ بس پھر کیا تھا وہ تیار ہو گئے چھاپہ مارنے کو۔ ورنہ یہ بھلا کونسا جرم ہے کہ دو شریف مرد عورت پل پل کو دل بستگی سے مل بیٹھیں ۔۔"

"کان پھوٹ جائیں میرے! ارے پگلے یہ تو آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ پہیلیاں نہ بجھا میرا تو دل دھک دھک کرنے لگا۔ الف سے یے تک سنا ماجرا کیا ہے ۔۔"

"ماجرا کوئی خاص نہیں ہے ۔۔ آپ انھیں تو جانتی ہیں نا .... نواب رئیس الدولہ کی ڈیوڑھی والوں کو ۔۔"

"کون سا رئیس دولہا ۔" خالہ الجھ کر بولیں اور اصل میں آواز کی مطلوبہ بلندی قائم نہیں رکھ سکا تھا۔

"رئیس الدولہ" میں نے بلند آواز میں دہرایا۔

"ہاں ہاں۔ اس ڈیوڑھی میں تو آگرے سے کوئی آکے بسا ہے"۔

"بس اسی گھرانے میں ایک جوان بیوہ کا نام ہے مشتری خانم۔ کچھ دن ہوئے اس کے سینے پر ایک پھوڑا نکلا تھا۔ بہت علاج کئے فائدہ نہیں ہوا۔ کسی نے منشی جی کا بھی ذکر کر دیا کہ بڑی اچھی جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ بس یہ بلا بھیجے گئے۔ قسمت کی خوبی ان کی جھاڑ پھونک سے وہ بالکل اچھی ہوگئی اور جبھی سے ان کی وہاں آرجا رہے"۔

"آگ لگے اسی دن کے لئے یہ جھاڑ پھونک سیکھی تھی بڑے میاں نے ۔۔۔ پر بیٹا آگے تو بتا ۔"

"آگے اتنا ہی ہے کہ ان کا زیادہ آنا جانا مشتری خانم کے خسر کو پسند نہیں ہے۔ انھوں نے منع بھی کیا مگر خود مشتری خانم روز روز کے آنکھیں بچھا لیتی ہے جب یہ نہیں جاتے۔ وہ خسر سے الگ بالا خانہ پر رہتی ہے جس کا ایک زینہ باہر سے ہے۔ دن میں تو منشی جی کسی کسی وقت جاتے ہیں مگر عشاء سے کچھ پہلے روز جاتے ہیں ۔۔۔۔"

"پھٹ جائے زمین، سما جاؤں میں نصیبوں جلی ۔۔ جبھی یہ مغرب کی ٹکریں مارتے ہی کھانے کی مارا ماری ہوتی ہے اور اوندھے سیدھے ٹکڑے توڑ کے بھاگتے ہیں کہ دفتر جانا ہے ۔۔ اس بڑھاپے میں یہ لچھن، ہائے اللہ یہ دن دیکھنے کیلئے مجھ گڑھے میں ٹھکی کو زندہ ہی کیوں رکھا تھا"۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں خالہ جان۔ وہ خدانخواستہ ایسے ویسے خیالات کے آدمی نہیں ہیں" میں نے تسلی دی" بس ذری مشتری خانم سے دلبستگی ہے۔ وہ بچاری بالکل جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی ہے۔ گاتی بھی بہت اچھا ہے......"

"بس بس ہونٹ سی لے بیٹا میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ مجھے کیا خبر تھی یہ دفتر کے بہانے منہ پر کالک مل جا رہی ہے بڑھاپے میں"۔

منشی جی بوڑھے تو نہیں ہیں خالہ جان۔ بہت سو بہت پچاس کے ہوں گے"۔

" ہاں ہاں ان کی تو جوانی پھٹی پڑ رہی ہے... لا دے مجھے تھوڑا سا زہر... گھونٹ د... د.... دے م... میرا گ.. گلا ---"

اب ان کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا ---- میں بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ پورا مکالمہ تو ظاہر ہے میرے کانوں میں کہاں سے پڑتا جو منشی جی کی آمد پر ان کے اور منشیائن کے مابین برپا ہوا ہوگا ان کے بھتیجے شہرت علی سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ منشی جی قسمیں کھاتے کھاتے پاگل ہو گئے تھے مگر منشیائن منتری خانم کے لئے جدید سے جدید تر القاب و آداب تصنیف کرتی ہیں اس درجہ منہمک تھیں کہ منشی جی کی ساری قسمیں، ساری یقین دہانیاں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئیں یہاں تک کہ ان کا گلا بیٹھ گیا۔ کنپٹی کی رگیں پھول گئیں ---- انھوں نے داڑھی اور سر دونوں کے بال ایک ساتھ نوچتے ہوئے گھگھیا کے کہا۔

" مت کرو یقین۔ میں بھی کل سے نوکری چھوڑ کر تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھوں گا۔ یہ ملا مردود، نمرود، شیطان، بے ایمان خدا کی پھٹکار اس پہ۔ اس سے بڑا دغاباز دنیا کے پردے پر نہ پیدا ہوا نہ پیدا ہوگا ---"

"ہاں ہاں وہ تو دغاباز ہے کیونکہ تمہارے گلچھروں کا راز کھول دیا۔ میں نصیبوں جلی بھی دغاباز ہوں کہ ایسی خوش خبری سن کر تم پر واری نہیں گئی ---- جاؤ بس منتری جان کے یہاں جاؤ۔ شرع شریف نے چار چار کی اجازت دی ہے۔ دوسری وہ ہو جائے گی۔ تین اور کر لینا۔ کیونکہ مجھ آفت ماری کا تو وقت آہی گیا ہے"۔

" یا اللہ کیسی مصیبت میں پھنس گیا" منشی جی ایک ہاتھ سے داڑھی اور دوسرے ہاتھ سے سر کے بال نوچتے ہوئے بلبلائے تھے۔ بقول شاعر

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
ہاتھ میرے دونوں نکلے کام کے

اگلے دن وہ میرے گھر دوڑے آئے تھے اور رو رو کر ملائن سے شکوہ کیا تھا۔ ملائن بمشکل ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی تھیں

" خدا کا شکر ادا کرو ان کا غصہ میں نے دبا دیا ورنہ نوکری سے بھی جاتے"۔

اب وہ ایڈیٹر تجلی کے آگے فریادی ہوئے تھے ---- مولوی برہان الدین سے پتہ چلا کہ ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر کہا تھا

" اس گدھے کے شریر ہونے میں تو کوئی شک نہیں منشی جی مگر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ آپ کی اہلیہ جو آپ کے حق میں تھانیدار بنی ہوئی ہیں یہ کس غلطی کا خمیازہ ہے ---"

منشی جی چند ثانیے ہونق بن کر ایڈیٹر صاحب کو تکتے رہ گئے پھر پھسپھسی آواز میں بولے تھے۔

" سرکار وہ بڑی ظالم عورت ہے۔ ایسی بھڑکتی ہے کہ بس پھاڑ کھائے گی"۔

ایڈیٹر صاحب اس وقت اتفاق سے بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے " عورت بیں منشی جی ظلم کرنے اور پھاڑ کھانے کا بوتا ہی کہاں ہوتا ہے۔ یہ تو مرد کی زن مریدی ہے جو اسے نرم چارہ بنا دیتی ہے ---- جائیے اپنی میز پہ بیٹھئے۔ یقیناً آپ نے کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی کی ہوگی جس نے اس گدھے کو اس واہیات حرکت پر آمادہ کیا۔ ورنہ وہ آپ کے پیچھے ہمیشہ آپ کی تعریف ہی کرتا ہے"۔

تو یہ تھے منشی شہید الزماں۔ براہ راست انتقام لینے کے ارادے سے تو اب وہ توبہ کر چکے ہوں گے۔ مگر یہ بھی انتقام ہی کی ایک بغلی قسم کہی جائے گی کہ وہ مجھے اپنا اسسٹنٹ بنانے کی تگ و دو میں لگ رہے تھے۔

ایڈیٹر صاحب نے فرمایا

" آپ اس سے کیا کام لیں گے؟"۔

" اجی وہ انکم ٹیکس کا سارا حساب یوں ہی پڑا ہے۔ کاغذات داخل کرنے کا وقت قریب آگیا ہے انھیں ساتھ لگا کر میں کام کی تکمیل کرلوں گا"۔

"آپ جانیئے ــــ مجھے تو ڈر ہے کہ یہ آپ کو بھی چوپٹ کردے گا ــ مگر کوشش کیجئے اللہ مالک ہے"۔

میرے تن بدن میں برقی لہریں دوڑ رہی تھیں ــ میں اور حساب۔ دنیا کا سب سے بڑا تضاد ــ حساب تو میری چڑھ ہے اور رہے گی ـــــــ مگر فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ خود سالے صاحب قبلہ کو بھی یقیناً معلوم تھا کہ حساب میرے حق میں تپ دق ثابت ہوگا۔ مگر انھیں تو میرے عبس بیجا کی ضد تھی ورنہ منشی جی کو یقیناً انھوں نے درپردہ یہ ہدایت بھی دی ہوگی کہ اس کے کئے دھرے پر بھروسہ مت کرنا۔ مقصود تو الجھائے رکھنا ہے بلا سے دو چار رجسٹر ردی ہو جائیں۔

میرے لئے کونے کا کمرہ تجویز ہوا۔ یہاں میاں جعفر کی نشست تھی جو مکتبہ تجلی کے اسسٹنٹ انچارج ہیں۔ یہیں منشی جی بھی اپنا ڈیسک اٹھا لائے اور شروع ہو گیا دو اکم دو اور دو دونی چار۔

اف معبود ــــ اعداد و شمار سے بھرے ہوئے صفحات بھی کتنا بھیانک منظر پیش کرتے ہیں۔ کلبلاتے ہوئے گجگجے کیڑوں کا ایک چھتہ۔ پھر رہ رہ کر منشی جی کی استادانہ گل افشانیاں ان کا خیال تھا میں نے بیس تک پہاڑہ ضرور یاد کر رکھا ہوگا مگر جب میں نے عرض کیا کہ پہاڑے مجھے صرف پانچ تک یاد ہیں اور ان پانچ پر بھی میں ایک لاکھ مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں تو وہ میری داڑھی چھو کر بولے تھے

"پیارے ملا بھائی۔ اب تو ڈھنگ سے کام کر ہی لو۔ ہم ہارے تم جیتے ــ"

"یہ داڑھی چھونا آپ نے کہاں سے سیکھا۔ مشتری خانم کے خسر تو شاید داڑھی نہیں رکھتے ہیں"۔

"ارے یار خدا کے لئے اب جانے بھی دو ـــــ دیکھو یہ تین صفحوں کی میزانیں جوڑ دو۔ جمع میں پہاڑوں کی ضرورت نہیں پڑتی"۔

"یہ پرانی بات ہے۔ نئے علم الحساب میں جمع ضرب کے قاعدے سے کی جاتی ہے ــ"

"اچھا بابا تم کسی قاعدے سے کرو مگر کرو تو ــــ"

"کیوں کروں نہیں کرتا ....."

اسی طرح کی نوک جھونک برابر چلتی رہی۔ مگر پہاڑ سا وقت کاٹنے کے لئے جھک تو مارنی ہی تھی۔ سلسلہ جاری ہو گیا۔

نمونہ یہ ہے

"ایک اور ایک (دو) دو اور دو چار .... منشی جی پہ خدا کی مار۔ چھ اور چھ بارہ۔ ۲۵ اور ۱۲ تینتیس۔ نہیں سینتیس... ۳۷ اور اڑتالیس .... بائیں اڑتالیس نہیں ..... ۱۳۷ اور تین چالیس اور دس پچاس .... منشی جی کا ستیاناس ... پچاس اور نو ۵۹ .... ۱۵۹ اور پانچ .... پانچ ... ۱۵۹ اور ایک ساٹھ اور چار .... چار چھ سنتھ .... ہاں ۱۵۹ اور پانچ چہ سنتھ منشی جی کھوسٹ۔ نہ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ... مشتری خانم کا خسر وہ مار مارے گا ..... ۱۶۵ اور چھ ۱۷ اور تین ۴۷ اور چھ اسی .... منشی جی کے گلے میں رسی باندھ کر کھینچی جو ہے مشتری خانم کے خسر نے تو ہو گئی طبیعت بالکل صاف .... اسی اور دس ۹۰ اور نو .... نوننانوے۔ اناس کا مربہ .... ننانوے یہ گنتی خلاص ــ بس اب کل کریں گے"۔

اس دوران میں میاں جعفر دبے دبے ہنستے ــ کبھی کبھی کنکھیوں سے منشی جی کی طرف دیکھتے۔ منشی جی بہرے تو نہیں تھے۔ مگر اتنا اونچا ضرور سنتے تھے کہ میری سخن گسترانہ گرہیں انکے کانوں میں اکا دکا ہی پڑتیں۔ میں انھیں سنانے کے لئے کہتا بھی نہیں تھا۔ یہ تو دراصل تصنیفی صلاحیتوں کا فطری بہاؤ تھا جو سیل رواں کی طرح خود بخود امنڈا چلا آتا تھا۔ مگر اکا دکا ہی پر انھوں نے ایڈیٹر صاحب سے شکایت کردی۔ موصوف نے میرے کان پکڑے۔

"یہ کیا شرارت ہے۔ شرم نہیں آتی منشی جی تمہارے چچا کے برابر ہیں"۔

"میں تو آپ کا بھی بھتیجا ہوں" میں طیش میں آگیا "آپ مجھے چائے میں گھول کر زہر پلا دیں۔ یہ قسط وار ذبح ہونا میری استطاعت سے باہر ہے ــ"

جھک مارتے ہو۔ اتنی عمر قلم گھستے آگئی آج تک لفظ استطاعت کا محل استعمال بھی نہیں جان سکے"۔

انھوں نے چالاکی سے پینترا بدلا تھا۔ ان کی عادت ہے جب مجھے بغاوت پر آمادہ پاتے ہیں تو بڑی فنکاری سے محاذ جنگ بدل دیتے ہیں۔

"یہی میں بھی عرض کرنے آیا تھا کہ ابھی تو صرف الفاظ کا محل استعمال بھولا ہوں۔ قید دبند کا یہی عالم رہا تو میں روٹی کا بھی محل استعمال بھول جاؤں گا۔ آج ہی صبح چائے کی پیالی منھ کی بجائے ناک سے سٹکنے لگا تھا۔"

"کیا واقعی؟" انھوں نے ایسے جھوم کر پوچھا تھا جیسے میں نے اطلاع دی ہو کہ آپ کے نام ایک لاکھ روپے کی لاٹری کھلی ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو خیر گذری کہ گفتگو ان کے پرائیوٹ روم میں ہو رہی تھی اور اسٹاف کا کوئی آدمی یہ تماشا نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ اپنی موجودہ مضحکہ خیز پوزیشن پر اسٹاف والوں کی استہزائی مسکراہٹیں اور ذو معنی نظریں مجھے قتل و غارت تک پر آمادہ کر سکتی تھیں۔

ذرا ایمان سے کہئے۔ اس "کیا واقعی؟" کا جواب آپ ہوتے تو کیا دیتے۔

میں نے دھڑ دھڑی لی اور پیشانی کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے مذبوحی انداز میں کہا۔

"آپ کیا واقعی چاہتے ہیں کہ میں بور ہو ہو کے مر جاؤں ــــ حساب جس نے ایجاد کیا تھا میں اس کی سات پشتوں پر لعنت بھیجتا ہوں ــــ"

"بکواس مت کرو۔ کسے معلوم ہے حساب کی ایجاد کا سہرا کسی ولی یا پیغمبر ہی کے سر ہو ــــ"

تب میں اپنے الفاظ واپس لے کر انھیں منشی جی کی سات پشتوں کے حوالے کرتا ہوں"۔

"یہاں بھی تم چوکے ــــ" ان کا انداز خفگی کا نہیں چہکنے کا تھا "منشی جی کی چوتھی پشت خود تمہاری پانچویں پشت سے مل جاتی ہے ــــ"

"ملنے دیجئے" میں جھنجھلا گیا "میری کوئی پشت نہیں۔ مجھ پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ میں تو آسمان سے پھینکا گیا تھا"۔ مجھے یقین ہے کہ ان دردناک فقروں کی ادائیگی کے وقت میرے چہرے کا عالم کسی مغموم بیوہ کے عالم یاس سے کمتر نہ رہا ہوگا مگر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں" میں بلبلایا "منشی جی کی ماتحتی اور ہندسوں کی جمع تقسیم ــــ ان میں سے ہر ایک میرا دماغ الٹ دینے کے لئے بالکل کافی ہے ــــ"

"تمہارا دماغ بنا ہی الٹا ہے۔ اگر یہ الٹ جائے تو سیدھا ہو جائے گا ــــ میں پوچھتا ہوں کیا واقعی تم ناک سے چائے پی لیتے ہو؟"۔

"آپ سنجیدہ ہیں؟" میں نے سچ مچ حیران ہو کر پوچھا۔

"سو فیصدی ــــ اگر تم واقعی ناک سے چائے پی سکتے ہو تو یہ عجوبہ ہوگا۔ اس طرح تو یہ بھی ممکن ہے کہ تم کانوں سے بولنے اور آنکھوں سے سننے کی مشق بہم پہنچاؤ ــــ"

"میں سب سے پہلے سر کے بل کھڑے ہو کر کھو تکنے کی مشق بہم پہنچاؤں گا ــــ آپ مجھے قتل کر دیں مگر دفتر کی ڈیوٹی مجھ سے نہیں نبھے گی ــــ"

"فضول ہمت ہارتے ہو ــــ ڈیوٹی تم نبھاؤ گے ــــ نبھانی پڑے گی ــــ جاؤ اپنی جگہ بیٹھو ــــ"

اب ان کے لہجے میں یکایک وہی ہٹلریت آگئی تھی جسے میں آج تک چیلنج نہیں کر سکا ہوں مگر مولانا نے چاہا ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب میں اسے چیلنج کروں گا۔ خدائے کارساز نے نمرود کے لئے مچھر اور ہٹلر کے لئے اتحادی بھیجے تو سالے کی ہیکڑی دور کرنے کے لئے بہنوئی کو ہمت و جرأت کیوں نہیں بخشے گا۔ . . . آمین یارب العٰلمین۔

(ملّا زندہ۔ صحت باقی)

تذکرہ علمائے ہند

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب علماء ہند کے ذکر و بیان پر مشتمل ہے۔ جامع، ضخیم، فکر انگیز۔

مجلد بیس روپے

مراسلے

مسلمان کیا کریں؟

(بشیر احمد طاہر)

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "تجلی" دیوبند۔

جناب شفقی۔ السلام علیکم

ذریعہ ہذا ایک مضمون مرسل خدمت ہے جو نتیجہ ہے ان افکار کا جن پر راقم الحروف عملی نقطۂ نظر سے سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ تجاویز مندرجہ مضمون میں کوئی ندرت تو نہیں ہے لیکن کیا ہرج ہے اگر آپ کے تبرالاشاعت جریدے کے ذریعے یہ خیالات چند مسلمانوں تک پہنچ جائیں جو ابھی مسائل پر غور کر رہے ہیں اور ان کا عملی حل نکالنے کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں۔

میری یہ بھی درخواست ہے کہ جناب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کے عملی حل کی تجاویز کے باب میں اپنے گراں قدر مشورے اور رہبری سے ان کو بہرہ اندوز فرمائیں اور اس کو ایک تحریک کی شکل میں جاری رکھیں۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کے بارے میں زمانے کا گلہ کرنا شکوہ کرنا بے نتیجہ اور بے سود ہے۔ البتہ ان اسباب و علل کا جائزہ لینا جن کے باعث وہ موجودہ حالت سے دوچار ہیں اور انکا علاج تجویز کرنا ہی مفید اور کارآمد ہوگا۔

آیئے ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت کا کسی قدر سرسری جائزہ لیں۔ انتظامی اور مالی حیثیت سے مسلمان سب سے زیادہ پریشان ہیں۔ سالہا سال ان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر سرکاری آسامیوں پر تھا۔ سو وہ تبدیل شدہ حالات میں قابل لحاظ حد تک کم ہوگئیں۔ تجارت، کھیتی باڑی اور دوسرے کاروبار میں یہ جہاں تھے وہیں رہ گئے یا اور پیچھے ہوگئے۔ تعلیمی حالت ان کی پست تھی اب اور پست ہوگئی۔ فنی تعلیم کے لالے پڑ گئے۔ سوشل اور کلچرل اور اخلاقی حالت جس کا گہرا تعلق اقتصادی خوش حالی سے ہے، اب اور بھی گر گئی ہے۔ اس کا مجموعی اثر ان کی نفسیات پر یہ ہوا کہ وہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہوگئے۔ ان کے دلوں پر یاس و حرماں کا اندھیرا چھا گیا ان کے اعضائے عمل جو پہلے ہی سے معطل تھے اب مفلوج ہوگئے۔ آندھرا پردیش کے چیف منسٹر سری سنجیوا ریڈی نے حال ہی میں بمقام حیدرآباد ایک موقع پر مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ چند خوشحال افراد کو چھوڑ کر عام مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی پسماندگی ملک کے دوسرے پسماندہ طبقات جیسی ہے اور یہ کہ ان کی حالت کو سدھارنے کے لئے ان کو ویسی ہی مراعات ملنی چاہییں جو دوسرے پسماندہ طبقات کو حاصل ہیں۔ یہ عام مسلمانوں کی حالت کا نقشہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ انکے اقتصادی اور سوشل مسائل کو حل کرنے اور ان کا ٹھیک علاج تجویز کرنے کے لئے نہ کچھ دماغ کام کر رہے ہیں اور نہ ان کی کوئی لیڈرشپ باقی رہی ہے۔ جو لوگ کاروبار معیشت اور علم وفن میں رہبری کے قابل تھے وہ تقسیم ہند کے بعد یہاں سے چلتے بنے۔ ادھر اُدھر چند دردمند اصحاب ان کی حالت کو سنبھالنے کیلئے کچھ کوشش کر رہے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پرندہ قفس میں آشیاں کے لئے تنکے فراہم

کرے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کا حال اس قافلہ کا سا ہے جو منتشر درماندہ اور آوارۂ منزل ہوگیا ہے۔ جس کا کوئی رہبر اور میر کارواں نہیں رہا۔ غالب کا یہ شعر ان کی حالت کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے

ہوا مخالف و شب تار بحر طوفان خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

ان کی اس ماندگی اور زبوں حالی کے اسباب تاریخی ہیں۔ اور کچھ خود انھیں کے پیدا کردہ۔ جب کسی قوم میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسے اسباب تاریخی ہیں اور کونسے خود ساختہ۔ خواہ کچھ ہو یہ امر واضح ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ان کے مسائل نہ صرف پچھلے زمانے کے مسائل سے بلکہ خود ہمسایہ ملکوں کے مسلمانوں کے مسائل سے بالکل علیحدہ بلکہ مختلف ہوگئے ہیں اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ ان مسائل کو جو تاریخی اسباب کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں کس طرح حل کرتے ہیں۔ یہ نئے مسائل اور یہ نئے حالات ایسے ہیں جن کی شاید تاریخ اسلام میں مثال نہیں ملتی۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو جن کی حیثیت اس ملک میں قابل لحاظ اقلیت کی ہے ان مسائل کو نہایت ہوشیاری، مستقل مزاجی اور کامیابی سے حل کرنا ہے تو ان کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس برّ اعظم صغیر میں انھوں نے ایک نئی قومیت کی حیثیت سے جنم لیا ہے جن کے حالات اور مسائل کو کسی دوسرے ملک کے مسلمانوں کے حالات اور مسائل سے اس طرح نسبت نہیں جس طرح مصر، ترکی ایران و پاکستان کے مسائل کو انڈونیشیا کے حالات اور مسائل سے نسبت نہیں ہے۔ جس طرح یہ اسلامی ممالک اپنے اپنے مسائل اپنے ہی مخصوص حالات کے مطابق حل کر رہے ہیں اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اپنے مسائل یہیں کے حالات کے مطابق حل کرنے ہوں گے۔ اس حقیقت کو مان لینے کے بعد مسلمانانِ ہند کو اقتصادی اور نفسیاتی حیثیت سے ملک کے حالات سے میل اور مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مسائل کا حل کہیں باہر ڈھونڈیں اگر وہ ایسا کرینگے تو نہ وہ اپنے مسائل کو حل کر سکیں گے اور نہ اس سے ان کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ پچھلے چودہ پندرہ سال کی مدت میں انھوں نے ایک حد تک اپنے تئیں نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش تو کی ہے یا یہ کوشش مجبوراً کرنی پڑی، لیکن یہ کوشش ابھی کامیاب نہیں ہوئی۔ یہاں ایسے بھی مسلمان ہیں جو مشکلات کے باوجود زندگی کے مختلف کاروبار میں عزت کی روٹی کھا رہے ہیں۔ لیکن جو نکمے اور پست ہمت ہیں وہ اپنے افلاس و ادبار کو زمانہ کے حالات سے منسوب کر کے خوار اور پریشان روزگار ہوئے ہیں اور اپنی خودداری اور عزت نفس کو رسوا کر کے طفیلی اور گدائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ملک میں دوسری چھوٹی اقلیتیں بھی ہیں لیکن وہ اپنی تنظیم کی وجہ سے کس قدر آسودہ حال ہیں۔ مسلمان زیادہ تعداد میں ہونے کی وجہ سے بہتر طور پر اپنی تنظیم کر سکتے ہیں مسلمانوں کو یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلے۔ ہندوستانی برصغیر کی ایک اہم قومیت کی حیثیت سے ان کو اسلامی روایات کے مطابق حقائق کا مقابلہ اور نئے مسائل کا حل کرنا ہوگا۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن زمانہ کا چیلنج وہ اسی طرح قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے وسائل اور صحیح لیڈر شپ کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو اپنی پرانی ذہنیت بدلنے کی۔

معشیت و روزگار کے جو سرکاری و نیم سرکاری وسائل ہیں ان سے بہرحال فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ آئے دن قومی ترقی اور بہبودی کے نت نئے کاروبار پنج سالہ منصوبہ بندی کے پروگرام کے تحت شروع ہو رہے ہیں۔ جس حد تک اور جس حیثیت سے ممکن ہو مسلمانوں کو ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ لیکن سرکاری نوکری والی ذہنیت کو ختم کر کے اپنے آپ کو محنت مزدوری کے قابل بنانا اور اس قسم کے کاموں سے روزگار چلانے میں عار نہیں سمجھنا چاہیئے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کو خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ اس طرح کہ خود ان کے اوقاف کی جنکی ملک میں کافی تعداد ہونے کے باوجود ان کی تنظیم خراب ہے، اور دیگر خیراتی اداروں کی آمدنی کے صحیح اصول پر تنظیم کر کے اس کی گنجائش سے قوم کے لئے چند فنی مدارس اور درسگاہیں اور کارخانے قائم کئے جائیں، اور اعلیٰ تعلیم میں روپیہ، محنت اور عمر برباد کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہر قسم کے کاریگر مثلاً فٹرس، میکانکس، بجلی اور ر

کا کام جاننے والے - درزی اور کاریگر مشین چلانے والے بافندے ٹین گر، کسان، لوہار اور بڑھئی کا کام جاننے والے پیدا کریں تاکہ انکو روزگار کے وسائل خود بخود حاصل ہو جائیں اور دوسری طرف ملک کو کاریگر اور میکانک مل جائیں جن کی اسے شدید ضرورت ہے - ع

چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار

ایک اور صورت جس پر شاید کہیں کہیں سرسری طور پر عمل ہو رہا ہے بیت المال کی ہے - یہ ظاہر ہے کہ بیت المال اس حیثیت سے قائم کرنا موجودہ حالات میں ممکن ہے جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ہوا تھا، لیکن - ہے یہ صورت اپنی مدد آپ کرنے کی - اگر ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں میں سے ایک چوتھائی تعداد بھی ماہانہ ایک ایک روپیہ ادا کرے تو ہر مہینہ ایک کروڑ اور سال میں بارہ کروڑ روپے جمع ہو سکتے ہیں اور جو دے سکتے ہوں وہ حسب مرضی ایک روپے سے زائد دیکر اپنے نادار بھائیوں کی رقم کی کمی کی تلافی کر سکتے ہیں - اس کا نام ایک روپیہ فنڈ رکھا جا سکتا ہے اور یہ کوئی مشکل بات نہیں مشکل کام یہ رقم وصول کرنے کا ہے - کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ محلہ وار مسجدوں کی کمیٹیاں قائم کی جائیں اور یہ کمیٹیاں باقاعدہ رجسٹرڈ کرائی جائیں اور ان کے کھاتے بینک میں کھولے جائیں - ان کمیٹیوں کے ارکان محلے کے جملہ مسلمان ہوں اور دردمند دیانت دار اور باعمل حضرات ان کے کار پرداز ہوں جو ہر مہینے رقم ذی استطاعت اہل محلہ کے خاندانوں سے وصول کرکے بینکوں کے کھاتے میں جمع کرانیکے ذمہ دار ہوں مہینے دو مہینے کی رقم اس طرح جمع ہو جانے کے بعد شہر، اضلاع اور قصبوں کے مسلمانوں کے مشورے سے اس رقم کی امانت ٹرسٹ قائم کیا جائے اور اس کا بورڈ آف ٹرسٹیز مقرر کیا جائے جو قوم کی اقتصادی اور فنی ضروریات کا جائزہ لیکر ان کی ضروریات کو پورا کرنے کا ایک معیاری پروگرام بنائے اور مختلف محلوں اور مراکز پر مدرسے (صنعتی) اور فنی درسگاہیں قائم کرکے پیشوں اور حرفتوں کی تعلیم دلانے کا انتظام کرے - یتیم اور غریب بچوں اور اپاہج اور بوڑھے آدمیوں کی دیکھ بھال کے ادارے قائم کئے جائیں - غرض اس ٹرسٹ یا امانت کو بجز انفرادی خیرات کے جو باعث شرم ہے مسلمانوں کی ہر قسم کی مادی اور روحانی ترقی کے لئے استعمال کیا جائے - اس انتظام کے لئے اگر ابتداء میں عمارتیں دستیاب ہونے میں مشکل ہو تو مسجدوں کے احاطے میں اس کا انتظام کیا جائے - پیغمبر صلعم نے فرمایا تھا کہ ساری روئے زمین مسجد یعنی خدا کی عبادت گاہ ہے - آنحضرت صلعم کے اس بلیغ اشارے میں ہماری زندگی کے لئے کافی ہدایت ہے - عبادت سے مراد ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ زندگی کے تمام وظائف اور فرائض کو پورا کرنا ہی صحیح معنی میں خدا کی عبادت اور توصیف ہے - اور اس سے روئے زمین پر ہم خدا کے مایۂ روزگار بندے صحیح نائب اور خلیفہ بننے کے مستحق ہو سکتے ہیں -

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

بہرحال یہاں تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے - اس اسکیم کے لئے دردمند، باعمل، دیانت دار اور مستعد اشخاص کی ضرورت ہے کوئی صاحب یہ کہہ کر اس اسکیم کو سرے سے رد نہ کر دیں کہ اس میں عملی دشواریاں ہیں یہ معلوم رہے کہ عمل کے بغیر نہ زندگی بن سکتی ہے اور نہ قوم افسوس کہ بے عملی نے ہی مسلمانوں کو مفلوج اور اپاہج بنا دیا ہے - اگر مسلمانوں کو سچا مسلمان بننا ہو تو ان کو پہلے اپنا نفسیاتی جمود توڑ کر قومی اور اقتصادی مسائل بلا خوف و خطر اور نا امیدی کے حل کرنے ہوں گے - تب ہی وہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کے مصداق ہو سکتے ہیں - اقتصادی مشکلات کو حل کرنے کے بعد ہی وہ نہ صرف ملک کے کار آمد افراد بن سکتے ہیں، بلکہ خدا کی عبادت اور دنیا میں خدا کے کام خضوع و خشوع اور سکون قلب کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں اور ملک کی دوسری اقوام کے لئے ایک مثال اور نمونہ بن سکتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دنیا ۱۹۴۷ء کے بعد بدل گئی ہے جس میں ان کی اخوت، صداقت و ایثار، محنت و عمل اور زور بازو کی آزمائش نئے سرے سے ہو رہی ہے - اگر ایک دفعہ انکی کوشش چل نکلی تو پھر انکا بیڑہ پار ہے - اگر وہ دردمند اور صاحب فکر و عمل حضرات جو مسلمانانِ ہند کے مسائل پر سوچ بچار کر رہے ہوں میری ان تجاویز پر غور فرمائیں اور نہ صرف حیدرآباد کے بلکہ اضلاع اور بیرون حیدرآباد کے اخبارات، رسالوں اور اداروں میں اظہار خیال فرمائیں اور انکو روبہ عمل لانے کیلئے قوم کے مستعد نوجوان میدان میں آئیں تو کیا عجب ہے کہ یہ تحریک جو ایک چھوٹے ابھرے ٹکڑے کی سی نظر آتی ہے ابر گہربار بنکر قوم کو نہال کر دے

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے + نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

تجلّی ہندوستانی مسلمانوں کی غمخواری و ہمدردی پر مبنی یہ مراسلہ فکری اصابت اور عملی رہنمائی کے اعتبار سے کس درجے کا ہے یہ تو ایک الگ بحث ہے۔ ہم ہر حال میں ان لوگوں کو تحسین کا مستحق سمجھتے ہیں جو اپنے وقت اور دماغ کو مسلمانوں کے اُلجھے ہوئے مسائل کی گرہ کشائی میں کھپاتے ہیں اسی جذبۂ تحسین کا نتیجہ ہے کہ اس مراسلے کو ہم نے تجلّی میں جگہ دی ورنہ سچ یہ ہے کہ اس کی افادیت میں ہمیں شک ہے۔

ایک اچھے طبیب کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مرض کے اثرات و ثمرات سے آگے بڑھ کر اس کی جڑوں پر نگاہ ڈالتا ہے اور نسخے کی ترتیب میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مرض جڑ سے اُکھڑ جائے۔ ہندوستانی مسلمان اس وقت جن امراض کا شکار ہیں وہ گوناگوں ہونے کے باوجود ایک ہی بنیادی فساد کا ثمرہ ہیں اور یہی وہ فساد ہے جسے اس مراسلہ میں چھوا بھی نہیں گیا۔

حوصلہ شکنی کی نیت سے نہیں، بلکہ ضروری گوشوں کی وضاحت کے لئے ہم چند معروضات اس مراسلہ کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں شاید کہ وہ اہلِ نظر کے لئے کسی حیثیت سے مفید ہوں۔

مسلمان غیر منظم ہیں، غریب ہیں، تعلیم سے محروم ہیں، زوال و انحطاط کا شکار ہیں۔ یہ سب کچھ بجا لیکن اس طرح کے تمام نقائص بجائے خود امراض نہیں ہیں بلکہ وہ اثرات و علائم ہیں اُس بنیادی مرض کے جسے مختصر لفظوں میں "خدا فراموشی" کہا جا سکتا ہے۔

اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"سب سے بڑا پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس کو پچھاڑ دے۔"

مختصر سا ارشاد اپنے بطن میں علوم و معارف، حقائق و عبر اور پند و موعظت کی ایک انمول و لازوال دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے میں ایک دیوار زمین پر آ رہتی ہے بظاہر اس انہدام کا سبب زلزلہ ہی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک معمولی سا جھٹکا نہ سہ سکنے کے مرحلے تک پہنچنے میں اصل کارفرمائی ان گوناگوں اثرات و عوامل کی ہے جن کا ہدف مدت سے یہ دیوار بنتی چلی آ رہی ہے۔ بارش، دھوپ، ہوا، امتدادِ زمانہ، تمام ہی چیزوں نے اس کی ہر ہر اینٹ اور مسالے کی ایک ایک تہہ پر اپنے اثرات ڈالے ہیں تب کہیں جا کر یہ ضعف و ناپائداری کی اس پوزیشن تک پہنچی ہے کہ ایک ہلکا سا جھٹکا اسے منہ کے بل گرا دے۔

اسی مثال پر ہمیں اپنی حالت کا قیاس کرنا چاہئیے۔ ہماری موجودہ زبوں حالی و بیچارگی کے قریبی و ظاہری اسباب تو بیشک مادی ہی نوع کے ہیں لیکن ان کی جڑیں بہت دور اور بہت گہری اُتری ہوئی ہیں۔ ہماری طاقت اور عروج و ارتقاء کا اصل سرچشمہ ہمارا دین تھا۔ اس دین نے ہمیں وہ کردار عطا کیا تھا جو دنیا کے تمام ہی معاملات میں کارفرمائی کرتا ہے۔ اس دین نے ہمیں حوصلہ اور عمل بخشا تھا۔ اس دین نے ہماری سطوت اور ہیبت کی پرورش کی تھی۔ اس دین نے ہمیں عزت و افتخار کے سرمایے سے مالا مال کیا تھا۔ ہمیں شجاعت، ہمت اور توانائی دی تھی۔ دین اور نفس کے تقاضوں میں ازلی بیر ہے۔ اس دین سے ہم نے اپنا رابطہ کم کر دیا اور نفس کی پرورش میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ اسے پچھاڑنے کی بجائے غذائیں فراہم کیں۔ اسے شیطان کا شاگرد بنایا، اسی کے ایماء پر اپنے اعمال و افکار کے سانچے ڈھالے اور فلاح و عافیت کے اُس مرکزِ حقیقی سے دور تر ہوتے چلے گئے جو اسباب و علل کا سرچشمہ اور تقدیر و تدبیر کا مصدر رہے۔ خدا سے بغاوت رسول سے سرتابی اور شرک و طغیان سے والہانہ دل بستگی کا جو مشغلہ ہم مدت ہوئی اختیار کر چکے ہیں اس کا مآل یہی ہونا چاہئے تھا جو ہوا۔ بلکہ خدائے رحیم و کریم کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے درگذر سے کام لیا بہت ہلکی سزائیں دیں، رحم فرما لیا ورنہ سال دو سال کا نہیں سو اور دو سو سال کا جائزہ لیا جائے تب بھی یہی ثابت ہوگا کہ ملتِ مسلمہ کے فکر و کردار پر غلبہ شرک و زندقہ ہی کا رہا ہے اور آج بھی ہے۔ حکم جزوِ غالب کے مطابق لگا کرتا ہے۔ ہر عہد میں ایک خوش کردار اور خدا پرست گروہ کی موجودگی کے باوجود اس امت کو گم کردہ راہ ہی کہیں گے جس کی غالب اکثریت دین سے انحراف کے راستے پر بڑھتی جا رہی ہو۔ اسلام کا دعویٰ اور شرک سے ساز باز۔ خدا اور رسول ﷺ کے نام کا وظیفہ اور بجھن کہ یہود و نصاریٰ بھی شرمائیں، قرآن کی تکریم لیکن عقائد

اعمال قرآن کی ضد۔ ایک طرف مغرب کے مادہ پرستانہ طرزِ فکر کی اندھی تقلید۔ دوسری طرف بدعات و شرکیات کا زور۔ قبروں پر عیدیں۔ درگاہوں پر میلے۔ جن اعمال و اشغال کو اسلام نے اولین اہمیت دی تھی ان سے لاپروائی اور جن کی حیثیت ثانوی تھی ان پر شدت و اصرار۔ عقائد میں غلو۔ اعمال میں یک رخا پن۔ آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح تک میں اہوائے نفس کی پیروی۔ اخلاق تنگ، زبانیں تلخ۔ نفاق ہی نفاق کج روی ہی کج روی۔ اس روشِ بغاوت پر آقائے کائنات جو بھی سزا دے کم ہی ہے ابھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ہم ہندوستانی مسلمان ذلت و نکبت کے آخری مرحلے میں پہنچ چکے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کردار و عقائد کا اگر یہی عالم رہا۔ خدا پرستی کے عوض انسان پرستیوں کی لعنت یونہی فراواں رہی، دین کے نام پر گناہ و فسق کی گرم بازاری اور اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کی ریل پیل یونہی حصے میں آتی رہی تو قدرت کے وہ ہولناک کوڑے بھی ہم پر ضرور برسیں گے جن کی شدت و قہرمانی کے آگے آفات و بلیات کی موجودہ بارش شاخِ گل کی اٹکھیلیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ سمجھنا محض بھولا پن ہے کہ جن آفات کا ہم شکار ہیں ان کی مثال ہی ہماری تاریخ میں نہیں ملتی۔ بے شک ہماری مصیبتیں اور الجھنیں اس معنی میں نو ماضی کی ہر ابتلاء سے جدا ہیں جس معنی میں ہر طلوع ہونے والی صبح پچھلی تمام صبحوں سے جدا ہوتی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء پہلے کبھی نہیں آیا اس لحاظ سے اسے بے نظیر او ریکتا کہہ لیجئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملتِ مسلمہ نے آفت و ابتلاء کی بے شمار کڑیاں جھیلی ہیں اور اس سے بہت زیادہ سخت حوادث و آلام کا سامنا کیا ہے جس سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ جوہری اعتبار سے موجودہ مصیبت اور پچھلے دور کی مصیبتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں ظاہری سطح اور جزوی تفصیلات کا فرق ضرور ہے۔

فاضل مراسلہ نگار نے جس نوع کی تجویزیں پیش فرمائی ہیں ان کی افادیت سے ہمیں انکار نہیں۔ ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ ان پر غور کیا جائے اور قابلِ عمل اجزاء کو جامۂ عمل پہنایا جائے لیکن اصلاً ان تجویزوں کی حیثیت ہمارے نزدیک مرہم کے اس پھائے کی سی جو کینسر کے زخم پر رکھا جائے۔ معمولی مرہموں سے کینسر جیسے زخموں کا علاج نہیں ہوا کرتا۔ ملتِ مسلمہ کے زخموں کی شکل و صورت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان زخموں کا ہر سلسلہ کینسر کے اسی مادے سے جا ملتا ہے جسے "ترکِ اسلام" کہتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے عروج و ترقی کی بس ایک ہی راہ ہے۔ واحد اٹل راہ۔ خدا پرستی۔ قرآن و سنت سے وابستگی۔ ترکِ معاصی۔ شرک سے گریز۔ توحید سے والہانہ لگاؤ۔۔۔ انھیں سب چیزوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے اور اسلام ہی اکیلا راستہ ہے جو ملتِ مسلمہ کو امن و عزت سے دوچار کر سکتا ہے طاقت دے سکتا ہے۔ پروان چڑھا سکتا ہے۔ تم آسمان کے تارے بھی توڑ لاؤ۔ عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتے جب تک صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو گے۔ سالی مادی وسائل اور دنیادارانہ تجاویز کے بل پر عروج و رفعت حاصل کرنا چاہتے ہو تو بہتر ہوگا کہ اسلام سے دستبرداری کا اعلان کر دو۔ کھلے طور پر کافر و مشرک بن جاؤ۔ اس صورت میں اللہ تمھیں آزاد چھوڑ دے گا۔ وہ کفار و مشرکین کو خوب ڈھیل دیتا ہے کیونکہ آخرت میں تو ان کے لئے کوئی حصہ ہی نہیں دنیا کے قلیل عرصے میں جتنے مزے وہ کر سکیں کر لیں۔ مگر مسلمانوں کو بہت زیادہ ڈھیل کیوں دی جائے جبکہ وہ آخرت میں بھی حصہ لینا چاہتے ہیں۔

ہمارا منشاء یہ نہیں ہے کہ مادی وسائل و ذرائع سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اسباب و وسائل کا سہارا لینا تو خود اسلام کی بھی تعلیم ہے۔ وہ فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے اور احمقانہ غفلت کیشیوں کا سخت دشمن ہے لیکن اصل کار فرما شے خدا پرستی ہے۔ اللہ سے رشتہ استوار نہیں کرو گے تو اچھی سے اچھی اسکیم اور بہتر سے بہتر تدبیر بھی اس طرح بیکار ہو کر رہ جائے گی جیسے سڑے ہوئے دہی سے اچھے سے اچھا سالن بیکار ہو جاتا ہے۔

فاضل مراسلہ نگار نے یہ جو نصیحت کی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مسائل یہیں کے حالات کے مطابق حل کرنے ہوں گے اس سے مکمل طور پر اتفاق رکھنے کے باوجود ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس نصیحت کا آخر موقع کیا تھا۔ کیا ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی گروہ یا کوئی قابلِ ذکر فرد ایسا بھی ہے جو یہ خیال ظاہر کرتا ہو کہ ہم اپنے مسائل کسی اور ملک کے حالات کی روشنی میں حل کریں گے۔۔۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس نوع کی نصیحت یہ شبہ پیدا کرتی ہے

کہ فاضل مراسلہ نگار بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن بدنہاد اور دنی فطرت لوگوں کی تائید کر رہے ہیں جو اسی طرح کی لغو باتیں انتہائی فاسد نیت سے کہتے رہتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کو اگر اسلام کے رشتے سے تمام ہی دنیا کے مسلمانوں سے ایک ذہنی رابطہ ہے اور سرزمین حجاز کو وہ دنیا کے ہر خطے سے مکرم و معزز مانتے ہیں تو اسے ایک قابل اعتراض بات ٹھیرا کر نصیحتوں کے دفتر کھولے جاتے ہیں۔

صاحب مراسلہ کی یہ تنبیہ بھی مجمل ہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی پرانی ذہنیت بدلنی ہوگی۔

پرانی ذہنیت یعنی چہ؟

دودھ کا جلا چھاچ کو بھی پھونک کر پیتا ہے۔ پرانی ذہنیت کو تبدیل کرنے کا درس چونکہ ہمیں نیتاؤں اور ایمان فروشوں سے بھی بہت ہی رذیل معنوں میں وقتاً فوقتاً ملتا رہتا ہے اسلئے جب تک بات مشرح نہ ہو ہماری بدگمانی دور نہیں ہو سکتی۔

اس مختصر صحبت میں ہم صرف اتنا ہی کہہ کر زبان بند کئے لیتے ہیں کہ مسلمانوں کی دنیا ان کے دین سے وابستہ ہے۔ دین اختیار کرو دنیا بھی مل جائے گی۔ کوئی ایسی اسکیم جس میں مسلمانوں کی دینی غفلت پر نظر نہ کی گئی ہو کسی پائدار منفعت کی حامل نہیں ہو سکتی چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت اور دلکش ہو۔ نیز یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمان کی مصیبتوں کا علاج ___ بحیثیت مسلمان کے کبھی زمانہ سازی اور حالات سے مطابقت کی کوششوں سے نہیں ہوا نہ ہوگا ___ حالات سے مطابقت کا وعظ ایک سفسطہ ہے ___ ایک دامِ ہمرنگ زمیں ہے مسلمان صرف ان حالات سے مطابقت پیدا کر سکتا ہے جو اسلام سے مطابقت رکھتے ہوں رہے وہ حالات جو اسلام سے ٹکراتے ہوں ان سے لڑنا اُنھیں اسلام کے رُخ پر موڑنے کی جدوجہد کرنا ان سے پنجہ کشی کرنا ہی فلاح و ترقی کی راہ ہے چاہے اس آویزش میں دار و رسن اور طوق و سلاسل کے بازار ہی کیوں نہ لگ جائیں ہم ایسی مطابقت کے مؤید ہیں جس میں اسلام خارج نہ ہو لیکن ایسی مطابقت کو بالکل پسند نہیں کرتے جس کی قیمت میں ہمیں اسلامی اصول و اقدار کے خزانے سے ایک حبہ بھی دینا پڑے۔

تحقیق مزید

خلافت معاویہؓ ویزید کے مصنف محمود احمد عباسی کا دوسرا نقش عجیب تقریباً تین سو صحابہؓ اور پانچ ازواج مطہراتؓ کا تذکرہ۔ ان سب کی رائے یزید کی خلافت اور حضرت حسینؓ کے خروج کی نسبت کیا تھی؟ خونِ عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ اور دیگر جلیل القدر صحابہؓ نے جو قدم اٹھایا اس کے صحیح حالات کیا تھے؟ ایسے اہم سوالات کا محققانہ جواب۔ شیعی روایات کی مدلل تردید۔ ۶۵ بغاوتوں کے حالات، کئی چونکا دینے والے انکشافات اور دلچسپ حقائق۔ لہجہ متین، اسلوب دل کش، نقد گہرا، فاضل مصنف حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے احترام وادب کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ــــ ضخامت کافی۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری

بخاری کی ایک عظیم اُردو شرح کا سلسلۃ الذہب۔ اعلیٰ درجہ کی تحقیق، تفہیم، تشریح۔ علامہ انور شاہ صاحبؒ محدث کے افادات سے مالا مال۔ ابھی صرف مقدمے کی ۲ جلدیں شائع ہوئی ہیں، لیکن یہی اپنی جگہ قیمتی معلومات اور لاجواب مواد سے لبریز ہیں۔ ہر ہر صفحہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ احناف کے لئے یہ مقدمہ ایک عجیب اور نادر تحفہ ہے۔ دونوں جلدوں کی قیمت آٹھ روپے (مجلد دس روپے)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی چند کتابیں

● اسلامی جمہوریہ۔ ڈیڑھ روپیہ ● مسئلہ خلافت۔ پانچ روپے ● آزادؒ کی کہانی خود آزادؒ کی زبانی۔ سات روپے ● مقالاتِ آزادؒ۔ ۲ روپے ● نگارشاتِ آزادؒ۔ چھ روپے ● عیدین۔ ڈیڑھ روپیہ ● مضامین البلاغ۔ پونے چار روپے ● امر بالمعروف ڈیڑھ روپیہ ● شہیدِ اعظم۔ ڈیڑھ روپیہ ● صدائے رفعت۔ ساڑھے تین روپے ● انسانیت موت کے دروازے پر۔ ساڑھے تین روپے ● غبارِ خاطر۔ چھ روپے ● اصحابِ کہف۔ ڈھائی روپے ● ولادتِ نبوی مکمل۔ ۲ روپے ● ام الکتاب پونے پانچ روپے ● مضامین آزادؒ۔ ۲ روپے ● حضرت یوسفؑ۔ سوا دو روپے ● مضامین الہلال۔ تین روپے بارہ آنے

نظام الملک طوسی

الب ارسلان کے وزیر کبیر ابو علی حسن بن علی کی مبسوط سوانح عمری۔ قابل اعتماد تاریخی مواد۔ مؤلفہ:۔ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری۔ مصنف البرمکہ۔ قیمت بارہ روپے۔

البرامکہ

مصنفہ:۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری۔ عالم اسلام کے نامور وزراء خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کون تھے انھوں نے عہدِ عباسیہ میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئیے۔ ان دانشور اور مدبّر وزیروں کے عروج وزوال کی حیرت انگیز وعبرت انگیز داستان مکمل۔ مجلد بارہ روپے۔

تفسیر حقانی کامل

مولانا عبدالحق حقانی محدث دہلوی کی یہ مشہور تفسیر اب پانچ جلدوں میں مکمل مل سکتی ہے۔ مع مقدمہ۔

غیر مجلد کا ہدیہ ۷۲ روپے ہے، لیکن ہم بسبب گنجائش صرف ساٹھ روپے کا اعلان کرتے ہیں۔

پانچ جلدوں میں مجلد طلب فرمائینگے تو ہدیہ ستر روپے ہوگا۔

آرڈر کے ساتھ اپنا ریلوے اسٹیشن ضرور لکھئے۔ ڈاک سے خرچ بہت آتا ہے۔

مقالات شیخ الہند رح

مولانا محمود الحسن شیخ الہند رح، جو بہت بڑے شیخ الحدیث بھی تھے پہلے وحی کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہوئے نازک و غامض گوشوں کی توضیح فرماتے ہیں۔ پھر اس معلوم و معروف حدیث

لا ایمان لمن لا دیانۃ لہ

جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں

کی تفہیم و تشریح فرماتے ہیں۔ فکر انگیز دلپذیر اور عالمانہ

قیمت ایک روپیہ

القاموس الجدید

ایک رفیع الشان اردو عربی ڈکشنری

بے شمار اردو الفاظ کے عربی مترادفات کے علاوہ اس میں ضرب الامثال محاورات اور زبان کے نئے تغیرات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ضروری مقامات پر تصاویر کے ذریعہ مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ مفید، بیش قیمت اور جلیل القدر عربی سیکھنے والوں کے لئے خاص تحفہ ہے۔

سات روپے

لطائف علمیہ

محدث شہیر علامہ ابن جوزی رح کی کتاب الاذکیاء کا سلیس ترجمہ۔ اس کتاب میں ذہانت و فراست، مزاح، بذلہ سنجی اور حکمت پر مشتمل دلچسپ لطائف بیان کئے گئے ہیں۔ اسکے مؤلف امام ابن جوزی رح ایک ایسی عظیم شخصیت کے مالک تھے جن کے ہاتھ پر بیس ہزار یہودیوں اور نصرانیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

مجلد پانچ روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یو-پی)

نقد و تبصرہ　　　　عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

فاتحۃ الکلام فی القراءۃ خلف الامام

● از شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی
● ناشر :- پاکیزہ دار الکتب - جیل روڈ - حیدر آباد سندھ (پاکستان)
● صفحات ۱۶ لکھائی چھپائی غیر معیاری - قیمت ایک روپیہ بارہ نئے پیسے -

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئیے یا نہیں - اس مسئلے پر بیشمار بحثیں ہو چکی ہیں - احناف کا مسلک یہ ہے کہ پڑھنی نہ چاہئیے امت مسلمہ پر اگر خدا فراموشی کا ادبار مسلط نہ ہوتا تو یہ اور اس نوع کی دوسری فروعی بحثیں مستقل دردسر نہ بن جاتیں بلکہ ہر گروہ اپنے مسلک پر صبر و شرافت کے ساتھ عمل کرتا رہتا مگر ہوا اسکے خلاف رہا ہے - خصوصاً اہل حدیث حضرات اس باب میں جارحیت کے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں - چنانچہ زیر تبصرہ کتاب بھی ایک اہل حدیث ہی کی جارحیت کا دفاع ہے - انھوں نے تکمیل البرہان کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مولانا ظفر احمد صاحب کو باقاعدہ ڈاک سے بھیجی اب مولانا موصوف اس کا جواب نہ بھیجتے تو کیا کرتے - جواب عالمانہ اور مدلل ہے - لب و لہجہ بھی باوقار ہے حنفی مسلک کا اثبات مضبوط دلائل سے کیا گیا ہے ـــــ مگر ہمیں یقین ہے کوئی اہل حدیث جواب الجواب بھی لکھے گا - کیونکہ تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اہل حدیث حضرات چپ ہونا نہیں جانتے۔

. . . . .

حد ہے کہ ان کے ایک دہلی سے نکلنے والے اخبار میں آ سکے مولانا مودودی کے خلاف وہی فرسودہ "بازاری اور منضمن تبرّا جاری ہے جسکے نظارے سے وجدان سلیم کو ابکائیاں آتی ہیں - یا معبود ہم ...

قرآن پاک اور آسمانی پروازیں

● تالیف :- جناب معین الدین رہبر فاروقی
● ملنے کا پتہ :- معین الدین رہبر فاروقی - بیرون یاقوت پورہ محلہ املی بن ۱۷-۳-۴۰۵ حیدر آباد دکن -
● صفحات ۲۱۶ کاغذ سفید - لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت - قیمت تین روپے

اس طرح کی کوششیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں کہ علم و سائنس کی گوناگوں دریافتوں سے قرآن کا نہ صرف ہم آہنگ ہونا واضح کیا جائے بلکہ یہ بھی ثابت کیا جائے کہ قرآن میں خود ایسے بنیادی اشارات اور اساسی انکشافات موجود ہیں جن پر اعلیٰ ترین تحقیق اور سائنسی تب و تاب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے -

ہم نے عموماً اس طرح کی کوششوں پر رد کی ہے - ہمیں بالکل پسند نہیں ہے کہ قرآن کو اس کے اصل موضوع اور مقصد سے ہٹا کر ان مباحث میں استعمال کیا جائے جن کے لئے وہ نازل نہیں ہوا - ایسا کرتے ہوئے بر خود غلط حضرات مفسرین و محدثین اور علمائے سلف کے بارے میں جس طرح کی موشگافیاں فرماتے ہیں انسے بھی ہم بیزار ہیں -

لیکن خوشی کی بات ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے متعلق ہماری رائے بری نہیں - اس میں بھی کوشش تو یہی کی گئی ہے کہ قرآن کا تفوق مادی ترقیات اور سائنسی تگ و دو کے میدان میں بھی ثابت کیا جائے لیکن کوشش کا انداز بہت محتاط، معتدل اور خوشگوار ہے - نہ مؤلف کو اسلاف سے کد ہے نہ ہمہ دانی کے زعم میں گرفتار ہیں - علمائے سلف کی عزت و حرمت اور ان کے علمی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ سلیقے، ادب اور متانت کے ساتھ اپنے وہ خیالات پیش کرتے ہیں جن پر وہ کافی دماغ سوزی کے بعد پہنچے ہیں یہ خیالات جاندار بھی ہیں اور دلائل سے مزین بھی -

ضروری نہیں ہے کہ فاضل مؤلف نے جس آیت سے جو کچھ سمجھا ہے اور جس لفظ کو ایک خاص مفہوم کا حامل گمان کیا ہے اس سے ہر شخص اتفاق ہی کرے۔ بعض مطالب لیسے ہیں جن پر مزید غور و فکر کی ضرورت تھی تاہم جتنا کچھ جس انداز میں پیش کیا گیا ہے لائق تعریف ہے۔ خدا کرے کتاب مقبول ہو اور مؤلف کو دارین میں اس کا اجر ملے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے۔ ڈھائی روپے رکھی جاتی تو مناسب ہوتی۔

انوارِ اسلام کی خصوصی اشاعت

ماہنامہ انوار اسلام جناب حافظ امام الدین رام نگری کی ادارت میں رام نگر سے نکلتا ہے اور اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں جناب مدیر ہندو آئیڈیالوجی کے بالمقابل اسلام کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔ موصوف ہندی خوب جانتے ہیں اسلئے بعض ہندی کتابوں کے اسلام دشمن مطالب پر انھوں نے خوب خوب نقد کیا ہے۔

اب یہ پیش نظر اشاعت بھی ہندوؤں کے ایک خاص عقیدے "آواگمن" ہی کے جائزے پر مشتمل ہے۔ آواگمن تناسخ کو کہتے ہیں اور حافظ صاحب نے بعض ہندو عالموں کے دعاوی و براہین پر نقد کرتے ہوئے اس عقیدے کا ابطال کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حافظ صاحب کی تنقیدیں اکثر جاندار ہوتی ہیں اور ہندوانہ افکار و عقائد کا نقد تو ان کا خاص موضوع بن گیا ہے۔ یہ تنقید بھی کافی جاندار ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے میں موصوف خاصے کامیاب رہے ہیں۔

لیکن ایک پیچیدگی ہم سے حل نہیں ہو رہی — حافظ صاحب نے اپنی تنقید میں جو زبان استعمال کی ہے وہ وہی ہے جسے پڑھے لکھے مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی غیر مسلم تو شاید اردو کا ایم - اے کر کے بھی اس کے بعض الفاظ اور جملوں کو مشکل ہی سے سمجھ سکے۔ موضوع خالص نظری ہونے کے باعث بحث تو یوں بھی فلسفہ و منطق کی دشوار گذار راہوں سے گذرنی ہی تھی، لیکن حافظ صاحب نے یہ بھی کوشش نہیں کی کہ جن مشکل الفاظ کے سہل مترادفات آسانی سے مل سکتے ہیں انھی کو سہل بناتے چلے جائیں۔ مثلاً تخلیق - لافانی - جرح و قدح - تناقض وغیرہ - ایسی صورت میں یہ کتاب نما اشاعت آخر کن لوگوں کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ تناسخ کا عقیدہ ایسا نہیں جس کے بطلان سے پڑھے لکھے مسلمان ناواقف ہوں۔

پھر ہندو علماء جس بے مغز منطق اور دیو مالائی اسلوب میں اسے ثابت کرتے ہیں وہ تو یوں بھی کسی ہوشمند مسلمان کے دماغ میں نہیں اتر سکتا کہ اسے تردیدی دلائل کی حاجت ہو۔ اگر سمجھا جائے کہ شامت کے مارے بعض جاہل اور غبی مسلمان تناسخ کا ہدف بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے حافظ صاحب کا نقد مفید ہوگا تو یہ بھی اس اونچی نگارش کے ذریعہ ممکن نہیں جسے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ شامت زدہ تو دو چار صفحات بھی سمجھنا تو درکنار ہجے کے بغیر پڑھ بھی نہ سکیں گے۔

بعض مسائل میں ہم سے حافظ صاحب کا اختلاف منظر عام پر آچکا ہے اس لئے شاید کچھ لوگ ہماری اس الجھن کو اسی اختلاف کا ثمرِ خبیث سمجھیں۔ حاشا ثم حاشا۔ ہم نے حافظ صاحب کی اچھی کوششوں کو ہمیشہ سراہا ہے اور اب بھی سراہتے ہیں۔ مگر یہ بات ہماری ناقص عقل میں نہیں آسکی ہے کہ اس نوع کے خاص نمبروں یا کتابوں سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ تناسخ ہو یا ہندوؤں کا کوئی اور عقیدہ اس کے رد کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں۔ یا تو بعض کم سمجھ مسلمانوں کو ان کی لپیٹ سے بچانا یا پھر دریدہ دہن معترضین کو جواب دینا۔ دونوں ہی صورتوں میں گفتگو اسی لب و لہجے اور اسالیب میں ہونی چاہئے جسے مخاطبین سمجھ سکیں۔ مثلاً سوامی دیانند جی یا کسی اور مہاشے نے اگر اسلامی عقائد کے بالمقابل غیر اسلامی عقائد کو حق ثابت کرنے کی سعی کی ہے تو اس کے ممکنہ غلط اثرات کا ازالہ ایسی تنقیدوں سے تو نہیں ہو سکتا جن کی بازگشت ان غلط اثرات کا مسکن بننے والے اذہان و قلوب تک پہنچنی ہی ممکن نہ ہو۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ ایسی تنقیدوں کو ہندی کا روپ دیکر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اگر وسائل کی کمی ایسی مانع ہے تو اردو میں لکھا کوئی حقیقی افادیت اسی وقت رکھ سکتا ہے جب زبان و انشا اتنی ہلکی پھلکی اور عام فہم ہو کہ ہندو حضرات بھی اسے سمجھ سکیں اور وہ کم علم و کم عقل مسلمان بھی اسکی گہرائی میں اتر سکیں جن کے بارے میں اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض ہندو علماء کے جارحانہ افکار کا شکار ہو گئے ہوں گے یا آگے کو ہو جائیں گے۔ بحالتِ موجودہ تو اس کے سوا کوئی فائدہ

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ انوار اسلام کے کچھ ناظرین حافظ صاحب کو واہ واہ سے نواز دیں۔ اگر حافظ صاحب کے پیش نظر یہ بات ہو کہ کوئی ذی حیثیت مسلمان ان کی تنقید کا ہندی ترجمہ کر کے مناسب حلقوں میں پھیلا دے تب بھی انھیں انشاء اتنی سلیس اور عام فہم استعمال کرنی چاہیئے تھی کہ ترجمہ آسانی سے ہو سکے۔

زیر تبصرہ اشاعت کا سائز کتابی ہے (ناول سائز) صفحات ۱۱۲ ابتدائی تین ورق رف ہیں باقی گلیزڈ۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ یہ اشاعت انوار اسلام کی دو اشاعتوں کی کفالت کرتی ہے۔ کتابت وطباعت معیاری نہیں ہے۔ انوار اسلام کا سالانہ چندہ چار روپے ہے اور فی پرچہ چھ آنے۔

تجدید جنون

● مرتبہ :۔ رابرٹ کنکوئسٹ۔
● مترجمین :۔ جلیس عابدی۔ مخمور سعیدی
● نظر ثانی :۔ گوپال متل ● کاغذ، طباعت، کتابت شاندار۔
● صفحات ۲۱۲ سائز ۲۰×۲۶/۸ کپڑے کی جلد۔ قیمت پانچ روپے۔
● شائع کردہ :۔ مکتبہ تحریک۔ انصاری مارکیٹ۔ دہلی۔

کمیونزم نے اپنے دائرۂ اقتدار میں دوسری آزادیوں کی طرح شعر وادب کی آزادی کو بھی بُری طرح کچلا ہے اور فنکاروں کو ایک ایسا فن پیش کرنے پر مجبور کیا ہے جو خالصتہً کمیونزم کا قصیدہ ہو مگر اسکے باوجود تمام ضمیروں کو مکمل طور پر کچل ڈالنا اور دل ودماغ کو مسخ کر ڈالنا بہت مشکل ہے۔ کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہی ہیں جو سر پر لٹکی ہوئی تلوار کے باوجود اشارۃً وکنائے میں سچائی کا ذکر کر ہی ڈالتے ہیں۔

اس کتاب میں ایسی ہی نظمیں جمع کی گئی ہیں جن میں اشترا کی دنیا کے ناپاک ترین حقائق کے اشارے اور بے انداز جبر وتشدد کے خلاف دبی دبی فریادیں، طنز اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ ان نظموں کے کہنے والے روس، ہنگری، پولینڈ، زیکوسلاویکیا، رومانیہ، بلغاریہ اور مشرقی جرمنی کے زندانوں میں طوق وسلاسل کی شدید جکڑبند کے باوجود گا ہے گا ہے دل کو زبان پر لے آئے ہیں۔ مگر صراحت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اشارات اور کنایوں ہی سے مجبوراً کام لینا پڑا ہے۔

ہر ملک وقوم کی شاعری اپنے کچھ مسلمات، کچھ انفرادی زاویئے کچھ تلمیحیں، کچھ اصطلاحیں اور کچھ اسلوب رکھتی ہے اس لئے منظومات کے ترجموں سے اصل کا لطف اُٹھانا ممکن نہیں ہے، بلکہ بعض فن پارے تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ترجمہ اصل زبان نہ جاننے والوں کے لئے اضحوکہ اور عجوبہ بنکر رہ جاتا ہے۔ یہی صورت حال "تجدید جنوں" کی بعض نظمیں پڑھ کر ہمیں بھی پیش آئی ہے اور یقین ہے کہ دوسرے ناظرین کو بھی پیش آئے گی۔ لیکن اس سے اُس مقصد پر حرف نہیں آتا جس کے تحت یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جب سینے کی طرف پستول کی نال اٹھی ہوئی ہو تو صاف گوئی ٹیڑھی کھیر ہے۔ طاقت ور ضمیر اگر تڑپ کر کوئی آواز اٹھائے گا بھی تو وہ زبان پر آ کر مبہم الفاظ میں ڈھل جائے گی اور راست گوئی کا جذبہ اشارہ وکنایہ کی آڑ لینے پر مجبور ہوگا۔ اس کے باوجود یہ اشاراتی نظمیں اشترا کی جبر وطغیان کے لئے ایک اٹل شہادت فراہم کرتی ہیں۔ اشارے کہیں بہت لطیف ہیں، کہیں تقریباً پہیلی بن گئے ہیں، کہیں قدرے واضح بھی ہیں اور کہیں تو صراحت کی حدوں کو چھو گئے ہیں۔ پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔

شروع میں گوپال متل صاحب کے مختصر لیکن بلیغ پیش لفظ کے علاوہ خود مرتب کا افتتاحیہ بھی ہے جو مفصّل اور فکر انگیز ہے۔

طباعت وکتابت میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ ترجمے بعض مقامات پر بہت عمدہ ہیں، کہیں کہیں ایسے جھولدار بھی ہیں کہ مزید تفحص سے انھیں بہتر بنایا جا سکتا تھا۔

اونچی دکانیں

● مصنف :۔ صدیق الحسن گیلانی۔
● مرتب :۔ اسعد گیلانی۔
● ناشر :۔ آزاد بک ڈپو۔ سرگودھا (پاکستان)
● ملنے کا پتہ :۔ بساطِ ادب۔ چوک انارکلی لاہور۔ صفحات ۱۱۲

اسعد گیلانی تو پڑھے لکھے حلقوں میں معروف ہیں ہی ان کے بڑے بھائی صدیق الحسن گیلانی بھی اجنبی نہیں ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے طرز پر لکھتے رہے ہیں اور انھی نگارشات کا کچھ حصہ ان کے برادر خورد اسعد صاحب نے زیر تبصرہ مجموعے کی شکل میں پیش فرمایا ہے

اسلام پسند ادیبوں میں طنز ومزاح کی زلفِ چلیپا سنوارنے والوں کی بہت کمی ہے۔ معیار اعلیٰ تو دُور کی بات ہے معیار متوسط پر بھی معدودے چند ہی نظر آتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ طنز ومزاح کا فن بظاہر جتنا آسان اور بے بھاؤ ہے اتنا ہی مشکل اور مہنگا بھی ہے۔

بہت غنیمت ہے کہ اسلام پسند ادیبوں کی صف میں صدیق الحسن صاحب جیسے حضرات بھی موجود ہیں جن کے طنز و مزاح میں لطافت و ثقاہت کا خوشگوار امتزاج ہے اور کہیں کہیں تو معیار اعلیٰ کی بھی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ ان کے شہ پارے پڑھکر ہمیں ان کی ذہانت، بالغ نظری اور گہری قوت مشاہدہ کا قائل ہو جانا پڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ انشاء اور اسلوب کا کچا پن جگہ جگہ نمایاں ہے۔ وہ شاید جلد بازی میں ناک کو اکثر سیدھے سادھے طریقہ پر پکڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ طنز و مزاح ہی وہ میدان ہے جس میں ناک کو گردن کے پیچھے سے پکڑنا لطف دیتا ہے اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ گھماؤ کا طریقہ اختیار کرے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

صدیق الحسن صاحب اسلام پسند ہیں اس لئے ان کا طنز و مزاح بے مقصد نہیں بلکہ مکمل طور پر مقصدی ہے۔ ہر شہ پارہ کسی نہ کسی اخلاقی قدر سے جوڑ رکھتا ہے اور ہر تبسم کے پیچھے ایک نوحہ، ایک احتجاج نمایاں نظر آتا ہے۔ کمزوری یہ ہے کہ مقصد کو ریشمی گھونگٹ میں چھپائے رکھنے کی بجائے وہ بسا اوقات عریاں کرکے رکھدیتے ہیں۔ مقصد کی عریانی وعظ میں تو زیب دیتی ہے مگر ادبی فن پاروں میں کھل جاتی ہے۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ صدیق الحسن صاحب کے قلم پارے دلچسپ بھی ہیں، وقیع بھی۔ سبق آموز بھی ہیں، بہجت افروز بھی۔ انکا شاہد تیز نگاہ دور بیں اور ذہن چاق چوبند ہے۔ کاش قلم کا قط بھی سلیقے اور محنت سے رکھا گیا ہوتا تو وہ اسلام پسند ادیبوں کے حلقے میں طنز و مزاح کے امام بن سکتے تھے۔

سب سے آخر میں مضمون "مسلمانوں کے مذہبی فرقے" مختصر سا ہے مگر ژرف نگاہی کے اعتبار سے اس لائق تھا کہ اسے شروع میں رکھا جاتا۔ سنی، اہلِ حدیث اور شیعہ تینوں فرقوں کے فکر و عمل اور نفسیات کا جائزہ بڑی صائب نظری کے ساتھ لیا گیا ہے۔ خصوصاً اہل حدیث کے جائزے میں تو بالغ نگاہی کا کمال ہی کر دکھایا ہے۔

البتہ شیعوں کے جائزے میں ہم صرف ایک فقرے سے متفق نہیں ہو سکے۔

"زبان کو حق کے لئے استعمال کرتا ہے اور ہاتھوں کو باطل کے لئے۔"

کس دنیا میں رہتے ہیں وہ شیعہ جو زبان کو حق کیلئے استعمال کرتے ہیں؟ — ہمارا علم و مشاہدہ تو یہ ہے کہ حق کو شیعوں کی زبان نے جس ڈھٹائی اور پلید الذہنی کے ساتھ ذبح کیا ہے دنیا میں اس کی مثال نہیں ہے۔ صحابہؓ کو گالیاں دینا ظاہر ہے زبان ہی کے استعمال کے دائرے میں آتا ہے۔ بدگوئی و گندہ دہنی جس فرقے کے عقائد ضروریہ میں شامل ہو اس کی زبان حق کے لئے کیا اٹھیگی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ صدیق صاحب کسی خاص زاویۂ نظر سے یہ فقرہ لکھ گئے ہیں ورنہ سیدھے سادھے حقائق تو اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

شیعی فرقے کے بارے میں ایک دلچسپ فقرہ:-

"کردار کو امام غائب کے ساتھ ہی غائب کر چکا ہے اور دونوں کے انتظار میں آنکھیں لگائے تمام احکام دین کو الوداع کہہ چکا ہے۔"

امید ہے اسلام پسند حلقوں میں دلچسپ و مفید رشحات کا یہ مجموعہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

چوکھٹ کے اندر ام فاروق کے اصلاحی مضامین کا مجموعہ ● صفحات ۹۶ ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ شائع کردہ:- آزاد بکڈپو۔ بلاک نمبر ۲ سرگودھا (پاکستان)

اس مجموعے میں ایسے چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جنھیں نہ تو افسانہ کہا جا سکتا ہے نہ مقالہ۔ افسانوی اور نیم افسانوی انداز میں محترم مصنفہ نے بعض واقعات و حوادث کو اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ طرز نگارش پُرسوز اور مؤثر ہے۔ انداز فکر پاکیزہ ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے ان کے ستھرے قلم پارے مفید اثرات کے حامل ہیں۔

کتاب کا نام ہمیں پسند نہیں آیا۔ روش عام کے مطابق مجموعے میں شامل ایک مضمون کے عنوان کو کتاب کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔ یہ عنوان ترقی پسندانہ نوع کا ہے۔ "چوکھٹ" تو دروازے کے چوبی فریم کو کہتے ہیں۔ "گھر کے اندر" یا "اندرون خانہ" کا مفہوم "چوکھٹ کے اندر" سے ادا کرنا ٹھیک نہیں۔

ہم خواتین سے اس کتاب کو پڑھنے کی سفارش کریں گے ۔۔۔ [illegible]

پتھر کے دیوتا ترجمہ از:- گوپال متل۔ ناشر:- نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکٹ۔ دریا گنج۔ دہلی۔ صفحات ۳۰۴ کاغذ سفید۔ لکھائی چھپائی مناسب۔ قیمت ایک روپیہ۔

اس کتاب میں چھ ایسے مغربی مصنفین کی آپ بیتیاں جمع کی گئی ہیں جنھوں نے کمیونزم قبول کیا' خاص مدت تک اس کے لئے کام کرتے رہے اور پھر اس سے توبہ کرلی۔

جیسا کہ اہل نظر خوب جانتے ہیں، آپ بیتیاں بھی اسی حقیقت کی توثیق کرتی ہیں کہ باضمیر اور ہوشمند لوگ کمیونزم کو اس لئے قبول نہیں کرتے کہ اس کے اصول و فروع کی علمی و عقلی برتری ان کے ذہن میں آگیا ہے' بلکہ یہ قبولیت عموماً ایک جذبۂ مجہول پر مبنی ہوتی ہے اور اس مجہولیت کا سرچشمہ وہ مایوسی اور بد دلی ہوا کرتی ہے جو کسی انتشار پذیر معاشرے میں بے عقیدگی اور بے اصولی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ عیسائیت اپنے غلط کوش اور کج فکر پیروؤں کے ہاتھوں ایک ایسا مایۂ فاسد بنکر رہ گئی جسے استعمال کرنے کے لئے بے ضمیری، بے حسی اور ذہنی جمود شرطِ لازم ہے۔ معاشرے میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جو اپنے ضمیر کی چبھن اور اپنے ذہنی اضطراب کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ جب سماج میں عقیدے اور اصول کا بھیانک خلا محسوس کرتے ہیں تو اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ایک پیاسے کو پانی میسر نہ آنے پر سراب کی طرف دوڑے تو یہ قدرتی فعل ہے۔ اس کتاب کی آپ بیتیاں بھی یہی بتاتی ہیں کہ اسکے مصنفین کی روحانی تشنگی جب عیسائیت کے مایۂ شور سے نہ بجھ سکی تو وہ کمیونزم کے سراب کی سمت بڑھ گئے — پھر اس سراب کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد وہ مایوس و دل گرفتہ واپس لوٹے کیونکہ یہ سراب سیّال ریت سے عبارت تھا جو موجیں ضرور مارتا ہے مگر ان موجوں کو جاری رکھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ضمیر، روح، قلب اور احساسات لطیف کا سُرخ لہو ان میں شامل کیا جاتا رہے۔ اس لہو کے بغیر یہ موجیں اسی طرح جامد ہو جاتی ہیں جس طرح کھولتا ہوا گھی آنچ کم ہوتے ہی جمنا شروع ہو جاتا ہے۔

آرتھر کوئسلر — آندرے ژید — لوئی فشر — اگنازیو سلونے۔ رچرڈ رائٹ۔ سٹیفن اسپنڈر یہ ہیں ان چھ مصنفین کے نام جن کی خود نوشت رودادیں ترجمہ کرکے اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ ہر روداد اپنی جگہ سبق آموز عبرت ہے۔ بہت دلچسپ لیکن حقیقت افروز — ترجمہ بہت نفیس ہے۔

ایک نمونہ:-

"ہم میں سے ہر ایک کو کم سے کم ایک ساتھی کا علم ضرور ہے جس نے اپنی معصومی کے باوجود روس کے غلام خانوں میں جان دی' جاسوس قرار دیئے جانے کے بعد گولی کا نشانہ بنایا صرف لاپتہ ہو گیا' لیکن حیرت ہے کہ ان سب کے باوجود جمہوری ملکوں میں عدالتی ضابطے کی معمولی سے معمولی خامی پر ہم غصہ سے تلملا جاتے ہیں۔ اس کی مذمت میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں لیکن دنیا کے چھٹے حصّے میں جو سوشلسٹ ہونے کا مدعی ہے ہمارے ساتھیوں کی سزا اور سماعت کے بغیر موت ہمارے اطمینان قلب کو بالکل برہم نہیں کرتی اور ہم چپ چاپ اسے برداشت کر لیتے ہیں۔

روس میں جتنے انقلابی ہلاک ہوئے یا غلاموں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے اس کی نظیر دنیا کے کسی ملک کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو خود بھی سات سال تک مارکسی جھنڈے کے تلے کئے جانے والے ہر جرم اور حماقت کا جواز پیش کرتا رہا میرے لئے ان نیک دل اور ذہین لوگوں کی جدلیاتی شعبدہ بازی اتنی روح فرسا ہے کہ اسکے مقابلے میں سادہ لوح لوگوں کے وحشیانہ مظالم بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے —" (صفحہ ۸۲ و ۸۱ آرتھر کوئسلر)

دیوانِ صبیر بعض مرتبہ تبصرہ نگار بڑے چکر میں پڑ جاتا ہے اب اسی کو لیجئے۔ اس مجموعۂ شعری پر تبصرہ کا تقاضا شدید ہے' لیکن اس کے شروع ہی میں صاحبِ مجموعہ جناب ابوالبقا صبیر صاحب نے ضروری گذارش کے عنوان سے جو سطور د[illegible]

"حضرات قارئین اور خصوصاً شعرائے کرام کی خدمت
میں مؤدبانہ التماس ہے کہ اگر دیوان ہذا میں کوئی غلطی
لفظی یا معنوی جو میری ناواقفیت کی وجہ سے پائیں تو
بلقدر ... اعتراضات سے معاف فرمائیں۔"

اس گذارش کے بعد تبصرے کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے اس لئے کہ وہ بھی صبر صاحب اپنی فنی صلاحیتوں کے باوجود زمانے کی ... ناقدری کا شکار ہیں وہ ہر حساس اور شریف آدمی کے اندر رحم و ہمدردی ہی کے جذبات اُبھار سکتی ہے۔ ایسے نرم و گداز جذبے درمیان میں آ جائیں تو تبصرے کی بے رحم جراحت کاریوں کا موقع کہاں؟

تاہم ڈیوٹی ڈیوٹی ہے۔ ہم تبصرے کا مطالبہ دیتے ڈرتے ضرور پورا کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو ہمیں کھٹکی یہی مذکورہ "گذارش" تھی۔ حیرت ہے اتنا مشاق اور پرانا شاعر نثر کے چند جچے تلے جملے لکھنے پر قادر نہیں۔ دوسری چیز یہ کھٹکی کہ مولانا اسعد اللہ صاحب کی تقریباً ایک صفحے کی معمولی سی تقریظ پر یہ سُرخی دی گئی ہے۔

"تقریظ از افادات تعلم بلاغت رقم سلطان کشور
سخندانی سر پیرآرائے ملک معانی تاج البلغاء سراج
الاولیاء جناب حضرت الحاج مولانا مولوی محمد اسعد اللہ
صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور"

"افاداتِ تعلم" ہمارے لئے نئی ترکیب ہے۔ ہو سکتا ہے "قلم" کا تعلم بن گیا ہو — مگر ان باریکیوں سے قطع نظر اس عنوان کا طول و عرض اور الفاظ کی مخصوص نوعیت ہی یہ واضح کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ ان کا رقم کرنے والا ابد سے سوسال پہلے کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عنوان اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ جناب صبر خالی الفاظ کے میدان کے شہسوار ہیں۔ — کھوکھلے، ٹھس اور جھلیل الفاظ — دیوان کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ان کی شاعری محض الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ایسے الفاظ جنھیں تغزّل، سوز اور گداز چھو کر نہیں گیا۔ وہ کہنہ مشق ہیں لیکن اس پہلو پر توجہ کرنے کو انھوں نے شاید شروع ہی سے خارج از بحث قرار دے رکھا ہے کہ کونسا لفظ رشتۂ نظم میں پرونے کے لائق ہے اور کونسا نالائق۔

نمونے:—

یثرب کے دھنی سرورِ جمنی کیا شان ہے یہ اللہ وغنی
ہیں آپ ہی زینتِ عرش علا، سردارِ دو عالم خوب ہوا

سوائے اس کے کہ جمنی اور غنی میں "دھنی" کا جوڑ لگا دیا ہے اور "یثرب کے دھنی" کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ — حضورؐ کو زینتِ عرش کہنا ایسی مبالغہ آرائی ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

کیا چوٹ نگہ جس نے ہم کو اک آفت ہے وہ لڑکا
خبر کیا دست و پا کی ہو پتہ سر کا نہ ہے دھڑ کا

نظارہ اس کے جوبن کا کیا جس نے وہی بھڑکا
غضب بانکی ادا والا ہے شوخ و شنگ وہ لڑکا

اس کے علاوہ کہ اس طرح کے شعر "غزل" کے ساتھ تمسخر ہیں ہمیں شرم بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ شرم اس بات پر کہ ایرانی ذوق کا ایک کھلا مظاہرہ کسی ایسے شاعر کے لئے تو ہرگز موزوں نہیں جس کے متشرع قسم کے فوٹو سے بڑا تقدس ٹپکتا ہے اور حیرت اس پر کہ اس طرح کے واہی اشعار اگر کسی خاص دَور میں کسی خاص تحریک کے تحت صادر ہو ہی گئے تھے تو اب کہن سالی میں صبر صاحب کو اس کا احساس کیوں نہ ہوا کہ ایسے شعروں کو اپنے مجموعے میں چھاپنا تو در کنار انھیں کسی ایک آدمی کے آگے زبان سے نکالنا بھی اپنی ثقاہت، متانت اور خوش مذاقی کو ذبح کرنے کے مرادف ہے۔

قرار آیا کسی صورت نہ مرغ روح کو اپنے
قفس میں کالبد کے ہے یہ طائر روز و شب پھڑکا

بنایا جن کو روشن دل خدا نے وہ تو روشن ہیں
کہ چمکا بن کے مشعل دیکھئے تو رتبہ گودڑ کا

بخت گردش میں رہا تقدیر چکر میں رہی
راہِ الفت میں قدم رکھنا مجھے منحوس تھا

ابر میرے زخم کے اُتھرے ہوتے پھاہے ہیں سب
ہے فلک پیوند میرے زخم دامن دار کا

یہ غم کی جو دیوار مرے دل میں کھڑی ہے
آساں ہے تجھے توڑنا اس آہنی سد کا

چشم پُر افسوں سے وہ بت سامری فن ہو گیا
اس کی آنکھیں دیکھ لیں جس نے برہمن ہو گیا

سرسام ہو جسے نہ ہو سودائے زلفِ یار
دورانِ سر میں دردِ سر اُس کو ہو سر بسر

یہ سب اگر شاعری ہے تو ہمیں اعتراف ہے کہ سخن فہم ہمیں چھو کر نہیں گئی۔ اس پورے دیوان میں فنی مجاہدے بھی ہیں، لفظی اینچ پینچ بھی ہے، استادانہ ہما ہمی بھی ہے۔ مگر تغزل، صداقت، جذبات نگاری اور بے ساختگی ہمیں ڈھونڈے سے نہ مل سکی۔ خالص آورد۔ جو فن آرٹ اور سائنس میں ہے وہی صبر صاحب کی شاعری اور اُس شاعری میں ہے جسے ہم شاعری سمجھتے ہیں۔

ویسے صبر صاحب نے محنت جس قدر کی ہے اُس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اس مجموعے میں ایک سے ایک فنی چیز موجود ہے۔ مثلاً ایسی غزلیں جن میں پڑھتے وقت ہونٹ سے ہونٹ نہ ملیں۔ یا ایسی کہ ہر لفظ پر ہونٹ ضرور ملیں۔ بعض میں نقطوں کا التزام ہے بعض بے نقط ہیں وغیرہ

کاش شاہی زمانہ ہوتا تو صبر صاحب کو ایسی فنکاری پر انعام و اکرام مل سکتا تھا۔ لیکن بحالت موجودہ ایسے فنی مجاہدوں اور استادانہ عرق ریزیوں کا مصرف کیا ہو، اس کا جواب ہمیں نہ مل سکا۔ حیرت یہ ہے کہ تمام صلاحیتیں محض لفظی اُلٹ پھیر پر کھپا دینے کے باوجود لفظی خامیوں کی بھی کمی نہیں۔

خالق نے تمھیں پہچان لیا، اللہ نے تم کو جان لیا
ہاں ایک کو ایک نے مان لیا سردارِ دوعالمؐ خوب ہوا

ٹکڑوں کو مقفّی کرتے چلے جانا بے شک حسن کاری ہے، لیکن مفہوم کا بھی تو لحاظ رکھنا چاہئے۔ خالق اور اللہ کو ایک ہی مصرعہ میں دو مختلف ہستیوں کے انداز میں پیش کرنا اہمال ہے۔ اس کے علاوہ یہ شعر جبھی صحیح المعنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کچھ زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس میں اللہ تعالےٰ "سردارِ دوعالمؐ" کو جانتے پہچانتے نہیں تھے۔ معاذ اللہ۔ "ہاں ایک کو ایک نے مان لیا" کا فقرہ بھی اللہ کے تعلّق سے مہمل ہے۔

جب چلا میں آسماں نے دے دیا دوٗ گز کفن
پہلے لے نباش تو آکر مری چادر اٹھا

کیا مطلب ہوا؟

خدا پر صبر رکھئے گا قناعت
بھروسا کیا کسی کا آسرا کیا

قناعت کرنا محاورہ ہے "رکھنا" نہیں۔

میں نہ سرمست شرابِ عیش اک دن ہو سکا
ساغرِ دل میرا پہلو میں مرے معکوس تھا

"معکوس" یہاں "واژگوں" کے معنی میں صحیح استعمال نہیں ہوا ہے۔

جب سے پابند اسے شرم و حیا کا دیکھا
ہم نے دیدار نہ پھر شانِ خدا کا دیکھا

"دیدار دیکھنا" ——— "استفادہ حاصل کرنا" جیسی بات ہے

حاصل تبصرہ یہ کہ پیش نظر مجموعہ اُن لوگوں کے لئے تو مفید ہوگا جو تسکینِ ذوق کی بجائے ضرورۃً شعر پڑھتے ہوں یا جنھیں شعری میدان میں پیٹے کے ہاتھوں سے دلچسپی ہو، لیکن وہ لوگ اس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے جن کے نزدیک شعر کا پہلا کام روح کے کسی تار کو چھیڑنا اور وجدان پر شبنم ٹپکانا ہے۔ ہمیں بڑی کوفت اس سے بھی ہوئی کہ صبر صاحب لڑکوں سے اظہارِ عشق میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ شاید انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ دیگر شعراء جو محبوب کے لئے مذکر کی ضمیر میں استعمال کرتے ہیں وہ بھی لڑکوں ہی کے چکر میں ہیں ——— مگر ہم صبر صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کا خیال درست نہیں۔ ضمائر کی تبدیلی تو دراصل مشرقی تہذیب کا ایک رکھ رکھاؤ ہے ورنہ مقصود وہی جنسِ لطیف ہوتی ہے جس سے محبت کرنا خلافِ فطرت نہیں کہا جا سکتا، لیکن جب مذکر کی ضمیریں کسی شعر میں اس طرح استعمال ہو جائیں کہ جنسِ لطیف پر ان کا اطلاق ہی ممکن نہ رہے اور خالص "لڑکا" سطے ہو جائے تو یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے شاعری، لفنگے پن کی طرف مڑ جاتی ہے لونڈوں کے عشق کا تذکرہ بعض "بزرگوں" سے بھی صادر ہوا ہے۔ یادش بخیر، میر بھی کسی عطار کے لونڈے پر فریفتہ ہوئے تھے لیکن ساری دنیا بھی لڑکوں کے چکر میں گرفتار ہو جائے تو یہ فعل خلافِ وضعِ فطرت ہی رہے گا۔

یہ مت سمجھئے کہ ۴۴۰ صفحات کے اس دیوان میں عیب ہی عیب ہیں ہنر نہیں۔ نہیں یہ تو اندھا پن ہوگا کہ ہم اچھے اشعار کی موجودگی تسلیم نہ کریں۔ قدم قدم پر بہتر شعر بھی ملتے ہیں، لیکن یہ آفت ہر جگہ مشترک ہے کہ صبر صاحب دل و روح سے نہیں بلکہ

حسن یقین

ایک حجازی عالم کے ایمان افروز فرمودات کی تلخیص سلیس و شگفتہ اُردو میں اسلامی اقدار و عقائد کی دلپذیر حکیمانہ تفہیم و تشریح۔ قیمت مجلد سوا روپیہ

خلقِ مسلم

حضرت امام غزالیؒ کی مفید ترین عربی تالیف کا اُردو ترجمہ۔ اسلام کے پسند فرمودہ اخلاقی آداب و اطوار کی ایمان افروز تفصیل۔ قیمت پانچ روپے۔ کاغذ رف

بلاغ المبین

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی ایک بیش بہا کتاب کا اُردو ترجمہ۔ جو بدعت کے رد، سنت کے اثبات اور عقائد صحیحہ کی توضیح میں نہایت اعلیٰ ہے۔ کاغذ رف مجلد چار روپے

عمرو بن العاصؓ

اس صحابی رسولؐ فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستانِ حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے مدبر اسلام کے خطاب سے نوازا۔ بیحد دلچسپ، اثرانگیز اور مستند۔ مجلد دو روپے

فسادات جبلپور اور اس کے بعد

حال ماضی کی قبر میں دفن ہو جاتا ہے لیکن اس سے سبق حاصل کرنا جبھی ممکن ہے کہ وہ حافظے کی سطح پر زندہ رہے۔ یہ کتاب اسی امکان کو پائندہ رکھنے کی ایک مؤثر سنجیدہ اور فکر انگیز کوشش ہے۔ دو روپے
انگریزی ایڈیشن۔ سوا روپیہ۔

مسلم یونیورسٹی اور جارحانہ فرقہ پرستی

ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور جان و مال پر جو یورشیں ہیں ان کا مبصرانہ جائزہ اور ممتاز لوگوں کے فرمودات پر نقد و تبصرہ۔ ڈھائی روپے۔

فارابی

تالیف:۔ عباس محمود (مصری) ترجمہ:۔ رئیس احمد جعفری
معلم ثانی حکیم ابو نصر فارابی کے فضل و کمال، شخصیت، حالات و سوانح۔ علمی مقام اور تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل اور مستند حالات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

تلبیس ابلیس

علامہ ابن جوزیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کی نشاندہی۔ مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد کا بیان۔ مجلد دس روپے۔

عہد نبویؐ کے میدان جنگ

بدر و احد اور دور رسالت کی دوسری جنگوں کے نہ صرف محققانہ حالات، بلکہ فوٹو اور نقشے بھی۔ اس کے مؤلف مشہور استاذ قانون ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ۔

خطبات مدراس

سیرت کے موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی کے مشہور ترین خطبات جو اپنا جواب آپ ہیں۔
مجلد ساڑھے تین روپے

نصرۃ الحدیث

فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک معرکۃ الآراء کتاب۔ ہر الزام اور پروپیگنڈے کا مدلل رد۔ زبان عام فہم شگفتہ مگر مطالب نہایت وقیع و سنجیدہ۔ مقدمہ جدید کے اضافے کیساتھ۔ ڈھائی روپے

علمائے سلف و نابینا علماء

یہ کتاب علمائے سلف کے علمی ذوق و شوق کا وہ مصفا آئینہ ہے جسے دیکھکر دل مسرت اور فخر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ تاریخ کی بیسیوں ضخیم کتابوں کا عطر۔ تین روپے۔

موسم کی
تبدیلی کے
دنوں میں
صافی
استعمال کیجیے
صافی آپ کو خون کی خرابی سے
پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچائے گی
اور آپ کے نظامِ عصبی میں توازن
پیدا کرکے آپ کے جسم میں تازہ خون
کی لہر دوڑا دے گی۔ معدہ کے فعل
کو درست کرے گی اور جسم کو چُست
اور پُھرتیلا بنائے گی۔
SAF
THE GREA
BLOOD
PURIFIE
ہمدرد
دہلی - کانپور - پٹنہ

سے اپیل کرتے ہیں۔ یہ اپیل حلق سے نیچے نہیں اُترتی بلکہ کاسۂ سر کی چہار دیواری میں پھڑپھڑاتی رہ جاتی ہے۔

قیمت پانچ روپے۔ ناشر کا نام درج نہیں۔ نہ ملنے کا کوئی پتہ درج ہے۔ کاغذ سفید۔ جلد پر ڈسٹ کور۔

باب الصحت

روز بروز بڑھتی ہوئی کمزوری اور لاغری کا علاج

از حکیم عظیم زبیری

ہر وقت یا صبح و شام کمزوری، پستی، گراوٹ محسوس ہونے اور روز بروز بڑھتی ہوئی لاغری، ناتوانی کے چار ہی بنیادی سبب ہو سکتے ہیں۔

(۱) کسی ایسی عادت کا پڑجانا جو تندرستی کا ناس کرنے والی ہو (۲) کسی ایسے مرض کے چنگل میں پھنس جانا جو جسم کو کمزور ناتواں بناتا چلا جائے (۳) آلات ہضم کی کمزوری (۴) غذا کا قوت بخش جوہروں سے خالی ہونا۔

علاج و تدابیر۔ اگر کوئی عادت پڑگئی ہے جو تندرستی کا ناس کرنے والی ہو تو مضبوط قوت ارادی سے کام لے کر اس عادت کو چھوڑ دو۔ اور ان تمام افعال سے اپنے کو سختی کے ساتھ باز رکھو جو صحت اور زندگی کی بربادی کا سرچشمہ ہیں۔

اگر کسی ایسے مرض کے چنگل میں پھنس گئے ہو جو اندر ہی اندر جسم کو کھوکھلا اور کمزور بناتا جا رہا ہے اور روز بروز ناتوانی بڑھتی جا رہی ہے تو ایک سمجھدار اور ہوشمند انسان کی طرح اس مرض کا اصولی علاج کرو۔ اصولی طریقۂ علاج ہی کے ذریعہ کم مدت میں بگڑی تندرستی سنور سکتی ہے۔ کامیاب اور درست اصولی طریقۂ علاج کیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے میرے پتہ پر خط لکھ کر "محافظ شباب" مفت طلب فرمائیے۔

اگر آلات ہضم کمزور ہیں اور ان کی کمزوری کے باعث گھی، دودھ، مکھن، انڈا، پھل وغیرہ جو کچھ بھی غذا کھائی جاتی ہے وہ پورے طور پر ہضم ہو کر جزو بدن نہیں ہوتی۔ خون کم اور فضلہ زیادہ بنتا ہے جس کے نتیجہ میں باوجود عمدہ غذائیں استعمال کرنے کے روز بروز کمزوری بڑھتی جاتی ہے ایسی صورت میں قیمتی غذاؤں پر روپیہ برباد کرنے کی بجائے معدہ اور جگر کی اصلاح کرنے والی دواؤں پر پیسہ خرچ کرنا چاہئے۔

جوارش سنبل الطیب ایک ایسا یونانی مرکب ہے کہ اس کے استعمال سے معدہ۔ جگر اور آنتوں کی خرابیاں جلد دور ہو کر غذا جزو بدن ہونے لگتی ہے۔ پندرہ سال سے اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔

اگر آلات ہضم میں کوئی خرابی نہ ہو۔ بھوک اچھی محسوس ہوتی ہو۔ جو غذا کھائی جاتی ہو وہ ہضم ہو جاتی ہو۔ روزانہ فضلہ آسانی سے خارج ہو جاتا ہو۔ لیکن باوجود اس کے کمزوری، پستی اور گراوٹ محسوس ہوتی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غذا ان قوت بخش جوہروں سے خالی ہے جن کی جسم کو ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں ایسی غذائیں جن میں وٹامنز۔ کیلسیم۔ آئرن (فولاد) فاسفورس کافی مقدار میں ہوں۔ کھانی چاہئیں دودھ۔ مکھن۔ بالائی۔ انڈا۔ مچھلی۔ چوزہ مرغ کا شوربہ۔ انگور سیب اور دیگر مقوی پھل۔ ایسی غذائیت بخش غذائی اشیاء ہیں۔ لیکن اس گرانی کے زمانے میں ہر شخص قیمتی غذا استعمال نہیں کر سکتا اس لئے طاقت کو برقرار رکھنے اور روز بروز بڑھتی ہوئی لاغری و کمزوری کو روکنے کے لئے کوئی "ٹانک" ضرور استعمال کرنا چاہئے تاکہ وہ غذائیت بخش اجزاء کی کمی کو پورا کرتا رہے۔

"توانائی" ایسا جنرل ٹانک ہے جس کے استعمال سے جسم کو کافی غذائیت مل جاتی ہے۔ یہ جنرل ٹانک زبیری یونانی دواخانہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے کہ اپنی صحت اور اپنا پیسہ ہی وقت پر کام آتا ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ کوئی کسی کا ساتھ بغیر غرض و مطلب کے نہیں دیتا۔ پس اپنی صحت کی حفاظت کیجئے۔ بگڑی تندرستی کو سنواریئے اور ہمیشہ اصولی علاج کیجئے تاکہ پیسہ برباد نہ ہو۔ فقط۔

حسن یقین

ایک حجازی عالم کے ایمان افروز فرمودات کی تلخیص سلیس و شگفتہ اُردو میں اسلامی اقدار و عقائد کی دلپذیر حکیمانہ تفہیم و تشریح۔ قیمت مجلد سوا روپیہ

خلقِ مسلم

حضرت امام غزالیؒ کی مفید ترین عربی تالیف کا اُردو ترجمہ۔ اسلام کے پسند فرمودہ اخلاقی آداب و اطوار کی ایمان افروز تفصیل۔ قیمت پانچ روپے۔ کاغذ رف

بلاغ المبین

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی ایک بیش بہا کتاب کا اُردو ترجمہ۔ جو بدعت کے رد، سنت کے اثبات اور عقائد صحیحہ کی توضیح میں نہایت اعلیٰ ہے۔ کاغذ رف مجلد چار روپے

عمرو بن العاصؓ

اس صحابی رسولؐ فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستانِ حیات جسے خود اللہ کے رسولؐ نے مومن اور اسلام کے خطاب سے نوازا بیحد دلچسپ اثر انگیز اور مستند۔ مجلد دو روپے

فسادات جبلپور اور اس کے بعد

حال ماضی کی قبر میں دفن ہو جاتا ہے لیکن اس سے سبق حاصل کرنا جبھی ممکن ہے کہ وہ حافظے کی سطح پر زندہ رہے۔ یہ کتاب اسی امکان کو پائندہ رکھنے کی ایک مؤثر، سنجیدہ اور فکر انگیز کوشش ہے۔ دو روپے
انگریزی ایڈیشن۔ سوا روپیہ۔

مسلم یونیورسٹی اور جارحانہ فرقہ پرستی

ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور جان و مال پر جو یورشیں ہیں ان کا مبصرانہ جائزہ اور ممتاز لوگوں کے فرمودات پر نقد و تبصرہ۔ ڈھائی روپے۔

فارابی

تالیف: عباس محمود (مصری) ترجمہ: رئیس احمد جعفری
معلم ثانی حکیم ابونصر فارابی کے فضل و کمال، شخصیت، حالات و سوانح، علمی مقام اور تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل اور مستند حالات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

تلبیس ابلیس

علامہ ابن جوزیؒ کی شہرہ آفاق کتاب مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کی نشاندہی۔ مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد کا بیان۔ مجلد دس روپے۔

عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ

بدر و اُحد اور دورِ رسالت کی دوسری جنگوں کے نہ صرف محققانہ حالات، بلکہ فوٹو اور نقشے بھی۔ اس کے مؤلف مشہور استاذ قانون ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ۔

خطباتِ مدراس

سیرت کے موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی کے مشہور ترین خطبات جو اپنا جواب آپ ہیں۔
مجلد ساڑھے تین روپے

نصرة الحدیث

فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک معرکۃ الآراء کتاب۔ ہر واہی الزام اور پروپیگنڈے کا مدلل رد۔ زبان عام فہم شگفتہ مگر مطالب نہایت وقیع و سنجیدہ۔ مقدمہ جدیدہ کے اضافے کیساتھ۔ ڈھائی روپے

علمائے سلف و نابینا علماء

یہ کتاب علمائے سلف کے علمی ذوق و شوق کا وہ مصفا آئینہ ہے جسے دیکھ کر دل مسرت اور فخر سے لبریز ہو جاتا ہے تاریخ کی بیسیوں ضخیم کتابوں کا عطر۔ تین روپے۔

موسم کی
تبدیلی کے
دنوں میں
صافی
استعمال کیجیے
صافی آپ کو خون کی خرابی سے
پیدا ہونے والی بیماریوں سے بچائے گی
اور آپ کے نظامِ عصبی میں توازن
پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ خون
کی لہر دوڑا دے گی۔ معدہ کے فعل
کو درست کرے گی اور جسم کو چست
اور پھرتیلا بنائے گی۔
SAFI
THE GREAT
BLOOD
PURIFIER
ہمدرد
دہلی - کانپور - پٹنہ

Only Tytle Printed at Pradeep Printing Press, Deoband

ایڈیٹر: عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs 7. 62 nP.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلّی دیوبند

شمارہ نمبر ۹ — جلد نمبر ۱۴

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے - فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۰ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے)

شد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے - یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں - اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ ۶۲ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائینگے۔

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں سالہ جاری ہوجائیگا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۲ء

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

دفتر تجلّی - دیوبند - ضلع سہارنپور (یو-پی)

مدیر عامر عثمانی فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:- مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی کراچی (پاکستان)

آغازِ سخن

آج کی گفتگو سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے تجلی جولائی ۶۲ء کا سوال و جواب ۶ پیش نظر رکھئے۔ اس میں زکوٰۃ کے ایک خاص جزئیے کا تذکرہ تھا۔

فاضل مدیر زندگی نے اس پر نقد کرتے ہوئے سب سے پہلے بعض کتب فقہ کی عبارات نقل کی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ سونا اور چاندی میں بہرصورت زکوٰۃ لازم ہوگی حنفیہ کے اصول کو قاعدہ کلیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ معروف جملہ سامنے لائے ہیں۔

لانھما خلقتا اثمانًا	اسلئے کہ سونا اور چاندی ثمن بناکر
فیزکیھما کیف کانا	پیدا کئے گئے ہیں لہٰذا صاحب مال
+ + + +	ان دونوں کی زکوٰۃ ادا کریگا یہ دونوں
+ + + +	جس شکل میں موجود ہوں۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ کسی بھی مطلق اور عام فقرے میں سے وہ چیزیں یقیناً مستثناء ہو جایا کرتی ہیں جن کا استثناء دوسرے اصول و کلیات کا مقتضیٰ ہو۔ مثلاً اسی اصولی فقرے میں یہ تقیید بالکل نہیں کہ یہ سونا چاندی بقدر نصاب ہونا چاہئے مگر سب جانتے ہیں کہ نصاب سے کم مقدار پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح وہ سونا چاندی بھی اس سے خارج سمجھے جائیں گے جو کسی نابالغ کی ملکیت ہوں خواہ ان کی مقدار سیروں اور منوں ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بعض لطیف پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے کسی خاص جزئیے میں زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا حکم لگایا جائے تو یہ متذکرہ قاعدہ کلیہ اور کتب فقہ کے دیگر متون اس میں مانع نہ ہوں گے۔

اس تصریح کے بعد ایک خاص بات ہم یہ عرض کر دیں کہ فقہی مسائل میں ہماری حیثیت مقلد کی ہے۔ ہم اپنے کو فقہی اجتہاد کا اہل نہیں پاتے اس لئے کسی فقہی مسلک کی تائید یا تردید میں استدلال تو ہم اپنے علم و فہم کے ذریعے کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن اصلاً اس کو اختیار کرنا یا اختیار نہ کرنا تقلید ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ ماضی قریب کے علماء میں ہمارا زیادہ ذہنی تعلق مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ زیر بحث جزئیہ چونکہ درمختار اور عالمگیری جیسی کتب میں ہمارے ہاتھ نہ آسکا اس لئے مولانا اشرف علیؒ کے امداد الفتاویٰ میں تفحص کیا۔ اس میں بھی خاص یہ جزئی تو ملی نہیں مگر دو فتوے ایسے مل گئے جن پر ہماری دانست میں اس جزئیے کے فیصلے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔

پہلا جواب تو وہ ہے جو کتاب الزکوٰۃ والصدقہ میں سوال ۶ کا دیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ سونا چاندی کے ساتھ اگر کسی اور دھات کو گلا کر ملا دیا گیا ہو تو فقہاء نے کہا ہے کہ غالب کا اعتبار ہے۔ یعنی دوسری دھات مقابلۃً کم ہے تو پورا زیور سونے چاندی ہی کا مانا جائے گا اور کُل وزن پر زکوٰۃ عائد ہوگی اور اگر دوسری دھات زیادہ ہے تو پورا زیور اسی دھات کا مانا جائے گا سونے چاندی کا اعتبار نہیں ہوگا۔ الفاظ یہ ہیں۔

"اگر غالب ذہب یا فضّہ ہو تو مجموعے کو سب احکام میں ذہب و فضہ کہا جائیگا اور اگر غالب دوسری چیز ہے تو مجموعے کو دوسری چیز کے حکم میں کہیں گے اس میں جس قدر ذہب و فضہ ہے اس میں بھی احکام

ذہب و فضہ کے جاری نہ ہوں گے۔ نہ اس پر زکوٰۃ ہوگی۔" (امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ مطبوعہ کراچی)

دوسرا جواب اس کے متصل بعد ہی سکّوں سے متعلق ہے۔ سائل نے ایسے سکوں کے بارے میں سوال کیا ہے جن میں چاندی دوسری دھاتوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ یعنی فقہی اصطلاح میں کھوٹ غالب ہوتا ہے۔ سائل نے کہا کہ کھوٹ غالب ہونے کے باعث انھیں چاندی کا تو مان نہیں سکتے جو زکوٰۃ آئے۔

اس پر حکیم الامۃؒ نے جواباً تسلیم کیا ہے کہ:-

"غلبۂ غش (کھوٹ) سے ذہب یا فضہ ہونے کی نفی صحیح ہے۔"

ان دونوں جوابوں سے واضح ہے کہ اگر کھوٹ غالب ہو تو مغلوب چاندی سونے کو کالعدم قرار دیں گے۔ انصاف بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب سونا چاندی غالب ہونے کی صورت میں کھوٹ کو کالعدم قرار دیکر پورے زیور کو مع کھوٹ سونا چاندی ہی کا تسلیم کیا جاتا ہے تو برعکس صورت میں سونے چاندی کو بھی کھوٹ کے حکم میں شامل کر کے زکوٰۃ سے فارغ سمجھا جائے۔

گوٹے ٹھپّے کے متعلق تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ چاندی کے تار اس میں خالص نہیں ہوتے، بلکہ غالب حصّہ کھوٹ کا ہوتا ہے جسے چاندی ہی کے ساتھ گلا کر آمیز کیا جاتا ہے اس صورت میں ہمیں یہی صحیح معلوم ہوا کہ حکیم الامۃؒ کی تصریح کے مطابق چاندی کو کالعدم مانیں اور کالعدم مان لیا تو اس کو زیوروں کے ساتھ ملا کر نصاب پورا کرنے کا سوال آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جس صورت میں گوٹے ٹھپے میں بجائے خود چاندی بقدر نصاب موجود ہو تو کھوٹ غالب ہونے کے باوجود ہم کیوں اس میں زکوٰۃ کا وجوب مانتے ہیں اس کی وجہ وہی ہے جسے ہم نے اپنے جواب میں ذکر کیا تھا یعنی مقدار اور حیثیتِ مستقلہ کا احکامِ شرعی میں معتبر ہونا۔ ایک من بھر کی دیگ اس طرح بنوائی جائے کہ سیر بھر سونا اور ۳۹ سیر تانبا پیتل آمیز کیا گیا ہو تو کھوٹ غالب ہونے کے باوجود اس سیر بھر سونے کو کالعدم نہیں مانا جائے گا۔ کیونکہ یہ بجائے خود اس مقدار سے متجاوز ہے جس کو شریعت نے زکوٰۃ سے بری مانا ہے اور اسے مستقل حیثیت دینے میں کوئی شے مانع نہیں۔ لیکن سونا صرف ۲ تولہ اور باقی سب تانبا پیتل ہو تو اس قلیل اور نصاب سے کم مقدار کو سونے چاندی کے زیوروں میں ضم کرنا آئینی توازن کے خلاف ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فاضل مدیر نے سونا چاندی کو ضم کرنے کے ذیل میں فرمایا ہے کہ:-

"ایسے سکے جن میں چاندی سونا کم اور کھوٹ زیادہ ہو عروض میں داخل ہیں۔"

ہم علی الاطلاق اسے بھی درست نہیں سمجھتے۔ بازار میں جو روپیہ رائج ہے اس میں چاندی تو برائے نام ہی ہوگی سارا کھوٹ ہی کھوٹ ہے۔ پھر بھی اسے "سامان" (عروض) نہیں کہیں گے۔ یہ تو "مال" ہے اور جب مال ہے تو موصوف کا یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ:-

"اگر وہ بازار میں رائج ہیں یا ان کی تجارت مقصود ہے تو قیمت دیکھی جائے گی۔ اگر ان کی قیمت چاندی کے نصاب تک پہنچ جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔"

جو سکّے بازار میں رائج ہیں ان کی زکوٰۃ کا تعلق اس چاندی سے ہرگز نہیں ہے جو ان میں پائی جاتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر تو آج کے رائج شدہ پانچسو روپوں پر بھی زکوٰۃ نہیں عائد ہو سکتی۔ کیونکہ اتنوں میں سے بھی خالص چاندی بقدر نصاب شاید ہی نکلے۔ مروجہ سکوں پر زکوٰۃ ان کی متعینہ مالیت پر ہے نہ کہ چاندی اور سونے کے لحاظ سے چنانچہ ان سو روپوں پر بھی حولان حول کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جن میں چاندی چاہے دس تولہ بھی نہ ہو۔

رہے وہ سکّے جو فقہی اصطلاح کے مطابق نہیں بلکہ عام

اصطلاح کے مطابق کھوٹے ہوں تو چونکہ وہ بازار میں سکے کی حیثیت سے نہیں چل سکتے اس لئے انھیں "عروض" میں داخل کیا جائیگا اور ان کی وہی قیمت معتبر ہوگی جتنے میں وہ فروخت ہو سکتے ہوں ان میں اگر چاندی یا سونے کی کوئی مقدار موجود ہے تو اسے دوسرے زیور کے ساتھ ملا کر حساب کرنے کی رائے دینے میں فقہاء اسلئے حق بجانب ہیں کہ کھوٹے سکوں کو روکے رکھنے کا مطلب ایسی ہی شے کو روکے رکھنا ہے جس کا کوئی مصرف سوائے فروخت کردینے کے نہیں ہے۔ مگر گوٹے ٹھپے کو اس پر قیاس کرنا اس لئے موزوں نہیں کہ اس کا مصرف زیب وزینت ہے۔ جائز زیب و زینت جسے اسلام نے منع نہیں کیا ہے —— جب معلوم ہے کہ لاکھوں روپے کا مکان بھی حکم زکوٰۃ کا مورد نہیں اگر اسے کرائے پر چلایا جا رہا ہو تو اور تجارت کی نیت نہ ہو۔ تو معلوم ہوا کہ مصرف بدلنے سے بھی احکام بدل سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم قیاس کرتے ہیں کہ مصرف اور نیت پر نظر کرتے ہوئے کھوٹے سکوں[1] میں پائے جانے والے سونے چاندی کو زیور کے ساتھ ملا لینا چاہیئے چاہے وہ کتنی ہی قلیل مقدار میں ہو۔ لیکن مصرف اور نیت بدل جانے کی وجہ سے گوٹے ٹھپے کی قلیل سی چاندی یا سونے کو زیور میں ضم کرنا ضروری نہیں قرار دینا چاہیئے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

عاجز نے اپنے جواب میں کہا تھا کہ احتیاط اور تقوے کا تقاضا تو یہی ہے کہ زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ اس پر فاضل مدیر نے فرمایا ہے

"وہ (عاجز) بعض جلیل القدر فقہاء کے احناف کے اس قول سے واقف ہوں گے کہ عبادات میں احتیاط واجب ہے۔"

عاجز کی رائے یہ ہے کہ فقہاء کے اس قول کا حوالہ برمحل نہیں دیا گیا۔ یہ قول اتنا غیر محدود نہیں ہے کہ ٹھیٹ قانونی بحث میں بھی کار آمد ہو سکے۔ وضو میں احتیاط کا تقاضا ہے کہ منھ کو پانچ سات مرتبہ دھویا جائے۔ ہاتھ پیروں پر میل ہو تو اسے بھی مل کر چھڑایا جائے۔ مگر اس احتیاط کو واجب کون کہہ سکتا ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اگر صدقہ فطر مثلاً چودہ آنے بیٹھتا ہے تو ایک روپیہ دیدیا جائے۔ گیہوں ایک سیر پندرہ چھٹانک بنتا ہے تو دو سیر صدقہ کیا جائے مگر کیا کوئی بھی فقیہ قانون کی ٹھوس بحث میں اس زیادتی کو وجوب کی فہرست میں رکھے گا؟

چاندی کا مشہور نصاب ۵۲ تولہ ہے۔ احتیاط اسمیں تھی کہ زکوٰۃ پچاس اور اکیاون تولے پر بھی عائد ہوتی اور محتاط لوگ اتنی معمولی کمی کی صورت میں عملاً زکوٰۃ ادا بھی کرتے ہیں، لیکن کیا مفتی بھی یہ فیصلہ دے سکے گا کہ پچاس یا اکیاون تولہ چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے؟۔

منشاء یہ عرض کرنا ہے کہ فقہاء کے منقولہ ارشاد کا محل اور ہے جس کا زیر بحث موضوع سے تعلق نہیں ہے۔ احتیاط اپنی جگہ ہے۔ قانون اپنی جگہ۔

موصوف نے فرمایا کہ:۔

"فقہ حنفی کے لحاظ سے چاندی سونے میں بہر صورت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے چاہے ان کی حیثیت مستقل ہو یا نہ ہو۔"

ہمیں یہ تعمیم واطلاق تسلیم نہیں۔ دو تولے سونے پر کوئی حنفی زکوٰۃ کا قائل نہیں چاندی پچاس تولہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ نابالغ ہزار من سونے کا وارث بنے وہ بھی زکوٰۃ سے مبریٰ ہے۔ ایسی صورت میں ماننا پڑیگا کہ وجوب زکوٰۃ کیلئے وہ شرائط بہر حال ملحوظ رکھنے ہوں گے جو معتبر اصول یا قیاس صحیح سے مستفاد ہوں۔ قرآن نے علی الاطلاق —— کوئی نصاب بتائے بغیر زکوٰۃ کو فرض کیا لیکن اللہ کے رسول ؐ نے ہر قسم کے اموال میں حدیں مقرر کیں کہ جب مال ان تک پہنچ جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اس سے پہلے واجب نہ ہوگی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حدوں کی تشخیص وحی خفی کی روشنی میں ضرورت اور زائد از ضرورت کے فرق کی بنیاد پر کی گئی نیز اس میں کسی شے کے نامی ہونے نہ ہونے (نشو ونما اور نفع خیزی کی صلاحیت رکھنے نہ رکھنے) کا بھی لحاظ رکھا گیا اور نیت کو بھی اہمیت دی گئی۔

---

[1] کھوٹے اس معنی میں کہ بازار میں نہ چل سکتے ہوں نہ کہ فقہی اصطلاح میں ۱۲ +

یہ ہماری اُپج نہیں ہے۔ ائمہ معتبر کے مسالک اس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً مالکیہ کے نزدیک جائز قسم کے زیورات اور جہاد کے لئے رکھی گئی تلوار کے طلائی دستے اور سونے کے دانت یا ناک پر ایسی حالتوں میں زکوٰۃ نہیں ہے جب کہ وہ اپنے مطلوبہ استعمال میں ہوں یا استعمال کے لئے بالکل ٹھیک حالت میں ہوں۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ ضرورت اور عدم ضرورت کو زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب میں مؤثر مانا گیا۔

حنابلہ بھی اُن حلال زیوروں میں زکوٰۃ نہیں مانتے جو استعمال میں ہوں۔

شوافع بھی اصلاً اسی مسلک پر ہیں۔ یہ ضرور فرق ہے کہ ان کے نزدیک ایسے زیور پر زکوٰۃ عائد ہو جائے گی جو حدودِ اسراف میں پہنچ گیا ہو۔ گویا زیورات کی غیر مسرفانہ مقدار ان کے یہاں بھی زکوٰۃ سے بری ہے۔

کیا یہ مسالک ایک زیرک فقیہ کو یہ رہنمائی نہیں دیتے کہ زکوٰۃ کا تعلق ضرورت اور فاضل از ضرورت کے پہلوؤں سے بہت گہرا ہے۔ خصوصاً زیور کے ساتھ "جائز" کی شرط عائد کرنے پر اِن ائمہ کا متفق ہونا اس خیال کو اور بھی مضبوط کرتا ہے کہ ضرورت اور "بے ضرورت" کے پہلو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عورتوں کے لئے زیور ایک ضرورت ہے۔ ایسی ضرورت جو اسلامی نقطۂ نظر سے صرف مباح ہی نہیں مستحسن بھی ہے۔ لہٰذا مذکورہ تینوں فقہی گروہوں نے اس ضرورت کا لحاظ کرکے زکوٰۃ کا نفاذ نہیں کیا۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن و سنت میں بھی اس لحاظ کی گنجائش موجود ہو۔ مَردوں کے لئے زیور حرام ہے اس لئے ان پر انھوں نے زکوٰۃ واجب مانی۔ حرام شے کے فاضل اور بے ضرورت ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ جہاد عبادت ہے۔ جہاد کے لئے تیار کی ہوئی تلوار کے طلائی قبضے کو ضرورت ہی کی بنیاد پر خارج از زکوٰۃ کیا گیا کہ وسائل عبادت بھی ضروریات ہی میں شامل ہیں۔ اسراف حرام ہے۔ لہٰذا شوافع نے صرف اُن زیوروں پر زکوٰۃ مانی جو داخلِ اسراف ہوں۔

یہ تو ضرورت اور عدم ضرورت کا معاملہ ہوا۔ اب نیت کی اثر اندازی دیکھئے کہ کئی سو روپے کے برتن آپ کے پاس موجود ہوں مگر نیت تجارت کی نہ ہو تو ان پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ نیت تجارت کی کرلیں تو زکوٰۃ عائد ہو جائے گی۔ مکان ہوں۔ پورے کا پورا گاؤں ملکیت میں ہو۔ صرف نیت ہی پر ان کے لائق زکوٰۃ ہونے نہ ہونے کا انحصار ہے۔

تیسری شے کسی چیز کا نامی ہونا ہے۔ سونا اور چاندی صلاحیتِ نمو میں اعلیٰ تر مانے گئے ہیں اسی لئے ان پر اس صورت میں بھی زکوٰۃ عائد کی گئی جب کہ یہ کاروبار کے لئے استعمال نہ کئے جا رہے ہوں اور زیورات کو "عروض" ہونے کے باوجود "عروض" کی فہرست سے خارج کرکے نقد مال کی فہرست میں شامل کرنا اسی لئے ہے کہ وہ بہرحال نفع خیزی اور نمو کی صلاحیت سے کسی وقت عاری نہیں ہوتے۔

لیکن سونے چاندی کو نقدین ماننے اور ان کے بارے میں اتنا محتاط معاملہ کرنے کے باوجود آپ کو خبر ہے کہ متعینہ مقدارِ نصاب کو پہنچے بغیر ان پر زکوٰۃ کا لزوم نہیں ہوتا۔

کیوں؟ کیا اس کی حکمت اور کُنہہ پر ہمیں غور نہیں کرنا چاہیئے —— عاجز تو غور کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ شریعت اُس قلیل مال و منال پر —— خواہ وہ سونے چاندی کی شکل میں ہو یا برتنوں اور مکانوں کی صورت میں زکوٰۃ عائد کرنا نہیں چاہتی جو ضرورت سے زیادہ نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ ہونے نہ ہونے کا معیار بھی اس نے نصابوں کی شکل میں معیّن کر دیا ہے۔ بعض ضرورت سے زائد اموال پر بھی وہ اُس صورت میں زکوٰۃ واجب کرنا نہیں چاہتی جب کہ ان سے کاروباری انتفاع کی نیت نہ ہو جیسے مکان۔ پہننے کے کپڑے۔ فرنیچر۔ برتن وغیرہ۔ ان چیزوں کی قوتِ نمو ضعیف ہے اس لئے ان کی زکوٰۃ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ ان کا مالک انھیں کاروبار میں لگا کر اس ضعف کو قوت میں تبدیل کرنے کی سعی کرے۔

اب عورتوں کے گہنے ٹھپے پر نظر ڈالئے۔ ذکر اُن عورتوں کا نہیں جن کے پاس بے شمار رسچا گوٹہ ٹھپہ ہے۔ اُن عورتوں کا ہے جن کے پاس زیور تھوڑا اتنا کم ہے کہ نصاب کو نہیں پہنچتا

اور سچا گوٹہ بھی بس اتنا ہی ہے کہ اس میں بقدر نصاب چاندی نہیں۔ اب یہ حکم لگانا کہ وہ دونوں کو ملا کر نصاب پورا کریں، اُس اسپرٹ اور کُنہ کے مطابق نہیں معلوم ہوتا جس کی تفصیل عرض کی گئی۔ سونے چاندی جیسی قوتِ نامیہ اس گوٹے والی چاندی میں کہاں دھری ہے جب کہ اسے بہت سے کھوٹ میں ملا کر استعمال کیا گیا ہے۔ ویسے بھی سب جانتے ہیں کہ گوٹہ بیچنے بیٹھیں تو قیمت خرید کا نصف بھی ہاتھ نہیں آتا اسی لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ اس چاندی کے ساتھ کاروباری انتفاع کی نیت منسوب ہو سکے۔ پھر اتنے قلیل گوٹے ٹھپے سے وہ توقعات بھی کوئی وابستہ نہیں کرتا جو زیور سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ یعنی اڑے وقت میں کام آنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس چاندی پر اُس بھرپور معنویت کے ساتھ "نقد" کا اطلاق نہیں ہوتا جو مستقل حیثیت والے سونا چاندی میں پائی جاتی ہے۔

ان وجوہ کو اختصار کے ساتھ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑے سے گوٹے ٹھپے کی قلیل سی کھوٹ زدہ چاندی میں نہ تو وہ قابل لحاظ قوتِ نمو ہے جو سونے چاندی کی فطری خصوصیت سمجھی گئی ہے۔ نہ اُس سے کاروباری انتفاع ممکن ہے سوائے اس کے کہ جسطرح آپ گھر کا ہانڈی برتن بیچکر کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح اس گوٹے ٹھپے کو فروخت کر کے چند پیسے وصول کر سکتے ہیں۔ یہ انتفاع نہیں بلکہ خسارے کا سودا ہوگا۔ نہ اس کے ساتھ کسی ایسی نیت کو وابستہ کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے جو فاضل جمع پونجی کے ساتھ قدرتاً وابستہ ہو جاتی ہے۔

پھر آخر کس بنیاد پر یہ واجب قرار دیا جائے گا کہ یہ چاندی زیور والے سونا چاندی کے ساتھ ملا کر نصاب شمار کیا جائے اور اس پر زکوٰۃ دی جائے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ زکوٰۃ پاکیزہ تر شے ہے۔ اس کے نکالنے میں کبھی کوئی نقصان نہیں۔ غیر واجب حالتوں میں بھی نکالدی جائے تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن تقوے اور جذبۂ خیر کی یہ اسپرٹ اگر نصاب سے کم سونے چاندی پر زکوٰۃ واجب نہیں کرتی تو ایک غریب عورت کے اُس گیٹے ٹھپے کی قلیل سی چاندی کو کیسے "نقد" کی حیثیت دیگی جب کہ سچا گوٹہ خریدنے میں عورتوں کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کالا نہیں پڑے گا۔ زینت بنی رہیگی۔ سچا گوٹا چاندی کی خاطر نہیں خریدا جاتا۔ چاندی تو تبعاً آتی ہے اور اتنی ضعیف صلاحیت نمو لیکر آتی ہے کہ اسے کالعدم قرار دیدیں تو ناروا نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف سونے چاندی کے زیوروں کے خریدنے یا تیار کرانے میں تنہا زینت اور کالا نہ پڑنے کی خصوصیت ملحوظ نہیں ہوتی بلکہ یہ نیت، تصور، یقین بھی شعوری اور لاشعوری دونوں اعتبار سے موجود ہوتا ہے کہ ہماری نقدی ہمارے پاس رہی۔ ہمارا زیور اڑے وقت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔ وہ روپے پیسے ہی کی طرح نقد دولت ہے۔

فاضل مدیر نے کتابوں اور برتنوں پر بنے ہوئے چاندی سونے کے ٹھپّوں اور نقش و نگار پر زکوٰۃ واجب ہونے کو بطور استدلال پیش کیا ہے کہ جب ان پر زکوٰۃ ہے تو گوٹے ٹھپے پر بدرجۂ اولیٰ ہوگی۔

عاجز عرض کرتا ہے کہ کتابوں اور برتنوں پر چاندی سونا چڑھانا اور اس کے گل بوٹے بنانا قطعاً غیر ضروری بلکہ اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ فعل ہے۔ لہٰذا اُسی ضرورت اور عدم ضرورت کی حکمت سے جس نے مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ کو غیر جائز زیور پر زکوٰۃ عائد کرنے کا ادّعا دیا اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہونی اور ضرور ہونی چاہیئے۔ کیا حق ہے ہمیں کہ سونے اور چاندی جیسی نامی شے کو لایعنی مصرف میں کھپا دیں۔ لایعنی نہ سہی اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ کتابوں اور برتنوں پر سونا چاندی کھپانا شوق پورا کرنے کے سوا کوئی افادیتِ شرعیہ نہیں رکھتا۔ فالتو ہی دولت ہوگی اس کے پاس جو یہ شوق پورا کرے گا لہٰذا زائد از ضرورت ہونے کا پہلو اس پر زکوٰۃ عائد کر دے گا۔

اس کے برعکس زیب و زینت کرنا اور سجیلے کپڑے پہننا عورت کا جائز حق ہے جسے بعض قیود کے ساتھ اسلام مستحسن ـــــ بلکہ بعض حالتوں میں ضروری قرار دیتا ہے۔ ایک غریب عورت دس بیس روپے کا سچا گوٹہ ٹھپہ خرید کر ملبوس پر ٹانک لیتی ہے تو یہ مدِّ فضول نہیں ہے۔ اسراف بھی نہیں ہے۔ ذہنی عیاشی بھی نہیں ہے۔ ضرورت ہے۔ ایسی ضرورت جس کے ضرورت

ہونے پر شہوریت کی غیر تصدیق ہے۔ اس کے برخلاف کتابیں اور برتنوں کو سونے چاندی سے لیپنا ذہنی عیاشی ہے۔ غیر ضروری ہے دولتمندی کی دلیل قوی ہے۔

ہم نے اگر اپنے جواب میں ازراہِ اختصار مستقل اور غیر مستقل کے الفاظ سے ان تفصیلات کو سمیٹ لینا چاہا تھا جو اب پیش کیں تو اس پر فاضل مدیر کا یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ :-

"مستقل وغیر مستقل کی جو بحث کی ہے وہ فقہائے احناف کی تصریحات کے خلاف ہے بلکہ باب زکوٰۃ میں تمام ائمہ کے مسلک کے خلاف ہے۔"

یہ بڑا بھاری الزام ہے۔ ہم اور تمام فقہاء کے خلاف زبان کھولیں۔ العیاذ باللہ۔ ہم تو اکیلے فقہائے احناف کے خلاف بھی جانا اپنے بس کا روگ نہیں سمجھتے چہ جائیکہ تمام فقہاء لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقط الفاظ کی حد تک "مستقل اور غیر مستقل" کی قید کو ایک ایسی قید کہا جا سکتا ہے جو ان الفاظ میں فقہاء کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ نہ پائے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اُن بنیادی عِلل وحِکَم کا انکار کرتے ہیں جن کی تعبیر ہم نے صحیح یا غلط طور پر مستقل اور غیر مستقل کے الفاظ سے کی۔ تینوں مکاتبِ فقہیہ کی آراء ہم نقل کر آئے۔ یہ تینوں ضرورت اور نیت کو زکوٰۃ کے مسئلہ میں دخیل مانتے ہیں اور فقہائے احناف بھی اس کا انکار نہیں کرتے۔ رہا کھوٹے سکّوں کے مغلوب سونے کو دوسرے طلائی سامان میں ضم کر کے زکوٰۃ نکالنے کا مسئلہ اور اس سے زیر بحث جزئیے پر استدلال تو ہم عرض کر ہی آئے ہیں کہ یہ استدلال درست نہیں۔ کھوٹے سکے جو شخص روکے گا وہ ایسا مال روکے گا جس کا کوئی مصرف سوائے بیچ دینے کے نہیں۔ بیچ کر نقد کر لیا جائے تو نقد کی زکوٰۃ کے احکام جاری ہوں گے اور مان لو اس خیال سے روک کر رکھا جائے کہ ان میں سونا چاندی یا دوسری دھاتیں جو بھی ہیں ان کی قیمت عنقریب چڑھنے والی ہے تو یہ قصد و نیت ہی اسے زکوٰۃ کا اہل بنا دیں گے۔ اس کے برخلاف گوٹے ٹھپے کا معاملہ یہ نہیں۔ اس کی حیثیت سامانِ زینت کی ہے۔ اسے روکے رکھنا کاروباری قصد و نیت اور خیالِ انتفاع سے ادنیٰ سا واسطہ بھی نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ کھوٹے سکّوں کے سونا چاندی کو مستقل حیثیت دینے کا لازمی مطلب گوٹے ٹھپے کی قلیل سی چاندی کو بھی مستقل حیثیت دینا ہے عاجز کے خیال میں درست نہیں ہے۔ ہمیں ایسا کوئی جزئیہ فقہ حنفی میں دکھا دو جس میں گوٹے کی مغلوب، قلیل اور تقریباً غیر نامی چاندی جیسی کسی شے کو مستقل حیثیت دیکر دوسرے زیورات سے ضم کرنے کا فیصلہ دیا گیا ہو تو ہم اپنے خیال سے دست برداری دیدیں گے۔

موصوف نے فرمایا :-

"جن ائمہ نے زیورات میں عدم زکوٰۃ کا قول اختیار کیا ہے ان کا قول دلیل کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اس لئے ایک ایسے قول سے مسلک حنفی کے خلاف تائید حاصل کرنا کسی جہت سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر دوسرے ائمہ کا مسلک قوی ہوتا جب بھی یہ بات درست نہ تھی چہ جائیکہ وہ مسلک ہی ضعیف ہے۔"

اولاً تو یہی ابھی تک غیر ثابت ہے کہ ہم مسلک حنفی کے خلاف تائیدوں کے متلاشی ہیں۔ اگر ثابت ہو جائے کہ زیر بحث جزئیے میں زکوٰۃ کا وجوب مسلک حنفی کی رو سے ہوتا ہے تو ہمارا کیا مقام ہے کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکیں۔

ثانیاً کسی حنفی کے نزدیک دوسرے فقہاء کا مسلک کمزور ہے تو اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ تینوں مکاتبِ فکر جس بنیاد پر متفق ہیں ہم اس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں اور ان کے اتحادِ فکری کو ذرہ برابر اہمیت نہ دیں۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ دوسرے ائمہ کے مسلک ضعیف کیوں ہیں؟ مقلد کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے امام اور اپنے مجتہدین کے فقہی مسالک کو آنکھیں بند کر کے مضبوط اور ہر مخالف مسلک کو بلا تامل ضعیف مانے۔ لیکن ہم نے اِن جلیل القدر اربابِ تفقہ کے مسالک سے مسلک حنفی کے خلاف تائید حاصل کرنے کی جسارت نہیں کی ہے، بلکہ ان سے اُس خاص جزئیے میں مسلک حنفی متعین کرنے کی کوشش کی ہے جس کی تفصیل یہیں اور خود

فاضل مدیر کو بھی حنفیہ کی کتب میں نہ مل سکی۔

موصوف نے ہمارے ایک قیاس پر شدید اظہار حیرت کرتے ہوئے فرمایا :-

"وجوب و عدم وجوب زکوٰۃ میں بالاصل اور بالتبع کے فرق کو مؤثر کسی امام نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی امام وقت اس فرق کو مؤثر مان لیتا تو ہزاروں اور لاکھوں تولے چاندی اور سونے سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی۔"

فدوی عرض کرتا ہے اس اصولِ فقہاء کو تو خود موصوف تسلیم کرتے ہیں کہ سونے کے زیور میں کھوٹ ملا ہوا ہو مگر سونے سے کم ہو تو غالب پر حکم کل کا لگے گا یعنی اس کھوٹ کو سونے ہی میں شمار کر کے زکوٰۃ دی جائے گی۔

تو کیا آئینی عدل وہی نہیں ہے جسے مولانا اشرف علیؒ نے اپنے جواب میں ظاہر فرمایا یعنی زیور میں کھوٹ زیادہ اور سونا کم ہو تو کل پر کھوٹ کا حکم لگایا جائے بشرطیکہ یہ مغلوب سونا بجائے خود حدِ نصاب کو پہنچا ہوا نہ ہو۔

جہاں تک عاجز کو معلوم ہے کسی مفتی نے رولڈ گولڈ کی اشیاء میں پائے جانے والے سونے اور چاندی کے اجزاء کو دوسرے ملوکہ سونے چاندی میں شامل کر کے زکوٰۃ کا فتویٰ نہیں دیا، حالانکہ سونا اور چاندی بالتبع رولڈ گولڈ کی تمام اشیاء میں، نِکل پالش کے سامان میں اور عمدہ قلموں کی نبوں تک میں پایا جاتا ہے۔ سونے چاندی کی اس مقدار کو کالعدم قرار دینا اگر بالاصل اور بالتبع کا فرق تسلیم کرنا نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ ہمیں کسی امام کا قول دکھایئے کہ اس نے شریعت کی تصدیق کردہ اشیائے ضرورت میں بالاصل اور بالتبع کے فرق کو نظرانداز کر کے سونے اور چاندی کی قلیل سے قلیل اور مغلوب سے مغلوب مقدار پر بھی سونے اور چاندی ہی کا حکم لگایا ہو اور نقدین میں ضم کرنے کا فیصلہ دیا ہو۔

موصوف نے ہمارے قیاس پر حیرت ظاہر فرمائی ہے۔ ہم اجازت چاہیں گے کہ خود ان کی حیرت پر حیرت ظاہر کریں۔ آخر لاکھوں تولے چاندی اور سونے سے زکوٰۃ ساقط ہونے کا اندیشہ کہاں سے پیدا ہوا جبکہ ہم نے اپنے زیرِ بحث جواب میں بھی واضح کر دیا تھا اور اب بھی کہتے آ رہے ہیں کہ مغلوب سونا چاندی اگر بجائے خود نصاب کی مقدار کو پہنچے ہوئے ہوں تو زکوٰۃ عائد ہو جائے گی۔ گفتگو ایک قلیل تر مقدار میں ہے نہ کہ کثیر مقدار میں۔

ویسے آئینی انصاف میں یہ اندیشہ فی الواقع کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصول و قواعد جس فیصلے کے متقاضی ہوں وہی فیصلہ دیا جائے گا چاہے اس کے نتیجے میں کوئی بھی صورت پیدا ہو۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ اصولِ معتبرہ کے تقاضے پر لولو، مرجان اور جواہرات تک کو فقہاء نے واجب الزکوٰۃ نہیں مانا، الّا یہ کہ ان کی تجارت کی جائے۔ دیکھ لیجئے ہیرے موتی تو کس قدر قیمتی ہوتے ہیں اور بے شمار دولت سے زکوٰۃ اٹھ جانے کا جو اندیشہ غلط طور پر آپ نے ہماری اختیار کردہ صورت میں ظاہر فرمایا وہ یہاں صحیح طور پر پایا جا رہا ہے، بلکہ اندیشے کی حد سے گذر کر واقعات و حقائق کی صف شامل ہے۔ لیکن فقہاء کا یہ کام نہیں کہ اس طرح کے اندیشوں میں پڑیں، ان کا تو کام فقط یہ ہے کہ اصولِ شرعیہ کا تتبع کرتے جائیں چاہے نتیجے میں یہی صورتِ حال کیوں نہ پیدا ہو جائے کہ دو لاکھ روپے کا مکان تو وجوبِ زکوٰۃ کے دائرے سے نکل جائے، مگر ہزار روپے کا سونا واجب الزکوٰۃ ہو جائے۔ آپ دیکھتے ہیں معدن[1] درکاز تک پر زکوٰۃ نہیں ہے حالانکہ ان کی مالیت کروڑوں اور اربوں تک ہو سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں خالصۃً اصولِ معتبرہ کا لحاظ ہوگا، معیشت و اقتصاد کے کسی غیر اصولی پہلو کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔

فاضل مدیر نے فقہ کا یہ مشہور مسئلہ تو نقل کیا :-

غالب الفضۃ والذھب فضۃ وذھب۔	جس چیز میں چاندی اور سونا غالب ہو اس کا حکم چاندی اور سونے ہی کا ہے۔

+ + + +

لیکن اس کے برعکس کو نظرانداز کر دیا۔ حالانکہ اس کے عکس کو مولانا اشرف علیؒ ہی نہیں دیگر فقہاء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ الجزائری نے کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں ایسے ساز و سامان کے بارے میں جو تجارت کی غرض سے نہ ہو، رقم کیا ہے

---

[1] زمین سے برآمد شدہ قدرتی یا غیر قدرتی خزانے ۱۲

وإذا كان الذهب والفضة مغشوشاً فلا زكوٰة فيهما حتى يبلغ ما فيهما من الذهب والفضة الخالصين نصاباً۔

اور جب سونا اور چاندی دوسری دھاتوں کے ساتھ آمیز ہوں تو ان میں اسی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جبکہ اس آمیزے میں پائے جانے والے سونے چاندی کی واقعی مقدار حدِ نصاب کو پہنچ ہوئی ہو۔

+ + + +
+ + + +

یہ وہی بات ہے جو ہم کہتے آ رہے ہیں کہ کھوٹ سے مغلوب سونا چاندی کو اسی وقت سونا چاندی مانیں گے جب وہ بجائے خود نصاب تک پہنچ جائیں۔ اگر اس سے کم ہیں تو انھیں دوسرے موجود سونے میں ضم نہیں کیا جائے گا۔ حتی یبلغ ما فیہما کے الفاظ اسی پہلو پر زور ڈال رہے ہیں کہ خود اس سونے چاندی کا نصاب تک پہنچ جانا معتبر ہے نہ یہ کہ اسے دوسرے موجود سونے میں جوڑ کر نصاب پورا کیا جائے۔

اس کے تحت الجزائری نے حنفیہ کا جو مسلک بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:۔

الحنفية قالوا يعتبر في المغشوش الغالب من الذهب أو الفضة أو غيرهما فالذهب المخلوط بالفضة إن غلب فيه الذهب تزكى زكوٰة ذهب واعتبر كله ذهباً وإن غلب فيه الفضة فحكمه كله حكم الفضة في الزكوٰة فإن بلغ نصاباً زكى وإلا فلا۔ أما إن كان الغالب النحاس فإن راج في الاستعمال رواج النقد وبلغت قيمته نصاباً تزكى كالنقود ولكن لا تزكى زكوٰة النقد إن كان الخالص فيه يبلغ نصاباً فإن لم يروج ولم يبلغ خالصه نصاباً فإن نوى به التجارة كان كعروض التجارة فيقوّم وتزكى القيمة وإلا فلا تجب فيه الزكوٰة (جلد اوّل کتاب الزکوٰۃ)

کھوٹ سے مخلوط سونے چاندی میں اعتبار غالب ہی کا ہوگا چاہے سونا غالب ہو یا چاندی یا ان کے علاوہ کوئی دھات۔ پس مخلوط سونا چاندی میں اگر سونا غالب ہوگا تو کل مجموعے کو سونا ہی مان کر سونے کی زکوٰۃ نکالی جائے گی اور اگر چاندی غالب ہوگی تو کل پر چاندی کا حکم لگائیں گے۔ اگر چاندی کا نصاب پورا ہو گیا تو زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔ رہا یہ کہ اگر تانبا غالب ہو تو دیکھا جائے گا کہ یہ شے استعمال میں بطور نقد رائج ہے یا نہیں۔ اگر رائج ہے اور اس کی قیمت نصاب کو پہنچی ہوئی ہے تو اس کی زکوٰۃ نقد اشیاء کی زکوٰۃ کی مانند دی جائے گی اور اسی طرح نقد شے کی زکوٰۃ دی جائے گی اگر اس میں پایا جانے والا سونا چاندی نصاب کی حد تک پہنچا ہوا ہو۔ پس اگر یہ مذکورہ آمیزہ (جس میں تانبا غالب ہے چاندی سونے پر) نہ تو نقد کی حیثیت سے رائج ہے نہ اس کے سونا چاندی بقدر نصاب ہیں تو دیکھا جائے گا کہ اس میں تجارت کی نیت ہے یا نہیں۔ اگر تجارت کی نیت ہے تو عروضِ تجارت کی حیثیت سے اس کی زکوٰۃ دینے نہ دینے کا فیصلہ کیا جائے گا اور اگر تجارت کی نیت نہیں ہے تو زکوٰۃ اس میں نہ ہوگی۔

دیکھ لیجئے۔ تانبا (یا کوئی بھی دوسری دھات) غالب ہونے کی صورت میں حنفیہ نے سونے چاندی کو مستقل حیثیت نہیں دی، بلکہ تابع بنا کر سونا چاندی کے حکم سے خارج مانا اور یہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مغلوب سونا چاندی کے قابلِ زکوٰۃ ہونے کو وہ اسی میں منحصر کر رہے ہیں کہ یہ بنفسہٖ نصاب تک پہنچ جائیں نہ یہ کہ دوسرے زیورات وغیرہ سے مل کر نصاب پورا کریں۔ اگر یہ نصاب سے کم ہیں اور تجارت کا قصد بھی نہیں پایا جاتا تو زکوٰۃ نہ واجب ہونے کا فیصلہ بالکل صریح ہے۔

گوٹے ٹھپے میں پائے جانے والی چاندی کی کیفیت بالکل یہی ہے کہ وہ کھوٹ سے آمیز ہوتی ہے اور کھوٹ ہی غالب بھی ہوتا ہے۔ تو حنفیہ ہی کے اصول پر یہ چاندی، چاندی مانی ہی نہیں جائے گی جب تک کہ بجائے خود نصاب کو نہ پہنچے۔ اسے زیور وغیرہ سے جوڑ کر نصاب کا حساب کرنا اگر حنفیہ کا مسلک ہوتا تو اس موقع پر کان الخالص فیہ اور لم یبلغ خالصہ نصاباً جیسی تحدید کی بجائے وہ ضرور یہ اشارہ دیتے کہ قلیل سا مغلوب سونا چاندی اگر کسی اور زیور سے مل کر نصاب پورا کر دیتا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لیکن انھوں نے اس کا اشارہ نہیں دیا۔ حالانکہ یہ بات تو ان پر بھی منکشف تھی کہ چھوٹا موٹا زیور تو عموماً ہر گھر میں موجود ہوتا ہی ہے۔

عاجز نے اس مسئلہ میں مفتی دارالعلوم مولانا جمیل الرحمن صاحب سے بھی استفتاء کیا تھا۔ ان کا جواب وہی ہے جو مدیر زندگی کا ہے۔ لیکن اس جواب کی صحت پر انھوں نے در مختار سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اسے ہم اس زیر بحث جزئیے پر منطبق نہیں سمجھتے۔ زبانی بھی ہم نے ان سے گفتگو کی اور وجوہِ اختلاف پیش کرتے ہوئے مولانا اشرف علیؒ کے فتوے کی توجیہ چاہی لیکن نہ توجیہ تلی توجیہ مل سکی نہ وجوہِ اختلاف ختم ہوئے۔ فلہٰذا ہم ابھی تک اپنی رائے پر قائم ہیں اور یہ یقین کرتے ہوئے قائم ہیں کہ فقہ حنفی کی تقلید کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

احناف کی کتب فقہ میں اگر زیر بحث جزئیے کا واضح فیصلہ مل جاتا تب تو ہم اپنے فکر و فہم کو بالائے طاق رکھ کر اسی کو مانتے لیکن جن دیگر جزئیات کے فیصلوں کو اس جزئیے پر منطبق کیا جارہا ہے وہ ہماری نگاہ میں اس سے مختلف ہیں اور انطباق میں لطیف و عمیق گوشوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اختلاف ہم مقلدوں کا آپس کا اختلاف رہا۔ مقلد اور مجتہد کا نزاع نہ ہوا۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

یہ بھی سن لیجئے کہ مسئلہ زیر بحث پر ہم شیخ المعقول والمنقول مولانا محمد ابراہیم صاحب رئیس الاساتذہ دارالعلوم دیوبند سے بھی استفادہ کر چکے ہیں وہ اس سے بالکل متفق ہیں کہ آمیزش کی صورت میں اعتبار غالب کا فقہی قاعدہ یکطرفہ نہیں ہے بلکہ کھوٹ غالب ہو تو سونا چاندی بھی اسی طرح کالعدم قرار پائیں گے جس طرح ان کے غلبے کی صورت میں کھوٹ کالعدم قرار پاتا ہے۔ الا یہ کہ یہ مغلوب سونا چاندی ہی بجائے خود نصاب کو پہنچ جائیں۔

نصاب کے سلسلے میں ہم نے اپنے جواب میں جس الجھن کا ذکر کیا تھا اس کی گرہ کشائی میں فاضل مدیر نے جو رہنمائی کی ہے اس کے ہم ممنون ہیں۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ اس باب میں اہل علم سے تبادلۂ خیال کریں گے۔ قیراط کے حساب میں ایک ماشے کی غلطی واقعی رہ گئی اسے حساب میں ہمارا اناڑی پن کہئے یا قلم کا سہو۔ ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا۔

فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلہ پر گفتگو کی گنجائش اس بار ختم ہو گئی۔ زندہ رہے تو انشاء اللہ اگلی صحبت میں اسے لیں گے۔ متذکرہ بالا جزئیے میں تو ہمیں اب تک یہ وسوسہ باقی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کتب حنفیہ سے ہماری رائے کے خلاف ہی کوئی ثبوت سامنے آجائے اور ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑے، لیکن فنڈ کی زکوٰۃ نہ ہونے کے مسئلہ میں بفضلہ تعالیٰ ہم بالکل مطمئن ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے دلائل جاننے کے بعد وہ لوگ بھی مطمئن ہو سکیں گے جو اصول و کلیات پر پوری گرفت نہ رکھنے کے باعث فنڈ میں وجوب زکوٰۃ کا گمان کرتے ہیں۔ کیا تعجب مدیر زندگی بھی ہم سے متفق ہو جائیں وَ لِلّٰہِ عاقبۃ الامور۔

قیام و میلاد

ہمارے ماں باپ قربان ختمی مرتبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ نے بصیرتِ نورانی اور وحیِ آسمانی کی روشنی میں جو کچھ کہہ دیا اس کی خفی اور جلی حکمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ بہت سی حکمتیں تو عوام بھی سمجھ لیتے ہیں مگر بہت سی لطیف و غامض حکمتیں صرف خواص ہی کے حصے میں آتی ہیں۔

آپ نے فرمایا تھا۔

شر الامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة	بدترین امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے

نیز فرمایا۔

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد	جس نے ہمارے دین میں کوئی بدعت نکالی وہ مردود قرار پائے گی۔

متعدد ظاہری و عقلی مصالح میں سے ایک مصلحت تو امتناعِ بدعت کی یہی ہے کہ آدمی لاشعوری طور پر خود شارع بننے کی جسارت کرتا ہے اور اطاعتِ الٰہی کے جذبے کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

لیکن یہاں ہم ایک دقیق مصلحت کا ذکر کریں گے جس تک ہر ایک کی نظر نہیں پہنچتی۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح بعض غذائیں اور دوائیں خون میں گرمی اور بعض ٹھنڈک پیدا کرتی ہیں ٹھیک اسی طبعی طریقے پر بدعت سے وابستگی انسان کی عقل سلیم پر اثر انداز ہوتی ہے جس درجے میں آدمی بدعات کی طرف راغب ہو گا اسی تناسب

سے اس کی سلامتی عقل غبار آلود ہوتی چلی جائے گی۔ اسمیں کسی بڑے چھوٹے کا استثناء نہیں۔ بڑے بڑے علماء و صلحا تک کی عقل سلیم متأثر ہوئے بغیر نہیں رہی ہے اگر اخلاص کی تساہت یا فکر کی چوک سے انھوں نے کسی بدعت کو بہ نگاہِ استحسان دیکھنے یا اختیار کرنے کی غلطی ہے۔

جب اجل علماء و صلحاء کا یہ حال ہے تو وہ بریلوی علمأ کس شمار میں ہیں جنھوں نے عقل سلیم کھو کر کتنے بہت سارے علمأ حق کو کافر و مرتد بنا چھوڑا۔ اور جب وہ کسی شمار میں نہیں تو عامر عثمانی یا امام الدین رام نگری کس کھیت کی مولی ہیں کہ وہ اگر شیطان کے بھرّے میں آ کر کسی بدعت کی طرف راغب ہو جائیں تو ان کی عقلوں پر اس کا بُرا اثر نہ ہو اور ان کی ذہنی فضا غبار آلود نہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے حافظ رام نگری صاحب عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر شیطان کے ہتھے چڑھ گئے ہیں اور قیام و میلاد کا حسن و جمال ان کے دماغ میں ایسا سمایا ہے کہ اپنے رسالہ کی دو اشاعتوں میں انھوں نے دسیوں صفحات اس کی تحسین و تائید میں سیاہ کر دیئے ہیں۔ اپنے موقف کے لئے دلائل مہیا کرنا برا نہیں لیکن ہم قارئین کو دکھلائیں گے کہ استدلال کے سلسلے میں وہ بالکل بچے بن گئے ہیں۔ بچے کم سمجھ ہونے کی وجہ سے معصوم ہوتا ہے رام نگری صاحب کم سمجھ نہیں ہیں بلکہ ان کی متعدد کتابیں اور تجلی میں چھپے ہوئے مضامین گواہ ہیں کہ ان کی سمجھ اور معلومات بڑی اچھی ہیں، لیکن ہم حیران تھے کہ کچھ دنوں سے ان کے فکر و بصیرت کو کیا ہو گیا۔ اب اچانک ان کے قلم سے میلاد و قیام کی وکالت دیکھ کر یہ حیرت دور ہوئی ہے اور ہماری سمجھ میں آیا ہے کہ ان کی سلامتی عقل کو کس آفت سے سابقہ پیش آیا ہے۔ وہی تحسینِ بدعت کا میلان اور شرک و زندقہ سے مفاہمت کا خیالِ فاسد۔ یہ وہ ظالم مرض ہے کہ عقل سلیم کو گھن کی طرح چاٹتا اور جونک کی طرح چوستا ہے۔ مگر حافظ صاحب کی معصومیت سے ہمیں پھر بھی انکار نہیں۔ ہماری دانست میں ان کی سمجھ بگڑی ہے نیت نہیں۔ وہ بلا سے ہمیں بدنیت، یزیدی، فریب کار، ہٹ دھرم، بد دماغ اور جو چاہے قرار دیتے رہیں، لیکن ہم اپنے آپ کو اتنا جری نہیں پاتے کہ قطعی شہادت کے بغیر کسی کی نیت پر حکم لگا سکیں۔ انشاء اللہ اگلی صحبت میں ہم ان کے اڑائے ہوئے غبار کو صاف کریں گے اور وہ جو مولانا عبد الحیٔ کا ایک فتویٰ پیش کر کے چیلنج کر رہے ہیں کہ کسی میں ہمت ہو تو اس پر علمی نقد کر کے دکھلائے۔ تو بعونہٖ تعالیٰ و توفیقہٖ ہم اس پر بھی اور ان کے نقل فرمودہ تمام ارشاداتِ سلف پر بھی علمی ذمہ داری کے ساتھ معروضات پیش کریں گے۔ اللہ ہمارا ناصر ہے اور وہی ہے جس کی عطا فرمودہ توفیق اور فہم نے بدعت کے رد اور سنت کی حمایت میں ہمارا سینہ کشادہ کر دیا ہے۔ سُبْحَانَہٗ تَعَالیٰ وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُوالْعَرْشِ الْمَجِیْدُ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔

مستقل عنوان

تفہیم الحدیث

عامر عثمانی

باہمی محبت و اخوۃ

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:- والذی نفسی بیدہٖ لا تدخلوا الجنۃ حتٰی تسلموا ولا تسلموا حتٰی تحابّوا وافشوا السلام تحابّوا۔ وایّاکم والبغضۃ فانہا ھی الحالقۃ لا اقول لکم تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔ (اخرجہ مسلم وابوداؤد وابن ماجہ والبخاری فی الادب المفرد)

ترجمہ:-

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم بہشت میں نہ جا سکو گے۔ جب تک مسلمان نہیں بنو گے اور مسلمان اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت و اخوت نہ بڑھاؤ اور سلام کو رواج نہ دو۔ آپس میں محبت کرو اور بغض سے بچو کہ بغض مونڈنے والا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ سر کو مونڈتا ہے بلکہ وہ دین کو مونڈتا ہے۔

تفہیم:-

سب سے پہلے اس نکتے کو ذہن نشین کر لینا چاہیے جسے ہم اپنی تحریروں میں پہلے بھی مصرّح کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی بہت سے محاورات ہیں جن کا مفہوم لغت، صرف و نحو اور منطق کے ذریعے نہیں نکالا جاتا بلکہ محاورات ہی کے اعتبار سے معیّن کیا جاتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بہت لوگ گمراہ ہوئے۔

یہ تنبیہ یہاں اسلئے ضروری ہوئی کہ حدیث بالا میں بھی اللہ کے رسول نے محاوراتی طرزِ کلام اختیار فرمایا ہے۔ محاورہ یہ ہے کہ نوعِ کلی بول کر فردِ کامل مراد لے لیا جاتا ہے یعنی مثال سے سمجھئے کہ مثلاً ہم کہتے ہیں۔

• انسان وہ ہے جو مصیبت زدوں کے کام آئے!

یہاں پر ہم نے لفظ انسان بولا جو نوعِ کلی ہے اگر محاورے کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا مطلب صریح طور پر یہ ہوگا کہ جو لوگ مصیبت زدوں کے کام نہیں آتے اور خود غرضیوں میں محو رہتے ہیں۔ وہ نوعِ انسانی سے خارج ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ مطلب غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ ہمارا منشاء تو اس قول سے یہ ہوتا ہے کہ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ اسے جو اختیار کرے گا وہی بہترین انسان ہوگا اور جو اختیار نہیں کرے گا قابلِ مذمت انسان ہوگا۔ ہمارا مقصود اس فقرے سے انسان کی منطقی تعریف نہیں بلکہ انسانِ کامل کا ایک امتیاز بیان کرنا ہوتا ہے۔ مصیبت زدوں سے لاپرواہی برتنے والوں کو ہم چوپایہ قرار دیکر گا۔ بھینس کی صف میں نہیں کھڑا کر دیں گے۔ ہاں مذمت کے طور پر

انہیں ناقص انسان ضرور کہیں گے۔

یہی نکتہ ایسی اکثر حدیثوں میں پایا جاتا ہے جن میں اللہ کے رسول نے بعض قبیح اعمال کی شدید قباحت اور بعض نفیس اعمال کی بیش بہا نفاست کو نمایاں فرمایا ہے آپ نے فرمایا کہ مومن ایمان سے نکل جاتا ہے جب وہ زنا یا چوری میں مبتلا ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے جس سے اس کے ہمسائے مامون نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جس نے قصداً نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔ اسی طرح بہت حدیثیں ہیں جن میں محاوراتی انداز کلام ہی اختیار فرمایا گیا ہے گویا ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ زانی و سارق، یا ہمسایہ آزار یا تارک صلوٰۃ واقعۃً کافر ہو گیا۔ منطقی اور آئینی اعتبار سے تو ایسا شخص مسلمان ہی رہتا ہے اور اس سے تمام معاملات وہی کئے جائیں گے جو مسلمان سے کرنے چاہئیں لیکن جس طرح یہ بات محاورۃً درست ہے کہ مصیبت زدوں کے کام نہ آنے والا انسان نہیں ہے اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ بدترین گناہوں میں مبتلا ہونے والا مسلمان نہیں ہے۔

آپ نے سنا ہوگا ایک فرقہ خوارج کا گذرا ہے اسی کے مشابہ ایک فرقہ معتزلہ کا ہوا ہے۔ انھیں دراصل ایسی ہی احادیث اور آیات سے غلط فہمی ہوئی کہ معصیت کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے انھوں نے دوسری آیات کے مفہوم سے لوگوں کو نظر انداز کر کے ظاہری اور سطحی معنی مراد لئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور تو اور حضرت علیؓ جیسے رفیع الشان صحابی کو انھوں نے کافر کہدیا۔ حالانکہ زبان کے محاورات پر نگاہ رکھے بغیر آیات و احادیث سے مطالب اخذ کرنا کسی ہوشمند کے نزدیک درست نہیں ہے۔

اس تنبیہ کے بعد یہ بات تو خود بخود صاف ہو گئی کہ حدیث بالا میں بغض و عناد کی روش پر چلنے والوں کے مسلمان ہونے کا انکار آئینی و منطقی انکار نہیں ہے بلکہ محاوراتی انکار ہے جو لوگ باہمی محبت و اخوۃ سے محترز ہوں اور جدل و تفرقہ ہی ان کی روش ہو وہ بھی فتوے اور آئین کے اعتبار سے گنے تو مسلمان ہی جائیں گے لیکن یہ قطعاً طے ہے کہ وہ نہایت برے قسم کے مسلمان ہیں وہ سخت مذمت کے مستحق ہیں۔ انھیں عذاب الیم کا مزا چکھایا جائیگا اور اللہ یوم قیامت ان کی طرف رحمت کی نگاہ نہیں ڈالے گا۔

آپس کی اخوت و محبت ایسی شے نہیں جس کی خوبیاں کسی سے مخفی ہوں سورج روشنی دیتا ہے۔ بارش کھیتوں کو سیراب کرتی ہے اتنی ہی مسلم اور واضح بات یہی ہے کہ آپس کی دوستی تعاون اور برادرانہ غمخواری ہزار بھلائیوں کی ایک بھلائی اور ہزار نیکیوں کی ایک نیکی ہے۔ سو آدمیوں میں دلی ربط و تعلق ہو تو وہ ہزاروں پر بھاری ہیں۔ ہزار آدمیوں کی جمعیت میں دلی اخوت و مواثست نہ ہو تو وہ ایک ایسی بھیڑ میں جسے بڑی آسانی سے تتر بتر کیا جا سکتا ہے۔

محبت و اخوت نے دنیا کی تاریخ میں کیسے کیسے نقش ثبت کئے ہیں اس کی تفصیل میں جائیے تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے ہم یہاں صرف ایک ہی واقعے کی یاد تازہ کریں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ عرب کے صحرا سے نکل کر قیصر و کسریٰ کے تخت الٹنے والے شیروں کی باہمی اخوت و مؤدت کا کیا عالم تھا۔

جنگ یرموک میں ابوجہم بن حذیفہؓ اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلے اور پانی کا مشکیزہ ساتھ لے لیا کہ اگر وہ پیاسے ہوں تو پانی پلا دیں۔ مردہ اور نیم مردہ سپاہی میدان میں بکھرے ہوئے تھے۔ ابوجہم کا بیان ہے کہ میرے بھائی مجھے مل ہی گئے مگر وہ زخموں سے چور تھے اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

" اے برادر! تمھیں پانی کا گھونٹ دوں؟"

انھوں نے عالم کرب میں اشارۃً " ہاں " کہی۔ میں پانی ان کے حلق میں ٹپکانے ہی والا تھا کہ قریب ہی سے کراہ کی آواز آئی۔ میرے بھائی نے نظر پھیر کر اُدھر دیکھا۔ ایک اور مجاہد خاک و خون میں لت پت جاں کنی میں مبتلا تھے۔ بھائی نے پانی لئے بغیر اشارہ کیا کہ میں اس کراہنے والے کی خبر لوں۔ میں جلدی سے وہاں پہنچا۔ وہ ہشام بن ابی العاص تھے زخموں سے بے حال اور زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار۔ ابھی انھیں پانی نہیں پلا سکا تھا کہ قریب ہی ایک اور مجاہد تقریباً دم توڑتے نظر آئے۔ ہشام نے مجھے ان کی خبرگیری کا اشارہ کیا اور میں

وہاں پہنچا۔ مگر اتنے ہی میں وہ واصل بحق ہو گئے۔ اب میں تیزی سے ہشام کے پاس لوٹا مگر یہ بھی اسی لمحے اپنے رب سے جا ملے تھے۔ دوڑ کر اپنے بھائی کے پاس آیا مگر آہ ان کے ہونٹوں پر بھی ہمیشہ کے لئے مہر سکوت لگ چکی تھی۔

دیکھا آپ نے۔ یہ تھی محبت و اخوت۔ یہ تھا وہ جذبۂ دوستی جس نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو واقعی ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی حیثیت دیدی تھی — یہ کوئی مافوق الفطرت عجوبہ نہیں ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک ماں آج بھی اپنی بھوک پر اولاد کی بھوک کو اور اپنے راحت وآرام پر بچوں کے راحت و آرام کو ترجیح دیتی ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک باپ اپنے بچے کے منہ میں لقمہ دیکر اُس سے زیادہ لذت وآسودگی محسوس کرتا ہے جتنی وہ اس لقمہ کو اپنے مُنھ میں دیکر کرتا — یہ خون کے اشتراک کا نتیجہ ہے عین فطرت کے مطابق — ہر وقت کا مشاہدہ — صحابہ نے شدتِ تعلق کے اسی ثمرے کو عقیدہ و فکر کے گہرے اتحاد سے حاصل کیا تھا۔ یہ اتحاد اتنا مضبوط اور عمیق تھا کہ خون کے رشتے بھی اس کے آگے ماند پڑ گئے۔ آپ کو معلوم ہے صحابہ کے معاملہ میں یہ اتحاد باپ کے پیار اور ماں کی ماتا پر بھی بازی لے گیا تھا — حق یہی ہے کہ دینی تعلق کے سامنے کوئی رشتہ رشتہ نہیں، محبت اور نفرت، صلح اور جنگ، دوستی اور دشمنی سب کا محور یہی تعلق ہونا چاہیے اللہ کے رسول نے فرمایا من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ و اعطیٰ للّٰہ و منع للّٰہ فقد استکمل الایمان (جس نے اللہ ہی کے لئے محبت اور اللہ ہی کے لئے بغض کیا اور اللہ ہی کے لئے داد ودہش کی اور اللہ ہی کے لئے ہاتھ روک لیا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی) یہ جو آپس کے اتحاد و اتفاق کی شدید ہدایت کی گئی یہ اسی لئے تو ہے کہ جب ہم خون اور ملک و قوم اور دوسرے ہر رشتے اور ہر مفاد سے بلند تر ہو کر کسی شخص یا گروہ سے اسلئے محبت کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہی طرح دین حق کا پرستار، اللہ اور رسول کا مطیع اور اسلام کا شیدائی ہے تو اسی کا نام الحبُّ للّٰہ (اللہ کے لئے محبت کرنا) ہے۔ اور جب کوئی فرد یا گروہ اللہ اور رسول کا باغی بن جاتا ہے یا دعوۂ اسلام کرتے ہوئے اسلام دشمن نظریات کو عملی و فکری طور پر قبول کرلیتا ہے تو اس سے بغض رکھنا البغض للّٰہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث باب میں جس بغض سے روکا گیا ہے وہ ایسا بغض ہے جس کی بنیاد دنیاوی اغراض ومقاصد، حسد، جذبۂ مسابقت، سوءِ ظن اور اسی نوع کے کسی مفسدے پر رکھی گئی ہو۔ رہا وہ بغض جو اللہ کی خاطر ہو وہ تو نہ صرف محبوب و مستحسن ہے بلکہ اس کا نہ ہونا ایمان کی کمزوری اور دین سے بے تعلقی کی علامت ہے۔ اللہ جل شانہ نے جہاں رسول اللہ اور ان کے صحابہ کی یہ خصوصیت بیان کی کہ رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ (آپس میں رحم ومروت کا برتاؤ کرنے والے) وہیں اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ بھی بیان کی۔ یعنی صداقتوں سے انکار اور اطاعت الٰہی سے گریز کرنے والوں کے بالمقابل سخت گیر وسخت کوش۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جسے خیر و صلاح سے جتنی زیادہ محبت ہوگی فتنہ و شر سے اتنی ہی عداوت بھی ہوگی۔ تاریکی اور روشنی کا معاملہ ہے۔ ہاں یہ پہلو بہرحال ملحوظ رکھنا چاہئیے کہ بغض و عداوت کا اصل نشانہ کفر و زندقہ ہے کافر و زندیق کی ذات نہیں۔ ذات میں اگر کفر و زندقہ اس طرح رچ بس جائے کہ اسے ذات سے علیحدہ کرنا عملاً ممکن ہی نہ ہو تب تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہماری عداوت و نفرت کا ردِّ عمل ذات پر بھی اثر انداز ہو لیکن جب تک خلط وآمیزش کی یہ شدت نہ ہو کافر و زندیق بھی اسی طرح نرم فہمائش اور ہمدردانہ تفہیم و تدریس کا مستحق ہے جس طرح قابلِ علاج مریضوں سے طبیب ہمدردی و موانست کا برتاؤ کرتا ہے۔

(باقی باقی)

تجلّی کی ڈاک

جماعت اسلامی اور جماعت تبلیغی

سوال ۱؎ — نام و پتہ ندارد۔

مولانائے محترم! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔

آج کل جماعت اسلامی ہمارے شہر میں ایک اہم اور پریشان کن مسئلہ بنی ہوئی ہے تبلیغی جماعت اور اس کے مقامی علماء اس جماعت کی پوری شدّت کے ساتھ مخالفت کررہے ہیں اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جماعت اسلامی گمراہ بے دین ضال و مضل اور انتہائی فتنہ پرور جماعت ہے اس کی نماز اس کے تقیے وغیرہ بھی جدا ہیں۔ یہ جماعت اس وقت کے جلیل القدر علماء دین سابقہ بزرگانِ دین حتیٰ کہ صحابۂ کرامؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں شدید گستاخیاں کرتی ہے۔ اور اس کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔ اس جماعت سے کسی مسئلہ میں اور کسی قیمت پر اتفاق واتحاد ملّتِ اسلامیہ کیلئے جائز نہیں ہے۔ یہ الفاظ تبلیغی جماعت کے ایک ذمّہ دار (جو فاضل دارالعلوم دیوبند بھی ہیں) کی تقریر سے ماخوذ ہیں۔ یہ تقریر مولوی صاحب نے ۲۸ ستمبر کو احمد منزل والی مسجد میں بعد نماز جمعہ فرمائی تھی۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۷۰ تھی جس میں جماعت اسلامی کے دو علماء اور متعدد کارکن بھی موجود تھے کیونکہ دراصل تقریر کا پروگرام جماعت اسلامی والوں نے مولانا محمد شفیع صاحب مونس کا رکھا تھا جو جماعت اسلامی حلقہ دہلی کے امیر ہیں۔ رات میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ان کی تقریر کا اعلان بھی ہو گیا تھا مگر تبلیغی جماعت کی چونکہ یہاں اکثریت ہے اس لئے اس نے جماعت اسلامی والوں کے پروگرام کو عین وقت پر فیل کردیا اور خطبۂ جمعہ سے قبل ہی مولوی صاحب (جو تبلیغی جماعت کے ذمہ دار عالم ہیں) کی تقریر کا اعلان کردیا۔ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے یہ اعلان سُنکر اپنی تقریر کے التوا کا بخوشی اعلان کردیا مگر تعجب ہے کہ تبلیغی جماعت کے مولوی صاحب کی شدید مخالفانہ تقریر کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ کوئی جواب نہ دے سکے حالانکہ ضلعی اجتماع کی وجہ سے اکثریت مجمع کے اندر جماعت اسلامی والوں ہی کی تھی۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں مندرجہ بالا جملوں کو بار بار دھرایا۔ الغرض تبلیغی جماعت جو اس شہر پر چھائی ہوئی ہے جماعت اسلامی کی مخالفت میں تن من دھن سے لگ گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جماعت اسلامی گمراہ جماعت ہے جو اس میں جائیگا وہ دین وایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ تبلیغی جماعت ہی وہ واحد دینی جماعت ہے جو حدیث رسول کی رُو سے ناجی ہے اور جو ایک دفعہ چلّہ دیدے گا وہ ان تمام حقائق سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا۔

اس نازک صورت حال کے اندر ہم آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ماہ نومبر کے رسالے میں جواب دیکر شکریہ کا موقع عنایت کریں گے آپ مستند عالم اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل بھی ہیں' اس لئے آپ کے جواب سے ہمیں انشاءاللہ ضرور تسکین حاصل ہوگی۔ واضح رہے کہ میرا تعلق نہ تو جماعت اسلامی سے ہے اور نہ ہی تبلیغی جماعت سے۔ البتہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا عقیدتمند ضرور ہوں۔ درج ذیل سوالات مدلّل جواب کے طالب ہیں:—

(۱) ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تبلیغی جماعت کے موجودہ

ہوتے ہوئے جماعت اسلامی بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی — نہ یہ جماعت بنتی اور نہ مسلمانوں میں افتراق و انتشار ہوتا؟

(۲) علمائے حق کی اکثریت کبھی کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتی تو آج جبکہ نہ صرف یہ کہ علماءِ دیوبند بلکہ تمام ہی فرقوں کے علماء جماعت اسلامی کی گمراہی پر متفق ہو چکے ہیں تو اس میں شک کی کیا گنجائش ہے؟

(۳) علماء اور بزرگانِ دین کی حمیت اور کسی بڑی دینی درسگاہ کی سند جسے حاصل نہ ہو اُسے کیا حق ہے کہ وہ ملّت کو اس کے دینی مسائل میں نہ صرف یہ کہ حصّہ لے، بلکہ دینی نقطۂ سے اس کی رہنمائی اور قیادت کے لئے کوشاں ہو؟

(۴) کیا جماعت اسلامی کی کتابوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بزرگانِ دین و نیز علماءِ وقت کے ساتھ بے جا گستاخیاں نہیں کی گئی ہیں خواہ وہ غیر شعوری طور پر خلوصِ نیت ہی کے ساتھ کیوں نہ ہوں؟

(۵) تبلیغی جماعت کے پاس بھی کچھ کتابیں ہیں جنھیں عرب و عجم کے بے شمار انسان پڑھتے ہیں۔ پوری دنیا کے اندر ان جماعتوں کے جال بچھے ہوئے ہیں چلّوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کی زندگیاں بدلی ہیں اور بدل رہی ہیں۔ کیا کبھی اس جماعت کے خلاف کوئی مہم کسی ملک کے اندر چلائی گئی کبھی اس کی کتابوں میں باوجود تلاش و جستجو کے کوئی غلط بات کسی کے ہاتھ آئی؟ اگر ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو کیا حرج ہے اگر جماعت اسلامی بھی تبلیغی جماعت میں ضم ہو جائے یا وہ بھی اپنے یہاں دعوتِ دین کے یہی طریقے اختیار کرے۔

(۶) آپ کے نزدیک جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنا اس کے اجتماعات میں شرکت کرنا اور اس کی ہمدردی کرنا یا اس کا ممبر بننا اور اس کی ہر لحاظ سے حتی الوسع مدد کرنا کہاں تک درست اور جائز ہے؟

الجواب:-

آپ کا خط ایسا نہ تھا کہ اس پر تجلّی کے صفحات برباد کئے جاتے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ جاہلوں اور نفس پرور عالموں کی طرف سے جماعت اسلامی کی مخالفت کا طوفان پھر جگہ جگہ اُٹھایا جا رہا ہے اس لئے دل پر جبر کر کے جواب لکھ رہے ہیں تاکہ مخالفت کرنے والوں کو احساس ہو جائے کہ ان کی فتنہ طرازیوں اور لغو بیانیوں پر ٹوکنے والا تجلّی ابھی مرا نہیں ہے۔

شیطان اور نفسِ امارہ جب سکوٹ کر لیتے ہیں تو انسان کی چشمِ بصیرت میں ٹھیک ویسا ہی بھینگا پن پیدا ہو جاتا ہے جیسا چشم سر میں پُتلیاں چڑھ جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ اپنے ہی کو دیکھئے۔ خود مان رہے ہیں کہ بدزبانی، جارحیت، ہنگامہ آرائی اور فتنہ پردازی کے مرتکب مقامی علماء اور تبلیغی جماعت کے افراد ہیں۔ جماعت اسلامی والے تو ٹکراؤ اور مناظرہ و جدل سے اس حد تک اجتناب کرنا چاہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کے بالمقابل اپنی تقریر بھی ملتوی کر دی تاکہ فتنہ نہ بڑھے۔

لیکن ظالم کی مذمت اور مظلوم کی ہمدردی کے عوض شیطان آپ سے یہ لکھوا رہا ہے کہ:-

"آج کل جماعت اسلامی ہمارے شہر میں ایک اہم اور پریشان کن مسئلہ بنی ہوئی ہے —"

کیا یہ بالکل ایسا ہی نہیں ہے جیسے مسلمانوں پر آئے دن ظلم کرنے اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنے والے یہ ارشاد فرمائیں: آج کل مسلمان ہمارے ملک میں ایک پریشان کن مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔

محترم! تجلّی کا فائل اگر کہیں سے مل جائے تو اٹھا کر دیکھئے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا دوسرے کوئی بزرگ۔ جس نے بھی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر ناروا قسم کے اعتراضات کئے ہیں اُسے ہم نے قرآن، حدیث اور ائمۂ و فقہاء کی شہادتوں کے ساتھ مسکت جواب دیا ہے۔ آج بھی اگر کوئی صاحبِ علم متین اور معقول سطح پر اعتراض پیش کرے تو ہم جوابدہی کے لئے دل و جان سے حاضر ہیں کیونکہ جماعت اسلامی پر کئے جانے والے اعتراضات کو ظلم و تعصب اور فساد و جہل پر مبنی دیکھ کر ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مظلوم کی طرف سے مدافعت کریں۔ لیکن اس طرح کی جاہلانہ اور شیطانی مخالفتوں کا علمی جواب کیا ہو سکتا ہے جن کا کوئی سر پیر ہی نہ ہو۔ یہ جماعتِ تبلیغی کے جاہل اور نیم جاہل معترضین، یہ دین و ملّت کے حقیقی درد سے محروم عافیت پسند علماء، یہ اقامتِ دین اور دعوتِ حق کی جنگاہ سے جان چُرانے والے جُبّہ پوش واعظین و مبلغین۔ یہ موٹی عقل اور موٹے نفس والے سجادے اور پیر۔ ان سب کی مثال اُن گذرے ہوئے لوگوں کی سی ہے جنھوں نے امام ابوحنیفہؒ کو بدعتی کہا۔

جنھوں نے امام ابن تیمیہؒ کے لئے خبیث اور زندیق کے الفاظ استعمال کئے۔ جنھوں نے امام بخاریؒ کو شہر بدر کرایا۔ جنھوں نے مجدد الف ثانیؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ جیسے لوگوں پر صلواتیں بھیجیں ان کی مخالفتیں کیں۔ انھیں بددین اور گمراہ قرار دیا۔

کیا آپ نے تاریخ نہیں دیکھی۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ حق کی تحریک نے جب بھی قوت پکڑی ہے خود مسلمانوں ہی میں اسکے بے شمار مخالف پیدا ہوئے ہیں اور شیطان اچھے اچھے علماء و صلحاء کو فتنے کی راہ پر لگائے گیا ہے۔

یہ کہنا کہ جماعت اسلامی کی نماز الگ ہے روزہ الگ اور یہ جماعت رسولؐ اور صحابہؓ کی شان میں شدید گستاخیاں کرتی ہے ایسی ہی بیہودہ بکواس ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ فجر کی نماز دوپہر میں اور عشاء کی نماز صبح دس بجے ہوتی ہے۔ آدمی خدا کے خوف سے بے نیاز ہو جائے تو وہ گالیاں بھی بک سکتا ہے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ کون اس کی زبان پکڑے۔ یہ مخالفین جن کا آپ نے ذکر کیا یا تو فی الحقیقت حسابِ آخرت کے منکر ہیں اور نفس و خواہش ہی کو انھوں نے معبود بنا لیا ہے یا پھر ان کی عقلیں اتنی موٹی اور غبار آلود ہیں کہ یہ عدل اور ظلم، سچ اور جھوٹ، دین اور بے دینی کا فرق ہی نہیں سمجھتے۔

آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ بریلوی حضرات دیوبندیوں کو، اہل حدیث کو، تبلیغی جماعت والوں کو کس طنطنے کے ساتھ بددین، مردود، گمراہ یہانتک کہ کافر کہتے ہیں اور مولانا محمد قاسمؒ مولانا اشرف علیؒ اور دیگر اکابرین دیوبند کی کتابوں سے ایسے ایسے لغو و باطل عقائد نکالتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ یہ جن دیوبندی فاضل صاحب کا آپ نے تذکرہ کیا انسے کہئے کہ عقل کے دشمن! عبرت پکڑو۔ بریلوی علماء ظلم و تحریف کا جو کھیل علمائے دیوبند کے خلاف کھیلتے ہیں وہی تم جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف کھیل رہے ہو۔ بریلوی بھی یہی کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ، اولیاء کرام اور صحابۂ عظامؓ کی شان میں شدید ترین گستاخیوں سے علمائے دیوبند علمائے اہل حدیث وغیرہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ سب مردود، بے دین، گمراہ کافر ہیں۔ اسی طرح تم بھی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی کتابوں کو بھینگی اور بعض حالتوں میں اندھی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ بریلوی اگر یاوہ گوئی، تحریف، شر پسندی اور عنادہ گردی کے عتاب میں آخرت کا عذاب چکھیں گے تو یقین کرو تمھارا بھی حشر ان ہی کے ساتھ ہوگا کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کے خصوصی رشتے دار نہیں ہو۔ دروغ بافی، فتنہ پروری، افترا پردازی اور افتراق و عناد کی تحریکیں جو بھی چلائے گا آخرت میں قہر و عذاب کا مستوجب ہوگا۔

آپ اگر شیطان کے بھرّے میں نہ آگئے ہوتے تو مجھ سے سوالات کرنے سے پہلے ان فتنہ پروروں ہی سے پوچھتے کہ بتاؤ تو کس کتاب میں جماعت اسلامی والوں نے اپنی الگ نماز اور الگ روزے کا تذکرہ کیا ہے۔ دکھاؤ تو جماعت اسلامی کا کوئی فرد جدید قسم کی نماز کیسے اور کہاں پڑھتا ہے۔ اگر یہ لوگ نہ بتا سکتے اور نہ دکھا سکتے —— اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ قیامت تک یہ اپنے سفید جھوٹ کا ثبوت مہیّا نہ کر سکتے تو آپ کو خود ہی سمجھ لینا چاہئیے تھا کہ ان کے ایمان و دیانت کس درجے کے ہیں اور ان جیسے ہرزہ سراؤں پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کے سچے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی کا ذکر و بیان کرنے لگے۔ آپ نے ایسے ایسے لرزہ خیز الزامات جماعت اسلامی کے بارے میں سنے اور ان الزام لگانے والوں سے یہ مطالبہ کرنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ذرا دکھائیے تو ہمیں بھی اس جماعت کی کوئی کتاب جس میں ایسے کافرانہ عقائد و افکار کا اظہار کیا گیا ہو۔ صداقت و عدل کے لئے آپ میں کوئی تڑپ ہوتی تو ضرور آپ تحقیق پر مائل ہوتے اور تحقیق سے قبل اُن واہی خیالات کو دل میں جگہ نہ دیتے جن کا اظہار خط میں فرما رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے سربراہوں کو ہم کچھ نہیں کہتے لیکن اسکے سرکار چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں، اور دیوبند میں بھی ان کا ورود خوب ہوتا ہے۔ ان میں غالب اکثریت اُن جاہل اور بے استعداد لوگوں کی ہے جو دین و دنیا کسی کی بھی تمیز نہیں رکھتے۔ چِلّے بازی کی رٹ لگانا اور دہقانیوں، جاہلوں اور کوتاہ فہموں

کو بہکا سکھا لینا مردانگی کا کھیل نہیں۔ ہم کبھی جماعت تبلیغی کے خلاف کچھ اسی لئے نہیں لکھتے کہ چلو جو لوگ دنیا میں اور کچھ کرنے کے قابل نہیں وہ اپنے شب و روز چلّے بازی اور کشف و کرامت وغیرہ کے نشے ہی میں گذار لیں تو ہمارا کیا حرج ہے۔ یہ جماعت تبلیغی کے چلّوں میں گاؤں در گاؤں نہ پھرتے تو چوپال میں بیٹھ کر غیبتیں ہانکتے۔ ہل جوتتے۔ رکھشا چلاتے۔ زیادہ سے زیادہ بچوں کے مدرسے میں مدرّسی کرتے۔ لیکن جب ان کی زبانوں کو ہم جماعت اسلامی کے خلاف چلتا دیکھتے ہیں تو حیرت و عبرت کے شدید تأثر میں یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے:۔

درازدستی کوتاہ آستیناں بیں

آپ نے جماعت اسلامی کا لٹریچر نہیں پڑھا پھر بھی اس سے بُری طرح بدگمان ہو بیٹھے حالانکہ جماعت تبلیغی کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ اس کا سارا علم و عمل چلّے بازی کے محور پر گھومتا ہے۔ آپ نے اس کے کسی ذمّہ دار سے کیوں نہ پوچھا کہ جناب اسلام کی پونے چودہ سو سالہ تاریخ میں کیا کسی اور عالم، فقیہہ، شیخ، صوفی، تابعی، صحابی نے بھی اس طرح کی تحریک چلائی ہے کہ باندھو بوریا بستر اور چلو گاؤں در گاؤں۔ کیوں نہ پوچھا کہ قرآن کی کس آیت اور حدیث کی کس عبارت سے آپ نے یہ اسکیم نکالی ہے کہ جاہلوں، احمقوں اور سیدھے سادھے لوگوں کو گھیر گھار کر گاؤں در گاؤں لے چلو اور مسلمانوں سے کلمے پڑھواؤ۔ اگر واقعی کسی آیت یا حدیث سے یہ اسکیم نکلتی ہے تو آپ کو پوچھنا چاہئے تھا کہ پھر تو سارے اسلاف، سارے ائمہ و صلحاء ناسمجھ ہی نکلے کہ وہ اس آیت یا حدیث سے یہ اسکیم نہ نکال سکے۔ چودہ سو برسوں میں اور کسی کو اصلاح کی یہ نرالی ترکیب نہ سوجھی کہ نرے جاہل لٹھ گنوار بھی تبلیغ کرنے قریہ بہ قریہ پھرا کریں۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ تبلیغی جماعت ہی وہ واحد دینی جماعت ہے جو حدیث رسول کی رو سے ناجی ہے۔ تو میرے معصوم بھائی! یہی بات بریلوی بھی اپنی جماعت کے بارے میں کہتے ہیں۔ یہی خوش فہمی شیعوں کو بھی اپنے بارے میں ہے۔ یہی بات تمام وہ جماعتیں سمجھتی ہیں جن کی عقل کو شیطان نے ڈس لیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ناجی و ہدایت یافتہ وہ ہے جو میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر چلے۔ حکم دیا گیا کہ علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین۔ ذرا بتاؤ تو کیا اللہ کے رسولؐ یا کسی خلیفۂ راشد نے بھی یہ سسٹم جاری کیا تھا کہ وقت کے تمام فتنوں اور کفر و زندقہ کی تمام قوتوں سے آنکھیں بند کر کے بس چلّہ بازی کو سب کچھ قرار دے لیں اور تربیت یافتہ، سمجھدار مبلغین کی بجائے ایسے ایسے اَن گھڑ جاہلوں، گنواروں اور بے عقلوں کو تبلیغی جماعت کا رکن بنا کر گاؤں در گاؤں بھیجیں جنھیں ناک پونچھنے تک کی تمیز نہ ہو۔

اور کیا تمھیں معلوم نہیں کہ رسولؐ اور اُس کے معظم اصحابؓ کی زندگیاں کس مسلسل جہادِ زندگی میں گذری تھیں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ انھوں نے وقت کے تمام باطل نظریات سے کس طرح کھلے میدان میں جنگ لڑی تھی اور زخم کھا کھا کر اسلام کو اقتدار و حکومت کی مسند پر بٹھایا تھا۔ تبلیغ کا یہ سسٹم ہی اول تو نوایجاد اور مشتبہ ہے کہ اچھے برے، احمق، گاؤدی ہر ایک کو تبلیغ کی مہم پر روانہ کر دو پھر اس کا کوئی جزوی فائدہ بھی نکلے تو اسکی قدر و قیمت اسلام کے اصل مطلوب کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اسے اُس ہمہ گیر، پُرخطر، بہادرانہ اور ہمت آزما جد و جہد سے کیا نسبت جس کا نمونہ اللہ کے رسولؐ اور اُس کے اصحابؓ نے پیش کیا تھا۔

اگر جماعت تبلیغی کے خود ساختہ چلّے واقعتًہ تزکیۂ نفس کے لئے اتنے ہی مفید ہوتے جتنے وہ باور کرائے جاتے ہیں تو یہ شرمناک نظارہ کبھی دیکھنے میں نہ آتا کہ اس کے افراد جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر افتراء کرتے اور اپنے سوا کسی کو لائقِ نجات نہ سمجھتے۔ سچے مسلمان کبھی اس غرور میں مبتلا نہیں ہوتے کہ نجات تو بس ہمارا ہی حصّہ ہے اور سارے مسلمان جہنمی ہیں۔ سچا مسلمان ہر وقت خدا سے ڈرتا ہے، کانپتا رہتا ہے کہ کسی بھی گناہ کے خمیازے میں وہ مستحق عتاب نہ ہو جائے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کے بارے میں حتی المقدور حسن ظن رکھتا ہے۔ بلا تحقیق کسی پر الزام نہیں لگاتا۔ اپنی اہلیت و قابلیت سے بڑھ کر باتیں نہیں بناتا۔ انتہائی احتیاط و تفتیش کے بغیر گمراہی و بے دینی کے فتوے نہیں داغتا۔

مگر ہائے رے یہ چلّہ بازانِ گردن افراز۔ ان میں کے وہ افراد بھی جو کریما اور حمد باری تک کے مطالب نہیں سمجھ سکتے محض

سُنی سُنائی پر اور محض اپنے رہنماؤں کی شہ پر جماعت اسلامی کے لئے گمراہی کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو جنّت کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں۔ یا خدا تیری پناہ ــــ غنیمت جانو اللہ تعالےٰ بے حد رحیم و رؤف ہیں ورنہ جو جو کرتب دینداری کے بلند بانگ دعوے کرنے والے وقتاً فوقتاً دکھلاتے رہتے ہیں ان کا تقاضا تو یہی تھا کہ اللہ پچھلی تاریخ دُہرائے اور انھیں بندر یا کوئی اور جانور بنادے۔

اللہ کے بندو۔ تمھیں ایک دن مرنا ہے۔ اُس بارگاہ میں پیش ہونا ہے جہاں تمھارا ایک ایک عضو خود اپنے منھ سے اپنا کچّا چٹھا بیان کرے گا ــــ اس وقت کیا عذر لاسکو گے تم اِس گناہِ کبیرہ کا کہ تحقیق و غور اور دیانت و عدل کے ابتدائی تقاضوں کو بھی نظر انداز کرکے مسلمانوں کی ایک عظیم جماعت پر تم نے افترا پردازی کی، ایمان والوں کو گمراہ بددین ٹھیرایا، فتنے پھیلائے اور حق کی راہ میں کانٹے بوئے۔ کیا یہ کہکر خدا کو بہلا سکو گے کہ ہم تو گاؤں گاؤں چلّے کرتے پھرتے تھے ہمیں تو ہمارے رہنماؤں نے یہ بتایا تھا کہ تبلیغ کی راہ میں ایک قدم اُٹھاؤ گے تو ایک لاکھ نیکیاں ملیں گی اور سارے گناہ معاف ہوجائیں گے لہٰذا ہم نے یقین کرلیا کہ اب کوئی گناہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم جسے چاہیں جھوٹ کا نشانہ بنائیں جسے چاہیں بددین کہیں۔ ہماری تو مغفرت یقینی ہے۔

سنبھلو اے نفسِ امّارہ اور شیطان کی چالوں میں آنے والو۔ موت قریب ہے۔ محاسبے کا دن سر پر آگیا ہے۔ کوئی پیغمبر ایسے لوگوں کی سفارش نہیں کرے گا جنھوں نے اپنے دینی بھائیوں پر ناحق، بلا تحقیق گمراہی کے فتوے لگائے۔ اسلام کو بدنام کیا۔ چند چلّے دیکر جنت کی کنجی غصب کرنی چاہی اور اُس انقلاب آفریں دین کو جس کی راہ تیر و تفنگ، سنگ و آہن، شعلۂ و برق اور آفات و مصائب سے ہوکر گذرتی ہے ایک ایسے دین کی حیثیت میں متعارف کرایا جو محض عافیت کوشی اور محض لاکھوں من ثواب کی افسانہ طرازی کا سبق دیتا ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ ہم مجیب و مفتی کے مقام سے ہٹکر واعظ ناصح کی مسند پر پہنچ گئے ہیں مگر کیا کریں۔ دل میں طوفان اُمنڈ آتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ خوفِ خدا اور اندیشۂ آخرت ان حلقوں میں بھی کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے جن کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ خدا سے ڈرتے اور آخرت کی جوابدہی سے متفکر رہتے ہیں۔ یہ تبلیغ کے نام پر کوچہ گردی، یہ ذکر و تسبیح یہ مسمسی صورتیں بنا کر زہد و طاعت کی میٹھی باتیں کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتیں اگر انھوں نے دلوں میں خوفِ خدا، روحوں میں اخوتِ اسلامی کا جانداراحساس، ذہنوں میں غلبۂ حق کی لگن اور مزاجوں میں اسلامی اخلاق اختیار کرنے کا قوی رجحان پیدا نہیں کیا۔ کیا یہی اسلامی اخلاق ہے کہ مسلمانوں کی ایک ممتاز و مشہور جماعت کی کتابوں سے وہی سلوک کرو جو بریلوی تمھاری کتابوں سے کرتے ہیں۔ عبارتوں کے من ملنے مطلب نکالو، جھوٹے الزامات دو، مخالفت کے ہنگامے اٹھاؤ۔ حالانکہ وہ جماعت امن وصلح کی خاطر تم سے مناظرۃ و مجادلہ بھی نہ کرے مگر اس کی اس صلح جوئی اور امن پسندانہ روش کو تم اس کے لاجواب ہوجانے سے تعبیر کرو۔

اب ہم بالترتیب آپ کے سوالوں کا جواب عرض کرتے ہیں:-

(۱) آپ کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئے گی جبتک دماغ کو وہابی پروپگنڈے کے اثرات سے خالی کرکے فکری زاویئے کو درست نہ کرلیں۔ اسے تو چھوڑیئے کہ جماعت اسلامی غالباً جماعت تبلیغی سے پہلے بنی تھی۔ ہم کہتے ہیں تبلیغی جماعت کیا آسمان سے نازل ہوئی ہے جو اس کے ہوتے کسی اور جماعت کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر آپ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ مسلمانوں کا افتراق و انتشار کوئی نیا حادثہ نہیں۔ اس کی تاریخ تو بہت پرانی ہے۔ عقل سے بالکل عاری ہے وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ جماعت اسلامی بننے سے قبل مسلمان متفق و متحد تھے اور جماعت اسلامی بن گئی تو انتشار و افتراق پھوٹ پڑا۔ یہ ایسی طفلانہ بات ہے جس پر اہل ہوش ہنس دیں گے۔

اور اچھا مانے لیتے ہیں افتراق و انتشار آج ہی پھیلا ہے تو کیا اس کی ذمہ داری اُن لوگوں پر نہیں ہے جو بیٹھے بٹھائے افترا پردازی فتوے بازی اور جاہلانہ مخالفت کا ہنگامہ اُٹھاتے ہیں۔ ذرا ڈھونڈکر

کوئی حوالہ تو دو کہ جماعت اسلامی نے بھی کسی مسلمان جماعت کو کبھی گمراہ بے دین کہا ہو، کسی کی تقریر رکوائی ہو۔ کسی طرح کی فتنہ پردازی کی ہو۔ افتراق تو پھیلائیں مخالفین، جھگڑا تو اٹھائیں معاندین مگر ذمہ داری ڈالدو مظلوموں پر ـــــ یہ خوب انصاف ہے یہ شاید آپنے اُن برادرانِ وطن کا سبق سیکھا ہے جو مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرکے کہتے ہیں کہ مسلمان فرقہ پرست ہیں مسلمان مجرم ہیں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی ابتدائً کفار نے یہی کہا تھا کہ لو صاحب یہ ہم سب کو ہمارے موروثی معبودوں سے پھیر کر ایک خدا کی دعوت دیتا ہے اور قوم میں افتراق و انتشار کا بیج بوتا ہے۔

پھر جب بھی کوئی مجدد آیا ہے ـــــ غزالیؒ ہوں یا ابن تیمیہؒ ـــــ مجدد الف ثانیؒ ہوں یا شاہ ولی اللہؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ سب کے بارے میں یہی شور مچایا گیا ہے کہ یہ شخص افتراق و انتشار کا بانی ہے۔ یہ بددین ہے، گمراہ ہے وغیر ذلک۔

تو میرے بھائی آپ اپنے علم کو وسیع، بصیرت کو روشن اور دماغ کو حق پسند بنائیے تبھی آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ فتنے کی بانی جماعت اسلامی نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو علمی اختلافات کو نفسانی جدل اور پست قسم کی ہنگامہ آرائی کا رنگ دیتے ہوئے ہیں۔

(۲) یہ آپسے کس نے کہدیا کہ جماعت اسلامی کے سارے مخالف علماء علماءِ حق ہی ہیں۔ کیا اس دعوے کی کوئی دلیل ہے؟ ـــ حق و باطل کا پیمانہ قرآن وسنت ہیں نہ کہ میرے آپکے زبانی دعوے۔ قرآن و سنت کی رو سے تو وہ علماء علمائے حق ثابت نہیں ہوتے جو محبت اور نفرت میں جائز حدود سے گذر جائیں۔ جھوٹے پروپیگنڈے کرنا، تہمتیں رکھنا، بازاریوں کی سی زبان استعمال کرنا، اسلامی اخلاق کو بالائے طاق رکھدینا یہ کیا علمائے حق کی شان ہوتی ہے؟

اور کیا آپ کو معلوم ہے اکیلے امام احمد ابن حنبلؒ نے کوڑے کھائے تھے۔ باقی سارے علماء نے عافیت ہی کی راہ اختیار کی تھی۔ تو کیا آپ کہیں گے کہ احمد ابن حنبلؒ گمراہ تھے؟

اور کیا آپنے وہ کتاب دیکھی ہے جس میں بریلویوں نے دکھایا ہے کہ حرمین شریفین کے تمام علماء دیوبندی علماء کو کافر قرار دیتے ہیں۔ تو کیا آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے؟

اور یہ آپ کو کس نے بہکا دیا کہ علماء کی اکثریت جماعت اسلامی کی گمراہی پر متفق ہے۔ آپ ہر جبّے قبّے والے کو عالم سمجھ لیں اور ہر سند یافتہ کو سند مان لیں تو اس سادگی کا کوئی علاج نہیں ورنہ بے شمار بڑے بڑے علماء جماعتِ اسلامی کو ہرگز گمراہ قرار نہیں دیتے۔

(۳) ایسے علماء اور بزرگانِ دین کی تائید جماعت اسلامی کو کیسے حاصل ہو سکتی ہے جنھوں نے کُل دین کو نظر انداز کر کے اس کے صرف ایسے حصے کو لے لیا ہو جس میں عافیت ہی عافیت ہو۔ رات بھر مسجد میں ذکر کئے جاؤ۔ دن بھر نمازیں پڑھو روزے رکھو۔ گاؤں درگاؤں جاکر جاہلوں کو کلمے پڑھوادو۔ کشف و کرامت کے چند افسانے سُنادو۔ چوغے پہن لو۔ باتیں بنالو۔ اس میں کیا خطرہ اور کیا پامردی ہے۔ پیغمبرؐ اور اس کے اصحابؓ نے کانٹوں پر زندگی گذاری ہے شعلوں سے غسل کیا ہے۔ خون کے رشتے کاٹے ہیں۔ لہو سے منھ دھویا ہے۔ کفر و شرک کے پہاڑوں سے سینے اور سر ٹکرائے ہیں۔ یہ علماء جنھیں تم علمائے حق کہہ رہے ہو بتاؤ تو انھوں نے اسوۂ رسولؐ کے اس پہلو کو کہاں تک نظر میں رکھا۔ دکھاؤ تو کون کونسا عالم ہے جو طاغوتی قوتوں سے ٹکر لینے کا کوئی منصوبہ پیش نظر رکھتا ہو۔ جماعت اسلامی کا قصور تو یہی ہے کہ وہ کُل دین پر عامل ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ اسلام کو ظفر مند کرنا چاہتی ہے۔ گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر کڑے امتحانوں کی راہ دکھاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پیغمبر اور صحابہؓ کی طرح رات کے زاہد اور دن کے مجاہد بنو۔ یہ دعوت بڑی جرأت آزما ہے۔ عافیت کوش علماء اسے کیسے مانیں۔ صاف صاف تو کہہ نہیں سکتے کہ ہم اپنے بسترِ امن و عافیت کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اپنی کمزوری چھپانے اور داعیانِ حق کی دعوت کو دبانے کی خاطر غیر متعلق بحثیں چھیڑتے ہیں۔ اعتراض گھڑتے ہیں اور عوام و خواص میں گمراہی پھیلاتے ہیں۔

رہا کسی درسگاہ کی سند کا معاملہ تو اول تو آپ یہ سُن لیں کہ جماعتِ اسلامی ہند کے امیر مولانا ابو اللیث صاحب باقاعدہ ندوے کے سند یافتہ ہیں اور پھر بھی وہ بیچارے تو آپ کو فقہی مسئلے نہیں بتاتے۔ یہ جو اعتراض آپنے پیدا کیا ہے یہ وہی فرسودہ اعتراض ہے جو مولانا مودودی کے لئے گھڑا گیا تھا۔ وہ تو پاکستانی

ہوچکے آپ ہندوستان میں بیٹھکر ان کی رہنمائی سے کیوں خوف کھاتے ہیں۔ شرارت ہی پیش نظر نہ ہو تو جماعت اسلامی ہند کی مخالفت کے لئے اس طرح کی لایعنی باتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

ویسے یہ ہم آپ کو بتا دیں کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے پاس بھی کسی مدرسے کی سند نہیں تھی — کیا آپ ان کے بھی عالم ہونے سے انکار کریں گے — اور برادرم! آپ کو بہکانے والے یہ بھی نہیں ثابت کر سکتے کہ امام غزالیؒ یا مجدد الف ثانیؒ یا امام ابوحنیفہؒ کے پاس بھی کسی مدرسے کی سند تھی۔ کاش آپنے مولانا مودودی کی تحریروں کو تعصب سے پاک ہو کر پڑھا ہوتا تو قدرے اندازہ ہوتا کہ وہ کس پائے کے عالم و مفکر ہیں۔

پھر جماعت اسلامی کسی مدرسے کا نام تو نہیں ہے جہاں مولانا مودودی اپنی خاص فقہ کا درس لوگوں کو دیتے ہوں۔ مولانا مودودی ایک عالم اور مفکر ہیں۔ لوگ مختلف مسائل میں ان سے سوال کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں تاکید آئی ہے کہ اہلِ علم دوسروں تک علم پہنچائیں اور سوال کرنے والوں کیساتھ بخل نہ برتیں۔ جو عالم علمِ دین چھپائے گا وہ گناہگار ہوگا۔ اسی لئے مولانا مودودی سائلین کو اپنے علم و فہم کے مطابق جوابات دیا کرتے ہیں، لیکن یہ انھوں نے کب کہا کہ ہر شخص ضرور ہی ان کی رائے کو مانے۔ جماعت اسلامی میں اہلِ حدیث بھی ہیں شافعی بھی، حنبلی اور حنفی بھی۔ کسی کو مجبور نہیں کیا گیا کہ آپ جماعت میں آئے ہیں تو مولانا مودودی کو امام فقہ بھی تسلیم کیجیے۔ جماعت اسلامی تو اس مقصد سے بنی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ اپنے اپنے فقہی مسلک پر قائم رہتے ہوئے مل جل کر اس عظیم مقصد و منزل کی طرف پیش قدمی کریں جو اسلام کے شایانِ شان ہے یعنی باطل قوتوں پر اسلام کو غالب کرنا، معاشرے کو اسلامی رنگ میں رنگنا اخلاق، تجارت، سیاست ہر محاذ پر اسلام ہی کا بول بالا کرنا اور طاغوت سے ٹکرانا۔ یہی وہ دعوت ہے جو عافیت کوش، استراحت پسند اور تنگ نظر علماء کے حلق سے نیچے نہیں اترتی اور اسے گول کرنے کے لئے وہ طرح طرح کی کج بحثیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ہنگامے اٹھاتے ہیں۔ اعتراضات گھڑتے ہیں۔

(۴) یہ کوری بکواس ہے کہ جماعت کی کتابوں میں پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب اور بزرگانِ دین کے ساتھ گستاخیاں کی گئی ہیں۔ بہت ڈھونڈ ڈھانڈ کے فتنہ طرازوں نے بعض عبارتیں نکالی ہیں جن میں فی الحقیقت کوئی گستاخی نہیں مگر زبردستی ان میں سے گستاخانہ معنی نکالے جاتے ہیں اور یہ ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے بدعتی لوگ علمائے دیوبند کی کتابوں سے عبارتیں نکال نکال کر انھیں گستاخ، بددین، گمراہ نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے کسی رکن کے قلم سے بعض ایسے الفاظ نکل گئے ہوں جو غیر معتدل ہوں جن میں تھوڑی سی ترمیم درکار ہو۔ لیکن اس جرم میں یہ لوگ تنہا نہیں۔ دنیا کا ہر وہ مصنف جس نے بہت کچھ لکھا ہو ضرور کہیں نہ کہیں لغزش کا شکار ہوا ہے۔ امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا اشرف علیؒ وغیرہ کی کتابوں میں بھی کتنی ہی عبارتیں ایسی ہیں جنپر لوگ شد و مد سے یہی الزام لگاتے ہیں جو مولانا مودودی پر لگایا جا رہا ہے اور واقعی ان سب سے بھی ازراہِ بشریت کہیں نہ کہیں چوک ہو گئی ہے — مگر ہر بھول چوک ایسی تو نہیں ہوتی کہ اسکی آڑ لیکر اول فول بکی جائے گمراہی کے فتوے لگائے جائیں دیندار کو بددین کہا جائے۔ یقین کیجئے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر رسولؐ اور اصحابؓ اور اولیاء اللہ کی توہین کا اتہام تراشنے والے خدا کا غضب مول لیتے ہیں۔

(۵) زبان سے اگر آپ یا تبلیغی جماعت والے یہ بھی دعویٰ کر دیں کہ ہم نے ساتویں آسمان میں تھگلی لگائی ہے یا افریقہ و امریکہ میں پچاس لاکھ کافروں کو مسلمان کیا ہے تو کون ہے جو کسی کی زبان پر تالا ڈال سکے — مگر بے دلیل دعووں کے ذریعہ سچائیاں ظہور میں نہیں آتیں۔ تبلیغی جماعت کے کچھ افراد نے مختلف ممالک کے سفر جو کر لئے تو اسی کو یہ معنی دیئے جا رہے ہیں کہ پوری دنیا میں اس کے جال بچھ گئے ہیں حالانکہ اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنا بڑا اور موثر جال قادیانیوں نے بیرون ممالک میں بچھا رکھا ہے اس کے مقابلے میں تبلیغی جماعت کا جال کچھ بھی نہیں ہے۔

اور یہ دعویٰ کہ چلّوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کی زندگیاں بدلی ہیں ذرا اور پھیلا کر یوں جڑ کر دیجئے کہ چلّوں کے ذریعے پوری دنیا ہی کو بدل ڈالا ہے — اسی کو کہتے ہیں احمقوں کی جنت۔ محترم! ہر دعویٰ ثبوت چاہتا ہے۔ میں کہنے لگوں کہ میرے تجلّی نے اربوں انسانوں کی زندگیاں بدل دیں تو آپ احمق ہی ہوں گے اگر بلا دلیل اس دعوے کو مان لیں۔ ملک سے باہر کی بات چھوڑئیے۔ ملک کے اندر بتائیے تبلیغی جماعت نے کہاں کہاں کس قسم کا اسلامی انقلاب برپا کیا ہے۔ کونسے مذکّی افراد ہیں جنھیں مزعومہ تبدیلیوں کے ثبوت میں سامنے لایا جا سکتا ہے —— زیادہ نہیں صرف ایک ہی دو مثالیں اس طرح کی دیدیجئے کہ فلاں مزار کا عرس جماعت تبلیغی کی تبلیغ نے بند کرا دیا۔ فلاں ناپاک رسم معاشرے سے ناپید ہو گئی۔ فلاں جگہ کفر و باطل کو شکست دے کر اسلام کو مسندِ اقتدار عطا کی گئی۔ ہمیں تو بالکل پتا نہیں کہ جماعت تبلیغی نے کوئی انقلابی کارنامہ انجام دیا ہو۔ رہا کچھ جہلا اور نیم جہلا کو چلّوں میں لگا لینا، دیہقانیوں سے کلمے پڑھوا لینا، کچھ لوگوں کے ہاتھ میں تسبیحیں دیدینا، ذکر کرا لینا وغیر ذلک تو یہ کام تو اور بھی مرشدین و مشائخ کر رہے ہیں۔ یہ کام اچھے ہی سہی مگر انھیں اُس عظیم جد و جہد سے کوئی نسبت نہیں جسے اقامتِ دین کی جد و جہد کہتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر نے سیکڑوں مغرب زدہ انسانوں کو اسلام کی طرف موڑا ہے۔ کمیونزم کی گود میں جانے والوں کو عین سرحد پر روکا ہے۔ باطل افکار کا رد کیا ہے۔ مصلحین و مجددین کا ہمیشہ یہی مشن رہا ہے کہ وقت کے باطل نظریات کی کاٹ کریں، طاغوتی فلسفوں کو شکست دیں، اسلامی نظریات کو علمی پیمانے پر ارفع و اعلیٰ ثابت کر دکھائیں یہی کام مولانا مودودی نے کیا ہے یہی جماعت اسلامی کر رہی ہے اور جماعت تبلیغی کی مثال تو اُن کمزور، نحیف اور ناتواں لوگوں کی سی ہے جنھیں مجاہدین جہاد پر جاتے ہوئے عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھروں پر چھوڑ جاتے ہیں۔

جماعت تبلیغی کے خلاف کوئی مہم کیوں چلائے۔ شیطان ہمیشہ اسی کا پیچھا زیادہ کرتا ہے جس سے اس کے کاز کو زیادہ خطرہ ہو۔ آپ دیکھ لیجئے۔ انبیاءؑ، صحابہؓ، ائمہؒ اور مجددین کی مخالفتیں کس قدر شدید کی گئیں۔ جب بھی کسی مصلح کی تحریک و تبلیغ نے زور پکڑا مخالفتوں کا طوفان بڑھتا گیا اور شیطان کو جتنا جتنا نقصان کا اندیشہ بڑھا اتنا ہی اتنا اس نے لوگوں کو فتنہ و شر پر اُبھارا۔ تمام تاریخ اس سے بھری پڑی ہے اور آج بھی یہی صورت حال ہے کہ مخالفت ایسے افراد اور جماعتوں کی زیادہ ہوتی ہے جو اہم ہوں۔ جن کے کام سے دور رس نتائج نکل سکتے ہوں جن سے مخالف قوتیں خطرہ محسوس کریں بیچاری جماعت تبلیغی کی مخالفت میں مہم چلا کر کوئی کیوں وقت ضائع کرے گا جبکہ معلوم ہے کہ اس سے کسی کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ نہ کفر و شرک کو نہ بدعت و معصیت کو۔ نہ شیطانی اقتدار کو۔ جماعت تبلیغی کی مخالفت میں کوئی مہم نہیں چل رہی ہے۔ یہی ایک بات سمجھداروں کو اس نتیجے پر پہنچانے کے لئے کافی ہے کہ اس کا کوئی اثر باطل قوتوں پر نہیں پڑ رہا ہے۔ اگر پڑتا تو شیطان اسی طرح مخالفتوں کے ہنگامے برپا کراتا جس طرح انبیاءؑ، ائمہ، صلحاءؒ اور مجددین کے خلاف برپا کراتا چلا آیا ہے۔ کیا آپ کو ماضی قریب کی تاریخ بھی یاد نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک۔ جوں جوں زور پکڑتی گئی اور بدعت و معصیت کے قصر میں جتنا جتنا زلزلہ آتا گیا اتنا ہی اتنا ان حضرات کی مخالفتوں کا ہنگامہ بڑھتا گیا۔ ان کے قتل تک کی سازشیں کی گئیں، انھیں گمراہ، بیدین فتنہ پرداز اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی تحریک شیطان کے منصوبوں میں رخنہ انداز ہو اور شیطان چپکا بیٹھ جائے۔ جماعت تبلیغی کے معاملے میں شیطان کی خموشی اور لاپروائی اٹل ثبوت ہے اس بات کا کہ اس کے مقاصد کی راہ میں اس جماعت کی سرگرمیاں کوئی روڑہ نہیں اٹکاتیں۔ وہ تو خوش ہے کہ جو ہزاروں افراد لنگر لنگوٹ کس لینے کی صورت میں اس کی نیند حرام کر سکتے تھے وہی اپاہج بن کر ایک لایعنی سے مشغلے میں مگن ہو گئے ہیں۔ اسے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ تیسرے اور چھوٹے درجے کے بے صلاحیت افراد ہل جوتیں، چوکیداری کریں یا گاؤں در گاؤں پھر کر مسلمانوں کو کلمے پڑھوائیں۔ اس کی توجہات تو ہمیشہ ایسے ہی افراد اور گروہوں کی طرف لگی رہتیں ہیں جن کی صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی محاذ پر میرے چیلوں کو شکست دے کر نیکی اور اخلاق کا پرچم گاڑ دیں گے۔ مولا بخش اور اللہ دیا گھر بیٹھکر بیلوں کو ہانکتا رہا تب کیا اور قریہ بہ قریہ کلمے پڑھواتا رہا تب کیا۔

رہی کتابوں کی بات۔ تو ان کی گنتی ہی کیا ہے۔ جماعت تبلیغی کی معدودے چند کتابیں ہیں انھیں پرائمری سطح پر کم استعداد لوگوں کے لئے تصنیف کیا گیا ہے۔ ان میں غلطیاں ہیں یا نہیں۔ اس جستجو میں کوئی پڑے ہی کیوں۔ نقد و جرح کے ہنگامے اُن اہم کتابوں پر اٹھا کرتے ہیں جو افکار و نظریات پر قوی ضرب لگانے کی استعداد رکھتی ہوں۔ دیکھ لیجئے شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان اور مولانا اشرف علیؒ کی اکثر تصنیفات پر اہل بدعت نے کتنے ہنگامے اُٹھائے۔ لیکن آپ نے نہیں سُنا ہوگا کہ علی بابا چالیس چور اور طوطا مینا کی کہانی پر بھی کوئی ہنگامہ اُٹھا ہو۔ بے شمار مہمل، گھٹیا کتابیں بازار میں موجود ہیں اور ہمیشہ رہی ہیں مگر ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی، کیونکہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسی طرح جماعت تبلیغی کی کتابوں میں غلطیاں تلاش کرنے کی زحمت کوئی کیوں اٹھائے جبکہ وہ باطل کے لئے بے ضرر ہیں جبکہ ان کا علمی و فکری مقام کوئی نہیں۔

ویسے ایک بار تجلی میں ہم شیخ الحدیث مولٰنا زکریا مدظلہ العالی کی ایک کتاب پر جزوی تبصرہ کر بھی چکے ہیں۔ کوئی آج تک ہمارے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکا۔ جاہلوں کو کیا معلوم کہ جو حدیث یا حکایت ان کے آگے بیان کی جا رہی ہے وہ کس حد تک لائق اعتبار ہے۔ کمزور و ضعیف روایتیں بیان کرنا، بے سند حکایتیں سنانا، ذہنوں کو جہاد زندگی اور حقائق سے دُور لیجانا جماعت تبلیغی کے یہاں عام ہے۔ آپ جیسے معصوم لوگ ان باتوں پر جھومتے ہیں، خوش فہمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہمیں بھی رد و قدح کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اس جماعت کے اکھڑ افراد نے اگر جماعت اسلامی کی مخالفت کا ایسا ہی سلسلہ جاری رکھا جیسا کہ آج کل سننے میں آرہا ہے تو ہم مجبور ہونگے کہ اُن کتابوں کا جائزہ لیں جنھیں دیہاتی اور بے علم لوگ آسمانی صحیفے سمجھے بیٹھے ہیں۔

(۶) جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنا وقت کا اچھا مصرف ہے۔ اس کے اجتماعات میں شریک ہونا کچھ بیجا نہیں اور اسکی ہر لحاظ سے مدد کرنا بھی کارِ ثواب ہے لیکن اس کا ممبر بننا اتنا آسان نہیں ہے کہ بوریا بستر اباندھو اور گھر سے نکل کھڑے ہو۔ وہ ایسے ہی لوگوں کو ممبر بناتی ہے جو اللہ کے دین کو ہر دوسری شے پر فوقیت دینے کا عہد کریں۔ جو باطل سے مفاہمت کو جرم سمجھیں۔ جو حرام سے بچیں۔ جو تن من دھن سے حق اور صرف حق کی مذمت پر آمادہ ہوں۔ انھوں نے بےعملوں اور لوالفضولوں کی بھیڑ جمع کر کے وہ اپنی قبولیتِ عام کی نمائش کرنا نہیں چاہتی۔

حرف آخر

اس سے قبل ہم نے کبھی اس شدت وحدت کے ساتھ تبلیغی جماعت پر لے دے نہیں کی۔ اگر جماعت اسلامی اور مولٰنا مودودی کے خلاف شرانگیزی کی متعدد اطلاعیں ہمارے پاس نہ پہنچی ہوتیں تو اب بھی ہم زبان نہ کھولتے۔ ہمیں تبلیغی جماعت کے مشن سے کوئی تعارض نہیں ہے۔ سہارنپور میں ہمارے ایک عزیز دوست ہیں جو تبلیغی جماعت میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے شرکت کے وقت بھی ہم سے مشورہ کیا تھا اور اب بھی گاہے گاہے اس موضوع پر گفتگو ہو جاتی ہے۔ ہم نے ابتداءً بھی ان کی حوصلہ افزائی کی تھی اور یہی مشورہ دیا تھا کہ ضرور شرکت کیجئے اور اب بھی ان کے آگے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے انکی ہمت شکنی ہو۔ یہ طرزِ عمل محض ظاہرداری نہیں، بلکہ حقیقتاً ہم تبلیغی جماعت کے کام کو کارِ خیر ہی سمجھتے ہیں اور جو لوگ دینی جذبے اور خلوص نیت کے ساتھ اس میں شامل ہو کر اپنے اوقات عبادت و ریاضت اور وعظ و تبلیغ میں گذارتے ہیں ان کیلئے ہمارے قلب میں محبت بھی ہے اور جذبۂ تحسین بھی۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ جو بھی افراد اور گروہ اپنے اپنے انداز میں دین و اخلاق کی خدمت گذاری کر رہے ہیں وہ چاہے طریق کار کے اعتبار سے باہمدگر کتنے ہی مختلف ہوں لیکن اصل مقصد کو ان سب کے ذریعہ کچھ نہ کچھ کمک پہنچ رہی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے اُلجھے بغیر اپنے اپنے کاموں میں منہمک رہنا چاہیئے۔ جماعت تبلیغی افراد و اشخاص کو اسلامی رنگ میں رنگنا چاہتی ہے یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اسلام کو غالب و نافذ کرنے کیلئے بہرحال ایک اجتماعی جدوجہد، ایک تنظیم، ایک شیرازہ بندی ناگزیر ہے

اسی خلا کو جماعت اسلامی پُر کرنا چاہتی ہے۔ اس ربط و تعلق کو یوں سمجھنا چاہئے جیسے عمارتیں تعمیر کرنے کے سلسلے میں کچھ لوگ اینٹیں تیار کرتے ہیں کچھ مصالحہ بناتے ہیں۔ کچھ چنائی کرتے ہیں۔ کچھ نقشے بناتے ہیں۔ یہ سبھی اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کے ارتباط و تعاون ہی سے سر بفلک عمارتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

اب تن بدن میں آگ نہ لگے تو کیا ہو جب ہم یہ دیکھیں کہ جماعت تبلیغی یا جماعت دیوبند یہ آئے دن بیٹھے بٹھائے جماعت اسلامی کے خلاف طوفان اُٹھانا شروع کر دیتی ہے اور جو توانائیاں باطل کے خلاف حق کے مفاد میں استعمال ہونی چاہئیں وہ یوں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اندھے کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرف سے کیسی یلغار ہے۔ باطل ان دونوں کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتا ہے۔ جان و مال اور دین و تہذیب سب توپ کے دہانے پر ہیں، لیکن شیطان کی چالوں اور نفسِ امارہ کی مکاریوں میں آنے والے آپس ہی میں لڑمرنا چاہتے ہیں۔ ذرا نہیں سوچتے کہ یہ خودکشی ہے۔ یہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا ہے۔

واقعات گواہ ہیں کہ جماعت اسلامی نے کبھی جماعت تبلیغی یا گروہِ دیوبند کے خلاف ہنگامہ نہیں اُٹھایا۔ وہ ہمیشہ صلح و مفاہمت کی سعی کرتی رہی ہے۔ آج بھی وہ دل و جان سے تعاون کے لئے تیار ہے۔ اسے تو اس میں بھی عار نہیں کہ جماعتِ تبلیغی یا گروہِ دیوبند کے معظم افراد آگے بڑھ کر اس کے کام کو سنبھالیں اور اس کے موجودہ امراء ان کے فرمانبردار خادم بنکر کام کریں، لیکن ادھر تو خود پرستی و خود رائی کا کابوس مسلّط ہے ہم چو ما دیگرے نیست کا سودا سروں میں سمایا ہے۔ خطرات و ابتلاء کی راہ سے جان نکلتی ہے۔ دین کے اصول و کلیات سے زیادہ فروعی بحثوں سے دلچسپی ہے۔ اللہ، رسولؐ اور صحابہؓ سے زیادہ اپنے پیروں، استادوں اور اہلِ قبور سے شیفتگی ہے۔ "حضرت حاجی" — اور "حضرت شیخ" اور "پیر و مرشد" کے آستانے ہی سو کعبوں کا کعبہ اور ہزار مدینوں کا مدینہ بنے ہوئے ہیں۔ بریلوی تو مدت ہوئی مرفوع القلم ہوئے۔ انھیں عرس و فاتحہ یا غوث الاعظم شیئاً للہ کے سوا نہ قرآن کی ضرورت ہے نہ حدیث کی لیکن دیوبندی اور جماعتِ تبلیغی والے اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے چاہنے والے بھی نزاعِ باہمی اور دسیسہ کاری میں لگ جائیں تو دینِ حق آخر کسے پکارے۔ کون اس یتیم کے آنسو پوچھے۔

کہا جاتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے اکابرین بڑے صلح کل، مرنجا مرنج اور حلیم الطبع ہیں وہ بحث و جدل کو پسند نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں استاد اپنے شاگرد سے پہچانا جاتا ہے اگر عناد و شرارت کے خوردبینی جراثیم اس جماعت کے ارباب حل و عقد میں موجود نہیں ہیں تو آخر یہ مریدوں اور مقلدوں پر جماعت اسلامی کی مخالفت کا دورہ وقتاً فوقتاً کیوں پڑتا رہتا ہے۔ جیسا کہ زیر بحث خط سے ظاہر ہے جہاں کہیں جماعت تبلیغی کو کچھ قوت و سطوت حاصل ہوتی ہے وہیں وہ جماعت اسلامی پر نزلہ ضرور گراتی ہے۔ اوپر ہی کے حلقوں سے اگر شہ نہ ملے تو وہ لوگ بیچارے جماعت اسلامی یا مولانا مودودی کے بارے میں کیونکر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اقامتِ دین، حکومتِ الٰہیہ اور غلبۂ اسلام کس چڑیا کا نام ہے۔

اگر واقعی اس جماعت کے اعیان و اکابر ہی تفرقہ نزاع کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اس سے باز آ جانا چاہئے اور اگر ان کی مرضی اور ایماء کے خلاف ایسا ہو رہا ہے تو انھیں اپنے طرزِ اصلاح پر ناقدانہ نظریں ڈال کر غور کرنا چاہئے کہ اس میں کہاں وہ خامی ہے جس کے سوراخوں سے نفس پروری، خود پسندی اور فتنہ طرازی کے جراثیم داخل ہو رہے ہیں۔ ہر راعی اپنی رعایا کے لئے مسئول ہے تو اکابرین جماعت کیسے ان شرانگیزیوں کی جوابدہی سے بچ سکتے ہیں جو ان کی تحریک میں شامل ہونے والے جماعتی پیلنے پر برپا کر رہے ہیں۔

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

کفر و اسلام کے درمیان جذبات کے گھمسان رن میں!

"صلح حدیبیہ" کی وہ تاریخی دستاویز قلم و قرطاس کی فیصلہ کن منزل میں داخل ہوا چاہتی تھی جہاں لڑائیوں اور تلواروں کی خونیں چھاؤں میں کبھی نہ جھکنے اور دبنے والا اسلام صلح کے محاذ پر قلم و قرطاس کے سائے میں ہر لحاظ سے دبتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نازک صبر آزما صورت حال کو ایک ڈرامائی موڑ دینے کے لئے کفر کے ترجمان کی جھنجھوڑ دینے والی للکار بلند ہوئی۔

"اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے نہیں بلکہ" اے اللہ تیرے نام سے" کے الفاظ اس دستاویز صلح کی پیشانی پر چمکیں گے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا فقرہ خالص اسلامی فقرہ ہے جب کہ دوسرا لفظ کفر کی قدیم روایت ہے۔ اسلامی روایت قربان کر کے کفر کی روایت کو زندہ رکھا جائے!"۔

اسلام کے دبتے ہوئے موقف کو دیکھ دیکھ کر توحید و رسالت کے سربکفن مجاہدوں کے سینوں میں جذبات کا جو ہنگامہ اندر ہی اندر ایک زبردست ہلچل برپا کئے ہوئے تھا لیکن جس کو محمدؐ کے پاس خاطر میں سینوں کے اندر ہی گھونٹ ڈالا گیا تھا وہ اس غیرت آزما چوٹ پر آتش فشاں کی طرح بیتاب ہی تو ہو گیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی چشم و ابرو کے اشاروں کو تکنے والے بے محابا پھٹ پڑتے۔ بے شک حال یہ ضرور ہو چکا تھا کہ رگ و پے میں خون کی جگہ آگ بہہ نکلی تھی۔ چہرے انگاروں کی طرح تمتما چکے تھے۔ جبینوں پر گہری آتشیں شکنیں ابھر آئی تھیں اور فرط غیرت و غضب سے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ اچانک ایک فولادی گرفت کے ساتھ ننگی تلواروں کے دستوں پر اینٹھ گئے تھے۔ نام خدا پر مٹ جانا ہی جن لوگوں کی اکیلی آرزو کا درجہ رکھتا ہو ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے خدائے رحمٰن و رحیم کا نام صلحنامہ سے کھرچ کر پھینک دیں محض اس لئے کہ کفر کے جذبات اپنی روایت کی پاسداری چاہتے ہیں؟۔

کون کہہ سکتا تھا کہ اس محاذ پر مسلمان اپنے جذبات کے ریلے پر قابو پا سکیں گے؟ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ طوفان جو ایک بار چہرے کی تمتماہٹ، آنکھوں کی خونابی اور تلواروں کے دستوں پر آہنی گرفت کے بیتاب تشنج تک آ پہنچا ہے ایک بار پھر سینوں کی نامعلوم دور افتادہ گہرائیوں میں پلٹ بھی سکتا ہے؟۔

لیکن جب دل کے بیقرار حوصلے نکل لینے کے لئے محمدؐ کے پروانوں نے نظروں ہی نظروں میں بصد التجا اس کی اجازت طلب کی کہ اس گستاخانہ مطالبہ کا جواب زبان کے بجائے پیاسی تلواروں کو دینے دیجئے تو وہاں کچھ اور ہی عالم نظر آیا! وہاں انسان کے تمام انسانی جذبے ایک سب سے عظیم جذبہ میں گم ہو چکے تھے۔ خدا کا آخری پیغامبر ایک بہترین بشر کی حیثیت سے اپنے ذاتی جذبات و محسوسات کی پوری کائنات سے بلند ہو کر صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا خدا اس سے کیا چاہتا ہے؟۔ آپ کی ظلمت سوز اور سحر آفریں نگا

بادی النظر کی تہ میں اتری ہوئی تھی ـــــــ اور ایک پرسکون بصیرت اور ٹھنڈے دل کے ساتھ آپؐ اس صلح کی ظاھری شانِ مغلوبیت میں سے اسلامی غلبۂ و تسلّط کا وہ نیا سویرا طلوع ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے جو کئی ماہ و سال کے بعد تاریخ کی نظروں کے سامنے ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں آیا۔ اس لئے کفر کے اس سطحی مطالبے کا تجزیہ کرنے کی پوری اہلیت و قوت آپؐ کے پاس تھی جس سے کام لے کر آپؐ نے فیصلہ کیا کہ یہ نزاع محض ایک لفظی نزاع سے زیادہ کچھ نہیں دستاویزِ صلح کا آغاز اسی اللہ کے نام سے بہرحال ہو رہا تھا جس کے نام سے ہر شئے کا آغاز ہونا چاہیئے۔

اس لئے ٹھیک اس وقت جب آپؐ کے جاں نثار صحابہ انتہائی بیتابیوں کے عالم میں اس مطالبہ کو مطالبہ کرنے والوں کے ناپاک خون سے دھوکر صاف کر دینا چاہتے تھے، آپؐ نے بلاخوف و تردّد اعلان کیا۔

"منظور ہے"!۔

یکایک صحابہ کے جذبات کے امنڈتے ہوئے دھاروں کو ایک جھٹکا لگا اور ـــــــ طوفان دبے پاؤں اندر ہی اندر پس منظر میں گم ہو گیا۔ محمد عربیؐ کے لبوں سے جو الفاظ نکلے ـــــــ کتنے طاقتور، کتنے فیصلہ کن اور کس قدر فاتحانہ تھے وہ الفاظ! تلواروں کے دستے پر آہنی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ـــــــ دل کی بیقرار دھڑکنیں معمول پر آگئیں ـــــــ خونِ جگر سے جلتی ہوئی سرخ آنکھیں اٹھیں اور فرشِ خاک پر جھکتی چلی گئیں۔ پیغمبر کی جاذبیت بھلا کیسے فیل ہو سکتی تھی جب کہ اس کے ماننے والے دل کی گہرائی سے یہ یقین رکھتے تھے کہ آپؐ کے ہونٹوں سے سوائے صدائے حق کے اور کچھ سنا ہی نہیں جا سکتا۔ چند لمحات پہلے جو لوگ آگ بگولہ ہو کر کفر کے اس مطالبہ کے پرخچے اڑا دینے کے متمنی تھے یہاں وہی سب کے سب زبانِ حال سے وہی بات کہہ رہے تھے جو حضورؐ نے کہی تھی۔

"ہمیں منظور ہے!!"۔

لیکن ابھی یہ دستاویز چند قدم چل کر ان الفاظ تک پہونچی تھی کہ "محمد رسول اللہ کی طرف سے".... کہ اچانک کفر نے ایک اس سے بھی بڑے دھماکے کے ساتھ اعلان کیا:۔

"رسول اللہ؟ ـــــــ ہرگز نہیں! ـــــــ یہ الفاظ فوراً مٹائے جائیں ....."

"کیا؟....!!" ـــــــ یکایک غیرتِ حق کی آگ میں تپتے ہوئے سینے چٹخنے لگے ـــــــ جوش و خروش کی ایک بے پناہ آندھی ان کے پورے وجود کو ہلائے ڈالتی تھی۔ دل و جگر کا تمام خون آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ زندگی کی ساری توانائیاں اس غضبناک للکار میں ڈھل گئی تھیں ـــــــ "کیا کہا! ـــــــ کیا ہم ان الفاظ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں جن کو بلند کرنے کے لئے ہم نے اپنی پوری دنیا لٹا دینے کی قسم کھائی ہے؟ کیا خودکشی کسی اور شئے کا نام ہے؟ ـــــــ ہرگز نہیں! اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا ـــــــ کبھی نہیں! ـــــــ ہرگز نہیں! ـــــــ جان دیدیں گے ان الفاظ پر ـــــــ مگر ان کو مٹنے نہ دیں گے!"۔ ـــــــ مگر جب آندھی طوفان کی طرح گرجتی ہوئی یہ ایمانی طاقت رسول کے اذن و ایما کے لئے سراپا اضطراب بن کر اٹھی تو وہاں ایک عظیم سکون کے سوا کچھ نہ پایا! ـــــــ ایک سکون جس میں لرزہ خیز خاموش جلال کی شان جلوہ گر تھی ـــــــ ایک سکون جس کی طاقت کے آگے اضطراب و جوش کے ہزاروں طوفان بے بس تھے۔ ایک شانِ سکوت جو اس وقت اس کامل ترین انسانؐ کے سوا کسی کو نصیب ہونا محال تھی جس کا لافانی عرفانِ حقیقت طاقتور سے طاقتور جذبات کے طوفانوں کو اپنے قدموں کے نیچے دبائے رکھتا تھا۔ انتہائی صبر و تحمل کی ٹھنڈک اور گہرائی کے ساتھ آپؐ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کفر کا یہ مطالبہ بھی مانا جا سکتا ہے جس نے واقعی خدا کے رسولؐ کو ابھی تک تسلیم ہی نہیں کیا ـــــــ ایک منکرِ رسالت کے منھ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کے جذبات کی صحیح پکار ہیں۔ اگرچہ حق و صداقت کی روشنی میں سراپا غلط ہی سہی! ـــــــ

"اچھا" ـــــــ خدا کے رسولؐ کی آواز میں خوداعتمادی کا وقار تھا ـــــــ تدبّر اور فراست کے تیور تھے۔ مگر ساتھ ہی

کفر کے ماروں کی بدبختی پر خوں چکاں درد کی محسوس چوٹ بھی
"اچھا ــــ یوں ہی سہی۔"

آپؐ نے یہ فرمایا اور دستاویز نویس بندۂ حق سے کہا کہ وہ ان الفاظ کو کاغذ کی سطح پر سے محو کر دیں۔

اپنے جذبۂ ایمان و ادب کی بے پناہ ہیوں کے تھپیڑے کھانے والے مسلمانوں نے پیغمبرؐ کا یہ ارشاد ــــ یہ فیصلہ ــــ یہ فرمان سنا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے جیسے وہ سب سکتے میں آگئے ــــ وہ سب سکوت و درد کی المناک تصویر بنے کھڑے تھے جن کی خاموشی سے ان کے دل کا تازہ تازہ لہو صاف ٹپک رہا تھا ــــ ٹپک رہا تھا اور اس صلح کی پوری فضا کو خون سے تر کئے دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجال نہ تھی کہ جذبات اور ارشادِ نبویؐ کے درمیان تڑپتے ہوئے دل و دماغ احتجاج کی ہلکی سے ہلکی سسکی تک نکال سکیں! ۔ پیغمبرؐ کے ہونٹوں کی جنبش نے ایک بار پھر دلوں کی دھڑکنوں کا رخ پھیر دیا تھا ــــ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس بار اس فیصلے سے وہ دل اندر ہی اندر کاری زخم کھا گئے تھے جن میں محمد رسول اللہ کے لئے پیار اور سپردگی نے ایک حسین جنوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جذبات کے آتش فشاں کے دہانوں پر ایک بار پھر پاس رسالت کے جذبہ سرشار نے مہر سکوت ثبت کر دی تھی۔ لیکن خاموشی ایک درد بھری کسک کے ساتھ اب بھی یہ فریاد کر رہی تھی کہ "للہ! ہمیں اس پر مجبور نہ فرمایئے کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی اس انمول سچائی پر قلم پھیر دیں"۔ نہیں! ــــ اے خدا کے رسولؐ! آپ تو بے شک خدا کے رسول ہیں ــــ ہمارے ہاتھ اس تحریر کو مٹانے کے لئے اٹھیں گے تو اٹھتے ہی مفلوج ہو جائیں گے ــــ ہمارا دل پاش پاش ہو جائے گا ــــ ہمارا دماغ ماؤف ہو جائے گا"۔

اور خدا کے سچے فرستادہ نے رسالت کے جاں نثاروں کو اطاعت اور بیچارگی کے اس دو آتشہ عالم میں دیکھا تو خود ہی اس کام کو سر انجام دینے کا فیصلہ فرما لیا۔

"مجھے بتاؤ وہ الفاظ کہاں لکھے ہیں ــ" آپؐ نے اپنے جاں نثاروں کو محبت و سپردگی کی نازک گھاٹی سر کرنے کے لئے اپنا سہارا دیتے ہوئے کہا ــــ اور جب ان جاں نواز الفاظ کی طرف تھرتھرائے ہوئے ہاتھوں نے اشارہ کر دیا تو رسولؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ تحریر مٹا دی اور اب اس کی جگہ یہ نئے الفاظ ایک دوسری حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے اُبھر آئے:۔

"تیرے نام سے اے خدا! ــــ یہ ہے جو طے پا گیا۔ عبد اللہ کے بیٹے محمدؐ اور عمرو کے بیٹے سہیل کے درمیان" مجاہدوں کا وہ جوش و خروش جس سے ٹکرانے اور جس کو روک دینے کا یارا چٹانوں اور پہاڑوں میں بھی نہ تھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند الفاظ سے قابو میں آچکا تھا۔ اور وہ دستاویز صلح جس کی راہ میں بظاہر انسانی جذبات کی سدِ سکندری حائل ہو چلی تھی۔ ایک بار پھر تحریر کی دشوار گذار منزلوں سے جوئے رواں کی طرح گذرنے لگی۔ اس معاہدے میں اس ہوشربا دفعہ کی گھاٹی بھی آئی جس میں کہا گیا تھا کہ مکے سے جو مسلمان بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آئے گا اس کو کفار کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن مدینے سے اگر کوئی کافر کفار مکہ کے پاس چلا جائے گا تو اس کو مکہ کے کافر واپس کرنے کے لئے مجبور نہ ہوں گے۔

کس قدر کڑی تھی یہ اطاعت کی گھاٹی جس کو مسلمان عشق رسالت کے بغیر ایک قدم بھی سر نہ کر سکتے تھے۔ آہ! سینوں میں جذبات کی کیسی لرزہ خیز ہلچل تھی! ــــ ایسی ہلچل کہ عمر بن خطابؓ جیسا پرستارِ حق بھی بے اختیار پکار اٹھا تھا:۔

"اے خدا کے رسولؐ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ۔ ۔ ۔ ہم حق پر نہیں؟"

یہ آخری اٹھا رتھا اس آخری اضطراب کا جو جذبات کی طوفانی ہنگامہ خیزیاں حکم اور امتثال حکم کی راہ میں پیدا کر سکتی ہیں۔

لیکن جیسے ہی دیکھا گیا کہ محمد عربیؐ بدستور صلح کے موقف پر جمے ہوئے ہیں جذبات کے یہ سارے ہنگامے

اس یقین اور اس پیار بھرے ایمان کے نیچے دبتے چلے گئے
کہ یہ انسان کبھی باطل پر ایک پل کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتا
——— جم جانا تو دور کی بات ہے ۔
لیکن ابھی قدرت کو ان مومنوں، ان خدا اور رسولؐ
کے جاں نثار، چاہنے والوں سے ایک اور جذباتی قربانی
طلب کرنی تھی ۔ ایک عظیم ترین قربانی جس کو یہ لوگ
بارگاہِ محمدی میں اپنے تمام ذاتی جذبات و خیالات ———
آرزؤں اور حسرتوں کو یکسر فنا کئے بغیر ہرگز ہرگز پیش
نہ کر سکتے تھے ۔
اور یہ آزمائش خوں آلود زنجیروں میں جکڑے ہوئے
ابوجندلؓ کی شکل میں پوری قوت سے سامنے آکر کھڑی ہوگئی!
ابوجندلؓ ——— معاہدے کے فریق ثانی سہیل بن عمرو کے
بیٹے جن کو ان کا باپ ایمان لانے کے "جرم" میں بدترین
شکنجوں میں کھینچ رہا تھا ——— جن کو ان کے گھر میں بیڑیاں
پہنا کر ان کے اپنے گھر کو زنداں کی کالی کوٹھری بنا دیا گیا تھا
ہاں وہی ابوجندلؓ نہ جانے کیسے زنجیریں تڑا کر اپنے ایمانی
بھائیوں کی اخوت سے داد چاہنے کے لئے سراپا فغاں
بنے ہوئے صلح حدیبیہ کی فضا میں آپہونچے تھے ۔
ابوجندلؓ کی یہ حالت زار دیکھ کر ———
ابوجندلؓ کی یہ دلدوز پکار سن کر ———
اخوت کی حسین ترین رقت میں جکڑے ہوئے مسلمان
نیم بسمل کی طرح تڑپ اٹھے کہ ان کو بڑھ کر اپنے دھڑکتے
ہوئے سینے سے لگا لیں ——— اور پھر کبھی اس تاریک
دنیا میں واپس نہ جانے دیں جہاں کفر کے جبڑے ان کی زندہ
لاشیں چبائے ڈالتے تھے ۔
لیکن یہاں تو خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ عہد
کر چکا تھا کہ مکہ سے ہر آنے والا مکہ کو لوٹا دیا جائے گا ———
کس قدر صبر آزما ——— کتنی ہوشربا ——— کتنی روح
فرسا تھی یہ ایفائے عہد کی گھاٹی ! ——— بڑے بڑے
مومنوں کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے ۔ بڑے بڑے مجاہدوں
کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی ——— خطاب کا بیٹا
عمر فاروقؓ جیسا انسان بیتابانہ آگے بڑھا اور اللہ کے
رسولؐ سے بچوں کی طرح گڑگڑا کر التجا کی
"ابوجندلؓ کو بچائیے اے خدا کے رسولؐ
ابوجندلؓ کو ! ....."
لیکن اللہ کا رسولؐ ہر جذبہ و احساس بشری کی کمزوریوں
سے ماوراء ہو کر اپنے خدا کی پکار پر گوش بر آواز تھا ۔ آپکی
آنکھوں میں بھی دل و جگر کا لہو سمٹ آیا تھا مگر پھر بھی وہ نظر
ابوجندلؓ پر نہیں صلح حدیبیہ کی اس آتشیں دفعہ پر جمی ہوئی
تھی جس میں ابوجندلؓ کی قربانی دینے کے لئے ایفائے عہد
کی عظیم پکار سنائی دے رہی تھی ۔
ٹھیک اس فضائے دردوگداز میں جب ابوجندلؓ
سلاسل کی خوں آلود جھنکار کے ساتھ آنسو بہا کر پناہ
طلب کر رہے تھے ——— جب ایک بندۂ مومن کی بے پناہ
مظلومیت سے دلفگار ہو کر عمر بن خطاب کی گڑگڑاہٹ
سنائی دے رہی تھی ——— جب پورا اسلامی لشکر
عمرؓ کی آواز سے آواز ملا کر رحم ! ——— اور امان
کی بھیک ابوجندلؓ کے لئے مانگ رہا تھا ۔ محمد عربیؐ نے
آخری فیصلہ کر دیا کہ وہ "عہد" کی توہین کر کے اپنے خدا کو
خفا نہ ہونے دیں گے ۔ خواہ ساری دنیا کیوں نہ بگڑ جائے
آپؐ نے جذبات سے لبریز آواز
میں ابوجندلؓ کو تلقین صبر کی اور کہا کہ انھیں خود کو اپنے
صیاد" کے حوالے کر دینا چاہئے ۔
"کیا" ابوجندلؓ کے ہونٹوں سے پوری قوت سے
چیخ نکل گئی "کیا مجھے ان مشرکوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا
تاکہ وہ مجھے بالجبر میرے دین سے پھیر دیں ؟ ! ....."
پیغمبرؐ نے کہا ———
"اے ابوجندل ! صبر ! صبر ! ! ——— خود پر قابو
پاؤ ——— ہم نے ان سے صلح کر لی ہے اور دیکھو ہم نے
ایسا کرتے ہوئے خدا کا نام لیا ہے ۔ ہو نہیں سکتا کہ
ان کے ساتھ اس عہد کی خلاف ورزی کی جائے ———"
اور پھر کیا ہوا ؟ ۔

کوئی آہ و فغاں ہی پھر سنائی نہ دی! ــــــ کوئی احتجاج ہی بلند نہ ہوا ــــــ ابوجندلؓ جس جذبۂ بیتاب کے ساتھ پناہ کے لئے آئے تھے اس سے بھی زیادہ گہری سنجیدگی اور جوش کے ساتھ پلٹ پڑے تھے ــــــ پلٹ پڑے تھے تاکہ خود کو محمدؐ عربی کے فرمان پر خوشی سے بھینٹ چڑھانے میں کوتاہی نہ کریں۔

مسلمانوں کا کیا عالم تھا؟ ــــــ اس کا اندازہ کوئی کیسے کرتا؟ ــــــ ان کے اندر جذبات کی ایک قیامت برپا تھی۔ لیکن با ہر تعمیل حکم اور پاس محبت کی پرسکون فضا تھی اور بس ــــــ ہاں ان کی جذباتی بیقراریوں کی ایک جھلک اس وقت نظر آئی جب واپس جاتے ہوئے ابوجندلؓ کے پیچھے پیچھے عمر بن خطاب نے جست کی اور چلا کر کہا۔

"صبر کرو! ــــــ اس لئے کہ وہ محض مشرک ہیں جن کا خون ایک کتے کے خون کی طرح ارزاں ہے"۔ یہ کہا اور ابوجندلؓ کی طرف بے اختیار اپنی تلوار کو بڑھانے لگے۔ بعد میں خود انھوں نے بتایا کہ ان کا منشا تھا کہ خود ابوجندلؓ جنھوں نے کوئی معاہدہ نہ کیا تھا اس تلوار کو لیکر اپنے کافر باپ کی گردن اڑا دیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ابوجندلؓ نے تلوار نہیں قبول کی ــــــ وہ جان لینے کے مقابلہ میں اس طرح جان دینے میں نہ جانے کیسا لطف پا رہے تھے ــــــ آہ کون سمجھ سکتا ہے اس رازِ ایمانی کو! ــــــ انھوں نے ہر قیمت پر محمدؐ عربی کے الفاظ کو سینے سے لگا لیا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے یہ اپنی قسم کا پہلا حادثہ تھا ان کے سر فرطِ غم سے سینوں پر ڈھلک گئے۔ دلوں پر منوں بوجھ لد گیا تھا ــــــ سینے ضبطِ غم سے شق ہوئے جاتے تھے مگر کسی بھی ہونٹ سے ایک سسکی بھی تو نہ نکلی ــــــ ایک گرم نظر بھی تو نہ اٹھ سکی۔ وہ جذبات کے اس گھمسان رن میں فرمانِ رسولؐ کے آگے زخش راہ ہو گئے تھے۔

ہاں یہ کہانی بھی ہماری ہے! ــــــ

لیکن کون کہہ سکتا ہے؟ ــــــ

کون مان لے گا یہ بات!! ــــــ

ہم ــــــ کہ جذبات و خواہشات کی آندھی میں بے بس اور بے قابو ہو کر اسلام کے حقائق کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ بھی خیال نہیں آتا کہ ایک گھڑی سر جھکا کر اس صورت حال پر غور ہی کرلیں۔ تاسف، ندامت اور انفعال کی بات تو دور رہی! ــــــ لیکن اسی بے حسی اور گمشدگی کو ہم سینے سے لگا لگا کر کہے چلے جاتے ہیں کہ "ہم مسلمان ہیں؟"۔ دنیا، عقل اور انصاف جواب دیتے ہیں "بکے جاؤ۔ کیا تم مسلمان ہو؟"۔

الفتنۃ الکبریٰ

آپ شراب کا ایک جام چڑھا جائیں ممکن نہیں کہ نشہ پیدا نہ ہو۔ آپ بھرے ہوئے پستول کی نال کنپٹی پر رکھ کر گھوڑا دبا دیں ممکن نہیں کہ دماغ کے پرخچے نہ اُڑ جائیں ـــــ اسی طرح بدعت وہ زہر ہلاہل ہے کہ اس کا پیالہ نوش کرنے کے بعد ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کے اندر اصل دین سے بیزاری اور خود ساختہ دین سے شیفتگی پیدا نہ ہو۔ بدعت عین اپنی فطرت اور خمیر کے اعتبار سے قطعی طور پر ایک ایسی غذائے فاسد ہے جو عقل اور نفس دونوں کو موٹا کرتی ہے۔ بدعت، چاہے وہ ظاہر میں کتنی ہی خوبصورت اور مقدس ہو فکر و بصیرت کے زاویوں میں کجی ضرور پیدا کرے گی قلب و ذہن سے اصل دین کی اہمیت ضرور گھٹائے گی، غلو اور سفلہ مزاجی کو ضرور جنم دے گی۔

ہم شروع سے آج تک جو بدعت کے تعاقب میں سرگرم اور اہل بدعت کے رد میں پیش پیش ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس جرثومۂ ہلاکت سے بڑھکر ناپاک جرثومہ دین کے دائرے میں کوئی نہیں۔ یہ ایسا ملعون کیڑا ہے جو دیکھنے میں بعض مرتبہ بڑا حسین نظر آتا ہے لیکن اس کا واحد مشغلہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعتِ خالصہ کے جذبے کو گھن کی طرح چاٹے ذوق و وجدان کو سڑائے۔ اہم ترین احکام و اصول پر پردہ ڈال کر فروعی اور سطحی و ذیلی اعمال و عقائد کا جھنڈا اونچا کرے۔ یہ اندر ہی اندر ڈستا ہے اور اس کے میٹھے زہر کا خاصہ یہ ہے کہ کھوپڑی الٹ جاتی ہے جاہلانہ شدت اور احمقانہ غلو کے واہیئے خودرو گھاس کی طرح اُگ آتے ہیں۔ عقل مرے ہوئے چوہے کی طرح پھول جاتی ہے اور نفسانیت کا بڑھتا ہوا حجم قلب و روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے کسی بھی بدعتی کے آگے آپ قرآن کی صریح آیت یا رسول اللہؐ کا کوئی مسلّمہ ارشاد پیش کر کے دیکھئے۔ کیا مجال ہے اس کے کانوں پر جوں بھی رینگے۔ وہ ملعون اسے ایک حقیر شے کی طرح نظر انداز کر کے اس علم کلام کا دفتر کھول دیگا۔ جس کا ہر صغریٰ کبریٰ شیطان اور نفس امارہ کے ناپاک تعلق کا آفریدہ ہے۔

بدعت کا سب سے بڑا گڑھ بریلی ہے اس لنکا سے جو بھی نکلا (الا ماشاء اللہ) باون گز کا نکلا۔ تیجہ چہلم، نیاز فاتحہ، عرس قوالی، میلاد قیام، یہ ساری ہفوات اسی سرچشمۂ ظلمت سے نکلی ہیں رسول اللہؐ کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب کہنے کا صریح شرک اسی معبدِ ظلم و زندقہ کا پھیلایا ہوا ہے۔ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا ـــ یہ بے بنیاد خیال پیدا تو بعض اسلاف کے دماغوں میں ہوا مگر اسے عام کیا بریلوی ہی مکتب فکر نے۔ ہوسکتا ہے آپ بعض دیوبندیوں کو بھی کچھ مسائل میں بریلویوں کا ہم نوا پائیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بے شمار مغرب زدہ مسلمان مغربی طرز فکر کے ہمنوا ہیں۔ مومن یا کافر، بدعتی یا غیر بدعتی کے سر میں سینگ نہیں ہوتے۔ جو شخص دیوبند میں پیدا ہوا یا وہاں کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی وہ بھی خیالات کے پہلو سے بریلوی ہی کہلائے گا۔ اگر بدعت کے تعفن سے اس کی قوت شامہ نے مفاہمت کرلی ہے بدعت بدعت ہی ہے چاہے وہ مکے اور مدینے میں کیوں نہ ہو۔ اپنے دیوبندیوں میں بھی بدعت عنقا نہیں ہے۔ عنقا کیا معنی اب تو رفتہ رفتہ یہاں کے عالم اور نیم عالم مبلغین و واعظین بہت سی بدعتوں کا خود بھی شکار ہیں اور بہت سی بدعتوں کو صلح و رواداری کے نام پر کھلی ہوئی چھوٹ دے رہے ہیں۔ یہ ناپاک قسم کی صلح و رواداری بھی شیطان ہی کے حیلوں میں سے ایک حیلہ ہے۔ بدعت سے مفاہمت بدعت سے صرفِ نظر، بدعات سے صلح و رواداری فی الاصل توحید

وسنت سے ذہنی انقطاع اور جذبۂ حق پرستی کے زوال و اضمحلال کا ایک مظہر ہے جسے خوشنما نام دیدیئے جاتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق بڑی نعمت ہے امن وصلح کے کیا کہنے لیکن جب دین کے نام پر بے دینی، خوش عقیدگی کے نام پر شرک و بدعت، تکریم اولیاء کے نام پر ابلیسیت اور عشق رسولؐ کے نام پر سفاہت و جہالت پھیلائی جارہی ہو تو صبر و سکوت، صرفِ نظر، رواداری اور مفاہمت موت کے مرادف ہیں۔

لطف یہ ہے کہ اگر ہم صبر بھی کریں تو بریلوی سورماؤں کو چین نہیں۔ انھیں روٹی ہی ہضم نہیں ہوتی جب تک کسی مسلمان کو کافر نہ بنالیں، جب تک گالیوں اور صلواتوں سے منہ میٹھا نہ کرلیں۔ یوم اول سے آجتک ان کا ریکارڈ ہی یہ ہے کہ دور از کار قسم کی بحثیں اٹھائیں گے۔ نئے نئے شوشے نکالیں گے اور پھر کسی دیوبندی یا کسی اہل حدیث کو کافر بنائے بغیر ان کی تان نہیں ٹوٹے گی۔

اس تمہید کے بعد ہم آپ کی خدمت میں معاصر چٹان کا ایک اداریہ پیش کرتے ہیں جس کا عنوان فاضل مدیر نے رکھا ہے

"مسلمانوں کو کافر کہنا جرم قرار دیا جائے"

چٹان پاکستان کے جریدوں میں ایک ممتاز جریدہ ہے اور اس کے مدیر جناب شورش کشمیری ہے اگرچہ ہم ایک آدھ مرتبہ اختلاف رائے کرچکے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ہماری نگاہ میں بہت محترم ہیں کیونکہ چٹان کے مسلسل مطالعے سے ہم ایمانداری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کا مدیر حق پسند ہے۔ دین و ملت کے لئے اس کے دل میں درد ہے وہ ہٹ دھرم اور ضدی نہیں مخلص اور نجیب الطبع ہے

اس کا قلم سبحان اللہ نثر اور نظم دونوں میں طاق۔ نثر جاندار دلنشیں، رواں اور چست، نظم مرصع، منجھی ہوئی، پُرزور اور فکر انگیز۔ پاکستان میں جو بریلویوں نے اودھم مچایا ہے اس نے اندیشہ پیدا کردیا ہے کہ کہیں وہاں بھی علما کا حشر وہی نہ ہو جو ترکی میں ہوا تھا۔ ہم نے ہمیشہ کہا اور آج بھی کہتے ہیں کہ مغرب زدہ مسلمانوں کو ملزم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے بھی گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ خود ہماری خرمستیاں اور فتنہ پسندیاں علماء کی ساکھ بگاڑنے اور ان کو فساد کا مصدر و منبع باور کرانے میں کہاں تک کارفرما ہیں۔ کافرگری کا مشغلہ بریلوی اختیار کرتے ہیں۔ نئے سے نئے جھگڑے کھڑے کرنا بریلویوں ہی کا طرۂ امتیاز ہے اور بریلوی سے ہماری مراد صرف وہ لوگ نہیں جو بریلی میں پیدا ہوئے بلکہ ہر وہ شخص اور گروہ ہے جس نے غلو، ابتداع، نعرہ بازی، مُردہ پرستی اور فروعی مسائل میں گرما گرمی کی راہ اختیار کرلی ہے اس کا وطن چاہے دیوبند ہی ہو۔ اس نے سندِ فراغت چاہے دارالعلوم دیوبند یا اہل حدیث کے کسی مدرسے سے حاصل کی ہو لیکن اگر وہ ذہنی اعتبار سے بریلوی آئیڈیالوجی کا ہمنوا ہوگیا ہے تو اسے ہم بلا رعایت دشمن دین و ملت ہی قرار دیں گے۔

آخر بتایئے اُس صورت حال کے بعد — جو بریلوی طائفے نے پاکستان میں پیدا کردی ہے وہاں کے مغرب زدہ حکام سارے ہی مولویوں کو پنجرے میں بند کر کے کسی چڑیا گھر میں رکھنے کی تجویز سوچیں تو کس منھ سے ہم ان کا شکوہ کرسکیں گے۔ شورش صاحب دیوبندی نہیں ہیں نہ انھیں فرقہ وارانہ عصبیتوں سے کوئی تعلق ہے وہ تو ایک سیدھے سچے مسلمان ہیں جن کی دلی آرزو یہ ہے کہ ملت مسلمہ کو عروج ملے برائیاں مٹ جائیں اور بھلائیوں کا دور دورہ ہو۔ نکتۂ نظر کی جزوی غلطیاں ہم سے بھی ہوتی ہیں اُن سے بھی ہوسکتی ہیں مگر حق و صداقت سے ان کے قلب سلیم کو گہرا لگاؤ ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بریلوی حضرات کی مسلسل فتنہ سامانیوں، شوریدہ پیشتیوں اور سیہ کاریوں پر وہ چلا اٹھے ہیں پھر لائق صد شکر یہ ہے کہ غنڈہ گردی کے انداز کی کافرسازی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس بجا اور صائب نوع کی تکفیر کو لپیٹ میں نہیں لیا ہے جو ابھی کچھ ہی دن ہوئے جناب غلام احمد پرویز کو دائرہ اسلام سے خارج کرچکی ہے ذیل میں آپ دیکھیں گے کہ شورش صاحب نے لکھا ہے

"یہ بات جرم قرار دینی چاہیئے کہ آئندہ جو شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو کسی مسلمان کو اس طرح کافر کہے گا جس طرح کہ اس گروہ کا شیوۂ گفتار ہے۔ تو وہ قرار واقعی سزا کا مستحق ہوگا"

یہ عبارت صاف طور پر ان پرویزی حضرات کو مایوس کرنے والی ہے جو شورش صاحب کے صحیح ترین مطالبے کو کفر پرویزی کے دماغ میں استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ پرویز کے کافر ہونے کا اعلان بریلویوں جیسی غنڈہ گردی کے انداز میں نہیں ہوا۔ وہ پوری متانت کے ساتھ ایسے انداز میں ہوا ہے جو علم و عقل، آئین و ضابطہ، شرافت

وثقاہت اور ایمان و دیانت ہر اعتبار سے ناقابلِ اعتراض ہے یہ تو کوئی بھی ہوشمند نہیں کہہ سکتا کہ جو شخص مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہو وہ کبھی کافر ہو ہی نہیں سکتا چاہے اسلام کے ہر ہر بنیادی عقیدہ و اصول سے اعلانیہ انحراف کرتا چلا جائے۔ پرویز صاحب کا کفر کفرِ مبین ہے جبکہ بریلوی کاریگروں کی کفر سازی لفنگے پن اور غنڈہ گردی سے زیادہ کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ (عامر عثمانی)

اداریہ چٹان (بابت ۸ راکتوبر ۱۹۶۲ء)

ہم نے تین ہفتے پہلے چٹان میں کافر ساز ملّا کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا، جس میں یہ عرض کیا تھا کہ وہ لوگ جو منبر و محراب پر کھڑے ہو کر فقہی مسائل کی آڑ میں مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں اور غیر ضروری مسئلوں کا انبار پیدا کر کے مسلمانوں کی تکفیر پر تلے ہوئے ہیں انھیں اپنی اس حرکت سے باز آنا چاہیے، ان کا یہ فعل مسلمانوں کی وحدت کو نہ صرف غارت کر رہا ہے بلکہ ملک کی سالمیت کیلئے خطرناک ہونے کے علاوہ ایک ایسا طوفان اٹھا رہا ہے، جس کا نتیجہ مسلمانوں کی بربادی اور پاکستان کی تباہی ہے۔ ہم نے اس گروہ کی نشان دہی بھی کر دی تھی، کیونکہ اشاروں میں بات کرنے یا کہنے کا مطلقاً فائدہ نہ تھا۔ یہ بریلوی "علماء" کا گروہ ہے جن میں ہماری تقہ معلومات کے مطابق علماء تھوڑے بلکہ گنتی کے چند ہیں، اور مذہب کے نام پر روٹیاں توڑنے والے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ خانہ ساز مسائل کے سوا ان کے پاس علم دین بالکل نہیں، ان کا مدار محض مسلمانوں کی جہالت اور عوام کی بے بضاعتی پر ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں عامۃ المسلمین کے دماغ پر اس قسم کے نقش پیدا کر رہی ہیں جس سے اصل دین نہ صرف غائب ہو گیا ہے بلکہ مسلمانوں میں وہ تمام گمراہیاں، ضلالتیں اور بدعتیں پیدا ہو کر اصل دین بن گئی ہیں، جن کی تردید و تغلیظ قرآن پاک کے اوراق میں جابجا موجود ہے اور جو لوگ ان گمراہیوں اور نافرمانیوں پر اصرار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں عذاب النار کی خبر دی ہے۔

اس قبیلے ہی کی تخم پاشیوں کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو یہ لوگ اسلام کے نام پر غیر اسلامی مسئلے پیدا کر رہے ہیں دوسری طرف ان کی ناوک افگنی کا یہ عالم ہے، کہ اگر صلحائے امت میں ان لوگوں نے شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی، مولانا محمود الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے ذیشان اکابر کے خلاف کفر کے فتوے بہ التزام لگائے ہیں تو دوسری طرف ان کی زبان کفر ترجمان سے سر سید، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور قائد اعظم بھی نہیں بچے ہیں — حیرت یہ ہے کہ ان کا یہ لٹریچر کھلم کھلا چھپ رہا اور بک رہا ہے۔ ان کے جلسوں میں جنھیں یہ میلاد کے نام سے منسوب کرتے ہیں، نہ صرف ژاژخائی کا مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ عام مسلمانوں کو دین سے منحرف کر کے اکابر امت اور صلحائے امت کے خلاف رکیک حملے کئے جاتے اور ان کی کتابوں میں تحریف کی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے افکار کو سیاق و سباق کی قطع و برید سے اپنی منشا کے معنی پہنا دیئے جاتے ہیں۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں یہ اجازت کیوں دی گئی ہے اسلئے کہ بعض ادنیٰ سرکاری ملازم ضعیف العقیدہ ہوتے ہیں اور انہیں اصل دین کے بجائے بدعتی دین زیادہ سہل نظر آتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال کوئی چیز نہیں، اقوال ہی سب کچھ ہیں اور قیامت کے روز ان کو یا اسی قسم کی گمراہیاں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جگہ دیں گی۔ ان لوگوں کی کتابیں پڑھئیے، ان کے واعظ سنئیے ان کے فتوے ملاحظہ فرمائیے، ملفوظات پر نظر دوڑائیے، آپ عجیب و غریب مجموعہ خرافات پائیں گے۔ یہ لوگ اللہ کا صرف نام لیتے اور لکھتے ہیں، حضور (فداہ امی وابی) کی ذات اقدس کے ساتھ ایک آدھ سطر کا القاب ہوتا ہے، لیکن اپنے یا اپنے مرشدوں کے نام کے ساتھ کئی کئی صفحوں کے القاب آویزاں کرتے ہیں گویا اللہ و رسولؐ جو ہیں سو ہیں، اصل تو پیر جی ہیں یا شیخ جی یا پیران کے سجادے اور حصار تخیل کے لات و منات۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ناخواندہ مسلمانوں کا دین ان کے عقیدت خانوں کی جنس عام بن گیا ہے اور جو لوگ فرنگی تعلیم

کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں، وہ ان کے خط و خال، چہرے مہرے، وعظ و بیان، تقریر و تحریر، شرف و مجد، سیرت و صورت، جہالت و علم، قہر و غضب، طعام و کلام اور پیام دشنام سے دل برداشتہ ہو کر اسلام ہی سے آزردہ ہو رہے ہیں اس "طائفہ مقدسہ" کو اس امر کا مطلق احساس نہیں کہ نئی پود اگر اسلام کے معاملے میں بے ادب ہوتی جا رہی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب انہی حضرات کا وجود ہے، جن کی بات ایک عاجز دماغ کا شیر فروش تو سن لیتا ہے، کہ وہ تقدیر پر راضی کر دیا گیا ہے لیکن یونیورسٹی کا ایک متعلم یا معلم جس کے ہاتھ میں اب مملکت و معاشرہ کی تہذیب و ترتیب ہے ان باتوں کو بے معنی سمجھتا اور خار و خس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ——— اب سوال یہ ہے کہ اس کا نقصان کس کو ہے؟ اسلام کو اور صرف اسلام کو، ان لوگوں کا تو کچھ نہیں بگڑتا، انھیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ناخواندہ لوگوں کی بھیڑ مہیا کر دیتی ہے، اندیشہ یہ ہے کہ جس خرمن میں انہوں نے آگ لگا رکھی ہے اس کے خاکستر ہو جانے کا امکان ہے۔ اور وہ جل بجھے تو کیا باقی رہ جاتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ان کی بے لگام تقریروں پر کوئی احتساب نہیں؟ کیا احتساب ان کے لئے ہے جو سیاسی طور پر حکومت کے نکتہ چیں ہوتے ہیں یا جن کی ہسٹری شیٹ انگریزی حکومت سی، آئی، ڈی کے دفتروں میں چھوڑ گئی ہے ———

ان لوگوں سے اگر کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تو افراد کے حاکمانہ ردو بدل کا خطرہ ہوگا، اور یہ جمہوری ملکوں کی خصوصیت ہے، کہ حزب اقتدار سے حزب اختلاف چہلیں اور چوٹیں کیا کرتی ہے ان سے باخبر رہنا بھی حکومت کا فرض ہے مگر کافر گری کا جو مشغلہ ان بریلوی ملاؤں نے اختیار کیا ہے، اس سے نہ صرف مسلمانوں کی وحدت کے تباہ ہو جانے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں نے۔

۱:۔ عقائد کے صحیح مغز میں آگ لگا رکھی ہے۔

۲:۔ لوگوں کو اپنی تن پروری کے لئے گمراہ کر رہے ہیں۔

۳:۔ عامۃ المسلمین کی ناخواندگی کے باعث ان میں ایسے مسئلے پیدا کر رہے ہیں، جو حقیقۃً کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

۴:۔ اپنے سوا ہر مکتب فکر کے مسلمانوں کو کافر کہنا، کافر بنانا، اور ان کے خلاف یاوہ گوئی کرنا ان کے مذہب کی روح ہے۔

۵:۔ ان کی بعض کتابیں جو دوسروں کے خلاف ژاژ خائی سے پر ہوتی ہیں، اتنی گندہ اور شرمناک ہیں کہ ان سے کوک شاستر کی عبارت زیادہ متین نظر آتی ہے۔

— ہم نہایت عاجزی کے ساتھ صدر مملکت کی قومی مسئولیت سے عرض پرداز ہیں۔ کہ اس ساری صورت حال سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے وہ ان کی تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لینے پر کسی صحیح الخیال افسر کو مقرر کریں، خود ان لوگوں کے اعمال و افعال سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائیگی کہ ان کا یہ فتنہ ملک و قوم کی اجتماعیت، دین و مذہب کی صداقت اور علم و دیانت کی ابدیت کے لئے کہاں تک خطرناک ہے؟ یہ لوگ واقعۃً دینی مفسد ہیں، ان کا تعاقب نہ صرف ایک اسلامی ریاست کا فرض ہے، بلکہ یہ بات جرم قرار دینی چاہئے کہ آئندہ جو شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو، کسی مسلمان کو اس طرح کافر کہے گا، جس طرح کہ اس گروہ کا شیوۂ گفتار ہے، تو وہ قرار واقعی سزا کا مستحق ہوگا اور ملکی قانون کی رو سے اس کو ایسی سزا دی جائے گی جس سے دوسروں کو عبرت ہو، اسی میں پاکستان کی بھلائی ہے، اسلام کا وقار ہے اور دین کا نفع ہے، ہم اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں نہ حضور ﷺ سے، نہ بے گناہوں کی آہ سے ان کی زبانوں کو ایک ہی چیز مہر لگا سکتی ہے اور وہ حکومت کا قانون کے مطابق احتساب ہے۔

اسی شمارے کا ایک اور ٹکڑا

پولیس برانچ سے سوال کریں! یا ادب کے ساتھ سی آئی ڈی کے حکام سے پوچھیں! یا ان لوگوں سے دریافت کریں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی جن کے سپرد اس عنوان کے تحت احتساب و پرسش کی ذمہ داریاں ہیں۔ کہ ان کی نظر سے کافر گری کا وہ لٹریچر، اشتہارات، کتابیں، پمفلٹ اور رسالے گذر رہے ہیں جن کی اشاعت و طباعت کا سہرا بریلوی مکتب خیال کے اس طائفہ مقدسہ کے سر بندھ چکا ہے جس کا واحد مشغلہ مسلمانوں کی تکفیر مسلمانوں

تصنیفات میں تحریف، خود ساختہ حوالوں کی تبلیغ، اکابر علماء کی توہین اور گالی گلوچ کی نوبت رہ گیا ہے واقعہ یہ ہے سارا لٹریچر اس منبع خرافات ہی سے نکل رہا ہے۔ اور اب ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا ہے

ہم اس سوال کو فی الحال زیر بحث نہیں لانا چاہتے کہ اس لٹریچر کے مندرجات قانون کی زد میں آتے ہیں تو ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی جاتی؟ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارا لٹریچر یا اس کا غالب حصہ بے شمار دفعات کی زد میں آتا ہے۔ مگر حکام مہر بلب ہیں۔ لیکن افسوسناک تماشا یہ ہے کہ ان دنوں جو اشتہار اور پمفلٹ نکل رہے ہیں جن میں بدعت فروشوں نے خدا کے خوف سے ہاتھ اٹھا کر اپنے مخالفوں کے قتل کا علانیہ سروسامان کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ فرضی ناموں سے شائع کئے جارہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ قاعدہ و قانون کے مطابق کوئی پرنٹ لائن نہیں ہے اور اب تک اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا —— ہم کیا سمجھیں؟ ایک یہی سوال کیا جا سکتا ہے کہ حکام کہاں ہیں؟

علمائے بدعت کی زبان

اس وقت ہمارے سامنے وہ تمام اشتہارات، کتابچے، رسالے اور کتابیں ہیں جن میں علمائے بدعت نے علماء امت کو ننگی گالیاں دی ہیں مولوی غلام علی کی کتاب کا حوالہ ہم پچھلے شمارے میں دے چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے انجمن حمایت اہل سنت مصری شاہ لاہور کا ایک پمفلٹ ہے۔ جس پر کوئی پرنٹ لائن نہیں۔ نہ پریس کا نام ہے اور نہ کسی مرتب و ناشر کا یہ مجموعہ گالیوں اور بہتانوں کی پوٹ ہے۔ ایک اشتہار کسی محمد اسحاق صدیقی صدر مجلس تحفظ علمائے اہل سنت راولپنڈی کی طرف سے ہے لیکن اس پر بھی کوئی پرنٹ لائن نہیں، اس میں حضرت قاری محمد طیب، مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا تاج محمود لائل پوری، مولانا محمد علی جالندھری۔ اور مولانا غلام اللہ خاں کو مادر زاد برہنہ گالیاں دی گئی ہیں۔

چھوٹا ملّا ابن العرب مکی

جگر لخت لخت

قوم اور قانون

تعلیمی کمیشن رپورٹ پر طلباء کے احتجاج کے سلسلے میں ملک خداداد پاکستان کے ایک بڑے کرسی نشین نے تصوف کے ساتویں آسمان سے فرمایا:۔

"اس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جو قانون کا احترام نہ کر سکے"

بجا فرمایا — لیکن یہ بھی تو ارشاد فرمایا ہوتا کہ:۔

اس قانون ہی کو زندہ رہنے کا حق کب ہے جسے اندھے بنائیں اور بہرے چلائیں۔

قوم کی جائز خواہشات، بنیادی ضروریات اور معاشی و سماجی حالات کو نظر انداز کر کے من مانے قوانین بناؤ۔ قوم چیخے چلائے تو کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے رہو۔ فریادی دروازہ کھٹکھٹائیں تو چوکیداروں سے کہدو ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لیں۔

پھر صبر و ضبط کے بند ٹوٹ جائیں تو قلا بازی کھا کر صوفی بن جاؤ اور بھیڑیے کی طرح غرا کر کہو کہ اس قوم کو زندہ رہنے کا حق نہیں جو قانون کا احترام نہ کر سکے۔

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

جناب ڈاکٹر لوہیا علیہ ما علیہ کی فیض یافتہ سوشلسٹ پارٹی کی ایک شاخ نے — کہ شبھہ نام جس کا سماج وادی یووک سبھا ہے — باقاعدہ دن کے اُجالے میں مطالبہ کیا ہے

"پردے اور برقعے کو قابل تعزیر جرم قرار دینے کے لئے قانون بنایا جائے"

یہ تو کم ہے مہاشے جی! مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ کم سے کم گرمی گرمی لباس پہننے ہی کو جرم قرار دیا جائے اور نر ہو یا ناری دیوی ہو یا دیوتا — یعنی اپنے مقدس دیش بھارت کی عورتیں ہوں یا مرد موسم گرما میں ان سب کو الف ننگے پھرنا چاہئے — فائدے اس میں گوناگوں ہیں اور نقصان کچھ نہیں — کروڑوں گز کپڑا بچے گا جسے ملک سے باہر بھیجکر ہماری سرکار زرِ مبادلہ کما سکے گی — روحانیت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی کیونکہ سنا ہے لنگ پوجا بھی ایک مقدس عبادت ہے۔ اس عبادت کی ریل پیل گلی گلی کوچے کوچے ہو جائے تو روحانیت کے خزانے لبالب ہوئے بغیر کیوں رہیں گے — بے شمار سیاح دور دور سے آکر بھارتیہ خزانے کو پونڈوں، ڈالروں اور روبلوں سے بھر دیں گے۔ کیونکہ بھارتی نر ناریوں کو تہذیب نو کی بلند ترین چوٹی پر دیکھنے کا زریں موقعہ من چلے لوگ چھوڑنے والے نہیں۔

اے رنگین مزاج شہزادو! تم نے شاید پردے اور برقعے کو بھی گائے کا گوشت اور اُردو زبان سمجھ رکھا ہے کہ پاشکستہ مسلمان تمہارا زخم کر دیں گے — مگر کان اور دماغوں کے سوراخ کھولکر سن لو کہ بے طرح پٹ جانے کے باوجود یہ امت ابھی اتنی بے غیرت بزدل اور مُردہ نہیں ہوئی ہے کہ جبر و تشدد اس سے اس کا دین و اخلاق اور عفت و عصمت بھی چھین سکیں۔ تمہارے افلاطونی مطالبے پر اول تو حکومت کان نہیں دھرے گی، لیکن اگر دھر

بھی لے تو اپنی تمام قہرسامانیوں کے باوجود اس کے پنجۂ جبر کو برقعوں تک پہنچنے کے لئے آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑیگا۔

حکومت کی ناک اگر فرقہ پرستی کی بو سونگھنے میں نزلے سے متأثر نہ ہوتی تو ضرور اسے ان مطالبہ کرنے والے سورماؤں سے پوچھنا چاہیئے تھا کہ کون ہوتے ہو تم برقعے اور پردے کے متعلق مطالبوں کی ٹانگ اڑانے والے۔ تمھیں اگر پردے سے چڑھ ہے تو شوق سے اپنی عورتوں کو باہر نکالو۔ ان کے منھ اور سر پر پلو بھی پڑا نہ رہنے دو۔ تہذیب و ترقی کی راہ میں جہاں تک لیجا سکتے ہو لے جاؤ۔ جو چاہے کرو مگر یہ برقعہ — جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے یہ تمہاری آنکھوں میں کیوں کھٹک رہا ہے؟۔

مگر واہ رے حکومت! فرقہ پرستی کی تلاش قطب شمالی کے برفستانوں اور کوہ قراقرم کی گھاٹیوں میں تو کرتی رہے گی مگر زہر کے بھرے ہوئے اُن بچھوؤں کو نہیں دیکھے گی جو بالکل اس کے سامنے بڑے کلبلا رہے ہیں۔

قرضہ، کم سود اور آسان قسطوں پر حاصل کریں

آپ تو چونک پڑے!

حرج تو کچھ بھی نہ تھا اگر فدوی اور ایڈیٹر تجلی مل کر سودی کاروبار شروع کر دیتے — مگر ہم غریبوں کے پاس کیا دھرا ہے — یہ تو دراصل علمائے کرام و مفتیانِ عظام کی جماعتِ حقہ جمعیۃ العلماء ھند کے سرکاری آرگن روزنامہ الجمعیۃ (دہلی) کی ۵ اکتوبر کی اشاعت سے نقل کیا ہوا ایک عنوان ہے جو اس ایک شاعرے کے بعد بھی چھپتا رہا ہے اور جسے اس مقدس اخبار میں سُرخی کے قلم سے لکھا گیا ہے۔

عنوان کے بعد پہلا ہی فقرہ اتنا شاندار ہے کہ آپ کی توضیح میں اسے نقل نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ فرمایا گیا ہے:۔

"اپنے بازوؤں کے بل سے ہندوستان کی شان کو بلند کریں"۔

جانتے ہیں آپ روزنامہ الجمعیۃ کے راعی و مسئول کون ہیں — وہ اونچی کلغی نیچے جبے اور منغلی پائچوں والے علمائے حقہ تم حقہ کہ جن کا دعویٰ ہے:۔

دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

جمعیۃ العلماء کے صدر کچھ روز پہلے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اب دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا فخرالدین دام ظلہ العالی ہیں۔ جنرل سکریٹری، ناظم، اراکینِ شوریٰ ممبران حتیٰ کہ محرر بھی ماشاء اللہ علمائے حقہ تم حقہ بار حقہ ہیں۔

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

تصویریں تو پہلے بھی چھپتی تھیں اب بھی چھپتی ہیں۔ عرسوں کے نام پر شرک و زندقہ سے تعاون پہلے بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے۔ لیکن اُس کارِ خیر کے ساتھ تعاون جس کے بارے میں اللہ کے سچے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ سود میں ستر بُرائیاں ہیں اور ان میں کی سب سے کمتر برائی ایسی ہے جیسے ماں سے زنا کیا — خیر سے اب شروع ہوا ہے فالحمد للہ علےٰ ذٰلک۔ دیر آید درست آید۔

فدوی کو تو ٹھیک ٹھیک اُن علاقوں کا حال نہیں معلوم جہاں ابھی تک طوائفوں کا کاروبار خلاف قانون قرار نہیں پایا ہے ورنہ نیکی کر کنویں میں ڈال کے طور پر وہاں جاکر بھدر طوائفوں سے عرض کرتا کہ نیک بختو! کسی اچھے فوٹوگرافر سے اپنے دلفریب پوز کھنچواؤ، اور بالکفایت ریٹ کے اعلان کے ساتھ روزنامہ الجمعیۃ میں بھیجدو۔ کچھ ایسے مقدس قسم کے گاہک تمھارے ہاتھ ضرور آجائیں گے جو پیسے بھی پیٹ بھر کے دیں گے اور آخرت میں بخشوانے کی ذمہ داری بھی سر آنکھوں پر لیں گے۔ اس کا اندیشہ مت کرو کہ علمائے حقہ تم حقہ کا یہ طاہر و مطہر اخبار تمھارا اشتہار شائع نہیں کرے گا۔ پیسے بھرے دو اشتہار ضرور چھپے گا۔ تم اور وہ ہم پیشہ ہی ہو۔ تم اپنی خدمات بیچتی ہو وہ اپنی خدمات بیچتا ہے۔ حلال حرام کا فکر تمھیں بھی نہیں، حلال حرام کا فکر اسے بھی نہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ تم اپنی تن فروشی کے جواز پر کوئی خوبصورت سی دلیل نہیں گھڑ سکتی ہو مگر وہ اپنے علم دریاؤ سے سورج کو کالی روشنائی کی ٹکیہ ثابت کرنے پر قادر ہے۔ تم کسی پر طعن نہیں کر سکتی ہو۔ وہ بڑے بڑے فتوے داغ سکتا ہے۔ تم کبھی کبھار اپنی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوگی مگر وہ روتا نہیں غراتا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا دہلی میں ایک ولائتی کمپنی آئی تھی جیلر

درجنوں لیڈیوں نے برف کے مصنوعی فرش پر اسکیٹنگ وغیرہ کے تماشے
دکھائے تھے۔ اُس نے اپنے اشتہاروں میں ان مہذب خواتین کی
تصویریں بھی دی تھیں جن کے جسموں پر دو انگل کی چڈی (انڈرویر)
اور بالشت بھر کے سینہ بند کے سوا کوئی کپڑا نہیں تھا۔ یہ اشتہار
چشم بددور علماء کی مقدس ترین جماعت کے مقدس ترین آرگن
الجمعیۃ میں بھی چھپا تھا کیونکہ پیسے کھرے ملے اور یورپین لیڈیز
کے نیم برہنہ جسموں سے روحانیت کشید کرنے کا زرّیں موقع بھی علیٰ
رؤس الاشہاد یعنی کہ سربازار یعنی کہ دوپہر کی روشنی میں ہاتھ آیا
تھا۔ اب ظاہر ہے الجمعیۃ کے ہزاروں قارئین میں سبھی تو اتنے مُردہ
دل نہیں ہو سکتے کہ درجنوں مہوشانِ سیم تن کے اجسامِ نیم عریاں
سے انرجی اور وٹامن مستخرج کرنے کا کچھ چانس میسر آئے اور وہ
داڑھیوں میں کنگھے کرتے رہ جائیں۔ خود عاجز ہی اسی اشتہار کے
طفیل اسٹیڈیم پہنچا تھا اور اپنے کفن دفن کے لئے جمع کئے ہوئے پیسوں
میں سے دس روپے ٹکٹ کی نذر کر دیئے تھے۔ ٹکٹ ویسے دو روپے
بھی تھا، پانچ بھی۔ مگر اپنا مسلک یہ ہے کہ گو کھائے تو ہاتھی کا کھائے
کہ پیٹ بھر کر بھی ناشتے کے لئے بچ جائے۔ یہ کیا کہ چڑیوں اور کبوتروں
کی بیٹ چاٹتا پھرے۔

ٹکٹ گھر کی عقبی دیوار کی آڑ میں کئی داڑھیاں بھی صاف
لہراتی نظر آئی تھیں۔ دو صاحب تو جبّہ سمیت آئے تھے جن کے
حاشیے پر کارچوب اور کامدانی دمک رہی تھی۔ دو علمائے حق نے
افسانوی شہزادوں کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ انھوں نے کہیں
یہ پڑھ لیا تھا کہ مغربی لیڈیاں روایتی شہزادوں اور پُراسرار
لباسوں کی بڑی گرویدہ ہوتی ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اتنی بہت
سی لیڈیوں میں سے کسی ایک کی بھی نظروں پر چڑھ گئے تو وارے
کے نیارے ہو جائیں گے۔

کھیل کے دوران اسکیٹنگ کرتے ہوئے ایک مرتبہ دو لڑکیاں
ہمارے قریب سے گذریں تو سینٹ کی جاں نواز خوشبو سے طبیعت
باغ باغ ہوگئی۔ اسی وقت پاس والے جڑواں مولویوں میں سے
ایک نے بڑے ایمان افروز لہجے میں سبحان اللہ کہتے ہوئے نتھنے
پھڑپھڑائے تھے پھر دوسرے مولوی صاحب سے فرمایا تھا۔

"حضرت کمال ہے۔ اِن مغربی خواتین کے اجسام سے خوشبو
کس قدر بلیغ پھوٹتی ہے۔"

حضرت نے جواب دیا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے لڑکیوں نے محرم اور زیر جامے پر اصغر علی
محمد علی کا عطر شمامۃ العنبر لگا رکھا ہے ۔۔۔ بالکل اسی نوع کی
مہک تھی۔"

"نہیں حضرت" پہلے صاحب نے بات کاٹ کر رازدارانہ اہمیت
سے کہا "سنا گیا ہے کہ ان مغربی خواتین کے اجسام ہی قادرِ مطلق نے
خوشبودار بنائے ہیں فتبارک اللہ احسن الخالقین۔"

"واللہ اعلم بالصواب" ۔۔۔ حضرت نے طویل اور ٹھنڈا
سانس لیکر فرمایا ۔۔۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ ۔۔۔ تحقیقی نتیجے پر تو
تجربے ہی سے پہنچا جا سکتا ہے۔"

دوسرے مولانا چند ثانیئے خاموش رہے۔ نظریں لیڈیوں
کے اُس زہد شکن جھرمٹ پر تھیں جو یکے بعد دیگرے پڑنے والی
رنگ برنگی روشنیوں میں کوہ قاف کی پریوں کو چھٹی کا دودھ
یاد دلا رہا تھا۔ دفعتاً وہ کچھ یاد کر کے بولے:۔

"مولانا قطب الدین صاحب کے گہرے مراسم امریکن
سفارت خانے کے ایک بڑے افسر سے ہیں۔ غالباً ان کے توسط
سے تجربے کا بھی موقع فراہم ہو سکتا ہے۔"

"واللہ اعلم بالصواب کوشش کر کے دیکھیں گے۔"

اب یہ تو خدا ہی جانے کہ انھوں نے کوشش کی تھی یا نہیں
کی تھی اور کی بھی تو بدن اور خوشبو کے ربط کی سائنس ان پر منکشف
ہو سکی تھی یا نہیں ۔۔۔ کہنا فقط اتنا ہے کہ اشتہار چاہے ناچ گانے
کا ہو، سینما کا ہو، اُس بازار کا ہو، سود کا ہو، قمار کا ہو، کہیں کا
بھی ہو بس قانونِ ملکی کے خلاف نہ ہونا چاہئیے پھر تو آپ کھرے
پیسے دیکر علمائے حقہ در حقہ کے سرکاری آرگن کا تعاون بسرو
چشم حاصل کر سکتے ہیں۔ مانا کہ سود اسلام میں چوری، غصب،
رشوت، زنا بھی سے بڑھ کر جرم ہو اور بلا سے اللہ اور رسولؐ
نے سود خواری کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہو مگر تسبیحیں
گھمانے والوں، دو مشت داڑھی رکھنے والوں، مزاروں پر پھول
اور چادر چڑھانے والوں، نذر و نیاز دینے والوں اور ابو الاعلیٰ
مودودی کو ضال و مضل کہنے والوں کا اسلام بیچارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

مستقل عنوان

بڑا ملّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

جبل یعنی تجلی آفس کی طرف آتے ہوئے صبح ملائن نے فرمایا تھا۔

"آج دفتر سے ذرا جلدی آجیے گا۔ مرغ مسلم پک رہا ہے۔"

"تم ہاتھی مسلم بھی پکاؤ تو میرے اوقات اسیری میں کوئی فرق نہیں آسکتا ـــــ مگر ..... خیر تو ہے یہ مرغ مسلم ..... یعنی کہ ......؟"

"کل بھیا نے مرغ بھجوایا تھا کہ پکا کر آپ کو کھلا دوں ... ..."

"بہت اچھے ..... یہ طنز ملیح ہے یا ..... یا ..... مگر کچھ نہیں۔ ـــــ تم مرغ واپس بھجوا دو اور کہلوا دینا کہ ملا بدنصیب کو تو مونگ کی دال غیر مسلم ہی کافی ہے بس اتنا کرم فرمائیں کہ یہ آفس کی قید بے میعاد ختم کردیں۔ معدے سے لیکر کھوپڑی کے آخری کنارے تک گھانس اُگ آئی ہے۔"

"آپ تو فضول کڑھتے ہیں نوکری چاکری تو سبھی کرتے ہیں۔"

"بس بس ناصح مشفق بننے کی کوشش مت کرو میں تمھیں اور تمہارے بھیا کو خوب سمجھتا ہوں۔"

میں جھلایا ہوا دفتر پہنچ گیا تھا۔ مگر اپنی میز پر بیٹھنے کے بعد اچانک خیال آیا کہ بھلا اس میں جھلانے کی کیا بات تھی۔ مرغ مسلم کے لئے تو سنا ہے کہ چوری کا مرغ بھی جائز ہے مدت ہوئی خواجہ طعام الدین کے یہاں یہ نعمت نصیب ہوئی تھی۔ کیا کہنے ہیں آج تک انگلیاں چاٹ رہا ہوں۔

کام کے دوران ناک میں برابر بھینی بھینی خوشبو آتی رہی بار بار گھڑی پر نظر جاتی کہ کب بارہ بجیں اور کب سر پہ پیر رکھکر بھاگوں۔ مگر گھڑیاں اس موقع پر جسقدر نمک حرام ہوجاتی ہیں اس کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جس نے فراق کی پہاڑ سی گھڑیاں کاٹی ہوں۔ میں نے تنگ آکر گھڑی کا فیتہ کھولا اور بڑی سوئی کو ایک گردش دیدی۔ پھر اس اضطراری حرکت کو بھلا دینے کی کوشش میں ہندسوں سے سر مارنے لگا۔

" دو اور دو چار ... چار اور تین آٹھ ..... آٹھ ..... آٹھ چار اور تین سات ..... سات میں سے پانچ گئے دو بچے ..... دو میں پھر پانچ جوڑ دیئے وہی سات کے سات ..... سات اور چار دس .. نہ دہ سات اور تین دس .. دس ..... بس پیارے ملّا بس ..... بارہ میں دس منٹ رہ گئے چلو اب مرغ مسلم کی ران اُدھیڑیں گے ..... "

رجسٹر کو بند کر کے میں قبلہ کے روم میں پہنچا ـــ جی ہاں آرڈر یہی تھا کہ جو بھی دفتر سے جائے سلام کر کے جائے ـــ لاٹ صاحب کے بچے ..... سالے ہوکر بہنوئی سے ڈنڈوت کراتے ہیں۔

خدایا تو کہاں ہے کیا ہوئی تیری غضبناکی

"سلاما لیکم" میں نے روز کا وظیفہ دہرایا۔

بجائے جواب کے اُنھوں نے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "کیا بات ہے؟"

"بارہ بج رہے ہیں اور کیا بات ہے" میں نے بھی دو بدو جواب دیا۔ انھوں نے پہلے اپنی رسٹ واچ پر پھر دیوار کے کلاک پر نظر ڈال کر فرمایا۔

"یہ کلاک دس منٹ تیز ہے اور ابھی اس میں گیارہ بجکر پانچ منٹ ہوئے ہیں ـــ"

"اسے کباڑی کے یہاں بھجوا دیجئے" میں جھلایا "آپ کی رسٹ واچ میں تو بارہ ہی بج رہے ہوں گے"

"اس میں پونے گیارہ ہیں یہ دس منٹ سست ہے۔"

"اسے چکّی میں پسوا کر میری آنکھوں کا سُرمہ بنا دیجئے۔"

"اونٹ کیوں رہے ہو کیا تمہاری گھڑی میں بارہ بجے ہیں؟"

"جی ہاں صرف میری ہی نہیں دنیا کی ہر گھڑی میں اس وقت بارہ بجے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے؟"

میں نے کلائی آگے کر دی وہ ایک نظر ڈال کر مسکرائے۔

"اس میں تم اب سے دو گھنٹے پہلے بھی بارہ بجا سکتے تھے..... جاؤ چلو اپنی جگہ بیٹھو۔"

عزم بالجزم یہی تھا کہ لڑ بھڑ کر بارہ منوالوں گا۔ مگر خدا جانے کیسا تعویذ اس شخص نے گھول کر پیا ہے کہ عزم اور جزم دونوں ہی اس کے آگے پھُس ہو کر رہ جاتے ہیں سر لٹکائے پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔

صدیوں کے بعد آخر کار بارہ بج ہی گئے۔ زینے سے اترا ہی تھا کہ بشارت علی ٹکرا گئے چہک کر فرمایا۔ "ارے بھائی خوب ملے — آؤ تمہیں ایک چیز سے ملواؤں۔"

"مجھے ملک الموت سے ملوا دیجئے — جانیے میں اس وقت اچھے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"کیوں یار ناشکری کرتے ہو — کرسی پر بیٹھ کر صبح سے شام تک تو نوابی کرتے ہو اور کیا چاہیے۔"

"بجلی کی کرسی دیکھی ہے آپ نے؟" میں نے تقریباً ڈپٹ کر پوچھا۔

"خدا نہ دکھلائے — اتنے جھلائے ہوئے کیوں ہو۔"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے — اچھا فرض کیجئے کہ آپ کو موت کی کرسی پر بٹھا کر سوال کیا جائے کہ یہ جو سامنے مرغیاں پھر رہی ہیں ان کی ٹانگیں گن کر بتائیے کہ مرغیوں کی تعداد کتنی ہے — آپ کیا کریں گے؟"

"ٹانگوں کی کل تعداد کو دو سے تقسیم کر دیں گے۔" انھوں نے روانی میں کہا

"یہی میں بھی کرتا ہوں — مگر جواب ہمیشہ غلط آتا ہے۔"

"کیوں؟" وہ چونکے

"اسلئے کہ مرغیاں ایڈیٹر تجلی کی ٹرینڈ کی ہوئی ہیں وہ کھٹ سے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔"

"پھر تو تم بغیر تقسیم کے جواب دیدیا کرو۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لیا مگر نہیں چلا۔ انھیں سکھایا گیا ہے کہ سب ایک ساتھ ایسا مت کرو۔ کچھ دو ہی ٹانگوں پر قائم رہتی ہیں۔"

"پھر تو مشکل ہے" انھوں نے قہقہہ اڑایا — "اچھا چلو یار ایک ایسی چیز سے ملواؤں گا کہ طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

"اس وقت نہیں شام کو۔"

پھر شام کو موصوف کی بیٹھک میں واقعی ایک چیز ہی سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بریلی کے فیض یافتہ ایک اونچے درجے کے صوفی تھے۔ کامدانی کے کام کا اتنا لمبا چوغہ انھوں نے پہن رکھا تھا کہ مجھے پاجامے کا سراغ نہیں لگ سکا۔ سر پر کلغی دار گیروا عمامہ تھا۔ گلے میں — غالباً کبوتر کے انڈوں سے بنی ہوئی ہزار دانہ تسبیح تھی۔ اپنا تعارف آپ کراتے ہوئے بولے۔

"خاکسار کو غوثِ طریقت صوفی هل من مزید کہتے ہیں۔"

میری کھوپڑی میں پھلجھڑی سی چھوٹی — چونک کر سوال کیا۔

"کیا آپ محمود احمد عباسی ہیں؟"

"نعوذ باللہ۔ آپ عجیب آدمی ہیں۔" وہ تڑپے "بھلا اس کافر و اکفر سے ہمارا کیا تعلق؟"

"م..... معافی چاہوں گا۔ دراصل وہی آج کل اس قافیے کی کتابیں لکھ رہے ہیں۔ فدوی نے خیال کیا کہ شاید تحقیق مزید کے بعد هل من مزید آئی ہو۔"

"جی نہیں ہم ایسی ناپاک کتابیں نہیں دیکھا کرتے — آپکی تعریف؟"

"جی..... جی خاکسار کو یا ایہا الذین آمنوا کہتے ہیں۔"

ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کسیلی آواز میں بولے۔

"کیا فرمایا! یا ایہا الذین آمنوا؟"

"جی ہاں۔ میں نے ذرا مختصر کر دیا۔ ورنہ پورا نام تو دادے صاحب نے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ رکھا تھا۔"

"اتنا لمبا!"

"ارے صاحب یہ تو کیا ہے — میرے پھوپی زاد بھائی کا نام خدا بخشے دو مصرعوں میں تھا۔

يَا مَعْشَرَ الْعُشَّاقِ بِاللّٰهِ خَبِّرُوْا
اِذَا حَلَّ عِشْقٌ بِالْفَتٰى كَيْفَ يَصْنَعُ"

وہ خوش ہو کر بولے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں عربی کا بہت شوق ہے۔ ہمارے دادے بھی عربی کے بہت شوقین تھے انہی کے حکم پر

والد صاحب نے ہمارا نام تجویز فرمایا تھا۔"

"یہ دینداری کی علامت ہے۔ آپ بھی اپنی اولاد کا نام اسی انداز کا رکھیں تو برکت نسلاً بعد نسل چلیگی۔"

"خیال تو ہمارا بھی یہی تھا مگر کوئی مناسب قافیہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"قافیہ تو بنا بنایا ہے۔ خلافت معاویہ ویزید بسبر صوفی ھل من مزید"

"پھر آپ نے اس مردود کتاب کا نام لیا۔ سُنا ہے اس میں امام حسین علیہ السلام کو منہ بھر بھر کے گالیاں دی گئی ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"فدوی نے تو اُسی وقت محمود عباسی کے کافر و مرتد ہونے کا فتویٰ دیدیا تھا۔ جب یہ کتاب چھپی بھی نہیں تھی۔"

"الحمد للہ۔ آپ پکے دیندار معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں آپ کی دعا سے اب تک دو درجن کافر بنا چکا ہوں۔ مگر صوفی صاحب ایک شخص اتنا کٹر وہابی ہے کہ کسی طرح کافر نہیں بن پاتا۔"

"کیوں؟" وہ پرجوش لہجے میں بولے "ہمیں بتائیے کون ہے وہ ملعون۔"

"ایڈیٹر تجلی — آپ نے نام تو سنا ہوگا عامر عثمانی۔"

"استغفر اللہ۔ اُس وہابی کا نام کس نے نہیں سنا۔ شیطان کی طرح مشہور ہے۔ مگر وہ تو کافر ہے ہی پھر کیا دشواری پیش آرہی ہے۔"

"دشواری یہ پیش آرہی ہے کہ اس کی بیوی میری خالو زاد بہن ہے کفر کا فتویٰ دیتا ہوں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے نکاح ٹوٹ گیا تو وہ میرے ہی سر آپڑیگی کہ تمہی نے نکاح توڑا ہے تمہی میرا خرچ اٹھاؤ۔"

"یہ تو واقعی دقت ہے ...... م مگر آپ اس سے عقد کر لیجئے گا۔"

"باپ رے ....." میں اچھل پڑا "یہ کیسے ممکن ہے صوفی صاحب شریعت پانچ بیویوں کی اجازت نہیں دیتی۔"

"ارے تو کیا آپ کے چار بیویاں ہیں؟"

"جی ہاں چار — مطلب یہ ہے کہ کہنے کو تو ایک ہی ہے مگر چار ملکر جو درگت بنا سکتی ہیں وہ اکیلی بنا لیتی ہے — کیا کوئی ایسی ترکیب ہے کہ ایڈیٹر تجلی کافر بھی بن جائے اور اسکا نکاح بھی نہ ٹوٹے۔"

"ہے — ایسی بھی ہے" صوفی صاحب نے فخر سے فیالسب آواز میں کہا — "تھوڑا سا خرچ کرنا ہوگا۔"

"ضرور کروں گا — بتائیے کتنا؟"

"آپ کی آمدنی کیا ہے؟"

"یہی کوئی بارہ سو روپے مہینہ —"

"ماشاء اللہ پھر تو پانچ سو میں کام ہوجائے گا۔"

"گڈ لک — پانچ سو مزید بطور نذرانہ پیش کروں گا۔ بس ایسا کس فتویٰ رگا دیجئے کہ بھیا جان ناچتے پھریں — اس کی وہابیت سے بڑے بڑے اولیاء اللہ ناراض ہیں۔"

"ملعون ہے پکا۔ اس کا کفر تو سورج کی طرح روشن ہے۔ آپ بے فکر رہیے ہم پوسٹر چھپوا کر گلی گلی لگوا دیں گے۔"

"جزاک اللہ۔ مگر نکاح کو بچا لے جانے کی کیا ترکیب آپ نے سوچی ہے؟"

"اجی سوچی کیا تجربے میں آئی ہوئی ہے۔ جب ہم بریلی میں تھے تو ہمارے ایک معزز کارکن کو جماعت اسلامی والے وہابی بنا لے گئے تھے ہم نے کفر کا فتویٰ صادر کیا تو اس کا سالا دوڑا دوڑا آیا کہ حضرت جی یہ آپ نے کیا کر دیا۔ میری بہن تو کہیں کی نہ رہیگی۔ خدا کے لئے کوئی صورت نکالئے کہ نکاح نہ ٹوٹے۔ ہم نے کہا کہ نکاح تو کافر ہوتے ہی ٹوٹ گیا مگر خیر ہم پیر و مرشد سے پوچھیں گے وہ شاید کوئی راستہ نکالیں۔ پھر ہم نے پیر و مرشد سے پوچھا تھا تو انہوں نے ایک ترکیب بتادی تھی۔ چنانچہ کفر کا فتویٰ تو نہیں ہٹا مگر نکاح بجا کا جڑا رہا۔"

"کمال ہے — مگر ....."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ دیوبندی لوگ نذر و نیاز کی برکت سے آگاہ نہیں۔ پوری ترکیب تو میں کسی کو بھی نہ بتا سکوں گا مگر مختصراً اتنا بتاتا ہوں کہ اہل اللہ کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ نذر و نیاز سے انھیں خوش کیجئے وہ جیسا آپ چاہیں گے کر دیں گے۔ نکاح کا توڑنا اور جوڑنا تو کیا چیز ہے اولیاء اللہ چاہیں تو سورج کو توڑ کر مٹھی میں دبالیں اور ساری دنیا اندھیرے میں ٹکراتی پھرے۔"

"سچ فرمایا۔ بجا فرمایا — میں تو آپ کی دعا سے اولیاء اللہ پر جان دیتا ہوں۔ خدا کے فضل سے کافر تو میں ابھی ایڈیٹر تجلی کو بنا سکتا تھا مگر یہی نکاح کی دشواری تھی — آپ نے اللہ کی سنوار بڑی مشکل حل کردی۔"

"ٹمپ کا حسن ظن ہے" انھوں نے شاعروں کے انداز میں کہا۔ "فرمائیے پانچسو روپے کب دلوا رہے ہیں"؟

"بس اگلے ہفتے۔ مگر کفر کا فتویٰ لکھکر آپ آج ہی کتابت کرادیجئے کل چھپ جائے گا....؟"

"جی نہیں فتویٰ نکل گیا تو نکاح ٹوٹ جائیگا۔ پہلے نذر و نیاز سے نکاح کی روک تھام کرلینی ہے پھر فتویٰ نکالیں گے۔"

"مگر ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ بریلی والے کے لئے آپ نے فتویٰ صادر کر دیا تھا اور اس کا نکاح ٹوٹ بھی گیا تھا بعد میں جوڑا گیا۔۔۔؟"

"اوہ..... ارے ہاں..... ٹھیک ہے بعد میں بھی جڑ جاتا ہے خیر تو فتویٰ ابھی ہم لکھے لیتے ہیں۔ کاتب کا انتظام آپ کرلائیے۔"

پھر اگلے ہی روز ایک جہازی پوسٹر شہر بھر میں چپک گیا ملخص اس کا یہ تھا کہ ایڈیٹر تجلّی اول درجے کا کافر ہے۔ مرتد بھی ہے زندیق اور ملحد بھی ہے یزیدی اور ناصبی بھی ہے ثبوت میں اس کی تحریروں کے بعض تراشے بھی دئے گئے تھے۔ ان سے ایڈیٹر صاحب کے یہ عقائد ثابت ہوتے تھے۔

(۱) اللہ کے رسول معاذ اللہ خاکی بشر تھے نور نہیں تھے۔ (۲) اللہ کے رسول کو معاذ اللہ علم غیب نہیں تھا نہ وہ حاضر و ناظر تھے (۳) اولیاء اللہ معاذ اللہ ملک الموت کے آگے بے بس ہیں وہ بھی عام آدمیوں کی طرح مرجاتے ہیں (۴) مزارات شریف پہ عاشقانہ غزلیں گانے والی عورتیں معاذ اللہ رنڈیاں ہیں ان سے دلبستگی کرنے والے معاذ اللہ گنہگار ہیں۔ (۵) اولیاء کے روضوں پہ چادر اور پھول چڑھانا معاذ اللہ بدعت ہے اور وہاں مرادیں مانگنا معاذ اللہ شرک ہے (۶) حضرت امام حسین اور حضرت علی علیہما السلام معاذ اللہ خطا کرسکتے تھے اور سیدزادے بھی معاذ اللہ دوزخ میں جاسکتے ہیں۔

ان عقائد کو ثبتِ قرطاس کرکے یہ فتویٰ دیا گیا تھا۔

"ایسے ناپاک عقائد رکھنے والا بہ اجماع امت کافر و اکفر ہے اور تمام علما نے خلف و سلف اس کے کفر پر مجتمع ہیں اسکا نکاح اگرچہ یہ اسباب خصوصی قائم کا قائم رہا باقی تمام معاملات میں اس سے کافروں جیسا معاملہ کیا جائے اور جب یہ مرجائے تو اس کی نعش کو بغیر غسل دیئے کسی نالے تالاب وغیرہ میں پھینکدیا جائے یا اگر کوئی اہل سنت والجماعت دین کی حمایت کے خیال سے اسے قتل کردے تو کسی مسلمان کے لئے پولیس میں رپورٹ کرنا جائز نہیں نہ پولیس ہی کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسے ملعون شخص کے قتل کی تحقیق کرے اور قاتل کو سزا دلوائے۔ جو شخص عامر عثمانی کے کفر میں شک کرے گا وہ بھی کافر اور اس کے کفر میں جو شک کرے وہ بھی کافر۔ اسی طرح قیامت تک وہ تمام اشخاص کافر ہوتے چلے جائیں گے جو عامر عثمانی کے کفر میں یا اس کے کفر میں شک کرنے والوں کے کفر میں ذرہ برابر شک کریں گے یا اس کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہیں گے۔

واللہ اعلم بالصواب　　　غوث طریقت صوفی جل من مزید عفی عنہ

اس فتویٰ کو کتابت کراتے ہوئے مجھے خیال ہوا تھا کہ عام طور پر فتاویٰ میں ایک دو اور عالموں کی بھی تصدیق کرائی جاتی ہے۔ اس سے فتویٰ مضبوط ہوجاتا ہے دماغ پر زور ڈالنے سے یاد آیا کہ دنگئی پیر والے درگاہ کے سجادہ صاحب بھی مفتی ہیں اور ایڈیٹر تجلّی کے جانی دشمن۔ سیدھا انہی کی خدمت میں پہنچا۔ فتویٰ دیکھکر وہ بہت خوش ہوئے اور ذیل کی تصدیق لکھی۔

"فتویٰ بالکل درست ہے البتہ فتویٰ لکھنے والا خود بھی کافر ہوا۔ کیونکہ اس نے فتوے کے خاتمے پر واللہ اعلم بالصواب لکھا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ عامر عثمانی کے کفر میں اسے ابھی کچھ نہ کچھ شک باقی ہے اسے سوا سات روپے کی نیاز دیکر تجدید ایمان اور تجدید نکاح کرلنی چاہیے۔

حقیر فقیر صوفی نزاکت میاں سبزواری۔

اس کے بعد صوفی انقلاب علی سے تصدیق لکھوائی انھوں نے رقم کیا۔

جواب بالکل صحیح ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ"

میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کرلیا کہ اس آیت کا یہاں کیا جوڑ ہوا۔ غضبناک ہوکر بولے "تم عامی افتاء کے معاملہ میں کیا دخل دیتے ہو"

اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جن لوگوں نے کفر کیا انھیں چاہئے کہ اللہ کی طرف سے گھیر لو یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق خواجہ گیسو دراز حضرت شاہ محفوظ علی رضی اللہ عنہ نے تقدیر کی لوح پر لکھ دیا تھا کہ یہ قرآن کو جھٹلانے والے ہیں — جاؤ یہ تم جیسوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔"

تو یہ مع فتوٰی چھپ تو گیا لیکن ایڈیٹر تجلی پر اس کا فوری ردِ عمل دیکھنے کا موقع مجھے نہیں مل سکا۔ صوفی صاحب کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ رضوان آباد چلئے وہاں میلاد ہے یہاں سے ہم شیخ بھینڈے کو لئے جا رہے ہیں۔

شیخ بھینڈے ایک نابینا میلاد خواں تھے آواز اچھی تھی میں نے سوچا چلو ایک دو دن تفریح ہو جائے گی۔

مولود خاصا شاندار ثابت ہوا۔ بہت بڑے ہال کو خوب سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر میر مجلس شیخ بھینڈے ہی بنے۔ مغرب سے عشاء تک لاؤڈ اسپیکر پر ریکارڈ بجتے رہے۔ ایک دو گانا تو بے شک صوفیانہ تھا مثلاً فلم یا نکا مجاہد کا یہ گانا۔

"دشمن کا خون پی لوں گا ترے پیار کی قسم ہر حال میں جی لوں گا۔ آجا مرے دل کے سہارے آجا۔"

یا فلم "میرا اسلام لے جا" کا یہ گانا۔

"میں جاؤں گا مدینے۔ مجھے آنے لگے پسینے۔ اب تو مدد کر غوث الاعظم۔ غوث الاعظم کیا کہنے —"

لیکن اس کے بعد وہ شروع ہوا

"تری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے —"

اللہ اللہ

"اتنے تو ذرا منہ پھیرے لو چند اہم چھپ کے پیار کر لیں گے شکوے ہزار کر لیں گے۔"

میں نے صوفی صاحب سے کہا کہ یہ سب کیا ہے کہنے لگے۔

"بھئی ذرا مجمع اچھا لگ جائے گا دیکھتے نہیں ابھی سے چہل پہل ہے۔"

"وہ تو ہے مگر مولود شریف کے دن تو خالص روحانی چیزیں ہونی چاہئیں تھیں۔"

"ارے تم کچے ہو۔ روحانیت تو آدمی کے دل میں ہوتی ہے ہمیں دیکھو ان گانوں سے بھی طریقت کا سبق لیتے ہیں۔ آپ ضرور سنتے ہوں گے مگر مجھے تو انھیں سن کر شنکر دیال مالا یاد آرہی ہے۔"

"کچھ حرج نہیں۔ ذرا طبیعت روشن کر لو پھر ہر چہرے کے پیچھے مولا کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔"

اتنے میں ایک صاحب خواجہ ہد ہد داخل ہو گئے۔

"ارے بھئی صوفی صاحب یہ آپ کا شرفو بڑا بد تمیز ہے۔ ہم نے کہا تھا انار کلی والے ریکارڈ بجائے کہتا ہے ہم تو نہیں بجاتے۔"

"ہم اس کے کان اینٹھیں گے آپ ذرا اسٹیج سے لونڈے لاروں کو ہٹا دیجئے۔"

عشاء کے بعد مولود شروع ہوا۔ اسٹیج بڑا نہیں تھا۔ دو چھوٹے تخت جوڑ کر ان پر قالین بچھا دی گئی تھی۔ میلاد کرانے والوں کے اہل و عیال نے اسے پُر کر دیا تھا۔ شیخ بھینڈے آگے بٹھائے گئے تھے۔

تلاوت قرآن سے محفل شروع ہوئی۔ شیخ بھینڈے نے منہ زبانی روایات بیان کرنی شروع کیں۔ قصص الانبیاء انھیں ازبر یاد تھی۔ میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا کیونکہ کئی ایسی روایتیں سننے میں آئیں۔ جو نہ کبھی پڑھی تھیں نہ سنی تھیں۔ مثلاً ایک روایت تھی.....

شیخ بھینڈے ہی کی زبان میں سنئے۔

"تو بھائیو جب آگاہ کیا رب العزت نے فرشتوں کو کہ آج پیدا ہونے والا ہے آمنہ بی بی کا لال تو گر گئے چھیالیس ہزار چھ سو ننانوے فرشتے سجدے میں اور لباس بدلے حورانِ بہشتی نے کر سجائی گئی بیچ جنت کے محفل شریف میلاد شریف کی اور گایا حوروں نے نعت کا نغمہ کھلتے چلے گئے زمین سے آسمان تک گلاب اور گیندے اور موتیا اور جوہی کے پھول۔ اور جس وقت تشریف لائے دنیا میں آمنہ کے لال سجدے میں گر گئے تمام عالم کے کلیسا اور بت خانے — اور چھائی رہی تمام عالم پر سات ماہ تک روشنی کہ نہ کم ہوتی تھی باوجود ڈوب جانے سورج کے اور راوی نے بیان کیا ہے کہ تھی ایسی عجیب روشنی کہ اندھی عورتوں نے ڈورے ڈالے سوئیوں میں اور اندھوں نے جدا جدا کیا کالے اور سفید تلوں کو بے دھڑک۔ پھر جب انگوٹھا چوسا آمنہ کے لال نے تو پھوٹنے

لگے خوشی سے عرش اعظم کے فرشتے اور اجازت دی رب العزت نے اس بڑی خوشی کے دن فرشتوں کو واسطے تقسیم کرنے شیرینی کے آپس میں بھی اور دنیا والوں میں بھی.....۔"

اس کوالیٹی کی کئی روایتیں سننے کے بعد میں نے چپکے سے صوفی صاحب سے پوچھا۔

"کیا یہ سچی روایتیں ہیں ـــ"

وہ چمک کر بولے ـــ "کمال کرتے ہو۔ میاں وہ تو حوالے سے بیان کر رہا ہے سنا نہیں اس نے کہا تھا کہ راوی نے کہا ـــ"

"جی ہاں ـــ مگر راوی تو آتو کا پٹھا بھی ہو سکتا ہے۔"

"چپ چپ ـــ" انھوں نے بگڑ کر کہا۔ "کسی نے سن لیا تو جھگڑا بندھ جائے گا۔ راوی کے لئے بُرے الفاظ مُنھ سے نہیں نکالا کرتے۔"

کچھ دیر بعد سلام کا نمبر آیا اب سب کھڑے ہو گئے۔ جان کی سلامتی تو اسی میں تھی کہ میں بھی تقیہ کر کے کھڑا ہو جاؤں مگر دفعتہً کھوپڑی کے سوراخوں سے ایک نکتۂ لطیف دماغ میں داخل ہوا اور میں ہمت کر کے جوں کا توں بیٹھا رہا۔ سیکڑوں کھا جانے والی نظریں میری سمت تھیں۔ صوفی عل من مزید بھی بڑے بُرے منھ بنا رہے تھے مگر شیخ بھیندے غریب کو کیا معلوم۔ وہ لہرائے گیا اور لوگ سلام کے اختتام تک ضبط کئے رہے۔

پھر سلام ختم ہو گیا تو چاروں طرف سے مجھ پر دھاوا تھا جتنے منھ اُتنی ہی باتیں۔

"وہابی ہے ـــ کافر ہے ـــ گمراہ ہے ـــ بدعقیدہ ہے۔"

آنکھ ناک بچاتا ہوا میں اچھل کر اسٹیج پر آیا اور مائیکروفون میں چیخا۔

"بھائیو سن تو لو ـــ ارے سنو تو ہوا کیا ـــ شکر ادا کرو احقر کی وجہ سے تم سب بچ گئے ورنہ...... ورنہ قسم ہے داد سے پیر غوث دستگیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہاں خون کی ندی بہتی نظر آتی۔"

لوگ چونکے ـــ پھر چاروں طرف سے استعجابیہ آوازیں بلند ہوئیں۔ "کیا ہوا صاحب...... بتائیے تو کیا ہوا۔"

"بیٹھ جائیے۔ آپ سب حضرات اپنی جگہ بیٹھ جائیے ـــ"

جب مجمع پُرسکون ہو گیا تو میں نے گلا صاف کر کے ارشاد کیا۔

"اے آقائے دو جہاں کالی کملی والے آمنہ کے لال کے متوالو ـــ پروانو ـــ جاں نثارو! ـــ درود پڑھو پہلے تین تین مرتبہ سب درود پڑھو ـــ اللھم صلی علیٰ......"

بھنبھناہٹیں بلند ہوئیں ـــ جوش ہلکا پڑا۔ ہلکا کیسے نہ پڑتا۔ مشہور یہ کر دیا گیا ہے کہ نذر و نیاز و میلاد وغیرہ کو بدعت کہنے والے وہابڑے درود پڑھتے ہی نہیں۔ رسول اللہ کی ثنا سے ان کی جان نکلتی ہے اب عاجز کی طرف سے درود کی یہ تبلیغ و تکریم دیکھ کر انھیں کچھ کچھ اطمینان ہوا تھا کہ یہ شخص وہابڑا نہیں ہے بلکہ سچ مچ کوئی گہرا راز منکشف کرنے والا ہے۔

جب درود سے فراغت ہوئی تو عاجز عرض گزار ہوا۔

"اے محبوب سبحانی صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیو نہ پوچھو آج کیا ہوا ـــ جس وقت شیخ بھیندے نے سلام شروع کیا ہے تو سرکار رسالتؐ کا یہ غلام بھی فرطِ تعظیم میں کھڑا ہونے والا تھا کہ گم سُم ہو کر رہ گیا ـــ کیا دیکھتا ہوں وہاں سامنے (میں نے آمد و رفت والے دروازے کے باہر کی سمت اشارہ کیا) حضور پُر نور سید الابرار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں اور ان کی نظریں جائزہ لے رہی ہیں کہ اس محفل میں کس جگہ تشریف فرما ہوں۔ آپ کے آگے آگے شیرِ خدا علی مرتضٰے تھے جن کے دستِ مبارک میں برہنہ شمشیر تھی۔ وہ بھی بے تابانہ نظریں ڈال رہے تھے کہ اس محفل میلاد میں کونسی جگہ ہے جہاں دو جہاں کے شہنشاہ کو بٹھائیں۔ جب کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی تو غضبناک ہو کر آگے بڑھے اور میرے سینے پر شمشیر بُراں کی نوک رکھ کر فرمانے لگے کہ" اے بدبخت نابکار! ایک معمولی افسر اور وزیر اور بادشاہ کے لئے بھی خاص مسند بچھائی جاتی ہے مگر اس محفل میں دو جہاں کے سردار افضل البشر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی اہتمام اس کا نہیں ہے کہ وہ تشریف لائیں گے تو کہاں بیٹھیں گے ـــ کیا انھیں اس گھٹیا مسند پر بٹھایا جائیگا جہاں شیخ بھیندا بیٹھا ہے یا نعوذ باللہ وہ لوگوں کے پیروں میں تشریف رکھیں گے۔"

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ شیرِ خدا کی گرج اور ننگی تلوار کی دہشت۔

نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اے داماد رسول! یہ سوال تو آپ سب کھڑے ہونے والوں سے کیجئے جنھیں پہلے سے معلوم تھا کہ آپ تشریف لائیں گے اور سلام پڑھتے ہوئے یہ کھڑے بھی اسی لئے ہو گئے ہیں کہ تشریف لانے والے معزز مہمان کی تعظیم کریں۔ یہ غلام کھڑا نہیں ہوا کیونکہ خود کو میزبانوں میں شامل کر کے معزز مہمان کی بے حرمتی کرنے کا گناہگار بننا نہیں چاہتا تھا۔"

حضرت علی نے ایک قہر آلود نگاہ مجمع پر ڈالی اور فرمانے لگے۔

خاص طور پر مجھی سے ہم نے اسلئے ہمکلامی کی ہے کہ تیری کھوپڑی میں گودا معلوم ہوتا ہے تو ہی وہ شخص ہے جس نے یہ احساس کیا کہ ایک نہایت درجہ معزز و مکرم مہمان کے شایان شان ہمارے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہے تو ہم میزبان بننے کی جسارت کیسے کریں۔ یہ مردود شہنشاہ دو عالم کو اپنی محفل میں بلاتے ہیں اور تعظیم کے لئے کھڑے بھی ہو جاتے ہیں مگر اتنی تمیز نہیں ہے کہ آخر معزز مہمان بیٹھے گا کس جگہ؟"

میں نے لرزتی کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"اے خلیفۂ راشد! آپ فرمائیں تو اسٹیج سے میں شیخ پھینڈے اور دوسرے لوگوں کو ہٹوا دوں اور حضور پر نور اس پر تشریف رکھیں۔"

گرج کر بولے۔

"نابکار۔ یہ اسٹیج جن دو تختوں سے ملا کر بنایا گیا ہے تجھے معلوم ہے اس پر کیا کیا کوتک ہوتے ہیں۔ شرم شرم اے بدتمیز انسان شرم۔"

میں نے عرض کیا۔

"اے شیر خدا! شرم مجھے تو بہت آگئی ہے مگر یہاں اور کوئی شرم دار نہیں ہے میں تو خود آپ کی طرح ان کا مہمان ہوں۔ یہ مجھے مجھے وہیڑا قرار دیکر جہنم پہنچا دیں گے۔"

وہ دہاڑے

"بکواس بند کر و غنیمت ہے کہ عمر فاروق آتے آتے رہ گئے ورنہ وہ تم سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھدیتے۔ غرض تو میرا بھی یہی تھا کہ تم سب کی گردنیں قلم کر دوں لیکن تجھ فرد واحد کو یہاں

پاکر خیال ہوتا ہے کہ انھیں ایک موقعہ دیا جائے۔ تو انھیں سمجھاتا کہ بدبختو! انس و جن کے سردار کو مہمان بنانے کا شوق ہے تو شایان شان میزبانی کا سلیقہ بھی سیکھو!

میری جان میں جان آئی عرض کیا۔

"اے صحابی محترم! کیا یہ طریقہ موزوں ہو گا کہ ہر محفل میلاد میں بڑھیا سا تخت قالین وغیرہ سے سجا کر خالی چھوڑ دیا جایا کرے کہ اللہ کے رسول اس پر تشریف رکھیں گے؟"

حضرت علی ہنسے۔

"اے بھولے بھالے جوان۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ معمولی کلکٹر و زیر، صدر کی میزبانی کس پیمانہ پر کی جاتی ہے۔ پھر کیا دنیا کے سب سے بڑے انسان کی میزبانی کا حق ایسی ہی چُھٹر پُٹر سے ادا ہو جائے گا؟"

میں جھکرایا۔ "بات تو سچ ہے اے شیر خدا مگر ہم غریب لوگ شایان شان ساز و سامان کہاں سے لائیں گے۔"

ارشاد ہوا۔

"اب تو نے عقل کی بات کی۔ بے شک اللہ کے رسول کو سامانِ دنیا کی پروا نہیں ہے۔ مگر ان کی میزبانی کی جسارت کرنے والوں کو صلاح و تقویٰ کا وافر سرمایہ تو ضرور ہی جمع رکھنا چاہئیے کیا تو نہیں دیکھتا کہ ان کے اعمال و احوال کس قدر ناگفتہ بہ ہیں۔ یہ اب جاکر سوئیں گے تو ان میں سے کتنے ہی دن چڑھے اٹھیں گے۔"

میں نے کہا

"سچ فرمایا اے داماد رسول! مگر شیخ پھینڈا تو پکا نمازی ہے۔"

انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر جواب دیا۔

"تو کیا جانے اس مردِ ناہنجار کا حال اس نے میلاد پڑھتے ہوئے تین مرتبہ نہایت متعفن گوز مارا ہے جس کی بدبو سے رحمت کے فرشتے کئی کئی میل دور بھاگ گئے ہیں۔"

دفعتہً مجمع میں بھونچال سا آگیا۔ سب بڑی دلچسپی سے عاجز کی داستان سُن رہے تھے یہ اطلاع ان پر بجلی بن کر گری کہ شیخ پھینڈے کی خفیہ کارروائی سے رحمت کے فرشتے بھاگ گئے۔ بھورے قصائی نے تو فوراً ہی شیخ پھینڈے کے گریبان

پر ہاتھ ڈال دیا- اور غرا کر پوچھا-

" اے خبیث میلاد پڑھتے ہوئے گوز مارتا ہے"

مولابخش حلوائی بھی ترنخ کر بولا — ہاں ہاں مجھے بھی بدبو آئی تھی"

بیچارے شیخ بھینڈے گھگھیا کے عرض گزار ہوئے

" اجی میرا کرتہ پھٹ جائے گا- میری کیا خطا کھانے میں خالی ارد کی دال اور گوبھی کی بھجیا تھی"

" اجی حاجی جی تو اتنا کھایا ہی کیوں تھا"

" کھا ہی لیا تھا تو پہلے استنجا ہو آتے"

اسی طرح کی چنیں چناں سے فائدہ اٹھا کر عاجز تو وہاں سے سرک آیا اور سر پہ پیر رکھکر بس اسٹینڈ کی طرف بھاگا- سرکنا اسلئے ضروری تھا کہ کیا خبر کب ان کے جوش غضب کا رخ میری طرف ہو جائے اور کب میں وصیت کے بغیر ہی بھرتہ بنا دیا جاؤں-

(ملا زندہ صحبت باقی)

انگریزی اخبار کی ضرورت

مسلمانوں کے لئے ایک معیاری قسم کے انگریزی اخبار کی اس وقت جتنی شدید ضرورت ہے اس کا احساس کم سمجھ اور بے حس لوگوں کے سوا ہر مسلمان کو ہے۔ ایک اخبار اگرچہ اُس لشکرِ صحافت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے جس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اس دیس سے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن، امتیازات اور دین و اخلاق کا جنازہ نکال کر رہیگا۔ لیکن جہاں ایک ہی کے لالے ہوں وہاں ایک سے زائد کی بات کیا کی جائے۔ فی الحال تو ہم یہی سے ہر شخص کو اپنے مقدور بھر اِن لوگوں سے تعاون کرنا ضروری ہے جو انگریزی اخبار کے لئے برادرانِ ملت سے التماس کرنے آ اٹھے ہیں۔

ذیل میں کچھ باحوصلہ حضرات کا مرتب کردہ اعلانیہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ راقم الحروف اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے صدقاتِ جاریہ اور اجتماعی نیکی کو جو بلند و برتر مقام دیا ہے اس کا شدید تقاضا ہے کہ اس نازک وقت میں ہم اپنے باہمی اختلافات سے بالاتر ہوکر اُس انگریزی اخبار کے اجراء اور بقاؤ ترقی میں تن من دھن سے مدد دیں جس کی حیثیت فی الحقیقت ایک دفاعی قلعہ کی سی ہے جسے اسلام اور ملت مسلمہ پر مسلسل کئے جانے والے حملوں کے دفاع میں تیار کیا جا رہا ہے۔ سادہ و معصوم لوگ شاید نہ سمجھ سکیں کہ ایک انگریزی اخبار کی اشاعت دینی اعتبار سے کوئی ثواب کا کام ہو سکتی ہے لیکن ہم ان دوستوں کو یاد دلائیں گے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جب ایک بار باطل کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے خندق کھودنے کی ضرورت پڑی تھی تو اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ساتھ مل کر خود بھی خندق کھودنے میں حصہ لیا تھا اور اس کام کو اتنی اہمیت دی گئی تھی کہ اللہ کے اس سب سے بڑے پرستار کی چند نمازیں بھی قضا ہوگئی تھیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جب اسلام اور ملت مسلمہ شدید خطرے میں ہو تو اس کی حفاظت و بقاء کی تدبیریں سب سے بڑی عبادت بن جاتی ہیں۔ اپنے وطن میں بظاہر ہم مساوی حقوق کے مالک ہیں لیکن عملاً ہمیں جس نچلی سطح پر پہنچا دیا گیا ہے اس کا علم و احساس کسے نہیں۔ یہ سطح ابھی اور نیچی ہو سکتی ہے ہمیں اور زیادہ پیسا، کچلا اور دبایا جا سکتا ہے اس المناک صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جہاں دوسری نوع کی جہد و سعی ضروری ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا کم سے کم ایک انگریزی اخبار تو ہو جو ظالموں کے ظلم اور سفاکوں کی سفاکی سے عوام کو بروقت آگاہ کر سکے۔

عاجز بغیر کسی مبالغے، اللہ اور حساب آخرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، دیانت اور ایمانداری کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جس شخص نے اسلام اور ملت مسلمہ کے درد، حق کی حمیت اور اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے اس اہم ترین کام میں تعاون دیا اسے ویسا ہی ثواب ملے گا۔ جیسا کسی مسجد کی تعمیر میں تعاون دینے سے مل سکتا ہے بلکہ مسجد کی تعمیر اس وقت اتنا بڑا ثواب نہیں کہلا سکتی جتنا یہ کام ہے مسجد نہ ہو تو کھلی زمین پر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے لیکن ملت مسلمہ ہی مٹ گئی اور اسلام ہی کو دیس نکالا مل گیا تو کس کی مسجد اور کہاں کی نماز۔ محل بحث و نزاع کا نہیں درمندی و غمخواری کا ہے ہم ذیلی عقائد اور فقہی جزئیات میں باہم کتنا ہی اختلاف رکھتے ہوں لیکن مشترکہ ابتلا میں مل جل کر ہم نے استیصال و دفاع کی کوشش نہیں کیں تو امنڈتے ہوئے طوفان اور بپھرتی ہوئی آندھیاں ہم سب کو بلا امتیاز روئی کی

طرح ڈھن دیں گی۔ یہ اخبار — جس کی تجویز سامنے ہے کسی ایک مکتب فکر کا نمائندہ اور کسی خاص گروہ کے خاص مسلک کا نقیب نہ ہوگا بلکہ یہ دینِ حق کی صرف ان تعلیمات کو عام کرے گا جن سے کسی بھی مسلمان کو اختلاف نہ ہو۔ یہ اسلام کا بنیادی تعارف کرائے گا اور اُن برادرانِ وطن کو صحیح معلومات بہم پہنچائے گا جنھیں غلط معلومات پر مطمئن کر کے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہو۔ اکثریت کے قلوب میں اسلام اور مسلمانوں کی نفرت بٹھانے میں جہاں شیطانی ذریات کی کارفرمائی ہے وہاں ہماری کوتاہیوں اور غفلتوں کو بھی خاص دخل ہے۔ ہم اگر تلافی مافات کا عزم لیکر اپنے مقدور بھر اشاعتِ حق اور ابلاغ وغیرہ میں لگ جائیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ ضرور ہمارے کام برکت دیگا وہ کہتا ہے بندہ ہماری طرف ایک قدم بڑھے تو ہم اسکی طرف دو قدم بڑھتے ہیں۔ ایک انگریزی اخبار اگرچہ اُس سمیت کا ازالہ کرنے کے لئے بہت کم ہے جو درجنوں اخبار اور رسالے ہمارے خلاف پھیلا رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہے کہ میدانِ بدر کی طرف بڑھنے والے وہ تین سو تیرہ سوختہ سامان مجاہد بھی حریف کے کثیر التعداد اور مسلح لشکر سے بہت کم ہی تھے جنھوں نے اللہ کے توکل پر قدم آگے بڑھایا تھا۔ اللہ یہ دیکھتا ہے کہ جس بندے کو جتنی بھی استطاعت امور خیر کی طرف بڑھنے کی دی گئی ہے اس نے اسے کام میں لگایا ہے یا نہیں۔ اگر لگایا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور اللہ جسکی مدد کرے اُسے زمین و آسمان کے سارے لشکر بھی مل کر فنا نہیں کر سکتے۔ ہماری استطاعت میں یہ تو نہیں کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں اتر کر ان کی غلط فہمیاں دور کر سکیں۔ نہ ہم کسی فتنہ پسند کی سرشت تبدیل کر سکتے ہیں لیکن یہ ہمارے بس میں ضرور ہے کہ باہمی تعاون سے انگریزی اخبار نکالیں اور بیدار مغزی سے کام لے کر بر وقت اُن مفسدانہ افواہوں، جھوٹے پروپیگنڈوں اور قانون دشمن سرگرمیوں کی قلعی کھولیں جن کی آڑ میں بھولے بھالے عوام کو نفرت، غیظ اور انتقام کا سبق دیا جاتا ہے۔ ہم نے اس کام کو اللہ کے بھروسے پر تندہی اور محنت کے ساتھ انجام دینا شروع کر دیا تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ ملک و ملت دونوں کے لئے اس کے نتائج بہتر نکلیں گے۔

جہاں تک اس بورڈ کا تعلق ہے جو اس کام کی سربراہی کے لئے مرتب کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے اس کے متعدد اراکین کو تو ہم ذاتی طور پر بھی جانتے ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ دیانت، بالغ نظری، جفا کوشی اور سلامت روی ہر اعتبار سے یہ اس اہم کام کے اہل ہیں۔ تمام برادرانِ ملت سے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ہماری پر زور التجا ہے کہ مالی تعاون میں پیش قدمی فرمائیں جتنا زیادہ سے زیادہ دے سکتے ہوں دیں۔ اللہ کا نیک بندہ ابوبکر صدیقؓ ہمارے ہی اسلاف میں تو تھا جس نے دین و ملت کی مدد کے موقع پر اپنے گھر کا سارا اثاثہ — جھاڑو تک — تک امیرِ قوم کی خدمت میں لاکر رکھدیا تھا۔ اور جب امیر نے پوچھا تھا کہ ابوبکر! بال بچوں کے لئے کیا چھوڑ آئے تو اس سمندر جیسے دل والے نے گردن جھکا کر کہا تھا کہ آپ پر میرے باپ قربان اہل و عیال کے لئے تو بس اللہ اور اللہ کا رسول کافی ہے۔ -

اللہ کا نیک بندہ عمرؓ ابن الخطاب بھی ہمارے ہی اسلاف میں تھا جو اپنے تمام اثاثے کا نصف اٹھا لایا تھا۔ اللہ کا نیک بندہ عثمانؓ ابن عفان بھی ہمارے ہی اسلاف میں تھا جس نے اشرفیوں کی تھیلیاں اور اونٹوں کی قطاریں نذرِ خدمت کر دی تھیں۔

ہم سیاہ کار و خطا کوش اخلاف ان رفیع الشان اجداد کی پیروی تو کیا کر سکتے ہیں مگر کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنی فاضل دولت ہی دین و ملت کی فلاح پر نچھاور کر دیں۔ پوری نہ سہی کیا اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی راہِ حق میں صرف کرنے کی ہمت ہم میں نہیں۔

اور تو چھوڑیئے اگر ہم اتنے ہی پیسے آگے بڑھا سکیں جتنے حقہ، سگریٹ، پان چائے، قیمتی ملبوسات، فرنیچر اور مرغن غذاؤں میں غیر ضروری طور پر کھپا دیتے ہیں تو بہت بڑا کام انجام پا جائے۔ ایک نہیں دس انگریزی روزنامے ظہور میں آ سکتے ہیں۔ اگر افراد ملت اسلامی اخوت و مودت اور ایمانی بصیرت و بالغ نظری سے متصف ہو جائیں۔ اس ملک میں ہمیں جینا ہے عزت کے ساتھ جینا ہے مسلمان رہ کر جینا ہے۔ یہ عزم خالی پیچ و تاب، داستان سرائی، جوش و خروش اور چیخ پکار سے کامران نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے سنجیدہ، انتھک، دور رس اور ٹھوس سعی و جہد کی ضرورت ہے۔

اللہ گر یہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اب آپ وہ "اعلانیہ" ملاحظہ فرمائیں جو بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ (عامر عثمانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان میں اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے ایک انگریزی اخبار کی ضرورت و اہمیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ملت کا ہر فرد اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے اور اس کی یہ دلی تمنا ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت کے سامنے ہر معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر آتا رہے اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی رہے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بے بنیاد باتوں کی وجہ سے پھیلتی رہتی ہیں۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کا اپنا انگریزی اخبار نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو ان کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی ہو پاتی نہ ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے موثر آواز اٹھائی جا سکتی اور نہ ہی ان بہت سے واقعات کے سلسلے میں ملک کے سامنے صحیح صورتِ حال آپاتی ہے جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں خصوصاً جن کا تعلق مسلمانوں کی ذات اور ان کے مفادات سے ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس واقعات عموماً غلط رنگ میں پیش کئے جاتے ہیں اور معاملات کی غلط تصویر سامنے لائی جاتی ہے جس سے بہت سے خیر پسند اور شر بیزار افراد بھی کسی نہ کسی درجہ میں متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا اپنا اخبار ہو اور باشندگانِ ملک کے سامنے صحیح صورتِ حال آتی رہے تو یقین ہے کہ بہت سی ان غلط بیانیوں کی بروقت تردید کی جا سکتی ہے جو بسا اوقات ملک و ملت دونوں کے لئے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں یا کم از کم باہمی اعتماد خیر سگالی اور ہمدردی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں مانع اور باہمی منافرت کا موجب بنتی ہیں۔

خیر پسندی انسانی فطرت ہے صحیح صورت حال سامنے ہو تو رائے عامہ کو گمراہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ بعض اردو اخبارات اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اول تو ان کا حلقہ بہت محدود ہے دوسرے ملک کا بیشتر پڑھا لکھا طبقہ اردو اخبارات کو یا تو پڑھتا نہیں یا پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اسلئے انگریزی اخبار کے سوا ان حلقوں تک رسائی کی اور کوئی صورت ہی نہیں ہے۔

یہ وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی طرف سے اس ضرورت کا بار بار اظہار ہوتا رہا ہے اور اس کے لئے مختلف تجویزیں اور اسکیمیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی عملی قدم اُٹھایا نہیں جا سکا اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اب مزید انتظار نہ کیا جائے اس لئے ہم لوگوں نے اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کے باوجود محض اللہ کے بھروسہ پر اس ضرورت کو پورا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اللہ ہماری مدد کرے۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی ہند نے بھی اپنے پورے تعاون کا اعلان کیا ہے جیسا کہ مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کی اپیل سے جو دعوت مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی ہے واضح ہوتا ہے۔

اس کام کے لئے ہم نے "بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز" کے نام سے ایک بورڈ بنا لیا ہے، یہی بورڈ دیگر ضروری اور مفید لٹریچر کی نشر و اشاعت کے ساتھ اپنی نگرانی میں انگریزی اخبار بھی نکالے گا۔

ضرورت کا تقاضا تو یہ ہے کہ انگریزی اخبار روزنامہ ہو سکین ہمارے وسائل و ذرائع ایسے نہیں ہیں کہ فی الحال ہم اس کا ارادہ کر سکیں اس لئے سردست ایک معیاری ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آئندہ اگر حالات سازگار ہو سکے تو انشاء اللہ روزنامے کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے گا۔

طرح ڈھن دیا گی۔ یہ اخبار — جس کی تجویز سامنے ہے کسی ایک مکتب فکر کا ترجمان نہ اور کسی خاص گروہ کے خاص مسلک کا نقیب نہ ہوگا۔ بلکہ یہ دینِ حق کی صرف ان تعلیمات کو عام کرے گا جن سے کسی بھی مسلمان کو اختلاف نہ ہو۔ یہ اسلام کا بنیادی تعارف کرائے گا اور اُن برادرانِ وطن کو صحیح معلومات بہم پہنچائے گا جنھیں غلط معلومات پر مطمئن کر کے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہو۔ اکثریت کے قلوب میں اسلام اور مسلمانوں کی نفرت بٹھانے میں جہاں شیطانی ذریات کی کارفرمائی ہے وہاں ہماری کوتاہیوں اور غفلتوں کو بھی خاص دخل ہے۔ ہم اگر تلافی مافات کا عزم لیکر اپنے مقدور بھر اشاعتِ حق اور ابلاغ وغیرہ میں لگ جائیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ ضرور ہمارے کام برکت دیگا وہ کہتا ہے بندہ ہماری طرف ایک قدم بڑھے تو ہم اسکی طرف دو قدم بڑھتے ہیں۔ ایک انگریزی اخبار اگرچہ اُس سمّیت کا ازالہ کرنے کے لئے بہت کم ہے جو درجنوں اخبار اور رسالے ہمارے خلاف پھیلا رہے ہیں۔ لیکن بہو لومت کہ میدانِ بدر کی طرف بڑھنے والے وہ تین سو تیرہ سوختہ سامان مجاہد بھی حریف کے کثیر التعداد اور مسلح لشکر سے بہت کم ہی تھے جنھوں نے اللہ کے توکل پر قدم آگے بڑھایا تھا۔ اللہ یہ دیکھتا ہے کہ جس بندے کو جتنی بھی استطاعت اور خیر کی طرف بڑھنے کی دی گئی ہے اس نے اسے کام میں لگایا ہے یا نہیں۔ اگر لگایا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور اللہ جسکی مدد کرے اُسے زمین و آسمان کے سارے لشکر بھی مل کر فنا نہیں کر سکتے۔ ہماری استطاعت میں یہ تو نہیں کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں اتر کر ان کی غلط فہمیاں دور کر سکیں۔ نہ ہم کسی فتنہ پسند کی سرشت تبدیل کر سکتے ہیں لیکن یہ ہمارے بس میں ضرور ہے کہ باہمی تعاون سے انگریزی اخبار نکالیں اور بیدار مغزی سے کام لے کر بر وقت اُن مفسدانہ افواہوں، جھوٹے پروپیگنڈوں اور قانون دشمن سرگرمیوں کی قلعی کھولیں جن کی آڑ میں بھولے بھالے عوام کو نفرت، غیظ اور انتقام کا سبق دیا جاتا ہے۔ ہم نے اس کام کو اللہ کے بھروسے پر تندہی اور محنت کے ساتھ انجام دینا شروع کر دیا تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ ملک و ملّت دونوں کے لئے اس کے نتائج بہتر نکلیں گے۔

جہاں تک اس بورڈ کا تعلق ہے جو اس کام کی سربراہی کے لئے مرتب کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے اس کے متعدد اراکین کو تو ہم ذاتی طور پر بھی جانتے ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ دیانت، بالغ نظری، جفاکوشی اور سلامت روی ہر اعتبار سے یہ اس اہم کام کے اہل ہیں۔ تمام برادرانِ ملت سے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ہماری پرزور التجا ہے کہ مالی تعاون میں پیش قدمی فرمائیں۔ جتنا زیادہ سے زیادہ دے سکتے ہوں دیں۔ اللہ کا نیک بندہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمارے ہی اسلاف میں تو تھا جس نے دین و ملت کی مدد کے موقع پر اپنے گھر کا سارا اثاثہ — چمٹا، ٹھیکنی تک امیرِ قوم کی خدمت میں لا کر رکھ دیا تھا۔ اور جب امیر نے پوچھا تھا کہ ابوبکر! بال بچوں کے لئے کیا چھوڑ آئے تو اس سمندر جیسے دل والے نے گردن جھکا کر کہا تھا کہ آپ پر میرے باپ قربان اہل و عیال کے لئے تو بس اللہ اور اللہ کا رسول کافی ہے۔ -

اللہ کا نیک بندہ عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب بھی ہمارے ہی اسلاف میں تھا جو اپنے تمام اثاثے کا نصف اٹھا لایا تھا۔ اللہ کا نیک بندہ عثمان رضی اللہ عنہ ابن عفان بھی ہمارے ہی اسلاف میں تھا جس نے اشرفیوں کی تھیلیاں اور اونٹوں کی قطاریں نذرِ خدمت کر دی تھیں۔

ہم سیاہ کار و خطاکوش اخلاف ان رفیع الشان اجداد کی پیروی تو کیا کر سکتے ہیں مگر کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنی فاضل دولت ہی دین و ملت کی فلاح پر نچھاور کر دیں۔ پوری نہ سہی کیا اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی راہِ حق میں صرف کرنے کی ہمت ہم میں نہیں۔

اور تو چھوڑیئے اگر ہم اتنے ہی پیسے آگے بڑھا سکیں جتنے حقہ، سگریٹ، پان چائے، قیمتی ملبوسات، فرنیچر اور مرغن غذاؤں میں غیر ضروری طور پر کھپا دیتے ہیں تو بہت بڑا کام انجام پا جائے۔ ایک نہیں دس انگریزی روزنامے ظہور میں آ سکتے ہیں۔ اگر افرادِ ملت اسلامی اخوت و مودت اور ایمانی بصیرت و بالغ نظری سے متصف ہو جائیں۔ اس ملک میں ہمیں جینا ہے عزت کے ساتھ جینا ہے مسلمان رہ کر جینا ہے۔ یہ عزم خالی پیچ و تاب، داستان سرائی، جوش و خروش اور چیخ پکار سے کامران نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے سنجیدہ، انتھک، دور رس اور ٹھوس سعی و جہد کی ضرورت ہے۔

اللہ اگر دھر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اب آپ وہ "اعلانیہ" ملاحظہ فرمائیں جو بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ (عامر عثمانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان میں اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے ایک انگریزی اخبار کی ضرورت و اہمیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ملت کا ہر فرد اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے اور اس کی یہ دلی تمنا ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت کے سامنے ہر معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر آتا رہے اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی رہے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بے بنیاد باتوں کی وجہ سے پھیلتی رہتی ہیں۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کا اپنا انگریزی اخبار نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو ان کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی ہو پاتی نہ ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے موثر آواز اٹھائی جا سکتی اور نہ ہی ان بہت سے واقعات کے سلسلے میں ملک کے سامنے صحیح صورت حال آپاتی ہے جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں خصوصاً جن کا تعلق مسلمانوں کی ذات اور ان کے مفادات سے ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس واقعات عموماً غلط رنگ میں پیش کئے جاتے ہیں اور معاملات کی غلط تصویر سامنے لائی جاتی ہے جس سے بہت سے خیر پسند اور شریف افراد بھی کسی نہ کسی درجہ میں متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا اپنا اخبار ہو اور باشندگان ملک کے سامنے صحیح صورتِ حال آتی رہے تو یقین ہے کہ بہت سی ان غلط بیانیوں کی بروقت تردید کی جا سکتی ہے جو بسا اوقات ملک و ملت دونوں کے لئے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں یا کم از کم باہمی اعتماد خیر سگالی اور ہمدردی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں مانع اور باہمی منافرت کا موجب بنتی ہیں۔

خیر پسندی انسانی فطرت ہے صحیح صورت حال سامنے ہو تو رائے عامہ کو گمراہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ بعض اردو اخبارات اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اول تو ان کا حلقہ بہت محدود ہے دوسرے ملک کا بیشتر پڑھا لکھا طبقہ اردو اخبار کو یا تو پڑھتا نہیں یا پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اسلئے انگریزی اخبار کے سوا ان حلقوں تک رسائی کی اور کوئی صورت ہی نہیں ہے۔

یہ وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی طرف سے اس ضرورت کا بار بار اظہار ہوتا رہا ہے اور اس کے لئے مختلف تجویزیں اور اسکیمیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی عملی قدم اُٹھایا نہیں جا سکا اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب مزید انتظار نہ کیا جائے اس لئے ہم لوگوں نے اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کے باوجود محض اللہ کے بھروسہ پر اس ضرورت کو پورا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اللہ ہماری مدد کرے۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی ہند نے بھی اپنے پورے تعاون کا اعلان کیا ہے جیسا کہ مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کی اپیل سے جو دعوت مورخہ ۱۹ راگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی ہے واضح ہوتا ہے۔

اس کام کے لئے ہم نے "بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز" کے نام سے ایک بورڈ بنا لیا ہے، یہی بورڈ دیگر ضروری اور مفید لٹریچر کی نشر و اشاعت کے ساتھ اپنی نگرانی میں انگریزی اخبار بھی نکالے گا۔

ضرورت کا تقاضا تو یہ ہے کہ انگریزی اخبار روزنامہ ہو لیکن ہمارے وسائل و ذرائع ایسے نہیں ہیں کہ فی الحال ہم اس کا ارادہ کر سکیں اس لئے سردست ایک معیاری ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آئندہ اگر حالات سازگار ہو سکے تو انشاء اللہ روزنامے کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے گا۔

اخبار کسی کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ وقف رہے گا۔ اور اس کا بنیادی سرمایہ وہ عطیات ہوں گے جو اہل خیر حضرات سے ہمیں موصول ہوں گے۔ اخبار کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

اخبار کے مقاصد

۱۔ اسلام کا صحیح تعارف، اس کی تعلیمات کی اشاعت اور اس کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ۔

۲۔ مسلمانوں کی دینی حالت بہتر بنانے اور ان کی معاشرتی اصلاح کی کوشش۔

۳۔ مسلمانوں کے مخصوص ملی مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی رہنمائی کرنا۔

۴۔ مسلمانوں کے خلاف آئے دن کی غلط بیانیوں کی بروقت تردید کرنا اور صحیح صورت حال سامنے لاکر ان کی مشکلات و مسائل کے سلسلے میں ملک کے اجتماعی ضمیر کو بیدار کرنا۔

۵۔ ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر سے غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ اظہار خیال اور ملک کے اجتماعی شعور کی ایسی تربیت کرنا کہ باشندگان ملک علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں سے بلند ہو کر ملکی اور انسانی بنیادوں پر ان کے حل کی طرف متوجہ ہوں۔

۶۔ ملک میں پھیلی ہوئی بداخلاقی، رشوت ستانی اور دوسری خرابیوں کی اصلاح اور عدم رواداری اور تشدد پسندی کو دور کرنے کی کوشش۔

۷۔ ملک کے تمام کمزور اور مظلوم طبقوں اور مذہبی تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کے جائز حقوق کی حمایت۔

۸۔ آمریت اور فسطائیت کے رجحانات کے خلاف جمہوری رجحانات کی تائید اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی پامالی پر احتجاج خاص طور پر اس اصول پر زور دینا کہ حکومت مذہب کی بنیاد پر اپنے شہریوں کے درمیان کوئی تفریق نہ برتے گی۔

معیاری ہفت روزہ نکالنے کے لئے بھی سب سے پہلے اخبار کا اپنا پریس ہونا ضروری ہے تاکہ اخبار باقاعدگی اور پابندیٔ وقت کے ساتھ نکلتا رہے۔

اخبار کو اپنا مقام پیدا کرنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے ہمارے اندازے کے مطابق کم و بیش تین سال کی مدت درکار ہوگی۔ اس مدت میں پریس وغیرہ کے مصارف اور پہلے تین برسوں کے متوقع خسارے کو پورا کرنے کے لئے ہمارے اندازے کے مطابق کم از کم ۱۰ لاکھ روپے درکار ہیں جو اہل خیر حضرات کے عطیات ہی سے فراہم ہو سکیں گے۔

فراہمی رقم کے لئے دس، پچیس، پچاس اور سو روپے کے علاوہ ایک، دو اور پانچ روپے کے کوپن بھی تیار کرائے گئے ہیں تاکہ امت کا ہر طبقہ اپنی استطاعت اور جذبہ کے مطابق اس کار خیر میں حصہ لے سکے۔

انگریزی اخبار کی اسکیم کا ملک کے ہر حلقہ سے پرجوش خیر مقدم ہوا ہے اس سے ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ اخبار کے اجراء کیلئے جن ابتدائی وسائل کی ضرورت ہے وہ انشاء اللہ جلد فراہم ہو جائیں گے۔

ہم ملت کے ہر فرد سے پرخلوص تعاون کی امید رکھتے ہیں اور زیادہ سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔

۱۔ محمد یوسف (مرکز دہلی) (۲) محمد مسلم (دعوت دہلی) (۳) انیس الدین احمد (چتر پور۔ جنوبی بہار) (۴) افضل حسین (درسگاہ اسلامی رامپور) (۵) انعام الرحمٰن خاں (بھوپال) (۶) محمد عبدالحی (الحسنات رامپور) (۷) محمد یوسف صدیقی (ٹونک) ناظم اعلیٰ۔

ممبران۔

بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز۔ ۱۵۲۵۔ سوئیوالان۔ دہلی ۶

آدمی کے منہ میں کتے کی زبان

تبادلۂ خیال، بحث، افہام وتفہیم انسانوں سے ہوسکتی ہے لیکن کسی فرد یا گروہ کی مت ہی ماری جائے تو اس سے بحث وگفتگو کسی پاگل کتے سے سر مارنے کے مرادف ہوگی۔
نذرو نیاز، قیام و میلاد، عرس و قوالی اور صریح قبر پرستی کو اسلام کے نام پر رواج دینے والوں نے توحید ورسالت کے پاکیزہ منزہ تصور اور شریعتِ مطہرہ کی معقولیت پسندی پر جو سیاہی لیپی ہے اس کا وبال ہمارے سروں پر آسمان بھی توڑدے تو جائے حیرت نہیں۔ یہ عقل و تفقہ سے عاری اور توہمات و خرافات کی کیچڑ میں لت پت لوگ کافرگری اور مرتد سازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ کسی ایک بھی کافر کو مسلمان تو انھوں نے کبھی نہیں بنایا مگر بے شمار مسلمانوں کو مشرکانہ عقائد کا چسکا لگا کر شرک و زندقہ کا رسیا ضرور بنا دیا اور جن خدا ترس بزرگوں نے ان کی ناشائستہ سرگرمیوں پر روک ٹوک کی انھیں ان بد دماغ، بدزبان اور بدگہر لوگوں نے ادنیٰ تامل کے بغیر کافر و مرتد قرار دیدیا۔ ان کی بے لگام جراتوں کے چند نمونے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں۔ پڑھئے اور سر پیٹئے ـــــ

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان اپنی دو کتابوں "الکوکبۃ الشہابیہ" اور "سل السیوف الہندیہ" میں حضرت شاہ شہیدؒ کو بے نقط گالیاں دینے کے بعد "الکوکبۃ الشہابیہ" بار پنجم کے صفحہ ۵۴ پر رقمطراز ہیں۔

فرقہ وہابیہ، اسماعیلیہ اور اس کے امام نافرجام پر جزماً قطعاً اجماعاً بوجوہ کثیر کفر لازم اور بلا شبہ جماہیر فقہائے کرام واصحاب فتویٰ اکابر واعلام کی تصریحات واضحہ پر یہ سب کے سب مرتد کافر باجماع آئمہ ان سب پر اپنے کفریات ملعونہ سے بالتصریح توبہ ورجوع اور ازسرِ نو کلمۂ اسلام پڑھنا فرض وواجب ہے۔

ان احمد رضا خاں کے مظہر ـــ مولوی حشمت علی بہ قول خویش مظہر اعلیحضرت اپنی کتاب "تجانب اہل السنۃ عن اہل الفتنۃ" نے اپنی کتاب کے صفحہ (۵) اور (۱۱) پر شاہ شہید کو کافر کہنے کے بعد انھیں کافر نہ سمجھنے والوں کو بھی مرتد قرار دیا ہے۔

ایک دوسری کتاب "کشف ضلال دیوبند" کے حاشیہ صفحہ ۴۸ پر ارشاد ہوتا ہے۔

اسمٰعیل دہلوی رکن ایمان کو محض خبط کہکر کافر ہوا، جب وہ کافر ہے تو اس کے متبع اس کے معتقد تم اور دیوبندی سب کافر ہوئے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ ان مولوی حشمت علی خاں کے چھوٹے بھائی مولوی محبوب علی خاں نے "تاریخ اعیان وہابیہ" لکھی ہے، اس کے صفحہ ۱۸ پر فرماتے ہیں:

سید احمد کو عیاری، مکاری، جعلسازی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم سے بے نیاز اور بے شرم، بے غیرت، بے حیا اور مسلمانوں کی مفید تحریکوں مٹانے والا تھا۔ صفحہ ۲۱

یہ امیر و شہید نہیں بلکہ بناسپتی علمبردار دین اسلام کا غدار علماء سو اور خدا و رسولؐ سے بے نیاز۔ صفحہ ۲۷

انگریزوں نے دونوں دین فروشوں کو روپے سے خرید کر اپنے کار خاص کے حصول کی غرض سے چھوڑ رکھا تھا، دونوں ملک و قوم

قذارا اور اسلام کے کٹر دشمن تھے۔ صفحہ ۴۵

نانوتویؒ، گنگوہیؒ، مدنیؒ، تھانویؒ

مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا خلیل احمدؒ مہاجر مدنی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

(۱) سب کے سب کافر و مرتد ہیں باجماع امت اسلام سے خارج ہیں۔ حسام الحرمین صفحہ ۱۱۳

(۲) جو ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔

عرفان شریعت۔ جلد اول ص ۲۴

مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی

احمد رضا خاں صاحب نے، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی ایک سوا ایک وجوہ سے تکفیر کر کے ان سے توبہ کا مطالبہ کیا تھا جس میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اکابر دیوبند کی تکفیر نہیں کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو، الطاری الداری صفحہ ا جلد دوم)

علامہ شبلیؒ

صلح کلی نیچری لیڈروں کا مقصد سیاست کے پردے میں بے دینی و دہریت پھیلانا ہے، ان صلح کل لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی بہت نمایاں ہیں، یہ سب بحکم شریعت مطہرہ کفار و مرتدین ہیں۔

صفحہ ۲۸۹ - ۴۵۳ تجانب اہل السنت

شبلی اعظم گڈھی کے ان اشعار کا کفر یقینی و ارتداد قطعی ہونا مہر نیمروز و ماہ نیم ماہ سے بھی بڑھکر واضح و روشن ہے۔

تجانب ص ۲۹۵

ان کے (یعنی علامہ شبلی کے) قطعی و یقینی کافر و مرتد ہونے میں کچھ شک و شبہ رہ سکتا ہے۔ تجانب صفحہ ۲۹۶

مولانا حالی

۱:- الطاف حسین حالی نے ایک مسدس لکھا جس کا نام مد و جزر اسلام رکھا، نیچری لیڈروں و صلح کلی واعظوں نے اس کی اشاعت میں ایڑی چوٹی کے زور لگائے۔ اس نے مسدس کے صفحہ ۲۲۴ پر اپنے نیچری شاعر بن جانے کا سبب ان لفظوں میں لکھا۔ تجانب اہل السنۃ صفحہ ۲۹۱

۲:- شبلی و حالی دونوں کے اقوال سے اتنا ضرور ثابت ہوگیا، کہ ان دونوں کو گمراہ اور بے دین بنانے والی ان دونوں کے دین و ایمان کو مٹانے والی وہی سر سید احمد خاں کو لی علی گڈھی کی کافرانہ و ساحرانہ نگاہ تھی۔ تجانب ص ۲۹۸

۳:- یہ کفریات ملعونہ وہی ہیں، جو امام الوہابیہ اسمٰعیل دہلوی نے اپنی ناپاک کتاب تقویۃ الایمان میں بکے۔ حوالہ مذکور ص ۲۹۸

۴:- حالی نے امام الوہابیہ کی شاگردی میں ان سب کفروں کا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم پر افترا کر دیا۔ حوالہ مذکور ص ۲۹۹

۵:- تو اس بے دین قائل (حالی کو) کافر و مرتد ماننا پڑیگا۔ ص ۳۰۲

علامہ اقبالؒ

ہم نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر (اقبال) صاحب ایسے عقائد رکھتے ہوئے کیسے مسلمان ہیں، ان کے اسلام کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ اپنے گھڑے ہوئے اسلام کی بنا پر مسلمان ہیں۔

تجانب اہل السنۃ صفحہ ۳۴۵

"وہ بحکم شریعت مطہرہ یقیناً بے ایمان و بے دین ہے" صفحہ ص ۳۴۴

واضح رہے کہ علامہ اقبال کو شکوہ لکھنے پر لاہور کے ان بدعت فروشوں نے واضح طور پر کفر کا فتویٰ دیا تھا، بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا۔ کہ ان کا کلام پڑھنے والا بھی کافر ہو جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں کے خلاف تو لاہور اور بریلی سے کفر کا باقاعدہ فتویٰ جاری ہوا تھا اور کہا گیا تھا کہ جو زمیندار پڑھتا ہے اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

سر سید مرحوم

سر سید ایک خبیث مرتد تھا جو اس کے کفر یا ارتداد میں شک کرے وہ خود کافر و مرتد ہو جاتا ہے اور اگر بے توبہ مرا تو مستحق عذاب ابدی ہے

تجانب اہل السنۃ ص ۲۵ و ۸۶

نورتن بھی کافر

"سر سید نے بے دین اکبر بادشاہ کی طرح اپنے نورتن بنا رکھے تھے جو پیغمبر کے وزیران نیچریت مشیران دہریت اور مبلغین زندیقیت تھے جن کے نام یہ ہیں (۱) محسن الملک (۲) اعظم یار جنگ (۳) مولوی چراغ علی (۴) نواب انتصار جنگ (۵) مولوی مشتاق حسین۔ (۶) الطاف حسین حالی (۷) مولوی ذکاء اللہ دہلوی (۸) مولوی مہدی حسن (۹) سید محمود خاں۔

تجانب اہل السنۃ صفحہ ۸۶ و ۸۷

دو مزید:- (۱) شبلی نعمانی (۲) ڈپٹی نذیر احمد خاں۔

(باقی صفحہ ۶۵)

نقد و تبصرہ — عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

انتقادِ صحیح بجوابِ ذیل رکعاتِ تراویح

● از خامہ:- مولانا آزاد رحمانی ● کتابت و طباعت پاکیزہ۔ کاغذ عمدہ سفید۔ صفحات ۱۶۸۔ سائز ۲۰×۲۶/۸۔ قیمت پونے دو روپے

ملنے کا پتہ :- ہلال احمد اعظمی۔ مکان ۲۴/۲۵ پانڈے حویلی بنارس

یادش بخیر "رکعات تراویح" کے نام سے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی کتاب شائع ہوئی تھی اس کا جواب مولانا نذیر احمد رحمانی نے "انوار مصابیح" کے نام سے رقم فرمایا۔ اس جواب کا جواب مولانا عبدالباری صاحب قاسمی نے "ردانوار مصابیح" کے نام سے لکھا اور "رکعات تراویح" کے نئے ایڈیشن کے ساتھ ذیل کی حیثیت سے شائع فرمایا۔

ان تینوں کتابوں پر تجلی میں تبصرہ ہوچکا ہے اب لیجئے "رد انوار مصابیح" کے تعاقب میں مولانا آزاد رحمانی کی پیشِ نظر کتاب آگئی ہے جسے دیکھکر ابتداءً تو ہمیں چکر سا آگیا کہ یا اللہ اسے کیسے پڑھیں اور نہ پڑھیں تو تبصرہ کیسے کریں۔ در اصل رکعات تراویح؛ فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین جیسے مسائل میں ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ کسی بھی فریق کو شدت نہیں برتنی چاہئیے نہ بحث و مناظرے کے چکر چلنے چاہئیں۔ حدیث و قرآن ہی پر دونوں فریقوں کی بنیاد ہے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ حسن نیت اور دینی خلوص رکھتے ہیں۔ افہام و تفہیم کی حد تک خوشگوار فضا میں گفتگو ہو اور پھر ہر فریق اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرتے ہوئے دوسرے فریق کو بھی دیانتدار ہی سمجھے۔ اور نکرز اویوں کا معمولی سا اختلاف شخصی و گروہی عناد و کدورت میں تبدیل نہ ہوجائے تو اسی میں امت کی خیر ہے۔ علمی اختلافات کو نفرت و جدل کا وسیلہ بنا لینا وہ بدترین طریقہ ہے جسے اسلام کی اصطلاح میں بجا طور پر "فتنہ" کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے سوچنے کا یہی ڈھنگ ہے جس نے ہمیں زیر تبصرہ کتاب سے وحشت زدہ کردیا تھا۔ لیکن ناشر نے نہ صرف دو نسخے تبصرے کے لئے بھیجے بلکہ ایک زائد نسخہ مطالعے کے لئے بھی عنایت فرمایا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ دل پر ہاتھ رکھکر اسے پڑھیں اور تبصرے کا ہفت خواں طے کریں۔

لیکن ہمیں اعتراف کرنا پڑرہا ہے کہ اس کتاب کو شروع کرنے کے بعد نہ تو ہمیں کوئی کوفت ہوئی نہ ہمت بالخیر تک پڑھے بغیر اسے ہم نے چھوڑا۔ نہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد رحمانی نے اسے لکھکر زیادتی کی ہے۔

ویسے اگر ہم بھی سرشت و مزاج کے لحاظ سے ٹھیٹ دیوبندی ہوتے تو اس کتاب پر تبصرے کا نام ہی نہ لیتے کیونکہ یہ ہمارے معظم اکابر کی بعض ایسی لغزشوں سے پردہ اٹھاتی ہے جن کی کوئی تاویل ہمارے پاس نہیں ہے ہم دیوبندیوں کے مزاج میں اسلاف کی غیر معتدل عقیدت اور شخصیت پرستی کا زہر کچھ ایسا سرایت کرگیا ہے کہ کور نگاہی اور جمود کے اعتبار سے ہم میں اور بریلویوں میں بہت ہی کم فرق رہ گیا ہے۔ ہمیں کیا پڑی تھی کہ ایسی کتاب پر تبصرہ کریں جو — خطا معاف ہمارے منہ پر طمانچے رسید کرتی ہے اور اگر اپنے اکابر کی وکالت کے جوش میں تبصرہ کرتے بھی تو تاویلات و توجیہات کا وہ انبار لگاتے کہ ایک دفعہ تو فلکِ پیر کو بھی دعشرہ طاری آجاتی۔

مگر یہی بات ہے کہ گروہی تعصب کے چکر میں نہ تو ہم الیاس نکل سکتے ہیں نہ اہل حدیث دوستوں کو یک طرفہ الزام دے سکتے ہیں "رکعات تراویح" جیسی بحثوں کو طول دینا اور جواب الجواب کا سلسلہ چلانا اصلاً افسوسناک ضرور ہے لیکن جب ملت مسلمہ کی شامت اعمال سے یہ بحثیں فضا میں گونج ہی رہی ہیں تو ہم مولانا آزاد رحمانی کو قصوروار نہیں ٹھیرا سکتے کہ انھوں نے یہ کتاب کیوں لکھی۔

اس کتاب کا وہ ابتدائی حصہ ہمارے لئے کافی دلچسپ ہے جس میں مؤلف نے اُن الزامات کا جواب دیا ہے جو "رد انوار مصابیح" کے مقدمہ نگار جناب مولانا ایوب صاحب نے اہل حدیث پر لگائے تھے۔

پہلا الزام تو بمبئی کے ایک وقتی قضیے کے متعلق تھا اس سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں۔ دلچسپی ہے دوسرے الزام سے جس کا تعلق علماء کی شان میں طنز و طعن کرنے اور اپنا قلم کو بے لگام چھوڑ دینے سے ہے شکوہ کیا گیا تھا کہ اہل حدیث حضرات علمائے احناف کی شان میں بد زبانی کرتے ہیں گستاخ ہیں شائستگی اختیار نہیں کرتے۔

مولانا آزاد رحمانی نے اس الزام کے جواب میں خود ہمارا ہی آئینہ ہمیں دکھا دیا ہے اور اس میں ہمیں اپنے معظم اکابر کے بعض ایسے خد و خال نظر آتے ہیں کہ اردو محاورے کے مطابق طبیعت صاف ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ بد زبانی، استہزا، سب و شتم، تحمیق و تضحیک دینی و علمی مباحث میں علماء کی شایان شان نہیں ہے اہل حدیث علماء اگر ایسا کرتے ہیں تو اس کی قباحت میں شک نہیں مگر خود ہمارے اکابر بھی زبان و بیان کے اونچے معیار کو قائم نہ رکھ سکے ہوں اور ان کے قلم نے بھی گھٹیا سطح تک پہنچنا قبول کر لیا ہو تو اس قصور و لغزش کی نشان دہی کرنے والوں پر بگڑنے اور غلط سلط تاویلات کرنے کے عوض ہمیں ایمانداری کے ساتھ تسلیم کر لینا چاہیے کہ شریک جرم ہم بھی ہیں۔

یہ بہت بری اور شرمناک بات ہے کہ کسی دوسرے مکتب فکر کی طرف سے اگر ہمارے کسی بزرگ کے بارے میں گستاخانہ انداز کلام اختیار کیا جائے تو ہم اس طرح آسمان سر پہ اٹھالیں گے جیسے گولی مار دی گئی ہو مگر جب خود ہمارے کوئی بزرگوار دوسرے مکتب فکر کے بزرگوں کو نازیبا اور پست انداز میں خطاب کریں تو ہمیں احساس ہی نہ ہو کہ یہ بھی کوئی بری حرکت ہے اور بجائے شرمساری کے واہ واہ کے ڈونگرے برساتے چلے جائیں کوئی برا مانے یا بھلا یہ ہر طرف ہو رہا ہے دیوبندی سمجھتے ہیں کہ ہمارے اکابر محفوظ عن الخطاء ہیں ان کی گالی بھی محبوب کی گالی ہے جس سے رقیب بے مزا نہیں ہو سکتا اور وہ جلد بازی میں مرغے کی ایک ہی ٹانگ بتائیں تو پھر دوسری ٹانگ قیامت تک پیدا نہ ہو۔ اسی طرح بریلوی بھی اور اہل حدیث حضرات بھی اپنے اکابر کے بارے میں زیادہ حساس اور نازک مزاج ہیں یہ چیز افتراق و جدل کی جڑ ہے اور اس جڑ کی آبیاری ہمارے سلجھے ہوئے نفوس کر رہے ہیں۔

مولانا آزاد رحمانی نے — مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا خلیل احمدؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کے فرمودات سے ایسے اقتباسات پیش کئے ہیں جنھیں پڑھ کر کم سے کم ہمیں تو پسینہ ہی آگیا ہے خصوصاً مولانا محمد حسن سنبھلی حنفی نے تو بد تہذیبی اور ناشائستگی کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ ہمارا سر شرم سے جھک گیا۔ ان مولانا نے شرح عقائدیہ "تنظیم الفوائد" کے نام سے حاشیہ لکھا ہے اس میں انھوں نے ایک جگہ امام ابن تیمیہ، ابن القیمؒ، شوکانی ابن حزم اور داؤد ظاہری کو اور ان سے محبت رکھنے والوں کو "کتا" قرار دیا ہے۔

مولانا نذیر احمد نے تو صرف اتنی ہی شکایت کی ہے کہ یہ صاحب "کتا" کہتے ہیں مگر تبصرہ نگار کو اس سے بھی بڑا جرم ان کا یہ نظر آیا کہ انھوں نے قرآن کی آیت فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ کو اس دریدہ دہن اور بے لگام آدمی کی طرح استعمال کیا ہے جیسے خدا اور حساب آخرت کا خوف چھو کر نہ گیا ہو۔ جس کا جی چاہے قرآن اٹھا کر دیکھ لے یہ آیت سورۂ اعراف میں آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس تمثیل کے بارے میں خود ہی واضح فرما دیا ہے ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (یہ مثال ہے اُن لوگوں کی جنھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو) جس مثال کو اللہ تعالیٰ خود کہے کہ کافروں کے لئے ہے اسے امت کی بعض شخصیتوں پر دن دہاڑے چسپاں کرنا گروہی تعصب اور بگڑی ہوئی حنفیت کی وہ المناک ادا ہے جس پر سوائے لعنت کے کچھ نہیں بھیجا جا سکتا۔

اور سُنیئے۔ یہی ہمارے مولانا محمد حسن صاحب حنفی ـــ جن کی محشّٰی شرح عقائد پر شرم سے پانی پانی ہونے کی توفیق کسی دیوبندی اور حنفی کو نہیں ہوئی۔ اہلِ حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" اس کے خلاف ایک جماعت زاویہ منفرجہ سے نکلی ہے جو (حق سے) باغی ہے (براہیاں) کمانے والی ہے، "قنوجی" سے (اشارہ مشہور اہلِ حدیث بزرگ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے جو قنوج کے رہنے والے تھے۔ ناقل) اللہ کے لئے جسم ثابت کرتی ہے اسکو مخلوق سے تشبیہ دیتی ہے اپنی عورتوں کی شرمگاہوں کی کمائی کھاتی ہے بدعتوں کا پاد ملتی ہے آواز کے ساتھ بھی اور بغیر آواز کے بھی "

دیکھ لیا آپ نے ایسے علماء کے بارے میں اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ علم نے ان کے ذوق کی گراوٹ میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج تک کسی حنفی عالم نے اس سوقیانہ گل افشانی پر کوئی احتجاج نہیں کیا حالانکہ دین کے بنیادی عقائد کی کتاب پر حاشیہ لکھتے ہوئے ایسی پست زبان استعمال کرنا جس قدر بُرا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ حق یہ ہے کہ گروہی عصبیتوں نے ہمیں اندھا کر دیا ورنہ یہ کوئی راز نہ تھا کہ اسلام نے ہمیں کھلے کفار کے مقابلہ پر بھی شائستگی کا سبق دیا ہے اور ہم جس طرح اپنے بزرگوں کے لئے جذبۂ احترام رکھتے ہیں اسی طرح دوسرے گروہ بھی اپنے بزرگوں کے بارے میں کچھ احساسات رکھتے ہیں۔ جن کا لحاظ ضرور کرنا چاہیئے۔

یہ تو تھا اندازِ بیان کی ناپاکی کا قضیہ۔ اب ایک حیرتناک بات کا ذکر اور سنتے جایئے جو ہمارے لئے مستقل الجھن بنکر رہ گئی ہے مولانا محمود الحسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے ایضاح الادلۃ جو اہلِ حدیث کے رد میں لکھی گئی ہے اسے چھاپنے والے بھی ایسے ویسے بزرگ نہیں بلکہ مولانا سید اصغر حسین رحمۃ اللہ کی نگرانی میں چھپی ہے اس میں ص۹۷ سے مولانا آزاد رحمانی نے ایک اقتباس پیش کیا ہم چونک گئے دوڑ کر ایضاح الادلہ اٹھائی۔ ص۹۷ کھولا۔ دو مرتبہ حرف حرف کا مقابلہ کر کے دیکھا کہ کہیں ناقل نے کوئی چالاکی تو نہیں کر دی ہے۔ مگر نہیں اقتباس توحرفاً حرفاً درست نکلا۔ اور ہمیں مستقل ایک دردِ سر دے گیا۔ یہ معمہ حل کرنے کے لئے ان دراز قامت دیوبندیوں کی خدمت میں پیش ہے جو مونچھوں پر تاؤ دیکر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے اکابر نہ سہی معصوم مگر محفوظ عن الخطاء ضرور تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ ایک اہلِ حدیث بزرگ سے خطاب کرتے ہوئے دورانِ بحث میں فرماتے ہیں

" یہی وجہ ہے کہ یہ ارشاد ہوا فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ وَإِلَىٰ أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ اور ظاہر ہے کہ اولوالامر سے مراد اس آیت میں سوائے انبیاء کرام علیہم السلام اور کوئی ہیں سو دیکھئے اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت انبیاء وجملہ اولی الامر واجب الاتباع ہیں آپ نے فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر۔ تو دیکھ لی اور آپ کو یہ اب تک معلوم نہ ہوا کہ جس قرآن مجید میں یہ آیت ہے اسی قرآن میں آیت مذکورہ بالامعروضہ احقر بھی موجود ہے عجب نہیں کہ آپ تو دونوں آیتوں کو حسبِ عادت متعارض سمجھکر ایک کے ناسخ اور دوسرے کے منسوخ ہونے کا فتویٰ لگانے لگیں "

مولانا رحمانی کو حیرت ہے ـــ اور بجا حیرت ہے کہ یہ کونسا قرآن ہے جس سے حضرت شیخ الہندؒ آیت نقل فرما رہے ہیں۔ واقعی عجیب بات ہے کہ حضرت شیخ نے بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ الفاظ کے ایک ایسے مجموعے کو قرآن کی آیت قرار دے دیا جو تیس پاروں میں کسی بھی جگہ موجود نہیں ہے ہم حافظ نہیں ہیں مگر کسی حافظ سے پوچھ لینا تو کچھ مشکل نہیں تھا ویسے حافظ سے تحقیق کئے بغیر ہی ہمیں اطمینان ہوگیا تھا کہ رحمانی صاحب کی نشاندہی درست ہے اور حضرت شیخ سے چوک ہوگئی ہے۔ اس یقین کی بنیاد یہ تھی کہ فان تنازعتم والی آیت قرآن میں صرف ایک ہی جگہ آئی ہے اور وہ ہمیں بھی اسلئے یاد ہے کہ مضامین کے دوران عموماً اسکی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

اس موقع پر ہمارے ذہن کے ایک تاریک گوشے میں اس عقیدت نے سر اُبھارا جو ہمیں حضرت شیخ الہندؒ سے ہے شیخ الہندؒ نہ صرف بڑے عالم تھے بلکہ رہنمائے طریقت بھی تھے۔ ہمارے والد رحمۃ اللہ علیہ انہی کے مرید تھے جذبۂ عقیدت کی بناء پر ہم نے

خامی دماغ سوزی کی کہ کوئی معقول سی تاویل اس سہو کے جواز کی ڈھونڈھ لائیں مگر ہمیں اعتراف ہے کہ جوتے شیر لانے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ کتابت کی غلطی اسلئے نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت شیخ کا استدلال ہی اس ٹکڑے پر قائم ہے جو اضافہ شدہ ہے اور آیت کی اسی اضافہ شدہ شکل کا قرآن میں موجود ہونا وہ شدومد سے بیان فرما رہے ہیں اولی الامر کے واجب الاتباع ہونے کا استنباط بھی اسی سے کر رہے ہیں، اور حیرت در حیرت یہ کہ جس مقصد سے اصل آیت نازل ہوئی تھی اسے ان کے اضافہ کردہ فقرے اور اس کے استدلال نے بالکل الٹ دیا ہے۔ قرآن اٹھا کر سورۂ نساء کھولئے۔ اللہ نے فرمایا۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْئٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (رکوع ۸)	اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اسکو رجوع کرو۔ طرف اللہ کے اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

یہ ترجمہ ہم نے حضرت شیخ الہندؒ ہی کے مترجم قرآن سے نقل کیا ہے اس پر علامہ شبیر احمدؒ کا تفسیری حاشیہ یہ ہے۔

"یعنی اور اگر تم میں اور اولوالامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جائے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہیئے۔"

اب اس عظیم سہو کا اندازہ کیجئے جو حضرت شیخ الہندؒ سے ہوا ہے۔ جو آیت یہ بتانے نازل ہوئی تھی کہ عوام اور حکام کے مابین اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اسی میں حضرت موصوف نے نہ جانے کیسے ایک فقرہ بڑھا دیا جو حکام کو بجائے فریق کے جج بنائے دے رہا ہے — پھر اس فقرے میں اولوالامر کا دائرہ انھوں نے ائمہ مجتہدین تک پھیلا دیا۔ جن کی تقلید کی جاتی ہے تاکہ اہل حدیث کے بالمقابل مسلک تقلید کی صحت پر استدلال کیا جا سکے۔ حالانکہ خود انہی کے ترجمے میں اولوالامر سے مراد حکام وقت ہیں نہ کہ مجتہدین اور تمام ہی مستند مفسرین اسی مراد پر متفق ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے انھوں نے آیت کی اس اضافہ شدہ شکل کو شدومد کے ساتھ قرآن کی آیت قرار دیدیا حالانکہ ایسا کرتے ہوئے یہ آیت ہی بے معنی اور اپنی معلوم و متفق علیہ مراد کے منافی ہو گئی۔

ہمیں یہ خیال ہوا کہ دیکھیں قرآن میں آگے بھی ایک جگہ اولی الامر کا تذکرہ آیا ہے کہیں ایسا تو نہیں شیخ کو وہاں سے متشابہ لگ گیا ہو۔ صفحات الٹے۔ آیات دیکھیں مگر مضطرب ذہن کوئی بھی صورت تسکین نہیں نکال سکا۔ آپ بھی دیکھیں کوئی صورت توجیہ و تطبیق کی بنتی ہے یا نہیں۔ اسی سورۂ نساء میں آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ	جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اسکو مشہور کر دیتے ہیں۔ اور اگر اسکو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک تو تحقیق کرتے اسکو جو ان میں تحقیق کرنیوالے ہیں اسکی۔

نہ تو لفظاً اس آیت میں گنجائش ہے کہ فان تنازعتم والی آیت سے متشابہ لگ سکے نہ معناً یہ اشتباہ و توارد کا گمان پیدا کر سکتی ہے۔ ترجمہ آپ کے سامنے ہے جو شیخ الہندؒ ہی کا ہے اور تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مزید وضاحت کر دی ہے۔ کہ روئے سخن ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی طرف ہے جو بہت سی باتیں بلا تحقیق مشہور کر دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ خاموشی سے یہ باتیں رسول اور دوسرے حاکموں تک پہنچا دیتے تو اہل نظر ان کی تحقیق کر لیتے۔

معلوم ہوا کہ یہ آیات بھی نہ تو مجتہدین وغیرہ کی تقلید وغیرہ سے کوئی تعلق رکھتی ہیں نہ ان میں الفاظ کا در وبست ایسا ہے کہ حافظے کی ذرا سی چوک سے وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ کا فقرہ یہاں سے اکھڑ کر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ والی آیت میں جا لگے۔

پھر آخر ہم کیا کریں دیوبندیت کی رگ پھڑک پھڑک کہہ رہی تھی کہ چلا دو الٹی سیدھی زبان اور کر دو کوئی ایسی کج بحثی شروع

جو اصل معاملے کو توگول کر دے اور کھل جائے مولٰنا مودودی اور نواب صدیق حسن جیسی کسی ہستی نامبارک کی لغزشوں اور گمراہیوں کا ہی کھاتہ۔ مگر حسابِ آخرت کے اندیشے اور حق و صداقت کے تقاضے نے اس فاسد رگ کے کان پکڑ لئے اور ہمیں برملا کہنا پڑ رہا ہے کہ محفوظ عن الخطاء سوائے انبیا کے کوئی نہیں۔ وہ ہمارے اکابر ہوں یا اہل حدیث کے۔ سبھی سے سہو و خطا ممکن ہی نہیں کہیں نہ کہیں واقع بھی ہے۔ ہمیں دوسروں کی لغزشوں کو گمراہی اور زندقہ قرار دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا چاہیئے کہ خود ہمارے بزرگوں سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں اور دوسرے لوگ جیسے کو ویسا کی رعایت سے ان پر بھی گمراہی اور فسق وغیرہ کے الفاظ ضرور چسپت کریں گے۔

اندھی عقیدت وہ بلا ہے کہ الامان الحفیظ۔ ایضاح الادلہ کے ایڈیشن پر ایڈیشن چھپے ہیں ہم نے وہ آخری ایڈیشن بھی دیکھ لیا جو مرادآباد میں چھپا ہے اس میں تبدیلی تو کیا ہوتی ایک یہ اضافہ ضرور ہوا کہ مصحح یا ناشر صاحب نے حاشیے پر آیت کا اردو ترجمہ درج فرمادیا اور یہ کھوجنے کی توفیق پھر بھی نہ ہوئی کہ قرآن میں کس جگہ یہ آیت آئی ہے نہ یہ سوچ کر چونکنا نصیب ہوا کہ یہ اختلافی امور میں اولوالامر کی طرف رجوع کرنے کا نیا شوشہ کیسے نکلا۔ کسی حافظ کسی مولوی نے اسے پڑھا ہی ہوگا مگر عقیدت جب نشہ بن کر اعصاب پر سوار ہوتی ہے تو یادداشت اور فکر و فہم کی سب صلاحیتیں گہری نیند سوجاتی ہیں کسی کو نظر نہ آیا کہ حضرت شیخ سے کیا چوک ہوگئی ہے اور اگر نظر بھی آیا ہو تو شاید یہ سوچکر خموشی اختیار کرلی گئی کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم ایسی عقیدت، ایسی حق پوش عصبیت، ایسی کورانہ نیاز مندی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں حضرت شیخ انسان تھے۔ بلا تأمل تسلیم کرلینا چاہیئے کہ ان سے قصور ہوگیا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس قصور کے پیچھے عزم و ارادہ کارفرما نہ ہو مگر جب دوسرے غلطی کریں تو انہیں بھی ہمیں ایسے ہی حسن ظن کا مستحق سمجھنا چاہیئے یہ کیا کہ ہم سے قصور ہو تو وہ سہو و نسیان اور دوسروں سے قصور ہو تو وہ خباثت و شرارت۔ بد باطنی وغیرہ کے گھناؤنے الزامات مضبوط شواہد چاہتے ہیں۔ یہ شواہد بریلوی فرقے نے تو بیشک اتنے انبار در انبار مہیا کردیئے ہیں اور برابر کرتا جارہا ہے کہ اس کی جہالت و شرارت، بلید الذہنی، بوالفضولی اور گمراہی میں شک کرنا حقائق میں شک کرنا ہوگا۔ لیکن احناف اور اہل حدیث کے ممتاز اور ذمہ دار اسلاف و اخلاف کے بارے میں ایسے شواہد ہرگز موجود نہیں ہیں کہ ان کی لغزشوں اور فکری غلطیوں کو خباثت اور بد باطنی سے جوڑ دیا جائے۔

میں اپنے دیوبندی بھائیوں سے پوچھتا ہوں استاد محترم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے "الشہاب الثاقب" میں محمد بن عبد الوہاب نجدی کو برملا ظالم و باغی اور خونخوار فاسق لکھا (ص۴۲) پھر اسی پر بس نہیں کی۔ چند سطروں میں تین مرتبہ ان سے منسوب گروہ کو خبیث کے لفظ سے نوازا۔ (ص۵۱ و ۵۳) اور یہاں تک ارشاد ہوا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مماثل ذات سرور کائنات خیال کرتے ہیں۔ (ص۴۷) — دیوبندی سوچیں کہ جب بریلوی حضرات مولانا اشرف علی وغیرہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ حضورؐ کی تکریم نہیں کرتے اور انہیں بس بڑے بھائی جیسا سمجھتے ہیں تو دیوبندیوں کو کیسا تاؤ آتا ہے اور کس شدت سے وہ بریلویوں کی شرارت و سفاہت کا ماتم کرتے ہیں لیکن ایسا ہی الزام ہمارا کوئی بزرگ دوسرے کسی فرقے کے بزرگ پر لگاتا ہے تو ہم اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان بزرگوں نے بھی تو کہیں بریلویوں ہی کی طرح افواہوں، تحریفوں اور پروپیگنڈوں پر بھروسہ نہ کرلیا ہو۔ خبیث بڑا مکروہ لفظ ہے لڑائی جھگڑے میں اس کا استعمال ہم جیسے کریں تو کریں مگر کسی بڑے عالم کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسے شخص کو خبیث کہے جس کی کوئی خباثت اس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی اور نہ کسی قابل وثوق ذریعہ سے اس کی اطلاع اسے پہنچی۔ محض سُنی سُنائی اور ہمہ شما کی تحریر کردہ معلومات پر تکیہ کرکے تخبیث و فسق کے ٹھپے دینا اہل انصاف ہے۔ تو پھر بریلویوں ہی کی دریدہ دہنیوں کا شکوہ ہم کس منہ سے کرسکتے ہیں، سرخاب کا پر نہ ہمارے بزرگوں میں ہے نہ دوسروں کے بزرگوں میں۔ ہم سب اللہ اور رسول کے غلام ہیں افہام و تفہیم کی حد تک متین گفتگو ہونی چاہیئے گالی گلوچ اہل حا

کا شیوہ نہیں۔ اسے بریلویوں ہی کے لئے چھوڑ دینا چاہیے
یہ تبصرہ تو ابتدائی حصّے سے متعلق۔ اسے ہم نے طول
اس لئے دیا کہ شاید کسی کے لئے تازیانۂ عبرت بن جائے۔ خود
تنقیدی ہی وہ وصف ہے جو انسان کو دوسروں کے ساتھ انصاف
کرنے پر مائل کر سکتا ہے اب رہا اصل بحث کا معاملہ تو اس پر مفصل
تبصرے کی گنجائش اب صفحات میں باقی نہیں رہی اجمالاً کہا جا سکتا
ہے کہ رحمانی صاحب کی باتوں میں وزن ہے قلم میں زور ہے ذہن
میں تیزی ہے مناظرانہ صلاحیت وافر ہے۔ بات کہنے، سمجھانے
اور سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ دوران مطالعہ میں جگہ جگہ
وجدان کو دھچکے بھی لگے۔ ذوقِ سلیم کسمسایا بھی لیکن اسکی شکایت
کیسے کریں جبکہ مد مقابل بھی اسی نوع کی زبان اور اسی کوالیٹی کی انشاء
استعمال کر رہا ہے کوئی قیمتی بیرومیٹر ناپے تو ناپے کہ فریقین میں سے
کس کی تیزی و تندی کم رہی اور کس کی زیادہ۔ ہمیں تو دونوں ہی کا
وہ لب و لہجہ، وہ الفاظ اور وہ طنز و طعن ناپسند ہیں جو علمی وقار
اور فکری ثقاہت و نجابت سے فروتر ہیں۔

ہاں ایک ناوک زنی پر ہم رحمانی صاحب سے دوستانہ
شکایت ضرور کریں گے۔ صفحہ ۱۴۰ پر انھوں نے جو لکھا ہے کہ

" یہاں بھی قاسمی صاحب نے اپنی " ذہانت" ہی دکھانے
کا شوق پورا کیا ہے اور یہ " ذہانت" ان کو اپنے اس امام سے
ملی ہے جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے زبردست
فقیہہ اور ذہین تھے کہ اگر چاہتے تو اپنی ذہانت اور فقاہت کے
زور سے لکڑی کے ستون کو سونے کا ثابت کر دیتے تو کیا قاسمی
صاحب اس امام کی تقلید کے طفیل اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ سونے
کے ستون کو مٹی کا ثابت کر دیں؟"

نیت اور ذہنی کیفیات کا حال اللہ جانتا ہے اپنے مفہوم
کے اعتبار سے یہ طنز امام ابوحنیفہؒ کی تنقیص و تضحیک تک جا
پہنچا ہے ہم بہرگز نہیں کہتے کہ امام ابوحنیفہؒ تنقید سے بالاتر
ہیں اور یہ بھی نہیں کہتے کہ اہل حدیث یا شوافع وغیرہ ان کے ساتھ
ایسی ہی عقیدت رکھیں جیسی ہم احناف رکھتے ہیں لیکن یہ ضرور
کہتے ہیں کہ ان کی جلیل القدر ہستی ہم سب کا مشترکہ سرمایہ ہے
ان پر اور ان کے شاگردوں پر عالمانہ پیرائے میں نقد و جرح تو
کی جا سکتی ہے مگر تشنیع و طنز نہیں۔ ان کی " ذہانت " کی متذکرہ
تمثیل ایک بڑے انسان سے منسوب ہے اس نے اگر غلط کہا یا
بعد کے لوگوں نے اس کی طرف یہ قول غلط منسوب کر دیا تب بھی
اس پر استہزاء کے تیر نہیں چلانے چاہئیں۔ یہ ہم خوب سمجھتے ہیں
کہ رحمانی صاحب کی ذہانت اپنے مذکورہ فقروں کی بھی خوشنما تعبیر
پیش کرنے سے معذور نہیں ہو سکتی۔ مگر دلسوزی کے ساتھ گذارش
ہے کہ تعبیر و تاویل کے بجائے اگر وہ اگلے ایڈیشن میں ان لائنوں کو
قلمزد ہی کر دیں تو مناسب ہوگا۔ کسی حنفی نے اگر کبھی اہل حدیث کے
کسی بزرگ پر نازیبا قسم کا طعن کیا ہے تو اس کا گناہ میرے یا
رحمانی صاحب کے لئے تو گناہِ مزید کا جواز نہیں بن سکتا۔ ونعوذ
باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا صفحہ ۷۵ پر
کہا گیا ہے۔

> آٹھ رکعت پر اکتفا کرنا سنت نبوی ہے اس کے
> ثبوت کے لئے اہل حدیث کسی امتی کے عمل کو
> سہارا نہیں بناتے۔ ان کے پاس تو اس کے ثبوت
> کے لئے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف
> و صریح اسوۂ حسنہ موجود ہے اس کے بعد انہیں
> یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے کہ فلاں زمانے
> کے مسلمانوں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔"

ہمارے خیال میں اتنے اطلاق و توسع کے ساتھ " امت " سے
بے نیاز ہو جانا محلِ نظر ہے۔ آخر حضور ہی نے تو فرمایا ہے کہ
علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین۔ جب رسول کی اطاعت
کا حکم خداوندی اس اطاعت کو عین خدا کی اطاعت بنا دیتا ہے
تو خلفائے راشدین کی سنت پر چلنے کا حکم پیغمبر کیوں خلفائے
راشدین کی سنت پر چلنے کو خود پیغمبر ہی کی سنت پر چلنے کا ہم معنی
نہیں بنا دیگا۔ ہمارا تو یہی خیال ہے کہ جس فکر و عمل میں چاروں خلفاءؓ
کا مکمل اتفاق ہو اس سے صرف نظر کرنا سنت ہی سے صرف نظر
کرنے کے مرادف ہوگا۔ اگر ایسا نہ مانیں تو رسول کی اطاعت
خدا کی اطاعت نہیں کہلا سکیگی۔ گو پوری کتاب سے اہل حدیث کا
یہ مسلک ظاہر نہیں ہوتا کہ خلفائے راشدین کا اجماع و اتفاق ان
کی نگاہ میں معیار و حجت نہیں ہے مگر منقولہ عبارت بہرحال کا

مسلک پر دلالت کرتی ہے لہذا یہ مسلک اگران کا نہ ہو تو اس عبارت میں ترمیم کرنی چاہیے۔

اصل بحث — یعنی رکعات تراویح آٹھ پڑھی جائیں یا بیس — اب تہ کر کے رکھدی جائے تو اسی میں امت کی خیرخواہی ہوگی۔ جو آٹھ پڑھتا ہے آٹھ پڑھے جو بیس پڑھتا ہے بیس پڑھتا رہے انشاء اللہ دونوں کی بخشش ہوگی۔ دونوں کی نیتیں نیک ہیں دونوں کا مستدل اللہ اور رسول ہی ہیں بس فرق اتنا ہے کہ اہل حدیث کے ہاتھ ذرا لمبے ہیں وہ براہ راست قرآن و حدیث تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم مقلدین کی کوتاہ دستی اس رسائی میں حائل ہے لہذا ہم سیڑھیاں طے کر کے قرآن و حدیث تک پہنچتے ہیں سجدہ گاہ ہم دونوں کی ایک ہی ہے اچھے اور برے لوگ ہم دونوں کی جماعتوں میں ہیں۔ خدا ان احناف اور ان اہل حدیث کو نیک توفیق دے جو آئے دن بیٹھے بٹھائے ھل من مبارز کا نعرہ لگا بیٹھتے ہیں اور نتیجے میں لغو ولاطائل بحث و جدل کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے کاش یہ دونوں گروہ سمجھیں کہ آپس میں لڑنا یا مولانا مودودی اور جماعت اسلامی وغیرہ کے لئے لینا ہمارے لئے مناسب نہیں ہمارا کام تو یہ ہے کہ متفق ہو کر بدعت و شرک سے بھرپور جنگ لڑیں جس نے شریعت تیودی کا روپ دھار کر دین متین کی پاکیزہ فضا کو تعفن سے بھر دیا ہے اور اسی کے ادبار میں ہم سب گرفتار ہیں۔ کوئی مانے نہ مانے۔ ہمیں تو سو فیصدی یقین ہے کہ ہماری زبوں حالی، انحطاط، ہمارے آلام و مصائب اور ہماری نکبت و فلاکت کی بنیاد یہی ناپاک صورت حال ہے کہ امت کی غالب اکثریت شرک و بدعت کی نوع بہ نوع اقسام میں گرفتار ہو کر توحید سے دور چلی گئی اور اللہ ناراض ہو گیا۔ یہ قبروں پر جمع ہونے والے جہلاء تو ایک طرف رہے اگر آپ ان اپٹوڈیٹ حضرات کا بھی جائزہ لیکر دیکھیں جو بظاہر مغرب پرست ہیں اور دین سے انھیں کوئی سروکار نہیں تو پتہ چلیگا کہ تیودی شریعت کا زہر ان میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے جب کبھی یہ کسی چکر میں پھنس جائیں اس وقت دیکھئے کہ یہ بھی کسی مزار ہی پر دست بدعا نظر آئیں گے اور تعویذ گنڈوں والے صوفیاء ہی کے گرد منڈلاتے ملیں گے الا ماشاء اللہ۔

اشک و تبسم

● مجموعۂ کلام جناب سنتوش کمار موج ● ملنے کا پتہ:- سنتوش کمار سکسینہ موج رامپوری محلہ جھنڈا۔ رام پور۔ یو پی۔ ● صفحات ۱۴۸ ● طباعت و کتابت گوارا۔ کاغذ سفید۔ مجلد تین روپے۔

نوجوان شاعر جناب موج صاحب کا یہ شعری مجموعہ خاصا دلکش ہے۔ فکر و نظر کی بلندی اور اسلوب بیان کی پختگی تو رفتہ رفتہ ہی پیدا ہوگی لیکن حسن بنیادوں پر فن کی بلند عمارت اٹھا کرتی ہے وہ ان کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ غزل، نظم اور قطعات تینوں اصناف سخن میں انھوں نے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انھوں نے نعتیں بھی کہی ہیں۔ سلام بھی اور حضرت حسینؓ پر مستقل نظم بھی۔

ادبی ذوق رکھنے والوں کو ان کا یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے۔

آئینۂ حیرت

● جناب عبدالمجید حیرت کی منتخبہ غزلوں کا مجموعہ ● شائع کردہ۔ مکتبہ الحسنات رام پور یو پی ● صفحات ۱۳۶ قیمت دو روپے۔

حیرت شملوی ایک معروف شاعر ہیں۔ ان کا اپنا ایک رنگ ہے۔ انفرادیت سے بھرپور۔ دلکشی سے لبریز، چھوٹے چھوٹے فقروں میں وہ بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں اشارت اور ایجاز ان کے اسلوب کی جان ہے۔ سلاست اور سادگی سے رچے ہوئے ان کے تیکھے شعر ذہن پر بڑا شگفتہ اثر چھوڑتے ہیں۔

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آ گئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

کوئی ہمدم مرے ہمراہ مرے دوش بدوش
دو قدم چل نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا

آج بھی جو وفا پہ قائم ہیں — وہ بھی ہیں لوگ کس زمانے کے

خوشی میں بھی وہ اک کیفیت غم — نہیں جاتی ہے دل اتنے دکھیں سے

نیت ہو اگر پاک تو ملتا ہے صلہ بھی
شیشہ ہو اگر صاف تو آتی ہے جلا بھی

گھڑیاں مسرتوں کی بھی آئیں تو عارضی
دائم اگر رہا تو غم یار ہی رہا

بھول چوک سے کوئی بچا ہوا نہیں۔ خفی وجلی لغزشیں ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً۔

تماشایہ بھی گذرا ہے نظر سے   گھٹا اٹھی مگر بادل نہ برسے

اس میں گھٹا اور بادل اس طرح استعمال ہوئے ہیں گویا وہ دو جداگانہ چیزیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے دونوں مرادفین میں سے ایک حشو وزوائد میں سے ہے۔

آرام کا سودا جسے ہوگا اُسے ہوگا ؛ اپنی تو اسی گردش آفات میں گذری

"سودا" کا محل نہیں تھا۔ اس کی جگہ "میسر" آجاتا تو شاید بہتر تھا۔

آرام میسر جسے ہوگا اُسے ہوگا

حیرت سے اختلاف کسی کا عجب نہیں ؛ حیرت کا منتہائے نظر دیکھتے ہوئے تخلص کی یہاں تکرار غیر فنی ہے مفہوم بھی گنجلک ہے۔

حیرت ہزار صبر کا پیکر سہی مگر
وہ بھی تو ان کے ہاتھ سے نالاں ہے آجکل

"ان کے ہاتھ سے نالاں ہونا" محاورہ نہیں ہے "ان کے ہاتھوں" درست ہوتا۔

دل صاف نہیں غیر تو کیا ان سے شکایت
جب خود ہی منافق ہوں مسلمان ہزار دں

دلدار اور دلنواز کی طرح "دل صاف" کہنا محل نظر ہے۔

اعادہ مقصود نہیں۔ جس طرح بہت اچھے اچھے شعراء کی تقریباً ہر غزل میں ملتے ہیں اسی طرح زبان و بیان کی معمولی لغزشیں بھی نایاب نہیں ہیں۔ مجموعی حیثیت سے حُسن بیان غالب ہے۔ لاریب یہ مجموعہ ارباب ذوق کے لئے ایک تحفۂ مغتنم ثابت ہونا چاہیئے۔

نصرۃ الحدیث

فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک معرکۃ الآراء کتاب۔

ہر دوہی الزام اور پروپیگنڈے کا مدلل رد۔ زبان عام فہم شگفتہ۔ مگر مطالب نہایت وقیع و سنجیدہ۔ مقدمہ جدیدہ کے اضافے کے ساتھ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

(بقیہ از صفحہ ۵۶)

آدمی کے مُنہ میں کُتّے کی زبان

خواجہ حسن نظامی رح

خواجگی کے دعویدار کفر کی تبلیغ کے شکیدار اسلام کی مخالفت کے علمبردار کرشن کنہیا کے امتی مسٹر جٹادھاری خواجہ حسن نظامی دہلوی مسلمانو! کیا اب بھی حسن نظامی کے کافر، مرتد، منافق، ملحد زندیق بے دین ہونے میں کچھ شک رہ سکتا ہے۔ بحکم شریعت مطہرہ حسن نظامی سے بڑھ کر ڈبل کافر کون ہوگا۔

صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰ تجانب اہل السنۃ

مولانا ابوالکلام آزاد رح

ابوالکلام آزاد، عبدالشکور کاکوروی حسین احمد مدنی۔ اجودھیا باسی شبیر دیوبندی، عطاء اللہ بخاری۔ حبیب الرحمٰن لدھیانوی احمد سعید دہلوی کفایت اللہ یہ سب مرتد، بے دین اور کافر ہیں۔ تجانب اہل السنۃ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۶

شاہ ابن سعود

تجانب کے صفحہ ۲۵۷ اور ۲۵۹ میں شاہ ابن سعود کو ابن سعود خذلہ اللہ الملک المصور اور ابن سعود قبحہ الملک الودود جیسے القابات دیکر لکھا ہے۔

کفار نجد کے اس مجموعہ خبیثہ میں اور بھی بکثرت کفریات قطعیہ وارتدادات یقینیہ ملے کھلے بھرے ہیں مگر آدمی کے کافر و مرتد ہو جانے کے لئے معاذ اللہ ایک ہی کفر و ارتداد بس ہے۔

تجانب ۲۶۳

قائداعظم

مسٹر جینا بحکم شریعت اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ خبیثہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اُسکو مسلمان جانے یا اُس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اُس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ کافر مرتد۔ اور شر النار اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت۔

تجانب صفحہ ۱۲۲

از حکیم حکیم محمد عظیم زبیری - امروہہ

باب الصحت

(عمر اور کام کے لحاظ سے غذا کا تعین)

جسم کو بڑھوتری کے زمانے میں جس کی مدت پچیس ۲۵ سال کی عمر تک ہے پروٹینی غذائیں زیادہ مقدار میں درکار ہوتی ہیں۔ گوشت۔ مچھلی انڈے کی زردی۔ اور ماش کی دال میں کافی مقدار پروٹین کی ہوتی ہے ان اشیاء کے علاوہ دودھ۔ مکھن۔ بالائی۔ گاجر۔ ٹماٹر۔ شلغم۔ مولی۔ کیلا۔ آم کا استعمال بھی جسم کے نشو ونما کے لئے ضروری ہے غریب آدمیوں کو چاہیئے کہ بڑھوتری کے زمانہ میں بچوں کو کچی گاجریں مولی۔ شلغم۔ ماش کی دال۔ ٹماٹر استعمال کرائیں۔

جوانی میں جس کی مدت پچیس ۲۵ سال سے لیکر چالیس سال کی عمر تک ہے انرجی اور طاقت بڑھانے والی اشیاء کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ جوانی کی عمر میں کاروباری مشغولیت اور گھر گرہستی کے دھندوں میں طاقت کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اسلئے اپنے کام اور پیشہ کے لحاظ سے جتنی طاقت روزانہ خرچ ہوتی ہو اسی کے مطابق طاقت پیدا کرنے والی غذا کھانی چاہیئے۔ اگر آپ اپنے کام چستی اور ہمت کے ساتھ ادا کر رہے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو خوراک آپ کے جسم کی ضرورت کے مطابق مل رہی ہے۔

ادھیڑ عمر کے لوگوں کے لئے دودھ۔ انڈا۔ بکری کے گوشت کا شوربہ اور زود ہضم تازہ سبزی مفید غذا ہے۔ بڑھاپے میں غذا اچھی طرح چبائی نہیں جاتی۔ ہضم کی قوتوں میں کافی کمزوری آجاتی ہے اس لئے بڑھاپے میں غذا کا نرم۔ سادہ اور اچھی طرح پکا ہوا ہونا ضروری ہے قریب بکرے اور چوزہ مرغ کا شوربہ۔ مچھلی۔ اور انڈے کی زردی اس عمر میں طاقت میں اضافہ کرنے والی غذائیں ہیں۔

کمزور اور لاغر دبلے پتلے لوگوں کو گوشت اور چربی پیدا کرنے والی غذائیں۔ سب قسم کے اناج۔ گھی۔ مکھن۔ بالائی۔ پنیر۔ بھینس کا دودھ خشک میوے اور موسمی پھلوں کا استعمال مناسب ہے۔ ادھیڑ اور بڑھاپے کی عمر میں موٹا ہونے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد دبلا پن تکلیف نہیں پہنچاتا بشرطیکہ صحت درست رہے۔

جو لوگ اعصابی شکایتوں میں مبتلا ہیں ان کے لئے اور خاموشی کے ساتھ دماغی کام کرنے والوں کے واسطے دودھ۔ مکھن انڈا۔ سبزی اور پھل مفید غذائیں ہیں۔ اگر جد وجہد اور نئی نئی ایجادات کرنے کا ولولہ اور شوق ہے تو مچھلی۔ گوشت۔ انڈا نیز دیگر پروٹینز اور فاسفورس پر مشتمل غذائیں مثلاً بادام۔ پستہ اخروٹ وغیرہ استعمال کریں۔

جو لوگ دماغی کام زیادہ کرتے ہوں یا جن کا زیادہ وقت بیٹھنے میں گزرتا ہو انہیں ٹھوس ثقیل بھاری غذا کم سے کم کھانی چاہیئے کیونکہ دماغی محنت کرنے والوں کی عصبی قوت زیادہ صرف ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں قوت ہضم کمزور پڑ جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کو جس زمانہ میں زیادہ محنت کرنی پڑے اس زمانہ میں یا تو ورزش اور چہل قدمی میں اضافہ کر دینا چاہیئے تاکہ فعل ہضم درست رہے غذا برابر ہضم ہوتی رہے یا غذا کی مقدار گھٹا دینی چاہیئے لیکن غذا کی مقدار گھٹانے کے ساتھ غذائیت بڑھا دینی چاہیئے۔ ایسی غذائیں جو مقدار میں قلیل اور غذائیت میں زیادہ ہیں مثلاً نیم برشت انڈا۔ چوزہ مرغ۔ تیتر۔ بٹیر۔ مرغابی کا شوربا۔ دودھ استعمال کریں۔ ان غذاؤں کے استعمال سے ہاضمہ درست رہیگا۔ دماغ تھکن محسوس نہ کریگا۔ غذا کی کمی سے دبلا پن نہ ہوگا۔ جسمانی محنت مشقت کرنے والوں کو نشاستہ دار غذائیں مثلاً دالیں۔ چاول۔ آلو۔ جو۔ گیہوں۔ چقندر۔ شکر قند۔ گڑ۔ راب۔ کھانڈ۔ کیلا وغیرہ کافی مقدار میں استعمال کرنی چاہئیں۔

Regd No A- 972

Tajalli Monthly, Deoband. U. P.

ماہنامہ تجلّی دیوبند

14 (10)

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs 7. 62 n.P.

موسم کی
تبدیلی کے
دنوں میں
صافی
استعمال کیجیے
صافی آپ کو خون کی خرابی سے
پیدا ہونے والی بیماریوں سی بچائے گی
اور آپ کے نظامِ عصبی میں توازن
پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ خون
کی لہر دوڑا دے گی۔ معدہ کے فعل
کو دُرست کرے گی اور جسم کو چُست
اور پھُرتیلا بنائے گی۔
SAF
THE GRE
BLOOD
PURIFIE
ہمدرد
دہلی - کانپور - پٹنہ

ماء اللحم

ہمدرد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلّی دیوبند

شمارہ ۱۰/ — جلد ۱۴/

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھیئے)

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو

سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں اگر آئندہ خریداری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائینگے۔

پاکستانی حضرات۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ میناباز(ار) پیر الٰہی بخش کالونی کراچی (پاکستان)

اوپر لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجد(یں) جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانے سے ملتی (ہے)۔
منیجر

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن

چین کے جارحانہ اقدامات نے جب فوجی حملے کی شکل اختیار کی تو پچھلا شمارہ تکمیل پا چکا تھا۔ اسی لئے اس میں اس اہم ترین موضوع کا ذکر نہیں آیا۔ اس وقت جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں جنگ اور اس سے متعلق تفصیلات کا علم ملک کے بچے بچے کو اس حد تک ہو چکا ہے کہ خبر کی حیثیت سے بیان کرنیکو ہمارے پاس کوئی نئی بات نہیں۔ ابتدائی آویزشوں سے گذر کر ہماری اور چین کی جنگ ایک عبوری ٹھیراؤ کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ ٹھیراؤ طویل المدّت ہوگا یا قلیل المدت اسکا علم اللہ ہی کو ہے۔ بعض خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شدید ترین برفانی موسم سے قبل چند معرکے اور بھی ہوں گے لیکن اندازہ اندازہ ہی ہے۔ قطعی طور پر تو سوائے خبیر و علیم باری تعالیٰ کے کوئی بھی نہیں جانتا کہ جس وقت یہ سطور آپ کے سامنے ہوں گی اُس وقت تک حالات کتنی کروٹیں لے چکے ہوں گے والی اللہ ترجع الامور۔

یہ کہنا کہ چین کے ستمگرانہ حملے سے ہمارے دل و دماغ کو دُکھ پہنچا ہے اور شرافت و اخلاق کی تمام قدروں سے عاری دشمن کو مار بھگانا ہمارے نزدیک تمام اہل وطن کا مُقدّم ترین فریضہ ہے، تحصیل حاصل ہی ہوگا۔ جہاں تک ریکارڈ بنانے اور سندِ وفاداری حاصل کرنے کا تعلق ہے ہمارے پاس کوئی ایسی کہانی نہیں جو ارباب وطن کو سنا سکیں۔ نہ ہماری کسی کمسن بچی نے پندرہ دن روزے رکھ کر بھارت کی فتح کے لئے دعائیں مانگی ہیں نہ ہمارے کسی عزیز نے خون سے دستخط کر کے وزیر اعظم کو خط بھیجا ہے۔ ہاں جہاں تک صاف گوئی کا تعلق ہے ہم پورے اطمینان قلب کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو دین ہمارے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کا سرچشمہ ہے وہی ہمیں صاف طور پر یہ بتا رہا ہے کہ ہمارے وطن پر حملہ کرنے والا چین دغا باز ہے' بد عہد ہے' ظالم و غاصب ہے۔ اس سے لڑنا' اسے پسپا کرنا اور اس سے اپنے وطن کی ایک ایک انچ زمین واپس لینے کی جدوجہد ہمارے لئے نہ صرف دنیاوی فریضہ ہے بلکہ ہمارا دین بھی یہی ہدایت دیتا ہے کہ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور تمہاری جمہوری حکومت اگر یہ جنگ جیتنے کے لئے کسی بھی محاذ پر تمہاری ضرورت سمجھے تو اپنے داخلی اختلافات کو نظر انداز کر کے اسکی آواز پر لبیک کہو اور ملک و قوم کی ہر ممکنہ خدمت اُسی خلوص و دیانت کے ساتھ انجام دو جس کی اسلام ہر حال میں تعلیم دیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ابنائے وطن ہماری وطن دوستی کا اعتبار نہیں کرتے اور ہماری ہر پیش کش ان کی نگاہ میں خوشامد اور ظاہر داری کے سوا کوئی وزن نہیں رکھتی، لیکن اس نازک وقت میں کسی کی کوتاہ نظری ہمارے لئے اپنے فرائض سے انحراف یا تساہل کا باعث نہیں بن سکتی۔ خواہ مخواہ الٹی سیدھی نمائشِ وفاداری کی تو ضرورت نہیں۔ یہ بھی نہایت پوچ بات ہے کہ ہم اگر وطن کی سلامتی اور فتح و ظفر کی دعائیں بھی مانگیں تو ہماری آرزو یہ ضرور ہو کہ ان دعاؤں کی بازگشت کسی نہ کسی طرح حکومت اور عوام کے کانوں تک بھی پہنچ ہی جائے۔ ہم اگر اخباروں میں یہ چھپواتے ہیں کہ ہماری ننھی بچی نے پندرہ دن روزہ رکھکر فتح کی دعا مانگی ہے تو اپنے چھوٹے پن کا ثبوت دیتے ہیں اور ملک و قوم سے اپنی وفاداری کو مذاق کا موضوع بناتے ہیں۔ ہرگز ضرورت

نہیں ہے کہ ہم نیازمندی کے جہری اعلانات کو اپنا شعار بنائیں ضرورت صرف اس کی ہے کہ متانت کے دائرے میں رہ کر صحیح جذبات کا اظہار کر دیں اور وطن کو جہاں کہیں ہماری ضرورت پڑے مردانہ وار آگے بڑھ جائیں۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ اس وقت پورا ملک وطن دوستی کے جذبے سے سرشار ہے۔ ہمارے یا کسی اور کے وعظ کی اسے ضرورت ہی نہیں۔ پیسہ، سونا، کپڑا اور خون کون سی شے ہے جو ابنائے وطن بڑھ چڑھ کر دفاعی فنڈ میں نہیں دے رہے ہیں۔ فوج میں شمولیت کے لئے بھی جوانوں کی صفیں موج در موج بڑھ رہی ہیں۔ ہر طرف ولولہ ہے امنگ ہے مر مٹنے کا ہمہمہ ہے۔ جوش و خروش ہے۔ عزم اور جذبہ ہے۔ ہتھیار بھی دوست ملکوں سے حاصل ہوتے جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ انشاء اللہ کامیابی ہندوستان کا منھ چومے گی اور اعتماد شکن، باطل کوش اور طاغی و غاصب حملہ آور کو اپنی کرنی کا پھل بھگتنا ہوگا۔ ہم مسلمان سوائے خدا کے کسی بھی شے کی پرستش نہیں کرتے اس لئے عقیدے کی حد تک تو حملہ آور سے نفرت کرنے کے معاملہ میں ہمارے اور ان ابنائے وطن کے مابین ضرور ذہنی فرق ہوگا جو وطن کو معبود اور دیوتا کی حیثیت دیتے ہیں مگر اس مقصد و مدعا میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کہ حملہ آور کو اپنے وطن کی سرحدوں سے پرے دھکیلنے کی خاطر اپنے اموال، اپنے جملہ وسائل اور اپنی جانیں تک ہمیں داؤ پر لگا دینی چاہئیں۔ نیز یہ بات بھی کمیونسٹ حضرات کے علاوہ ہم سب میں مشترکہ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ دین دھرم سے ہمارا دلی لگاؤ ہے اور حملہ آور چین روحانیت کے نام تک سے جلتا ہے۔ ہر روحانی و اخلاقی قدر کا انکار، ہر مذہبی تصور سے عناد اور ہر ناپاک سے ناپاک ذریعہ کو مقصد برآری کے لئے بلا تکلف اختیار کر لینے کی روش اس کا معروف و معلوم طرۂ امتیاز ہے۔ اسکی دنیا میں درست وہ ہے جسے وہ درست کہدے اور غلط وہ ہے جسے وہ غلط قرار دیدے۔ کوئی جبر کوئی دھاندلی کوئی شقاوت و قساوت ایسی نہیں جس کے ارتکاب میں اسے عار ہو۔ اس طرح کے حملہ آور سے بھرپور جنگ لڑنے کے لئے ہم سب کے پاس ذہنی و روحانی بنیادیں قدر مشترک کے طور پر موجود ہیں اور کسی صاحبِ فہم کے لئے یہ یقین کر لینے میں کوئی شے مانع نہیں ہے کہ بھارتی کمیونسٹوں کو چھوڑ کر ملک کا بچہ بچہ حملہ آور کے خلاف شدید جذباتِ نفرت رکھتا ہے۔

لیکن دو باتیں ہم اپنی حکومت سے ضرور کہیں گے۔ گو ہمیں احساس ہے کہ ہماری کمزور آواز اونچے ایوانوں تک نہیں پہونچ سکے گی یا بطور کرامت پہنچ ہی جائے تو اس پر التفات و اعتناء کی توقع نہیں، لیکن ہم تو کہنے ہی کی حد تک مکلف ہیں۔ آگے اللہ کی مرضی۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں سے حملہ آور کے مقابلے میں کسی نوع کی خدمت لینا ظاہر ہے حکومت ہی کے اختیار کی بات ہے۔ وہ چاہے تو ہماری صلاحیتوں کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے خوب استعمال کر سکتی ہے اور نہ چاہے تو گھروں میں بیٹھے بیٹھے ہم سوائے دعا کے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آزادی کے پندرہ سالوں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کو دُہرانے کا یہ وقت نہیں۔ حکومت ہم سے زیادہ جانتی ہے کہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے ہماری مسلسل حوصلہ شکنی کی ہے، ہمیں یہ محسوس کرایا ہے کہ تم کاغذ کے دائرے سے باہر اس ملک میں ہمارے جیسے حقوق نہیں رکھتے' ہمیں پچھاڑا ہے' ہمیں احساسِ کمتری اور حزن و یاس میں مبتلا کیا ہے۔ ہمارے دلوں کو مسلا اور ہمیں خواہی نہ خواہی یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ اپنے ہی وطن میں تم محکوم و مظلوم ہو ۔۔۔ یہ سب کچھ ہو چکا۔ وطن پر دشمن نے یلغار کی ہے تو یقین کیجئے ہم نے سارے شکوے شکایت دیوار پر مار دیئے لیکن اب تو حکومت کو ایسا طرزِ عمل ضرور اختیار کرنا چاہئے جس سے ہم محسوس کر سکیں کہ یہ جنگ چین اور بھارتی اکثریت کی نہیں، بلکہ چین اور اہلِ ہند کی ہے۔ کمیونزم اور جمہوریت کی ہے۔ ظالم اور مظلوم کی ہے۔ وطن کو حملہ آور سے پاک کرنے کا جذبۂ صادق فقط اکثریت کی جاگیر نہیں اقلیتیں بھی اس کی امین ہیں۔ حکومت اگر ایسا طرزِ عمل اختیار فرمائے تو وہ انشاء اللہ دیکھے گی کہ جن ناکردہ گناہوں کو زبردستی بے وفا اور غدّار پوز کیا جاتا ہے وہ تحفظ وطن کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے میں کسی مائی کے لال سے پیچھے نہیں رہیں گے مانا کہ گذشتہ پندرہ سالوں میں انھیں حال اور مستقبل دونوں کے بارے میں مایوس و دل شکستہ کیا گیا ہے لیکن آج بھی ان کا یہ عقیدہ

نہیں ہے کہ ظالم کے خلاف لڑنا جہاد ہے اور جہاد میں جان دے دینا انسانی شرف و سعادت کی آخری منزل۔

دوسری بات جو دراصل پہلی ہی بات کا تتمہ ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان، ان کی تہذیب و تعلیم، ان کے کلچر اور معاش اور ان کے دستوری حقوق کے بارے میں ارباب اقتدار کا جو رویہ آج تک رہا ہے اسے کم سے اِس حد تک تو ضرور بدلنا چاہئے کہ مسلمان اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو یکسوئی اور دلچسپی کے ساتھ نبھا سکیں۔ یہ طے ہے کہ آج تک کے رویہ میں کوئی فرق نہ آیا تب بھی ہمارے دلوں سے حملہ آور کی نفرت اور وطن کی حفاظت کا جذبہ تو نہیں نکل سکتا، لیکن یہ صاف و سادہ حقیقت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اگر کسی فرد یا گروہ کو مسلسل کچوکے دیئے جاتے رہیں تو اس کی بہت سی انرجی شیون و فریاد میں ضائع ہوتی رہے گی۔ جنگ کب تک جاری رہے گی کون جانے۔ خدا چاہے تو ہم حملہ آور کو کل بھی مکمل طور پر پسپا کر سکتے ہیں اور خدا کی مشیت نہ ہو تو چین ہمارے قومی جسم کا ایک ناسور بھی بن سکتا ہے۔ بہر حال میں قوم و ملک کے حق میں یہی مفید ہوگا کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو دل گرفتگی اور یاس کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔ دانش مند دور تک سوچتے ہیں۔ طاقت کے گھمنڈ میں عدل و دیانت سے انحراف کرنے والوں کو تاریخ سے سبق لینا چاہئے اور مذہب کے عطا کردہ اس عقیدے کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ظلم کی مثال اُس درخت کی سی ہے جس کی کوئی جڑ نہیں اور عدل وہ درخت ہے جس کی جڑیں بہت گہری اُتری ہوئی ہیں۔ جَو سے کبھی گیہوں نہیں اُگا اور نیم بو کر انگور کبھی کسی نے نہیں کاٹے۔ چین کے عمل و حرکت کی فکری بنیاد اخلاق دشمنی پر ہے اور ہمارے عمل و حرکت کی بنیاد اخلاق دوستی پر ہونی چاہئے یہ اخلاق محض میٹھی میٹھی باتوں کا نام نہیں وہ ایک ہمہ گیر عملی حقیقت ہے۔ عدل، رواداری، مروت و شفقت، پیار، دوستی، اعتماد، تعاون، حیا، فکری پاکیزگی، شرافت ان تمام پاکیزہ چیزوں کے مجموعے کو اخلاق کہتے ہیں۔ ہمیں اپنی حکومت سے مراعات نہ پہلے درکار تھیں نہ اب مطلوب ہیں۔ ہمیں صرف اخلاقی التفات چاہئے۔ انصاف چاہئے۔ فریب اور تعصبات سے خالی محبت چاہئے۔ یہ چاہنا پہلے بھی جرم نہیں تھا آج بھی جرم نہیں ہے اور اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ دفاعی جد و جہد پر مرکوز حکومت اور قوم کو ہم کسی کم اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ وقت یقیناً اس لائق ہے کہ تمام تر توجہات حفاظتِ وطن ہی کے ذکر و فکر پر مرتکز رہنی چاہئیں لیکن یہ بھی حفاظت وطن کی محتاط ترین جد و جہد ہی کا ایک پہلو ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو پسپا، کمزور اور بددل کرنیوالی پالیسی میں دانشورانہ اصلاح کی جائے۔ دست درازیوں میں بریک لگایا جائے۔ پیہم تاخت اور تغلّب کو روکا جائے۔ اشارہ صرف فسادات کی طرف نہیں۔ فسادات تو جارحانہ عزائم کا ایک بھونڈا سا مظہر ہیں۔ اشارہ اُن تمام ذہنی تعصبات کی طرف ہے جو مسلمانوں کے دین، کلچر، تہذیب، معاش اور دستوری حقوق کے لئے میٹھی چھری بنے رہے ہیں۔

مانیں نہ مانیں آپ کو یہ اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائیں گے

عامر عثمانی
۹ نومبر ۶۲ء

یہ خدا فراموشی

تحفظ وطن کے سلسلے میں اپنے گرم جذبات و عزائم کا جو اعلان بالجہر بعض مسلم جماعتوں اور شخصیتوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے اس میں تصنع اور شوقِ نمائش کا عنصر ہی کیا کم قبیح تھا کہ مزید قباحت ایک اور بے احتیاطی نے پیدا کر دی ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ مسٹر چرچل اور پنڈت نہرو کی نقل کرتے ہوئے بعض ارباب جبّہ و دستار اور اصحابِ ریش و تسبیح بھی احتیاط و تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ہیں۔ چرچل نے اگر کہا تھا یا نہرو اگر کہتے ہیں کہ آخری فتح یقیناً ہماری ہے تو ان پر اعتراض کی گنجائش نہیں۔ انھیں یہ سبق نہیں ملا کہ وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْن لیکن مسلمان کو تو یہ سبق بڑے شد و مد سے ملا ہے کہ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ اور فیصلہ دیتے ہوئے انشاء اللہ ضرور کہو۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو پیش گوئی کو کبر و ادّعا کی گراوٹ سے بچا کر خیر و برکت

کی فضائے پاکیزہ میں لے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ الفاظ ہیں جو مسلمان کے حقیقی معنوں میں مومن ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ کیسا اچھا تھا اگر ہمارے معظم افراد و گروہ انشاء اللہ کا اضافہ اپنے جہری اعلانات میں فرما لیتے۔ حد ہے کہ بڑودہ میں منعقد ہونے والے "عظیم الشان" دینی تعلیمی کنونشن کی تجاویز میں بھی یہ تو کہا گیا کہ آخری فتح ہماری ہوگی لیکن "انشاء اللہ" کا خیال کسی کو نہ آیا حالانکہ کم سے کم دینی تعلیم کے بلند بانگ داعیوں کو تو یہ ثبوت ضرور فراہم کرنا چاہیے تھا کہ دین کی جڑیں ان کے قلب و ذہن میں اتری ہوئی ہیں۔ مستقبل کے بارے میں ایک یقینی فیصلہ دیتے ہوئے بھی اگر خدا کی یاد نہ آئی اور دینی ہدایت کو فراموش کر دیا گیا تو ایسے لوگوں کی دینی جد و جہد میں کس خیر و برکت کی امید ہو سکتی ہے۔ وا حسرتا دینی تعلیم کے علمبردار اور خدا فراموشی کا یہ عالم۔ زہد و طاعت کے مدعی اور اللہ سے بے نیازی کا یہ حال لہ۔

ذکر عوام کا نہیں عوام بیچارے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ "انشاء اللہ" بے یقینی اور شک کا مظہر ہے لیکن ذکر خواص کا ہے جنھیں خوب معلوم ہے کہ ریب و شک انشاء اللہ کے لوازمات میں سے نہیں ہیں۔ یاد داشت دھندلا گئی ہو تو ہم یاد دلائیں کہ سورۂ فتح قرآن کے چھبیسویں پارے میں ہے اور اس میں یہ آیت آئی ہے :-

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ۔	اللہ نے یقیناً اپنے رسول کو یہ سچا اور یقینی و قطعی خواب دکھلایا کہ تم داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں انشاء اللہ امن و عافیت کے ساتھ۔

ملاحظہ فرما لیجیے کہ مستقبل میں ہونے والے ایک واقعے کو اللہ تعالیٰ خواب کی صورت میں دکھلاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شک کا امکان ہی سرے سے ختم۔ یہاں تک کہ جب صلح حدیبیہ کے نتیجے میں بظاہر ناکام لوٹ آنے پر صحابہؓ عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے تو فرمایا تھا کہ ہم امن و عافیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ کا رسولؐ یہ جواب نہیں دیتا کہ ممکن ہے خواب غلط رہا ہو، بلکہ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال داخل ہوں گے۔ خواب یقینی ہے۔ داخلہ ضرور ہوگا اور امن و امان کے ساتھ ہوگا لیکن کب ہوگا یہ نہیں معلوم۔

اس کے بعد اگلے ہی سال خواب واقعے کا جامہ پہن لیتا ہے آیت مذکورہ نازل ہوتی ہے تو دیکھیے کہ ایک تقدیری و قطعی وعدے میں بھی انشاء اللہ کے الفاظ نقش دوام کر دیے جاتے ہیں۔ گیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ الفاظ توثیق و تاکید کی خاطر بھی لائے جاتے ہیں اور جزم و تیقن کا یہی وہ اسلوب ہے، جو اللہ پر توکل کرنیوالے مومنوں کو اسباب ظاہر پر بھروسہ کرنے والے دنیا داروں سے جدا کرتا ہے۔ ہم اگر یہ کہتے ہیں کہ جنگ میں آخری فتح انشاء اللہ ہماری ہی ہوگی تو یہ ریب و شک پر مبنی نہیں بلکہ صداقت و توکل سے ہے اور اس داخلی کیفیت کو نمایاں کر رہا ہے کہ ہمارا دل اللہ سے فتح و ظفر کا ملتجی ہے۔ چین تو بڑا جابر و قاہر دشمن ہے۔ کسی کمتر دشمن سے جنگ ہو تب بھی کسی سچے مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ انشاء اللہ کے بغیر دعوے اور پیش گوئیاں منھ سے نکالے۔ ایسا کرنا ایمان باللہ کے منافی ہے۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (اور اگر پہنچائے تجھے اللہ کوئی تکلیف تو اس کے سوا کون ہے اس تکلیف کو ہٹانے والا اور اگر پہنچانا چاہے تجھے کوئی بھلائی تو کوئی نہیں جو اس کے فضل و انعام کی راہ روک سکے۔ وہ پہنچاتا ہے اپنا فضل جسے چاہے بندوں میں سے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے)۔

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ○ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ○ اور جب اللہ کسی قوم کو مبتلائے مصیبت کرنا چاہے تو پھر وہ مصیبت نہیں ٹلتی اور نہیں ہے گرفتاران مصیبت کا کوئی مددگار اللہ کے سوا۔ وہی ہے جو دکھاتا ہے تمھیں بجلی ڈرنے کو اور امید دلانے کو اور اٹھاتا ہے وزنی بادل۔ اور پڑھتا ہے رعد اور تمام فرشتے ہیبت زدہ ہو کر حمد باری کی تسبیح اور بھیجتا ہے اللہ کڑکڑاتی بجلیاں پھر وہ جا پڑتی ہیں جس پر چاہے اور یہ لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کے بارے میں اور اللہ کی پکڑ [illegible]

لہ [illegible] العلماء ہند کے بزرگ ہوں یا الہدیٰ اور معارف کے ایڈیٹر صاحبان سب اس خدا فراموشی کی سطح پر ایک ہی صف میں [illegible]۔

بڑی سخت ہے۔

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (اگر اللہ تمھارا مددگار ہو تو کوئی نہیں ہے جو تم پر غالب آسکے اور اگر وہ اپنی مدد سے محروم کردے تو پھر کون ہے اس کے بعد جو تمھارا مددگار ہوسکے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے اہل ایمان کو)

عامر عثمانی — دسمبر ۱۹۶۲ء

یہ اپنے پجاری

پڑوسیوں کا محبت اور سلوک سے رہنا یوں تو ہمیشہ ہی امن وعافیت کا ضامن سمجھا گیا ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جب کہ ہمیں چین جیسے جابر وقاہر دشمن کا سامنا ہے، پڑوسی ملکوں سے دوستانہ مراسم اور صلح وصفائی کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے متعدد ذی ہوش لیڈر برابر زور دے رہے ہیں کہ پاکستان سے دوستانہ مراسم کی راہ نکالنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن ہمارے وہ مسلم قائدین جنھوں نے کرسی کی خاطر ضمیر فروشی، خدا فراموشی اور مفاد پرستی کا شاندار ریکارڈ پچھلے پندرہ سالوں میں قائم کیا ہے آج بھی اپنی بزدلانہ روش اور پست ذہنیت کے مظاہرے سے باز نہیں رہ رہے ہیں خیر سے پارلیمنٹ کے ایک مسلمان ممبر صاحب کو زبان ہلانے کی توفیق نصیب ہوئی تو آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

"پاکستان پر کڑی نگاہ رکھنی چاہئے اور اس سے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔"

گویا جس وقت ملک وقوم کو صحیح ترین مشوروں اور نفاق ودغا سے پاک صلاحوں کی اشد ضرورت ہے اس وقت بھی ایمان ودیانت کے یہ دشمن درباری ذہنیت سے دستبرداری دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انھیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ حقیقی وطن دوستی کا تقاضا کیا ہے اور وقت کا نقیب کیا پیام دے رہا ہے۔ انھیں تو صرف اس سے بحث ہے کہ ہماری وفاداری دنیا زمندی کے شیشے میں کوئی ایسا بال نہ آجائے جس کے نتیجے میں ذاتی مفادات کو خطرہ لاحق ہو۔ یہی ذہن ہے جس نے اس وقت بھی انھیں پاکستان دشمنی کے مظاہرے سے باز نہیں رہنے دیا جب کہ ڈاکٹر لوہیا، راج گوپال اچاریہ اور جے پرکاش نرائن جیسے حضرات بھی قوم وملک کی بھلائی اسی میں سمجھ رہے ہیں کہ پڑوسی ملکوں سے تعلقات درست کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ کشیدگی ختم ہو جس کے نتیجے میں ہماری فوجی طاقت کا ایک معتد بہ حصہ چینی افواج کی سرکوبی کے لئے فارغ نہیں ہوسکتا ہے ان مسلم ممبر صاحب کی دانست میں اگر پڑوسی ملکوں سے کشیدگی ہی قرینِ مصلحت ہوتی تو یہ بات وہ کبھی نہ کہتے کہ:-

"نیپال کے ساتھ زیادہ دوستانہ تعلقات بڑھانے چاہئیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ پڑوسیوں سے بہتر تعلقات انکی دانست میں بھی قوم وملک کے حق میں مفید ہیں لیکن مشورہ پیش کرنے میں انھوں نے ملک وقوم کے فائدے کو نہیں بلکہ اپنی ریکارڈ سازی کو مقدم رکھا۔ ورنہ جس طرح نیپال سے اضافۂ تعلقات کا مشورہ پیش کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پاکستان سے بھی حسن تعلق ہی کی کوشش کا مشورہ پیش کیا جاتا۔ بلکہ پاکستان سے تنازع ختم کرنے کا مشورہ زیادہ اولیٰ تھا کیونکہ ہماری عسکری قوت کا بہت سا حصہ نیپال کے نہیں پاکستان کے محاذ میں کھپا ہوا ہے اور پاکستان سے اچھے مراسم ہوجانے کی صورت میں ہندوپاک کے بے شمار عوام کو جو سکون واطمینان نصیب ہوسکتا ہے وہ بھی کسی آنکھ والے سے مخفی نہیں ہے۔

کاش اللہ تعالیٰ وہ وقت لائے کہ ہندوپاک کی حکومتوں کی باہمی کشیدگی، منافرت، بے اعتمادی اور کشاکش ختم ہو اور وہ لاتعداد عوام چین کا سانس لیں جنھیں ارباب اقتدار کی کشمکش سے سوائے خوف، تشویش اور نقصان کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے تو کوئی بھی ہندوستانی پسند نہیں کرسکتا کہ مصالحت کی خاطر ہندوستان بہت بڑی قیمت ادا کرے، لیکن کشیدگی دور کرنے کے لئے یہ بہرحال ناگزیر ہوا کرتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف میں لچک پیدا کریں۔ ایک دوسرے کو سمجھیں، ایک دوسرے کو نقصان پہ

رکھنے کے عوض یہ جذبہ پیدا کریں کہ اپنے چھوٹے سے نقصان اور فائدے کو دوسرے کے بڑے نقصان اور فائدے پر ترجیح نہیں دیں گے۔ یہی رواداری و عدل پسندی دلوں کو جوڑا کرتی ہے یہ نہیں کہ کوئی بھی فریق ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے اور اپنے تولہ بھر فائدے کی خاطر دوسرے کے دس تولے نقصان کو شمہ برابر اہمیت دینے پر آمادہ نہ ہو۔

پاکستان اور نیپال سے حسن تعلق صرف آج ہی مفید نہیں ہے بلکہ چین کو پسپا کر دینے کے بعد زمانۂ امن میں بھی یہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔ محبت شجر طیب ہے جس سے خیر و برکت ہی کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور نفرت و کشمکش شجرِ خبیث ہے جس سے ادبار و فساد ہی کے پھل ملتے ہیں۔

ع ۔ عثمانی ۱۵ / نومبر ۶۲ء

المناک

آدمی دماغ کے سوراخوں پر ضد اور خود پرستی کا سیمنٹ چڑھالے تو پھر آپ اس سے یہ بھی نہیں منوا سکتے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اکتوبر ۶۲ء کے تجلی میں ہم نے " انوار الاسلام " کی خصوصی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حافظ رام نگری صاحب عقیدۂ تناسخ کے رد میں جو زبان استعمال کر رہے ہیں وہ حقیقتاً مفید مطلب نہیں ہو سکتی وہ اتنی اونچی اور مغلق ہے کہ اُس حلقے میں نہیں سمجھی جا سکتی جس کے لئے اس کی افادیت متصور ہو سکتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہم نے یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ ہماری اس رائے کو اُس اختلاف کا ثمرِ خبیث ہرگز نہ سمجھا جائے جو بعض مسائل میں ہمارے اور حافظ صاحب کے درمیان منظر عام پر آچکا ہے۔ لیکن حافظ صاحب نے تازہ انوار اسلام میں اس پر جو نوٹ لکھا ہے وہ دیدنی ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ عامر نے ہمارے وسیع مطالعہ اور تحقیق اور طرز بحث کی تو کوئی داد نہ دی بلکہ اُلٹا اعتراض وارد کر دیا۔ یہ شکایت کرتے ہوئے انھوں نے ہمارے اعتراض کا خلاصہ نقل کر دیا ہے اور پھر یہ فیصلہ کر کے بات ختم کر دی ہے کہ یہ اعتراض اختلاف ہی کا ثمرۂ خبیثہ ہے!

اندازہ فرمائیے اخلاص دشمنی کا۔ ہمارا اعتراض اگر واقعتہً غلط تھا تو موصوف کو چاہئے تھا کہ واقعات کی منطق سے اس کی تردید کرتے۔ بتاتے کہ میری تنقید ثقیل اور مغلق ہونے کے باوجود فلاں اشخاص اور فلاں گروہ کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے عوض انھوں نے صرف شکایت ہی شکایت کی اور اپنی عادت کے مطابق عامر کی نیت ہی کو فاسد ٹھیرایا۔

ہم ارباب عقل سے انصاف چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے خیال کی صحت اور عدم صحت پر غور فرمائیں۔ آخر آواگون کے مسئلہ پر ایسی زبان میں بحث و نقد کرنا جسے اچھی قابلیت کے مسلمانوں کے سوا کوئی بھی نہ سمجھ سکے عملاً کیا فائدہ رکھتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے گیا سے گیا مسلمان بھی بفضلہ تعالےٰ تناسخ کے چکر میں نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوگا تو ایسا ہی مسلمان ہوگا جو یکسر کافرانہ ماحول میں زندگی گذار رہا ہو اور کلمے سے زیادہ کچھ نہ جانتا ہو۔ تو ایسے مسلمان تک انوار اسلام کا پہنچنا معلوم اور پہنچ ہی جائے تو اس کا سمجھا جانا معلوم۔ اہل ہنود سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ انوار اسلام کے مطالعہ سے مشرف ہوں گے اور ہو بھی جائیں تو ان کے پلے پڑے گا کیا جب کہ اسلوبِ نقد مغلق اور الفاظ بھاری بھرکم ہیں۔

ہمیں اگر خواہ مخواہ اعتراض کرنا ہوتا تو ہم ان کے " ستیارتھ پرکاش کا تحقیقی جائزہ " پر بھی کر بیٹھتے لیکن اس پر نہیں کیا کیونکہ اس میں افادیت کے پہلو ہیں اور اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو جواب دینا کار خیر میں داخل ہے۔

سخت رنج ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ جناب حافظ صاحب عالم پیری میں بھی خود تنقیدی سے کام نہیں لیتے، حالانکہ یہی وہ وصف ہے جو انسان کو اپنی خامیوں سے آگاہ کر کے استغفار کی راہ کھولتا ہے اور دوسروں کے حق میں سوءِ ظن سے روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قلب و ذہن کو خود بینی و کج فہمی کے زنگ سے محفوظ رکھے اس کے ہوتے آدمی عین دوپہر میں بھی سورج کو نہیں دیکھ پاتا۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا

عامر عثمانی
۲۰ / نومبر ۶۲ء

(" تجارہا، ڈاک " اور " کھرے کھوٹے " کیلئے انشاء اللہ اگلے شمارے میں کافی صفحات نکالے جائیں گے)

مولانا آزادؒ کی چند مشہور کتب

کتاب	نئے پیسے	روپے
غبار خاطر (مجموعہ مکاتیب)	۰	۶
نگارشات آزادؒ (مختلف مضامین)	۰	۶
مسلمان عورت (ترجمہ المراۃ المسلمہ)	۰	۴
صبح امید (انتخاب مضامین و تقریر)	۲۵	۴
مضامین الہلال (انتخاب)	۷۵	۳
مضامین البلاغ (”)	۷۵	۳
انسانیت موت کے دروازے پر (انسانوں کے آخری لمحات)	۵۰	۳
انسان کی حیات صالحہ (منتخب کردہ مضامین)	۷۵	۳
صدائے رفعت (” ”)	۰	۳
قول فیصل (گرفتاری اور فیصلے کی تاریخ)	۵۰	۲
اصحاب کہف (سورۂ کہف کی تفسیر)	۵۰	۲
حضرت یوسفؑ (سورۂ یوسف کی تفسیر)	۲۵	۲
مقالات آزادؒ (مقالوں کا انتخاب)	-	۲
مضامین آزادؒ (مضامین کا انتخاب)	-	۲
عیدین (دونوں عیدوں کی نوعیت اور تفصیل)	۵۰	۱
امر بالمعروف (اسلامی تعلیمات پر مفصل گفتگو)	۵۰	۱
شہید اعظم (معرکۂ کربلا کی تفصیل و تاریخ)	۵۰	۱
اسلامی جمہوریہ (جمہوریت کسے کہتے ہیں؟)	۲۵	۱
میرا عقیدہ (خود مولانا ہی کے قلم سے)	۵۰	۱
افسانۂ ہجر و وصال (ایک درد انگیز تقریر)	۵۰	۰
مقام دعوت (دعوت کسے کہتے ہیں؟ اور کیسے دی جاتی ہے)	۵۰	۰
ولادت نبویؐ (حضورؐ کی پیدائش پر)	۳۷	۰
مسلمانوں کا راستہ (۱۹۴۷ء کی ایک انقلابی تقریر)	۳۷	۰

خطبات مدراس

سیرت کے موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی کے مشہور ترین خطبات جو اپنا جواب آپ ہیں۔
مجلد ساڑھے تین روپے

	نئے پیسے	روپے
خطبات مدراس	۵۰	۳

مصری مصنفین کی چند کتابوں کے اردو تراجم

کتاب	نئے پیسے	روپے
حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ — مصنفہ:- ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ترجمہ:- مولانا عبدالحمید نعمانی	۷۵	۶
حضرت عثمانؓ و علیؓ — مصنفہ:- ایضاً، ترجمہ:- ایضاً	۰	۱۲
ابوبکر صدیقؓ — مصنفہ:- محمد حسین ہیکل، ترجمہ:- شیخ محمد احمد پانی پتی	۰	۵
عمر فاروق اعظمؓ — مصنفہ:- محمد حسین ہیکل، ترجمہ:- حبیب اشعر	۰	۹
امام احمد بن حنبلؒ — مصنفہ:- استاذ ابوزہرہ، ترجمہ:- عمر فاروق ایم اے	۰	۹
حیات امام ابن تیمیہؒ — مصنفہ:- استاذ ابوزہرہ، ترجمہ:- رئیس احمد جعفری	۰	۲۱
فقہ الاسلام — مصنفہ:- حسن احمد الخطیب مصری، ترجمہ:- سید رشید احمد ارشد ایم اے	۰	۱۲
فارابی — مصنفہ:- عباس محمود مصری، ترجمہ:- رئیس احمد جعفری	۷۵	۱۰
مسلمان عورت — مصنفہ:- فرید وجدی آفندی، ترجمہ:- مولانا ابوالکلام آزادؒ	۰	۴

تین کتابوں کا روح نواز سٹ

ان میں سے ہر کتاب عام فہم بھی ہے اور مستند بھی
مقبول عام ہو کر بار بار ان کے ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

کتاب	نئے پیسے	روپے
رسول عربیؐ	۱۲	۱
خلافت راشدہ (حصہ اول)	۰	۱
خلافت راشدہ (حصہ دوم)	۰	۱
تینوں کی مجموعی قیمت تین روپے	۰	۳

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

مستقل عنوان

عامر عثمانی

تفہیم الحدیث

باہمی محبت واخوۃ

(۲)

متذکرہ حدیث میں باہم سلام کو رواج دینا آپس کی محبت کے لئے ایک ضروری وسیلے کے طور پر پیش فرمایا گیا۔ یعنی یہ جو کہا گیا کہ تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت واخوۃ نہ بڑھاؤ اور سلام کو رواج نہ دو تو اس میں اصل مقصد کی حیثیت محبت واخوت کو حاصل ہے اور سلام اس کا وسیلہ ہے وسیلے کے علاوہ وہ مظہر اور آئینہ بھی ہے دلی ربط وضبط کا۔ "سلام" کے موضوع پر ہم پہلے تفصیلاً گفتگو کر چکے ہیں یہاں بس یہی بات دُہرا دینی کافی ہوگی کہ مسلمانوں کا ایک دوسرے کو سلام کرنا محض ایک تہذیبی رسم نہیں ہے بلکہ اسے ادبِ شرعی اور فریضۂ دینی کی حیثیت بھی حاصل ہے بدقسمتی سے بعض دوسرے امورِ خیر کی طرح سلام کا رواج بھی مسلمانوں میں کم ہو گیا ہے اور کم ہونا ہی چاہئیے تھا جب خدا اور رسول سے تعلق کم ہوگا تو ان کی تعلیمات سے بھی رشتہ ٹوٹتا چلا جائیگا دلوں میں دینی رشتے کی اہمیت کا احساس نہ رہا تو ملی اخوت ومحبت کہاں سے آئے جن حلقوں میں اب تک سلام باقی ہے وہاں بھی زیادہ تر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کا داخلی پسِ منظر غائب ہے یعنی دل سے نہیں محض حلقوم سے آواز ابھرتی ہے اور اُس بے نہایت معنویت کا ادنیٰ سا احساس بھی قلوب میں نہیں پایا جاتا جو السلام علیکم کے مختصر الفاظ میں دریا بکوزہ کے مصداق سمائی ہوئی ہے ذرا سوچئے تو سلامتی کی دعا کتنی ہمہ گیر دعا ہے ہر نعمت اس میں شامل ہو گئی اور ہر زحمت خارج ہو گئی۔ سلامتی یعنی کُل بائے مراد سے دامن کا بھر جانا اور ہر حزن وملال کا دور ہو جانا۔ دل سے اگر السلام علیکم نکل جائے تو اتنی بہترین دعا ہے کہ ہم گھنٹے بھر لمبی چوڑی دعائیں دیکر بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ بصیرت کی آنکھ اگر کھلی ہوئی ہو تو اسلامی تعلیمات کی یہ جزوی چیزیں ہی آدمی کو اس نتیجے تک پہنچانے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ اسلام ہی بے شک مذہبِ حق ہے ایک ایک کلمے میں مطالب کے دفتر سمو دینا اور ایک ایک لفظ میں صداقتوں کے انبار سمیٹ دینا ظلوم وجہول انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کے ذریعے ایسے الفاظ دنیا کو دیئے جو ایجاز وجامعیت کے حیرتناک نمونے ہیں۔ سلام کا رواج دنیا کی تمام قابلِ ذکر اقوام میں ہے ایک ایک کرکے جائزہ لے ڈالئے کہ کون کیا الفاظ استعمال کرتا ہے انشاء اللہ کہیں یہ جامعیت، یہ بیکرانی اور ہمہ گیری نہیں پائیں گے جو السلام علیکم کے ننھے سے فقرے میں ہے والحمد للہ رب العٰلمین

ولکن تحلق الدین

تمثیل دنیا کی ہر زبان میں تفہیم مراد کا بہترین ذریعہ سمجھی گئی ہے۔ قرآن اور احادیث بھی امثلہ سے معمور ہیں آپس کا شقاق وافتراق کس بری طرح دین کا صفایا کرتا ہے اس کی تمثیل حضورؐ نے "مونڈنے" سے پیش کی۔ سر پر اُسترا پھر جائے تو بالوں کا صفایا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں میں باہم بغض ومنافرت پیدا ہو جاتے تو دین کی صفائی ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ سبق بھی ملا کہ کچھ مسلمانوں کا نماز روزہ ادا کرتے رہنا اور جزوی طور پر اسلامی تہذیب اختیار کئے رکھنا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہاں میں واقعۃً دین موجود ہے آج ہم مسلمانوں کا باہمی شقاق و نفاق کس منزل میں پہنچا ہوا ہے کسی سے مخفی نہیں۔ اگر حضورؐ کا ارشاد غلط نہیں ہو سکتا تو ماننا پڑیگا کہ دین مونڈا جاچکا۔ پھر یہ ہمارے نماز روزے، یہ مسجدیں، یہ مدرسے، یہ مذہبی ہنگامے اور تقریبیں یہ دینی لٹریچر، یہ تلاوتِ قرآن، یہ درود و سلام یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ دین نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے نزدیک جس جامع و مانع، بسیط و بیکراں اور محکم و مستحکم عقیدہ و کردار پر لفظِ دین کا بھرپور اطلاق ہوتا ہے وہ تو یقیناً ملت کے درمیان سے اُٹھ چکا جوارش جالینوس اگر پندرہ مفردات سے مل کر بنتی ہے تو صرف پانچ سات دواؤں کے مجموعے کو صحیح معنوں میں جوارش جالینوس نہیں کہہ سکیں گے۔ حکیم جو نسخہ لکھکر دے اسے پورا پورا استعمال کیجئے جب تو ٹھیک لیکن اس میں سے کچھ دوائیں لے کر باقی کو نظرانداز کر دیجئے تو یہ کتنا مذاق ہی ہوگا کہ ہم نے فلاں حکیم کا نسخہ استعمال کیا۔ ٹھیک یہی معاملہ دین کا ہے، دین صرف نماز روزے درود و سلام، صرف تلاوت، صرف داڑھی اور تسبیح کا نام نہیں۔ یہ چیزیں اس کا جزو ضرور ہیں مگر کُل نہیں۔ کُل دین تو یہ ہے کہ مسلمان بلوغ سے لیکر مرتے دم تک زندگی کے ہر شعبے، ہر مرحلے، ہر گوشے میں صرف اور صرف اسلام کا وفادار ہو۔ لڑے تو اسلام کے لئے لڑے، مصالحت کرے تو اسلام کے لئے کرے۔ معیشت، اقتصاد، سیاست، تجارت، رہن سہن، ملازمت، گھریلو زندگی سبھی منازلِ حیات میں اس کے رد و قبول کا معیار صرف اسلام ہو۔ اس کی انا ایک قطرۂ بے مقدار کی طرح ذاتِ واجب الوجود کے سمندر میں گم ہو چکی ہو۔ وہ اپنے رب کے آگے ایسا غلام بن جائے جسے سمعنا واطعنا کے سوا کچھ آتا ہی نہ ہو۔ جو صرف زبان سے نہیں دل اور روح کے ساتھ یہ جاں نواز نغمہ بلند کرے کہ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری پوری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے وہ اللہ جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے) یہ ہے دین کامل اور یہ ہے وہ نسخۂ شفا جو اسلام کے نام سے اللہ رب العزت نے بندوں کو عطا کیا ہے اب ہم نابکار بندے اس نسخہ کے کچھ اجزا تو لے لیں اور کچھ کو چھوڑ دیں تو یہ کتنا لایعنی ہی ہوگا کہ ہم حکیم مطلق اللہ جل جلالہٗ کے حوالہ کا نسخۂ شفا استعمال کر رہے ہیں ہماری پوزیشن تو ان مبغوض لوگوں کی سی ہوگی جنھیں اللہ تعالیٰ نے ڈانٹا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر تو ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو) بے شک عقیدۃً ہم سب پورے ہی قرآن اور تمام ہی صحیح احادیث پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے بے ایمان تو قرار نہیں پا سکتے کہ ایمان عقیدے کا نام ہے عمل کا نہیں۔ لیکن عقائد کا مظہر اعمال ہی ہوتے ہیں اور اعمال کے اعتبار سے اگر ہم دین کے بعض حصوں کے تارک ہیں تو ہمارا دین مظہر اور جسم کے اعتبار سے ختم ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کے ایک ہی ورق کا منکر مکمل طور پر کافر ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ آدھ کچرا کافر قرار پائے۔ اسی طرح دین کے بعض حصوں کو دائرہ عمل سے خارج کر دینے والے جسمانی اعتبار سے مُردہ ہی کہلائیں گے آپ دیکھتے ہیں کہ روح جسم سے نکل جائے تو آدمی مُردہ کہلاتا ہے۔ روح نہیں مری مگر جسم سے اس کا تعلق ختم ہو گیا تو موت کا فتویٰ برحق ہوا۔ اسی طرح عقائد کی حیثیت روح کی ہے اور اعمال بمنزلۂ جسم ہیں۔ عقائد ہمارے کافرانہ نہ ہوں مگر اعمال سے ان عقائد کا تعلق مضبوط نہ ہو تو اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ روح باقی ہے جسم ختم ہوا۔ اللہ کے رسول نے تمثیل میں "مونڈنے" کو پیش فرمایا ہے۔ ظاہر ہے مونڈنے میں بالوں ہی کا صفایا ہوتا ہے ان کی جڑوں اور اُن کیمیاوی عناصر کا صفایا نہیں ہوتا جن سے بال اُگتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے درمیان سے دین اُٹھ گیا اگرچہ عقائد کی جڑیں اور اعمال خیر کی صلاحیتیں بدستور موجود ہیں۔ دین موجود ہو اور ملت مسلمہ کفار سے مغلوب ہو جائے یہ ناممکن ہے، چند افراد و اشخاص کی دینداری مسلّم مگر دیکھنا تو پوری امت کی مجموعی حالت کا ہے غلبہ بے دینی کا ہوگا تو سو پچاس صلحاء و زہاد کی موجودگی اور عامۃ الناس کی کچی پکی دینداری اس المناک فیصلے کو مسترد نہیں کر سکے گی کہ قومی و ملی پیمانے پر دین کا خاتمہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ

أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ کا وعدۂ ربانی پکار پکار کر کہہ رہا ہے

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں۔

من حیث المجموع امت پر مومنین کا اطلاق ہو اور پھر وہ سر بلند نہ ہوں یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ایک بہت بڑے بزرگ کا واقعہ مطالعہ میں آیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "سلام" کی غیر معمولی معنویت اور جامعیتِ تامہ کے فہم میں ہم نے غلطی نہیں کی۔ جی چاہتا ہے آپ بھی اس واقعہ کو سُنیں۔

تقریباً ساٹھ سال قبل ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ۔ ان کی عالی مقامی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے اساطینِ علم و زہد ان سے بیعت تھے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں مسلمان بستے ہوں اور کوئی نہ کوئی مرید آپ کا نہ ہو۔ دراصل آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکے آ اقامت گزیں ہو گئے تھے اور فریضۂ حج کے قربان جائیے کہ مسلمانوں کی کوئی آبادی ایسی نہیں جہاں سے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مکہ مکرمہ نہ پہنچتا ہو۔

ایک بزرگوار شاہ قسطنطنیہ کے خواص میں تھے۔ انھوں نے حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ سلطان المعظم بہت عادل بادشاہ ہیں آپ پسند کریں تو میں آپ سے ان کا تعلق قائم کروں۔ حاجی صاحب نے جواب دیا۔

"بھائی اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ میرے معتقد ہو جائیں اور پھر وہی ہو جو آپ کے ساتھ ہوا ہے یعنی مجھے بلا بھیجیں۔ مجھکو جانا پڑے گا۔ بیت السلطان کا قرب ہوگا۔ بیت اللہ سے بُعد ہوگا۔ آپ تعریف کرتے ہیں کہ وہ سلطانِ عادل ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطانِ عادل کی دعا مقبول ہوتی ہے۔ اگر آپ سے ممکن ہو تو ان سے میرے لئے دعا کرا دیجئے ______ لیکن یہ امر آدابِ سلطنت کے خلاف ہے کہ بادشاہ سے کسی درویش کے لئے دعا کو کہا جائے۔ مناسب یہ ہوگا کہ آپ ان سے میرا سلام عرض کر دیں، وہ جواب میں وعلیکم السلام فرمائیں گے بس یہ دعا میرے لئے کافی ہے۔"

یہ چھوٹا سا واقعہ اس توضیح میں بالکل کافی ہے کہ الفاظ کی روح اور معانی مطلوبہ تک پہنچ جانے والی نظروں میں السلام علیکم کی کیا قدر و قیمت ہے۔

کمیونزم کی تصویریں

پانچ معلوماتی کتابیں

(۱) اقتصادی تعاون (۲) ہمارے دور کا انقلاب۔
(۳) اقتصادی سامراج (۴) غیر جانبداری کا نظریہ۔
(۵) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام۔ (ہر ایک کی قیمت چار آنے)

نمان بطور — چین کے قازق مسلمانوں کی داستان، ہجرت، اشتراکیت کے بے پناہ جبر و تشدد کے سایہ
لمت میں مسلمانوں پر کیا گذری اور کیا گذر رہی ہے۔ ایک کہانی
یک تاریخ ایک قیمتی دستاویز۔ قیمت سوا روپیہ۔

چین کے مسلمان — کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی
آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف چار آنے۔

اور یانگسی بہتا رہا — ذرا دیکھو۔ وہ کروڑوں خمیدہ کمر انسانوں کی قطار جو بے معنی جد و جہد
کا بے تحاشا بوجھ پشت پر اُٹھائے جانوروں کی طرح چلی جا رہی
ہے ہر آن ان میں سے کتنے ہی بدنصیب تھک کر گرتے ہیں اور دم
توڑ دیتے ہیں یہ چین ہے۔ جبر و استبداد کا ایک وسیع و عریض
جیل خانہ پڑھیئے۔ یہ حقیقت افروز کہانی ضرور پڑھیئے۔
قیمت صرف ایک روپیہ

کمیونزم اور کسان — کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بیشمار
دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ ڈھائی روپے۔

سوئٹ نظام کی چھ کنجیاں — جچے تلے عقلی و نفسی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور
معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی۔
صفحات ۳۲۴ صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب — بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد
کے تحت چھاپا گیا ہے۔ قیمت مجلّد تین روپے۔

ورکُٹا — ایک بہی دلچسپ اور حیرت انگیز آپ بیتی جس سے روس کے جبری محنت کے ظالمانہ نظام کا بھیانک
منظر سامنے آتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

آزادی کی طرف — ایک بڑے روسی افسر کی خود نوشت سوانح جس نے امریکہ میں پناہ لی۔ یہ
بے حد دلچسپ لیکن عبرتناک کتاب روس کے حقیقی حالات سے
متعارف کراتی ہے اسے پڑھنے کے بعد آپ کمیونزم کے حسین
نعروں اور مصنوعی دعووں سے کبھی دھوکا نہیں کھائیں گے۔
قیمت مجلّد تین روپے

تھکے دیوتا — چھ آپ بیتیاں، دلچسپ، سبق آموز اور لائق مطالعہ، جن سے کمیونزم کے متعدد
گوشے روشنی میں آتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

لینن — انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ قیمت ایک روپیہ

ادب میں ترقی پسندی — کمیونزم ادب و ثقافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے؟ اس کا
مستند جواب۔ یہ کتاب اپنی اہمیت کی بنا پر متعدد ترقی
یافتہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ (اُردو) ایک روپیہ۔

آج کا چین — مشہور مفکر و ماہر ڈاکٹر ایس۔ چندر شیکھر کی تالیف جس کا سلیس و بلیغ ترجمہ ایڈیٹر الجمعیۃ جناب عثمان
فارقلیط نے کیا ہے۔ چین کے سماجی، اقتصادی، زرعی، صنعتی، فکری
اور علمی نظام کی بے کم و کاست عکاسی۔ الفاظ سے بنی ہوئی ایک
جامع تصویر۔ ملحوظ رہے یہ اُسوقت کی تالیف ہے کہ جب چینی ہند

مستقل عنوان   شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں

سولہ سال کی نوخیز عمر تھی جب زبیرؓ بن عوام نے اپنے خدا کے قدموں پر پہلا والہانہ سجدہ کیا۔ پہلا والہانہ سجدہ بیتاب! ——کتنا عظیم اور فاتحانہ تھا یہ انسانی سر کا بے اختیار جھک جانا کہ اس کی پہلی ٹھیس پر سولہ سالہ بت پرستی چور چور ہوگئی—— وہ سیکڑوں بت جن کے آگے سیکڑوں پیشانیاں سجدے میں پڑی تھیں زبیرؓ کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے تھے۔

خدا کے آگے جھک جانے والے کے سامنے کتنے چھوٹے خدا قدم بوس ہو جاتے ہیں!۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ نوخیز جوانی کے جوش میں زبیرؓ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں گی۔ کون توقع کر سکتا تھا کہ اس جذبۂ بندگی سے جب زمینی زندگی کے سیکڑوں جذبات ٹکرائیں گے تو ان کا یہ فیصلہ کتنی دیر زندہ رہ سکے گا؟۔ لیکن حضرت زبیرؓ بن عوام نے اس فیصلے پر ایک فولادی چٹان کی طرح جم کر دنیا کو خوب سمجھا دیا کہ سچائی جن جذبات کو آدمی کے سینے میں ابھارتی ہے وہ ریت کے محل نہیں آہن و فولاد کے قلعے ہوتے ہیں—— ان قلعوں سے جو چیز ٹکراتی ہے خود ہی پاش پاش ہو جاتی ہے لیکن ان کی بنیادوں کو ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتی۔

خاندانی مذہب سے بغاوت کے "جرم" میں ان کے قریب ترین عزیزوں نے آنکھیں لال پیلی کیں۔ چاہت سے چھلکتے ہوئے دل نفرت کی آگ سے جھلس کر سیاہ ہو گئے۔ جذبات کی آنچ سے دہکتا ہوا خون سفید ہو گیا۔ ہاں پیار کرنے والوں نے بپھر بپھر کر حملہ کیا—— سینے سے لگا لینے والوں نے ٹھوکریں لگائیں۔ سہارا دینے والوں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا تاکہ زبیرؓ بالکل بیچارگی اور بے کسی کے عالم میں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائیں۔

لیکن جہاں تمام سہارے ٹوٹ چکے تھے وہاں ایک سہارا اب بھی باقی تھا۔ وہ اکیلا سہارا جس کے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

زبیرؓ اب بھی ثابت قدم تھے—— اگرچہ ان کے پاؤں تلے سے پوری زمین کھسک چکی تھی!

دنیا نے یہ عجیب منظر دیکھا اور جھنجھلاہٹ کے مارے اپنا سر پیٹ لیا۔ دھمکیاں گرجتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ڈرانے دھمکانے کے لئے دانت پیسے گئے۔ اور آخر آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ توحید کی جس نرالی آواز کو دبایا نہ جا سکا اس کو اس نوخیز مجاہد کے حلق ہی میں گھونٹ ڈالا جائے۔ چنانچہ ان کو ایک چٹائی میں مُردار جانور کی طرح لپیٹ کر زبردست دھونی دی گئی تاکہ نوائے حق بلند کرنے والے کا دم ہی گھٹ کر رہ جائے۔

لیکن ٹھیک اسی وقت جب آدمی کو جان بچانے کی آخری فکر ہونی چاہیے تھی یہ انسان نوائے حق بلند کرنے کے لئے زندگی کی پوری طاقت کو سمیٹ رہا تھا اس کی آواز دھوئیں کی لپیٹ میں گھٹ جانے سے پہلے ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اور قہرناک طاقتوں کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ انھوں نے اپنے ستمگر حقیقی چچا کو مخاطب کر کے اعلان کیا۔ " جو چاہو کر گذرو! لیکن دوبارہ کافر ہونے کے مقابلے میں تم مجھے ہر بار مرجانے پر تیار پاؤ گے"۔ کیسی عظیم تھی وہ حق پسندی جس کو جواں مرگی کا خوف بھی ٹس سے

مس نہ کر سکا! ہائے وہ سچائی جو انسان کو جان سے بھی زیادہ پیاری ہو جائے!۔

پھر کم سنی کی منزلیں طے کر کے زبیرؓ کی یہ حق کوشی سن و سال کی پختگی کو پہنچی۔ تو باطل کے لئے سچ مچ قیامت بن گئی! میدانِ بدر میں ان کے ولولۂ جہاد کے آگے ان کی آہنی تلوار بھی بل کھا گئی اور ان کے جوش جاں نثاری کو خراج عقیدت دینے کے لئے فرشتوں کی غیبی فوج کو خدا کے رسول نے ٹھیک زبیرؓ کے لباس میں اُترتے ہوئے دیکھا! پھر اُحد کی گھاٹی آئی جہاں خوف نہیں "غم" کی چوٹ کھا کر کچھ دیر کے لئے ایمان و عمل کے بڑے بڑے جیالے سکتے میں دیکھے گئے تھے وہاں بھی زبیرؓ کی تلوار خوف کی طغیانیوں میں مسلسل چمکتی بجلی کی طرح لہرا رہی تھی۔ خدا کا بندہ خدا کی حسین ترین "امانت" محمدؐ کو بچانے کے لئے — "آدم خوروں" کی عفریتی ڈار پر ان تھک گھونسے برسا رہا تھا آخر طوفان کا منھ پھر گیا۔ پہاڑوں پر رعشہ دوڑا — آندھیاں شل ہو گئیں — بجلیوں کا منھ فق ہو گیا!۔

پھر یہی وہ شعلۂ جوالہ تھا جو یرموک کے محاذ پر اس طرح چمکا کہ بڑے بڑے سورماؤں کی آنکھیں حیرت سے پتھرا گئیں! حالانکہ اس دور میں یہ شعلہ اندر ہی اندر بجھا بجھا سا تھا۔ خدا کے رسول کی وفات سے ان کے دل پر سوگ اور افسردگی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے — لیکن خود یہ "سوگ" وہی سوز و درد تھا جو برفیلے پہاڑوں کو چھو جائے تو پانی کر دے اور سمندروں کی تہ میں پہنچے تو کرۂ آب کو بھاپ بنا کر اڑا دے۔

جب لوگوں نے کہا —

"آگے بڑھیئے ؟ — ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں!"—

تو زبیرؓ نے پلٹ کر دیکھا۔ آنکھوں سے چھلکتے ہوئے عجز اور یقین نے مل کر ایک حسین جلال کی شکل اختیار کر لی۔

"نہیں! — تم لوگ میرا ساتھ نہ دے سکو گے!"

اور سچ مچ کوئی ان کا ساتھ نہ دے سکا — اسلئے کہ وہ بڑھے تو بڑھتے ہی چلے گئے۔ تلواروں کی خوں چکاں گھٹاؤں کو چیرتے ہوئے — تیروں کی سنسناتی ہوئی باڑھ کو کاٹتے چھانٹتے ہوئے — آہن و فولاد میں ڈوبی ہوئی انسانی فوجوں میں دراڑیں ڈالتے ہوئے وہ بڑھتے ہی گئے اور وہاں تک جا پہنچے جہاں دشمن کی فوج ہی ختم ہو گئی تھی! — وہ میدانِ جنگ کے بیچ بیچ آر پار نکل گئے تھے۔ پھر وہاں بھی وہ نہ رُکے — وہ جوار بن کر چڑھے تھے اور بھاٹا بن کر پلٹے — مجاہدانہ جذبات کا یہ مدّ و جزر دوست اور دشمن کو حیرت سے مفلوج اور خوف سے ماؤف کرتا ہوا چڑھا اور اُترا۔ اور جب وہ ایکبار اسلامی سپاہ میں واپس آئے تو ان کا جسم بے شمار زخموں کی مالا پہنے ہوئے ایک فرید و وحید تاریخی شجاعت کا اعلان کر رہا تھا۔ کیسے گہرے تھے وہ زخم جو مندمل ہو کر بھی ان کے جسم میں "غار" ڈال گئے تھے اور یہ مندمل سوکھے ہوئے گھاؤ ان کے ساتھ ان کے کفن میں گئے۔ شاید اسلئے کہ انھیں ان کا خدا لاہوتی دنیا میں بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتا تھا۔ تاکہ میدانِ حشر میں شہادت کے ان زخموں سے رنگ و نور کے فوّارے پھوٹتے ہوئے دیکھکر وہ بدنصیب انسان فرطِ غم سے سینہ کوبی کریں جن کے ہاتھوں نے آنکھیں بند کر کے حق و صداقت کو سینہ فگار کیا تھا۔ کس قدر گہرا ہوگا وہ جذبۂ شہادت جس کے زخموں کے نشانات میں اتنی گہرائی اور اس قدر دیرپائی تھی!۔

لیکن یہی انسان جو موت سے اسقدر بے جھجک ہو کر آنکھیں چار کرتا تھا کہ اس کی تلوار کاٹتے کاٹتے جگہ جگہ سے خود بھی کٹ کر مر گئی تھی — ہاں یہی تیغ آزما جو تلوار سے ڈرتا تھا نہ توپ سے، اپنے خدا سے کتنا ڈرتا تھا!۔

جب قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ — اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔ بیشک قیامت کے دن تم اپنے پروردگار کے یہاں جھگڑ رہے ہو گے — تو زبیرؓ پکار اُٹھے اور ان کی آواز کانپ رہی تھی:—

"اے خدا کے رسول! کیا قیامت کے دن ہمارے جھگڑے دہرائے جائیں گے ؟"

اور جب اللہ کے رسولؐ نے گہری سنجیدگی اور تشویش کے ساتھ فرمایا تھا "ہاں"— تو وہ بندۂ جوش جس کی عبادت کی راتیں نالۂ نیم شبی میں گذرتیں اور جس کے دن خوں آشام تلواروں کی چھاؤں میں زخم کھاتے ہوئے بسر ہوتے تھے ہاں وہ بندۂ مومن

اپنی تمام عبادتوں اور جاں نثاریوں کے درمیان معاملات کے خوفناک مواخذے کے اندیشوں میں ڈوبتا چلا گیا — کتنی خوفناک — کتنی خطرناک ہوگی معاملات کی وہ پکڑ جس کے خیال ہی سے وہ شخص لرزہ براندام تھا جس کے قدموں میں تلواروں کی دھار پر بھی کبھی جنبش تک نہ ہوئی تھی؟ درحقیقت آخرت کے ڈر کا حقیقی ذائقہ کچھ وہی جان سکتا ہے جو غیر اللہ کے لئے نڈر اور بے باک ہو چکا ہو۔ اور کتنی ٹھوس بات ہے کہ یہ دو خوف کبھی یکجا جمع نہیں ہوتے — خوفِ دنیا اور خوفِ خدا! — ایک چیز ہوگی تو دوسری نہ رہے گی اور دوسری ہوگی تو پہلی چیز کا بیخ و بن سے خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

اور —

کتنی عظیم ہوگی وہ خدا کی چاہ جس پر گوشت پوست کے دلکش اور جاں نواز رشتوں کو بے دریغ تج دیا گیا ساری دنیا کے پیار کو اپنے لئے عتاب بنا چھوڑا مگر دل پھر بھی ایسا شیر اور ایسا غنی رہا جیسے خدا کے سوا انھیں نہ کسی کے پیار کی طلب تھی اور نہ کسی کی نفرت کی ذرہ برابر پروا!۔

اپنے فرزند کو جب وہ بستر علالت پر لیٹے ہوئے اس بات کی وصیت کر رہے تھے کہ قرض اور فرض کی ادائیگی ان کے اموال متروکہ سے کر دی جائے تو کس قدر ناز سے یہ بات کہی تھی کہ اگر "سرمایہ پھر بھی کافی نہ ہو تو پھر میرے مولا کی طرف رجوع کرنا اے بیٹے؟"

"کون ہے آپ کا مولا ابا جی!"

بیٹے نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود پرشوق جذبات کا "رقص شرر" دیکھنے کی آرزو ظاہر کی۔ اور یہ سوال جیسے سوئے ہوئے نغموں پر بہترین مضراب کا کام کر گیا — جذبات کی وہ ہلچل جو روح کی گہرائیوں میں برپا تھی اُبل پڑی — رگ و ریشہ سے اُبل پڑی — چہرے کے خد و خال اس جذبہ کی التہاب انگیزی میں ڈھل گئے آنکھوں میں وہ مقدس اشک تیر گئے جو ایک اللہ والے کی آنکھوں میں صرف اللہ کا نام لیتے ہوئے چھلک سکتے ہیں۔ جذبات کے ہمہ تن ارتعاش میں ایک انتہائی معصومانہ عشق کی وجد انگیز پکار سنائی دی۔

"میرا مولا — میرا خدا — میرا سب کچھ؟ — جس نے ہر آڑے وقت میں میری دستگیری کی ہے" یہ کہتے کہتے آواز گلوگیر ہوگئی اور جہاں الفاظ بے ہوش تھے وہاں آنسوؤں نے داستانِ شوق مکمل کر دی۔

بولو دوستو! جس خدا کو حضرت زبیرؓ بن عوام "اپنا" کہا کرتے تھے کیا وہی ہمارا بھی خدا نہیں؟ —

کیا وہی خدا قدم قدم پر ہمارے بھی آڑے وقتوں کام نہیں آتا؟ —

کیا اس کے بارِ احسانات سے ہماری گردنیں بھی کبھی سبکدوش ہو سکتی ہیں؟ —

تو پھر آخر کیا اور کیوں ہے کہ اس کا نام ہمارے لبوں پر آتا ہے تو کوئی جذبۂ بیتاب نہ آنسو بنکر آنکھوں سے چھلکتا نہ خون بنکر رگوں سے ٹپک پڑتا ہے؟ — کیا وہ خدا — وہ محسن اعظم ہمارا خدا نہیں — یا پھر کیا ہم مسلمان ہیں؟ بے شک وہی ہمارا خدا ہے اور ہم کافر بھی نہیں ہیں لیکن سوال پھر ایک پُر اسرار سوال ہے کہ کیا ہم مسلمان ہیں

عامر عثمانی

ھَلْ تَریٰ مِنْ فُطُور؟

خلا میں پھیلی ہوئی عظیم کائنات کے بارے میں جو چھان بن سائنس داں حضرات جدید آلات کے ذریعہ کر رہے ہیں س سے حاصل شدہ معلومات کی حیرتناکیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ذرا سوچئے۔ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ اسّی ہزار میل چلتی ہے۔ ہمارے جیسے مبتدی حساب دانوں کے لئے تو یہی حساب لگانا مستقل دردِ سر ہے کہ روشنی اس رفتار سے چل کر چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں کتنا فاصلہ طے کر لیتی ہے، لیکن ماہرین نے اپنے شوقِ تحقیق میں اس سے بہت آگے بڑھکر نہ صرف یہ حساب لگایا ہے کہ اس تحیّر خیز رفتار سے مسلسل چلتے جانے پر پورے سال بھر میں روشنی کتنا سفر طے کرلے گی بلکہ یہ تخمینہ بھی لگایا ہے کہ فلاں ستارا ہماری زمین سے کتنا دور ہے اور اس کی روشنی ہم تک کتنے عرصے میں پہنچتی ہے۔ آسانی کے لئے "نوری سال" کی اصطلاح مقرر کرلی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے بارہ مہینے جن میں روشنی ایک لاکھ اسّی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے پیہم سفر کرتی رہی۔ اب حساب کیجئے تو معلوم ہوگا کہ صرف ایک گھنٹے میں روشنی چونسٹھ ۶۴ کروڑ اسّی لاکھ میلوں کی مسافت قطع کرلیتی ہے تو چوبیس ۲۴ گھنٹوں کے ایک دن رات اور تین سو پینسٹھ دنوں کے ایک سال میں اس کی قطعِ مسافت کے اعداد و شمار کہاں تک پہنچیں گے۔ مگر حیرت کا پہاڑ اس وقت پھٹتا ہے جب ہم ریسرچ کرنے والوں کے یہ انکشافات دیکھتے ہیں کہ فلاں ستارہ ہماری دنیا سے پچاس نوری سالوں کے فاصلے پر ہے اور فلاں ہزار نوری سالوں کے فاصلے پر ــــ پھر یہیں تک بس نہیں بہت سے ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بیکراں خلا کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اور یہ کتنی بڑی بڑی ہیں اور ان کا فاصلہ ہماری دنیا سے کتنا ہے؟

ان سوالوں کے جوابات ماہرین کی زبان سے سُن کر سماعت دم بخود، دماغ شل اور ہوش و حواس ماؤف ہو جاتے ہیں۔ ذرا سُنئے وہ خوبصورت کہکشاں جو دوسری کہکشانوں کے مقابلے میں ہم سے سب سے زیادہ قریب ہے کتنے فاصلے پر ہے۔ غالباً دو چار ارب یا لاکھ دو لاکھ کھرب میل پر ــــ جی نہیں اعداد و شمار کا یہاں کیا ذکر یہ ماضی سر بسجود اور ہندسے سر در گریباں ہیں۔ ماہرین کا حسابی اندازہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کا فاصلہ ہم سے ۱۵ لاکھ نوری سالوں کے برابر ہے ــــ سمجھے آپ پندرہ لاکھ نوری سال۔ یعنی اتنا بہوت کن فاصلہ کہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ اسّی ہزار میل کی رفتار سے چل کر ۱۵ لاکھ سالوں میں اسے طے کر سکتی ہے۔ اور یہ بھی سن لیجئے اس کہکشاں کا طول و عرض کیا ہے۔ کروڑ، پدم، کھرب میل ــــ۔ توبہ کیجئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا قُطر ساٹھ ہزار نوری سال ہے۔ یعنی قیاس و تصور سے بالا تر۔ پھر یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ ماہرین کی تصریحات کے مطابق ایسی کہکشائیں خلا میں دو چار سو پچاس نہیں بلکہ کروڑوں ہیں ــــ جی ہاں کروڑوں ــــ اور یہ سب متحرک بھی ہیں۔ ایک محوری گردش بھی ان میں پائی جاتی ہے اور پوری کی پوری یہ ہم سے مخالف سمت میں بھی مصروفِ سفر ہیں۔ یہ بھی گوش گذار کر لیجئے کہ جو کہکشاں سب سے کم رفتار سے گردش کرتی ہے اس کی رفتارِ سفر سات سو میل فی سکنڈ ہے اور وہ ہم سے ساٹھ لاکھ نوری سالوں کی دُوری پر نظر آتی ہے۔ ایک کہکشاں اڑتیس ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتی ہوئی بھی دیکھی گئی ہے اور اس کا فاصلہ ہم سے ۳۶ کروڑ نوری سال ہے۔

العظمۃ للہ ــــ ہے کوئی دماغ جو بے شمار آیاتِ آلہیہ میں سے اِن معدودے چند آیات ہی کی بیکرانی و حیرت خیزی کا حقِ استعجاب

ادا کرسکے۔

راقم الحروف اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس طرح کی معلومات کے سلسلے میں ایک ماہر مشاہد جناب ایف آر مولٹن نے ارشاد کیا:۔

"کائنات ہستی کی یہ بیکراں وسعت اور لا محدودیت انسان کے لئے اتنی زیادہ اہم نہیں ہے، بلکہ جس چیز کو دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہجاتا ہے وہ کائنات کی مکمل باضابطگی اور اس کا نظم ہے اس میں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے اور نہ مزاحمت۔"

یہ پڑھ کر بے ساختہ لوحِ حافظہ پر سورۃ اَلْمُلْک اُبھر آئی۔ یوں تو وقتاً فوقتاً آیاتِ قرآنیہ یاد آتی ہی رہتی ہیں اور جی بھی چاہتا ہے کہ اپنے تاثرات میں دوسرے بھائیوں کو بھی شریک کرکے ذکر و تسبیح کا فریضہ ادا کیا جائے مگر بے توفیقی راہ روک لیتی ہے اور مصروفیتیں دوسری طرف کھینچ لے جاتی ہیں ۔۔۔ مگر آج طبیعت بیتاب ہی ہو گئی کہ تاثرات نوکِ قلم پر آجائیں۔ اللہ اکبر کس شانِ جلالت اور وقار و تمکنت کے ساتھ خالقِ کائنات، مالک الملک، بدیع السموات والارض جلّ جلالہٗ وعم نوالہٗ فرماتے ہیں:۔

تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں بادشاہی ہے ۔ سلطنت ہے ۔۔۔ راج ہے ۔۔۔ کائنات ہے۔

یہ آگاہی دینے والا خوب جانتا تھا کہ کائنات کی وسعتوں میں جب انسان تحیر خیز نوامیس و آیات کا مشاہدہ کرے گا تو اس کی چھوٹی سی عقل مبہوت ہو کر رہ جائے گی اور وہ چکرا جائیگا کہ یہ سب کچھ کیسے بن گیا ۔۔۔ تحیّر اور سرگشتگی کو دور کرنے کے لئے ارشاد کیا گیا کہ جس ذاتِ والا صفات کے قبضے میں یہ کل کائنات ہے، جو تمام موجودات کی مالک و خالق اور حکمراں ہے وہ تو ہر چیز پر قادر ہے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وہی تو ہے جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ وہ جانچے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور بخشنے والا بھی ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔ دیکھ لیجئے موت و حیات ہی انسان کے لئے وہ اساسی حقائق ہیں جنھیں ہر شے کا آغاز و انجام اور مبدء و منتہا ماننا ناگزیر ہے۔ ساری تگ و دو اور تحقیق و تلا[ش] زندگی ہی تک ہے مرگئے تو کھیل ختم۔ کائنات کی دوسری بھی تما[م] اشیاء کی وسعتیں زندگی اور موت ہی کے حصار میں مقید ہیں جو ہستی موت اور حیات کی خالق ہو وہ کس شے کی خالق نہ ہو اور جو خالق ہوگی اس کے لئے مخلوقات کی نگہداشت، النصر[ام] ربوبیت کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ ہم تو ابھی آسمانِ دنیا ہی کے تحی[ر خیز] عجائبات میں سرگرداں ہیں۔ ان عجائبات کا خالق اطلا[ع] دے رہا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ وہ زبردست قوت والا، وہ قادرِ مطلق وہی تو ہے جس نے سات آسمان تہہ بر تہہ پیدا کئے۔

اس اطلاع پر اہلِ کفر ہی نہیں بہت سے اہلِ ایمان بھی چونکتے ہیں۔ ان کے دل بھنچ جاتے ہیں اور انھیں لاشعوری طور پر یہ کچھ گراں گذرتا ہے کہ اللہ میاں برابر سات آسمانوں کا ذکر کئے جاتے ہیں حالانکہ سائنس ابھی تک ایک ہی آسمان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، بلکہ اس نیلی چھت کو جسے آسمان کہا جاتا ہے فقط حدِّ نظر قرار دیتی ہے۔

العیاذ باللہ الف الف مرۃً۔ خبردار دوستو بھولے سے بھی یہ گمان مت کرنا کہ سات آسمانوں کی گنتی ۔۔۔ جو بار بار قرآن میں آئی ہے ۔۔۔ یہ کوئی استعارہ ہے ۔۔۔ کنایہ ہے۔ ۔۔۔ تمثیل ہے ۔۔۔ نہیں اللہ نے بیشک سات آسمان پیدا کئے ہیں اور آسمان فقط حدِ نظر کا نام نہیں۔ حدِ نظر تو ایک منفی نوع کی اصطلاح ہے حالانکہ قرآن کی متعدد صریح و محکم آیات بالبداہت بتاتی ہیں کہ آسمان ایک ایجابی اور مرئی چیز کا نام ہے جسے محض نارسائی کی بنا پر ۔۔۔ سائنسدانوں کی مرعوبیت میں حدِ نظر کے ماسوا کچھ نہ ماننا ضعفِ ایمان کی علامت ہے ۔۔۔ ایسا ضعفِ ایمان جو کفر تک منجر ہو سکتا ہے۔ بھلا سوچو تو جس نے یہ کائنات بنائی، یہ انسان بنایا، یہ سورج اور چاند اور ستارے اور کہکشائیں بنائیں وہ سات تو کیا سات ہزار آسمان بھی بنادے تو دشواری کیا اور شک کیسا۔ حیرت ہوتی ہے جب بعض عالمانِ دین کو بھی سات آسمانوں کی توجیہہ تاویل میں سرگرداں پاتے ہیں اور سائنسی

کشاف کے آگے ان کا انداز معذرداری کا سا ہوتا ہے۔ بعض اہل علم کو تو ایسی توجیہات کرتے بھی دیکھا گیا جن کا حاصل یہ ہے کہ سماوات آسمان سے مراد سات "کرتے" بھی ہو سکتے ہیں۔ پناہ بخدا ـــــ حالانکہ قرآنی آیات اس سے ابا کرتی ہیں اور احادیث میں تو یہ تک تفصیل موجود ہے کہ کونسا آسمان کس میٹیریل (مواد) سے بنایا گیا ہے۔

خیر بحث یہاں آسمان کی نہیں۔ ایف آر مولٹن کے تاثر پر جو آیات خصوصیت سے یاد آئیں وہ یہ ہیں:-

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ کیا تمہیں اللہ کی صنعتِ تخلیق میں کوئی فرق کوئی اختلال کوئی نقص و عیب نظر آتا ہے ـــــ تفٰوُتٌ لغۃً صرف فرق کو کہتے ہیں، لیکن عربی روزمرہ کے اعتبار سے اس ارشادِ ربانی کا مفہوم یہ ہے اور یہی تمام اہلِ علم نے سمجھا ہے کہ اے انسان! کیا تو خالق کی کاریگری میں، صناعی میں، کمالِ مہارت میں کہیں کوئی فرق پاتا ہے؟ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ہاں دوبارہ نگاہِ تجسس ڈال اور بتا کیا کوئی رخنہ ـــــ کوئی شگاف، کوئی خلا تجھے صنعتِ کردگار میں نظر آیا؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ پھر دیکھ۔ دو دو بار نگاہ ڈال ـــــ جلدی نہیں غور سے بار بار ملاحظہ کر ـــــ ہرگز تجھے خالقِ کائنات کی صنعت اور کاریگری اور کمالِ فن اور اعجاز و قدرت میں رخنہ، دراڑ، عیب، فروگذاشت، خامی نظر نہیں آئیگی بلکہ تیری تگ و دو اور امعانِ نظر کا ثمرہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ لوٹ آئے گی تیری نگاہ ناکام ہو کر اور تھک ہار کر۔ درماندہ، پشیمان، عاجز۔

واقعی آر مولٹن نے سچ کہا حیرتناک صرف یہی نہیں کہ خالقِ کائنات نے کیا کچھ کتنا اور کیسا پیدا کیا ہے، بلکہ صد درجہ تحیر خیز یہ ہے کہ مصنوعات و مخلوقات کے اس قافلۂ بے نہایت اور کاروانِ مسلسل میں کہیں کوئی رخنہ نہیں، تخالف نہیں، اختلال نہیں، مزاحمت و نزاع نہیں۔ دور مت جاؤ۔ ایک سورج اور چاند ہی کو دیکھ لو۔ کب سے ـــــ کتنے ہزار یا لاکھوں برسوں سے یہ

اپنے لگے بندھے راستوں پر لگی بندھی رفتار سے گرم سفر ہیں۔ نہ کسی ٹھوس چیز پر ٹکے ہوئے، نہ رسیوں سے بندھے ہوئے۔ نہ ظاہر میں کوئی ڈرائیور ہے نہ انجینیر۔ نہ انھیں مرمت کی حاجت ہے نہ نئے رنگ روغن کی۔ نہ یہ تھکتے ہیں نہ راہ بھٹکتے ہیں ـــــ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ ہمیں دکھاؤ تو بڑے سے بڑے سائنس داں نے بھی کوئی ایسی مشین بنائی ہو جو ہزار دو ہزار سال نہیں۔ سو دو سو سال بھی نہیں۔ صرف دس بیس ہی سال آپ سے آپ یکساں اپنی خدمات انجام دے سکتی ہو۔ آٹومیٹک مشینری کا رواج اب ترقی پذیر ہے، لیکن بہتر سے بہتر مشین پر بھی کسی نہ کسی چلانے والے اور نگہداشت کرنے والے کی موجودگی بہرحال ضروری ہے اور اتنا بھی تو نہیں ہوا ہے کہ ایک بار بٹن دبانے کے بعد سال دو سال ہی کوئی مشین بغیر کسی خلل کے آپ سے آپ مستقلاً یکساں خدمت انجام دیتی رہے اور اس دوران میں اس کی دیکھ بھال اور "غذا رسانی" کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ـــــ یہ ہے خالقِ کائنات کے مقابلہ میں انسانی ایجاد و صنعت کاری کا حال ـــــ بے حقیقت، ناقابلِ التفات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ نے اپنی بے نہایت قدرت و قوت کا بیان بار بار مختلف اسمائے حسنہ کے ساتھ کیا ہے جو اپنی اپنی جگہ بدع و خلق اور فطرۃ و ایجاد کے گوناگوں پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ تنبیہ کرتے ہیں کہ اے ظلوم و جہول اور عاجز و درماندہ انسان! اپنے گڑیوں کے کھیل پر مت پھول اور خدائے برتر و توانا کی بارگاہ میں فروتنی کے ساتھ جھک جا۔ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (بروج) ـــــ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (حشر)

دوستو! خدا کی یکتائی و عظمت کی طرف سے دل و دماغ کو کبھی غافل مت ہونے دو۔ یہی ہر قفل کی چابی، ہر بھلائی کا مصدر اور ہر کامرانی کی تمہید ہے جس نے اپنے ایمان کو شرک سے ملوث کیا اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (نساء)

عامر عثمانی

میلادالنبیؐ

اگست ۶۲ء کے تجلّی میں "شرفاء کی زبان" کے عنوان سے ہم نے کچھ عرض کیا تھا۔ اس کے تعاقب میں حافظ امام الدین رام نگری صاحب نے اکتوبر کے انوارِ اسلام میں بے تکان سات صفحات رقم کئے۔ ان صفحات کو دیکھ کر ہمارے بعض محترم دوستوں نے ہمیں خطوط لکھے کہ خدارا آپ جواب الجواب کا سلسلہ نہ چلایئے گا۔ ہم نے برملا ان سے وعدہ کیا کہ نہیں چلائیں گے۔ ایسا وعدہ اس لئے کیا کہ ان سات صفحات کو پڑھنے کی ہمت ہی ہمیں نہیں ہو سکی تھی۔ ہمت دو وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ ایک یوں کہ ان کا پہلا ہی پیرا پڑھنے کے بعد ہم نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کا لکھنے والا بخار میں مبتلا ہے۔ قلم پکڑتے ہی فرمایا گیا کہ مدیرِ تجلّی شر انگیز ہے۔ سلامت پسندی اسے چھو کر نہیں گئی۔ تفرقہ پسندی اور فتنہ طرازی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے وغیرہ۔

یہ تیور ہوں تو کون امید کر سکتا ہے کہ آگے کوئی معقول بات کہی گئی ہوگی۔ اسی لئے ہم نے آگے پڑھنا فضول سمجھا۔ دوسری وجہ نہ پڑھنے کی یہ تھی کہ خراب لکھائی چھپائی کے معاملہ میں ہمارا مزاج بڑا نازک ہے۔ اسے آپ کمزوری کہیں یا جو چاہے نام دیں صورت گرد گار بہر حال یونہی ہے کہ دس دس گھنٹے مسلسل دماغی کام کرنے پر بھی ہمیں دردِ سر یا کسی قسم کے دماغی تعب سے سابقہ پیش نہیں آتا لیکن شکستہ تحریر یا خراب لکھائی چھپائی کے صفحات سامنے آجائیں تو بغیر پڑھے ہی سر کا وزن بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور پڑھنے کی ہمت کریں تو نہ صرف دردِ سر شروع ہو جاتا ہے بلکہ آنکھیں بھی دُکھنے لگتی ہیں۔ یہ نزاکتِ طبع عیب ہو یا خامی، جرم ہو یا گناہ۔ ہے بہر حال ایک امرِ واقعہ شروع ہی کی سطروں سے اگر مایوسی نہ ہو گئی ہوتی تو ہم دردِ سر مول لیتے ہوئے بھی پورا مضمون ضرور پڑھتے مگر معقولیت کی توقع اُٹھ جانے کے بعد دردِ سر مول لینا نقصان کا سودا معلوم ہوا تو حافظ صاحب کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے رسالہ بند کر دیا۔

اب آج پھر کیوں کاغذ سیاہ کرنے بیٹھے ہیں؟

اس کا جواب خاصا دلچسپ ہے۔ لطیفہ یہ پیش آیا کہ حافظ صاحب کے اسی متذکرہ مضمون کو پڑھ کر جناب ماہر القادری نے حافظ صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تنبیہ کی کہ میلاد و قیام کے بارے میں آپ کا موقف غلط ہے اس سے رجوع فرمایئے۔ یہ خط صرف ایک صفحے کا تھا۔ حافظ صاحب نے فرطِ جوش میں اس پر آٹھ صفحات لکھ مارے اور یہ دونوں چیزیں نومبر کے انوارِ اسلام میں چھپ کر ہمارے سامنے آگئیں۔ انوارِ اسلام کا معیارِ کتابت تو اب بھی بہر حال حسب سابق ہی تھا لیکن اپنی کمزوری دماغی کی پروا کئے بغیر ہم نے یہ صفحات پڑھ ہی ڈالے اور اس مطالعہ کا نتیجہ وہ اعلان ہے جو گذشتہ ماہ ہم کر چکے ہیں۔

جن دوستوں سے ہم نے کچھ نہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ ہمیں وعدہ شکن ضرور قرار دیں گے۔ خفا بھی ہو جائیں تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن انھیں ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہماری وعدہ شکنی ضعفِ کردار کا ثمرہ نہیں ہے، بلکہ حکمِ شریعت ہی کی تعمیل ہے۔ شریعت نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص غیر جائز نذر ملنے تو اس کی حرمت کا علم ہو جانے پر ہرگز ہرگز اسے پورا نہ کرے۔ یہی حال اس وعدے کا ہے۔ وعدہ یہ سمجھ کر کیا گیا تھا کہ حافظ صاحب محض ہماری ذات کے خلاف دل کا غبار نکالا ہے اور میلاد

قیام کی آڑ لیکر عامر عثمانی کے پرخچے اُڑاتے ہیں۔ ہمیں ایسی عنایتوں کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی۔ صلواتوں کی توپیں اور گالی کوسنوں کی مشین گنیں ہماری ذات پر چلانے والے اور بھی ہیں ایک حافظ صاحب کا اضافہ کونسا آسمان توڑ دے گا۔ پرواہ اسے ہو جو اپنے آپ کو کچھ سمجھے اور جس کی انا تبرّا سنکر پیچ وتاب کھائے۔ یہاں اپنی حقیقت مشتِ خاک سے زیادہ کچھ بھی نظر نہیں آتی پھر کسی کے طنز و طعن، الزام تراشیاں، افترا اور صلواتیں کیا دُکھ دینگی لیکن نومبر کی گل افشانیوں سے بہرہ ور ہونے کے بعد ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا پڑا ہے کہ نشانہ صرف ہماری ذات ہی نہیں بلکہ حافظ صاحب عقائد صحیحہ پر بھی بڑے پینترے سے گرد و غبار اُڑانے میں کوشاں ہیں اور عربی کا ایک لفظ نہ جاننے کے باوجود انھوں نے سلف و خلف کی بہت سی عربی عبارتیں مع ترجمہ ڈھیر کر کے کم علم لوگوں کو شکار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ جس طرح کمیونسٹوں کا بھی لٹریچر ہے۔ انھوں نے بھی الحاد و کفر کے احقاق میں دفتر سیاہ کئے ہیں اسی طرح ہر جماعت کا اور اہلِ بدعت کا بھی کچھ لٹریچر ہے۔ اس میں سے جس کا جی چاہے کوئی کتاب اٹھا لے اور اس میں سے من چاہے اقتباسات لیکر عوام کالانعام سے اپنی تلاش و تحقیق اور علم و مطالعے کی داد وصول کرتا جائے۔ مگر ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ حافظ صاحب نے اہلِ بدعت کی کسی کتاب سے فائدہ اُٹھایا ہے یا بطور خود کنج کاوی کر کے مختلف کتابوں سے مواد لیا ہے۔ ہمیں صرف اس سے بحث ہے کہ میلاد و قیام کے استحسان پر ان کا جمع فرمودہ مواد اگرچہ ہوائی قلعے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا مگر وہ کم علم قارئین کو فسادِ عقائد میں مبتلا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم ان کے اُڑائے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ گالی کا جواب گالی سے ہم نہ دے سکیں گے، لیکن بدعت و شرک کا تعاقب تو ہماری زندگی کا مشن ہے۔ کسی کو یہ تعاقب بُرا لگے یا بھلا ہم بہرحال حافظ صاحب کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں کہ:-

"کوئی مولانا عبدالحیؒ کے اس فتوے پر بھی جسکے اقتباسات ہم نے گذشتہ مضمون میں نقل کئے ہیں انھیں کی سی علمی شان سے قلم اُٹھائے تو ذرا ہم بھی اس کے علم و قلم کا زور دیکھیں۔"

قلم اٹھانے سے پہلے ہم نے حافظ صاحب کا وہ پچھلا مضمون بھی پڑھ لیا ہے جسے دردِ سر سے بچنے کے لئے یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب نقد و نظر سے قبل صرف اتنا بتانا ہمارے ذمے اور رہ گیا ہے کہ پچھلے آغازِ سخن میں ہم نے یہ بات کیوں کہی تھی کہ استدلال کے سلسلے میں حافظ صاحب بالکل بچے بن گئے ہیں!

ذرا ٹھنڈے دل سے سنئے اور فیصلہ کیجئے۔ کچھ لوگ یہ معمول بناتے ہیں کہ فلاں وقت فلاں مسجد میں جمع ہوا کریں اور حلقہ بنا کر کچھ دیر درود و استغفار پڑھا کریں اور پھر نوافل ادا کیا کریں۔ اس پر زید کہتا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ احداث فی الدین ہے۔ مسجد میں حلقے بنا کر مجتمعاً ذکر و تسبیح اور نفل خوانی صحیح طریقہ نہیں ہے اس سے پرہیز کیجئے۔ اب طلحہ اُٹھتا ہے اور پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زید کو شر پسند، فتنہ پرداز اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہوئے ذکر و تسبیح کے فضائل اور نفل خوانی کے مناقب بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔

فرمائیے آپ طلحہ کو احمق اور ہٹ دھرم نہیں سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے۔ زید کا اعتراض نفسِ ذکر پر نہیں — وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ درود و استغفار کی تسبیحیں پڑھنا اور نوافل ادا کرنا کوئی بری بات ہے وہ تو ان اعمالِ خیر کی ایک خاص نو ایجاد شکل پر معترض ہوا ہے۔ وہ اجتماع فی المسجد کی متذکرہ صورت کو بدعت کہہ رہا ہے۔ اب شریفانہ طریقہ تو یہ تھا کہ طلحہ اور اس کے ہمنوا کلین اس خاص صورت کے جواز و استحسان پر دلائل لاتے لیکن وہ عام اہلِ بدعت کا وطیرہ اختیار کرتے ہوئے درود و استغفار کے فضائل اور نوافل کے استحسان کا مضمون لے بیٹھتے ہیں تو اس حرکت کو اہلِ عقل حماقت و بلادت یا فریب کاری و مکاری کے سوا کیا کہیں گے۔

حافظ صاحب نے بھی طلحہ ہی کی روش اختیار کی ہے، مگر ہم انھیں فریب کار یا احمق نہیں کہتے بلکہ ان کے فعل کو صرف "بچپنا" قرار دیتے ہیں کیونکہ ہماری دانست میں ان کی نیت فاسد نہیں بلکہ جس طرح ایک بخار زدہ آدمی اچھی بھلی چیزوں کو کڑوا یا میٹھا قرار دیتے ہوئے بدنیت نہیں ہوتا

بلکہ سچ مچ اسے یہ غذائیں بخار کی وجہ سے ایسی ہی محسوس ہوتی ہیں اسی طرح حافظ صاحب جان بوجھ کر غلط استدلال کا انبار نہیں لگا گئے ہیں، بلکہ میلان الی البدعت کے خوفناک مرض نے سچ مچ ان کے زاویۂ فکر و نظر میں ایسا گھماؤ اور بھینگا پن پیدا کر دیا ہے کہ بڑی معصومیت سے وہ ایک کو ڈیڑھ اور ساٹے کو چور سمجھے بیٹھے ہیں۔ ہمیں ان کی حالت پر غصہ نہیں رحم آتا ہے۔ رحم کا تقاضا یہ تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہیں خاموشی سے سُن لیا جائے، لیکن رحم سے بلند تر بھی ایک جذبہ ہے۔ — بدعت و شرک کے رد اور عقائد صحیحہ کی وکالت و حمایت کا جذبہ — دین کے مصفّا آئینے کو فاسد خیالات کی گرد سے بچانے کا جذبہ — اسی جذبے سے مجبور ہو کر ہم آمادہ ہوئے ہیں کہ حافظ صاحب کے ارشادات پر زبان کھولیں۔ وہ ہمیں معاف کر دیں گے تو ان کا کرم ہوگا۔ نہیں معاف کریں گے تو قیامت بہر حال ایک دن آنی ہے۔ ہمیں پورا اطمینان ہے کہ آج تک ہم نے بغیر مضبوط شہادتوں کے کسی کی نیت پر حملہ نہیں کیا، لیکن حافظ صاحب اللہ کے یہاں اپنا جواب سوچ رکھیں کہ وہ اللہ کے خوف اور بندوں کی شرم سے بے پروا ہو کر ملا عامر عثمانی کی نیت پر الزام عائد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ یہ بھی در اصل بدعت پسندی ہی کا زہریلا اثر ہے۔ بدعت کا یہ میلان اگرچہ دُم یا سینگ بن کر آدمی کے جسم پر نہیں اُبھرتا مگر اندر ہی اندر وہ سرطان کے پھوڑے کی شکل ضرور اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہ پھوڑا سڑ تا ہے اس میں پیپ پڑتی ہے تو آدمی پر وہی بورائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا مشاہدہ آپ پچھلے تجلی میں ان خدا ترسوں کی صورت میں کر چکے جن میں بندگانِ بدعت نے کسی کو کافر بنائے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

پھر یہ مت سمجھئے کہ بدعتی اخلاف نے اپنے اسلاف کی روش چھوڑ دی۔ توبہ۔ بدعتی اور زہر اُگلنا چھوڑ دے ناممکن۔ اسی سنہ ۶۲ء کے متعدد پوسٹر ہماری ردّی کی ٹوکری میں موجود ملیں گے جن میں شیطان کی اس ذریت نے تمام علمائے دیوبند، جمعیۃ العلماء، جماعت تبلیغی، اہل حدیث، جماعت اسلامی۔ غرض اپنے سوا پوری دنیا کو کافر، مرتد، بیدین قرار دیا ہے اور ڈنکے کی چوٹ بلا ابہام دیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم سب سے پہلے مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کے اُسی فتوے پر گفتگو کرتے ہیں جس کے بہت سے اقتباسات حافظ صاحب بڑے غرّے کے ساتھ پیش کر کے اپنی بات کو طولانی کر گئے ہیں۔

دنیا جانتی ہے اور فقہ کا معروف قاعدہ ہے کہ المعروف کالمشروط۔ جو تفصیلات کسی اصطلاح کے بارے میں طے شدہ ہوں وہ لازماً ملحوظ رکھی جائیں گی چاہے ان تفصیلات کا لفظاً کوئی ذکر نہ کیا گیا ہو۔ فرض کیجئے کوئی شخص کہے کہ حدیث میں یوں آیا ہے تو اگرچہ لفظ حدیث کے لغوی معنی صرف "بات" کے ہیں مگر اس قائل کا دعویٰ لازماً یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قولِ رسول کا مضمون بیان کر رہا ہے اور اسی طرح اگر کوئی یوں کہے کہ ایک آیت میں ایسا آیا ہے تو اگرچہ آیت کے معنی صرف نشانی کے ہیں اور قرآن و حدیث کی رو سے چاند سورج حیوان و انسان نباتات و جمادات سبھی اللہ کی نشانیاں ہیں مگر قائل کی مراد صرف اور صرف یہی سمجھی جائے گی کہ وہ قرآن کا ذکر کر رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح جب گفتگو میلاد اور قیام کی ہو تو آپ سے آپ یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ میلاد اور قیام سے کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم ان دونوں کو بدعت کہتے ہیں تو یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا ذکر کرے گا یا کسی بزرگ کے لئے تعظیماً کھڑا ہوگا وہ بدعت کا مرتکب قرار پائے گا۔ بھلا کون مردود ایسا ہو سکتا ہے جو یوں کہے کہ رسول اکرم فداہ امی و ابی کی ولادت شریفہ کا ذکر ہی سرے سے بدعت و معصیت ہے اور کسی بھی محترم شخصیت کی تعظیم میں کھڑا ہو جانا ہی احداث فی الدین ہے۔ العیاذ باللہ۔

مراد قطعی طور پر یہ ہوتی ہے کہ سال بسال وقت معین کر کے التزام کے ساتھ جو میلاد رائج کر لیا گیا ہے اور اس میں سلام پڑھتے ہوئے حضورؐ کی تعظیم کے طور پر جو قیام کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے۔ وہ احداث فی الدین ہے۔ ایجاد بندہ ہے۔

اب ذرا مولانا عبد الحئیؒ کا وہ مجموعۂ فتاویٰ اٹھائیے جسکے ایک فتوے سے متعدد ٹکڑے لیکر حافظ صاحب نے خواہ مخواہ کاغذ سیاہ کیا ہے اور کم علم عوام کو یہ باور کرانے کی سعیِ نامحمود کی ہے کہ مولانا عبد الحئیؒ بھی انھی کی طرح میلادِ مروّجہ کے قصیدہ خواں تھے۔ اس مجموعے کی کتاب الحظر والاباحۃ میں ایک سوال ہے جس میں یہ نہیں پوچھا گیا ہے کہ میلادِ مروّجہ کی محفلوں کا کیا حکم ہے، بلکہ سائل صرف یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ کی ولادت کا نفسِ ذکر ہی مستحسن ہے یا نہیں اور یہ کہ اگر کوئی شخص کچھ لوگوں کو جمع کرکے ولادت کا ذکر کرے اور اس اجتماع میں کوئی بھی عنصر خلافِ شرع شامل نہ کرے تو اسے بدعت کا مرتکب کہیں گے یا نہیں۔ اسکا جواب مولانا نے بہت طویل دیا ہے اور اسی طول سے ناجائز فائدہ اٹھا کر حافظ صاحب نے اس کے ٹکڑے بار بار نقل کر دیئے ہیں۔ لیکن مولانا مرحوم نے اپنی پوری بحث سے جو کچھ ثابت فرمانا چاہا ہے اسے خود انھی کے الفاظ میں دیکھئے۔ اختتام پر وہ لکھتے ہیں:-

"حاصل کلام کا یہ ہے کہ ذکرِ مولدِ فی نفسہٖ مندوب ہے، چاہے خیر الازمنہ میں وجود کی وجہ سے ہو یا سندِ شرعی کے تحت میں اندراج کی وجہ سے اور کسی نے اس کے مندوب ہونے سے انکار نہیں کیا ہے مگر ایک چھوٹے گروہ نے جن کا سرغنہ تاج الدین فاکہانی مالکی ہے اور اس کو علمائے مستنبطین کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے جنھوں نے ذکرِ میلاد کے مندوب ہونے کا فتویٰ دیا ہے پس اس کا قول ماننے کے لائق نہیں ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے مولانا کے فتوے میں بحث مجرد ذکرِ ولادت کے مندوب ہونے نہ ہونے کی ہے۔ استحسان نفسِ ذکر کا ثابت کیا گیا ہے مروجہ میلاد کا نہیں۔ مروجہ میلاد کے بارے میں تو مولانا موصوف متصل بعد خود ہی فرماتے ہیں کہ:-

"البتہ اگر ذکرِ مولد کے ساتھ غیر مشروعہ تخصیصات اور غیر ماموره تشریعات ملا دیئے جائیں تو اسکے مندوب ہونے کا حکم باقی نہ رہے گا۔"

ہم چونکہ حافظ صاحب کے بدنیت ہونے کا گمان نہیں رکھتے اس لئے یہ الزام دینا نہیں چاہتے کہ انھوں نے جان بوجھ کر اصل بحث کو چھپایا اور مولانا عبد الحئیؒ پر قصداً افترا کیا ہے۔ مجبوراً ہمیں یہی سمجھنا پڑ رہا ہے کہ بدعت کے میلان نے ان کی سوجھ بوجھ کو معطل کر دیا ہے اور وہ سمجھ نہیں پاتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے متذکرہ فقروں میں خود ہی کھول دیا ہے کہ مروجہ میلاد مندوب و مستحسن نہیں ہے۔ شاید اس لئے نہ سمجھے ہوں کہ مولانا نے ذرا عربی الفاظ استعمال کر لئے۔ اب وہ سمجھ لیں کہ غیر مشروعہ تخصیصات کے معنی ہیں ایسی خصوصیتیں جن کا شریعت نے اذن نہ دیا ہو اور غیر ماموره تشریعات کا مطلب ہے ایسی پابندیاں جن کا دین میں حکم نہ آیا ہو۔

کیا یہ بات کسی سے مخفی ہے کہ علمائے دیوبند یا ہم ولادت کے نفسِ ذکر اور مجرد محفلِ میلاد کو بدعت نہیں قرار دیتے بلکہ ٹھیک اسی بات کو بدعت قرار دیتے ہیں جس کے مستحسن ہونے کا انکار خود مولانا عبد الحئیؒ کر رہے ہیں یعنی سال بہ سال وقت معینہ پر محفل سجانا اور وہ سارا اہتمام کرنا جسے اندھا بھی دیکھ رہا ہے۔ گز بھر کی زبان چلانے والے ہمیں بتائیں کہ یہ وقت کی تعیین و تخصیص کا اذن شریعت نے کہاں دیا ہے اور میلاد کی محفلوں کو عبادتِ مستقلہ بنا لینے کا حکم شریعت میں کہاں آیا ہے۔ اگر نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ نہیں آیا تو پھر آخر کہاں کی شرافت ہے کہ اپنے فکری مادۂ فاسد کی پچکاری مولانا عبد الحئیؒ کے کاندھے پر رکھ کر چلائی جائے وہ تو خود کھول کر بتا رہے ہیں کہ غیر مشروعہ و غیر ماموره تخصیص و تعیین درست نہیں ہے مگر حافظ صاحب ہیں کہ اُس میلادِ مروّجہ کے استحسان میں مولانا مرحوم کو کھینچ کر لا رہے ہیں جس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ ہر سال بلاناغہ وقت معینہ پر خاص انداز میں منعقد کیا جاتا ہے اور منعقد کرنے والوں نے اس حد تک اسے مشروع بنا رکھا ہے کہ جو انکی تقلید نہ کرے وہ وہابی ہے۔ بدعقیدہ ہے۔ گمراہ ہے۔ وغیر ذلک

طلحہ کی جو مثال ہم دے آئے ہیں آپ دیکھ لیجئے کہ حافظ صاحب بھی ٹھیک اسی پر کاربند ہیں یا نہیں۔ گفتگو مجرد ذکرِ ولادت میں نہیں۔ مروجہ میلاد میں ہے۔ بدعت نفسِ میلاد کو نہیں کہا گیا اُس سالانہ التزام کو کہا گیا ہے جس نے جنم دن منانے کی غیر اسلامی ذہنیت کو مسلمانوں میں رواج دیا ہے۔ اسی لئے مولانا عبد الحئیؒ نے بجا فرمایا کہ ذکرِ مولد کے فی نفسہٖ مندوب ہونے سے ایک چھوٹے گروہ کے سوا کسی نے انکار نہیں کیا۔ اگر بات میلادِ مروجہ

کی ہوتی تو مولانا کبھی ایسی بات نہ فرماتے، کیونکہ وہ جاہل نہیں تھے
جو اتنا بھی نہ جانتے ہوں کہ ابن تیمیہ سے لیکر مولانا کے زمانے تک
بڑے بڑے جید علمائے حق نے یہاں تک کہ مجدد الف ثانیؒ جیسے
عاشقِ رسول صلعم تک نے میلادِ مروجہ کو بدعت اور قابلِ اجتناب
قرار دیا ہے۔

اس توضیح سے حافظ صاحب کے قصرِ استدلال کا سب سے بڑا
فیل پایہ تو منہدم ہوا۔ صاف معلوم ہو گیا کہ انھوں نے وہی حرکت
کی ہے جو اہلِ بدعت کا معمول ہے۔ یعنی قائل کی عبارت سے اسکے
خلافِ مدعا مفہوم نکالنا۔ مگر قصور حافظ صاحب کا پھر بھی
نہیں، کیونکہ زہر کسی کے حلق سے اُتار دیجئے تو وہ بیچارہ مجبوراً
مر جائے گا۔ شیطان نے جب بدعت پسندی کے جراثیم ہی حافظ
صاحب کے جسمِ مبارک میں انجکٹ کر دیئے تو اب وہ مجبور ہیں کہ
اہلِ بدعت ہی کی تکنک استعمال کریں اور عقلِ سلیم کو اسی طرح چھٹی
دیدیں جس طرح ہر بدعتی دیدیا کرتا ہے۔

آئیے کچھ نمونے اور دیکھئے جن سے آپ اندازہ کرسکینگے
کہ حافظ صاحب جیسا دیدہ ور، فہیم اور خوش فکر آدمی مرضِ
بدعت کا شکار ہو کر مجہولیت کے کس درجے میں پہنچ گیا ہے۔
بے دانشی کا یہ مرض اہلِ بدعت میں عام ہے کہ قرآن و حدیث
کی صریح و محکم نصوص کو تو اس کان سُنکر دوسرے کان سے
اُڑا دیں گے اور ذرا پروا نہیں کریں گے کہ ان سے کیا ثابت
ہو رہا ہے، البتہ آیاتِ متشابہات اور احادیثِ ضعیفہ سے
عجیب و غریب معانی نکالینگے اور انکے ذریعے حضورؐ کو عالم الغیب
اور حاضر و ناظر اور خالص نور اور مافوق البشر وغیرہ ثابت کرتے
چلے جائیں گے۔ یہی مرض ابتدائی اسٹیج میں حافظ صاحب کو
بھی لاحق ہوا ہے۔ قرآن اور صحاح ستہ کو تو انھوں نے تہہ کر کے
رکھدیا۔ غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ اور مجدد الف ثانیؒ جیسی
جلیل القدر ہستیاں تو اب ان کی نگاہ میں کسی قابل ہی نہیں
رہیں۔ لو کس سے لگی ہے ذرا ملاحظہ ہو۔

ایک صاحب ابو الخطّاب مغربی ان کے ہاتھ لگے۔ انکی
کتاب کے حوالے سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی
ایک روایت بیان فرماتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ اس روایت کے مفہوم و مفاد پر
گفتگو کی جائے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حافظ صاحب
کو یہ ابتدائی بات بھی معلوم نہیں کہ روایت کا اعتبار یا تو
کسی بخاری مسلم جیسی مستند کتاب کے حوالے سے ہوتا ہے
یا پھر پوری سند سے۔ کسی مغربی یا مشرقی کا یہ کہدینا کہ
فلاں صحابی نے یہ فرمایا اہلِ بدعت ہی کو متأثر کرے تو
کرے ذمہ دار دینداروں کو متأثر نہیں کرسکتا۔ اگر حدیث
سے استناد کرنا ہی تھا تو ذرا اس کی پوری سند نقل کی ہوتی
تب ہم دیکھتے کہ ایک صحابی کا فرمودہ ابو الخطاب صاحب کو
سات سو برس بعد پہنچا کیسے اور سند کس پائے کی ہے۔ کیسی
غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے کہ نہ تو کسی معروف و متفق علیہ کتاب
کا نام لیا جاتا ہے نہ روایت کی سند پیش کی جاتی ہے۔ بس
قلم اُٹھا کر لکھدیا کہ ابو الخطاب مغربی نے اپنی کتاب میں یوں لکھا

خیر چلئے فرض کئے لیتے ہیں ابو الخطاب کی روایت
کسی قابل ہی ہے مگر اس سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ فسادِ
بصیرت کی دلچسپ مثال ہے۔ سُنئے روایت یہ ہے:۔

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے کہ وہ ایک روز اپنے مکان میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے حالات بیان
فرما رہے تھے۔ لوگ بھی موجود تھے وہ لوگ بیان
سنکر مسرت حاصل کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کا
شکر ادا کر رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم پر درود پڑھ رہے تھے کہ ناگہاں حضورؐ
تشریف فرما ہوئے اور فرمایا تمہارے لئے میری شفاعت
حلال ہوگئی۔"

اس روایت سے جو استدلال فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے۔

"اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو
ذکرِ ولادتِ نبوی سے خاص عقیدت و محبت تھی
اور وہ لوگوں کو اپنے یہاں جمع کر کے حضورؐ کی ولادت
مبارک کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔"

دیکھا آپ نے یہ استدلال خواہ ابو الخطاب صاحب کا ہو یا حافظ ام نگری صاحب کا۔ ہر صورت میں داد دینی پڑے گی کہ پَر کا کبوتر بنانا اسی کو کہتے ہیں۔ دشواری اہل بدعت کے سامنے سب سے بڑی یہ رہی ہے کہ قرآن وسنت، آثار صحابہ اور اقوال ائمہ میں انھیں کوئی بنیاد اپنی ایجاداتِ شیطانیہ کی نہیں ملتی۔ مجبوراً وہ ادھر اُدھر سے چٹکلے تلاش کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ جہلاء و سفہاء سے دادِ شعبدہ گری وصول کرتے ہیں۔

روایت ہر شخص کے سامنے ہے۔ اگر پل بھر کے لئے اسے درست ہی مان لیں تو اس سے زیادہ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ ایک بار اتفاقاً بغیر کسی اہتمام اور بلا کسی رسمی ٹیپ ٹاپ کے حضرت ابن عباسؓ نے کچھ لوگوں سے سرکار رسالتؐ کی پیدائش کا تذکرہ فرمایا۔ خاص طور پر ولادت کا تذکرہ اس لئے فرمایا ہوگا کہ دُور دُور کے نئے نئے لوگ اسلام لا رہے تھے انھیں سرکار رسالتؐ کے حالات کا زیادہ علم نہیں تھا۔ ان میں سے کسی نے ابن عباسؓ سے دریافت کر لیا ہوگا کہ حضورؐ کب پیدا ہوئے۔ کس طرح پلے بڑھے وغیرہ۔ اس پر ابن عباسؓ تفصیلاً ذکر ولادت کرنے لگے ہوں گے۔ بھلا ایسی اتفاقی مجلس کی مروّجہ میلاد کے سلسلہ میں کیا بحث ہے اور کون کافر ہے جو یہ تصور بھی کر سکتا ہو کہ ذکرِ ولادت کی تمام ہی شکلیں بدعت و معصیت ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک لیکن شاباش ہے حافظ صاحب کی فنکاری کو کہ اس اتفاقی مجلس کو صحابہؓ کا معمول بنا کر پیش کر رہے ہیں، حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ یہ مجلس اگر سال بہ سال جنم دن منانے کی دلیل بن سکتی تو کم سے کم ابن عباسؓ اور اس محفل کے دوسرے شرکاء تو آئندہ بھی ایسی مجلس ضرور منعقد کیا کرتے مگر تاریخ و آثار کی ساری کتابیں چھان جایئے کہیں نہیں ملے گا کہ سال بہ سال تو کجا صحابہؓ میں سے کسی ایک صحابی نے زندگی بھر میں بھی دس پانچ ہی بار محفلِ میلاد سجائی ہو۔ اور یہ بھی صحابہؓ کی ذات پر محض افتراء ہے کہ انھیں حضورؐ کے ذکر ولادت سے خاص عقیدت و محبت تھی۔ انھیں تو حضورؐ کے ہر تذکرے سے محبت تھی۔ ان سے بڑھ کر حضورؐ کا عاشق کون ہوگا، لیکن جب یہ گفتگو آ پڑے کہ انھیں حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کے کس حصّے سے زیادہ اور خاص دلچسپی تھی تو ہر پڑھا لکھا آدمی یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ انھیں حضورؐ کے دورِ رسالت سے خاص دلچسپی تھی۔ اسوۂ رسول ان کی دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرجع تھا۔ ارشاداتِ رسالتؐ پر وہ اپنی بڑی توجہات مرکوز رکھتے تھے۔ کھلی بات ہے کہ حضورؐ کا زمانۂ رسالت آپ کے زمانِ ولادت سے افضل ہے صحابہؓ اسے خوب سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ کسی ایک بھی صحیح روایت میں یہ نہیں ملتا کہ وہ خصوصیت سے ذکر ولادت میں دلچسپی لیتے ہوں۔

یہ تو تھی روایت کو درست مان کر گفتگو، لیکن حق یہ ہے کہ یہ روایت ہی سرے سے قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ اگر سند بیان کی گئی ہوتی تو ہم اس پر نقد کر کے دکھلاتے۔ نہیں بیان کی گئی تو لیجئے ہم اصولِ درایت ہی کے تحت اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں اولاً یہ غور کیجئے کہ حضورؐ کے اس ارشاد کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے کہ:۔

"تمہارے لئے میری شفاعت حلال ہو گئی۔"

اگر یہ مطلب ہے کہ اس وقت سے پہلے تو تمہاری شفاعت میرے لئے حرام تھی اب حلال ہوئی تو یہ سراسر غلط بلکہ جاہلانہ مفہوم ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہر بد سے بدتر مسلمان کے لئے بھی حضورؐ کی شفاعت حلال ہے کجا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے لئے۔

اور اگر حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت یقینی ہو گئی تو یہ بھی ایک غیر علمی تاویل بلکہ تُک بندی کہلائے گی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ صحابہؓ کا درجہ کس قدر بلند ہے۔ مجلس مذکورہ کے تمام حاضرین ظاہر ہے کہ صحابی ہی تھے۔ خصوصاً ابن عباس رضی اللہ عنہ تو بڑے پائے کے صحابی تھے۔ ان کے لئے روز قیامت حضورؐ کو اذنِ شفاعت ملنا تو احادیث سے یقین کے درجے میں ثابت ہے حتیٰ کہ بخاری جیسی کتاب کی روایات سے یہاں تک ثابت ہے کہ حضورؐ اپنے معمولی سے معمولی صحابی کی بھی شفاعت فرمائیں گے اور اس پر اللہ فرمائے گا کہ اے محمدؐ تم نہیں جانتے تمہارے بعد فلاں فلاں صحابی نے کیا کیا۔ گویا تمام ہی صحابہؓ کے حق میں حضورؐ کا شفاعت فرمانا اہلِ علم کے لئے ایک معلوم و معروف بات ہے۔ پھر اس کے کیا معنی کہ حضورؐ خاص طور پر ذکر ولادت کرنے والوں کیلئے حلّت لکم

شفاعتیں فرماتے۔

ثانیاً یہ غور کیجئے کہ اگر اس فقرے سے واقعتہً کوئی بڑی بشارت مراد لی گئی ہے تو پورا ذخیرۂ حدیث موجود ہے جس میں حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف خوش نصیبوں کو بشارتیں دی ہیں کسی جگہ بھی یہ نہیں ملے گا کہ آپ نے کسی کو محض تھوڑے سے زبانی جمع خرچ پر بشارت دی ہو بلکہ بشارت ہمیشہ اونچے درجے کے اعمالُ کردار یا کسی ایک اعلیٰ درجے کے فعل و عمل پر دی گئی ہے۔

پھر یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ عشرۂ مبشرہ ـــــ یعنی جن دس اصحاب کو جیتے جی مغفرت کی بشارت متعین طور پر دی گئی ان میں عبداللہ ابن عباسؓ شامل نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہ روایت درست ہوتی تو علمائے امت لازماً ابن عباسؓ کو بھی اس فہرست میں شامل کرتے۔

ثالثاً اگر سچ مچ اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہوتا جیسا کہ اس روایت میں بیان ہوا ہے تب تو ابن عباسؓ اور دیگر حاضرینِ مجلس بہت ہی زور شور سے لوگوں کو تلقین کرتے کہ ایمان والو ذکرِ ولادت کی محفلیں سجایا کرو کیونکہ یہ اس قدر مبارک اور مفید ہیں کہ ان کے تعلق سے ہمیں رسول اللہؐ نے زبردست بشارت دی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صحابہؓ باہم دگر تواصی بالحق یعنی ایکدوسرے کو امورِ خیر کی وصیت و نصیحت کرنے میں بڑے سرگرم تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ابنِ عباسؓ اور دیگر صحابہؓ کو مجلس میلاد کی زبردست محبوبیت کا یقینی علم ہوتا اور وہ دوسروں کو اس سے باخبر نہ کرتے۔ باخبر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ مجلسیں عام ہوجاتیں اور آج اس کی ضرورت نہ پڑتی کہ لوگ ہیم دلیر قسم کی روایات ڈھونڈتے پھریں۔

رابعاً یہ کہ اگر واقعی رسول اللہؐ کو اپنی ولادت کا ذکر اتنا ہی پسند ہوتا جتنا اس روایت کے پیش کرنے والے نے باور کرانا چاہا ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دیگر امورِ خیر کی طرح اس کی بھی تلقین و ترغیب احادیث صحیحہ میں نہ ملتی۔ نہ صرف ترغیبؔ تلقین بلکہ ہونا قدرتاً یہ چاہیئے تھا کہ خود حضورؐ بھی انبیائے سلف ـــ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محفلِ میلاد منعقد کیا کرتے اور صحابہؓ میں تو حضورؐ کے ذکرِ میلاد کی محفلیں بہت عام ہوجاتیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کسی سرگرمی کا نشان دَورِ سعید میں نہیں ملتا۔ تب اس کے سوا کیا کہا جاسکے کہ صدہا اور روایتوں کی طرح یہ روایت بھی اہلِ بدعت دماغ سے تصنیف کرلی ہے۔ یا پھر الفاظ میں اُلٹ کرکے صحیح روایت کو اپنے حسب منشاء بنایا جارہا۔ دونوں ہی صورتیں شرمناک ہیں۔

دوسری روایت جسے حافظ صاحب نے بطور استدلال فرمایا ہے یہ ہے:۔

"حضرت ابودرداءؓ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عامر انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے وہ اپنی اولاد اور اپنے قبیلے کو جمع کرکے حضورؐ کی ولادت مبارک کے واقعات تعلیم کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ آج ہی کا دن ہے وہ آج ہی کا دن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور تمام فرشتے تمہارے لئے بخشش کی دعا مانگ رہے ہیں جو شخص بھی تمہاری طرح یہ عمل کریگا وہ تمہاری ہی طرح نجات پائے گا۔"

سند اس روایت کی بھی کچھ نہیں۔ نہ احادیث صحیحہ کی معروف کتب میں اس کا نام ونشان ہے۔ حافظ صاحب شاید اس سے بے خبر ہیں کہ دورِ سابق میں بے شمار روایتیں گھڑی گئی ہیں اور اسی لئے علمائے اصول نے روایت کے ردّ و قبول کے لئے روایت و درایت کا زبردست فن ترتیب دیا ہے۔ اگر وہ بھی ابوالخطّاب اور حافظ رام نگری کی طرح ہر روایت پر بھروسہ کر بیٹھتے تو آج دین کا تیاپانچہ ہوچکا ہوتا۔

ذرا سوچئے تو گھڑنے والے نے اس روایت میں بھی صاف طور پر وہی باور کرانا چاہا ہے جو پچھلی روایت میں چاہا تھا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذکرِ ولادت کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اتنا زیادہ کہ جہاں کہیں آپ نے یہ ذکر ہوتے سُنا وہیں نہایت شد و مد اور صراحت کیساتھ نجات د

مغفرت کی بشارت دیدی۔ اگر یہ امرِ واقعہ ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ احادیث صحیحہ میں بلا ابہام تکرار و اصرار کے ساتھ ایسے عظیم عمل کی ترغیب و تلقین نہ ملتی۔ وہ رسولؐ جس کھانے پینے، استنجا کرنے، اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے وغیرہ کی ذرا ذرا سی جزئیات تک صراحت سے بیان کیں اور احادیث صحیحہ ان صراحتوں سے معمور ملتی ہیں کیا وہ ایسے عظیم عمل خیر کی صریح ترغیب کبھی نہ دیتا جو ان غیر معتبر روایات پر بھروسہ کرنے والے نیک بختوں کے نزدیک اتنا مہتم بالشان ہے کہ اس کے عاملین کھٹ سے جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

کم سے کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہئیے تھا کہ وہ ابن عباس، ابو درداء اور عامر انصاری رضی اللہ عنہم تو بعد میں ضرور ہی ہر سال محفل میلاد منعقد کیا کرتے جن کے بارے میں متذکرہ روایات سنانے والے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے خود حضورؐ سے ذکرِ میلاد پر مغفرت کی خوش خبری سنی تھی۔ مگر کمال ہے کہ نہ یہ حضرات نہ وہ لوگ جو متذکرہ دونوں محفلوں میں موجود تھے پھر کبھی محفلِ میلاد منعقد کرتے نظر آتے ہیں نہ تابعی علماء و مشائخ میں سے کوئی نجات کے اس آسان راستے کو اختیار کرتا ہے نہ ائمۂ مجتہدین، نہ محدثین، نہ فقہاء یہ توفیق پاتے ہیں کہ نجات کے لئے محفلِ میلاد منعقد کرلیا کریں۔

انصاف کیجئے۔ بدعت کے میلان نے اگر حافظ صاحب کے قوائے فکری کا ستیاناس نہ کردیا ہوتا تو کیا ان جیسے فہیم اور سرد و گرم چشیدہ کو متذکرہ روایات کے یہ سب پہلو نظر نہ آتے آتے اور ضرور آتے۔ مگر مجبوری وہی ہے کہ جب شیطان نے بدعت کا انجکشن لگادیا تو ہوش و خرد کیسے صحیح کام کریں۔

اور لیجئے فرمایا گیا ہے:-

"اس سلسلے میں صحیح مسلم کی ایک روایت بھی قابل ملاحظہ ہے۔"

شکر ہے کسی مستند کتاب کا نام تو حافظ صاحب کی نوکِ قلم پر آیا یہ الگ بات ہے کہ اس کی روایت سے جو باطل استدلال کیا گیا ہے وہ بے دانشی اور ہٹ دھرمی کا شاہکار ہے۔ سنئے روایت کیا ہے:-

"حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبے کو روزہ رکھا کرتے تھے، حضورؐ سے پوچھا گیا کہ آپ یکیا روزہ رکھتے ہیں؟ حضور نے فرمایا۔ میں آج ہی کے دن پیدا ہوا اور آج ہی کے روز مجھ پر وحی کے نزول کا آغاز ہوا۔"

اب ذرا حافظ صاحب کا استدلال دیکھئے:-

"چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ کو روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ خود روزہ رکھا کہ اس روز حضورؐ کی ولادت باسعادت، اور وحی کی ابتداء ہوئی تھی اس لئے حضورؐ کے نزدیک اس دن کی یہ خصوصیت تھی کہ حضور اس روز روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضورؐ کے اس عمل سے حضورؐ کے یومِ ولادت کی یادگار قائم کرنے، اس کی خوشی منانے، وہ دن ہو یا کوئی اور دن حضورؐ کی ولادت مبارک کے حالات بیان کرنے اور ہر اس کام کے کرنے کا جواز ہی نہیں استحسان بھی مستنبط ہوتا ہے جو شرع کے اصول و مقاصد اور اس کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔"

ہم جو وقتاً فوقتاً کہتے آئے ہیں کہ بدعت کا مزاج ہی سنت سے گریز و فرار ہے اس کا واضح نمونہ یہ استدلال ہے۔ صحابہؓ و ائمہ، علماء و صلحاء اور تمام ہی بندگانِ حق کا قولاً و عملاً یہ طریق رہا ہے کہ جس موقع کے لئے روایاتِ صحیحہ سے حضورؐ کا جو عمل معلوم ہوگیا اسی کو سنت سمجھ کر سینے سے لگایا۔ اس کے برعکس اہلِ بدعت کا یہ طریق ہے کہ سنت کو تو گول کر جاؤ اور شارع علیہ السلام کو اپنی طرف سے معاذ اللہ اصلاح دو۔ روایت آپ کے سامنے ہے کیا اس میں صاف طور پر موجود نہیں ہے کہ سرکارِ رسالتؐ کی پیدائش اور بعثت کی گرانمایہ نعمتوں کی شکر گذاری اور اظہارِ مسرت کا صحیح طریقہ خود سرکارِ رسالتؐ کے نزدیک روزہ رکھنا ہے نہ کہ محفلیں منعقد کرنا یہ روایت موجود نہ ہوتی اور امت کو صرف مبہم طور پر معلوم ہوتا کہ اپنی پیدائش کی خوشی اور شکر میں حضورؐ نے کوئی خاص عمل کیا تھا تو اسکی گنجائش بھی تھی کہ ہم اندازے اور قیاس سے کوئی طریقہ اظہارِ مسرت کا نکالیں لیکن جب کہ صاف صاف معلوم ہوگیا کہ رسول اللہؐ نے روزہ رکھ کر

حق تشکر ادا کیا تھا اور کسی نوع کی محفل سازی اور ہنگامہ آرائی سے کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا تو اللہ اور رسول کے مخلص فرمانبرداروں کے لئے واحد معقول اور مبارک راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ سنت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے روزہ رکھیں نہ یہ کہ محفلِ میلاد منعقد کرکے غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر اس شرمناک خیال کا مظاہرہ فرمانے لگیں کہ نعوذ باللہ رسولِ اکرمؐ کو اظہارِ مسرت اور شکرِ نعمت کا پورا سلیقہ نہیں تھا۔ سلیقہ ہمیں ہے کہ محفلِ میلاد کے ذریعہ شکرِ نعمت ادا کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میلادی حضرات میں یوم ولادت کے روزے کا تو ذکر تک نہیں آتا۔ ذکر کیسے آئے مقصود رسولؐ کی پیروی نہیں اپنے ذوق و تخیل کی آسودگی ہے۔ محبت سنت سے نہیں اضافہ و ایجاد سے ہے۔ اسی لئے تو رسول اللہؐ کا یہ فرمودہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے کہ جہاں ایک بدعت جنم لے گی وہاں سے ایک سنت اٹھالی جائے گی آخر ہمیں بتاؤ تو یوم ولادت پر اظہارِ مسرت اور شکرِ نعمت کے طور پر محفل میلاد منعقد کرنا اگر اللہ اور رسولؐ کے نزدیک کوئی محمود و معقول طریقہ ہوتا تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کے رسولؐ نے محض روزے پر اکتفا کرکے اور محفلِ میلاد منعقد نہ کرکے شکرِ نعمت میں کوتاہی کی؟ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ اچھے اور برے، محبوب اور غیر محبوب اعمال و اشغال کی تشخیص تم اللہ کے رسولؐ سے بھی بہتر اور بڑھ کر کر سکتے ہو؟ اگر ایسا سمجھتے اور ایسا خیال کرتے ہو تو ہم اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اس فہم و خیال پر اللہ اور اس کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں اور اگر نہیں سمجھتے تو آخر یہ آگاہی حاصل ہو جانے کے بعد بھی کہ ولادت کی خوشی منانے کا صحیح طریقہ حضورؐ کی نظر میں روزہ رکھنا تھا یہ سال کے سال جنم دن منانے اور ہنگامے برپا کرنے کا استحسان آخر کہاں سے ثابت ہو گیا۔ ذرا سوچو تو سال بہ سال میلاد کرنا، زور شور سے یادگار منانا، تاریخ معین پر محفلیں ترتیب دینا اگر اسلام کے مزاج اور اللہ رسولؐ کی پسند سے موافقت رکھتا تو آخر کس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا تھا کہ خود اپنا اور حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کا یوم ولادت نہ منائیں اور کس نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو منع کیا تھا کہ اپنے محبوب ترین پیغمبر کے یوم ولادت محفلِ میلاد منعقد نہ کیا کریں۔ دین کے مزاج شناس تم زیادہ ہو یا اللہ کے رسولؐ اور صحابۂ کرامؓ زیادہ تھے اور کیسی عجیب بات ہے کہ تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی فقیہ، امام، محدث، مفسر، شیخ، ولی کو محافل میلاد کا استحسان نہ سوجھا حالانکہ وہ امورِ خیر کی محبت اور مندوبات و مستحبات کی لگن اور دین و شریعت کی مزاج شناسی میں تم سے بہت آگے تھے تف ہے اس عقل پر جو خیر القرون کا دامن چھوڑ دے اور نفریں ہے اس مزاج پر جو شریعتِ محمدیؐ کو ناقص سمجھ کر نئی عبادتیں نکالے۔

غور کرنا چاہیئے کہ یوم ولادت پر روزہ رکھنے کا اہتمام نظر انداز کر دیا گیا جو کہ سرکارِ رسالتؐ کا طریق تھا اور اس کے عوض وہ طریقہ ایجاد کر لیا گیا جس کے لئے اسوۂ رسول میں کوئی ایماء کوئی اشارہ تک نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ بعض میلادی حضرات روزہ بھی رکھتے ہیں تب بھی میلادِ مروّجہ کیلئے گنجائش نہیں نکلتی۔ عبادات کا معاملہ نقل و روایت پر موقوف ہے عقلی گدے بازی پر نہیں۔ سنت کے معاملہ میں ہو بہو پیروی اور اضافہ و ایجاد سے بچنے کا اہتمام صحابہؓ کے یہاں کس قدر تھا اس کے شواہد سے صحابہؓ کے آثار لبریز ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

مشکوٰۃ میں ترمذی شریف کے حوالہ سے روایت آئی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے ایک شخص کو چھینک آئی اور چھینکنے کے بعد اس نے زبان سے الحمد للہ والسلام علیٰ رسول اللہ ادا کیا۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے اسے ٹوکا اور کہا کہ ہم تو چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہیں گے اور والسلام علیٰ رسول اللہ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ ہمیں تو رسول اللہؐ نے چھینکنے کے بعد ہر حال میں الحمد للہ کہنے کی ہدایت فرمائی ہے (مشکوٰۃ۔ باب العطاس۔ الفصل الثالث)۔

غور فرمایئے۔ چھینکنے والے نے الفاظِ مسنونہ نہیں چھوڑے تھے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایک فقرہ بڑھا دیا تھا۔ پھر یہ

فقرہ بھی کیسا تھا نہایت پاکیزہ، نہایت مندوب و محبوب۔ یعنی سلامتی ہو اللہ کے رسول پر۔ لیکن جلیل القدر صحابی ابن عمرؓ اسے بھی پسند نہیں فرماتے اور یہ تلقین فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے صرف الحمد للہ کا اذن دیا ہے تو اسی پر اکتفا کرنا بہتر ہے۔ اضافے میں بہتری نہیں خواہ وہ کتنا ہی مقدس ہو۔

یہ تھا دین کے رمز شناس اور سچے غلامانِ محمدؐ کا مزاج و رحجان۔ اسوۂ و طریق۔ اس کی روشنی میں آپ دیکھیں تو یہ فیصلہ کرنا دشوار نہ ہوگا کہ جب یوم ولادت کے تشکر اور اظہار مسرت کے لئے خود حضورؐ کا عمل واضح ہو گیا تو اب یہ تو کیا درست ہوتا کہ اس عمل کو نظر انداز کرکے کوئی دوسرا عمل ایجاد کیا جائے یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ اس عمل میں اضافہ کیا جائے۔ یعنی روزہ رکھتے ہوئے محفلِ میلاد سجانا تو کارِ ثواب کیا ہوتا یہ بھی کارِ ثواب نہیں ہو سکتا کہ روزہ رکھکر ہی محفلِ میلاد سجائی جائے۔ اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ محفل مکروہاتِ شرعیہ سے یکسر خالی ہو۔ آپنے دیکھ ہی لیا کہ حضورؐ سے الحمد للہ کی ہدایت مل جانے کے بعد ایک ایسے پاکیزہ کلمے کا اضافہ بھی صحابیِ مکرمؓ کو پسند نہیں جس کو اللہ اور رسولؐ نے دوسرے مواقع پر نہ صرف پسند فرمایا ہے بلکہ اس کی تلقین کی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یوم ولادت کے روزے میں پاکیزہ قسم کی محفلِ میلاد کا اضافہ بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا، کجا کہ ایسی محفلوں کا اضافہ جو متعدد مکروہات و خرافات سے مملو ہو گئی ہوں۔ لوگ بھول گئے ہیں کہ اسلام تمامتر نام ہے اللہ اور رسولؐ کی بے چون و چرا اطاعت کا۔ جس معاملے میں ابہام ہو اس میں تو بے شک تعقل و تفکر کا اذن ہے، لیکن جب رسول اللہؐ کا اسوہ، آپؐ کی قولی یا عملی ہدایت اور آپ کا ایما غیر مبہم طور پر سامنے آگیا تو چنیں چناں اور چون و چرا کی کوئی گنجائش کہاں! حذف و اضافہ جرم ہے۔ این و آں نافرمانی ہے۔ ہم نے کہا تھا ناکہ بدعت عقل سلیم کو ڈس لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس متذکرہ روایت کو دیکھ لینے کے بعد جسے حافظ صاحب نے میلاد کے استحسان پر برہان بنایا ہے انھیں فوراً محسوس کر لینا چاہئے تھا کہ عقل و قیاس کی جو گنجائش اس روایت کے نہ ہوتے ہوئے نکل سکتی تھی وہ بھی اس نے ختم کر دی ہے اور سچے غلامانِ رسولؐ کے لئے واقعۃً یہی موزوں ہے، کہ سنت ہی کی پیروی کریں اضافہ و ایجاد کی جسارت نہ کریں۔

مگر ہائے۔ شاہد بدعت سے آنکھ لڑ جانے کے بعد ہوش و حواس کی سلامتی کہاں ذرا غور تو کیجئے حافظ صاحب کے ان الفاظ پر۔

"چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ کو روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیا، لیکن خود روزہ رکھا۔۔۔"

کیا یہ الفاظ فریب دہی اور ہٹ دھرمی کے نمایاں مظہر نہیں؟ یہ در اصل حافظ صاحب آج کل کے میلادیوں کی صفائی پیش کر رہے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ گو کہ حضورؐ نے یوم ولادت پر روزہ رکھا مگر زبان سے ہمیں حکم نہیں دیا کہ روزہ رکھا کرو اس لئے طبقۂ میلاد اگر روزہ نہیں رکھتا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، ہاں وہ جشن دن مناتا ہے تو عین ثواب ہے۔

افسوس بدعت کے نشے میں حافظ صاحب یہ بھول گئے کہ حضورؐ کا ہر وہ عمل تمام امت کے لئے بجائے خود سنت ہے جسکے بارے میں یہ توضیح نہ کر دی گئی ہو کہ یہ صرف حضور کے لئے خاص تھا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ حضورؐ نے یوم ولادت کو روزہ رکھا تھا اور کوئی ایسی توضیح بھی سامنے نہیں آئی جس سے پتا چلے کہ یہ فعل حضورؐ کے لئے خاص تھا امت کو اس پر عمل نہیں کرنا چاہیئے۔ تو آپ سے آپ ثابت ہو گیا کہ یہ ایسی سنت ہے جس پر عمل کرنا ہر امتی کے لئے موجب ثواب ہوگا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حضورؐ نے زبان سے حکم دیا یا نہیں دیا ــــ حکم کا سوال ہی کیا اٹھتا ہے کہ معاملہ تو نوافل و فضائل کا ہے۔ حکم واجبات اور سنن مؤکدات میں ہوتا ہے نہ کہ عباداتِ نافلہ میں۔ اور پھر بے دانشی کی انتہا دیکھئے جو عمل خود حضورؐ کر رہے ہیں اس کی اہمیت گھٹانے کے لئے تو یہ حربہ زبانی کہ آپنے اس کا حکم نہیں دیا اور جو عمل حضورؐ نے نہیں کیا یعنی محفلِ میلاد کا انعقاد اس کے استحسان کا استنباط اسی عمل سے کیا جا رہا ہے اسے کہتے ہیں بصیرت کا بحران اور فکر کا زیغ۔ فرض تو چھوڑ دو۔ نفلوں پر جان لٹا دو۔ سنت سے تو آنکھیں بند کر لو۔ بدعت و ایجاد پہ گلِ محمد کی طرح جم جاؤ۔ محکمات سے جی چراؤ۔ متشابہات کو حاصلِ زندگی بنا لو۔ جو عمل حضورؐ فرما رہے ہیں اس سے تو یہ کہہ کر کنی کاٹ جاؤ کہ اس کا زبانی حکم تو حضور نے دیا ہی نہیں اور جو عمل آپ نے نہیں فرمایا اسے اینڈی بینڈی منطق سے اخذ کرکے مستقل معمول بنا لو۔ فیا حسرتا ثم یا حسرتا۔

یہ تو ایک رُخ ہوا۔ ذرا دوسرا رُخ بھی دیکھئے حدیث مذکورہ میں کوئی خاص مہینہ موجود نہیں ہے۔ صرف پیر کا دن موجود ہے جو ہر ساتویں روز آتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سالانہ جشن وغیرہ کا کوئی تصور اس سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے تو کوئی تصور ہر سہ شنبہ کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ یوم ولادت کی حیثیت سے ہر پیر کو حضورؐ کا روزہ رکھنا برملا بتا رہا ہے کہ شاہت صرف یوم معین کی قابل لحاظ ہے ماہ و سال کی گردش ہرگز قابل لحاظ نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یوم ولادت کے تعلق سے حضورؐ سال میں صرف ایک پیر کو روزہ رکھتے تھے حدیث تو بلا تخصیص ہر پیر کو یوم ولادت کی یادگار بتا رہی ہے پھر کیسے کسی شخص کے دماغ میں اس حدیث سے سالانہ میلاد کا تصور پیدا ہو سکتا ہے مگر جب آدمی دیانت اور بصیرت کے تقاضوں کو بدعت کے آستانے پر ذبح کر دے تو پھر وہ جو چاہے کہہ اور لکھ گذرے کون اسکے زبان و قلم کو لگام دے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم کی متذکرہ حدیث سے استنباط کا دعویٰ تو محض نکتہ بعید الوقوع ہے۔ ارباب بدعت کا معمول ہی یہ ہے کہ پہلے ایک عقیدہ ذہن میں جما لیا پھر احادیث و آثار کو کھینچ تان کر اس کا مؤید اور مبنیٰ قرار دے ڈالا چاہے بقول ڈاکٹر اقبال اللہ اور رسولؐ کو بھی اس پیوندکاری پر حیرت ہو جائے۔

حافظ صاحب کو ایک اور بات ہم بتائیں۔ یہ کہ سہ شنبہ کو روزہ رکھنا صرف ولادت و بعثت ہی کے تشکر میں نہیں تھا بلکہ اس کی ایک اور بھی وجہ حضورؐ ہی سے منقول ہے۔ نسائی اور ابوداؤد نے حضرت اسامہؓ کی ایک روایت کی تخریج کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں:-

رأیت رسول اللہ علیہ وسلم یصوم الاثنین والخمیس فسألتہٗ فقال ان الاعمال تعرض یوم الاثنین والخمیس فاحبّ أن یرفع عملی وانا صائمٌ	میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے ہیں۔ میں اسکے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ انسانوں کے اعمال نامے بارگاہِ قدس میں پیر اور جمعرات کے دنوں میں پیش ہوتے ہیں۔ مجھے یہ بات محبوب ہے کہ میرا عمل بارگاہِ قدس میں ایسے میں اٹھایا جائے کہ میں روزے سے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیر کا روزہ متعدد مصالح پر مبنی تھا اگر کسی کو سچ مچ سنت کی پیروی کرنی ہے تو وہ وفاکیش غلاموں کی طرح ہر پیر کو روزہ رکھنے کی سعی کرے گا اور کسی اضافہ و اختراع کا شائق نہیں ہوگا۔ شوق اگر کسی وجہ سے جڑ ابھی گیا تو اضافہ مجرد پیر کے دن تک محدود ہوگا۔ ہر سال ربیع الاوّل میں جشن منانے کا تصور تک اس صوم الاثنین سے اس کے ذہن میں نہیں آئے گا۔ کیسا ظلم ہے کہ ایجاد تو کی جائے اپنے ذوق و رجحان کے تقاضے پر کوئی تقریب اور ظاہر یہ کیا جائے کہ یہ ایجاد ہم نے آیات و احادیث کے تقاضوں پر کی ہے۔ وادریغا۔

حذر اے چیرہ دستو سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حافظ صاحب نے مزید فرمایا:-

"اور دن اور تاریخ کا تعین، دعوت و اجتماع اور اہتمام نہ صرف دین کے مزاج کے خلاف نہیں ہے بلکہ عین مطابق ہے۔ نماز پنجگانہ، جمعہ، عیدین، رمضان کے روزے حج تمام ارکان و اعمال دن اور وقت کے تعین کے ساتھ ہی بجالائے جاتے ہیں"

وہی اُلٹی منطق — اللہ کے بندو یہی تمہارا استدلال تو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ جن جن عبادتوں کا جس درجے میں تعین اسلام کو مقصود تھا اس کی پوری وضاحت قرآن و حدیث میں کر دی گئی اب کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ کوئی نئی عبادت نکالے یا کسی نئی بات کو نئے تعینات اور نئی خصوصیتیں عطا کرے۔ تم کہتے ہو دن اور تاریخ کا تعین دین کے مزاج کے خلاف نہیں ہے مگر یہ نہیں سوچتے کہ عبادات کے معاملے میں یہ تعین صرف اللہ اور رسولؐ کا حق تھا۔ اسی کا نام تو احداث فی الدین ہے کہ یہ حق ہم تم اپنا سمجھنے لگیں۔ آذ

تو۔ تم تو میلاد جیسی اپنی ایجاد کی ہوئی عبادت کے تعین پر اصرار کر رہے ہو، لیکن شریعت میں تو عبادات مکتوبہ و منصوصہ تک کے لئے کسی ایسے تعین اور تخصیص کو درست نہیں مانا گیا جس کی اللہ اور رسولؐ تصدیق نہ فرمادیں۔ مسلم اٹھاؤ۔ باب کراھة افراد یوم الجمعة بصوم لایؤافق عادتہ کھولو۔ پھر یہ روایت پڑھو۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تختصوا لیلة الجمعة بقیام من بین اللیالی ولا تخصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الّا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم۔	ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راتوں میں سے صرف جمعہ کی رات کو عبادت کیلئے مخصوص نہ کرو اور مخصوص مت کرو... دوسرے دنوں کے مقابلہ میں صرف جمعہ کے دن کو۔۔۔ الّا یہ کہ اتفاقاً اس دن جمعہ آپڑے جس دن تم نے روزے کا قصد کر رکھا ہے۔

+ + + +

+ + + +

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ اللہ کے رسولؐ کی نگاہ میں ان خصوصیات و تعینات پر قناعت کرنا جنھیں اللہ اور رسولؐ نے واضح فرمادیا کس قدر ضروری تھا اور ان سے ہٹ کر اپنی طرف سے تعیین و تخصیص کتنی ناپسند تھی۔ دیکھ لیجئے نماز روزے جیسے اعمالِ خیر کا معاملہ ہے۔ جمعہ کا دن بھی اہم دن ہے مگر حکم دیا جارہا ہے کہ تخصیص مت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادات میں دن اور تاریخ کا تعین اللہ اور رسول کی اجازت ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم عقل کی گدّے بازی سے نئے تعینات نکالیں۔ اگر یہ درست ہوتا تو پھر جمعہ کے دن روزہ رکھنا اور جمعہ کی رات کو خاص طور پر صرفِ عبادت کرنا بہت ہی عمدہ فعل ہوتا مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کا رسولؐ اس سے روک رہا ہے

دعوت، اجتماع، محفل وعظ اور اسی طرح کے دیگر امور میں دن اور تاریخ کے تعین پر کوئی عالم نکیر نہیں کرتا کیونکہ یہ چیزیں بجائے خود عبادت نہیں۔ یہ محض ذرائع ہیں مقاصدِ جائزہ اور مطالبِ واجبہ کے لئے۔ نکیر اور ردّ و قدح اُس محفلِ میلاد پر ہے جسے بجائے خود مقصد اور کارِ ثواب سمجھ کر برپا کیا جاتا ہے اور غلو کا یہ عالم ہے کہ جو اِن اہلِ بدعت کے سُر میں سُر نہ ملائے اسے بدعقیدہ، گمراہ اور قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

ہماری اتنی ہی معروضات اہلِ عقل پر یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ بدعت پسندوں کا طرزِ استدلال کس قدر نامعقول اور بچکانہ ہے۔ مگر ہم کسی ایسے شخص کو جس کی نظر سے حافظ صاحب کے شہ پارے گزرے ہوں یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتے کہ فلاں دلیل کا رد تو ہوا مگر فلاں دلیل رد نہیں ہوئی۔ طول منظور مگر یہ ہمیں منظور نہیں کہ بدعت کے جامۂ تلبیس کا ایک بھی بخیہ اُدھیڑے بغیر چھوڑ دیں۔

اب سُنیئے۔ متذکرہ دلائل کے بعد۔۔ بشرطیکہ انھیں دلائل کہا جاسکے ۔۔ حافظ صاحب چند ایسے علماء کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے میلاد کو بدعت حسنہ قرار دے کر مستحسن ٹھیرایا ہے۔ ذرا سنئے ان علماء کے نام۔

(۱) علامہ جمال حنفی مفتی مکہ مکرمہ (۲) مولٰنا عبدالرحمٰن سراج مفتی مکہ معظمہ (۳) مالکی مفتی شیخ ابو بکر بسیونی (۴) شافعی وکیل مفتی محمد سعید بن باصیل۔

ہم پڑھے لکھے مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کیا انھوں نے یہ نام پہلے سُنے ہیں؟ اور اگر سُنے ہیں تو کیا ان کی حیثیت واقعی ایسی ہے کہ جب انھوں نے کوئی فتویٰ صادر فرمادیا تو اب امتِ مسلمہ اکابرین امت کو طاق میں بٹھادے۔ ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ جیسے ائمہ کو دُور سے سلام کرے۔ حضرت اسماعیل شہیدؒ اور مولٰنا اشرف علیؒ اور حضرت گنگوہیؒ جیسے مجددین کے بارے میں سمجھ لے کہ یہ جھک مارتے ہیں۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ علم العقائد اور سنت و بدعت کی بحثوں پر حافظ صاحب کے پاس منضبط علم کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ انکا حال اس باب میں اُس اہل حدیث طالب علم کا سا ہے جس نے پہلی بار لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب دیکھی اور خوشی سے جھوم اٹھا کہ یہ روایت تو اس کے ہاتھ بڑی زور کی آئی جسے پیش کرکے وہ مسلک احناف کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے۔ اب اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ روایت علمائے سلف میں بحث و نظر کے کن کن مرحلوں سے گذر چکی ہے۔ اسی طرح حافظ صاحب کسی بدعتی کی کتاب میں میلاد

قیام کے استحسان والے چند فتاویٰ اور چند اینٹ روڑے بنیڈے دلائل دیکھ
کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے کہ ہیرے موتی ہاتھ آ گئے۔ حالانکہ
انھیں معلوم ہونا چاہئیے ایسے سطحی فتاویٰ اور بے حقیقت دلائل کی
ایک ایک بخیہ علمائے حق مدت ہوئی اُدھیڑ چکے ہیں اور یہ بھی
انھیں معلوم ہونا چاہئیے کہ شیطان چودھویں صدی کی پیداوار نہیں
ہے۔ وہ چھٹی اور ساتویں صدی میں بھی موجود تھا۔ کج فکری اور
غلطیِ اجتہاد بھی نیا مرض نہیں ہے یہ صدیوں پہلے بھی تھا۔ لہٰذا
اس سے کوئی حاصل نہیں کہ حافظ سیوطیؒ یا قاضی عیاضؒ یا امام سبکیؒ
یا مکے اور مدینے کے بعض مفتی صاحبان کیا رائے رکھتے تھے اور رکھتے
ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کا ازلی و ابدی کلام، رسول اللہ ﷺ کی صحیح
احادیث، صحابہؓ کے آثار، متفق علیہ ائمہؒ و فقہاء کے ارشادات
اور عقلِ سلیم کے تقاضے کس فیصلے پر صادر کرتے ہیں۔ کیسے غضب کی
بات ہے کہ کل تک اللہ اور رسول ﷺ ہی کو معیارِ حق ماننے والے حافظ
صاحب آج بدعت و احداث کی حمایت میں علاقائی سطح کے مفتیوں
اور دوسرے درجے کے عالموں کے ارشادات بطور حجت پیش کر
رہے ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ حافظ صاحب نے متذکرہ بالا مفتیوں کے فتوے
تو نقل کئے مگر یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے نقل کئے۔ ایسی صورت میں
ان کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا۔ مگر خیر چلئے ہم مانے لیتے ہیں کہ نقل
میں بے ایمانی نہیں کی گئی مگر ان فتووں سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا
کہ ان میں استحسان اس محفلِ میلاد کا بتایا گیا ہے جو زیرِ بحث ہے
کتنی بار کہیں کہ مجرد ذکرِ ولادت زیرِ بحث نہیں نہ ایسی محفلیں زیرِ
بحث ہیں جن میں تمام جزئیاتِ شرعیہ کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ بحث
اُن محفلوں سے ہے جو رائج کر لی گئی ہیں۔ جن میں غیر معمولی روشنیاں
اور دوسرے لوازمات کی شکل میں اسراف کیا جاتا ہے۔ جن کے شرکاء
صالحین ہی نہیں ہوتے فساق و فجار بھی ہوتے ہیں۔ جن میں غیر معتبر
اور واہی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں قیام ہوتا ہے اور
جن کو بجائے مستحب کے اس درجہ لازم و واجب قرار دے لیا گیا ہے
کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ٹل جائے مگر یہ نہ ٹلیں اور جو اِن کی محمودیت
کا قائل نہ ہو اس پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اسے بدعقیدہ سمجھا جاتا
ہے وغیرہ ذلک۔

منقولہ فتاویٰ کا تعلق ہندوپاک سے نہیں مکہ معظمہ سے ہے۔ گو
کہ میلاد کو جشن دن کی شکل میں منانا لازماً بدعت ہی ہے چاہے وہ مکے
اور مدینے ہی میں کیوں نہ ہو مگر اس فرق کو بہر حال ملحوظ رکھئے کہ مکے
میں بھی جن معدودے چند لوگوں کی غلط فکری نے بدعتِ میلاد سے
لَو لگائی ہے ان کے خیالات و اطوار ہند و پاک کے میلادیوں جیسے
نہیں ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ وہ اس معاملے میں اصرار و
شدت سے کام نہیں لیتے۔ امرِ مندوب پر اصرار بجائے خود ممنوع ہے
اپنے ہند و پاک میں اصرار و شدت کا جو عالم ہے سب پر ظاہر ہے۔
علاوہ ازیں وہ لوگ اسراف سے بچتے ہیں۔ روایات میں غلو نہیں
کرتے۔ قیام بھی نہیں کرتے۔ اسی لئے بعض مفتیوں کو ظاہری
سطح سے دھوکا لگا اور انھوں نے جواز و استحسان کے فتوے صادر
کر دیئے۔ ان فتووں سے اپنے یہاں کے مروجہ میلاد کا جواز لانا
تقریباً ایسا ہی ہے جیسے کوکجم پر اصلی گھی کا دھوکا کھانا۔
اور علمی سطح پر جائزہ لیجئے تو یہ فتوے جان اور وزن نہیں رکھتے
حافظ صاحب جیسے لوگ ــــ جنھیں علماء کی اصطلاحات کا علم
نہیں ــــ وہ تو کسی مفتی کے اِن الفاظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں کہ
"سلف و خلف جمہور علمائے کبار نے اس کو مستحسن قرار
دیا ہے۔"
لیکن جو لوگ اصطلاحات اور اکثر علماء کی عادات کا علم
رکھتے ہیں انھیں خوب معلوم ہے کہ "جمہورِ سلف و خلف" سے
ان علماء کی مراد تمام امت کے "جمہورِ سلف و خلف" نہیں ہوتے
بلکہ ان کے اپنے مکتبِ فکر اور دھڑے کے اکابر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ وہ بے جھجک دعویٰ کر گذرتے ہیں ورنہ اگر ان کی مراد وہ ہی
ہو جو حافظ صاحب نے سمجھی تو یہ دعویٰ سفید جھوٹ ہوگا کہ میلاد کے
استحسان پر جمہورِ سلف و خلف متفق ہیں۔ اس کے جھوٹ ہونے کے
ثبوت میں ہم متعدد شواہد پیش کر سکتے ہیں مگر طول سے بچنے کے لئے
صرف ایک ہی شہادت پیش کرتے ہیں جو اہلِ انصاف کیلئے کافی
وافی ہوگی۔ یہ شہادت نہ صرف دعوۂ مذکور کی قاطع ہوگی، بلکہ
حافظ صاحب کے ایک اور دعوے پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دے گی۔
ماہر صاحب نے اپنے خط میں حافظ صاحب کو متنبہ کیا تھا کہ
میلاد کی محفل سلجوقی بادشاہوں کی نکالی ہوئی ہے۔ اس پر حافظ صاحب

ـاتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو حضرت امام تاج الدین ـبکی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا اور ان کے زمانے کے ائمۂ حدیث و ـقہ اور علماء و صلحاء نے اسے پسند کیا۔ یہ تو حافظ صاحب نے فرما دیا ـگر حوالہ بالکل نہیں دیا کہ آخر اس دعوے کا ماخذ کیا ہے۔ اس کا ـطلب اسکے سوا کیا سمجھیں کہ ماخذ کسی بدعتی کی اُردو کتاب ہے اور ـافظ صاحب ازراہِ سیاست حوالہ گول کر گئے ہیں۔

خیر ہم جیسوں پر تو اس سے بھی کوئی اثر نہ پڑتا اگر یہ دعویٰ درست ہی ہوتا کیونکہ ناموں سے مرعوب وہ ہو جسے قرآن و سنت اور صحابہؓ و ائمہ پر بھروسہ نہ ہو۔ ہمارے لئے تو نہ کوئی سبکیؒ حجت ہے نہ سیوطیؒ۔ وو ٹنگ ہی پر اگر فیصلہ ٹھیرے تب بھی ہم ان حضرات کے مقابلہ میں ان سے بڑے درجے کے ارباب علم کے نام اپنے موقف کی تائید میں پیش کر سکتے ہیں۔

لیکن یہاں تو لطیفہ یہ ہو رہا ہے کہ حافظ صاحب کا دعویٰ ہی بے دلیل ہے۔ لیجئے ہم وہ شہادت پیش کرتے ہیں جس سے یہ دعویٰ بھی خارج ہو جاتا ہے اور وہ جمہور سلف و خلف والی بات بھی حافظ صاحب کے سمجھے ہوئے مفہوم میں لایعنی ہو کر رہجاتی ہے۔

امام احمدؒ بن محمد بن البصری جو معروف علمائے سلف میں سے ہیں اپنی کتاب القول المعتمد میں میلاد کی بحث میں رقمطراز ہیں۔

قد اتفق علماء المذاهب الاربعة على ذم العمل به فممن يذمه العلامة معز الدين الخوارزمی قال فی تاریخه ان صاحب اربل الملك ابو سعید الكوكری كان ملكا مسرفا يامر علماء زمانه ان يعملوا باستنباطهم واجتهادهم وان لا يتبعوا المذهب غيرهم حتى مالت اليه جماعة من العلماء وطائفة من الفضلاء و تحفل لمولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الربیع الاول هو اول من احدث من الملوك هذا العمل و قال ابو الحسن علی بن الفضل المقدسی مالکی فی کتابه جامع المسائل ان عمل المولد لم ینقل من السلف الصالح وانما احدث بعد القرون الثلثة فی الزمان الطالح ونحن لا نتبع الخلف فیما اهمله السلف لانه یکفی بهم الاتباع فای حاجة لنا الی الابتداع۔

یقیناً متفق ہیں چاروں مذاہب (حنفی۔ شافعی۔ حنبلی۔ مالکی) کے علماء رسول اللہؐ کے جنم دن منانے کی مذمت پر۔ ان علماء میں سے ایک عالم معز الدین خوارزمی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ اربل کا بادشاہ ابو سعید کوکری ایک فضول خرچ بادشاہ تھا وہ اپنے دور کے علماء سے کہتا تھا کہ تم اپنے اجتہادات پر عمل کیا کرو کسی اور مکتب فکر کی بات مت مانو۔ اس کی باتوں میں علماء و فضلاء کی ایک جماعت آگئی اور یہ بادشاہ ماہ ربیع الاول میں میلاد کی محفل کیا کرتا تھا اور یہی پہلا بادشاہ ہے جس نے یہ فعل ایجاد کیا اور ابو الحسن علی بن الفضل المقدسی مالکی اپنی کتاب جامع المسائل میں لکھتے ہیں کہ عملِ میلاد سلفِ صالحین سے منقول نہیں ہے بلکہ وہ تو بعد کے نامسعود زمانے میں ایجاد کیا گیا ہے اور ہم ایسے امور میں خلف کی پیروی نہیں کر سکتے جنھیں سلف نے ناقابل التفات سمجھا کیونکہ سلف کی پیروی ہمیں کافی ہے پھر کیا ضرورت ہے بدعت اختیار کرنے کی۔

+ + + +

اس واضح شہادت سے حافظ صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ بھی ساقط ہو گیا کہ میلاد کے موجد امام سبکیؒ ہیں اور وہ فتویٰ بھی ہوائی ثابت ہوا جس میں میلاد کے استحسان پر جمہور علمائے سلف و خلف کا اتفاق بتایا گیا ہے۔ آپ کے سامنے ہے کہ اس میں تو اس کے برعکس چاروں مذاہب کے علماء کا میلاد کی مذمت پر متفق ہونا منکشف کیا گیا ہے اور یہی امر واقعہ بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ علماء کی بہت بڑی تعداد ہمیشہ ہی شاہوں کے آستانوں پر سر ٹیکتی رہی ہے۔ ابتداءً ایسے ہی علماء نے میلاد کے موجد بادشاہ کا ساتھ دیا اور دنیا کمائی۔ یا پھر کچھ ایسے بزرگ اس بدعت کی ظاہری سطح سے دھوکہ کھا گئے جو فی الواقع صاحب علم بھی تھے اور صاحب کردار بھی لیکن انکے تفقہ پر تصوف غلبہ پائے ہوئے تھا اور تصوف کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو لیکن قوانین شرعیہ اور فقہ میں اسے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ جب ان زاہد و عابد بندوں کو یہ میلاد کی تقریب اپنے ذوق و رجحان کے تحت پسندیدہ محسوس ہوئی تو اس کا

رواج بڑھتا گیا اور پھر جب قانون شریعت کے بے لاگ ماہروں نے اس کے بدعت ہونے کا فیصلہ دیا تو ان زیادہ عبادت کے عقیدت مندوں نے قدرتی طور پر ان کے فیصلے کو ٹھکرا دیا اور آیات و احادیث میں کھینچ تان کر کے اس کا استحسان ثابت کرنا چاہا۔ یہ وہی طریقہ تھا جو آج بھی عام طور پر رائج ہے یعنی پہلے ایک فعل کو کسی وقتی جذبے یا کسی غیر معقول عقیدت و تعصب کے تحت برحق مان لینا پھر دلائل ڈھونڈنا۔ جو دلائل خلاف نظر آئیں انھیں نظر انداز کر دینا اور جن سے کچھ سہارا ملے انھیں نکتہ سنجی کے ذریعہ اندراج کر کے پیش کرنا۔

لیکن حق یہ ہے کہ جن متقی علماء نے میلاد کو مستحسن سمجھا تھا ان کے پیش نظر بھی یہ مروّجہ میلاد ہرگز نہیں تھا جسے آج کل فرض و واجب بنا لیا گیا ہے بلکہ وہ تو دینداروں کی ایک غیر رسمی سی پاکیزہ مجلس تھی جو اصلاً بدعت ہونے کے باوجود خرافات و فضولیات سے منزہ تھی۔

چلئے ایک شہادت اور لیجئے:۔

علامہ ابن الحاج المدخل میں فرماتے ہیں:۔

ومن جملة ما احدثوہ من البدع مع اعتقادھم ان ذلك من اكبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلونہ في شهر الربيع الاول من المولود وقد احتوي ذلك علي بدعة ومحرمات۔	اور منجملہ ان بدعات کے جنھیں یہ سمجھ کر ایجاد کر لیا گیا ہے کہ یہ بڑی عبادتیں اور اسلامی شعائر ہیں وہ بدعت ہے جسے ربیع الاول کے مہینے میں مولود کے نام سے کیا جاتا ہے یہ بدعت یقیناً متعدد بدعات و محرمات پر مشتمل ہے۔

اچھا ایک اور بھی لیجئے۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے مرزا حسام الدین نے مولود کے بارے میں سوال کیا اس کا جواب حضرت مجدد دیتے ہیں:۔

بنظر انصاف بینید کہ اگر فرضاً حضرت ایشاں دریں زمان در دنیا زندہ می بود و ایں مجلس و اجتماع منعقد شد آیا باایں امر راضی می شدند و ایں اجتماع را می پسندیدند یا نہ؟ یقین فقیر آنست کہ ہرگز ایں را تجویز نمی فرمودند بلکہ انکار می نمودند۔	نگاہ انصاف سے دیکھئے کہ اگر بفرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں زندہ ہوتے اور یہ میلاد کی محفل منعقد ہوتی تو کیا وہ اس اجتماع کو پسند فرماتے یا ناپسند؟ تو فقیر کا یقین ہے کہ ہرگز اس کو جائز نہ رکھتے، بلکہ انکار فرماتے۔

(مکتوب دوصد و ہفتاد و سوم ۲۷۳)

\+ + + + .

ان شہادتوں سے واضح ہے کہ حافظ صاحب کو بدعت کے میلان نے اللہ میاں کے گنبد میں پہنچا دیا ہے اور انھیں خبر نہیں ہے کہ ناقص مطالعے اور اہل بدعت کی کتابوں پر اعتماد کے نتیجے میں ان کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا

یہ تو حافظ صاحب کے اُن دلائل کا رد ہوا جنھیں وہ اپنے قصور علمی کی بناء پر براہین قاطعہ سمجھے ہوئے تھے، حالانکہ وہ سرے سے دلائل ہی نہیں ہیں بلکہ بریلوی بازی گروں کے چٹکلے ہیں۔ دیگ کا حال ایک چاول بتا دیتا ہے تو اندازہ کر لیجئے کہ موصوف کے باقی ارشادات کا حال کیا ہوگا۔ مگر ہم آپ کے اندازے ہی پر معاملہ چھوڑنا نہیں چاہتے، بلکہ ہر ہر تلبیس کا جائزہ لیں گے۔

ایک شاندار تلبیس موصوف کی یہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اکابرین دیوبند تو میلاد و قیام کو نہ صرف بہ نگاہِ استحسان دیکھتے تھے بلکہ عملاً بھی ان میں شریک تھے، مگر یہ عامر عثمانی ہی فتنہ پرداز ہے کہ ڈنڈا اٹھائے پھرتا ہے۔

اس تلبیس کے لئے انھوں نے ٹھیک اہل بدعت ہی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اہل بدعت کا یہی تو رویہ ہے نا کہ اللہ اور رسولؐ جو کچھ صاف صاف بلا ابہام کہیں اسے تو نظر انداز کر دو اور ان کے غیر متعلق یا متشابہ ارشادات سے بلا تکلف ایسے معانی نکالتے چلے جاؤ جو صریح ارشادات کی نقیض ہوں۔ قابل اعتماد وسائل پر توجہ مت دو اور اٹکل پچو باتوں سے کام نکال لے جاؤ۔

اسی طرح حافظ صاحب نے اکابرین دیوبند کے عقیدہ و موقف کا حال جاننے کے لئے اُن کتابوں اور رسالوں پر تو نظر نہیں ڈالی جن میں ان حضرات نے صاف صاف میلاد و قیام کو بدعت و معصیت قرار دیا ہے مگر دوڑے الدّرّ المنتظم کی اُس تقریظ کی طرف جس میں ایک صاحب نے یہ رقم فرمایا ہے کہ خاندان ولی اللّٰہی کے بزرگ اور دیوبند کے علماء و مشائخ نہ صرف محافل میلاد میں شریک ہوتے تھے، بلکہ بعض نے قیام میں

بھی حصہ لیا ہے۔

ہم اہلِ انصاف سے پوچھتے ہیں کیا متذکرہ بزرگوں کی اپنی کتابیں اور فتاویٰ چھوڑ کر ایک غیر متعلق شخص کے بیان پر بھروسہ کرنا کسی صداقت پسند آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہمارے اکابرین کی کتابیں ناپید تو نہیں ہیں۔ فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ امدادیہ، بہشتی زیور، براہین قاطعہ، فتاویٰ میلاد، اصلاح الرسوم، تعلیم الدین، تقویۃ الایمان، المہنّد، مکتوبات شیخ الاسلام، نصیحۃ المسلمین، مأۃ مسائل، ہدایۃ المومنین، رسالہ ردّ شرک، تذکیر الاخوان، تنبیہ الغافلین، تصفیۃ العقائد، تحذیر الناس اور البلاغ المبین وغیرہا ہر طرف موجود ہیں۔ یہ نام تو ہم نے ایک سانس میں لکھ دیئے اور ان سب کتابوں میں خاندانِ ولی اللّٰہی اور اکابرین دیوبند کی اپنی توضیح و تصریح موجود ہے کہ میلاد و قیام جیسی بدعات کے بارے میں ان کی رائے کس قدر سخت ہے مگر انھیں گول کر کے حافظ صاحب ایک ایسی تقریظ اٹھائے پھر رہے ہیں جس میں اولاً تو صاحبِ تقریظ ہی نے صورتِ حال کی تصویر کشی میں سیاستاً غلو سے کام لیا ہے۔ دوسرے خود حافظ صاحب اس کا ٹھیک محل و مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔

ہم بار بار کہتے آ رہے ہیں کہ بحث نفس مولود میں نہیں۔ مولود مروّجہ میں ہے۔ اصلی گھی میں نہیں کوکو جم میں ہے۔ مجرد عمل میں نہیں اس کی خاص شکل میں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ شاہ عبد العزیزؒ مولانا محمد یعقوب یا حضرت حاجی امداد اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کبھی کبھار مولود کی جن محفلوں میں شریک ہوئے ہیں اور ان میں انوار و برکات کا باطنی مشاہدہ کیا ہے ان میں اور زیرِ بحث مولود میں بس اتنی ہی ظاہری مشابہت ہے جتنی اصلی گھی اور کوکو جم میں ہوتی ہے۔ اثرات و مضرات کے اعتبار سے وہ دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ اُن غیر شرعی تخصیصات کو تو ایک طرف رکھیے جو میلادِ مروّجہ کے اجزائے لاینفک کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں تنہا یہی بات میلادِ مروّجہ کے مکروہ ہونے کے لئے کافی ہے کہ اسے امرِ واجب جیسی اہمیت دیدی گئی ہے۔ بڑے سے بڑا امناظر بھی مولود کو زیادہ سے زیادہ مستحب ثابت کر سکتا ہے مگر شریعت کا طے شدہ اصول ہے کہ کسی امرِ مستحب و مندوب پر اصرار کیا جائے اور اسے مثل واجب قرار دیکر ترک و رخصت پر عمل نہ کیا جائے تو وہ بھی بدعت و معصیت بن جاتا ہے۔ تو کیا کسی شخص پر یہ مخفی ہے کہ آجکل کے میلادیوں کے اصرار اور شدت کا کیا حال ہے۔ کسی سال ترک کرنا تو درکنار جو شخص میلاد نہ کرے یا اس میں شریک نہ ہو اسے گمراہ اور بدعقیدہ ٹھیرایا جاتا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر نہ ٹلے تو میلادیوں کا میلاد نہ ٹلے۔ یہ امرِ مستحب کو واجب بنا لینے کی واضح ترین شکل ہے۔ اس کے برخلاف اُن میلادوں کا یہ حال نہیں تھا جن میں متذکرہ اکابر کبھی کبھار شریک ہو گئے ہوں۔ اُن میلادوں میں نہ تو فسّاق و فجّار کا گذر تھا۔ نہ تنبوڑ ڈیرے تھے۔ نہ دیوالی جیسی روشنیاں تھیں۔ نہ واہی تباہی روایتیں تھیں۔ نہ کرنے والوں کا یہ خیال تھا کہ جو ان سے اختلاف کرے وہ بدعقیدہ ہے۔ نہ یہی ضروری تھا کہ ٹھیک تاریخ معینہ ہی پر یہ محفل سجے۔

ایسی محفلوں میں اگر ہمارے اکابر میں سے بعض نے شرکت کر لی ہو تو احمقوں اور ہٹ دھرموں کے سوا کوئی اسے اس بات کی دلیل نہیں بنا سکتا کہ اکابرینِ دیوبند میلاد مروجہ کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ ثبوت میں ہم نے اتنی بہت سی کتابوں کا نام لے دیا۔ ایک تفصیلی ثبوت بھی دیکھتے چلئے :۔

اس تقریظ میں میلاد و قیام کی شرکت کرنے والوں میں مولانا محمد یعقوب صاحب کا بھی نام لیا گیا ہے۔ اب ذرا "فتاویٰ میلاد" اٹھائیے اور مولانا احمد علیؒ سہارنپوری کا وہ فتویٰ دیکھیے جس میں انھوں نے نہایت شد و مد سے میلاد اور قیام کو نہ صرف بدعت و معصیت قرار دیا ہے بلکہ ان کے عاملین کو آیۂ قرآنی اَلَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو کھیل کود بنا لیا اور دھوکے میں ڈالا انھیں حیاتِ دنیاوی نے) کا مصداق قرار دیا ہے۔

اس میدان ہی مولوی یعقوب صاحب کی تصدیق ملاحظہ فرمایئے جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ میلاد و قیام میں شرکت کر لیتے تھے۔ یہ تصدیق آٹھ نو سطروں کی ہے جس میں اس والہانہ انداز میں فتوے کی توثیق کی گئی ہے کہ :۔

"سبحان اللہ کیا اچھا جواب مولانا مجیب لبیب نے

عنایت الٰہی سے دیا ہے .... جو بات
ناحق اور باطل اور محض گھڑی ہوئی بے اصل تھی ..
... اس کو بالکل رد اور باطل کر کے جڑ سے اکھاڑ
دیا ___"

فرمائیے کیا مولانا یعقوب صاحب کے موقف و مسلک کے اظہار میں یہ توثیق زیادہ معتبر ہے یا کسی اور شخص کا بے دلیل بیان ___ مان بھی لیں کہ کبھی مولانا اتفاق سے کسی محفل میلاد میں شریک ہوگئے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی قیام بھی کرلیا تو اسے سوائے غیر شعوری فعل کے کیا کہیں گے۔ اگر شعوری طور پر ہی کیا ہو تب بھی مذکورہ توثیق سے ظاہر ہوگیا کہ انھیں اپنا قصور محسوس ہوگیا تھا۔

حاجی امداد اللہؒ کے بارے میں ہم ماہ اگست میں بتا چکے ہیں کہ وہ باوجود بہت بڑے شیخ ہونے کے باضابطہ عالم دین نہیں تھے۔ اگر انھوں نے میلاد کو کارخیر سمجھا تو یہ شرعی حجت نہیں ہے۔ اس پر حافظ صاحب نے جو سفیہانہ اور مبتذل گفتگو کی ہے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اہل انصاف کے سامنے یہ صورت حال رکھتے ہیں کہ دیکھئے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اکابرین دیوبند میں چوٹی کے بزرگ ہیں۔ علم اور تقویٰ دونوں میں وہ ممتاز تھے۔ حاجی صاحبؒ اگرچہ ان کے پیر ہیں مگر خود حاجی صاحب ہی اپنی تصنیف "ضیاء القلوب" میں رقم طراز ہیں کہ حق یہ ہے کہ مولوی رشید احمدؒ اور مولوی محمد قاسمؒ ایسے برگزیدہ لوگوں میں ہیں کہ انھیں میری جگہ اور مجھے ان کی جگہ ہونا چاہئے تھا۔

اب ملاحظہ فرمائیے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ میلادِ مروجہ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کیا فرماتے ہیں

" ایسی مجلس ناجائز ہے اور اس میں شریک ہونا گناہ ہے اور خطاب جناب فخر عالم علیہ السلام کو کرنا اگر حاضر و ناظر جان کرے کفر ہے۔ ایسی محفل میں جانا اور شریک ہونا ناجائز ہے اور فاتحہ بھی خلاف سنت ہے اور سویم بھی کہ یہ سب ہنود کی رسوم ہیں

البتہ ثواب پہنچانا اموات کو بلا قید روا ہے اس کا مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد گنگوہیؒ
(فتاویٰ میلاد شریف ص۱۱)

اور یہ بھی سن لیجئے کہ اگرچہ ان کے پیر حاجی امداد اللہؒ محفل میلاد تمام مروجہ التزامات و خرافات سے خالی ہوا کرتی تھی اور روایات صحیحہ کا بھی کافی اہتمام ہوتا تھا مگر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ باوجود مرید ہونے کے کبھی ساتھ نہیں دیتے تھے بلکہ ناگواری کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور شیخ نے بھی کبھی اس ناگواری کا برا نہیں مانا، بلکہ اصولاً اسے تسلیم کیا کہ رشید احمدؒ عالم ہیں علمی اعتبار سے رائے ان ہی کی درست ہے۔

اب مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کو لیجئے جو اکابرین دیوبند میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں اور حضرت حاجی صاحبؒ ہی کے متوسلین میں سے ہیں۔ وہ جواباً رقمطراز ہیں:۔

" انعقاد محفل میلاد اور قیام وقت ذکر پیدائش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرون ثلثہ سے ثابت نہیں ہوا پس یہ بدعت ہے۔" (فتاویٰ میلاد)

اور یہ بھی سن لیجئے کہ اس جواب پر بھی اُن مولانا محمد یعقوب صاحب کی تصدیق ہے جن کے بارے میں بتایا جا رہا تھا کہ وہ میلاد و قیام میں شرکت کیا کرتے تھے۔

بدعت مت نہ مار دیتی تو حافظ صاحب کے لئے مولانا اشرف علیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمود الحسنؒ کے فتاویٰ پر نگاہ ڈالنا دشوار نہ تھا مگر وہ بدعت ہی کیا جو آدمی کی عقل و بصیرت کو دھواں دھواں نہ کردے۔

اور تماشا دیکھئے۔ حد ہے کہ حافظ صاحب میلاد و قیام کے بدعتِ مذمومہ نہ ہونے کی شہادت میں اُس ماحیِ بدعت شہیدِ سنت امام زماں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا نام بھی لے آتے ہیں جس کے لہو کا ایک ایک قطرہ بدعات کے خلاف شعلۂ جوالہ بنا رہا ہے۔ حافظ صاحب شرم دنیا اور خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر حضرت شہیدؒ کی ایک ایسی عبارت نقل فرماتے ہیں جس میں میلاد و قیام کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ بدعت

سنت کے موضوع پر جو کہا جا رہا ہے مگر اس عبارت کو یہ تأثر
دینے کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ حضرت شہیدؒ بھی میلاد و قیام جیسے
اُمور کو بدعتِ حسنہ ہی سمجھتے تھے۔

یا معبود! یہ تو بڑے بڑے گھاگ بدعتیوں کو بھی پیچھے
چھوڑ دیا گیا۔ ایمان والو انصاف کرنا کیا بدعتی ائمہ بھی نہیں
کرتے کہ ایک آیت یا حدیث لی اور اس سے کھینچ تان کر
ایک ایسا مطلب اخذ کر لیا جس کی تردید اللہ اور رسولؐ
دوسری نصوص میں صریح طور پر کر رہے ہیں۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مشہورِ دوراں کتاب "تقویۃ الایمان"
موجود ہے ذرا اسے اُٹھا کر دیکھو۔ لائقِ اجتناب رسوم و
بدعات کی فہرست میں صاف طور پر مروّجہ میلاد اور قیام
کو شامل کیا گیا ہے اور ایک ایک صفحہ اس کتاب کا شریعتِ
قبوری پر تیغِ بے نیام ہے۔ بریلوی آج تک اس کتاب کو
پانی پی پی کر کوستے ہیں۔ کتنا ڈھیٹ ہے وہ شخص جو شاہ شہیدؒ
جیسے شہرۂ آفاق امامِ سنت اور قاطع بدعت کو بھی کسی بدعت
کا حامی باور کرانے کی ناپاک کوشش کرے۔

یہی حرکت مولانا مودودی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ان کی ایک
عبارت حافظ صاحب نے یہ تأثر دینے کے لئے نقل فرمائی کہ ان کے
نزدیک بھی میلاد و قیام مستحبات ہی میں داخل ہیں حالانکہ مولانا
موصوف کی صریح تحریریں موجود ہیں اور ہر واقفِ حال جانتا
ہے کہ ان کی نگاہ میں یہ اُمور ہرگز مستحسن نہیں۔ مگر حافظ صاحب کو
اس سے کیا۔ بدعتی لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا ھُوَ کے صریح ارشاد
ربانی کو نہیں سنے گا اور اس ارشاد کے رد میں ڈھونڈ کے لائے گا
کوئی ضعیف روایت اور اس میں منطق لڑا کر یہ معنے پیدا کرے گا کہ
حضورؐ عالم الغیب تھے۔ لعنت بکار شیطان۔

ایک بددیانتی حافظ صاحب کی یہ ہے کہ آپ نے حضرت
شہیدؒ کی ایک ایسی عبارت نقل کی جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے
کہ وہ بھی بدعت کی دو قسمیں کرتے تھے۔ حسنہ اور سیئہ۔ لہٰذا عامر
عثمانی کی اس بکواس اور ابن تیمیہؒ یا مجدد الف ثانیؒ کے اس
فیصلے کو کوئی وزن نہ دو کہ بدعت کی فی الحقیقت کوئی قسم حسنہ نہیں
ہے۔ بدعت تو سیئہ ہی سیئہ ہے۔ حالانکہ جس کا جی چاہے
تقویۃ الایمان اُٹھا کر دیکھ لے اس کے دوسرے باب تذکیر
الاخوان میں بدعت و سنت کی بحث موجود ہے۔ اس میں حاصل
بحث کے طور پر وہی کہا گیا ہے جو عامر عثمانی کہتا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ
بدعت کو دو قسموں میں تقسیم کرنا محض ایک لفظی اختراع ہے حقیقت
میں بدعت کی کوئی قسم حسنہ نہیں ہے۔ جن بدعات کو حسنہ کہا گیا
ہے وہ صرف سطحی جائزے میں بدعت نظر آتی ہیں گہری نظر سے
دیکھئے تو ان کا جوڑ شریعت کے اصول و قواعد سے ملے گا اور انہیں
سنت کے زمرے میں رکھنا ہوگا۔

تفرقہ پسندی کی دہائی

الحمد للہ کہ میلاد کی حد تک ہم حافظ صاحب کے ایک ایک استدلال
کے تجزیئے سے فارغ ہو گئے۔ اب ہم انشاء اللہ اگلی صحبت میں اُن
فتاویٰ پر نظر ڈالیں گے جو انھوں نے "قیام" کے جواز و استحسان میں
پیش کئے ہیں۔ لیکن آج کی گفتگو ختم کرنے سے قبل ہم اُس کم نگاہی
اور ظلم و تعصب کا ماتم ضرور کریں گے جس کے تحت حافظ صاحب
جیسے لوگ ہمیں اتحادِ ملت کا سرمن سناتے اور تفرقہ پردازی سے
پرہیز کا وعظ پلاتے ہیں۔

حافظ صاحب بار بار یہ رونا روتے ہیں کہ فروعی اختلاف
کی شدت نے ملتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے لیکن مدیر تجلی
جیسے لوگوں کو اس کا کوئی غم نہیں۔

مدیر تجلی عرض کرتا ہے کہ اس احتجاج میں حافظ صاحب کی
پوزیشن ٹھیک اُس آدمی جیسی ہے جو چینی حملہ آوروں کی شرارت
خباثت سے تو آنکھیں بند کر لے مگر ہندوستانی مدافعین کو نصیحت
کرنے لگے کہ دوستو جنگ و جدل سے باز آؤ توپیں بندوقیں لے کر
لڑنا بری بات ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا
روس صاحب نے اپنے برادرِ خورد چین کی جارحیت پر تو مذمت کا
ایک لفظ نہیں کہا لیکن جب چین نے پوری مکاری کے ساتھ جنگ
بندی کی کچھ لغو شرطیں پیش کیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ چین کی مصالحت
آمیز رویّہ پر ہندوستان کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہئے۔ ٹھیک یہی
پارٹ حافظ صاحب ادا کر رہے ہیں۔

یا پھر اُن فرقہ پرستوں کی مثال سامنے رکھئے جو خود تو

رقہ پرستی میں غرق ہیں، لیکن الزام دیتے ہیں مسلمانوں کو
ں کا اور سب سے بڑی فرقہ پرست جماعت قرار دیتے ہیں
عتِ اسلامی کو جس سے بڑھ کر فرقہ پرستی کی دشمن کوئی جماعت
ی روش ہمارے بارے میں حافظ صاحب اختیار کئے
ں۔ ہم ان سے اور دیگر انصاف پسندوں سے پوچھتے
ا ہم نے اور ہمارے سنت دوست اکابر نے کبھی اہل
کے ائمہ و اکابر پر نام لے کر کفر و ارتداد کے فتوے
یں۔ کبھی کسی بدعتی بزرگ کو معین کر کے مشرک و ملحد
کبھی یہ پروپیگنڈہ کیا ہے کہ اہل بدعت اسلام سے
یں ان سے کسی معاملے میں مسلمانوں جیسا برتاؤ مت کرو۔
لیکن ذرا اہل بدعت کی روش دیکھو۔ چند نمونے تو پچھلے
تجلی میں پیش کئے جا چکے کہ ائمہ بدعت کس طرح اعلان و
کے ساتھ اکابر امت کو نام بہ نام کافر و بے دین قرار
ں۔ جائزہ لیا جائے تو کوئی سال ایسے اشتعال انگیز
فانہ فتاویٰ سے خالی نہیں ملے گا۔ نہ صرف فتاویٰ بلکہ
ہل بدعت کا بس چلتا ہے اپنے سوا مسلمانوں کی ہر
ت اور اس کے ہر بزرگ پر صریح تبرا کرتے ہیں۔
ون کہتے ہیں۔ جاہلوں میں ان کے خلاف عناد و تعصب
بھڑکاتے ہیں۔ اسی سن باسٹھ ۶۲ء میں غالباً چار پانچ
ی سائز کے پوسٹر عاجز ہی کو ایسے موصول ہو چکے ہیں
ٹھیک اسی مبتذل اور بازاری زبان میں جو ارباب
کا طرۂ امتیاز ہے نام بہ نام ہمارے اکابر کو، جمعیۃ العلما
عوت تبلیغی کو اور نہ جانے کیسے کیسے بد سے بدتر کافر،
لدم مرتد، زندیق، خبیث، ملعون، وہابی اور وہ سبھی کچھ
ہے جو شریف لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔
ے علاوہ ان کے رسالے اور واعظین و مقررین آئے
جگہ اسی کمینی جارحیت کا ننگا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔
تقسیم کئے جاتے ہیں۔ کسی اشتعال انگیزی سے گریز
یا جاتا۔ تو کیا حافظ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اس مسلسل
و جارحیت کے دفاع میں عامر عثمانی اتنا بھی نہ کرے کہ
عوام کے سامنے حق اور باطل، سنت اور بدعت، توحید

اور شرک کے فرق کو قرآن و حدیث کی روشنی میں مصرح کرتا
رہے۔ کیا ظلم کا دفاع، شیطنت کا استیصال، حق کی وکالت
اور دین کی حمایت بھی تفرقہ اندازی ہے۔ کیا حافظ صاحب
سائبیریا کے کسی دور افتادہ کونے میں بستے ہیں جو انھیں اتنا
بھی پتا نہیں کہ جارح، ظالم، فتنہ پرداز اور تفرقہ انداز کون
ہے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ عامۃ المسلمین کی توحید شرک کی غذا
بنتی رہے، شریعت بدعات کے حلق میں اترتی رہے، اکابر امت
کو کافر و مرتد قرار دیا جاتا رہے اور عامر عثمانی اپنے بزرگوں کی
روش چھوڑ کر، اپنے ضمیر کو کچل کر ہونٹ سی لے انگلیاں توڑ
لے۔ اگر وہ یہی چاہتے ہیں تو انھیں سن لینا چاہئیے کہ جب تک
عامر کی انگلیوں میں قلم پکڑنے کی سکت اور جسم میں زندگی کی
رمق ہے ان شاء اللہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ اور اگر
وہ یہ نہیں چاہتے بلکہ واقعتاً انھیں اتحاد ملت کی تڑپ ہے
تو پھر شدت و غلو سے پرہیز کا وعظ انھیں اہل بدعت کو پلانا
چاہیئے، ہم نے اور ہمارے اکابرین نے تو ہمیشہ یہ چاہا اور
آج بھی چاہتے ہیں کہ فروعی اختلافات کو جنگ و جدل کا
رنگ نہ دیا جائے۔ ہر مکتبِ فکر شرافت کے دائرے میں رہے
اور اپنے اپنے معتقدات پر قائم رہتے ہوئے اسلامی اخوت و
مودۃ کو بڑھایا جائے۔ میلاد کرنے والے میلاد کریں مگر ان لوگوں
کے خلاف اشتعال و نفرت نہ پھیلائیں جو اس فعل کو پسند نہیں
کرتے۔ وہابیت اور بے دینی کے فتوے نہ دیں۔ مگر اس نہ
کریں۔ مگر بچھو کی خصلت کب بدلتی ہے جو اہل بدعت کی بدلیگی۔
وہ اپنی غیر منقطع جارحیت سے باز نہیں آ سکتے۔ تو ہم کیسے
اپنے فریضۂ دفاع سے باز آ سکتے ہیں۔ اگر حافظ صاحب میں ذرا
سی بھی انصاف پسندی ہو تو وہ ہمارا ظرف دیکھیں کہ ہم اپنے اکابر
کے لئے نام بہ نام گالیاں اور کفر و ارتداد کے فتوے سن کر بھی اہل
بدعت کے کسی بزرگ کو گالی نہیں دیتے۔ نام لیکر کافر و مشرک
نہیں کہتے، بلکہ جس طرح اللہ اور رسول ؐ نے اپنے ارشادات
میں صراحت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ فلاں فلاں افعال اور
فلاں فلاں عقائد معصیت و شرک ہیں اسی طرح ہم بھی عوام کو
متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ فلاں عقیدہ عقیدۂ شرک ہے اور فلاں

فعل فعلِ بدعت۔ جسے عاقبت برباد کرنی ہو وہ اہلِ بدعت کی پیروی کرے اور جسے عاقبت عزیز ہو وہ ہماری بےتعصبانہ رواداری سے گریزاں ہم نہیں عاشقانِ بدعت ہیں۔ زیادہ سمجھنی ہیں تو ان کی پکڑ دکر وہ شرم وحیا اور خوفِ آخرت سے بے بہا کر چلتی ہیں۔ اللھم حفظنا۔

کیا ہم مسلمان ہیں؟

(مدیر تجلی کے فکر انگیز پیش لفظ کیساتھ)

خدا، رسول، صحابہؓ اور صلحاءِ امت کی محبت میں ڈوبے ہوئے ایسے ایمان افروز، وجد انگیز اور عبرت آموز شہ پارے جن کے لفظ لفظ میں پیغام ہے، للکار ہے، تڑپ اور دلسوزی ہے ہو نہیں سکتا کہ آپ انھیں پڑھیں اور آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکیں دل میں ٹیس نہ اُٹھے۔

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا یہ خوبصورت مجموعہ چھپکر تیار ہے۔ عمدہ سفید کاغذ اور حسین ڈسٹ کور۔ مجلد سوا دو روپے

شمس نوید کے بے مثال مضامین کا یہ مجموعہ اس لائق ہے کہ آپ خود پڑھیئے اپنے دوستوں اپنی ماں بہنوں اور بہو بیٹیوں کو پڑھوائیے۔

سورۂ نور

سورۂ نور قرآن کی خاص الخاص سورتوں میں ہے جس میں ہر وقت کام آنے والے اخلاقی اصول نازل کئے گئے ہیں۔ اس کی تفسیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے مفسرین، محدثین ائمہ اور فقہاء کے ارشادات کی روشنی میں جس بالغ نظری کے ساتھ کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ہدیہ مجلد چار روپے۔

سنن ابن ماجہ (اردو)

صحاح ستہ کی مشہور کتاب۔ احادیث کا بہترین مجموعہ۔ ترجمہ مستند اور عمدہ۔ ہدیہ مجلد صرف بارہ ۱۲ روپے

خدا کا انعام

یہ انعام حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟
قیمت سوا روپیہ

الادب المفرد

امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ کی بیش بہا کتاب جس میں ہر دور اور ہر شخص کے کام آنے والی ہدایات پر مشتمل احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اردو مع عربی۔ کتابت طباعت عمدہ کاغذ گلیز۔ مجلد بارہ ۱۲ روپے۔

زبدۃ المناسک

حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب۔
مصنفہ:۔ استاد الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔
ہدیہ مجلد آٹھ روپے۔

آثارِ امام

امام ابو حنیفہؒ کے احوال و کوائف پر ایک اچھی کتاب۔
قیمت ڈھائی روپے

حیاتِ انور

اپنے وقت کے امام۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی مکمل سوانح۔ ان کے علمی کمالات ان کے بے مثال حافظے اور اوصافِ عالیہ کا تذکرہ۔ ان کے مخصوص تلامذہ کے محققانہ مقالات کے ساتھ۔

خدا مغفرت کرے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمایا تھا۔ "مولانا کو بطور استعارہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور شیخ عز الدین بن عبد السلامؒ کہا جا سکتا ہے۔" علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا تھا کہ "مولانا سمندر کے مانند تھے جو اوپر سے ساکن ہوتا ہے مگر اس کی گہرائیوں میں گرانقدر موتیوں کا خزانہ چھپا رہتا ہے۔" آپ بھی اسے پڑھیئے دوستوں کو بھی پڑھائیں۔ مجلد چار روپے

عامر عثمانی

فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ

ملازمین سرکاری ہوں یا غیر سرکاری۔ ان کی تنخواہ سے کچھ رقم کاٹ کر جمع کرتے جانا اور اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ رقم ملاتے جانا محکموں اور اداروں کا عام طریقہ ہے۔ اسے اصطلاح میں "فنڈ" کہتے ہیں اور فنڈ کے بارے میں تجلی اگست ۶۲ء میں سوال ۱ کا جواب دیتے ہوئے ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی' بلکہ یہ وصول ہو کر سال پورا کر لے تب زکوٰۃ دی جائے گی اور اسی ایک سال کی دی جائے گی۔ پچھلی مدت کی نہیں دی جائے گی۔

اس پر ماہنامہ "زندگی" (رامپور) کے فاضل مدیر مولانا سید احمد عروج قادری نے ۶ر اگست ۶۲ء کے گرامی نامے میں ازراہِ خلوص و محبت ہمیں بعض نکات کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اصولاً تو ہمیں ڈاک ہی سے ان کو جواب دینا چاہئے تھا لیکن فنڈ کا مسئلہ چونکہ عام ضرورت کا مسئلہ ہے اور جس طرح برادر موصوف کو اس باب میں شرح صدر نہیں ہو سکا ہے اسی طرح بہت سے اور لوگ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں' اس لئے ہم نے خط لکھ کر موصوف سے اجازت لے لی ہے کہ ان کے گرامی نامے پر تجلی ہی میں گفتگو کی جائے۔ ہمارا اگست کا جواب جسے مستحضر نہ ہو وہ اسے پھر پڑھ لے تاکہ بحث و نظر کے فہم میں آسانی ہو سائل شمس نوید عثمانی تھے۔ مدیر زندگی کے پیش فرمودہ نکات و ایرادات جوں کے توں درج ذیل ہیں۔

مدیر زندگی کے ارشادات

(۱) شمس صاحب نے سوال میں لکھا ہے۔ "وہ رقم ختم ملازمت کے بغیر ملازم کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی" آپ نے بھی جواب میں لکھا ہے کہ "جب تک فنڈ ملکیت میں نہیں آ جاتا" گویا آپ دونوں نے ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کیا ہے' حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ملکیت الگ شے ہے اور قبضہ الگ شے ہے۔ اُردو زبان میں بھی دونوں میں فرق کیا جاتا ہے اور جہاں تک قانونی اور فقہی زبان کا تعلق ہے دونوں میں بالیقین فرق ہے اور اس فرق پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ اگر فنڈ پر قبضے سے پہلے ملازم کی ملکیت ہی ثابت نہ ہو تو سرے سے زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) آپ نے لکھا ہے۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک فنڈ ملکیت میں نہیں آ جاتا اسے محکمے کے ذمے قرض ہی تصور ہی کیا جائیگا" آپ کے جواب کی اساس اسی فقرے پر قائم ہے۔ آپ نے جس قطعیت کے ساتھ یہ فقرہ لکھا ہے اسے پڑھ کر تعجب ہوا۔

پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے ملازمین کی جو رقم انکی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ ایک حصہ ملازم کی تنخواہ سے لیا جاتا ہے اور اسکے بقدر محکمے کی طرف سے ملا کر مجموعی رقم اس ملازم کے نام پر جمع کر دی جاتی ہے۔ اس کا کھاتہ الگ ہوتا ہے۔ حساب الگ ہوتا ہے۔ اس کے نام کی پاس بک ہوتی ہے۔ وہ رقم محکمے کے کسی افسر اعلیٰ کے پاس بھی نہیں رہتی' بلکہ ملازم کے نام پر بینک میں یا ڈاکخانے میں جمع کر دی جاتی ہے محکمے کے کسی شخص کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہوتا۔ خود ملازم کے سوا کسی دوسرے شخص کو اس فنڈ سے کوئی رقم بطور قرض بھی نہیں دی جا سکتی۔ ایک ایسی نوعیت کے فنڈ کو محکمے کے ذمہ

قرض سے کونسی مشابہت ہے ؟

اس کے علاوہ آپ نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ تنخواہ سے جو رقم کاٹی جاتی ہے محکمے کی طرف سے اس پر اتنا ہی اضافہ بھی کیا جاتا ہے اب اگر آپ تنخواہ سے لی ہوئی رقم کو قرض قرار دیتے ہیں تو یہ اضافہ ربا ہوگا اور مسلمان ملازم کے لئے اس کا لینا جائز نہیں رہے گا۔ چونکہ اس خط کی غرض آپ کو چند نکتوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لئے اس فنڈ کے سلسلے میں اپنی رائے درج نہیں کر رہا ہوں۔

(۳) آپ نے لفظ "قرض" کو لفظ "دَین" کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ قرض، دَین سے اخص ہے۔ دَین کا مترادف بالکل نہیں۔ قرض کے لئے فقہاء اپنی کتابوں میں علیحدہ فصلیں لکھتے ہیں اور بہت سارے احکام اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خود اس مسئلے میں فقہاء دَینِ قوی کی مثال میں قرض دیئے ہوئے مال کو پیش کرتے ہیں۔

(۴) اگر ملازم کے فنڈ کو بالفرض محکمے کے ذمہ قرض مان بھی لیا جائے تو یہ دَینِ قوی کی قسم میں داخل ہوگا۔

یہ چند سطریں شرعی مسئلہ ہونے کی وجہ سے اور اس خلوص کی وجہ سے بھی لکھی گئی ہیں جو ہمارے درمیان قائم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے غور کئے بغیر سرسری طور پر جواب لکھ دیا ہے۔ اللہ مجھے اور آپ کو سب کو معاف فرمائے۔ آمین۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔

آپ نے برہان کے اداریوں کا جو جواب لکھا ہے اسے پڑھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے آمین جولائی کے اداریئے کا جواب بھی انشاء اللہ خوب ہی ہوگا۔

سید احمد قادری

ہماری معروضات

ہم تہہ دل سے ممنون ہیں کہ ہمارے محترم دوست مولانا سید احمد عروج قادری صاحب نے اپنی دانست میں جس توجہ دہانی کو ضروری سمجھا اس پر مکتوب ارسال کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا یہ مکتوب ہمارے خیالات نہیں بدل سکا' لیکن آئندہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تنبیہ اور توجہ دہانی واقعۃً ہمارے لئے رہنما ثابت ہو اور ہم اپنے خیالات کی اصلاح کر سکیں۔ لہذا ہم گذارش کریں گے کہ اگر آئندہ بھی ہمارے کسی فتوے، کسی جواب کو وہ مبنی بر خطا سمجھیں تو توجہ دہانی کی زحمت ضرور گوارا فرمائیں اور اس اتفاقی صورتِ حال سے کبیدہ خاطر نہ ہوں کہ یہ موجودہ توجہ دہانی مفید ثابت نہیں ہو سکی۔ ویسے غور کیا جائے تو افادیت سے بالکل خالی بھی نہیں رہی۔ یہ افادیت ہی ہے کہ اس کے نتیجے میں فنڈ کی زکوٰۃ جیسے عام ضرورت کے مسئلہ پر مفصل اور جامع تصریحات کا موقع نکل آیا۔

اب ہم علی الترتیب جملہ نکات پر اظہار خیال کرتے ہیں:۔

(۱) ہم بھی ملکیت اور قبضے کے فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں لیکن آپ کو شاید یہ مستحضر نہیں رہا کہ وجوبِ زکوٰۃ میں محض ایسی ملکیت کافی نہیں جسے جزوی حیثیت سے ملکیت کہا جا سکے بلکہ ایسی ملکیت ضروری ہے جس پر ملکیت تامہ کا اطلاق ہو سکے۔

کتبِ فقہ ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں شروطِ زکوٰۃ کے خانے میں آپ کو الملك التّام کی شرط بھی ملے گی اور ملک تام کی تصریح احناف جو کچھ کرتے ہیں وہ یہ ہے:۔

الحنفیۃ قالوا الملك التام ان یکون المال مملوکاً فی الید فلو ملك شیئاً لم یقبضہ فلا تجب فیہ الزکوٰۃ	حنفیہ کہتے ہیں ملک تام یہ ہے کہ مال اپنے ہاتھ میں مملوک ہو۔ پس اگر ایک شخص کسی چیز کا مالک بنا مگر اس پر قبضہ نہ پا سکا تو اس مال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
+ + + +	

اس سے ظاہر ہوگیا کہ ملکیت کو قبضے کے معنی میں استعمال کر کے ہم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے، بلکہ یہ تو احناف کا مسلّم مسلک ہے۔ اس مسلک کی پاسداری یہاں تک کی گئی ہے کہ عبدِ مکاتب[۵] کے مال کو بھی زکوٰۃ سے مبرّیٰ مانا گیا' حالانکہ وہ مال بظاہر اس کی ملکیت بھی ہوتا ہے اور قبضے میں بھی۔ بس اتنی سی بات زکوٰۃ سے بری ہونے کے لئے کافی سمجھی گئی کہ اس کی مالکانہ استعداد میں اعتباری نوع کا ضعف ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں:۔

الملك التام ھو ان یکون	ملک تام وہ ہے کہ مالک اپنی مملوکہ

۵ وہ غلام جس کے مالک نے کہا ہو کہ اتنا مال ہمیں دیدو تو تم آزاد ہو جاؤ گے ۱۲

الشخص صاحب التصرف فیما ملك۔	شے میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف میں آزاد ہو۔
حنابلہ کہتے ہیں:۔	
الملك التام هو ان یکون المال بیده لم یتعلق به حقٌ للغیر ویتصرف فیه علی حسب اختیارہ وفوائدہ له لا لغیرہ۔	مِلک تام وہ ہے کہ جو شے بطور ملکیت ہاتھ میں آئی اس سے کسی اور کا حق متعلق نہ ہو اور مالک اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا مختار ہو اور اسکے فائدے اسی کے لئے ہوں نہ کہ کسی اور کے لئے۔

+ + + +

شوافع بھی مِلک تام کو وجوب زکوٰۃ کی شرط مانتے ہیں اور ان کی کوئی تصریح ہماری نظر سے ایسی نہیں گذری جس میں انھوں نے قبضے کو مِلک تام کی تعریف سے خارج کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ احناف ہی نہیں چاروں مکاتبِ فقہیہ نے قبضے اور تصرف کے کلی اختیار کو وجوب زکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے زکوٰۃ کی بحث میں لفظِ ملکیت کو ملکیتِ تامّہ کے معنی میں بول کر غلطی نہیں کی، بلکہ خود آنجناب یہ گمان کرنے میں جلدی کر گئے ہیں کہ قبضے سے محروم ملکیت یعنی ملکیتِ ناقصہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مؤثر ہو سکتی ہے۔۔ المعروف کالمشروط فقہ کا معروف قاعدہ ہے۔ جب وجوب زکوٰۃ کے باب میں جملہ فقہاء کے نزدیک ملکیت کے ساتھ تامّہ کی قید لگی ہوئی ہے تو جب بھی اس بحث میں ملکیت کا انکار کیا جائے گا وہ ملکیتِ تامّہ کا انکار ہوگا نہ کہ مجرد ملکیت کا۔ اسی لئے ہم نے ملکیت میں آنے سے مراد قبضے میں آنا لیا ہے۔ ہمیں اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ملکیتِ تامّہ کے بغیر زکوٰۃ کا وجوب نہیں ہوتا اور ملکیت تامہ بغیر قبضے کے متصور نہیں۔ فھو المراد۔

(۲) فنڈ کی جو تفصیل آپ نے تحریر فرمائی ہے وہ ہمارے بھی علم میں ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم فنڈ کی رقم مالک ہی کے نام پر بالکل الگ جمع کرتے رہنے کا سسٹم ہر ادارے میں نہیں ہے اور سرکاری اداروں میں بھی غالباً اب چلا ہے پہلے ہمہ گیر پیمانے پر نہیں تھا، لیکن اس سے بھی زکوٰۃ کے واجب نہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بحالت موجودہ بھی محکمہ کے ذمہ قرض کیسے رہی اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دیں کہ جو رقم محکمے کی طرف سے ملائی جاتی ہے اسکی حیثیت عطیے اور ہبہ کی ہے اور ہبہ میں قبضے کے بغیر ملکیت ۔۔۔ کم ۔۔۔ اسلامی قانون میں تسلیم نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس حصہ کو "قرض" نہ بھی مانیں تو اس پر عدم ملکیت کے باعث زکوٰۃ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

رہا یہ معارضہ کہ فنڈ کو قرض قرار دیں تو محکمہ کی دی ہوئی رقم ربوٰ بن جائیگی تو یہ ربوٰا اور ہبہ میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ربوٰا (سود) کے طور پر جو رقم فنڈ میں بڑھتی ہے وہ فنڈ کی کل رقم کے علاوہ ہوتی ہے۔ یعنی ملازم کی اپنی رقم اور محکمے کی ہبہ کردہ رقم دونوں کو راس المال قرار دے کر اس پر سود دیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ محکمہ ملازم کی اصل رقم پر بطور سود اتنا ہی اضافہ کرتا ہو۔ ربوٰا کی حقیقت پر غور کیجئے تو التباس مٹ جائے گا۔ ربوٰا میں راس المال جوں کا توں رہے جاتے تب بھی مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ سودی رقم بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔ محکمہ جتنی رقم ملازم کی کاٹتا ہے اتنی ہی اپنی طرف سے ہبہ کرتا ہے۔ مجموعہ ظاہر ہے ہر ماہ بڑھتا ہی جائے گا مگر محکمے کی طرف سے دی جانے والی رقم اس مجموعے کے تناسب سے زائد ہوتی نہیں چلی جاتی، بلکہ متعینہ رقم ہی جمع کی جاتی ہے۔ ہاں سود ضرور مجموعے کے اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جائے گا اور اس کا نام حکومت نے سود ہی رکھا ہے نہ کہ کچھ اور۔

حاصل یہ کہ جو رقم خود ملازم کی تنخواہ سے کٹتی ہے تنہا وہی قرض نہیں کہ محکمہ کی دی ہوئی رقم کو ربوٰا کے مشابہ جانیں بلکہ دونوں کی رقموں کا مجموعہ قرض ہے اور ربوٰا صرف وہ ہے جو سود کے نام سے بینک اس مجموعے پر دے گا۔

(۳) گفتگو اگر عربی میں ہو رہی ہو تو بے شک اُس لطیف فرق کا لحاظ رکھا جائے گا جو دَین اور قرض کے مابین ہے لیکن اُردو میں یہ دونوں لفظ یکساں مفہوم میں مستعمل ہیں اور یہ استعمال محض عوام کا نہیں، بلکہ بڑے بڑے مفتیوں کے یہاں ملتا ہے آپ کوئی سا بھی اُردو کا مجموعۂ فتاویٰ اُٹھا کر دیکھ لیجئے آپکو مل جائے گا کہ سوائے ایسے خاص مواقع کے جہاں اس لطیف

... ہی زبان میں یوں سمجھئے کہ جہاں اس فرق پر کوئی خاص مسئلہ متفرع کرنا ہو وہاں تو دَین اور قرض کے فرق کا ذکر آئے گا ورنہ یہ دونوں لفظ ایک ہی مفہوم میں استعمال کئے گئے ہوں گے۔ مثالیں ہم اس لئے نہیں دیتے کہ اس سے طول ہوگا۔ اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو تو ایک نہیں دس مثالیں بہ ادنیٰ تامل نقل کی جاسکتی ہیں۔

رہا عام اردو استعمال تو یہ بھی محتاج ثبوت نہیں مثلاً ایک دوکاندار کہتا ہے کہ زید پر سال بھر سے میرے دو سَو روپے قرض ہیں۔ اس نے کپڑا خریدا تھا۔ اب بتائیے کیا کبھی کسی عالم یا فقیہ یا کسی بھی آدمی نے اس دوکاندار کو یہ الزام دیا ہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے تیرا قرض کہاں دَین چاہئے۔ حالانکہ لطیف فقہی تعریف کے اعتبار سے کپڑے کی واجب قیمت قرض نہیں ہے "دَین" ہے۔ قرض تو صرف اُس شے کا نام ہے جو لی گئی۔ ایک شخص پر متعدد دوکانوں کا اُدھار چڑھ جاتا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بازار کا مقروض ہے۔ اگر اصطلاحِ فقہ کے فرق کا لحاظ کیا جائے تو یہ کہنا غیر صحیح ہوگا کیوں کہ اس کے اعتبار سے تو یہ مدیون ہے مقروض نہیں مگر اُردو بول چال میں اس فرق کا تصور تو کیا ہوتا اس کا علم بھی شاذ ہی لوگوں کو ہوگا اُردو میں دَین، قرض، اُدھار تینوں ایک ہی مفہوم میں بولے جاتے ہیں اور ہمیں یہ مان لینے میں کوئی عار نہیں ہے کہ دَین اور قرض کے لطیف فرق سے باخبر ہونے کے باوجود ہم نے اپنے زیرِ بحث جواب میں ان لفظوں کو بطورِ مرادف ہی استعمال کیا ہے۔ آپ نے فقہی فرق کی طرف توجہ دلائی اس کا شکریہ، لیکن اس فرق سے زیرِ بحث مسئلہ میں کیا فرق پڑا یہ ہماری ناقص فہم میں بالکل نہیں آیا نہ ہم آپ کے اس جملے کا مطلب سمجھ سکے کہ:۔

"خود اسی مسئلہ میں فقہاء دینِ قوی کی مثال میں قرض دیئے ہوئے مال کو پیش کرتے ہیں۔"

"خود اسی مسئلہ" کا مطلب تو یہ ہوا کہ فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلے میں۔ ہمیں بتائیے کہ اس مسئلہ میں کس معروف فقیہہ نے "دَینِ قوی" کا قول کرکے زکوٰۃ کا اثبات کیا ہے۔

(۴) آپ جو فنڈ کے روپے کو قرض تسلیم کرنے کی صورت میں اسے "دَینِ قوی" قرار دے رہے ہیں اس کے لئے آخر کیا دلیل ہے۔

دَینِ قوی کی جو تعریف ہم نے کتبِ فقہ میں پڑھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"نقد روپیہ کسی کو اُدھار دیں یا مالِ تجارت اُدھار بیچیں اور مقروض اپنے مقروض ہونے کا معترف بھی ہو تو اسے "دَینِ قوی" کہتے ہیں۔"

آپ ہمیں بتائیں کہ فنڈ کا روپیہ کیا ملازم اپنی جیب سے نکال کر محکمے کو دیتا ہے؟ کیا یہ صورت کہیں ہوتی ہے کہ تنخواہ ملازم کو ادا کر دی گئی اور اس کے بعد اس نے اس میں سے کچھ حصہ بخوشی محکمے کے پاس جمع کرا دیا؟ —— اگر ایسا ہو تب تو "دینِ قوی" کی صورت پیدا ہوتی ہے لیکن ایسا نہ ہو —— اور یقیناً ایسا نہیں ہوتا تو دَینِ قوی یہ کیسے ہو جائے گا جب کہ نہ تو اس روپے پر ایک سکنڈ کے لئے بھی ملازم کو ملکیتِ تامہ حاصل ہوئی نہ اسے اختیار حاصل ہوا کہ جمع کرائے یا نہ کرائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تنخواہ کسی مالِ تجارت کا معاوضہ نہیں ہوتی خدمت کا عوض ہوتی ہے اور مردِ آزاد (شرعی اصطلاح میں) کی خدمت کو فقہاء "مال" نہیں مانتے پھر کیونکر اسے "دَینِ قوی" کہہ سکیں گے۔ ہمارا خیال ہے فنڈ کی رقم کو "دینِ قوی" کی قسم میں داخل کرتے ہوئے آپ نے محض بے فکری سے کام لیا ہے اور اس تحقیق کی زحمت نہیں فرمائی ہے کہ فقہاء کی اصطلاح میں "دینِ قوی" کس چیز کا نام ہے۔ ہمیں ایک فقیہہ بتائیے جس نے مردِ آزاد کی خدمت کو مالِ تجارت مانا ہو۔ اگر نہیں مانا تو ایسا کوئی فقیہہ بتائیے جس نے نقد اور مالِ تجارت کی قیمت کے علاوہ بھی کسی دَین کو "دینِ قوی" کہا ہو۔ اگر نہیں کہا تو پھر کن فقہی بنیادوں پر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فنڈ کو قرض تسلیم کرلینے کی صورت میں یہ دینِ قوی کی قسم میں داخل ہوگا۔

ہاں اگر آپ ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے اس قول پر صاد کرنا چاہیں کہ ہر دَین دینِ قوی ہی ہوتا ہے اور اس پر قبل القبض زکوٰۃ ضرور واجب ہوتی ہے تب الگ معاملہ ہے۔ لیکن حنفیہ کا سوادِ اعظم تو اس پر صاد نہیں کرتا بلکہ وہ اس باب میں قولِ ابوحنیفہؒ ہی کو مفتیٰ بہ اور عدل و عقل کے زیادہ قریب مانتا ہے جس میں دَین کو مختلف اقسام میں منقسم کرکے ان کی زکوٰۃ کے احکام میں فرق کیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ فرق ہی انصاف، معقولیت اور شریعت کی

اسپرٹ کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے۔

آپ کی پیش فرمودہ چاروں شقوں کی گفتگو تمام ہوئی۔ اب ہم اپنے موقف کی تائید میں دو مضبوط شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی شہادت مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا اشرف علیؒ کا وہ فتویٰ ہے جسے امداد الفتاویٰ جلد دوم کے اختتام پر ضمیمے کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ صورت یہ تھی کہ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کے دو فتوے فنڈ کے بارے میں مفتی صاحب موصوف کی نظر سے گذرے جو متضاد تھے۔ موصوف نے حکیم الامت کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ حکیم الامۃ پر خدا کی رحمتیں ہوں، دین کے معاملے میں ان جیسا بے نفس اور اخلاص کیش متاخرین میں مشکل ہی سے ملے گا۔ ان کا عالم یہ تھا کہ ایک معمولی طالب علم بھی ان کے کسی فتوے پر معترض ہو یا کسی سہو کی نشاندھی کرے تو وہ اللہ کے بندے نہ برا مانتے تھے نہ زبردستی تاویل کی کوشش کرتے تھے بلکہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ یا تو اعتراض کا معقول جواب دیدیا کرتے تھے یا پھر اعترافِ قصور کر کے تصحیح فرما دیا کرتے تھے۔ ان کے متعدد رجوعات ان کی کسر نفسی اور اخلاص فی الدین کے روشن مینار ہیں۔

مفتی صاحب موصوف کی توجہ دہانی پر انھوں نے حاضر الوقت علماء کو فنڈ کی زکوٰۃ کے مسئلہ پر غور و فکر کرنے کا ایما فرمایا۔ اس ایما کی تعمیل ہوئی اور غور و فکر کے نتیجے کو مفتی محمد شفیع صاحب نے مفصل تحریر کی شکل میں حکیم الامۃ کی خدمت میں پیش کر دیا اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ فنڈ کا روپیہ دَینِ ضعیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے دینِ متوسط تک لا سکتے ہیں۔ دینِ قوی ہرگز نہیں۔ لہٰذا اصح روایات کے مطابق اس پر زکوٰۃ کا وجوب قبضہ ملنے اور سال گذر جانے کے بعد ہی ہوگا۔ گذشتہ زمانے کی زکوٰۃ نہیں واجب ہوگی اس تحریر پر حکیم الامۃ تصدیقاً لکھتے ہیں کہ:-

"آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے لہٰذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں اور اس کے خلاف سے رجوع کرتا ہوں۔"

ہم ماہ گذشتہ عرض کر چکے ہیں کہ فقہی مسائل میں ہماری فنی نیازمندیوں کو مولانا اشرف علیؒ سے زیادہ مناسبت ہے لہٰذا ہمارے لئے تو مذکورہ فتویٰ اور مولانا کی تصدیق کافی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ اسے اہمیت نہ دیں پھر بھی یہ تو ماننا ہی پڑیگا کہ فنڈ کو محکمہ کے ذمے قرض قرار دینے پر آپ نے جو تعجب ظاہر کیا ہے اس کا ہدف ہم جیسا کم علم ہی نہیں مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا اشرف علیؒ جیسے اکابر بھی بنتے ہیں۔ انھوں نے ہماری ہی جیسی قطعیت کے ساتھ اسے دَین مانا ہے اور پھر اسے "دَینِ ضعیف" کی قسم میں شمار کیا ہے۔

دوسری شہادت فتاویٰ دارالعلوم جلد سوم کتاب الزکوٰۃ میں ملاحظہ ہو۔ سائل نے فنڈ کے روپے کی پوری تفصیل دیتے ہوئے وجوبِ زکوٰۃ کا سوال کیا تھا۔ مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰنؒ نے حدیث، آثار اور ملا علی قاری کی شرح نقایہ سے دلیل پکڑتے ہوئے صراحت کے ساتھ فتویٰ دیا کہ:-

"ہر سہ رقم وصول ہوجانے کے بعد جولان حول ہونے کے بعد زکوٰۃ دینا واجب ہوگا۔ سنین ماضیہ (گذشتہ سالوں) کی زکوٰۃ کسی رقم کی بھی لازم نہ ہوگی۔"

"ہر سہ رقم" سے مراد یہ ہے کہ ایک وہ رقم جو ملازم کی اپنی تنخواہ میں سے کٹی۔ دوسری وہ رقم جو محکمہ نے اپنی طرف سے ملائی۔ تیسری وہ رقم جو ختم ملازمت پر محکمہ بطور انعام دے گا بشرطیکہ ملازم کا ریکارڈ اس قابل ہوا۔

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ سائل نے یہ توضیح کر دی تھی کہ تنخواہ سے کاٹی ہوئی رقم ملازم ہی کے نام پر بینک میں جمع کر دی جاتی ہے اور اس کا نفع بھی اسی کے نام پر درج ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مفتی صاحب تینوں نوعیت کی رقموں پر زکوٰۃ نہ واجب ہونے وہی حکم لگا رہے ہیں جو ہم لگا چکے ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ ان شہادتوں کے بعد ہم مقلدین کیلئے نزاع و اختلاف کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ لیکن آپ اگر تقلید کو پسند نہ کریں تب بھی ہم جتنا کچھ عرض کر آئے ہیں وہ آزادانہ

بحث کی سطح پر ہمارے موقف کی تائید کے لئے کافی ہے۔ ہاں چند ایسے اشتباہات کو دور کرنا ابھی ہمارے ذمے باقی ہے جن سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں تو یہ بوجھ بھی ہم اُتارے دیتے ہیں۔

ایک اشتباہ عقلی گھوڑے دوڑانے والوں کو یہ ہوتا ہے کہ اگر فنڈ میں من مانے تصرف کا اختیار نہ ہونا وجوبِ زکوٰۃ میں مانع ہے تو پھر بینک میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس میں بھی زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے کیونکہ تصرف کی آزادی وہاں بھی کسی نہ کسی درجے میں مقید ہو جاتی ہے مثلاً حساب کی وہ مد جس میں تمام رقم بیک وقت نہیں نکالی جاسکتی، بلکہ ہفتے وار معین مقدار میں نکالی جاسکتی ہے ــــ (Current Account) کامل تصرف میں حائل ہے۔ یا حساب کی وہ مد بھی جس میں ہر وقت کُل رقم نکالی جاسکتی ہے (Demand Deposit) اس حد تک تو کامل تصرف میں مانع ہے ہی کہ بینک کے اوقاتِ کار کے علاوہ یا تعطیل کے دنوں میں یہ نہیں مل سکتی۔

اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ حساب کی مد کوئی سی ہو لیکن جمع کرنے سے قبل جمع کرنے والا اس رقم کا پورا مالک تھا یعنی یہ اسکے قبضے میں بھی تھی اور اس پر ہر طرح کا حقِ تصرف بھی اسے حاصل تھا۔ بینک میں جمع کرنا نہ کرنا بھی اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ لہٰذا جمع کرنے کے بعد جو بھی قیود عائد ہوئی ہیں وہ اس نے اپنی مرضی ہی سے قبول کی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آپ اپنا روپیہ تالے میں رکھ دیں تو اس کو صَرف میں لانا بھی اس قید سے ضرور مقید ہو جائے گا کہ چابی قفل میں گھمائیے اور تالا کھولئے تب روپیہ استعمال کیجئے۔ بینک کی چھٹی کے اوقات و ایام میں روپیہ نہ ملنے کی مجبوری ایسی ہی مجبوری ہے جیسے آپ گھر کے بکس میں روپیہ رکھ کر ہزار میل سفر کو چلے جائیں تو ظاہر ہے وہاں بیٹھ کر آپ اس روپے میں کوئی تصرف نہیں کر سکیں گے اور اختیارِ تصرف کا استعمال واپسی ہی پر منحصر ہوگا۔

فنڈ کے روپے اور بینک میں جمع کردہ روپے کا بنیادی فرق یہی ہے کہ فنڈ کے روپے پر آپ کو ایک منٹ کیلئے بھی ملکیتِ تامہ حاصل نہیں ہوئی۔ جو رقم آپ ہی کی تنخواہ سے کاٹی گئی ہے وہ بھی ایسی نہیں تھی کہ پہلے آپکے ہاتھ میں دیدی گئی ہو اور پھر آپ کو کامل اختیار حاصل رہا ہو کہ جمع کرائیں یا نہ کرائیں۔ گویا ملکیت تامہ بھی نہ اور اجبار بھی موجود۔ اس کے برخلاف بینک میں جو رقم آپ جمع کرتے ہیں وہ آپ کی مکمل طور پر مملوک بھی تھی اور بینک والوں کی طرف سے جبر بھی نہیں کیا گیا تھا کہ داخل ہی کیجئے۔ فلہٰذا زکوٰۃ کے معاملہ میں دونوں مساوی کیسے ہو سکتی ہیں جب کہ اجبار اور ملکیتِ ناقصہ دونوں ہی وجوبِ زکوٰۃ کے موانعات میں سے ہیں۔

ایک اشتباہ یہ ہوتا ہے کہ مالِ تجارت کے بدلے جو رقم ہمارے دوسروں پر چاہئے اس میں بھی تو ہمیں وصول سے قبل تصرف کا اختیار نہیں ہوتا۔ نہ ہم اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں پھر اس میں کیوں زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر اختیارِ تصرف کے فقدان کے باوجود اس میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے تو فنڈ کو بھی اسی پر کیوں نہ قیاس کرلیں۔

اس اشتباہ کا جواب بھی متذکرہ جواب میں موجود ہے۔ جو مال آپ نے بیچا اس پر آپ کو ملکیتِ تامہ حاصل تھی۔ آپ نے اپنی مرضی اور اختیار سے اسے قرض بیچا۔ لہٰذا وصول ہونے تک قدرتِ تصرف سے محرومی آپ نے اپنی مرضی سے گوارا کی ہے اجبار و زبردستی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آپ نقد روپیہ کسی کو قرض دیدیں تو وصول ہونے کے بعد اس پر گذشتہ زمانے کی زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ جتنے دنوں یہ مقروض کے پاس رہا آپ کی مرضی سے رہا آپ چاہتے تو قرض نہ دیتے۔ دیدیا تو حقِ تصرف کی محرومی آپنے خود قبول کی ـــ مگر فنڈ کے روپے میں یہ بات کہاں۔ آپ نہ چاہیں جب بھی وہ کٹے گا۔ آپ کو اس پر ایک پل کے لئے قبضہ نصیب نہیں ہوا۔

ان دو اشتباہات کی تنقیح کے بعد مزید استقراء کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی آپ کوئی بھی مسئلہ لیں اس میں دیکھنا یہی ہوگا کہ ملکیت تامہ کی شرط پائی گئی یا نہیں اور جبر کا تو کوئی قضیہ بیچ میں نہیں آیا۔ اگر جبر بھی نہیں اور ملکیت بھی تام ہے تو بے شک زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ لیکن جبر ہے یا ملکیت ناقص ہے تو زکوٰۃ کا وجوب اصولِ شرعیہ کے خلاف ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مختلف شہروں میں دُرِّ نجف کے ایجنٹ

دارالفیض رحمانی سے براہِ راست منگانے کے عوض اگر آپ دُرِّ نجف اپنے یہاں کے ایجنٹ سے خریدینگے تو ڈاک خرچ کی بچت ہو جائے گی، کیونکہ وہ آپ کو ہماری مشتہرہ ہی قیمتوں پر بلا اضافۂ قیمت کے دے گا اور اُس سے آپ ۳ ماشے والی شیشی بھی (قیمتی ڈیڑھ روپیہ) حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کے شہر میں کوئی ایجنٹ نہ ہو تو کسی بھی دوکاندار یا کاروباری آدمی کو ایجنسی لینے پر آمادہ کیجئے۔ دُرِّ نجف اب ایسی چیز نہیں رہی کہ یہ کسی کے پاس پڑی رہ جائے۔ ادارہ ایجنسیوں کو وقتاً فوقتاً اشتہارات بھی مہیا کرتا ہے۔

● محمد علی صاحب لکھنوی۔ تاجر عطر متصل مچھلی کمان۔ پوسٹ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ● سلطان احمد خاں جنرل کیپ میکر ۲ مسیح لائن۔ بمبئی ۸ ● افضل جنرل اسٹور، کتاب گھر۔ ہنمکنڈہ ورنگل دکن ● مفید عام دوا خانہ۔ بچھی۔ رام گڑھوا۔ چمپارن ● حا غلام رسول۔ عربیہ مدرسہ۔ دبیر۔ چکلی۔ بلڈانہ ● عبد الحمید عزیزی ۱۴۵ کیشب چندرسین۔ اسٹریٹ کلکتہ ● سید محمد یونس رحمانی۔ جل کوڑہ۔ مونگیر۔ (بہار) ● بابا اینڈ کمپنی۔ سدی پیٹھ۔ میدک (آندھرا پردیش) ● محمد شمیم الاسلام۔ پروفیشنل اسٹیشن مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ ● سید عبد الغفار صاحب۔ منیجر جمہور لائبریری میمن پورہ۔ گلبرگہ دکن ● حکیم حافظ مختار احمد ڈاکخانہ نرور۔ شیوپور۔ گوالیار ● عثمانیہ بکڈپو ۱۰۴ لور چیت پور روڈ۔ کلکتہ ● محمد معین الدین کرانہ مرچنٹ۔ بچیر۔ مونگیر (بہار) ● ڈاکٹر مہدی حسن صاحب بصری۔ ہومیوکیمسٹ لکھمنیہ بازار (بہار) ● مولانا امام الدین تاجر عطر۔ کچی مسجد۔ اکولہ۔ برار ● محمد نعمان صدیقی صاحب کوسیارہ۔ پلامون (بہار) ● محمد امیر الدین خاں بریاتو۔ رانچی (بہار) ● منیجر آزاد بکڈپو۔ نزد بس اسٹینڈ۔ ہندو پور۔ (آندھرا پردیش) ● حاجی مولوی سرفراز خاں معرفت ایس۔ ایس قیوم اسٹیشن بازار۔ تانڈور۔ حیدرآباد دکن ● مولوی بشیر احمد۔ ایجنسی ہمدرد دواخانہ۔ مئوناتھ بھنجن۔ اعظم گڑھ ● حاجی رحمت اللہ صاحب جنرل مرچنٹ۔ چوک سلطانپور (یو۔پی) ● عبد العزیز شیخ۔ حکیم اسٹریٹ۔ پرانا بس اسٹینڈ۔ مالیگاؤں۔ ناسک ● سمیع الدین رشیدی۔ کتبخانہ چترا۔ ہزاری باغ (بہار) ● نظام اسٹور، جمہوریہ بازار بردوان۔ بنگال ● نور الاسلام۔ ایکس ڈرافٹ مین میونسپل آفس۔ مونگیر (بہار) ● غلام حسین محمد بھائی گھی والا۔ محلہ ڈبگر واڑ۔ بھروچ (گجرات) ● ایچ۔ این۔ اینڈ سنز اسپورٹس ڈیلر۔ نظام آباد دکن ● شہاب الدین تہا گجرات کرانہ اسٹور ۳-۸-۳۴ نزد بالکیا میل میٹھی پور روڈ۔ احمد آباد ۲ ● حاجی افسر محمد اطہر اینڈ کو۔ شارٹنگ و بیڈ سیٹ مرچنٹ۔ پینٹ پور۔ سیتاپور (یو۔پی) ● راجہ مولی اینڈ سنز جنرل مرچنٹ۔ سر پور۔ کاغذ نگر (سی ریلوے) ● محمد کیور۔ محلہ ٹیلا۔ میدان روڈ۔ سیوہارہ۔ بجنور ● الہلال میڈیکل ہال ۵۳۲ اٹالہ الہ آباد ● محمد سلیمان صاحب۔ ہٹاتی ہاٹ۔ جوگبانی۔ پورنیہ (بہار) ● ندیم بکڈپو ● قسیم الحق صاحب تاجر موتی پور ضلع مظفر پور (بہار) ● حافظ علی صاحب ڈبلو۔ اے۔ او۔ ایس۔ آفیسر۔ ایسٹرن ریلوے جمالپور ضلع مونگیر (بہار) ● ایجنسی ہمدم دواخانہ مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ ● محمد نظام الدین صاحب جموریا ہاٹ (نظام اسٹیٹ) ● صدیقی اسٹور، اسٹاکسٹ ہمدرد دواخانہ سیوہارہ بجنور ● فیض الباری صاحب۔ کلاتھ مرچنٹ ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔ ● محمد سلیمان معرفت میسرز ظہیر علی صاحب۔ ایسٹ بازار کریم گنج۔ کچھار (آسام) ● کرشن گوپال صاحب اسٹور کیپر۔ آفس این ریلوے بیکانیر۔ راجستھان ● مولوی عبد الجلیل صاحب۔ مقام ہیونا ہیڈگلی بلاری (میسور) ● شیخ حسین عبد اللہ صاحب سبزی منڈی نندوربار دھولیہ

چھوٹا ملا ابن العرب مکی

تقیّہ

اب اُجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

۲ نومبر ۶۲ء کے الجمعیۃ میں ایک خبر کا عنوان دیکھکر فدوی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

" انجمن ترقی اردو کی جے پور کانفرنس ملتوی کردیگئی"

آپ ناک مُنھ بنا رہے ہیں کہ بھلا اس عنوان میں دل کو دھک دھکانیوالی کونسی بات ہے۔ ذرا صبر کیجئے پوری خبر پڑھ لیجئے پھر انشاء اللہ آپکے قلب کو بھی دھک دھک کرنے کی توفیق میسّر آسکے گی۔

"چونکہ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کردیا گیا ہے اور اس وقت ہم سب کا فرض ہے کہ دوسرے مسائل کو ملتوی کرکے پوری توجہ قومی دفاع پر لگادیں اسلئے انجمن ترقی اردو ھند کی کُل ہند اردو کانفرنس جو ۲۴، ۲۵ نومبر ۶۲ء کو جے پور میں ہونے والی تھی ملتوی کردیگئی

آل احمد سرور (جنرل سیکریٹری)"

کہئے اب بھی کلیجہ دھڑکا یا نہیں؟

نہیں دھڑکا۔ دھڑکے کیسے آپ بھی تو اُسی بھولی بھالی حکومت کی رعایا ہیں جس نے بسبب اپنی معصومیت کے دوپہر کے بارہ بجے تک یہ خواب دیکھا تھا کہ چین ہمارا بھائی ہے حالانکہ خوابوں کی سہانی رات کا سویرا اُسی وقت طلوع ہوچکا تھا جب اس بھائی نے تبت کے سینے میں چھ انچ لمبا خنجر اتار دیا تھا۔ پھر جو کچھ کار ہا سہا کہر اُس سرخ آندھی نے چھانٹ دیا تھا جو ہمالہ کا سینہ چیر کر بھارت کی مقدس فضا میں سرخ سویرا بکھیرتی دندناتی اور اینڈتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب بھی معصوموں کا طلسم خواب نہیں ٹوٹا۔ ٹوٹا تو اس وقت ٹوٹا جب دیو استبداد کی ضربت کاری سے بھارت ماتا کی چھاتی سے دودھ کے عوض خون کا فوارہ اُبل پڑا۔

آپ بھی اپنے خداوندانِ نعمت کے نقشِ قدم پر چل کر جاگتے میں بہت سے خواب دیکھ رہے ہیں ایک خواب یہ بھی ہے کہ آج کی انجمن ترقی اردو ایک وطن دوست بھولی بھالی جماعت ہے جس کا مشن صرف اردو کی خدمت ہے آپ کے اس خواب میں بفضلہ تعالیٰ حکومت بھی شریک ہے نہ شریک ہوتی تو اب تک وہ اتنی مزاج پُرسی اس کی ضرور کرچکی ہوتی جتنی کہ کی ہے اُس نے مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اور صفائی کرتی اُس میں سے اُن افراد کی جو موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں بھارت کے قومی خزانے سے مگر گُن گاتے ہیں چین کے۔ عقیدہ سے پڑھتے ہیں کمیونزم کے اور دعوت دیتے ہیں چین اور روس کو قبضہ کرنے کی بھارت پر دعوت بالکل صاف اور برملا۔

اب شاید آپ اختلاج قلب کے لئے پَر تول رہے ہوں گے ایک منٹ اور صبر کیجئے ظاہر میں تو بڑی قوم پرورانہ خبر ہے کہ بچاری انجمن نے ملک و وطن کی خاطر اپنا اجلاس تک ملتوی کردیا لیکن غور کیجئے کہیں ایسا تو نہیں کہ " قومی دفاع " کا لفظ خاص کمیونسٹوں کی اصطلاح میں بولا گیا ہو اور " قوم " سے مراد بھارتی جنتا نہیں بلکہ ملت کا مریڈیہ ہو۔ ایسی صورت میں اس خبر کا باریک مفاد اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کے کمیونسٹ نواز سپوت اب اندر ہی اندر اپنی محلہ آور قوم کی مدد کے زیر زمین منصوبوں پر غور فرمائیں گے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس مُلّا مردود کے گال پر چانٹا رسید کرنا چاہیئے یہ وطن دوستی کے اعلانوں سے غداری و بغاوت کے ناپاک معنی نکالتا ہے۔ چلئے آپ چانٹا بھی مار لیجئے بلکہ قابو چل جائے تو عاجز کو جیل بھی بھجوا دیجئے مگر یہ سوال حقیر فقیر آپ سے ضرور کرے گا کہ آخر اُس ادارے کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے جو عین اُس وقت جب چین کا کمیونی دیو ہمارے دیش پر بھرپور حملہ کرنے والا تھا۔ اور بھارت کی سیکڑوں میل زمین پر اپنے جھنڈے گاڑ چکا تھا "سخن مختصر" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کرتا ہے اور اس مجموعے میں سفید کاغذ پر کالی روشنائی سے صاف صاف یہ شعر چھاپتا ہے۔

ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں
ادھر بھی ایک نظر اے نگارِ خطّہ چیں

اس شعر کی تفسیر ایک کمیونسٹ بزرگ نے تو یہ کی کہ "خطّہ چیں" دراصل شاعر کی مارواڑی محبوبہ کا نام ہے یہ بالکل غلط ہے کہ اس نے ملک چین سے خطاب کیا ہے چین کے پیٹ میں تو ایک نقطہ ہے جبکہ "خطّہ چیں" کا نون بالکل کنوارا ہے۔

یہ تفسیر اگر آپ کے دل کو لگے تو پھر انہی بزرگ سے بعض اور اشعار کی تفسیر بھی دریافت کر لیجئے جو انجمن ترقی اردو کی مطبوعات میں ملتے ہیں۔ مثلاً

اس طرف روس ادھر چین ملایا، برما
اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

اس کی آسان سی تفسیر تو عاجز بتائے دیتا ہے کہ کاتب مردود نے اندھیرے کو اجالا لکھدیا۔ اصل مصرعہ یوں ہے۔

اب اندھیرے میری دیوار تک آپہنچے ہیں۔

لیکن بعض اشعار ایسے بھی ہیں کہ ان کی صحیح تفسیر عاجز تو کیا مذکورہ کمیونسٹ بزرگ بھی شاید نہ بتا سکیں اس کے لئے کوئی ہائی کلاس مفسر رہ ہی سے بلانا ہوگا۔ مثلاً

چین — چرچل، پٹیل اور نہرو، ٹرومین اور مارشل کیلئے
چیانگ اور چیانگ کی طرح کے ڈاکوؤں کی سیہ کاریوں لئے زہر اور موت کا جام ہے۔

(شکست زنداں صفحہ ۹۱)

یہاں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ چین کا نون کنوارا ہے بھی مت سمجھ بیٹھئے گا کہ "چیانگ" کسی کمیونسٹ چینی ہے ——— توبہ توبہ۔ کمیونسٹ بھلا کبھی ڈاکو ہوا ہے تو صرف وہی ہوتا ہے جو کمیونزم کا جوا اپنی گردن پر رکھنے انکار کر دے۔ "چیانگ" بے شک ایک چینی بزرگ کا نام مگر وہ کمیونسٹوں کے حریفوں میں ہیں اور آج کل غالباً امریکہ تشریف فرما ہیں۔

تو اب بتائیے ملّا جیسے بزدل کا دلِ نامراد کیسے دھک دھک نہ کرے جب وہ دیکھے کہ چین کو بڑے پیار سے دعوت اقدام دینے والے اور زندہ سلامت نہرو کو چینی خنجر کا شکار دیکھنے کی برملا تمنا کرنے والے شاعروں کا کلام چھاپنے والی انجمن ترقی اردو "قومی دفاع" کا نام لے رہی ہے۔ الفا کتنے ہی خوبصورت ہوں مگر جب خود ہی شاعر کہہ رہا ہے کہ

ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں

تو پھر کیسے اس اندیشے کو خارج از بحث قرار دیا جا سکتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ الفاظ تقیّے کے خاندان سے ہوں گے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرْ؟

اہل حدیث کی ایک کانفرنس منعقدہ لاہور میں اہلِ حدیث کے ایک معروف بزرگ مولانا محمد حنیف ندوی نے بڑی اچھی تقریر کی اور جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ

"کیا اہلِ حدیث" کہلانے سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ دوسروں کے عمل بالحدیث کی نفی کرتے اور انھیں حق و صداقت سے دور سمجھتے ہیں؟"

تو انھوں نے جواب دیا

"نہیں ——— ہم کسی کو حق و صداقت سے دور نہیں سمجھتے۔ اہلِ حدیث اور محدثین ایک خاص مکتبِ فکر کا نام تھا جو پیش آئند مسائل کے بارے میں براہِ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تھے ہم بھی اسی مسلک کے پابند ہیں اور اسی مکتبِ فکر کے تابع ہیں۔ لیکن ہم دوسرے فقہی مکاتب کو قطعاً غلط قرار نہیں دیتے ہمارے نزدیک تمام فقہی مدارسِ فکر صحیح ہیں ائمہ دین کے رجحانات اور ان کی تحقیقی کاوشوں کا احترام اور ان سے استفادہ مختلف مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے مگر ہمارے نزدیک حق ایک ہی دائرے میں سمٹا ہوا نہیں ہے۔

(الاعتصام ۲ نومبر ۱۹۶۲ء)

الحمد للہ علیٰ ذلک۔ یہ پہلا موقع ہے کہ موجودہ اہلِ حدیث میں سے ایک صاحبِ فضل بزرگ نے اپنے موقف کی ترجمانی ایسے نپے تلے انداز میں کی ہے ——— کہ ہے کم ہماری نظر سے تو اس سے قبل آج کے کسی اہلِ حدیث عالم کی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں توسط و اعتدال اور حزم و احتیاط کی یہ روش اختیار کی گئی ہو۔ اس کے برعکس اہلِ حدیث دوستوں کی تحریریں عام طور پر اس تأثر کی حامل رہی ہیں کہ مقلدین کی راہِ تقلید راہِ گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں اور حق صرف اہلِ حدیث کے دائرے میں محدود ہے یہی وہ تأثر ہے جو افتراقِ امت کی جڑ اور فتنہ و فساد کا سرچشمہ ہے۔ نقطۂ نظر اگر وہ ہو جیسے مولانا محمد حنیف صاحب نے ظاہر کیا ہے تو پھر مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان جدل و نزاع کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اختلافِ خیال بشریت کا جزو لاینفک ہے۔ اسی لئے اللہ کے رسول نے امت کے حق میں اسے رحمت بھی فرمایا ہے بشرطیکہ خلوص و دیانت کی حدوں میں ہو۔ فتنہ و شر اس وقت ہوتا ہے جب ہم رواداری و اعتدال کی دیواریں توڑ کر عناد و تعصب کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں مقلدین میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے عدل و رواداری کے جائز تقاضوں کو پامال کر کے انا ولا غیری کا نعرہ لگایا اور اہلِ حدیث حضرات کی تحریر و تقریر میں بھی اس نعرے کی گونج برابر سننے میں آتی رہی ہے آج اس کا موقع نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر مجرم ٹھیرائیں اور اپنی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹیں۔ موقع اس کا ہے کہ پچھلی غلطیوں سے استغفار کر کے ہم واقعۃً دل سے اسی زاویہ نظر کو اپنائیں جس کا اظہار مولانا محمد حنیف

صاحب کے ارشادِ عالیہ سے ہوتا ہے اس زاویۂ نظر کا بالکل صریح تقاضا یہ ہے کہ ہر مکتبِ فکر اپنے موقف کی تبلیغ و اشاعت ضرور کرے لیکن اشارۃً و کنایۃً بھی یہ چیلنج نما دعویٰ نہ کیا جائے کہ حق صرف اور صرف وہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور باقی سب باطل ہی باطل ہے۔ اہلِ حدیث یہ پروپیگنڈہ چھوڑ دیں کہ مقلدین شخصیت پرست ہیں اور مقلدین یہ پروپیگنڈہ بند کر دیں کہ اہلِ حدیث ائمہ و فقہاء کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان دونوں پروپیگنڈوں کے لئے بنیادیں خود ہر دو فریق ہی نے مہیا کی ہیں اور دونوں ہی اپنے دعاوی کے لئے ایک دوسرے کے لٹریچر سے بہت کچھ نکال کر سامنے رکھ سکتے ہیں لیکن دین و ملت کے حق میں یہ تو تو میں میں نہ پہلے مفید ہوئی ہے نہ اب ہو سکتی ہے جب معلوم ہو گیا کہ اسلوبِ نظر اور نہج و طریق کے فرق کے باوجود مقلدین اور غیر مقلدین دونوں ہی کا قبلۂ مقصود قرآن و سنت ہیں دونوں ہی توحید کے متوالے اور ختمی مرتبت سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان ہیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم انتہا پسند اور کوتاہ بین افراد کی بے اعتدالیوں کی بنیاد پر برابر پنجہ کشی کرتے رہیں اور نتیجہ یہ ہو کہ شرک و بدعت اور تجدد و زندقہ کے جو دیو اسلام کے سینے پر مونگ دَل رہے ہیں، پوری کامیابی کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھیں۔ ہم فریاد و التجا کی تمام تر نگوں ساریوں کے ساتھ اہلِ حدیث دوستوں سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنے حلقوں میں اب اسی طرزِ فکر کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں جس کا اعلان ان کے محترم ساتھی مولانا محمد حنیف صاحب نے کیا ہے اور اسی طرح علمائے احناف سے بھی ہمارا فقیرانہ التماس ہے کہ اہلِ حدیث کو گمراہ فرقوں کی فہرست میں شمار کرنا چھوڑ دیں اور ان کے کسی بھی مسلک پر اس انداز میں لے دے نہ کریں۔ جیسے حدیثِ رسول سے براہ راست استفادہ جرم و گناہ ہو۔ اختلافِ رائے آخر امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں بھی تھا۔ خود صحابہ کیا اختلافِ خیال سے بالاتر تھے؟ —— فروعات میں اختلاف تو ذہنِ انسانی کی جبلت ہے جسے گلہائے رنگا رنگ کی حیثیت دینی چاہئیے۔ خوشبو گلاب، چنبیلی، چمپا، موتیا کسی کی بھی ہو بہر حال خوشبو ہے۔ چمن کی زینت مختلف الالوان پھولوں سے ہے۔ قدرت کی کاریگری دیکھئے ہر پھول پیاسے خود متنوع رنگوں سے مزین ہوتا ہے۔ پھر آخر کیا آفت ہے کہ وہ لوگ ذرا ذرا سے اختلافات پر ایک دوسرے کا منہ نوچیں جن کے بنیادی عقائد یکساں اور اساسی نظریات ایک ہیں۔ بدعت و زندقہ نے جو دھوم مچائی ہے وہ کیا تشریح و تفصیل کی محتاج ہے اِدھر سے اُدھر تک شیطان ہی شیطان کا راج ہے اور اس کا بڑا سبب خود ہماری باہمی آویزشیں ہیں۔ ہم فریبِ نفس میں آکر ایک دوسرے کی پگڑی نہ اُچھالتے تو طاغوتی قوتوں کو اطمینان سے پھلنے پھولنے کا زریں موقعہ نہ ملتا۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم سنبھلیں اور ابلیس کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں۔ نہ سنبھلے تو خوب سمجھ لو کہ عصرِ نو کے بدنہاد کاریگر اور "جاہل علماء" ہر گمراہی کو ہدایت، ہر شرک کو توحید، ہر بدعت کو سنت اور ہر جاہلیت کو عینِ علم بنا چھوڑیں گے۔

کوئی ہماری التجا پر کان دھرے یا نہ دھرے ہم اپنی حد تک تو بہر حال صاف طور پر اعلان کرتے ہیں کہ گذشتہ چودہ سالوں میں ہمارے قلم سے اگر اہلِ حدیث کے خلاف کسی غیر منصفانہ تحریر کا صدور ہوا ہے، اگر کوئی دلآزار فقرہ ہماری زبان سے نکلا ہے اگر کوئی متعصبانہ ریمارک ہم ان پر کر گذرے ہیں تو وہ ہمیں معاف کریں ہم غیر مشروط طور پر اس سے رجوع کرتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اہلِ حدیث کی وہ جماعت یقیناً اہلِ حق کی جماعت ہے جس کا زاویۂ نظر وہ ہو جو مولانا حنیف صاحب نے بیان فرمایا ہے اگر اہلِ حدیث حضرات کے دل میں غریب اسلام اور ملتِ مسلمہ کا درد ہے تو وہ بھی آج سے اپنے قلوب کو کدورتوں سے صاف کر کے عزم کر لیں کہ مقلدین کو ضال و مضل نہیں سمجھیں گے واحد جماعت حقہ ہونے کا دعویٰ نہیں کریں گے۔ اختلافی مسائل میں ایسا اسلوب اختیار نہیں فرمائیں گے کہ فقہائے احناف کی توہین و تضلیل ہو، بلا وجہ علماء دیوبند، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر سنگ باری و خشت اندازی کا مشغلہ نہیں چلائیں گے اور بدعت و زندقہ کے خلاف مشترکہ محاذ بنانے کی مخلصانہ جدوجہد کریں گے ہم اپنا دل تو کسی کے سینے میں نہیں ڈال سکتے مگر اللہ جل شانہ کے حکمِ مبارک وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا واسطہ دیتے ہوئے

یہ ضرور عرض کریں گے ——— اور ہمارے مخاطب مقلدین و غیر مقلدین سب ہیں ——— کہ اے دوستو اور بزرگو خدا کی قسم موت بالکل قریب ہے اور بہت جلد وہ وقت لازماً آنے والا ہے جب باری تعالیٰ جل جلالہٗ فرمائیں گے کہ اے نابکار بندو! ہم نے تمہیں ایمان جیسی نعمت دی تھی۔ دل و دماغ دئے تھے قوتیں دی تھیں۔ تم نے انھیں ہمارے باغیوں کے خلاف خرچ کرنے کے عوض آپس کی سر پھٹول میں صرف کیا۔ تم فاتحہ خلف الامام اور رکعات تراویح پر لڑتے رہے اور شیطان شرک و طغیان کے ہر محاذ پر پیش قدمی کرتا رہا۔ تم نے کفر مبین اور شرک صریح کو چھوٹ دی مگر ایسی فروعات پر دادِ شجاعت دیتے رہے جن میں اختلافِ رائے کی گنجائش خود ہم نے عطا کردی تھی۔ تم کافر و مشرک نہیں ہو مگر کفر و شرک کی بالواسطہ اعانت کے ضرور مرتکب ہو۔ تم بدعتی نہیں ہو مگر فروغِ بدعت میں تمہاری بے دانشی کو ضرور دخل ہے۔

سوچو اس وقت کیا جواب دو گے؟

تفسیر بیان القرآن

مولانا تھانویؒ کی مقبول و معروف تفسیر۔ اردو مع عربی۔ ۳۰ پاروں میں مکمل تجلی سائز پر۔ مکمل کا ہدیہ ساٹھ روپے۔
(ہر پارہ علیحدہ بھی مل سکتا ہے فی پارہ۔ دو روپے)
(مکمل سٹ منگوانے پر محصول و پیکنگ رعایتاً چھوڑ دیا جاتا ہے۔)
اگر مجلد طلب فرمائیں گے تو کامل پانچ جلدوں میں ستر روپے ہدیہ ہوگا۔

دعواتِ عبدیت

مولانا تھانویؒ کے مواعظ کا ایک عمدہ سلسلہ۔ ہر ماہ ایک حصہ چھپ رہا ہے ہر حصہ کی قیمت ایکروپیہ بارہ آنے اب تک ۱۰ حصے چھپ چکے ہیں۔ مکمل سیٹ منگوانے پر ہر حصہ سوا روپیہ سے دیا جائے گا۔ ہر حصہ اپنی جگہ مکمل ہے۔

فتوح الغیب

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ مجلد ڈھائی روپے

حقوق الاسلام

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی ایمان افروز تالیف۔ مسلمان پر اللہ اور رسولؐ کے، صحابہ اور اہلِ بیت کے، اہل و عیال کے اور اساتذہ و تلامذہ وغیرہ کے کیا حقوق اسلام نے عائد کئے ہیں اس کی مستند تفصیل۔ آخر میں سماع و مزامیر (گانے بجانے سے متعلق رسالہ) بھی لگا دیا گیا ہے۔ مجلد دو روپے

چند نئی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
محمد رسول اللہؐ	توفیق الحکیم	پانچ روپے
خانۂ کعبہ	محمد طاہر الکردی	ایکروپیہ بارہ آنے
خالد سیف اللہؓ	ابو زید شبلی	دو روپیہ چار آنے
المامون	شبلی نعمانی	دو روپیہ چار آنے
اسلام اور اجتماعیت	صدر الدین اصلاحی	ایکروپیہ ۳۰ پیسے
علومِ عرب غیر مسلموں کی نظر میں	عبد الباطن صاحب	ایکروپیہ آٹھ آنے
ملحدین کے شبہات	سید حامد علی	۳۲ پیسے
کیا خدا کی ضرورت نہیں	،،	۳۲ پیسے
خدا کا انکار کیوں۔	،،	۳۲ پیسے
خدا پرستی ملحدین کی نظر میں۔	،،	۳۲ پیسے
تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھیؒ	،،	ایکروپیہ بارہ آنے
مسلم خواتین کیلئے بیس سبق	مولانا عاشق الٰہیؒ	ایک روپیہ
انسان	ایک سبق آموز کہانی	۶۲ پیسے
بھارت کے تہوار	(ہندو مسلم تمام تہواروں کی تاریخ)	۶۲ پیسے
جنات کی دنیا	(مختصر اور سبق آموز کہانیاں)	ایکروپیہ آٹھ آنے
مرد آہن	(ایک اسلامی تاریخی ناول)	۷۵ پیسے

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

مستقل عنوان — مُلّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

دو صحبتیں

نسیمہ — یعنی حقیر فقیر مُلّا کی اکلوتی مُلّائن دیر سے گنگنا رہی تھیں۔ گنگنا کیا رہی تھیں شہد کی مکھی کی طرح بھنبھنا رہی تھیں مجھے یہ دماغ کو برمانے والی بھنبھناہٹ کھلنی ہی چاہیئے تھی کیونکہ اس وقت میں تاریخ انسانی کے ایک عجیب و غریب درلاثانی شہ پارے سے عبرت کشید کرنے میں اس قدر محو تھا کہ حقّے کی نَے کو بجائے مُنھ کے ناک سے سُٹک رہا تھا۔ تنگ آکر میں نے کہا:۔

"خدا کے لئے ہز ہجسٹی ذرا کھُل کر گا لو۔ یہ بے الفاظ کا نغمہ تو میری عاقبت برباد کر دے گا۔"

وہ جھینپ سی گئیں۔

"آپ اپنا کام کئے جائیے اِدھر کیوں دھیان دیتے ہیں"

"اب تم ایک اینٹ بھی میری کھوپڑی پر رسید کر کے اطمینان سے کہنا کہ اپنا کام کئے جاؤ گھبراتے کیوں ہو۔ ۔ ۔ نیک بخت۔ ۔ ۔ ہاں ذرا سناؤ تو یہ صبح سے آج ایک ہی دُھن میں کیا گنگنائے جا رہی ہو۔"

"کچھ نہیں بہت پرانا شعر ہے۔ آپ اپنا کام کیجئے۔"

"اب نہیں ہوگا کام وام۔ تمھاری گنگناہٹ تیرِ نیم کش بن کر بھیجے میں اُلجھ گئی ہے۔ سناؤ تو کیا شعر تھا؟"

انھوں نے کچھ جھینپ کر، کچھ اُلجھ کر، کچھ مسکرا کر چچا غالب کا یہ شعر پڑھا:۔

گو ہاتھ کو نہیں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ✤ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

"لاحول ولاقوۃ" میں نے بھرپور قرأۃ کے ساتھ کہا "تو اس گھسے پٹے شعر پر گلا برباد کر رہی ہو۔"

"گھساپٹا کیوں" وہ بُرا مان کر بولیں "آپ ذرا نئے شاعروں میں تو کسی ایک کا بھی ایسا شعر لا کے دکھلائیے۔"

"کیوں اس میں کیا سرخاب کا پر ہے؟"

"کسی مرغوب شے سے انتہائی تعلق کا اظہار اس پیرائے سے بڑھ کر آج تک کوئی نہیں کر سکا۔"

"شرابی کی تعریف کرتی ہو" میں نے خواہ مخواہ کہا۔

"سوال شرابی یا نمازی کا نہیں" وہ تاؤ میں آکر بولیں "تخیّل کی پرواز اور اسلوب کی ندرت دیکھئے۔ ذرا آپ تو کوئی شعر ایسا سنائیے جس میں شدّتِ شوق کی معراج اس بھرپور انداز میں پیش کی گئی ہو۔"

میں نے کھوپڑی سہلائی۔ پھر پانوں کی ڈبیا سے بڑے پُر تکلف انداز میں ایک پان کھایا۔ پھر مستعلیق انداز میں کھنکارا۔ اس طرح میں اپنا حافظہ ٹٹولنے کے لئے تھوڑی مہلت حاصل کر رہا تھا — مگر واحسرتا! یادداشت کے فیتے پر تو دنیا بھر کی الا بلا اس طرح گچ پچ نظر آئیں کہ شوہرانہ عظمت کو سہارنے کے لئے بھنّانے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا۔

"شاعری پر میں لعنت بھیجتا ہوں — ہونھ۔ ۔ ۔

...کار بیکاراں ۔۔۔۔ ہاں نثر میں سننا چاہو تو ابھی وہ لاجواب چیز سنا سکتا ہوں کہ غالب اور مومن سب تھکیں ہونے نظر آئیں گے ۔"
وہ ذرا کھل کر مسکرائیں پھر ارشاد ہوا :۔
"نثر ہی ہی سہی ۔ میں دیکھوں تو غالب سے بڑھ کر پرواز خیال کیا دکھائی ہے کسی نے ۔"
"بچی ہو ۔۔۔ پرواز خیال تو اتنی شاندار ہے کہ آنکھیں ملتی رہ جاؤ گی ۔۔۔ لو اس وقت اتفاق سے میں اسی شہ پارے پر سر دھن رہا تھا ۔"
میں نے رسالہ چٹان اٹھایا جو میرے آگے کھلا رکھا تھا۔ اسی میں تاریخ انسانی کا وہ عجیب و غریب شاہکار بھی تھا جس کا ابھی ذکر کر آیا ہوں ۔ وہ سمجھ رہی تھیں میں حسب عادت غلط مبحث کرنے والا ہوں ۔ چٹکی لینے کے انداز میں کہنے لگیں :۔
"ہاں صاحب سنائیے ۔"
"کان کا میل صاف کر لوں ۔ جو کچھ سنانے والا ہوں وہ صرف تمہارے چیلنج ہی کا جواب نہیں ہے ، بلکہ ایک ایسا لطیفہ بھی ہے جس پر ستر ہزار فرشتے سالہا سال سے سر دھن رہے ہیں"
وہ دوسرے پلنگ پر اطمینان سے بیٹھ گئیں ۔
"تمہید بھی سنو گی یا شروع ہو جاؤں ؟"
"جو چاہے سنائیے مجھے تو پرواز خیال سے بحث ہے ۔"
"میرے سر سے بحث ہے ۔۔۔ اعلیٰ حضرت کو جانتی ہو ؟"
"کیسے اعلیٰ حضرت ؟"
"اچھے اعلیٰ حضرت ۔۔۔ یہ کیا بے تکا سوال ہے کہ کیسے اعلیٰ حضرت ۔"
"اللہ توبہ ۔ مجھ نگوڑی کو کیا معلوم کون اعلیٰ حضرت ۔"
"ہاں تم نگوڑی کو غالب اور میر تو خوب معلوم ہیں ، ائمۂ حق کیوں معلوم ہونے لگے ۔"
انھوں نے کچھ سوچنے کے سے انداز میں میری طرف دیکھا پھر کھٹ سے بولیں :۔
"اے ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ وہ تو نہیں وہ بریلی والے مولوی احمد رضا خاں صاحب ؟"
"ہاں اور کون ہے دنیا میں اعلیٰ حضرت ۔۔۔ پورا سنا ہے ان کا ؟"
"میں نے کونسا ادھورا لیا ہے ۔"
"وہاں بن ہو ۔۔۔ پورا نام نوٹ کرو ۔ خلاصۃ الاولیا زبدۃ الاتقیاء ، جلاد الوہابیین ، شہنشاہ المکفرین ، شیخ الاعراس والقبور حضور فیض گنجور ۔۔۔ ۔"
"بس ختم کیجئے ۔۔۔ ان تفصیلات میں الجھے رہے تو ہنڈیا کب چڑھاؤں گی ۔"
"بس جل گئیں ۔۔۔ نیک بخت یہ تو نام کی فقط تمہید تھی ۔ ۔۔۔ خیر یہ بہرحال تم جانتی ہی ہو گی کہ اعلیٰ حضرت دنیا کے خاص انسانوں میں تھے ۔ انھوں نے وصال شریف سے دو گھنٹے ۱۷ منٹ پہلے جو وصیت کی تھی وہ سن کر تم غالب و الب سب کو بھول جاؤ گی ۔"
"یہ چٹان میں ان کی وصیت کہاں سے آگئی ؟"
"نقل کی ہے "وصایا شریف" سے ۔ آج کل پاکستان میں بریلویوں اور دیوبندیوں کی فری اسٹائل چل رہی ہے ۔ دیوبندی بچاروں کا پٹ پٹ کر منھ سوج گیا ۔"
"کیوں جھوٹ بولتے ہیں" وہ تڑخیں ۔۔۔ "اُفوہ ۔۔۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ بریلوی بچارے کیا ہرا ئیں گے دیوبندیوں کو"
"ہار جیت کا سوال نہیں ۔ بریلویوں نے وہ ڈھائی ڈھائی من کی گالیاں اور ایک ایک ٹن کے فتاوائے کفر رسید کئے ہیں دیوبندیوں کے گالوں پہ کہ منھ سوج کر کپے بن گئے ہیں ۔ دیوبندی بچارے قرآن و حدیث لئے پھرتے ہیں ۔ بہت ہوا مارا تو صحابہؓ اور محدثین کو مدد کے لئے لے آئے ۔ نہ گالیوں کا سلیقہ نہ چپک دار فتوے ان کے بس کے ۔۔۔ ۔ ارے الاقسم گالی بھی دیتے ہیں تو لکھنوی انداز کی جو پھول بن کر بریلویوں کے لگتی ہے اور وہ کھٹ سے اسے اپنے کسی بزرگ کے مزار پر چڑھا دیتے ہیں ۔"
"مگر آپ تو ایک دن بتا رہے تھے کہ شورش کشمیری صاحب نے بڑا اکڑا پکڑا ہے ۔"

"ارے تو وہ دیوبندی کب ہے، احراری پٹھا ہے۔ دے تو ہے بڑی بانکی گالیاں مگر ماں بہن کی اسے بھی نہیں آتیں۔ بندیوں پر تو ماں بہن کی پڑ رہی ہیں۔"

"اللہ توبہ ختم کیجئے۔ ماں بہن کی گالی کوئی اچھا ہی دیگا۔"

"تو تم کیا سمجھتی ہو بریلوی پٹھے کسی میدان میں کم ہیں۔ لیوں کی سائنس ان سے بڑھ کر روس کو بھی نہیں آتی۔ تم اید سال بھر کی ہوگی جب ایک بریلوی بزرگ نے اپنے اخبار الی نمبر نکالا تھا۔ وہ وہ گالیاں تراشی تھیں ظالم نے کہ طوائفوں نے لنگر لنگوٹ کھول دیئے تھے۔"

"کچھ تو حیا کیجئے ـــــ نوج ہے آپ مردوں سے ـــ"

"ارے تو میں کون گالی بک رہا ہوں ـ خیر سنو۔"

اب میں نے مثنوی مولانا روم کی دھن میں قرأت کے سُر لگا کر وصیت پڑھی ـــــ نہ تو بہ وصیت شریف پڑھی ولفظ بہ لفظ یہ ہے:۔

بریلویوں کے پیشوا مولوی احمد رضا خان کی آخری وصیت

اعزّہ سے اگر بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں ۲ دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگر بھینس کے دودھ کا ہو، مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ خواہ بکری کا۔ شامی کباب، پراٹھے اور بالائی، فیرینی، اُرد کی پھریری دال مع ادرک ولوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف۔ اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب جانو مگر بطیب خاطر میرے لکھنے پر مجبور نہ ہو۔

رضا حسین، حسنین اور تم سب محبت واتفاق سے رہو اور حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو۔ اور میرا دین مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے۔ اس پر مضبوطی قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے۔

دستخط۔ فقیر احمد رضا غفرلہٗ بقلم خود بحالت صحت

وصایا شریف صفحہ ۸-۹

جو وصایا شریف سے دو گھنٹہ ۱۷ منٹ پیشتر قلم بند کرائے۔

ناشر:۔ نوری کتب خانہ
بازار داتا صاحب لاہور
مطبوعہ:۔ گلزار عالم پریس لاہور

ملانی اس دوران میں بار بار اچک کر کھلے ہوئے صفحے کو دیکھ رہی تھیں۔ انھیں شاید گمان ہو رہا تھا کہ میں ہاتھوں ہاتھ تصنیف کر کے پڑھ رہا ہوں۔ صبر نہ ہوا تو چٹان میرے ہاتھوں سے چھین لیا اور خود پڑھ کر ایسا بُرا سا منھ بنایا جیسے فاتحہ کے کباب میں ہڈی آگئی ہو۔

"اب ہو" میں بولا "تمہارے چچا غالب تو بس نزع ہی کی بات کر رہے تھے۔ یہاں شدت شوق بعد مرگ بھی جوں کی توں ہے۔"

وہ خالی خولی نظروں سے مجھے تکتی رہیں جیسے عالم بالا میں پہنچ گئی ہوں۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ میرا ریمارک انھوں نے سمجھا تو کیا سنا تک نہیں۔

"کہاں گم ہوگئیں" میں نے جھنجوڑا "کیا چچا غالب کی ہار برداشت نہیں ہو رہی ہے؟"

"ہا... ہا... ر..." وہ کھوئی کھوئی بڑبڑائیں۔

"کیا مصیبت ہے... نیند آگئی کیا...؟"

"جی... ہائے اللہ کیا یہ سچ ہے؟"

"بہت اچھے۔ غالب کے شعر پر تو ایمان بالغیب لے آئیں اب منھ توڑ جواب ملا ہے تو سچ جھوٹ کا شوشہ نکال رہی ہو۔ جھوٹ کا اس میں کیا سوال ہے۔ تم ہی تو خوش ہو رہی تھیں نا کہ غالب نے مرتے مرتے بھی ساغر و مینا سامنے رکھنے کی التجا کر کے اظہار شوق کی حد کر دی ہے۔ دیکھ لو اعلیٰ حضرت نے تو اس حد سے بھی میل بھر آگے حد قائم کی ہے بتاؤ اس تخیل سے اونچا تخیل اور اس والہانہ شوق سے بڑھ کر شوق اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی قبر میں بھی......"

"بس چھوڑیئے" انھوں نے چٹان ہاتھ سے رکھ دیا۔

"میں نہیں مانتی کہ یہ وصیت واقعی کی گئی ہوگی۔ کون جھاڑو پھرا مرنے کے بعد بھی حلوے پرانٹھے مانگے گا۔"

"توبہ توبہ زبان کو لگام دو۔ جھاڑو پھرا کس چڑیا کا نام ہے۔ کسی بریلوی نے سُن لیا تو ابھی کفر کا فتویٰ لگا کر تمھیں بیوہ اور مجھے اُلّو کا پٹھا بنا دے گا۔"

"خاک پڑ جائے ایسے فتووں پر۔ جھاڑو پھرا تو میں نے چٹان کو کہا ہے۔ اسی نے گھڑی ہوگی یہ وصیت۔"

"کیا بچوں کی سی بات کرتی ہو۔ یہ وصیت تو ایک ایک بریلوی کے ورد زبان ہے۔ مگر مطلب تم غلط سمجھ رہی ہو۔ بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ یہ مال ملیدے اعلیٰ حضرت اپنے لئے نہیں مانگ رہے ہیں یہ تو انھوں نے غریبوں، بیواؤں اور یتیموں مزدوروں کی دلجوئی کا اہتمام فرمایا ہے۔ حضرت کو غریبوں مسکینوں سے بڑی ہمدردی تھی۔"

"ہوگی ہمدردی" ملائن کلس کر بولیں "کیا انھیں پیارے رسول ﷺ سے بھی زیادہ غریبوں کی ہمدردی تھی مگر پیارے حضور ﷺ نے جو وصیت فرمائی ہے اس میں تو نہ کھانے کا ذکر ہے نہ پینے کا اور کسی بزرگ کی وصیت لے لیجئے ہرگز ایسی باتیں نہیں ملیں گی۔ آخری وقت میں نوابی کھانوں کی ایسی لچھے دار فہرست اسی کے یاد رہ سکتی ہے جس کی روح اور دل و دماغ سب مل کر ایک بڑا سا معدہ بن گئے ہوں۔"

"تم ٹھیریں پکّی وہابن۔ سٹر گیا تمھارا بھیجا ۔۔۔ بھاگوان اعلیٰ حضرت خوش خوراک بے شک تھے مگر ۔۔ یعنی ۔۔۔ مگر ۔۔۔۔ سو وہ کہ ۔۔۔۔۔"

"کیا اگر مگر ۔۔۔ سچ مچ غریبوں کا خیال ہوتا تو ننگوں کو کپڑا پہنانے، یتیموں کی پرورش کرنے، بیواؤں کا نکاح کرانے اور فاقہ کشوں کے یہاں آٹا دال پہنچانے کی وصیت کی جاتی نہ مرتے مرتے نوابی کھانوں کی وصیت تو ایسی ہے جیسے ۔۔۔ جیسے آپ مرغ پلاؤ کھا کر انگلیاں چاٹتے ہیں۔"

"میں! ۔۔۔ ہوش میں ہو ۔۔۔ یعنی منہ پر مضحکہ ۔۔۔۔"

"مضحکہ کاہے کا ۔۔۔۔ آپ بتائیے غریبوں ہی کا درد ہوتا تو اس کا کیا مطلب کہ "دودھ کا برف خانہ ساز اگر بھینس کے دودھ کا ہو" ۔۔۔ یہ تو چٹخارے ہیں ورنہ غریب مری پٹیو بال کی کھال کا کیا واسطہ کہ دودھ بھینس کا ہو یا ہاتھی کا۔۔ گائے یا بکری کا اور ہائے اللہ یہ سیب کا پانی۔ یہ انار کا آگ لگے امریکہ اور انگلینڈ میں بھی کسی کو یہ چونچلے کاہیں کو ہوں گے۔ صدقہ و خیرات کی یہ کونسی قسم ہے کہ جتنے بیسیوں بھوکوں کا پیٹ بھر سکتا ہوں اور دس سردی میں سکڑتے خاندانوں کو لحاف بچھونا مہیا ہو سکتا ہو اس سے نوابی کھانا بنا کر دو چار لگوں سگوں کو گلچھرے اُڑوا دو ۔۔۔ اگر سچ مچ یہ اعلیٰ حضرت فرما گئے ہیں تو اسے عمل کرانے کے لئے سیب اور کے پانی کے ساتھ انگور کا پانی اور لکھوا دیجئے۔ سارے غریب بہشت میں پہنچ جائیں گے۔"

"تم تو ملائن بہت ہی سٹری ہوتی وہابن بلکہ وہابڑن بن ہو۔ میں کہتا ہوں تمھیں کیا خبر روحیں بھی عالم بالا میں گوشت کچوریاں کھا کر سوڈے کی بوتل چڑھاتی ہوں ۔۔۔ نہیں میں ایک کہتا ہوں۔"

"ضرور اعلیٰ حضرت کا بھی یہی خیال ہوگا" وہ بربڑا بولیں "اگر ان کا منشا یہی ہوتا کہ نوابی کھانے پکا پکا کر غریبوں میں تقسیم کئے جائیں تو سوڈے کی بوتل نہ کہتے" بولیں "کہتے ۔۔۔۔"

"کچھ بھی ہو۔ اللہ پاک نے بہرحال آرڈر دیا ہے کہ کُلُوا وَاشْرَبُوا! کھاؤ پیو موج اُڑاؤ۔"

"کیوں مجھے اُلّو بناتے ہیں۔ آگے وَلَا تُسْرِفُوا بھی تو کہا ہے اسراف جھاڑو پھرا اور کس بلا کا نام ہوگا۔"

اس وقت وہ جوش میں آگئی تھیں اسی لئے کچھ تاؤ بھی کھا گئی تھیں ورنہ حقیر فقیر کا اُلّو بنانا اور بننا تو روز کی بات ہے۔ اس شکایت انھیں عام حالات میں ہرگز نہیں ہوتی۔

اگلے روز میں دفتر کی ڈاک سے ایک پرچہ اُڑا لایا کہ نام ہے جس کا طوفان میل ۔۔۔ میل نہیں صرف "طوفان"۔ اسے چٹان کے نہلے پر دہلا کہئے۔ اس کے مطالعہ سے منکشف ہوا کہ بریلوی دوستوں کی پوری شریعت قبوری دراصل عشق رسول ﷺ سے عبارت ہے۔

"ستا تم نے" میں نے طائن کو متوجہ کیا " اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا قاسمؒ، مولانا اشرف علیؒ سب انگریزوں کے پٹھو گاندھی کے چیلے اور اللہ رسولؐ کے دشمن تھے ـــ اب کہو تم دوزخ کے کونسے طبقے میں جانا پسند کروگی "۔

انھوں نے "طوفان" جھپٹ لیا پھر نصف گھنٹے تک پڑھتی رہیں۔ فراغت پائی تو منھ پر ڈھائی بج رہے تھے۔ جھلا کر کہنے لگیں۔

"لکّی لگے اِن بدعقلوں پر۔ پیارے رسولؐ کو خدا بناتے ہیں۔ حاضر و ناظر اور عالم الغیب کہتے ہیں۔ مُردوں کو غوث اور دستگیر سمجھتے ہیں پھر دیوبندی ٹوک دیں تو انھیں انبیاء و اولیاء کا دشمن کہتے ہیں۔ چولھے میں گئے ایسے مومن ...."

"ایمان مت نگلو" میں نے کہا " وہ بچارے یہی تو کہہ رہے کہ ہم پیارے رسولؐ کی والہانہ محبت سے دستبردار نہیں ہوسکتے ...."

"عیسائی بھی تو یہی کہتے ہیں" وہ آگ بگولا ہوگئیں "میں نے خود ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ عیسائی لوگ مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ کا دشمن کہتے ہیں۔ بے تکی محبت اور مشرکانہ عقیدت کے جواز میں جتنی دلیلیں اس اخبار میں دی گئی ہیں وہ سب حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہنے کے لئے بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی حضرت رسول اللہؐ کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب کہنے کے لئے۔"

ان کا چہرہ سُرخ تھا۔ ہماری شادی کو اگر ایک صدی نہ گذر چکی ہوتی تو میں ضرور کہتا کہ وہ اس وقت چندے آفتاب چندے ماہتاب نظر آرہی تھیں۔ طوفان میں نے انکے ہاتھ سے لیا اور ورق اُلٹ کر وہ صفحہ کھولا جس میں بریلوی پہلوانوں نے وصیت کا جواب وصیت سے دیا تھا۔ یعنی چٹان جو اعلیٰ حضرت کی وصیت کئی اشاعتوں میں شائع کرتا آرہا ہے تو جواب آں غزل کے طور پر بریلوی سقراطوں نے فرمایا کہ اچھا ہم بھی تمھارے اشرف علی کی وصیت شائع کرتے ہیں جو ازبسکہ روسی محاورے میں لوٹ کھسوٹ اور استحصالی ذہنیت کا شاہکار ہے۔

وصیت تو لمبی ہوگی اس میں بریلوی دوستوں کو صرف اتنے فقرے کام کے مل سکے کہ:-

"میرے بعد بھی میرے تعلق کا لحاظ غالب رہے۔
وصیت کرتا ہوں کہ بیس آدمی ملکر اگر ایک ایک روپیہ ماہوار ان (زوجۂ تھانوی) کے لئے اپنے ذمّے رکھ لیں تو ...."

یہ فقرے نقل کرکے اعلیٰ حضرت کے فیض یافتوں نے بڑا پیارا ریمارک دیا ہے۔ یعنی یہ کہ اعلیٰ حضرت کے کھانے پینے سے جلنے والے اور کھدر کی شلوار میں ریشمی کمربند ڈالنے والے گاندھی جی مہاراج کے چیلے ذرا ملاحظہ تو فرمائیں کہ ان کے غدار الملت، ایجنٹ الانگریز، حسن بن صباح کے پیرو اشرف علی تھانوی نے کس طرح آخر وقت غریب مفلس بے روزگار اور مزدور پیشہ مُریدوں کا لہو چوسا ہے۔

"لاجواب" میں نے طائن کو چھیڑا " اعلیٰ حضرت تو فقط تھوڑی سی چاٹ کی وصیت فرما رہے تھے یہ تمھارے مولانا اشرف علی تو اکدم ایک روپیہ ماہوار یعنی سو نئے اور چونسٹھ پرانے پیسے ماہوار کہ بچاس گنے انکے علی الترتیب پانچ ہزار اور تین ہزار دو سو ہوتے ہیں مانگ رہے ہیں۔"

"دھیلے بنا کر سو سے ضرب دے لیجئے" وہ مسکرا کر بولیں "جھاڑ دھرے اتنی بھی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے کہ پڑھنے والے ان کے منھ میں کیا کیا دیں گے ...."

"ہائیں فارسی بول رہی ہو"

"فارسی کیا یہ عقل کے پُتلے اُردو ہی سمجھ لیں ـــ بھلا سوچئے تو جس پیر نے سالہا سال مریدوں کو دین کی تعلیم دی۔ اخلاق سکھلایا۔ تذکئے کے طریقے بتلائے اور اپنا سارا وقت ان کی تربیت میں کھپایا اگر وہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان میں سے دس بیس کو ایک روپیہ بھیجنے کی وصیت کرتا ہے تو سوائے پاگل کے کون اسے لوٹ کھسوٹ کہہ سکتا ہے۔ شرم و حیا اُڑ گئی دنیا سے۔ غریب سے غریب بھی ایک روپیہ بھیجنے سے کمر دُہلا نہیں ہوسکتا مگر یہ کن ذہن اسے خون چوسنے سے تعبیر کررہے ہیں۔ بات تو جب تھی کہ ہمارے کسی بزرگ کو چیتنٹو ثابت کرکے دکھلاتے تب جواب بنتا اعلیٰ حضرت کی وصیت کا۔"

"تمھارے بزرگ تو بدذوق تھے۔ سوکھے گتے دال

بنی کھاتے کھاتے۔ آخر اللہ نے یہ مُرغ یہ بکرے یہ مال لمیدے ہی سے تو پیدا کئے ہیں کہ کھاؤ کس کس کے اور ڈکاریں لو اتنی دردار کر دہل جائے دل کفار کا اور پھیل جائے اسلام جیسا حق ہے پھیلنے کا۔"

"تفنن ہر وقت اچھا نہیں لگتا۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بلیں "آپ ایک خط تو لکھئے ان آفت ماروں کو کہ کیوں جگ ہنسائی کراتے ہیں۔ مُرید تو مُرید ہیں۔ آدمی بال بچوں کو بے سہارا چھوڑ کر مرنے لگے تو وہ غیروں تک سے یہ التماس کر گذرتا ہے کہ جا تیرے ہوسکے تو ان کی دیکھ بھال کر لینا۔ اس میں نہ کوئی گناہ ہے نہ کوئی جرم۔ آخر کیا پیارے رسول ؐ کی وفات کے بعد انکی ک بیبیوں کی مالی خدمت صحابہؓ نے نہیں کی؟ — کٹ جائے وہ زبان جو ایسے پاک سلوک اور خدمت کو "خون چوسنا" کہتی ہے۔ اتنا بھی نہیں سوچا ان کوڑ مغزوں نے کہ اوّل تو غریب ور مزدور پر بھی ایک روپے مہینہ سے کوئی بوجھ نہیں پڑتا دوسر ولانا اشرف علیؒ کے مُرید تو ہزاروں تھے۔ ان میں بڑے بڑے دولت مند بھی تھے۔ کیا مرحوم نے یہ کہا تھا کہ ایک روپیہ مہینہ صرف وہ غریب دیا کریں جو فاقہ کش ہیں۔ انکا روئے سخن تو تمام ہی مُریدوں کی طرف تھا —— بے شرموں کو یکھو مُرغ پلاؤ اور دودھ کے برف اور دنیا بھر کی الا بلا میں تو کچھ خرچ ہوتا نظر نہیں آتا، مگر مرتے فقط ایک روپیہ مہینہ کی وصیت اپنے اہل خانہ کے لئے کر دی تو لوٹ کھسوٹ اور خون چوسنا ہو گیا۔ بھُس بھر گیا ہے دماغوں میں ——"

"اچھا ہز مجسٹی بس کرو — تمہاری وہابیت تو اپنا بیڑا غرق کئے بغیر نہیں چھوڑے گی۔" (ملا زندہ صحبت باقی)

معدے کی خرابی دور کرنے کی ایک خاص تدبیر

معدہ کی خرابی میں ہزاروں آدمی مبتلا ہیں! اس کا خاص سبب رات کو بھاری اور مرغن غذا کا پیٹ بھر کر کھانا ہے۔ صبح کے وقت گرانی۔ کھٹے ڈکار۔ سینے میں جلن۔ دردِ سر۔ زبان کا میلا ہونا۔ گیس کی کثرت سے پیدائش یہ سب شکایات رات کو غیر متوازن۔ مرغن اور چربیلی بھاری غذا کھانے ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ رات کو تمام اعضاءِ جسم آرام کرتے ہیں۔ لیکن معدہ کو ثقیل اور پیٹ بھر کر کھائی ہوئی غذا کو پچانے اور ہضم کرنے کے لئے رات بھر کام کرنا پڑتا ہے

معدہ کی خرابی دور کرنے کی خاص تدبیر یہ ہے کہ غذا میں تبدیلی کر دی جائے۔ اور اوقاتِ غذا کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔

علی الصبح ہلکا لیکن غذائیت سے بھرپور ناشتہ کیا جائے جاڑوں میں مقوی حلوہ یا کوئی مقوی جسم معجون استعمال کی جاسکتی ہے۔ بارہ سے پہلے دوپہر کی غذا کھائی جائے۔ دوپہر کی غذا متوازن۔ اور مقوی ہونی چاہیے۔ اس وقت خوب پیٹ بھر کر کھائی جاسکتی ہے غذا کے بعد آدھ گھنٹہ آرام کیا جائے۔ رات کو سورج غروب ہونے کے بعد جتنی بھی جلدی کھانا کھایا جاسکے کھا لینا چاہیے۔ زیادہ رات گئے پر کھانا کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ رات کی غذا عموماً سونے سے تین گھنٹہ پہلے کھائی جائے۔ اور وہ بھی ایسی جس سے معدہ پر بوجھ نہ پڑے۔ بلکہ وہ اس کو آسانی سے کم مدت میں ہضم کر دے۔ جو لوگ رات گئے تک دماغی کام کرتے ہیں اُن کے لئے تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہلکی غذا استعمال کریں۔ یا صرف دودھ۔ پھل پر ہی اکتفا کیا جائے۔

جو لوگ رات کی غذا اور وقتِ غذا میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ رات گئے بھاری اور مرغن غذا کھاتے ہیں وہ خود اپنے معدہ کو خراب کرتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ قسم کی مقوی معدہ دوا کیوں نہ کھائیں معدہ اُن کا درست ہو نہیں سکتا۔ مقوی معدہ دوا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت ہے کہ معدہ کو زیادہ سے زیادہ آرام بھی پہنچایا جائے۔ کوئی بھی مشینری ہو قدرتی یا مصنوعی آرام دینے کی دونوں کو ضرورت ہے اگر تم تندرستی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو معدہ کو صحیح رکھو۔ یاد رکھئے کہ

—— اچھی صحت کا دارومدار درست متوازن غذا اور قوت ہاضمہ کی عمدگی پر ہے ——
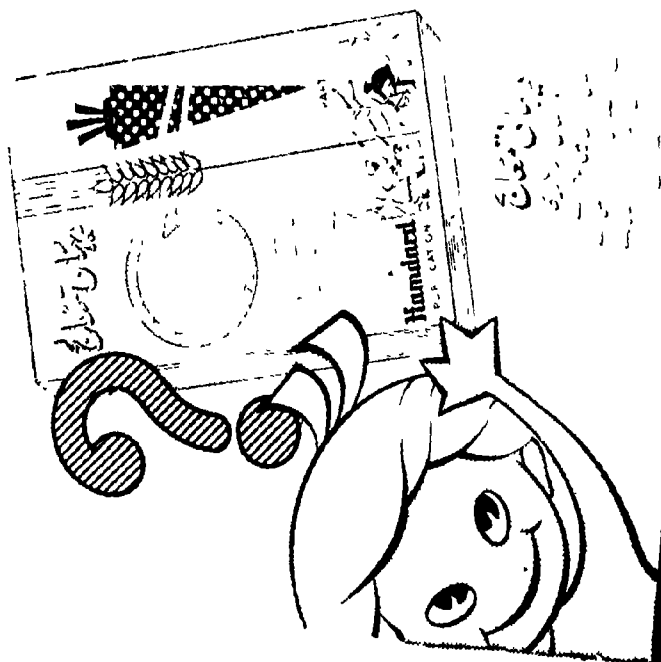
Regd. No. A-972

Tajalli Monthly, Deoband. U. P.

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs- 7. 62 n P.

مترجم
تفسیر جلالین
مع
اردو شرح
کمالین
خصوصیات
پروگرام
کتابت
طباعت
کاغذ
سب کا
معیاری
انتظام
منیجر ادارہ تھانوی دیوبند یو.پی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماھنامہ تجلّی دیوبند

شمارہ ۱۱

جلد ۱۴

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۱۸ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھئے بالکل سادہ رکھئے)

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا۔ جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ نئے پیسے کا ہوگا، منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں سالہ جاری ہو جائیگا

فہرست مضامین مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

دفتر تجلّی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر

عامر عثمانی

فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:۔ نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانے سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ ۔۔۔ مینا بازار ۲۲۸۰

پیر الٰہی بخش کالونی کراچی (پاکستان)

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلّی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن

"میلاد" کے مسئلہ پر ہم نے گذشتہ اشاعت میں جو کچھ لکھا اور "قیام" کے مسئلہ پر اس بار جو کچھ سپرد قلم کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اسے پڑھیئے اور پھر حافظ رام نگری صاحب کی تازہ بتازہ گہرباریاں ملاحظہ فرمائیے۔

تازہ الوارِ اسلام میں وہ عنوان دیتے ہیں :-

"تجلّی کا شجرِ خبیثہ"

پھر رقم فرماتے ہیں :-

"گذشتہ شمارے میں جگہ کی کمی کی وجہ سے "آواگمن کا تحقیقی جائزہ" سے متعلق تجلی ہی کے لفظوں میں اس کے "شجرِ خبیثہ" کی جو نشاندہی کردی گئی تھی اسکو تجلّی نے ناکافی قرار دیا ہے۔ لہٰذا آئندہ انشاء اللہ اس کی ہر ڈال اور ہر پتی سے اس کی خباثت نمایاں کردی جائے گی۔ تجلّی کی جائزہ اور میلاد سے متعلق خباثت کو ہم اس اشاعت میں بھی نمایاں کر سکتے تھے، اگر دوسرے مضامین کو مقدم نہ رکھتے"

(ابو محمد امام الدین)

اتنا لکھ کر بھی دل کو سکون نہیں ملا تو چند صفحات بعد پھر عنوان دیتے ہیں :-

"تجلّی کی فتنہ پردازی"

اور اس کے تحت ارشاد ہوتا ہے :-

"جو حضرات ہمیں میلاد و قیام کی بحث سے روکتے ہیں وہ نومبر اور دسمبر کا تجلّی دیکھیں اور تجلّی کی مذمت میں ہمیں خط لکھیں ہم جواب میں ان کو شائع کردیں۔ یا پھر ہمیں چھوڑ دیں ہم اسے ٹھیک کردیں۔ ہم اکابر دیوبند کا احترام کرتے ہیں اور تجلّی انکو لاکر ہمارے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اس لئے بات بڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بزرگانِ دیوبند اپنے لاڈلے کو سنبھالیں ورنہ ہمیں معذور سمجھیں"

یہ ہے اُن صاحب کا طرزِ کلام اور مزاج و مقام جن کا خیال یہ ہے کہ وہ آسمان سے تارے توڑ کر لاتے ہیں۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا تھا :-

لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمٰن)	زمین پر اتراتا اکڑتا مت چل اللہ تعالیٰ کسی اکڑباز خودستائی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اور یہی نصیحت براہ راست بھی اللہ نے بندوں کو کی ہے :-

لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (بنی اسرائیل ۔۔۔ رکوع ۴)	زمین پر متکبرانہ مت چل تو (اپنے اکڑباز انہ چال سے) نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ (اپنی مغرورانہ سرفرازی سے) پہاڑ جیسا اونچا ہو سکتا ہے۔

+ + + +

اسے تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے کہ بحث میں حق کس کی طرف ہے اور دلائل کس کے قوی ہیں یہ دیکھیئے کہ حافظ صاحب زاد لطفہ' کا طرزِ کلام کیا ہے۔ تیور کیسے ہیں۔ ادائیں کس شان کی ہیں۔

ہم ان کے فرمودات پر تبصرہ کیا کریں آپ مذکورہ دونوں

...ات کو ایک دو بار توجہ سے پڑھ دیکھیں خود اندازہ فرما ...گے کہ ان کا صدور جس دہانِ مبارک سے ہوا ہے اس میں ...دانت ہیں۔ عامر عثمانی کا کام صرف احقاقِ حق اور ابطالِ ...ل ہے دھینگا مشتی نہیں۔ طنز و طعن بے شک ہم بھی اپنر کرتے رہے ہیں لیکن حیرت اس پر ہے کہ قلم چلاتے چلاتے وہ شیخ فانی ہو گئے مگر یہ شعور اب بھی انھیں نہیں آیا کہ اہلِ علم اور اہلِ جہل کی گالیوں میں فرق ہوتا ہے۔ بحث اور تعریض و تبرّا کا بھی ایک مقام ہے، لیکن یہ تو خوش مذاقی نہیں کہ آدمی حریف کی نظریں نیچی کرنے کے لئے اپنے سارے کپڑے اُتار کر بازار میں آکھڑا ہو۔ اللّٰھم احفظنا مِن کلِّ جبارٍ عَنید۔

ناظرین مطمئن رہیں کہ ان کی ضیافت طبع ہی کے لئے ہمنے حافظ صاحب کے اقوالِ زرّیں نقل کر دیئے ہیں۔ یہ ارادہ بالکل نہیں کہ اب یا آئندہ ہم اس نوع کی گہر فشانیوں کا ترکی بترکی جواب دیں گے۔ جواب سوال و اعتراض کا ہوتا ہے ہذیانات ...ہفوات کا نہیں۔ کسی مرفوع القلم آدمی سے سر مارنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود بھی مذاق کا موضوع بنے۔ ونعوذ باللّٰہ من ذلک۔ اللّٰہ تعالیٰ حافظ صاحب کی عاقبت بخیر کرے اور ہمیں ضبط و تحمل کی توفیق دے۔

ہاں یہ اطلاع ضرور سُن لیجئے کہ اسی انوار اسلام میں ایک بزرگوار کا مفصّل خط "علوم و مسائل" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے جس میں انھوں نے چند فقہائے احناف کے حوالوں سے عامر عثمانی کو ایک ایسے موضوع پر تنبیہ و فہمائش کی سعی بلیغ کی ہے جس کے متعلق عامر عثمانی بیچارا بار بار ارادہ کرتا ہے کہ اب اس پارینہ موضوع پر تجلّی کے صفحات سیاہ نہیں کرے گا، لیکن کوئی نہ کوئی شوشہ ایسا نکل ہی آتا ہے کہ اس ارادے کی تعمیل نہیں ہو پاتی۔ مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔ متذکرہ خط چونکہ علمی نوع کا ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس پر علمی انداز کا مذاکرہ کریں۔ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ حافظ ...ام نگری صاحب بھی اپنے خاص انداز میں اس میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ اس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ کونسے موضوع پر وہ گفتگو کے اہل ہیں اور کونسے پر نہیں۔

ہر فن مولا ہونے کی خوش فہمی اور بر خود غلط ہونے کی افتاد انھیں ہر میدان میں بے دھڑک کودپڑنے کی دعوت دیتی ہے چنانچہ نمونہ از خروارے اسی انوار اسلام میں انھوں نے متعدد صفحات پر مشتمل ایک سیاسی نوع کا اداریہ لکھا ہے جس کا لبّ لباب یہ ہے کہ پورا پاکستان — مع جماعت اسلامی کے دانش، بصیرت اور اخلاق سے یکسر فارغ البال ہو بیٹھا ہے، اور ضرورت ہے کہ وہ ایک سعادتمند شاگرد کی طرح حافظ صاحب سے ان سب محاسن کا درس حاصل کرے۔ ہمیں سیاسیات کے غوامض و دقائق کا علم نہیں اسی لئے کبھی اس موضوع پر جھک بھی نہیں مارتے۔ ہمارے رب نے فرمایا ہے لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (جس شے کا تجھے علم نہیں اس کے چکر میں مت پڑ۔ یقیناً کان اور آنکھ اور قلب ہر ایک سے اس کے عمل کے بارے میں احتساب کیا جائیگا) ظاہر ہے جو شخص ایسے موضوع پر زباں درازی کرے جس کے خم و پیچ کا اسے کما حقہٗ ادراک نہیں وہ اپنے ساتھ دوسروں کی بھی مٹی پلید کر کے رہے گا۔ ہم نہیں کہتے کہ حافظ صاحب نے پاکستان کے بارے میں غلط رائے زنی کی۔ ہو سکتا ہے ان کی رائے کے مطابق واقعۃً سارا پاکستان پاگلوں اور بے ایمانوں کی بستی بن چکا ہو، لیکن یہ سامنے کی بات تو ان چرخ ہفتم سے کلام کرنے والے بزرگ سیاست داں کو سوچنی ہی چاہیئے تھی کہ جس نازک دَور میں تمام دُور اندیش اور بالغ نظر مدبرین ہند و پاک میں صلح و دوستی کو پورے ایشیا کے حق میں مفید قرار دے رہے ہیں اور اصلاح حال کی کوششیں بھی برابر جاری ہیں اس وقت ایسے جلے پھنکے اداریئے لکھنا اور عناد و منافرت کے شعلوں کو ہوا دینا سطحی قسم کی نمائش وفاداری ہو تو ہو قوم و وطن کی حقیقی بہی خواہی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ حافظ صاحب کو اگر قارئین سے اپنی سیاست دانی ہی کا لوہا منوانا تھا تو وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ بجائے آگ اُگلنے کے یہ مختصر سا فقرہ جلی قلم سے انوار اسلام میں لکھا دیتے کہ لوگو میں حافظ، فقیہہ، شاعر، نقاد وغیرہ وغیرہ ہونے کے علاوہ بہت بڑا سیاست داں اور دیش بھگت بھی ہوں۔ مجھے مانو

ورنہ مدیر تجلی کی طرح تمھیں بھی ٹھیک کر دوں گا۔

راقم الحروف کو یقین ہے کہ ان کی اس للکار پر بہت سے اقراری خطوط انھیں مل جانے جنھیں وہ اسی طرح اپنے پرچے میں چھاپتے جس طرح دیگر تعریفی خطوط چھاپتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر بھلے آدمی کو ہمہ دانی کے خبط سے محفوظ رکھے اور ہر ایاز کو اپنی قدر پہچاننے کی توفیق دے۔

تو عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ جس علمی مذاکرے کا ابھی ذکر کیا اس میں حافظ صاحب کا دخیل ہونا نانوے فی متوقع ہے لیکن ہم ناظرین کو اطمینان دلاتے ہیں کہ انکی لا کا نوٹس لیکر ہم اس مذاکرے کو طویل نہیں ہونے دینگے

اللہ ترجع الامور۔ عامر عثمانی ۱۲ر دسمبر ۶۲

چار خاص نمبر

ترجمان القرآن کے منصب رسالت نمبر

جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے منکرین حدیث کے تمام دلائل کا مضبوط اور مسکت جواب دیا ہے۔ دلچسپ، مدلل اور ایمان افروز۔ اس ضخیم نمبر کے کچھ نسخے ابھی باقی ہیں۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

تجلی کے خلافت نمبر

یہ مقبول اور شہرت یافتہ نمبر ختم ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے پھر کچھ تعداد مہیا ہو گئی ہے۔ شائقین جلد طلب فرمائیں۔ ایک روپیہ

چراغ راہ کے سالنامہ ۱۹۶۰ء

چراغ راہ (کراچی) کے سالنامے کبھی پرانے نہیں ہو مفید دلچسپ اور فکر انگیز مضامین نثر و نظم۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ

چراغ راہ کے سالنامہ ۱۹۶۱ء

بیش بہا، وقیع اور دلچسپ مضامین کا گنجینہ ضخیم ڈ
ڈھائی روپے

رمضان المبارک کی تقریب میں اعلان رعایت

ہم نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آج سے رمضان المبارک کے اختتام تک کتابوں کے ہر اُس خریدار جو دس روپے سے زائد کی کتابیں ایک ساتھ منگائے گا:۔

دو آنے فی روپیہ کی رعایت دی جائے گی

اس رعایت میں وہ نفیس قرآن و حمائل بھی شامل ہیں جن کا اشتہار اسی شمارے میں کسی جگہ موجود ہے۔

منیجر مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

نہایت نفیس عکسی قرآن اور حمائلیں

آرڈر میں صرف وہ نمبر لکھدینا کافی ہے جو ہر ایک کے ساتھ درج ہے

قرآن دو ترجمے والا نمبر ۶۸ ● (۱) مولانا شاہ رفیع الدینؒ (۲) مولانا اشرف علیؒ۔ حاشیے پر مستند تفاسیر کا خلاصہ ● آغاز میں انبیاءؑ و صحابہؓ احوالِ مقدسہ، سورتوں کے خواص، غزوات کے تذکار اور نوع کی دیگر مفید چیزیں اردو میں دی گئی ہیں ● لکھائی چھپائی س۔ کاغذ اعلیٰ آرٹ پیپر دبیز زمین سبز ● ہدیہ مجلد رنگزین ہ روپے ● مجلد چرمی ساڑھے سترہ روپے ● یہی قرآن بتاً ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۸ الف ہے) ہدیہ:۔ مجلد رنگزین ہ روپے ● مجلد چرمی ساڑھے سولہ روپے ● یہی قرآن اور ہلکے کاغذ پر (اس کا نمبر ۶۶ ہے) زمین حنائی مجلد رنگزین ہ روپے ● مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن ایک ترجمہ والا نمبر ۶۴ ● ترجمہ:۔ مولانا اشرف علیؒ ● حاشیہ پر مختصر تفسیر بیان القرآن۔ سائز تجلی سے کچھ بڑا ● کاغذ ولائتی سفید ● آغاز قرآن میں بہت سی مفید چیزیں۔ مثلاً سورتوں کے خواص، ان ناموں تفصیل جو قرآن میں آئے، ان مقامات کا نقشہ جنکا ذکر قرآن میں آیا ہے ● مجلد رنگزین بارہ روپے ● مجلد چرمی ساڑھے پندرہ روپے۔

قرآن بلا ترجمہ نمبر ۳/۵ ● کاغذ آرٹ پیپر ولائتی۔ ● کتابت طباعت بے نظیر۔ ● ہر سطر کے بعد لائن ● حروف کشادہ ● تجلی سائز ● کمزور نگاہ والوں کے لئے بہت عمدہ ● مجلد رنگزین آٹھ روپے۔ ● چرمی ساڑھے گیارہ روپے۔

قرآن بلا ترجمہ نمبر ۶۸/ب ● تجلی سائز ● کاغذ گلیزڈ۔ صفحات ۸۸۸ ● مجلد پارچہ ● ہدیہ پانچ روپے ● یہی قرآن رف کاغذ پر مجلد پارچہ چار روپے

حمائل مترجم نمبر ۸ ● ترجمہ:۔ شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ ● کاغذ آرٹ ● زمین رنگین ● سائز تجلی سے نصف ● مجلد کرمچ ہدیہ دس روپے۔ ● مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے۔

حمائل مترجم نمبر ۳۵ ● ترجمہ:۔ مولانا فتح محمد صاحب ● حاشیہ پر مختصر تفسیر ● زمین سبز ● کاغذ ولائتی ● سائز تجلی سے نصف ● مجلد پلاسٹک کور گیارہ روپے

حمائل مترجم ● ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ۔ ● تفسیر:۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ● زمین حنائی ● سائز $\frac{20\times30}{16}$ سے کچھ بڑا ● غیر مجلد ہدیہ بارہ روپے ● مجلد رنگزین ساڑھے تیرہ روپے۔

حمائل بلا ترجمہ نمبر ۲۳ ● کاغذ سفید مضبوط ● سائز تجلی سے نصف ● حروف کافی روشن ● ہر سطر کے بعد لائن ● مجلد کرمچ کا ہدیہ پانچ روپے۔

حمائل نمبر ۲۶ بلا ترجمہ ● پاکٹ سائز ● کاغذ باریک اور چکنا (بائیبل پیپر) سفر کے لئے خاص تحفہ ● جلد پلاسٹک کور ● ہدیہ مجلد چار روپے۔

حمائل نمبر ۲۴ بلا ترجمہ ● بہت ہی مختصر سائز حافظوں کے مطلب کی ● کاغذ عمدہ۔ ● جلد پلاسٹک کور ہدیہ دو روپے۔

نمونے مفت طلب فرما سکتے ہیں

مکتبہ تجلی دیوبند (یو-پی)

ایک خط
شیعوں کا قرآن

بخدمت جناب حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب

السلام علیکم!۔

گذارش ہے کہ تجلی میں شیعہ حضرات کے متعلق ایک دفعہ پڑھا تھا کہ یہ حضرات قرآن مجید کو محرّف مانتے ہیں۔ پڑھ تو لیا، مگر دل نے تسلی نہ پکڑی کہ اگر واقعی قرآن مجید محرّف ہے تو پھر تورات وانجیل وغیرہ کے پائے کی ایک کتاب کے سوا اس کا کیا درجہ رہ گیا ہے۔ یہ تو سب مسلمان مانتے ہیں کہ تورات وانجیل الہامی کتابیں ہیں مگر چونکہ وہ محرف ہوگئی ہیں اسلئے قابل قبول نہیں رہیں۔ اسی طرح اگر قرآن میں بھی تحریف ہوگئی ہے تو پھر اس کا کیا درجہ رہ گیا ہے۔ آخر پھر مسلمانوں کے پاس رہ کیا گیا ہے۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ شیعہ حضرات کا شائع کردہ قرآن مجید مقبول ترجمہ جو کہ لاہور سے شائع ہوا ہے وہ مل گیا۔ چنانچہ پڑھا۔ اور حیرانی دور ہوگئی۔ اس میں بیسیوں جگہ حاشیہ پر لکھا ہوا موجود ہے کہ فلاں آیت اصل میں یوں نازل ہوئی تھی لیکن جمع کرنے والوں نے بعد میں اس طرح درج کر دی۔ نیز صحابہ کرام کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی درج کرتا ہوں۔ اگر آپ تجلی میں شائع کردیں تو کم از کم عباسی صاحب کا رد لکھنے والے یا طیش میں آنے والے شاید کچھ سوچنے پر مجبور ہوں۔

(۱) ص ۹۵ پارہ ع ۳ کے حاشیہ میں لکھا ہے۔ تفسیر عیاشی میں منقول ہے کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی ذات پر یہ بات واجب فرمائی ہے کہ اس شخص کو ہرگز جنت میں داخل نہ کرے جس کے دل میں اول و ثانی کی محبت ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ہو۔

آیت کی تنزیل خدا اسی طرح تھی۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ اُمَمِ النَّبِیّٖنَ ..... مگر بعد میں لفظ امم گرا دیا گیا صفحہ ۱۱۸ پارہ ع ۳۔

(۳) کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ ...... اصل میں یوں تھی اَنْتُمْ خَیْرُ اَئِمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ص ۱۲۵ پ ۴۔

(۴) وَاَنْتُمْ ضُعَفَآءُ اصل میں اَنْتُمْ قَلِیْلٌ تھا پ ۴ ص ۱۲۹۔

(۵) تفسیر عیاشی میں جناب امام محمد باقر سے مروی ہے کہ بعد میں جناب رسول خدا کے سوائے تین شخصوں کے اور سب مرتد ہوگئے۔ سوال کیا گیا کہ وہ تین کون تھے۔ فرمایا سلمانؓ۔ ابوذرؓ۔ مقدادؓ) ص ۱۳۴۔

(۶) پانچویں پارہ میں ہے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً۔

مگر مقبول ترجمہ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ کافی میں جناب امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی ..... فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاٰتُوْهُنَّ ص ۱۶۱۔

(۷) وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ کافی میں جناب امام جعفر صادق رضہ سے خدا تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں منقول ہے کہ واللہ جناب رسول خدا پر آیت

اس طرح نازل ہوئی۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ كَلِمٰتٍ فِي مُحَمَّدٍ وَّ عَلِيٍّ وَ فَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَالْأَئِمَّةِ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ فَنَسِيَ پ ۱۶ ص ۶۳۷ ۔

(۸) تفسیر عیاشی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ وہ حضرت اس آیت کو یوں تلاوت فرمایا کرتے تھے :- فَإِنْ خِفْتُمْ تَنَازُعًا فِي أَمْرٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَإِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ پارہ ۵ ص ۱۷۳ ۔

(۹) جَآءُوكَ تفسیر قمی میں ہے کہ تنزیل میں جَآءُوكَ کے بعد یا علی تھا ص ۱۷۴

(۱۰) وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ کافی ۔ اور تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ فِي وَلَايَةِ عَلِيٍّ وَّالْأَئِمَّةِ مِنْ بَعْدِهٖ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ پارہ ۲۲ ص ۵۵۲ ۔

(۱۱) امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب رسول خدا نے غدیر خم کے دن جناب امیر المومنین کو اپنا قائم مقام کرنا چاہا تو آنحضرت کے سامنے منافقین میں سے سات شخص تھے ۔ اور ساتوں یہ تھے۔ ابوبکرؓ عمرؓ ۔ عبدالرحمٰن بن عوف ۔ سعد بن ابی وقاص ۔ ابو عبیدہؓ بن جراح ۔ سالم مولائے ابی حذیفہ ۔ مغیرہؓ بن شعبہ رضؓ ۔ پارہ ۱۱ ص ۳۹۵

(۱۲) اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۔ جناب امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ یہاں شیطان سے مراد حضرت ثانی ہیں۔ سورہ محمد ص ۱۰۱۵ ۔

یہ چند نمونے ہیں۔ ویسے تو بے شمار حوالے درج کر سکتا ہوں۔

ع ۵۳۰۴ عبدالرشید ڈنکا ندار ..... باجرہ گڑھی ضلع سیالکوٹ ..... (پاکستان)

تجلی

سنی حضرات عام طور پر شیعوں کے بنیادی عقائد سے ناواقف ہیں۔ انھیں تو بس لے دے کے اتنا ہی معلوم ہے کہ شیعہ لوگ تفضیل علیؓ کے قائل ہیں اور بعض ان میں سے ازراہِ غلو ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما پر تبرا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ انھیں بالعموم کچھ معلوم نہیں۔ حالانکہ تبرا اور تفضیل علیؓ تو بعد کی بات ہے پہلی اور قطعی طور پر بنیادی باتیں دو ہیں جو انھیں اور ہمیں بظاہر تو دو فرقوں میں تقسیم کرتی ہیں مگر فی الاصل وہ دو جداگانہ ملتوں کی اساس ہیں۔ ایک قرآن کا معاملہ دوسرے معصومیت کا معاملہ۔ ہمارے نزدیک قرآن اپنی ترتیب، اپنے الفاظ اور اپنے تمام التزامات کے ساتھ اسقدر یقینی قطعی ہے کہ اس میں ایک حرف کی کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر حلال نہیں ہے۔ لیکن شیعوں کے بنیادی عقائد میں یہ عقیدہ مسلمات کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ موجودہ قرآن ترتیب مقدار اور بعض الفاظ کے اعتبار سے محرف ہے۔ قابل اعتبار وہ قرآن ہے جو حضرت علیؓ نے تنزیل کے مطابق جمع کیا تھا وہی نسلاً بعد نسلٍ ہمارے ائمہ کے پاس محفوظ رہا اور اب وہ ہمارے بارہویں امام کے پاس ہے۔

دوسرا بنیادی اور دور رس اختلاف ہمارا اور ان کا یہ ہے کہ ہمارے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی معصوم نہیں حتیٰ کہ وہ ابوبکرؓ بھی نہیں جنھیں ہم بجا طور پر افضل البشر بعد رسول اللہ خیال کرتے ہیں، لیکن ان خوش فہموں کے عقیدے میں ان کے وہ بارہ امام قطعاً معصوم ہیں جنھیں "امامت" خود ان کے ذہنوں نے تفویض فرما دی ہے۔

ان دونوں عقائد کا اختلاف اس اختلاف سے کم شدید نہیں ہے جو ہمارے اور قادیانیوں کے مابین پایا جاتا ہے نہ اس کی حیثیت ہمارے اور اہل قرآن کے اختلافات سے کم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے سلف نے روافض کو مسلمان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مثلاً عیسائی حضرات انجیل کی تحریف کے جواب میں مسلمانوں پر خود قرآن کی تحریف کا الزام روافض ہی کے حوالے سے قائم کرتے تھے تو علامہ ابن حزم نے برملا کہا

وما قولهم فی دعوی الروافض ربان نصاری کا روافض کے

تبدیل القرآن فان الروافض لیسوا من المسلمین ۔ حوالہ سے تبدیلیِ قرآن کا قول کرنا تو روافض مسلمان ہی کب ہیں ۔ (کتاب الفصل جلد ۲ ص ۸۰)

یہ روافض بعض جزئی عقائد کے اختلاف کی بنا پر شیعوں میں ایک جداگانہ فرقے کی حیثیت رکھتے ہوں تو رکھتے ہوں لیکن تحریف قرآن کے عقیدے میں تو روافض و شیعہ بالکل متفق ہیں اور کلینی کی کتاب الکافی ان کے یہاں کتب معتبرہ میں سے ہے ملاحظہ کیجئے اس کتاب الکافی کے بھی دو نمونے ۔

عن جابر الجعفی قال	جابر الجعفی کہتے ہیں کہ میں نے
سمعت ابا جعفر یقول :۔	ابو جعفر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے
ما ادعی احد من الناس	کہ سوائے جھوٹوں کے کوئی ایک
انہ جمع القرآن کلہ	شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ
کما انزل الا کذاب	قرآن اسی طرح جمع کر لیا گیا جیسا کہ
وما جمعہ وحفظہ	وہ نازل ہوا تھا ۔ قرآن کو ٹھیک
کما انزل اللہ الا علی	ٹھیک تو صرف حضرت علی اور
ابن ابی طالب والائمۃ	ان کے بعد کے ائمہ (ائمہ شیعہ)
من بعدہ ۔	نے جمع اور محفوظ کیا ۔

(الکافی ص ۵۴ طبع ۱۲۷۸ھ)

+ + + + + + + + + + + + +

اسی کتاب کے ص ۱۵۸ پر ابو بصیر واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ابو عبد اللہ نے انھیں بتایا ۔

ان عندنا المصحف	ہمارے پاس فاطمہ علیہا السلام
فاطمۃ علیہ السلام	کا مصحف (قرآن) ہے ۔ میں نے
.... قلت :۔ وما	(ابو بصیر نے) کہا مصحف فاطمہ
مصحف فاطمۃ ؟ قال :۔	سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ ابو عبد اللہ
مصحف فیہ مثل قرآنکم	نے جواب دیا :۔ وہ اتنا ضخیم
ھذا ثلاث مرات	مصحف ہے کہ اس کے مقابلہ میں
واللہ ما فیہ من قرآنکم	تمہارا یہ قرآن تو فقط ⅓ ہے ۔ قسم
حرف واحد ۔	خدا کی تمہارے قرآن میں کا تو
	ایک حرف بھی اس میں نہیں ۔

+ + + + + + + + + + + + +

یہ ہے اس کتاب الکافی کے مندرجات کا نمونہ جسکی روایات پر شیعہ ایسا ہی بھروسہ کرتے ہیں جیسا ہم بخاری و مسلم ؒ در وہ "منہاج الکرامۃ" جو صحابۂ کرام کے حق میں گالیوں، خرافات و بدزبانیوں کا پلندہ ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں اس کی دھجیاں اڑائی ہیں ۔ اس کے مصنف ابن المطہر کی شیعہ حضرات میں وہ عظمت ہے کہ بایدوشاید نمونۃً وہ چند القاب و آداب سنئے جو انھیں دئیے جاتے ہیں مفخر الجہابذۃ الاعلام ومرکز دائرۃ الاسلام آیۃ اللہ فی العالمین ونور اللہ فی ظلمات الارضین واستاذ الخلائق فی جمیع الفضائل بالیقین جمال الملۃ والحق والدین .... وغیرہ وغیرہ (مقدمۃ المنتقی من منہاج الاعتدال ۔ للحافظ الذہبی)

(عامر عثمانی)

تجلّی کی ڈاک

وہی جماعت تبلیغی اور جماعت اسلامی

سوال ۱:- از یعقوب علی۔ کریم نگر (آندھرا پردیش)

تجلّی ماہ نومبر ۱۹۶۲ء میں "تجلّی کی ڈاک" کے زیرِ عنوان آپ نے جو سوال اور جواب شائع فرمایا ہے اُس کو دیکھ کر یہاں عوام میں عجیب قسم کا تأثر پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ بھی جماعت اسلامی کے رکن ہیں اور یہاں پر ایک مولوی صاحب رہتے ہیں جن کا اسم گرامی حبیب الرحمٰن صاحب ہے۔ یہ بیچارے میٹرک پاس ہیں اور ہائی اسکول میں صرف اُردو پڑھاتے ہیں۔ اُن کو جب تجلّی دکھایا گیا تو اس کے بارے میں اُن کے تأثرات بہت خراب پائے گئے۔ ان مولوی صاحب کا مستقل شغل جماعت اسلامی کی مخالفت کرنا ہے۔ یہاں جماعت اسلامی کی طرف سے مقامی مسجد میں درس قرآن کا اہتمام ہوتا تھا۔ بعض علماء اور مذکور مولوی صاحب نے ملکر آوارہ اور غنڈہ عناصر کو نشہ آور اشیاء پلاکر میلاد خوانی اور اسلام کے ذریعہ قرآن کا درس بند کروادیا اور بیچارے جماعت اسلامی والوں نے محض فتنہ و فساد کے اندیشے سے درس قرآن مسجد میں بند کر کے ایک صاحبِ خیر کے مکان پر اُس کا اہتمام کیا۔ اس طرح جماعت اسلامی کی مخالفت کرنے اور اُس پر مختلف طریقہ سے الزامات عائد کرنے کا کام کرنے والے حضرات یہی یہاں تبلیغی جماعت مشتمل ہے۔ ان مخالفین جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے افراد کا کہنا ہے کہ جماعت اسلامی والوں کو گالیاں دینا اور تکلیف پہنچانا کارِ ثواب ہے اور اُن کو اس بات کا پورا پورا اطمینان ہے کہ اگر جماعت اسلامی والوں کو ماریں اور گالیاں دیں یا کچھ بھی کریں یہ لوگ جوابی کارروائی نہیں کرتے۔ اس لئے ان کے ساتھ دل کھول کر جو چاہے کرو۔ ان لوگوں کی مخالفت حد سے گذر گئی ہے۔ بعض لوگوں نے علماء اور عوام سے آپ کے ماہ نومبر ۱۹۶۲ء کے رسالہ کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ جناب عامر عثمانی صاحب نے ایسا تحریر کیا ہے تو اُس پر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ عامر عثمانی تو لونڈا ہے وغیرہ۔ اس سے ہم کو بہت تکلیف ہوئی۔ اور ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ بھی جماعت اسلامی ہی کے آدمی ہیں یا ایجنٹ ہیں اور آپ کو جماعت اسلامی سے سالانہ کئی ہزار روپے ملتے ہیں جس کی وجہ سے آپ جماعت اسلامی کی تائید میں لکھتے رہتے ہیں۔ اب یہ مولوی صاحب اس سال حج کو بھی جارہے ہیں اس لئے بھی لوگ اُنکو بڑا متقی اور عاشقِ رسول خیال کر کے اُن کی بات پر یقین کرتے ہیں۔ ان کا پیشہ تو جماعت اسلامی کی مخالفت کرنا ہے۔ اس لئے براہ کرم آئندہ ماہ کے پرچے میں حسب ذیل سوالات کے جواب عنایت فرماکر ممنون فرمائیے اگر مناسب خیال فرمائیں تو اس پورے خط کو شائع فرمادیں۔

(۱) کیا آپ جماعت اسلامی کے رکن یا اس کے ایجنٹ ہیں؟ اور آپ کو سالانہ کتنے روپے جماعت اسلامی سے ملتے ہیں؟ (۲) اگر کوئی صاحب حج کرنے کے بعد بھی جماعت اسلامی کی مخالفت ترک نہ کریں تو انکے بارےمیں آپکا کیا خیال ہے؟

الجواب :-

سنت اللہ شروع ہی سے کچھ یونہی چلی آرہی ہے کہ داعیانِ حق پر ابتلاؤں کے پہاڑ ٹوٹیں۔ ان پر مخالفتوں کی یلغار ہو۔ انھیں ستایا جائے اور حق کی تحریک کو قدم قدم پر اپنوں اور بیگانوں کی دسیسہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ جماعت اسلامی بھی اپنے ارادے اور نیت کے اعتبار سے داعیانِ حق کی ایک جماعت ہے کیسے ممکن تھا کہ سنت اللہ اس کے معاملہ میں بدل جاتی اور شیطان غافل ہو بیٹھتا۔ ہم علم و استدلال کی سطح پر تو ہر اُس فرد یا گروہ سے افہام و تفہیم کر سکتے ہیں جو جماعت اسلامی کے کسی عقیدے یا عمل پر معترض ہو لیکن ایسی غیر علمی غیر معقول مخالفتوں کا ہمارے پاس کیا توڑ ہے جن کا خاکہ آپ نے کھینچا۔ ان مخالفتوں کے مقابلہ میں خود جماعت اسلامی کی کیا روش ہے۔ یہ سب کے سامنے ہے۔ اسی روش سے ہر منصف مزاج اندازہ کر سکتا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔ اللہ جلّ جلالہٗ کا ارشاد ہے :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (الفرقان)	رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر نرم روی سے (ایسی رفتار سے جس میں نخوت، غرہ اور جارحیت نہ ہو) چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہتے ہیں (لڑتے بھڑتے نہیں)

+ + + +

+ + + +

عباد الرحمٰن ہی کا یہ وصف بتایا گیا ہے کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔

اس آئینۂ قرآنی میں مفسدین و مصلحین کے چہرے پہچانیئے۔ اندازہ کیجئے کہ کون زیادتی کر رہا ہے اور کون ہدف ہے۔ کس کا تیور معقولیت کا ترجمان ہے اور کس کا نامعقولیت اور تصور کا مظہر ہے۔ ہم ذکر و تسبیح، اشراق و تہجد اور زاہدانہ طور طریق کے دل سے مدح خواں ہیں لیکن ہماری دانست میں تمام اعمالِ خیر کا مقصد و مدعا انسان کے اندر نفیس اخلاق اور پاکیزہ ملکات و رجحانات پیدا کرنا ہے۔ اگر عبادتیں عابد کے قلب و ذہن اور روح اور شعور کو حسنِ اخلاق، خشیت و تقویٰ اور عجز و تواضع کے گہرے رنگ میں نہ رنگ سکیں تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ منزل سے دور ہے۔

ہم نے سنا تھا کہ تبلیغی جماعت میں اکرامِ مسلم کا بڑا چرچا ہے۔ نزاع و مخالفت سے بالا بالا کام کرنا ان حضرات نے اپنا شعار بنایا ہے۔ پھر آخر یہ کیا حادثہ ہے کہ اونچے درجے کا اکرامِ مسلم تو کیا ہوتا حدیث کے حکم صریح تک کی پروا نہیں کی جا رہی ہے۔ اللہ کے رسول ؐ نے فرمایا ہے :-

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ	اچھا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اہلِ اسلام محفوظ و مامون ہوں۔

تو کیا یہ طور طریق اس حدیث کے مطابق ہیں کہ جہاں موقع ملے جماعت اسلامی کو جبر و طاقت سے دبا دیا جائے اور درسِ قرآن بھی بلا کسی معقول وجہ کے بند کرا دیا جائے۔ زبان کے تیر کسی عقیدہ و عمل کی تنقید میں تو چلائے جا سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے جس فکر و عمل پر کسی کو اعتراض ہو وہ ضرور اپنے اعتراض کو مدلل طور پر دنیا کے آگے رکھ سکتا ہے اور اس کی دانست میں یہ جماعت شرکت و تائید کے قابل نہیں ہے تو سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ عامۃ المسلمین کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کر سکتا ہے مگر یہ بات بہت بری اور افسوسناک ہے کہ شرافت و متانت کی حدیں توڑ دی جائیں۔ ہم جماعت اسلامی کے مومن مخالفین سے ہاتھ جوڑ کر عرض کریں گے کہ خدارا امت کے انتشار و افتراق کو اور زیادہ نہ بڑھایئے۔ ہماری اجتماعیت کا حال بہت پتلا ہے۔ ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر چکے ہیں۔ کیا اللہ اسے پسند کرے گا کہ شیرازہ بندی اور تلافیٔ مافات کی دردمندانہ مساعی کے عوض ایک دوسرے کے جیب و گریباں کی دھجیاں اُڑانے میں سرگرمی دکھائی جائے۔ حملہ شرک و بدعت، فسق و معصیت اور زندقہ و الحاد پر کیجئے۔ غلط نشانوں پر اپنا میگزین برباد مت کیجئے۔ نصیحت کرنے والا آپ سے بہت کمتر ہے مگر اسے نظر انداز کر کے خود نصیحت پر غور فرمایئے کہ وہ اللہ اور رسول ؐ کی ہدایات کے موافق ہے

مخالف۔

مولوی حبیب الرحمان صاحب نے ہمیں "لونڈا" کہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ اس طعن سے ہماری جو تحقیر ان کے پیش نظر ہے ہم واقعتہً اس سے بھی زیادہ حقیر ہیں۔ ہم کیا اور ہمارے علم و فہم کیا۔ جماعت تبلیغی اور علمائے دیوبند میں تو ایسے ایسے معظم حضرات ہیں کہ ہم ان کے جوتے بھی اٹھائیں تو یہ ہمارے لئے باعثِ افتخار ہوگا۔ لیکن اس اعترافِ کمتری کے باوجود ہم مولوی صاحب موصوف اور جماعت اسلامی کے دیگر مخالفین کو بطور تذکیر یاد دلائیں گے کہ ہم اور آپ جس تاجدارِ دوعالم، کمالِ مجسم، آقائے محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اسے بھی نادانوں نے مجنوں، جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا۔ اس کی بھی ہر طرح کے طنز و طعن کے ساتھ تحقیر و تضحیک کی تھی۔ اس پر دست درازی تک سے باز نہ آئے تھے، یہانتک کہ اس کے جسدِ اطہر سے وہ لہو تک بہایا تھا جس کے ایک ایک قطرے کی قیمت میں یہ پوری کائنات نیلام پر چڑھ سکتی ہے اور تو اور اللہ کے کلام کو اساطیر الاولین کہا تھا اور کہنے والے العیاذ باللہ اب بھی کہتے ہیں۔ پھر کونسا مصلح، مجدد اور اونچے درجے کا داعیِ حق ایسا گذرا ہے جسے اپنوں اور بیگانوں کی شدید مخالفت، ایذا دہی اور جارحیت سے سابقہ نہ پیش آیا ہو تو سوچنے اور ڈرنے کی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی یا عامر عثمانی کے خلاف تمھاری قولی و عملی مخالفتیں کہیں ظلم و طغیان اور حق دشمنی کی ناپاکی سے ملوث نہ ہو گئی ہوں۔ عامر عثمانی تو ہیچ طفل مکتب ہے۔ وہ اپنی حقیقت خود بھی اُس ذرۂ بے مقدار سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا جو علم و عقل کے بیکراں میدانوں میں ایک طرف پڑا ہے، لیکن غرور و ظلم بڑے سے بڑے جبلِ علم و عقل کو بھی زیبا نہیں۔ خدا کی قسم جب بھی یہ سنتے ہیں (اور آئے دن سنتے ہیں) کہ فلاں جگہ کسی نے جماعت اسلامی کے کسی رکن یا ہمدرد کا درسِ قرآن بند کرا دیا تب بے اختیار دل و دماغ کرب و درد سے بھر جاتے ہیں اور قرآن کے یہ الفاظ کاسۂ سر میں گونجنے لگتے ہیں:-

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰمٓ سجدہ)	اور منکرین کہنے لگے کہ مت کان دھرو اس قرآن کے سننے میں اور بک بک کرکے اسمیں گڑبڑ ڈالو بعید نہیں کہ تم غالب آجاؤ۔

+ + + +

حاشا و کلّا یہ ہرگز نہیں کہ جماعت اسلامی کے دشمنوں کا اسلام ہماری نظر میں مشکوک ہے۔ درس قرآن بند کرانے یا کسی کو ایذا پہنچانے کا فعل یہ لوگ اسلام دشمنی یا قرآن کی تردید و تکذیب کی نیت سے نہیں کرتے، بلکہ غلط فہمیوں کے تحت یہ سمجھتے ہوئے کرتے ہیں کہ ہم اسلام کی خدمت کر رہے ہیں مگر ظاہر ہے کہ کسی کی کم فہمی یا غلط اندیشی سے حقائق تو بدلا نہیں کرتے۔ حقیقت یہی ہے کہ تمام معاصی و مظالم افعالِ کفر ہی کے زمرے میں داخل ہیں اور ہر شخص جو انکا مرتکب ہوگا وہ فتوے اور اصطلاح کے اعتبار سے کافر نہ بن جانے کے باوجود بوقت ارتکاب ایمان و اسلام سے کٹ جائے گا۔

اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا:-

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مؤمن الخ (بخاری مسلم)	جو شخص بھی زنا کرتا ہے وہ حالتِ زنا میں مومن نہیں ہوتا اور جو بھی چوری کرتا ہے وہ چوری کے وقت میں مومن نہیں ہوتا اور جو بھی شراب پیتا ہے وہ پینے کے وقت مومن نہیں ہوتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ زنا اور چوری اور مے نوشی وغیرہ کافرانہ افعال ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے قصداً نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔ اسی طرح اور بہت سے ناجائز افعال و افکار کے بارے میں حضورؐ نے تنبیہ کی ہے کہ وہ کفر کے زمرے میں ہیں۔ گویا ایک مومن جس وقت یہ افعالِ ناشائستہ کر رہا ہوتا ہے اس وقت وہ حالتِ ایمان میں نہیں ہوتا بلکہ حالتِ کفر اس پر طاری ہوتی ہے۔ ایسی باتوں پر کوئی ہمیں اسی طرح خارجی اور معتزلی قرار دے سکتا ہے جسطرح (امام ابوحنیفہؒ کو ایمان و عمل کی نازک بحث کے سلسلہ میں لوگوں نے

مرجیہ قرار دیا تھا' لیکن نہ ہم خارجی و معتزلی ہیں نہ امام اعظمؒ مخصوص مفہوم میں مرجیہ تھے۔ یقین کیجئے جب ہم معصیت کا ارتکاب کرتے ہوں ـــــ تو ان لمحات میں ہمارے ایمان پر کفر سایہ فگن ہو جاتا ہے اور درس قرآن بلا کسی معقول وجہ کے بند کرانا تو اپنے ظاہر اور شکل و صورت کے اعتبار سے ٹھیٹ کافرانہ اقدام ہے ہی جس پر متانت اور خشیت الٰہی کے ساتھ نظر ثانی کرنی چاہئے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ۔

مولوی حبیب الرحمان صاحب حج کو جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ ہم ان کے عشقِ رسول سے ہرگز انکار نہیں کرتے۔ مبارک ہیں وہ خوش نصیب جن کے قلوب کو عشقِ رسول کی بے بہا نعمت سے کچھ حصّہ مل جائے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ موصوف متقی نہیں ہیں۔ صرف اتنا کہتے ہیں اور بڑے ادب سے کہتے ہیں کہ عشقِ رسولؐ اور تقوے ہی کا یہ تقاضا ہے کہ جماعت اسلامی کی مخالفت میں غیر متین، غیر پاکیزہ اور غیر عادلانہ طریقہ نہ برتا جائے۔ یہ جس رنگ کی مخالفت کی جا رہی ہے یہ تو اُسی مخالفت کا نمونہ ہے جو بریلوی حضرات دیوبندیوں اہل حدیثوں اور جماعت تبلیغی والوں کے بالمقابل اختیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ بہت بُری اور شرمناک ہے۔ یہ دین اور دنیا دونوں کیلئے مضر ہے

اِس عاجز نے جماعت اسلامی کا بہت لٹریچر دیکھا ہے۔ مخالفین کے رسائل بھی پڑھے ہیں اپنے طور پر نہایت فکر و تدبر بھی کیا ہے۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نظر نہ آئی کہ مخالفت و منازعت کے اس ہنگامے میں شیطان کی وہی فتنہ پردازی اور دسیسہ کاری کارفرما ہے جس نے ہمیشہ دعوتِ حق کے خلاف ذہنوں کو مسموم کیا اور ہمیشہ راتی کا پہاڑ بنا کر افتراقِ امت کا بیج بویا۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں لغزشوں سے کون بچا ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی بہت سی ایسی چیزیں موجود ہو سکتی ہیں اور موجود ہونی چاہئیں جن میں حذف و ترمیم اور اصلاح و نظرِ ثانی کیضرورت ہو۔ مگر ان چیزوں کے ساتھ خیر خواہی اور اصلاح کی روش اختیار کرنے کے عوض وہ بدانجام اور المناک تعصب برتا گیا جو بریلوی حضرات دیوبندیوں کے ساتھ برتتے ہیں اور کم فہم و بے بصیرت لوگ امام ابوحنیفہؒ کے خلاف اختیار کرتے رہے ہیں۔ آگ لگی ہوئی ارباب جبّہ و دستار کی ہے اور یہی وہ گروہ ہے جو ہمیشہ ہی آگ لگانے اور بجھانے دونوں کا ماہر رہا ہے۔ علماء و مشائخ اگر تعصبات سے بالا ہو کر حق کی خدمت پر جم جائیں تو ان سے بڑھ کر شیطان کا دشمن کوئی نہیں، لیکن یہی اگر مغالطوں اور خود پرستیوں کے چکر میں پھنس کر حق دوستی کے نام پر باطل کو مدد دینے لگیں تو ان سے بڑھ کر شیطان کا خادم و معاون کوئی نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ابوحنیفہؒ اور غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ اور دیگر اکابرِ امت کے مخالفین بھی یہی سمجھ کر مخالفت کرتے ہیں کہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور جس کی مخالفت کی جا رہی ہے وہ اسلام کا دوست نہیں، لیکن ایسا سمجھنے سے اگر واقعتًہ یہ اکابر اسلام کے دشمن نہیں ہو جاتے تو جماعت اسلامی کے خلاف غلط سلط خیالات اور من گھڑت الزامات کیونکر اس جماعت کی گمراہی پر حجتِ شرعی بن سکتے ہیں۔

دوستو! عامر عثمانی لونڈا ہے یا جاہل و اجہل ہے اسے اپنی کھال میں مست رہنے دو۔ تم اپنی طرف دیکھو کہ کس قسم کا سرمایۂ آخرت جمع کر رہے ہو۔ خدا تم سے جب سوال کرے گا کہ جماعت اسلامی کی اندھا دھند مخالفت کے لئے تمہارے پاس کیا وجہ جواز تھی تو کیا اس وقت بھی کسی کو لونڈا اور کسی کو گمراہ کہہ کر اللہ کا سوال چٹکیوں میں اڑا سکو گے؟ کیا اُس وقت بھی عبارتوں میں تحریف، اخذ معانی میں دجل و فریب، الزام تراشی میں بے لگامی اور خوردہ گیری میں انتہا پسندی کام آجائے گی؟

کام صرف خلوص سے نہیں چلا کرتا۔ مخلص تو اپنے جذبۂ نیت کے اعتبار سے وہ بُت پرست بھی ہے جو تضرع کے ساتھ بُت کے آگے جھکتا اور غیر اللہ کو دیوتا سمجھتا ہے۔ لیکن تم اسے اسی لئے تو کافر و مشرک کہتے ہو کہ اس کا خلوص فکر صحیح سے خالی اور فہم سلیم سے دور ہے۔ یہی پیمانہ خود اپنی پیمائش میں بھی استعمال کرو۔ آخر کہاں کی دانشمندی ہے کہ مل جل کر طاغوتی قوتوں سے

جنگ کرنے کے عوض آپس ہی میں لڑمرنا چاہتے ہو سنبھلو، سنجیدہ
بنو اور ڈرو اس وقت سے جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ اپنے
ہی اعمال و عقائد سزا و جزا کی بنیاد بنیں گے۔ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ
لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔

ہمیں احساس ہے کہ اپنی بارہا کی روش کے مطابق اس
بار بھی ہم جواب کے حدود سے نکل کر وعظ و ارشاد کی وادی میں پہنچ
گئے ہیں، مگر کریں بھی کیا۔ معاملے کی نوعیت علمی نہ ہو تو سوائے
تذکیر و نصیحت کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

لیجئے اپنے سوالات کے جوابات بھی سن لیجئے:۔

(۱) ہمیں جماعت اسلامی کی رکنیت کا شرف حاصل نہیں۔
جماعت اسلامی کا رکن بننا اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا جماعت
تبلیغی یا جمعیۃ العلماء کا ممبر بننا۔ یہ جماعت جانچ پرکھ کر صرف
اُن لوگوں کو ممبر بناتی ہے جو عقل و شعور کی پوری آمادگی کے ساتھ
اللہ کے دین کو غالب کرنے کی ہمت آزما، صبر طلب اور کٹھن
جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہوں۔ دین کو غالب کرنے سے
کیا مراد ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب اس جماعت کے
نزدیک دوسری جماعتوں سے مختلف ہے۔ دوسری کوئی جماعت
دین کو زندگی کے تمام دائرہ اور شعبوں میں غالب و نافذ کرنے
کو اپنا نصب العین نہیں بنائے ہوئے ہے۔ یہ جماعت کہتی ہے
کہ دین صرف نماز روزے تسبیح و درود، انفرادی زہد و طاعت
اور شخصی ورع و اتقا کا نام نہیں۔۔۔ بلکہ سیاست، معیشت،
تہذیب و تمدن اور حکومت و سیادت وغیرہ کے تمام دائروں
میں اللہ اور رسولؐ کی مرضیات کو غالب و نافذ کرنا بھی دین ہی
کا اہم ترین شعبہ ہے جس سے غفلت برتنا اس کے سوا کوئی ثمرہ
نہیں دے سکتا کہ معاشرے میں برائیاں پھلیں پھولیں اور اچھائیوں
کے لئے سانس تک لینے کی گنجائش کم سے کم تر ہوتی چلی جائے۔
اسی طرز فکر کے تحت یہ جماعت بنائی گئی ہے اور اس کا نصب العین
ہے ہمہ گیر اقامتِ دین۔ مسجد سے لیکر پارلیمنٹ تک، خانقاہ
سے لیکر کارخانوں تک اسلام ہی کا سکہ چلانا اس کا مطمح نظر ہے۔
یہ نصب العین ظاہر ہے بڑا کٹھن بڑا دور اُفتادہ بڑا
صبر آزما ہے۔ ہم اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتے کہ اس کیلئے کما حقہٗ
جدوجہد کر سکیں اسی لئے جماعت اسلامی کی رکنیت بھی ہمیں
نصیب نہیں ہے۔ رہی "ایجنٹی" کی بات تو یہ نکتہ جماعت تبلیغی
والے ہی بتا سکتے ہیں کہ دینی اُمور میں ایجنٹی کیا شے ہوتی ہے۔
روس اور چین کے بارے میں تو پڑھا اور سُنا ہے کہ وہاں جو شخص
بھی اربابِ اقتدار کی مرضی کے خلاف لب ہلائے یا جنبش کرے
وہ فوراً سامراج کا ایجنٹ قرار دیدیا جاتا ہے مگر دین و شریعت
میں ہمیں یہ اصطلاح نہیں مل سکی۔

بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا خود اپنا ذہن اس قسم کا ہو کہ
بغیر دنیاوی غرض کے وہ لقمہ نہ توڑتے ہوں انھیں تو قدرتاً یہ سمجھنا
ہی چاہئے کہ عامر عثمانی یا کوئی بھی شخص بغیر دنیاوی منفعت کے کسی
سرگرمی میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ اسی نوع کے لوگ جماعت
تبلیغی کے بارے میں بھی یہی تصور رکھتے ہیں کہ اسے کہیں باہر سے
مالی مدد ملتی ہے ورنہ کہاں سے اس کی جماعتیں دنیا بھر میں
سفر کرتی پھرتیں۔ المرء یقیس علیٰ نفسہٖ ہر شخص دوسروں
کو عموماً اپنے ہی آئینے میں دیکھتا ہے۔ ہمیں بفضلہ تعالیٰ کبھی یہ
تصور تک نہیں گذرا کہ تبلیغی جماعت کے افراد کچھ لے دے کر گاؤں
در گاؤں پھرتے ہیں۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ خلوص کیش ہیں۔
اپنی جیب سے خرچ کرتے ہیں اور جماعت اسلامی کی مخالفت بھی
بدنیتی سے نہیں کرتے، بلکہ ان کے ذہنوں میں شیطان کی ذریات
نے غلط فہمیوں اور عناد و تعصب کی کاشت کر دی ہے۔ انکی
عقلوں کا پیمانہ بھی عموماً کچھ ایسا ہی ہے کہ یہ زیادہ اونچے اور غامض
مسائل و مباحث کو نہیں سمجھ سکتے۔ بہت جلد لوگوں کے بہکائے
سکھائے میں آجاتے ہیں۔

اب یہ ان حضرات کی مرضی ہے کہ ہمارے بارے میں
جو چاہے رائے قائم کریں۔ ہمارا تو خیال بھی ہے کہ روپے پیسے
والا الزام وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کی مفاد پرستی یہ تصور ہی
نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص مخلص بھی ہو سکتا ہے اور حق و صداقت
کی حمایت دنیاوی مفاد کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔

خیر ہم ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے۔ انھیں بتا
دیجئے کہ عامر عثمانی کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ تو ہندوستان کی

جماعت اسلامی دیتی ہے اور ایک لاکھ سالانہ مولانا مودودی منی آرڈر سے بھیجتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس آمدنی پر حکومت ٹیکس بھی نہیں لیتی۔ کرم فرماؤں سے کہئیے کہ کرا سکیں تو اس آمدنی کو بند کرا دیں۔

(۲) حج بہت بڑی نعمت ہے اگر مقبول ہو جائے، لیکن مقبولیت کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں۔ جو روش مولانا حبیب الرحمان صاحب کی آپ کے خط سے منکشف ہے وہ تو ایسی نہیں ہے کہ حج کی مقبولیت متوقع ہو سکے۔ عبادات کی مثال دواؤں کی سی ہے۔ دوائیں کتنی ہی کئے جائیے لیکن بد پرہیزی بھی جاری رکھیں گے تو دوائیں یا تو بے اثر رہیں گی یا کم سے کم ان کی افادیت کم ضرور ہو جائے گی۔ معروف کے ساتھ منکر بھی برابر کا لائق توجہ ہے۔ اللہ نے جہاں کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا وہاں کچھ کاموں سے رُک جانے کا بھی حکم دیا۔ یہ ممنوعہ کام امراضِ باطنی کے لئے بد پرہیزی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ درسِ قرآن کو روکنا، جماعت اسلامی کی ناحق مخالفت کئے جانا، بے علمی کے تحت الزامات تراشنا اور اصلاح و فلاح پر متوجہ کرنے والوں کو لوٹا لُٹیرے کہہ کر نظر انداز کر دینا صریحاً امورِ ممنوعہ ہیں۔ معاصی ہیں۔ اِن معاصی سے بطورِ شغل مستقل دلچسپی رکھنے والوں کے حق میں یہ امید مشکل ہے کہ حج اور دوسری عبادتیں ان کے امراضِ روحانی کا خاطر خواہ علاج کر سکیں گی۔

اختلافات کے سلسلے میں ہم تو جماعت اسلامی کی روش کچھ اس طرح کی دیکھ رہے ہیں کہ گویا اس کے اراکین اللہ کے اس فرمودے پر نظریں جمائے ہوئے ہوں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ (الروم)	یونہی مہر لگا دیتا ہے اللہ ان کے قلوب پر جو بے علم ہیں۔ سو جمے رہو تم بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور تمھیں پھسلا نہ دیں (اپنے موقف سے) وہ لوگ جو بے یقین ہیں۔

+ + +

یہ طویل جواب ہم نے اُن خدا ترس لوگوں کی خاطر پیش کیا ہے جو از راہ نفسانیت نہیں بلکہ بے خبری اور غلط فہمی کے باعث جماعت اسلامی کے دشمن بن گئے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنھیں حق ناحق سے کچھ مطلب ہی نہیں، بلکہ اپنے احبار و رہبان کو "خدا" بنا کر انھوں نے ہر دوسری آواز کے لئے ذہنوں کے سوراخ بند کر لئے ہیں انھیں ہم کیا راہ راست پر لائیں گے۔ ان جیسوں کے بارے میں تو ختمی مرتبت خاتم رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تک سے اللہ نے فرما دیا:۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	تو (اے محمد) کیا تم سناؤ گے بہروں کو یا راہ دکھاؤ گے اندھوں کو اور انھیں جو صریح غلطی میں بھٹک رہے ہیں۔

+ + + +

اور فرمایا:۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس)	تو کیا تم سناؤ گے بہروں کو اگرچہ وہ عقل نہ رکھتے ہوں۔

خاتمۂ کلام پر ایک اور نکتہ بھی ہم نفع عوام کی خاطر پیش کر دیں۔

جماعت تبلیغی اور خانقاہی حلقوں کے بزرگوں کی تعلیمات آج کل بڑے شدومد سے یہ تاثر عام کرتی جا رہی ہیں کہ علم کی درحقیقت کوئی اہمیت نہیں جو شخص نہایت نیازمندی کے ساتھ مرشدین و شیوخ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جاتا ہے اور ذکر و تسبیح سے اس کی زبان تر رہتی ہے وہی مبارک بندہ ہے وہی بے دریغ جنت میں جائے گا اور وہی سچا مومن ہے۔

ہماری دانست میں یہ تاثر غلط بھی ہے اور مہلک بھی۔ طولانی دلائل میں جائے بغیر ہم صرف امام ابوحنیفہؒ کا فرمود پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:۔

"مضبوط اور قابل اعتماد عمل وہی ہو سکتا ہے جو معرفت تامہ پر مبنی ہو۔ چنانچہ خیّر (صاحب خیر) وہ نہیں ہے جو صرف عملِ خیر کرتا ہو بلکہ اصل میں خیّر وہ ہے جو خیر اور شر کا صحیح علم حاصل کرنے اور خیر کی

خوبیاں سمجھنے کے بعد عمل خیر کرے اور بُرائی کو صحیح طور پر برائی سمجھنے کے بعد اس سے بچے۔ اسی طرح عادل وہ نہیں ہے جس سے عدل سرزد ہو بلکہ عادل وہ ہے جو عدل کی خوبی، شرف وغایت اور حسن انجام سے آگاہ ہو کر اور ظلم کی خرابی سے باخبر ہو کر عدل برتے۔

حضرت امام صاحبؒ کتاب العالم والمتعلم میں فرماتے ہیں کہ عمل علم کا تابع ہے جس طرح کہ اعضاء نظر کے تابع ہوتے ہیں۔ علم کے ساتھ معمولی عمل بھی اس عمل کثیر سے زیادہ نافع ہے جو جہالت کے ساتھ ہو۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ۔	کہدو اے محمد کیا عالم اور غیر عالم برابر ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں) جز این نیست کہ ارباب عقل و بصیرت ہی کرنے کی طرح اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔"

+ + + +

حضرت امام صاحبؒ کے اس تبیان کے بعد کیا یہ بیان کرنے کی حاجت رہ گئی کہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے افراد کے اعمال واشغال باہم کیا تفاوت رکھتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تبلیغی جماعت میں کثرت کن لوگوں کی ہے ہوتا یہ ہے کہ کتنے ہی اَن گھڑ اور بے علم لوگ وقتی تحریک ترغیب کے تحت شریک جماعت ہو جاتے ہیں۔ چلّے دیتے ہیں کچھ تسبیحیں اور وظائف سیکھ لیتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی گنجائش ہی نہیں کہ خیر وشر اور عدل وظلم کی حقیقت کا ذرا سا سایہ بھی ان کے نا مبروع ذہنوں پر پڑ سکے یہ کیا جانیں کہ چلّوں کا یہ طریقہ قرآن وسنت کی کن ہدایات سے اخذ کیا گیا ہے اور کفر واسلام کی حقیقتیں ایک دوسرے سے کتنی مختلف اور کس درجہ متضارب ہیں۔ انھیں کچھ نہیں معلوم۔ ان کے تمام معمولات اور اشغال بھیڑ چال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ان لوگوں کی مانند ہیں جو راہ چلتے کسی انبوہ میں شریک ہو جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ انبوہ کس لئے جمع ہوا ہے۔

اس کے برخلاف جماعتِ اسلامی کا ایک رکن بھی ایسا نہیں جو کافی دنوں تک مختلف اہم مسائل پر مطالعہ اور تدبر کرنے کے بعد پورے عزم وشعور کے ساتھ اس میں شامل نہ ہوا ہو۔ اس کے ذہن وقلب نے جب اچھی طرح یہ صداقت قبول کرلی کہ اسلام کی ہر تعلیم خیر وفلاح سے لبریز اور غیر اسلامی تعلیمات سراسر فتنہ ہیں اور پھر یہ بھی سمجھ لیا کہ اسلام کو غالب ونافذ کرنے کے لئے منظم جدوجہد بلاشبہ ضروری ہے تب وہ جماعت اسلامی میں شریک ہوا ہے۔ لہٰذا خود قرآن کی تصریح کے مطابق یہ کہنا ظلم اور کذب ہی ہوگا کہ اِن ہر دو قسم کے افراد کی عبادتیں اور سرگرمیاں ایک ہی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ کیا اندھے اور سونکھے برابر ہو سکتے ہیں مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں کیسا فیصلہ دیتے ہو۔

امام اعظمؒ کے مذکورہ تبیان کا مصدر ومبنیٰ قرآن و حدیث کی کثیر نصوص میں یہاں ہم مثالاً دو حدیثیں نقل کرتے ہیں حضورؐ سے دو ایسے شخصوں کے بارے میں سوال کیا گیا جن میں سے ایک عابد ہو اور دوسرا عالم۔ حضورؐ نے جواب دیا:-

فضل العالِمِ علی العابِدِ کفضلی علی ادنٰکم ثم قال ھٰذہ الآیۃ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (مشکوٰۃ کتاب العلم)	عالم عابد پر ایسی ہی برتری رکھتا ہے جیسی میں تم میں سے ایک معمولی فرد پر۔ پھر حضورؐ نے یہ آیت قرآنیہ پڑھی۔ جز این نیست کہ اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں

ایک اور حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

فقیہٌ واحدٌ اَشَدُّ علی الشیطٰن من الف عابد (مشکوٰۃ کتاب العلم)	ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔

+ + + +

جن لوگوں کے قلوب میں اللہ اور رسولؐ کے ارشاداتِ مبارکہ کی قرار واقعی عظمت واہمیت ہے وہ تو یقیناً ہماری معروضات پر دیانت کے ساتھ توجہ کریں گے، کیونکہ ہم قرآن وحدیث ہی کی روشنی میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن جن حضرات کو اللہ اور رسول سے زیادہ فلاں حضرت جی اور فلاں پیر و مرشد

اور فلاں سجادے صاحب پر اعتماد ہے وہ لونڈا تو کیا ہمیں پاجی اور گمراہ اور اجہل بھی کہدیں تو کوئی غم کی بات نہیں۔ جہالت، اندھی تقلید اور استکبار ان تینوں میں سے ہر شئے آدمی کو کنوے کا مینڈک بناتی اور اپنی کینچلی میں مگن رکھتی ہے۔ وہ اپنے خلاف بڑے سے بڑے علمی و عقلی استدلال کو پھبتی یا سکوتِ بے نیازی سے رد کردیتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ مخلص اور سلیم الطبع ہوتے ہیں وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح ایک بے علم بڑھیا اور ایک ادنیٰ اعرابی کی بات بھی نہ صرف بغور سنتے ہیں بلکہ وہ معقول ہو تو اپنے قصور کا اعتراف کرتے اور تائب ہوتے ہیں۔ الھدایۃ والسعادۃ کُلٌّ مِنَ اللّٰہِ

شراب ملی ہوئی دوائیں

سوال ۲:۔ از۔ شاہد اقبال۔ دہلی۔

آج کل عام طور سے انگریزی دوائیں بہت استعمال کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض دوائیں ایسی ہوتی ہیں جن میں شراب کا جز ملا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دوا آتی ہے جس کا نام واٹر بری کمپاونڈ ہے۔ یہ شربت کی شکل کی ہوتی ہے اور نزلہ کے لئے اکسیر ہے۔ لیکن اس کے ڈبے پر لکھا ہوتا ہے کہ اس میں شراب کا جز بھی ملا ہوا ہے تو اب ایسی صورت میں اس دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں جب کہ اس کے پینے سے ذرہ برابر بھی نشہ کا اثر نہیں ہوتا؟

الجواب ۲:۔

مختصر جواب تو یہ ہے کہ کسی بھی ایسے مکسچر یا مشروب کا پینا جائز نہیں ہے جس میں شراب کی آمیزش کا یقین یا گمان غالب ہو۔ شراب کے حرام ہونے کی علت تو بے شک نشہ ہی ہے لیکن دلائل قویہ سے یہ اصول طے پاگیا ہے کہ جس شے کی معتد بہ مقدار نشہ لانے والی ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہوگی خواہ وہ قلیل مقدار بجائے خود نشہ طاری کرنے کی قوت نہ رکھتی ہو۔ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام [1]

ماضی میں تو یہ ایک صاف سا مسئلہ تھا جس میں بحث و جدل کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن موجودہ زمانے میں مغربی طرزِ فکر کے غلبۂ و تسلط اور احوال و کوائف کے تغیر نے بعض اور مسائل کی طرح اسے بھی قدرے الجھا دیا ہے لہذا اُن حضرات کے لئے جو دین سے بغاوت کا بھی ارادہ نہیں رکھتے مگر احکام شرعیہ کے بارے میں ذہنی تسکین کے بھی طالب ہیں ہم قدرے تفصیل کی راہ اختیار کریں گے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شراب کی حرمت کا سبب اس کا نشہ آور ہونا اگرچہ ظاہر و باہر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ صرف اُسی شخص کے لئے حرام ہوگی جس پر اسے پی کر نشہ طاری ہوجائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شراب میں بالذات نشہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور اسے تیار ہی کیا جاتا ہے نشہ آور مشروب کی حیثیت سے۔ لہذا اس کا صرف ایک قطرہ بھی کسی نہ کسی درجے میں اُس علت کا حامل ہے جس پر حرمت منحصر ہے یعنی نشہ پیدا کرنے کی صلاحیت۔ تو حرمت کے لئے ایک قطرہ بھی کافی ہوگا جب تک کہ کسی مصنوعی یا قدرتی عمل سے اس کی حقیقت ہی تبدیل نہ ہو جائے۔

حقیقت تبدیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کیمیاوی تحلیل یا پکانے اور جلانے کے کسی طریق سے اس کے تمام یا بعض اجزا میں جوہری تغیر واقع ہوجائے یا اس کا کوئی ایسا جزو مکمل طور پر تحلیل ہوجائے جس کے بغیر باقی اجزاء نشہ پیدا کرنیکی صلاحیت سے عاری ہوں۔ ایسی صورت میں حرمت کا حکم باقی نہ رہیگا جیسے کہ سرکہ کسی مقدار میں بھی حرمت نہیں اور جیسے کہ کچا گوشت پکنے کے بعد حلال و طاہر ہو جاتا ہے حالانکہ جو لہو بجائے خود حرام تھا وہ اس سے علیحدہ نہیں کیا گیا بلکہ پکنے کے دوران اس کے بعض عناصر بھاپ بن کر اُڑ گئے اور بعض اپنی جوہری ترتیب ختم کرکے پارچوں میں جذب ہوگئے۔ یا جیسے دریا میں بول و براز کی آمیزش اس کے پانی کو ناپاک نہیں کرتی کیونکہ مقداری تناسب کا فرقِ عظیم کیمیاوی تحلیل کا قدرتی سبب بن جاتا ہے اور نجاست کے وہ اوصاف کالعدم ہوجاتے ہیں جن کے وجود سے یہ نجاست عبارت تھی۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہر وہ مکسچر اور مشروب بالیقین

حرام ٹھیرتا ہے جن میں شراب، شراب ہی کی حیثیت سے آمیز کی گئی ہو اور اجزا کا تناسب اس درجہ کا نہ ہو کہ شراب کے اجزاء و عناصر کالعدم ہو کر رہ جائیں۔ واٹر بری کمپاؤنڈ کے بارے میں جب کہ خود بنانے والوں نے وضاحت کر دی ہے کہ اس میں شراب کا جزء موجود ہے تو پھر اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ شراب کو اس کے فارمولے میں ایک جزءِ مستقل کی حیثیت حاصل ہے اور تناسب کے اعتبار سے بھی اس کی مقدار کافی ہے ورنہ اس کی آمیزش کی صراحت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا

لیکن اُن دواؤں کی حرمت کا فیصلہ دینا آسان نہ ہوگا جن کے بارے میں ہمیں یقین تو کیا گمانِ غالب بھی نہ ہو کہ ان میں شراب آمیز کی گئی ہے مشہور عام طور پر یہی ہے کہ اکثر ڈاکٹری دواؤں میں شراب کی ملاوٹ ضرور ہوتی ہے لیکن یہ شہرت حرمت کے لئے کافی نہیں۔ خصوصاً اس دور میں تو دواؤں کے پیکنگ پر فارمولا (نسخہ) بھی درج ہوتا ہے اس کو پڑھکر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ شراب شامل ہے یا نہیں۔

قانون کا فلسفہ

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی حرام شے کے حلال ہو جانے کے لئے بس اتنی ہی بات کافی ہے کہ جس علت کی وجہ سے حرمت کا حکم دیا گیا تھا وہ علت عملاً موجود ہو تو ایسا خیال کرنا دنیا اور دین دونوں کے فلسفۂ قانون سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا دنیاوی قوانین کی مثال دیکھئے کہ بغیر لائسنس کے پستول رکھنا جرم ہے۔ علت اس جرم کی اس کے سوا کیا ہے کہ لائسنس کی شرط نہ ہونے کی صورت میں یہ مہلک ہتھیار تمام ان لوگوں کے بھی قبضے میں پہنچ جائیگا جن کے کردار کا کوئی علم حکومت کو نہیں اور جن سے ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ وہ اسے ناجائز طور پر استعمال کر ڈالیں گے۔

اب فرض کیجئے ایک شخص بغیر لائسنس کا پستول رکھنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہے لیکن اس نے ابھی تک اس پستول کو ناجائز طور پر استعمال نہیں کیا ہے تو کیا قانون کا فیصلہ یہ ہوگا کہ اسے کوئی سزا نہ دی جائے کیونکہ اس کے معاملہ میں وہ علت عملاً نہیں پائی گئی جس کی بنیاد پر پستول رکھنا جرم قرار دیا گیا تھا اور کیا جج یہ کہے گا کہ اسے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس نے پستول کا استعمال ہی نہیں کیا۔

سب کو معلوم ہے کہ قانون کا فیصلہ یہ نہیں ہوگا۔ اسلئے نہیں ہوگا کہ دراصل جرم قرار دینے کی بنیاد خطرے کا عملی جامہ پہن لینا نہیں بلکہ بجائے خود اس خطرے کا پایا جانا ہے۔

اسی طرح شراب کی حرمت اگرچہ بظاہر نشے ہی پر قائم ہے لیکن فی الاصل نشہ پیدا کرنے کی صلاحیت کا پایا جانا سبب حقیقی ہے نہ کہ اس نشہ کا عملی جامہ پہن لینا۔ جو شخص ایک بوند استعمال کر لیتا ہے اس کے بارے میں یہ باور کرنے کی کوئی ضمانت نہیں کہ چند بوندیں اور بھی استعمال نہیں کرے گا۔ یہی امکان اور اندیشہ ہے جسے دنیاوی قوانین میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور دینی قوانین میں بھی۔ ایک غیر سند یافتہ ڈاکٹر اُسی وقت مجرم نہیں ٹھیرایا جائے گا جب کہ وہ اپنے اناڑی پن سے کسی مریض کو ہلاک کر دے بلکہ اسے اس صورت میں بھی قانون مجرم ہی قرار دے گا جب کہ کوئی ضرر اس سے کسی مریض کو نہ پہنچا ہو بلکہ فائدہ ہی فائدہ پہنچ رہا ہو۔ حالانکہ غیر سند یافتہ لوگوں کو پریکٹس کی ممانعت اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ ان کے اناڑی پن سے صحتِ عامہ کو خطرہ ہے لیکن اس خطرے کا عملی لباس پہن لینا ضروری نہیں لہٰذا شراب کی حرمت کے لئے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس کی وہی مقدار حرام ہو جو عملاً نشہ پیدا کر دے۔

شرعی تمثیل میں زنا کی مثال لیجئے۔ ظاہر ہے زنا کی حرمت کے لئے بھی کوئی نہ کوئی علت و سبب ہے۔ آپ کوئی بھی علت ـــ یا متعدد علتیں تجویز کریں مگر بعض صورتیں زنا کی ایسے ضرور نکل سکتی ہیں جن میں تجویز کردہ علتوں میں سے ایک بھی علت نہ پائی جاتی ہو تو کیا ان صورتوں میں آپ زنا کو جائز قرار دیں گے؟ ـــ مان لیجئے ایک ایسی بیوہ ہے جسے آپریشن کے ذریعے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اب ایک شخص، اس سے نہایت محفوظ و مخفی

مقام پر زنا کرتا ہے تو دیکھ لیجئے کہ کوئی بھی وہ علت نہیں پائی گئی جسے مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے حرمتِ زنا کی علت قرار دیا جائے۔ لیکن زنا پھر بھی حرام قرار پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض افعال اپنی سرشت اور وضع ہی میں قبیح ہوتے ہیں اور ان کی حرمت اس علت پر موقوف نہیں ہوتی کہ ہم نے عقل و منطق کے ذریعہ جن گوناگوں نقصانات کو ان کے لئے اسبابِ حرمت سمجھا ہے ان میں سے کوئی سبب ظہور میں آ ہی آجائے۔ جن شاذ صورتوں میں کوئی بھی سبب موجود نظر نہ آئے وہ بھی ممنوع قرار پائیں گی۔

شراب بھی زنا کی طرح قبیح بالذات ہے۔ اس کے خمیر اور سرشت ہی میں نشہ آوری ہے لہذا حرمت کا فیصلہ دینے کے لئے اس کا انتظار نہیں کیا جائے گا کہ نشہ ظہور ہی میں آجائے ایسا کیسے نہ ہو جب کہ قانون کا ازلی و ابدی فلسفہ ہی یہ ہے کہ جو فعل ممنوع ہوگا اس کے طبعی ذرائع پر بھی حکم ممانعت لگایا جائے گا اور ممانعت کی نرمی یا شدت اس پر منحصر ہے کہ اصل جرم کس درجے کا جرم ہے۔ اگر بھیانک قسم کا جرم ہے تو اس کے وسائل و اسباب کی ممانعت میں بھی شدت و وسعت برتی جائے گی۔ شراب، قمار، زنا، سود شریعت میں بدترین قسم کے جرائم ہیں۔ چنانچہ سود ہی کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ اللہ کے رسولؐ نے بعض ایسے معاملات کو بھی فاسد قرار دیا جن میں سود کی مشابہت تھی۔ اسی بنیاد پر قانونِ شرعی میں یہ طے ہے کہ ماہرینِ قانون کے نزدیک جس عقد (معاملے) میں سود کی مشابہت جوہری اعتبار سے متحقق ہو جائے وہ حرام و باطل قرار پائے گا۔ اور اسی طرح شراب پینے ہی کو نہیں اسکے بنانے کو، بیچنے کو، اس کی درآمد برآمد کو، اس کے لئے جگہ کرائے پر دینے کو ممنوع ٹھیرایا اور اسی طرح مرد و زن کے اختلاط، بوس و کنار اور حد سے متجاوز بے تکلفی کو جرم قرار دیا۔

الحاصل جو لوگ صحیح طور پر یہ جان لیں کہ شراب نوشی کا سدباب کس شدت و اصرار کے ساتھ اسلام کو مطلوب ہے انھیں اس نکتہ پر مطمئن ہونے میں ہرگز تامل نہیں ہو سکتا کہ شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے اور ایسے ٹانک اور دوائیں مسلمان کے لئے "نجاست" کا درجہ رکھتی ہیں جن میں شراب آمیز کی گئی ہو۔

انعامی باؤنڈز

سوال ۳:- (ایضاً)

ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے کئی سال سے "قومی انعامی باؤنڈ" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ اس وقت صرف پاکستان اسکیم کے بارے میں معلومات کرنی ہے۔

شاید آپ کو بھی معلوم ہو، حکومت نے یہ طریقہ کیا ہے کہ نوٹ سے مشابہ باؤنڈز تیار کرائے ہیں جن پر ان کی متعینہ قیمت درج ہوتی ہے اس طرح یہ باؤنڈز اتنی مقررہ قیمت کے کرنسی نوٹ کے مساوی ہوتے ہیں جو ان پر درج ہے۔ جو شخص یہ بونڈ خریدتا ہے وہ اس کا مجاز رکھتا ہے کہ روپے کی ضرورت پڑنے پر وہ جب بھی جہاں سے چاہے اسے کیش کرا سکتا ہے۔ زرِ مبادلہ میں اسے اتنے ہی روپے مل جائیں گے جتنے کا اس نے یہ خریدا تھا۔ حکومت کی مقرر کردہ میعادوں پر سال میں چار مرتبہ تمام فروخت شدہ بونڈوں کی قرعہ اندازی ہوتی ہے اور تعداد مقررہ کے مطابق قرعہ اندازی میں نکلنے والے بونڈوں کے نمبروں کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اب اعلان شدہ نمبروں کے بونڈ جس کے پاس بھی ہوں وہ اسے دکھا کر اپنا انعام وصول کر سکتا ہے۔ ایک بار انعام نہ نکلنے کے بعد یہ بونڈ بیکار نہیں ہوتے بلکہ بعد کی قرعہ اندازی میں بھی شریک رہتے ہیں اور اگر انعام پانے والا شخص چاہے تو ایک یا دو بار انعام حاصل کرنے کے باوجود بغیر کسی سودی لین دین کے انھیں کسی بینک میں یا نجی طور پر فروخت کر کے اپنی اصل قیمتِ خرید وصول کر لے۔ مختصر یہ کہ کوئی شخص خواہ انعام حاصل کرے یا نہ کرے اس کی اصل رقم بہرحال محفوظ رہتی ہے اور وہ جب بھی چاہے ایک پیسہ بھی سود کا ٹے پائے بغیر اسے وصول کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بونڈوں کی خرید و فروخت جائز ہے یا ناجائز۔ اگر ناجائز ہے

تو اس کی کیا وجہ ہے؟

الجواب:-

اس سے پہلے بھی تجلی میں اظہارِ خیال کیا جاچکا ہے لیکن اب تک کسی ایسے سبب کا علم نہیں ہوا جس کی بنیاد پر ان باؤنڈوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا جائے۔ اس معاملے کی جوہری مشابہت نہ سود سے ہے نہ قمار سے نہ بیع فاسد کا کوئی ایسا عنصر اس میں پایا جاتا ہے جس کی تاویل نہ ہو سکے۔ لہٰذا سببِ حرمت سے آگاہ ہوئے بغیر تو ہم اسے جائز ہی کہیں گے۔ سُنا ہے کہ بعض حضرات جواز کے قائل نہیں۔ معلوم نہیں ان کے دلائل کیا ہیں۔

فال اور استخارہ

سوال:- (ایضاً)

شریعت میں استخارے کی کیا حیثیت ہے۔ کیا ہر شخص استخارہ کرنے کا مجاز ہے؟ استخارہ کس طرح کرنا چاہئے اور کس قسم کے معاملات میں؟ بعض لوگ ہر معاملہ میں استخارہ کرانے کے قائل ہوتے ہیں اور خاص طور پر شادی بیاہ کے معاملات میں خواہ شادی کرنے والے راضی ہوں لیکن وہ لوگ بغیر استخارہ کرائے بات کرنے پر راضی نہیں ہوتے اور بعد میں کہہ دیتے ہیں کہ استخارہ بہت خراب آیا ہے وغیرہ۔ کیا اس طرح ہر بات پر چاہے جس سے استخارہ کرا لینا درست ہے؟

اس طرح بعض لوگ مختلف طریقوں سے قرآن سے فال نکالتے ہیں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر استخارہ اور قرآن کی فال باہم متعارض ہو جائیں تو ان میں ردّ و قبول کی کیا صورت ہوگی اور اس ردّ و قبول میں کچھ قباحت تو نہیں؟

الجواب:-

ہمیں اس باب میں صرف اتنا معلوم ہے کہ قرآن وغیرہ سے فال نکالنا بے بنیاد ہے اور بعض حالتوں میں اس کی حرمت کا قول کیا جائے گا۔ رہا استخارہ تو ایسے اُمور میں جن کا کرنا نہ کرنا شرعاً مباح ہو اس کا جواز ہے۔ گو کہ اس سے قطعی فیصلے کی حیثیت تخمین و ظن سے زیادہ نہیں۔ ترکیب کا ہمیں علم نہیں کسی اور صاحبِ علم سے دریافت کی جائے۔

مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی وغیرہ

سوال:- از۔ مولانا غلام رسول ساکن چیچہ شاہ (پاکستان)

(۱) مولانا مودودی کی ذات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ علم و عمل کا پیکر ہے یا محض تحریری ید طولیٰ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو اندھی عقیدت میں مبتلا کر رکھا ہے؟

(۲) تحریکِ اسلامی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ سیاسی یا مذہبی حیثیت سے علماء کرام کی جانب سے اس تحریک میں جو خامیاں اور غلطیاں واضح کی جارہی ہیں وہ کس حد تک صحیح ہیں؟

(۳) کیا آپ دار العلوم دیوبند کے خلاف جو مضامین لکھتے رہتے ہیں یا "مسجد سے میخانے تک" کے زیرِ عنوان جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ اس بات کی تو غمازی نہیں کرتے کہ آپ نے یہ سارا مسئلہ خاندانی چپقلشوں کی وجہ سے تو نہیں چھیڑ رکھا۔ ہمارے اکثر حلقہ میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے

الجواب:-

(۱) مولانا مودودی کی نجی زندگی سے ہمیں تفصیلی واقفیت نہیں ہے لیکن اتنی واقفیت ضرور ہے کہ ان کے اقوال و اعمال میں نفاق و تخالف نہیں ہے۔ کسی سخت سے سخت دشمن نے بھی آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مولانا موصوف کی بے عملی اور منافقت کو ثابت کر سکتا ہے۔ مولانا کسی کنجِ عزلت میں نہیں رہتے ان کے شب و روز کا مطالعہ کرنے والے بے شمار افراد ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی مولانا پر اعمالِ شرعیہ میں غفلت و تساہل کا الزام نہیں رکھتا تو آخر اس کا کیا جواز ہے کہ ہم بیٹھے بٹھائے ایک سوال کھڑا کریں اور عیاش قسم کے ذہنوں کو چنیں چناں کا موقع دیں۔

اندھی عقیدت جہلاء میں تو چل جاتی ہے، لیکن اس جماعت کا امیر جس میں پڑھے لکھے لوگ ہی شریک ہیں، زیادہ دنوں تک اپنے ساتھیوں کو مصنوعی زہد و تقویٰ کے جال میں نہیں پھانسے رکھ سکتا۔

(۲) کسی فرد یا جماعت کی خامیوں کی نشاندہی اگر متانت

علم اور انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی جائے جب تو اس پر غور کر کے یہ فیصلہ دیا جا سکتا ہے کہ کونسی خامی کس درجے میں واقعتہً موجود ہے اور کونسی خامی خود نشاندہی کرنے والوں کے غلط انداز نظر کی زائیدہ ہے۔

لیکن جہاں حال یہ ہو کہ مخالفتوں نے بازاری شکل اختیار کر رکھی ہو، علماء اپنے مقام کو فراموش کر کے معاندین کی سطح پر اتر آئے ہوں، لغو ولاطائل اعتراضات واتہامات کی گرم بازاری ہو اور جہل مرکب نے طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہو وہاں کون یہ فیصلہ دے کہ کونسی خامی حقیقی ہے اور کونسی فرضی۔ اور فیصلہ بھی دیدے تو سُننے اور دیانت کے ساتھ غور کرنے والے ایسے معترضین کے انبوہ میں کہاں سے آئیں گے جن کا پیشہ ہی یہ ہو کر رہ گیا ہو کہ جماعت اسلامی کو ہر قیمت پر ذلیل و رسوا کیا جائے۔

ہمارے پاس سَو سے زائد اخبارات و رسائل آتے ہیں اور کتابوں کا مطالعہ بھی بقدر فرصت جاری رہتا ہی ہے ہم اپنے خدا کو حاضر و ناظر جانکر اور حساب آخرت کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایک بھی اعتراض ایسا آجتک ہماری نظر سے نہیں گزرا جس کی رو سے جماعتِ اسلامی کی مخالفت کار خیر قرار دی جا سکے۔ زیادہ تر اعتراض تو ایسے اذہان کی تراوش ہیں جنھیں نفس امّارہ اور ابلیس کی سازش نے کج فکری، کینہ پروری اور جہل مرکب کا گنجینہ بنا کر رکھدیا ہے۔ کچھ اعتراض ایسے ہیں جو معترضین کی قلتِ فہم پر مبنی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بنیاداً تو درست ہیں مگر انھیں بفرقِ مراتب انلارج اور المضاعف کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو بنیاداً ہی نہیں تفصیلاً بھی درست ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر جماعت اسلامی کو ضال ومضل قرار دینا، اسکی مخالفت کرنا اور اسے بیخ وبُن سے اُکھیڑ پھینکنے کے جذبے کی نمائش فرمانا بجائے خود گمراہی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ اصلاح کا طریقہ یہ ہر گز نہیں ہوتا کہ عمارت کا اگر ایک ستون کج یا ایک دیوار کمزور ہے تو پوری عمارت ہی کو اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ آدمی کی ایک انگلی میں زخم ہو تو اس کا مرہم ڈھونڈنے کی بجائے خود بچارے آدمی ہی کو ذبح کر دینے کا مشورہ دیا جائے۔

آپ صاحب علم ہیں اگر آپ کے سامنے واقعتہً کچھ ایسی خامیاں جماعت اسلامی کی آئی ہوں جنھیں امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا جا سکے تو براہ کرم کھُل کر انھیں منکشف فرمائیں ہم انکا خیر مقدم کریں گے اور اپنے ناقص علم وفہم کے مطابق اظہار خیال سے بھی نہیں چوکیں گے۔

(۳) ہر شخص آزاد ہے جو چاہے سوچے اور جیسا چاہے فیصلہ دے۔ دل ایسی چیز تو ہے نہیں جو کسی کے آگے چیر کر رکھدی جائے۔ ہم تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ خاندانی چپقلشوں سے کسی بھی قسم کی دلچسپی ہمارے مزاج وطبیعت سے اتنی بعید ہے کہ شاید آسمان بھی زمین سے اتنا بعید نہ ہو۔ یہ بات کبھی کبھار یہ سوء ظن رکھنے والے کرم فرما ہی یاد دلا دیتے ہیں کہ ہمارے اور کسی اور کے خاندان میں کبھی کوئی کشمکش اور چپقلش بھی رہی ہے۔ ورنہ علاّم الغیوب جانتا ہے کہ یہاں تو ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی اس مرحوم چپقلش کا کوئی زندہ تصور پایا ہی نہیں جاتا۔ نفسیات اگر کوئی چیز ہے تو اسی ایک بات سے ہمارے ذہن ومزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کچھ روز ہوئے پاکستان کے ایک پروفیسر صاحب نے "تجلیات عثمانی" کے نام سے ہمارے حقیقی چچا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پر ایک ضخیم کتاب شائع کی تھی۔ اس کتاب میں جس شد ومد اور جوش وخروش کے ساتھ علامہ عثمانیؒ کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر وبیان ہوا ہے اس کا بدیہی تقاضا تھا کہ اگر خاندانی عصبیت کا معمولی سا جذبہ بھی ہمارے اندر ہوتا تو اس کتاب کو "مکتبہ تجلی" کے ذریعے خوب خوب اشاعت دیتے لیکن تجلی کا فائل اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں اتفاق سے ہی اس کا معمولی سا اشتہار نظر آجائے گا۔

دوسری بات یہ بھی سن لیجئے کہ اگر خاندانی چپقلش سے ہمیں دلچسپی ہوتی تو سب سے پہلے ہم "سوانح قاسمی" پہ مفصل تنقید کرتے جو تاریخی حقائق کے لحاظ سے بددیانتی کا شاہکار ہے۔ جس میں خاندانِ عثمانی کو خصوصاً نظر انداز کرنے اور واقعات

کو مسخ کر کے تمام امتیازات کسی اور خاندان کو عطا کرنے کا وہ فن استعمال کیا گیا ہے کہ صداقتیں منہ دیکھتی رہ گئیں ہیں لیکن قارئین تجلی گواہ ہیں کہ اس بکھیڑے میں بھی ہم نہیں پڑے۔

تیسری بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے والدِ محترم مولانا مطلوب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ ایک معروف مرشد تھے۔ ان کے ہزاروں مرید ہند و پاک میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ذہن و مزاج کا معمولی سا بھی جوڑ خاندانی عصبیت کے ساتھ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تجلی کے صفحات والد مرحوم کے اذکار مسلسل سے خالی رہتے۔ خصوصاً جب کہ دیوبند کے ایک خانوادے نے یہ اسوہ بھی سامنے رکھ دیا ہے کہ سعادت مند بیٹا باپ کی زندگی ہی میں باپ کو سقراطِ زماں اور طبیب دوراں بنا دے سکتا ہے تو ہمارے لئے کیا دشوار تھا کہ تجلی جیسے مقبول (بفضلہ تعالیٰ و باحسانہ) پرچے کو باپ اور چچا اور دادے (فضل الرحمنؒ جو بانیٔ دارالعلوم کی حیثیت رکھتے تھے) کی تصویر کشی اور شہرت دہی کیلئے استعمال کریں۔ مگر ہم سے کچھ نہ ہوا۔ ہم پر توفی الحقیقت خاندانی عصبیت کا سوءِ ظن بر عکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق ہے۔ سچا اعتراض اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے..... کہ ہم خاندانی عصبیت کے معاملہ میں ناخلف اور مغفل رہے ہیں۔

الحاصل علمائے دیوبند پر نقد و تعریض کو خاندانی چپقلش سے جوڑنا اتنا ہی مطابق واقعہ ہے جتنا مولانا مودودی کو خارجی کہنا یا ان کی طرف اسلامی تعزیرات کو ظالمانہ قرار دینے کا انتساب کرنا یا حضرت عثمانؓ کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے سارا خزانہ اپنے عزیز و اقربا کو بانٹ دیا۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)۔

کھانے پینے کی چیزوں پر پھونکیں مارنا

سوال:- از۔ نظام الدین۔ شب پور۔ ہوڑہ۔

تعویذ گنڈے، پانی، تیل یا کسی دوسرے کھانے کی چیزوں پر پھونک مارنا برائے شفا یابی یا برکت کیسا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ خصوصاً بعد نماز مغرب مسجد کے دروازوں پر پانی پھونکنے یا لڑکوں کو پھونک ڈالنے کے لئے ایک کثیر مجمع ہو جاتا ہے۔ اس باب میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب:-

بعض احادیث میں ملتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص مواقع پر کچھ پڑھ کر کھانے پینے کی بعض چیزوں پر دم کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں غیر معمولی برکت کا معجزہ ظہور میں آیا۔ اس سے دم کرنے کا جواز تو بظاہر نکلتا ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس طریق کو بطور سنت معمول بہا بنا لینا چاہئے۔ حضورؐ کو متعدد معجزے عطا کئے گئے اور ان میں سے یہ معجزہ بھی تھا کہ آپ کے لعاب دہن سے امراض کو شفا ہو گئی اور آپ کے بعض الفاظ سے کھانے پینے کی چیزوں میں بے انتہا برکت و اضافے کا مظاہرہ ہوا۔ یہ اگر حضورؐ ہی کی خصوصیت نہ ہوتی تو ہم دیکھتے کہ صحابہؓ نے بھی عموم و کثرت کے ساتھ دم کرنے کا طریق اختیار کیا ہوتا کیونکہ صحابہؓ سے بڑھ کر سنتِ نبوی کی پیروی کرنے والا کون ہو سکتا ہے مگر آثارِ صحابہ میں دم کرنے کا عمل عموم کے ساتھ تو کجا خصوص و شذوذ کے ساتھ بھی نہایت تلاش تفحص کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل بطور سنت عمومیت کے ساتھ اختیار کرنے کا نہیں۔ ویسے یہ دعویٰ بہر حال غلط ہوگا کہ آیاتِ الٰہیہ پڑھ کر دم کرنے سے کسی نفع و برکت کی امید ہو ہی نہیں سکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

امتیازی الفاظ

سوال:- (ایضاً)

ہندوستان میں خاندان و نسب کے خطابات امتیاز و برتری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ علمائے کرام بھی اپنے ناموں کے ساتھ ایسے خطابات استعمال کرتے ہیں جن سے برتری کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلامی مساوات کے پیش نظر بعض احباب کو اس طرح کے خطابات سے ذہنی الجھاؤ ہے شرعی حیثیت سے اس کی کہاں تک اجازت ہے صراحت کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

الجواب :-

اصل ناموں پر اضافہ کئے ہوئے الفاظ دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن سے تعارف مقصود ہو۔ دوسرے وہ جن سے مدح وستائش کا ارادہ کیا جائے۔ پہلی قسم کی مثال یہ ہے جیسے سلمان فارسی، ابوذر غفاری، صہیب رومی، بلال حبشی، معین الدین چشتی، عبدالقادر جیلانی، عامر عثمانی، ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہا ان ناموں میں اصل پر جو اضافہ ہے وہ کسی مقام یا خاندان یا گروہ کی طرف نسبت کی شکل میں ہے جو صرف تمیز وتعارف کا فائدہ دیتا ہے خود ستائی، تفوق پسندی اور استکبار سے اسکا کوئی تعلق نہیں اس طرح کے تمیز وتعارف کی اجازت خود باری تعالیٰ نے دی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات)	اے لوگو ہم نے تمھیں بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس کی پہچان ہو۔

متعدد صحابہؓ کے ناموں کا وطن یا خاندان کے ساتھ منسوب ہونا اور حضورؐ کا اسے ناپسندیدہ قرار نہ دینا بجائے خود کافی وشافی دلیل ہے اس بات کی کہ یہ انتساب اعلان برتری کا مظہر نہیں نہ مساوات کا مخالف ہے۔

دوسری قسم کی مثال یہ ہے جیسے علامہ، مولانا، حکیم الامت، شیخ الاسلام، محبوب الملت وغیرہا ــــ یہ خطابات عموماً عوام کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال میں دوسرے لوگوں کے لئے تو کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ انھیں خواہ مخواہ نہ گھڑ لیا گیا ہو، البتہ خود صاحب خطاب کو انھیں اپنے نام کے ساتھ استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ صریحاً خود ستائی ہو گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ احکم۔

قربانی

سوال ۳:- از محمد عبدالکریم۔ اورنگ آباد دکن۔

اگست ۶۲ء کے تجلی میں "تفہیم الحدیث" کے ذیل میں یہ پڑھ کر کہ اسلام میں انسانوں ہی کے ساتھ نہیں جانوروں تک کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی ہے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو جانوروں کو ذبح کر کرکے کھانا نہایت بے رحمانہ فعل ہوا اور قصاب حضرات تو بڑی ہی ستم رانی کے مرتکب ہیں ــــ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ رائج تھا؟

(سوال غیر ضروری طویل تھا۔ مختصر کر دیا گیا ہے تاہم جواب میں ہم جملہ شبہات کا لحاظ رکھیں گے)۔

الجواب :-

معلوم ہوتا ہے آنجناب نہ تو دینی لٹریچر کا مطالعہ فرماتے ہیں نہ قرآن ہی کو کبھی ترجمے کے ساتھ پڑھا ہے ورنہ یہ سطحی شبہ آپ کے ذہن میں نہ ابھرتا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اچھائی اور برائی ظلم اور عدل کی حقیقت کو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اسے جاننا بھی چاہیئے کہ وہی تو ہر شے کا خالق ومالک ہے۔ کوئی معاملہ اچھا ہے یا برا، ظلم پر مبنی ہے یا انصاف پر۔ اس کا فیصلہ ہم اپنے فہم وقیاس کے ذریعہ اس وقت کریں گے جب اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی واضح ہدایت نہ ملی ہو۔ لیکن اگر یہ ہدایت موجود ہے تو پھر ہمارا صرف یہ کام ہے کہ اسی ہدایت کے آگے اپنی زبان اور سر ہی کو نہیں دل ودماغ کو بھی نیازمندانہ جھکا دیں۔

جانوروں کو ذبح کرکے غذا بنانا اللہ اور رسولؐ کی صریح ہدایات کے مطابق عین عدل ہے ظلم ہرگز نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ہمارے حضورؐ نے حجۃ الوداع میں ایک ہی دن سو قربانیاں کی تھیں جن میں سے ۶۳ تو خود اپنے دست مبارک سے کی تھیں۔

یہ تو جواب تھا مسلمانوں والا۔ یعنی سمعنا واطعنا

عقلی جواب یہ ہے کہ جن جانوروں کی قربانی اللہ نے جائز رکھی ہے ان کا مقصد پیدائش ہی یہ ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں۔ سواری کا فائدہ ہو یا ہل میں جوتنے کا۔ دودھ حاصل کرنے کا ہو یا غذا بنانے کا۔ یہ عین مقصد پیدائش کے مطابق ہے۔ لہذا ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ عورت کو بچہ جننے سے قبل شدید دردِ زہ سے گذرنا پڑتا ہے۔ اسے بھی نعوذ باللہ خدا کا ظلم کہنا پڑے گا اگر فیصلہ سطحی مطالعہ پر رکھا جائے لیکن یہ یقیناً ظلم نہیں ہے کیونکہ طبعی شے ہے۔ نظام فطرت کا جزوِ لازم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سب سے بڑا انصاف والا ایک ایسی تکلیف کو لازمۂ حیات بنا دے جس پر ظلم کا اطلاق ہو سکے۔

بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ حلال جانوروں کی قربانی اگرچہ صورۃً ظلم نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً وہ قدرت کے نظام تکوینی کا ایک جزو اور ان جانوروں کے مقصدِ تخلیق کا ایک تقاضا ہے۔ اسے ظلم تصور کرنے والے نازک مزاجوں کو پھر یہ بھی چاہئے کہ عورتوں کے پاس نہ پھٹکیں کیونکہ قرب کے نتیجے میں وہ انھیں دردزہ کی شدید اذیت میں مبتلا کرنے کے مجرم بن رہے ہیں۔

بلکہ گہری نظر سے دیکھئے تو دردزہ والی کیفیت بظاہر ذبح سے زیادہ ظالمانہ ہے کیونکہ ذبح کا کرب تو منٹ دو منٹ کا ہوتا ہے مگر دردِ زہ کی کم سے کم مدت بھی اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انسانی احساس ووجدان کرب و اذیت کے قبول کرنے میں حیوانات سے زیادہ ذکی اور سریع الحس ہیں۔ لہذا کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے ایک عورت دردِ زہ میں اس سے کہیں زیادہ تکلیف اٹھاتی ہے جتنی ایک جانور صحیح اسلامی طریق پر ذبح کئے جانے میں اٹھاتا ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جانوروں کو جیتے جی غیر ضروری اذیت دینا اور بات ہے اور ان کو منشائے قدرت کے مطابق ذبح کر کے کھا جانا بالکل دوسری بات۔ پہلی بات کے لئے عقل ومنطق اور انسانی اخلاق کے اعتبار سے کوئی وجہ جواز نہیں جب کہ دوسری کے لئے جواز ہی جواز کے وجوہ موجود ہیں۔

ویسے یہ ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ قصابوں کی جہالت و شقاوت اور مسلم معاشرے کی ابتری نے ذبح کے نظام میں بعض ایسی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جنھیں خود اسلام بھی پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن ان خرابیوں کی وجہ سے نفسِ ذبح کے جواز — اور بعض حالتوں میں وجوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وسواس وفتن

سوال[۹]:— از— محمد ظہور۔ غازی پور

ذیل میں جناب مولوی خورشید حیدر صاحب عرف چھیدی غازی پور شہر کے چند ارشادات روانہ کئے جا رہے ہیں۔ براہ مہربانی اپنے رسالے کی قریبی اشاعت میں انکی صحت یا عدم صحت پر مدلل روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں تاکہ یہاں کے لوگوں میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے دُور ہو سکے۔

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی نہیں تھے لیکن نبی سے کم بھی نہیں تھے۔

(۲) حضورؐ کا یہ فرمانا محض عائشہ صدیقہؓ کو خوش کرنے کے لئے تھا کہ حضرت عمرؓ کی ساری نیکیاں ابوبکر صدیقؓ کی ایک نیکی کے برابر ہیں۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بہتان کے واقعہ کی حقیقت سے قبل نزول وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باخبر تھے، لیکن لوگوں سے اس وقت اس وجہ سے ظاہر نہیں کیا کہ زوجہ کا واقعہ ہے لوگ باور نہیں کریں گے۔

(**نوٹ**) چند لوگ مولوی صاحب مذکور کی پوزیشن شرعی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا اس کے متعلق بھی تفصیل سے روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں۔

الجواب[۹]:—

یہ جو اونچے درجے کے بزرگوں نے کہا ہے کہ عوام کو ائمہ وفقہاء کی تقلید کرنی چاہئے اور ہمہ شما کی پیروی نہیں کرنی چاہئے یہ اسی لئے تو ہے کہ اس میں عقائد کے فساد اور دین کی بربادی کا اندیشہ ہے۔ یہ تینوں ہی دعوے جن کا آپ نے ذکر کیا العوذ باطل ہیں۔ صحیح ومعتبر عقائد مختصراً یہ ہیں:—

(۱) حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے بعد تمام انسانوں سے افضل وفائق ہیں لیکن حضرت ابوبکرؓ کی برابری نہیں کر سکتے اور ابوبکر اگرچہ انبیاء کے بعد سب انسانوں سے فائق ہیں لیکن

مرتبۂ نبوت سے ان کا مرتبہ نیچا ہے۔ جب وہ نبی سے کم ہیں تو حضرت عمرؓ بدرجۂ اولیٰ کم ہوں گے۔ دھوکا مولوی صاحب مذکور کو شاید حضورؐ کے اس ارشاد سے لگا ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتا" — لیکن انھیں سمجھنا چاہئے کہ نبوت کی برتری کا مدار بشر کی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں پر نہیں ہے بلکہ اس فرید ویکتا شرف پر ہے کہ اللہ نے اس بشر کو نبوت کے لئے منتخب فرمالیا۔ طبعی وفطری صلاحیتوں کے اعتبار سے تو ہو سکتا ہے حضرت عمرؓ ہی نہیں امت کا کوئی اور فرد بھی کسی نبی کی طبعی وفطری صلاحیتوں سے بڑھا ہوا ہو لیکن وہ شرفِ انتخاب جو کسی بشر کو "نبی" بناتا ہے وہ اسے کہاں نصیب۔ اس کا تعلق کسب سے ہے ہی نہیں۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ تب یہ تصور کرنا سوائے گمراہی کے اور کیا ہے کہ عمرؓ یا کوئی بھی صحابی نبی نہیں تو نبی سے کم بھی نہیں۔ ایسا تصور رکھنے والے کو توبہ کرنی چاہئے اور اگر وہ اپنے قول کی کوئی مناسب تاویل کرتا ہے تو اس کے باوجود وہ مجرم ہے کیونکہ بنیادی عقائد کے معاملے میں "پہلے تولو پھر بولو" کا التزام ضروری ہے۔ واللہ الموفق۔

(۲) یہ بڑی ناروا جسارت پر مبنی قول ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے رسولؐ ایک صحابی کو خوش کرنے کیلئے خلافِ واقعہ بات کہہ گئے ہیں۔ استغفر اللہ۔

(۳) یہ دعویٰ قرآن اور حدیث دونوں سے بے خبری یا پھر بے پروائی پر مبنی ہے۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو متعدد صحیح روایات کی تکذیب کرنی پڑے گی اور تکذیب نہ کرنے کی صورت میں یہ ماننا لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اداکاری کی تھی۔ پناہ۔ ہزار بار پناہ۔

ہم زیادہ کہنے کی بجائے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ خدارا ایسے لوگوں سے دور رہئے جو بیٹھے بٹھائے متفقہ عقائد کو بھی نزاعی بنادیں اور مفید کاموں کے عوض لوگوں کو لایعنی امور میں وقت برباد کرنے کی راہ دکھائیں۔

منصور حلاج

سوال ۱۰۔ از — عقیل احمد شیدا بی۔ اے۔ اڑیسہ۔

دیوبند کا علمی دینی تبلیغی ترجمان — اور فاسدا حوال کے لئے ہمہ تن احتجاج "ماہنامہ ..." (جولائی ۶۲ء) پیش نظر ہے۔ محترم ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اپنے مضمون "منصور حلاج" میں منصور کے مخالفین کو خاطی مجرم اور گنہگار ٹھیرایا ہے۔ منصور کو رسن ودار تک پہنچانے والے اگر عاصی و خطاکار ہیں تو شرع متین کے معیاری صاحبانِ امر کون لوگ ہیں۔ منصور کی وارداتِ قلبی وکیفیاتِ باطنی خواہ کچھ بھی ہو اولوالامر کے لئے حجت نہیں اجراءِ احکام کا تمام تر مدار ظاہر پر ہے اور اسی کو بنیاد بنانے پر نظامِ شرع قائم وبرقرار رہ سکتا ہے۔ مقتدر باللہ اور احمد بن الیاس مثوب و ماجور ہوں گے نہ کہ مستحق عذاب۔ جنھوں نے ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کا سدباب کیا۔ منصور اگر کسی جذب دروں کی انگیز انا الحق کہتے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائیں۔ کہ عالم الغیب سے دلوں کا حال مخفی نہیں۔ قیصر صاحب کے مضمون میں محولہ اکابر دیوبند کے اقوال نے تشویش پیدا کردی ہے۔ آپ اس مسئلہ پر تجلی میں ضروری وضاحت اور علمائے متقدمین کی رائے کے ساتھ روشنی ڈالیں تو کشادِ قلب اور الجھن دور ہو۔

الجواب :—

علمائے سلف وخلف میں منصور حلاج کے بارے میں دونوں ہی طرح کی آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت برگزیدہ تھے۔ دوسری یہ کہ وہ گم کردہ راہ تھے۔ کچھ علما نے درمیانی راہ بھی اختیار کی ہے۔ ہمارا اپنا یہ خیال ہے کہ اس باب میں بحث وگفتگو ہی نہ کی جائے اور علمی وتاریخی اعتبار سے کی ہی جائے تو آخرت کے بارے میں جج بننے کی جرأت بہرحال نامناسب ہے — یہ ضرور کہا جا سکتا ہے اور اس پر تمام محققین وائمہ متفق ہیں کہ کسی کیلئے بھی ایسا نعرہ لگانا جائز نہیں جو دعوۂ خدائی کے ہم معنی یا اسکے قریب قریب ہو۔ باطنی حال کسی کا کچھ ہو لیکن قاضی ظاہر ہی پر فیصلہ دیگا اور اس فیصلے میں روا گنجائش نہ ہوگا چاہے حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار نعرہ لگانے والا کتنا ہی بڑا صاحب باطن ہو۔ اس سے زیادہ اس میں

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (هود)

عامر عثمانی

قیامِ میلاد

اب ہم حافظ رام نگری صاحب کے اُس حصۂ مضمون پر گفتگو کرتے ہیں جو قیام فی المیلاد کے جواز و استحسان پر انھوں نے شائع فرمایا ہے۔

ابتداءً انھوں نے آٹھ مفتیوں کے فتوے "قیام" کے استحسان میں نقل فرمائے ہیں۔ قارئین ذرا ان مفتیوں کے نام سُن لیں:-

(۱) شیخ عبداللہ سراج (۲) علامہ جمال (۳) شیخ سراج (۴) مولانا محمد سعید باصیل (۵) شیخ خلف بن ابراہیم (۶) مولانا حسین ابراہیم (۷) مولانا محمد عمر بن ابی بکر الرئیس، (۸) مولانا عثمان حسن دمیاطی۔

پہلی بات تو یہ قابلِ ملاحظہ ہے کہ جن شیخ عبداللہ سراج کا اسمِ گرامی حافظ صاحب نے نمبر ایک پر لکھا تھا انھی کا فتویٰ پھر نمبر تین پر نقل کر دیا اور اس طرح شمار میں خواہ مخواہ اضافہ کیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے عدالت میں آپ اپنے گواہوں کی گنتی بڑھانے کے لئے ایک ہی گواہ کو دو بار پیش کر دیں۔

دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ یہ جتنے نام لئے گئے ہیں کیا ان کی حیثیت اربابِ علم کی نگاہ میں ایسی ہے کہ ان کے بے دلیل فتوے ائمہ و اکابر کے بالمقابل حجت بن سکیں۔ کسی موقف کے برحق ہونے کے لئے اگر فقط یہی بات کافی ہو کہ متاخرین میں کچھ لوگ اس کی تائید کر گئے ہیں تو پھر کونسا مسئلہ ایسا ہے جس کے دس بیس حامی شمار نہ کرائے جا سکیں۔ محتاط اہلِ علم کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یا تو وہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں یا پھر ایسے شہرۂ آفاق علماء کے اقوال کو شہادت میں لاتے ہیں جن کی فکری و اجتہادی عظمت امت کے اربابِ علم و فضل میں معروف و مسلّم ہو۔ ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، مجدد الف ثانیؒ یا ان جیسا کوئی اور نام بے شک اس پائے کا ہے کہ اس سے منسوب ایک غیر مدلل قول بھی بطور شہادت پیش کرنے کے قابل سمجھا جا سکے۔ لیکن یہ علاقائی سطح کے غیر معروف یا نیم معروف مفتیوں کے غیر مدلل فتوے علم و تفقہ کی عدالت میں کیا مقام پا سکتے ہیں جب کہ ان کے خلاف روشن دلائل موجود ہوں۔ عوام تو ان سے مرعوب ہو سکتے ہیں لیکن اربابِ بصیرت ہرگز انھیں حجت اور دلیل قوی نہیں مان سکتے۔

تیسری بات یہ دیکھئے کہ شیخ سراج کے فتوے میں خود حافظ صاحب ہی یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "بوقت ذکرِ ولادت قیام جائز و مستحب ہے اگر بطریق محبت ہو اور علی سبیل الالتزام نہ ہو۔" اس سے ظاہر ہوا کہ اگر علی سبیل الالتزام ہو تو مفتیِ موصوف بھی اسے جائز و مستحب نہیں مانتے۔ اب اہلِ انصاف دیکھ لیں کہ آج کل کے قیامی حضرات کس پابندی اور شد و مد سے قیام کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے نہ دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سلام میلاد کے وقت قیام کرتے ہیں وہ کبھی کبھی بغیر قیام کے بھی یہ سلام پڑھ لیتے ہوں بلکہ یہی دیکھا ہوگا اور نہ دیکھا ہو تو اب تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جب بھی میلاد میں سلام پڑھا جائے گا یہ لوگ لازماً قیام کریں گے اور جو ساتھ نہ دے گا اسے وہابی اور بدعقیدہ وغیرہ ٹھیرائیں گے۔ یہ التزام و دوام اتنا معروف ہو چکا ہے کہ "المعروف کالمشروط" کا اصول اس پر صریحاً منطبق ہوتا ہے لہٰذا جس قیام پر گفتگو ہے اس کی حمایت میں متذکرہ فتویٰ نقل کرنا یا تو حافظ صاحب کی نافہمی ہے یا

مغالطہ دہی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ قیامی حضرات کبھی قیام کا ناغہ نہیں کرتے۔ ناغہ کیا کریں گے انھیں معلوم ہی نہیں کہ مستحب اُمور پر اصرار و دوام استحباب کو قباحت میں بدل دیتا ہے۔ پھر کس جرأت پر متذکرہ فتویٰ آج کل کے قیام کی حمایت میں نقل کیا گیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ فتویٰ ان ہی شیخ سراج کا ہے جن کا نام دو مرتبہ مستقل نمبروں کے ساتھ دیدیا گیا ہے۔ اس طرح آٹھ کی فہرست میں سے دو خارج ہو کر چھ رہ گئے۔ یہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ بغیر التزام ہی کے "قیام" کیونکر جائز و مستحب ہے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ عدم التزام کی شرط نے شیخ سراج کو حافظ صاحب کی فہرست گواہان سے خارج کر دیا۔

اب باقی فتاویٰ کو لیجئے۔ علامہ جمال صاحب کا فتویٰ یہ نقل کیا گیا ہے:۔

"ذکر میلاد نبوی کے وقت قیام کو سلف کی ایک جماعت نے مستحسن قرار دیا ہے اس لئے وہ بدعتِ حسنہ ہے۔"

عرض یہ ہے کہ "سلف" کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ ہم سے پہلے جو کروڑوں اربوں لوگ گذر چکے ہیں سب سلف ہی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کونسے سلف ہیں جن کی پیروی کا ایماء قرآن و سنت سے ملتا ہے۔ تو اہلِ علم جانتے ہیں کہ خیر القرون ہی کے اسلاف کا اسوۂ و عمل معیاری سمجھا گیا ہے اور خیر القرون کا اطلاق زیادہ سے زیادہ تبع تابعین کے دَور تک ہوتا ہے۔ بعد کے علماء و شیوخ کی یہ حیثیت ہرگز نہیں مانی گئی ہے کہ آپ قرآن و سُنت کی تعلیمات اور فکر و تدبر کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے جس کی بھی پیروی کر لیں گے ہدایت یاب ہوں گے۔ میلاد کا وجود ہی اسلام کے ابتدائی پانچ سو برسوں میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اس کے بعد آنے والے علماء و شیوخ کا اتباع نقد و نظر کے بعد ہی ہو سکتا ہے آنکھیں بند کر کے نہیں۔ پھر جب کہ تمام علماء کا اتفاق و اجماع بھی ظہور میں نہ آئے، بلکہ علامہ جمال کے اپنے بیان کے مطابق صرف ایک جماعتِ سلف نے قیام کی بدعت کو مستحسن قرار دیا ہو تو قرآن و سنت کے عطا فرمودہ تصورات و قواعد اور اونچے درجے کے علماء و ائمہ کے مقابلہ میں کوئی بھی حیثیت اس ایک جماعت کے فیصلے کی نہیں رہ جاتی۔ خاص طور پر جب کہ یہ بھی واضح ہو رہا ہو کہ اس مبیّنہ جماعت کا محدود اور لعرکیا ہے۔ دوسرے زمانہ پر جماعت کا اطلاق ہو جاتا ہے معدودے چند علماء و صوفیاء پر لفظ جماعت کا اطلاق کر کے ایک ایسے مسئلہ میں حجت پکڑنا جو دنیا کی سب سے ناپاک چیز شرک سے متعلق ہو کوتاہ فکر اور بے احتیاط لوگوں کا کام تو ہو سکتا ہے ذمہ دار اہلِ علم اور بالغ نظر فقہاء کا نہیں۔ ہمارے پاس محکم نصوص، مستند ائمہ اور شہرۂ آفاق علماء و فقہاء کا سرمایۂ علم و یقین موجود ہو تو ہم پر کیا آفت ہے کہ خیر القرون کے بعد کی ایک قلیل و منتشر جماعت کے مخصوص مزاج و رجحان کی پیروی کریں اور دین میں اٹکل پچو باتوں کو راہ دیں۔

مولانا محمد سعید باصیل کا فتویٰ یہ ہے:۔

"آنحضرت صلی اللہ کے ذکرِ ولادت کے وقت قیام بعض کے نزدیک مندوب ہے اور بعض کے نزدیک بدعت حسنہ ہے۔"

غور طلب یہ ہے کہ کیا ان محترم مفتی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بعض عالمی شہرت و عظمت رکھنے والے علماء و مجتہدین کے نزدیک قیام میلاد مذموم رہا ہے۔ اگر نہیں معلوم تھا تب تو وہ منصب افتاء ہی کے اہل نہیں کیونکہ مفتی کے لئے موافق و مخالف آراء اور فریقین کے دلائل و مباحث سے واقف ہونا اوّلین شرط ہے۔ اور اگر انھیں معلوم تھا تو فتویٰ اس انداز میں نہیں دینا چاہیئے تھا کہ گویا بس دو ہی طرح کے علماء پائے گئے ہیں۔ ایک وہ جو قیام کو مندوب کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو بدعت حسنہ قرار دیتے ہیں۔ ممنوع و مذموم قرار دینے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

فتوے کا یہ انداز صاف بتا رہا ہے کہ مفتی صاحب مسئلہ بیان کرنے میں پوری طرح دیانت دار نہیں ورنہ انھیں کسی نہ کسی لفظ سے یہ ضرور ظاہر کرنا چاہیئے تھا کہ علماء کی ایک قسم قیام کو مذموم و ممنوع ٹھیرانے والی بھی ہے۔

بجائے خود فتویٰ بھی دلیل سے خالی اور محض یک رُخے فکر کا آئینہ دار ہے۔ آخر یہ کیا طریقہ فکر ہی مسائل میں فیصلہ

دینے کا ہے کہ خیر القرون سے بعید تر زمانوں میں اگر بعض علماء اپنے مخصوص مزاج و رجحان کے تحت کسی بدعت کی تحسین فرما گئے تو آپ قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر اس پر اعتماد کر لیں۔ ایسا اعتماد تو صرف اُس اجماع پر ہو سکتا ہے جو خیر القرون میں ہوا ہو۔ یا چلئے بعد ہی کے کسی زمانے میں تمام علمائے عصر کسی شے کی مندوبیت پر متفق ہو گئے ہوں تو آپ اس اتفاق کامل کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے اچھے معلوم ہو سکتے ہیں لیکن یہ جسارت تو بڑی ناروا ہے کہ رفیع و جلیل علماء کے سخت اختلاف کے باوجود کچھ علماء کی بے دلیل رائے کو حجت کا درجہ دے دیا جائے۔

شیخ خلف بن ابراہیم کا فتویٰ یہ نقل کیا گیا ہے:-

"ذکر ولادت نبویؐ کے وقت کا قیام علماء و فضلاء کا طریقہ رہا ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کی تعظیم ظاہر ہوتی ہے اور قیام والدین' اہلِ علم اور سردار قوم کے لئے مسنون ہے۔"

یہ بزرگوار بھی بھول گئے کہ بہت سے جلیل القدر علماء قیام کی ممانعت بھی کرتے رہے ہیں۔ فتویٰ اس طرح دیا گویا تمام ہی علماء و فضلاء قیام کرنے والوں میں شامل ہیں۔

خیر غنیمت ہے کہ اس فتوے میں کچھ دلیل تو بیان کی گئی مگر ہر ہوشمند دیکھ سکتا ہے کہ یہ دلیل اُس دعوے سے کوئی جوڑ نہیں رکھتی جس پر گفتگو ہے۔ مسئلہ اگر یہ زیر بحث ہوتا کہ کسی بزرگ ہستی کے روبرو تعظیماً قیام کرنا اچھا ہے یا مرا تب تو یہ دلیل کام دے سکتی تھی لیکن مسئلہ زیر بحث ہے ہی نہیں۔ مسئلہ تو یہ زیر بحث ہے کہ جو پیغمبر آج دنیا میں بقید حیات نہیں ہے بلکہ صدیاں ہوئیں رحلت فرما چکا اس کے لئے تعظیماً قیام کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ والدین ہوں یا اہل علم یا سردار قوم ان میں سے کسی کے لئے قیام تعظیمی کو مسنون قرار دینا ظاہر ہے یہی مفہوم تو رکھتا ہے کہ جب وہ سامنے موجود ہوں اس وقت بطور تعظیم کھڑے ہو جاؤ۔ یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ وہ مر چکے ہوں یا نظروں سے دور ہوں تب بھی کسی وقتِ معین میں ان کے تذکرے پر کھڑا ہونا مسنون و مستحسن ہے۔ پھر کیونکر اس روبرو اور بالمواجہ قیام کو اُس قیام کے لئے نظیر و دلیل بنایا جا سکتا ہے جو غائبانہ کیا جا رہا ہے۔ نظیر اس کی پیش کرنی چاہئے کہ کبھی کسی معقول آدمی نے والد یا استاد یا حاکم کے لئے اس کی غیر حاضری میں بھی تعظیمی قیام کیا ہو تب تو یہ کہنا بجا ہو سکتا ہے کہ حضور بدرجۂ اولےٰ اس تعظیم کے مستحق ہیں لیکن جب کہ تعظیمی قیام کا مدار ہی ہستیِ معظم کے حاضر و موجود ہونے پر ہے اور ایک نظیر بھی غائبانہ قیام کی پیش نہیں کی جا سکتی تو ہستی غائب کیلئے قیام کی بنیاد عقلاً اور عرفاً اور شرعاً کسی بھی اعتبار سے کیا باقی رہ جاتی ہے۔

لوگ زبان سے اعتراف نہ کریں، لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ شیطان نے بعض توحید پرستوں کے دماغوں میں یہ باطل و فاسد گمان ڈال دیا ہے کہ سلام پڑھتے وقت حضورؐ تشریف لے آتے ہیں۔ یہی گمان قیام تعظیمی کا محرک بنا ورنہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جن مومنوں کو پانچ وقت بیٹھکر درود پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو اور قرآن کی تلاوت بھی بیٹھ ہی کر تجویز کی گئی ہو ان کے دماغ میں یہ تصور انگڑائی لے کہ سلام کھڑے ہو کر پڑھو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بھیڑ اچال چلنے والے بہت سے قیامیوں کو آج قیام کرتے ہوئے اس مشرکانہ تصور کا شعور و احساس نہ رہتا ہو۔ لیکن جڑ بنیاد قیام کی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ موجد اس قیام کا لازماً یہی گمانِ باطل ہے۔ دیکھ لیجئے مفتی صاحب نے والدین وغیرہ کے قیام کو تمثیل میں پیش کیا ہے۔ گویا ارادی یا غیر ارادی طور پر ذہن ان کا بھی یہی ہے کہ سلام پڑھتے وقت حضورؐ تشریف لے آتے ہیں ورنہ تمثیل میں اُن افراد کو پیش نہ کرتے جن کے لئے قیامِ تعظیمی کیا ہی اس وقت جاتا ہے جب وہ سامنے آ گئے ہوں۔ اعتراض کرنے پر تاویلات تو بعض قیامی حضرات اس مجبوری کو کرتے ہیں کہ حضور کی تشریف آوری کا صریح مشرکانہ عقیدہ ابھی خود انھیں بھی نامناسب سا لگتا ہے لیکن بعض قیامی صاف طور پر تشریف آوری کے اعتقاد کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں۔ افسوس شیطان کس طرح اہل علم اور اصحاب زہد و ورع تک کو بربادی کی راہ پر لگا لیجاتا ہے

وہ سمجھتے ہیں ہم جنت کمارہے ہیں مگر بارگاہِ قدس میں ان کے تمام اعمالِ حسنہ اور طاعت و زہد پر شرک کی سیاہی پھیرنے کا حکم دیدیا جاتا ہے۔ آخر خدا کو غصہ کیوں نہ آئے جب کہ وہ تمام ممکن پیرایوں میں حضور کی عبدیت و بشریت کو کھول کھول کر بار بار بیان کر چکا ہے۔ قرآن کو ماننے کا بھی دعویٰ، مگر اسکے صریح و محکم توضیحات و تنبیہات سے لاپروائی بھی۔ نہ صرف لاپروائی بلکہ اس کے خلاف جسارت اور ڈھٹائی۔ توحید کے نام پر توحید کا تمسخر، محبت رسول کے نام پر خدا کی توہین و تکذیب اور دین سے تلعب۔

مولانا حسین بن ابراہیم کا فتویٰ یہ ہے:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ ولادت کے وقت قیام کو کثیر علماء نے مستحسن قرار دیا ہے۔"

دیا ہوگا۔ کثیر علماء نے تو قبروں پر چادر اور پھول چڑھانے، عرس منانے اور نوع بہ نوع بدعتیں کرنے کو بھی مستحسن قرار دیا ہے۔ تیرہ سو برسوں میں لاکھوں علماء گذرے ہیں۔ ایک شخص ان میں سے سو پچاس کو "کثیر" قرار دے تو یہ محاورۃً درست ہونے کے باوجود صورتِ واقعہ کی غلط تصویر کشی ہے۔ کثیر سے بھی کثیر علماء ایسے گذرے ہیں جنھوں نے قیامِ میلاد کو ممنوع قرار دیا ہے اور ان میں سے بعض ایسی بلند شہرت و مقبولیت کے مالک ہیں جن کا مقابلہ حریف علماء میں کوئی نہیں کر سکتا۔

پھر ہم کہتے ہیں دینی عقائد کا معاملہ کیا رائے شماری سے طے ہوا کرتا ہے؟ کیا یہ بھی الیکشن کا قضیہ ہے کہ جدھر کثرت ہوگئی وہی حق مان لیا گیا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ متعدد مسائل میں ابوحنیفہؒ اکیلے ہیں اور ان سے اختلاف رکھنے والے کثیر۔ لیکن کوئی شخص مجرد اس دلیل سے ابوحنیفہؒ کی رائے کو رد نہیں کر سکتا کہ وہ اکیلے ہیں اور فریقِ ثانی عددی کثرت رکھتا ہے۔

دور کیوں جائیے جماعتِ اسلامی ہی کو ضال و مضل کہنے والے علماء کثیر ہیں۔ کثیر علماء کا قول اگر حجت ہو سکتا ہے تو حافظ صاحب کیوں اسے نہ مانتا کیوں اس پر شدومد سے تنقیدیں کیں کیوں آج بھی وہ جماعتِ اسلامی کو ضال و مضل نہیں سمجھتے۔ ثابت ہوا کہ خود حافظ صاحب کے نزدیک بھی کثیر علماء کا فیصلہ بجائے خود دلیلِ شرعی نہیں جب تک بے لاگ نقد کی ترازو میں وہ پورا نہ اترے۔ تب اس کے سوا کیا کہیں گے کہ اپنے دعوے کی تصدیق میں وہ ایسی کسوٹی پیش کر رہے ہیں جسے وہ خود بھی کسوٹی نہیں مانتے۔

حق یہ ہے کہ ہم مقلدین کے لئے ائمہ مذاہب کے اقوال بجائے خود شہادت بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن جو بدعت پانچویں صدی کے بعد نکالی گئی ہو اس کے لئے بھلا ان ائمہ مذاہب کی گواہی کہاں نصیب ہو سکتی ہے جو بہت پہلے واصل بہ حق ہو چکے۔

مولانا محمد عمر کا فتویٰ یہ ہے:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ ولادت کے وقت کے قیام کو علماء نے مستحسن قرار دیا ہے اور وہ اچھا ہے اس لئے کہ حضور کی تعظیم ہم پر واجب ہے۔"

یعنی وہی عقیدۂ فاسدہ کہ سلام پڑھتے وقت گویا حضور آگئے۔ بے شک حضور کی تعظیم واجب ہے، لیکن یہ طریقۂ تعظیم کس نے بتایا ہے کہ سامنا ہو یا نہ ہو ادب کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اور سوال یہ ہے کہ آخر سلام میلاد کے علاوہ کسی اور موقع پر مدعیانِ قیام کیوں حضور کے نام پر کھڑے ہونے کا التزام نہیں کرتے۔ ماہ و سال میں اور بھی تو ہزاروں اوقات حضور کے ذکرِ مبارک کے آتے ہیں اگر مفروضہ یہی ہے کہ ذکر سنتے ہی آپ تشریف لے آتے ہیں تو پھر ہمیشہ یہ واجب قیام عمل میں لانا چاہئے۔ اس فتوے کا داخلی تضاد بھی ملاحظہ ہو۔ ایک طرف قیام مستحسن اور اچھا ہے۔ دوسری طرف وہ واجب بھی ہے۔ کہنے کو جس چیز کو چاہے آپ فرض بھی قرار دیدیں تو زبان کون پکڑ سکتا ہے لیکن قرونِ اولیٰ میں تو کسی صحابی، تابعی، امام وغیرہ کو آپ دکھا نہیں سکتے کہ ذکرِ حضور آتے ہی وہ کھڑا ہو ہو۔ یہ بعد کی اپج ہے اور اس اپج کے پیچھے وہی فاسد عقیدہ

کارفرما ہے کہ اِدھر میلاد کا سلام شروع ہوا اور اُدھر حضورؐ تشریف لے آئے۔

مولانا عثمان حسن دمیاطی کا ارشاد یوں نقل کیا گیا ہے:۔

"میلاد خوانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر ولادت کے وقت حضورؐ کی تعظیم کے لئے جو قیام کیا جاتا ہے اس کے استحسان، طلب، استحباب اور اس کے مندوب ہونے میں کوئی شک نہیں اور قیام کرنے والے کو بہت ثواب اور بڑا خیر حاصل ہوتا ہے۔"

بندۂ عاجز عرض کرتا ہے کہ یہ فیصلہ دیتے وقت مولٰنا دمیاطی ثواب و عذاب کی حقیقت نظر انداز کر گئے۔ ثواب مرتب ہوتا ہے اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری پر اور عذاب کا منبع ہے انحراف و سرکشی۔ اعمال کا فقط صوری حسن اگر ثواب کا ضامن ہوتا تو پھر اس طرح کی بدعتیں تو لازماً مستحسن کہلاتیں کہ مثلاً کچھ لوگ مجتمع ہو کر مساجد میں قرآن پڑھا کریں یا نوافل کے لئے اجتماع فی المسجد کی رسم نکالیں۔ مگر علمائے حق جانتے ہیں کہ یہ اُمورِ قبیحہ ہیں جن کے موجدین قابلِ ملامت ہوں گے نہ کہ مستحقِ تحسین۔

ٹھیک اسی طرح قیامِ میلاد کا سطحی حسن اس فعل کے موجبِ ثواب ہونے کی ضمانت نہیں ہو سکتا اس کے پیچھے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا جذبہ نہیں۔ احداث فی الدین اور ابتداع و ایجاد کی ذہنیت کارفرما ہے۔ شانِ رسولؐ میں غیر جائز غلو اس کا مبنیٰ ہے اور جو شخص شعوری طور پر حضورؐ کی تشریف آوری کا اعتقاد نہ بھی رکھے وہ بھی مستحق ثواب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اس فعل کی فکری بنیاد کچھ نہیں محض جہولیت اور کورانہ تقلید کے تحت وہ ایسا کر رہا ہے۔ اعمال کی فکری توثیق اور پشت پناہی جب تک شریعت سے نہ ہو رہی ہو اور افعال کا مناط و مبنےٰ جب تک مستند و معتبر نہ ہو اجر و ثواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ثواب و عذاب میکانکی چیزیں نہیں ہیں کہ جب بھی پانی کو آنچ دکھائی جائے تو بھاپ ضرور اڑنے لگے۔ ان کا ترتب اُس روح پر منحصر ہوتا ہے جو اعمال کی فکری بنیادوں میں کارفرما ہوتی ہے

اُس جذبے اور شعور پر ہوتا ہے جس کے تانے بانے اعمال کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ تعظیم رسولؐ بے شک امر واجب ہے لیکن لامحدود طور پر نہیں۔ جس طرح یہود و نصاریٰ کی حد سے گذری ہوئی تعظیم پیغمبر کفر کہلائی اس طرح مسلمانوں کی بھی تعظیم پیغمبر شرک کہلائے گی اگر وہ مشرکانہ تصورات سے وابستہ ہو۔

یہی مولانا دمیاطی آگے لکھتے ہیں:۔

"علامہ ابن حجرؒ نے "جوہر منظم" میں فرمایا ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام طرح کی تعظیم جس میں اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت میں شرکت نہ پائی جائے ان لوگوں کے نزدیک مستحسن ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ بصارت عطا کیا ہے۔ بوصیری پر اللہ کی رحمت ہو جیسا کہ انھوں نے کہا ہے اس چیز کو چھوڑ دے جس کا ادعا نصاریٰ نے اپنے نبی کے لئے کیا ہے اور جو چاہے اپنے نبی کی مدح میں کہے۔"

بندۂ ضعیف عرض کرتا ہے کہ اللہ کے یکتا ہونے کا صرف یہی مطلب نہیں کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ پر بات ختم ہو گئی۔ اس کے کسی بھی وصف میں آپ کسی کو برابر کا شریک کریں گے شرک لازم آئے گا۔ تمام ماکان و مایکون کا عالم صرف اور صرف اللہ ہے۔ ہر جگہ حاضر و ناظر بھی تنہا وہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عظمت خواہ کتنی ہی بلند ہو لیکن یہ وصف ان کے لئے ثابت کرنا کہ جہاں کہیں میلاد کا سلام پڑھا جائے گا وہ تشریف لے آئیں گے شرک مبین ہے۔ اُلوہیتِ رسول کا دعویٰ ہے۔ من گھڑت ہے۔ اس فاسد و بے بنیاد خیال پر عمل کی جو بھی عمارت اٹھے گی باطل ہو گی۔ علامہ ابن حجر مکیؒ کو قیام کی جوہری حیثیت کے ادراک میں تسامح ہوا ہے۔ وہ حبِّ رسولؐ کی فراوانی میں احساس نہیں فرما سکے کہ قیامِ میلاد بھی رسول کو مرتبۂ الوہیت تک پہنچانے ہی کی شعوری یا تحت الشعوری کوشش کا مظہر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی غیر مذموم قسم کی توجیہ اپنے ذہن میں رکھتے ہوں، لیکن دین کا معاملہ ہر شخص کی توجیہ و تاویل پر معلق نہیں۔ اعمال و عقائد شریعت کے پیمانے سے ناپے جائیں گے۔ اور جن افعال کا ہیولیٰ ہی مشرکانہ ذہنیت سے تیار ہوتا ہو ان کے بارے میں کسی کی خوبصورت تاویل اور اچھی نیت شریعت ہرگز

قبول نہیں کرے گی۔

یہ تھے وہ فتاویٰ جو حافظ صاحب نے نقل کئے اور یہ گمان فرمالیا کہ ان سے ان کا موقف و مسلک قوت پا گیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ ایسے ہزار فتوے بھی نصوصِ قطعیہ کے ناسخ اور ادلۂ محکمہ کے حریف نہیں ہو سکتے۔ جو مفتی مجمل طور پر کثیر علماء کا حوالہ دیتے ہیں ان کے بارے میں ہم وہی کہیں گے جو امام ابو یوسفؒ نے امام اوزاعیؒ کے جواب میں کہا تھا۔ مال غنیمت میں دو گھوڑوں کے حصے کے مسئلہ میں جب امام اوزاعیؒ نے ابو یوسفؒ کی رائے کے برخلاف اپنی رائے کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ :-

"اس پر اہل علم کا اتفاق ہے اور ائمہ اس کے پابند ہیں۔"

تو امام ابو یوسفؒ نے جواباً کہا تھا کہ :-

"اوزاعی کا یہ دعویٰ کہ اہل علم اس پر متفق ہیں اور ائمہ نے اسی پر عمل کیا ہے حجازیوں کے اس قول سے ملتا جلتا ہے کہ "سنت یہی ہے"۔ مجمل دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ وضاحت کرو کون کونسا وہ عالم اور امام ہے جس نے اس پر عمل اور اس سے اتفاق کیا ہے پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ اس لائق بھی ہے کہ اس سے اخذ و احتجاج کیا جائے اور اس کے عمل و رائے کو وزن دیا جائے۔"

یہ بات قاضی ابو یوسفؒ نے — جو ائمہ احناف میں سے چوٹی کے امام اور ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے مخصوص ترین شاگرد ہیں — اُس صورت میں کہی تھی جب کہ ایک بڑا امام — اوزاعیؒ اپنے مسلک پر تمام علماء و ائمہ کے اتفاق کا دعویٰ کر رہا تھا۔ تب تو ہم حافظ صاحب کے منتخب فرمودہ مفتیوں سے یہی بات کہنے کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے تمام علماء کا نہیں بس کثیر علماء کے عمل و رائے کا تذکرہ کیا ہے۔ مصادر شریعت اور عللِ احکام سے بے خبر ہے وہ شخص جو یہ تصور کرتا ہے کہ قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے بعد بھی کسی دور کے دس بیس علماء کی مجرد رائے اور عمل شریعت میں مناط و منہاج کا کام دے سکتے ہیں۔ سبحانہٗ و تعالیٰ۔ اللہ کا دین اس سطحیت سے بہت بلند، اس کمزوری سے بہت بالا اور اس کورانہ عقیدت سے یکسر بر تر و منزہ ہے ذٰلک الدین القیم۔ ذٰلک تقدیر العزیز الحکیم۔

آگے بڑھنے سے قبل ہمیں عبد اللہ ابن مسعودؓ کے اُس قول پر کچھ گفتگو اور کرنی ہے جسے مفتی شیخ سراج صاحب نے بطور استدلال پیش فرمایا ہے ابھی تک اس قول کا ذکر نہیں آیا کیونکہ حافظ صاحب کے دیئے ہوئے نمبر ۳ کے تحت شیخ سراج نے قیام کو مستحسن اُس صورت میں قرار دیا تھا کہ اس پر التزام و دوام نہ ہو۔ اس شرط و قید کی بناء پر ہم نے بجا طور پر زیر بحث قیام کے حامیوں کی فہرست سے انھیں خارج کر دیا تھا۔ لیکن ان کا ایک اقتباس نمبر ۱ کے تحت بھی دیا گیا ہے اور اسی میں عبد اللہ ابن مسعود کا وہ قول بطور دلیل موجود ہے جسے اہل بدعت عام طور پر اپنی ہر رائج کردہ بدعت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ اس قول پر بھی گفتگو ہو جائے۔

سنئے عبد اللہ ابن مسعودؓ کا قول یہ ہے :-

ما راٰہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن	جو عمل مسلمانوں کے نزدیک مستحسن ہے وہ اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہے۔

اس قول کی آڑ لے کر بہت سے کم فہم تو عرس اور مزارات کی دیگر رسوم کو بھی مستحسن قرار دینے کی جسارت سے نہیں چوکتے گویا یہ عمل ان کے ساتھ ہے۔ ہم برادرانِ اسلام کو اس قول کا مفہوم و منشا سمجھاتے ہیں۔

صحیح بات سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس قول کو اسکی اصل جگہ دیکھ لیا جائے۔ احمد اور البزار اور الطبرانی وغیرہم کی تصریح کے مطابق پوری بات یوں ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ نَظَرَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ فَاخْتَارَ مُحَمَّدًا فَبَعَثَہٗ بِرِسَالَتِہٖ ثُمَّ نَظَرَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ فَاخْتَارَ لَہٗ اَصْحَابًا فَجَعَلَھُمْ اَنْصَارَ دِیْنِہٖ وَوُزَرَاءَ نَبِیِّہٖ فَمَا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ وَمَا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ قَبِیْحًا فَھُوَ	اللہ تعالیٰ نے بندوں کے قلوب کا جائزہ لیا پس منتخب فرمایا محمدؐ کو اور مبعوث کیا انھیں اپنی پیغام رسانی کے لئے پھر جائزہ لیا قلوب کا پس چنا محمدؐ کیلئے ساتھیوں کو اور بنا دیا انھیں دین کا مددگار اور وزیر پس جس شے کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جسے مسلمان بُرا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک

عِنْدَ اللّٰہِ قَبِیْحٌ ۔ (احمد والبزار والطبرانی وغیرھم)

بھی بُری ہے ۔

+ + +

+ + +

یہ ایک الگ بحث ہے کہ فما راٰہ المسلمون الخ قولِ رسول ہے یا قولِ ابن مسعودؓ ۔ بعض علماء مثلاً امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اور علامہ عینیؒ نے شرح ہدایہ میں اسے قولِ رسولؐ مانا ہے مگر علامہ ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر سے متحقق ہوتا ہے کہ اس کا قولِ رسولؐ ہونا ثابت نہیں ۔ ہر آئینہ یہاں اس تصفیے کی ضرورت نہیں ہے ۔ مفتی شیخ سراج صاحب اسے اثر (قولِ ابن مسعودؓ) مان کر ہی پیش کر رہے ہیں تو ہمارا کام صرف یہ سمجھنا اور سمجھانا رہ جاتا ہے کہ اس قول کا مفہوم و منشاء کیا ہے ۔ المسلمون سے کیا مراد ہے اور اہلِ بدعت کے لئے اپنی رائج کردہ بدعتوں میں اس قول سے فائدہ اٹھانا کہاں تک دین ودانش کے مطابق ہے ۔

خدا جانے حافظ صاحب کو تفصیلاً یہ علم ہے کہ نہیں کہ عربی میں کسی لفظ پر الف لام کیوں آتا ہے ۔ اس تفصیل کو جانے بغیر یہ سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ اس قول میں المسلمون سے کون لوگ مراد ہیں ۔ نفسِ بحث کا تقاضا تھا کہ ہم الف لام کے بارے میں مکتبی نوع کی گفتگو کرتے اور جنس، عہد، استغراق جیسے اصطلاحی الفاظ استعمال کر کے بتاتے کہ المسلمون کا الف لام کیا معنی رکھتا ہے لیکن مکتبی انداز قارئین کیلئے ادق بھی ہوگا اور اُکتا دینے والا بھی ۔ لہٰذا نفسِ مطالب کو اصطلاحوں سے ہٹ کر مصرح کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے تاکہ بات عوام کے لئے بھی گوارا رہے ۔

ایک بار زیر بحث فقرے کو پھر دہرا لیجئے :-

"جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے"

اب دیکھنا یہ ہے کہ "مسلمان" سے کیا مراد ہے ۔ آیا ہر وہ شخص جس پر "مسلمان" کا اطلاق ہو سکے اس پوزیشن میں ہے کہ جس شئے کو وہ اچھا سمجھ لے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی قرار پا جائے ؟ یا کچھ خاص ہی قسم کے مسلمان اس پوزیشن میں ہو سکتے ہیں ۔ ؟

جواب بالکل صاف ہے ۔ ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ میری امت مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور سوائے اُس فرقے کے جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقوں پر چلے گا باقی سب فرقے جہنم کا مزا چکھیں گے ۔ تو معلوم ہوا کہ جہنمی فرقوں نے جن عقائد و اعمال کو اچھا سمجھ کر اختیار کیا ہوگا وہ فی الواقع عند اللہ اچھے نہ ہوں گے ورنہ سزائے نار کا کیا مطلب ۔ دوسری طرف ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ اور افراد متعدد دینی مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے تو کھلی بات ہے کہ اللہ کے نزدیک دو متضاد و متخالف رائیں مستحسن نہیں ہو سکتیں ۔ ایک مستحسن ہوگی اور ایک قبیح، لہٰذا یقینی طور پر واضح ہوگیا کہ یہاں "مسلمان" سے ہر مسلمان مراد نہیں ہے ورنہ خیر و شر کی تمیز اُٹھ جائے گی اور دنیا میں کوئی بد سے بدتر عقیدہ و عمل بھی عند اللہ قبیح نہ رہے گا ۔

پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ کس قسم کے مسلمان مراد ہیں ؟ تو اس کا سراغ اسی طرح ہاتھ آ سکتا ہے کہ منقولہ بالا متن پر غور کر کے دیکھا جائے کہ ابن مسعودؓ کا اینا روئے سخن کس قسم کے مسلمانوں کی سمت ہے ۔ ہم نے جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ مسلمون پر الف لام عہد کا داخل کیا گیا ہے ۔ عہد کا الف لام وہ ہوتا ہے جو کسی وسیع الاطلاق لفظ پر داخل ہو کر صرف اُس فرد یا افراد کو خاص کر دیتا ہے جو قائل کے ذہن میں ہیں ۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی) تو رسول ایک وسیع الاطلاق لفظ ہے جو حضرت عیسےٰ اور موسےٰ اور ہر اُس نبی پر صادق آ سکتا ہے جسے اللہ نے رسالت عطا کی ہو ۔ یہاں تک کہ مناسب مواقع پر یہ فاصد کے معنی میں فرشتوں تک پر صادق آ سکتا ہے، لیکن اس آیت میں یہ صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص ہے کیونکہ اس پر الف لام عہد کا داخل کیا گیا ہے اور معہود ذہنی کی حیثیت سے

خاتم النبیینؐ ہی اللہ کے پیش نظر ہیں۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ اس آیت کے تحت حضورؐ کے سوا کسی اور بھی رسولؐ کی اطاعت کو مسلمانوں کے لئے مامور بہ قرار دے۔ اسی طرح یاایھا النبی کا الف لام تنہا حضورؐ کی ذات کو متعین کر دیتا ہے ورنہ نبی کا لفظ تو بڑا اوسع الاطلاق ہے اور اسی طرح اَلَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ میں صرف وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ پر تہمت دھری تھی ورنہ افک تو بغیر الف لام کے ہر تہمت و اتہام کو کہتے ہیں۔

غرض عربی زبان میں الف لام عہد بہت مستعمل ہے۔ ہم محققین کے تتبع میں المسلمون کے الف لام کو بھی عہدی کا سمجھتے ہیں اور جو بھی فہیم و زیرک شخص ذاتی رجحانات سے بلند ہو کر غور کرے گا وہ انشاء اللہ ایسا ہی سمجھے گا۔ ہمارے نقل کردہ پورے متن پر غور کر کے دیکھیے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کا معہود ذہنی کیا ہو سکتا ہے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ معہودِ ذہنی بالکل صاف ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کرامؓ ہی کے لئے المسلمون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کے نصوص سے بھی اسکی توثیق ہوتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہدایت یاب وہی لوگ ہیں جو میرے اور میرے اصحابؓ کے طریقوں پر چلیں۔ نیز فرمایا کہ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی پیروی کرلوگے ہدایت یاب ہوگے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابؓ ہی کی شان میں یہ شاندار توثیقی الفاظ فرمائے کہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ (اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی)

آپ اردو نثر میں متذکرہ بالا متن کی تشریح کر کے دیکھئے تو بات یوں بنے گی کہ :-

"اللہ نے اپنی رسالت کے لئے حضورؐ کو چنا اور دین کے معاونین و وزراء کی حیثیت اصحابِ رسول کو دی لہذا یہ جلیل القدر ارباب اسلام جس شے کو حسن سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی ضرور حسن ہوگی اور جس چیز کو قبیح سمجھیں وہ اللہ کے یہاں بھی قبیح ہی ٹھیرے گی"

یہ المسلمون کی وہ تفسیر ہے جسے اونچے درجے کے محققین نے پسند فرمایا ہے۔ تاہم دو توجیہیں اور بھی ہیں جن سے ہمیں انکار نہیں۔ ایک یہ کہ المسلمون سے افراد کامل مراد لئے جائیں جس طرح ہم بولتے ہیں کہ انسان وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ تو انسان سے مراد افرادِ کامل ہوتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خود غرض اور مفاد پرست لوگ بھی نوع انسانی سے تو خارج نہیں ہیں۔ اسی طرح المسلمون سے مراد وہ ائمہ مجتہدین اور فقہاءِ کاملین لئے جائیں جو اپنے معروف زہد و تقویٰ، فہم و ادراک علم و تفقہ اور ملکاتِ جلیلہ کے باعث امت کی نگاہ میں اس منصب کے مستحق ٹھیرے کہ دین میں اجتہاد کریں اور اصول سے فروعات کا استنباط کر کے قانونِ شریعت کو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی کریں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ المسلمون سے تمام قابل ذکر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق مراد لیا جائے۔ یعنی امت کے تمام قابل لحاظ افراد جس شے کے مستحسن ہونے پر مجتمع ہو جائیں وہ اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہوگی۔

ان دونوں توجیہوں میں سے کوئی بھی اختیار کر لیجئے وہ مقصد بہرحال حاصل نہیں ہوتا جس کی خاطر مفتی سراج صاحب نے متذکرہ قول پیش کیا ہے۔ پہلی تو یوں غیر مفید ہے کہ امت کے تسلیم کردہ ائمہ مجتہدین کا دَور تو اُس زمانے سے بہت پہلے ختم ہو لیا جب میلاد و قیام کی بدعت ایجاد کی گئی بعد کے علماء کا منصب ائمہ مذاہب کا نہیں بلکہ یہ مقلدین ہیں اور جو ان میں کے کچھ اونچے گئے ان کی حیثیت بھی ہرگز یہ نہیں ہے کہ جسے وہ حسن سمجھ لیں وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہی مانا جائے

دوسری یوں غیر مفید ہے کہ میلاد و قیام کے استحسان پر اجماع و اتفاق تو کیا معنی بڑے بڑے جید علماء اسکو ناپسندیدہ قرار دیتے رہے ہیں۔ اگر کچھ مسلمانوں کا اتفاق ہی عند اللہ حسن ہونے کی ضمانت ہو تو ان جید علماء کا میلاد و قیام کے ناپسندیدہ ہونے پر اتفاق کیوں عند اللہ حسن نہ ہوگا۔ پھر تو بڑے لطیفے کی بات ہو جائے گی کہ ایک ہی شے اللہ کے نزدیک اچھی بھی ٹھیرے گی اور بری بھی۔ فما لکم کیف تحکمون۔

واقعہ یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کے قول کا تعلق صرف ازمنۂ خیر سے ہے یعنی پہلے تین ادوار جن کے بعد ہونے کی خبر اللہ کے

رسولؐ نے دی ہے - اس کے بعد تو کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں جس میں ما راٰہ المسلمون والا قول چل سکے - واللہ تعالیٰ اعلم -

---

اور سنیے - حافظ صاحب لکھتے ہیں :-

" اُردو کی ایک شکستہ اور نامکمل کتاب ہے جس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو چکے ہیں - کتاب کسی اچھے عالم کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے - آخر میں میلاد اور قیام کے متعلق عربی میں علمائے مکہ معظمہ کا ایک مکمل و مدلل فتویٰ ہے جو اس قابل تھا کہ پورا نقل کیا جاتا لیکن اس کے جستہ جستہ اقتباسات دینے پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے - "

دیکھ لیا آپ نے - وہ حافظ صاحب جو جماعت اسلامی کی حمایت کرتے ہوئے قرآن و سنت کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے اب اپنے عقائد و بنیہ کے لئے کیسے کیسے شاندار مصادر و مآخذ پر جان چھڑک رہے ہیں - یعنی ایک اُردو کتاب وہ بھی خراب و شکستہ کیسا دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ بدعت پسندی کے زہر نے ایک خوش فکر و خوش عقیدہ انسان کو کس سطحیت تک پہنچا دیا ہے - ظاہر ہے کہ یہ یتیم و یسیر کتاب کسی بریلوی کا شاہکار ہوگی - بریلوی حضرات تو یوں بھی تحریف و تلبیس کے استاد ہیں - محض نمونہ از خروارے کے طور پر جس کا جی چاہے المہند علی المفند اُٹھا کر دیکھ لے یا اُن پوسٹروں اور رسالوں کو ملاحظہ فرما لے جن میں یہ لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ غلط سلط عقائد دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہیں کی عبارت کہیں جوڑ کر من مانے مفاہیم نکالتے ہیں -

مگر ٹھیریے ہم اس کتاب کے نقل کردہ مطالب کو نقل مطابق اصل مان کر ہی گفتگو کریں گے — فرمایا گیا :-

" علامہ ابن حجر نے " مولد الکبیر " میں لکھا ہے - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کے ذکر کے وقت قیام کرنے کے لئے یہ بات نظیر ہے کہ امتِ محمدیہ میں اہل سنت والجماعت قیام مذکور کے مستحسن ہونے پر متفق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی - "

ابن حجر مکی کافی بڑے عالم اور شیخ تھے - ہمارا خیال ہے کہ ایسی کچی باتیں کسی کاریگر نے ان کی کتاب میں داخل کر دی ہیں — لیکن اس خیال کو آپ نہ مانیں تو پھر ہم برملا کہیں گے کہ اس عبارت میں کیا ہوا دعویٰ سراسر ہوائی ہے اور حدیث لا یجتمع امتی علی الضلالۃ (میری امت گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی) کو قطعی بے محل طور پر استعمال کیا گیا ہے

اگر کوئی شخص " اہل سنت والجماعت " کی اصطلاح اسی غیر ذمہ داری کے ساتھ استعمال کرے جس کا مشاہدہ بریلوی حضرات کی طرف سے ہر شخص کو ہو رہا ہے تب تو کوئی گفتگو ہی نہیں - بریلویوں کے یہاں تو سوائے اُن کے کوئی اہل سنت والجماعت تو کیا ہوتا مسلمان بھی مشکل ہی سے ہے - لیکن اگر واقعی ذمہ دارانہ اور عالمانہ روش اختیار کرنی ہے تو بھول کر بھی یہ صریح غلط بیانی نہیں کی جا سکتی کہ تمام اہل سنت والجماعت قیام میلاد کے استحسان پر متفق ہیں - ابھی تو پچھلے ہی تجلی میں " میلاد النبیؐ " کے تحت آپ کچھ علماءِ اہل سنت کے فرمودات دیکھ چکے کہ وہ میلاد و قیام کو بدعتِ سیئہ کے سوا کچھ نہیں قرار دیتے - اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہو تو ہم اور بہت سے علماءِ اہل سنت گنوا سکتے ہیں جنھوں نے میلاد و قیام کو ناپسندیدہ ٹھیرایا ہے -

لیکن چند ہی علماء کا شدید اختلاف جب دعوۂ اجتماع کو ختم کر دیتا ہے تو مزید در دسری سے کیا حاصل -

رہا حدیث لا یجتمع امتی علی الضلالۃ کا معاملہ تو معلوم ہوتا ہے حافظ صاحب کے خیال میں وہ سب علماء حضورؐ کی امت ہی میں نہیں ہیں جو قیام کو مذموم کہتے ہیں ! — حافظ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ میں تھوڑی کہہ رہا ہوں یہ تو علامہ ابن حجرؒ کہہ گئے ہیں - ہم پوچھتے ہیں آخر حافظ صاحب کی اپنی سوجھ بوجھ کہاں چلی گئی جو یہ سامنے کی بات محسوس نہ فرما سکے کہ میلاد و قیام کے استحسان پر اجتماع امت کا دعویٰ تو ایسا ہی صریح البطلان، خلافِ واقعہ اور بے حقیقت ہے جیسے ایک شخص آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور کہنے لگے کہ اب میں

آسمان، چاند سورج سب معدوم ہوگئے۔ اجتماع امت تو بڑی بات ہے اسلام کے پورے چودہ سو برسوں میں کوئی ایک صدی بھی ایسی نہیں دکھائی جاسکتی جس کے تمام علماء میلاد و قیام کی بدعت پر متفق ہوگئے ہوں۔ خوب ہے یہ تفقہ اور سوجھ بوجھ کہ حافظ صاحب محض دعووں کے رعب میں آکر حقائقِ قطعیہ اور واقعاتِ ثابتہ کو بھی نظر انداز کئے جارہے ہیں۔ حدیث مذکورہ پر شارحین حدیث کے حوالوں سے لمبی بحث بھی کی جاسکتی ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی جب کہ میلاد و قیام کے معروف نزاعی مسئلہ پر اس حدیث کا چسپاں کرنا بدیہی طور پر غلط ہے۔

آگے ابھی ابن حجر کا فرمودہ نقل کیا گیا:۔

"قیام کا مطلوب ہونا ثابت ہے تو خود حضورؐ کے لئے یہ بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہوگا۔"

دیکھ لیا آپ نے۔ قیام کا ہر حامی کس شدت سے یہ تصور کئے بیٹھا ہے کہ سلام کے وقت حضورؐ بنفس نفیس تشریف لے آتے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو آخر اس استدلال کا کیا موقع تھا۔ یہ استدلال تو صریح طور پر یہی بتا رہا ہے کہ استدلال کرنیوالے کی نگاہ میں حضور سامنے آگئے ہیں اور دوسرے بزرگوں کے بالمقابل وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی تعظیم میں کھڑا ہوا جائے۔

علامہ ابن حجر تو اللہ کے یہاں سدھار گئے ہم حافظ صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ تعظیمی قیام آخر ان ہی بزرگوں کے لئے تو مطلوب ہوسکتا ہے جو نظروں کے سامنے تشریف لے آتے ہوں مگر بحث تو اُس پیغمبرؐ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی ہے جو دنیا سے رحلت فرما چکا ہے۔ حد سے حد کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ اس مسلک کی تائید و تردید سے قطع نظر ہم کہتے ہیں کہ اچھا یونہی سہی مگر قیامِ تعظیم کے لئے فقط حیاتِ قبر تو کافی نہیں۔ قیام ایک جسمانی طرزِ تعظیم ہے اور اس کو اختیار اسی وقت کیا جائے گا جب معظم ہستی جسمانی طور پر سامنے آجائے۔ کیا کوئی اپنے شیخ یا والد یا استاد وغیرہ کی تعظیم میں اس وقت بھی کھڑا ہوتا ہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہوں۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر نظروں کے سامنے آجانے والے بزرگوں کیلئے جو قیام مطلوب ہوسکتا ہے وہ اُس ہستی کے لئے بدرجۂ اولیٰ کیونکر مطلوب ہوگا جو سامنے نہیں ہے؟

تاویلیں کوئی کتنی ہی کرے حقیقت یہی ہے کہ قیام کے حامی اصلاً یہی تصور رکھتے ہیں کہ محفل میلاد کا سلام شروع ہوتے ہی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم جسم سمیت تشریف لے آتے ہیں۔ متذکرہ استدلال کے بعد مزید استدلال دیکھئے۔ بقول حافظ صاحب علامہ ابن حجر نے:۔

"دلیل میں سعد بن معاذ کے قیام سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش کیا ہے اور اسی حدیث کی بناء پر امام نوویؒ کے حوالے سے بغوی اور خطابی کا قول نقل کیا ہے کہ سردار، حاکم عادل اور معلم کیلئے بلا کراہت قیام مستحب ہے۔ اس کے بعد حضرت کعب بن مالک انصاری کے قبول توبہ کے واقعے سے حضرت کعبؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ۔"

ٹھیر جائیے۔ عام لوگ تو امام نوویؒ اور امام بغوی اور امام خطابیؒ جیسے نام دیکھ کر بیچارے مرعوب ہو ہی جائیں گے لیکن حیرت ابن حجر مکی پر ہے — بشرطیکہ منقولہ عبارات کی نسبت ان کی طرف درست ہو — اور حافظ صاحب پر ہے جو فہیم آدمی ہیں کہ امام نوویؒ، بغویؒ اور خطابیؒ وغیرہ نے جو استدلال کسی حاضر و موجود ہستی کے قیامِ تعظیمی کے لئے پیش کیا تھا اسے وہ اُس قیام کی بحث میں پیش کر رہے ہیں جس کا تعلق نگاہوں سے اوجھل ہستی سے ہے۔ سردار، حاکم عادل اور معلم کے لئے قیام کا استحباب زد در زد یعنی آمنے سامنے ہونے کی صورت ہی میں تو ہے یا مذکورہ ائمہ کا منشاء آپ کے نزدیک یہ ہے کہ سامنا ہوئے بغیر ہی ان کے لئے قیامِ تعظیمی مستحب ہے؟

آگے ابن حجر نے حضرت کعبؓ کا جو بیان نقل کیا ہے یا مزید جو روایتیں پیش کی ہیں وہ بھی سب کی سب صرف اور صرف یہی ثابت کرسکتی ہیں کہ سامنے آجانے پر کسی بزرگ، سردار، والد یا استاد وغیرہ کے لئے کھڑا ہوجانا مستحب ہے لیکن اس دعوے سے ان کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے کہ جو

پیغمبرؐ صدیاں گذری وصال فرما چکا اس کی ولادت کا ذکر کرتے اور اس پر سلام و درود بھیجتے ہوئے کھڑا ہو جانا چاہیئے ابن حجر جیسا فہیم و باخبر شخص اگر متذکرہ روایات کو بطور دلیل پیش کرتا ہے تو صریح بات ہے کہ وہ محفلِ میلاد میں حضورؐ کی جسمِ اطہر سمیت تشریف آوری کا عقیدہ رکھتا ہے چاہے اس عقیدے کو وہ صاف طور پر بیان نہ کرے اور چاہے اس کا کوئی واضح تصور بھی اس کے دائرۂ ادراک میں موجود نہ ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو دعوے اور دلیل کی اتنی واضح بے تعلقی اس کی نظر سے چھپی نہ رہتی۔

قابل صد غور

الحمد للہ کہ حافظ صاحب نے دلیل و شہادت کی قسم سے جو کچھ پیش کیا تھا اس کا جائزہ پورا ہوا۔ اہلِ فہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہستیِ غائب کے لئے تعظیمی قیام کا استحسان تو کیا جواز تک حافظ صاحب کے پیش فرمودہ مواد سے مترشح نہیں ہوتا۔ ہاں حضور کی بہ نفسِ نفیس تشریف آوری کا یقین کر لیا جائے تب یہ مواد مفید ہو سکتا ہے مگر اس یقین کا اعتراف وہ نہیں کرتے بلکہ فرماتے ہیں:—

"ہم کسی خاص عقیدے کے تحت قیام نہیں کرتے یہ ہمارے لئے ایک ذوقی چیز ہے۔"

بے شک انھوں نے درست کہا ہوگا۔ ہمیں بھی یقین ہے کہ وہ مشرکانہ تصورات نہیں رکھ سکتے لیکن یہ بات تو وہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کا ذاتی رجحان اور ذوق ایسے اعمال کے لئے وجہِ جواز نہیں بن سکتا جن کی وضع ہی میں شرک ہو، جو طبعاً ہی شرک سے جڑے ہوئے ہوں۔ جن کا خمیر ہی شرک سے اٹھا ہو۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی میں سے ہے) مشابہت اختیار کرنے کا تعلق ظاہر ہی سے ہے نیت سے نہیں۔ مسلمان شرک و کفر کی نیت کے بغیر ہی چوٹی رکھ لے، دھوتی پہن لے، قشقہ لگا لے، زنار ڈال لے، بُت کی تعظیم کر گذرے تو عزمِ کفر و شرک کے بغیر بھی یہ افعال حرام ٹھیریں گے اور یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ یہ میری ذوقی چیزیں ہیں عقائد کے اعتبار سے میں مسلمان ہی ہوں۔

انسان نے فرقِ مراتب کے لئے جو طور طریق وضع کئے ہیں قیام بھی انھی میں سے ایک ہے۔ رسول اللہؐ اس طریق کو پسند فرماتے تھے یا نہیں یہ جداگانہ بحث ہے۔ مان لیجئے پسند ہی فرماتے تھے تب بھی اس سے صرف اتنا ثابت ہو سکتا ہے کہ ہم کسی معظم ہستی کی تشریف آوری کے وقت کھڑے ہو جائیں۔ یہ نہیں ثابت ہو سکتا کہ غائبانہ بھی قیام کوئی چیز ہے۔ ازل سے آج تک کہیں، کبھی، کسی قوم و ملک نے غائب ہستیوں کے لئے قیامِ تعظیمی کا تصور تک نہیں کیا۔ جس طرح دھوپ کو دیکھ کر بلا تأمل فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اسی طرح کسی شخص کو تعظیماً قیام کرتے دیکھ کر برملا کہا جا سکتا ہے کہ کوئی ہستی معظم بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئی ہے۔ بہ نفسِ نفیس اس لئے کہ قیام ایک جسمانی طریقِ تعظیم ہے اور اس کو اختیار کیا ہی اس وقت جاتا ہے جب کوئی معظم ہستی جسمانی طور پر سامنے موجود ہو۔ لہٰذا قیام کے ساتھ کسی ہستیِ معظم کی روبرو موجودگی کا تصور اتنا ہی لازمی، قطعی اور طبعی ہے کہ عقیدہ رکھیئے یا نہ رکھیئے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی شخص مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور چیختا ہے کہ یا علی مدد۔ یا غوث اعظم اغثنی۔ یا شاہ نیاز اجمیری فریاد — تو چاہے وہ کتنا ہی عذر پیش کرے کہ یہ میری ذوقی چیزیں ہیں عقیدۃً میں ان لوگوں کو حاضر و ناظر نہیں مانتا لیکن عذر مقبول نہ ہوگا اور اس استمداد کو شرک ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔

ہم کہتے ہیں مان لیا کہ کسی خاص عقیدے کی عدم موجودگی میں قیامِ میلاد شرک نہیں ہے مگر کیا اس سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ صورۃً یہ شرک ہی کی طرف مشیر ہے اور عوام جب عمامہ و ریش والے حضرات کو قیام کرتے دیکھیں گے تو نیت اور عقیدے کی تفتیش کئے بغیر ہی وہ آپ سے آپ یہ گمان کر لیں گے کہ سلام پڑھتے ہی حضورؐ تشریف لے آئے اس لئے کہ کسی غیر حاضر ہستی کے لئے قیامِ تعظیمی کا کوئی تصور ہی کہیں نہیں پایا جاتا تو سوچنا چاہیئے کہ حافظ صاحب یا کوئی اور بزرگوار حضورؐ کی تشریف آوری کا

عقیدہ رکھنے کے باعث شرکِ حقیقی سے بچ ہی جائیں تو کیا یہ معصیت کچھ کم ہے کہ وہ قیام کرکے عوام کے ناپختہ ذہنوں میں مشرکانہ تصورات کی تخم ریزی کر رہے ہیں۔ شراب خانے میں بیٹھ کر کوئی شخص شربت روح افزا کا جام بھی پیئے گا تو دیکھنے والے قدرۃً یہی سمجھیں گے کہ وہ شراب پی رہا ہے۔

نیز یوں بھی سوچیئے کہ جو چیز جتنی زیادہ خطرناک، ضرر رساں اور ہولناک ہوتی ہے آدمی اتنا ہی زیادہ اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔ کسی بستی میں مہلک وبا پھیلی ہوئی ہو تو محتاط لوگ اس کے مضافات تک سے گذرنا پسند نہیں کرتے۔ آپ کا بچہ کنویں کی من پر چڑھا بیٹھا ہو تو آپ ڈانٹ کر اسے اُتاریں گے کیونکہ اس کا کنویں میں گرنا آپ کو پسند نہیں۔ زہر ہلاہل کی شیشی کوئی بال بچوں والا اپنے گھر میں نہیں رکھتا۔ طوائفوں کے محلے سے مجرد گذرنا ہی سلیم الطبع حضرات کو ناگوار ہوتا ہے — یہ فطری بات ہے کہ ضرر تک پہنچانے والے ذرائع اور متہم کرنے والے مواقع سے بھی آدمی حتی الوسع دور بھاگتا ہے اور اسی فطرت کے مطابق شریعت نے بھی سدِّ باب ذریعہ کو اس حد تک اہمیت دی ہے کہ ایک فعلِ حرام سے دور رکھنے کی خاطر متعدد اُن امور کو بھی حرام قرار دیا جو بجائے خود حرام نہونے کے باوجود فعلِ حرام تک پہنچانے کا قوی ذریعہ بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اب کیا یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ شرک، کفر سے زیادہ ہولناک، ضرر رساں اور ملعون چیز مومن کے لئے کوئی نہیں إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ (جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے اس پر اللہ نے جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے) — تو حافظ صاحب یا کوئی اور شخص اگر قیام کرتے ہوئے مشرکانہ عقائد سے بچا ہوا بھی ہے تو بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ شرک کی بالکل سرحد پر کھڑا ہے اور شرک کی نجاست و خباثت کا اسے کوئی جاندار احساس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعین فرمودہ حدود کو توڑنے ہی سے منع نہیں کیا، بلکہ ان کے پاس پھٹکنے کو بھی منع کیا ہے۔ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا (یہ اللہ کے حدود ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ) ایک اور آیت دیکھئے۔ اس میں کس طرح شرک و معصیت کے کناروں پر ڈیرہ ڈالنے والوں کا حال بیان فرمایا ہے:—

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (التوبہ ۱۳۶)	بھلا جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے ڈرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے جذبے پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک ایسی کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے کو ہے پھر وہ اس عمارت سمیت ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔

+ + + +

+ + + +

دیکھا آپ نے۔ کس کمالِ بلاغت سے اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ جو لوگ شاخِ نازک پر آشیانہ بناتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ العظمۃ للہ جو شخص فی الواقع یہ سمجھ لے کہ شرک کس قدر خوفناک غار ہے وہ اس غار کے پاس پھٹکنا بھی پسند نہ کرے گا۔ مگر جو لوگ اپنے ذوق و مذاق کی پیروی میں ہر دوسری شے کو نظر انداز کر سکتے ہیں ان کے ذہن و قلب میں خدا کا خوف اور شرک کی دہشت کون اُتارے اور کیسے اُتارے۔

ایک بات اور سمجھئے۔ قیام کو حامیانِ قیام بھی زیادہ سے زیادہ مستحسن و مستحب قرار دیتے ہیں فرض و واجب نہیں۔ اس کے خلاف مانعینِ قیام اسے مبنی بر شرک کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوا کہ قیام اگر نہ بھی کیا جائے تو حامیانِ قیام ہی کے نقطۂ نظر سے یہ گناہ کا ارتکاب نہ ہوگا کیونکہ مستحسن و مستحب کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کے کرنے میں ثواب ہو مگر ترک میں عذاب نہ ہو۔ اس کے برعکس مانعین کے نقطۂ نظر سے قیام کرنے میں شرک جیسی بدترین ناپاکی سے ملوث ہونا پڑتا ہے۔ اب اس بحث کو ایک طرف رکھ دیجئے کہ کون درست کہتا ہے اور کون غلط۔ یہ تصور کر لیجئے کہ دونوں ہی فریق کے دعوے امکانِ غلط اور صحیح ہونیکا

رکھتے ہیں۔ دونوں ہی طرف اہل علم ہیں اور دونوں ہی کے پاس دلائل ہیں۔

تو اس صورتِ حال میں انصاف کیجئے کہ ایک محتاط اور خدا ترس آدمی کا کیا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ آیا قیام کر کے شرک کا خطرہ مول لے یا قیام چھوڑ کر محض ترکِ مستحب کا نقصان اٹھائے؟

یہ سوال ایک تمثیل سے خوب واضح ہوگا۔ فرض کیجئے ایک کنویں کے پانی کے بارے میں اطباء کے مابین دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ کچھ اطباء یہ کہتے ہیں کہ یہ پانی اعصاب کو تقویت دیتا ہے اور کچھ اطباء یہ کہتے ہیں کہ اس پانی سے کوڑھ اور دق جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اب ایمانداری سے فیصلہ کیجئے کہ سمجھداروں کے لئے اس پانی کا پینا اچھا ہے یا نہ پینا۔ ہمارا تو پختہ خیال یہی ہے کہ ایسے پانی کو ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اگر موخر الذکر اطباء کا خیال درست ہوا تو زندگی یکسر برباد ہو جائے گی اور اگر اول الذکر اطباء کی رائے درست ہوئی تو ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا کیونکہ اعصاب کی تقویت کے لئے اور سیکڑوں غذائیں اور دوائیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ یا نہ بھی کی جائیں تو بغیر اس کے بھی زندگی کی راحتوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ الحاصل ادنیٰ سے فائدے کی موہوم امید میں بہت بڑا خطرہ مول لینا کسی ہوشمند کے نزدیک درست نہیں ہاں بہت بڑے نقصان کے ڈر سے ادنیٰ فائدے کو نظر انداز کر دینا ہمیشہ معقول سمجھا گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ میلاد اور قیام جیسے اُمور ہرگز ہرگز کوئی شرعی اصل نہیں رکھتے مگر شیطان کی وسیسہ کاری سے وہ رواج و رسم کا درجہ حاصل کر گئے ہیں۔ رواج و رسم کا معاملہ یہ ہے کہ مضبوط سے مضبوط دلیلیں بھی ان سے ٹکرا کر کالفراش المبثوث ہو جاتی ہیں۔ کہاں کا قرآن، کیسی حدیث، ایک رسم چل نکلے تو پھر کوئی استدلال اسے نیچا نہیں دکھا سکتا۔ حافظ رام نگری صاحب کو جس نوع کے دلائل میلاد و قیام پر فراہم ہوئے ہیں اسی نوع کے بے شمار دلائل اُن تمام افعال و عقائد کے لئے بھی موجود ہیں جن کے ممنوع و حرام ہونے میں خود حافظ صاحب کو بھی شک نہیں لیکن کس کی مجال ہے جو علمی دلائل سے بدعت و معصیت کے اہرام ڈھا سکے۔ ہم جو برابر باطل کا تعاقب کئے جاتے ہیں تو وہ صرف اس لئے کہ جو لوگ ابھی پوری طرح گرفتارِ بلا نہیں ہوئے ہیں وہ اُلٹے پیروں لوٹ آئیں ورنہ جو لوگ بدعت و معصیت کو بطورِ رسمِ عام اختیار کر چکے ہیں ان کی اصلاح اور پورے معاشرے کی تطہیر تو صرف اُسی دعوت کی کامیابی پر منحصر ہے جسے دعوت اقامت دین کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور نفسِ امارہ کی داروگیر سے بچائے۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ۔ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ۔ (المائدۃ ع ۱۱)	اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے پس درج کر دیجئے ہمارا نام ماننے والوں کے زمرے میں۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اُس حق پر جو ہمیں پہنچا اور کیوں نہ امید رکھیں اس بات کی کہ داخل کر دے ہمارا رب ہمیں نیک بختوں کے ساتھ۔

+ + + + +

مستقل عنوان

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

کہاں کی چوٹ کہاں جا کے رنگ لائی ہے

درگاہ گھوڑے شاہ کا عرس اس سال بڑا کامیاب رہا۔ آگرہ اور پونہ کے علاوہ اب کی اجمیر شریف کی طرف سے بھی وجود زنانِ عاشقان اولیاء آئی تھیں کہ درگاہ کے سارے بوڑھے جوان ہو گئے۔ حد ہے کہ اس درگاہ کے ریٹائرڈ سجادے صاحب بھی جن کی عمر پچانوے سے کم نہیں رہی ہوگی بارہ میل سے پالکی میں چل کر آئے تھے۔ پیری اور شباب کا ایسا ایسا شاندار تضاد یہاں شیر و شکر نظر آیا کہ فدوی تو دل وجان سے اجتماع ضدین کا قائل ہو گیا۔

خیر بقدرِ توفیق کسبِ فیض کر کے میں پانچویں روز گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ملائن دالان والے تخت پر تشریف فرما ہیں اور قینچی سے کچھ کاٹ چھانٹ رہی ہیں۔ انھیں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ میں کچھ دنوں سے امرود اور پپیتے کا پیوند لگا کر سیب پیدا کرنے کی فکر میں ہوں اور اسی سلسلہ میں ٹکنیکل معلومات حاصل کرنے گورکھپور گیا ہوں ابتداءً وہ بہت بگڑی تھیں کہ یہ کیا مراق تم پر سوار ہے مگر میں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ اگر میں کامیاب ہو گیا تو ساری دنیا میں دھوم مچ جائے گی اور پھر تمہیں توے چمٹے سے اور مجھے قلم گھسنے سے نجات مل جائے گی۔

چلتے وقت انھوں نے کہا تھا — مجھے یقین ہے آپ گورکھپور نہیں جا رہے — خیر کہیں بھی جائیں زیادہ دن نہ لگائیے گا"

"توبہ کرو۔ کل یا پرسوں یہیں دیکھ لینا"

اب پانچویں روز گھر میں داخل ہوتے ہوئے میرے قدم بوجھل ہو رہے تھے مجھے داخل ہوتا دیکھ کر وہ اپنی دائمی عادت کے مطابق مسکراتی ہوئی اٹھیں اور میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لیتے ہوئے خیر و عافیت پوچھی۔

"الحمد للہ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں اور آنجناب کی خیریت خداوند دو عالم سے نیک مطلوب"

میرا فقرہ دالان تک پورا ہوا تھا مگر یہاں پہنچ کر میں کچھ چکرا سا گیا۔ بات یہ تھی کہ جس تخت پر وہ اٹھ کر آئی تھیں اس پر سینے پرونے کا بکھیڑا بالکل نہیں تھا بلکہ کئی کتابیں بے ترتیب پڑی تھیں اور ان کے اردگرد کاغذ کی کترنوں اور تراشوں کا غیر معمولی سا بکھراؤ نظر آ رہا تھا۔ پاس ہی گوندانی اور قینچی بھی موجود تھی۔ میں نے یہ تاویل کرنے کی کوشش کی کہ قمیصوں کے گلے اور دامن وغیرہ کے لئے نئے ڈزائن کے کاغذی فرمے بنائے جا رہے ہوں گے یا پھر ہمسائن کی گڑیا کی پالکی بنانے کا پلان ہوگا مگر دفعۃً میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ آنکھوں کے آگے تارے جاسوسی ناولوں میں تو اس وقت ناچتے ہیں جب پیچھے سے کوئی گدی پر پستول کا دستہ رسید کرتا ہے لیکن مجھ پر حملہ سامنے سے ہوا تھا اور حملہ آور تھے وہ کاغذ کے تراشے جو تخت پر پھیلے نظر آ رہے تھے۔

حیرت، طیش اور صدمے کے ناگہانی بھونچال میں کئی ثانیے تو میں آنکھیں اور منہ دونوں پھیلائے دم بخود کھڑا رہا پھر دل کو یہ تاویل کر کے تسلی دی کہ ہو نہ ہو ریل میں جو کوئلہ آنکھ میں گرا تھا اس نے بینائی میں کوئی ٹیکنیکل خلل ڈال دیا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے وہ وہی ہو جو فی الحقیقت وہ نظر آ رہا ہے۔

نہایت چستی سے ہتھیلیاں آنکھیں رگڑنے کے لئے بلند کیں اور یہ بھی مستحضر نہ رہا کہ وہاں تو چشمہ چڑھا ہوا ہے۔ ثمرہ اس بوکھلاہٹ کا اس کے سوا کیا نکلتا کہ چشمہ تو دور جا گرا

اور وہ کمانی ہاتھ میں آگئی جسے پچھلے ہفتہ آل پن سے اٹکا لیا تھا۔ آل پن کی نوک الگ مزاد سے گئی۔

ملائن نے بڑی سعادت مندی سے جھپٹ کر چشمہ اٹھایا اور مشفقانہ ترحم کے ساتھ کہنے لگیں۔

"میں تو آپ سے اسی روز کہہ رہی تھی کہ اسے بازار میں درست کرا لیجئے کہیں آل پن سے بھی کمانیاں جڑتی ہیں"

میرے بھیجے سے ان کے الفاظ ٹکرائے مگر مفہوم گرفت میں نہ آ سکا۔ مفہوم کو گرفت میں لینے والا پرزہ تو اس وقت ہمہ تن اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا کہ تخت پر جو کچھ نظر آ رہا ہے کیا سچ مچ وہ وہی ہے جو نظر آ رہا ہے اگر وہی ہے تو مسئلے کی رو سے مجھے پہلے خودکشی کر کے ملائن کو طلاق دینی چاہیئے یا پہلے طلاق دیکر اپنے سر میں اینٹ مار لینی چاہیئے۔

"یہ ..... یہ کیا ہے؟" میں معدے اور پھیپھڑے کی مشترک قوت سے دہاڑا میری شہادت کی انگلی تخت کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"کیا کسی سے لڑ کر آئے ہیں" ملائن کی کھنا کے دار آواز بڑی طمانیت سے بلند ہوئی "ذرا دم لیجئے میں چائے بنا کے لاتی ہوں"

"چائے گئی جہنم میں ..... ت تم نے شراب پینی تو نہیں شروع کر دی؟"

"آپ ہی کی لائی ہوئی سنکارا پی رہی ہوں اگر اس میں شراب ملی ہوئی ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی یا ہمدرد والوں پر"

میں نے کانپتی انگلیوں سے تخت پر سے ایک ورق اٹھایا جو تین جوڑوں پر مشتمل تھا میرے خدا یہ سچ مچ اصح السیر ہی کا ورق تھا ——— وہ اصح السیر جس کے پہلے ایڈیشن کا نسخہ میں نہ جانے کتنی مشکلوں سے آزاد لائبریری سے چرا کر لایا تھا بہترین کاغذ۔ لاجواب چھپائی۔

فوراً ہی نظر ایک اور ورق پر گئی جو سیرت النبیؐ سے تراشا گیا تھا یہ بھی سالم نہیں تھا بلکہ دو مختلف ورقوں کو کاٹ کر باہم دگر جوڑ لگائے گئے تھے۔ یہ سیرت النبی علامہ شبلی والی تھی جسے میں نے صوفی بدرالدین سے نو آنے میں خریدا تھا۔ نو آنوں کی کوئی حیثیت نہ سہی لیکن یہ نسخہ سب سے پہلے ایڈیشن والا قسم اعلیٰ کا نسخہ تھا اور اس کی خاص تاریخی اہمیت یہ تھی کہ صوفی صاحب جس دن اسے کچھ اور کتابوں کے ساتھ ردی میں فروخت کرانے کے لئے اپنے صاحبزادے کے ہاتھ موہن حلوائی کی دکان پر بھجوا رہے تھے ٹھیک اسی دن چین نے تبت پر قبضہ کر لیا تھا اور ٹھیک اسی دن ننگی پیر کی درگاہ کے بڑے سجادے صاحب نے سیٹھ دھاں لو ہے والا کو خلافت عطا کی تھی۔

"مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے" میں نے ملائن کو جھنجھوڑا۔

"ہائے اللہ۔ غصہ تو تھوکئیے۔ آپ تو کہا کرتے ہیں جب تک کسی معاملہ کی تہ تک نہ پہنچ جاؤ رائے ہرگز مت قائم کرو"

"رائے اور معاملہ سب گئے جہنم میں ..... میں پاگل ہو جاؤں گا نہیں تو جلدی سے بتاؤ یہ .... یہ .... یہ ...... میرے خدا اس حرکت کو کن لفظوں سے تعبیر کروں"

"آپ خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں ذرا طیش کم کیجئے میں ساری بات بتاؤں گی تو آپ خوش ہو جاویں گے"

میں چکرا گیا ——— کہیں سچ مچ تو اللہ کی بندی کا دماغ خراب نہیں ہو گیا ——— اندازہ کیجئے ننھے بچوں کی طرح میری قیمتی کتابیں کاٹ چھانٹ رہی ہے اور کہتی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ بدنصیب کی آنکھوں میں دیوانگی کی علامات ڈھونڈنے کی سعی بلیغ کی تو برا مان کر یہ ارشاد ہوا۔

"آپ یوں گھور گھور مجھے کیا دیکھ رہے ہیں"

"پھر کیا کروں۔ تمہیں پاگل خانے بھیجنے سے پہلے کیا جی بھر کر دیکھ بھی نہ لوں"

"خدا سمجھے آپ مردوں سے۔ دو تین دن کہکر پانچویں دن تشریف لائے ہیں اور بجائے نادم ہونے کے الٹا مجھے پاگل ٹھیرا رہے ہیں"

"اف فوہ .... تاخیر کے جرم میں میری کھوپڑی پر ٹھینگنی مار دو مگر یہ ...... یہ ......" میں نے ہسٹریائی انداز میں تخت کی طرف اشارہ کیا۔

"سنا سنایا کچھ نہیں غصہ کرنے میں پیش پیش ہیں"

"اب کیا دھرا ہے سننے کو۔ اتنی قیمتی کتابیں تم نے برباد کر دیں۔ سناؤ کیا سنانا چاہتی ہو"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مولانا اشرف علی صاحب کا بہشتی زیور پڑھا کرو اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے پتھر کی لکیر سمجھو"

"پھر؟" میں مبہوت ہوکر بڑبڑایا۔

"اور یہ بھی آپ ہی نے کہا تھا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی ویسے تو بہت بڑے عالم ہیں ہی۔ مگر جب سے وہ مولانا اشرف علی صاحب سے بیعت ہو گئے ہیں ان کا درجہ بھی ہم مقلدین کے حق میں امام کم نہیں رہا۔"

"ہاں ہاں کہا ہوگا..... اس وقت ان بے تکی باتوں کا کیا موقع ہے؟"

"بے تکی کیوں ـــــ بات تو ساری اسی میں ہے۔"

"یعنی؟" میں جھلایا

"جھلائیے مت ـــــ یاد کیجئے ایک دفعہ میں صدق جدید کی ایک تحریر پر کچھ اختلاف ظاہر کر رہی تھی تو آپ نے کتنے شد ومد سے کہا تھا کہ خبردار مولانا دریا بادی کی رائے میں کبھی شک مت کرنا ورنہ کافر ہو کر مروگی۔"

"استغفراللہ ـــــ کہا تھا بابا سب کچھ کہا تھا۔ میں تو صبح سے شام تک نہ جانے کیا کیا کہتا ہوں مگر..... مگر....."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ تو ناؤ کھا رہے ہیں۔ تاؤ میں بھلا کیا بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"رحم..... بانو، بیگم، رانی رحم..... اب میں اپنا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ کر جنگلوں چڑھ جاؤں گا۔"

"نوج چڑھے جنگلوں،" انھوں نے نہایت اطمینان سے کہا "ٹھیرئیے میں چائے لاتی ہوں۔"

"چلو چائے ہی لاؤ...... اور ہاں انڈا ونڈا بھی کچھ ہو تو..... طے ہے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ چائے اور انڈے کی مشترکہ گرمی نے میری آتش غضب کو خاص حد تک فرو کیا۔ پھر ملائن الماری میں سے ایک اخبار اٹھا کر لائیں جو صدق جدید کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کہنے لگیں۔

"پوری بات آپ تب سمجھیں گے جب اسے پڑھ لیں۔"

یہ ۲۰ر نومبر ۱۹۶۲ء کا صدق جدید تھا اس کا صفحہ ۳ کھول کر انھوں نے میرے آگے رکھا۔ مولانا دریا بادی معمولاً ایک بغلی عنوان دیکر کوئی خبر نقل کرتے ہیں پھر اس پر چبھتی ہوئی رائے زنی فرماتے ہیں اس صفحے کے جس عنوان پر ملائن نے انگلی رکھی تھی وہ یہ تھا۔

مولانا مودودی کی خدمت میں

میرے چشمے کا حشر تو آپ دیکھ ہی چکے بغیر چشمے کے میں نے خدمت کو "مذمت" پڑھا۔ ملائن نے ٹوکا۔

"مولانا مودودی کی مذمت میں نہیں خدمت میں"

"کیا فرق پڑتا ہے" میں نے ڈھٹائی سے کہا" مجھے یقین ہے اس میں مولانا مودودی کی تعریف نہیں کی گئی ہوگی۔ لاؤ ایک پن اٹکا کر چشمہ مجھے دیدو۔"

پن تو فوری طور پر نہیں ملا۔ انھوں نے کلابتو کے تار سے چشمہ کی مرہم پٹی کر دی۔ اب میں نے بہت غور سے اُن ظالم سطروں کا مطالعہ کیا جن کی چونک میں میری قیمتی کتابوں پر دبال آیا تھا۔

مولانا دریا بادی نے پہلے تو مولانا مودودی کی تقریر کا مندرجہ ذیل ٹکڑا نقل کیا تھا۔

> "اگر اسلام کے ساتھ منافقت اور جمہوریت کے ساتھ مذاق کا طرز عمل ختم نہ کیا گیا۔ تو پاکستان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ار اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کی کوئی وجہ جواز موجود نہ تھی۔ اس مارشل لا نے ساری قوم میں بزدلی پست ہمتی۔ مایوسی۔ خوشامد پسندی اور ملک کے معاملات سے بے پروائی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ساری دنیا میں ہماری آبرو ختم ہو چکی ہے جمہوری ممالک کے اندر ہمارا اثر و نفوذ بالکل ختم ہو گیا ہے.... دس کروڑ مسلمانوں نے حصول پاکستان کے لئے جدوجہد اس غرض سے نہیں کی تھی کہ یہ ملک چند آدمیوں کی جاگیر بن جائے یا چند خاندان اس ملک کے ٹھیکیدار بن جائیں۔ ملک کے معاملات سے قوم کو بے دخل کر دیا جائے اور ایک آدمی اس پر قابض ہو جائے۔"

پھر اس پر یہ رائے زنی فرمائی گئی تھی۔

> "تقریر میں معاملات و مسائل پر جو رائے زنی کی گئی ہے۔ اس کی صحت یا غلطی سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ یہ ساری تقریر اور اس قسم کی دوسری تقریریں اور بیانات جو مولانا کے قلم اور زبان سے آج کل ہر روز شائع ہو رہے ہیں

سرتاسر سیاسی ہے یا دینی ؟ اور اگر یہ تقریریں سیاسی نہیں۔ تو آخر پھر کون سی تقریریں سیاسی ہوتی ہیں ؟ مولانا اپنا موضوع سخن اگر صرف ان قوانین تک محدود رکھتے۔ جو براہ راست احکام دین میں مداخلت کرتے ہیں (مثلاً جدید عائلی قوانین) جب تو یہ بات ایک عالم دین کے بالکل شایانِ شان رہتی۔ لیکن جب تقریر میں مارشل لا جمہوریت اور اس کے تقاضے۔ امریکہ کی عہد شکنی۔ معاہدہ ناجنگ چین سے۔ حکومت کی نوعیت پارلیمنٹری یا صدارتی وغیرہ زیر بحث آنے لگیں۔ تو پھر ایک سیاسی لیڈر اور ایک محترم عالم دین کے درمیان فرق ہی کیا رہ جاتا ہے (اور اخبار والوں نے بھی شاید یہی بھانپ کر فلاں اور فلاں سیاسی لیڈر کی طرح مولانا کی بھی تصویریں ہر روز چھاپنا شروع کر دی ہیں) اور پھر ان کی ذات اس گندگی سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے جو ساری سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے پر اچھالتی ہی رہتی ہیں!۔۔۔ یہ مشورہ ان کے کسی مخالف نکتہ چین کی طرف سے نہیں، ایک ہمدرد و ہواخواہ کی طرف سے پیش ہو رہا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اس روشنی میں وہ اپنی روش پر نظر ثانی گوارا فرمائیں "

کتنا اچھا تلاؤ ریمارک۔ کیسی پتے کی بات۔ میں پل بھر کو بھول ہی گیا کہ اس وقت مطالعہ کا مقصد مولانا دریابادی کو داد دینا نہیں بلکہ معمہ نمبر فلاں کا چلیپائی اشارہ حل کرنا مقصود ہے۔

" دیکھا تم نے بیگم کتنے بچے تلے خیالات ہیں " میں نے لہک کر عرض کیا " ایک دینی قائد اور سیاست میں بھلا کیا جوڑ۔ مولانا مودودی شاید سٹھیا گئے ہیں "

" اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے "

" ہوتا ہے نا " میں خوش ہو کر چہکا " یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ علمائے دین کو صرف فقہی مسائل اور احکام دین سے سروکار رکھنا چاہئیے۔ سیاست میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئیے "

" پتا نہیں ۔۔۔۔۔۔ بھیا اور خود آپ بھی کبھی کبھی یہ کیوں کہتے رہے ہیں کہ دین اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں ۔۔۔ "

" ہم دو نوں جھک مارتے ہیں ۔۔۔۔۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ بڑے دین و سیاست الگ الگ نہ ہوں مگر عالم اور سیاست داں کی کرسی الگ الگ ہونی چاہئیے حاکموں کا کوئی اقدام قوم میں بلندی پیدا کرتا ہے یا پستی اور جمہوریت کو فروغ ملتا ہے یا آمریت کو ان سیاسی مکروہات سے علماء و مصلحین کا کیا واسطہ ۔۔۔۔ "

" واقعی نہ ہوگا " ملائن نے انتہائی سعادت مندی سے کہا " اچھا یہ تو بتائیے سیاست کہتے کسے ہیں ؟ "

" ہائیں سیاست ۔۔۔۔ یعنی کہ سیاست ۔۔۔۔۔ ارے بھئی سیاست کے تو بس ایک ہی معنی ہیں یعنی کہ سیاست ۔۔۔۔۔ استغفر اللہ تمہاری جہالت نے تو حد کر دی ۔۔۔۔۔ "

" خیر یہ بتائیے مختلف قوموں سے صلح اور جنگ کرنا، معاہدے کرنا، فوجیں لڑانا یہ سارے کام علماء دین کے ہیں یا سیاست دانوں کے ؟ "

" بڑی بے خبر ہو۔ نیک بخت علماء و صلحاء کا ان مکروہات دنیا سے کیا تعلق یہ سب کام حکام وقت کی صوابدید سے ہوتے ہیں اور حکام وقت ظاہر ہے سیاست ہی کی روشنی میں کام کرتے ہیں وہ سیاست نہ جانیں تو قوم و ملک کا سلفہ اڑ جائے "

" بس ٹھیک ہے " ملائن نے اطمینان کا طویل سانس لے کر کہا " اب آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہونی چاہئیے کہ میں کتابوں میں تراش خراش کیوں کر رہی ہوں "

مجھ پر دفعتہً بجلی سی گری۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ گفتگو کیا اور کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ ان کے الفاظ تیرِ نیم کش بنکر کھوپڑی میں پیوست ہو گئے۔

" تو ۔۔۔۔۔ یعنی۔ کیا مطلب ہے تمہارا ؟ "

" سب سے پہلے میں سیرت کی کتابوں کو درست کروں گی ان میں نہ جانے کن مرے پیٹوں نے ڈھیر کے ڈھیر ایسے احوال و کوائف اور واقعات و حوادث بھر دئیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے پیارے رسول ﷺ بھی خدانخواستہ بہت بڑے سیاست داں تھے۔ کہیں سیاسی معاہدوں کا ذکر ہے۔ کہیں فوجی نقل و حرکت ہو رہی ہے کہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ

فلاں شادی اس مصلحت سے کی۔ کہیں سیاسی مفادات کی بنیاد پر صلحنامے ترتیب دیئے جا رہے ہیں کہیں مالِ غنیمت کی تقسیم تک میں سیاسی نزاکتوں کا لحاظ رکھا جا رہا ہے گویا ستر پہرے دور اللہ کا رسول ایک سیاسی لیڈر بھی تھا......"

"کافرہ! کمبخت زبان بند کرو" میں حلق کے بل دہاڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تقریر میرے سینے پر گھونسہ بن کر برسی تھی" تم اللہ کے رسولؐ کی توہین کر رہی ہو"

"ہیضہ کھائے توہین کرنے والوں کو" وہ تنک کر بولیں" یہ خوب رہی نیکی برباد گناہ لازم۔ آپ ابھی تو زور شور سے یہ فرما رہے تھے کہ عالم دین اور سیاست کے درمیان کوئی ربط نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ دو میں سے ایک بات ماننی پڑیگی یا تو یہ مانیئے کہ پیارے نبی عالم دین نہیں تھے یا یہ مانیئے کہ ان کے اسوۂ حسنہ میں سیاسی اور عسکری نوع کے معاملات و مشاغل کسی دشمنِ اسلام نے گھڑ گھڑ کر شامل کر دیئے ہیں......"

"اے ارسطو کی خالہ...... تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ عالم دین اصطلاحاً اسے کہتے ہیں جس نے کسی مدرسہ سے باقاعدہ سند حاصل کی ہو......"

"سند تو مولانا مودودی نے بھی حاصل نہیں کی.... مگر اف.... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اللہ کے رسول نے کسی مدرسے سے سند......

"اُف...... بند کرو زبان —— میں مردود تمہاری یہ چخر چخر میں جانے کیا بک گیا...... کون کافر ہے جو کہتا ہے کہ حضورؐ عالم دین نہیں تھے......"

"خیر اب تو میں یہی کارِ خیر انجام دے رہی ہوں کہ سیاست کے اجزاء کو کتاب سے تراشوں اور بالکل اصلی سیرت ترتیب دوں......"

"تم مجھے پاگل بنا دو گی...... تم کسی دن میرا گلا کاٹ کر پاؤں کے انگوٹھے میں جوڑ دو گی —— یا معبود اس طرح تو تم میری ساری کتابیں برباد کر دو گی"

"ضرور کروں گی" انھوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا" کوئی صحابی ہو یا تابعی، مجدد ہو یا امام میں ہر ایک کے تذکرے سے سیاست کا زہر الگ کروں گی —— میں تو بخاری اور مسلم کو بھی کاٹوں گی۔ نہ آئے مجھے عربی مگر کتاب المغازی جیسے عنوان تو سمجھ ہی لیتی ہوں۔ جنگ کا سرا آپ نے خود ہی بتایا ہے کہ سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہوا کرتا ہے"

"بس کرو خدا کے لئے...... میں اب پاگل کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دوں گا......"

"غصے کی کیا بات ہے۔ سیاست کے چکر میں تو کیا ہمارے شیخ الہند اور کیا ہمارے مولانا اسمٰعیل شہید اور کیا مولانا محمد علی جوہر اور کیا خلافت کمیٹی والے علماء سبھی تھے اور تو اور خدا جانے کن سرپھروں نے یہ تک گھڑ لیا ہے کہ اللہ کے رسول کی میت دفن کرنے سے پہلے ہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر قیام خلافت کی خاطر سقیفہ بنی ساعدہ دوڑے چلے گئے تھے۔ نوج ایسا ہوا ہو یہ اتنے بڑے بڑے صحابیوں کو سیاست داں باور کرانے والے واقعات ضرور ان عجمی سازش بازوں نے گھڑے ہیں جن کا سراغ خدا خدا کر کے اب سیکڑوں برس بعد مولانا غلام احمد پرویز نے لگایا ہے"

"اف میرے خدا۔ تم عورت ہو یا...... یا......"

"چڑیل۔ کہیئے نا چپ کیوں ہو گئے۔ آپ کی تو عادت ہے کہ جب جواب نہیں بنتا تو طرارہ دکھانے لگتے ہیں"

"گھونٹ دو میرا گلا۔ چبا جاؤ میری ہڈیاں —— تم بات کو سمجھتی ہو نہیں زبان چلائے جاتی ہو۔ دکھاؤ سیرت النبی یا اصح السیر ہمارے حضورؐ نے مارشل لا اور جمہوریت اور امریکہ و چین کا ذکر کہاں کیا ہے"

"ارے وا —— آپ دکھائیے قرآن و حدیث۔ اللہ رسول نے روزے اور نماز کا ذکر کہاں کیا ہے؟"

"پاگل ہو گئی ہو۔ یہ جگہ جگہ صوم و صلوٰۃ کا ذکر تمہیں نظر نہیں آتا"

"گفتگو الفاظ میں ہے۔ روزے اور نماز کے الفاظ دکھلایئے۔"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی"

"پھر مارشل لا اور جمہوریت وغیرہ الفاظ کا مطالبہ آپ نے کیوں کیا۔ یہ تو فقط الفاظ ہیں معانی کے اعتبار سے کیا سیاسی و عسکری اور عمرانی و اجتماعی معاملات و مسائل کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ملتا۔ امریکہ اور چین وغیرہ کی جگہ روم و فارس اور جمہوریت کی جگہ شاورھم فی الامر اور مارشل لا کی جگہ واللہ لا یحب الظلمین سے معنوی یکسانیت میں کیا فرق پڑتا ہے کیا قرآن اور حدیث میں

حکام کے فرائض نہیں بتائے گئے۔ کیا منفی اور مثبت ہر طرح کے۔ حصول و اقتدار پر اللہ اور رسول کی ہدایات موجود نہیں۔ اور پھر صحابہ نے حکومتیں قائم کر کے کیا عملاً اور قولاً یہ نہیں ثابت کیا کہ قوم و ملت کے مجموعی عروج و زوال کی ساری کہانی سیاست ہی کے ارد گرد گھومتی ہے اصطلاحیں آج کچھ بنالی جائیں لیکن معنوی حقائق تو الفاظ و اصطلاحات میں منحصر نہیں ہوا کرتے۔"

" قینچی کی طرح چلتی ہے تمہاری زبان۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ مردانہ معاملات میں اپنی چڑیا جیسی عقل مت لڑایا کرو۔ تم کیا مولانا ندوی یا دریا بادی سے زیادہ سمجھدار ہو۔"

" میں کب کہتی ہوں۔ اُنھی کی سمجھ پر بھروسہ کر کے تو میں نے کتابوں کی درستگی شروع کی ہے۔ یہی تو ان کا فرمانا ہے کہ علم دین اور سیاست میں تضاد ہے جو سیاست سے ناطہ جوڑے گا وہ عالم اور مصلح اور متقی نہیں ہو سکتا۔ تو رسولؐ اور صحابہؓ اور صالحین کے علم و تقویٰ کا انکار کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں سے صاف انکار کر دیا جائے۔"

" پھر تو تم قرآن میں بھی کتر بیونت کرو گی" میں سہم کر بولا۔

" بے شک کروں گی۔ اگر صالحیت و سیاست میں منافات ہے تو قرآن میں بھی ردّ و بدل کئے بغیر چارہ نہیں۔ کیا حضرت یوسف اور کیا داؤد و سلیمان بڑے بڑے پیغمبروں کا دامن بھی سیاست سے آلودہ نظر آتا ہے ـــــ"

" آسمان پھٹ پڑیگا ملائن ـــــ کیا ہو گیا ہے آج تمہیں۔"

" مجھے صدق جدید ہو گیا ہے ـــــ ٹھیرئیے میں وضو کر کے قرآن لاتی ہوں۔ شیخ الہند کے ترجمے میں دسیوں جگہ ایسی تصریحات میں نے دیکھی ہیں جن کا معنوی جوڑ سیاست ہی سے ہے ـــــ"

" خبردار ..... ـــــ قرآن صرف اس شرط پر لا سکتی ہو کہ اس میں مارشل لا اور پارلیمنٹ اور امریکہ وغیرہ کے الفاظ دکھلاؤ ـــــ"

" چلئے منظور ہے ـــــ مگر پہلے آپ کو یہ دکھلانا ہو گا کہ قرآن میں شراب اور سور اور سود کو حرام لکھا ہے۔"

" یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ لکھا ہے۔ خمر، خنزیر اور ربوا کن چڑیوں کے نام ہیں؟"

" مطالبہ لفظوں کا ہے۔ وھسکی، برانڈی، بیئر ان الفاظ میں شراب کی حرمت دکھلائیے۔"

" قرآن انگریزی میں نہیں ہے۔"

" تو مارشل لا اور پارلیمنٹ بھی عربی الفاظ نہیں ہیں۔"

" تم بیوی ہو کر شوہر کے کان کاٹتی ہو۔ جہنم میں جاؤگی۔"

" میں آپ کے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتی۔"

باپ رے ..... نون سنس ..... استغفر اللہ ربی من کل ذنب....."

" چھنّے ہٹیّے۔ پانچ دن میں تو آئے ہیں اور ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ امرود اور پپیتے کے پیوند سے سیب اُگانے کے سلسلہ میں کوئی کام کی بات ہاتھ لگی یا نہیں۔"

" بکواس بند کرو۔ میں سیب اور انگور سب پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم کیوں، نہیں تجلّی اور صدق جدید کے پیوند سے کذب جدید نام کا ایک اخبار نکالنا شروع کر دیتیں۔ بہت بکے گا۔ اس پر لکھنا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ۔ ..سالانہ خریداری قبول نہیں کی جائے گی ہر شمارہ وی۔ پی سے بھیجا جائیگا۔ جس کی قیمت صرف دو روپے ہوگی۔ ہاں نہیں تو ....."

(ملّا زندہ صحبت باقی)

ایک تولہ پانچ روپے ۔ چھ ماشے تین روپے

ڈاک خرچ ایک روپیہ آٹھ آنے

تین شیشیاں ایک ساتھ طلب کرنیوالونکو محصولڈاک معاف

بے شمار خطوط میں سے دو خطوں کے اقتباس

(۱) مورخہ ۱۵ مارچ

محترم سلام مسنون!

واضح ہو کہ مجھے ایک شیشی سرمہ دُرِ نجف کی ضرورت ہے جو میں آپ کے یہاں سے پہلے ایک مرتبہ ایک شیشی منگا چکا ہوں اس سے ناخونہ میں بہت زیادہ فائدہ ہے۔ تاکید جان کر ایک شیشی اور پتہ ذیل پر روانہ کرنے کی مہربانی کریں گے۔ محمد مزمل۔ موضع بازار بیلوہ۔ ڈاکخانہ ساٹھی۔ ضلع چمپارن (بہار)

(۲) بھوپال — ۱۵ ار اگست ۱۹۶۲ء

...... میں نے برادرم میاں سعید محمد خاں صاحب کو بھی خاص طور پر دُرِ نجف کی حتی الوسع کثرت کیساتھ اشاعت کرنے کو خوب کہہ دیا ہے اور چونکہ ان کا ناخونہ سخت قسم کا اور بہت دیرینہ اس دُرِ نجف کے استعمال سے بفضلہ تعالیٰ تقریباً اچھا ہوچکا ہے اس لئے وہ بذاتِ خود اس کے بہت مدّاح ہیں اور ہروقت اس کی شیشی اپنی جیب ہی میں رکھتے ہیں۔ منشی بہاری لال برمکان محمد ایوب خاں۔ نزد ٹال والی مسجد۔ بھوپال۔

دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دو مکتوب

مکتوب ۳۶ - خواجہ محمد تقی کے نام

(جستہ جستہ)

بجابت آثار! اہل سنت و الجماعت کی علامات میں سے تفضیل الشیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ کو افضل امت سمجھنا) اور محبۃ الختنین (علیؓ و عثمانؓ سے محبت رکھنا) ہے۔ تفضیل شیخین جب محبت ختنین کے ساتھ جمع ہو تو یہ خصائص اہل سنت و جماعت میں سے ہے۔ تفضیل شیخینؓ، صحابہؓ و تابعینؒ کے اجماع سے ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ اکابر ائمہ نے اس اجماع کو نقل کیا ہے۔ ان اکابر ائمہ میں امام شافعیؒ بھی ہیں۔ اور شیخ ابوالحسن اشعریؒ فرماتے ہیں کہ ساری اُمت میں ابوبکرؓ و عمرؓ کی افضلیت قطعی ہے۔ اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بتواتر ثابت ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانے میں گروہ کثیر کے روبرو فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ اس اُمت میں سب سے بہتر ہیں۔ چنانچہ امام ذہبیؒ نے کہا ہے اور امام بخاری نے روایت کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "بہترین مردم بعد از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ ہیں، پھر ایک اور" حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؒ نے دریافت کیا، پھر آپ؟ فرمایا کہ میں تو مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں۔ بالجملہ، تفضیل شیخین راویوں کی کثرت کی بنا پر شہرت و تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہے اس کا انکار کرنا یا جہالت کی وجہ سے ہے یا ازراہِ تعصب۔ عبدالرزاق جو اکابر شیعہ میں سے ہیں جب انھوں نے مجال انکار نہ پائی تو (لاچار ہو کر) تفضیل شیخین کے قائل ہو گئے اور کہا کہ "جب حضرت علیؓ (خود) شیخینؓ کو اپنے اوپر فضیلت دے رہے ہیں تو میں بھی حضرت علیؓ کے قول کے مطابق شیخینؓ کو حضرت علیؓ پر فضیلت دیتا ہوں۔ اگر حضرت علیؓ فضیلت نہ دیتے تو میں بھی فضیلت نہ دیتا، یہ گناہ کی بات ہے کہ میں ایک طرف حضرت علیؓ کی محبت کا دعویٰ کروں اور دوسری طرف ان کے قول کی مخالفت کروں" ۔۔۔ اور چونکہ حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں فتنوں کا ظہور ہوا اور لوگوں کے احوال و معاملات میں بہت سا اختلال واقع ہوا اس بنا پر کچھ لوگوں کے دلوں میں (اس وقت) بہت کچھ کدورت پیدا ہو گئی اور عداوت و کینہ نے غلبہ پا لیا۔ اس وجہ سے "محبت ختنین" بھی از جملہ شرائط سنت و جماعت شمار ہوئی تاکہ کوئی ناواقف اس راہ سے اصحاب خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدگمانی نہ کرے اور حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے ساتھ بغض و عداوت نہ پیدا کرے ۔۔۔ پس محبت حضرت علیؓ شرط اہل سنت واقع ہوئی۔۔۔ جو ان سے محبت نہ کرے وہ اہل سنت و جماعت سے خارج ہے اس کا نام خارجی ہے ۔۔۔ اور جس نے محبت حضرت علیؓ میں غلو اور افراط کی سمت اختیار کی اور حدِ مناسب سے تجاوز کر گیا اور اصحاب خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدگوئی اور ان کی شان میں گستاخی کے ساتھ زبان کشائی کی اس کا نام شیعہ ہوا۔ پس اہل سنت محبت علیؓ کی افراط و تفریط کے درمیان اعتدال پر ہیں افراط و تفریط کو دو رفض

(خوارج) نے اختیار کیا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ حق وسط میں ہے اور افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔ چنانچہ امام احمد حنبلؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی سے فرمایا "اے علی تم کو عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہت ہے۔ کہ یہود نے اُن سے دشمنی کی، حتیٰ کہ ان کی والدہ مریمؑ صدیقہ پر بھی بہتان باندھا اور نصاریٰ نے ان کی محبت و عظمت میں اتنا غلو کیا کہ ان کو اس مرتبے پر لا تارا جس کے وہ ہرگز مستحق نہ تھے یعنی اللہ کا بیٹا کہا ——— پھر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے معاملے میں بھی دو گروہ ہلاک ہو گئے ایک وہ جو میری محبت میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا اور جو صفت میرے اندر نہیں ہے اس کو ثابت کرتا ہے اور دوسرا وہ جو میرے ساتھ دشمنی رکھتا ہے اور دشمنی اور عداوت کی وجہ سے مجھ پر بہتان تراشی کرتا ہے۔"

• قرآن و احادیث اصحابِ کرامؓ ہی کی تبلیغ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اگر اصحاب کرامؓ مجروح و مطعون ہو تو وہ دین بھی جو ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے مجروح و مطعون ہو جائے گا نعوذ باللہ من ذلک .... محض اپنے گمان سے کسی بزرگ دین کو (خواہ مخواہ) دشمنِ علی سمجھ لینا اور پھر اس کے حق میں لعن طعن کو جائز رکھنا انصاف سے دور ہے، یہ اطراف محبت کے شگوفے ہیں ———

"اگر کوئی محبت علیؓ کو مستقلاً اختیار کرتا ہے اور حُبِّ پیغمبر کو اس محبت میں کوئی دخل نہیں ہے تو ایسا شخص بحث سے خارج ہے، اور قابلِ مخاطبت نہیں ہے ایسے شخص کی غرض تو دین کو باطل کرنا اور شریعت کو ویران کرنا ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ بغیر توسط حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ اختیار کرے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تعلق ہو کر حضرت علیؓ کی طرف مائل و متوجہ ہو ...... حضرت علیؓ (یقیناً) ایسے شخص سے بیزار ہیں اور اس کے اس کردار سے ان کو (روحانی) صدمہ ہے ——— (در اصل) اصحاب پیغمبر اور خُسران و دامادانِ پیغمبرؐ سے دوستی و محبت رکھنا دوستی و محبت پیغمبر ہی کی وجہ سے ہے اور ان کی تعظیم و تکریم بحضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم ہی کی بنا پر ہے ——— خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے ان سے (صحابہؓ سے) محبت رکھی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی۔" ایسے ہی جو شخص ان حضرات کا دشمن ہے وہ بھی اپنے اندر دشمنی پیغمبر رکھنے کی وجہ سے اُن کا دشمن ہے جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ——— "جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے اُن سے بغض رکھا۔" مطلب یہ ہے کہ جو محبت میرے اصحاب سے متعلق ہے وہ وہی محبت ہے جو مجھ سے متعلق ہے۔ ایسے ہی اُن سے جو بغض متعلق ہے وہ وہی بغض ہے جو مجھ سے متعلق ہے ...... اے مخاطب! بہت زیادہ پرہیز کر، اکابر دین پر طعن کرنے سے اور مقتدایانِ اسلام کی بُرائی کرنے سے۔ وہ اکابرِ دین جنھوں نے اپنی پوری طاقت کو صرف کیا ہے کلمۂ اسلام کو بلند کرنے اور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی نصرت و حمایت میں، اور جنھوں نے اپنے مالوں کو خرچ کیا ہے تائیدِ دین میں رات دن، خفیہ اور علانیہ اور جنھوں نے حُبِ رسولؐ کی خاطر اپنے کنبے، برادری کو چھوڑا، اپنی اولاد و ازواج کو چھوڑا۔ جنھوں نے اپنے گھر، اپنے بہتے چشمے اپنی کھیتیاں اپنے باغات اور نہریں یہ سب چیزیں چھوڑیں۔ جنھوں نے ذاتِ رسول علیہ و علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنی ذاتوں پر ترجیح دی، جنھوں نے محبت رسولؐ کو اپنی ذات کی محبت اور اپنے اموال و اولاد کی محبت کے مقابلے میں ——— اختیار کیا ——— یہ وہ ہیں جو شرفِ صحبت سے مشرف ہیں اور صحبت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر برکات نبوت سے بہرہ مند ہوئے۔ وحی ان کے سامنے آئی، جبرئیلؑ کی حاضری ان کی موجودگی میں ہوتی تھی اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے خوارق و معجزات رسولؐ کو دیکھا ہے یہاں تک کہ ان کا غیب شہادت اور ان کا علم عینی ہو گیا۔ اور ان کو یقین کی وہ دولت عطا ہوئی جو ان کے بعد کسی کو نہیں ملی، یہاں تک کہ دوسروں کا کوہِ اُحد کے برابر سونا خیرات کرنا اُن کے ایک مُد یا نصف مُد جَو کے اجر کے برابر بھی نہیں ہے

یہ وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک
ں فرمایا ہے۔
ضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْاعَنْہُ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ
اللہ سے خوش۔

دوسری جگہ انجیل کے حوالے سے فرمایا گیا ہے۔

ثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ
فْرَجَ شَطْئَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَا
سْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ
جِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ
کُفَّارَ۔

اور انجیل میں ان اصحابِ محمد رض (علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مثال یوں بیان ہوئی ہے کہ ایک کھیتی کی طرح جس کا (کمزور اور نرم ونازک) انکھوا زمین سے برآمد ہوا، پھر اسکو طاقت و قوت ملی پھر وہ اپنی ساق (یعنی ڈنڈیوں) پر سیدھی قائم ہوگئی پھر وہ مضبوط ہوگئی۔ کاشتکار اسے دیکھ کے خوش ہوتے ہیں ـــ تاکہ جلیں اُن سے دل کافروں کے۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ سے جلنے والوں کو "الکفّار" رمایا ہے، پس صحابہؓ سے جلن اور کینہ اور غصہ سے اسی لرح پرہیز کرنا ضروری ہے جس طرح کفر سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

مکتوب ۱۹ میر محب اللہ کے نام

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــ سیادت پناہ برادرم میر محب اللہ کو لکھتا ہوں کہ اس طرف کے فقراء کے احوال لائقِ حمد ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری سلامتی وثابت قدمی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اس عرصے میں تم نے اپنی طرف کے احوال سے مطلع نہیں کیا، مسافت کی دوری بھی کچھ مانع ہے ـــ ہماری نصیحت بس یہی ہے کہ احکام دین کی پابندی اپنے اوپر لازم قرار دے لی جائے اور سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور پیروی ہوتی رہے۔ سُنّتِ سنیہ کو ادا کیا جائے۔ بدعتِ غیر مرضیہ سے پرہیز ہو اگرچہ بدعت کی روشنی صبح کی طرح کیوں نہ دکھلائی دیتی ہو۔ اس لئے کہ بدعت میں درحقیقت کوئی بھی نور نہیں ہے۔ نہ بیمار کے لئے اُس کے اندر کوئی شفا ہے۔ نہ مرض کے واسطے اس میں کوئی دوا ہے (بدعت میں کیسے کوئی نور ہو جبکہ وہ) دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو وہ سنت کو اُٹھا دینے اور دُور کرنے والی ہے یا اُس سے ساکت ہے اگر ساکت ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سُنّت سے زائد ایک چیز ہو۔ جب زائد ہوئی تو وہ درحقیقت سُنّت کی ناسخ ہوئی۔ لہذا بدعت کسی قسم کی بھی ہو سنت کو اُٹھا دینے والی اور سنت کی نقیض ہی ہوگی۔ پس بدعت میں کوئی بھلائی اور حسن نہیں ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ دینِ کامل اور اسلامِ پسندیدہ کے اندر پیدا کی ہوئی بدعت میں حُسن کا حکم کہاں سے لگا دیا جب کہ نعمتِ دین مکمل ہو چکی۔ ـــــــ ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ دین کے کامل، مکمل اور پسندیدہ ہونے کے بعد بدعت کو تراشنا، حُسن وخوبی سے کوسوں دور ہے ـــــــ حق کے بعد ضلالت و گمراہی کے علاوہ اور کون شے ہو سکتی ہے؟ اگر اہلِ بدعت یہ سمجھ لیں کہ دین کامل میں کوئی بدعت نکال کر اُس بدعت کو حسنہ بتانا، عدمِ کمالِ دین اور عدمِ اتمامِ نعمت کی اطلاع دیتا ہے۔ تو وہ ہرگز بدعت کو حسنہ قرار دینے کی جُرأت نہ کریں! رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَعَلٰی من لدیکم۔

(پہلا خط الفرقان (لکھنؤ) اور دوسرا خط فاران (کراچی) سے نقل کیا)

شمس نوید عثمانی — مستقل عنوان

کیا ہم مسلمان ہیں؟

بہت آسان ہے یہ بات کہ محض زبان ہلا کر ایمان جیسی عظیم شے کا دعویٰ کر دیا جائے!

لیکن جہاں ایمان موت اور زندگی کا نازک سوال بن جائے وہاں اس شخص کے سوا کوئی نہیں ٹھیر سکتا جو ایمان کے لئے اپنی جان ہی پر کھیل جائے اور جس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ اس کا دل چیر کر دکھا رہے ہوں۔ جنگِ اُحد کے دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو اسی نازک مقام سے جاں نثارانہ گذرنا پڑا تھا جہاں میدان کشت وخون کی گرم بازاری میں کائنات کے سب سے بڑے انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کفر ایک فیصلہ کن وار کر رہا تھا۔

حق وصداقت کے آخری سورج اور ظلم وکذب کی ہولناک ظلمت کے مابین اسوقت طلحہ رضؓ تن تنہا کھڑے ہوئے تھے جبتک اس محاذ سرفروشی پر دوسرے فداکار پہنچیں اس وقت تک اس اکیلے مجاہد کو اس آتشیں طوفان کے غضبناک تھپیڑوں میں رسالت کے مقدس سفینے کو ہر قیمت پر بچانا تھا۔ ان کو کفر سے نہیں اپنی موت سے جنگ کرنی تھی۔ ان کا فرضِ ایمانی ان کو پکار پکار کر بتا رہا تھا کہ جب تک ان کی جان میں جان باقی ہے ان کو محمد رسول اللہ صلعم کی حفاظت میں سینہ سپر رہنا ہے اور جب تک اس حفاظت کی ضرورت باقی ہے ان کو زخموں سے چُور چُور ہو کر بھی گر جانے کی اجازت نہیں — مر جانیکی اجازت نہیں۔ اور — خدا کی شان ہے کہ اس مشتِ خاک نے ٹھیک یہی کر کے دکھلا بھی دیا۔

جب ایک انسان کو مٹا دینے کے جنون میں صدہا انسانی درندے سر جوڑ کر یلغار کر رہے تھے۔ جب ایک ساتھ اور ایک ہی سمت میں تڑپتی، چمکتی ہوئی تلواریں آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ جب تیروں کے پرے کے پرے ایک عقابی آندھی بن گئے تھے — جب نفرت اور انتقام کی بد ترین وحشت ناکیاں مہیب جبڑے کھولے ہوئے ایک شخصِ واحد پر بھوکی بلاؤں کی طرح ٹوٹی پڑتی تھیں۔ طلحہ رضؓ حضورؐ کے آگے پیچھے، دائیں بائیں خدائی چٹان بنے ہوئے کھڑے تھے۔ جسم وجاں کی تمام تر محبت ایمان کی محبت میں سرتاسر گم ہو چکی تھی۔ وہ رسولِ خداؐ کے چاروں طرف پروانہ وار نثار ہوا چاہتے تھے۔ نہیں نہیں! — طلحہ رضؓ کا جذب وجنوں ایک پروانے کے جذبۂ شوق کو گرد کر چکا تھا۔ پروانہ پَر جلنے کے بعد اپنا طوافِ شوق جاری نہیں رکھ سکتا۔ لیکن خدا کا یہ بندہ — محمدؐ کا یہ دیوانہ — اسلام کا یہ فدائی تو زخم پر زخم کھا رہا تھا، لیکن جوں جوں گھائل ہو رہا تھا اس کے جوش وخروش پر جوانی آ رہی تھی — اس کے حوصلے کچھ اور تازہ ہو رہے تھے — اس کے قدموں کی صلابت کچھ اور بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا جنون کچھ اور وارفتہ و بے پناہ ہوتا جاتا تھا۔

زہرناک تیروں کی باڑھ کو وہ اپنی ہتھیلیوں میں نتھی کر رہا تھا مگر یہ ہتھیلیاں چھلنی ہو جانے کے باوجود تیروں کی باڑھ کو للکار رہی تھیں — تلواروں کی گرتی، کڑکتی بجلیوں کے لئے اس نے اپنا چوڑا چکلا سینہ کھول دیا تھا۔ یہ سینہ خون میں نہا چکا تھا مگر جاں نثاری کی بڑھتی ہوئی پیاس کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ مہبطِ وحی کے صدرِ مقدس کو بچانے کیلئے اس نے

اپنے پورے جسم کو قیمہ کر لینے کا والہانہ فیصلہ کر لیا تھا۔ زخموں کی بوچھار اس کے لئے پھولوں کی بارش تھی۔ تلواروں کے کچوکے اس کے حق میں راحت بخش خوابوں کا پرکیف لمس تھے وہ تو ہر گھاؤ کو ایک حسین یادگار سمجھ کر سینے میں محفوظ کر رہا تھا۔ اس لئے کہ یہ زخم اس کو اس حقیقی گھاؤ اس آخری زخم سے بچائے ہوئے تھے جو رسول اللہ ؐ کو ہلکی سے ہلکی گزند پہنچ جاتی تو سچ مچ اس کے قلب و روح کے ٹکڑے کر ڈالتا۔ اسی ناقابل برداشت صدمے سے بچنے کے لئے وہ کبھی رسولِ خدا ؐ کے پہلو میں کھڑا ہو کر گھائل ہوتا تو کبھی طوفان بلا کو سر سے اونچا ہوتا ہوا دیکھ کر کفر و شرک کے آتشیں اژدہوں کو لپٹ جاتا اور مرگ ہلاکت کے طوفان کو پیچھے دھکیل کر پھر حضور ؐ کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔ کفر حیرت سے گنگ تھا کہ جس انسان کے جسم کو خوں ریز تلواروں نے زخموں سے پاٹ دیا ہے وہ کس طرح زندہ کھڑا ہوا ہے — جس کے لہو سے اس کا جسم ہی نہیں زمین بھی لالہ زار بن چکی ہے کونسی طاقت ہے جو پھر بھی اس کو شعلۂ جوالا بنائے ہوئے ہے!

اور — اسی مقامِ حیرت پر جب ایک کافر کی تلوار شعلۂ جوالا کی طرح چمکتی ہوئی ٹھیک آفتابِ رسالت ؐ پر گرا چاہتی تھی تو کوئی اور چارۂ کار نہ پاکر اس نے بے قرار ہاتھوں سے گرتی ہوئی آبدار تلوار کو پکڑ لیا اور یہ تیغ آبدار اس کے ہاتھ کی انگلیاں تراشتی ہوئی اُبھری تو اس کے ہونٹوں سے "آہ" کے بجائے "الحمد للہ" کا نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور خوں ٹپکاتی ہوئی تلوار کا تعاقب کرتا چلا گیا۔

اللہ اکبر!

کیا شے تھا وہ جذبۂ بے پناہ جس نے زخم کو مرہم — درد کو لذت اور کراہ کو واہ بنا چھوڑا تھا! طلحہ رضؓ کے جذبۂ بندگی — جنون ایثار اور کیف سپردگی کا آخر کیا عالم تھا اُحد کے دن!

خدا کے رسول ؐ بھی پکار اُٹھے "یہ طلحہ رضؓ نہیں — خیر ہے!"

ابوبکر صدیق رضؓ جیسے عظیم مومن نے کہا:

"اُحد کا دن اُحد کا دن نہ تھا — سچ پوچھو تو طلحہ کا دن تھا!" — عمر فاروق رضؓ جیسا کم گو اور متین و سنجیدہ انسان بھی رشک و عقیدت کی شدت سے تھرتھرا گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا:—

"اے طلحہ رضؓ! — اے اُحد والے — اے صاحبِ جنگِ اُحد!" اور خود طلحہ رضؓ کو بجا طور پر ناز تھا اپنی زندگی کے ان لمحوں پر جو ان کے نزدیک ان کی پوری عمر کا حاصل تھے۔ جب اُحد کی اس پُر خطر گھاٹی کا خیال کر کے یہ دیکھتے کہ اللہ کے رسول ؐ ان کے سامنے جلوہ افروز ہیں تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے بے ساختہ مسکرا لیتے! مسکراتے مسکراتے ان کی آنکھوں میں شکر و سرور میں ڈوبے ہوئے آنسو تیر جاتے۔ ان کو انسانی ضعف و بیچارگی پر نظر کر کے یہ جاں نواز یقین فرط کیف و نشاط سے لرزہ براندام کر دیتا کہ اُحد کے دن وہ خدا کی طاقت میں ڈھل گئے تھے۔ یقیناً وہ بندگی اور فنا فی اللہ کے اس مقامِ عظیم سے گذر رہے تھے جہاں خدا بندے کا ہاتھ اور آنکھ اور کان بن جاتا ہے — ہائے وہ زندگی کے فردوس بداماں لمحے جب ایک مومن کے ستر کاری زخموں سے ٹپکتا ہوا لہو — خونِ حیات کا فوارہ خدا کے رسول ؐ کے قدموں پر ٹپک ٹپک کر خدا کی عطا فرمودہ زندگی کا حقِ تشکر ادا کر رہا تھا — خون کے لفظوں سے داستانِ وفا لکھی جا رہی تھی جس کو انسان اور خدا دونوں پڑھ رہے تھے۔ اور یہ داستان آج بھی تاریخ اپنے دیدہ و دل پر اٹھائے ہوئے صدیوں سے صدیوں کا بیکراں فاصلہ طے کر رہی ہے۔

حق یہ ہے کہ اسلام اگر خود پرستی کی جڑیں کاٹ کر خود کو تمامتہ اپنے خدا کے قدموں پر ڈال دینے کا دوسرا نام ہے — اگر نماز کا مفہوم ہی یہ ہے کہ پوری زندگی ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سجدۂ شوق میں ڈھل جائے، اگر ایمان اسی اٹل طاقت کا نام ہے جس کے نشے میں سرشار مومن جاں کنی کے جاں گداز عالم میں بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہی کہتا ہے کہ "ہاں وہ اپنے خدا کا ہے! — ہاں خدا، خدا کے سوا کوئی نہیں — کوئی بھی نہیں اور محمد ؐ اس کے بندے بھی ہیں اور رسول بھی" — تو ایک طلحہ رضؓ ہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں "میں مسلمان ہوں — میں ہوں خدائے واحد کا پجاری!"

ایسے ہی تھے وہ انسان جن کو خدا نے جیتے جی امتحانِ وفا میں کامیاب قرار دے کر "عشرہ مبشرہ" کی آسمانی فہرست میں جگہ عطا کی۔ یہاں تو زندگی کے چند لمحوں ہی نے پوری زندگی کے امتحان کا طویل فاصلہ طے کر لیا تھا۔ یہاں تو دردِ بندگی سے بندہ اس طرح تڑپا کر عرشِ عظیم کا مالک پکار اٹھا:۔

"بس کر! — اے میرے پرستار — بس کر! میں نے دیکھ لیا ہے کہ تو میرا اور صرف میرا ہے — تو زمین پر ہے مگر جنت ابھی سے تیرا انتظار کر رہی ہے — سُن لے! کہ تیرا امتحان زندگی ختم ہونے سے پہلے ختم کر دیا گیا — قیامت کی عدالت میں مغفرت کا جو فیصلہ دوسروں کو سنایا جائے گا وہ تجھے ابھی اور اسی وقت سُنایا جاتا ہے۔"

غزوۂ اُحد میں جان کی قربانی کا حوصلہ دکھا کر طلحہؓ نے غزوۂ حُنین میں جان و مال دونوں کی قربانی کا ولولہ دکھایا۔ سامانِ جنگ کی تیاری کے لئے دولت کو پانی کی طرح یوں بہا دیا کہ جیسے وہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی اور اس کے صلے میں بارگاہِ رسالت سے "فیّاض" کا خطاب پا کر لوٹے تو حُنین کے محاذ پر اس وقت بھی ثابت قدم نظر آئے جب تیروں کی ہولناک ترین پہلی باڑھ میں مجاہدوں کے پاؤں لڑکھڑا گئے تھے۔ جس بے پناہ طوفان کے تھپیڑوں میں خدا کا رسولؐ ہی ثابت قدم رہ سکا۔ طلحہؓ ان چند جاں نثاروں میں شامل تھے جو اس وقت بھی حضورؐ کے دوش بدوش کھڑے ہوئے اپنی موت کی طرف پُرشوق بازو پھیلائے ہوئے تھے۔

غزوہ تبوک کے موقعہ پر جب اسلام دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے تاجدار قیصر سے ٹکرانے جا رہا تھا تو یہی وہ مجاہد تھا جس نے ایک ساتھ "دو جہاد کئے"! — خدا کے رسولؐ نے ان کو مارِ آستین منافقوں کی سرکوبی پر مامور کیا جو سُویلم کی منزل میں چھپے ہوئے قاتلانہ سازش کر رہے تھے۔ اسلام پر جان چھڑکنے والا مجاہد بے خوف و خطر آگے بڑھا اور ان عیّار دشمنوں کے سر پر قضا بن کر گرا۔ سویلم کے "جہنم کدے" کو نذرِ آتش کر کے سازشی اور سازشیوں کو جیتے جی جہنم ہی کا مزا چکھا دیا، لیکن ایک لمحے کو دم لئے بغیر پھر پلٹا تو ایمان و یقین کی یہ بجلی تبوک کے محاذ پر چمک رہی تھی۔ سچ ہے ایمان ایک انتھک جاں نثاری کا نام ہے جہاں فرائض کو موت سے پہلے کبھی نیند نہیں آتی۔

اور —

کیسا ایمان افروز — کیسا جاں نواز ہوگا وہ منظر بھی!

جب مقام حدیبیہ پر خدا کا رسولؐ خدا کے بندوں سے کہہ رہا تھا کہ آؤ اور بندگی کا عہدِ وفا تازہ کرو۔ جب محمد مصطفٰےؐ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیکر خدا کے پرستار جذب و جنون کے عالم میں چیخ رہے تھے کہ وہ جہادِ زندگی کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک جسم میں خون کی ایک بوند بھی باقی ہے۔ اور ایسے ڈرامائی موڑ پر خدا کے رسولؐ کے ہاتھوں میں ایک شخص نے ہاتھ دیکر یہی بات دہرائی تو دنیا نے دیکھا کہ اس ہاتھ کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں! — ہائے وہ انگشت بریدہ دستِ شوق جس کی انگلیاں خود محمد عربیؐ پر اُحد کے دن نثار ہو چکی تھیں! — کون جانے کیا حال ہوا ہوگا رسولِ خدا کا! کیسا درد بھرا — اور کتنا استوار ہوگا وہ عہدِ وفا جو ان ہاتھوں سے کیا جا رہا تھا جو خود اپنے عہد کا ثبوت تھے!۔

خدا کے رسولؐ پُرسوز شفقت کے ساتھ طلحہؓ کو دیکھ رہے تھے۔ اور طلحہؓ کی بے قرار و بے تاب نظریں اس جاں نواز ہستی کی بلائیں لے رہی تھیں جو اُحد کی ہولناکیوں سے سلامت نکل کر پھر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ سامنے موجود تھی۔

یہ ہستیؐ طلحہؓ کی آنکھوں کا نور تھی۔ کلیجے کی ٹھنڈک اور دل کا قرار تھی۔ جب تک یہ ہستیؐ نظر آتی رہی یہ خدا کا پرستار زخم کھاتا اور مسکراتا رہا، لیکن جس دن یہ ہستی موت کے پردوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی اس کے تمام زخموں کی ٹیس ایک جاں ستاں ٹیس میں سمٹ آئی اور وہ بیدم ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جس وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ طے ہو رہا تھا طلحہ ایک کونے میں پڑے ہوئے کسی معصوم بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ آنسو تھے کہ کسی طرح نہ رکتے تھے۔ ہچکیاں تھیں کہ کسی طرح بند نہ ہوتی تھیں۔ درد تھا کہ کسی طرح نہ تھمتا تھا۔

کوئی بتاؤ کیا یہ وہی تھا جو اُحد و حنین میں فولاد سے زیادہ فولادی تھا؟ جس کو تیروں کے کچوکے اور تلواروں کی کاٹ نے بھی کبھی روتے اور کراہتے نہ دیکھا تھا؟ پھر آج اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بیٹھا بیٹھا دل تھامے ہوئے بلک رہا تھا! بھری دنیا سے ایک انسان کے اٹھ جانے سے وہ رو رو کر جان دیئے دیتا تھا۔ اس کو تو ایسا لگتا تھا کہ دنیا سے محمدؐ نہیں گئے یہ پوری دنیا اجڑ کر کھنڈر بن گئی۔ تمام بہاروں نے دم توڑ دیا۔ تمام کاروانِ رنگ و بو گرد و غبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تمام رعنائیاں کفنا دی گئیں دفنا دی گئیں۔ ہاں یہ سب کچھ اسلئے تھا کہ وہ دنیا کو نہیں انسانیت کو پیار کرتا تھا اور آج دنیا اس دنیا کے سب سے بڑے انسان سے خالی ہو گئی تھی۔

یہی تو وہ آخری اور پہلا زخم تھا جس کے تصور سے اسکی روح فنا ہوتی تھی اور آج یہی گھاؤ پوری قوت سے لگا تو اس کے ہونٹوں سے عمر بھر کی گھٹی ہوئی چیخیں ایک دلخراش چیخ بن کر ابل پڑیں۔ آج پہلی بار وہ زخم کھا کر گرا تھا جو نشترِ تلواروں کی پیاس بجھا کر بھی تھکا ہارا نہ تھا نہ لش سے مس ہوا تھا۔

اور اس خوں چکاں گھاؤ کی گود میں گرتے گرتے جب اس کو یہ خبر ہوئی کہ ایک جہاد ابھی اور باقی ہے تو اس کی جذباتی بیتابیاں اپنی بے بسی سے سر ٹکرانے لگیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس سب سے بڑے جہاد پر بھی ایک مجاہد چلا رہا ہے۔ اس جانے والے کے دل پر بھی وفاتِ رسولؐ کا گھاؤ خون ٹپکا رہا ہے مگر پھر بھی اس کے قدموں میں کوئی لرزش نہیں۔ ہاں یہ جہاد رسولِ خدا کے بعد رسولِ خدا کی چہیتی امت کو خودکشی اور قتلِ عام سے بچانے کا جہاد تھا۔ خانہ جنگی کے جوالا مکھی کو پھٹنے سے پہلے ٹھنڈا کرنے کا جہاد۔ یہ اس چمن کی حفاظت کا معرکہ تیز و تند تھا جس کو محمدؐ نے ۲۳ سال تک سینچ سینچ اپنے خون سے سینچا تھا اور یہ آخری مجاہد وہی تھا جو پہلا مسلمان — سب سے پہلا مسلمان بن کر اسلام کے افق سے ابھرا تھا۔ دل و جگر کو خون کئے ہوئے۔ اور خون کے آنسو دل ہی دل میں رو کے ہوئے جب طلحہؓ کو ابوبکر صدیقؓ اس جہادِ اکبر پر بڑھتے دکھائی دیئے تو وہ بھی تڑپ گئے کہ ان کے ساتھ ہو جائیں لیکن ہوش و حواس نے ساتھ چھوڑ دیا — تاب و تواں جواب دے گئی۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا داغ پھیلا اور پورے وجود پر چھا گیا۔ جہاد کیساتھ حضورؐ یاد آئے اور حضورؐ کی یاد کے ساتھ یہ سوچ کر دل امنڈ آیا کہ یہ وہ جہاد ہے جہاں مجاہدوں کے درمیان رسالتؐ کا ناقہ خالی اور ویران ہے! اے خدائے ذوالجلال! آج وہ جاں نواز آنکھیں کہاں ہیں جو اپنے گھائلوں کی طرف اٹھتی تھیں تو ہر زخم مندمل ہو جاتا تھا۔ ہر درد خود اپنا مرہم اور ہر مرض خود اپنا مداوا بن جاتا تھا۔

لیکن غم و اندوہ کی یہ ہولناک گرفت بہت دیر تک اس مجاہد کے جذبۂ جہاد کو پابجولاں نہ رکھ سکی۔ جیسے ہی اس کو ذرا ہوش آیا اس نے آنسوؤں اور خونِ جگر کے درمیان سے جست کی اور پھر جہادِ زندگی کی قربانگاہ پر جوں کا توں سینہ سپر ہو گیا۔

عہدِ صدیقی میں اس نے پھر اسی بے جگری سے آگ اور خون کے ہفت خواں سر کئے۔ عہدِ فاروقی نے پھر اس کو ذوقِ شہادت میں سر بکف پایا۔ جانِ رسالت کی جدائی سے اس کا دل تو ٹوٹ چکا تھا مگر فرض کے شعلۂ جوالہ نے دل کی جگہ سنبھال کر ان دھڑکنوں کو ماؤف نہیں ہونے دیا جن کے آہنگ میں مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ کا نغمہ گونج رہا تھا۔

پھر عہدِ فاروقی کی آخری شام کو دنیا نے ان کو یہ زرّیں موقعہ دیا کہ وہ چاہیں تو "عام مجاہد" کے درجے سے گذر کر "امیر المومنین" بننے کا عظیم شرف حاصل کریں — حضرت عمر فاروقؓ اپنے پیچھے انتخابِ خلافت کے جن چند صحابہؓ کی فہرست چھوڑ گئے تھے ان میں طلحہؓ کا نام بھی شامل تھا۔ کھلا ہوا راستہ تھا کہ وہ اپنی خدماتِ جلیلہ کا تاریخی تاج بڑھا کر اس تاجِ خلافت کو اپنے سر پر رکھ لیں جو اسلام کی سیاسی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز تھا اور سب سے بڑی ذمہ داری بھی۔ لیکن ہوا یہ کہ احساسِ ذمہ داری اور احساسِ حق

نے ان کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ لیا اور اعزاز و شرف کے دنیوی پہلو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ان کی نظر میں عثمان رضؓ بن عفان اس عہدے کے لئے احق ہے ۔ خطرۂ احتساب سے بچنے اور حق حقدار کو پہنچانے کے دو روشن پہلو بیجا دیکھ کر طلحہؓ خوشی خوشی اپنے حق سے حضرت عثمانؓ کے لئے دست بردار ہو گئے دنیا جس دولت و اعزاز کے خزانوں کی کنجیاں ان کے دامن میں ڈال رہی تھی وہ ان تمام خزانوں سے دامن جھاڑ کر اسی "راہِ فرض" پر چل نکلے جہاں ادائے حق کے امکان زیادہ سے زیادہ اور مواخذے کے خطرے کم سے کم ہیں ۔ جو خود ہی ایک نعمت بھی ہے اور شکر نعمت بھی!

لیکن وہ دنیا سے ذہنی اور روحانی طور پر جتنے دور تھے دنیا اتنی ہی ان کے پاؤں پڑتی چلی تھی ۔ راہِ خدا میں ۔۔۔ ذاتِ رسولؐ پر انگلیاں کٹوانے والے کو قدرت خالی ہاتھ کیسے چھوڑ دیتی! خدا کے اس انعام میں آزمائش کا جو لطیف پہلو تھا مجاہد اس میں سو فیصدی کھرا اور پورا اترا ۔ دولتِ دنیا انبار در انبار ہو کر ان کے ہاتھوں میں آ رہی تھی مگر یہ انسان ۔۔۔ دولتِ دل کا مالک انسان دونوں ہاتھوں سے یہ دولت اسی خدا کی راہ میں دن رات لٹا رہا جو خدا اس کا حقیقی عطا کرنے والا تھا ۔ ہر نعمت ۔ نئی نعمت اس کی زندگی میں خوفِ احتساب کی ایک نئی یاد لیکر آتی تھی ۔۔۔ آخرت کی اس کڑی منزل کی یاد جب ہر نعمت ختم ہو چکی ہوگی مگر ہر نعمت کا حساب دینا باقی ہوگا ۔ جب خدائے ذوالجلال فرمائے گا کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۔ جب بھائی بھائی سے، اولاد والدین سے اور والدین اولاد سے آنکھیں چرائیں گے اور جب زمین و آسمان اَلْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ کی پیہم بازگشت سے گونج رہے ہوں گے ۔ یہ احساس ۔۔۔ یہ فکرِ مواخذہ یہ اندیشۂ جواب دہی فقط دل کی دنیا ہی میں ہلچل ڈالے ہوئے نہ تھا بلکہ اکثر و بیشتر ان کے چہرے ۔ ان کی آنکھوں اور ان کے سراپا سے پھوٹنے لگتا تھا ۔ ان کی بیوی نے ایک بار انکو سخت پریشانی سے ہراساں اور سر درگریباں حالت میں دیکھا تو سمجھیں کہ کوئی بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے ۔ دریافت کیا تو جواب ملا کہ " اے نیک بخت! میں اس لئے پریشان ہوں کہ

زر و مال بڑھتا ہی جاتا ہے میں اتنی دولت کا حساب اپنے رب کو کیسے دوں گا! " پھر جب تک اسی دن چار لاکھ کی رقم صدقہ نہ کر دی ان کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا ۔ قبیلے کے قبیلے ان کے انفاق پر پل رہے تھے ۔ بنی تیم کے گھرانوں میں طلحہؓ کی کفالت سے چولھے جلتے اور چراغ روشن ہوتے ۔۔۔ لڑکیوں اور بیواؤں کے ڈولے اٹھتے اور جہیز تیار ہوتے ۔۔۔ تیس تیس ہزار کا مقروض بھی سامنے آیا تو طلحہؓ نے قرض کے بوجھ سے اس کی گردن چھڑانے میں پس و پیش نہ کیا ۔۔۔ یہ بھی ہوا کہ کوئی بہت بڑی رقم انکے ہاتھوں میں آئی مگر فی سبیل اللہ لٹانے کے دھنی نے یہ دولت گھر تک آنے کی نوبت نہ آنے دی ۔۔۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں انھوں نے ایک بڑی جاگیر کا سودا کیا ۔ سات لاکھ ہاتھ آئے ۔۔۔ مگر بیت المال سے گھر تک کے راستے میں یہ رقم اس تیزی اور فیاضی سے لٹائی گئی کہ ایک دھیلا بھی گھر تک نہ پہنچ سکا! اور یہ تو ہنگامی انفاق کی مثالیں تھیں ۔۔۔ کوئی نہیں جانتا کہ بنی تیم کے گھرانوں کی طرح کتنے اور قبیلے اور گھرانے محض ان کی در پردہ دست گیریوں پر چل رہے تھے ۔ کتنے معزز ناداروں کی آبرو ان کے دم سے قائم تھی ۔۔۔ اس لئے کہ یہ تھا وہ فیاض جسکی فیاضی دریا دلی کو یہ بات بھی شاق تھی کہ سائل کے سوال کا انتظار کرے غیرت کے ماروں کو وہ منہ کھولنے اور پردہ اٹھانے کی نوبت نہ آنے دیتے ۔ واقعی وہ ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہوتی ۔ اس دور کے ایک شریف انسان قیس بن حازم نے برملا اعلان کیا کہ میری زندگی کا تجربہ گواہ ہے کہ میں نے بے طلب دینے میں طلحہؓ سے آگے کسی کو نہ دیکھا!

امدادی رقموں کے ساتھ ساتھ اعزازی ہدیے علاوہ تھے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علم و تقویٰ سے بہت متاثر تھے اور دس ہزار درہم سالانہ خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کرتے تھے ۔ لیکن خدا کی راہ میں جو دولت لُٹ رہی تھی وہ دولت کبھی نہ لُٹ سکی! کبھی نہ کم ہوئی بلکہ اور زیادہ ہوتی رہی ۔ بندے کی غیرتِ بندگی کا جواب غیرتِ خداوندی کی طرف سے مل رہا تھا ۔ خدا کی یہی وہ عظیم ترین غیرت پذیرائی ہے جس کے پیش نظر اللہ کے رسولؐ نے اس ایک بات کو

تین بار کہا۔

مت ڈور کو خدا کے راستے میں خرچ کرنے سے۔

نادار ہو جاؤ گے!۔

مت ڈرو!

مت ڈرو!

طلحہؓ اس یقین دہانی کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے والا جب دنیا سے سدھارا تو بائیس ۲۲ لاکھ کی خطیر رقم پھر بھی آل اولاد کے لئے چھوڑ گیا۔

ہائے کس قدر دلکش تھا وہ انسان جس نے "فرض" کو زندگی اور زندگی کو "فرض" بنا چھوڑا تھا! وہ جدھر گذرتا زندگی مسکرا اٹھتی۔ وہ جہاں نظر ڈالتا نورِ تقدیس کے چراغ جل اٹھتے۔ وہ بولتا تو منھ سے پھول جھڑتے۔ وہ چلتا تو زیرِ قدم ذروں کی چیتیاں چمک اٹھتیں۔ حلقۂ احباب کی روحِ رواں وہ تھا۔ خاندان کا محبوب اور مرکزِ نظر وہ تھا۔ اپنوں کا سہارا۔ بیگانوں کی امید۔ بازار کی رونق۔ گھر کی زینت۔ امن کا چراغ اور جنگ کی للکار!۔ سراپا زندگی۔ سراپا جہاد!۔

عتبہ بن ربیعہ کی خوبرو اور خوش خصال صاحبزادی حضرت امّ ابانؓ کے نکاح کے لئے پیام پر پیام آرہے تھے۔ ان میں معززین بھی تھے۔ ذہین بھی۔ سرمایہ دار بھی تھے اور خوش جمال بھی۔ لیکن ان کی نظرِ انتخاب جس ہستی پر گئی وہ طلحہؓ تھے۔ جب اس انتخاب کے عملی تجربے کا کافی زمانہ گذر گیا تھا تو کسی نے سوال کیا تھا۔

"اے ام ابان!۔ اتنے بڑے بڑے شاندار پیغاموں کو ٹھکرا کر طلحہؓ کی گرویدہ کیوں ہوگئیں تھیں تم؟۔ بات سمجھ میں نہیں آئی!"

ام ابان نے سیدھا سادا جواب دیا تھا۔

"تم نہیں سمجھ سکے یہ بات مگر مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا میں جانتی ہوں کہ کیا کیا خوبیاں ہیں ان میں۔ گھر آتے ہیں تو خندہ بہ لب۔ جاتے ہیں تو اپنی مسکراہٹ ہمارے درمیان چھوڑ کر!۔ کسی مانگ کو رد نہیں کرتے۔ بخل نہیں کرتے۔ کمی نہیں کرتے۔ وہ تو خاموش سوال کو سُن لیتے ہیں۔ مانگنے کا انتظار نہیں کرتے۔ اور ہاں کوئی بھلائی کرے تو کیسے کیسے شکور ہوتے ہیں اور اگر کسی سے خطا ہو جائے تو خطا کو عفو و درگذر کے دامن میں چھپا لیتے ہیں۔۔۔"

جو زندگی میں اتنا حسین تھا کہ ساری دنیا اس کو پیار کرتی تھی۔ خدا بھی اس کو چاہتا تھا اور خدائی بھی۔ ہاں وہ موت کے بعد بھی اتنا ہی حسین۔ اس سے بھی زیادہ حسین و محبوب بنکر قبر میں اُتارا گیا تو مٹی۔ قبر کی بھوکی مٹی اس کو نہ کھا سکی اور قبر کے کیڑے اس کے جہادِ زندگی کا سنگھار نہ چھین سکے۔ وہ جس میدانِ جنگ میں شہید ہوئے تھے وہیں دفنا دیئے گئے تھے۔ کسی نے خواب میں دیکھا۔ شاید بار بار دیکھا کہ اپنی لاش کو یہاں سے منتقل کرنے کو فرما رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک مکان خریدا اور میّت کو منتقل کرنے کے لئے قبر سے نکالا تو لوگوں نے بچشمِ سر یہ دیکھا کہ اتنے عرصے کے بعد بھی لاش بالکل جوں کی توں تھی۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں لگایا گیا کافوری کاجل بدستور برقرار تھا!

ایسے ہوتے ہیں مسلمان جو مر کر بھی نہیں مرتے۔ وہ جدھر گذرتے ہیں حق و صداقت کے نور سے ماحول کو زندہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قبر بھی ان کی لاش سے مس ہوتی ہے تو جی اُٹھتی ہے۔ اور ہم؟۔ ہائے ہم!۔ جو جیتے جی مرگئے تقدیر کا شکوہ اور زمانے کا گلہ کرتے کرتے ہمارا منہ سوکھا جاتا ہے۔ مگر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارے سینے میں اگر ایمان ہے تو اس کی حیات انگیزیاں کیا ہوتیں؟ کاش ہم کم از کم اتنے تو مسلمان ہوسکیں کہ باہر کی دنیا کو دیکھ دیکھ کر کڑھنے کے بجائے اپنے اندر جھانک کر یہ کھوج لگائیں:۔

"کیا سچ مچ ہم مسلمان ہیں؟"

ماءاللحم
HAMDARD DAWAKHANA

نقد و تبصرہ

کھرے کھوٹے

تبصرے کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں

علماء اور اسلام

مصنف :- جناب محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے ● شائع کردہ :- مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد دکن۔
● کتابت چھپائی چلتی ہوئی ● صفحات ۹۲ قیمت ایک روپیہ۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے یہ واضح کرنے کی سعی مشکور کی ہے کہ اسلام کو معزز اور سربلند رکھنے کے لئے علماء اسلام کو جو اسوۂ و کردار اختیار کرنا چاہیئے تھا اس میں ان سے کوتاہی ہوئی اور اس کا نتیجہ امت کے زوال و انحطاط کی شکل میں برآمد ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ ٹھیک اسلامی خطوط پر چل کر دین و ملت کے عروج و بقا کی کوششیں کرنے والے علماء ہر دور میں موجود رہے ہیں اور ان کی کوششیں رائگاں بھی نہیں گئیں ہیں، لیکن حکم غلبہ و کثرت ہی کے مطابق لگایا جاتا ہے اور غلبہ و کثرت یقیناً ایک مدت سے ایسے ہی علماء کی رہتی چلی آرہی ہے جو بجائے دین کو مقصد زندگی بنانے کے عوض اس کے بعض اہم ترین پہلوؤں کو نظر انداز کرتے چلے آرہے ہیں اور دین کے بارے میں ان کا طرز فکر اتنا جامع اور ہمہ گیر نہیں رہا ہے جتنا اسے ہونا چاہیئے تھا۔

ہم فاضل مصنف کے مخلصانہ تجزیے اور نقد و تبصرہ سے بڑی حد تک متفق ہیں اور دین و ملت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے علماء کے اسوۂ و کردار، طرز فکر اور عادات و خصائل کی اصلاح کو اساسی اہمیت دیتے ہیں لیکن کہیں کہیں حد اعتدال سے تجاوز بھی محسوس ہوا۔ مثلاً بعض نقائص اور تاریک پہلوؤں سے مایوس ہو کر یہ کہنا کہ موجودہ دینی درسگاہیں افادیت سے بالکل خالی ہیں زیادتی ہے۔ یہ درسگاہیں اسلام کو اس کی منزل مطلوب تک پہنچانے کی جامع سعی و جہد نہ کر رہی ہوں [illegible] لیکن طلباء کے قلوب و اذہان میں وہ بیج تو بہرحال [illegible] میں آگے چل کر گھنا درخت بن سکتا ہے۔ انہیں توجہ و توضیح کرتے ہوئے ہمیں ان کی افادیت سے بالکلیہ انکار نہیں [illegible]

اسی طرح یہ بات بھی علی الاطلاق [illegible] کہ

"انسان کی شخصی فلاح، نجات [illegible] فلاح کے بغیر ناممکن ہے" ملک اگرچہ سیاق و سباق سے جوڑ کر اس کی گوارا تاویل ممکن ہے لیکن قلم کو اتنا بے قابو ہی کیوں کیا جائے کہ تاویل ضرورت پیش آئے۔ شخصی فلاح و نجات انتہائی فاسد اجتماعی نظام کی موجودگی میں بھی ممکن ہی نہیں واقع ثابت ہے۔

ایک دو جگہ ایسے فقرے بھی ملے جو موضوع کے لحاظ سے

اور ثقاہت کے قادح ہیں جیسے صفحہ ۲۹ پر پیشہ ور واعظوں پر رے رے کرتے ہوئے کہا گیا۔

" اس صورت میں انھیں انٹر کلاس کا کرایہ کہاں سے ملیگا۔
اور قورمہ پلاؤ کون کھلائے گا"

اس انداز میں طعن و تشنیع کا یہ موقع نہیں تھا۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب لائق مطالعہ، قابل توجہ اور فکر انگیز ہے۔

خصائل مسلمین
اردو ترجمہ
مسائل اربعین

● مؤلف :- حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
● مترجم :- سید ابو احمد سجاد بخاری
● شائع کردہ :- کتب خانہ رشیدیہ۔ ۴۔ مدینہ مارکیٹ۔ راجہ بازار۔ راولپنڈی۔
● صفحات ۱۲۶ قیمت مجلد دو روپے۔

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے خانوادے کے بارے میں جس نے کہا بالکل سچ کہا۔

این خانہ ہمہ آفتاب است

شاہ صاحب خود کیا تھے اور پھر کیسی کیسی ہستیوں نے آپ کے خاندان میں جنم لیا یہ کس باخبر سے پوشیدہ ہے۔ شاہ محمد اسحاق بھی اسی مبارک خاندان کے ایک فرد تھے۔ آپ علم و تفقہ میں اسی مقدس زنجیر کا ایک حلقہ ہیں جسے حضرت اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہما نے انسانیت کی سعادت کبریٰ — یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی منزل علیا تک پہنچایا تھا۔ یہ زیر تبصرہ کتاب تقویۃ الایمان جیسی مصلحانہ اسپرٹ پر مبنی ایک مختصر کتاب ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قدر و قیمت میں نہایت اعلیٰ ہے۔ اس میں حضرت مصنف نے متعدد معاشرتی رسوم سے متعلق مسائل بیان فرمائے ہیں مقصود ان کا اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ سنت کا اتباع کریں اور بدعات و خرافات سے دور بھاگیں۔ استدلال تمامتر قرآن و سنت اور اقوال مجتہدین ہی سے ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کے لئے یہ نافع اور رہنما ہے۔ فاضل مترجم نے ترجمے کو حواشی سے بھی مزین کیا ہے جو ہر آئینہ مفید ہیں اللہ تعالےٰ اس کتاب کی افادیت کو عام کرے۔

تواریخ عجیب
المعروف بہ
کالا پانی

تالیف :- مولوی محمد جعفر تھانیسری
ترتیب :- جناب محمد ایوب قادری۔ ایم۔ اے
شائع کردہ :- سلمان اکیڈمی حق نشان — ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵

یاد ش بخیر۔ حضرت سید احمد اور حضرت اسماعیل شہیدین رحمۃ اللہ علیہما نے اقامت دین کی جو تحریک برپا کی تھی اس کتاب کے مصنف رحمۃ اللہ علیہ اسی کی فوج کے ایک سپاہی تھے اُنھوں نے اس کتاب میں اپنی گرفتاری اور پھر ۱۸ سال سے زائد " کالے پانی " کی سزا بھگت کر ہندوستان واپس آنے کے احوال و کوائف نہایت سادگی، بے تکلفی اور تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ انگریز کے دور میں یہ کتاب ضبط ہوگئی تھی متعدد ایڈیشن اس کے پہلے بھی چھپے ہیں لیکن یہ پیش نظر ایڈیشن اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ فاضل مرتب نے اس پر نہ صرف مفید حواشی دئے ہیں بلکہ نقشہ اور گوناگوں معلومات پر مبنی پارٹ اور انڈیکس وغیرہ لگا کر کتاب کی لٹریری اہمیت میں قابل قدر اضافہ کر دیا ہے۔

شہیدین کی اسلامی تحریک کیا تھی، یہ کن مراحل سے گذری اور اس کے عواقب و مضمرات کیا رہے یہ معلومات تو سیر حاصل طور پر جناب غلام رسول مہر اور مولانا علی میاں ندوی کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن پیش نظر کتاب بھی یہ اندازہ کرانے کے لیے بہرحال کافی ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر ماضی قریب کے مجاہدوں نے کیسی کیسی ابتلائیں جھیلی ہیں اور دین و صداقت پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے میں ان برگزیدہ بندوں کی ہمتیں کس قدر بلند رہی ہیں رحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ

مصنف کی زبان ظاہر ہے اُس دور کی زبان ہے جب اردو جوان نہیں ہوئی تھی۔ بعض الفاظ کا ایسا استعمال بھی اس میں ملتا ہے جو شاید پہلے درست رہا ہو مگر اب بدل گیا ہے مثلاً
" میں نے اس کو دیکھا کہ نہایت خوش چلن اور شرمناک عورت

ہے" ص۱۵۵

"خوش چلن" تو شاید اب بھی کوئی لکھدے مگر "شہر مناک" کا لفظ اب شرمیلی اور حیادار کے معنی میں نہیں بولا جاتا۔

یا مثلاً — "جنگل کی صفائی اور مہلک امراض کا قطعی ہوکر اس کا رشک کشمیر ہوجانا" ص۲۱۴

اگر لفظ "قطعی" کاتب یا پریس کی کارگزاری نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ "قلع قمع" کے مفہوم میں یہ لفظ اب نہیں بولا جاتا

لیکن لب و لہجہ، انداز بیان اور در و بست اتنا دلکش، فصیح و بلیغ اور اثر انگیز ہے کہ ذوق و وجدان جھوم جھوم اٹھتے ہیں اخلاص اور صداقت بیانی نے تو اس کتاب کے ورق ورق میں وہ جادو جگایا ہے کہ جی چاہتا ہے اسے ختم کرنے کے بعد پھر سے پڑھا جائے۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا خلوص اور مومنانہ انداز فکر ہی ہے۔ وہ ایک مومنِ قانت کی طرح ہر حادثہ و واقعے کو عبرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور باری تعالیٰ سے ان کا ذہنی رشتہ سخت سے سخت مراحل میں بھی مضبوط نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اُن لوگوں کو جو "سیرت سید احمد شہید" اور اس کی ملحقہ جلدیں نہیں پڑھ سکے ہیں۔ وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کا پتہ چلے گا کہ یہ جو آج بریلوی حضرات قرآن و سنت کے ہر علمبردار کو "وہابی" کا خطاب عطا کردیتے ہیں یہ خطاب انگریز کا چلایا ہوا ہے۔ سرکاری زبان میں ہر اس شخص کو "وہابی" کہا جاتا تھا جو انگریز کے ظلم و طغیان کا دشمن اور اعلائے کلمۃ الحق کا داعی ہو۔ وہابی اور غدار ایک ہی مفہوم کے دو لفظ تھے اور اُن مولویوں نے جو مختلف مفادات یا خوف کے تحت انگریزوں کے ہمنوا اور معاون ہوگئے تھے اس گالی کو خوب خوب رواج دیا تھا۔

یہ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ عام طور پر مطالعہ کی جائے

پاندان والی خالا

بھوپال سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا ہے۔ "بھوپال پنچ" جس کے مدیر ہیں جناب تخلص بھوپالی۔ کہنے کو یہ مزاحیہ پرچہ ہے لیکن تخلص صاحب کی دردمندی، فکری اصابت اور خلوص نے اسے مقصدیت کا رنگ بھی دیدیا ہے اسی میں وہ "پاندان والی خالہ" کے عنوان سے مستقل فیچر لکھتے ہیں اور یہی فیچر اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ صفحات ۲۷۵ قیمت بھی اتنے ہی پیسے یعنی پونے تین روپے۔

جلد پر دلکش ڈسٹ کور۔ شائع کردہ:۔ پنچ بھون پبلیکیشنز۔ جہانگیر آباد۔ بھوپال۔

طنز و مزاح کا یہ دلپذیر آمیزہ ادبی اعتبار سے نہ صرف وقیع ہے بلکہ منفرد بھی ہے تخلص صاحب اپنے انداز تحریر میں شانِ امتیاز رکھتے ہیں۔ عورتوں کی زبان اس خوبی، روانی، گہرائی اور بے تکلفی سے لکھنے والا کم سے کم راقم الحروف کی نظر سے تو کوئی گذرا نہیں۔ گذرا ہے تو ایسا گذرا ہے جسکی نقالی کو زیادہ دیر دیکھنا طبع سلیم کے بار بن گیا۔ تخلص صاحب کی نگارش میں بڑی جاذبیت ہے۔ ذہانت کا جوہر ہے۔ ہلکا پھلکا فن ہے — ہلکا پھلکا اسلئے کہا کہ کلاسیکل انداز کا فن تو عوامی معدے کے لئے پتھر سے کم نہیں۔ تخلص صاحب کا فن حلوے کی طرح نرم اور شربت کی طرح سیال ہے۔ ہضم کا مدار اپنے اپنے معدوں پر ہے۔ تبصرہ نگار کا خیال تو یہی ہے کہ پیچش زدہ آنتوں کے علاوہ ہر آنت اسے پچا جائیگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خالہ کون ہیں؟ — ایک کھنڈر جہاں خراب و خستہ دیواروں پر نئے گھانس پھونس کے چھپر چھا دیئے گئے ہیں — انھیں کسی شبِ مسلسل کی صبح کاذب کہئے — وہ ایک فریاد ہیں جو ماضی کی قبر سے بلند ہوکر حال کے ایوانوں سے ٹکرائی ہے اور کھنکھناتی ہوئی صدائے بازگشت بن گئی ہے ہمیں یقین ہے کہ مزاح کی حس، لطائف کا ذوق اور ادب کا شعور رکھنے والا ہر شخص — بشرطیکہ وہ شئے لطیف سے محروم نہ ہو — تخلص صاحب کی نگارشات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیگا۔

یہ کتاب اُردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اسلام اور اجتماعیت

مصنف :- مولانا صدر الدین اصلاحی۔

شائع کردہ :- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ ۱۵۲۵۔ سوئی والان۔ دہلی۔ ۶۔

صفحات ۱۵۹ قیمت ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے۔ کتابت طباعت غنیمت۔

اس کتاب میں حضرت مصنف نے قرآن و حدیث، اجتہادات ائمہ اور عقل و قیاس کے شواہد و براہین کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ اجتماعیت ——— جماعتی نظام اسلام کی نہ صرف شرعی ضرورت ہے بلکہ وہ عینِ فطرت ہے اور ایک مستحکم، صالح اور باقاعدہ جماعتی نظم کے بغیر اسلام کے تمام مطالبات پورے ہو ہی نہیں سکتے۔

پہلے کبھی تو یہ بات اختلاف سے بالاتر تھی کہ مسلمان کا تسبیح کی طرح ایک ہی رشتہ میں گندھا جانا دینِ ہدیٰ کا بنیادی مطالبہ اور اسلام کی نفسیات کا اٹل تقاضا ہے لیکن حالات کی اُلٹ پھیر شیطان اور نفس امارہ کی ساز باز، باطل افکار و نظریات کی وسیسہ کاری اور ذہن و قلب کے زیغ نے اس متفق علیہ اور اظہر من الشمس حقیقت کو نہ صرف مختلف فیہ بنا ڈالا بلکہ آج نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جو فرد یا گروہ شیرازہ بندی کی جد و جہد کے لئے آگے بڑھے اور ٹھیٹ اسلامی مفہوم میں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کی دعوت دے اس سے بڑھکر خطرناک، گمراہ، رجعت پسند اور فتین کوئی نہیں۔

جماعت اسلامی کی حیثیت اس کے سوا آخر ہے کیا کہ وہ مسلمانوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتی ہے وہ چاہتی ہے کہ ہم تہ دل سے اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا سبق عمل کی زبان میں دہرائیں۔ وہ چاہتی ہے کہ اس دنیا اور اسکی بوقلمونیوں کو غیر مسلم قوموں کے زاویۂ نظر سے دیکھنے کے عوض ہم اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے زاویۂ نظر سے دیکھیں اور ٹھیک اسلامی خطوط پر اپنے اجزائے پریشاں کو ترتیب دیں اس خواہش و آرزو کے حاملین انسان ہی ہیں فرشتے نہیں۔ وہ دس طرح کی فکری و عملی غلطیاں کر سکتے ہیں۔ ان سے چوک ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ لوگ اپنے دیدۂ بینا سے ان کی فروگذاشتیں دیکھنے پر قادر ہیں تو مصلحانہ طریقہ یہ نہیں کہ نفس دعوت ہی کی مخالفت کی جائے۔ مصلحانہ طریقہ یہ ہے کہ غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے دردمندانہ التفات فرمایا جاوے۔

زیر تبصرہ کتاب کا حرف حرف ہم نے پڑھا۔ کہنا پڑتا ہے کہ فاضل مصنف نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور ابلاغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ لب و لہجہ باوقار، تفہیم عالمانہ، دلائل روشن، اسلوب تحریر پختہ اور دلپذیر۔

بہت خوشی کی بات یہ ہے کہ آیات و احادیث اگرچہ کتاب میں بکثرت استعمال ہوئی ہیں لیکن ناشر نے ان کی تصحیح پر پوری پوری توجہ دی ہے۔ فی زمانہ یہ بات بہت عام ہوتی جا رہی ہے کہ ارباب قلم آیات و احادیث سے استدلال تو کرتے ہیں لیکن آیات پر اعراب دینے کی توفیق نہیں ہوتی اور احادیث کی کتابت میں غلطیوں کا طومار ہوتا ہے ہماری پختہ رائے ہے کہ ایسے لوگوں کو قرآن و حدیث کی نقل کا استحقاق نہیں ہے جو حقِ نقل نہ ادا کر سکیں زیر تبصرہ کتاب میں تو احادیث بھی معرب دی گئی ہیں جو ایک مستحسن طریق ہے۔ ویسے دھبّہ چاند میں بھی ہوتا ہے ایک آیت میں اعراب کی غلطی رہ ہی گئی۔ صلا پر فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ النّاس کے س پر زبر کے عوض زیر چھپ گیا ہے۔ لیکن بعید نہیں کہ یہ پریس والوں کا کرتب ہو۔ ہمیں بارہا تجربہ ہوا ہے کہ پریس میں کوئی کاپی اگر قدرے خراب چھپ گئی ہے تو پلیٹ ساز نے اسکی درستگی میں ایسے اٹکل پچو تیر چلائے ہیں کہ بعض مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا ہے۔ مثلاً ابھی اکتوبر ۶۲ء کے تجلی میں ص۳۱ کا پہلا کالم ملاحظہ کیجئے۔ ویسے تو اس میں متعدد غلطیاں ملیں گی مگر اس ستم ظریفی کا کیا جواب ہے کہ جو لفظ "ارسطو" ایک لائن بعد آرہا تھا اسے پلیٹ ساز نے ایک سطر قبل بھی ٹانک دیا اور عبارت ایسی بن گئی کہ جی چاہے ہنس لیجئے جی چاہے رو لیجئے۔ یہ کالم اغلاط کا مجموعہ ہے۔ "پہنچ" کی جگہ "سمجھ" ——— "سخن" کی جگہ "طرح ——— کھلے" کی جگہ "کھلے" چھپا ہے۔ اب پریس کے نشیب و فراز سے بے خبر قارئین کو کون بتائے کہ یہ کس کے دستِ کرم کی جدت

طرازی ہے ایک سہو خود فاضل مصنف کا ہم نے یہ محسوس کیا کہ "نماز" کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی اجتماعیت کے بیان میں وہ نماز جمعہ تک تو پہنچے مگر عیدین کی نمازیں بھول گئے حالانکہ اجتماعیت کے تدریجی ارتقا میں پنجوقتہ جماعت اور حج کے مابین نماز جمعہ اگر دوسرا ارتقائی قدم ہے تو نمازِ عید یقیناً تیسرا قدم کہلائے گا ایک مستقل ترقی پذیر مرحلہ کی حیثیت میں نماز عید کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا۔

پھر یہ بھی شاید تکنک کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا کہ نماز کے متصل بعد "حج" کا ذکر کیا جاتا نہ کہ زکوٰۃ وصوم کا۔ زکوٰۃ وصوم یوں تو بیشک نماز کے متصل بعد ہی ذکر کئے جانے کے مستحق ہیں اور قرآن وحدیث سے لیکر تمام کتب فقہ میں یہی ترتیب پائی بھی جاتی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جس مقصد سے نماز پر گفتگو آئی ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ محسوس ومشاہد اجتماعیت کی آخری اور مکمل شکل — حج کو بھی نماز کے ساتھ ہی لایا جاتا۔ سوال اہمیت کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے "حج" اجتماعیت کے اسی سلسلۃ الذہب کا آخری حلقہ ہے جس کا پہلا حلقہ "نماز با جماعت" قرار پایا ہے۔

مآخذ کے بعض حوالے شاید اتفاقاً ہی ناتمام رہ گئے ہیں مثلاً صفحہ ۳۰ پر امام غزالی کے ایک شاذ و منکر قول کا حوالہ صرف اتنا ہے۔ "حاشیہ مشکوٰۃ ص۹۲" اس سے بھلا کسی کو کیا پتا چلے گا کہ مصنف کے سامنے مشکوٰۃ کا کونسا ایڈیشن ہے۔ جو ایڈیشن آج کل متبادل ہیں ان میں تو متذکرہ حاشیہ موجود نہیں ہے۔

یا مثلاً صفحہ ۶۵ پر حدیث کا حوالہ صرف اتنا دیا گیا ہے "بخاری جلد دوم کتاب التفسیر" ———— یہ حوالہ اس صورت میں تو کافی ہوتا کہ "کتاب التفسیر" بخاری کے بعض اور ابواب کی طرح مختصر سی ہوتی لیکن تقریباً سو [illegible] صفحات کی کتاب التفسیر کے لئے یہ حوالہ پورے [illegible] کیسے ہوگا۔ کیا حرج تھا اگر "تفسیر سورۂ منافقون" کے الفاظ بھی بڑھا دیئے جاتے۔

"اتفاقاً" ہم نے اس لئے کہا ہے کہ اکثر بیشتر

حوالے کافی شافی دیئے گئے ہیں۔ حسنِ معنوی میں اضافہ ہی ہوتا اگر سارے ہی حوالے مکمل ہوتے۔

ص۲۳ پر حدیث کے الفاظ فَهُوَ مِنْ جُثَىِّ جَهَنَّمَ کا ترجمہ "اسکا ٹھکانا جہنم ہے" مراد ومدعا کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے لیکن حقِ ترجمہ ادا نہیں ہوا۔ محاورے کے ساتھ رعایت لفظی کا حق بھی ادا ہوجاتا اگر یوں کہہ دیتے کہ "وہ اہل جہنم میں سے ہے"۔

اس کتاب میں خلیفہ کو معزول کر سکنے نہ کر سکنے کی بحث بہت اہم ہے۔ فاضل مصنف نے خوب دادِ تحقیق دی ہے لیکن ہماری ناقص رائے میں تشنگی بالکل مٹی نہیں بلکہ بعض گوشے مزید فکر و نظر کے طالب ہیں۔ یہ فیصلہ جو انھوں نے کر دیا ہے کہ خلیفہ سے کسی غلطی، ظلم یا فسق کا صدور نہ ہونے پر بھی اسے اس بنیاد پر معزول کیا جا سکتا ہے کہ امت میں اس سے بہتر صلاحیتوں کی کوئی شخصیت اُبھر آئی ہے اتنی آسانی سے نہیں مانا جا سکتا۔ ہمارے نظریات واصول کے مآخذ اگر قرآن وسنت اور اجماع وقیاس ہی ہیں تو مذکورہ فیصلے کے لئے ان میں کوئی بنیاد نہ ہمیں ملی ہے نہ خود مصنف نے پیش کی ہے وہ صفائی سے نہ سہی تھوڑے سے گھماؤ کے ساتھ سہی یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انتخاب صدر کا جو طریقہ مروجہ پارلیمنٹری جمہوریت میں رائج ہے وہی ٹھیک اسلامی طریقہ بھی ہے اسلام بھی یہی پسند کرتا ہے کہ خلیفہ کو بدلنے نہ بدلنے کے بارے میں ایک معینہ مدت کے بعد استصواب رائے کیا جاتا رہے اور کثرت رائے جب بھی بدل دینے کے حق میں ہو۔ اسے بدل دیا جائے، تبصرہ نگار کے خیال میں اس دعوے کی صحت مشکوک ہے۔ اس کے حق میں جو عقلی استدلال پیش کیا گیا ہے وہ نقل سے مطابقت نہ رکھنے کے علاوہ خود عقلی سطح پر بھی نہ بھرپور ہے نہ فیصلہ کن۔ ہم صرف تبصرہ کر رہے ہیں۔ اسلئے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ لیکن اگر مصنف کو اپنی رائے پہ اصرار ہی ہو اور وہ ہم سے وجوہ اختلاف کا مطالبہ کریں تو ہم انشاء اللہ اس سے بھی گریز نہیں کرینگے۔ وباللہ التوفیق۔

مصنف کی فصیح و بلیغ انشاء میں کہیں کہیں ایک فقرہ

ہیں کھٹکا۔

" اس فرق کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں دکھائی پڑتا۔"

" دکھائی پڑتا" اس کتاب میں ایک سے زائد بار آیا ہے۔ یہ کچھ جچتا نہیں۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت کامیاب ہے اور تبلیغی لٹریچر میں ایک وقیع اضافہ۔ اختتام پر "گوشہ گیری" کے زیر عنوان جو گفتگو کی گئی ہے خاصے کی چیز ہے۔

تحفۃ الموحدین

● تصنیف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
● ترجمہ:۔ مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلویؒ

صفحات ۷۸ قیمت ۶۳ پیسے ● شائع کردہ المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ۔ لاہور۔

توحید کے موضوع پر حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہؒ کا یہ مختصر رسالہ تقریباً پچاس برس پہلے دہلی سے شائع ہوا تھا اب اسے لاہور سے شائع کیا گیا ہے اور فارسی متن نیچے اردو ترجمہ۔ ناشر نے ذیلی عنوانات کا اضافہ کر کے فہرست مضامین بھی بڑھا دی ہے رسالہ کیا ہے توحید کے موضوع پر بڑی بڑی کتابوں کا نچوڑ ہے اسے پڑھ کر ہر منصف مزاج اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جن عقائد و نظریات کو بڑے زور شور سے "عقائد وہابیہ" قرار دیکر کفر و بے دینی کے فتوے داغے جاتے ہیں ـ وہی شاہ صاحب موصوف کے نزدیک عین عقائد اسلامیہ ہیں اور ان کے خلاف عقائد رکھنے والے شرک و زندقہ کا شکار ہیں۔

ارشادات کے چند نمونے۔

" اللہ کے سوا کسی (غائب) کو بایں طور پکارنا کہ اے فلاں شخص میری حاجت پوری کر کفرِ خالص ہے۔"

" خلاصہ مطلب یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ خدا کے رسول ہیں مگر تب بھی اپنی جان کو نفع پہنچانے اور نقصان سے محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے"

شاہ صاحب کے نزدیک قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا میں اللہ تعالیٰ پیغمبر کی زبان سے جو کچھ کہلوا رہا ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ۔

" اے لوگو تم جو ہمارے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ جس وقت ہم اپنے پیغمبر کو یاد کرتے ہیں وہ سن لیتا ہے اور ہر آنے والی چیز کو یا جو نظر سے غائب ہے اسے خوب جانتا ہے قطعی طور پر غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔"

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ کسی بزرگ کو کارخانۂ قدرت میں کچھ دخل ہے اور اللہ کی کوئی بھی صفت اس میں پیدا ہو گئی ہے وہ کافر و مشرک ہے نیز وہ فرماتے ہیں غیر اللہ کو سجدہ کرنے والا کافر ہے خواہ سجدہ کسی بھی نیت سے کیا گیا ہو وہ فرماتے ہیں کہ رکوع کے انداز میں کسی کی تعظیم کرنے والا یا دست بستہ مثلِ نماز کسی کی تعظیم کرنے والا مشرک ہے اور فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کے بجائے کسی بزرگ کی قبر کی طرف رخ کر کے عبادت کرنا اور تعظیماً اس کی طرف متوجہ ہونا شرک ہے اسی طرح غیرِ خدا سے دعا مانگنا شرک ہے۔

" جو آدمی کہ یا رسول اللہ اور یا علی اور یا غوث الاعظم اور یا حسنین اور یا فاطمہ اور اے خواجہ اور اے پیر کہا کرتے ہیں وہ اپنے احوال کا اس آیۂ کریمہ کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ - یعنی تم اے محمد! نہ مردے کو سنا سکتے ہو نہ بہرے کو۔ یعنی سننے کے حق میں مردہ اور بہرہ برابر ہے۔ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ اور نہ تم ان لوگوں کو سنا سکتے ہو جو قبروں میں ہیں۔"

اللہ کے سوا کسی کی نذر و نیاز کے بارے میں شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ وہ غضب خداوندی کا موجب ہے شفاعت اور ایصالِ ثواب وغیرہ کے بارے میں موصوف نے اسلام کا صحیح صحیح نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ الحاصل یہ رسالہ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا عمدہ نمونہ ہے۔

ترجمہ پرانے انداز کا ہے ایک جگہ مترجم سے چوک بھی ہوگئی ہے یا پھر وہ کتابت وطباعت کا نقص ہے عبارت تھی "روزہ کہ از اعظم عباد است" اس کا ترجمہ یہ کر دیا گیا۔

"روزہ جو ساری عبادتوں سے بڑی عبادت ہے"

ظاہر ہے یہ غلط ہے صاف سا ترجمہ یہ ہوگا کہ "روزہ جو بڑی عبادتوں میں سے ہے"

ایسی ہی غلطی ارکانِ حج سے متعلق عبارت کے ترجمہ میں ہوئی ہے

ہم خیال کر رہے ہیں کہ شاہ صاحب کا یہ رسالہ نسبتاً بہتر ترجمے کے ساتھ تجلی میں شائع کر دیں۔ واللہ الموفق۔

توحید اس کتاب کا ذیلی نام ہے "چودہ مسئلوں کا واحد حل" مصنف ہیں جناب محمد سلطان نظامی۔ تقسیم کنندگان ہیں:۔ اتفاق الاسلام یونین۔ شاہی محلہ لاہور۔ مگر قیمت بھی رکھی گئی ہے ۷۵ پیسے۔ ملنے کا پتہ ہے۔ شرکت ادبیہ پنجابیہ۔ شاہی محلہ لاہور

کسی شیعہ صاحب نے ایک کتابچہ لکھا "چودہ مسئلے۔" اس میں انھوں نے چودہ مسائل کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے اسکے جواب میں نظامی صاحب نے یہ رسالہ لکھا ہے جس میں صرف دو مسئلوں سے بحث ہے اور باقی کے بارے میں اعلان ہے کہ عنقریب کتابی شکل میں سب پر گفتگو کی جائے گی۔

پہلا مسئلہ ہے رونا پیٹنا۔ یعنی شیعہ صاحبان کے عقائد کا سب سے بڑا مظہر ماتم وشیون۔ دوسرا مسئلہ ہے زنجیروں کے ذریعہ ماتم کرنا۔ نظامی صاحب نے قرآن وحدیث سے اور خود شیعہ حضرات کی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ شیعوں کا موقف غلط ہے جن کا ماتم کیا جاتا ہے خود وہی ان حرکاتِ ناشائستہ کو لغو وباطل کہہ گئے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ نظامی صاحب کے شواہد وبراہین اپنی جگہ کافی شافی ہیں اور شیعہ صاحب کے دلائل قرآن وحدیث سے بے رحمانہ مذاق کے سوا کچھ نہیں لیکن رنج کی بات ہے کہ آیات واحادیث کی صحتِ کتابت سے لاپروائی برت کر مصنف اور ناشر نے اس کی قدر وقیمت گھٹا دی ہے۔ شاید ہی کوئی حدیث اس میں ایسی ہو جو کتابت کی غلطی سے پاک ہو۔ مثلاً پہلی ہی حدیث میں ابی سیف کے عوض ابو یوسف اور ظئراً کی جگہ ظہرا اور ربنا کی بجائے اینا اور یفری اقلت کے بدلے یفمر اقلت چھپا ہے۔ دوسری میں اِنَّ لِلّٰہِ کے بجائے ان اللہ اور معاذ بن جبل کی جگہ مفاذ بل جبل نظر آتا ہے۔ تیسری میں الخدود کی بجائے الخدود ہے چوتھی میں اُغمِیَ کا اعمی اور فاقبلت کا ماقبلت اور یحْیاً ثُمّا کا لعد ثھا بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ پانچویں میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں۔

لاٰیۃ کونھن الفسخ

حالانکہ صحیح الفاظ یوں ہیں۔ لَا یَتَرْکُوْنَھُنَّ الْفَخْرَ۔

آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ میں اَفَائِنْ مَّاتَ کی جگہ اَفَاءِ مَنْ مَّاتَ بن گیا ہے ص۵ پر سورۂ ذاریات کی آیات میں ضَیْفِ ابراھیم کے بدلے حنیف ابراھیم اور عَجُوْزٌ کے عوض عَجُوْزٌا ملتا ہے۔ ص۵۲ کی آیات کا حوالہ ہی غلط ہے بجائے ۱، تا ۳، کے ۴، تا ۶، چھپا ہے۔

ان بے احتیاطیوں کے بعد کتاب کی لٹریری حیثیت کیا باقی رہ جاتی ہے آیات واحادیث کے بعض تراجم بھی گڑبڑ سے خالی نہیں جیسے یہ حدیث لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعی بدعوی الجاھلیۃ اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے (جو شخص مصیبت میں چہرے پر ہاتھ مار کر پیٹے اور کپڑے پھاڑے، وہ جاہلیت پر ہے یعنی میری امت میں نہیں) یہ ترجمہ لغو ہے۔

معلوم نہیں آیاتِ قرآنی کے تراجم کہاں سے نقل کئے گئے ہیں یہ بھی بہتر نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ ذاریات (آیات ۲۴ تا ۳۰) میں بیان کیا ہے کہ مہمانوں کے لئے حضرت ابراہیم گھر سے عِجْلٍ سَمِیْنٍ لائے اور ان سے کھانے کا التماس کیا۔ عجل سمین کا لغوی ترجمہ تو "موٹا بچھڑا" ہی ہے مگر کھلی بات ہے کہ کوئی شخص زندہ سلامت بچھڑا مہمان کے آگے کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کھاتے کیوں نہیں یہاں گھی میں تلا ہوا یعنی خوب مرغن سالن مراد ہے۔ نیز قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ کا ترجمہ "اجنبی لوگ" بھی بھرپور نہیں ہے۔ محض اجنبیوں سے حضرت ابراہیم کا گھبرانا اور خوف کھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ منکرون کا ترجمہ اوپرے یا "غیر معمولی" کرنا چاہیے زوجۂ ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کا اپنی پیشانی پر

ہاتھ مارنا۔ حنفی مسخروں کے نزدیک سینہ کوبی کے لئے دلیلِ جواز ہے۔ وہ تو خیر بوالفضول ہیں لیکن جواب میں یہ اصرار بھی زیادتی ہی ہے کہ ہاتھ مارنا ازراہِ مسرت تھا۔ یہ تو حیرت واستعجاب کا ایک اضطراری سا مظہر تھا اور بس۔ سورۂ ھود میں اگر فضحکت کا لفظ آیا ہے یعنی "وہ ہنسی" تو یہ ہنسی بھی مسرت سے تعلق نہیں رکھتی۔ تمسخر اور تحیر ہی پر مبنی تھی۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ اس کتاب کو کسی اچھے عالم کی نظرِ ثانی اور اصلاح کے بعد سلیقے سے چھاپا جائے تو مفید مطلب ہو سکتی ہے۔ بحالتِ موجودہ صرف عامیوں کے کام آئے گی۔

پاسبانِ صحت

مرتبہ:- بیگم عظیم زبیری
شائع کردہ:- زبیری یونانی دواخانہ امروہہ ضلع مرادآباد ● صفحات ۶ء طباعت وکتابت پسندیدہ۔ کاغذ سفید۔ قیمت مع محصولڈاک سوا دو روپے۔

اس کتاب میں صحت عامہ سے متعلق ہدایات پیش کی گئی ہیں۔ ہر ہر ورق پر طویل تجربے اور وسیع معلومات کے جوہر بکھرے ہوئے ہیں عام طور پر لاحق ہونے والے امراض اور باآسانی میسر آنے والی غذاؤں کے متعلق مرتبہ نے جدید اور قدیم دونوں طرح کی معلومات سپردِ قلم کرکے قارئین کے لئے مفید مواد پیش کیا ہے جو لوگ عام طور پر مریض رہتے ہیں یا جسمانی انحطاط کا شکار ہیں۔ ان ہی کے لئے نہیں بلکہ صحت مندوں کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کیونکہ اس سے بقائے صحت اور اضافۂ قوت کے لئے اچھی رہنمائی ملتی ہے۔

سالنامہ اُردو ڈائجسٹ

یہ جریدہ پرانا تو نہیں ابھی تقریباً دو سال سے شائع ہو رہا ہے لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے قابلِ رشک صوری ومعنوی معیار قائم کیا ہے اس نے اس کی مقبولیت کو تیزی سے فروغ دیا ہے فی الوقت اس کا سالنامہ ۱۹۷۳ء پیش نظر ہے اس کے محاسن صوری ومعنوی ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ڈیزائن، طباعت، کاغذ، ترتیب سب حسن وکشش کا خزینہ اور مندرجات خوب سے خوب تر۔ تین سو زائد صفحات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے بھرتی کا کہا جائے یہ الگ بات ہے کہ مذاق ومزاج کے فرق سے کسی قاری کو کوئی چیز زیادہ پسند آئے اور کسی کو کوئی اور چیز۔

یہ کمی ضرور محسوس ہوئی کہ منظومات کا خانہ بالکلیہ خالی ہے ہمارے خیال میں چند صفحات معیاری منظومات سے بھی آراستہ کئے جاتے تو پرچے کے اسٹائل اور مزاج کے خلاف نہ ہوتا۔ ہر آئینہ اس سالنامے کو خصوصاً اور ڈائجسٹ کے عام شماروں کو عموماً ہم اپنی اس سفارش کا مستحق سمجھتے ہیں کہ پاکیزہ اور جاندار ادب سے دلچسپی رکھنے والے شائستہ حضرات اسے اپنے مطالعہ کی میز کی زینت بنائیں۔

● پاکستان کا پتہ:- ۵ مین روڈ۔ سمن آباد لاہور۔ ● ہندوستان میں ترسیلِ زر کا پتہ:- محفوظ احمد رحمانی۔ اقبال منزل۔ متصل عیدگاہ۔ شاملی روڈ۔ مظفرنگر۔ یوپی۔

● مجلس ادارت:- الطاف حسین قریشی۔ ایم۔اے۔ ظفراللہ خاں ایم۔اے۔ امین اللہ وثیر ایم۔اے۔ مقبول جہانگیر

● اس سالنامے کی قیمت ڈھائی روپے۔ عام شمارے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ سالانہ چودہ روپے۔

کمیونزم کی تصویریں

آج کا چین مشہور مفکر و ماہر ڈاکٹر ایس۔ چندر شیکھر کی تالیف جس کا سلیس بلیغ ترجمہ ایڈیٹر الجمعیۃ جناب عثمان فارقلیط نے کیا ہے۔ چین کے سماجی، اقتصادی، زرعی، صنعتی، فکری اور علمی نظام کی بے کم و کاست عکاسی۔ الفاظ سے بنی ہوئی ایک جامع تصویر۔ ملحوظ رہے یہ اُس وقت کی تالیف ہے کہ جب چینی ہندی "بھائی بھائی" تھے اس لئے اس کے مطالب و معانی کو تعصب اور جانبداری سے نہیں جوڑا جا سکتا۔
صفحات ۲۴۰ قیمت صرف ایک روپیہ۔

پانچ معلوماتی کتابیں

(۱) اقتصادی تعاون (۲) ہمارے دَور کا انقلاب (۳) اقتصادی سامراج (۴) غیر جانبداری کا نظریہ (۵) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام ۔۔ (ہر ایک کی قیمت چار آنے)

عثمان بطور چین کے قازق مسلمانوں کی داستانِ ہجرت، اشتراکیت کے بے پناہ جبر و تشدد کے سایۂ ظلمت میں مسلمانوں پر کیا گذری اور کیا گذر رہی ہے۔ ایک کہانی ایک تاریخ ایک قیمتی دستاویز۔ قیمت سوا روپیہ۔

چین کے مسلمان کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کیمونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ قیمت صرف چار آنے۔

اور یا نگسی بہتا رہا ذرا دیکھو وہ کروڑوں خمیدہ کمر انسانوں کی قطار جو بے معنی جد و جہد کا بے تحاشا بوجھ پشت پر اُٹھائے جانوروں کی طرح چلی جا رہی ہے ہر آن ان میں سے کتنے ہی بدنصیب تھک کر گرتے ہیں اور دم توڑ دیتے ہیں یہ چین، جبر و استبداد کا ایک وسیع و عریض جیل خانہ پڑھئے یہ حقیقت افروز کہانی ضرور پڑھئے۔ قیمت صرف ایک روپیہ

کمیونزم اور کسان کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش جو بے شمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ ڈھائی روپے۔

سوئٹ نظام کی چھ کنجیاں جچے تلے عقلی و نفسی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی صفحات ۳۴۲ صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

وُرکُٹا ایک بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز آپ بیتی، جس سے روس کے جبری محنت کے ظالمانہ نظام کا بھیانک منظر سامنے آتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

آزادی کی طرف ایک بڑے روسی افسر کی خود نوشت سوانح۔ جس نے امریکہ میں پناہ لی۔ یہ بیحد دلچسپ لیکن عبرتناک کتاب روس کے حقیقی حالات سے متعارف کراتی ہے اسے پڑھنے کے بعد آپ کیمونزم کے حسین نعروں اور مصنوعی دعووں سے کبھی دھوکا نہیں کھائینگے۔ مجلد تین روپے۔

پتھر کے دیوتا چھ آپ بیتیاں، دلچسپ، سبق آموز اور لائق مطالعہ، جن سے کیمونزم کے متعدد گوشے روشنی میں آتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ

لینن انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ ایک روپیہ۔

ادب میں ترقی پسندی کیمونزم ادب و ثقافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے؟ اس کا مستند جواب۔ یہ کتاب اپنی اہمیت کی بناء پر متعدد ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے (اُردو) قیمت ایک روپیہ۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

بدعت کیا ہے؟
لطائف علمیہ
تفسیر سورہ نور
وجد و سماع
تعزیہ
مکتبہ تجلی دیوبند

Regd. No. A- 972

Tajalli Monthly, Deoband. U. P.

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

Annual Rs. 7.

62 nP.

بدعت کیا ہے؟
بدعت ومعصیت کے رد میں ایک عظیم کتاب جو قرآن وحدیث اور عقل ومنطق کے اٹل دلائل کے ذریعے صحیح ترین اسلامی عقائد کو واضح کرتی ہے ـــــ تمام بدعات کے لئے ضرب کلیم۔
نیا اضافہ شدہ ایڈیشن۔
مجلد تین روپے۔
لطائف علمیہ
عظیم محدث ابن الجوزی رح کی شہرۂ آفاق تالیف کتاب الاذکیاء کا سلیس اردو ترجمہ اس نادر کتاب میں عقل وفراست اور علم و ذکاوت کے دلچسپ ترین لطائف جمع کئے گئے ہیں۔ مجلد پانچ روپے
تفسیر سورۂ نور
اس شاہکار تفسیر میں ائمہ واتقیاء کے بہترین اجتہادات جمع کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے اصول سے فروعات کا استنباط کیونکر ہوتا ہے۔ اسلامی اخلاق کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل سورۂ نور کی یہ تفسیر ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ از مولانا مودودی۔ ہدیہ مجلد چار روپے
وجد وسماع
شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی یہ تصنیف مروجہ عرس وقوالی اور گانے بجانے کی شرعی حیثیت پر حرف آخر ہے۔ پیش لفظ مدیر تجلی کا ہے۔ قیمت ایک روپیہ
تعزیہ
اسلام اور علمائے اسلام کی نظر میں۔ قیمت ۳۷ نئے پیسے
مکتبہ تجلی۔ دیوبند

ماہنامہ تجلی دیوبند
شمارہ نمبر ۱۲
جلد نمبر ۱۴
ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے
سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے
غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
(پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھئے)

انشد ضروری

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ اگر آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی سات روپے باسٹھ ۶۲ نئے پیسے کا ہوگا)۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:- ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہوجائیگا۔

فہرست مضامین مطابق ماہ فروری ۱۹۶۳ء

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

پاکستانی حضرات:- نیچے لکھے ہوئے پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

مکتبہ عثمانیہ — مینا بازار ۲۲۸۰
پیر الٰہی بخش کالونی کراچی

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند سے چھپواکر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا

آغازِ سخن

ہمارے ایک دوست نے جب قادیانیوں کے خود کاشتہ پیغمبر مسٹر غلام احمد آنجہانی کی متعدد کتابوں کا مطالعہ فرمایا تو ان کی لاتعداد تضاد بیانیوں اور حیرتناک گل افشانیوں سے مبہوت ہو کر کہنے لگے کہ کون کہتا ہے دنیا میں سات عجوبے ہیں قادیانی پیغمبر تو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے

پھر انھیں ماڈرن اسلام کے معمار مسٹر غلام احمد پرویز کی سخن طرازیوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا تو گھبرا کر کہنے لگے کہ یہ تو نواں عجوبہ بھی نکل آیا۔

ہم سمجھتے ہیں وہ گھبراہٹ میں صحیح فیصلہ نہیں دے سکے۔ یہ تو بے شک درست ہے کہ یہ دونوں بزرگ اپنی نادر خصوصیات کی بنا پر عجوبہ کہلانے کے یقیناً مستحق ہیں، لیکن علم النفس کی نزاکتوں کا لحاظ رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ انھیں دو الگ الگ عجوبے قرار دینے کے عوض ایک ہی عجوبے کے دو پہلو اور ایک ہی شرخاب کے دو پر شمار کرنا زیادہ قرین قیاس ہو گا۔ ناموں کی یکسانیت سے قطع نظر ان کے منہاجِ فکر میں جو بنیادی یکسانیت ہے وہ صریح تقاضا کرتی ہے کہ انھیں ایک ہی خمیر کے دو پتلے، ایک ہی گیت کی دو دھنیں اور ایک ہی ڈرامے کے دو کردار مان لیا جائے۔ الکفر ملۃ واحدۃ ایک نے ظلی و بروزی نبوت کے ایٹمی آلات سے ختمی مرتبت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کو تارپیڈو کرنا چاہا اور دوسرا ماڈرن انداز میں اُن کی رسالت ہی کا تیا پانچہ کرنا چاہتا ہے معوذ باللہ من ذلک۔ نشانہ دونوں کا اسلام ہی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ایک نے تو وہ توڑے دار بندوق استعمال کی تھی جو مسیلمہ کذاب کے کارخانے میں بنی تھی اور دوسرا وہ مشین گن اٹھائے ہوئے ہے جسے ترقی یافتہ مغرب کی فیکٹریوں نے ڈھالا ہے۔ لوہے کو گلا کر آپ نیزہ و شمشیر بنالیں یا سلائی کی مشین تیار فرمالیں لوہا بہرحال لوہا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قرنِ جدید کے ان دونوں ائمہ کو دو مستقل عجوبے تسلیم کرنے کے عوض یہ کہنا زیادہ اقرب الی الصواب سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ہی عجوبے کے دو ہیولے اور ایک ہی گلستانِ خوبی کے دو طائرِ ہزار داستان ہیں۔ شاید اسی لئے معدودے چند غربائے اسلام کے سوا پوری دنیائے اسلام نے انھیں امتِ محمدیؐ کا فرد اور ملتِ اسلامیہ کا جزو ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ وللہ عاقبۃ الامور۔

اس ہلکی پھلکی تمہید کے بعد پرویز صاحب کے بیشمار تضادات میں سے آج فقط ایک تضاد بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے!

ویسے ہمیں پرویز صاحب کے افکار و نظریات سے لینا دینا کچھ نہیں۔ بحث و مذاکرہ اس سے ہو سکتا ہے جو علم و عقل کے مسلمہ اصولوں کے دائرے میں رہ کر بات کرے۔ ایسے شخص سے کیا گفتگو ہو گی جو دو اور دو پانچ کہہ کر چیلنج کرتا پھرے کہ آج پہلی بار میں نے ریاضی کی تہہ کو پایا ہے اور دنیا کے سارے ریاضی داں اب تک جھک مارتے رہے ہیں۔ پھر کوئی اللہ کا بندہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ثابت بھی کر دے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو یہ شخص ہاتھوں ہاتھ نئی بحث کا دروازہ کھول لے

ہونے سے پہلے ہی مردہ ثابت ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے ایجاد اور چیلنج کا یہ سلسلہ تو لامتناہی ہے کون اس کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت برباد کرے گا۔"

یہ محض تفنن نہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ تمام متفق علیہ اسلامی عقائد اور اٹل دینی تصورات کو قسط وار مسخ و محرف کرنے کا مشغلہ ٹھیک یہی حیثیت رکھتا ہے جس کی تمثیل اعداد میں پیش کی گئی۔ جو بنیادی نظریات و عقائد برسہا برس میں سیکڑوں دماغوں کی عرق ریز محنت کے بعد مدوّن ہوئے تھے اور پھر صدیوں ان کے نوک پلک درست کرنے کا کام ہوتا رہا۔ ان سب کے بارے میں جو شخص تشکیک پھیلاتا ہے اور جملہ مسلمات کو دریا برد کر دینا چاہتا ہے اس سے مناظرہ کرنا کس کے بس کا روگ ہے۔ اس کا قرآن۔ اس کا رسول۔ اس کی ہر شے ہم سے جدا۔ وہ لُغت، صرف و نحو اور منطق بھی اپنی ذاتی ہی رکھتا ہے جس کے مدارک و مناہج تک خود اس کے سوا دنیا میں کسی کی رسائی نہیں۔ پھر بھلا کون سارے کاموں کو بالائے طاق رکھ کر اس سے سر ملے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً مخلص دوستوں کے اصرار کے باوجود ہم نے پرویزیات کا باب تجلی میں نہیں کھولا۔

تاہم تفریح کا بھی دنیا میں ایک مقام ہے۔ ایک بڑا خوبصورت تضاد حال ہی میں سامنے آیا تو جی چاہا کہ ناظرین کو بھی اس تفریح میں شریک کرلیں۔

ان صاحب یعنی پرویز صاحب نے معارف القرآن کے نام سے ایک چیز لکھی ہے جسے ناقدرے اور کم سواد لوگ تو تفسیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ تفسیر جیسی غیر تخلیقی چیز نہیں ہے بلکہ موصوف کی طباعی اور صلاحیتِ ایجاد کا شاہکار ایک نیا قرآن ہے جسے موصوف نے عربی قرآن کے مقابلہ میں بزبان اُردو تصنیف کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح ڈاروِن کی دانست میں آدمی پہلے بندر تھا پھر رفتہ رفتہ آدمی بنا اسی طرح پرویز صاحب نئے قرآن کے مصنف یک لخت نہیں بن گئے بلکہ رفتہ رفتہ بنے ہیں اور معارف القرآن کی تسوید و ترتیب کے دوران ڈاروِنی عمل ارتقاء انھیں لطیف تدریجی مراحل سے گذارتا گیا ہے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے۔ معارف القرآن لکھنے کے عبوری عہد میں گو کہ ان کی تصنیفی صلاحیتیں باب درباب اُس مقامِ یکتائی اور منصب امامت کی طرف انگلی سے اشارہ کرتی نظر آتی ہیں، جس پر وہ ارتقاء کرکے آج فائز ہوئے ہیں لیکن اس وقت تک ان کا فکری رشتہ پچھلے مفسرین و محدثین میں سے بالکل کٹا نہیں تھا، بلکہ بقول شخصے تسمہ لگا رہ گیا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس وقت تک وہ پوری طرح یہ سُراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ صحابہ کرام سے لیکر آن کے دَور تک جتنے بھی محدثین و فقہاء اور مفسرین و فضلاء گذرے ہیں سب کے سب علم و عقل سے کورے، دین و دیانت سے فارغ اور اسلام کے خلاف مل جل کر سازش کرنے والے تھے۔ اسی لئے موصوف نے معارف القرآن کی جلد چہارم صفحہ ۶۸۱ پر "واقعۂ افک" کے زیر عنوان مندرجہ ذیل تفسیر پیش کی تھی پڑھ لیجئے۔ حرف بحرف درج ذیل ہے:۔

معارف القرآن کی تفسیر

جب منافقین نے حضرت عائشہ الصدیقہؓ کے خلاف (خاکم بدہن) تہمت لگائی ہے (جسے واقعۂ افک کہتے ہیں اور جس کی تفصیل آگے چلکر آئے گی)، تو حضورؐ کے لئے یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں اپنی بیویوں کی پاکدامنی کے متعلق خوب جانتا ہوں کون ان کم بخت ایسی عفت مآب خاتون کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ صحابہؓ کے لئے حضرت عائشہؓ خدا کے حکم کی رُو سے بمنزلہ ماں (ام المومنین) تھیں ان کے حیطۂ تصور میں بھی کسی قسم کی بدگمانی نہیں آسکتی تھی، لیکن واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر حضورؐ نے اسے خود ہی چُکا دینا نہیں چاہا اللہ کے فیصلے کا انتظار کیا۔ جب خود اللہ نے عصمت حضرت عائشہؓ کی شہادت دیدی تب اسکا اعلان فرمایا۔ ابھی آگے نہ بڑھیئے کہ اس واقعہ میں دو ٹکڑے اور ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر نگہ بصیرت وجد کرتی ہے۔ اس واقعۂ فاجعہ سے حضرت عائشہؓ کے دل پر جو کچھ گذری ہوگی اسکا

اندازہ ہر غیور آسانی لگا سکتا ہے وہ اپنے ماں باپ کے یہاں چلی گئی تھیں اور ہجوم غم سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ جب لسانِ وحی نے ان کی عصمت کی شہادت دیدی تو رسول اللہ نے جا کر بشارت دی کہ عائشہ رض تجھے مبارک ہو خدا نے تیری پاکدامنی کی گواہی دیدی ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

پھر پرویز صاحب نے صفحہ ۷۵۴ تا صفحہ ۷۵۷ پر بعنوان "افکِ عائشہ" اس واقعہ کی وہ قرآنی تفصیل بیان فرمائی ہے جس کا انھوں نے صفحہ ۶۸۱ پر وعدہ کیا تھا کہ "آگے چلکر آئے گی"۔ چنانچہ رقم طراز ہیں کہ:۔

"ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ حضورؐ کی خانگی زندگی کے متعلق کوئی فتنہ پردازی کی جائے جس سے مسلمانوں کی اجتماعیت میں انتشار و افتراق پیدا ہو جائے۔ غزوۂ بنو مصطلق میں حضرۃ عائشہ رض ساتھ تھیں۔ واپسی کی شام آپ ضروریات کے لئے باہر تشریف لے گئیں اور وہاں اپنا ہار تلاش کرنے لگیں۔ انھیں دیر لگ گئی کوچ کا وقت آگیا، ساربان نے یہ سمجھ کر کہ آپ محمل میں تشریف فرما ہیں۔ ناقہ کو شریک کاروان کر لیا۔ جب حضرۃ عائشہ رض لوٹ کر آئیں تو لشکر دور نکل چکا تھا۔ وہ اس خیال میں وہیں رک گئیں کہ جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آپ محمل میں نہیں ہیں تو کوئی نہ کوئی آدمی تلاش کے لئے بھیجیں گے۔ اتنے میں ایک اور صاحب ادھر سے آنکلے اور آپ ان کے ساتھ لشکر کی طرف آگئیں۔ مفسدہ پرداز منافقین کے لئے اتنی سی بات کافی تھی۔ انھوں نے اس سے ایک پورا افسانہ تراشا اور اسے خاص طور سے نشر کیا حتیٰ کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی اس کے دامِ فریب میں آگئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک تھا اس لئے حضورؐ نے اس میں خود فیصلہ نہیں دیا حتیٰ کہ خود قرآن میں حضرت عائشہ رض کی عفت کی شہادت آگئی۔ سورۂ نورؔ میں ہے:۔"

(یہاں پرویز صاحب سورہ نور کی آیات ۱۱ تا ۱۴ نقل کر کے ترجمہ و تفسیر یوں فرماتے ہیں۔ تجلی)

"جن لوگوں نے یہ طوفان (عائشہ رض کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمھارے ہی میں کا ایک گروہ ہے (یعنی منافقین کا گروہ جو مسلمانوں میں بظاہر شامل تھا) تم اس (طوفان انگیزی کو) اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو بلکہ (باعتبار نتیجہ کے) تمھارے حق میں تو بہتر ہے۔ یاد رکھو ان میں سے ہر شخص کو جس نے جتنا کچھ کیا (اتنا ہی) گناہ ہوا اور جس شخص نے ان میں سے اس (بارے میں) سب سے بڑا حصّہ لیا اس کو سخت ترین سزا ہوگی۔ جب تم لوگوں نے یہ بات سُنی تھی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپ داروں کے ساتھ دل سے نیک گمان کیوں نہ کیا (وہ زبان سے) کہہ دیتے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ یہ لوگ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی) اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم جس شغل میں پڑے تھے تم پر سخت عذاب واقع ہوتا۔ اس کے بعد فرمایا:۔

(یہاں آیات ۱۵ تا ۱۸ نقل کر کے یوں لکھا گیا ہے۔ تجلی)

"جب کہ تم اس (بہتان) کو اپنی زبان سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے مُنھ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جسکی تم کو مطلق خبر نہ تھی اور تم اس کو بہت معمولی بات سمجھے ہوئے تھے، درانحالیکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی، اور جب تم نے اس (بات) کو (اوّل بار) سُنا تھا تو یوں کیوں نہ کہدیا کہ ہمارے لئے سزاوار نہیں ہے ہم ایسی بات منھ سے بھی نکالیں، معاذ اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے! اللہ تم کو (تاکید کے طور پر) نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر تم ایمان والے ہو۔ اللہ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے اور اللہ سب کو جاننے والا اور بڑی حکمتوں والا ہے"

پھر منافقین کے متعلق فرمایا:۔

(یہاں آیات ۱۹ تا ۲۱ نقل کر کے یہ ارشاد ہے۔ تجلی)

"جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بےحیائی کی بات مسلمانوں میں پھیلے ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب مقرر ہے اور (بلا شبہہ) اللہ (ہر بات) کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتی (تو یہ منافقین اپنی سازش میں ضرور کامیاب ہوتے) اللہ (تم پر) بڑا ہی شفقت و رحمت والا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک پاک دامن خاتون کو مفسدین کی اتہام تراشیوں سے محفوظ اور جماعت مومنین کو تشتت و انتشار کی ایک گہری سازش کے عواقب سے مصئون رکھا ورنہ منافقین کی ابلیسی وسیسہ کاریاں اپنا کام کر ہی چکی تھیں" پھر سورہ نور کی آیت ۲۱/۲۴ مع ترجمہ لکھنے کے بعد تحریر فرمایا گیا ہے کہ:-

"ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس سازش میں ایک ایسا شخص بھی شریک تھا جس کی کفالت حضرت ابوبکرؓ کے ذمہ تھی۔ آپ نے اس واقعہ کے بعد اس کی پرورش سے ہاتھ اُٹھالیا' لیکن جب وہ نادم ہوا اور اللہ نے اسے معافی دیدی تو ساتھ ہی یہ بھی حکم دے دیا کہ اس کی کفالت پھر سے شروع کر دی جائے۔"

پھر اس کی شہادت میں سورۂ نور کی آیت ۲۲/۲۴ مع ترجمہ لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد چند سطروں میں دیگر امہات المومنینؓ کے بلند ترین اخلاق اور سوتیا ڈاہ سے ان کے منزہ ہونے کو بتایا گیا ہے اور آخر میں ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے سارے واقعات کی بابت تحریر فرمایا گیا ہے کہ:-

"قرآن حکیم نے ان واقعات کو اس لئے اپنے دامن حفاظت میں جگہ دی ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی گوشہ آنیوالوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہے۔"

معارف القرآن کے اس طویل بیان سے آپ کو یہ سبق حاصل ہوئے جو مبین قرآن ہیں کہ:-

● — واقعۂ افک کا تعلق خود قرآن نے حضرت عائشہؓ ہی سے قرار دیا ہے۔

● — زبانِ وحی حضرت عائشہؓ کی عصمت کی شہادت ہوئی اور یہ شہادت خود قرآن میں موجود ہے۔

● — قرآن کہتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی تھیں۔

● — قرآن ہی یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے میکے میں ہجوم غم سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔

● — ان سب واقعات کو قرآن کریم نے اپنے دامن حفاظت میں جگہ دی ہے۔

یہ تو ہوئے معارف القرآن

اب سنئے کہ یہی معارف القرآن کے عارف پرویز صاحب ایک جدید لغت بنام لغات القرآن کے مصنف بنے ہیں۔ لغات مرتب کرنے والے کے لئے "مصنف" کا لفظ شاید آپکو کھٹکے لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ عظیم لغت سراسر تصنیف ہی ہے۔ مغربی عقلا نئی نئی مشینیں اور ہتھیار ایجاد کرتے ہیں اور ایشیا کے عظیم مفسرِ قرآن نے نئے لغات' نئی عربی اور نئے معانی ایجاد کئے ہیں۔ یہ کمال معمولی نہیں کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آجتک اس کے معانی و مطالب کو اِس نہج' اِس بانکپن اور اس منتر سے کسی نے نہیں سمجھا جس سے پرویز صاحب نے سمجھا ہے۔ حد ہے کہ بڑے بڑے فصحائے عرب کو اُن معانی کی ہوا تک نہیں لگی جن کے بحرِ بیکراں میں ڈوب کر "لغات قرآن" جیسا کوہِ نور موصوف نے نکالا ہے۔

اس نادر لغت کو جی کھول کر خراج تحسین دیں گے تو حرفِ مطلب دُور جا پڑے گا۔ لہٰذا معارف القرآن کے مقابلہ پر فی الوقت آپ لغات القرآن کی تصریحات ملاحظہ فرما لیجئے۔ وہی سورۂ نور جس کا ترجمۂ و تفسیر آپ پرویز صاحب کی زبانی سن چکے اسی کے ذیل میں اب یہ محترم کیا فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو لغات القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۸۰۹ و ۱۸۱۰ بعنوان "تتمّہ"۔

فرمایا گیا

"سورۂ نور میں قرآنِ حکیم نے مومنین کو نصیحت اور تاکید کی ہے کہ وہ جھوٹے الزامات نہ وضع کیا کریں اور معاشرے میں اس قسم کی باتوں کو نہ پھیلایا کریں (دیکھئے ۲۴/۴ و ۲۴/۱۸) اس ضمن میں اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک گروہ نے کسی پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (۲۴/۱۱) جو لوگ اس جھوٹ کو افترا کر کے لائے ہیں وہ تم ہی میں سے ایک گروہ ہے۔ اس سارے واقعہ میں قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ وہ کون تھا جس کے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا۔ اس نے کہا صرف یہ ہے کہ جب یہ خبر جماعتِ مومنین تک پہنچی ہے تو ان کا پہلا ردعمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ حسن ظن سے کام لیتے اور کہدیتے کہ ھذا افک مبین (۲۴/۱۱)"

اور هٰذا بهتان عظیم (۲۴/۱۶)، یہ وہی بات ہے جس کی دوسری جگہ یہ کہہ کر وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی بات تم تک پہنچائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو (۴۹/۶) قرآن کریم نے صرف اتنا کہا ہے لیکن ہماری تاریخ ــــ روایات ــــ میں اس واقعہ کو (معاذاللہ) حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کر کے اس پر افسانہ طرازی کی ایک عمارت قائم کر دی گئی ہے حتیٰ کہ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ خود نبی اکرمؐ بھی اس باب میں سخت متردد تھے اور انھوں نے حضرت عائشہؓ کو ان کے میکے بھیج دیا تھا جہاں ان کی حالت غیر ہو گئی تھی حتیٰ کہ خدا نے بذریعۂ وحی ان کی براءت کی تب حضور اکرمؐ انھیں گھر لائے۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ گھڑا ہوا قصہ ہے جسے خاص مقصد کے ماتحت وضع کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے مستند واقعہ کی حیثیت سے لئے چلے آ رہے ہیں اور جب مخالفین اسلام اس پر اعتراض کرتے ہیں تو ہم طیش میں آ جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اس کے جواب میں وہی کہہ دینا چاہئے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ هٰذا افك مبين (۲۴/۱۲) یعنی یہ واقعہ جسے حضرت عائشہؓ اور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ هٰذا افك مبين اور بہتان عظیم (۲۴/۱۶) ہے۔" (لغات القرآن کا اقتباس تمام ہوا)

اب سر پکڑ کر سوچئے کہ بات کیا بنی؟

ویسے تو آپ یہ پیش افتادہ کہاوت دہرا سکتے ہیں کہ ــــ دروغ گو را حافظہ نہ باشد، لیکن بات اتنی سادہ نہیں بلکہ اس کی تہہ میں وہی ڈاروِنی فلسفۂ ارتقاء کارفرما ہے جس کی رو سے بندر کا آدمی اور مفسر کا مصنف بن جانا ایک ایسی مجبوری ہے جس پر غصے کی بجائے ترس آنا چاہئے۔

جناب پرویز صاحب اس تضادِ فاحش کا صرف ایک ہی جواب لا سکتے ہیں۔ یہ کہ بھائیو میں خود پہلے محدثین و مفسرین کے بھرے میں آ گیا تھا اور جس عقل نے آج یہ سمجھایا ہے کہ قرآن کے واقعۂ افک کو حضرت عائشہؓ سے منسوب کرنا خالص کذب و افتراء ہے وہ عقل معارف القرآن لکھنے کے عہد میں یا تو رحم مادر میں تھی یا سنِ بلوغ کو نہیں پہنچی تھی۔ اب بفضلہ تعالیٰ وہ بالغ ہو گئی تو میں آگاہ ہو گیا کہ یہ سارے تمام محدثین، مفسرین، مشائخ، علماء، فقہاء و مؤرخین سب مفتری تھے۔ قرآن کے دشمن تھے بے عقل تھے۔ انھیں اتنا بھی خدا کا خوف نہ تھا کہ جن ازواج مطہراتؓ کو قرآن نے اُمہات المومنین قرار دیا ہے انھی میں کی ایک ممتاز اور برگزیدہ ماں کے ساتھ تہمتِ زنا کے من گھڑت انتساب سے پرہیز کرتے۔ انھوں نے بغیر کسی قطعی شہادت کے بہت اطمینان سے کہہ دیا کہ قرآن جس واقعۂ افک کا ذکر کر رہا ہے وہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کو پیش آیا تھا۔

اس اعتذار پر اگر کوئی یہ الزام ان کو دے گا کہ تم صحابہؓ تک کو مفتری، فاسق اور بددین ٹھیرا رہے ہو پھر آخر اسلام اور ایمان وغیرہ کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے تو اس کا چلتا ہوا جواب ملے گا کہ نہیں صحابہؓ وغیرہ کو ہم ہرگز ایسا نہیں کہتے، بلکہ ہمارا تو مطلب یہ ہے کہ جھوٹی روایتیں منافقین وغیرہ نے گھڑی ہیں اور بھولے بھالے محدثین و مفسرین نے ان پر خواہ مخواہ اعتبار کر کے انھیں احادیث و تفاسیر کی کتب میں درج کر دیا ہے۔

بظاہر جواب خاصا خوشنما ہے، لیکن سوال یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ امام مالکؒ، امام بخاریؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ حضرت حسن بصریؒ اور ان جیسے دیگر مشائخ و ائمہ جو صحابہؓ سے متصل زمانوں میں گذرے ہیں اگر اتنے ہی ناسمجھ، بے شعور اور دین کے معاملہ میں متساہل تھے تو پھر اس قرآن کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے جس کی آڑ سے کر پرویز صاحب اپنے مسلمان ہونے پر پیہم اصرار کئے جاتے ہیں۔ قرآن ہم پر براہِ راست تو آسمان سے نہیں آیا یہ انھی تابعین اور تبع تابعین کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے جن کی بے دانشی اور خام کاری کا بقول پرویز صاحب یہ عالم تھا کہ وہ زنا جیسی تہمت کا انتساب بغیر کسی شہادتِ قطعی کے ام المومنین کی طرف قبول کر لیتے ہیں۔ تب تو پرویز یا ان کوئی بھی مرید بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ فلاں فلاں آیات فی الاصل آیات نہیں ہیں، بلکہ انھیں منافقین نے گھڑا ہے اور محدثین مشائخ قبولِ روایت کے معاملے میں بصیرت و بصارت سے محروم

تھے ہی لہٰذا انھوں نے انھیں قرآن ہی کا جزو سمجھ کر اخلاف کی طرف منتقل کر دیا ہے۔

یہ کوئی فرضی منطق نہیں۔ اس کا سبق تو شیعہ حضرات باین طور صدیوں سے دے رہے ہیں کہ فلاں آیت یوں بھی اور فلاں آیت یوں تھی۔ خود پرویز صاحب بھی یہ سبق ضرور دیتے اگر انھیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی لیکن فکر و فن کی ترقی کے اس دور میں لاٹھی توڑے بغیر سانپ مارنے کی ترکیبیں نادر نہیں۔ انھوں نے قرآن کی کسی آیت کو جعلی یا محرف کہنے کی بجائے قرآن کو اپنا موٹو، اپنا نعرہ، اپنا بورڈ بنایا اور آرٹ صرف اتنا سا دکھلایا کہ آیات کے آبگینوں میں معانی اپنے ڈال دیتے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ کسی زبان سے دنیا میں کبھی کسی نے ایسا دلچسپ لیکن بے رحم مذاق نہ کیا ہوگا جیسا پرویز صاحب نے عربی کے ساتھ کیا ہے۔ مگر نیرنگیِ زمانہ دیکھئے کہ یہ مذاق خاصا چل گیا چل اس لئے گیا کہ ماحول اور اقتدار دونوں سے اسے غذائیں ملیں۔ پاکستان میں حکومتوں کی الٹ پلٹ اگرچہ دھوپ چھاؤں کا کھیل رہی ہے لیکن جو بھی ٹیم برسراقتدار آئی وہ ناموں اور چہروں کے لحاظ سے اپنے پیشرووں سے کتنی ہی مختلف رہی ہو مگر دین سے بے خبری اور شاہد مغرب کی ذہنی غلامی میں ذرا بھی مختلف نہیں تھی۔ شاہد مغرب کی قرآن و سنت والے اسلام سے تو کوئی آشنائی نہیں مگر پرویز صاحب والے اسلام کی جھولی میں اس قتالۂ عالم کے سولہ سنگھار کے لئے بڑا اسباب و سامان موجود ہے پھر کیسے گروہِ مقتدر کی تائید اور پشت پناہی اسے نصیب نہ ہوتی۔

بہرحال جس منطق سے پرویز صاحب محدثین کی صحیح ترین اور متفق علیہ روایات کو ایجادِ بندہ قرار دیتے ہیں اس کی موجودگی میں خود قرآن کا قابلِ اعتماد ہونا محض ایک لکھنوی تکلف بن کر رہ جاتا ہے۔ انھوں نے کل معارف القرآن میں واقعۂ افک کا تعلق حضرت عائشہؓ سے بتاتے ہوئے جب تمام وہی تفصیلات ثبتِ تفسیر کی تھیں جنھیں آج افسانہ طرازی کہہ رہے ہیں اور ان تفصیلات پر بقول ان کے انکی نگاہِ بصیرت وجد بھی کر گذری تھی تو آخر آج وہ کس دل گردے سے اُلٹی قلابازی کھا رہے ہیں۔ کل انھیں کتنا وثوق تھا اس بات پر کہ واقعۂ افک کا تعلق حضرت عائشہؓ ہی سے ہے مگر آج نہ جانے کونسی عینک لگا کر وہ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ:—

"صاف نظر آتا ہے کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہے جسے خاص مقصد کے تحت وضع کیا گیا ہے"

یہ الفاظ جس طرح روایاتِ متواترہ سے ثابت شدہ اس واقعے کے بارے میں کہے گئے اسی طرح کسی بھی آیت یا سورۃ کے بارے میں بلا تکلف کہے جا سکتے ہیں۔ جب کہنے والے کے سوا کسی کی نظر معتبر نہ ہو اور کہنے والا ہی اس کا بھی مختار ہو کہ جو مقصد چاہے کسی کی طرف منسوب کر دے تو قرآن ہی کے لئے امان کہاں رہ جاتی ہے۔ قرآن کے محفوظ اور غیر محرف ہونے کے لئے سوائے روایاتِ متواترہ کے اور کوئی شہادت امت کے پاس ہے۔ تواتر بھی پرویز صاحب کے ایک ہی ریمارک میں صاف ہوا تو آگے کونسی آہنی دیوار ہے جو انکار قرآن میں حائل ہو سکے۔

اچھا چلئے تھوڑی دیر کے لئے ہم حدیث کا معاملہ درمیان سے ہٹائے دیتے ہیں۔ پرویز صاحب کو بہت ناز ہے کہ عقل و منطق میں انکا کوئی حریف نہیں لیکن عقل کا مفہوم بھی ان کی نظر میں شاید ایسا ہی مخصوص و منفرد ہے جیسا آیاتِ قرآنی کا۔ انھوں نے پہلے تو ایک مفروضہ قائم کیا کہ "جب مخالفین اسلام اعتراض کرتے ہیں تو ہم طیش میں آجاتے ہیں" حالانکہ سرے سے یہی واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ انھوں نے علمائے سلف کا لٹریچر نہیں دیکھا یا دیکھا ہے تو صرف غلطیاں چھانٹنے اور کیڑے ڈالنے کی غرض سے دیکھا ہے۔ اگر وہ دیکھنے کی طرح دیکھتے تو انھیں بے شمار جگہ نظر آتا کہ اسلام پہ کئے جانے والے ہر اعتراض کے جواب میں علماء نے پوری متانت، حلم اور تدبّر کے ساتھ نہایت محکم جوابات دیئے ہیں۔ غصہ وہ کرے جس سے جواب نہ بن پڑے۔ یہ الزام دینا کہ علمائے اسلام مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں فقط تاؤ کھاتے تھے

ہیں حقائق سے چشم پوشی اور یاوہ گوئی کا بہت بڑا نمونہ ہے۔ ماضی ہی میں نہیں آج بھی منکرین اسلام نے ہر اعتراض کا معقول جواب نہایت بردباری اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن جن لوگوں کو اندھے کی لاٹھی کی طرح قلم چلانے کی عادت ہو ان کے ناوک ستم سے کون بچ کر جا سکتا ہے۔

مفروضہ قائم کرنے کے بعد جو کچھ فرمایا گیا وہ بھی خوب ہے

"حالانکہ ہمیں اس کے جواب میں وہی کہہ دینا چاہئیے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ ھٰذَا اِفْكٌ مُّبِين یعنی یہ واقعہ جسے حضرت عائشہؓ اور نبی اکرم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ھٰذَا اِفْكٌ مُّبِين اور بہتان عظیم ہے۔"

سمجھے آپ۔ اگر یہ تفکیر و تدبر ہے تو ابلہ فریبی کسے کہینگے؟

چھوڑیئے حدیث و تفسیر کو۔ ایک بار معارف القرآن کے منقولہ بالا فرمودات پھر پڑھ لیجئے اور مزید تکلیف کرکے مترجم قرآن میں سورۂ نور کھول لیجئے۔ اللہ تعالیٰ تہمت زنا کے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جو نزولِ قرآن ہی کے دور میں پیش آیا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ	جو لوگ لائے ہیں یہ تہمت وہ تم ہی میں کے کچھ لوگ ہیں۔ اس حرکت کو تم اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ خیر ہے تمہارے لئے

پھر ایک آیت اور:۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ○	کیوں نہ جب اس تہمت کو تم نے سنا تھا تو خیال کیا ہوتا ایمان والے مرد و زن نے اپنے لوگوں کے بارے میں بھلا خیال اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔

+ + + +

اسے جانے دیجئے کہ یہ بہتان کس پر لگا تھا لیکن یہ تو قطعی طور پر واضح ہے کہ ھٰذَا کا اشارہ اس بہتان کی طرف ہے۔ لیکن پرویز صاحب چلتے ہوئے فقروں میں یہ مضحکہ خیز مفہوم باور کرانے کی سعی فرما رہے ہیں کہ دورِ رسالت گذرنے کے بعد جو محدثین و مفسرین نے یہ بہتان طرازی کی کہ قرآن کے اس واقعۂ افک کو حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسی کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ یہ تو صریح بہتان ہے!

ہے اس نکتہ سنجی کی کوئی حد؟ اگر یہ تفسیر ہے تو مسخرہ پن کیا ہوگا! خدا جانے اس طرح کے مواقع پر پرویز صاحب مخالفین اسلام کو اتنا بدھو کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ آپ نے ادا کے ساتھ ھٰذَا اِفْكٌ مُّبِين کہا اور وہ کھٹ سے بولنے کہ او ہو ہم سمجھے نہیں تھے اب ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جہاں تک تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ فرما دیا ہے:۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ	اور (اے محمد) تم سے یہود و نصاریٰ راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کا یہ آبائی دین قبول نہ کر لو۔ کہدو ان سے کہ راہ تو وہی سیدھی ہے جو اللہ بتلاتا ہے۔ اور اگر (بالفرض) تم نے پیروی شروع کر دی ان کی خواہشات کی بعد اسکے کہ تمہیں (حقائق کا) علم دیا جا چکا تو پھر سمجھ لو کہ) اللہ سے (اسکے احتساب گرفت سے) بچا لینے والا اور تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں۔

+ + + +

ظاہر ہے کہ پیغمبر تو مامور ہونے کے باعث یہود و نصاریٰ کی ملت کا اتباع کرنے ہی والا نہیں تھا اللہ نے اسے خطاب کرکے دراصل پوری امت کو اس نکتے سے باخبر اور متنبہ کیا ہے کہ اہلِ کفر کے اعتراض و طعن سے ڈر کر اگر کسی مومن نے کبھی اسلام کے کسی حکم کو بدلنا یا توڑنا مروڑنا چاہا تو اس سے اہلِ کفر نہ تو راضی ہونگے نہ اعتراض کا دروازہ بند ہوگا۔ وہ تو بس اسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ مومن اسلام کو سلام کہہ کے پوری طرح انھی کے دین پر چل پڑے۔

پرویز صاحب اور درسگاہِ مغرب کے فیض یافتہ سبھی مجتہد برابر اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ جن جن عقائد و تصورات پر مغرب کے نازک مزاجوں کو اعتراض ہے ۔ مثلاً تعددِ ازدواج، فقط مرد کے لئے حقِ طلاق "نکاحِ صغیرہ" پردہ وغیرہ ۔ انھیں اسلام سے خارج کر دو۔ اب قرآن کو خاکم بدہن فقہ بود کرنا آ

ممکن نہیں تھا ترکیب یہ نکالی کہ قرآن کو سیاق و سباق سے کاٹ دو۔ شانِ نزول کو افسانہ طرازی ٹھیراؤ اور جہاں ان ساری حرکتوں سے بھی کام نہ چلے تو الفاظ کے من مانے معانی تراشو یہ کام اور لوگ تو فرادی فرادی کرتے آئے تھے مگر پرویز صاحب نے اسے باقاعدہ ایک تنظیم کی شکل دی اور حالات کی سازگاری سے فائدہ اٹھاکر ایک لغت بھی چھاپ دی جس میں جو چاہا لکھا اور جس طرح چاہا کلام الٰہی کا حلیہ بگاڑا۔ ذرا دیکھئے قرآن کا ذکر فرمودہ وہ مکالمہ جو کفار اور مومنوں کے درمیان ہوا تھا کہیں ان آج کے فنکاروں پر تو صادق نہیں آتا جو عینِ کفر کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش میں پسینے پسینے ہوئے ہیں

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ ۱۱و۱۲)

اور جب ان سے (مومنوں کی طرف سے) کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا مت کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو کہ وہی فسادی ہیں مگر انھیں شعور و فہم نہیں ہے

+ + + +

نیز:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح سب لوگ ایمان لائے

اور یہ کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ کا ٹکڑا خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ مطالبہ فقط یہ نہیں کیا گیا کہ ایمان لاؤ جس انداز میں تمھارا جی چاہے بلکہ یہ قید لگا دی گئی کہ جس انداز میں اور مومنین ایمان لائے اسی انداز میں تم بھی لاؤ۔ اب یہ کفار جواب دیتے ہیں کہ واہ جناب:۔

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ

کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جیسے (سب) بیوقوف ایمان لائے ہیں

+ + + +

گویا ایمان لانے سے تو صاف انکار نہیں مگر لانا چاہتے ہیں اپنے خاص انداز میں۔ یہ جو صحابہؓ نے حضورؐ کی دعوت پر آمنّا و صدّقنا کہہ کر سر جھکا دیا اسے وہ حماقت قرار دے رہے ہیں اور اپنی عقل و خرد پر نازاں ہیں۔

ذرا سوچئے۔ کیا ٹھیک یہی موقف پرویز صاحب نے اختیار نہیں کیا۔ موبہ مو یہی موقف۔ وہ کہتے ہیں یہ پہلی صدی ہجری سے لیکر اُن کے اپنے زمانے تک تمام محدثین و مفسرین اور ان پر اعتماد کرنے والی تمام امت سفہاء کا مصداق تھی۔ یہ سب احمقوں کی طرح ایمان لائے۔ ان کا ایمان واہی عقائد اور من گھڑت مزعومات کا پلندہ ہے۔ کیا ہم بھی ——— ہاں ہم سائنسی دور کے فرید و وحید دانشور بھی ان بے عقلوں کی طرح ایمان لے آئیں ——— ہرگز نہیں۔ ہم ایمان لاتے ہیں مگر نہایت عقل و تدبر کے ساتھ۔ ہم سراپا مومن ہیں مگر ایسے غبی نہیں کہ آیاتِ قرآنیہ کے وہ مفاہیم مان لیں جو یہ سفہاء کی قوم تیرہ سو برسوں سے مانتی آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیا:۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

کان کھولکر سن لو ایسی لوگ (جو دوسرے مومنوں کو بیوقوف کہہ رہے ہیں) خود بیوقوف ہیں مگر یہ اپنی حماقت کا علم نہیں رکھتے

اب یہ ہر مسلمان کو خود فیصلہ کرنا چاہئے کہ آیا بیوقوف وہ تمام لوگ ہیں جنھیں پرویز صاحب وقتاً فوقتاً سازشی، احمق، کم سواد اور اسی نوع کے دیگر القاب و آداب سے نوازتے رہتے ہیں یا خود پرویز صاحب اور انکے متبعین ہیں جن کے لئے قرآن کا کھلا فیصلہ موجود ہے۔

اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا

ارادہ کیا گیا ہے کہ ماہ مارچ کی چھٹی کرکے مارچ اور اپریل کا مشترکہ شمارہ آغاز اپریل میں بطورِ خاص نمبر نکالا جائے ایک ماہ کا ناغہ قارئین پر جس قدر شاق گذرتا ہے اس کا ہمیں احساس ہے، لیکن ناغہ کے بعد دو ماہ کا مشترکہ نمبر اس کوفت کی تلافی کر دیتا ہے یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ ہم ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کوشش کریں گے کہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بناکر پیش کریں۔ بڑا حصہ اس میں تجلّی کی ڈاک کا ہوگا اور تبصروں کے لئے بھی کافی جگہ نکالی جائے گی۔ تبصرہ طلب کتابوں کا انبار جمع ہے۔ رمضان میں ہم حتی المقدور مطالعہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ کتاب پڑھ کر تبصرہ کرنے کا التزام گلے کا پھندا بنکر رہ گیا ہے

لیکن یہ سہل انگاری بھی طبیعت قبول نہیں کرتی کہ محض سرسری نظر ڈال کر تبصرہ اُڑا دیا جائے۔ تبصرے کے لئے کتاب بھیجنے والا ہر دوست تاؤ کھاتا ہے — اور اپنی جگہ بجا کھاتا ہے کہ ہماری ایک کتاب مدیر تجلی سے مہینوں میں بھی نہیں پڑھی گئی مگر اس دوست کو ریاضی کا یہ فارمولا کون سمجھائے کہ ایک اور ایک کو اگر سو پچاس بار جمع کیا جائے تو حاصل جمع کتابوں کا انبار نکلتا ہے۔

ہاں ہم ایک ایسا بھی عنوان قائم کرنے کا قصد کر رہے ہیں جس کے تحت بعض ایسی احادیث پر فنی نقد کیا جائے جو عام طور پر مشہور و مقبول ہو گئی ہیں۔ کیا تعجب یہ عنوان اسی مشترک شمارے سے شروع ہو جائے۔ واللہ الموفق۔

خیال ہے کہ اس شمارے کے لئے ملا مکی بھی غالباً کوئی خاصے کی چیز لا سکیں گے وہ ابھی سے ایک نیا قلم خریدنے کے سلسلے میں دکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں اللہ ان پر اور ہم سب پر رحم کرے۔

کیا مہتمم دار العلوم دیوبند کافر ہیں؟

یہ لطیفہ تو غالباً آپ کے علم میں آ ہی چکا ہوگا کہ دار العلوم کے صدر مفتی مولانا مہدی حسن صاحب نے دن کے اُجالے میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند پر کفر والحاد کا فتویٰ کھینچ مارا ہے۔ اس سلسلے میں کیا کیا گل کھلے یہ داستان حیرت بھی انشاء اللہ آپ خاص نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ جی تو اس زندہ کہانی کے دوہرانے کو بالکل نہیں چاہتا۔ کیونکہ کسی اور کے نہیں اپنے ہی رِستے ہوئے ناسوروں کی نمائش ہوگی، مگر دوسروں پر تنقید کرنے والے کو خود تنقیدی بھی ضرور کرنی چاہئیے۔ کیا انمول ہدایت دی ہے ہمارے رب نے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝	اے ایمان والو جمے رہو انصاف پر گواہی دو خدا لگتی، اگرچہ نقصان ہو خود تمہارا یا ماں باپ کا یا عزیز اقربا کا۔ اگر کوئی دولت مند ہے یا مفلس ہے تو اللہ تم سے بڑھکر ان کا بہی خواہ ہے پس تم انصاف کرنے میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم گول مول باتیں کروگے یا بچا جاؤگے تو اللہ تمہارے سارے کاموں سے باخبر ہے۔

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

علیؓ و معاویہؓ

معاویہؓ و علیؓ کے اختلافات میں تلواروں کی جھنکار اور عربی گھوڑوں کی ٹاپوں سے کوئی شک نہیں کہ زمین دہل گئی اور آسمان کانپ اٹھا — خدا کی زمین خدا کے نام لیواؤں کے ہاتھوں اللہ والوں کے مقدس خون سے لالہ زار بن گئی جسمیں دنیا نے بلا مبالغہ ہزارہا انسانی تڑپتی ہوئی لاشوں کو عبرت کی خاموش داستانیں سناتے ہوئے دیکھا — لیکن کیسے تھے یہ دو عظیم مخالف کہ جہاں فوجی طاقت کے آتش فشانوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے وہاں تقویٰ، خوفِ خدا اور حق کوشی نے دونوں کی زبانوں پر تالے ڈال دیئے تھے۔ یہ دونوں زبانیں کھلتی تھیں تو ان سے تنقید نکلتی تھی تحقیر و تکفیر نہیں — جلال ایمان و یقین ٹپکتا تھا ضمیر فروشی کا تعفن نہیں — یہ ہونٹ جب ہلے تو ان سے خدا اور انسان دونوں کے عظمت و وقار کی پاسبانی کرنے والی پُرسوز پکار ہی سُنائی دی — شعلے نہیں پھول جھڑے۔ پھول ہی جھڑے۔ ہاں جس وقت میدانِ جنگ میں اختلافات آگ اور خون تھوک رہے تھے اس وقت بھی ان کے قلب و زبان نے ایک دوسرے کو کوئی اخلاقی گالی نہیں دی ہاں جب وہ باہم ٹکرانے کے لئے نکلے اس وقت بھی وہ ایکدوسرے کے ایمان کی قسم کھا رہے تھے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کے افق سے اسلام میں ڈوبا ہوا جو اتحاد نکلا وہ بھی بے مثال تھا اور جو اختلاف اُبھرا وہ بھی بے نظیر!

جب معاویہؓ کی شخصیت پر خارداز بانوں کا حملہ ہوا تو اس حملے کی باڑھ پر جست کرنے والا خود علیؓ ابن ابی طالب ہی تو تھا! وہ کیسا بیتابانہ باہر نکلا اور پکار اٹھا:—

"اے لوگو! اہل شام کا اور ہمارا خدا ایک رسول ایک اور اسلام ایک ہے۔ نہ وہ ہم سے زیادہ نہ ہم ان سے کم — دونوں بالکل برابر ہیں۔ ہاں صرف قتل عثمانؓ کے سلسلے میں ہم میں اختلاف ہو گیا ہے۔"

دوسری طرف امیر معاویہؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دورانِ جنگ اور تلواروں کی چھاؤں میں یہ بات لکھ کر بھیجی:—

"اگر ہم کو اور خود آپ کو یہ خبر ہوتی کہ جنگ اس قدر طول کھینچے گی تو غالباً ہم دونوں اسکو چھیڑنا پسند نہ کرتے بہرحال ہم کو اب اس تباہ کن جنگ کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔"

پھر علیؓ کی وفات کے بعد عرب کے بہترین مدبر امیر معاویہؓ کے دربار میں ذکرِ علیؓ ابو تراب چھڑا تو دنیا نے چشم سر سے دیکھا اور گوش ہوش سے سُنا کہ معاویہؓ پر رقت طاری ہو گئی اور جذبات سے بوجھل آواز میں "توصیف ابوالحسن" پر لفظ بہ لفظ صاد کیا۔

درحقیقت اسلام کے یہ دو نمائندے اسلام کی دو مختلف تصویریں تھے۔ ایک حقیقت کے دو افسانے! ایک نے خدا کی عظمت دوسرے نے بندے کی عبودیت کی تصویر کشی کی۔ ایک اسلام کا سردار تھا تو دوسرا انتہائی خاکسار۔ دونوں اسلام کے تھے۔ شروع سے آخر تک اسلام ہی کے رہے۔ دونوں کی زندگیوں میں روح کی یکسانیت اور جسم کی نیرنگی کارفرما تھی۔

عبد المطلب کے گھرانے میں رسول عربیؐ نے انقلابی ضیافت کے

بعد چالیس سربرآوردہ قریشیوں کو جب تائیدِ حق کے لئے دل و روح کی گہرائیوں سے آواز دی تو مکہ کے اعلیٰ طبقے نے پتھریلے جمود اور بے رحمانہ سکوت سے جواب دیا۔ اس وقت رسولؐ کے ٹوٹتے ہوئے دل کو جس اکیلی آواز نے جوڑنے کی توفیق پائی وہ حضرت علیؓ تھے۔ دس پندرہ سالہ زندگی کے درمیان کھڑا ایک طفلکِ سادہ پکار اُٹھا "میں ہوں آپ کا ساتھی! — میں!!" تین بار محمدؐ نے پتھر کے پجاریوں کو آواز دی اور تینوں بار قریشیوں کی موت کی سی خاموشی کو توڑنے والی اکیلی آواز اسی لڑکے کے سینے سے بلند ہوئی "میں ہوں آپ کا ساتھی — میں! — ہاں اگرچہ میری آنکھیں دُکھتی ہیں اور میری ٹانگیں پتلی پتلی ہیں! —"

ٹھیک اسی انداز پر معاویہؓ نے حق کے قدموں پر خود کو اس وقت لا ڈالا تھا جب ان کا خود اپنا باپ ابوسفیان خون کے پیالوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر خدا اور محمدؐ کے خلاف تلواروں کو زہر میں بجھا رہا تھا۔ دونوں کا اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غیر معمولی حالات کی نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ پیامِ نشاط تھا اس وقت جب چاروں طرف سے کانٹوں کے ہار پیش کئے جا رہے تھے۔ دونوں کافر باپ کی گود سے نکلے اور اسلام کی آغوش میں آ گرے۔

جب یمن مسلمان ہوا تو وہاں عہدۂ قضا پر کام کرنے کے لئے خدا کے رسولؐ کی نظرِ انتخاب جس شخص پر پڑی وہ علیؓ تھے تو حضرت کے وفد نے جب کھلیانوں کی امانت وصول کرنے کے لئے ایک بہترین منتظم اور معتمد طلب کیا تو معاویہؓ کے نام پر رسالت کا قرعۂ فال نکلا — اگر علیؓ قرآن کے معانی کے امین تھے تو حضرت معاویہؓ قرآنی الفاظ کے خازن و محرم راز تھے — ایک نے وحی کو قرطاس و قلم تک پہنچایا تو دوسرے نے اسکے معانی کو سیکڑوں سینوں میں اُتارا۔

غزوۂ تبوک میں جب علیؓ بیمار تھے اور شاملِ جہاد نہ کئے گئے — قافلہ ان کو چھوڑ کر راہِ مولا میں کالے کوسوں کے سفر پر نکل کھڑا ہوا تو علیؓ کی غیرت جوش میں آئی اور وہ تن تنہا جلتے ہوئے ریگستان میں گھسٹتے ہوئے ورماتے ہوئے قدموں میں چھالے ڈالے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو خدا کے رسولؐ نے ان کو یوں تسلی دی اور قانونِ جہاد سے اس وقت مستثنیٰ اس طرح کیا۔

"کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہاری مثال میرے لئے ایسی ہی ہو جیسی ہارون کی مثال تھی موسیٰ کے لئے!" تو دوسری طرف معاویہؓ کو بھی اسلام نے اپنے ایک عظیم قانون سے مستثنیٰ ہونے کا شرف بخشا۔ یہ شرف کسی معمولی ہاتھ سے نہیں ملا بلکہ اس خلیفۂ رسول عمر ابن الخطابؓ کے دستِ آہنی سے ملا جو قانون کے باب میں ذرا بھی لچکنا نہ جانتا تھا۔

دمشق میں امیر معاویہؓ کی شان و شکوہ کو دیکھ کر جب حضرت عمرؓ جلال کے ساتھ گھوڑے سے کود پڑے اور سنگریزے اٹھا اٹھا کر معاویہؓ کے لباس پر مارتے ہوئے کہا "اتنی جلد — ابھی سے عجمیت کا روپ رنگ اختیار کر لیا ہے تم نے! — اتنی جلد!!" — تو معاویہؓ نے جبینِ وقار پر شکن ڈالے بغیر عرض کیا:—

"اے امیر المومنین! قسم ہے خدا کی یہ سب دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے ہے — ورنہ قباؤں کے نیچے ننگی تلواریں اس وقت بھی موجود ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ عمر ابن خطابؓ کے چہرے سے تعریف و ستائش کا نور جھلک پڑا۔ کسی نے قیصر و کسریٰ کے تدبر کا ذکر جب کبھی کیا تو جبینِ عمر ابن الخطابؓ پر شکنیں پڑ گئیں اور تیوری چڑھا فرمایا "تم لوگ معاویہؓ کے ہوتے ہوئے قیصر و کسریٰ کے تدبر کا تذکرہ کرتے ہو!" — پھر وہی عمرؓ جنھوں نے دمشق میں ایک با معاویہؓ کے شکوہ شاہانہ کا سنگریزوں سے استقبال کیا تھا آئندہ تمام عمر ان کو پیار سے کہتے رہے "معاویہؓ! اے عرب کے کسریٰ! اے عرب کے نوشیرواں — ہمارے معاویہؓ!!" — ہاں یہ الفاظ اسی کے تھے جس نے سعدؓ ابن ابی وقاص کا شاہی قصر دیکھتے دیکھتے نذرِ آتش کرا دیا تھا!

حضرت علیؓ کو ڈھونڈتے ہوئے جب ایک بار خدا کے رسولؐ مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ خاک میں اٹے ہوئے حضرت علیؓ فرشِ خاک پر میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہاں جسم انور گرد و غبار میں کندن کی طرح دمک رہا ہے۔ انتہائی چاہ اور پیار کی شدت

میں آپ نے علیؓ کو اٹھایا اور فرمایا "اجلس یا ابا تراب!۔ ۔ اٹھ بیٹھ اے خاک میں لتھڑے ہوئے! اٹھ بیٹھ!!"۔ کس قدر محبوب تھی یہ کیفیت جو علیؓ کو دہانِ رسالت سے عطا ہوئی!۔ وہ جب اس کیفیت سے پکارے جاتے خوشی سے باچھیں کھل جاتی تھیں علیؓ کی!۔

اُدھر عبد اللہؓ ابن عمرؓ کی دقیع آواز آرہی ہے "میں نے آنحضرتؐ کے بعد امیر معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو سردار نہ پایا۔" "کسی کو بھی نہیں؟" لوگ حیران ہو کر چلائے "ابو بکرؓ عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کو بھی نہیں؟"

"خدا کی قسم!" وہ پکار اٹھے "یہ لوگ امیر معاویہؓ سے کہیں افضل تھے، لیکن ـــ لیکن معاویہؓ کی شخصیت میں سرداری کی شان کہیں زیادہ تھی۔"

حضرت علیؓ تنہائیوں میں داڑھی پکڑے ہوئے اگر آخرت کے فکر میں زار و قطار رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ـــ "دور ہو جا اے بوڑھی دنیا! ـــ میں نے تجھے تین طلاقیں دیں ـــ دور ہو جا! مجھے دھوکے میں کیوں ڈالتی ہے تو! ـــ جا کسی اور کو پرچا جا کر! ـــ ہائے سفر دور دراز کا ہے اور توشہ تھوڑا! ـــ"

تو دوسری طرف حضرت شقیا الاضحیٰؓ جب ٹھیک اسی یوم حساب کی یاد یوں تازہ کرتے ہیں کہ:۔

میدان حشر میں سب سے پہلے جن تین انسانوں پر دوزخ کی لپٹ جھپٹے گی وہ تین آدمی "قاری" مجاہد اور مالدار ہوں گے جنھوں نے تلاوت کلام پاک، جہاد کشت و خون اور شہادت اور انفاق و سخا میں عمریں بِتائی ہوں گی، لیکن ان کے دل میں رضائے الٰہی کے بجائے غالب تصور دنیا کے نام و نمود کا ہو گا ـ تو یہ سنتے ہی امیر معاویہؓ پر گریہ طاری ہوا ـــ عرب کا حلیم ترین مدبر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر رو پڑا اور روتے روتے یہ حالت ہو گئی کہ لوگ ڈرے کہیں آج معاویہؓ ہلاکِ غمِ آخرت ہی نہ ہو جائیں!

حضرت علیؓ اگر حضورؐ کی بتائی ہوئی "تسبیح فاطمہؓ" اور کنیت "ابو تراب" کو سینے سے لگائے ہوئے پھرتے تھے محض اس لئے کہ ان کو سردارِ دو عالم محمد مصطفےٰؐ سے نسبت تھی تو امیر معاویہؓ نے دم توڑتے ہوئے تڑپ تڑپ کر وصیت کی کہ مجھے حضورؐ کے اس کرتے میں کفنانا جو آپ نے دستِ خاص سے مجھے عطا کیا اور میں نے اسی دن کے لئے جانِ عزیز کر کے رکھا تھا ـ اور لوگو! وہ ناخون مبارک اور مقدس بال جو میں نے اسی دن کے لئے حرزِ جاں بنائے تھے ـ انکو میری آنکھوں اور میرے منھ میں اس وقت بھر دینا جب میری لاش زمین میں اُتاری جائے ـــ مجھے یقین ہے ان کی برکت سے میرا خدا مجھ پر رحم کرے گا۔

لیکن آج وہ لوگ جن میں نہ علیؓ کی خاکساری اور نہ معاویہؓ کی سرداری ہے ـــ ہاں وہی لوگ ان دو۲ اشرف ترین مخالفوں کے مقدمۂ اختلاف کا فیصلہ کرتے ہیں ـ وہ کہتے ہیں انصاف کا حق ادا کرنے کے لئے ان میں سے ایک کے ساتھ ظلم ناگزیر ہے! ـــ یا عرب کے کسریٰ کو خطا کار قرار دو ـــ یا ابو ترابؓ پر کیچڑ اُچھالو! ـ

حالانکہ خود حضرت علی و معاویہؓ نے یوں نہیں سوچا تھا بلکہ یوں سوچا تھا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور ہمارے درمیان اختلاف ہوا و ہوس کا نہیں طرزِ فکر کا ہے ـ اسلام ہم دونوں کا محبوب اور دین و ملت کی فلاح ہم دونوں کی منزل مقصود ہے ـ

کاش ہم سب بھی یوں ہی سوچیں اور ان دو۲ عظیم الشان مسلمانوں کے حق و ناحق کا فیصلہ کرنے کی بجائے یہ غور کریں کہ ہم خود کس درجے کے مسلمان ہیں ـ

درجہ تو بڑی بات ہے ـــ سوچو کیا ہم واقعی مسلمان ہیں!

چین اور روس کی زندہ تصویریں

آج کا چین — ایک مفکر سیاح کے قلم سے چین کی سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کی حقیقت افروز روداد۔ قیمت صرف ایک روپیہ

عثمان بطور — چین میں مسلمانوں پر کیا گذری؟ ایک کہانی ایک تاریخ۔ سوا روپیہ۔

اور یانگسی بہتا رہا — ناول کے پیرائے میں چین کی ایک عبرت انگیز داستان۔ ایک روپیہ۔

آزادی کی طرف — ایک روسی افسر کی آپ بیتی جو بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزیں ہوا۔ نہایت دلچسپ اور عبرت ناک۔ تین روپے۔

پتھر کے دیوتا — چھ آپ بیتیاں۔ جاذبِ توجہ، حیرت ناک۔ ایک روپیہ۔

ادب میں ترقی پسندی — کمیونزم ادب و صحافت کی آڑ میں کیا کھیل کھیلتا ہے
قیمت ایک روپیہ

چین کے مسلمان — کروڑوں مسلمان کیا ہوئے؟ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ کمیونزم کی آدم خوری کا دستاویزی تذکرہ۔ صرف چار آنے

کمیونزم اور کسان — کمیونزم کو ایشیائی نقطۂ نظر سے سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش

جو بے شمار دستاویزی حوالوں سے مزین ہے۔ ڈھائی روپے۔

سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں — چھ ٹھوس عقلی و نفسی دلائل پر مشتمل ایک سنجیدہ اور معیاری کتاب جو دلچسپ بھی ہے اور حقیقت افروز بھی۔ صفحات ۳۲۴ قیمت صرف ایک روپیہ

آزادی کا ادب — بعض منتخب مقالوں، افسانوں اور منظومات کا مجموعہ جنھیں نیک تعمیری مقاصد کے تحت چھاپا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

ورکٹا — ایک بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز آپ بیتی جس سے روس کے جبری محنت کے ظالمانہ نظام کا بھیانک منظر سامنے آتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

لینن — انقلاب روس کے بانی لینن کی مستند سوانح۔ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ۔ ایک روپیہ۔

پانچ معلوماتی کتابیں

(۱) اقتصادی تعاون (۲) ہمارے دور کا انقلاب (۳) اقتصادی سامراج (۴) غیر جانبداری کا نظریہ (۵) موجودہ سماج میں طبقاتی نظام۔ (ہر ایک کی قیمت چار آنے)

مولانا آزادؒ کی چند مشہور کتب

غبارِ خاطر (مجموعۂ مکاتیب) — چھ روپے
نگارشاتِ آزاد (مختلف مضامین) — چھ روپے
مسلمان عورت (ترجمہ المرأۃ المسلمۃ) — چار روپے
صبحِ امید (انتخاب مضامین و تقریر) — سوا چار روپے
مضامین الہلال (انتخاب) — پونے چار روپے

مضامین البلاغ (انتخاب) — پونے چار روپے
انسانیت موت کے دروازے پر (انسانوں کی آخری گھڑیاں) — ساڑھے تین روپے
انسان کی حیاتِ صالحہ (منتخب کردہ مضامین) — پونے چار روپے
صدائے رفعت (" ") — تین روپے
قولِ فیصل (گرفتاری اور فیصلے کی تاریخ) — ڈھائی روپے
اصحابِ کہف (سورۂ کہف کی تفسیر) — ڈھائی روپے۔
حضرت یوسفؑ (سورۂ یوسفؑ کی تفسیر) — سوا دو روپے
مقالاتِ آزادؒ (مقالوں کا انتخاب) — دو روپے
مضامین آزاد (مضامین کا انتخاب) — دو روپے

عیدین۔ ڈیڑھ روپیہ ● میرا عقیدہ۔ ڈیڑھ روپیہ ● **مکتبہ تجلی۔ دیوبند یو۔پی** ● ولادت نبوی۔ مجلد دو روپے ● الفلسفہ

تجلّی کی ڈاک

شیطان کے حربے

سوال :- از ڈاکٹر سی۔ ایم عبدالسلام ڈینٹسٹ موتی بیٹھ کڈپہ (خط سے ملخصاً)

جناب مولوی...... صاحب مبلّغ دارالعلوم دیوبند نے محلہ بہادر خاں مسجد کڈپہ میں ۲۷ ستمبر ۱۹۶۲ء جمعہ کی شب میں دس بجے دینی نوع کی تقریر فرمائی اور پھر دعائے عام کرتے ہوئے آخر میں یوں فرمایا کہ یا اللہ انبیاءؑ اور صحابہؓ اور مجتہدین اور بزرگانِ دین کے صدقہ و طفیل ہماری دعا قبول فرما۔ اس طرح کے فقرے بار بار دہرائے۔

دوسرے دن خطبۂ جمعہ سے قبل آپ نے اردو خطبہ دیا تو رات کی طرح اس میں بھی صدقہ و طفیل سے دعا مانگی۔ نماز کے بعد میں نے مولوی صاحب سے استفسار کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جب کہ اللہ نے قرآن میں جہاں بھی دعا کا حکم دیا ہے بلا واسطہ دیا ہے۔ اس پر انھوں نے جواب دیا:-

"ہمارے مسلک میں صدقہ و طفیل درست ہے۔ جو اس مسلک کو پسند نہیں کرتے انھیں ان کا مسلک مبارک۔ لکم دینکم ولی دین"

اب آپ سے اور دیگر علمائے دیوبند سے سوال ہے کہ کیا یہ طریق حنفی مسلک کے مطابق ہے اور کیا یہ لکم دینکم والی آیت ایسے موقع پر برمحل کہی جاسکتی ہے۔

الجواب :-

دعا میں بزرگوں کا توسّل اور طفیل درست ہے یا نہیں یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض حضرات اسے درست سمجھتے ہیں اور بعض نہیں لیکن آپ کی بیان فرمودہ صورت حال میں سوال توسّل کے جواز اور عدم جواز کا نہیں سوال اس طرزِ عمل کا ہے جو محترم مبلّغ صاحب نے اختیار فرمایا ہے۔ وہ جب دارالعلوم کے مبلّغ کی حیثیت میں سفر کرتے ہیں تو قدرتی بات ہے کہ ان کے افکار و اعمال کو لوگ علمائے دیوبند ہی کا آئینہ سمجھیں گے ہم بانگِ دہل کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو کچھ طرز انھوں نے اختیار فرمایا علمائے دیوبند کی روش کے بالکل خلاف اور ان کے مسلک و مشرب کی انتہائی غلط ترجمانی ہے۔ دعا میں توسّل کو جائز ماننا اور بات ہے لیکن بھرے مجمعوں میں اسکی نمائش کرنا اور خواہ مخواہ ان لوگوں کو اشتعال دلانا جو اس مسلک سے اختلاف رکھتے ہوں علمائے دیوبند کا طرز ہرگز نہیں ہے۔

آپ کو شاید معلوم نہیں علمائے دیوبند کی نظر میں تو سرے سے اردو خطبۂ جمعہ ہی ناپسندیدہ ہے جس کا جی چاہے فتاویٰ دارالعلوم، فتاویٰ اشرفیہ اور دہ مختلف رسائل دیکھ لے جن میں علمائے دیوبند نے اردو خطبے کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی مصرّح فرمائی ہے۔ دیوبند کی جن مساجد میں جمعہ ہوتا ہے وہاں نہ پہلے کبھی اردو خطبہ پڑھا گیا نہ اب پڑھا جاتا ہے۔ جمعہ کی پہلی آذان کے بعد عربی خطبے سے قبل اگر کوئی اردو تقریر کی جائے تو اس کا حکم بھی خطبے ہی جیسا ہے اور علمائے دیوبند اس کی اجازت نہیں دیتے کہ عربی خطبے پر اردو خطبے کا بھی اضافہ کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ کبھی نہیں ہوا نہ آج ہوتا ہے کہ علمائے دیوبند خطبہ و تقریر کے بعد اعلانیہ ایسی دعائیں مانگیں جیسی مبلّغ موصوف نے مانگی ہیں۔

پھر لکم دینکم والی آیت کا استعمال تو ظاہر ہے انھوں نے غلط جگہ کیا ہے۔ شانِ نزول سے قطع نظر یہ بات ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ جزئیات وفروعات کا اختلاف "دین" کا اختلاف نہیں کہلاتا بلکہ علمی اصطلاح میں اسے "مذہب" کا اختلاف کہتے ہیں۔ آپ جہاں کہیں فقہاء کے اختلافی مسائل کا بیان دیکھیں گے وہاں اس طرح کے فقرے نظر آئیں گے کہ یہ احناف کا مذہب ہے یہ شوافع کا۔ یہ ہرگز نہیں دیکھیں گے کہ یہ فلاں کا دین ہے اور یہ فلاں کا۔ دین تو اُن تمام انسانوں کا ایک ہی ہے جو اسلام کے مبانی ومبادی پر ایمان رکھتے ہیں خواہ فروعی مسائل اور ذیلی عقائد وآراء میں وہ کتنے ہی مختلف ہوں۔

سب سے بڑی خرابی جو موصوف کے طرز میں پائی جاتی ہے وہ وہی ہے جو اہل بدعت کا طرۂ امتیاز ہے یعنی اپنے مخصوص عقائد کو اس انداز میں ظاہر کرنا کہ مخالفین کو چڑھ ہو اور ان پر ایسے مقامات میں عمل کرنا جہاں ان سے اختلاف رکھنے والے بھی شرکت پر مجبور ہوں اور شرکت نہ کریں تو نکّو بنیں۔ یہ در اصل شیطان کی وسیسہ کاری ہے۔ مبلغ موصوف اگر دعا بالتوسّل کو درست سمجھتے ہیں تو کس نے انھیں روکا ہے کہ اپنی پنجوقتہ نمازوں کے بعد خاموشی کے ساتھ اس پر عمل کر لیا کریں۔ جب یہ ہر باخبر جانتا ہے کہ دعا بالتوسّل اختلافی مسئلہ ہے تو سوائے شیطان کے اور کون یہ خیال موصوف کے دماغ میں القا کر سکتا ہے کہ جس مجمع عام میں وہ دین کی متفق علیہ تعلیمات کا وعظ فرما کر باہمی اخوۃ ومؤدت کا درس دے سکتے تھے وہاں اعلان وجہر کے ساتھ دعا بالتوسّل کا شوشہ چھوڑ کر انھوں نے فتنہ کھڑا کیا حالانکہ یہ انھیں بھی معلوم ہے کہ یہ دعا زیادہ سے زیادہ مباح وجائز ہو سکتی ہے واجب وفرض نہیں لہٰذا وہ اسے اپنے گوشۂ خلوت کے لئے اٹھا رکھتے اور مجمع عام میں اختلاف سے بالاتر انداز کی دعا کرتے تو یہ ہر لحاظ سے بہتر ہوتا۔

مگر یہ زمانہ فتنوں کا ہے، ہر شخص فرعونِ بے سامان بنا ہوا ہے۔ تشدد، افراط وتفریط، کج بینی وغلط اندیشی اور خود پرستی کی مارا مار ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔

حاصل جواب یہ ہے کہ صدقہ وطفیل کے ساتھ دعا کرنے کو بعض علمائے دیوبند جائز ضرور سمجھتے ہیں مگر یہ ہرگز پسند نہیں کرتے کہ اپنے اس مسلک کی اجتماع عام میں نمائش کریں۔ پھر آپ نے اپنے خط کے ایک حصہ میں خود ہی لکھا ہے کہ میں نے مولانا طیب صاحب اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے متعدد مواعظ سُنے ہیں مگر کبھی انھیں اس طرح دعا کرتے نہیں دیکھا تو پھر یہ سمجھنے میں کیا دقّت ہے کہ مبلغ موصوف نے جو کچھ کیا وہ ان کا ذاتی فعل ہے علمائے دیوبند کے اسوۂ وطریق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دار الحرب وغیرہ کا مسئلہ

سوال ۲۲:۔ از سید محمد سعید۔ امروہہ۔

"عقود فاسدہ" کی تسلی بخش تشریح وتوضیح فرمائیے۔ میرے ایک قابل احترام بزرگ کا خیال ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم چونکہ کافر حربی ہیں، لہٰذا اُن سے مکر وفریب مباح ہے اور اُن کے ساتھ ایسی بیوع جائز ہیں جو بین المسلمین حرام ہیں۔ اسی اصول پر اُن کو خریدی ہوئی چیزوں کے بدلے کھوٹے سکّے دیئے جا سکتے ہیں۔ میرے خیال ناقص میں غیر مسلمین کے ساتھ معاملات میں اور بھی زیادہ احتیاط ضروری ہے تاکہ اُن کے دلوں پر مسلمانوں کے گفتار وکردار کے اچھے نقوش ثبت ہوں۔ تالیف قلوب کے لئے سب سے پہلی چیز تو یہی ہے ناکہ مخالفین معاملات میں ہماری راست روی کے امتیاز کو تسلیم کریں۔

الجواب:۔

معلوم ہوتا ہے ان بزرگ نے دار الحرب، دار الاسلام اور کافر حربی وغیرہ کے اصطلاحی الفاظ ادھر اُدھر سے سُن لئے ہیں یا ناقص طور پر پڑھ لئے ہیں ورنہ اگر باقاعدہ طور پر ان الفاظ کے مفاہیم اور ان سے متعلق شروط وقیود اور احکام واوامر کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو ایسی رائے کبھی نہ رکھتے۔ لمبی بحث کو تو جانے دیجئے ایک یہی شرط متذکرہ خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ حربی کافروں سے بعض عقود فاسدہ کا جواز فقہاء کے نزدیک صرف اُن مسلمانوں کے لئے ہو سکتا ہے جو دار الحرب میں مستقلاً سکونت پذیر نہ ہوں، بلکہ محض عارضی حیثیت میں وہاں آئے ہوں۔ ایسا قول تو کسی مجتہد کا

ہماری نظر سے نہیں گذرا کہ جس دار الحرب میں مسلمان اس کے شہری کی حیثیت سے مستقلاً رہائش رکھتے ہوں وہاں بھی حربی کفار سے عقود فاسدہ ان کے لئے جائز ہو جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قصداً کھوٹا سکہ دینا فریب کاری ہے عقدِ فاسد نہیں۔ اس طرح جو بیع کی جائے گی وہ نہ باطل ہوگی نہ فاسد بلکہ خریدنے والا گنہگار ہوگا اور فروخت کرنے والے کو جب بھی یہ آگاہی ہو جائے کہ اسے کھوٹا سکہ دیا گیا ہے وہ اس کے بدلے کھرا طلب کرنے کا حقدار ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ عقود فاسدہ کو فقہاء نے ربوا میں شامل کیا ہے اور ربوا کا معاملہ اصح اقوال کے مطابق مسلمان اور حربی کافر کے مابین بھی جائز نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جو مسلمان کہیں باہر سے دار الحرب میں باقاعدہ داخل ہو۔ باقاعدہ سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت مستامن یعنی امن و تحفظ کی آئینی ضمانت کے ساتھ جیسے کہ آج کل پاسپورٹ وغیرہ کے ذریعہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جایا جاتا ہے تو مستامن مسلمان کے لئے کفار سے دھوکا کرنا یا ان کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔ ایسی حرکت کو فقہاء نے غدر سے تعبیر کیا ہے۔

پانچویں بات یہ کہ ہندوستان کا دار الحرب ہونا تو اس وقت بھی مختلف فیہ تھا جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی اب خود ہندوستانیوں کی حکومت ہو جانے اور ہر ہندوستانی شہری کو بلالحاظ مذہب اس میں شریک مان لئے جانے کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دار الحرب ہے۔ دستور کو نظر انداز کر کے اگر عملی حقائق کی بنیاد پر کوئی فقیہ اسے دار الحرب ہی قرار دینے پر مصر ہو تو اگرچہ یہ اصرار نہایت محلِ نظر ہے لیکن اسے درست ہی فرض کر لینے کی صورت میں اس فقیہ پر لازم آجائیگا کہ تمام ان احکام و ہدایات کو قبول کرے جو دار الحرب کے بارے میں ہیں نہ یہ کہ ایک دو حکم تو منتخب کرلے اور باقی کو نظر انداز کردے۔ متعدد احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ یہاں شادی بیاہ نہ کرے، جائدادیں نہ بنائے اور یہاں سے رخصت ہونے کی تیاری فرمائے۔

حاصلِ جواب یہ ہے کہ ان بزرگوار کو اپنے خیال پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور اگر وہ اس پر آمادہ نہیں تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ یا کوئی اور مسلمان ان کی تقلید کر کے اپنے دین دنیا خراب نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مشکلاتِ زمانہ کے مسائل

سوال ۳۱ :۔ از صادق علی صادق۔ بستی۔ فاضل دیوبند

آج کل گورنمنٹ کے زیرِ تعاون جہاں اور بہت سے کاروباری سلسلے عوام و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کئے گئے ہیں ایک سلسلہ "پاور لوم سوسائٹی" کا بھی ہے۔ یہ پاور لوم بغیر سوسائٹی کے ذاتی طور پر چلنے کا مجاز نہیں۔ جو شخص اسمیں آنا چاہتا ہے وہ ایک معیّنہ رقم ایک یا کئی حصّے کی جمع کر کے سوسائٹی کا ممبر بن جاتا ہے۔ ممبران کی تعداد کم از کم بیس ۲۰ پچیس ۲۵ ہوتی ہے فیس ممبری کا روپیہ سوسائٹی کے سرپنچ کے پاس جمع رہتا ہے۔ گورنمنٹ ممبران سوسائٹی کو ان کے ذاتی کاروبار "ہینڈلوم" پر بطور تہا ون فی سیکڑہ ۶ ½ روپیہ دیتی ہے جسے "رویٹ" کہا جاتا ہے یہ روپیہ سرپنچ کے ذریعہ بینک میں جمع ہو جاتا ہے۔ بایں وجہ سرپنچ جھوٹی قسمیں کھا کر رویٹ کا روپیہ اصل سے زائد لکھواتا ہے۔ رویٹ پر "قسم" بائیلاز کی ایک دفعہ ہے اس کے بعد رویٹ کے روپے کا آٹھ گنا بینک سوسائٹی کو قرض دیتا ہے جس کا سود سوسائٹی بینک کو دیتی ہے اسی روپے کا پاور لوم تیار ہوتا ہے۔ کپڑے کی فروختگی کا نفع ممبران پر تقسیم ہوتا ہے۔

اب جواب طلب امور یہ ہیں :۔

(۱) کیا اس صورت سود کی بھی شرعاً ممانعت ہے؟

(۲) کیا یہی وہ سود ہے جس کے متعلق ارشاد ہے الربا سبعون جزءًا ایسرھا ان ینکح الرجل امہٗ۔

(۳) کیا یہی وہ دور ہے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے زمان یاکلون فیہ الربا قیل لہٗ الناس کلھم قال من لم یاکلہ نالہٗ من غبارہ۔

(۴) کیا اس قسم کے کاروبار داران بلا نوش پر ذیل کی حدیث

صادق آتی ہے لعن اللہ آکل الربا وموکلہ وشاھدیہ وکاتبہ۔

(۵) کیا اس قسم کی سوسائٹیوں میں ممبر بن کر کام کرنا یا اسکے کسی شعبے میں ملازمت کرنا جائز ہے؟ اگر نہیں تو کسی مسلمان کی کسی ہندو سود خور کے یہاں بھی ملازمت جائز نہ ہونی چاہئے۔

(۶) کیا صرف قومی مفاد کے لئے بھی ایسی فیکٹریاں نہیں چلائی جاسکتیں جب کہ یہ بھی خطرہ ہو کہ آئندہ سوسائٹی میں نہ شامل ہونے والوں کو ذاتی کاروبار میں بھی مختلف مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ مثلاً سوت نہ ملنا یا گراں ملنا وغیرہ۔

(۷) کیا مسلم قومی مفاد کے لئے آج کی طاغوتی حکومت سے جھوٹی قسمیں کھاکر "ربیٹ" کا روپیہ نکالنا جائز نہیں ہے؟

(۸) کتابوں میں پڑھا ہے مصلحتاً جھوٹ بولنا جائز ہے۔ آج جب کہ رشوت، جھوٹ، سود، چالبازی کے بغیر مادی ترقی ناممکن ہی ہو رہی ہے پھر بھی مذکورہ باتیں جائز نہیں۔ آخر آج سے بُرا وقت کونسا آئے گا جس میں مصلحتاً جھوٹ بولنا جائز ہو۔

(۹) ایک وقت تھا کہ اس میں "انگریزی پڑھنا حرام ہے" کا فتویٰ دیا گیا تھا اور آج ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وقت کی رفتار فتویٰ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے تو آج اس نازک وقت میں جب کہ ایک مسلمان روحانی ارتقاء کے ساتھ مادی ارتقاء بھی حاصل کرنا چاہ رہا ہو اور مادی ارتقاء بغیر رشوت جھوٹ سود کے نہیں ہوسکتا ہے کیا ایسے وقت میں بھی مصلحتاً مذکورہ چیزوں کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا اگر نہیں تو مسلمان کے لئے مادی ترقی کی کیا صورت ہے۔ آج کل تجارتی کاروبار میں اس قسم کی بہت سی چیزیں اسلام سے ٹکرا رہی ہیں تو اس حالت میں یا مسلمان اسلام سے دست بردار ہو جائے (نعوذ باللہ) یا تجارت وغیرہ ترک کردے یا بہت معمولی تجارت کرے لیکن اس میں بھی جھوٹ اور چالبازی کے بغیر چارہ نہیں میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہوں اور خود ایک چھوٹی تجارت کر رہا ہوں اگر سولہ قسم کی باتیں کروں تو مال بھی فروخت ہو جائے اور نفع بھی حاصل ہو اور اگر دینی نقطۂ نگاہ سے چلوں تو بدھو بنا بیٹھا رہنا پڑے اس کا کوئی واضح حل پیش فرمائیے۔

(۱۰) مذکورہ بالا سوسائٹی کے خیرات فنڈ و تعلیم فنڈ کا روپیہ یا کوئی سامان مسجد یا مدرسے میں لگانا جائز ہے؟

(۱۱) ایک فتوے میں ہے "بدون اشد مجبوری کے سودی قرض لینے کی بھی اجازت نہیں ہے" آخر اشد مجبوری کیا ہو سکتی ہے۔ میں ذاتی تجارت کرنا چاہتا ہوں یا ایک سوسائٹی کے ذریعہ پوری قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں لیکن نہ میرے پاس روپیہ ہے اور نہ قوم کے پاس۔ زندگی غربت کی وجہ سے تنگ ہو رہی ہے۔ حکومت قرض دیتی ہے سود پر۔ بینک قرض دیتا ہے سود پر۔ بلاک قرض دیتا ہے سود پر۔ ایک ہندو مالدار قرض دیتا ہے سود پر۔ مسلمان یا تو اتنا مالدار نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ بلا نفع کہاں تک قرض دے گا۔ ان صورتوں میں ہوگی قرض لینا کیا اشد مجبوری نہیں ہے؟ بہرحال جو شخص جس بناء پر بھی قرض لیتا ہے وہ اسی کو "اشد مجبوری" تصور کرتا ہے یوں کا کسی کو شوق نہیں ہوتا۔ ہمارے علمائے کرام کو کیا ان مسائل اور ان کے حل پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ان کیلئے فتوے دینا آسان ہے!

مجھے یہ الجھن بہت دنوں سے ہے۔ مجبوراً آپ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔ آپ ان نمبران پر ایسی روشنی ڈالیں کہ یہ باتیں واضح ہو جائیں اور رفتار زمانہ پر بھی اجمالی روشنی پڑ جائے اور اس دورِ ناہنجار میں ایک مسلمان دین پر چلتے ہوئے کس طرح مادی ترقی کرتے ہوئے سکون کی زندگی گذارے۔ آج اکثریت اسی میں مبتلا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں اس لئے ان اسلام سے ٹکرانے والی چیزوں کا کوئی واضح حل پیش کرنا ہمارا اور آپ کا اہم فریضہ ہے۔

الجواب:-

عدم گنجائش کی بناء پر طولانی سوالات کو ہم عموماً رد کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے سوال کو اس لئے شائع کیا گیا کہ اس کا تعلق اُن معاملات و خیالات سے ہے جن میں آج ہمارے ہندوستانی مسلمان کثرت سے مبتلا ہیں اور جب آپ جیسا فاضل دیوبند بھی ان کی شکن در شکن زلف کو سلجھا نہیں پایا ہے تو عوام کا تو کہنا ہی

حسب گنجائش علی الترتیب جواب حاضر ہے:۔

(۱) معلوم نہیں فاضل دیوبند ہونے کے باوجود آپ کو اس کھلے سودی معاملہ کی حرمت میں شک کیوں ہوا۔ کیا آپ بھول گئے کہ حرمتِ سود کی شدت کے باعث اُن معاملات کو بھی فاسد قرار دیا گیا ہے جن میں صریحاً سود نہ ہو مگر سود کا قوی اشتباہ ہو۔ متذکرہ صورتِ حال میں تو سود صراحتہً موجود ہے پھر ریب و شک کیسا؟

نمبر ۲ و ۳ و ۴ کا جواب میری طرف سے اثبات میں ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نمبر۳ میں ذکر کی ہوئی حدیث کس صفائی سے آجکل کے زمانے پر صادق آرہی ہے۔ ہم براہ راست سودی لین دین سے پرہیز کریں لیکن پوری دنیا کے معاشی نظام پر بینکنگ کی گرفت اتنی ہمہ گیر ہے کہ بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جنھیں کوئی ایسا پیسہ میسر آسکے جو کسی نہ کسی مرحلے میں سود کی نجاست سے ملوّث نہ ہو چکا ہو۔

(۵) میرے نزدیک کسی ایسے ادارے کی ممبری یا ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سودی لین دین کو فیصلہ کن اور بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ سود خوار ہندو ہو یا مسلمان کون کہتا ہے کہ اس کی ملازمت جائز ہے۔ ہاں یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ یہ ملازمت سودی کاروبار سے متعلق ہے یا اس سے اس کا ربط نہیں۔ اگر متعلق ہے تو جواز بالکل نہیں۔ غیر متعلق ہے تو جائز ہے مثلاً ایک سودی کاروبار کرنے والا آپ کو اپنا لڑکا پڑھانے پر ٹیوٹر رکھے یا اپنے ہوٹل میں منیجری کا عہدہ عنایت فرمائے تو اس میں حرمت نہ ہوگی۔

(۶) "قومی مفاد" کی اصطلاح بڑی مبہم ہے اور آج کل اسے نوع بہ نوع مفاہیم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عاجز صرف اتنا جانتا ہے کہ ہر قسم کا مفاد اُخروی مفاد کے تابع ہے اگر کسی کے نزدیک سودی معاملات میں ملوّث ہوئے بغیر "قومی مفاد" کا حصول محال یا دشوار ہے تو وہ اپنے دلائل کا جائزہ لیکر خود فیصلہ کرلے کہ قیامت کے دن اللہ کو بھی مطمئن کرسکے گا یا نہیں۔ شریعت تو حالتِ اضطرار کے سوا حرام چیزوں کا اذن نہیں دیتی اور حالت اضطرار اس قسم کے خطروں اور اندیشوں کا نام نہیں ہے جیسے آپ نے پیش فرمائے۔ آخری درجے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا گروہ نے اپنے رزق کو سودی لین دین پر مشتمل حالات ہی میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور کوئی دوسری جائز راہ اسے کسب معاش کی نظر نہیں آتی تو وہ اسے اختیار کئے رکھے مگر گناہ سمجھتے ہوئے۔ یہ کوشش درست نہ ہوگی کہ چونکہ وہ اپنی دانست میں اس فاسد راہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہے، لہٰذا شریعت کو بھی اس کا جواز پیدا کرنا چاہئے۔

(۷) حکومت طاغوتی ہے تو اسے بدلنے کی جدوجہد کیجئے یہ کہاں کی شرافت و انسانیت ہوگی کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ ناجائز رقم حاصل کرکے خود بھی طاغوت کا جزو بن جایئے۔ اسلام نے مسلمان کو ہمہ گیر دیانت سکھائی ہے۔ یہ نہیں سکھایا کہ مسلمانوں سے تو دیانت برتو اور غیر مسلموں کو دھوکا دو۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ آپ کیا بھول گئے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّے سے ہجرت کرتے وقت جن امانتوں کی واپسی کا انتظام فرمایا تھا وہ اہلِ اسلام کی نہیں تھیں بلکہ کافروں ہی کی تھیں اور ان کافروں کی تھیں جنھوں نے حضورؐ سے دشمنی کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیانت کا برتاؤ تو مسلمانوں کو اُن کافروں سے بھی کرنا چاہئے جو دشمنی پر آمادہ ہوں۔ پھر یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ اس حکومت کو فریب دیا جائے جس کے تحت ہمیں قانونی تحفظات حاصل ہیں یا کسی ایسے ادارے کو دیا جائے جس سے ہم نے باقاعدہ معاملہ کیا ہے۔

(۸) مصلحت کی بناء پر جھوٹ بولنے کا جواز کسی مستند کتاب میں اس توسع اور اطلاق کے ساتھ ہرگز نہیں پایا جاتا جسے آپ اختیار فرما رہے ہیں۔ اس جواز کے لئے جس قسم اور درجے کی مصالح درکار ہیں انھیں بھی ان کتابوں میں بیان کردیا گیا ہے۔ اگر قاعدہ یہی طے پاجائے کہ ہر مصلحت کے لئے دروغ گوئی جائز ہے پھر تو سچ کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا۔ آخر کون دروغگو ہے جو اپنے جھوٹ کی پشت پر کوئی نہ کوئی مصلحت و منفعت نہیں رکھتا۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اول تو شریعت نے بہت خاص حالتوں میں صریح جھوٹ کی نہیں بلکہ تعریض کی اجازت دی ہے۔ تعریض اسے کہتے ہیں کہ آدمی ایسے الفاظ استعمال کرے جو اصلاً خلافِ واقعہ نہ ہوں مگر سننے والا ان سے خلافِ واقعہ ہی مطلب اخذ کرے۔ اس سے ایک منزل آگے بڑھکر بعض صورتوں میں کذبِ صریح کی بھی اجازت ہے ـــ نہ صرف اجازت بلکہ وجوب تک ہے۔ لیکن ایسے تمام قانونی مراحل ہماری اپنی صوابدید اور خوش فہمی پر طے نہیں ہو جاتے، بلکہ ان کا انحصار اُن مصالح پر ہے جو نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہوں، اور اللہ یا رسولؐ نے صراحت کے ساتھ انھیں مؤثر مانا ہو۔

مثلاً ایک جوان عورت افتاں و خیزاں آپ کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور التجا کرتی ہے کہ مجھے بچایئے غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد واقعتہً کچھ غنڈے آپ کے دروازے پر پہنچتے ہیں جنھوں نے اس عورت کو آپ کے گھر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا مگر ان کا اندازہ ہے کہ شاید وہ اسی گھر میں داخل ہوئی ہو۔ آواز دے کر وہ آپ کو دروازے پر بلاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی عورت آپ کے یہاں آئی ہے؟

آپ اکیلے ہیں اور غنڈے کئی۔ آپ کے بس کی بات نہیں کہ طاقت کے ذریعہ انھیں ظلم و بدکاری سے باز رکھ سکیں۔ یہ بھی توقع نہیں کہ آس پاس کے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلالیں۔ غنڈے انتہائی سرکشی اور درندگی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

اس وقت تعریض یا دروغگوئی آپ کے لئے صرف جائز ہی نہیں واجب بھی ہے۔

کیونکہ مظلوم کی صیانت اور عصمتوں کا تحفظ واضح ترین اور منصوص مصالحِ شرعیہ میں سے ہیں۔ سچ بولا جائیگا تو ایک مظلومہ کی عصمت بلکہ پوری زندگی برباد ہو جانیکا شدید اندیشہ ہے۔ اب تعریض تو یہ ہے کہ آپ ان سے کہدیں نہیں صاحب یہاں تو کوئی عورت وورت نہیں ہے۔

تعریض یہ اس لئے ہے کہ لفظ "یہاں" کا مصداق وہ محدود جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں آپ اور غنڈے کھڑے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں کوئی عورت نہیں ہے لہٰذا اصلاً آپ کا کلام مطابقِ واقعہ ہوا لیکن مقصود آپ کا یہی باور کرانا ہے کہ عورت آپ کے یہاں نہیں آئی۔ یہ خلافِ واقعہ ہے لہٰذا اسے تعریض کہیں گے۔

اور آپ کی ذہانت اس وقت تعریض کی راہ نکالنے سے قاصر ہے یا تعریض سے کام چلنے کی توقع نہیں ہے تو برملا جھوٹ بولنا بھی آپ کے لئے نہ صرف جائز ہوگا بلکہ ضروری قرار پائیگا

اسی مثال پر قیاس کر لیجئے کہ جھوٹ کا جواز یا وجوب کن مصالح کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے۔ آپ کے طرزِ فکر میں دو خامیاں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ آپ نے ایک بالکل غلط مفروضہ طے کر لیا کہ آجکل بغیر فریب کاری، رشوت ستانی اور دروغ بافی کے مادی ترقی محال ہے حالانکہ تجربہ و مشاہدہ اس کی تردید کرتا ہے۔ بے ایمان تاجروں کا کام زیادہ دنوں نہیں چلتا لیکن ایماندار پھلتے پھولتے ہیں ان کی ساکھ بندھ جاتی ہے۔ ان کے پاس دُور دُور سے خریدار آتے ہیں۔ امریکہ، یورپ، جرمنی، جاپان وغیرہ جو اس وقت دنیا میں ملک التجار بنے بیٹھے ہیں ان کی کسی بھی چھوٹی یا بڑی فرم کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے نہایت خوش معاملہ، دیانتدار اور راست گو پائیں گے۔ ان کے یہاں تو بطورِ اصول کے یہ طے کر لیا گیا ہے کہ ایمانداری بہترین پالیسی ہے۔ [1]

یہ جو عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ ایمانداری سے آجکل کہاں کام چلتا ہے یہ ایک فکری مغالطے کے سوا کچھ نہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ اکثر لوگ ایمانداری برتنے کے باوجود کاروبار میں فیل ہو جاتے ہیں تو وہ اس کا الزام "ایمانداری" کو دیتے ہیں اور بعض بے ایمان لوگوں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر یہ یقین ان کے دماغ میں گھر کر جاتا ہے کہ کامیابی کا اصل ذریعہ تو آج کل بے ایمانی ہی ہے۔ حالانکہ یہ محض فریبِ نظر ہے۔ وہ خود جو فیل ہوتے اس کا سبب بعض حالات میں ان کا پھوہڑ پن، تساہل اور کم عقلی ہوتا ہے اور بعض حالات میں کچھ اور عوارض۔ "ایمانداری" کوئی جادو کی چھڑی تو ہے نہیں کہ کام چلنے کے دیگر ناگزیر وجوہ ہوں یا نہ ہوں

[1] HONESTY IS THE BEST POLICY-

مگر خالی ایمانداری وارے کے نیارے کر دے۔ اسی طرح جو بے ایمان لوگ پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں ان کے عروج کا مصدر و مبنیٰ بے ایمانی نہیں ہوتی بلکہ ان کی بعض بہتر صلاحیتیں ہوتی ہیں یا پھر چانس اور حسن اتفاق۔

دوسری خامی آپ کے طرزِ فکر کی یہ ہے کہ "مادّی ترقی" کے مبہم اور لامحدود مقصد کو آپ نے عین مصلحت شرعیہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اس مقصد کو شریعت نے حلال وسائل و ذرائع کے ساتھ محدود کر دیا ہے نیز قومی مفاد اور مادّی ترقی نہایت گمراہ کن اصطلاحیں ہیں۔ کم سے کم انھیں آج کل تو گمراہ کن ہی مفاہیم میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ دین کا معاملہ تو صاف صاف یہ ہے کہ حالتِ اضطرار میں تو نہایت محدود پیمانے پر حرام شے حلال ہو جاتی ہے، لیکن دین نے مجھے یا آپ کو قومی مفاد اور مادّی ترقی کا ٹھیکیدار بنا کر نہیں بھیجا کہ ہم حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر ان مبہم اصطلاحوں کی غیر معین منزل کی طرف قدم بڑھاتے چلے جائیں جتنی کچھ ترقی اور قومی خدمت حلال ذرائع سے ممکن ہے ان سے دین منع نہیں کرتا لیکن ایسی ترقی اور خدمت کو وہ گمراہی قرار دیتا ہے جس کے لئے حرام کا ارتکاب کرنا پڑے۔

(۹) بے شک فتوے میں زمانے کا لحاظ بھی ہوتا ہے مگر جائز حدود کے اندر۔ کسی بھی زبان کا پڑھنا اسلام میں مباح ہے لہٰذا کوئی حرج نہیں اگر علماء کسی خاص زمانے میں اس مباح کو دین ہی کی خاطر ممنوع قرار دیدیں اور پھر جب دینی مصلحت اس ممانعت کو اٹھا لینے میں ہو تو بلا تکلف اٹھا لیں۔ یہ ایک انتظامی نوع کا معاملہ ہے لیکن رشوت ستانی، جھوٹ اور سود وغیرہ تو بدترین محرمات شرعیہ ہیں انھیں حلال کرنے کا حق علماء کو کہاں سے مل سکتا ہے۔

آپ نے اپنی مثال دی "سولہ" قسم کی باتوں سے آپ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ خریدار کو بڑھا چڑھا کر قیمت بتاتے ہیں۔ پھر وہ کم کراتا ہے تو کچھ کم کر دیتے ہیں مگر اتنی نہیں جتنی وہ کم کرا رہا ہے اس کا اصرار جاری رہتا ہے تو آخر کار آپ اور کچھ کم کر دیتے ہیں۔

مگر یہ صورت تو حرام نہیں نہ یہ جھوٹ کے دائرے میں آتی ہے۔ ہاں اگر آپ غلط بیانی کرتے ہوں کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی ہے یا چیز کی حیثیت غلط طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوں تو یہ سب بددیانتی ہے اس سے فوراً توبہ کیجئے۔

رہا یہ کہنا کہ "اگر دینی نقطۂ نگاہ سے چلوں تو بدھو بنا بیٹھا رہوں" تو میرے بھائی معلوم ہوتا ہے آپ نے پڑھا لکھا سب ضائع کر دیا ــــ دین صنعت و تجارت میں جن پہلوؤں پر زور دیتا ہے وہ تو اتنے مفید، بارآور اور کارگر ہیں کہ غیر مسلم تجّار بھی انھیں اختیار کر کے مالا مال ہو رہے ہیں۔ دین آخر اس کے سوا کیا سکھاتا ہے کہ کاروبار میں دھوکا مت دو جھوٹ مت بولو۔ حسن معاملت پر کاربند رہو۔ صفائی ستھرائی کا لحاظ رکھو۔ اخلاق و تواضع اختیار کرو۔ پورا تولو۔ پورا ناپو۔ یہ ساری خوبیاں آپ ہر اُس ملکی و غیر ملکی فرم میں پائیں گے جو آج دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ کسی بھی شہر کی ایک معمولی سی دکان کو دیکھ لیجئے۔ اگر وہ خوب چل رہی ہو تو لازماً اس کے پیچھے مذکورہ سب یا ان میں کی اکثر خوبیاں کارفرما ہوں گی۔ تجارت چھوٹی ہو یا بڑی، دین کی دی ہوئی تعلیمات اس کے فروغ ہی کا باعث ہوتی ہیں نہ کہ تباہی کا۔

ہاں یہ ضرور آپ کہہ سکتے ہیں کہ تمام غیر مسلم فرموں اور جملہ انواع کے کاروبار میں سود کا عنصر تو بہرحال شامل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سود کا عنصر شامل ہونا یہ معنی ہرگز نہیں رکھتا کہ فروغ و ترقی کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور افریقہ کے کتنے ہی مسلمان تاجروں کو تو ہم جانتے ہیں کہ جنھوں نے سودی لین دین اور عقودِ فاسدہ سے یکسر پرہیز رکھا مگر ان کی تجارت خوب خوب چلی اور بفضلہٖ تعالیٰ وہ کافی دولتمند ہیں۔

(۱۰) بعض علماء تاویل کے ذریعہ اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ محلِ نظر ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

(۱۱) اشد مجبوری میں خنزیر اور خمر بھی حلال ہو جاتے ہیں تو سودی قرض کیوں نہ حلال ہوگا لیکن "اشد مجبوری" کہتے کسے ہیں اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہر شخص کو نہیں دیا گیا۔ آپ نے پڑھا ہوگا امریکہ و یورپ میں سیکڑوں عورتوں کی خودکشی کا واحد سبب

یہ دریافت ہوا کہ انھیں اپنے میک اپ کی چیزیں مہیا کرنے کے
لائق رقم دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ گویا ان کی نظر میں غازے
اور لپ اسٹک جیسی اشیاء کا بروقت مقدارِ مطلوبہ میں مہیا نہ ہو سکنا
ہی اتنی زبردست مجبوری تھی کہ اس سے بے بس ہو کر انھوں نے
زندگی ہی ختم کر لی۔ ایک عیش پسند آدمی تو اسے بھی اشد مجبوری
ہی قرار دے گا کہ ناشتے میں اسے انڈے اور پراٹھے دستیاب
نہیں ہو رہے ہیں۔ اس طرح ہر شخص اپنے اپنے احوال کے مطابق
جس چیز کو چاہے اشد مجبوری قرار دے سکتا ہے۔

مگر شریعت نے اپنے قوانین کو اتنا پھسپھسا نہیں رہنے
دیا ہے کہ جس کا جی چاہے انھیں کھلونا بنائے۔ اشد مجبوری کی
تشخیص اسی پیمانے پر ہوگی جو قرآن وسنت سے ملا ہے اور یہ
پیمانہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ جب آدمی کی جان یا آبرو پر
بنی ہو اس وقت وہ غیرَ باغٍ وّلاَ عادٍ کی شرط کے ساتھ
بادلِ ناخواستہ حرام سے فائدہ اٹھالے۔ آبرو کی تعریف
بھی شریعت ہی سے لینی ہوگی یہ نہیں کہ سوسائٹی نے عزت آبرو
کے جو خود ساختہ معیار بنا لئے ہیں انھیں جج مان لیا جائے۔

آپ تجارت کرنا چاہتے ہیں تو حلال راہوں کا انتخاب
کیجئے۔ بالکل غلط ہے کہ آج کل حلال راہیں یکسر مسدود ہو چکی
ہیں۔ فرض کیجئے کوئی بڑی تجارت آپ کے لئے حلال طریقے
پر ممکن نہیں رہی ہے تو چھوٹی کیجئے۔ پوری قوم کو فائدہ
پہنچانا آپ کے ذمے نہیں۔ دما انت بمصیطر۔ جائز حدود
میں جتنا بھی فائدہ آپ خود اٹھا سکیں یا قوم کو پہنچا سکیں
دین اس کی تحسین کرتا ہے مگر جائز حدوں میں رہ کر یہ ممکن نہیں
تو صرف اپنے اور اہل وعیال کے آذوقۂ حیات پر بس کیجئے۔
محنت مزدوری، تانگہ رکھنا چلانا، جوتے گانٹھنا اس مادی
ترقی اور شاندار کاروبار سے بدرجہا بہتر ہے جس کی بنیاد
حرام پر ہو۔

جواب پورا ہوا۔ اب میں چند نکات کی طرف آپ کو
خصوصی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے ـــ اور اسے
کبھی نہ بھولئے کہ ہم میں اور غیر مسلموں میں ایک بنیادی فرق
ہے۔ یہ کہ ہمارے لئے مرنے کے بعد بہت کچھ ہے اور غیر مسلموں کے
لئے کچھ بھی نہیں۔ اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے ـــ اور ہونا
چاہئے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ حیاتِ دنیا ہی میں ڈھیل
دے اور ہمیں سخت پکڑے۔ کافر سود، قمار وغیرہ سے پھلے
پھولیں مگر ہمیں یہ محرمات ہرگز راس نہ آنے چاہئیں۔ اگر
کسی مسلمان کو بظاہر یہ راس آگئے ہیں تو سمجھئے کہ وہ حد درجہ
بدنصیب ہے۔ بدنصیب اس معنی میں کہ اللہ جسے حرام خوری میں
ڈھیل دے اس کی عاقبت بڑے خطرے میں ہے۔ یہ تو مسلمانوں
کا معاملہ تھا۔ رہے کفار تو اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کفار کی
مادی ترقی سود اور قمار اور بے ایمانی وغیرہ کی وجہ سے ہے تو
گو کہ بالکل غلط سمجھتا ہے لیکن اسے مان ہی لیں تب بھی اس
فرق کو بہر حال ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس قلیل سی زندگی کے عیش و
آرام کے بعد انھیں آخرت کا طویل والیم عذاب بھگتنا ہے۔
اس کے برخلاف جو مسلمان باوجود سعی وجہد کے عیش دنیا
حاصل نہ کر سکے انھیں آخرت کی بے شمار نعمتیں میسر آتی ہیں۔
یہ سودا آپ کی نگاہ میں مہنگا ہو تو ہو ہماری نگاہ میں تو مہنگا
نہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال وانحطاط
کی حقیقی علت یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ پیٹ بھر کر حرام خوری،
بے ایمانی، عیاری اور سود کاری نہ کر سکے بلکہ یہ ہے کہ انھوں
نے اسلام پر کماحقہٗ عمل چھوڑ دیا۔ اپنی حقیقت وحیثیت
بھلا دی۔ آپ نے اللہ کی یہ وارننگ پڑھی ہوگی لَا تَکُوْنُوْا
کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ۔ جو لوگ
اللہ کو بھلا دیتے ہیں اللہ ان کے فکر وبصیرت پر ایسا ذہول و
سُکر طاری کر دیتا ہے کہ وہ خود اپنی بھی حیثیت وحقیقت فراموش
کر بیٹھتے ہیں۔ یہی حال ہمارا ہوا۔

اگر ہمیں عروج وترقی کی طرف جانا ہے تو اللہ کو یاد
کرنا ہوگا اور اللہ کو یاد کرنا یہ ہے کہ شھداء علی الناس
کا جو منصب اس نے ہمیں عطا کیا تھا اس کے جملہ حقوق ادا
کریں۔ دنیا کی رَو میں بہہ گئے تو ہم میں اور کافروں میں کیا
فرق رہا۔ اس وقت کفر وطغیان کی تاریکی جتنی زیادہ ہے اتنی ہی

زیادہ ضرورت ایمان و دیانت کے اُجالے کی ہے۔ آج اگر ہم اپنے عمل سے یہ اُجالا دنیا کو دے سکیں تو ہماری عزت و عظمت کے دروازے کھل جائیں گے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ علماء کی کوتاہیاں اور تن آسانیاں اپنی جگہ لاکھ قابلِ اعتراض سہی لیکن وہ اگر وہ کام انجام دینے لگیں جس کی طرف آپ کا اشارہ ہے یعنی محرمات کو حلال کرنا اور قوم کو مادّی ترقی کی راہ میں آزادانہ دوڑانا تو انکے چہروں اور دلوں کی سیاہی موجودہ حالت سے بھی کہیں زیادہ گہری ہو جائے گی۔ ان کے کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ مادّی ترقی کو منزلِ مقصود بنا کر حیلے اور فتوے تراشیں بلکہ یہ ہے کہ حجروں سے نکل کر رزم گاہِ زندگی میں تشریف لائیں اور آپس کے فروعی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر امتِ مسلمہ کو اس مقصد کے لئے متحد کریں کہ باطل سے ہمہ گیر جنگ لڑنی ہے اسلام کو غالب کرنا ہے اور زمانہ کا رُخ اپنی مطلوبہ سمت موڑنا ہے چاہے اس جہاد میں جان و مال، آل اولاد، عزت آبرو سب فنا ہو جائیں۔ یہ ہے اوج و ترقی کا واحد راستہ — یہ راستہ جب تک اختیار نہیں کیا جاتا عامۃ المسلمین کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ ہر شخص اپنی حد تک اسلام کو اختیار کرے اور جس محدود دائرے میں وہ اسے پھیلا سکتا ہو پھیلائے آخرت میں اپنا حساب ہر شخص کو خود دینا ہے۔ زمانہ کیسا ہی ہو ہم سے اللہ تعالیٰ زمانے کا حساب نہیں لے گا خود ہمارا حساب لے گا۔

وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ	اور پیروی کرو اس بہتر بات کی جو اتری تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے اس سے پہلے کہ عذاب تمھیں دفعتًا آگھیرے اور تم بے خبر ہو۔

نوٹ:۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس باب میں آپ کسی اور بیدار مغز عالم یا مستند دار الافتاء سے مزید استصواب فرمالیں۔ عاجز کے علم و فہم بس یوں ہی سے ہیں ہو سکتا ہے اپنی نظر مسئلہ کے کسی غامض اور دُور رس پہلو سے چوک گئی ہو۔ سچی بات تو یہی ہے کہ حالاتِ زمانہ کی پیدا کردہ مشکل ترین گتھیوں کو سلجھانا علماء ہی کا فرضِ منصبی تھا اور اس کے لئے انھیں ذہنی و عملی دونوں طرح کی ہم آہنگی، ارتباط اور تعاون و توافق کی ضرورت تھی۔ اجتہاد ہم جیسے بے بضاعت لوگوں کا منصب نہیں انفرادی اجتہادات سے ملّی ذہن کی شیرازہ بندی ہو سکتی ہے۔ مگر ہائے! علماء کی گراں خوابی و بے سوزی کا حال کس سے کہیں سفینہ ہولناک موجوں کی ٹھوکروں میں تھرّا رہا ہے مگر اکثر ناخدا اپنی اپنی کیچلیوں میں سکڑے پڑے ہیں۔ و یا حسرتا۔

رکعاتِ تراویح

سوال:۔ از محمد جمال الدین۔ میدک۔

براہِ کرم آپ آئندہ ماہ کی اشاعت میں وہ طریقۂ تراویح جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمایا تھا واضح کر دیجئے تاکہ یہ مسئلہ ہمارے یہاں ہر سال جو نزاعی صورت اختیار کر رہا ہے باعث سکون ہو جائے۔

الجواب:۔

میرے بھائی۔ اب تو شاید ہماری تقدیر ہی یہ بنکر رہ گئی ہے کہ فروعی جھگڑوں کی آگ ہرگز فرو نہ ہو اور روز بروز ان مسائل میں بھی تنازع بڑھتا ہی جائے جن پر ماضی میں برائے نام اختلاف تھا۔ تراویح کی کتنی رکعتیں اولیٰ ہیں اس پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں کہ اب کسی بحث کی قطعًا ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر سال اس فتنے کی بیداری کو سوائے بدنصیبی کے کیا نام دیں۔ بھائی صاحب ہم مقلدین کے نزدیک بیس رکعات اولیٰ ہیں اور اسی پر دنیا بھر میں عمل ہے۔ آپ مقلد ہیں تو اطمینان سے بیس پڑھ کر اپنے کام میں لگیئے اور غیر مقلد ہیں تو آٹھ والوں کی جماعت میں شریک ہو جائیے۔ نزاع کیسا اور سر پھٹول کیوں۔ دونوں مسلکوں کے پیچھے ایسے دلائل ہیں جو اس اختلاف کو بدعت و سنت کے اختلاف سے ممتاز کرتے ہیں لہذا کوئی وجہ نہیں کہ فریقین ایک دوسرے سے اُلجھیں اور عبادت کو ایک فضیحتہ بنا دیں۔ ہم علماء کو خدا کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ایک بخت کسی اسٹیج پر تو امت کو اتحاد و محبت کی راہ اختیار کرنے دو۔ دین تمھاری تفرقہ اندازیوں سے سراپا فریاد بن کر رہ گیا ہے۔

فقہی حیلے

سوال:- از حافظ اقرار احمد عباسی ایم اے، ال ال بی

فقہ میں "تاویل" کی تعریف کیا ہے اور تاویل کس درجہ ضرورت پر کن مقاصد کے لئے کی جا سکتی ہے؟ یہاں پر مچھلی کی ملکیت کا قصہ چل رہا ہے۔ تالاب کی مچھلی شرعاً جو بھی پکڑ لے اُس کی ہے۔ مگر واجباتِ ارض (قانون حکومت) کے تحت زمیندار مچھلی پکڑنے والوں سے آدھی بانٹ سکتا ہے ——— ایک مقامی دیندار، تقویٰ شعار زمیندار اپنے تالاب سے مچھلی پکڑنے والوں کو اپنے حصے کی (نصف) مَن دو مَن مچھلی کے چار چھ آنے دیدیتے ہیں۔ اس طرح قلب کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم نے مچھلی قیمتاً خریدی ہے۔ ماہی گیر چھ آنے بھی "فتوحات" سمجھ کر لے لیتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں واجب الارض زمیندار کے ساتھ ہے ——— ہمارے مشرب کے ایک عالم دین متین ہیں وہ اس تاویل کو لغو قرار دیتے ہیں اور ایک دوسری ترکیب سے حرمت کو حلت سے بدلتے ہیں۔ دس بیس ماہی گیروں کے ساتھ ایک آدمی اُن کا بھی برائے نام شریک ہو جاتا ہے وہ صرف جال کو ہاتھ لگا دیتا ہے۔ مولانا کے نزدیک (جو خیر سے شریک تالاب بھی ہیں) اس طرح کی پکڑی ہوئی مچھلی کی تنصیف جائز ہے فرماتے ہیں کہ مساوی حصہ بانٹنے کے لئے مساوی جدوجہد ضروری نہیں۔

کیا اس طرح کی تاویلات لغو، مضحک اور بار دہنیں، اور کیا اس طرح کے اقوال و اعمال سے دین حنیف کا چہرہ مسخ نہیں ہوتا؟ خصوصاً جب کہ اُن کی نسبت ذمہ دار اور شرع شعار لوگوں کی جانب ہو؟

الجواب:-

فقہی حیلوں کی مقاصد کے لحاظ سے دو بنیادی قسمیں ہیں ایک یہ کہ ان حیلوں کے ذریعے جائز حقوق کا حصول اور ظلم کا دفع مقصود ہو۔ شریعت کے حرام کو حلال کرنا اور کسی اور کا حق مارنا مقصود نہ ہو۔ دوسری یہ کہ مقاصد شرعیہ اور حقوق جائزہ کے خلاف کوئی انتفاع پیش نظر ہو۔ پہلی قسم مباح و حلال ہے بشرطیکہ خود حیلہ بھی قواعدِ شرعیہ کے خلاف نہ ہو اور دوسری قسم حرام و گناہ ہے چاہے خود حیلہ قواعد فقہیہ کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

متذکرہ سوال میں یہ بحث تو بعد کی ہے کہ جو دو حیلے اس میں مذکور ہیں وہ بجائے خود کس حد تک ضوابطِ فقہ کے مطابق ہیں پہلی گفتگو یہ ہے کہ خود مقصد کیسا ہے۔ اس میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے مقصد مستقیم و درست نہیں کیونکہ تالابوں کی وہ مچھلیاں جن کی پرورش اور نشوونما میں تالاب کے مالک کا کوئی دخل نہ ہو اور وہ آپ سے آپ پیدا ہوئی ہوں یا کسی اور سرچشمہ سے ان تالابوں میں تیر آئی ہوں اُن پر شریعت تالابوں کے مالکوں کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں کرتی نہ یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ کسی کو اس کا شکار کرنے سے روکیں۔ ایسی صورت میں کسی تالاب کے مالک کا یہ چاہنا کہ جو بھی اس کے تالاب سے مچھلی پکڑے اسے ضرور اس میں سے حصہ دے مقاصدِ شرعیہ کے خلاف ہے۔ جو حق ملکیت شریعت نے نہیں دیا اُسے حاصل کرنے کی جسارت ہے اور جو حقِ کامل شکار کرنے والوں کو شریعت نے دیا ہے اس میں دخل اندازی ہے پھر کیسے کسی فقہی حیلے سے اس کا جواز نکل سکتا ہے۔ ابطالِ حق اور تنسیخ شریعت کی کوشش تو وہ جرم قبیح ہے کہ کسی بھی مسلمان کو اس کی قباحت میں شک نہیں ہونا چاہئے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ طلاق مغلظہ دی ہوئی عورت سے صرف اس لئے نکاح کرنا کہ حلالے کی شرط پوری ہو جائے اور پھر طلاق دے کر اسے شوہرِ اول سے بیاہ دیا جائے حرام ہے حالانکہ فقہی اعتبار سے اس میں کوئی خاص خامی نہیں۔

خود مقصد و مدعا فاسد قرار پایا تو اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حیلہ فقہی اعتبار سے کس نوع کا ہے۔ تاہم یہاں تو دونوں حیلے بھی قواعدِ فقہیہ پر کھرے اُترتے نظر نہیں آتے۔

پہلا حیلہ اس لئے نادرست ہے کہ حیلہ کرنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ ماہی گیر جو نصف مچھلی اسے دے رہے ہیں وہ حکومتِ وقت کے قانون کی مجبوری میں دے رہے ہیں اور یہ بھی اس کا عقیدہ ہے کہ حکومت کا یہ قانون شرعاً درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ نہ ہوتا تو حیلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

حیلہ کرنا کھلا ثبوت ہے اس بات کا کہ خود اس کی نگاہ میں بھی ماہی گیروں کی پکڑی ہوئی مچھلیوں کا یہ نصف حصّہ حکومت کے جائز کر دینے سے شرعاً اس کے لئے حلال نہیں ہو گیا۔ تب یہ خرید و فروخت ایک بے روح ناٹک سے زیادہ کیا ہو گی کہ جتنی مچھلی بازار کے بھاؤ سے بیسیوں روپے کی بنتی ہے اسے صرف چند آنوں میں خریدنے کی نمائش کی جائے۔ خرید و فروخت کا قطعی اصولِ فقہی یہ ہے کہ بیچنے والا اس شے کا اصالتاً یا وکالتاً مالک ہو اور بیچنے کے بارے میں خریدار اس پر جبر و تشدد بھی نہ کرے۔ نیز اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے کہ خریدار کے جبر سے بیچنا ضروری ہو ـــ جیسے کہ حکومتیں اپنے پلانوں کے سلسلے میں کسی خاص جگہ کی زمینیں اور مکانات وغیرہ مالکین سے بالجبر خریدتی ہیں تو اس بیع کا جواز بھی اسی وقت ہے جبکہ مالک کو مناسب قیمت وصول کرنے کا حقدار تسلیم کر لیا جائے۔

متذکرہ صورت میں اوّل تو خرید و فروخت کا مسئلہ ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ قانون نے ماہی گیروں کو بیچنے کا آرڈر نہیں دیا بلکہ نصف حصّہ بلا قیمت مالک تالاب کو دینے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لین دین میں بیع و شراء کے فقہی حیلے لانا ہی سرے سے وضع شے علیٰ غیر محلّہ ہے یعنی ایک شے کا بے جگہ استعمال۔ لیکن اگر مالک تالاب اسے بیع و شراء ہی کے دائرے میں لانا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ ماہیگیروں کو بیچنے نہ بیچنے کا کامل اختیار دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو نا ممکن ہے کہ ماہی گیر دس روپے کا مال دس پیسے میں اسے دیدیں۔ اور اگر وہ انھیں بیچنے پر مجبور ہی کرتا ہے تو یہ اختیار بہرحال عطا کرنا ہو گا کہ وہ مچھلی کی قیمت بازار کے بھاؤ کے مطابق وصول کریں۔

علاوہ ازیں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ قانون نے ماہی گیروں کو نصف دینے کا تو آرڈر دیا ہے مگر یہ آرڈر نہیں دیا کہ خود مالک تالاب اگر اس قانون کو اپنی شریعت کے مطابق نہیں سمجھتا تو ماہی گیر پھر بھی نصف مچھلی اس کے سر ڈالیں یا اسے حکومت کے حوالے کریں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قانون کا رُخ سخن ماہی گیروں کی طرف ہے۔ خود مالک سے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تمھیں نصف مچھلی لازماً لینی ہو گی۔ پھر یہ کیسے درست ہو گا کہ جس مچھلی پر مالک تالاب شرعاً اپنا حق نہیں سمجھتا وہ چند آنوں میں شرعاً اس کی ہو جائے۔ کسی شے پر حقِ ملکیت ثابت ہونے کے جتنے بھی طریق شریعت سے مستنبط ہیں ان میں یہ طریقہ داخل نظر نہیں آتا۔

دوسرا حیلہ اس لئے فقہی جواز سے خارج ہے کہ باہمی معاہدے میں اگر کسی ظاہری یا معنوی جبر کو دخل نہ ہو تب تو بے شک یہ جائز ہے کہ نفع میں حصوں کا تعین حسب مرضی اتفاقِ رائے سے کر لیا جائے لیکن یہاں تو کھلا جبر موجود ہے۔ حکومت کا وہ قانون ـــ جسے خود مالک تالاب بھی شرعاً درست نہیں سمجھ رہا ہے ـــ موجود نہ ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ماہی گیر ایک ایسے شخص کو نصف مچھلی دیدیں جس نے جال کو فقط ہاتھ لگا دیا ہو۔ اختیار و رضا کی صورت میں تو تمام ہی ماہی گیر مساوی حصّہ چاہیں گے۔ مثلاً دس آدمی ہیں تو مچھلیوں کے دس حصّے کئے جائیں گے۔ نیز ایسے شخص کو تو وہ کوئی بھی حصہ نہ دینگے جو محض جال کو ہاتھ لگا دینے کا مذاق کر رہا ہو۔

حق یہ ہے کہ بنیادِ فاسد پر اُٹھائی ہوئی عمارت کبھی فساد سے خالی نہیں ہو سکتی۔ بنیادی طور پر متذکرہ معاملہ میں یہ ذہنی فساد پایا جاتا ہے کہ شریعت نے جو تالابوں کی مچھلیوں پر تالابوں کے مالکوں کا حق تسلیم نہیں کیا اسے آپ کے ذکر فرمودہ زمیندار پسند نہیں کرتے اور غیر اسلامی حکومت کے قانون نے انھیں جو موقعہ عطا کر دیا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص حکومت وقت کے قوانین سے فائدہ اٹھا کر سودی لین کے لئے حیلے تراشے۔ حکومت ظاہر ہے سودی لین دین کو جرم نہیں سمجھتی بلکہ اسے قانونی تحفظ دیتی ہے۔ لہٰذا جو مسلمان ذہنی طور پر سود کی نجاست و حرمت کو اہمیت نہیں دیتے وہ نوع بہ نوع حیلے نکال کر اس سے ملوث ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ حیلہ سازیاں کم فہموں کو مطمئن کر دیں تو کر دیں لیکن وہ مسلمان تو ہرگز ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا جسے اس بنیادی حقیقت کا شعور ہو کہ

"فقہ" دینی مقاصد کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے سے عبادت ہے نہ کہ انھیں منہدم کرنے اور ان کا حلیہ بگاڑنے سے۔ ہماری نظر سے امام ابوحنیفہؒ اور دیگر مجتہدین کے جتنے بھی فقہی حیلے گذرے ان میں ایک بھی مثال اس کی نظر نہ آئی کہ کسی حیلے کو خلافِ شرع مدعا کے حصول اور حرام کو حلال کرنے کی غرض سے اختیار کیا گیا ہو۔ شاذونادر ایسا تو ہوا ہے کہ مدعا مطابقِ شرع تھا مگر حیلے میں نقصِ شرعی پایا گیا۔ یہ صورت بھی اگرچہ متعدد مجتہدین کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن بعض مجتہدین نے مدعا کی نسبت سے اسے جائز قرار دیا ہے اور ذریعے یعنی حیلے کی نسبت سے گناہ، لیکن ایسا شاذونادر بھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ مستند فقہاء نے کسی غیر جائز اور مکروہ و مذموم مقصد و مدعا کے لئے حیلہ سازی کو روا کہا ہو چاہے حیلے بجائے خود فقہی قواعد کے مطابق ہی کیوں نہ ہوں۔

ھذا اما عندی والعلم عند اللہ والیہ انیب۔

نوٹ :- یہاں گفتگو صرف اُن تالابوں کی ہے جنھیں نہ تو مالک نے ماہی گیری کے لئے خریدا ہو نہ اس میں کہیں اور سے مچھلیاں لاکر ڈالی ہوں نہ کوئی باقاعدہ انتظام اس کا کیا ہو کہ اس کی مچھلیاں اسی میں محفوظ رہتے ہوئے کسی اور متصل تالاب یا دریا میں نہ پہنچ سکیں نہ وہاں سے اس میں آسکیں۔

اگر ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو تو احکام بدل جاتے ہیں۔

اہم کتابیں

کتاب	قیمت
مؤطا امام مالکؒ اردو مع عربی مجلّد	۱۲ روپے
بخاری شریف اردو مکمل در سہ جلد مجلّد	۲۴ روپے
حجۃ اللہ البالغہ اردو مع عربی مکمل 〃	۲۰ روپے
حصن حصین 〃 〃 〃 〃	۸ روپے
بستان المحدثین اردو 〃 〃	۵ روپے
مشکوٰۃ شریف اردو 〃 〃	۱۶ روپے
ترمذی شریف 〃 〃 〃	۱۶ روپے
بلوغ المرام اردو مع عربی 〃 〃	۸ روپے
ریاض الصالحین اردو مع عربی 〃 〃	۲۰ روپے
تفسیر آیت کریمہ (امام ابن تیمیہؒ) غیر مجلّد	ساڑھے تین روپے
تزکیۂ نفس (مولانا امین احسن)	ساڑھے چار روپے
سوانح خواجہ معین الدین چشتی	ساڑھے چار روپے
فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر مکمل در دو حصہ	ساڑھے تیرہ روپے
مفتاح اللغات	دس روپے
عظیم لغات القرآن مکمل در چھ جلد مجلد	ساڑھے ۳۶ روپے
لغات الحدیث چھ جلدیں	۷۶ روپے
جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات مکمل	۱۹ روپے
قرآن اور تعمیر سیرت	ساڑھے چھ روپے
فہم قرآن	سوا تین روپے
قرآن اور تصوّف	تین روپے
حضرت ابوبکرؓ صدیق کے سرکاری خطوط مجلّد	۵ روپے
〃 عمرؓ کے سرکاری خطوط 〃	۱۲ روپے
اخلاق اور فلسفہ اخلاق	ساڑھے سات روپے
امام غزالیؒ کا فلسفۂ مذہب و اخلاق	۱۰ روپے
العلم والعلماء	ساڑھے پانچ روپے
وحیِ الٰہی	چار روپے
مسند امام اعظمؒ اردو مع عربی	آٹھ روپے
کتاب الآثار 〃 〃	آٹھ روپے
ترجمان السنۃ مکمل مجلّد	ساڑھے چھتیس روپے

کتاب	قیمت
تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان	ساڑھے تین روپے
اسلام کا نظام حکومت	۷ روپے
〃 〃 عفت و عصمت	۵ روپے
〃 زرعی نظام	۵ روپے
〃 اقتصادی نظام	۷ روپے
تبلیغ دین (امام غزالی)	ساڑھے چار روپے
تذکرہ امام غزالیؒ	سوا دو روپے
مکاتیب زنداں	۲ روپے
مسلمانوں کا راستہ (مولانا آزادؒ)	۳۷ پیسے
شہادت حسینؓ (〃)	سوا روپیہ
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ	پونے دو روپے
اسلامی معاشیات	۱۲ روپے
مقالات احسانی	ساڑھے چھ روپے
تدوین حدیث	ساڑھے چھ روپے
النبی الخاتمؐ	سوا تین روپے
سوانح ابوذر غفاریؓ	۲ روپے
صراطِ مستقیم (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)	ڈھائی روپے
خدا کا انعام	سوا روپیہ
تعلیمات (مولانا عبیداللہ سندھیؒ)	پونے دو روپے
بھارت کے تہوار	۶۲ پیسے
مسلم خواتین کے لئے بیس سبق	ایک روپیہ
تحقیق مذاہب	دو روپے
کتاب التوحید (عبدالوہاب نجدیؒ)	تین روپے
ضبط ولادت	ڈیڑھ روپیہ

ہندی سکھانیوالی کتابیں

کتاب	قیمت
ہندی اردو ماسٹر	۳۰ پیسے
اردو ہندی ماسٹر	۵۰ پیسے
ہندی اردو لغت	ساڑھے تین روپے
اردو ہندی لغت	ساڑھے تین روپے
ہندی دفتری مراسلات	دو روپے

تصانیف مولانا مودودی

کتاب	قیمت
رسائل و مسائل ہر دو حصہ	ساڑھے بارہ روپے
رسالہ دینیات	ڈیڑھ روپیہ
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	ڈیڑھ روپیہ
تفہیمات حصہ اوّل	ساڑھے پانچ روپے
〃 حصہ دوم	ساڑھے چھ روپے
پردہ	ساڑھے تین روپے
حدیث اور قرآن	ایک روپیہ
منصب رسالت نمبر	ساڑھے تین روپے
تنقیحات	تین روپے
تجدید و احیائے دین	ڈیڑھ روپیہ
مسئلۂ قومیت	پونے دو روپے
اسلامی قانون	۶۲ پیسے
سرمایہ داری اور اشتراکیت	۷۵ پیسے
سلامتی کا راستہ	۳۱ پیسے
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	۲۵ پیسے
اسلام کا نظامِ حیات	۵۰ پیسے
جماعت اسلامی کی دعوت	۲۵ پیسے
نشانِ راہ	۳۷ پیسے
حقیقت ایمان	۵۰ پیسے
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۳۱ پیسے
حقیقتِ اسلام	۴۰ پیسے
حقیقتِ صوم و صلوٰۃ	۶۰ پیسے
شہادتِ حق	۳۱ پیسے
میلاد النبیؐ	۱۳ پیسے
ایک اہم استفتاء	۱۶ پیسے
قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۱۹ پیسے
معراج کی رات	۶ پیسے
جبر و قدر	۱۵ پیسے
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۴۰ پیسے

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

پچھلی اشاعت کا "مسجد سے میخانے تک" آپنے پڑھ لیا۔ ہو سکتا ہے بعض غیر معمولی متانت رکھنے والے قارئین مقصدی طنز و مزاح کے اس فیچر کو پڑھنا پسند نہ کرتے ہوں تو ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ دل پر جبر کر کے پچھلا فیچر تو پڑھ ہی ڈالیں عذاب سارا ہماری گردن پر۔ اس کے بعد وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے وہ ارشادات گرامی ملاحظہ فرمائیں جو تقریباً ۳۷ برس پہلے اسی عنوان کے تحت جس کے ذیل میں آج وہ مولانا مودودی کے سیاسی فکر و عمل کو کریہہ و نجس قرار دے رہے ہیں صادر ہوئے تھے۔ یہ ارشادات کسی محمد یوسف صاحب نے ہفت روزہ "سچ" سے نقل کر کے ۵ رجنوری ۱۹۶۳ء کے "ایشیا" (لاہور) میں طبع کرائے ہیں۔ پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ آج دین اور سیاست کو آگ اور پانی قرار دینے والے بزرگ ۳۷ سال قبل کس شد و مد سے اپنے اسی اندازِ فکر کی تردید و تغلیط فرماتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ یہ شذ پارہ ممدوح نے کسی ایسے ہی صاحب کی تردید و تنبیہ میں لکھا ہے جنھوں نے دین و سیاست کے باب میں وہی اندازِ فکر اختیار فرمایا ہوگا جو آج خود مولانا ممدوح اختیار فرما رہے ہیں۔ اس موقع پر نہ جانے کیوں ہمیں غالب کا ایک ایسا شعر یاد آ رہا ہے جس کا کوئی جوڑ یہاں نہیں معلوم ہوتا۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آپ بھی سوچئے کہ یہ بے محل آخر کیوں یاد آیا؟ — واللہ تعالیٰ اعلم۔

سچی باتیں

(مطبوعہ ہفت روزہ "سچ" ۱۱ ردسمبر ۱۹۲۵ء)

از:- مولانا عبدالماجد دریابادی

آپ کو یاد ہے کہ حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہم السلام کیا پیام لے کر فرعون کے سامنے آئے تھے؟ اگر آپ کو یاد نہ رہا ہو تو آیات کلام مجید کی تلاوت کر کے اپنی یاد تازہ کر لیجئے۔ یہ دونوں بھائی جب فرعون کے دربار میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:-

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

(ہم تیرے پروردگار کی جانب سے پیام لیکر آئے ہیں کہ، تو بنی اسرائیل کو اپنے پنجے سے رہائی دے کر ہمارے ساتھ کر دے)

ایک دوسرے مقام پر پھر یہی مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ:-

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (شعراء - ع ۲)

(ہم پروردگار عالم کی جانب سے تجھے یہ پیام پہنچانے آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے ہمارے ساتھ کر دے)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے تنہا بھی اپنے اس مطالبے پر اصرار کیا:-

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ (دخان ع ۱)

(فرعون کی قوم کے پاس برتر نبی آیا اور اس نے کہا کہ خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دو)

فرعون کی گورنمنٹ کو اپنی قوت، اپنے تمدن، اپنے

اقبال، اپنی فوج اور اپنے خزانے پر پورا بھروسہ تھا — ان لوگوں نے پورے اطمینان ویقین کے لہجے میں کہا۔ کہ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (اعراف ع ۱۵) یعنی ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں — ان لوگوں کے ذہن میں یہ واقعہ بھی عجیب وغریب اور قابلِ مضحکہ تھا کہ اپنی مفتوح ومحکوم رعایا کے دو شخصوں کے مطالبات کے سامنے سر جھکا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے حیرت سے کہا کہ:-

"کیا ہم اِن دو شخصوں پر ایمان لے آئیں جن کی قوم ہماری رعایا ہے"

اب یہ ارشاد ہو کہ حضرت کلیم اللہ کا یہ پیام سیاسی تھا یا مذہبی؟ حضرت موسیٰؑ پیمبر برحق تھے - اللہ کی طرف سے ایک خاص پیام لے کر فرعون اور اس کی گورنمنٹ کے پاس آئے تھے، کیا وہ پیام سیاسی تھا؟ کیا اس پیام پر بھی مذہبی کا اطلاق نہیں ہو سکتا؟ اگر ایک رسولِ برحق کے لائے ہوئے پیام کو بھی خالص مذہبی نہیں کہا جا سکتا تو خدا معلوم دنیا میں سے کس شے کو مذہبی کہا جا سکتا ہے؟ بہرحال اگر آپ کے عقیدہ میں حضرت موسیٰؑ آزادیٔ بنی اسرائیل کے پیام کو لیکر آئے تھے اور اُن کا لایا ہوا پیام خالص مذہبی تھا تو پھر آپ نے آزادیٔ ملک اور آزادیٔ قوم کو مذہب وایمان کے دائرے سے نکال کر کیوں ایک سیاسی تحریک سمجھ لیا ہے؟ کیا اس لئے کہ آپ کے بہت سے موجودہ مشائخ وعلماء اس تحریک سے الگ ہیں؟ کیا اس لئے کہ بہت سے وہ لوگ جنھیں آپ اب تک پیر اور مولوی کہتے آئے ہیں، اس جہاد میں کچھ زیادہ حصہ نہیں لیتے؟ اگر ایسا ہے تو اپنے دل میں خوب سوچ لیجئے کہ آپ کے نزدیک حضرت موسےٰ علیہ السّلام جیسے اولو العزم پیغمبر کا مرتبہ بڑھا ہوا تھا یا موجودہ مولویوں اور پیروں کا ہے؟ آپ کے اوپر ایک جلیل القدر پیمبرؑ کی تقلید فرض کی گئی ہے یا ان حضرات کی جن کی اندرونی بزرگیوں اور عاقبتوں کا حال آپ کو کچھ معلوم نہیں ہے؟ کیا یہ سب حضرات ملکر بھی حضرت کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہم رتبہ ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتے اور یقیناً نہیں ہو سکتے تو آپ کیوں آفتاب نبوّت کی روشنی کو چھوڑ کر چراغوں اور لالٹینوں کی طرف دوڑ رہے ہیں؟

اُودھ میں مولانا امیر علیؒ شہید کا واقعۂ شہادت ابھی کل کی بات ہے ۱۸۵۷ء کی مشہور جنگِ آزادی سے ذرا پہلے کا واقعہ ہے۔ جب وہ جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے لئے نکلے تو کتنے عالموں اور فقیروں نے ان کا ساتھ دیا تھا؟ اودھ کی مشہور درسگاہیں اور علمی فتویٰ خانے جیسے آج ہیں اس وقت بھی موجود تھے۔ پھر یہاں کی بسنے والی آبادی میں سے زیادہ نہیں چند افراد بھی اپنی جان دینے باہر نکلے تھے؟ برعکس اس کے کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان حضرات نے مولانا علیہ الرحمۃ کو اس قصد سے روکنے کیلئے ہر جائز وناجائز سعی کی۔ عام مسلمانوں کو مولانا سے بیزار وبدگمان کرنے کے لئے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی اور مولانا کی مخالفت میں اُلٹے فتوے اور اشتہارات شائع کرتے رہے۔ آپ اپنے دل کو خوب ٹٹولئے کہ آپ میں مولانا امیر علیؒ شہید کی وقعت وعظمت زیادہ ہے یا ان مولویوں اور پیرزادوں کی جو انھیں اس راہ سے روکتے تھے۔ اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وقعت زیادہ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ آپ ان کے طریقہ کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے راستے کو کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں؟

اگر سنتِ موسوی پر چلنا آپ اپنے لئے باعث فخر وسعادت جانتے ہیں تو پھر آپ قوم وملک کی آزادی کیلئے آگے بڑھنے میں کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ اور میدان سیاست میں قدم رکھنا کیوں مذہبی خدمت سے الگ سمجھ رہے ہیں؟

("م" یعنی مولانا عبد الماجد)

ایک دینی درسگاہ

مختصر تعارف اور تعاون کی اپیل

(عاجز مدیر تجلی اہلِ استطاع سے اس اپیل پر خصوصی توجہ کی درخواست کرتا ہے)

سراج العلوم کے نام سے ایک دینی درسگاہ ریاست نیپال کے دور دراز علاقہ میں واقع ہے نیپال اسٹیٹ میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت آباد ہے۔ جہاں مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا حکومت کی طرف سے کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اسلام پسند بھائیوں کے تعاون سے صرف ایک دینی مدرسہ سراج العلوم کے نام سے نیپال اسٹیٹ ضلع ٹول تحصیل بہادر گنج کے ایک موضع جھنڈینگر میں ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔ الحمد للہ قرب وجوار کے دو ڈھائی سو طلبہ اس میں تعلیم پاتے ہیں۔

مدرسہ میں نو اساتذہ تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیتے ہیں اور پچاس بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا بھی مکمل انتظام ہے باورچی کھانا تیار کرنے کے لئے مقرر ہیں۔ کچھ ضروری عملہ اور بھی ہے۔ مدرسہ کا سالانہ خرچ تقریباً پندرہ ہزار ہے۔ مدرسہ کے لئے کچھ اوقاف حاصل ہیں اِن سے نیز افراد ملت کے عمومی تعاون سے مدرسہ کا تعلیمی نظام بحمد اللہ قائم و مستحکم ہے امسال بچوں کی زیادتی کے سبب چھوٹے بچوں کی علیحدہ درسگاہ اور ایک جدید دار الاقامہ کی تیاری و تعمیر کا بھی سوال ہے جن کی اشد ضرورت ہے اسلئے تمام خیر پسند برادرانِ اسلام سے التماس و استدعا ہے کہ مدرسہ ہذا کی تعلیمی ضروریات و تعمیری مصارف کے لئے بلا علاقائی تعصب کے حسب استطاعت آپ ضرور کوئی حصہ لیں اور دوسرے بھائیوں کو بھی اس کی امداد کی طرف توجہ دلائیں۔ تعاونوا علی البر والتقوی۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب شیخ الحدیث (مبارکپوری) حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدیر صدق جدید مدیر تجلی وغیرہ کی شہادتیں اور تصدیقات مدرسہ کے متعلق ناظرین کی نظر سے بارہا گذر چکی ہیں۔ برائے تعمیر یا برائے تعلیم جن جن مدات کے لئے آپ رقوم روانہ فرمائیں گے اور اس کی صراحت کردیں گے تو آپ کا عطیہ یقیناً اپنے محل اور صحیح مصرف میں صرف ہوگا۔ وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا۔

پتہ ذیل سے امدادی رقوم روانہ فرمائیں

مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری (ناظم مدرسہ) معرفت قاضی تبارک اللہ ڈاکخانہ رامدت گنج بازار۔ ضلع بستی۔

نوٹ! پاکستان کے اصحاب خیر پتہ ذیل پر مدرسہ کی رقم بھیجکر پتہ بالا پر ناظم کو اس کی اطلاع دیکر مشکور فرمائیں گے۔ واجرکم علی اللہ۔

پتہ:۔ جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ خطیب مدرسہ محمدیہ چاہ شاہاں والا گوجرانوالہ (پاکستان)

ابوالفیض مولوی (افضل العلماء) خطیب بنگلور
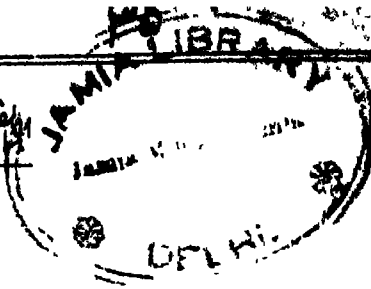
تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی

یہ مقالہ نما طویل خط اُس وقت موصول ہوا جب گذشتہ اشاعت میں دیا ہوا ہمارا جواب مرحلۂ کتابت کی منزل سے گذر چکا تھا۔ اگر یہ پہلے موصول ہو جاتا تو مذکورہ جواب میں اس کی رعایت ضرور ملحوظ رکھی جاتی۔ اب اس خط کے بارے میں اپنا تأثر ہم اس کے اختتام پر پیش کرینگے۔ عامر عثمانی

مکرمی و محترمی محسن الملت — زیدت مجدکم

عرصۂ دراز سے آپ کا قلم بدعت اور دیگر خرافات کے خلاف جو خدمت انجام دے رہا ہے اس کا ہم دل و جان سے اعتراف کرتے ہیں۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ احقاقِ حق اور ابطال باطل کے سلسلے میں آپ نے نہ صرف غیروں کے لعن طعن کو برداشت کیا بلکہ اپنے اساتذہ وغیرہ کی بے رُخی کو بھی انگیز کیا ہے۔ جماعت اسلامی کے خلاف کئے جانیوالے ایک ایک اعتراض کا آپ نے جو علمی جواب دیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ خدا آپ کے قلم میں اور قوت عطا فرمائے آمین تجلی کو عامۃ المسلمین کے حق میں مفید سے مفید تر بنائے۔ ماضی میں جب دیوبند حاضر ہوا تھا تو آپ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا اور بہت دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو بھی رہی ہر حال میں ذاتی طور بھی آپ کا بہت احترام ہوں اور جو آپ سے بدگمان ہوا (میرے حلقۂ احباب میں سے) اس کی بدگمانی کو رفع کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا ہوں — اگرچہ بعض مسائل میں مجھے آپ سے بھی تھوڑا سا اختلاف ہے مگر اللہ کا فضل ہے کہ اس اختلاف کی وجہ سے ذرا بھی کدورت اپنے دل میں نہیں پاتا اور یوں بھی کسی مسلمان سے کسی جزوی مسئلہ کے اختلاف میں حقارت آمیز طریقہ اختیار کرنا میرے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ کجا کہ اک عالم دین اور محسن ملت کے ساتھ دشمنی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اللھم احفظنا من العناد والتعصب۔

عرض کرنا یہ ہے کہ ابھی نومبر کے تجلّی میں تبلیغی جماعت کے خلاف آپ نے جو مضمون سپرد قلم فرمایا ہے اس سے ہمیں بڑا رنج ہوا۔ تبلیغی جماعت کے خلاف کسی بدعتی کا قلم حرکت میں آجائے تو تعجب نہیں کیونکہ بقول آپ کے "قبوری شریعت" جو انھوں نے ایجاد کر کے لوگوں کو شیطان کی راہ پر لگا دیا ہے، اور بزرگانِ دین کے مزارات کی آڑ لیکر شکم پروری کے جو اڈے قائم کر لئے ہیں اس جماعت تبلیغی کی دینی و تبلیغی سرگرمیوں سے ان میں زلزلے پڑ رہے ہیں — امت میں علم دین زندہ ہو رہا ہے، نمازیں زندہ ہو رہی ہیں۔ دیگر شرعی امور کی بھی پابندی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کام کو دیکھ کر کوئی شکم پرور واعظ مفتی عالم بگڑ جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں مگر مولانا عامر عثمانی کا قلم حرکت میں آجائے تو ہمیں حیرت ہی نہیں بلکہ سخت صدمہ ہوگا۔

اصل غلطی

کسی سائل نے آپ سے جو سوالات کئے ہیں یہ اس کے اپنے

ذاتی سوالات ہو سکتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کا ان سوالات سے کوئی تعلق نہیں ۔۔۔ اس جماعت کا مسلک ہی یہ ہے کہ کسی کی مخالفت نہ کریں۔ کسی جماعت یا فرد پہ کیچڑ نہ اچھالیں۔ کسی عالم دین کی چاہے وہ کسی بھی مکتب فکر کا ہو تذلیل و تضحیک نہ کریں۔ سائل نے یہ جو کسی دیوبندی عالم کو جماعت کا ذمہ دار قرار دیا وہ بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ شخص کبھی تبلیغی جماعت کا ذمہ دار ہرگز نہیں ہو سکتا چاہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی بڑا عالم ہو جو مسلم جماعتوں پر ناروا حملے کرتا ہو۔ انھیں ضال مضل اور فاسق و فاجر گردانتا ہو اور اپنے کو ناجی اور جنتی قرار دیتا ہو۔ مسلمانوں کی تحقیر کرتا ہو۔ ایسا شخص ایک فی صد بھی تبلیغی جماعت کا ذمہ دار نہیں بن سکتا ۔۔ تحقیر مسلم اور تکفیر تفسیق و تضلیل مسلم تبلیغی جماعت کے اصولوں کے تحت حرام ہے ۔۔ تبلیغ میں مسلمانوں کی تحقیر نہیں اکرام سکھایا جاتا ہے۔ یہ اس کے نمبروں میں سے ایک مستقل نمبر ہے اکرام مسلم ۔۔۔ اب اگر کوئی دیوبندی عالم تبلیغی بن کر جماعت اسلامی پر حملہ کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی طرز عمل ہے۔ تبلیغی جماعت اس کی ہرگز ذمہ دار نہیں ۔۔ اور کسی دیوبندی عالم کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ تبلیغ کے اسٹیج پر آکر کسی جزوی و فرعی مسئلہ کو چھیڑ کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالے یا کسی مسئلہ میں دیوبندیت کا مظاہرہ کرے۔

تبلیغی جماعت کے بہت بڑے ذمہ دار مولانا سے میں نے اس کا تذکرہ کیا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ تبلیغ کا کام فروعی مسائل کو اچھال کر تکفیر مسلم کا بازار گرم کرنے کا نہیں، دیوبندیت، بریلویت، وہابیت کو اجاگر کر کے ملت میں انتشار پیدا کرنے کا نہیں، بلکہ کلمۂ توحید پر امت کو جوڑنے کا کام ہے۔ مسلمانوں میں فرائض دین کا احساس کروانا اور سنت الٰہی زندگی کو اختیار کرنے کی ترغیب دلانا ہے ۔۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ کسی بھی طرز فکر کے آدمی کو تبلیغ میں آکر اپنے فروعی مسائل کو چھیڑنا یا تبلیغ کے اسٹیج پر آکر اپنے کسی خاص مسلک کی حمایت کرنا، تبلیغ کو دفن کرنے کے برابر ہے۔ آنے والے کو چاہئے کہ تبلیغ کے جو چھ نمبر ہیں انھیں نمبروں کے اندر گفتگو رہے۔ اب آپ ہی انصافاً فرمائیں کہ کوئی دیوبندی عالم کسی حماقت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس ایک آدمی کے جرم کی سزا پوری جماعت تبلیغ کو دینا کہاں تک درست ہے؟ سچی بات ہے کہ علماء دیوبند میں جو معتبر اور ثقہ ہیں انھوں نے کبھی کسی اسٹیج پر سے جماعت اسلامی کی مخالفت نہیں کی ہے۔ کم از کم ہمارے ان علاقوں میں دیوبند کے روح رواں مولانا قاری محمد طیب صاحب تشریف لا چکے ہیں، ان کی بہت سی تقریریں ہوئی ہیں اور اکثر تقریروں میں بندہ بھی حاضر رہا لیکن کبھی جماعت کے خلاف مولانائے موصوف نے کچھ نہیں کہا۔ مولانا ارشاد احمد صاحب بھی تشریف لاتے رہتے ہیں انھوں نے بھی اسٹیج پر سے کسی جماعت پر حملے نہیں کئے۔ ہو سکتا ہے نجی گفتگو میں جماعت اسلامی کے خلاف کچھ کہا ہو، لیکن یہ تن من دھن خلاف میں نہیں لگا رکھا ہے ۔۔ کچھ عرصہ قبل مولانا منظور نعمانی صاحب بھی تشریف لائے تھے انھوں نے بھی جماعت اسلامی کے خلاف کچھ نہیں کہا، بلکہ انھوں اتحاد مسلم کی دعوت دی۔ خاکسار نے مولانا سے سوال کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی نازک ترین دور سے گذر رہی ہے، اب مسلمانوں کو متحد کرنے کی شکل و صورت کیا ہے؟ تو مولانا نے بعض جماعتوں کا نام لیا اور ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کا بھی نام لیا۔ فرمایا کہ یہ جماعتیں پچانوے فی صد باتوں میں اشتراک رکھتی ہیں اور پانچ فی صد باتوں میں اختلاف۔ لہٰذا اختلافی باتوں کو نظر انداز کیا اور مشترک باتوں کو زیادہ اجاگر کیا جائے۔ اختلافی مسائل میں شدت نہ برتیں۔ نرم پالیسی اختیار کریں تو جماعتیں قریب ہو سکتی ہیں مولانا کی باتوں سے درد و اخلاص ظاہر ہوتا تھا اور کبھی آبدیدہ بھی ہو جایا کرتے تھے۔

تبلیغی جماعت کے اصول

تبلیغی جماعت اپنے سامنے ایک مقصد رکھتی ہے، اس تک پہنچنے کے لئے اس کے پاس کچھ اصول ہیں۔ بہت سیدھے سادے اور ایمان افروز۔ یعنی کہ چھ نمبر۔ کلمۂ طیبہ توحید، نماز، علم و ذکر، اکرام مسلم، اخلاص نیت، تفریغ وقت ۔

اب آپ ہی فرمایئے جماعت اسلامی کی مخالفت کہاں اور کس نمبر میں داخل ہے۔ یہ تو وہ بیچارے دیوبندی عالم کا اپنا ذاتی طرزِ عمل تھا جس کو غلطی سے سائل نے تبلیغی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ مذکورہ چھ باتوں سے کیسے انکار ہو سکتا ہے یہ آپ نے تبلیغی جماعت کو غلط سمجھا ہے کہ چند بے وقوف قسم کے لوگوں کو کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور چند باولے بسترے باندھ کر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

محترم! جب تک مرکز یعنی نظام الدین پہنچکر یا اجتماعات میں شریک ہوکر ذمہ دار حضرات کی باتیں نہیں سُنیں گے ہرگز معلوم نہ ہوگا کہ اس جماعت کے مقاصد کیا ہیں اور یہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے میں نے یہی سمجھا کہ اعلائے کلمۃ الحق، نظام اسلامی، شرعی احکامات کا احیاء، قانون خداوندی کا اجراء، اسلامی معاشرہ، طاغوتی طاقتوں سے مقابلہ، خلافت ارضی، جہاد فی سبیل اللہ، کُل دین پر عمل پیرا ہونا یہ جتنی اصطلاحیں جماعت اسلامی میں رائج ہیں اور ان مقاصد کے لئے دن رات کوششیں ہو رہی ہیں یہی سب کچھ تبلیغی جماعت کے بھی پیش نظر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں الفاظ کچھ اور قسم کے استعمال کئے جاتے ہیں اور طریقۂ کار بھی کچھ مختلف ہے۔ لیکن منزل ایک، جہاں کو یہ چلنا چاہتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک منزل کی طرف گامزن ہونیوالے یہ کارروان آپس میں ٹکرائیں کیوں؟ تبلیغی جماعت پر یہ الزام لگانا کہ یہ محض امت کو نماز روزے کی دعوت دیتی ہے اور تمام دینی امور میں آزاد چھوڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے وہ بھی یہی چاہتی کہ مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبے اسلامی سانچوں میں ڈھل جائیں، اس لئے وہ پہلے ایمان و یقین کی دعوت دیتی ہے کیونکہ یہی اصل بھی ہے۔ جہاں ایمان میں ضعف آجائے وہیں سے ساری خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔ آخرت کی فکر پر دنیا کی فکر غالب آجائے تو ظاہر بات ہے انسان کامیابی اور ناکامی کے فیصلے دنیا کو سامنے رکھ کر کرے گا۔ لہذا ایمان کو مضبوط بنالو اور عمل ٹھیک کرلو۔ کامیاب ہو جاؤ گے ــــ اب رہا اجتماعی جدوجہد تنظیم وغیرہ جماعت اسلامی کے مقابلے میں یہاں کچھ ڈھیل دی گئی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ فرد کی اصلاح ہو جائے تو اصلاح شدہ معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ افراد ہی سے معاشرہ بنتا ہے تو ہر فرد کو ایمان و یقین کی دعوت دو۔ جب افراد کی اصلاح ہو جائے گی تو صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

تبلیغی جماعت کی نقل و حرکت

یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ تبلیغی جماعت میں پھرنے والے سارے گنوار اور احمق قسم کے لوگ ہیں۔ محترم! آپنے بالکل سطحی انداز کا فیصلہ دیا ہے۔ جہاں آپ کو اس جماعت میں قریہ و دیہات کے گنوار اور ناخواندہ لوگ ملیں گے وہاں علماء کرام، مشائخین عظام، لیڈران قوم، سرکاری افسر، کلاس انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لکچرار بھی ملینگے جماعت اسلامی کی مخالفت کا ردِ عمل ہے جس سے آپ کا قلم اس قدر غضب ناک صورت کر گیا ہے ورنہ اس قسم کا گھٹیا فیصلہ آپ جیسے عالم کبھی نہیں فرماتے اگر کوئی بریلوی اور بدعتی شریعت کا حامل اس قسم کی بات کرتا تو تعجب نہ تھا۔ بلکہ تبلیغی جماعت کی نقل و حرکت سے ان کے کاروبار پر زد پڑتی ہے۔ ان کی دوکانیں ماند پڑ رہی ہیں۔ تبلیغی جماعت ہے کیا؟ خلاصہ یوں سمجھئے بالغ مسلمانوں کا ایک چلتا پھرتا مدرسہ جس سے مسلمانوں میں دین کا علم زندہ ہو رہا ہے، نمازیں، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوتِ قرآن، حلال کمائی کی جستجو، پڑوسیوں اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ یہ سب زندہ ہو رہے ہیں۔ آپ کچھ بھی کہیں یہ کام بہت اونچے درجے کا کام ہے۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر بیشک ایمان افروز ہے۔ مگر امت میں کتنے افراد ایسے ہیں جو علم رکھتے ہیں؟ اور لٹریچر پڑھکر سمجھ سکتے ہیں؟ یہاں تو پچاس فیصد ایسے مسلمان ہیں جنہیں ابجد کا الف بھی نہیں آتا۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ کب یہ لٹریچر پڑھینگے اور کب ان کی زندگی میں تبدیلی آئے گی یا تبلیغی جماعت ایک ایک جاہل اور گنوار کو سامنے کر کلمہ، نماز، روزہ، ذکر و تلاوت قرآن، سکھا رہی ہے تو کیا یہ کوئی ایسا کام ہے کہ جس کی مخالفت کی جائے سائل نے اگر یہ کہا کہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں تبلیغی جماعت

انقلاب آیا ہے تو اس نے کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مگر مولانا! یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ہزاروں مسلمانوں کی زندگیاں بدل چکی ہیں۔ جو کسی زمانے میں پرلے درجے کے شرابی، زانی، چور، بے نمازی، بدکار تھے آج وہ اعمال صالح میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ تبلیغی جماعت سے اگرچہ کہ کوئی زبردست اجتماعی انقلاب رونما نہیں ہوا لیکن یہ افراد کی زندگیوں کے بدلنے کا معاملہ یہ بھی کوئی معمولی اور آسان کام نہیں ہے۔

بوریا بستر باندھنے کی تبلیغی اسکیم

آپ کا یہ ارشاد بھی محل نظر ہے کہ پورے چودہ سو سال سے قرآن و حدیث کی روشنی میں بوریا بستر باندھ کر گاؤں در گاؤں پھرنے کی اسکیم کسی نے کیوں نہیں نکالی؟

اس حدیث کو تو آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ۔ علم دین کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔ بتلائیے آج مسلمانوں میں نوے فیصد دینی علم سے کورے اور بے بہرہ ہیں انھیں ضروری حد تک علم کون سکھائے اور کیا انتظام کرے۔ لاکھوں مسلمان جنھیں کلمہ بھی نہیں آتا، نماز روزے کے طریقوں سے ناواقف، دعاؤں، تلاوتِ قرآن سے نابلد۔ اگر یہ اسی طرح مر جائیں تو انجام کیا ہوگا؟ ایک ایک وقت کی نماز ترک کر دینے پر کیا کیا وعیدیں ہیں آپ احادیث میں پڑھ چکے ہیں۔ خود قرآن کریم میں تارکینِ صلوٰۃ کے لئے کس قسم کے عذابات کی دھمکیاں دی گئی ہیں آپ ہم سے زیادہ واقف ہیں۔ اب جس آدمی کی عمر ختم ہو چکی مگر مسجد کی شکل نہیں جانتا، روزے کی اہمیت سے ناواقف ہے، اگر یہ بغیر نماز، بغیر کلمہ، بغیر روزہ و زکوٰۃ و حج کے مر رہے ہوں تو کیا امت کے کسی فرد پر بھی اسکی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ قریہ بہ قریہ، گاؤں در گاؤں پہنچ کر ان کے نماز روزے کلمے درست کروا دیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ علماء اور مشائخین کس طرح اس زمانے میں ان ذمہ داریوں سے غافل ہیں الا ماشاء اللہ — جماعت اسلامی کا لٹریچر جنھیں پڑھنا نہ آتا ہو بڑی مشکل سے الٹا سیدھا پڑھ بھی لیں تو ان اونچی اصطلاحوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ان جیسوں کی اصلاح کے لئے بتلائیے آپکے پاس کیا پروگرام ہے۔ یہ کب جماعت اسلامی کے لٹریچر کو پڑھ کر دینداری اپنے اندر پیدا کر لیں گے۔ اگر تبلیغی جماعت آگے بڑھ کر ان سب میں دین زندہ کرنے کی اور سنتوں کو جاری کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو کیا یہ برا کام ہے؟ ایک نا عاقبت اندیش کے جماعت اسلامی پر حملہ کرنے کی وجہ سے کیا پوری تبلیغی جماعت کو اس کی سزا دے ڈالیں؟

محترم مولانا! جیسے دین کے بہت سے مفید کاموں کے لئے قرآن و حدیث سے بلا واسطہ ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً یہ کہ مدرسوں کا باقاعدہ نظام، اس کی عمارتیں، اس کے ہاسٹل، اس کے بجٹ وغیرہ۔ یہ اسکیم کس حدیث سے نکالی گئی ہے؟ یہ خانقاہیں، یہ ذکر جہری، یہ اصلاح کے دیگر طریقے جو امت میں جاری ہیں، قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے یہ اسکیم نکلتی ہے؟ — بس بات اتنی ہے کہ فرائض کو زندہ کرنے کے لئے کچھ ترکیبیں نکالی جائیں (جو بدعت کی تعریف میں نہ آتی ہوں) تو کیا مضائقہ ہے؟

تبلیغی جماعت کی صحیح پوزیشن

جماعت تبلیغ کے اکثر ذمہ داروں سے میں نے بارہا سنا ہے کہ تبلیغی جماعت کوئی تنظیمی جماعت نہیں ہے جس کا باقاعدہ دفتر ہو۔ بیت المال ہو۔ ارکان ہوں۔ ذرائع و وسائل ہوں۔ بلکہ یہ جماعت ایسی ہی جماعت ہے جیسے مسلمان نماز کیلئے مسجد میں جمع ہوتے ہیں جب تک وہاں رہیں جماعت ہے، جب فارغ ہو گئے تو اپنے اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے اجتماعات میں بارہا اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی مسلمان کو تشکیل کر کے باہر لے چلنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کو مبلغ بنایا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ قریہ کا وہ جاہل اور گنوار جسے کلمہ بھی صحیح پڑھنا نہ آتا وہ کیسے مبلغِ اسلام بن سکتا ہے؟ یہ غلط فہمی بہت سے علماء کو ہوتی ہے کہ جاہل تبلیغ کرنے کو چلا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ

وہ جاہل تبلیغ کرنے نکل پڑا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرنے کے لئے نکل پڑا ہے۔ اپنے اندر جو کھوٹ ہے اس کو نکالنے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔ اپنی نماز اور کلمہ درست کرنے کے لئے چل پڑا ہے کسی مقام پر پہنچکر آجتک کسی شخص نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ میں تمھارے درمیان تبلیغ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ بلکہ یہ کہا ہوگا کہ جیسے میں اپنے اندر کا کھوٹ نکالنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ بھائیو آپ بھی اپنے اندر کمزوری محسوس کرتے ہوں تو ساتھ چلو ہم سب ملکر ایک دوسرے کی اصلاح کرلیں۔

(۱) اگر کوئی دیوبندی غیر ذمہ دار عالم یہ کہتا ہے یا کوئی سائل یہ کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت اپنے آپ کو واحد دینی جماعت اور حدیثِ رسولؐ کی رُو سے ناجی سمجھتی ہے تو یہ سراسر اس دیوبندی عالم کی زیادتی ہے۔ جماعت کے ذمہ داروں نے کبھی اور کسی اجتماع میں یہ بات ہرگز نہیں ہے۔

تبلیغی جماعت کے کام کا تعارف

اس سے پہلے بھی یہ بات کہہ آیا ہوں کہ تبلیغی جماعت کا سارا پروگرام ان چھ نمبروں کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی جماعت کو مطعون کرنا' برا بھلا کہنا' کافر کہنا یہ جماعت کا اصول ہی نہیں ہے۔ جماعتی کام کو پھیلانے کے لئے افراد جماعت بہت فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔ بہت سی ناگواریوں کو انگیز کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی برا کہے' گالیاں دے تو شکریہ کے ساتھ لیتے ہیں۔ وہ قسم مرنجاں مرنج والی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

ساتھ ہونے والوں کو (بقول آپ کے بوریا بستر لپیٹ کر ساتھ چلنے والوں کو) نماز کے طریقے' دعائیں سکھاتے ہیں۔ کتابی تعلیم ہوتی ہے جس میں فضائل اعمال والی حدیثیں سُنا کر عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ تعلیمی حلقے بنا کر ایک دوسرے کی نمازیں دعائیں ٹھیک کرتے ہیں۔ سنتوں پر سختی سے پابندی کرتے اور کراتے ہیں۔ معمولی سنتوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ راتوں کو اُٹھکر تہجد کی نمازیں پڑھ کر رو رو کر اُمت کی اور اپنی اصلاح و مغفرت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرکے عام مسلمانوں کو مسجدوں کی طرف لاتے ہیں۔ التزام کے ساتھ روزانہ حتی المقدور تلاوتِ قرآن کر لیتے ہیں تسبیحاتِ مسنونہ کی پابندی کرتے ہیں۔ بتلائیے ان میں کس کام سے آپ کو اختلاف ہے؟

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت

امت میں اس وقت یہ دونوں جماعتیں احیائے دین کے لئے جان توڑ کوششیں کر رہی ہیں۔ منزل ایک' مقصد ایک' خدا ایک' رسول ایک' قرآن ایک' کعبہ ایک' تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں ٹکراؤ کیسے ہے؟ طریقۂ کار میں کچھ اختلاف ضرور ہو مگر اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مذکورہ باتوں میں دونوں سو فیصد مشترک ہیں۔ دیوبند کے بعض علماء علمی موشگافیوں کے نتائج کو سامنے رکھ کر جماعت اسلامی کو حریف سمجھ بیٹھیں تو اس کا کیا علاج؟ لیکن تبلیغی جماعت سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گی اور جماعت اسلامی کو فیل کرنے کے لئے تن من دھن سے لگ جائے گی!

علماء دیوبند اور جماعت اسلامی کے اختلاف سے اس قدر نقصان نہ پہنچے گا جس قدر کہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے ٹکراؤ سے ملت کو ہوگا۔ دیوبند ایک ادارہ ہے۔ جماعت اسلامی ایک تحریک ہے اور ملک کے ہر گوشے میں یہ تحریک جڑ پکڑ چکی ہے علمائے دیوبند کی مخالفت اس تحریک پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ تبلیغی جماعت بھی اپنی نوعیت کی ایک تحریک ہے یہ بھی ملک کے چپے چپے میں داخل ہو چکی ہے۔ بیرونِ ملک میں بھی اس کا اثر و نفوذ ہے۔ اب بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی دو متحرک فعّال جماعتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ خدا نہ کرے کہ وہ گھڑی ہمیں دیکھنے کا موقعہ ملے جس میں ساری دنیا کو ایمان و یقین' اتحاد و اتفاق' انسانیت و شرافت' اخلاق و علم کی دعوت دینے والے نفوسِ قدسیہ آپس میں ایک دوسرے کا گریبان پکڑ رہے ہوں' ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھال رہے ہوں

ایک دوسرے کو ضال و مضل قرار دے رہے ہوں۔ ہمارا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ یہ ہلکے سے اختلافات بھی بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ اپنے پروگرام و اصول کے مطابق کام تو کریں گی مگر ایک دوسرے سے دست و گریبان نہ ہوں گی۔ ایک منزل کے راہی ہمیشہ حریف نہیں رہ سکتے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ یہ سارا تماشا اخلاص کی کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ دین کی دعوت دینے والے اپنے اندر اگر اخلاص نیت پیدا کریں گے تو انشاء اللہ پھر ٹکراؤ کی بات ہی نہ ہوگی۔

جماعت اسلامی کا بھی تعارف

اس بدنصیب جماعت کے خلاف علمائے کرام نے جھوٹے اور غلط قسم کے پروپگنڈے کئے ہیں۔ جتنے اعتراضات علمی قسم کے تھے سب کے جوابات دیئے گئے اور اس سلسلے میں آپ نے علم و قلم کے بڑے بڑے جوہر (تجلی میں) دکھلائے ہیں مگر برا ہو تعصب کا۔ علمائے کرام کی آنکھوں پر یہ بدترین قسم کا چشمہ لگ گیا۔ اب کسی بات کو علم و عمل کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے جماعتی تعصب اور گروہی عصبیت سے حل کیا جانے لگا۔ جماعت اسلامی نے اردو زبان میں دین کا ایسا لٹریچر تیار کیا ہے جس کی مثال نہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جو کمیونزم، سوشلزم، الحاد و دہریت کی گود میں جا چکا تھا اس جماعت کے لٹریچر نے ایسے انوکھے انداز میں انھیں اسلام کی طرف موڑا جس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی بھی جماعت اسلامی کو علمی انداز میں سمجھنا چاہے اس کا لٹریچر پڑھ کر سمجھے اور فیصلہ کرے۔

(۱) مجھے صرف ان لوگوں کی خدمت میں چند موٹی موٹی باتیں عرض کرنی ہیں جو آج تک بھی جماعت اسلامی کو ضال و مضل اور قادیانی جماعت سمجھ رہے ہیں۔

جماعت اسلامی میں سیکڑوں علمائے کرام موجود ہیں جن میں دیوبند کے فاضل بھی ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ بھی ہیں۔ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرستہ الاصلاح سرائے میر، جامعہ دار السلام عمر آباد، باقیات الصالحات ویلور وغیرہ کے فارغ حضرات بھی شامل ہیں۔ جہاں کچھ علماء مخالفت کر رہے ہیں وہاں کچھ موافقت بھی تو کر رہے ہیں کیا کسی گمراہ جماعت کی موافقت میں ہر طرز فکر کے علماء اکٹھے ہو سکتے ہیں؟ گذشتہ چند سال پیشتر مولانا منظور نعمانی، مولانا عبدالرحیم اشرف، مولانا صبغۃ اللہ بختیاری، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا علی میاں جیسے اکابر حضرات سالہا سال تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ضال و مضل اور گمراہ جماعت میں ایسے چوٹی کے علماء اتنے سال تک شریک رہ سکتے ہیں۔ اگر بعد میں کچھ علماء نے ساتھ چھوڑ دیا تو یہ سمجھ کر تو نہ چھوڑا ہوگا کہ ہم بالکل گمراہ ضال مضل جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں بلکہ کچھ جزوی اختلافات درپیش ہوئے جن کی وجہ سے ان اکابرین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ خدا نخواستہ یہ اکابر یہ کہدیں کہ بھائی ہم واقعی ایک قادیانی قسم کی جماعت میں شریک رہے اور اب توبہ کرتے ہیں تو امت کے لئے اس سے بڑی ٹریجڈی اور کچھ نہ ہوگی۔ جن کو امت اپنا رہنما اور پیشوا سمجھتی ہے وہ اگر دس دس بارہ بارہ سال تک ایک قافلے کے ساتھ چلتے رہیں۔ پھر بارہ سال کے بعد احساس ہوا کہ گمراہ جماعت کے ساتھ چل رہے تھے تو محترم پھر ان اکابر کی رہنمائی کا کیا اعتبار ہوگا۔ ممکن ہے اب جو راستہ چل رہے ہوں اس کے بارے میں بھی دس سال کے بعد انکشاف فرما دیں کہ اُف ہم تو پھر غلط راستے پر چلتے رہے۔ پھر دس سال تک ایک مسلک سے واسطہ رہیں پھر اچانک اعلان فرمادیں کہ ہم تو اب بھی گمراہی کے ہی راستے پہ چلتے رہے تو فرمائیے یہ رہنمائی بصیرت پہ مبنی ہوگی یا ظرفہ تماشائی پر۔

جماعت اسلامی میں جب یہ لوگ پہلی بار داخل ہو رہے تھے تو سوچ سمجھکر ہی تو داخل ہو رہے تھے۔ اور بالفرض آدمی بغیر سوچے سمجھے کسی جماعت میں شریک ہو جائے تو کیا سالہا سال تک اس جماعت کی گمراہی اس پر واضح نہ ہوگی؟ صرف مولانا منظور نعمانی صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے انھوں نے جماعت اسلامی میں شریک ہونے سے پہلے کس قدر تحقیق کی ہے۔

جماعت اسلامی میں شرکت کا فیصلہ اور لاہور کے اجتماع کی رپورٹ

"جماعت اسلامی میں شرکت کے لئے جو لوگ مختلف مقامات سے آئے تھے نہ صرف ان کی گفتار سے بلکہ عام طرزِ عمل سے بھی اخلاص للہ اور دینداری کا رجحان میں نے نمایاں پایا۔ یہ لوگ عموماً اس جماعت اور دوسری عام سیاسی جماعتوں اور اداروں کے فرق کو سمجھنے والے تھے۔ ان میں باضابطہ علماء کی بھی خاصی تعداد تھی۔ ان میں مختلف مسلکوں کے اور مختلف مکاتب خیال کے فیض یافتہ حضرات تھے۔ مثلاً مجھ جیسے دیوبندی حنفی بھی، اور پھلواری اور ندوی بھی نیز سلفی المسلک اہل حدیث بھی۔ مگر بحمد اللہ سب ان مسالک کے جزوی اختلاف کے حدود کو صحیح طور پر سمجھنے والے اور وقت کے دینی تقاضوں کا احساس رکھنے والے تھے"

"علاوہ اور چیزوں کے ان جدید تعلیم یافتہ حضرات میں ایک خاص چیز میں نے یہ محسوس کی کہ وہ قریب قریب سب ہی اس کا احساس رکھتے تھے کہ جماعت اسلامی جس کام کو لیکر اُٹھ رہی ہے وہ خالص دینی ہے اسلئے اس میں بڑی حصہ داری اور ذمہ دارانہ رائے زنی کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ کسی اجتماعی کام کے متعلق یہ احساس و اعتراف آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں بالکل مفقود ہوتا جا رہا ہے اور نتائج کے لحاظ سے یہ بڑی خطرناک چیز ہے اس لئے (جماعت اسلامی میں شریک ہونے والے انگریزی داں حضرات کی اسلامی طرز فکر کو دیکھ کر مجھے بڑی قدر ہوئی۔"

"سب سے زیادہ جس چیز سے میں متاثر ہوا وہ اس اجتماع کا یہ اصول اور طرز عمل تھا کہ ہر معاملہ میں کتاب و سنت اور صحابۂ کرام کا طریق عمل ہمارے لئے حکم ہوگا۔ اجتماع میں جو کچھ ہوا وہ اسی اصول و آئین کے تحت ہوا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض اُمور میں رائیں مختلف ہوئیں مگر کتاب و سنت یا تعامل صحابۂ کرام رضی سے جب کسی ایک جانب کی ترجیح معلوم ہوگئی تو سب نے بلا چوں و چرا اسی کو تسلیم کر لیا حتیٰ کہ جماعت کے آئین کے بارے میں بھی صرف انھیں اصول دین کو چراغ راہ بنایا گیا۔"

(الفرقان لکھنؤ (ماخوذ حکومت الٰہیہ - حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری)

کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟

عالم اسلام کے علمائے کرام کی رائیں ذیل میں دی جا رہی ہیں جو جماعت اسلامی کے بارے میں ظاہر کی گئی ہیں معاندین آپ اسی کو بار بار پڑھیں اور اگر انصاف کرنے والا ذہن اور ایمان رکھنے والا قلب مردہ نہیں ہو چکا اور نور بصیرت باقی ہے تو خدارا رات کی تنہائیوں میں جب ذکر و فکر کی محفل گرم ہوتی ہے اس موقعہ پر سوچیں کہ جس جماعت کا برحق ہونا سورج کی شعاعوں کی طرح واضح ہے سیکڑوں معتبر اور ثقہ علماء کی رائیں موجود ہیں۔ اس جماعت کو ضال و مضل، گمراہ، قادیانی وغیرہ کہہ کر اپنا ایمان غارت کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

علمائے کرام کی رائیں

مولانا منظور نعمانی مدظلہ العالی کی رائے:۔

مولانا مودودی صاحب کے مسلک کے بارے میں:۔

" ان کا مسلک اور طریق عمل اس بارے میں وہ ہے جو حنابلہ میں حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کا اور حنفیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہم کا تھا۔"

مولانا مودودی کی شخصیت کے بارے میں:۔

" امیر میں جو اوصاف ہونے چاہئیں ان کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی مولانا مودودی صاحب سے زیادہ بہتر

بلکہ ان کے برابر بھی ہم نے شرکا میں کسی اور کو نہیں پایا اس لئے سب نے انھیں کے متعلق رائے ظاہر کی اور انھیں سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی چنانچہ وہی جماعت کے امیر منتخب ہوتے۔"

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی رائے :-

جماعت اسلامی کا قیام مقصد حق کے لئے ہے۔ ہم ان مسلمانوں کو چھانٹ چھانٹ کر جمع کر رہے ہیں جو اس پورے حق کیلئے کر اُٹھنے کا عزم رکھتے ہیں اور ان سے ایک جماعت کی تشکیل کرلی ہے۔ اس طرح ہم اسلام کے ان مقاصد کو ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو صرف جماعتی زندگی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ جماعت کمزور اور ضعیف ہے لیکن اگر کچھ ذرّے اکھٹے ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذروں میں کبھی گرمی و حرارت پیدا کی اور ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہوگئی تو کیا عجب ہے کہ اس کمزور جماعت کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پاجائے جو اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ ہمیں اس کام کے لئے سچا خادم بنا دے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی کی رائے :-

جماعت اسلامی کو جڑ سے اکھیڑنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے والوں کی خدمت میں مولانا درخواست فرما رہے ہیں کہ مسلمان کیسی تمنا کرے :-

"اگر میرے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے لئے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کیلئے بھی خالی نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لئے قدم اٹھا رہے ہوں، تو ان کے لئے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کردوں لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہوسکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرتِ حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس دعوتِ حق کو فتنہ قرار دیدوں لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لئے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہوگی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہئے۔" (حکومت الٰہیہ حافظ امام الدین رام نگری)

مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی رائے

"ان عبارتوں میں یعنی جماعت اسلامی کے دستور کے واضعین کی عبارتوں میں صحابہ کرامؓ کو معیار، مینار، روشنی، چراغ راہ، جامع و مکمل نمونہ، مدار نجات اور ان کے اسوے کو واجب الاتباع تسلیم کیا گیا ہے۔" رسالہ دارالعلوم مئی ۱۹۵۰ء

"جہاں تک احقر کی رائے کا تعلق ہے یہ صحیح نہیں ہے کہ مودودی صاحب کا لٹریچر دیکھنے سے ایمان جاتا رہتا ہے ممدوح نے اسلامی اجتماعیات کے بارے میں نہایت مفید اور قابل قدر ذخیرہ فراہم کردیا ہے۔ اس دورِ خلط و اخلاط اور تلبیس و التباس میں جس بے جگری سے انھوں نے اسلامی اجتماعیات کا تجزیہ اور تنقیح کرکے جماعتی مسائل کو صاف کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ میں انھیں اسلامی اجتماعیات کا ایک بہترین سیاسی مفکر سمجھتا ہوں۔ البتہ فقیہہ اور مفتی نہیں مانتا... یہ لکھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے سے ایمان چلا جاتا ہے۔"

"اس جماعت کے اصولِ اجتماعی میں کوئی بات خلاف شریعت نظر نہیں آتی۔" (رسالہ دارالعلوم۔ جون ۱۹۵۱ء)

"محترم مولانا مودودی صاحب نے مستقلاً اسی عنوان سے اپنی تحریک شروع کی اور اسی کی اساس پر جماعت اسلامی کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی۔ اس تحریک و تشکیل نے اجتماعیات اسلامی کی حد تک قوم کو کافی فائدہ پہنچایا اور ان کے معقول و متین طرزِ بیان نے اور طریقِ استدلال نے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو عموماً متاثر کیا۔ بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ حلقہ جسکے سامنے اسلامی اجتماعیات کا کوئی منضبط تصور ہی نہ تھا۔ اسلام کی اجتماعی زندگی اور خالص دینی سیاست کے بہت ہی قریب ہوگیا۔ جس کے لئے پوری قوم کو مرہون منت ہونا

چاہیئے۔ ـــــ "فطری حکومت" مولانا طیب صاحب ۱۹۶۹ء۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی فاضل دیوبند کی رائے:۔

"شاید ہی کوئی بدبخت مسلمان ہوگا جس کے دل سے مولانا مودودی صاحب کے ان بلیغ و اثر انگیز دل دوز مضامین کو پڑھ کر دعائیں نہ نکلتی ہوں۔ اور آج بھی ایسا کون نصیب، کوتاہ بخت، سیاہ سینہ کون مسلمان ہوگا جس کے دل میں مولانا کی اس خالص قرآنی دعوت سے اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے" (اخبار صدق ۱۸ اگست ۱۹۵۰ء)

حضرت مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینی کی رائے:۔

"جماعت اسلامی کے دستور کی اس عبارت میں (جس سے بعض علماء نے اختلاف کیا ہے[۵۱]) کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقیدۂ اسلام کے خلاف ہو"

حضرت شیخ عبد اللہ کنون صدر مدرس مدرسۂ اسلامیہ مراکش کی رائے:۔

"جماعت اسلامی کے دستور کی اس عبارت میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہو اور نہ ہی اس سے اعتراضات اور شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ جو جماعت اس عبارت کے مضمون پر عقیدہ رکھتی ہے وہ برسرحق ہے اسکا لٹریچر پڑھنا اور اس کی طرف دعوت دینا جائز ہے۔ اسی طرح فرائض تدریس کا اس کے سپرد کرنا اور ان مدرسوں کی اعانت کرنا جن میں وہ درس دیتے ہیں جائز بلکہ مستحسن ہے اور ہر طریقے سے اور تمام وسائل سے ایسا کرنا چاہیئے۔ رہا جماعت کے ساتھ تعاون اور اشتراک کا مسئلہ تو اس سلسلے میں میں قرآن کریم کے الفاظ پر اکتفا کروں گا۔ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا (کاش میں ان کے ساتھ ہوتا پس بڑی کامیابی حاصل کرتا)

مولانا شیخ عبد العزیز بن باز الاثری مدرس مسجد حرام مکۂ مکرمہ کی رائے

"دستور جماعت اسلامی میرے نزدیک بالکل صحیح اور درست ہے۔ یہ جماعت اس اعتقاد میں حق کی حامل ہے۔ تمام اہل اسلام پر اس عقیدے کو قبول کرنا واجب ہے جیسا کہ تمام اہل علم نے اس کی توثیق کی ہے"

مولانا شیخ حسین محمد مخلوف مفتی دیار مصریہ کی رائے۔

"دستور جماعت میں درج شدہ عقیدہ۔ عقیدۂ اسلامیہ کے ساتھ کلی مطابقت رکھتا ہے۔ اس عقیدے پر تمام مسلمانوں کا ایسا اجماع ہے جس میں بجز گم راہ، راہ حق سے محروم، یا کافر و منکر کے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں رکھتا"

حضرت علامہ طنطاوی قاضی دمشق کی رائے گرامی۔

"استاذی محمد مخلوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر مبنی برحق ہے۔ اس میں کسی دو مسلمانوں کا اختلاف نہیں ہے اس کے خلاف کہنے والا ہی ضال ہے مضل ہے اور اہل سنت والجماعۃ سے خارج ہے"

مولانا عبد الرحمٰن صاحب چشتی سابق صدر مدرس دار العلوم خلیلیہ ٹونک کی رائے

"میں نے جماعت اسلامی کی کتابوں کو بامعان نظر دیکھا ہے میرے نزدیک ان کتب میں کوئی بات خلاف شریعت نہیں ہے اور اس دستور کے مطابق تبلیغ اسلام کا کام عین دین اور شریعت کا منشاء اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل ہے۔ ان کتب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اہل سنت والجماعت کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہو۔ چہ جائیکہ کفر و گمراہی کی بات۔ بلکہ ان کتابوں کے پڑھنے سے اسلام دل میں جمتا ہے۔ قرآن و حدیث کی اتباع اور صحابہؓ اور صلحائے امت کی پیروی کا جذبہ ابھرتا ہے"

مولانا محمد سعید صاحب ندوی مفتی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی رائے

"جماعت اسلامی کی ہر دفعہ کو غور سے پڑھا۔ کوئی بات خلاف شرع نہیں معلوم ہوئی۔ بلکہ اس پر پابندی

---

[۵۱] مراد دستور جماعت اسلامی کی وہ مشہور دفعہ ہے جس پر بڑے بڑے فاضلین نے ماضی قریب میں ایسے ایسے طوفان اٹھائے ہیں کہ الامان والحفیظ یعنی دستور میں کہا گیا ہے کہ "خدا اور رسولؐ کے سوا کوئی معیار حق نہیں"۔ ـــ اس عبارت کے بارے میں مفتی اعظم فلسطین نے اظہار رائے کیا ہے اور آگے بھی دیگر علماء جس عقیدۂ و اعتقاد کا ذکر کر رہے ہیں اس سے یہی عقیدہ مراد ہے۔ تجلی

ـنے والا اور اس کے مطابق اشاعت اسلام کرنے والا قابلِ
ستائش ہے۔ عند اللہ اجر کا مستحق ہے اور دین اسلام کی صحیح
دمت ہے" اس فتوے کی مندرجہ ذیل علماء کرام نے
تائید کی ہے:۔

مولانا محمد ظہور ندوی۔ مولانا عبد الحفیظ فاضل دیوبند۔
مولانا محمد حلیم صاحب عطا۔ مولانا ابو العرفان شیخ الحدیث وغیرہ

مولانا احمد حسن خاں صاحب سابق مفتی محکمہ شرعیہ ٹونک کی رائے گرامی

"میں نے جماعت اسلامی کا دستور اوّل سے آخر
تک پڑھا۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے دیکھ کر کہا
جا سکے کہ یہ اللہ کے نزدیک ناپسند اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ناراضی کا باعث ہے۔ جس مقصد اور نظریہ کی
تبلیغ جماعت اسلامی کرنا چاہتی ہے وہ وہی مقصد اور نظریہ
ہے جس کی طرف انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کو بلایا اور
بندگانِ خدا کو دعوت دی ہے۔ اللہ کے پاس ایسے ہی
کام وزنی اور لائق اجر ہیں۔"

مولانا عبد الہادی قاضی محکمہ قضائے ریاست بھوپال کی رائے:۔

"ہندوستان میں جماعت اسلامی جو عرصہ دراز
سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دے رہی ہے
ازروئے شریعت اس کے مقاصد اور طریقہ کار میں کوئی
بات قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔"

مولانا محمد عرفان خاں صاحب سابق مفتی عدالتِ شرع شریف ٹونک کی رائے:۔

"جماعت اسلامی کے دستور میں کوئی دفعہ ایسی نہیں
ہے جو اسلامی اصول کے خلاف ہو۔ یہ بالکل احکام شرعیہ کے
موافق ہیں۔ جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنے سے اسلام
کے ساتھ گہری وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک، حدیث
شریف اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و دیگر
اسلاف صالحین رحمہم اللہ کے ساتھ محبت اور سچے شوق
کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ وابستگی اور شوق کیسے نہ پیدا ہو،

جن باتوں کی طرف یہ کتابیں رہبری کرتی ہیں وہ باتیں عین
اسلام اور ایمان ہیں۔"

مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مبارکپوری شیخ الحدیث کی رائے

"دستور جماعت اسلامی کی عبارت کا مفہوم بلاشبہ
مومن و مسلمان کا عقیدہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہی ہر مسلمان کا عقیدہ
ہونا چاہئے۔"

مولانا عبد الودود صاحب ندوی کی رائے۔

دستور جماعت اسلامی کی عبارت کا مفہوم بالکل صاف
ہے۔ توحید خالص کا آئینہ ہے۔ اصول شرعیہ کے معیار پر
ڈھلا ہے۔"

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کی رائے۔

"دستور جماعت کی یہ عبارت عین حق و صواب ہے۔
اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے۔"

مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب کی رائے۔

"دستور جماعت اسلامی کی عبارت سے میرے نزدیک
نہ انبیاء سابقین کا انکار لازم آتا ہے نہ بزرگانِ دین رحمہم اللہ اور صحابہ
کرام رضی اللہ عنہم کی توہین و تنقیص ہوتی ہے اور نہ ائمہ رحمہم اللہ کی اتباع سے
دشمنی ظاہر ہوتی ہے۔"

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی رائے:۔

"دستور جماعت اسلامی کی یہ عبارت ہر مومن و مسلم
کا عقیدہ ہے اور ہونا چاہئے۔"

مولانا عبید اللہ صاحب سابق شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور کی رائے:۔

"دستور میں جو عقیدہ درج ہے وہی مسلمانوں کا عقیدہ
ہے اور جماعت حق پر ہے۔"

مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الجامعہ۔ مولانا عبید اللہ صاحب
کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مولانا کا جواب حق اور
صحیح ہے۔"

مولانا محمد چراغ صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ کی رائے:۔

"جماعت اسلامی کے دستور میں جو عقیدہ بیان کیا گیا ہے

وہ بالکل [illegible] ہے۔ اس کو علماء اور ائمہ نے بیان فرمایا ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہو اس کا لٹریچر پڑھنا جائز ہی نہیں اس کے ساتھ اعانت ضروری ہے۔"

مولانا عبد العالی احمد صاحب خطیب مسجد جامع گل امام ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کی رائے گرامی:۔

"جماعت اسلامی کے خلاف اس وقت فتوے بازی کی جو مہم ہو رہی ہے اسے دیکھ کر نہایت دکھ ہوتا ہے۔ میری نظر سے اب تک اس جماعت کی جو کتابیں گذری ہیں انہیں کوئی چیز ایسی نہیں پائی جس کی بناء پر جماعت کی مخالفت کی جائے یا عوام الناس کو جماعت کے ساتھ تعاون سے روکا جائے۔"

مولانا محمد ظفر صاحب موضع بستی آڈہ ڈیرہ اسماعیل خاں کی رائے

"میں نے جماعت اسلامی کا بیشتر لٹریچر پڑھا ہے جہاں تک میں نے سمجھا ہے اس کو قرآن و حدیث کے خلاف کہیں بھی نہیں پایا ہے۔ معترضین نے وقتاً فوقتاً جو فتوے شائع کئے ہیں وہ صریح زیادتی ہیں۔ انھوں نے عبارات سے بالکل غلط معانی لئے ہیں۔"

مولانا محمد عبد اللہ صاحب فاضل دیوبند شیخ الادب والتفسیر بہاولپور کی رائے:۔

"جو حضرات جماعت اسلامی کی مخالفت کر رہے ہیں ان کو اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ وہ کن کے ہاتھوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ اور کیا یہ حضرات صدٌّ عن سبیل اللہ کا پارٹ تو نہیں ادا کر رہے ہیں۔

اس عبارت سے حسب ذیل علماء متفق ہیں:۔

مولانا عبد الحق صاحب مفتی و خطیب جامع مسجد اندرون [illegible]۔

مولانا خان محمد صاحب صدر مدرس مدرسہ محمودیہ۔

مولانا عبد الستار صاحب مدرس دوم 〃 〃

مولانا احمد بخش صاحب 〃 〃 〃 〃

مولانا محمد جمال خان صاحب 〃 〃 〃 〃

مولانا غلام مصطفےٰ خاں صاحب فاضل دیوبند

مولانا محمد خلیل صاحب (شاگرد حضرت مولانا انور شاہ صاحب) کی رائے:۔

"جماعت اسلامی جماعت [illegible] ہے۔ اس کے لٹریچر کا پڑھنا پڑھانا ان کی اعانت اور ان سے ہر قسم کا اشتراک اور اس کے کارکنوں کو دینی درسگاہوں میں مدرس رکھنا جائز بلکہ افضل ہے۔"

حسب ذیل علماء کرام اس کی تائید کرتے ہیں:۔

مولانا غلام یٰسین صاحب فاضل دیوبند [illegible] مدرسہ سراج العلوم سرگودھا۔

مولانا [illegible] صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

مولانا غلام یٰسین صاحب کی ذاتی رائے:۔

"جماعت اسلامی حق پر [illegible] ہے۔ [illegible] اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں۔ جو اعتراض کرے گا تعصب سے خالی نہ ہوگا۔"

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم [illegible] اہل حدیث کی رائے:۔

"[illegible] اہل حدیث [illegible] بھی تحریک اقامت دین (جماعت اسلامی) کی مخالفت نہیں کی ہے۔"

مولانا [illegible] احمد صاحب [illegible] رکن مجلس [illegible] اہل حدیث کی رائے

"[illegible] ہیں [illegible] جماعت کو مطعون کیا جاتا ہے [illegible] آج [illegible] کوئی ایسی بات [illegible] ان فتووں کو صحیح سمجھے۔"

مولانا [illegible] مدیر "مصباح" کی رائے

"جماعت اسلامی نے جو لٹریچر تیار کیا ہے دین کی بڑی خدمت ہے۔ [illegible] کتنی غلط فہمیاں پیدا ہو گیا تھا [illegible]

دور میں ناممکن العمل سمجھا جا رہا تھا اسے آج ممکن العمل سمجھا جا رہا ہے۔ (کتاب "کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟" صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۲)
مؤلفہ :- مولانا عبدالرحیم اشرف

ناظرین! مذکورہ علماء کرام کے چند حوالے بطور نمونہ کے پیش کئے ہیں۔ میرے ناقص علم کے مطابق اور سو سے زائد ایسے معتبر اور ثقہ علماء کی رائیں موجود ہیں جنھیں عالم اسلام میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے طوالت کے خوف سے چھوڑ دے رہا ہوں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جماعت اسلامی کے برسر حق ہونے پر ہند و پاک کے علماء کے علاوہ مکہ، مدینہ، مصر، فلسطین، دمشق، مراقش وغیرہ کے معتبر علماء نے اتفاق کیا ہے۔ اب میں ادب کے ساتھ خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیکر اس بھولے "سائل" سے پوچھتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے گمراہ ہونے پر جو امت متفق ہو چکی ہے وہ امت زمین پر ہے یا آسمانوں میں؟

رہا کچھ علماء کا اختلاف کرنا۔ تو ہمیں بتایا جائے کہ دنیا میں وہ کونسی جماعت ہے جس سے کوئی اختلاف نہ کرتا ہو۔ یا وہ کونسا عالم ہے کہ جس کی کسی نے مخالفت نہ کی ہو؟ جماعت تبلیغی یا دیوبندی مسلک، بریلویت، مظاہریت، ندویت یا کوئی ادارہ کم سے کم ایک عالم ایسا بتائیں جسکی مخالفت کسی نے نہ کی ہو۔

تو میرے محترم سائل کسی جماعت یا ادارے یا کسی شیخ اور عالم کی کچھ لوگ مخالفت کریں تو یہ فرمانا کہ امت متفق ہو گئی ہے اس کی گمراہی پر ـــ اپنے جذبات کی تسکین تو ہو جائیگی مگر حقائق نہیں بدلا کرتے!!!

تجلی

یہ بصیرت افروز والا نامہ اگرچہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے لیکن اُس پس منظر کا تذکرہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ہمارا نو مبر والا جوابی مضمون نوک قلم پر آیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ جماعت تبلیغی کی طرف سے جماعت اسلامی کی مخالفت کا علم ہمیں پہلے پہل اسی پر ہم نے داویلا مچایا ہو۔ اسکی بجائے صورت یہ ہے کہ ماضی میں وقتاً فوقتاً ہمیں اس نوع کے مجمل و مفصل خطوط ملتے رہے ہیں اور ہم نے صبر و سکوت کی راہ اختیار کی ہے۔ ابھی ماضی قریب میں یہاں تک ہوا کہ ایک قریبی شہر سے چند افراد ہمارے پاس تشریف لائے اور مقصد تشریف آوری کا یہی ظاہر کیا کہ ہمارے یہاں جماعت تبلیغی اور گروہ دیوبندی کے افراد مل جل کر جماعت اسلامی کی شدید مخالفت پر اُترے ہوئے ہیں اور یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جس وقت اور جس مقام پر جماعت اسلامی کسی اجتماع کا اعلان کرتی ہے اسی وقت اور اُسی مقام کے لئے مخالفین اپنے جلسے کا اعلان کر دیتے ہیں اور جماعت اسلامی والوں کو اپنا اجتماع ملتوی کرنا پڑتا ہے۔

اس ناگوار صورت حال کے علاوہ ان حضرات نے اور بھی بعض المناک تفصیلات سنائیں اور ان میں سے دو حضرات سے تو ہم ذاتی طور پر پہلے سے واقف تھے اس لئے ان کے بیان پر یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر بھی ہم نے اظہار رنج کے بعد انھیں یہی تلقین کی کہ صبر اور دعا سے کام لیں بحث و مناظرہ ٹھیک نہیں اس سے فتنے اٹھیں گے۔

بات رفت گذشت ہوئی مگر کچھ ہی دن بعد چند حضرات اُسی شہر سے پھر تشریف لائے اور اس بار دو پچھلے صاحبوں کے علاوہ ایک نئے صاحب بھی تھے۔ ان کے مجموعی بیانات سے معلوم ہوا کہ صورت حال بہت بگڑ گئی ہے۔ مخالفین جماعت اسلامی والوں کے صبر و سکوت کو کمزوری پر محمول کر کے چیلنج پر چیلنج کر رہے ہیں اور عوام کو قدرتاً یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ جو الزامات جماعت اسلامی پر لگائے جاتے ہیں اور جن وحشت ناک عقائد کا انتساب اس کی طرف کیا جا رہا ہے اگر یہ غلط ہوتے تو جماعت اسلامی والے منہ میں تالا ڈال کر کیوں بیٹھے رہتے اور کیوں نہ چیلنج قبول کر کے ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔

ارباب وفد نے بتایا کہ اس عوامی تاثر کے ازالے کی خاطر ہم مجبوراً بحث و مناظرے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور ایک وکیل صاحب تو بہت شدومد سے جماعت اسلامی کا

دفاع کرنے کو تیار ہیں۔

اس انکشاف پر تبادلۂ خیال تو دفد کے ساتھ عاجز دیر تک کرتا رہا لیکن پایانِ کار جو مشورہ دیا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ راستہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ مناظرے بازیوں سے آج کل فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ تلخیاں بڑھ جائیں اور افتراق کی آگ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

اس پر ان حضرات نے پوچھا کہ پھر آخر کیا کیا جائے؟ عاجز نے عرض کیا کہ وہی جو اب تک کرتے رہے ہیں یعنی صبر و تحمل اور اپنی دعوت پر حکیمانہ استقامت۔ جہاں تک اسٹیج کی بحثوں کا تعلق ہے یہ موجودہ حالات میں ضرر ہی ضرر پر منتہی ہوں گی۔ ہاں اگر مخالفین اس پر آمادہ ہو جائیں کہ ان کی طرف سے کوئی اہلِ علم سنجیدگی کے ساتھ اپنے وجوہِ اختلاف پیش کرے اور پھر ٹھنڈے دل سے ان کے جوابات بھی سُنے اور محاکمہ و فیصلے کے لئے ایک یا دو متفق علیہ شخصیتیں جج مان لی جائیں تو بندۂ ضعیف ہر جگہ جانے کو تیار اور گفتگو پر آمادہ ہے۔

یہ واقعات کئی ماہ پہلے کے ہیں۔ ان کا تأثر ابھی ذہن سے زائل نہیں ہوا تھا کہ وہ خط آیا جس کا جواب ہم نے نومبر میں دیا ہے۔ اس خط پر نہ نام تھا نہ مقام اور چونکہ پہلے مختلف مقامات سے ہمیں اسی نوع کے خطوط وصول ہوتے رہے تھے اس لئے یہ قطعی فیصلہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس خط کا تعلق متذکرہ بالا شہر ہی سے ہے۔ گمان یہی ہوا کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت کی جو آگ کچھ دنوں سے دب سی گئی تھی وہ پھر سے مختلف اطراف و اکناف میں ابھر رہی ہے اور پھر ہمارا فریضہ ہو گیا ہے کہ اس جارحیت کے مقابلے میں سینہ سپر ہوں۔

مزید ثبوت اس بات کا کہ مخالفت کسی ایک شہر تک محدود نہیں سکریم نگر کا وہ خط ہے جس کا جواب سابقہ اشاعت میں دیا گیا ہے۔ اب اگر جناب ابوالفیض صاحب خطیب بنگلور وثوق کے ساتھ یہ بتا رہے ہیں کہ اس فتنہ پردازی کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی جماعتِ تبلیغی سے نہیں ہے تو ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس اطلاع کا خیر مقدم کرتے ہیں اور نہ صرف انھیں بلکہ جماعتِ تبلیغی کے تمام بزرگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو تلخ گفتاری ہم نے اختیار کی اس کا تعلق صرف اس مفروضے پر تھا کہ جماعتِ تبلیغی کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ یہ مفروضہ اگر حقائق کے خلاف ہے تو یقین کیجئے کہ تبلیغی جماعت سے ہمیں شمہ برابر بھی کد نہیں اور بلا کسی تصنع اور تکلف کے ہم تمام ان حضرات سے معافی چاہتے ہیں جنھیں ہماری سخت کلامی سے اذیت پہنچی ہو۔

اور یہ جو ہماری نگارشات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبلیغی جماعت میں سارے گنوار اور احمق ہی ہیں تو اسے بھی ہمارے جہل اور بے خبری کا ثمرہ کہیئے۔ ہمیں اس جماعت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع تو ملا نہیں۔ گاہے گاہے اس کی بعض ٹولیوں کا دیدار نصیب ہوا ہے تو ان میں عموماً عامۃ الناس ہی کو شامل پایا۔ پھر یہ دیکھا کہ وہ بلا شرط و قید ہر مسلمان کو چِلّہ دینے کی ترغیب دیتے ہیں لہٰذا نتیجہ اس کا لازماً یہی ہونا چاہیئے اور یہی ہو رہا ہے کہ بہت سے انگھڑ لوگ شریکِ کار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے وہ خیال قائم کیا جس کی فاضل خطیب صاحب تردید کر رہے ہیں۔ زہے نصیب۔ اگر یہ تردید واقعات کے مطابق ہے تو ہمیں اپنے قصور کے اعتراف میں ہرگز تامل نہیں علام الغیوب جانتا ہے کہ جو بھی سخت کلامی اور تعریض و تحقیر ہم نے کی وہ کسی معظم شخصیت کی توہین کی نیت اور بغض و استکبار پر مبنی نہیں تھی بلکہ اُس کا مبنیٰ صرف اور صرف یہ تھا کہ جس جماعتِ اسلامی کو ہم دَورِ حاضر کی بیکنار ظلمتوں میں ایک مشعل، ایک چراغ، ایک نشانِ راہ سمجھے ہوئے ہیں اس پر یلغار اور حملہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برداشت نہ کرنے کی صورت میں بھی ہمیں متانت و تحمل، اعتدال و احتیاط اور شیریں بیانی و نرم گفتاری کی راہ اختیار کرنی چاہیئے لیکن یہ وصف انسان کے اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا۔ مضبوط اعصاب اور فائر پروف دماغ اپنے ہاتھ سے تو نہیں بنائے جا سکتے۔

اسلام ہر طرف مظلوم ہی مظلوم غریب ہی غریب ہے۔ صدائیں
طاغوتی قوتوں کی ٹھوکروں میں نیم بسمل ہیں۔ حق پا شکستہ کر کے
ڈال دیا گیا ہے۔ یہ زہرہ گداز نظارہ اگر احساس کے پہلو میں
ایک زخم مستقل بن جائے تو کوئی تعجب نہیں ہے کہ آدمی معمولی
سی ٹھیس سے چلا اٹھے' بیتاب ہو جائے' واویلا کرنے لگے۔

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

جو کچھ ہوا سو ہوا۔ جماعت تبلیغی کے افراد جماعت اسلامی
سے نہ الجھیں تو ہمیں بھی اول الذکر پر لے دے کرنے کی ضرورت
نہیں۔ تاہم ہمیں یقین ہے کہ جماعت تبلیغی کو سمجھنے میں خود آں
جناب نے بھی کسی نہ کسی حد تک دھوکا کھایا ہے۔ یہ جو آپ نے کہا:۔

"جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے میں نے یہی
سمجھا ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق' نظام اسلامی' شرعی
احکامات کا احیاء' قانون خداوندی کا اجراء'
اسلامی معاشرہ' طاغوتی قوتوں سے مقابلہ' خلافت
ارضی' جہاد فی سبیل اللہ' کل دین پر عمل پیرا ہونا'
یہ جتنی اصطلاحیں جماعت اسلامی میں رائج ہیں
اور ان مقاصد کے لئے دن رات کوششیں ہو رہی
ہیں' یہی سب کچھ تبلیغی جماعت کے بھی پیش نظر ہے۔"

تو یہ محض خوش فہمی ہے واقعات اس کی تائید نہیں
کرتے ۔۔ پہلے افراد کی اصلاح ہو یا پہلے اسلام کو قوت و سطوت
حاصل ہو یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر ہم انشاء اللہ کسی اور
صحبت میں گفتگو کریں گے۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں
پہلے اور بعد کی بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کے بارے
میں بحث کی جائے کہ پہلے اسے زمین میں لگا کر اچھی طرح کھاد او
پانی دیا جائے یا پہلے اس کے لئے وہ مقام تلاش کیا جائے
جس کی آب و ہوا میں یہ اگ بھی سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جتنی
ضرورت کسی پودے اور بیج کے لئے اچھی تولائی اور آبیاری
اور نگہداشت وغیرہ کی ہے اتنی ہی ضرورت یہ دیکھ لینے کی
بھی ہے کہ زمین بنجر نہ ہو اور آب و ہوا موافق ہو۔ کیا آپ نہیں
دیکھتے کہ متعدد پھل اور بیلیں اور جڑی بوٹیاں ہر مقام پر
نہیں اگا کرتیں چاہے ان پر کتنی ہی محنت کی جائے۔ لہٰ
ڈالتے اور پودا لگاتے وقت ہی یہ دیکھ لینا بھی ضروری
زمین اور آب و ہوا بھی موافقت کرے گی یا نہیں او
ہی اس کا انتظام بھی ساتھ ساتھ ہی کرنا ہو گا کہ پالا اور
دھوپ ساری محنت اکارت نہ کر دیں۔ اسی پر قوموں
کیا جا سکتا ہے جتنی شدید ضرورت افراد و اشخاص کے
اصلاح کی ہے اتنی ہی شدید ضرورت ایسا ماحول اور فض
پیدا کرنے کی بھی ہے جس میں نیکیوں کے پودے طوفانی یا
یا ہولناک گرمی سے برباد نہ ہو جائیں اور برائیوں کی آند
ان کی کمر توڑ کر نہ رکھ دیں۔ کوئی کام ان میں سے پہلے اور
کی قید سے مقید نہیں ہے' بلکہ ایک ساتھ دونوں کی کوشش
ہونی چاہئیں۔

تاہم کچھ دیر کے لئے اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ شخصی اصلا
تربیت اور اجتماعی انقلاب کے درمیان تقدم و تاخر اور تد
تربیت کا فلسفہ کوئی مفید فلسفہ ہے تب بھی یہ دعویٰ خلاف
واقعہ ہی ہو گا کہ جماعت تبلیغی نے بھی اسی فلسفہ کو اختیار
ہے۔ یہ تو اس صورت میں درست ہوتا جب کہ اس جماعت
اصول و افکار اور عملی طور طریق سے بھی اس کا ثبوت مل سک
صراحتہً نہ سہی دلالتہً یا اشارۃً ہی سہی اس کے کسی قول
فعل سے تو یہ مترشح ہونا چاہئے تھا کہ آنجناب کے حسن ظن کے مطا
وہ کامل اقامت دین ہی کو منزل مقصود تصور کرتی ہے اور ا
موجودہ جدوجہد اسی منزل اعلیٰ کے لئے وسیلہ اور مبدء و مب
ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا لٹریچر اور طریق کار اور طرز ف
قطعی طور پر اپنی موجودہ جدوجہد ہی کو منزل' منتہا اور نصب الع
باور کراتا ہے اور جماعت اسلامی جس اجتماعی اور ہمہ گیر اصلا
تطہیر کو نصب العین قرار دیتی ہے اس کے بارے میں تو
تبلیغی جماعت میں نہ صرف یہ کہ کوئی ایجابی شعور نہیں پا
جاتا بلکہ اگر ہو تو اسے ایک غیر دینی' غیر اہم اور حقیر و کمتر
سمجھتی اور سمجھاتی ہے۔

طبیبوں کا ایک گروہ اگر نہایت انہماک اور یکسوئی کے
ساتھ مریضوں کے معالجے اور دیکھ بھال میں مشغول ہے اور اد

مرتے ہوئے بچوں، غلاظت کے ڈھیروں اور کوڑے کرکٹ کے انباروں کی طرف توجہ نہیں دے رہا ہے تو حسن ظن سے کام لیکر تاویل کی جاسکتی ہے کہ بیماریوں کو جنم دینے اور صحت کو برباد کرنے والی آب و ہوا کی طرف سے اس کی لاپروائی اس لئے نہیں ہے کہ وہ صحت کے تحفظ اور امراض کے استیصال کے لئے اچھی آب و ہوا کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس لئے ہے کہ مریضوں کا براہ راست معالجہ اسے کچھ اور کرنے اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا۔

لیکن طبیبوں کے اسی گروہ کو اگر ہم اس طرح کی باتیں کرتے سنیں کہ صفائی تو لایعنی چیز ہے، غلاظتوں کے ڈھیروں سے سر مارنا تو تن پرستی کے اصولوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا، مسموم آب و ہوا اور غبار و دود سے لبریز فضا کی تطہیر سے تو طبابت و حکمت کا کوئی ربط ہی نہیں اور براہ راست مریضوں کا علاج کرنے کی بجائے خارجی مؤثرات و عوامل پر محنت کرنا تو حفظانِ صحت کے دائرے سے باہر کی بات ہے — تو بتائیے اس حسن ظن اور توجیہہ کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ یہ گروہ صحت بخش آب و ہوا اور صاف ستھرا ماحول پیدا کرنے کا بھی کوئی قصد رکھتا ہے۔

آپ اگر کوئی واقعاتی ثبوت اس بات کا پیش کر سکتے ہوں کہ جماعت تبلیغی بھی بقول آپ کے قانونِ خداوندی کے اجراء، طاغوتی قوتوں سے مقابلے اور خلافتِ ارضی جیسے مرائی مقاصد پر نظر رکھتی ہے تو خدارا اس ثبوت کو ضرور پیش کیجئے۔ ہمیں تو اس کی تحریر و تقریر میں صرف ایسی تعلیمات ملی ہیں جو بجائے خود اگرچہ مقدس اور پسندیدہ ہیں لیکن ان کا مجموعی مفاد اور تاثر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دین کا ایک حصہ تو تمام تر توجہات کا مرکز بن جائے اور دوسرا حصہ یکسر نظر انداز ہو جائے۔ یہ تعلیمات ذہن کو ایک رہبانی زاویۂ فکر دیتی ہیں ایک ایسا مزاج دیتی ہیں جو اہلِ ایمان کو طاغوت کی بالادستی پر نہ صرف قانع رہنا سکھاتا ہے، بلکہ اُن لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی تلقین کرتا ہے جو طاغوت سے دو دو ہاتھ کرنے اور اسلام کو مسندِ اقتدار پر بٹھانے کی دعوت دے رہے ہوں۔

ہم شواہد پیش کریں گے تو کافی طول ہوگا۔ فی الوقت صرف ایک تازہ شہادت پیش خدمت ہے جس سے اس جماعت کے فکری منہاج اور مبارک فہم کا اندازہ دشوار نہ ہوگا۔

ابھی ۱۰ر دسمبر ۶۲ء کے روزنامہ دعوت (دہلی) میں خبر و نظر کے تحت پہلی ہی جو اطلاع چھپی ہے یہ ہے:—

"ہندوستان کی بیشتر مسلم جماعتوں کے رہنماؤں کی خدمت میں اور ان کے مرکزی دفاتر میں دعوت کی ایک ایک اعزازی کاپی بھیجنے کا انتظام ہے اسی طرح مولانا محمد یوسف صاحب امیر تبلیغی جماعت کی خدمت میں بھی بستی نظام الدین کے پتے پر یہ پرچہ بھیجا جاتا تھا۔ حضرت مولانا نے اپنے ایک تازہ خط میں اخبار کو روکدینے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھا ہے جسے بلا کسی تبصرے کے نذرِ قارئین کیا جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں:—

"ہمارے یہاں اخبارات اور فضائے حاضرہ سے متعلقہ امور کے مطالعہ کرنے کا دستور نہیں ہے کیونکہ انکی وجہ سے انسان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والے قیمتی اعمال سے ہٹ کر فضائے حاضرہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔"

ایک بالغ نظر انسان کے لئے تبلیغی جماعت کے محترم امیر کا یہ ارشادِ گرامی آئینہ ہے اُس اندازِ فکر کا جو تبلیغی جماعت کے مجموعی ذہن کو متعارف کراتا ہے۔ محترم امیر اگر وجہ ظاہر کئے بغیر اخبار کو روکوا دیتے تب تو استنتاج کی گنجائش نہیں تھی، لیکن انھوں نے وجہ ظاہر کر کے صاف طور پر اُن خوش فہم حضرات کی توبیخ و تردید کر دی ہے جو یہ حسن ظن لئے بیٹھے ہیں کہ جماعت تبلیغی بھی اُسی نصب العین کی طرف جا رہی ہے جس کی طرف جماعت اسلامی دعوت دیتی ہے۔

شاید عبداللہ ابن عباسؓ کا یہ قول آپ کی نظر سے گزرا ہو کہ تقدیر پر ایمان رکھے بغیر پچاس ہزار سال کی عبادت بھی بیکار ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسلام کے اساسی عقائد میں سے کسی ایک بھی عقیدے

سے محرومی نفسِ ایمان ہی سے محرومی ہے اور ایمان ہی درست نہ رہے تو لاکھ برس کی عبادتیں بھی رد ہیں۔ تو ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا قرآن کی ایک ایک آیت پر ایمان رکھنا بھی اساسی عقائد میں داخل نہیں؟ کیا وہ شخص مومن ہو سکتا ہے جو بعض آیات پر تو زور دیتا رہے مگر بعض آیات کے مطالب و مقاصد سے نہ صرف بے اعتنائی برتے بلکہ انھیں حقیر اور مذموم قرار دے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو نمونے کے طور پر ہم صرف ایک ہی آیت کا ذکر کریں گے جس کے مضمرات و مفادات کو ملحوظ رکھنا اللہ کے نزدیک اتنا ضروری ہوا کہ قرآن میں تین بار اسے دہرایا۔ کتاب اللہ اٹھا لیجئے اور سورۃ توبہ کا پانچواں رکوع کھولیے:۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔	اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر۔

+ + + + +

پھر سورۃ فتح کا چوتھا رکوع دیکھئے۔ لفظ بہ لفظ یہی آیت پھر ملے گی۔ پھر سورۃ صف ملاحظہ کیجئے اس میں بھی رکوع اول میں جوں کی توں یہی آیت دیکھیں گے۔ اس میں آخر اس کے سوا کیا آگاہی دی گئی ہے کہ رسول کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث کرنے کا مقصود و مطلوب ہی یہ ہے کہ یہ دین دوسرے تمام دینوں پر غالب کر دیا جائے۔ اسی لئے اللہ کے رسولؐ نے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی ایک ایسی ریاست قائم کر کے دکھلائی جس میں اسلام غالب تھا اور دوسرے دین مغلوب۔ اسلام قاضی تھا، آمر و ناہی تھا، صدر نشین تھا اور رسولؐ کے بعد بھی اس کے جانشینوں نے اسلام کی اس حقیقی منزلت و حیثیت کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اور اپنی صلاحیتوں کا ایک ایک حبہ صرف کر دیا۔ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی آئین نافذ کرنے والے امیر و امام کا نصب مسلمانوں پر واجب ہے، اور امرِ واجب جن مسائل و مساعی پر منحصر ہوا کرتا ہے ان کا واجب ہونا صرف فقہاء ہی کے نزدیک نہیں دنیا کے ہر دانشور اور ماہر قانون کے نزدیک مسلمات میں سے ہے۔ تو ہم دریافت کریں گے کہ جو فرد یا گروہ غلبۂ دین کے مقصد عظیم میں سعی و جہد تو کیا کرے ایسا کرنے ہی کو دین کے خلاف اور تعلیمات رسول کے منافی قرار دے اس کے بارے میں کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اس کا ایمان اور ضمیر ہی نقص و فساد سے آلودہ نہیں ہے۔ ہمیں علمائے سلف میں سے کسی ایک عالم کا بھی یہ انوکھا خیال کہیں نظر نہیں آیا کہ "حالاتِ حاضرہ" سے ذہنی طور پر ترکِ تعلق کر لو اور کسی کنویں یا گھاٹی یا غار میں چھپ کر ذکر اللہ کئے جاؤ۔

باری تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔	اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔

اللہ کی مدد کرنا اس کے سوا کیا ہے کہ جو مقاصد و مطالب اس معاشرۂ انسانی کے لئے اللہ کو پسند ہیں انسان انھیں روبہ کار لانے کی جدوجہد کرے۔ اس نے فرمایا کہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، قربانی، صوم، تواضع، مروت، حیا، رحم، حسنِ اخلاق مجھے پسند ہیں۔ اب جو شخص ان مرضیاتِ الٰہیہ کو روبہ کار لانے میں سعی بلیغ کرتا ہے وہی قرآن کی اصطلاح میں اللہ کا مددگار ہے۔ فقرا و مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف اللہ نے جس انداز میں کی اسے بھی یہاں تازہ کر لیجئے:۔

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ دحشر	جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور (محروم کئے گئے) اپنے مالوں سے ڈھونڈتے ہیں وہ اللہ کا فضل اور مدد کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی۔ وہی لوگ ہیں سچے۔

تو ہمیں بتلایئے کہ دینِ حق کا جو غلبہ اللہ کو اس درجہ مطلوب و مرغوب ہے کہ اسی کو مقصدِ بعثت قرار دے رہے ہیں اس کے لئے جدوجہد اور اس جدوجہد کے مبادیات و مبانی کو مذموم اور سنت کے منافی اور لائقِ پرہیز قرار دینے والوں کے بارے میں اس حسنِ ظن اور تاویلِ نیک کی کیا گنجائش ہے جس پر آپ اصرار فرما رہے ہیں۔ ایک شخص درخت کاٹنے، سوختہ خریدنے اور چولھا جلانے کو قبیح و ذلیل قرار دے تو علم و فہم کا فیصلہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ یہ شخص

[کھ]انا پکانے سے روک رہا ہے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ [فر]مائیے۔ آپ کو ملے گا کہ حضورؐ "فضائے حاضرہ" سے نہ صرف باخبر [ر]ہتے تھے، بلکہ زیادہ سے زیادہ باخبر رہنے کے لئے چاق چوبند مخبروں [س]ے خدمات لیتے تھے۔ یہ آئے دن مجاہدوں کی شیرازہ بندی۔ یہ [و]قتاً فوقتاً سرایا بھیجنے کا اہتمام، یہ کافروں کے حملے سے قبل دفاعی [ا]قدامات، یہ دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور منصوبوں کی بر وقت [ک]اٹ، یہ سب آخر اسی حقیقتِ ثابتہ کے مظاہر تو ہیں کہ حضورؐ ایک تارک الدنیا راہب، ایک گوشہ نشین زاہد، ایک بے خبر [ف]قیر نہیں تھے، بلکہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے والے قائد، منفی و مثبت عوامل پر نگاہ رکھنے والے مصلح، آنکھیں کھلی رکھنے والے جنرل اور سیادت و حکومت کی زمام کو مضبوط پکڑنے والے رسول تھے۔ اگر وہ بھی تبلیغی جماعت کی آئیڈیالوجی اور اندازِ فکر کو اختیار کر کے "حالاتِ حاضرہ" سے بے خبر رہنے ہی کو تقاضائے دین سمجھ لیتے تو اسلام کا مکمل خاتمہ پہلی ہی صدی ہجری [م]یں ہو چکا ہوتا۔ افسوس ہے اس ذہن پر جو حضورؐ کے سیاسی و عسکری افعال و اشغال کو نہ صرف ان کے اسوۂ حسنہ سے خارج اور بے قیمت قرار دیتا ہے، بلکہ انھیں "عملِ رسول" ہی نہیں مانتا۔ هيهات ثم هيهات كيف يحكمون

اس وقت کی گفتگو محض ضمنی ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سمجھا نہ آج سمجھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والوں کا کام لایعنی کام ہے اور یہ بھی خوش فہمی ہمیں نہیں کہ جماعت اسلامی والوں کا طریق کار وہ واحد طریق کار ہے جس سے ہٹ کر دین کی کوئی خدمت ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن یہ ہم ضرور سمجھتے ہیں اور اس پر ہمیں اصرار ہے کہ جماعت اسلامی کے نصب العین میں کوئی غلطی نہیں۔ وہ ہمیشہ عینِ حق رہا ہے اور ہمیشہ عینِ حق رہے گا۔ انفرادی اصلاح و تطہیر کی مساعیِ جمیلہ کے ساتھ اجتماعی دائروں میں اسلام کو غالب و نافذ کرنے کی حتی المقدور کوشش مسلمان کا مقصدِ حیات ہے۔ اس مقصد کے لئے طریق کار کا اختلاف تو بجا ہو سکتا ہے لیکن اس مقصد کی سرے سے نفی اور تحقیر بجا ہرگز نہیں۔ آپ اگر واقعی دلائل سے یہ واضح فرما سکتے ہوں کہ تبلیغی جماعت اس مقصد کی قائل ہے تو تجلی کے صفحات حاضر ہیں۔ ہم حقائق کی روشنی میں ہر بات مان سکتے ہیں مگر یہ نہیں مان سکتے کہ اللہ کے رسولؐ نے دین کو سیاست و حکومت کے دوائر میں غالب و نافذ کرنے کی جو نمایاں کوششیں کیں وہ اس حد تک بے قیمت تھیں کہ انھیں اسوۂ حسنہ کا جز نہیں مانا جا سکتا۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ جھوٹ صرف یہی نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہا جائے، جھوٹ یہ بھی ہے کہ دینِ حق کو من کل الوجوہ غالب و مقتدر کرنے کی سعی و خواہش کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے قیمتی اعمال سے ہٹنا قرار دیا جائے۔ واللہ الموفق للصواب وهو يهدي من يشاء الى صراط مستقيم۔

مستقل عنوان

ملّا ابن العرب مکّی

کتنی پامال امنگوں کا ہے مدفن مت پوچھ
وہ تبسّم جو حقیقت میں فغاں ہوتا ہے

مسجد سے میخانے تک

ذرا سوچئے آپ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نہایت آسودگی اور یکسوئی کے ساتھ بین الاقوامی معاملات پر غور و فکر کرنا چاہتے ہوں اور قریب ہی کوئی نامعقول شخص خواہ مخواہ — رہ رہ کر ہنسنے کی ریہرسل کئے جا رہا ہو تو آپ کے دل و دماغ پر کیا گذرے گی۔ ہنسنا تو خیر برحق ہے مگر ذکر اس ہنسی کا کر رہا ہوں جو ہنسنے سے زیادہ رونے اور رونے سے زیادہ منہ چڑانے کے انداز میں دل اور جگر سب کو کباب بنا کر رکھ دیتی ہے اور فرض کیجئے یہ نامعقول شخص آپکی بیوی ہو تب تو سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے یا تو آپ پہلی فرصت میں اسے طلاق دے کر اپنا سر دیواروں سے ٹکراتے پھریں گے یا پھر بھاگے بھاگے صوفی مسیح الزماں کے پاس جائیں گے اور نقد اُدھار جس طرح بھی ہوگا آسیب کا تعویذ لیکر آئیں گے تیسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل پر لات مار کر آپ کوئی فلمی دُھن الاپنی شروع کر دیں۔

مگر میں نے ان تینوں میں سے ایک بھی راہ اختیار نہیں کی، بلکہ نہایت الحاج و زاری کے ساتھ اس شخصِ نامعقول کو مخاطب کیا جسے عرفِ عام میں میری بیوی کہتے ہیں۔

"بانو! تمھاری بُننے کی سلائیاں کہاں ہیں؟"

انھوں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"گھورو مت۔ میں چاہتا ہوں سلائیاں لاکر میرے دونوں کان پھوڑ دو۔ یہ قسط وار ہنسی میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

ان کے چہرے پر ایک لہر سی آئی۔ ہونٹ زور سے بھینچے اور پھر ایک ناقابلِ برداشت کھلکھلاہٹ کے ساتھ وہ دُہری ہوتی چلی گئیں۔

"یہ ٹھیک ہے۔ ایک مرتبہ پیٹ بھر کر ہنس لو میں نہ پوچھوں گا کہ یہ مہینے کے آخری ہفتے میں رونے کی بجائے ہنسنے کا کونسا موقع ہے۔"

انھوں نے اوڑھنی کا کونا منھ میں دبا کر ہنسی کو بالجبر روکا اور جھپٹ کر باورچی خانے میں غائب ہو گئیں۔ نیرنگیٔ زمانہ کہئے آج صبح ہی سے ان پر کچھ دورہ سا پڑ رہا تھا۔ جس وقت نمازِ فجر سے فارغ ہو کر میں مسجد سے لوٹا ہوں تو باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی ننھی زینب کے یہ الفاظ کان میں پڑے تھے

"امّی! آپ بار بار ہنس کیوں رہی ہیں۔"

"تم نہیں سمجھو گی بیٹی — لو چائے پیو۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے چائے کی پیالی بیٹی کی طرف بڑھائی تھی مگر اس سے پہلے کہ بیٹی اسے اپنے ننھے ننھے ہاتھ میں سنبھالے ان کے ہونٹوں پر ایک تر و تازہ قہقہہ اُبل آیا تھا۔ اس کا ثمرہ اس کے سوا کیا ہوتا کہ بہت سی گرم چائے بیٹی کے پیروں پر چھلک گئی اور اسے چمکارنے کا فریضہ مجھے ادا کرنا پڑا۔ پھر میں نے سوال کیا تھا:-

"خیر تو ہے نیک بخت یہ صبح ہی صبح خندۂ بے اختیار کیسا؟"

خندۂ بے اختیار دراصل میں نے رات ہی ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ اس کے استعمال کا موقع نکلا تو چُوکتا کیوں۔

انھوں نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے اس طرح

[آ]یا تھا جیسے ہنسی کی کوئی طوفانی لہر پھر ہونٹوں سے ٹکرانے [کے] لئے بیتاب ہو۔

"خدایا خیر!" میں نے طویل سانس لیکر کہا۔ "رات [تو] مہینے کے آخری ہفتے پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر سوئیں تھیں کیا [ص]بح ہی صبح بھائی صاحب نے سو کا نوٹ بھیجدیا ہے؟"

"خدا رکھے انھیں بھیج ہی دیں گے تو اس میں طعنے کی [ک]یا بات ہے" ان کے تیور دفعتاً بگڑ گئے تھے۔

"نعوذ باللہ تم عورتیں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہو۔ طعنہ کس مردود نے دیا۔"

"اور نہیں تو کیا دیا یاد کیجئے ابھی پچھلے ہی مہینے تو آپنے گورکھپور کے لئے پچاس روپے لئے تھے۔"

"پھر کیا ہوا۔ وہ تو تم سے لئے تھے۔ تم میری زوجہ ہو۔ تم پر میرا حق ہے۔"

"زوجہ مری بیٹھی پر کیا آسمان سے روپے برستے ہیں۔ رو دھو کر بھیا ہی سے لائی تھی۔"

"اچھا کیا لائی تھیں۔ تم ان کی بہن ہو تمہارا ان پر حق ہے۔"

"آپ پر بھی کسی کا حق ہے؟" وہ جھلا کر بولی تھیں۔

"تاؤ مت کھاؤ ـــ میری گمراہی کی ذمہ داری بھی دراصل تمہارے بھیا ہی پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے تجلّی میں لکھا تھا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ میں اسی لئے مطمئن تھا کہ امرود اور پپیتے کے پیوند سے سیب اُگانے پر بھی وہ قادر ہو گا مگر روپیہ اور وقت برباد کرنے کے بعد پتا چلا کہ گلہری اور لنگور کے پیوند سے ہاتھی پیدا ہو سکتا ہے مگر امرود اور پپیتے کے پیوند سے سیب پیدا نہیں ہو سکتا۔"

وہ ہونٹوں کی بجائے ناک سے مسکرائی تھیں۔

"خیر بانو۔ ویسے تو میں اتنا خوددار ہوں کہ اگر میری لاش بھی بے گور و کفن پڑی ہو گی تو تمہارے بھیا سے نہیں کہوں گا کہ مجھے کفن پہنا دیجئے مگر۔۔۔۔ مہینے کے ابھی پانچ دن باقی ہیں تم ان سے بیس روپے لے آؤ تو دس روپے صوفی تمکین کو دیدیئے جائیں گے وہ کہہ رہے تھے کل نوچندی جمعرات ہے ایسا وظیفہ پڑھیں گے کہ دس کے بیس بن جائیں گے۔"

"آگ لگ جائے ان کے وظیفوں کو۔ وہ غریب تمکین کے بیس روپے کھاتے ہیں کہ لڑکا پیدا ہو گا۔ ہوتی وہی لڑکی۔"

"اس میں صوفی جی کا کیا قصور۔ انھوں نے تنبیہ کی تھی کہ ٹھیک جس دن نواں مہینہ شروع ہو غوث الاعظم والا وظیفہ پڑھنا۔ اب وہ غوث کو گوس پڑھے تو لڑکا کہاں سے پیدا ہو جائے گا ـــ اور پھر اسی کی کیا ضمانت کہ اس نے دن کا ٹھیک اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کی ہو گی۔"

"آپ ایسی باتیں باورچی خانے سے نکل کر کیا کریں۔ اسکی چھت پرانی ہے۔"

الحاصل میرے دماغ میں آج تڑکے ہی سے بین الاقوامی مسائل کی ریل پیل تھی۔ فجر کی جماعت میں فکر و تدبر کی کافی گنجائش ملتی ہے۔ امام صاحب تو لمبی قرأت فرما رہے تھے اور عاجز اس اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اگر درگاہ فرخ شاہ کے سجادے نے تھانے دار صاحب کے ذریعہ بادڈا لکر مشتری بائی کی ٹولی کو توڑ لیا تو درگاہ غوثیہ کا مستقبل کیا ہو گا۔ اگلے عرس کیلئے سیٹھ مسالے والا سے نیاز کی رقم کیسے وصول ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ مشتری بائی کے بغیر پل بھر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہی مسائل جاتے پیتے ہوئے بھی بھیجے میں کلبلاتے رہے ناشتے سے فارغ ہو کر ـــ بشرطیکہ ایک باسی روٹی اور دو پیالی چائے کو ناشتہ کہا جا سکے دالان میں آیا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ یہ پوزیشن دقیق مسائل پر غور کرنے کے لئے بہترین سمجھی گئی ہے۔ چند ہی لمحے گذرے تھے کہ ملائم کی دبی دبی ہنسی کانوں میں سرسرائی۔ میں نے صبر جمیل کیا۔ کچھ دیر بعد پھر یہی ہوا۔ میں نے پھر صبر جمیل کیا۔ تیسری بار پھر یہی ہوا مگر اب کی صبر کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کیونکہ خیالات کی رو بُری طرح بہکنے لگی تھی۔ ایک دفعہ تو بجائے درگاہ غوثیہ کے رنجیت مووی ٹون کے فلم اسٹیڈیو میں پہنچ گیا اور مشتری بائی کے عوض ثریا وغیرہ سامنے آ کھڑی ہوئیں تب مجبوراً غرغرا کر عرض پذیر ہوا۔

"بس کرو بانو۔ میں سر کے بل کھڑا ہو کر پاگل کتے کی طرح بھونکنے لگوں گا۔ تم آخر بتاتیں کیوں نہیں کہ ہنسی کا بھوت آج تمھارے سر پر کیوں سوار ہے؟"

"آپ نے تازہ "صدق" دیکھا؟" انھوں نے دفعتاً پوچھا

"صدق۔۔۔ یعنی اخبار صدق؟"

"جی ہاں"

"دیکھا یا نہیں دیکھا مگر اس میں مزاحیہ کالم کب سے آنے لگا؟"

"اب کی آیا ہے ــــ دیکھیں گے آپ؟"

اپنا سر پھوڑوں گا اور دیکھوں گا ــــ دکھائے گی ہمیں جو گردش تقدیر دیکھیں گے"

وہ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء کا صدق اٹھا لائیں اور صفحہ ۶ میرے سامنے کھولدیا۔ اس میں عنوان تھا:۔

"مولانا مودودی کی خدمت میں"

اس کے تحت مولانا دریابادی کے نام کسی صاحب کا مکتوب درج تھا جن کا نام حذف کرکے مولانا نے یہ الفاظ بریکٹ میں لکھے تھے:۔

(ایک اعلا تعلیم یافتہ پاکستانی کے قلم سے)

اعلا بجائے یائے ممدودہ کے الف سے لکھا گیا ہو تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے رویا البتہ جا سکتا ہے۔ پورا خط پڑھا تو پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ مزاح کا عنصر اس میں کہاں ہے۔ نہایت سنجیدہ، ٹھوس اور ثقہ خط۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ ہنسی کی رمق بھی ہونٹوں تک آجائے تو میرا نام ابن العرب کی بجائے علی بابا چالیس چور رکھدیجئے گا۔

خط مطبوعہ صدق

صدق ۵۳ء مطابق ۲۰ر نومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳ "مولانا مودودی کی خدمت میں" یہ تقریر میں نے بھی پڑھی تھی اور پڑھ کر کچھ لکھا بھی تھا کہ صدق کے لئے ارسال کروں مگر تحریر ضائع کر دی کہ کیا خواہ مخواہ ایسے جھگڑوں میں الجھنا، مگر یہ پرچہ دیکھ کر تقریر پھر ذہن میں ابھر آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا مودودی صاحب کو ایسی تقریریں کرنے میں کیا لطف آتا ہے۔ مولانا کی تقریریں اسلام کے ساتھ ایک بہت بڑا طنز ہیں۔ اگر مارشل لا نے ساری قوم کو بزدل بنا دیا ہے تو کیا مولانا خود بھی پسند فرمائیں گے کہ ان کو بزدل کہا جائے؟ یقیناً وہ اپنے کو بڑا دلیر کہتے ہیں اور ہرگز نہ مانیں گے کہ وہ بھی بزدل ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں مارشل لا نے مولانا کو دلیر بنا دیا ہے کیونکہ مارشل لا سے پہلے مولانا کی کو بھی ایسی دلیرانہ تقریر ہماری نظر سے نہیں گذری۔ افسوس مولانا بہت کچھ جاننے کے باوجود بہت کچھ سمجھتے نہیں۔

میں روز بروز اس حقیقت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ فکر، تدبر اور علم کے لحاظ سے یہ بیسویں صدی مسلمانوں کے لئے بالکل بنجر ہے۔ مسلمانوں کے یہاں جس قدر عالم، مفکر اور ... پیدا ہوئے اس بر اعظم میں وہ سب کے سب پچھلی صدی کی پیداوار تھے! فہرست بنا کر دیکھ لیجئے اور مولانا مودودی بیسویں صدی کی فہرست میں آتے ہیں۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ اب ان کو چاہئے کہ خاموشی سے بیٹھے تفسیر لکھتے رہیں یا اہل قرآن سے بحثوں میں الجھے رہیں۔ مگر خدارا ہماری سیاست کو مکدر نہ کریں۔ یہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ مولانا مودودی کو چاہئے کہ قوم کا اخلاق سدھاریں شراب کے خلاف جہاد کریں۔ ستیہ گرہ کریں۔ ٹیڈی ازم کا انسداد کریں، چور بازاری بند کروائیں، کیا یہ کرنے کے کوئی کام کم ہیں؟ بزدلی احساس کمتری کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ ڈاکٹر ایڈلر ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ ایک ماں اپنے تین بچوں کو لیکر چڑیا گھر گئی۔ سب سے بڑے کی عمر ۸ برس کی تھی۔ درمیانہ ۵ برس کا تھا، اور سب سے چھوٹا ۳ برس کا جب وہ شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچے تو بڑے لڑکے نے پنجرے کے اندر پتھر پھینکا شیر نے للکارا اور اس کی دھاڑ سن کر سب لڑکے سہم گئے، مگر بڑے لڑکے نے کہا۔ ماں ذرا تم یہاں ٹھیرو میں جاکر ابھی اس سے سمجھ لیتا ہوں درمیانہ بولا۔ ماں مجھے پتھر دینا میں اس کی ذرا خبر لوں اور سب سے جو چھوٹا تھا وہ پکارا۔ ماں مجھے گھر لے چلو مجھے اس کی شکل پسند نہیں! اگر مولانا اپنے آپ کو اس مثال میں فٹ کرکے دیکھیں تو اپنا مقام تلاش کر سکتے ہیں۔ ایاز قدر خود

بشناس! اب مولانا کا یہ فرمانا کہ مارشل لا نے قوم کو بزدل بنا دیا ہے۔ قابل توجہ نہیں رہتا۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ تو خط ہوا۔ اب وہ ریمارک بھی ملاحظہ فرما لیجئے جو مدیر صدق مولانا دریابادی نے اس پر دیا ہے۔

فرماتے ہیں:۔

"مراسلے میں گو بعض فقرے صدق کے معیار و مذاق کے نہیں۔ پھر بھی مراسلہ نگار نے بہ حیثیت مجموعی صدق کی ترجمانی کردی ہے۔ اقامتِ دین کے داعی کے لئے یہ بے شک ضروری ہے کہ وہ راعی و رعایا دونوں کی اسلامیت کا احتساب کرتا رہے اور خود بھی اپنا تعمیری، اصلاحی پروگرام جاری رکھے۔ لیکن پالیسی اور سیاست کاری کے جزئیات اگر وہ مخلص و جہاندیدہ اہلِ سیاست ہی پر چھوڑے رہے تو بہت بہتر ہو۔ اسے چاہیئے کہ اس کے لئے پوری جدوجہد (بلکہ جہاد) کر ڈالے کہ ملک بھر میں ایک بھی پیشہ ور فاحشہ نہ رہ جائے بدکاری کی طرف لیجانے والے ادارے سب قطعاً بند کر دیئے جائیں شراب کا ایک قطرہ نہ ملنے پائے۔ سودی کاروبار بڑی سے بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ رشوت، خیانت، ظلم، چوری کا سدباب ہو جائے وغیرہا۔ لیکن یہ کہ ملک کا نظامِ حکومت کیا ہو۔ جمہوری یا آمرانہ اور پھر اگر جمہوری رہے تو پارلیمنٹری طرز کا ہو۔ یا صدارتی طرز کا۔ انتخابات سہ سالہ ہوں یا پنج سالہ۔ انتخابی طریقے کیا کیا ہوں۔ اس قسم کے سارے سوالات اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں — اصطلاحی نام جو کچھ بھی ہوں، حقیقت کے اعتبار سے حکومت اپنے ہر شعبہ میں اسلامی ہو۔ یعنی خلافتِ راشدہ کے نمونے کی"۔

کہیئے ہے کوئی ہنسنے کا موقع؟ مگر ہائے یہ عورت کی ذات۔ ملائن میرے مطالعہ کے دوران بھی کھنا کے دار تبسم سے باز نہیں آرہی تھیں۔

"تم تو پاگل ہو گئی ہو، اس میں مزاح کا کیا پہلو ہے؟"

"ہے کیوں نہیں، ذرا غور کیجئے ــــ"

"اف فو۔۔۔۔ اب مزاح بھی غور کرکر کے نکالا کریگا"۔

"آپ تو صوفیوں لڑفیوں کی صحبت میں رہ کر سطحی قسم کے مزاح کے عادی ہو گئے ہیں۔ باریکی سے دیکھئے کیا یہ جملہ۔۔۔ مگر خدارا۔۔۔۔ ہماری سیاست۔۔۔ ست۔۔۔"

ان پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"یا معبود۔۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔۔"

بڑی مشکل سے وہ بتا سکیں کہ ان کی ہنسی کی جڑ یہ سیدھا سا جملہ ہے:۔

"مگر خدارا ہماری سیاست کو مکدر نہ کریں"۔

"ہماری سیاست۔۔۔۔ اہاہا۔۔۔ ہماری سیاست۔۔"

وہ اسی لفظ کو دہرائے جا رہی تھیں۔

"کیوں وقت برباد کرتی ہو"۔

"ہائے اللہ کیا اب بھی آپ نے محسوس نہیں کیا ــــ"

"ٹھیرو میں کوشش کرتا ہوں"۔

اب میں نے مراقبے کے انداز میں گردن جھکائی ــ حق یہ ہے کہ اسی آن ایک بجلی سی کھوپڑی میں کوندی ضرور تھی۔ پھر مراقبے کے چھٹے سکنڈ میں ایک بگولہ سا بھیجے کے جوف میں پھڑپھڑایا اور اچانک ایسی تیز روشنی ہوئی گویا اندھیرے میں بلب جل گیا۔ قہقہہ لبوں پر آنے ہی والا تھا کہ میں نے زبردستی اسے گھونٹا۔ یہ بڑی توہین کی بات ہوتی اگر میں قہقہہ اڑا کر ہاتھوں ہاتھ اپنی کند ذہنی اور ملائن کی ذکاوت کا عملی اعتراف کر لیتا۔ اقبال نے شاید ایسے ہی نازک مواقع کے لئے کہا ہے:۔

نالہ اے بلبلِ شیدا ہے ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

"مجھے تو مزاح کا کوئی پہلو نہیں نظر آیا" میں نے مراقبے سے دستبردار ہوتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہیں آپ ــ اچھا بتائیے "ہماری سیاست" کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ہماری سیاست۔۔۔ یعنی کہ ہماری کا مطلب بتاؤں

سیاست کا؟"

"الگ الگ نہیں دونوں کا ایک ساتھ بتلایئے۔"

"اپنا سر بتاؤں۔ آخر کونسا اس میں لاطینی لفظ ہے۔ اری سیاست کا مطلب ہے ہماری سیاست۔۔۔۔"

"وہ تو ہے ــــ مگر ہنسی اس پر آتی ہے کہ پوری مملکتِ ستان کو تو وہاں کی ہر حکومت نے اپنی جاگیر سمجھا ہی تھا کن یہ اعلا تعلیم یافتہ صاحب تو سرے سے سیاست ہی کو پی باندی سمجھے بیٹھے ہیں۔"

"یہ تو اپنی اپنی ہمت ہے۔ یاد نہیں غالب نے صاف ہا تھا:۔

دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں"

ملائن نے اس برجستہ استدلال کی کوئی داد نہیں ی۔ وہ تو اپنی دہابیت میں مگن تھیں۔

"مکدّر کی بات بھی خوب رہی" وہ کہنے لگیں "ستّر چوہے کھاکے بلّی حج کو چلی۔"

"کیا بات ہوئی" میں غرغرایا۔

"ایک بوڑھی طوائف کے بارے میں اگر کوئی یوں کہے کہ خبردار کوئی نامحرم اس کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھے ورنہ عفیفہ کی عفت کے شیشے میں بال آجائے گا تو آپ ہی بتایئے ہنسا نہیں جائے گا تو کیا رویا جائے گا۔"

"اردو بولو ــــ طوائفوں کا ذکر بھلا کہاں سے آکودا۔"

"سیاست ــــ خصوصاً پاکستانی سیاست شروع ہی سے جن غلاظتوں کا مخزن رہی ہے ان کا تعفّن تو بحرالکاہل کی مچھلیاں تک سونگھ رہی ہیں۔ فریب۔ نفاق۔ مفاد پرستی انانیت۔ دھاندلی۔ دھونس۔ سفّاکی مطلق العنانی۔ کونسی گندگی ہے جو پاکستانی سیاست کے دریائے کثیف میں ٹھنڈے منھ گھلی ملی نہیں ہے اور یہ اعلا تعلیم یافتہ صاحب فرما رہے ہیں ــــ ہماری سیاست کو مکدر نہ کرو ــــ ہائے ری نزاکت۔ ۔۔۔۔مکدّر نہ کرو۔۔۔۔"

یہ کہتے کہتے ملائن پر پھر ہنسی کا حملہ ہوا ــ بارے یہ طویل نہیں ہوا۔

"کچھ بھی کہو بہر حال ایک اعلا تعلیم یافتہ کے ارشادات رد نہیں کئے جاسکتے۔"

"اعلی تعلیم یافتہ" انھوں دانت پیس کر کہا "بد سے بدتر جہل کا نام آج کل علم رکھدیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان صاحب نے اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے' پی' ایچ' ڈی وغیرہ کی دس بیس ڈگریاں لکھدی ہوں اور مولانا صدق صاحب۔۔۔۔۔ اف مولانا دریابادی صاحب مرعوب ہو گئے ہوں، لیکن میں ایسے لوگوں کو صرف اہل کتاب مانتی ہوں اہل علم نہیں۔۔۔۔"

"میں پھر پوچھوں گا کہ یہ کیا بات ہوئی؟"

"علم ڈگریوں کا نام نہیں۔ وہ ایک روشنی ہے۔ جو ہر ہے کیا آپ نے نہیں سُنا:۔

نہ محقق بود نہ دانشمند ــــ چارپائے بر و کتابے چند

"میں شاعری میں یقین نہیں رکھتا۔"

"قرآن میں تو رکھتے ہیں۔ اللہ پاک نے یہودیوں کے لئے ٹھیک یہی تمثیل بیان فرمائی ہے۔ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا مانند گدھے کے جو پیٹھ پر کتابیں لادے ہوئے ہے۔"

"استغفراللہ۔ یہودیوں کی مثال میں مسلمانوں کو فٹ کرتی ہو۔"

"مثالیں محدود نہیں ہوا کرتیں۔ میں اگر زندگی بھر کتابوں میں جھک ماروں مگر اپنے آپ کو نہ پہچان سکوں تو یہی مثال مجھ پر بھی صادق آئے گی۔"

"میں پھر کہوں گا کہ اُردو بولو۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ صاحب اپنے آپ کو نہیں پہچان سکے؟"

"خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا عقل سے پہچانا ہے۔ اگر ایک بالشتیا پہاڑ سے کہنے لگے کہ ایاز قدر خود بشناس تو آپ کیا کہیں گے۔"

"میں اس کا منھ چوم لوں گا اور جھوم کر کہوں گا کہ شاباش برخوردار۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔"

"اب آپ کیوں فارسی بولے؟"

"سوری۔۔۔۔ مگر بالشتیے تو فارسی بھی سمجھ لیتے ہوں گے میں نے تو ایک بالشتیے کو انگریزی تک فرفر بولتے دیکھا ہے۔"

"طوطے ہر زبان بول لیتے ہیں مگر وہ طوطے کے سوا کچھ

نہیں ہوتے۔"

"پرندوں کی بات اور ہے۔ یہ صاحب تو ڈاکٹر ایڈلر کو گواہی میں لے آئے ہیں۔ کیا یہ گواہی بھی رد کی جا سکتی ہے۔"

"اس پر بھی مجھے بہت ہنسی آئی۔ یہ صاحب چلے تھے مولانا مودودی کے احساسِ کمتری کا انکشاف کرنے مگر کھول بیٹھے خود اپنا ہی پول۔ ان سے کوئی پوچھے ان کی والدہ انگریز تھیں یا والد۔ اگر کوئی نہیں تھا تو پھر کسی عربی فارسی عالم کا نام انھیں کیوں نہ یاد آیا۔ احساسِ کمتری کا آخری ارذل ترین درجہ ہے دوسری قوموں کی ذہنی غلامی۔ آج کل کے لوگ دو بول انگریزی کے پڑھ لیتے ہیں تو انھیں وحی صرف پانیئر میں نظر آتی ہے۔"

"یہ تو خیر تم دقیانوسیت پھیلانے لگیں۔ علم النفس جدید علم ہے۔"

"کیا نہ ٹھیک تھا۔ پہلے تو لوگ بلا نفس ہی کے پیدا ہوتے رہے ہوں گے۔"

"بات سمجھا کرو۔ آدمی محض خول کبھی نہیں ہوا مگر نفسیاتی اصول آج کی پیداوار ہیں۔"

"یہ آپ کی مرعوبیت ہے۔ اصول قاعدے موجود سب ازل سے تھے اب انھیں مرتب کر کے کتابوں میں لکھ دیا گیا ہے ڈاکٹر ایڈلر کی پیش کردہ تمثیل سے کہیں تیکھی اور بھرپور تمثیلیں چچا سعدی کی گلستاں ہی میں بھری پڑی ہیں ہو سکے تو آپ گلستاں کی ایک کاپی خرید کر اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب کو ڈاک سے بھیج دیں۔"

"باپ رے... بکواس بند کرو۔ جیب میں صرف دو روپے ۲۳ پیسے پڑے ہیں اور مہینے کی وفات میں ابھی کئی صدیاں باقی ہیں۔"

"میں تو بھیا سے کہوں گی کہ مولانا دریابادی کو ایک خط لکھیں کہ یہ کیا کھیل تماشا دکھلا رہے ہیں آپ اپنے تو قر جریدے میں۔ مولانا مودودی کو منھ چڑانا اوّل تو ہم بھارتیوں کے لئے کام ہی لایعنی ہے، لیکن اس کے بغیر کسی کا کھانا ہضم نہ ہو تو کبھی کبھی ذرا پڑھے لکھوں کے شایانِ شان ہونی چاہیئے۔ یہ تو کوئی سنجیدگی نہیں کہ مولانا صاحب گلی کوچوں سے بچے پکڑ پکڑ کر ان کے منھ پر مونچھ لگا رہے ہیں۔"

"بے پر کی اُڑاتی ہو اعلیٰ تعلیم یافتہ بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"بہت لوگ بوڑھے ہو کر بھی ذہنی اعتبار سے بچے ہی رہتے ہیں۔ بچوں کے سوا کون ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کھیل کھیل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چند موٹی موٹی برائیوں کی اصلاح تک محدود رہنے کی دعوت دینا اور خلافتِ راشدہ کی آس لگانا دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ بھی تو نہیں۔ حیرت اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب پر نہیں کہ آج کل کے اکثر اعلیٰ تعلیم یافتوں کا حال جانا پہچانا ہے مگر تعجب مولانا صاحب پر ہے کہ مولانا مودودی کے نصب العین کو جانتے بوجھتے بھی وہ کیسی بھولی بھولی باتیں کر رہے ہیں — جھونپڑی میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھنا بھی اس قدر مضحکہ خیز نہیں ہو سکتا جتنی یہ بات کہ تختِ حکومت پر تو شیطان کی ذرّیت جلوہ فرما رہے مگر علماء معاشرتی غلاظتوں کے ڈھیر ہٹا کر خلافتِ راشدہ کی گوڑی لانے کی فکر کریں۔"

"جب تک معاشرہ پاک و صاف مانند آئینہ نہیں ہو جاتا خلافتِ راشدہ کیسے قائم ہو سکتی ہے؟"

"جن معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی پر زور دیا جا رہا ہے انھیں زندگی اور تحفّظ دینے کی ذمہ داری قانون پر ہے۔ قانون حکومت والے بناتے ہیں۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ حکومت سے ٹکر لئے بغیر معاشرے کا رُخ موڑا جا سکتا ہے وہ ہوا میں گرہ لگاتا ہے۔ ہر بڑی بُرائی بہت سی چھوٹی چھوٹی برائیوں کے بطن سے جنم لیتی ہے اور ہر بڑے گناہ کا رشتہ طرح طرح کے اسباب و ذرائع سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ مان لو علماء کی کوشش سے طوائفوں کے کوٹھے نیست و نابود بھی ہو گئے تو کیا معاشرہ بدکاری کی غلاظت سے پاک ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ پاکی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے جب کہ سماج میں چاروں طرف حرص و ہوس کو غذا پہنچانے والے وسائل ہوا اور پانی کی طرح عام ہیں۔"

"بس بس —" میں اُکتا کے بولا "تمھارا مطلب میں سمجھ گیا۔ سیدھی بات کہو کہ تم مولوی ملاؤں کو حکومت دلانا

چاہتی ہو ---- مگر بانو! ذرا سوچو تو داڑھی لگی ہے اور حکومت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اُف - نہیں نہیں اس کا تو تصور ہی مضحکہ خیز ہے ---"

"اللہ سے پناہ مانگئے - چاروں خلیفہ داڑھی ہی والے ہوئے ہیں۔"

"یہ عجب کی بات ہے کہ پسینہ گلاب تھا - اب تو گلاب بھی بغیر خوشبو کے پیدا ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے" --- وہ بھنا کے بولیں اور پیر پٹختی اپنے دار السلطنت یعنی باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

یہ تو سب ہوا مگر خدا کے لئے کوئی یہ تو بتائے کہ اگر درگاہ لمرخ شاہ کے سجادے نے مشتری بائی کی ٹولی کو توڑ لیا تو درگاہ غوثیہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ -

نہیں! میں ایک بات پوچھتا ہوں۔

(ملّا زندہ صحبت باقی)

عامر عثمانی

تقتلک الفئة الباغیة

جنوری ۱۹۶۳ء کے "انوار اسلام" میں کسی مولانا سید محمد مقبول حسین کا ایک مکتوب ہمارے متعلق شائع ہوا ہے اس پر علمی مذاکرے کا اعلان ہم گزشتہ ماہ کر چکے ہیں لیکن بہ نگاہِ غور دیکھنے کے بعد یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سید صاحب نے اپنے مکتوب میں علم و فہم کا جو نمونہ اور اپنی استعداد کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کے بعد علمی مذاکرے کی گنجائش بالکل نہیں نکلتی مذاکرے کی نیت ہم نے ان کے نام مبارک کے ساتھ لفظ "مولانا" دیکھ کر کی تھی مگر مکتوب کے غائر مطالعے سے یہ گمان غالب پیدا ہوا کہ وہ مولانا تو کجا شاید مولوی بھی نہیں ہیں! اور اگر ہیں تو یہ مولویت صرف سند تک محدود ہے ذہن پر اسکی کوئی چھاپ نہیں پڑی۔ ایسی صورت میں مذاکرہ کس سے کریں۔ ہاں نقد و نظر کا فرض ضرور انجام دیں گے تاکہ جو بھولے عوام ان کے ارشادات کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں ان کے سامنے تہہ کی بات آجائے۔

ویسے علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے مشاجرات پر بارہا لکھنے کے بعد اب ہم اس موضوع کو بالائے طاق رکھ چکے لیکن اس موضوع کی بحث میں ایک روایت تقتلک الفئة الباغیة بار بار آتی رہی ہے اور سید صاحب نے بھی بعض فقہاء کے حوالے سے اس کا ذکر چھیڑا ہے اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی فنی حیثیت اور مفہوم و مراد پر ہم اس بار مفصل روشنی ڈالدیں۔ وباللہ التوفیق

لیکن اپنی عادت کے مطابق ہم پسند کرتے ہیں کہ سید صاحب کی بھی پوری بات ناظرین کے سامنے آجائے لہٰذا ان کا پورا مکتوب حرف بحرف نقل کئے دیتے ہیں حتیٰ کہ جہاں انھوں نے نقطے لگائے ہیں وہاں ہم بھی نقطے دیدیگے۔

مکتوب جناب سید صاحب ؒ م حافظ رام نگری صاحب۔

مکرمی سلام مسنون!

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ——— اکتوبر ۱۹۶۲ء کے تجلی میں جناب عامر عثمانی صاحب نے صہ ۳۱ پر مولانا مودودی صاحب کے بیان کردہ امام اعظم رضی اللہ عنہ کے اس قول کا (کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جتنی بھی لڑائیاں لڑیں حق ان ہی کے ساتھ تھا) ان سے حوالہ کا مطالبہ کیا ہے اور پوچھا ہے کہ امام صاحب کا یہ قول کس کتاب میں ہے تو اس کی نشاندہی تو مولانا مودودی صاحب کے ذمہ ہے، البتہ فقیر کو فقہائے احناف کے تین جلیل القدر ائمہ کے اقوال اس سلسلے میں حاصل ہوئے ہیں جو معہ حوالہ کے درج ذیل ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو اسے شائع فرماکر جناب عامر عثمانی کو بتائیں کہ حضرت علیؓ کے حق پر ہونے کے قائل بدھو، تبرائی یا شیعہ وغیرہ نہیں ہیں بلکہ احناف کے وہ مشہور و ممتاز علماء ہیں جن کی جلالتِ علم کی ایک دنیا معترف ہے۔ یہ علماء ہیں:- امام برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۵۹۳ھ صاحب ہدایہ، محقق دہر حضرت کمال الدین المعروف بابن الہمام صاحبِ عنایہ شارح ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۸۶۱ھ، حضرت علامہ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی صاحب عنایہ شارح ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان حضرات کی اصل عبارتیں نقل کر رہا ہوں۔ دیکھئے جناب عامر عثمانی ان ائمہ

فقہاء کے اقوال کو ملاحظ فرما کر ان حضرات پر کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں۔ والسلام مع الاکرام

محمد مقبول حسین الحسینی غفرلہ۔ الہ آباد

(۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ اخیرین کے کتاب ادب القاضی میں صاحب ہدایہ امام برہان الدین المتوفی ۵۹۳ھ نے امام قدوری کی عبارت۔ ثم یجوز التقلد من السلطان الجائر کما یجوز من العادل کی شرح میں لکھتے ہیں ـــــ لان الصحابۃ رضی اللہ عنہم تقلدوہ من معاویۃ رضی اللہ عنہ والحق کان بید علی رضی اللہ عنہ فی نوبتہ۔ (ہدایہ اخیرین کتاب القاضی)

(یعنی سلطان جائر (ظالم و کج رو حکمراں) کی اطاعت بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح عادل حکمراں کی اطاعت جائز ہے) ـــــ (کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نوبت میں حق آپ ہی کے ساتھ تھا)۔

اور اس کی شرح میں محقق دہر الشیخ کمال الدین المعروف بابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ صاحب فتح القدیر اپنی کتاب فتح القدیر میں لکھتے ہیں:-

ھذا تصریح بجور معاویۃ والمراد فی خروجہ لا فی اقضیتہ ثم انما یتم اذا ثبت انہ ولی القضاء قبل تسلیم الحسن لہ اما بعد تسلیمہ فلا۔ (وقولہ فی نوبتہ) نوبۃ علی التی ذکرھا المصنف ھی کونہ رابعًا بعد عثمان وقید بنوبتہ احترازًا عن قول الروافض انہ کان احق بھا فی سائر النوب حتی من ابو بکر رضی اللہ عنہ وانما کان الحق معہ فی تلک النوبۃ لصحۃ بیعتہ وانعقادھا فکان علی الحق فی قتال اھل الجمل وقتال معاویۃ بالصفین، وقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لعمار ستقتلک الفئۃ الباغیۃ وقد قتلہ اصحاب معاویۃ یصرح بانھم بغاۃ ولقد اظھرت عائشۃ رضی اللہ عنھما الندم کما اخرجہ ابن عبد البر فی الاستیعاب قال قالت عائشۃ رضی اللہ عنھا لابن عمر یا اباعبدالرحمٰن ما منعک ان تنھانی عن مسیری، قال رایت رجلا غالبًا علیک یعنی ابن الزبیر فقالت اما واللہ لو نھیتنی ما خرجت۔

یہ عبارت حضرت معاویہؓ کے جور کی صراحت کرتی ہے اور اس جور سے مراد ان کی (حضرت علیؓ کیخلاف بغاوت کے سلسلے کی غلط کاری ہے نہ کہ انکے قضایا (فیصلوں) کے سلسلے میں ..... اور یہ جو صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اپنی خلافت کی باری میں حق پر تھے تو یہ اس بناء پر کہ آپ کی خلافت چوتھے نمبر پہ حضرت عثمانؓ کے بعد قائم ہوئی اور انھوں نے حضرت علیؓ کی باری کی قید اس بناء پر لگائی کہ شیعوں کے اس قول سے احتراز ملحوظ تھا کہ وہ تمام باریوں میں حضرت علیؓ ہی کو خلافت حق دار کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ہم حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حق حضرت کے ساتھ صرف آپ ہی کی خلافت کی باری میں تھا۔ آپ کی بیعت کی صحت کی وجہ سے اور آپکی خلا کے منعقد ہو جانے کے سبب ا حضرت علیؓ جمل والوں اور حضر معاویہؓ کے ساتھ صفین میں نبرد ہونے میں حق پر تھے۔ آں حض صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عما سے یہ فرمانا کہ تمھیں عنقریب ا باغی گروہ قتل کریگا اور پھر حضر معاویہؓ کے ساتھیوں کا حضر عمارؓ کو قتل کرنا اس بات پر دلا کرتا ہے کہ یہ حضرات باغی تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خر پر اپنی ندامت کا اظہار کر دیا تھا جیسا کہ علامہ ابن عبد البرؒ نے استیعا میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا ــ ا عبدالرحمٰن! تم نے اس وقت مجھے جنگ سے منع کیوں نہیں کیا تھا؟ ا نے جواب دیا میں نے ایک شخص (ابن زبیرؓ) کو اس وقت آپ پر غالب حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ خدا کی قسم! اگر تم نے مجھے منع کیا ہوتا تو میں نہ کرتی ۱۲ (فتح القدیر جلد خامس ص۴۶۱ مطبوعہ مصر)

اس میں محقق ابن الہمامؒ نے صاف تصریح کر دی کہ حق علیؓ کے ساتھ تھا اور جناب عامر عثمانی نے ص۳۲ پر حضرت ع رضی اللہ عنہ والی حدیث سے استدلال کرنے پر مولانا مودو صاحب پر چوٹ کی ہے مگر اس حدیث کو صاحب فتح القد علامہ ابن الہمامؒ نے بھی اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، کیا یہ بھی شخصیت تھے؟

اسی ہدایہ کی عبارت پر علامہ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۷۸۶ھ نے اپنی کتاب عنایہ شرح ہدایہ میں لکھا ہے:-

(قولہ ثم یجوز التقلد) تفریع علیٰ مسئلۃ القدوری یتبین انہ لا فرق فی جواز التقلد لاھلہ بین ان یکون المولی عادلاً او جائراً فکما جاز من السلطان العادل جاز من الجائر وھذا لان الصحابۃ رضی اللہ عنہم تقلدوا القضاء من معاویۃ رضی اللہ عنہ وکان الحق مع علی رضی اللہ عنہ فی نوبتہ دلّ علیٰ ذالک حدیث عمار ابن یاسر۔ (عنایہ جلد ۵ ص۴۶۱ مطبوعہ مصر)	صاحبِ ہدایہ کا یہ قول کہ سلطان جائر کی اطاعت بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح سلطان عادل کی۔ قدوری کے مسئلہ کی تفریع ہے۔ یعنی اطاعت کے جواز میں کوئی فرق نہیں، امام عادل ہو یا امام جائر لیکن جس طرح کہ سلطان عادل کے لئے اطاعت جائز ہے اسی طرح سلطان جائر کے لئے بھی جائز ہے اور یہ اس لئے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہؓ کی قضاءۃ کی اطاعت کی جبکہ حق حضرت علیؓ کی خلافت کی باری میں ان کے ہی ساتھ تھا اور اس بات پر حضرت عمار بن یاسرؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے

اس میں بھی صاحب عنایہ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کی حدیث پر وثوق کیا ہے۔ مگر فاضل دیوبند جناب عامر عثمانی کی شرط پر یہ حدیث پوری نہیں اترتی حالانکہ میرے علم کے مطابق امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ حدیث دو جگہ تحریر فرمائی ہے۔ واللہ اعلم۔

آپ نے دسمبر ۶۲ء کے انوار اسلام میں جناب عامر عثمانی کی بے باکانہ جرأتوں اور گستاخیوں پر علماء کے سکوت پر بجا طور پر اظہار افسوس فرمایا ہے۔ مگر آپ بموجب فرمان اللہ جل وعلائے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر اپنے امکان کے بقدر اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہئے۔ اگر آپ نے بھی سکوت اختیار فرمالیا تو اس سے فتنہ پردازوں کی جرأتیں اور بڑھ جائیں گی۔ لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔ (مسلم شریف) والسلام

سید محمد مقبول حسین حسینی غفرلہ

جائزہ

اس سے قبل کہ نفسِ بحث پر توجہ دی جائے یہ دیکھ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس دو صفحے کے مکتوب میں علم وفہم کے کیا کیا کرشمے سید صاحب نے دکھائے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں ان کے ساتھ علمی مذاکرے کا ارادہ ترک کردینا پڑا۔

پہلا دلچسپ کرشمہ تو یہ ہے کہ انھوں نے ابن الھمام کو بھی صاحبِ عنایۃ لکھ دیا حالانکہ وہ فتح القدیر کے مصنف ہیں عنایۃ کے نہیں۔ عنایۃ محمود البابرتی کی ہے نہ کہ ابن الھمام کی۔ یہ کرشمہ اگرچہ ایک اتفاقیہ سہو یا خطائے کتابت قرار دیا جاسکتا ہے مگر دلچسپ بہرحال ہے۔

دوسرا دلچسپ کرشمہ ——— جو دراصل فاحش غلطی اور موصوف کے علم وفہم کا بہت برا نمونہ ہے، یہ ہے کہ انھوں نے قدوری سمجھی نہ ھدایہ، سمجھنا کیا معنی معلوم ہوتا ہے کسی اور بزرگوار کی نشاندہی پر انھوں نے فتح القدیر کا صرف ایک صفحہ کھول کر قدوری، ھدایہ، فتح القدیر اور عنایۃ کی عبارتیں نقل کردی ہیں کیونکہ یہ سب فتح القدیر ہی میں موجود ہیں اور آگے پیچھے سے پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ زحمت کیا گوارا کرتے ہمارا خیال ہے وہ عربی پڑھنے اور سمجھنے پر قادر ہی نہیں ہیں ورنہ کیسے ممکن تھا کہ التقلد کا ترجمہ اطاعت کر بیٹھتے اور پھر اسے چھپنے بھی دیدیتے۔

ارباب بصیرت کو تو ہمارا اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا۔ لیکن کثرت چونکہ عربی نہ جاننے والوں کی ہے اس لئے ہم پر وضاحت کا فریضہ بھی عائد ہوتا ہے۔ سنیئے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدوری کی عبارت ثم یجوز التقلد الخ ---- نقل کرکے انھوں نے التقلد کے معنی اطاعت بیان فرمائے ہیں حالانکہ عربی کا ایک مبتدی بھی سمجھ سکتا ہے کہ کتاب

ادب القاضی میں امام قدوری "اطاعت" کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ منصب قضا سے متعلق فقہی ہدایات کا تذکرہ ہے۔ تقلد پر الف لام داخل کر کے انھوں نے اس کے معنی لئے ہیں "عہدۂ قضا قبول کرنا"۔

سیّد صاحب اگر عربی میں درک رکھتے تو آگے پیچھے پڑھے بغیر ہی من السلطان الجائر کے صرف مِنْ سے یہ بات سمجھ لیتے کہ ذکر اطاعت کا نہیں۔ پھر یہی مِنْ ہدایہ کی عبارت میں بھی موجود ہے اور عنایۃ کی منقولہ عبارت میں تو صراحۃً تقلد القضاء من معاویۃ کے الفاظ ثبت ہیں لیکن اس تصریح سے اپنے قصور پر آگاہی حاصل کرنے کی بجائے وہ اس کا بھی یہ لغو ترجمہ پیش کرتے ہیں کہ:—

"حضرت معاویہؓ کی قضاوت کی اطاعت کی"

اس سے اندازہ ہوا کہ وہ خود عربی جانتے ہی نہیں بلکہ کسی اور ستم ظریف نے انھیں میدان میں اتار دیا ہے۔

کم فہمی کی انتہا

خیر عربی میں درک نہ سہی مگر اس مقام پر تو وہ صرف عقلِ عام ہی سے کام لیکر خطائے فاحش سے بچ سکتے تھے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے خود ہی قدوری کی کتاب ادب القاضی کا حوالہ دیا ہے تو کیا یہ قیاس کرنا کچھ دشوار تھا کہ اس باب کے ذیل میں جو باتیں آئیں گی ان کا کچھ نہ کچھ تعلق منصب قضا سے ضرور ہونا چاہئیے۔ التقلد کے معنی اطاعت لے لو تو عنوانِ باب سے اس کا کیا تعلق رہجاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی فقط عقل ہی سے جان لینے کی تھی کہ بجوز کے ساتھ اطاعت کا لفظ مضحکہ خیز ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سلطانِ وقت کی اطاعت واجب ہے صرف جائز نہیں۔ اگر سلطانِ جائر کی اطاعت کے وجوب میں کچھ گفتگو بھی ہو تو بہرحال سلطانِ عادل کی اطاعت کا وجوب تو دو رائے کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا پھر یہ ترجمہ کیوں مضحکہ خیز نہ ہوگا کہ:—

"سلطان جائر کی اطاعت بھی اسی طرح جائز ہے
جس طرح عادل حکمراں کی اطاعت جائز ہے"

یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی یوں کہے کہ نماز عشا وتر پڑھنا جائز ہے یا قسم توڑ دینے پر کفارہ دینا جائز ذلک۔ سیّد صاحب ذرا بھی سوجھ بوجھ رکھتے تو یہ ت نہیں کر سکتے تھے کہ جو شے بالاجماع واجب ولازم ہ لئے ایک فقیہہ "جواز" کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی جائز اسے کہتے ہیں جس کا کرنا نہ کرنا معصیت سے تعلق ہو۔ سلطان عادل ہو یا ظالم وہ اگر زید کو عہدۂ قضا ہے تو زید کے لئے اسے قبول کرنا بھی جائز ہے اور ا یہی قانونی جزئیہ امام قدوری بیان کر رہے ہیں ورنہ کی اطاعت تو بالاتفاق واجب ہے نہ کہ محض جائز۔

ان معروضات کی روشنی میں ہر صاحب فہم سمجھ کیوں ہم نے سیّد صاحب کے علم وفہم سے مایوسی کا اظہار

مزید لطیفے

اور سنئیے۔ انھوں نے فتح القدیر کی جو لمبی نقل کی ہے وہ بظاہر مسلسل نظر آتی ہے۔ ایک پڑھنے و سمجھے گا کہ ھذا التصریح سے لیکر ما خرجت تک مسلسل حذف وترمیم عبارت نقل کی گئی ہے، لیکن حقیقت کیا یہ فتح القدیر کھول کر ملاحظہ کر لیجئے۔ فتح القدیر ہر ایک نصیب لہذا ہم ہی بتاتے ہیں کہ کیا گڑ بڑ پھیلائی گئی ہے

یہ جو اما بعد تسلیمہ فلا کے متصل بعد (وقولہ نوبتہ) نقل کیا گیا تو ان کے درمیان سے دو چار لفظ نہ تقریباً ۲ تین لائنیں چھوڑ دی گئی ہیں جو یہ ہیں:—

دیسمّٰی ذلك العام المحاجۃ واستقضٰی ابا الدرداءَ بالشام وبھامات وکان معاویۃ عنہ استشارہ فیمن یولّی بعدہ فلشار علیہ بن عبید الانصاری فولاّہ الشام بعدہ (ملاحظہ فتح القدیر جلد پنجم صفحہ ۴۶۱ مصری)

یہ تاویل مت سوچئے کہ ہو سکتا ہے سید صاحب کے کتاب کا جو نسخہ ہو اس میں یہ عبارت چھپنے سے رہ گئی ہو۔ جی نہیں ہمارے سامنے بھی اتفاق سے ٹھیک وہی نسخہ ہے ج

حوالہ انھوں نے دیا ہے چنانچہ ہمارے اور ان کے صفحے تک میں کوئی فرق نہیں۔

یہ بھی مت سوچئے کہ اردو ترجمے کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ میں نقطے لگا دیئے گئے ہیں ان سے شاید اسی طرف اشارہ مقصود ہو کہ درمیان کی کچھ عبارت ہم نے حذف کردی ہے۔ جی نہیں۔ یہ مقصود ہوتا تو ترجمے کی بجائے عربی متن میں اُس جگہ نقطے دینے چاہئیں تھے جہاں سے عبارت حذف کی ہے یا پھر مکتوب میں کہیں اشارۃً یا صراحۃً حذف کا ذکر کرنا چاہئیے تھا۔ یہ تو تماشے کی بات ہوگی کہ حذف تو کرو متن میں سے مگر نقطے لگاؤ ترجمے میں۔

پھر یہ نقطے کیسے ہیں؟ ــــ یہ بھی ایک لطیفہ ہی ہے۔ فتح القدیر کی نقل کردہ عبارت میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جو انھوں نے حذف تو نہیں کیا مگر اس کا ترجمہ ان سے نہ ہوسکا یا پھر قصداً انھوں نے اس کا ترجمہ حذف کر دیا اور اس کی جگہ نقطے لگا دیئے۔ وہ جملہ یہ ہے:۔

ثم انما یتم اذا ثبت انه ولی القضاء
قبل تسلیم الحسن له واما بعد تسلیمه فلا

دیکھ لیجئے ان کی نقل فرمودہ عبارت میں یہ جملہ موجود ہے مگر اس کا ترجمہ انھوں نے نہیں کیا، بلکہ صرف نقطے لگا کر آگے بڑھ گئے۔

ان خوش فعلیوں کی موجودگی میں آپ ہی بتائیے کہ ہم سید صاحب سے علمی مذاکرہ کیا کریں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عبارت کے درمیان سے کچھ فقرے حذف کر دینا اور کسی نقل کردہ فقرے کا ترجمہ غائب کر جانا بددیانتی کے خانے میں آتا ہے لیکن ہم اسے بددیانتی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اپنے حصولِ مُدعا کے لئے حذف وغیرہ کا ارتکاب وہی شخص کر سکتا ہے جو عبارت کو سمجھا بھی ہو، لیکن متذکرہ صورتِ حال میں ہم خود کو اس فیصلے پر مجبور پاتے ہیں کہ سید صاحب کی علمی و عقلی معصومیت سمجھنے سمجھانے کے بکھیڑے سے بے نیاز ہے۔ حد ہے کہ قدوری کا جو فقرہ نقل کر کے انھوں نے التقلّد کے معنی "اطاعت" کر ڈالے اس کے متصل بعد ہی امامِ قدوری کا یہ فقرہ بھی موجود ہے:۔

ومن قلد القضاء	اور جس نے قضا کا عہدہ قبول کرلیا اس کے
یسلم الیه دیوان	سپرد کیا جائیگا اس سے پہلے قاضی کا دیوان
القاضی الذی کان قبله	(وہ ریکارڈ جسمیں اسکے فیصلے وغیرہ محفوظ ہیں)

کیا اس کے بعد بھی التقلّد کا ترجمہ اطاعت کرنے کی گنجائش تھی؟ ــــ نیز صاحب ہدایہ کی جو عبارت انھوں نے نقل کی اس کے متصل بعد صاحب ہدایہ کہہ رہے ہیں کہ اِلّا اذا کان لا یمکنه من القضاء بحق (یعنی سلطان جائر سے قضا کا منصب قبول کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب کہ قبول کرنے والے کے لئے عادلانہ اور بے لاگ فیصلے صادر کرنے کا موقع فراہم ہو، لیکن اگر یہ اندیشہ قوی درجے میں ہے کہ سلطان جائر کی آمرانہ دخل اندازی بے لاگ فیصلے دینے میں دخل انداز ہوگی تو منصب قضا قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

تو کیا یہ خیال قائم کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ فتح القدیر سید صاحب نے خود نہیں دیکھی بلکہ کسی نیم مُلّا نے انھیں پھنسا دیا ہے۔ متذکرہ بالا شواہد بجائے خود کافی شافی ہیں۔ ایک اور قرینہ دیکھئے کہ عنایہ کی جو عبارت سید صاحب نے پیش کی اس کے آگے بریکٹ میں حوالہ دیا "عنایہ" کا اور جلد اور صفحہ وہی لکھا جو فتح القدیر کا تھا۔ حالانکہ عنایہ کا حوالہ یہاں بالکل غلط ہے کیونکہ عنایہ کی عبارت فتح القدیر ہی کے حاشیے سے نقل کی گئی ہے۔ صحیح بات یہ ہوتی کہ وہ فتح القدیر ہی کا حوالہ دیتے اور تصریح کر دیتے کہ عنایہ فتح القدیر کے حاشیے پر چڑھی ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب کیسے ہوتا جب کہ علمی ذمہ داریوں کا ہوش ہی سید صاحب کو نہیں ہے۔

خود حافظ امام الدین رام نگری ایڈیٹر "الوار اسلام" بھی مغفّلین کی آخری سرحد پر نظر آ رہے ہیں۔ مانا کہ وہ عربی نہیں جانتے مگر یہ تو جانتے ہوں گے کہ سلطان عادل کی اطاعت واجب ہے۔ پھر کیوں نہ انھیں یہ دیکھ کر تنبّہ ہوا کہ ان کے سید صاحب ایک فقیہہ کی زبان سے سلطان کی اطاعت

[illegible] ہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مکتوب
شاید انھوں نے پڑھے بغیر کتابت کرا دیا ہو۔ استغفر اللہ۔
عامر عثمانی کی دھجیاں بکھیرنے والا مکتوب اور وہ اسے دیدہ و
دل میں سمائے بغیر چھاپ دیں ناممکن۔ ایک مرتبہ نہیں انھوں
نے اسے خدا جھوٹ نہ بلائے تین چار بار پڑھ کر ہی کاتب
کو دیا ہوگا اور فرطِ مسرت میں مولٰنا کا خطاب بھی سیّد
صاحب کو انھوں نے ہی عطا فرمایا ہوگا۔ انھیں تو دراصل
ایڈیٹر تجلی پر برسانے کے لئے بم چاہئیں چاہے وہ مٹی ہی کے
کیوں نہ ہوں۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن
سیئات اعمالنا۔

الفئة الباغية

جائزے کی ترتیب تو ہمارے ذہن میں یہ تھی کہ ہدایہ
اور فتح القدیر وغیرہ کی عبارتوں میں کیا خوبی اور کیا خامی ہے
پہلے اسے واضح کریں اس کے بعد حدایث باب کی گفتگو ہو۔
سید صاحب جیسی استعداد کے لوگ تو بے شک یہ سمجھنے کی قدرت
نہیں رکھتے کہ مشہور و ممتاز فقہاء سے بھی گاہے گاہے غلطیاں
ہوتی آئی ہیں لیکن راسخون فی العلم جانتے ہیں کہ ھدایہ
کے اوراق سہو و خطا سے خالی نہیں اور ابن الہمام جیسے
جلیل القدر فقہاء بھی وقتاً فوقتاً بشریت کی کمزوریوں کا
شکار ہونے سے نہیں بچے ہیں۔
لیکن اس ترتیب سے حدیث کی بحث ذرا دور جا پڑیگی
اس لئے پہلے اسے لے لیں۔ اس کے دوران یہ بھی سیّد
صاحب پر منکشف ہو جائے گا کہ جن چند فقہاء کو وہ حرفِ
آخر سمجھے بیٹھے ہیں ان کے استادوں کے استاد اور اماموں کے
امام حضرت ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ وغیرہ کیا
فرماتے ہیں۔ اگر ان اساطین ائمہ کے اقوال سے ابن ہمام
وغیرہ کی چوک مصرح ہو جائے تو پھر اس کی بھی کوئی خاص
ضرورت نہیں رہتی کہ ہدایہ اور فتح القدیر کی غلطیاں چھانٹی
جائیں۔

سیّد صاحب نے اپنے مکتوب میں یہ جو کہا ہے کہ حضرت
کے برسرِ حق ہونے کے قائل بدھو، خیراتی یا شیعہ وغیرہ
تو اس موضوع پر سیکڑوں صفحات ہم نے لکھے ہیں کوئی
کہ یہ دعویٰ ہم نے کب کیا۔ ہم نے تو صراحت و اشار
دونوں طور پر اس کا اعتراف بارہا کیا ہے کہ علمائے سلف
خلف کی غالب اکثریت علیؓ و معاویہؓ کے تنازع میں علی
کو حق پر مانتی ہے۔ پھر یہ طعن سوائے تعصب اور کم فہمی
کیا معنی رکھتا ہے۔
اور یہ جو کہا گیا ہے کہ عامر عثمانی نے اکتوبر کے تجلی
مولانا مودودی پر چوٹ کی ہے تو یہ بھی سیّد صاحب کی
تعبیر ہے ورنہ ہر فکری اختلاف "چوٹ" نہیں کہلاتا۔
شخص بھلا مولانا مودودی پر کیا چوٹ کرے گا جس نے مولا
موصوف کی خداداد عبقریت و عظمت کے آستانے پر دن کی
میں سجود نیاز لٹائے ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں معصو
نہیں مانا اور ان کے معاملہ میں وہ روش اختیار نہیں کی جو
مرید پیر کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔ صوفیاء کا مسلک ہے

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز رسم و راہِ منزل ہا

مگر اپنا مسلک ہے لا تکونوا کالذین اتخذوا
احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔
(ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنھوں نے اپنے اکابر و مشائخ
کو اللہ کے علاوہ رب و الٰہ بنا لیا) مولانا مودودی کی اگر کوئی
بات اپنے دماغ میں نہیں اترے گی تو اس سے اس وقت
تک اختلاف کیا جاتا رہے گا جب تک کہ دلائل ہی سے ہماری
غلطی واضح نہ کر دی جائے۔
اور یہ جو کہا گیا کہ عمار بن یاسر والی حدیث عامر
عثمانی کی شرط پر پوری نہیں اترتی تو یہ بھی سیّد صاحب کی
قلتِ علم و فہم کا ثمرہ ہے۔ اکتوبر کا تجلی اٹھا کر دیکھئے۔ ہم نے
صرف یہ کہا تھا کہ یہ حدیث اس درجے کی نہیں جس کی صحت
میں کلام جائز نہ ہو، یہ نہیں کہا تھا کہ یہ حدیث صحیح نہیں
ہے۔ ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں

لیکن ظاہر ہے وہ بزرگ اسے کیا سمجھ سکیں گے جو التقلد کا ترجمہ
"اطاعت" پیش کرتے ہوں اور جن کے مطالعے کا دائرہ ہدایہ و
فتح القدیر سے آگے نہ بڑھ سکا ہو۔

سُنئیے ہم نے ایسا کیوں کہا تھا۔ تیرھویں صدی ہجری کے
مشہور محدث اور مجتہد علامہ شوکانی کا نام آپ نے سُنا ہوگا
جن کی عظیم الشان کتاب "نیل الاوطار" علماء کے درمیان
متداول ہے انھوں نے اپنی کتاب "الفوائد المجموعة
فی الاحادیث الموضوعة" میں اسی حدیث کا ایک متن
بطور حدیث موضوع کے نقل کیا ہے اور پھر چھٹی صدی ہجری
کے مشہور محدث اور امام علامہ ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات
سے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ یہ روایت گھڑی ہوئی ہے۔
اس کی سند میں المعلی بن عبد الرحمٰن ہے جو وضّاع
(گھڑنے والا) ہے۔ نیز یہ روایت ایک اور طریق سے روایت
کی گئی ہے اس میں وضّاع راوی موجود ہے۔

اس کے بعد الفوائد المجموعہ میں کہا گیا ہے کہ اسے ایک
اور طریق سے محدث حاکم نے اربعین میں ذکر کیا ہے نیز طبرانی
اور خطیب نے اور بعض اوروں نے تقتلك الفئة الباغية کے
فقرے کو اپنی اپنی سندوں سے بیان کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں حاکم نے اربعین میں جو سند بیان کی ہے
اس میں ایک راوی محمد بن کثیر الکوفی ہے جس کا حال
یہ ہے کہ امام فن ابن معینؒ نے پہلے تو اسے ثقہ سمجھا مگر جب
بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ فلاں فلاں روایت بیان کرتا ہے
تو انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو وہ کذّاب ہے۔ امام احمدؒ
فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی بیان کردہ حدیثیں نذر آتش
کردیں ابن المدینی اس میں عیب نکالتے ہیں۔ یہ جس
حارث بن حصیرہ سے روایت کرتا ہے اسے ائمہ نے
رافضی، خطاکار قرار دیا ہے۔

ایک سند عبد اللہ ابن مسعود تک پہنچائی گئی ہے، مگر
اس میں ذکریا بن یحییٰ ضعیف ہے اور جس اسماعیل بن
عباد سے اس نے روایت لی وہ بھی ائمہ کی نگاہ میں ثقہ نہیں
ایک سند ابوسعید الخدری تک پہنچائی گئی ہے اس میں
الکرم تین راوی مجروح ہیں۔

طبرانی نے اگرچہ متعدد سندیں بیان کی ہیں لیکن سب
میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مثلاً کسی میں ایک دو ایسے راوی ہیں
جن کی کوئی خوبی اس کے علاوہ جانی نہیں گئی کہ وہ شیعہ تھے
کسی میں مسلم الملائیؒ جیسے راوی ہیں جنھیں ناقدین نے
متروک اور خلط ملط کرنے والا کہتے ہیں۔ کہیں ربیع بن
سہیل جیسے منکر الحدیث نظر آتے ہیں جنھیں ائمہ نے لیس
بشیٔ جیسے الفاظ سے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے کہیں ابو مریم
الانصاری تشریف فرما ہیں جن کے بارے میں ناقدین
فرماتے ہیں کہ غلو کرنے والا گھڑنے والا متروک۔ کہیں ابو
سعید دینار (الملقب عقیصا) شیعی ہیں جنھیں غلو کیش
اور غیر معتبر کہا گیا ہے۔ کہیں خلیل بن مرّہ جیسے ضعفاء ہیں
جو مجہولین سے روایت کرتے ہیں۔

خطیب کی ذکر فرمودہ سند میں ایک سے زائد شیعہ ہیں۔
نیز ابان ابن ابی عیاش ہے جسے المتروک مانا گیا ہے۔

اب صحاح کی طرف آئیے۔ اولیٰ یہ تھا کہ پہلے بخاری و
مسلم کو لیا جاتا، لیکن ان میں کلام اتنا طویل ہے کہ اسے ایک
مستقل حیثیت دیکر اگلی ہی صحبت پر اٹھا رکھنا مناسب ہوگا
امام بخاری نے یدعوھم الی الجنة ویدعونه الی
النار کا جو ٹکڑا حدیث زیر بحث کے ساتھ نکالا ہے اس پر
تشفی بخش گفتگو کے لئے ضروری ہے کہ حافظ ابن حجرؒ علامہ
عینیؒ اور علامہ انور شاہؒ صاحب کے تشریحی ارشادات
بھی نقل ہوں اور ان پر اظہار خیال کیا جائے۔ یہ کام تفصیل
طلب ہے لہٰذا آئندہ کے لئے چھوڑ کر فی الحال ترمذی
کو لیا جاتا ہے۔

ترمذی نے اپنی سند کو ابوھریرہ تک پہنچا کر
یہ متن اختیار کیا ہے ابشر یا عمار تقتلك الفئة الباغية
پھر اس کے بارے میں کہا ہے ھذا حدیث حسن
صحیح غریب۔ اب اہل علم تعمق فرمائیں کہ اس مبارک
کا کیا مطلب ہے۔ اگر علامہ جرجانی کی تشریح قبول کی جائے
تو یہ مفہوم ہوگا کہ روایت فی ذاتہ تو صحیح نہیں ہے لیکن اسکی

سند حسن دوسری سند حسن سے تقویت پاکر قوۃ میں
کے مماثل ہوگئی ہے اور اگر وہ تشریح قبول کی جائے
ں ہمارے اساتذہ سے پہنچی ہے تو یہ مطلب ہوگا کہ سند
طور پر صحیح نہیں ہے بعض نے صحیح مانا ہے اور بعض نے
حسن -

دوسری بات یہ قابل توجہ ہے کہ اگرچہ غرابت
ت کے لئے قادح نہیں ہوتی لیکن فنی اعتبار سے اس کا
صحت کی توثیق کی طرف نہیں بلکہ ضعف وریب کی
ہوا کرتا ہے - ترمذی نے علاء بن عبدالرحمٰن
فراد کی وجہ سے روایت کو غریب قرار دیا - لہٰذا نتیجہ
بیجا نہ ہوگا کہ تحسین و تصحیح کے باوجود ترمذی کے
ب یہ روایت اعلیٰ درجے کی صحیح نہیں ہے - ہم اس پر
حاظ سے کچھ اور بھی گفتگو کرنا چاہتے تھے لیکن اس خیال
ک جاتے ہیں کہ عام قارئین کے لئے اس کا پڑھنا اور
مشکل ہو جائے گا -

حافظ ابن حجر نے اس روایت کی تخریج کرنیوالوں
امام نسائیؒ کا نام بھی لیا ہے، لیکن یہ سنن نسائی جو صحاح
ہ میں سے ایک ہے اس میں تو یہ روایت ہے نہیں ہاں
ی الخصائص میں جو مناقب مرتضوی کہلاتی ہے
ہو لیکن نہ تو الخصائص ہمیں مہیا ہو سکی نہ اسکو اس بحث میں
مناسب ہوگا - امام نسائیؒ بڑے پائے کے محدث تھے - قبول روایت
دہ تشدد کی حد تک محتاط مشہور ہیں لیکن حضرت علیؓ و معاویہؓ سے
ق انکی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا - آپ سے جب سوال کیا
حضرت علیؓ کے مناقب تو آپنے منضبط فرمالئے کوئی روایت
ت معاویہ کی بھی آپکو معلوم ہے ؟ تو انھوں نے برملا جواب دیا -
" معاویہؓ کے مناقب کہاں ان کیلئے تو یہی کافی ہے کہ برابر سرابر
ٹ جائیں " --- بعض یہ جواب بایں طور بیان کرتے ہیں : -
" معاویہ کے مناقب میں مجھے سوائے 'لا اشبع اللہ بطنہ' کے
وئی صحیح حدیث نہیں ملی " --- یہ انداز نظر حضرت معاویہؓ کے بارے
س کا ہوا سکی مدح علیؓ اور ذم معاویہؓ بالیقین شکوک ہے - معاویہؓ کی
بنت تو اس سے زیادہ مضبوط و ثقہ روایات سے ثابت ہے جتنی یہ ۷
ع والی روایت ہے (بخاری کتاب الجہاد - باب ما قیل فی قتال الروم -

مسلم کتاب الامارۃ - البدایۃ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۲۲۹ - العواصم من القواصم
فی التعلیق) --- مختصر یہ کہ زیر بحث روایت کے سلسلے میں امام نسائیؒ کو
بیچ میں لانا غیر موزوں ہوگا -

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب حدیث باب میں تم اتنی ردّ و
قدح کرتے ہو تو اس کی صحت سے صاف انکار کیوں نہ کیا ؟
جواب یہ ہے کہ صاف انکار کی اب بھی گنجائش نہیں ہے
معاویہؓ کی عزت کی خاطر ہم اپنا ایمان تو خطرے میں نہیں
ڈال سکتے - اس روایت کے مختلف طرق کم و بیش چودہ صحابیوں
تک پہنچتے ہیں اور بخاری و مسلم جیسے ائمہ حدیث نے اسے قبول
کیا ہے - ابن تیمیہؒ اور حافظ ذہبیؒ بھی اس کی صحت
کا انکار نہیں کرتے لہٰذا ہمارے جیسے بے بضاعت کا اپنی ضد
اور نفسانیت کے تحت ان علمائے کبار کا خلاف کرنا نادانی اور
سرکشی کا مظاہرہ ہوگا - ہم نے جو کہا تھا کہ اس روایت کی
صحت میں کلام کرنا ناجائز نہیں ہے وہ تو بلاشبہ مذکورۂ بالا
معروضات سے واضح ہو گیا لیکن یہ نہ ہم نے پہلے کہا نہ اب
کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے - فافھم وتدبر -

پھر کیا بات بنی ؟

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ہم روایت کو صحیح مانتے
ہیں تو پھر معاویہؓ کے باغی ہونے میں کیا شک رہا ؟
اس سوال کا جواب ہم اپنی طرف سے نہیں بلکہ ہدایہ،
فتح القدیر اور عنایہ کے مصنفین سے کہیں برتر مجتہدین کی
کی طرف سے پیش کرتے ہیں - ابن تیمیہؒ کی منہاج السنۃ
کے "مختصر" المنتقی من منہاج الاعتدال
مطبوعۃ المطبعۃ السلفیہ بالروضہ کے صفحہ ۲۵۱
پر حافظ ذہبی اسی حدیث کے سلسلے میں نقل فرماتے ہیں : -

واما السلف کابی حنیفۃ	اور جہاں تک سلف کا تعلق ہے مثلاً
ومالک واحمد وغیرہم	امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام
فیقولون لم یوجد شرط	احمدؒ وغیرہ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ
قتال الطائفۃ الباغیۃ	علیؓ و معاویہؓ کی جنگ میں وہ شرط
فان اللہ لم یأمر	نہیں پائی گئی جو قرآن کی رُو سے

بقتالهما ابتداً بل امر اذا اقتتلت طائفتان ان يصلح بينهما ثم ان بغت احدا هما؟ قوتلت ولهذا كان هذ القتال عند احمد ومالك "قتال فتنة" وابوحنيفة يقول :- لا يجوز قتال البغاة حتى يبدأوا بقتال الامام وهولاء لم يبدأوه	باغی جماعت سے لڑنے میں پائی جانی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ شروع ہی میں قتال شروع کردو بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ جب مسلمانوں کے دو گروہوں میں قتال جاری ہو جائے تو انہیں مصالحت کرادی جائے پھر مصالحت کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ بغاوت کرے تو اس سے لڑائی لڑی جائے لہذا یہ علیؓ و معاویہؓ کی جنگ امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک

"قتال فتنة" قرار پائی نہ کہ قتال بالبغاۃ اور ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ باغیوں سے قتال جائز نہیں ہے جب تک یہ باغی امام سے قتال کی ابتداء نہ کریں اور معاویہؓ کے ساتھیوں نے علیؓ سے قتال کی ابتداء نہیں کی ۱۲

واضح رہے کہ ائمہ کے قول میں امرِ الٰہی قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات ر کوع ۱)	اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم جنگ کر بیٹھیں تو ان میں مصالحت کرادو۔ پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک ان میں کا دوسرے پر تو تم سب لڑو اس چڑھے چلے جانے والے سے یہاں تک کہ پھر آئے وہ اللہ کے حکم کی طرف۔

اور امام ابوحنیفہؒ کا جو قول حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا وہ ھدایہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اب ہم محترم مکتوب نگار جناب حسینی صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ اگر ابن الھمامؒ اور بابرتی وغیرہ پر سہو و خطا کا الزام ان کی نظر میں لائقِ توجہ نہیں تو یہ بات تو بہرحال لائقِ توجہ ہوگی کہ ان فقہاء کے بالمقابل ہم نے اوّل درجے کے ائمہ و مجتہدین کی آراء پیش کردیں جو ابن الہمام وغیرہ سے کہیں فائق و برتر ہیں۔ ہمیں جری اور گستاخ کہنے والے

اب انھیں بھی ایسے ہی خطابات کا نشانہ بنائیں۔ علامہ ابن عابدین نے رسم المفتی میں فقہاء کے جو سات طبقات گنوائے ہیں ان میں ابوحنیفہؒ، مالک اور احمد رحمۃ اللہ علیہم کا مقام طبقۂ اوّل میں ہے اور ابن الہمامؒ محمود البابرتی اور برہان الدین کو بہت کھینچ تان کر چوتھے طبقے میں شمار کیا جا سکتا ہے ورنہ بظاہر تو وہ پانچویں طبقے میں ہیں۔ امام قدوری البتہ چوتھے کے فرد ہیں۔ بہت نرمی برتو تو تیسرے میں شامل کرلو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اوّل درجے کے مجتہدینِ مطلق کی آراء کے مقابلہ میں تیسرے چوتھے اور پانچویں طبقات کے فقہاء کی آراء کو حجت کیسے مانا جا سکتا ہے۔

اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو یوں کہیئے کہ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد رحمہم اللہ نے اس حدیث کو لائقِ احتجاج ہی نہیں مانا — اور یہ ناممکن بھی نہیں ہے کیونکہ طرقِ کثیرہ کے باوجود یہ روایت اخبارِ احاد میں سے ہے اور اخبارِ احاد بعض حالتوں میں ایسا رجہ اختیار کر جاتی ہیں کہ ان کا نہ انکار کیا جائے نہ اقرار بلکہ سکوت اختیار کیا جائے۔ جو خبرِ واحد معاویہ اور ان کا ساتھ دینے والے بے شمار صلحاء و اتقیاء کو داعی الی النار قرار دے اور اس الزام رشت سے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ مُبَشِّرِ بِالْجَنَّۃ بھی بچ کر نہ جا پائیں اسے مسکوت عنہ اور ناقابلِ احتجاج قرار دینا بعید از قیاس نہیں ہے۔

یا پھر یوں کہیئے کہ مذکورہ ائمہ نے اس حدیث کو لائقِ احتجاج مانا ہے تو صاف ظاہر ہو گیا کہ فئۃ باغیہ وہ قاتلینِ عثمان ہی کو قرار دے رہے ہیں ورنہ گروہِ معاویہؓ کے باغی ہونے سے انکار کے بعد اور کون رہ جاتا ہے جسے باغی کہا جائے۔

اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ یہی توجیہہ خود معاویہؓ سے بھی منقول ہے۔

انحن قتلناه؟ انما قتله الذين جاءوا به۔ (مسند امام احمد ابن حنبل)	کیا ہم نے عمار بن یاسر کو قتل کیا؟ انھیں تو ان لوگوں نے قتل کیا ہے جو انھیں میدانِ قتال میں ساتھ لائے تھے۔

بے شک خود ملزم کی تاویل حجت نہیں ہوا کرتی لیکن اسی

تاویل کی توثیق اگر تین چوتھائی کے ائمہ بھی کرجائیں تو پھر اکیلا عامر عثمانی اس کا مستوجب نہیں رہتا کہ اسے گستاخ اور ناصبی اور حجری وغیرہ قرار دیا جائے۔ بُرا بھلا کہنا ہے تو ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ، ابن تیمیہؒ اور ذہبیؒ کو بھی کہو۔ عمار قتل چاہیے فوج معاویہؓ ہی کے کسی فرد کے ہاتھوں ہوئے ہوں، لیکن روزمرّہ کی گفتگو میں یہ طریقہ بہت عام ہے کہ کسی فعل کی نسبت اس کے مرتکب کی بجائے اصل ذمہ دار کی طرف کردی جاتی ہے مثلاً الف کی صحبت میں جیم شراب اور قمار وغیرہ کا عادی بنتا ہے اور پھر کثرت سے شراب نوشی کرتے ہوئے ایک دن کنوئے میں جا گرتا ہے تو ایسے موقع پر بارہا بولدیتے کہ جیم کا قاتل الف ہے۔ حالانکہ موت کا قریبی سبب شراب کا نشہ تھا اور کنوئیں میں کودنے کا مرتکب خود جیم ہوا ہے لیکن اس انجام کی طرف چونکہ الف کی بُری صحبت ہی لے گئی ہے اس لئے قاتل الف کو کہدیا گیا۔

اسی طرح آپ کہتے ہیں نیپولین کو فلاں مقام پر شکست فاش ہوئی۔ اب ظاہر ہے شکست تو دراصل وہ سپاہی کھاتے ہیں جو میدان میں نبرد آزما ہیں، لیکن شکست اور فتح کی نسبت کی جاتی ہے سالار کی طرف کیونکہ اسی کے ہاتھ میں قوم کی زمام ہوتی ہے۔ معاویہؓ کا لشکر خود چڑھ کر حضرت علیؓ پر حملہ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ اقدام حضرت علیؓ کی طرف سے ہوا تھا اور بظاہر سربراہ اگرچہ علیؓ ہی تھے لیکن اس فتنے کی زمام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے دن دہاڑے حضرت عثمانؓ کا خون بہایا تھا۔ اس طرح عمار کے قاتل بھی وہی ٹھیرتے ہیں گوکہ بادی النظر میں عمار فوج معاویہؓ کے ہاتھوں قتل ہوئے ہوں۔

قرآن کی سورۃ انفال کھولئے۔ مقتولین بدر کے بارے میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں :-

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى -	پس تم نے انھیں نہیں قتل کیا لیکن اللہ نے قتل کیا اور (اے محمد) تم نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی لیکن اللہ نے پھینکی۔

+ + + +

دیکھ لیجئے۔ بظاہر تو کفار سے مقابلہ مومنین ہی کرتے ہیں اور وہ مٹھی بھر خاک یا سنگریزے بھی حضورؐ ہی اپنے دست مبارک سے پھینکتے ہیں جنھوں نے کفار کے حق میں بلائے بے درماں کی شکل اختیار کرلی تھی لیکن اللہ کہتا ہے کہ نہیں یہ سب کچھ تم نے نہیں کیا بلکہ یہ تو ہم نے کیا یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ قرآن ہی کی تصریح کے مطابق اس جنگ میں مومنین کی نصرت کو فرشتے اُتارے گئے تھے لیکن تمام قریبی وظاہری اسباب کو کالعدم قرار دیکر اللہ قتل اور رمی کی نسبت اپنی اور صرف اپنی طرف کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خاص حالتوں میں کسی فعل کے مرتکب اور فاعل کو کالعدم قرار دیکر فعل کی نسبت اصل کارفرما اور قوتِ مؤثرہ کی طرف کردینا کوئی خلافِ قاعدہ اور غلطیات نہیں ہے۔

سورۃ شوریٰ کھولئے :-

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ - (الشوریٰ ع ۴)	اور جو کچھ تم پر سختی پڑے وہ نتیجہ ہے اُس کا جسے تم نے خود اپنے ہاتھوں کمایا ہے اور کثیر خطائیں تو معاف کردی جاتی ہیں۔

بچے اور انبیاء تو معصوم ہیں اور دیوانے وغیرہ غیر مکلّف ان کے علاوہ یہ خطاب ہر فرد انسانی سے ہے۔ اب ذرا دیکھئے بیٹھے بٹھائے آپ کے سر پر چھت کی اینٹ گرجاتی ہے اور زخم ہوجاتے ہیں۔ یا ریل میں سوار ہیں اور ڈبہ پٹڑی سے اُتر گیا جس سے آپ کا پیر ٹوٹ گیا۔ یا اور بے شمار مصیبتیں ہیں جن کے ورود میں بظاہر آپ کے اپنے فعل وقصد کو کوئی دخل نہیں ہو بلکہ ان کے اسباب وعلل خارج میں صادق طور پر موجود ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان اسباب وعلل کی بجائے ان مصیبتوں کا مصدر ومبنیٰ اور سبب اصلی آپ ہی کے کسی سابق فعل کو قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قریبی وظاہری اثر کو نظر انداز کرکے فعل وعمل کا رشتہ بعید وخفی سبب سے جوڑ دینا کوئی اَنہونی بات نہیں۔

کتنی ہی احادیث ہیں جن میں حضورؐ کی مراد وہ نہیں ہے جو بادی النظر میں معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ اُنصر اخاك

ظالماً او مظلوماً (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم) اب اگر لفظوں ہی کی پیروی کریں تو نعوذ باللہ بات نہایت خراب بن جائے گی اسی لئے صحابہؓ چونکے بھی تھے اور حضورؐ نے مفہوم بھی بیان کر دیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکو۔ اسی طرح یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تقتلک الفئۃ الباغیۃ کے ارشاد میں حضورؐ کا وہ منشا نہ ہو جو بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے بلکہ جماعتِ باغیہ اسی گروہ کو کہا گیا ہو جو خلافتِ عثمانی سے بغاوت کر کے تمام اگلے فساد و شر کا بانی مبانی بنا تھا۔

ایک اور شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ المنتقی کی تعلیق میں محب الدین الخطیب ص۲۵۱ پر لکھتے ہیں:۔

فی اعتقادی الشخصی ان کل من قتل من المسلمین بایدی المسلمین منذ قتل عثمان فانما اثمہ علی قتلۃ عثمان لانہم فتحوا باب الفتنۃ ولانہم واصلوا تسعیر نارہا ولانہم الذین اوغروا صدور المسلمین بعضہم علی بعض، ولو لم یکن قتلۃ عثمان لما کانت وقعۃ الجمل ولا وقعۃ صفین، فکما کان ہؤلاء الحمقی المفسدون قتلۃ عثمان فانہم کانوا القاتلین لکل من قتل بعدہ ایضاً، ومنہم عمار ومن ہم افضل من عمار کطلحۃ والزبیر الی ان انتہت فتنتہم بقتلہم علیا نفسہ، وقد کانوا من جندہ، وفی الطائفۃ التی کان علیؓ قائماً علیہا فالحدیث من اعلام النبوۃ۔ والطائفتان المتقاتلتان فی صفین کانتا طائفتین من المؤمنین وعلیؓ افضل من معاویۃ وعلیؓ ومعاویۃ من صحابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن دعائم دولۃ الاسلام وکل ما وقع من الفتن فاثمہ علی مؤرثی نارہا لانہم السبب الاول فیہا ویشارکہم فی ہذا الاثم کل من یستحسن عملہم الی یوم القیامۃ، فہم الفئۃ الباغیۃ التی قتل بسببہا کل مقتول فی وقعتی الجمل وصفین وما تفرع عنہما۔

+ + + +

+ + + +

+ + + +

اور میں اپنے ذاتی عقیدے کے ذیل میں کہتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جتنے بھی مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان سب کا بارِ گناہ قاتلینِ عثمانؓ کے دوش پر ہے، کیونکہ انھوں ہی نے فتنے کا دروازہ کھولا اور برابر فتنے کی آگ سلگاتے رہے اور وہی تو ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے خلاف عناد و اشتعال سے بھر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتے تو جمل اور صفین کے واقعات پیش ہی نہ آتے۔ پس جس طرح یہ احمقانِ فتنہ طراز عثمانؓ کے قاتل ہیں اسی طرح اُن تمام مقتولوں کے بھی قاتل ہیں جنھیں قتلِ عثمانؓ کے بعد موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ اور ان مقتولین میں عمار بن یاسرؓ بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جو ان سے افضل تھے مثلاً طلحہ اور زبیر یہاں تک کہ ان مفسدوں کا اُٹھایا ہوا فتنہ خود علیؓ کے قتل تک جا پہنچا اور یہ اشرار علیؓ ہی کے سپاہیوں میں تھے اور اسی جماعت کے شریک تھے جس کی سربراہی حضرت علیؓ فرما رہے تھے۔ پس حدیث مذکور نبوت کے دلائل میں سے ہے اور صفین کے دونوں متقابل فریق مومنین میں سے تھے اور علیؓ بیشک معاویہؓ سے مرتبے میں بڑھے ہوئے ہیں اور علیؓ و معاویہؓ دونوں ہی نہ صرف صحابیِ رسولؐ ہیں بلکہ مملکت اسلامیہ کے ستونوں میں سے دو ستون ہیں۔ اور جتنا کچھ فتنہ و فساد انکے مابین واقع ہوا اس کا پورا بارِ گناہ اس فتنے کی آگ بھڑکانے والوں کے سر ہے۔ کیونکہ وہی اس میں سببِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں اور انکے اس گناہ میں قیامت تک ہر وہ شخص شریک ہوتا رہے گا جو انکے عملِ خبیث کو سراہے گا۔ پس یہی لوگ تھے وہ جماعتِ باغیہ جو جمل، صفین اور دیگر ذیلی آویزشوں میں قتل ہونے والے ہر مقتول کے حق میں سببِ اصلی قرار پاتے ہیں۔

یہ طول بیانی ہم نے اس لئے نہیں اختیار کی کہ ہر شخص ہماری ہی تحقیق اور رائے سے اتفاق کرے بلکہ یہ ثابت کرنے کے لئے اختیار کی ہے کہ ہم اگر ایک رائے رکھتے ہیں تو وہ فقط ضد اور خود پرستی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ خارج میں اس کے لئے شواہد موجود ہیں ہماری رائے کو غلط سمجھنے والوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہم پر گستاخی، ناصبیت، انکارِ حدیث اور تعصب کا الزام لگائیں۔ رائے ہماری غلط ہو سکتی ہے لیکن نیت کو اللہ بہتر جانتا ہے۔ والیہ

تصحیح الامور۔

ایک اور توجیہہ

کیا حرج ہے اگر اہل نظر اس توجیہہ پر بھی غور کرلیں کہ ممکن ہے عمار بن یاسر گروہِ معاویہؓ کی بجائے اپنے ہی ساتھیوں میں سے کسی کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہوں۔ یہ جو طے کرلیا گیا ہے کہ انکا قاتل گروہِ معاویہؓ تھا یہ زیادہ تر اس بنیاد پر ہے کہ وہ علیؓ کے طرفدار تھے لہٰذا ان کا قاتل حریف ہی ہونا چاہئے لیکن کیا تلوار کی جنگوں میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجاہد اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں شہید ہو جائے؟ ہم کہتے ہیں یقیناً ہوتا ہے اور غزواتِ پیغمبرؐ ہی میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ جب گھمسان کا رن پڑ جائے اور تصادم جنگِ مغلوبہ کی شکل اختیار کر جائے تو کتنے ہی سپاہی اپنے ہی کسی ساتھی کے وار کا ہدف بن جاتے ہیں۔ عمار بن یاسر معرکۂ صفین میں شہید ہوئے ہیں۔ اس معرکہ میں کیسا گھمسان کا رن پڑا ہے اس کے لئے محاضراتِ خضری' اخبار الطوال' البدایہ وغیرہ کوئی بھی دیکھ لیجئے ۹ صفر کی صبح کو جو جنگ ہوئی تھی اس کا تو یہ عالم رہا تھا کہ چوبیس گھنٹے مسلسل چلی۔ قادسیہ کی لیلۃ الھریر کی طرح رات کی تاریکی میں بھی فوجیں گتھم گتھا ہوتی رہیں یہاں تک کہ اگلی صبح کا سورج نکل آیا۔

ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ انسان رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہوں۔ صفیں ٹوٹ چکی ہوں' تلوار اندھے کی لاٹھی کی طرح گھوم رہی ہو' جنگ مغلوبہ بھیانک شکل میں جاری ہو' تو کیا ایسے میں کوئی انہونی بات سمجھی جائے گی اگر عمار بن یاسر کی شہادت خود انھی کے ہمراہیوں میں سے کسی کے ہاتھوں نادانستہ ہو گئی ہو۔

خوب اچھی طرح سوچ لیجئے۔ کیا کوئی ایسی روایت آپ کے پاس موجود ہے جو ناقابلِ تردید قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کردے کہ عمار کی گردن معاویہؓ ہی کے کسی سپاہی نے کاٹی تھی۔ اگر موجود ہے تو اسے سامنے لایئے اور نہیں موجود ہے تو محض اس بنیاد پر کہ عمار حضرت علیؓ کے ساتھی تھے یہ فیصلہ درست نہیں ہے کہ انھیں گروہِ معاویہ ہی نے قتل کیا تھا۔

ہم کہتے ہیں نادانستہ ان کا خود اپنے ہمراہیوں کے ہاتھوں شہید ہو جانا تو عین ممکن ہے ہی اس سے بڑھ کر بھی ممکن ہے کہ دانستہ ہی وہ مار ڈالے گئے ہوں۔ یہ قاتلینِ عثمان کچھ کم اسکیم باز نہیں تھے۔ ان میں سے کسی فتین نے اپنی کسی اسکیم یا ذہنی رو کے تحت عمار کا خاتمہ کر دیا ہو تو کیا تعجب۔

تاہم دانستہ پر اصرار نہیں۔ قتل دانستہ ہوا ہو یا نادانستہ لیکن جب تک اٹل اور یقینی ذرائع سے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ عمار کا قاتل فوج معاویہ کا کوئی سپاہی تھا یہ دعویٰ کمزور ہوگا کہ انھیں گروہِ معاویہ نے قتل کیا اور جب اسی دعوے پر حدیث کے مصداق کا مدار ہے تو یقین کے ساتھ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کی پیشین گوئی کا ہدف معاویہ ہی کا گروہ ہے۔

اس توجیہہ کی تقویت کے لئے دو قرینے بھی ہیں۔

ایک یہ کہ حضورؐ نے عمار کے لئے خصوصیت سے پیشین گوئی فرمائی۔ گروہِ معاویہ کے ہاتھوں تو صفین میں بہت صحابی اور تابعی قتل ہوئے ہیں اگر عمار بھی اسی گروہ کے کشتہ رہے ہوں تو کیا خصوصیت ان کی باقی رہ جاتی ہے۔ ہاں اگر ان ہی کے ساتھیوں میں سے کسی نے انھیں قتل کر دیا ہو تب خصوصیت ظاہر و باہر ہے۔ ایسا عام طور پر نہیں ہوتا کہ اپنے ہی ساتھی قاتل بن جائیں۔

دوسرا یہ کہ جب جنگ جمل کے دوران قاتلین عثمان ہی کا ایک سفاک رکن عمرو بن جرموز حضرت زبیرؓ کو عین نماز میں شہید کر کے ان کے ہتھیار سمیت حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچا تھا تو حضرت علیؓ نے حضرت زبیرؓ کی تلوار پہچان کر فرمایا تھا:-

"میں زبیر کے قاتل کو جہنم کی بشارت دیتا ہوں"۔

اس پر ابن جرموز کو بڑا تاؤ آیا تھا اور تلخ لہجے میں بولا تھا

"واہ صاحب واہ ہم تو تمہارے دشمنوں کا صفایا کر رہے ہیں اور تم ہو کہ ہمیں دوزخ کی بشارت دیتے ہو"

بات ختم ہو گئی تھی، لیکن کیا قاتلینِ عثمان کی شر پسند طبیعت سے یہ بعید ہے کہ حضرت علیؓ کی یہ بات انھوں نے گرہ

میں باندھلی ہو اور اسی کے نتیجے میں ان کے بعض کینہ پروروں نے یا کم از کم ابن جرموز ہی نے یہ سوچا ہو کہ کیوں نہ اپنے ہی کیمپ کے اُن اکابر کا خاتمہ کر دیا جائے جو علیؓ کے دست و بازو ہیں اور ان کی جانبازی و حق پسندی سے اندیشہ ہے کہ معاویہؓ کی سرکوبی کے بعد خود ہماری سرکوبی کریں گے۔ ہو سکتا ہے آپ یوں کہیں کہ یہ طرزِ فکر احمقانہ ہے۔ ہم کہتے ہیں احمقانہ ہی سہی مگر جھلاہٹ اور غیظ کے عالم میں تو اچھے اچھے دانشوروں کا دماغ احمقانہ خیالات کا مہبط بن جاتا ہے۔ ابن جرموز حضرت زبیرؓ کو قتل کر کے خوش خوش علیؓ کے پاس آتا ہے کہ اپنی وفاداری کی داد دے گا۔ علیؓ بجائے داد دینے کے دوزخ کی بشارت سے نوازتے ہیں۔ ایسے میں ابن جرموز کا پارہ جتنا بھی چڑھ گیا ہو اور مشتعل دماغ میں جیسے بھی واہی خیالات آئے ہوں تعجب کی بات نہیں ہے۔ عمار حضرت علیؓ کے پُرجوش طرفداروں میں تھے، ان کا قتل ابن جرموز جیسے کسی ہمراہی کے ہاتھ سے اسلئے مستبعد نہیں کہ ابن جرموز جس گروہِ مفسدین کا فرد تھا وہ حبِ علیؓ اور بغضِ معاویہؓ سے زیادہ خود اپنے چکر میں تھا۔ اپنی اہواء و اغراض کے آگے وہ نہ علیؓ کا لحاظ کر سکتا تھا نہ عمار کا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس نے خود علیؓ کو ضیق میں ڈالا، سرتابی سرکشی کی۔ جان جلائی۔ اپنے قائد کو اس حد تک دل برداشتہ کیا کہ حضرت علیؓ کے اس وقت کے ——— خطبوں میں اپنے ساتھیوں کے لئے بیزاری توبیخ اور جھلاہٹ کی صدائے بازگشت آج بھی ایک تاریخی المیے کی حیثیت سے سب کے سامنے ہے۔

یہ دو قرینے اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ عمار بن یاسرؓ فوج علی ہی کے کسی سپاہی کے ہاتھوں دانستہ یا سہواً قتل ہو گئے ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب و ہو العلیم الخبیر۔

فی نوبتہ

اگرچہ ہدایہ وغیرہ پر مزید گفتگو کو ہم نے فی الوقت نظر انداز کر دیا ہے لیکن اتنی بات تو کہتے ہی چلیں کہ یہ جو صاحبِ ہدایہ نے فرمایا۔

"حق حضرت علیؓ ہی کے ساتھ تھا اپنی باری میں۔"

تو شارحین ہی کی توضیح کے مطابق اس کا یہی تو مطلب ہوا کہ حضرت علیؓ کا چوتھا خلیفۂ راشد ہونا برحق تھا۔ آمنّا وصدقنا۔ اس فیصلے پر وہ معترض ہو جو یہ خیال رکھتا ہو کہ علیؓ چوتھے خلیفۂ راشد نہ تھے بلکہ معاویہؓ کو چوتھا خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔ ہم برابر حضرت علیؓ کو چوتھا خلیفۂ راشد مانتے آئے ہیں، اس کا انکار ہم نے کبھی نہیں کیا اور خود معاویہؓ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ علیؓ مستحقِ خلافت نہیں، بلکہ میرے لئے تختِ خلافت خالی ہونا چاہئے۔ انھوں نے علیؓ کو ہمیشہ برگزیدہ جانا۔ اتنا ہی معظم اور عالی مرتبہ مانا جتنے وہ حقیقت میں تھے۔ نہ ان کے ذاتی فضل سے منکر ہوئے نہ ان کے استحقاقِ خلافت میں نقص نکالا۔ وہ تو بس اتنا ہی کہتے تھے کہ شہید عثمانؓ کا قصاص لو۔ قصاص کا مطالبہ عین قرآنی مطالبہ تھا اور خاندانی رشتے کی رعایت سے وہ اس مطالبے کے حقدار بھی تھے۔ انھیں حکمت و ہمدردی کے ساتھ باور کرایا جاتا کہ عثمانؓ کا قصاص لینا بحالتِ موجودہ واقعی ناممکن ہے تو بات نیزہ و شمشیر تک نہ پہنچتی لیکن جب مدارات و مروّت کو ترک کر کے معزولی کا پروانہ بھیجدیا جائے اور اسے نہ ماننے پر فوجی اقدام اٹھایا جائے تو ٹکراؤ لازمی ہونا تھا۔ اس طرح جو ہولناک قتال واقع ہوا وہ امام مالکؒ و امام احمدؒ کے قول کے مطابق "واقعی قتالِ فتنہ" تھا۔ قتال بالبغاۃ نہ تھا۔ خود ہدایہ ہی کا باب البغاۃ دیکھ لیا جائے۔ وہ خارجی اہل حروراء سے حضرت علیؓ کے قتال کو تو قتال بالبغاۃ مانتے ہیں، لیکن معاویہؓ کے ساتھ قتال کو اشارۃً بھی انھوں نے قتال بالبغاۃ نہیں کہا ہے۔ تفصیل انشاء اللہ پھر۔

ب الصحت) (از بیگم حکیم عظیم زبیری۔ امروہہ

غذا اور صحت

اچھی صحت کا انحصار متوازن غذا اور اس کے جذب و ہضم کے درست ہونے پر ہے غذا درست طریقہ پر استعمال کرنے سے نہ صرف
ت ہی برقرار رہتی ہے بلکہ بہت سی بیماریوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے ہر اس شخص کے لئے جو تندرستی کے ساتھ زندہ رہنے کا خواہش مند ہے
ی ہے کہ کھانے پینے کے معاملہ میں دانشمندی کے ساتھ توجہ دے۔ ہوشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی غذا کھائی جائے جو ہلکی۔ سادہ۔ زود ہضم
غذائیت سے پُر ہو۔ تازہ سبزی۔ بے چھنے موٹے آٹے کی روٹی۔ شاداب شیریں پھل اور تازہ خالص دودھ ایسی ہی غذا ہے۔
ری ہلکی آنچ پر پکائی جائے اور ادھ پکی حالت میں چولھے سے اتار لی جائے۔ دیر تک اور تیز آنچ پر سبزی پکانے سے نہ صرف اس کے وٹامنز
سالٹس و نمکیات) ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ دیر ہضم بھی ہو جاتی ہے۔ ایک طشتری جس میں دو ٹماٹم اور دو گاجریں۔ سرخ پختہ ٹماٹر اور تھوڑی
یودہ وٹامن سے پُر ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایسی غذائیں کمی کے ساتھ استعمال کرنی چاہئیں جن میں نشاستہ۔ چکنائی مٹھاس زیادہ ہو۔ جیسے
ت۔ مرغن سالن۔ مٹھائیاں۔ میدہ اور باریک سفید آٹے کی روٹی اور سفید چینی (دانہ دار شکر) صحت پر اچھا اثر نہیں ڈالتی ہیں دانہ دار
سے زیادہ مفید بھوری دیسی شکر ہوتی ہے۔ شہد اور گڑ چینی سے زیادہ غذائیت رکھتے ہیں۔ گاجریں ٹماٹر۔ چقندر۔ پیاز کچی حالت میں غذا کے
قہ روکھی استعمال کرنے سے صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے ایسی چاء جو گاڑھی ہو۔ اور اس میں دودھ بھی کم ہو کبھی نہ پینی چاہیئے۔ چاء میں ایک جوہر
ب الیسڈ ہوتا ہے جو جگر اور گُردوں کے لئے مضر ہے جیسی چاء عام طور پر پی جاتی ہے وہ دل کی حرکات کو غیر معمولی تحریک پہنچاتی ہے اس
بچنا ہی بہتر ہے جو لوگ چاء کے عادی ہیں ان کو چاہیئے کہ ہلکی چاء استعمال کریں اور صبح و شام دو وقت سے زیادہ نہ پئیں۔

اگر خدانخواستہ آپ کسی بیماری کا شکار ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے واقعی خواہش مند ہیں تو اپنا حال لکھکر مفت مشورہ
ل کریں "محافظ شباب" مفت منگا کر پڑھیں۔ محافظ شباب کا مطالعہ بتائے گا کہ بگڑی تندرستی کیسے سنواری جاسکتی ہے اور
ں خاص امراض کا کامیاب اصولی طریقۂ علاج حقیقتاً کیا ہے۔ پتہ یہ کافی ہے :۔ بیگم عظیم زبیری امروہہ

نئی کتابیں

سنت خیرالانام

حدیث کی اہمیت وضرورت پر جامع ازہر کے ایک فاضل کی بہترین کتاب۔ منکرین حدیث کا رد۔ عوام اس کتاب سے فن حدیث کی خاص اصطلاحوں اور ضروری پہلوؤں سے بھی آگاہ ہو سکیں گے۔

قیمت مجلد چار روپے

فلسفۂ دعا

دعا کی حقیقت، ضرورت افادیت اور دنیا بھر کے علماء و مفکرین کے نزدیک اس کی حیثیت وعظمت کا مفصل بیان۔ اپنی نوع کی واحد کتاب۔ مجلد چار روپے۔

حقوق الاسلام

اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے کس پر کس کا کیا حق ہے۔ اللہ، رسول ص، صحابہ رض، علماء، والدین، اقرباء، حاکم، شوہر، بیوی، اولاد، پڑوسی غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل۔ رسالہ سماع ومزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم۔

قیمت مجلد دو روپے

خصائل مسلمین

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کے پوتے شاہ محمد اسحاق کی مشہور کتاب مسائل اربعین کا اردو ترجمہ۔ چالیس مروجہ بدعتوں کا رد مستند کتب فقہ کے حوالوں سے۔ قیمت مجلد دو روپے۔

سوانح خواجہ معین الدین چشتی رح

محبوب العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی اثر انگیز سوانح حیات۔ جو اجمیر کی خاک میں استراحت فرما رہے ہیں۔ ساڑھے چار روپے

مولانا مودودی سے ملیئے

اسعد گیلانی کی مرتب فرمودہ ایک حقیقت افروز کتاب جو مولانا مودودی کی سیرت وکردار اور فکر وبصیرت کے خدوخال کو خود ان کی تحریروں اور دنیا بھر کے علماء و اکابر کے تبصروں کے آئینے میں پیش کرتی ہے۔ بسیط۔ فکر انگیز

قیمت مجلد ساڑھے چھ روپے۔

صحیح معلومات

سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں جن دنوں کی چھٹیاں رائج ہیں ان کے متعلق معلومات کا گلدستہ۔ جن بزرگوں کے نام پر بعض تہوار مسلمانوں نے نکال لئے ہیں ان کے حالات واقوال سے بچوں اور بڑوں سب کو فائدہ پہنچے گا۔ قیمت ایک روپیہ۔

چند لاجواب رسائل

"زندگی" کے سابق مدیر مولنا سید حامد علی کے علم وقلم محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق مفید ترین مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں چھپتا جا رہا ہے تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی فائدہ اٹھا سکے۔ اب تک درج ذیل کتابچے چھپ کر آ چکے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ گہرے علمی وعقلی موضوعات کو مصنف کے شستہ وپاکیزہ قلم نے عام فہم اور دلنشین بنا دیا ہے۔

(۱) خدا کا انکار کیوں؟ ۔ ۳۲ نئے پیسے (۲) کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ ۔ ۳۲ نئے پیسے (۳) ملحدین کے شبہات ۳۲ نئے پیسے۔ (۴) خدا پرستی ملحدین کی نظر میں ۳۲ نئے پیسے (۵) ہندوستان کا دفاع اسلام اور فن حرب کی روشنی میں ۔ ۳۵ نئے پیسے۔

(قیمتیں معمولی مگر مضامین بیش بہا)

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)